شاعر
ناولٹ نمبر ۷۱ء

THE BOMBAY MERCANTILE CO-OPERATIVE BANK LIMITED
IDEA-ARTS/67
WINDOW TYPE AIR CONDITIONERS
REFRIGERATORS

Phone: 325961 (5 Lines) Grams: 'KHAZANCHI' (Mandvi) Bombay
DOMESTIC ARTICLES
THE BOMBAY MERCANTILE CO-OPERATIVE BANK LTD.
ACQUIRE ON EASY TERMS
78 Mohamedali Road, Bombay-3 BR
ENCOURAGES YOU IN RAISING YOUR STANDARD OF LIVING AND HELPS IN ACQUIRING ON CONVENIENT TERMS THE FOLLOWING:
RADIOS
WASHING MACHINES
STEEL CUPBOARDS
SEWING MACHINES
CEILING FANS
TABLE FANS
ALL KINDS OF BANKING BUSINESS TRANSACTED

ہے کام آدمی کا اوروں کے کام آنا
جینا تو ہے اُسی کا جس نے یہ راز جانا
اشوک کمار
کلا انٹرپرائزز کی طرف سے
قومی یکجہتی اور انسان دوستی پر
ایک اچھوتی اور عظیم الشان فلم پیش کرتے ہیں
ASHOK KUMAR PRESENTS
KALA ENTERPRISES'
adhikar
EASTMANCOLOR
directed by S. M. SAGAR
music R. D. BURMAN
produced by S. NOOR
ڈائریکٹر : ایس، ایم، ساگر
پروڈیوسر : ایس، نور
میوزک : راہل دیو برمن
کہانی : آر۔ ایس ورما
گیت اور مکالمے : رمیش پنت
فوٹوگرافی : پی۔ آئزک
ایڈیٹنگ : وامن راؤ
رقص : سوریا کمار
ادھیکار
ایسٹمین کلر
(جلد نمائش کیلئے پیش کیا جارہا ہے)
ستارے : اشوک کمار۔ نندا۔ دیب مکرجی۔ ناظمہ
راج مہرہ۔ شمی۔ راجنیش۔ کشن مہتہ۔ رتن مالا۔ تبسم اور برہمچاری
ہیلن اور پران کے ساتھ
جاری کردہ : کلا انٹرپرائزز۔ ۳۱۴۔ فیمس سنے بلڈنگ، ہینز روڈ۔ مہالکشمی — بمبئی ۱۱
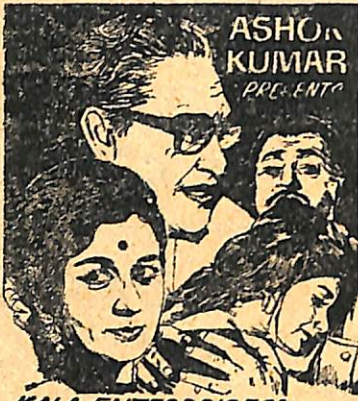
صحیح قدم آج ہی اُٹھائیے!

آپ تو یہی چاہتے ہیں نا کہ آپ کا پمپ سٹ بغیر کسی جھنجھٹ کے چلتا رہے اور آپ کے کھیتوں کو پانی برابر ملتا رہے، تو پھر اس کے لئے صحیح قدم آج ہی اُٹھائیے، یعنی اپنے پمپ سٹ کیلئے ایل اینڈ ٹی اسٹارٹر استعمال کیجئے۔ یہ آپ کی موٹر کی پوری پوری حفاظت کرتا ہے۔ اگر کبھی موٹر زیادہ گرم ہو جائے یا اس کا وولٹیج گھٹ جائے تو ایل اینڈ ٹی اسٹارٹر اپنے آپ موٹر کو لائن سے کاٹ دیتا ہے اور اس طرح اسے جل جانے سے بچا لیتا ہے۔ اس کے کونٹیکٹ بہت دنوں تک چلتے ہیں کیونکہ یہ ٹھوس چاندی کے ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ لارسن اینڈ ٹوبرو کا نام ہی اسٹارٹر کے قابلِ اعتماد ہونے کی ضمانت ہے۔ لارسن اینڈ ٹوبرو کے یہاں آپ کی ضرورت کے مطابق ہر قسم کے اسٹارٹر ملتے ہیں جیسے ڈائرکٹ آن لائن، اسٹار ڈیلٹا ۔۔۔
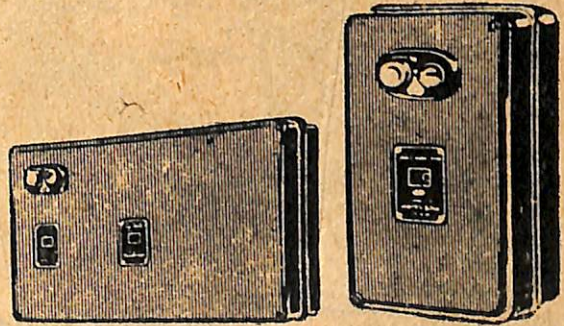
جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اُردو کا بیالیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جلد ۴۲
شمارہ ۳-۲

مُدیرِ اعلیٰ

اعجاز صدیقی

اِدارۂ تحریر:
مہندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن
ندا فاضلی

زرِ سالانہ
دس روپے

قیمت ناولٹ نمبر سات روپے

مکتبہ قصر الادب
پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ۔ بمبئی ۳ بی سی

فون نمبر (۳۵۹۹۰۴)

جھلکیاں

خواجہ احمد عبّاس

تین پہیے، ایک پُرانا ٹب اور دُنیا بھر کا کچرا

۹۱

کوثر چاند پوری

بھوکا ہے بھگوان

۱۵۳

سُہیل عظیم آبادی

بے جڑ کے پودے

۱۹۳

عفت موہانی

دلِ ایسی چیز

٣٦٣

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

پرچھائیوں کا شہر

٣٩٣

نور شاہ

آؤ، سو جائیں

٤١٣
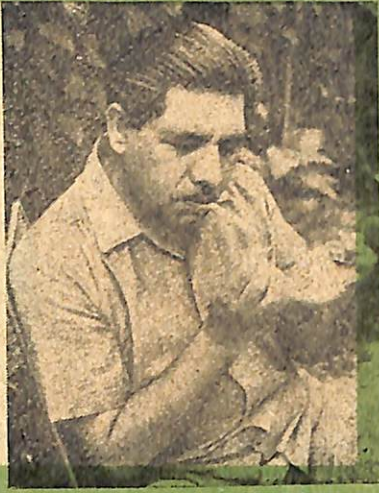
کشمیری لال ذاکر

دھرتی سدا سہاگن

۵۱۵

مُصوّر

سعید بن محمدؐ

۱۹۲۱ء محبوب نگر، حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں گورنمنٹ کالج آف فائن آرٹس حیدرآباد سے پینٹنگ میں ڈپلوما آنرس کے ساتھ حاصل کیا۔ ہندوستان میں منعقدہ بڑی نمائشوں کے ساتھ ساتھ رُوس، مصر، عراق، افغانستان وغیرہ میں ہونے والی اہم نمائشوں میں حصّہ لیا۔ نئی "ABRI" تکنک میں مہارت حاصل کی۔ آج کل گورنمنٹ کالج آف فائن آرٹس حیدرآباد کے اسٹاف میں ہیں۔

گروپ شو: ۱۹۷۰ء میں حیدرآباد میں ایک گروپ شو منعقد کیا۔

اِنعامات: ۱۹۴۵ء میں نواب چھتاری طلائی تمغہ۔ ۱۹۵۳ء میں دیوسکر طلائی تمغہ اور ۱۹۶۸ء میں بہترین تصویر پر اکاڈیمی آف فائن آرٹس کلکتہ کا اعزاز حاصل کیا۔

تصاویر: اورینٹیل میوزیم آف ماسکو۔ نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ نئی دہلی، مرکزی لِلت کلا اکاڈیمی نئی دہلی، پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی، اکاڈیمی آف فائن آرٹس کلکتہ۔ سالار جنگ میوزیم اور ریاستی میوزیم حیدرآباد، آندھرا پردیش للت کلا اکاڈیمی اور ہندوستان بھر میں اِنفرادی تصاویر۔ پتہ: ۲۷/۳/۳ آر ٹی۔ وجے نگر کالونی حیدرآباد ۲۸

صادق

صادق کی پیدائش ۱۹۴۳ء میں اُجین (مدھیہ پردیش) میں ہوئی۔ وکرم یونیورسٹی سے گریجوایشن کیا اور ۱۹۶۷ء میں مستقل طور پہ اورنگ آباد آ گئے۔ مرہٹواڑہ یونیورسٹی سے ایم اے کر رہے ہیں، اور اورنگ آباد میں اپنا ذاتی اسٹوڈیو قائم کرنے کی بھی دلی تمنا رکھتے ہیں۔

صادق شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں اور آرٹسٹ ہیں۔ بسا اوقات لگتا ہے کہ وہ صرف مصوّر ہیں۔ کھلا ہوا قلم ہاتھ میں ہو تو سامنے رکھے ہوئے اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی عافیت خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اگرچہ وہ نظمیں اور افسانے دوستوں کو کبھی نہیں سناتے، لیکن اپنی بنائی ہوئی تصویریں بڑے شوق سے دکھاتے ہیں۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی اُن کو سمجھانے کی ذمہ داری لینے سے صاف انکار کر جاتے ہیں۔ وہ مستقل مزاج اور خاموشی سے کام کرنے کے عادی ہیں لیکن تصویروں میں اُن کی تخلیقی بے چینی صاف نظر آتی ہے۔ اُنہوں نے مصوّری کی باقاعدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ کسی زمانے میں کارٹون نگاری سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ گذشتہ پانچ سال سے ماڈرن آرٹ کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ ان کی لکیروں میں ایک خاص قسم کی جان اور قوت ہوتی ہے۔ صادق جب خاموش رہتے ہیں تو سیدھے سادے نظر آتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں تو کھلنڈرے اور جب اظہار پر اُتر آتے ہیں تو بیحد پیچیدہ لگتے ہیں۔ وہ زندگی کو نظموں، افسانوں اور تصویروں میں قید کر دینے کے باوجود بے چین نظر آتے ہیں۔

پتہ: ۶۴-۱۵-۱ روہیلا اسٹریٹ۔ ڈیوڑھی بازار، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

غیاث قریشی

محمد غیاث الدین قریشی، مرہٹواڑہ کے تاریخی اور بین الاقوامی شہرت کے حامل شہر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد محمد بشیر الدین قریشی حیدرآباد کے محکمۂ تعلیمات میں ہیڈ کلرک تھے۔ غیاث قریشی بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ اپنے چچا محترم محمد محی الدین قریشی کی زیرِ سرپرستی تعلیم جاری رکھی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ آرٹ سے بھی فطری لگاؤ رہا۔

گورنمنٹ کے امتحانات ڈرائینگ ایلیمنٹری اور انٹرمیڈیٹ گریڈ پاس کیے۔ ایلورہ اور اجنتہ کی قربت نے غیاث کے آرٹ کے شعور کو بیدار کیا۔ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد اسکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس میں کمرشیل آرٹ کے مضمونِ اختیاری کے ساتھ شرکت کی۔ ہر سال سرکاری وظیفہ کے ساتھ امتیازی کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء میں امتحان ڈپلوما (جی ڈی آف آرٹ) میں دوسرے نمبر پر کامیابی حاصل کی۔ اورنگ آباد کی تاریخی سرزمین اور اُس کے اطراف واکناف کے قابلِ دید مقامات نے لینڈ اسکیپ اور پینٹنگ کی مشق میں بہت مدد دی۔ مختلف نمائشوں میں انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ پیشہ درس و تدریس ہے۔ پتہ: امیر منزل۔ شاہ بازار۔ اورنگ آباد (ایم ایس)

جُرعات

معیاری ادب کے قدردانوں کی خدمت میں "ناولٹ نمبر" حاضر ہے اور حرفِ آغاز ہی میں یہ عرض کر دینا ہے کہ ہمیں اِس کی تاخیرِ اشاعت کا بیحد افسوس ہے۔ "ناولٹ نمبر" کے کام سات مہینے پہلے شروع کیئے گئے تھے اور یقین تھا کہ یہ وقت سے پہلے ہی شائع ہو جائے گا۔ لیکن اِس بڑے کام کو جتنا آسان سمجھا گیا تھا، یہ اُتنا ہی مُشکل نِکلا۔ مختلف اصنافِ ادب کو لے کر اگر خاص نمبر نِکالا جاتا تو اِتنی دُشواری نہ ہوتی۔

"مُشکلے نیست کہ آساں نہ شوَد"

والی بات تو ٹھیک ہے ــــ مگر یہ سابھی نیا نہ اُردُو میں کوئی بڑا کام کرنا چاہو تو قیامتیں ٹوٹ پڑیں ــــ آخر دوسری زبانوں میں بھی تو بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔ وہ کیوں بحُسن و خُوبی وقت پر انجام پا جاتے ہیں؟ یہ بدقسمتی اُردو کے ساتھ ہی کیوں ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس کا سبب اُردو اداروں کی مالی کمزوری، اجتماعی تعاون اور احساسِ ذمہ داری کے فقدان کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اُردو میں بڑے کاموں کی ہمّت افزائی کیوں نہیں ہوتی ــــ تعاون کیوں نہیں مِلتا، اُردو والے اپنے مزاج کو کیوں نہیں بدلتے؟ یہ ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش چلنے سے کیوں کتراتے ہیں؟ معاصر "شب خُون" کے جناب شمس الرحمٰن فارُوقی "ناولٹ نمبر" کا اشتہار تک نہ چھاپتے ہوئے بِلاوجہ کا یہ طنز تو کر سکتے ہیں کہ:

"ایک رسالہ جو نمبر نکالنے میں بہت تیز ہے ----"

لیکن کچھ کر کے بتانا بہت مشکل کام ہے۔ قوموں اور زبانوں کے مُخلِص خادموں پر اینٹیں اور پتھر اُچھالنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ رویّوں کو ہمدردانہ، مُخلصانہ اور تعمیری ہونا چاہیئے۔ "شاعر" نے ہندوستان میں "خاص نمبروں" کی ایک پُروقار روایت قائم کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ معاصر رسائل اِس روایت کو آگے بڑھائیں۔ وہ "شاعر" کے نمبروں سے بھی اچھے نمبر نکالیں۔ حَسَد، جَلن اور کُڑھن کی عادت کو ترک کریں۔ آپسی تعاون سے کام لیں۔ اُردو کے مشاہیر اربابِ قلم اپنی ذمہ داریوں کو محسوس فرمائیں اور اُردو دوست ہندوستان کے اُردو رسائل کے خاص اور عام نمبروں کو بڑی تعداد میں خریدیں، اُنہیں توجہ کے ساتھ پڑھیں اور اپنی لائبریریوں کی زینت بنائیں۔ بلند مرتبہ ادیبوں اور شاعروں کی قدر کریں۔ اُردو کے سِلسلے میں یہ رونا دھونا، شِکوہ شکایت، بے نیازی اور عدمِ دلچسپی کب تک؟؟

○

ناولؔ اِس دَور کی سب سے مقبول صنفِ ادب ہے۔ اتنی مقبول کہ پُوری دُنیا میں اِس نے مختصر افسانے (Short Story) کا بازار بھی سَرد کر دیا ہے۔ اُردو میں بھی چند سال کی مُدّت ہی میں بکثرت ناول اور ناولٹ شائع ہوئے ہیں۔ اِن میں سے کئی اِس معیار کے حامل ہیں کہ اُنھیں عالمی ناولوں کے دوش بدوش رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اُردو والے شدید قِسم کے احساسِ کمتری میں مُبتلا ہیں۔ مانا کہ اُردُو میں کمزور اور گھٹیا درجہ کے ناول اور ناولٹ بھی بکثرت لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں، لیکن ایسا کِس زبان میں نہیں ہوتا؟ اُردو قارئین کی ناول سے بے پناہ دلچسپی نے ہمیں ایک ضخیم و عظیم اور مُنفرد "ناولٹ نمبر" شائع کرنے کا حوصلہ دِلایا۔

البتہ اِس نمبر کی اشاعت کے لیئے وقت کے تعین میں ہم سے چُوک ہوگئی۔ مُلک میں حالیہ انتخابات کے ہنگاموں نے کئی ماہ تک ہر شعبۂ زندگی کو مُتاثر رکھا۔ ہمیں بھی "ناولٹ نمبر" کے سلسلے میں بڑی دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چند بڑے نُقصانات بھی اُٹھانے پڑے۔ پھر بھی خوشی کی بات ہے کہ ہر دو دُشوار سے گُزر کر ہم "ناولٹ نمبر" اُسی شاندار طریقہ پر پیش کر رہے ہیں، جس طرح پیش کرنے کا منصُوبہ بنایا گیا تھا۔

"شاعر" نے اب تک بے شمار خاص نمبر نکالے ہیں۔ ان میں 'افسانہ و ڈرامہ نمبر' کرشن چندر نمبر، غالب نمبر، اور گاندھی نمبر کو' زبردست خراجِ تحسین ملا۔ "شاعر" کا ہر خاص نمبر اپنے اندازِ پیشکش اور معیار کے اعتبار سے جُدا جُدا ہوتا ہے۔ خاص نمبروں کے لئے اچھے فن پارے حاصل کر کے اُنھیں محض چھاپ دینا ہی کافی نہیں ہوتا، اُن کی ترتیب و تزئین پر بھی بہت توجہ دینا ہوتی ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر خاص نمبر کے اندازِ پیش کش میں زیادہ سے زیادہ حُسن، جدّت اور نُدرت ہو۔ یہ خودستائی نہیں، محض اظہارِ حال ہے کہ "شاعر" کے "ناولٹ نمبر" کو بھی ایک مثالی نمونہ بنا کر پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اُمید کہ اِسے زیادہ سے زیادہ پسند کیا جائیگا۔ ہندو پاک کے دو تین ہی رسالوں نے اب تک "ناولٹ نمبر" شائع کئے ہیں۔ سابقہ شائع ہونے والے ناولٹ نمبروں اور "شاعر" کے زیرِ نظر ناولٹ نمبر میں جو بات مابہ الامتیاز ہے' اُسے اربابِ نظر اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔

○

سوچا تو یہی تھا کہ ناولٹ نمبر میں صرف مختصر ناول' شریک کیئے جائیں گے' لیکن چند مشاہیر اہلِ قلم نے اِس نمبر کے لیئے طویل (Full Length) ناول عنایت فرمائے اور اِن کا شریک نہ کرنا سخت ناسپاسی ہوتا۔ چنانچہ نمبر میں کئی مکمّل ناول شامل ہیں اور اِس "ناولٹ نمبر" کا وزن و وقار اور بھی بڑھ گیا ہے۔ ہم نے اُن تمام مشاہیر اہلِ قلم کو دعوت دی تھی جو ناولٹ نگاری میں ایک بلند مرتبہ و مقام رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر نے ہماری دعوت قبول فرما کر ہمیں اِتنا شاندار اور جاندار نمبر شائع کرنے کا حوصلہ بخشا۔ اِدارۂ "شاعر" پُورے خُلوص اور احترام کے ساتھ اُن تمام ناولٹ نگاروں کا شکریہ ادا کرتا ہے جو اِس نمبر میں شریک ہیں۔ اِسی کے ساتھ ہمیں اِس کمی کا بھی سخت احساس و افسوس ہے کہ راجندر سنگھ بیدی، قاضی عبدالستار، ہربنس دوست اور موہن یاور اس میں شریک نہیں ہیں۔ ہم نے اپنی طرف سے کوشش' اِصرار اور یاد دہانیوں کی اِنتہا کر دی، مگر یہ یہ قلم کار "ناولٹ نمبر" میں شریک ہونے کی خواہش کے باوجود بعض ذاتی و ناگزیر وجوہ کی بنا پر ناولٹ لکھنے سے معذور و مجبور رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض ناولٹوں کے لیئے ۱۵ر اپریل تک انتظار کیا گیا اور دانستہ "ناولٹ نمبر" کی تاخیر و تعویق کو برداشت کر لیا۔ پھر بھی مایُوسی کے سِوا کچھ نہ ملا۔ بہرحال زیادہ سے زیادہ تاخیر سے موصولہ ناولٹ بھی اِس میں شریک ہیں۔

"ناولٹ نمبر" میں شریک ناول اور ناولٹ موضوعی تنوّع اور دلچسپیوں سے بھرپُور ہیں۔ یہ لکھنے والوں کے اپنے اپنے فکر و فن اور اسلُوبِ نگارش کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں عوامی جذبات و احساسات کو مُتاثر و مُحرّک کرنے کا سامان ہے۔ بعض ناولٹوں میں بہت گہرے تجربات و مشاہدات ہیں اور بعض میں واقعات کی رَو قاری کو کھو جانے پر مجبُور کر دیتی ہے۔

"ناولٹ نمبر" کے تمام ممتاز قلم کاروں سے ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ وہ تقدیم و تاخیر کا خیال نہ فرمائیں۔ ناول اور ناولٹ ایک ساتھ تو آئے نہیں، کتابت و طباعت کا سِلسلہ رُک نہیں سکتا تھا۔ اِس کے باوجود ترتیب مُتوازن ہے۔ جب کئی ہم عصر ادیب اپنے درجات کے اعتبار سے بہت قریب قریب ہوں تو تقدیم و تاخیر کا مسئلہ عقدۂ لاینحل بن جاتا ہے۔

○

ناولٹ نمبر کی تزئین میں تین آرٹسٹوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ سرورق حیدر آباد کے مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد صاحب کے جدّت طراز مُوقلم کا

نتیجہ ہے۔ ناول اور ناولٹوں کے اندرونی سرورق اور ننگ آبا (مہاراشٹر) کے ممتاز آرٹسٹ جناب صادق اور غیاث قریشی صاحب کی فنی چابکدستی کے مظہر ہیں۔ اِن دونوں مصوّروں نے ناولٹوں کے مرکزی خیال کو جدید و قدیم انداز میں اُبھارنے کی امکانی کوشش کی ہے۔ ادارہ "شاعر" اِن تینوں مصوّروں کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اِن کی کاوشوں سے "ناولٹ نمبر" کے حسن و زیبائی میں چار چاند لگے۔

ہم اُن تمام مخلص دوستوں اور ہمدردوں کے بھی شکرگذار ہیں جنہوں نے کسی بھی حیثیت سے ناولٹ نمبر کے کاموں میں ہاتھ بٹایا، اشتہارات کے حصول میں مدد کی۔ ہر چند سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے اُتنے اشتہارات حاصل نہ ہو سکے، جتنے اِس ضخیم نمبر کے لئے ضروری تھے۔ بہرحال جو کچھ ہو گیا، اُسے بھی ہم قابلِ شکر سمجھتے ہیں۔ اگر ہزاروں قارئین نے "ناولٹ نمبر" کو پسند کر لیا تو ہم اسی کو سب سے بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

○

ناولٹ نمبر فروری اور مارچ دو ماہ کی اشاعت پر مشتمل ہے۔ اپریل ۷۱ء کا "شاعر" تیزی کے ساتھ تیار کرایا جا رہا ہے۔ اپریل اور مئی کے دونوں شمارے الگ الگ مگر کسی قدر تاخیر سے شائع ہوں گے۔ البتہ جون ۷۱ء کا شمارہ وقت پر نکلے گا۔

○

اُن دِنوں جب کہ "ناولٹ نمبر" تیزی کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا اور محترم اعجاز صدیقی (مدیر شاعر) کی بھرپور توجہات کی ضرورت تھی، وہ یکایک سخت علیل ہو گئے۔ اُن کی علالت کا سلسلہ تو کئی سال سے چلا آ رہا ہے، لیکن اُن دائمی امراض سے ہٹ کر اِس بار، ۳ر اپریل کی شب میں اُنہیں دماغی دَورہ پڑا۔ دو دِن بعد ۵ر اپریل کو دِل کے دَرد کا شدید دَورہ پڑا۔ پھر وقفوں وقفوں سے دَوروں کا سِلسلہ جاری رہا۔ دس بارہ دِن تک تو اُن سے کوئی مشورہ بھی نہ لیا جا سکا۔

الحمدُللہ کہ دِل کی جھلّی کا وَرم اب کم ہے اور دَرد میں بھی کچھ کمی ہے۔

تمام اُردو دوستوں سے اُن محترم کے لیئے دُعائے صحت و سلامتی کی درخواست ہے۔

۲۰ر اپریل ۷۱ء

اُردو ناول — عظمت کی تلاش میں

ڈاکٹر محمد حسن

پچھلے بیس پچیس برس میں اُردو میں ناولوں کا جو سرمایہ فراہم ہوا ہے وہ گنے چنے ناولوں پر مشتمل ہے۔ قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا"۔ حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول"۔ بیدی کا "ایک چادر میلی سی"۔ قاضی عبدالستار کا "داراشکوہ"۔ "شب گزیدہ" اور غازی "صلاح الدین"۔ آمنہ ابوالحسن کا "سُرخ و سیاہ"۔ کرشن چندر کے چند ناول جن میں "گدھے کی سرگزشت" بھی ہے اور "دادر پل کے بچے" بھی۔ "ایک عورت ہزار دیوانے" بھی۔ احمد عباس کے چند ناول۔ اور عصمت چغتائی کا "دِل کی دنیا"۔ اور انور عظیم کی "پرچھائیوں کی وادی میں"۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ کچھ نام چھوٹ گئے ہوں گے اہم نام کم اور غیر اہم نام بہت سے۔ مگر کیا واقعی اِس سرمائے کو اُردو جیسی ترقی پذیر زبان کے لئے قابلِ فخر سرمایہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ مانا کہ ہر زبان میں اعلیٰ ناولوں کا سرمایہ محدود ہوا کرتا ہے، اور ٹالسٹائی اور دستافسکی جیسے ناول نگار روز روز پیدا نہیں ہوتے، مگر اُردو و ہندوستان میں جن کلاسیکی مراحل سے دوچار ہے ان سے یہ توقع بے جا نہ تھی کہ ہماری زبان اِس دَور کی چیرہ دستیوں اور آرزو مندیوں کا رزمیہ لکھ سکتی۔ اپنی حرماں نصیبی تسلیم، لیکن اُردو میں ادب دوسری زبانوں کے مقابلے میں بازاری اور تجارتی بہت کم ہو پایا ہے۔

یہاں نہ ایسے رسالے جو اعلیٰ معاوضے دے کر تصانیف خریدتے ہوں، نہ ایسے پبلشر جو تخلیقات کو سونے میں تول سکیں، نہ ایسا بازار جہاں ہنر کے یوسف کو بکنے کا ارمان ہو، یہاں تو جو لکھتا ہے بڑی حد تک جذبے سے مجبور ہو کر ہی لکھتا ہے اور بہت ہاتھ آیا تو نے مے کے تھوڑی سی شہرت اور تھوڑی سی رسوائی جسے اَونے پَونے کیش کرلیا جاتا ہے۔ پھر جو کڑی اُردو کا ادیب براہِ راست جھیل رہا ہے، اُس کی داستانیں ہی دوسروں نے سُنی ہیں۔ تہذیبی جینو سائڈ سے گزرتے ہوئے اگر وہ اپنے دَور کی مہابھارت لکھ جائے تو کچھ ایسے تعجب کی بات نہیں۔!

مگر یہ حادثہ ابھی پیش نہیں آیا۔ ایسا کیوں ہوا، اُس کا جواز کچھ بھی کیوں نہ ہو، لیکن اس کا تعلق براہِ راست اُردو ناول کے نہ پنپنے کے اسباب سے ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی تک ناول کا ایسا کچھ تصوّر اُردو دُنیا کے سامنے رہا ہے جیسے ناول محض ماحول کی عکاسی کا نام ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی روز نامے کے بیس پچیس سال کے فائل سب سے اچھے ناول قرار پاتے۔ کیوں کہ اِن سے اچھی عکاسی اور کون کرے گا۔ ناول کو اکثر صنعتی دَور کا رزمیہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس نے اُس دَور میں آنکھ کھولی جب مشین نے تخصیص کی جگہ تعمیم کا چلن عام کردیا تھا۔ دستکار کی محنتِ شاقہ اور منفرد کمال کے گل بُوٹوں کی جگہ مشین کی تیز رفتاری اور یکسانیت نے ایک ہی قسم کا سامان (جو پہلے شاید چند اشراف کے حصّے میں آتا تھا) جمہور کی منڈی میں لا ڈالا اور اُسے سب کی دسترس میں پھینک دیا۔ بشرطیکہ خریدنے والے کی جیب میں پیسے ہوں۔

ہمارے سماج کا محور بھی طبقۂ اشراف کے قصوں سے آگے بڑھ کر جمہور کے طرزِ زندگی تک جا پہنچا۔ مگر جنہیں "جمہور" کہا جاتا تھا اُن کا طرزِ زندگی اپنے اسلاف سے کہیں زیادہ پیچیدہ، تہ دار اور مرموز ہوگیا اب نہ ایسے خوفناک اور بدباطن "ولین" ہیں جو ہیرو کو منزلِ مُراد پر پہنچنے سے روکتے ہوں اور نہ ایسے

نونخوار لشکر ہیں جو راہ میں حائل ہوں۔ اگر بن پڑتا ہے تو وہ اندرون ہیں اور اگر وہ منزلِ مُراد کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی زنجیر بنتا ہے تو ان دیکھے تصوّرات اور غیر محسوس قدروں کی پرچھائیاں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ انسانی زندگی پر قابو رکھنے والا پورا نظام جبر زمیں دوز ہو گیا۔ اور خود شخصیت کے اندر سے کارفرما ہونے لگا۔

یہ پیچیدگی، تہہ داری اور رمزیت صنعتی دَور کا مقدّر ہے۔ اور یہ تینوں خصوصیات ہمارے دَور کے افسانوی ادب میں کم سے کم اعلیٰ افسانوی ادب میں ظہور پذیر ہونا کسی حد تک لازمی ہیں۔ یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ عصری ناول کی پہچان ہونے کے باوجود یہ عناصر ناول کی بُنیادی تعریف میں شامل نہیں ہیں۔ جس طرح ناول محض عصری عکاسی سے عبارت نہیں ہو سکتا اسی طرح وہ محض پیچیدگی، تہہ داری اور رمزیت کا مجموعہ بھی نہیں ہوتا۔

پھر ناول کا بنیادی عنصر کیا ہے؟ ناول پیچیدہ تر اعلیٰ وژن کا اظہار ہے۔ اور یہ اظہار افسانوی طرز پر کرداروں کی باہمی کش مکش کے ذریعے ہوتا ہے۔ ناول اسی لئے واقعات کا محتاج نہیں وہ واقعات کو استعمال کرتا ہے، وہ اسی لحاظ سے کرداروں کا محتاج نہیں، کیونکہ وہ کرداروں کو برتتا ہے، اور اپنے طور پر انہیں نئی معنویت بخش دیتا ہے۔ لیکن اعلیٰ تر وژن کے بغیر ناول نگار یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔

یہ وژن کیا ہے اور عصری حسیت اور سماجی عکّاسی سے اُس کا کیا رشتہ ہے؟۔ یہ سوال ہمارے دَور کے فن کاروں کو طرح طرح سے پریشان کرتا رہا ہے۔ وژن سے مُراد انسانی زندگی کے بارے میں کوئی ایسا ذہنی اور جذباتی رویّہ ہے جو قاری کے فکر و احساس کو نیا رُخ دے سکے۔ اور ناول پڑھنے کے بعد وہ زندگی کو ایک نئے زاویئے سے دیکھنے لگے۔ اِس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ کوئی مخصوص ناول یا سب ناول کسی ایک مخصوص موضوع پر (بالخصوص کسی ایک سیاسی موضوع پر) یا کسی خاص نظریئے کے ماتحت ہی لکھے جائیں۔ لیکن اِس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ ناول نگار کا بنیادی رشتہ محض واقعات یا کسی دَور کی سماجی عکّاسی سے اتنا نہیں ہے جتنا اِن سب کو معنویت بخشنے والے حیات و کائنات کے ایک نئے وژن سے ہے۔ یہ وژن صرف بڑے مسائل تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی جلوہ گری معمولی سے معمولی واقعے میں بھی ملتی ہے۔ لیکن اِس وژن تک پہنچنے کے لئے کائنات کے زیادہ گہرے عرفان اور اس کے مظاہر پر زیادہ گہری غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اور عام طور سے ہمارے ناولوں میں وژن کی یہ متاع بہت کم ہے جس کی بناء پر وہ واقعات کی کھتونی، رنگینیٔ بیان کے گلدستے اور سماجی عکّاسی کے نمونے تو بن جاتے ہیں ناول نہیں بن پاتے۔

اگر مُروّت، محبت، روایت اور احترام کے خلاف تہیہ کر کے ناول کے اِس سرمائے پر غور کیا جائے تو یہ کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا کہ ابھی تک اُردو میں ناول لکھنے کی مشقیں تو بہت سی ہیں ناول نہیں ہیں۔ اِس مختصر مقالے میں اِس اجمال کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ نہ یہاں اِتنی گنجائش ہے کہ اُن تمام ناولوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور جن میں اُن کی بعض خوبیوں کے باوجود وژن کی تہہ داری، پیچیدگی، رمزیت سبھی کی کمی بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی اتنی بات شاید بہت سے پڑھنے والوں کے لئے قابلِ قبول ہو گی کہ ان ناولوں کو پڑھ کر اِس گمبھیرتا کا احساس نہیں ہوتا جو اعلیٰ ناول کی نشانی ہے۔ یہاں اقدار کی کشمکش اور اُن کو بنانے بگاڑنے والی بصیرت کے تانے بانے اُلجھتے سُلجھتے نظر نہیں آتے۔ جس طرح دستافسکی۔ ٹالسٹائی سے لے کر سارتر تک کے ناولوں میں سے کسی ایک کو پڑھنے کے بعد ہمیں زندگی کی ایک نئی معنویت حاصل ہوتی ہے اور اس کے اقدار و جہات کے بننے بگڑنے کا تماشا دکھائی دینے لگتا ہے۔ وہ کیفیت اُردو کے کسی ناول میں موجود نہیں ہے۔ بھونڈے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ہمارے ناول ابھی تک فکری جَسم سے تقریباً محروم ہیں اور یہی فکری جسم وژن کی اصل ہے، اور ناول کا بنیادی عنصر!

ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ناولوں میں فکر اور زمانے کی کشمکش جاری ہے۔ اور ابھی تک زمانہ فکر پر غالب رہا ہے، بلکہ یُوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زمان و مکان فکر پر غالب رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ فکر اور زمان و مکاں دونوں میں کوئی تضاد ہو۔ کیونکہ فکر مجرد طریقے پر ناول تو کیا کسی صنف میں بھی اپنے کو ظاہر نہیں کر سکتی۔ یہاں بحث صرف یہ ہے کہ زمان و مکان کی عکّاسی کو فکر اور وژن پر غلبہ حاصل نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ

زمان ومکان کی عکّاسی کو اس اعلیٰ تر وژن کا وسیلۂ اظہار بننا چاہیئے۔ اس کشمکش کا سب سے واضح اظہار تین ناولوں میں ہوا ہے۔ "آگ کا دریا"۔ "لہو کے پھول"۔ اور "شب گزیدہ"۔ یوں تو پہلے دو ناول ایک طریقے پر دستاویزی ناول ہیں اور ہندوستان کی تاریخ کے مختلف اَدوار کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں، مگر ان دونوں میں وقت سے اُوپر اُٹھ کر یا واقعات کی عکّاسی میں بصیرت اور وژن بھرنے کی سعی ناکام ہوئی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے اندازِ بیان سے سہارا لے کر وقت کو ایک مرکزی وژن کی شکل میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کے کردار اتنے اُبھرے ہیں اور اندرون سے ایسے محروم ہیں کہ ان کی شخصیت میں کوئی گمبھیرتا اور ہمہ جہتی پیدا ہی نہیں ہو سکی ہے اور اسی کے ساتھ وہ آخری حصّے میں اپنے پُرانے موضوع "یادِ ماضی" میں اُلجھ کر تقسیم ہندوستان کے دَوران قدیم جاگیردارانہ تہذیب کی (جسے اُنھوں نے ہنوز مثالی بنا کر پیش کیا ہے) بربادی کا بیان کرنے لگیں، اور اُس مجموعی وژن سے دُور ہوتی گئیں جس کا اشارہ ایلیٹ کے اشعار کی مدد سے اُنھوں نے اِبتداء میں کیا ہے۔ اُن کے کردار عنفوانِ شباب کی دلچسپیوں سے آگے نہیں بڑھتے، اور ان دلچسپیوں میں کسی قسم کی گہری معنویت یا اقدار کی کشمکش کا انداز پیدا نہیں کر پاتے۔ اور ناول اپنی وسیع عقبی زمین کے باوجود فکری گہرائی اور ضخامت اختیار نہیں کر پاتا۔

"لہو کے پھول" میں یہ فکری جہت اور بھی معمولی ہے کیونکہ بیان پر ناول نگار نے زیادہ زور صرف کرایا ہے اُن واقعات اور کرداروں کے پیچھے جو معنویت ہے اُن کا احساس قاری کو نہیں ہوتا۔ ان کے سبھی کردار اُبھرے ہیں اور بڑی حد تک باطنی کشمکش سے پاک۔۔ ایسے قیامت خیز موقعوں پر بھی یہ کشمکش اقدار کی آویزش کی شکل اختیار نہیں کر پاتے۔ حیات اللہ انصاری کی بنیادی وفاداری واقعات اور کرداروں کے ڈھانچے سے ہے۔ وہ اس کے پیچھے فلسفیانہ جہات تک پہنچنے کی سعی بھی نہیں کرتے۔ اس قتل و خون کے ڈرامے کے پیچھے کیا انسانی مقدرات کے چند مسائل بھی پوشیدہ تھے، یہ سوال اُن کے سامنے سرے سے آتا ہی نہیں ہے۔

شب گزیدہ کا موضوع اِن دونوں سے مختلف ہے۔ مگر یہاں زمانے کے بجائے ماحول کا بھڑکیلا پن وژن پر غالب آیا ہے۔ جاگیرداری خود نظر کو خیرہ کرنے والے عناصر سے بھرپور ہے اور پھر وہ بھی ہندوستان کی جاگیرداری۔ اس بھڑکیلے پن کا استعمال ناول نگار کے لئے ممنوع نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان عناصر سے زندگی کی کوئی نئی بصیرت اُبھرتی ہے یا نہیں جو پڑھنے والے کو زندگی کے بنیادی مُسلّمات پر دوبارہ سوالیہ نشان لگانے پر آمادہ کرتی ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدرتِ بیان کے اعتبار سے قاضی عبدالستّار ہمارے تقریباً سبھی ناول نگاروں میں سب سے زیادہ سحر نگار ہیں اور قصّہ سُنانے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ جادو ایسا ہے جو جادوگر کو بھی مسحور کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ ناول میں بنیادی ٹکراؤ کسی ایسی ہل چل کو جنم نہیں دیتا، جو اُسے شخصیات کے آئینہ خانہ یا جاگیرداری کے بھڑکیلے طلسم سے اُوپر اُٹھا سکے۔

اُردو ناول ابھی اپنی انفرادیت کی تلاش میں ہے۔ گو اس راہ میں کئی اہم سنگ میل سامنے آئے ہیں۔ لیکن ہنوز منزل بہت دُور ہے اور اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اردو ناول اعلیٰ تر معیار کو نظر میں رکھے اور اعلیٰ ترین حقیقتوں کی دریافت کرے۔ عظمت اب اُردو ناول کے لئے محض خواب نہیں چیلنج ہے۔

کرشن چندر
پیار ایک خوشبو

کرشن چندر

کرشن چندر ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ اِبتدائی تعلیم کشمیر میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم لاہور میں۔ ایف سی کالج لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کیا۔ بعد اَزاں گورنمنٹ لاکالج لاہور سے ایل ایل بی کی ڈِگری حاصل کی مگر وِکالت کبھی نہ کی۔ دِل شروع ہی سے ادبیات کی طرف مائل تھا۔

ایل ایل بی کی ڈِگری حاصل کرنے کے فوراً بعد آل اِنڈیا ریڈیو سے مُنسلک ہو گئے۔ تین سال کی ریڈیو سروس میں لاہور سے دہلی اور دہلی سے لکھنؤ گھوم آئے۔ اُن ہی دِنوں اُنھیں یک بابی ڈرامے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ افسانہ نگاری وہ ۱۹۳۷ء سے شروع کر چکے تھے۔

تین سال کی ریڈیو سروس کے بعد اُنہیں حضرت جوشؔ ملیح آبادی، اور ساغر نظامی کے ساتھ شالیمار فلمز پُونا میں مُلازمت مِل گئی۔ اِس کے دو سال بعد بمبئی ٹاکیز سے متعلق ہو گئے، جب سے کرشن چندر بمبئی ہی میں مُقیم ہیں۔ ادبیات اور فلم ان ہی دو شعبوں میں اُن کی زندگی مُنقسم ہے۔ وہ مختلف بیرونی ممالک کا دَورہ بھی کر چکے ہیں۔ اور اُن کا شمار بین الاقوامی ادیبوں میں ہوتا ہے۔

اُنھوں نے بکثرت افسانے، ناول، ڈرامے، اِنشائیے اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ اُن کی تصانیف کا ترجمہ دُنیا کی ۶۵ بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جن میں یُورپی ایشیائی اور ہندوستانی زبانیں بھی شامل ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد اسّی سے زیادہ ہے۔

۱۹۶۹ء میں حکومتِ ہند نے اُنھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا۔ اُس سے پہلے اُنھیں سُوویت لینڈ نہرو ایوارڈ مِل چکا ہے۔ حکومتِ کشمیر نے اُن کی ادبی خدمات کے سِلسلے میں اُنھیں پانچ ہزار روپے کا اِنعام پیش کیا۔ حال ہی میں اُن کی پچپنویں سالگرہ منائی گئی۔ جس کی صدارت بمبئی میں شریمتی اندرا گاندھی اور دِلّی میں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حُسین نے کی۔

(بقلم دیگر)

تعارف

کشمیر کی گھاٹیوں میں بکروالوں کے کئی طرح کے قبیلے پائے جاتے ہیں۔
پہلے میں لفظ بکروال کی تشریح کر دوں۔ بکروال کا مطلب ہے، بکری والے۔ لیکن یہ قبیلے صرف بکریاں ہی نہیں پالتے بھیڑیں، بکریاں، گائیں، بھینسیں، گھوڑے، خچر وغیرہ بھی پالتے ہیں۔ اور ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ میں جاتے رہتے ہیں۔
ان میں سے بہت سے قبیلے ایسے ہیں، جنھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے، لیکن بھدرواہ کشتواڑ میں بہت سے ایسے قبیلے ہیں جو ہندو ہیں یا بُدھ مذہب کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور طرح کے بکروال بھی ہوتے ہیں، جن کا مذہب چترال سے پرے کافرستان کے رہنے والے لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ ان لوگوں کے دیوی دیوتا دوسرے قبیلوں سے نرالے ہیں۔ زمین اور آسمان، موت اور زندگی، رُوح اور بدرُوح کے متعلق ان کے اپنے اعتقادات ہیں جو پُرانے بابلیوں، سُمیریوں اور کہیں کہیں پر عبرانیوں کی پُرانی مقدّس کتاب ژند سے لگّا کھاتے ہیں۔
جب مَیں نے آنسکی کا مشہور ڈرامہ پڑھا جو رُوحوں کے متعلق اسی قِسم کے اعتقادات پر مشتمل ہے۔ تو مجھے فوراً بکروالوں کے اس تیسرے قبیلے کا خیال آیا، اور مجھے اس ڈرامے کے ماحول کو بدل کر اسے ہندوستانی رنگ دے کر، ایک ناول کے رُوپ میں ڈھال دینے کا بھی خیال آیا۔ ویسے رُوحوں، بدرُوحوں، جنّات اور عامل لوگوں کی کرامات کے متعلق اعتقادات بکروالوں کے ان تینوں قبیلوں میں پائے جاتے ہیں اور ایک حد تک ہندوستان اور اس سے مُلحق ممالک کے دیہی علاقوں میں یہ خیالات عام طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جھاڑ پھونک، ٹونے، منتر، تنتر، بدرُوحوں کو نکالنا، کسی مقصد کے تحت زندہ جانور یا زندہ انسان کی قربانی تک دے دینا۔ یہ اور ایسے بہت سے اعتقادات دُور دُور تک انسانی فہم اور ذہن میں پھیلے ہوئے ہیں۔
ہندوستانی اسٹیج ابھی بے حد بچکانہ حالت میں ہے۔ ورنہ مَیں اس ڈرامے کو جُوں کا تُوں پیش کرتا۔ لیکن اب مَیں نے آنسکی کے مرکزی خیالات اور کرداروں کو لے کر بکروالوں کے کوہستانی ماحول میں یہ ناول لکھا ہے۔ اس سے پہلے مَیں اسی طریقے سے ایک اور یوروپی ڈرامے کو "کارنیوال" کے نام سے ایک ناول کی صورت دے چکا ہوں، جسے قارئین نے بےحد پسند کیا ہے۔ اگر زندگی نے مُہلت دی تو مَیں یوروپی ڈرامہ نگاری کے خزانے میں سے چند اور شاہکار اسی طرح پیش کرنے کی جُرأت کروں گا۔
ذاتی طور پر مجھے اس کا پلاٹ اور ماحول بے حد پسند ہے۔ جو دراصل توہمات میں گھری ہوئی دو معصوم رُوحوں کے جذبۂ صادق کی کہانی ہے۔

کرشن چندر

پیار ایک خوشبو

کرشن چندر

پہلا باب

گل مرگ کے جنوب مغرب کے پہاڑی سلسلوں میں گرجن ڈھوک سب سے خوبصورت اور سب سے اونچی ہے (ڈھوک چراگاہ کو کہتے ہیں) یہ ڈھوک گیارہ ہزار فٹ سے تیرہ ہزار فٹ کی اونچائی پر ایک سطح مرتفع کی صورت میں پھیلی ہوئی ہے یہاں پر پانچ چھوٹی چھوٹی جھیلیں پائی جاتی ہیں۔ جو موسم سرما میں نیم بستہ رہتی ہیں۔ لیکن موسم گرما میں ان جھیلوں کے اردگرد رنگا رنگ پھولوں کے تختے کھل جاتے ہیں اور میلوں تک پھیلی ہوئی سبز دوب میں سینکڑوں مویشی چرتے ہیں۔

گرجن ڈھوک سے نیچے کے پہاڑی علاقے میں بچھن ڈھوک ہے۔ جو آٹھ ہزار سے گیارہ ہزار فٹ کی اونچائی پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ڈھوک موسم بہار میں چراگاہ کا کام دیتی ہے۔ جب تک گرجن ڈھوک کی برف نہیں پگھلتی ہے۔ مویشی اور بکروال اسی چراگاہ کو کام میں لاتے ہیں۔ موسم بہار کے ختم ہوتے ہی وہ اوپر گرجن ڈھوک میں چلے جاتے ہیں اور موسم گرما کے ختم ہوتے ہی پھر واپس بچھن ڈھوک میں آجاتے ہیں۔

بچھن ڈھوک سے نیچے اچھن ڈھوک ہے جو پانچ ہزار سے آٹھ ہزار فٹ کی اونچائی کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کہیں کہیں پر گاؤں ہیں۔ کہیں کہیں پر کاشت بھی ہوتی ہے کہیں کہیں پر گھنے جنگلات جو چیڑھ، دیودار، تنگ بیاڑ، بلوط اور شاہ بلوط پر مشتمل اچھن ڈھوک سے شروع ہو کر بچھن ڈھوک کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے گرجن ڈھوک تک جاتے ہیں۔ لیکن گرجن ڈھوک کی اونچائیوں پر کوئی درخت نہیں پایا جاتا یہاں صرف چراگاہیں، جھیلیں، اور پھولوں کے تختے ہیں، یا سال میں آٹھ مہینے کی شدید برفباری ہے۔

البتہ جہاں پر بچھن ڈھوک ختم ہوتی ہے اور گرجن ڈھوک شروع ہوتی ہے۔ وہاں پر شاہ بلوط کا ایک بہت بڑا اور پرانا پیڑ ہے۔ شاید صدیوں پرانا پیڑ ہے۔ اس کے نیچے جمدیال قبیلے کے بکروالوں کا پرانا معبد ہے۔ پیڑ کے پرانے تنے پر داکو دیوتا کی شبیہ کھدی ہوئی ہے جو بار بار شنگرف ملنے سے ارغوانی رنگ کی ہو چلی ہے۔ دیکھنے میں یہ ایک بھیانک سی شبیہ ہے۔ مگر جمدیال قبیلے کے نزدیک یہ شبیہ مقدس ترین ہے۔

اس پیڑ کی بھی ایک کہانی ہے۔ صدیوں پہلے جب جمدیال قبیلہ کافرستان سے نکل کر یہاں پہنچا اور نیچے اچھن ڈھوک میں پناہ گزین ہوا تو اس مقام پر کوئی درخت نہ تھا سولہ برس کی ایک لڑکی تورا جس کا نام تھا، موسم خزاں میں بچھن ڈھوک میں ریوڑ ھ چراتے چراتے جب اس مقام پر پہنچی تو اسے گرجن ڈھوک کے ایک برفانی طوفان نے آگھیرا۔ تیز و تند ہوائیں، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک اس غریب لڑکی کا دل دہلائے دیتی تھی۔ کبھی اولوں سے اپنے آپ کو بچاتی، کبھی ریوڑ سنبھالتی، نیچے جانے کی کوشش کرتی کہ اتنے میں شام ہوگئی اور چاروں طرف تاریک دھند چھاگئی۔ اتنی گہری دھند کہ چند گز کے فاصلے پر کچھ دکھائی نہ دیتا۔

پھر ایکدم سناٹا ہوگیا اور برف باری شروع ہوگئی۔

گھبرائی ہوئی تورا نے داکو سے دعا کی کہ وہ اسے اور اس کے ریوڑ کو تباہی سے بچالے۔ ورنہ اب اس کی اور اس کے ریوڑ کے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ کیونکہ شدید ژالہ باری کے بعد برفباری اسقدر شدید ہوچکی تھی کہ چاروں طرف برف کے گالوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

یکایک چلتے چلتے ٹھوکریں کھاتے، جھکتے پھسلتے ایک چٹان سے گر کر زخمی ہو کر نیچے جو تورا گری تو اسے ایسا لگا، جیسے وہ سینکڑوں فٹ ہوا میں معلق رہنے کے بعد ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے، جہاں ایک تناور پیڑ کا گھنا چھتنار ہے اور گہری دھند چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔ مگر اس پیڑ کے نیچے کوئی برف نہیں ہے، سوکھی دوب ہے اور گہری دھند

میں چھتارے کے نیچے ایک چھوٹی سی جگہ پر ایک عجیب سا نور نمایاں ہے، جیسے دُور تاریکی میں دیا جھلملاتا ہو۔ اور دھند سے یہ نور ایک ہالے کی صورت میں پھیلا ہوا تھا۔ تورا اس روشنی کو دیکھ کر ڈر سی بھی گئی۔ پھر سوکھی سوکھی دوب کو دیکھ کر اسے عجیب سا اطمینان بھی ہوا۔ اس نے ہولے ہولے کوشش کر کے اپنے سارے ریوڑ کو یہاں جمع کیا اور سارے ریوڑ کو سُلا کے وہ خود بھی دو گھنی اون والی بھیڑوں کے درمیان سو گئی۔ ایسے جیسے کسی لحاف میں سوئی ہو۔

صبحدم جو اٹھی تو تورا نے دیکھا کہ دھند چھٹ چکی ہے۔ گرجن کی جھیلوں اور چراگاہوں پر دور دُور تک برف چھا چکی ہے۔ لیکن جہاں پر وہ اپنے ریوڑ کے ساتھ رات کو سوئی تھی، وہاں پر راتوں رات شاہ بلوط کا ایک پیڑ اُگ آیا ہے اور یہ پیڑ اس سے پہلے یہاں موجود نہ تھا اور کسی نے اس کو یہاں دیکھا نہ تھا۔

اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ شاہ بلوط کے تنے پر زمین سے کوئی تین گز اوپر ایک عجیب وغریب شبیہہ بنی ہوئی تھی، جیسے شاہ بلوط کا تنا بیچ میں سے ذرا پھٹ جائے اور اندر سے لکڑی کی ایک کھدی ہوئی شبیہہ نکل آئے۔

ڈرتے ڈرتے تورا اس شبیہہ کے پاس گئی اور جب قریب پہنچی تو اس نے فوراً پہچان لیا۔ یہ شبیہہ راکو کی تھی۔ راکو جس نے اس دنیا کو بنایا تھا جو اس دنیا کا سب سے بڑا دیوتا ہے، جس کی پوجا جمدیال قبیلے کا ہر فرد کرتا ہے، اسی لکڑی کی شبیہہ کو اس کے قبیلے والے کافرستان سے لیکر آئے تھے۔

اس راکو نے تورا اور اس کے ریوڑ کی جان بچائی تھی۔

شبیہہ کو پہچان کر تورا اُسی وقت گھٹنوں کے بل گر گئی اور اس نے اپنا ماتھا راکو دیوتا کی تعظیم کی خاطر دھرتی پر ٹیک دیا۔

اسی حالت میں قبیلے والوں کو تلاش کرتے کرتے تورا اپنے ریوڑ سمیت اس پیڑ کے گھنیرے چھتارے کے نیچے مقدس راکو کی شبیہہ کے نیچے بیہوش ملی۔

وہ اسے اٹھا کر نیچے لے گئے۔ اچھن ڈھوک میں جہاں ان کا گاؤں تھا اور گاؤں میں بڑے چھوٹے خیمے تھے، صرف لکڑی کا ایک ہی گھر تھا اور وہ قبیلے کے سردار کا تھا۔

ہوش میں آنے پر سولہ برس کی کنواری تورا نے اپنی داستان سُنائی۔ اس دن سے اُس نے ریوڑ چرانا چھوڑ دیا اور اس شبیہہ کی پوجا کرنے لگی۔ وہ شاہ بلوط والے راکو دیوتا کی پہلی راہبہ تھی۔

ہولے ہولے، دھیرے دھیرے اس کی داستان قرب وجوار میں پھیلتی گئی اور دُور دُور سے جمدیال قبیلے کے لوگ آکر شاہ بلوط کے راکو کی عبادت کرنے لگے۔ یہاں لکڑی کی ایک خوبصورت عبادتگاہ بنادی گئی اور راکو کی شبیہہ کو مخمل کے پردے سے ڈھانک دیا گیا جس پر طلائی کام کے بڑے بڑے بارہ سنگھے کھدے ہوئے تھے۔ چند لمحوں کے لیئے زائرین کو شبیہہ مبارک دکھائی جاتی تھی اور اسے پھر مخمل کے پردے سے ڈھک دیا جاتا تھا۔ شبیہہ مبارک کے نیچے ایک چوبی چبوترہ بنایا گیا تھا، جس پر ہاتھ سے لکھی ہوئی بارہ سنگھے کی کھال پر کھدی ہوئی تیرہ پرانی جلدیں تھیں، جنھیں اس قبیلے کے لوگ کافرستان سے لیکر آئے تھے۔ یہاں پر عنبریں شمعیں جلتی تھیں اور گھی اور تیل کے چراغ۔ یہیں پر زائرین چڑھاوا چڑھاتے تھے اور منتیں مانتے تھے اور چھتارے کے نیچے دبی دبی خشک گھاس کی تیلیاں تبرک سمجھ کر دُور دراز کے گاؤں اور چراگاہوں میں اپنے ساتھ لیجاتے تھے۔

دھیرے دھیرے اس درخت کے نیچے راہبوں کے رہنے کے لیئے ایک چوبی عمارت بنادی گئی تھی، کیونکہ یہ شاہ بلوط کا پیڑ صدیوں پرانا معلوم ہوتا تھا اور اب تو وہ عمارت بھی اسقدر پرانی معلوم ہوتی تھی کہ اس نے بھی شاہ بلوط کے سیاہ تنے کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔

اس عمارت میں پوجا کا سامان رہتا تھا اور راکو کا چڑھاوا، اور یہیں پر قبیلے کے راہب ان پارچہ جات کا مطالعہ کرتے تھے جو قبیلے کے اوّلیں لوگ اپنے ساتھ کافرستان سے لائے تھے۔

شاہ بلوط کے اس پیڑ کے تقدس کی شہرت اتنی دُور دُور پھیلی کہ قبیلے کے لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی منتیں مانگنے کیلیئے آنے لگے۔ اس پیڑ کے نیچے کبھی کبھی سادھو، سَنت، پیر و فقیر اور صوفی لوگ بھی دیکھے جانے لگے۔ وہ لوگ یہاں کئی کئی دن اور کئی کئی رات رہتے اور دُنیا کے خالق کی بلندیوں تک پہنچنے کے لیئے اپنے روحانی تجربے اور مدارج بیان کرتے۔ کبھی کوئی مجذوب آجاتا اور مہینوں اس پیڑ کے نیچے قیام کرتا۔ اور قبیلے کے راہب اس سے کوئی تعرض نہ کرتے کیونکہ انکی نگاہ میں راکو اس دُنیا کا سب سے

ٹرا دیتا ہے اسلیئے سب مذاہب کے لوگ اسکے پیڑ کے نیچے پناہ لے سکتے تھے
پھر اس پیڑ کے تنے کے نیچے ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا، اور یہ واقعہ
بھی صدیوں پُرانا ہے اور اسی نازک اندام خوبصورت دوشیزہ سے تعلق رکھتا ہے
جس کا نام تورا تھا اور جو اس مقدس پیڑ کی پہلی راہبہ تھی۔

سات سال تک تورا اس پیڑ کے تنے کے نیچے رہی اور سات سال تک دن اور رات اس نے مقدس راکو کی عبادت کی۔ کہتے ہیں وہ ہر روز صبح اور رات کو سونے سے پہلے راکو کی شبیہ کے نیچے پیڑ کے تنے کے نیچے کی دھرتی جہاں سے یہ پیڑ اُگا تھا اپنے سنہری بالوں سے جھاڑو لگا کر صاف کرتی تھی اور دونوں وقت یہ اس کا کام تھا اور مقدس فریضہ تھا جسے وہ ایک مقدس گیت گا کر سر انجام دیتی تھی۔

ایک شام جب وہ سونے سے پیشتر اُسی طرح اپنے بالوں سے جھاڑو دے رہی تھی اور اپنے لانبے لانبے سنہری بالوں کے لچھوں سے زمین صاف کر رہی تھی کہ یکایک وہ رُک گئی۔ اس کے سامنے دو پاؤں کھڑے تھے۔

تورا نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور آہستہ آہستہ اس کی نگاہیں پاؤں سے اُٹھ کر اُس پیکرِ انسانی کے سر تک پہنچیں، جو اس کے سامنے کھڑا تھا اور ایسا خوبصورت نوجوان اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ بارہ سنگھے والی مغرور وحشی مگر خوبصورت آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا اور دیکھتا چلا گیا۔

اور دھیرے دھیرے یُوں ہوا کہ تورا سب کچھ بھُول کر اپنے سُنہری بالوں سے اس کے پاؤں کی گرد صاف کرنے لگی۔
اجنبی نے ایک قدم پیچھے کو ہٹا لیا تو، تورا نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے بالوں کی لٹ آگے اس کے پاؤں کی طرف بڑھا دی۔
اجنبی نے دوسرا قدم پیچھے کو ہٹا لیا تو اُس نے اپنے بالوں کی لٹ اور آگے بڑھا دی۔ کیونکہ تورا کے بال بہت لانبے تھے، اور سُنا ہے اس کے ٹخنوں تک آتے تھے۔

تیسرا قدم پیچھے ہٹا کے اجنبی نے عجیب نگاہوں سے تورا کی طرف دیکھا اور تورا کو ایسے لگا، جیسے چاروں طرف دُھند پھیلتی جا رہی ہے اور روشنی کا ایک ہالہ سا ہے، جو اس دُھند میں اس اجنبی کے پیکر کے چاروں طرف کھنچا ہوا ہے۔ وہ ان وحشی آنکھوں کے راستے پر اس کے پیچھے پیچھے چلتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ دونوں نیچے اچھن ڈھوک کے گاؤں میں پہنچ گئے۔

مگر تورا اور اجنبی اچھن ڈھوک سے نیچے جا نہ سکے۔ قبیلے کے سردار نے ان دونوں کو قتل کرا دیا۔ اس کے چوبی گھر کے سامنے ہی ان دونوں کی قبر ہے۔ جہاں راکو کی پہلی راہبہ اور وہ اجنبی دفن کیئے گئے تھے۔ اس قبر کی آج بھی پُوجا ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ دو پیار کرنے والوں کی قبر ہے۔ مگر تورا کا گناہ یہ تھا کہ اس نے راکو کی راہبہ ہو کر ایک آدمی سے محبت کرنا چاہی تھی۔
اُس دن سے یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ راکو دیوتا کی شبیہ مبارک کی پُوجا کے لیئے کوئی عورت راہبہ نہیں بن سکے گی۔

یہ اور اس طرح کے سینکڑوں قصّے، کہانیاں، معجزے، محیّر العقول واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو سینکڑوں سال سے اس پیڑ کے ساتھ ایک دیومالا کی صورت میں اس کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ جس نے اس معبد کی عزّت اور توقیر، ہیبت اور شوکت میں اضافہ کیا ہے۔ شاید اس طرح سے انسان دھیرے دھیرے ریزہ ریزہ اپنے آپ کو چُن کر جمع کرتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن یہ ڈھیر اہرام سے بھی زیادہ بلند اور مقدس ہو جاتا ہے۔

دوسرا باب

آنگی گرجن ڈھوک میں اپنا گلہ چرا رہی تھی۔ سینکڑوں بھیڑ بکریوں کا گلہ مَیں مَیں کرتا ہوا گھاس چر رہا تھا۔ گرمی کا موسم شباب پر تھا۔ آنگی نے اُون کا چوغہ اُتار کے ریشم کا چوغہ پہن رکھا تھا۔ جس کے سینے پر اُودے رنگ کی کشیدہ کاری تھی۔
اس کی دادی دُور ماں جھیل گردور کے کنارے کی سبز نرم دوب پہ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کھاتی ہوئی سو گئی تھی۔ اس کا مُنہ تھوڑا سا کھُلا تھا۔ اور پوپلے مُنہ کی جھرّیوں میں کسی چیونٹیوں کے بڑے ٹیلے کے سُوراخ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔
آنگی نے سوچا، کیا بڑھاپے میں اس کا چہرہ بھی ایسا ہو جائے گا۔ اس نے جُھک کر جھیل کی سطح پر اپنے عکس کی رعنائی کو جھلملاتے ہوئے دیکھا۔ ابھی تو وہ اٹھارہ سال کی بھی نہیں

ہوئی ہے۔ مگر بادامی چوغے کے اُوپر اُودے اُودے پھولوں والے بیل بوٹوں کے اندر دو سیب سے اُبھرے دکھائی دے رہے ہیں۔ آنگی اُنھیں دیکھ کر شرما گئی۔

پھر اُس نے اپنے ہونٹوں کو دیکھا۔ گہرے یاقوتی سُرخ کمان کی طرح کٹے ہوئے اور چھوٹے۔ اُس کا دہانہ کسی جنگلی گلاب کے چھوٹے سے گہرے سُرخ پھول کی طرح تھا۔ جس کے مرکز میں برف کا گالہ رکھ دیا گیا ہو۔ آنگی مُسکرائی اور موسم گرما کی سپید اور چمکیلی برف کی طرح دانت اس کے تنگ دہانے میں دکھائی دینے لگے۔

اس نے اپنی لانبی گردن سے سُنہرے ریشمی بالوں کی ایک لٹ جھٹک کے پھر اپنی دادی دورماں کی طرف دیکھا۔ "اُوہنہ" ابھی تو وہ اٹھارہ سال کی بھی نہیں ہوئی ہے۔ اور جب وہ دادی دورماں کی طرح اَٹھہتر برس کی ہو جائے گی، پھر اپنے پوپلے مُنہ کے متعلق سوچے گی۔

دُودھ کی رنگت ایسی ٹھوڑی، سیپی ایسے کان اور سیب کی سُرخی لیئے ہوئے رُخسار، اور آنکھیں کتنی بڑی، کتنی وحشی، کتنی پُرکشش، وہ اپنی آنکھوں کو دیکھ کر ڈر گئی۔ اُس نے جلدی سے جھیل کے عکس میں اُنگلی ڈال کر اُسے تتر بتر کر دیا۔ اب اس کا عکس ایک ہزار دائروں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر جھیل کے پانیوں میں کرنوں کی شطرنجی پھیلا رہا تھا۔ عکس جھیل میں کھلے ہوئے نیلوفر کے کے پھولوں سے جا ٹکرایا۔ اور آنگی نے اپنا چوغہ ذرا سا اوپر اُٹھا لیا۔ اسے اپنے سفید پاؤں اور برف کے گالوں ایسے نازک ٹخنے دکھائی دیئے۔ پھر وہ جھیل کے کنارے کے پانیوں میں اُتر گئی۔ اور ہات پھیلا کر نیلوفر کے چوڑے چوڑے تھالی دار پتوں کے بیچ میں کھلے نیلوفر کے پھول ان کی لانبی ڈنڈیوں سمیت توڑنے لگی۔

ابھی اُس نے آٹھ دس پھول توڑ کر کنارے پر پھینکے تھے کہ اسے ایک میمنے کے کراہنے کی آواز آئی، جو زور زور سے چلّا کر رو رہا تھا، اور مدد کے لیئے پکار رہا تھا۔ گلّے میں ایک عجیب بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور بہت سی بکریاں ایک سُرمئی چٹان پر کھڑی ہوئی عجیب مسکین لہجے میں "با آ ۔۔ با آ" کر رہی تھیں۔

آنگی پانی سے نکل کر جلدی سے اُدھر بھاگی، جدھر سے میمنے کے کراہنے اور بکریوں کے بے چین ہو کر "با آ، با آ" کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اس نے وہاں جا کر دیکھا۔ ایک اُونچی چٹان کے نیچے گہری کھڈ میں بکری کا ایک چھوٹا سا خوبصورت میمنہ گر پڑا تھا۔ وہ اپنا چھوٹا سا مُنہ بار بار کھول کر مدد کے لیئے پکار رہا تھا۔ کیونکہ وہ جہاں گرا تھا، وہاں کی گہری کھڈ میں ابھی تک برف پگھلی نہ تھی۔ وہ برف پر جا گرا تھا۔ اور اب برف کی سردی میں کانپتے ہوئے رو رہا تھا۔ اور میمنے کی ماں اور اس کی سہیلیاں وہ تمام بکریاں اُونچی چٹان پر کھڑیں بے بسی سے "با آ، با آ" کر رہی تھیں۔

آنگی نے کھڈ کے اُوپر کھڑے ہوئے لانبے لانبے بھُورے بالوں والے معصوم میمنے کی پکار سُنی۔ اور اُس کا جی چاہا کہ وہ کھڈ میں اُتر جائے اور میمنے کو گود میں لے کر اُٹھا لائے۔ مگر جب اُس نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کھڈ اتنی گہری ہے کہ وہ اس کے اندر تو اُتر سکتی ہے اور میمنے کو اپنی گود میں بھی لے سکتی ہے۔ مگر کھڈ سے باہر نہیں نکل سکے گی۔ ہاں اگر اس وقت اس کا باپ سردار بلوآل یہاں ہوتا۔ جس کا قد چھ فٹ سے اُونچا تھا۔ وہ اگر اس وقت یہاں ہوتا تو اس میمنے کو بچا سکتا تھا۔

وہ ابھی اسی کشمش و پنج میں تھی، کیا کرے کیا نہ کرے اس کا باپ تو نیچے اچھن ڈھوک میں تھا۔ اور وہاں جانے اور اسے ساتھ لے کر یہاں آتے آتے گہری رات ہو جائے گی۔ اور رات بھر اگر میمنہ وہیں پڑا رہا تو سردی سے مر جائے گا۔ اپنی بوڑھی دادی دورماں کو بھی جگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کبھی دادی دورماں اُونچے لانبے قد کی ہوگی مگر اب تو وہ جھک گئی تھی اور دُبلی ہو گئی تھی۔ وہ نہ تو میمنے کو کھڈ میں سے نکال سکتی تھی نہ آنگی کے کھڈ میں اُتر پڑنے پر اُسے باہر نکال سکتی ہے۔ دادی دورماں کو جگانا بیکار ہوگا۔

یکایک اُس نے اپنے پیچھے ایک آدمی کو کھڑے دیکھا۔

وہ چونک کر پلٹی ——

"تم کون ہو؟" اُس نے ڈر کر پوچھا۔

"میں ایک پردیسی ہوں، چھنن میرا نام ہے۔ میں بہت دُور سے آیا ہوں اور شوپان راھب سے پڑھنے کے لیئے آیا ہوں"۔

شاہ بلوط کے راہبوں میں شوپان راہب کا درجہ سب سے بلند تھا۔ شاہ بلوط کے معبد کا وہی سب سے بڑا کاہن تھا۔

آنگی نے چینن کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ لانبا، مگر اس کے باپ کی طرح بہت لانبا بھی نہیں ـــ آنگی سے کوئی چھ انچ اونچا ہوگا۔ دبلا، مگر اتنا دبلا بھی نہیں کہ سوکھا سڑا نظر آئے۔ سر کے بال بھورے اور بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے، بھوری آنکھیں اور کھنچے ہوئے رخسار۔ اور بھوک کے ہونٹ خشک مگر پتلے، برسوں کی بھوک کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ وہ ہلکی سرمئی اون کا چوغہ پہنے ہوئے تھا۔ اور چوغے کی کھلی آستین مشکل سے اس کی کلائی تک پہنچتی تھی۔ وہ بغل میں چند کتابیں تھامے تھا۔ اس نے کہا ـــ "میمنہ کھڈ میں جا گرا ہے، میں دیکھ سکتا ہوں، اسے نکالنا بھی ہوگا، مگر تم اسے نکال نہ سکو گی، یہ بھی میں دیکھ سکتا ہوں"۔

وہ ہولے سے مسکرایا۔ بڑی عجیب شرمیلی مسکراہٹ اس کی تھی، اور جب وہ مسکرایا تو آنگی کا سارا ڈر دور ہوگیا ـــ یہ نوجوان پہلی بہار کی ہلکی برف کی طرح معصوم تھا اور بنفشے کے پھولوں کی طرح شرمیلا۔

آنگی نے اس سے کہا ـــ "میں نیچے کھڈ میں اتر جاتی ہوں، میمنہ اٹھا کر اوپر تمہاری طرف پھینک دوں گی۔ پھر تم مجھے اوپر اٹھا لینا" ـــ

"نہیں" ـــ چینن بولا ـــ "میں خود کھڈ میں اتر کر میمنہ نکال لاؤں گا" ـــ

"کھڈ گہری ہے"! آنگی بولی۔ "اور اس کے اندر برف جانے کتنی گہری اور نرم ہو، تمہارے پاؤں دھنس جائیں گے"۔

جواب میں چینن نے کچھ نہ کہا۔ اس نے اپنی کتابیں بغل سے نکال کر آنگی کو دیں ـــ اور اس سے کہا ـــ "انہیں ذرا تھام لو" ـــ

آنگی نے کتابیں لے لیں۔ اجنبی نوجوان نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے مس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آنگی کے ہات میں صرف کتابیں آئیں۔ اس نوجوان کا لمس نہیں ـــ

پھر وہ کھڈ میں ہولے سے احتیاط سے اتر گیا۔ کھڈ میں اتر کر اس نے میمنے کو گود میں لیا۔ پھر اسے آہستہ سے اوپر اچھال کر کھڈ سے باہر پھینک دیا۔

میمنے نے کراہ کر اپنے لانبے لانبے بال جھٹکے۔ بکریاں چٹان سے اتر آئیں۔ اس کی ماں میمنے کے قریب آگئی، اور اسے چاٹنے لگی۔

آنگی نے کتابیں ہری دوب پر رکھ دیں اور اپنے دونوں ہات سیب کی ڈالی کی طرح سڈول اور سجل ہات، نیچے اجنبی کی طرف بڑھا کر کہا ـــ "اپنے ہات میرے ہات میں دیدو، میں کھڈ سے باہر نکلنے میں تمہاری مدد کروں گی"۔

مگر اجنبی نے پھر اس کے ہاتھوں کو نہیں چھوا۔ وہ اچک کر کھڈ کی اوپر والی چٹان سے لٹک گیا۔ چند لمحے لٹکا رہا، پھر پینگ لے کر کھڈ سے باہر آگیا۔ آنگی کو احساس ہوا کہ نوجوان اپنے بھوکے چہرے اور دبلے ہونے کے باوجود بھی طاقت ور اور دلکش ہے۔ دونوں بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس کے ہات چھو لیتی۔ مگر نوجوان نے ایسا نہ ہونے دیا۔ دل میں اسے ایک عجیب سی مایوسی ہوئی۔

"بڑی مہربانی ہے تیری چینن"۔ آنگی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھکا کر کہا ـــ

"ناں ـــ کوئی مہربانی نہ ہوئی۔ اگر میں میمنے کو اکیلا کھڈ میں گرا ہوا دیکھتا، جب بھی یہی کرتا" ـــ

ایک لمحے کے لیئے آنگی کا دل لرزا۔ یہ سوچ کر کہ وہ خود بھی اس کھڈ میں کیوں نہ گر گئی۔ وہ غور سے اس نوجوان کی دبلی، لانبی مخروطی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ جانے ان ہاتھوں کا لمس کیسا ہوگا۔ پہلے لمحے کی پہچان ہی سے وہ کیوں ان ہاتھوں کے لمس کے لیئے سوچ رہی ہے۔ اس نے آج تک کسی کے لیئے ایسا نہیں سوچا ـــ

نوجوان بولا: "تمہارا نام آنگی ہے کیا؟"

آنگی کا دل دھک سے رہ گیا: "تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہاری صورت سے"۔

"میری صورت پر کیا میرا نام لکھا ہے؟"

"تمہاری صورت پر اس حسن کا نام لکھا ہے، جو جمدیالوں کے سات فرقوں میں مشہور ہے۔ دور دور وادیوں، گھاٹیوں میں سردار بلوال کی لڑکی آنگی کے حسن و جمال کی دھوم ہے۔ آج کا دن بڑا مبارک ہے۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا۔"

اس کی لانبی مخروطی بے چین انگلیوں نے گھاس پر پڑی ہوئی کتابوں کو اٹھالیا، اور بولا: "اچھا میں چلتا ہوں۔ شاہ بلوط کا معبد کیا یہاں سے بہت دور ہے؟"

آنگی اتنی شرما گئی تھی کہ اس نے چند لمحوں کے لئے منہ پھیر لیا تھا۔ جانے کیا بات ہے۔ اسے اس اجنبی کے منہ سے اپنی تعریف بالکل بری نہیں لگی۔ دوسرے نوجوانوں اور مردوں کی تعریف سے وہ ڈر جاتی تھی، گھبرا جاتی تھی ——

اس کی نگاہیں نوجوان کی بے چین انگلیوں پر پڑیں، اس کا جی چاہا کہ وہ ان انگلیوں کی ایک ایک پور پر اپنے ملائم ہات پھیر کر ان کی بے چینی دور کر دے۔

آنگی نے آہستہ سے کہا: "راکو خدا کا معبد یہاں سے بہت دور نہیں ہے۔ مگر ابھی جا کر کیا کرو گے، سہ پہر میں جب میں گلہ واپس لے جاؤں گی، میرے ساتھ چلنا۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گی، پھر نیچے اپنے گاؤں چلی جاؤں گی" ——

چنن بولا —— مگر بولنے سے پہلے کسی قدر ہچکچایا، اور آنگی نے دیکھا کہ اس کی مضطرب، بے چین انگلیاں ایک دوسرے سے الجھی جا رہی ہیں، جیسے ان میں کسی بات کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

پھر وہ بولا: "بات یہ ہے کہ مجھے جلدی معبد میں پہنچ جانا چاہیئے کیونکہ میں بہت دور سے آیا ہوں، اور تھکا ہوا ہوں،" اور یکایک وہ رک گیا —— اور اس کی انگلیاں زور سے ایک دوسرے میں گندھ گئیں —— جیسے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے گا۔

آنگی نے نرمی سے کہا —— "یہ دوپہر کا وقت ہے۔ کھانے کا وقت ہے۔ ایک ٹکڑا روٹی کا میرے ساتھ توڑ لو۔ پھر نیچے چلے جانا، میں راستہ بتا دوں گی۔"

اس کی انگلیاں لرزیں جیسے وہ ہاں ناں، ناں ہاں میں فیصلہ کر رہی ہوں پھر اس کی کتابوں پر سختی سے جم گئیں۔

وہ سر جھکا کے آنگی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ پھر ذرا آگے بڑھ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، اور آنگی کو ایسا لگا، جیسے زمین اور آسمان ان دونوں کے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں۔

جھیل کے کنارے پہنچ کر وہ پیلے پھولوں کے ایک تختے میں بیٹھ گئے۔ یہیں پر اس کی دادی ماں سو رہی تھی۔ یہیں پر ایک دستر خوان میں لپٹا ہوا کھانا رکھا تھا۔ یہیں پر وہ نیلوفر کے پھول رکھے تھے جو جھیل کے پانیوں میں سے توڑ لائی تھی۔

آنگی پھولوں کے تختے کے بیچ بیٹھ گئی، جیسے کوئی شہزادی سنہری کرنوں کے تخت پر بیٹھ جائے۔ چنن اس کے پاؤں کی طرف بیٹھ کر ان نازک ٹخنوں کو دیکھتا رہا —— پھر اس غنچہ دہن کو دیکھتا رہا جس کا رنگ، یاقوت کو بھی شرما رہا تھا۔ پھر روشن ماتھے کی محراب کو جس کے عین بیچ دونوں بھنوؤں کے درمیان سوچ کی ایک چھوٹی سی لکیر ابھر آئی تھی۔ سنہری بالوں کی ایک لٹ کھل کر رخسار پر لٹک آئی تھی۔ دستر خوان کھولتے کھولتے آنگی نے دو مرتبہ اس لٹ کو چہرے سے پیچھے ہٹانا چاہا۔ مگر بڑی شریر لٹ تھی، بڑی نٹ کھٹ لٹ تھی، بار بار اس کے گال پر آجاتی۔

لپٹے ہوئے کپڑے میں سے مکئی کی روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی۔ دو روٹیاں تھیں، اوپر تلے —— آنگی نے دونوں روٹیوں کو کھولا۔ اندر سے لوکی کا اچار نکلا، اور ایک تیز تیکھی مرچوں اور تیل کی مہک اور اچار کے ساتھ ایک کونے میں دبا بھنا ہوا پنیر ——

آنگی نے ایک روٹی چنن کو دی۔ لوکی کے اچار کا ایک ڈلہ اسے دیا اور آدھا بھنا ہوا پنیر۔

چنن نے ایک لقمہ توڑا، رک گیا —— اور دادی دور ماں کی طرف اشارہ کر کے بولا —— "وہ نہیں کھائیں گی" —— ؟

"نہیں" —— آنگی سرگوشی میں بولی: "دادی دور ماں کو جلدی بھوک لگتی ہے وہ کھانا کھا کر سو گئی ہیں۔"

دیر تک وہ ایک دستر خوان پر لقمے توڑتے رہے اور کھاتے رہے۔ چنن نے کہا: "یہ بھنا ہوا پنیر تیتر کے گوشت سے بھی عمدہ ذائقہ رکھتا ہے۔"

دونوں بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے، کہیں
دادی ماں جاگ نہ جائیں۔

آنگی بولی: "یہ میرے ہاتھوں کا پنیر ہے۔ اسکی ٹکاڑی
میں نے پچھلی سردیوں میں تیار کی تھی"۔

چینن نے جیسے عالمِ خواب میں آنگی کے ہاتھوں کو پنیر
متھ کر اپنے دونوں کنوارے ہاتھوں میں بادلوں جیسے سفید
ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر، دونوں ہاتھوں سے ٹکاڑی کو جماتے اور
پھر اسے دُھوپ میں سُکھاتے دیکھا۔ مکئی کی روٹیوں کے برابر
کتنی ہی ٹکاڑیاں تھیں جو ایک رسّی کے سہارے ہوا میں اور
دُھوپ میں جھول رہی تھیں۔ پنیر کی ٹکاڑیاں جن میں آنگی
کے کنوارے ہاتھوں کی خوشبو تھی۔

چینن نے جیب سے ایک بادامی رنگ کا کپڑا نکالا، اور
آدھی روٹی، آدھے اچار اور آدھے پنیر کو اُس میں سنبھال کر
رکھ کر، لپیٹ کر، واپس اپنے چوغے کی جیب میں ڈال لیا اور
بولا: "اسے رات کو کھاؤں گا"۔

"کیوں"؟ آنگی بولی: "رات کو تمہیں معبد میں کھانا ملےگا۔
کوئی بھی پردیسی وہاں تین دن تک کھانا کھا سکتا ہے"۔

"نہیں"۔ چینن نے بڑے نرم لہجے میں کہا: "میں بس
اتنا ہی کھاتا ہوں آدھی روٹی مکئی کی یا جوار کی"۔

"بس ــــ"؟ آنگی نے حیرت سے پوچھا۔

"بس"! چینن نے ہوا کی سی سرگوشی میں کہا: "میں رات
کو دیر تک پڑھتا ہوں، اس لیئے مجھے کم کھانا چاہیئے اور پھر
ایسا پنیر شاید مجھے معبد میں نہ ملے"۔

آنگی کے جی میں آیا کہ وہ اس سے کہے۔ اگر تم کہو تو روز
تمہارے لیئے ٹکاڑی کا بُھنا ہوا پنیر معبد میں لے آیا کروں"؟
مگر پھر اسے اس خیال پر بے حد جھجک سی آگئی۔۔۔ وہ اپنے
خیال سے خود ہی شرما گئی ــــ اور دھیرے دھیرے
دستر خوان تہہ کرنے لگی اور جب وہ دستر خوان تہہ کر رہی تھی
تو اجنبی نے جھیل کے کنارے جاکر ہات دھو لیئے تھے، اور
اب وہ نیلوفر کی ڈنڈیوں کو ایک دوسرے سے ملا کر ایک
گول دائرے کی شکل کا ہار گوندھ رہا تھا۔

کس کے لیئے؟ آنگی نے سوچا۔

اس کا چہرہ سُرخ ہوتا گیا۔ سنہری سے شفق زار ہو گیا۔۔۔

"کیا میرے لیئے؟ ــــ مگر اس اجنبی کو کیا حق ہے"؟ ــــ

وہ، اُس کی بے چین انگلیوں کو ہار گوندھتے دیکھتی رہی۔

پھر جب ہار مکمل ہو گیا تو چینن نے آنگی کی طرف دیکھے بغیر
اس دائرے نما نیلوفر کے ہار کو جھیل کے پانی میں ڈال دیا۔ اور
آہستہ سے بولا: "اب میں جاؤں گا، معبد کا راستہ بتا دو"۔

اس کا راستہ تو میرے دل میں سے ہو کر گذرتا ہے۔
آنگی کے ذہن میں آیا۔ مگر اس نے فوراً ہی اس خیال کو دھیں
دبا دیا۔ آہستہ سے بولی ــــ "مغرب کی سمت نیچے اُترتے
جاؤ۔ کوئی آدھے پونے میل کی دُوری پہ تمہیں شاہ بلوط
کا پیڑ ملے گا۔ ایک ہی پیڑ ہے اس جگہ پر، آس پاس علاقے
میں اور کوئی پیڑ نہیں ہے۔ اسلیئے تم اُس جگہ کو بھول نہیں سکتے"۔

چینن نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے راستے پر چلا گیا۔
ایک دفعہ بھی اس نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ آنگی دیر تک اُسے
دیکھتی رہی۔ پھر جب وہ نظروں سے غائب ہو گیا تو اُس نے
مُڑ کر کھڑے کھڑے جھیل کے پانیوں پر نگاہ ڈالی۔ جھیل کے
پانیوں میں دائرے نما ہار ہولے ہولے تیرتا، ڈولتا ہوا اُس
کے عکس کے قریب آیا ــــ آتا گیا ــــ اب وہ اس کے
عکس کے چاروں طرف گھیرا ڈالے تھا۔ آنگی کو ایسا لگا، جیسے
کسی نے وہ ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ چونک کر سہم گئی۔

"لڑکی کیا دیکھتی ہے پانی میں؟ جب دیکھو جھیل کے آئینے
میں اپنی صُورت دیکھتی رہتی ہے"۔

ایک تلخ آواز آئی ــــ

آنگی نے مُڑ کر دیکھا ــــ

دادی دور ماں جاگ گئی تھی ــــ

تیسرا باب

چینن کو معبد میں آئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے،
کہ اتنے عرصے ہی میں راہبوں کے بڑے کاہن شوپان نے
دیکھ لیا تھا کہ اس کے شاگردوں میں چینن سب سے

ہوشیار ہے۔ ان چند دنوں میں اس نے مقدس اور قدیم ژند کے ڈیڑھ سو صفحے اَزبر کر لیئے تھے۔ اور اب وہ ان تیرہ پارچہ جات کے مطالعہ میں مصروف رہتا تھا، جو جمبیال قبیلے کے لوگ کافرستان سے ساتھ لائے تھے۔

آج شوپان نیچے اچھن ڈھوک کے گاؤں میں کسی بے حد بیمار اور قریب المرگ بڑھیا کے جھاڑ پھونک کے لیئے گیا ہوا تھا۔ اور دوسرے اس کے کئی شاگرد نیچے کی ڈھوکوں میں معبد کے لیئے روٹیاں اور سالن اکٹھا کرنے کے لیئے گئے ہوئے تھے۔

معبد میں اس وقت شوپان کے پانچ شاگرد موجود تھے، سوما، ڈنجی، چاکر، ڈاگر اور کولات۔ عام طور پر چنن دوسرے شاگردوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ زیادہ تر اس کا وقت پڑھائی میں گزرتا تھا، یا آنکھیں کھولے پلکیں جھپکائے بغیر خلا میں جانے کیسے کیسے خواب دیکھتے دیکھتے کھو جاتا۔ ایسا لگتا جیسے اُسے اپنے اِردگرد کے ماحول سے یا دوسرے شاگردوں اور راہبوں کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

چند گھنٹوں سے اسی شاہ بلوط کے پیڑ کے نیچے لکڑی کے معبد کے باہر ادھیڑ عمر کی ایک نائین جس کا نام سمّی تھا، وہ بھی تین روز سے آئی تھی، اور آرام کر رہی تھی۔ اس کے بال کھچڑی تھے، ماتھا فراخ تھا۔ چہرے پر ذہانت اور آنکھوں میں فراست کی چمک تھی۔ وہ غور سے شاگردوں کی باتیں سُن رہی تھی۔

چاکر کہہ رہا تھا۔ کہتے ہیں ظلالان کاھن ہمیشہ سونے کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔ جس کی پُشت پر راکو دیوتا کا تاج بنا ہوا تھا۔ اور اس تاج میں ایسے ہیرے موتی لگے تھے جو دن میں دس بار رنگ بدلتے تھے۔

۔۔۔ اور مَیں نے سُنا ہے۔ ڈاگر کہنے لگا کہ شوبیاں کے کاہن سُوسا شاہ جب کھانا کھاتا تھا تو دس نفیری والے نفیری بجاتے تھے۔ اور دو دَف والے دَف بجاتے تھے۔ اور ایک نٹ کھنجری لیکر ناچ دکھاتا تھا۔ اور جب کاہن سُوسا شاہ کہیں باہر جاتا تو اس کی ڈانڈی کو آٹھ وردی پوش مزدور اُٹھاتے تھے، جن کی وردیوں پر سونے کا کام ٹکا تھا۔

سوما بولا ــــ اور مَیں نے سُنا ہے کہ جب دیدانگ سا کاھن رات کو اپنے کمرے میں سونے کو جاتا تو اس کے سلیپر چاندی اور سونے کے ہوتے تھے۔

سمّی نائین نے بیزاری سے کھانس کر کہا، کیا بات کرتے ہو، بڑائی کسی کاہن کی بڑائی سونے کے سلیپروں سے نہیں ہوتی۔ یہاں سے بہت دُور بلدیال قبیلے کا کاھن راتم بکولا اس قدر غریب تھا کہ اس کا اُونی چوغہ ہمیشہ پھٹا رہتا اور وہ ہر روز گاؤں کے کسی ایک گھر سے ایک روٹی بھیک مانگ کر کھاتا تھا۔ مگر نیکی، پاکیزگی اور تقدس میں وہ تمہارے کسی کاھن سے کم نہ تھا۔

کولات کہنے لگا: تم بات کو سمجھی نہیں ہو سمّی نائین۔ جب ہم کاھن نالان کی سونے کی کرسی یا سوشاں کی سنہری ڈانڈی کی بات کرتے ہیں تو ہم ان کی دولت کی تعریف نہیں کرتے۔ بڑائی دولت سے نہیں آتی ہے، یہ ہم بھی جانتے ہیں۔ ہم ان علامتوں کے اندر چھپی ہوئی دوسری باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ راز جو سونے کی کرسی، دس نفیریوں اور سونے چاندی کے سلیپر میں پنہاں ہے۔

"اور وہ ہے کیا؟" ڈنجی بولا، جو سب شاگردوں سے ذہانت میں کمزور تھا۔

کولات، فخریہ لہجے میں بیان کرنے لگا۔ اصل نُکتہ یہ ہے کہ وہ سونے کی کُرسی، کُرسی نہیں تھی، وہ نفیری والے نفیری نہیں بجاتے تھے، وہ سونے کی جوتی سونے کی جوتی نہ تھی۔ وہ اُن علامتوں کے عکس تھے جو بڑائی کو اُجاگر کرتے ہیں۔

سمّی بیزار ہو کر بولی۔ سچی عظمت کو کسی علامت کے عکس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تم غلطی پر ہو۔ سوما بولا۔ عظمت کے لیئے بڑے ماحول کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

چاکر نے کہا۔ مجھے یاد آیا، ایک دن کاھن ظالان کو ایک غریب اور ایک امیر آدمی کے درمیان جھگڑا چکانا تھا۔ کاھن ظالان نے غریب آدمی کی شکایت سُنی۔ پھر امیر آدمی کا جواب سُنا۔ اور جواب سُن کر اُسے یقین ہو گیا کہ غریب آدمی کی شکایت سچّی تھی۔ اِس لیئے اس نے غریب آدمی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

امیر آدمی اُس فیصلے پر بہت بگڑا۔ اس نے کاھن سے کہا۔ مَیں اِس فیصلے کو ماننے سے اِنکار کرتا ہوں۔ اس پر کاھن نے کہا۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور تمہیں اسے منظور کرنا ہو گا۔

امیر آدمی نے اُنگلیاں چٹخا کر کہا ــــ جاؤ ــــ جاؤ ــــ کیا تم اور کیا تمہارا فیصلہ؟ اس پر کاھن ظالان اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اور اس کے ہات میں مقدس عصا تھا۔ اور اس نے بڑے بارُعب لہجے میں کہا: "اگر تم نے میرا فیصلہ نہیں مانا تو میں تمہیں اِس عصا سے پیٹ پیٹ کر ٹھیک کر دوں گا۔

اس پر امیر آدمی کو بہت غصہ آیا اور اُس نے کاہن ظالان کو بہت گندی گندی گالیاں دیں۔ کاہن خاموشی سے مُسکراتا ہُوا وہ گالیاں سُنتا رہا۔ پھر لیکایک اس نے اپنا عصا گھما کر جو اس امیر آدمی کی طرف پھینکا تو وہ عصا سانپ بن گیا اور امیر آدمی کا پیچھا کرنے لگا۔ اب تو امیر آدمی بہت گھبرایا، بہت گڑگڑایا اس نے کان پکڑے، کاھن کے پاؤں پکڑے اور اس کے ہر حکم کو ماننے کے لیئے تیار ہوگیا۔ اس پر کاھن ظالان نے ایک منتر پھُونکا۔ اور وہ سانپ پھر کاھن کے ہاتھ میں آ کر عصا بن گیا۔

ڈینجی ہنس کر بولا۔ ہاہاہا۔ کاھن کا عصا بڑے بڑے امیروں کو سیدھا کر دیتا ہے۔ سوما بولا۔ تم نے بات کو غلط طریقے پر بیان کیا ہے۔ وہ عصا جنّت کا سانپ نہ تھا جسکی وجہ سے حضرت آدم جنّت سے نکالے گئے۔

چاکر بولا: بے شک وہ سانپ پہلا سانپ نہ تھا۔ پہلا سانپ تو شیطان کو کہتے ہیں۔ کاھن ظالان ایک مقدس کام کے لیئے شیطان کو کیسے استعمال کر سکتا تھا۔

"کاھن ظالان کو بخوبی علم ہوگا کہ وہ کیا کر رہا ہے، کیا نہیں کر رہا ہے۔" ڈاگر نے کہا۔

چاکر بولا: مَیں جھُوٹ نہیں کہتا ہوں، جس گاؤں کا یہ واقعہ ہے، وہاں کے سیکڑوں لوگ اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے اس عصا کو سانپ بنتے ہوئے دیکھا۔ اور تم یہ کہتے ہو کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ تم کچھ جانتے نہیں ہو۔ اِس لیئے محض بحث کی خاطر...

سوما بولا: مَیں بحث کی خاطر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ اس سانپ کو کسی منتر تنتر یا حکم سے بُلایا نہیں جاسکتا!

سمّی بولی۔ ہاں مجھے تم سے اتفاق ہے۔ اگر وہ پہلا سانپ تھا تو سمجھو وہ شیطان تھا۔ اور شیطان کو کسی کے حکم سے بُلایا نہیں جاسکتا۔ وہ صرف خدا کے دوسرے نام سے بُلایا جاسکتا ہے۔ وہ نام جس کے اندر ایسے شعلے کی قوت ہے جو پہاڑوں کو پگھلا کر انھیں نشیبی وادیوں میں تبدیل کر دے۔

سوما بولا۔ کیا اس دوسرے نام کو زبان پر لانے سے کوئی معجزہ ہو سکتا ہے۔

مَیں نہیں جانتی۔ سمّی نائین سر ہلا کر بولی۔ مجھے اِتنا معلوم ہے کہ کسی انتہائی شدید جذبے کے دھارے میں بہتے ہوئے وہ نام زبان پر اِس طرح آسکتا ہے، جیسے شعلے سے کوئی چنگاری چھُوٹے اور نام لینے والے کو جلا کر خاک کر دے۔

"جس گاؤں سے مَیں آیا ہوں۔ چاکر بولا: وہاں ایک جادوگر رہتا ہے جو سچ مچ معجزے دکھا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ایک منتر پڑھ کر آگ لگا دیتا ہے۔ دوسرا منتر پڑھ کر اس آگ کو بجھا دیتا ہے، وہ اپنی بند آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ ایک سو میل کے فاصلے پر کیا ہوتا ہے۔ وہ دَم دے کر جنّات کو بُلا لیتا ہے اور مُردوں کو جگا دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو غائب کر سکتا ہے اور بَد رُوحوں کو قابو میں کر سکتا ہے۔ شیطان تک کو وہ بُلا لیتا ہے۔ مَیں نے خود اسکی زبان سے اُسے یہ دعوٰی کرتے سُنا ہے۔

چنن جواب تک خاموش رہا تھا، جس نے اس بحث میں اب تک حصّہ نہیں لیا تھا، اس نے آگے بڑھ کر چاکر سے پُوچھا۔

"وہ کون ہے؟"

سب راھب اس کا مُنہ دیکھنے لگے۔ چاکر نے پُوچھا: "وہ کہاں ہے جو معجزے دکھاتا ہے؟"

"وہ اور کہاں ہو سکتا ہے، سوائے میرے گاؤں کے۔"

"اور تمہارا گاؤں کیا یہاں سے بہت دُور ہے؟"

"میرا گاؤں"؟ چاکر نے پوچھا: "ہاں بہت دُور ہے یہاں سے، اُنارو ڈھوک سے بھی نیچے، نیچے نشیبی علاقے میں ہے۔"

"کتنی دُور؟"

"یہاں سے دس بارہ روز کا راستہ ہوگا۔" چاکر بولا: "مگر تمہیں اُس آدمی میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی ہے"

کیا تم اُس سے ملنا چاہتے ہو، تو سُن لو، میرے گاؤں کا نام سونا پُور ہے اور اس آدمی کا نام چینن را ہے۔"

چینن نے حیرت زدہ ہو کر کہا: "چینن را ــــ یعنی مصری حساب سے چینن کا خُدا..... وہ مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑایا... پھر غور کر کے کسی قدر چونک گیا اور کچھ سوچنے لگا۔

اِتنے میں ڈینجی نے کہا: "بس بہت ہو گیا۔ رات کے سمے ہمیں ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں۔ خاص طور پر اس مقدس جگہ پر۔ اب شام ڈھلنے والی ہے۔ کیا معلوم ہماری زبان سے کوئی ایسا ٹونہ نکل جائے۔ یا کوئی ایسی علامت جو کسی پر تباہی لے آئے۔ انجانے میں اکثر ایسا ہوا بھی ہے۔ آؤ معبد کا دروازہ بند کر لیں۔

ڈینجی معبد کا دروازہ بند کرنے جا رہا تھا کہ اس کی ٹکر ایک لانبے اُونچے قوی ہیکل آدمی سے ہو گئی۔ وہ اُسے پہچان کر مؤدبانہ پیچھے ہٹا اور کہنے لگا۔

"سردار بلوآل آئے ہیں"۔

شام کی خُنکی کچھ بڑھ چلی تھی۔ سردار بلوآل ان سب راھبوں سے اُونچا نظر آتا تھا۔ اس نے ستّی نائین کو دیکھ کر کہا "مَیں آج تمہارا انتظار کر رہا تھا"۔

"اور مَیں کل آنے والی تھی"۔

"آج کیوں نہیں؟"

"اِس لیئے کہ آج رات تمہاری خراب جاتی۔ مَیں نے سوچا، دِن میں آؤں گی اور تمہیں بتا دوں گی، کوئی اچھی خبر تو ہے نہیں۔ لڑکے والوں نے تمہاری شرطیں نہیں مانیں؟"

"اچھی خبر ہو یا بُری خبر ہو۔ تمہیں سیدھے میرے گھر آنا چاہیئے تھا" سردار بلوآل نے بے حد بارُعب لہجے میں کہا۔

ستّی نائین اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

سردار بلوآل سیدھا تنا ہوا کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں اوپر اُٹھی ہوئی تھیں۔ چہرے کا رنگ تانبے ایسا تھا اور وہ بھُورے رنگ کے پشمینے کا ایک عمدہ کفتان پہنے ہوئے تھا۔ اس نے راھبوں پر کسی قدر حقارت آمیز نظر ڈال کر کہا، تم میں سے چینن کون ہے؟

چینن سب سے الگ بائیں طرف کھڑا تھا۔

خاموشی سے آگے بڑھ کر چینن بولا: "میں ہی چینن ہوں"۔

سردار بلوآل نے اسے سَر سے پاؤں تک گھُورا۔ چینن بھی سیدھا لانبا کھڑا تھا۔ مگر سردار بلوآل کے کندھے تک آتا تھا۔ جسم بے حد چھریرا بلکہ کسی حد تک دُبلا تھا۔ مگر چھریرے پن کے باوجود اس کے چہرے اور سارے جسم سے کسی خفتہ قوت کا اظہار ہوتا تھا۔

سردار بلوآل کو دیکھ کر اس نے دوسرے راھبوں کی طرح آنکھیں نہیں جھپکائیں۔ سیدھا کھڑا رہا۔ سردار بلوآل کا لہجہ کسی قدر نرم پڑ گیا۔ اس نے کہا: "کاھن شوپان نے تمہاری بہت تعریف کی ہے۔ اس لیئے مَیں چاہتا ہوں کہ آج سے تم میرے گھر پر ہی رہو، سامان باندھ لو۔ پڑھنے کے لیئے تم روز یہاں آ سکتے ہو"۔ اِتنا کہہ کر سردار بلوآل گھُوم گیا۔

چینن کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی اُس نے اپنی چند کتابیں اُٹھائیں اور کچھ کہے بغیر راھبوں سے بغل گیر ہوئے بغیر سردار بلوآل کے پیچھے پیچھے معبد سے باہر نکل گیا۔

چوتھا باب

سردار بلوآل کا گھر لکڑی کا بنا ہُوا تھا اور دو منزلہ تھا۔ اس کے قبیلے کے باقی لوگوں کے پاس گھر نہ تھے، صرف خیمے تھے۔ مگر سردار کا گھر عمدہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ قبیلے کا سردار تھا۔ اور اس گھر کے ایک طرف ہٹ کر تورا اور اس کے عاشق کی صدیوں پُرانی قبر تھی۔ جس پر انگور کی بیلیں سایہ کیئے ہوئے تھیں۔ اس قبر سے کچھ فاصلے پر قبیلے کا قبرستان تھا، جس میں آنگی کی ماں بھی دفن تھی۔ آنگی جب کبھی قبرستان سے گُزرتی تو اسے اپنی ماں کی قبر سے میٹھی میٹھی لوریوں کی اَن سُنی صدا اپنے دِل کی گہرائیوں میں محسوس ہوتی تھی۔ اور جب وہ وہاں چراغ جلا کر تورا اور اس کے عاشق کی قبر پر آتی، تو اُسے لگتا جیسے کوئی اُداس رُوح اس کے پیچھے پیچھے آہیں بھرتی ہوئی چل رہی ہے۔ آنگی کو قبرستان

والا حصّہ بہت پسند تھا۔ یہاں انگور کی بیلیں تھیں اور پنج تارے کے گلابی پھولوں والے پیڑ تھے اور آلوچوں اور خُوبانیوں کے درخت تھے، جن کی شاخیں موسمِ بہار میں سفید سفید پھولوں سے لَد جاتیں۔ کہیں کہیں ٹیلوں اور قبروں پر گہری سبز دوب کے اندر لانبی لانبی ڈنڈیوں کے اُوپر نرگس کے پھول اپنی بے شمار آنکھوں سے اُسے تاکتے ہوئے نظر آتے۔ جیسے نرگس کے وہ پھول اُس سے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ مگر ہچکچا کر چُپ ہو جاتے ہوں۔ پھولوں کی آنکھیں جب آنگی کی آنکھوں سے مِلتیں تو آنگی اِک عجب پُراسرار سی کشش محسوس کرتی۔ اُس کا جی چاہتا وہ ان نرگسی پھولوں کو اپنے کلیجے سے لگا لے۔ بچپن میں وہ اکیلی قبرستان میں گھومتی رہتی تھی اور اکیلی کھیلتی رہتی تھی۔ اب جوانی میں بھی اسے اس قبرستان کے لہلہاتے پیڑوں اور نرگسی پھولوں کے درمیان ہولے ہولے سیر کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اسے ایسا لگتا جیسے وہ یہاں کے باسیوں کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہے۔ دادی دورماں اسے اکثر منع کیا کرتی۔ یُوں بار بار ہر روز قبرستان نہیں جایا کرتے۔ کبھی کبھار بزرگوں کی رُوحوں سے مِلنے کے لیئے چلے جانا ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی ان کی یاد بھی ٹھیک ہے۔ لیکن جو اس دُنیا سے چلے گئے ہیں ان کے قریب ہر روز جانا ٹھیک نہیں ہے۔ گھُومنے کے لیئے اور دوسری جگہیں ہیں۔

آنگی چُپ ہو جاتی۔ سُنی اَن سُنی کر دیتی۔ پھر ذرا سا موقعہ مِلتے ہی قبرستان میں چلی جاتی۔ جانے کیا بات ہے اُسے یہاں بہت سکون مِلتا تھا۔

آنگی کا کمرہ اُوپر کی منزل پر تھا۔ چیتن کا کمرہ نچلی منزل پر تھا۔ چیتن کے کمرے کا دروازہ گھر کے باہر کی طرف کھُلتا تھا۔ اور عقب میں ایک کھڑکی تھی جو پیچھے گھر کے برآمدے میں کھُلتی تھی، جہاں سے چیتن گھر کے کھُلے آنگن کو دیکھ سکتا تھا۔ آنگن میں ایک طرف برآمدے سے لگا ہوا کچّی اینٹوں کا کچن تھا۔ اس سے مُلحق دادی دورماں کا کمرہ تھا۔ کیونکہ کچن کی دیکھ بھال وہ خود کرتی تھیں۔ چیتن اکثر یہ کھڑکی بند رکھتا تھا۔ مگر دن میں دو مرتبہ یہ کھڑکی ضرور کھُلتی تھی۔

کوئی برآمدے سے بند کھڑکی کے سامنے آکے گھر کے اندر سے اُسے بُلاتا اور کھڑکی کھٹکھٹاتا، چیتن کھڑکی کھول دیتا۔ کبھی دادی دورماں ہوتیں۔ اخروٹ کی کشتی میں اُس کا ناشتہ لیئے ہوئے، یا نوکرانی رجی ہوتی۔ وہ دونوں کھڑکی ہی سے اُسے ناشتہ بڑھا دیتی تھیں۔ ناشتہ رکھ کر چیتن کھڑکی بند کر دیتا تھا۔ اور ناشتہ کر کے اور کتابیں اُٹھا کر اُوپر معبد میں چلا جاتا تھا۔ وہاں تک جانے میں اُسے دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔ دوپہر کا کھانا اسے بعد میں ہی مِلتا تھا، دوسرے شاگردوں کے ساتھ، پھر رات کو یہ کھڑکی کھُلی۔ کھٹ کھٹ سے معلوم ہو جاتا کہ اس کے لیئے کھانا کھایا ہے۔ اور کبھی دادی دورماں بیمار ہوتیں یا مصروف ہوتیں۔ یا رجی کسی کام سے باہر گئی ہوتی تو آنگی آتی تھی۔ مگر اُس نے کبھی کھڑکی کو کھٹکھٹایا نہ تھا۔ کبھی کھڑکی سے ہات بڑھا کے ناشتہ نہ دیا تھا۔ وہ اندر کے برآمدے سے ناشتہ یا کھانا اُٹھائے ہوئے باہر کے دروازے سے جاتی۔ جو آنگن کے باہر کھُلتا تھا اور تین سیڑھیاں نیچے اُتر کر بائیں طرف مُڑ جاتی، جدھر ایک کونے پر نچلی منزل میں چیتن کا کمرہ تھا۔ وہ چیتن کے کمرے میں ہمیشہ دروازہ کھٹکھٹا کر داخل ہوتی تھی۔ کھڑکی کھٹکھٹا کر نہیں۔ شاید وہ اسے بدتہذیبی میں شمار کرتی تھی کہ اس طرح کھڑکی کے راستے کسی کو کھانا دے دیا جائے، جیسے کسی نوکر یا غریب بھکاری کو دیتے ہیں۔ یا ممکن ہے چیتن کے لیئے اُس کے احساس دوسرے ہوں۔ کچھ بھی ہو اس نے آج تک چیتن کو کھڑکی سے کھانا نہ دیا تھا۔

وہ ہمیشہ دروازے سے اندر آتی تھی۔ اخروٹ کی منقّش کشتی ہات پر کندھے سے اُوپر اُٹھائے ہوئے۔ پہلے وہ دروازہ کھٹکھٹاتی تھی۔ وہ دستک گویا کسی نے چیتن کے دِل پر دستک دے دی۔ چیتن دروازے کی دستک سے ہمیشہ چونک پڑتا، دَھک سا رہ جاتا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ جاتا۔ اگر دروازہ کھُلا ہوتا تو آہستہ سے کہہ دیتا۔ اندر آجاؤ۔ اگر کُنڈی لگی ہوتی تو اُٹھ کر کُنڈی کھول دیتا تھا۔ آنگی کشتی اُٹھائے اندر آتی۔ مُسکرا کر کہتی۔

"کہو چیتن، کیسے ہو؟" کبھی کچھ نہ پوچھتی، صرف مُسکرا دیتی۔ زمین پر دسترخوان بچھا کر اس پر کشتی سے سالن کا پیالہ اُٹھا کر سجا دیتی۔ مکئی کی روٹیاں یا چاول ساگ اور گوشت

پنیر یا مکھن، چھاچھ کا کٹورہ یا دہی یا شہد، صاف کیا ہوا شہد نہیں، بلکہ برف کی سپیدی کی مانند چھتے کی چھوٹی چھوٹی موٹی ٹکڑیوں میں سفید سیال برف کی طرح ٹھنڈا شہد۔ ایک سالن ہمیشہ گوشت کا ہوتا تھا، دوسرا سالن سبزی کا، دال کا، بھنی ہوئی کلاڑی کا۔ جس دن آنگی کھانا کھلانے آتی تھی، ہمیشہ اپنے ہات کا پکا ہوا کچھ تیار کر کے لاتی تھی اور وہ ہر روز نہیں آتی تھی۔ وہ صبح یا شام چنن کے دل میں ایک تصویر کی طرح آویزاں ہو جاتی۔ اس کے دل کے تصویر گھر میں کتنی ہی ایسی خوبصورت صبحیں اور شامیں لٹکی ہوئی تھیں۔ جب آنگی اس کے لیئے کھانا لے کر آتی تھی، جب اس نے دسترخوان بچھایا تھا۔ وہ اس کی انگلیاں دیکھتا رہتا۔ رخسار پر اُلجھی ہوئی لٹ، سُرخ ہوتے ہوئے رُخسار جو سُرخ سے سُرخ تر ہوتے چلے جاتے تھے۔ جب وہ کچھ کہتی نہیں تھی، صرف کھانا پروستی جاتی تھی۔ زمین پر دو زانو ہو کر۔ اس کا چوغہ گھٹنوں تک کھنچ جاتا۔ اور سینے کی گولائیاں مچل مچل کر اُبھرنے لگتیں اور سانس تیز چلنے لگتی۔ اور بوجھل پلکیں احساس کے خمار میں جھک کر رُخساروں سے اُوپر نہ اُٹھتیں، اور وہ کھانا پروس کر آہستہ کمزور شہد آگیں آوازمیں کہتی:

"چنن کھانا کھالو"۔

"تم؟"

"میں کھانا کھا کر آئی ہوں"۔

اور چنن دھیرے دھیرے دسترخوان کی طرف ہات بڑھاتا، اور خاموشی سے کھانا کھانے لگتا۔ دھیرے دھیرے ایک ایک شئے کو چکھ کر، پرکھ کر اُس کا لُطف لے کر اس کی تعریف کرتا یا حلق سے مانوس آوازیں نکال کر بلا واسطہ ان کی تعریف کرتا۔ مگر یُوں بہت کم ہوتا تھا۔

اکثر اوقات دونوں کے درمیان کھانے کے دَوران ایک گہری خاموشی رہتی تھی۔ گہری گرم نرم رَو کی طرح ان دو پیکروں کے درمیان بہتی ہوئی ندی کے گنگناتے پانیوں کی طرح جسم و رُوح کو گدگداتی ہوئی خاموشی۔ کبھی کبھی یہ خاموشی بڑی تکلیف دہ ہو جاتی تھی، کھانا پروستے ہوئے، روٹی دیتے ہوئے، سالن کا کٹورہ چنن کے ہات میں تھماتے ہوئے غیر ارادی طور پر آنگی کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ چنن اس کی انگلیاں چھولے۔ مگر چنن ہمیشہ بے حد محتاط رہتا تھا اور ایسے سنبھل کر ہات بڑھاتا تھا کہ اس کی انگلیاں کبھی آنگی کی انگلیوں سے مَس نہ ہونے پاتیں۔ اندر ہی اندر اس بات پر آنگی جھلا جاتی۔ وہ ایسے کیوں کرتا ہے۔ دوسرے لڑکوں کی طرح کیوں نہیں ہے۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب ڈھونڈ لیتی۔ اگر وہ دوسرے لڑکوں کی طرح ہوتا تو شاید یہ آنگی کے دل میں چنن کے لیئے وہ کشش بھی پیدا نہ ہوتی۔

بہار کی ایک سہ پہر میں جب آلوچوں کی شاخوں پر سفید پھولوں کی بدلیاں چھا رہی تھیں۔ قبرستان میں گھومتے گھومتے آنگی نے چنن کی آواز سُنی۔

"دادی دورماں آپ کو بُلا رہی ہیں"۔

"کیا کہتی ہیں؟"

"کہتی ہیں قبرستان میں زیادہ گھومنا کنواری لڑکیوں کے لیئے اچھا نہیں ہوتا۔ چلیئے"۔ آنگی کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ پھر پلٹ کر اپنے عقب میں کھلے ہوئے نرگسی پھولوں کے ایک بہاریں تختے کی طرف دیکھ کر بولی: "چنن وہاں سے نرگس کے پھولوں کے چند غنچے لے آؤ اور میرے بالوں میں لگا دو"۔

ایسی جسارت آمیز بات اس نے آج تک نہ کی تھی۔

چنن خاموشی سے نرگسی تختے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے پانچ پھول نرگس کی ڈنڈیوں سے توڑے۔ پانچ بڑی بڑی وحشی آنکھیں اس کی طرف دیکھتی ہوئی ـــــــ واپس آکر اس نے آنگی کو وہ پھول دیتے ہوئے کہا:

"میں نے آج تک کسی کے جوڑے میں پھول نہیں لگائے ہیں اس لیئے خود ہی لگالو انھیں"۔

اور آنگی کی آنکھوں میں آنسو اُبھرتے اُبھرتے رہ گئے۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر پھول اپنے ہات میں لے لیئے۔ پھول لیتے وقت بھی دونوں ہاتھوں کے لمس الگ الگ رہے۔ کیونکہ دونوں ہاتوں کے درمیان نرگسی پھولوں کی لانبی ڈنڈیاں تھیں۔

آنگی تیزی تیزی سے واپس گھر کی طرف چلنے لگی۔ اس نے چنن کو پیچھے چھوڑ دیا۔

ایک دن ڈاکوؤں نے سردار بلوال کے قبیلے پر حملہ کر دیا۔ رات کی تاریکی میں ان لوگوں نے کئی خیمے لوٹ لیے۔ کئی خیموں میں آگ لگا دی۔ سردار بلوال اور اس کے قبیلے کے دوسرے بکروالوں نے مقابلہ کیا۔ مگر ڈاکوؤں کا حملہ اسقدر اچانک ہوا تھا کہ سب بوکھلا گئے تھے۔

ڈاکو ڈھاٹے باندھے گھوڑوں پر چڑھ کر آئے تھے۔ وہ خیموں کو روندتے لوٹتے نکل گئے۔ بیشتر اس کے کہ سردار بلوال کو خبر ہوتی، اس کے لکڑی کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ چنن آنکھیں ملتا ملتا باہر نکل آیا۔ اسقدر افراتفری تھی کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک لاٹھی لے کر وہ بھی ڈاکوؤں پر پل پڑا۔

ایک ڈاکو جو غالباً سب کا سردار معلوم ہوتا تھا، بڑی تیزی سے حملے کیے جا رہا تھا۔ چنن کے جسم میں جانے اتنی پھرتی کہاں سے آ گئی، وہ ایک ٹیلے سے اُچک کر اس ڈاکوؤں کے سردار کے گھوڑے پر پیچھے سے سوار ہو گیا اور اس نے ڈاکوؤں کے سردار کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اتنے زور سے کھینچا کہ گھوڑا نیچے سے نکل گیا۔ اور دونوں پٹخنیاں کھاتے ہوئے ایک دوسرے کے اُوپر گرتے پڑتے نیچے زمین پر لوٹنے لگے۔ ڈاکو کا ڈھاٹا کھل گیا۔ چنن اس کے سر پر لاٹھی سے مارنے والا ہی تھا کہ اچانک ڈھاٹا کھل جانے سے وہ اُس ڈاکو کا چہرہ دیکھ کر رُک گیا۔

عین اسی وقت سردار بلوال کے گھر کی دوسری منزل سے زور کی چیخ سُنائی دی۔ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ باہر کا دروازہ جل رہا تھا۔ آگ دوسری منزل تک پہنچ رہی تھی۔ چنن نے دیکھا کہ اُوپر کے ایک کمرے کی کھڑکی کھول کر آنگی چیخیں مار مار کر نیچے کُود جانے کی تیاری کر رہی ہے۔

چنن بھاگا ہُوا آگے گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے آنگی کو نیچے کُود جانے سے روکا اور خود جلتے دروازے کے اندر چلا گیا۔ لکڑی کے زینے میں بھی آگ لگ چکی تھی۔ نچلی منزل سے ہوتا ہوا چنن اُوپر کی منزل میں چلا گیا۔ اب آگ آنگی کے کمرے میں آ چکی تھی۔ چنن نے جلدی سے بستر سے ایک کمبل گھسیٹ کر قریب رکھے ہوئے گھڑے کے پانی سے تربتر کیا اور آنگی کو وہ گیلا کمبل اوڑھا کے جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں اُٹھا لیا اور دروازے سے باہر کُود گیا۔ پھر جلتے ہوئے زینے سے کُودتا ہُوا آگ کے شعلوں کے درمیان ایک ہیولے کی طرح ناچتا، پھلانگتا اُچھلتا آنگی کو صاف بچا کر باہر لے آیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی نچلی منزل ڈھ گئی، جل کر راکھ ہو گئی، اور سردار بلوال کا سارا گھر نذرِ آتش ہو گیا۔

گیلا کمبل کھول کر اس نے آنگی کی طرف دیکھا جو اس کی بانہوں میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ ابھی تک آنگی کے ایک ہاتھ کی اُنگلیاں چنن کے ہاتھ کی اُنگلیوں میں مُڑی تُڑی پھنسی تھیں اتنی مضبوطی سے کہ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی اپنی اُنگلیاں کونسی ہیں، اور آنگی کی کونسی۔ سیاہ گیلے کمبل سے یکایک آنگی کا چہرہ یوں برآمد ہوا جیسے سیاہ بادلوں سے چاند۔ بے داغ، کہیں پر اُسے گزند نہ پہنچی تھی۔ جب ہوا کے تیز تیز جھونکے آنے لگے تو آنگی کی آنکھیں کھلیں۔ دھیرے سے پلکیں اُٹھا کر اس نے دیکھا تو اس نے چنن کا متفکر چہرہ اپنے اُوپر جُھکا ہوا پایا۔

"آنگی ــــ آنگی ــــ تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں" ــــ آنگی کمزور آواز میں بولی: "مَیں ٹھیک ہوں"۔

دھیرے دھیرے اسے ایک ٹیلے کی اوٹ میں لٹا کر وہ اپنی انگلیاں آنگی کی انگلیوں سے الگ کرنے لگا۔ مگر آنگی اپنی انگلیوں کو اس کی اُنگلیوں سے الگ کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ آدھی زمین پر آدھی اس کی گود میں پڑی ایک عجب طرب ناک لمس محسوس کر رہی تھی۔ اس کا رُواں رُواں چنن کے لمس سے سیراب ہو رہا ہے۔ دیرانوں میں پھول کِھلتے جا رہے ہیں۔ اور آرُوچوں کی ننگی شاخیں پھولوں سے لدی جا رہی ہیں اور نرگس کے پھول اس کے کانوں میں محبت کی میٹھی میٹھی سرگوشی کر رہے ہیں۔

یکایک وہی ڈاکو ان دونوں کے سر پر آ موجود ہوا، جسے چنن نے گھوڑے سے نیچے گرا دیا تھا۔

اسے اپنے سر پر آتے دیکھ کر چنن چُپ چاپ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ڈاکو آنگی کی طرف اشارہ کر کے بولا: "مَیں اسے لے جاؤں گا"۔

چنن نے ایک عجیب نگاہ سے اس ڈاکو کی طرف دیکھا

اور کہا:

"لے جا سکتے ہو، مگر میری لاش رَوند کر۔"

ڈاکو چند لمحے کھڑا چین کو گھورتا رہا۔ چین اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ ڈاکو کی آنکھوں میں آگ کے شعلے ناچ رہے تھے اور ہوا کے تیز جھونکوں میں اُس کی ڈاڑھی کے بال اُلجھ اُلجھ جاتے تھے۔

چین نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا: "مجھے مار ڈالو، پھر آنگی کو ہات لگاؤ۔"

پھر جیسے ڈاکو کی آنکھیں بجھ گئیں۔ اس نے دو اُنگلیاں مُنہ میں ڈال کر زور سے سیٹی بجائی اور وہ سیٹی سُنتے ہی حملہ آوروں نے حملہ روک دیا۔ ڈاکو یکایک پلٹ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا اور جس تیزی سے وہ لوگ آئے تھے، اُسی تیزی سے وہ لوگ واپس چلے گئے۔

چین نے آنگی کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا۔ آنگی کے بازو اسکی گردن میں حمائل تھے اور وہ اپنی ٹھوڑی پر اس کے شہد آگیں سانس کے زیروبم کو محسوس کر رہا تھا اور آنگی سوچ رہی تھی۔ وہ ڈاکو چین پر حملہ کیے بغیر کیوں چلا گیا۔ چین کے بدن کا لمس کتنا لطیف اور گوارا ہے۔ اس کے بدن سے کیسی مہک سی آتی ہے۔ کاش یہ لمس کبھی ختم نہ ہو۔ گھر جلتے رہیں اور چین اُسے بچاتا رہے۔

پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

چین نے آنگی کو سردار بلوال کے سامنے جا کر اُس کے قدموں میں ڈال دیا۔

سردار بلوال نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ دادی دورماں نے اس کا مُنہ چوما۔ رجی نے بلائیں لیں۔ قبیلے والوں نے اس کی بہادری کی تعریف کی۔ ڈاکوؤں کے سردار کو اس نے جس طرح گھوڑے سے نیچے اُتار لیا تھا، اس منظر کو بہت سے قبیلے والوں نے دیکھا تھا۔ شاید ڈاکوؤں کا سردار اس لڑکے کی بہادری سے متاثر ہو کر حملہ روک کر بھاگ گیا تھا۔

ٹوٹے ہوئے خیمے، جلتا ہوا لکڑی کا گھر۔ زخمی چین، اس کے سر کے آدھے بال جل گئے تھے۔ کنپٹی کے قریب ایک زخم آیا تھا اور بائیں جبڑے کی جِلد پر ایک بڑا آبلہ نمودار ہو رہا تھا۔ یکایک چین بے حد تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سردار بلوال کے قدموں میں گر کر بے ہوش ہوگیا۔

پانچواں باب

چند مہینوں میں سردار بلوال کا نیا مکان تیار ہوگیا۔ چیڑھ، دیودار اور بلوط کی لکڑی اس میں لگی تھی۔ یہ مکان پہلے سے بھی بڑا اور شاندار تھا۔ ان چند مہینوں میں چین کے پاؤں پر آگ کے جلنے سے جو زخم آئے تھے وہ مُندمل ہو چکے تھے۔ سر کے جُھلسے ہوئے بالوں کی جگہ نئے بال نکل آئے۔ صرف جبڑے پر جلی ہوئی جِلد کا ایک گول داغ رہ گیا۔ جس کے غائب ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔

وہ لوگ آنگن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دادی دورماں دُھوپ تاپ رہی تھی۔ آنگی تکلی پر اُون بٹ رہی تھی۔ رجی کچن میں کھٹر بٹر کر رہی تھی۔ برتنوں کے اِدھر سے اُدھر رکھنے کی آوازیں چلی آرہی تھیں۔ سردار بلوال ایک بڑے مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جس پر چیڑا چڑھا ہوا تھا۔ اور سمی نائین اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ ان دونوں سے الگ ہٹ کر چین انگوروں کی بیل کے نیچے ٹانگیں پھیلائے دیوار کا سہارا لیے اپنی گود میں ایک کتاب لیے بیٹھا تھا۔ سردار بلوال کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ اور یہ اچھا تھا۔ وہ اطمینان سے جب جی چاہے دُھوپ میں براؤن اُون کی تکلی گھمانے والی لڑکی کو دیکھ سکتا تھا۔ آنگی کو معلوم تھا کہ چین پڑھ کم رہا ہے، دیکھ زیادہ رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ خود بخود مُسکرا پڑتی، اِٹھلا کر مُنہ پھیر لیتی یا چور نگاہوں سے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھ لیتی۔

"بہت دنوں کے بعد اِدھر کا پھیرا ہوا ہے، سمی۔" سردار بلوال نے نائین سے کہا۔

"ہاں۔"

"تزسنگ قبیلے کے سردار کا بیٹا کیسا ہے؟"

"مجھے تو بالکل اچھا نہیں لگا۔" سمی نائین پاؤں دباتے دباتے ناک پر ایک اُنگلی رکھ کر بولی: "سڑے چمڑے کا سا تو رنگ ہے اس کا اور سوکھا بدن، جیسے خارش زدہ کُتا۔ چھی!"

سمی نے مُنہ پھیر کر زور سے تھوک دیا۔ پھر بٹوا کھول کر

اُس میں سے مُلاس کی ڈبیا نکال ایک چُٹکی نسوار اپنے نتھنوں میں سُڑک لی۔

سردار بلوال کو محسوس ہوا، جیسے آنگی کان لگائے اُن کی گفتگو سُن رہی ہے۔ اس نے آنگی کی طرف چلّا کر کہا، حُقّہ گرم کر کے لا، اُوپر کمرے میں رکھا ہوگا۔ آنگی تکلی پھیرتی پھیرتی گھر کے اندر چلی گئی۔ چینن کو محسوس ہُوا، جیسے سہ پہر کے سائے گہرے ہوگئے۔

آنگی کے جانے کے بعد سردار نے ایک نگاہ دادی دورماں پر ڈالی۔ وہ دُھوپ کھاتے کھاتے سوچکی تھی۔

"گندالوں کے ہاں بھی گئی تھی؟"

سردار بلوال نے پُوچھا۔

"گندالوں، ہاں گئی تھی! گندالوں کے ہاں دو لڑکے اچھے ملے، مگر ایک غریب تھا۔"

"غریب نہیں چاہیئے مجھے۔" بلوال نے جلدی سے کہا۔

"دوسرا سردار کا بڑا بیٹا ہے اور ہر لحاظ سے اچھا ہے۔"

"تم نے بات کی۔"

"ہاں کی تو ـــــ" سمّی کہتے کہتے رُک گئی اور انہماک سے سردار بلوال کے پاؤں دابنے لگی۔ "مگر"۔

"مگر کیا؟ جلدی بتاؤ۔"

"وہ لوگ بھی تمہاری شرط ماننے کو تیار نہیں ہیں۔"

"تو چار مہینوں میں یہ کام تم نے کیا ہے؟" سردار بلوال جل کر بولا۔

کیا کروں، تمہاری شرط ہی ایسی ٹیڑھی ہے۔ سرداروں کا لڑکا مانگتے ہو مگر شرط رکھتے ہو کہ گھر داماد بن کر رہے، کون مانے گا؟ سبھی لوگ عزّت والے ہیں۔ اپنے گھر میں بہُو لانا چاہتے ہیں، اپنے گھر کا بیٹا نہیں دینا چاہتے۔

"ہُوں؟" سردار بلوال نتھنے پُھلا کر زور سے پُھنکارا۔

سمّی نائین نے چور نگاہوں سے چینن کی طرف دیکھا۔ بولی:

"لڑکا تو تمہارے گھر میں موجود ہے۔ پڑھا لکھا، اتنا کہ کوئی دوسرا اتنا پڑھا لکھا نہیں ہے۔ ساتوں علم جانتا ہے۔ دلیر اتنا کہ ڈاکو کا ڈھاٹا کھول دے۔ شریف، خوبصورت کوئی اکڑ نہیں، کوئی فُوں فاں نہیں، پھر اس کا تیرے گھر پر احسان بھی ہے۔ اس نے تیری لڑکی کو بچایا ہے۔"

"ایک مجھو کے ننگے راھب سے شادی کردوں اپنی لاڈلی بیٹی کی؟ باؤلی ہوئی ہے تو نائین۔"

"لڑکا لاکھوں میں ایک ہے۔"

"خبردار جو تم نے پھر اس کا دوبارہ نام لیا۔" سردار بلوال گرج کر بولا۔

نائین سر جُھکا کے سردار کے پاؤں دابنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد چینن نے کتاب بند کی۔ اور سردار کے مونڈھے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بولا: "سردار، جس دن تیری لڑکی کو بچایا تھا، تُو نے کہا تھا، جو مانگتا ہے مانگ لے، کہا تھا نا؟"

"ہاں کہا تھا ـــــ مگر تُو نے کچھ نہیں مانگا تھا۔"

"وہ سمے نہیں تھا کچھ مانگنے کا، آج مانگتا ہوں۔"

"کیا مانگتا ہے؟ سردار بلوال بڑی درشتی سے بولا۔ وہ کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا اور جو کچھ اس کی سمجھ میں آرہا تھا، اُسے سمجھ کر اس کا لہجہ خود بخود سخت ہوتا جارہا تھا۔

"وہی مانگتا ہوں، جس کا ذکر سمّی نائین اس وقت کر رہی تھی۔"

"یہ تم کتاب پڑھتے ہو، انگور کی بیلوں کے نیچے؟ یا کان لگا کر دوسروں کی باتیں سُنتے ہو۔"

چینن چُپ رہا۔

سردار بلوال قدرے توقّف کے بعد بولا: "اور اگر تم نے سب کچھ سُن لیا ہے تو پھر میرا جواب بھی سُن لیا ہوگا۔"

"ہاں سُن لیا ہے۔" چینن بھی کڑے لہجے میں بولا: "اسی لیئے تو پُوچھتا ہوں، میرے لیئے تمہاری شرط کیا ہے۔"

سردار بلوال نے تیکھی نگاہ سے چینن کی طرف سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے ہونٹ تمیدہ ہوگئے۔ بولا: "دوسروں کے لیئے دوسری شرطیں ہیں۔ تمہارے لیئے بس ایک ہی شرط ہے۔"

"سونے کے سِکّوں سے بھری ایک دیگچی۔"

"کیا؟" چینن حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"ہاں، سونے کے سِکّوں سے بھری ایک دیگچی لادو، تمہاری مُراد پُوری ہوجائے گی۔" کئی لمحوں تک چینن

خاموش کھڑا سردار بلوال کو گھورتا رہا۔ یکایک اس کے جبڑے تن گئے۔ بڑے مضبوط لہجے میں بولا: "دو سال دیتے ہو؟"

"دو سال؟" سردار بلوال نے پوچھا۔

"ہاں صرف دو سال چاہئیں۔ آج میں ابھی اس گھر سے رخصت ہوتا ہوں اور دو سال بعد اس گھر میں اُس وقت قدم رکھوں گا جب تمہاری شرط پوری کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" سردار بلوال نے لڑکے کے پاگل پن پر ہنس کر کہا: "میں دو سال انتظار کر لوں گا۔"

چین اُسی حالت میں آنگن کے بڑے دروازے سے باہر جانے لگا۔

سردار بلوال نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"مگر تم جا کہاں رہے ہو؟"

"سونے کی دیگچی لانے!"

چین نے اتنا کہا اور پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ آنگی سے نہیں ہلا۔ اس نے اپنا بستر ساتھ نہیں لیا۔ کوئی کتاب ساتھ نہیں لی، جس کپڑوں میں تھا، اُنہی کو پہنے ہوئے اُسی وقت سردار بلوال کے گھر سے نکل گیا۔

چھٹا باب

ڈھائی سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ جب چین، لوٹ کر شاہ بلوط کے معبد خانے میں آیا۔ وہ نیچے سردار بلوال کے گھر نہیں گیا۔ بلکہ سیدھا معبد خانے میں آکر چپ چاپ راکو دیوتا کی شبیہہ مبارک کے سامنے سجدہ کرنے لگا۔ ان ڈھائی سالوں میں وہ بہت دبلا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور ان میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ پیشانی پر سوچ اور فکر سے کئی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔ اور جبڑے کا گول داغ جامنی رنگ کا سا ہو چلا تھا جو اس کے چہرے کے بادامی رنگ پر عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔

جب وہ خاموشی سے سجدہ کر رہا تھا۔ تو ایک کونے میں چند راہب اُسے دیکھ کر اور پہچان کر چونک گئے اور دھیرے دھیرے سرگوشیوں میں اس کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

ایک نئے راہب نے جس کا نام پولتن تھا، کولات سے پوچھا:

"یہ نوجوان کون ہے؟ اسے میں نے پہلی بار یہاں دیکھا ہے۔"

"تم نئے آئے ہو۔ یہ ڈھائی سال پہلے یہاں اِس معبد خانے میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ پھر ایک دن یکایک غائب ہو گیا۔"

ڈاگر کہنے لگا: "بے حد ذہین لڑکا ہے۔ چند ماہ میں اس نے ژند کے ڈیڑھ سو صفحے اَزبر کر لیئے تھے اور تیرہ مقدس پارچہ جات میں سے نو کا مطالعہ ختم کر لیا تھا۔"

سوما کہنے لگا: "مگر کہاں کا رہنے والا ہے یہ؟"

"یہ کوئی نہیں جانتا۔" ڈنجی بولا: "یہ یہیں پر تھا، پھر یہ چلا گیا۔ ایک بار جب مقدس کاہن سوساشاہ یہاں آیا تھا وہ اس کی بہت تعریف کرتا تھا۔ کہتا تھا یہاں سے جاکر یہ کچھ مہینے سوساشاہ کے مدرسے میں بھی رہا تھا۔ اور ہفتے میں پانچ دن فاقہ کرتا تھا، اور سب مقدس پارچہ جات اَزبر کر لیئے تھے۔"

کولات نے آہستہ سے سرگوشی کی: "میں نے سُنا ہے، اس نے کبالا بھی پڑھا ہے۔"

"کبالا کیا؟" نئے راہب نے پوچھا۔

"کالے علم کو کہتے ہیں۔" کولات نے سمجھایا۔ "سُنا ہے، یہ کالے علم کا ماہر ہو چکا ہے۔ اِسی وجہ سے سوساشاہ کاہن نے اسے اپنے مدرسے سے نکال دیا۔ پھر یہ دَر بدر پھرتا رہا۔ دُور دراز کے قبیلوں سے اس کی خبریں آتی تھیں۔ سُنا ہے لوگ اس سے تعویذ گنڈے مانگنے لگے تھے۔ مگر اس نے ہمیشہ انکار کر دیا۔"

نئے راہب نے چین کی طرف نئی نظروں سے دیکھ کر سرگوشی کی۔ "ہو سکتا ہے، یہ کوئی مقدس ہستی ہو، جو اس پھٹے چوغے میں دھوکا دینے کے لیئے گھومتی ہو۔ اس کے متعلق زیادہ باتیں کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ چلو سو جائیں، رات بڑھ رہی ہے۔ اور سردی بھی۔ اس وقت کہیں سے دو گھونٹ سیگی شراب کے مل جائیں تو سردی دُور ہو سکتی تھی۔"

چاگر نے زیر لب ہنس کر دھیرے سے کہا: "اس چین سے

کہو' اپنے کالے علم سے ہمیں ایک مشکی بیگی کی عنایت کر دے۔"

"صبح آدھی روٹی مکئی اور گھنھار کا ساگ کھایا تھا قسم لے لو، جو اس کے بعد ایک کھیل بھی مُنہ میں اُڑ کر گئی ہو۔ نیند کہاں سے آئے گی۔" نیا راھب بولا۔

ڈاگر بولا: "صبر کرو، تھوڑی دیر اور انتظار کرو۔ مَیں نے سُنا ہے کہ سردار بلوآل اپنی اکلوتی لڑکی کا رشتہ کہیں پر طے کرنے ہی والا ہے۔ اور مَیں اُسے جانتا ہوں۔ وہ کھلے دِل کا سردار ہے۔ اِس موقع پر بہت بڑی دعوت کرے گا۔

"ارے چھوڑو بھی" کولات بیزار ہو کر بولا: "وہ کیا دعوت کرے گا۔ مَیں اُسے جانتا ہوں۔ اسے کوئی لڑکا پسند نہیں آتا۔ تین چار بار وہ دوسرے قبیلوں کے سرداروں کے ہاں جا جا کر لڑکے دیکھ دیکھ کر واپس آ گیا ہے۔ کہیں پریتمی نائین کچھ طے کرتی ہے تو اسے بھی ناپسند کر دیتا ہے۔ کبھی اسے لڑکا پسند نہیں آتا۔ کبھی خاندان، کبھی قبیلہ، دماغ پھر گیا ہے سردار بلوآل کا —— اسے کوئی لڑکا پسند ہی نہیں آتا۔

سردار بلوآل جمدیال قبیلے کا سردار ہے۔ چاکر کہنے لگا:

"جو بکروالوں کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ سردار بلوآل سب سرداروں میں سب سے امیر اور شان و شوکت کو پسند کرنے والا ہے۔ وہ کسی ایسے ویسے کے گھر اپنی لڑکی کیوں دے گا۔ وہ' گھر داماد لانا چاہتا ہے۔"

"مگر داماد لانے کے اور بھی طریقے ہیں۔" کولات نے کہا۔

"کون سے؟"

کولات اپنے خُشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا:

"پُرانے زمانے میں جب کوئی امیر بکروال یا سردار اپنی لڑکی کے لیئے شوہر تلاش کرنے نکلتا تھا۔ اور کسی اچھے لڑکے کو گھر داماد بنانا چاہتا تھا۔ تو وہ کسی بڑے گھر کا مُنہ نہیں دیکھتا تھا۔ کسی امیر سردار کے دروازے پر نہیں جاتا تھا بلکہ خود کسی مڑ سے یا راھب خانے میں آ کر نوجوان راھبوں کو دیکھتا تھا' اور ان میں سے کسی نوجوان خوبصورت پڑھے لکھے وجیہہ' باوقار اور پاکیزہ اطوار والے راھب کو پسند کر لیتا تھا۔ اور اس سے اپنی لڑکی کی شادی کر کے اسے اپنا گھر داماد بنا لیتا تھا۔

چاکر نے اپنی ٹھوڑی پر اُنگلی رکھ کر کہا: "وہ اِس راھب خانے سے کسی کو چُن سکتا تھا۔"

"کیسے؟" ڈنجی نے پُوچھا۔

"ایسے ہی فرض کر رہا ہوں"۔ کولات بولا۔

ڈاگر نے کہا: "ایسے فرض کرنے سے کیا فائدہ؟ ہمیں اپنے قبیلے کے سردار کے بارے میں ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

یکایک معبد کا دروازہ کُھلا۔ اور ایک بوڑھی عورت دو بچوں کو لے کر داخل ہوئی۔ اس کے بال اُلجھے اور پریشان تھے۔ اور دونوں لڑکوں کے دَم بھی پھُولے ہوئے تھے۔

بوڑھی عورت کے اشارہ کرنے پر اُن دونوں بچّوں نے جو سامان اُٹھایا ہوا تھا۔ وہ اُنھوں نے راکو دیوتا کے قدموں میں رکھ دیا اور اس کی بارگاہ میں جُھک گئے۔ بوڑھی عورت نے بھی اپنے دائیں ہات میں اُٹھائی ہوئی مشکی کو نیچے زمین پر رکھا۔ اور ہات جوڑ جوڑ کر بین کرنے لگے۔

پاک اور مقدّس راکو۔ ان دونوں بچّوں کو دیکھ۔ ان کی بیمار اور مَرتی ہوئی ماں کو بچا لے۔ مَیں تیرے دربار میں ان دو معصوموں کو لے کر حاضر ہوئی ہوں، ان پر رحم کر۔ میرے خاندان پر رحم کر۔

یکایک وہ عورت اُونچی آواز میں رُوتے ہوئے کہنے لگی "دو دِن سے وہ موت اور زندگی کی کش مکش میں مُبتلا ہے، اس پر رحم کر نہیں تو مَیں —— سارا جہاں تلپٹ کر دوں گی، راکو دیوتا!"

بوڑھی عورت نے چھاتی پیٹی اور قہر بھری نگاہوں سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔

"دھیرج" —— کولات بولا: "مائی، صبر کرو' اور گستاخی سے بات کرنے کے بجائے رحم کرنے کو کہو۔"

ڈاگر بولا: "ہم سے کہو، ہم لوگ رات بھر جاگ کر اس کے لیئے دُعا کریں گے۔"

"تیرہ مقدّس پارچہ جات پڑھو گے؟ بوڑھی گوراں نے پوچھا۔ تیرہ تو نہیں پانچ پڑھیں گے۔ رات بھر میں پانچ سے زیادہ نہ پڑھے جائیں گے۔"

بوڑھی گوراں نے بھیگی شراب کی مشکی کولات کے حوالے کی اور راکو دیوتا کے قدموں میں رکھا ہوا سامانِ خور و نوش

جو مکئی کی آٹھ روٹیوں اور اچار، اور پنیر پر مشتمل تھا۔ وہ بھی راہبوں کے حوالے کرتے ہوئے جیب سے دو روپے نکال کے کہا:

"یہ لو دو روپے، رات بھر دُعا کرنے کے۔"

پھر وہ اپنے پوتوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "چلو، دُعا کا بندوبست ہو گیا، چلو اب گھر چلیں۔"

جب بڑھیا گوراں بچوں کو لے کر چلی گئی تو ڈاگر نے کہا۔

عجیب بات ہے آج صبح ایک عورت آئی تھی جس کی لڑکی دو روز سے دردِ زہ میں مبتلا ہے اور اس کے بچہ پیدا نہیں ہوتا، اور آج رات کو یہ عورت آئی جس کی بہو موت کے سایوں میں ڈوب رہی ہے۔

"اس میں عجیب بات کیا ہے۔" نئے راہب نے پوچھا۔

ڈاگر بولا: "جب کسی مرنے والے کی رُوح جو ابھی مرا نہیں، کسی ایسے دوسرے جسم میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔ تو ایک عجیب کشمکش ہوتی ہے۔ مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ ایسے موقع پر اگر بیمار مر جائے تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے، اور اگر دوسری صورت میں بیمار بچ جائے۔ تو دوسری جگہ بچہ مُردہ پیدا ہوتا ہے۔ ایسا مقدس کتابوں میں آیا ہے۔"

"ارے جانے دو۔" کولات بولا: "آجکل کون دھیان دیتا ہے ایسی باتوں پر، لوگ اندھے ہو چکے ہیں۔ حیرت انگیز باتیں ہر روز ہوتی ہیں۔ مگر کون سُنتا ہے۔ کس کے پاس آنکھیں ہیں جو انھیں دیکھے۔"

نئے راہب کی آنکھیں شراب کی مٹکی پر لگی تھیں۔ اِس بڑھتی ہوئی سردی میں ہم نے مقدس راکو سے شراب کی مٹکی مانگی تھی۔ سو مل گئی۔ کھانے کو بھی بہت کچھ مل گیا۔ اب آؤ سب مِل کر بیمار کے حق میں دُعا کریں۔ بے چاری ٹھیک ہو جائے۔

"چلو مدرسے کے اندر۔" سوما بولا: "وہیں پہلے کھائیں پئیں گے، بعد میں دُعا کریں گے، ابھی بہت رات باقی ہے۔"

سب راہب ہنستے ہوئے شاہ بلوط کے معبد سے رخصت ہو کر قریب کے لکڑی کے گھر میں چلے گئے۔ جو اُن کا مدرسہ تھا اور رہنے کی جگہ بھی تھی۔ شراب اور کھانے کا سامان وہ ساتھ لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد چینن کا سر

سجدے سے اُٹھا۔ اس نے سیاہ مخمل بارہ سنگھوں والے پردے کو ہٹا کر راکو کی شبیہہ کو دیکھا اور سامنے لکڑی کے تخت پر پڑے ہوئے اپنے بزرگوں کے تیرہ مقدس پارچہ جات کو گِنا۔ جن میں ان کے قبیلے کی دانش پنہاں تھی۔ وہ دھیرے دھیرے مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑانے لگا۔ "کھُل جائے وہ بھید کا دروازہ؟ مگر کیسے کھُلے۔۔۔ سامنے تیرہ مقدس پارچہ جات ہیں، ہر لفظ ازبر ہے، مگر ہر لفظ ایک گورکھ دھندہ ہے۔ جو ظاہر کے معنی ہیں، باطن کے خفتہ معنی کو چھپائے بیٹھا ہے اور کسی طرح اپنا راز اُگلنے پر تیار نہیں۔ ڈھائی سال سے سر ٹیک رہا ہوں۔ مگر وہ کُنجی نہیں ملی، جو بھید بتا دے۔

کہنے کو یہ تیرہ پارچہ جات ہیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ، بارہ، تیرہ ——— تیرہ مقدس بھی اور نحوست والے بھی، سچ بھی، اور پھسل جائے تو جھوٹ بھی۔ آنگی کے نام کے تین حرف ہوتے ہیں، اور میرے نام کے بھی تین۔ اور تین کو تیرہ سے ضرب دو تو انتالیس ہوتے ہیں۔ حالانکہ میرے سامنے صرف چھتیس کا ہندسہ گھومتا ہے صرف تین مجھ سے باہر ہیں۔ وہ تین کون سے؟ آنگی کے۔۔۔۔ آنگی ہے۔۔۔ آنگی۔ آناں گی ناں آئے گی۔۔۔۔ کتنا خوفناک خیال ہے؟

کولات یکایک مدرسے سے شاہ بلوط کے معبد میں آیا۔

اور بڑبڑاتے چینن کو دیکھ کر بولا: "کیا سوچتے رہتے ہو ہر وقت، تمہاری آنکھوں میں کیسے خواب جاگتے ہیں۔ چلو اندر چلو، ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤ۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"سُنا ہے تم ہفتے میں پانچ دن فاقہ کرتے ہو۔"

"کبھی پانچ دن، کبھی چھ دن۔ کبھی ہفتے کے ہفتے فاقہ کر لیتا ہوں، بھوک ہی نہیں لگتی۔"

"تمہیں ہُوا کیا ہے، تم کیسے راہب ہو، تمہارے ہاتھ میں کوئی کتاب تک نہیں ہے۔"

"کسی کتاب میں کیا رکھا ہے؟"

"قانون۔۔۔۔ زندگی کے، عمل کے، فلسفے کے۔"

"سب خشک اور بے کار ہیں ہماری دُنیا کی کتابیں۔"

چینن جوش سے بولا: پھر کولات کی طرف ایک گہری نگاہ ڈالتے ہوئے بولا:
"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہماری زمین کی گہرائیوں میں ایک دوسری دُنیا آباد ہے' بالکل ایسی جیسی ہماری دُنیا ہے۔ اسمیں بھی وادیاں اور پہاڑ، جنگل اور ندیاں' دریا اور آبشار' شہر اور گاؤں، صحرا اور کھیت۔ اس دُنیا میں بھی ایسے ہی جھکّڑ اور طوفان چلتے ہیں۔ برف گرتی ہے اور خطرہ ہر سمت محسوس ہوتا ہے۔ صرف ایک بات میں وہ دُنیا ہم سے الگ ہے۔ وہاں کوئی آسمان نہیں ہے، اِس لیئے کوئی گرمی برسانے والا کوئی سورج نہیں دِکھتا ہے۔

بس ایسی ہیں تمہاری کتابیں اس دُنیا کی۔ یہ اور ان کے قانون اور ان کے الفاظ اپنی زنجیروں سے، ہمیں باندھ کے اس دُنیا میں رکھتے ہیں۔ مگر اُڑنے نہیں دیتے۔ مگر کبالے کا کالا علم' کالا علم، وہ جادو ہے جو رُوح کو اِس دُنیا سے آگاہ کر کے بے کراں خلاؤں میں اُونچا اُڑنے دیتا ہے۔ جہاں فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ وہاں ---- وہاں ---- میرا سَر دُکھ رہا ہے' مجھ میں طاقت نہیں رہی"۔

کولات کہنے لگا: "وہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ان بلند خلاؤں میں پرواز کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ایک لمحے میں انسان اُوپر ہے اور سورج اور مہتاب سے اُوپر، دوسرے لمحے میں غلیظ ترین پستیوں میں اُتر جاتا ہے۔ کالے علم کے پاس کوئی تقدیس نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اُوپر کی خلاؤں ہی میں ہمیں رکھتا ہے۔ لیکن ہماری مقدس کتابیں ہمیں آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ اُوپر لے جاتی ہیں، سیدھے راستے پر۔

اور جہاں تک کالے علم کا تعلق ہے، شوپان کاھن نے ہمیں بتایا تھا اور تمہیں بھی۔ وہ کہانی یاد کرو، چار آدمی --- راکو دیوتا کو ڈھونڈنے نکلے --- پہلے نے باہر دیکھا' اور مر گیا۔ دوسرے نے اندر دیکھا، اور مَر گیا۔ تیسرے نے سب مقدس خواتین سے انحراف کیا اور پاگل ہوگیا، صرف چوتھا کتاب لے کر اندر گیا اور شبیہہ مُبارک لے کر ساتھ آیا۔

مجھے یہ پہیلیاں مت سُناؤ۔ تم نہیں جانتے وہ کس علم کے راستے گئے تھے، کب اور کیسے، اور کیا لے کر گئے تھے ممکن ہے وہ اس لیئے ناکام رہے ہوں کہ وہ کچھ پانے کے لیئے گئے تھے۔ اپنی قربانی دینے کے لیئے نہیں گئے تھے' جیسے کاھن تولان گیا تھا۔

"کیا تم اپنا مقابلہ کاھن تولان سے کرنے چلے ہو؟" کولات نے حیرت زدہ ہوکر چینن سے پوچھا۔

چینن بولا: "مَیں اپنا مقابلہ کسی سے نہیں کرتا۔ مَیں بس اپنے راستے پر جاتا ہوں"۔

"کیسا راستہ ہے تمہارا؟"

"تم نہیں سمجھو گے"۔

"مَیں سمجھ لوں گا، میرا دل بھی بلندیوں کی طرف پرواز کرنا چاہتا ہے"۔

چینن نے کچھ دیر توقف کیا۔ پھر بولا: "ہمارے پاکیزہ لوگ دن رات انسانی رُوحوں کی صفائی میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ان رُوحوں سے گُناہ کی گندگی دُور کر کے اُنھیں اپنے عرفان کی جلا سے چمکا دیتے ہیں۔ مگر ان کا کام بڑا مُشکل ہے۔ کیونکہ گُناہ ہر دراڑ میں سے جھانکتا ہے۔ ایک رُوح صاف نہیں ہوتی کہ دوسری گندی رُوح اس کی جگہ لینے کو آجاتی ہے۔ ایک نسل ٹھیک نہیں ہوتی کہ دوسری نسل پہلی سے زیادہ احمق اور گنہگار آن موجود ہوتی ہے۔ گُناہ بڑھتا جاتا ہے اور تقدس کم ہوتا جاتا ہے۔

"تو تمہارے خیال میں اس کا علاج کیا ہے؟"

"گُناہوں کو دھونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گُناہوں کو صرف جلا دینا چاہیئے، جیسے سُنار اپنی بھٹی میں سونے کو جلا کے اسے صاف کرتا ہے' ایسے ہی گُناہ کو نفس کی بھٹی میں ڈال کر اس کی گندگی کو جلا دینا چاہیئے۔ جو باقی رہے گا' وہ مقدس ہوگا"۔

"گُناہ مقدس ہوگا، کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"راکو دیوتا نے ہر شئے پیدا کی۔ اِس لیئے ہر شے میں اس کا تقدس موجود ہے۔ مگر گُناہ کو راکو نے پیدا نہیں کیا۔ گُناہ کو شیطان نے پیدا کیا۔ تو شیطان کو کس نے پیدا کیا؟" چینن نے برافروختہ ہوکر پوچھا۔ راکو نے۔ اس لیئے شیطان بھی راکو کا ایک حصّہ ہے' اور اگر وہ راکو کا ایک حصّہ ہے تو اس کے اندر بھی تقدس موجود ہے۔

شیطان کے اندر تقدس ---؟ کولات بالکل حیرت زدہ

دکھائی دے رہا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکا۔ مجھے سوچنے دو۔

چینن اس کے قریب جا کر بولا: "کون گناہ سب سے طاقتور ہے؟ ــــ کون گناہ تقریباً ناقابلِ تسخیر ہے؟ ایک عورت کی خواہش ... ہے نا؟"

کولات نے اپنا سر اُٹھائے بغیر کہا: "ہاں!"

"لیکن جب تم اس گناہ کو اپنے باطن کی بھٹی میں جلا کر صاف کر لیتے ہو تو یہی گناہ کندن بن جاتا ہے اور ایک مقدس جذبے سے سرشار ہو کر چمکنے لگتا ہے۔ او میرے محبوب ... تجھ سے سُندر مکھڑا کسی کا نہیں ہے۔ تیری آنکھوں میں غزال کی سی نرمی ہے، تیرے بالوں میں ریشم کا سا سونا، تیری باہیں سیب کی ڈالیاں ہیں اور آواز شہد کے چھتے کی گونج ہے۔ کہاں ہو تم میری محبوب؟"

چینن بلند آواز میں بولتا ہوا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

"ششش" یکایک کولات نے اس سے کہا: "چپ ہو جاؤ۔ سردار بلوال کی لڑکی آنگی آ رہی ہے۔" آنگی کو دیکھ کر چینن کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنگی بھی اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے چونک پڑی پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور اپنی دادی سے بولی:

"دادی دورماں، تم نے کہا تھا تم مجھے راکو دیوتا کے حضور میں رکھے جانے والے بہت پرانے پردے دکھاؤ گی۔"

چینن آنگی کو دیکھتا ہی جا رہا تھا، جیسے وہ بے بس اور مسحور ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھیں آنگی کے چہرے پر گڑی تھیں۔ کبھی کبھی وہ پلکیں جھپکا لیتا۔ پھر دیکھنے لگتا۔ کوئی دوسرا غور سے دیکھنے والا ہوتا تو اُسے محسوس ہوتا، جیسے چینن کو دم بہ دم نشہ سا چڑھ رہا ہے۔

دادی دورماں نے کولات سے کہا: "ایک دفعہ راجہ صاحب نے جو ہمارے مذہب کے نہیں ہیں، بیمار ہونے پر ہمارے دیوتا کے حضور میں منت مانی تھی اور سونے کے کام کے پردے نذر میں چڑھائے تھے۔"

کولات بولا: وہ تو بہت پرانا قصہ ہے، کوئی سو برس سے بھی زیادہ ہو گئے، پچھلے راجہ صاحب کا قصہ ہے۔"

"... ہاں وہی وہی" دادی دورماں آہستہ سے بولی: "وہی پردے میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک دفعہ دیکھے تھے۔ وہی پردے تم اس کو بھی دکھا دو۔ یہ لڑکی ویسے ہی پردے بنائے گی، اور اپنی ماں کی برسی پر ان پردوں کی نذر چڑھائے گی۔ سچے سونے کے تاروں کا کام ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے شیر اور عقاب کی تصویریں اور جب بڑھیا مخمل کے وہ پردے یہاں راکو دیوتا کے قدموں میں پہنچیں گے تو اس کی ماں اوپر جنت سے اس کے لیے دُعائیں بھیجے گی۔"

اِس اثنا میں آنگی نے ایک بار پھر آنکھ اُٹھا کر چینن کی طرف دیکھا، اور جب اسے اپنی طرف مبہوت نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا تو اس کی نگاہیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔ اور رخساروں پر ہلکی سی سُرخی چھانے لگی۔ مارے شرم کے وہ پھر نگاہیں اُونچی نہ کر سکی۔

"ابھی لے کر آتا ہوں" کولات بولا: "اتنا کہہ کر وہ آنگی کی طرف غور سے دیکھتا ہوا ــــ پردے لانے کے لیے مدرسے کے اندر گیا۔ جہاں چڑھاوے کا سامان رکھا رہتا تھا۔ ایک بڑے صندوق کو کھولنے لگا جس میں تالا پڑا تھا۔

دادی دورماں نے آنگی سے پوچھا: "تمہیں آج رات کے سمے شاہ بلوط کے معبد میں آتے ہوئے ڈر تو نہیں لگا؟"

آنگی بولی: "میں رات کو کبھی یہاں نہیں آتی سوائے راکو دیوتا کے جنم دن پر۔ مگر اس رات تو دعوت ہوتی ہے یہاں اور سب مل کر ناچتے ہیں اور بہت سی روشنیاں ہوتی ہیں۔ وہ رات تو بڑی چمکدار ہوتی ہے۔ مگر آج اِس سمے یہ۔ اس معبد میں کتنی خاموشی اور اُداسی ہے۔"

دادی دورماں، ایک عجیب ڈھنگ سے ہنسکر بولیں:

"خاموشی اور اُداسی کیوں نہ ہو۔ یہاں آدھی رات کو مرے ہوئے لوگوں کی رُوحیں آتی ہیں۔ راکو کے قدموں کو چھُو کر واپس چلی جاتی ہیں اور اپنے سب غم یہاں چھوڑ جاتی ہیں۔ اس لیے یہ معبد اس قدر اُداس ہے۔"

"مرے ہوئے لوگوں کی بات مت کرو۔ دادی دورماں، مجھے ڈر لگتا ہے۔" آنگی نے آہستہ سے کہا۔

دادی دورماں ذرا اُونچا سُنتی تھیں۔ اس لیے آنگی کا فقرہ نہ سُن سکیں۔ آنگی کو ان کی ہنسی بڑی عجیب اور بُری محسوس ہوئی۔ اس ہنسی کے اندر موت سے گہری واقفیت کا تجربہ موجود تھا جو اکثر بوڑھوں میں پایا جاتا ہے اور جو انہیں غم کے احساس سے نا آشنا کرتا جاتا ہے۔

یہ شاہ بلوط کا معبد کتنا پُرانا ہوگا؟ آنگی نے پوچھا۔

"کتنا پُرانا؟ ___ میری بچی۔ یہ معبد بہت پُرانا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ معبد اور یہ پیڑ اُس وقت بھی دھرتی کے اندر موجود تھا، جب دھرتی کے باہر کچھ نہیں تھا۔ اس دُنیا میں کتنے طوفان آئے، زلزلے آئے، برف باریاں ہوئیں، مگر یہ پیڑ اور اس کا معبد صدیوں سے جُوں کا تُوں موجود ہے۔ پاک اور مقدس داکو کی مہربانی سے۔"

کیسی اُداسی ہے یہاں پر، اور کتنا حُسن۔ آنگی پیڑ کے چاروں طرف دیکھ کر بولی: "میرا جی یہاں سے ہٹنے کو نہیں چاہتا۔ میرا جی چاہتا ہے، مَیں اس پیڑ کے تنے سے باہیں پھیلا کر ایک بیل کی طرح لپٹ جاؤں۔ اس معبد سے مجھے روتے ہوئے خوابوں اور اُداس دِلوں کی خوشبو آتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے، میرا جی چاہتا ہے ـــ جانے میرا جی کیا چاہتا ہے، مگر میرا دل اندر سے آنسوؤں سے بھر گیا ہے۔"

اتنے میں کولات اپنے دونوں ہاتھوں میں بھوری مخمل کے بھاری کام کے پردے اُٹھائے لے آیا۔ یہ پردے جو داکو دیوتا کے جنم دن پر اُس کی شبیہہ کے سامنے لگائے جاتے تھے۔ کولات انہیں دکھاتے ہوئے بولا: "یہی وہ پردے ہیں کوئی سو برس سے بھی پُرانے۔ اور بڑے راجہ صاحب کی طرف سے نذر کیئے گئے تھے۔ یہ صرف داکو دیوتا کی سالگرہ پر استعمال ہوتے ہیں۔"

اس وقت تک رجی، دادی دورماں اور آنگی کے پیچھے پیچھے کھڑی تھی۔ چُپ چاپ، خاموش۔ مگر ان خوبصورت پردوں کو دیکھتے ہی خوشی کی ہلکی سی چیخ مار کر سامنے آگئی۔ اور پردوں کو چھُو کر اور دوزانو ہو کر بولی۔

ہائے کتنے اچھے پردے ہیں۔ کتنی گہری اور موٹی مخمل ہے، دبیز اور یہ دو شیر سونے کے تاروں کے بنے ہوئے۔ کتنا بھاری کام کا ہے۔ اور یہ ننھے ننھے کبوتر اور کبوتریاں دونوں طرف پھڑپھڑاتی ہوئی۔ آجکل نہ ایسا سونا ملے، نہ ایسا کام کہیں دکھائی دے۔

"یہ پردہ بھی بڑا اُداس ہے۔ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔" آنگی نے پردے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ پھر اپنے لبوں سے چُوم لیا۔ پھر کچھ جھجک کر شرما گئی، جب رجی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اتنے آہستہ لہجے میں کہا تا کہ دادی دورماں نہ سُن لیں۔

"ایک دُبلا پتلا لڑکا ہے، نوجوان ___ نہیں ___ جب سے آئی ہو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔" آنگی نے آہستہ سے اُسے بتایا۔

"وہ چینن ہے، تو بھول گئی اسے دو ڈھائی سال ہوئے اس مدرسے میں پڑھنے کے لیئے آیا تھا اور ہمارے گھر پر ٹھہرا تھا۔"

"آں؟ ـــ ہاں!" ___ یکایک رجی نے اُسے پہچان کر کہا:

"مگر کتنا دُبلا ہو گیا ہے اور ماتھا بھی اس کا کتنا چوڑا ہو گیا ہے۔ شاید سوچ سوچ کر۔" پھر ایکدم ہنس کر بولی: "مگر کیسے مُڑ مُڑ کر تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں، جیسے تمہیں بُلا رہی ہوں، شاید وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے، مگر ڈرتا ہے۔"

"ہاں" آنگی بولی: "بہت زرد رُو اور اُداس ہو گیا ہے جانے اتنے دن کہاں رہا۔ مجھے تو بیمار بھی لگتا ہے۔"

"بیمار نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں چمکتی ہیں۔"

"وہ ہمیشہ سے چمکتی تھیں۔" آنگی دھیرے سے بولی: بہت اچھی آنکھیں پائی ہیں اس نے۔ اور جب وہ مجھ سے بات کرتا تھا تو بات کرتے کرتے رُک جاتا تھا۔ اور مَیں بھی اس سے بات کرتے کرتے یکایک چُپ ہو جاتی تھی۔ مگر شاید کسی لڑکی کا کسی لڑکے سے یُوں بات کرنا مناسب نہ ہو۔"

یکایک دادی دورماں بولیں: "میرے خیال میں اب چل دینا چاہیئے۔ سردی بڑھ رہی ہے، رات تاریک ہوتی جارہی ہے۔"

"جانے سے پہلے ان پردوں کو ایک بار پھر چُوم لوں۔ جی چاہتا ہے۔" آنگی نے کولات سے پوچھا۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" دادی دورماں بولیں:

"مگر ہم نے تو ابھی اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا تک نہیں ___ آہ، رجی ـــ پہلے تم ـــ"

رجی دوزانو ہو کر پردے چُومنے لگی۔ پھر دادی دورماں جھک کر پردے چُومنے لگیں۔ اس دوران آنگی وہاں سے ہٹ کر چینن کے قریب آکر بولی:

"چینن تم کب آئے۔"

" آج ہی "

" اتنے دن کہاں رہے ؟ "

وہ کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ دادی دورماں آنگی کی طرف دیکھ کر بولیں : " لو اب تمہاری باری ہے "

آنگی دوزانو ہو کر پردے چومنے لگی ۔ اپنے سینے سے لگا کر، آنکھوں سے لگا کر، ہونٹوں سے بار بار انتہائی شدّت کے عالم میں ان پردوں کو چومتی گئی ۔ حتّٰی کہ دادی دورماں کو اُسے روکنا پڑا ۔ " بس، بس، مقدّس پردوں کو زیادہ عرصے تک نہیں چومتے بیٹی، یہ بہت متبرک چیز ہے ۔ ان پردوں پر جو کاڑھا گیا ہے وہ سونے کا ہے، لیکن جو لکھا گیا ہے وہ نظر نہیں آتا ۔ "

" کیوں نظر نہیں آتا ؟ " آنگی نے پوچھا ۔

" کیوں کہ وہ سفید آگ کے اُوپر کالی آگ سے لکھا گیا ہے، مخمل کے اندر ۔ اس لیے کسی کو اندر سے نظر نہیں آتا ۔ چلو، بچّو ____ اب یہاں سے چلدو ۔ "

دادی دورماں آنگی اور رجی کو لے کر چلی گئیں ۔ چین گویا آنگی کے قدموں کی آخری چاپ اپنی رُوح کے اندر جذب کرتا گیا ۔ دھیرے دھیرے بُڑبُڑانے لگا ۔۔۔ " تیرے ہونٹوں کے گلاب ۔۔۔ تیرے ہونٹوں کے گلاب ۔۔۔۔

" چین ! تم کیا کہہ رہے ہو ؟ " کولات نے پوچھا ۔

چین نے کوئی جواب نہ دیا ۔

کولات نے اس کی پیشانی کو ہاتھ لگا لیا ۔ چین کی پیشانی پسینے سے گیلی تھی ۔ کولات نے حیرت زدہ ہو کر کہا ۔ " اس سردی میں پسینہ، اتنی گرمی کہاں سے آئی ؟ کیا تم کالے جادُو کی دُنیا میں چلے گئے تھے ۔

" ہاں " چین نے بڑی مضبوطی سے کہا ۔

" کیا تم کالے علم کے سب راز جانتے ہو ؟ اس کی ساری رسمیں پُوری کرتے ہو جو تنتر بدیا کی کتاب میں لکھی ہیں ۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا ۔ "

" ہاں ۔ "

" اور تم سات دنوں میں پانچ دن فاقہ کرتے ہو ۔ "

" کبھی ساتوں کے ساتوں دن فاقہ کرتا ہوں ۔ مجھے اب بُھوک نہیں لگتی ۔ بُھوک کی خواہش بھی نہیں رہی " چین نے کمزور لہجے میں کہا ۔

" یہ سب کچھ تم کیوں کرتے ہو ؟ تمہیں کیا مل جائے گا، کیا کرنا چاہتے ہو تم ؟

" میں ایک ہیرا پانا چاہتا ہوں ۔ صاف اور چمکدار، جسے میں اپنے آنسوؤں میں پگھلا کر اس کی مہک کو اپنی رُوح کا مرکز بنا لوں ۔ میں حُسن کی ساتویں منزل پر پہنچ کر اُس کا دیدار کرنا چاہتا ہوں ۔ میں " ۔۔۔۔

یکایک چین رُک گیا ۔ اور بیزار ہو کر گہری شدّت سے بولا :

" میں سونے کے سکّوں سے بھری ایک دیگچی چاہتا ہوں، اپنے لیے نہیں ۔ کسی ایسے آدمی کو دینے کے لیے جو صرف سونے کے سکّوں میں گِن سکتا ہے " !

کولات نے شک و شبہات بھرے لہجے میں کہا : " چین، چین، تم غلط راستے پر جا رہے ہو، دُنیا کی کوئی مقدّس طاقت تمہیں یہ طاقت نہیں دے سکتی ۔ "

چین نے جسارت آمیز لہجے میں کہا ۔ اور اگر مقدّس طاقتوں نے میری مدد سے انکار کر دیا، تو میں کیا کروں ؟

کولات نے خوفزدہ ہو کر کہا : " مجھے تم سے باتیں کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے ۔ تمہارے نزدیک کھڑے ہونے سے ڈر لگتا ہے ۔ "

اتنے میں ڈنچی اور چاکر دُعا پڑھنے والے کمرے سے نکل آئے اور بولے : " ہو گئے تین پارچے، اب باقی دو کل صبح پڑھیں گے، اب کیا رات بھر تھوڑی پڑھنے کا ارادہ ہے، کولات اندر آؤ، کچھ کھا پی لو ۔ "

اتنے میں سمّی نائین کہیں سے بھاگی بھاگی شاہ بلوط کے پیڑ کے نیچے آ گئی، اور راکو کے سامنے دوزانو ہونے کے بعد مڑ کر راھبوں سے کہنے لگی : " اِس بار سردار بلوال نے میرے بجائے سالکا نانگ کو بلدیالوں کے سردار کے ہاں بھیجا تھا ۔ جس کے لڑکے سے وہ اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتا ہے ۔ بلدیالوں کے سردار نے یہ شرط رکھی کہ وہ پہلے پانچ سال اپنے لڑکے اور اپنی بہو کو اپنے گھر میں رکھے گا ۔ اور اس کے بعد انہیں سردار بلوال

کے گھر کے لیئے رخصت کرے گا۔ سردار بلوال کا خیال تھا شاید میں بھانجی مارتی ہوں۔ اب یہ ساتواں رشتہ ہے جو اِس طرح تقریباً طے ہو کر ٹوٹ گیا ہے۔"

چینن نے آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور خلا میں گھورتے ہوئے کہا: "مَیں پھر جیت گیا۔" یکایک چینن کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا جو ایک کونے میں پڑا تھا۔

کولات نے ستّی نائین سے کہا: "آؤ، تم بھی اندر چلو، اور کچھ کھا پی لو۔"

ستّی نائین، کولات کا بازو پکڑ کر اندر جانے کو ہی تھی، کہ اتنے میں سردار بلوال لمبے لمبے ڈگ بھرتا شاہ بَلوط کے معبد میں آیا اور جھک کر دو زانو ہو گیا۔ دیر تک دُعا پڑھتا رہا۔ پھر دُعا پڑھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور گلنار چہرے سے راھبوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"مَیں سمجھتا تھا، آج رات بھر کی جگار ہو گی اور دُعائیں پڑھی جائیں گی۔ مگر مجھے تو آج یہاں سے بیگی شراب کی خوشبو آ رہی ہے، واہ!

ڈاگر بولا: "امیر سردار، ہمارے ساتھ ایک لقمہ توڑ لو، ایک گھونٹ چکھ لو۔"

"ارے احمق ۔۔۔ مجھے تمہارے ساتھ کھانے پینے کی کیا ضرورت ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج مَیں خود دعوت کرنے والا ہوں آج کا دِن میری زندگی میں یاد رہے گا۔ آج مَیں نے اپنی بیٹی کی منگنی پکّی کر دی ہے۔"

"مبارک ہو، مبارک ہو۔" سب راھب چِلّا پڑے۔

ستّی نائین بولی: "مگر مَیں نے تو سُنا تھا کہ سماکا نائی لڑکے والوں سے تمہاری شرطیں منوانے میں ناکام رہا۔"

ڈِنجی نے کہا: "ہاں جب ستّی نائین نے ہمیں یہ بتایا تو سردار بلوال کیا بتائیں ـــــ یہ سُن کر کتنی مایُوسی ہوئی ہمیں!"

سردار بلوال نے کہا: "ہاں بات چیت تقریباً ٹوٹ گئی تھی، پر لڑکے والے آخری وقت پر مان گئے اور سب طے ہو گیا، بیکا بھی ہو گئی، مَیں شرپان کاھن کو بتانے آیا تھا۔ کیا شرپان کاھن"

سردار بلوال مدرسے کے اندر جاتے جاتے بولا۔

کولات اُس کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے بولا: "ان کے سَر میں درد تھا۔ آج وہ جلدی سو گئے۔ کیا جگا دُوں انھیں؟

چینن نے مایوسی سے ہات مَلتے ہوئے کہا: "منگنی ہو گئی؟ ہو گئی منگنی!؟ ـــــ تو یہ سب بیکار تھا، فاقے، تعویذ، جادُو، کالا عِلم، وہ سب اتھاہ گہرائیاں جہاں مجھے اس کی خاطر ڈوبنا پڑا، پھر کیا باقی رہا؟"

چینن نے اپنا ہات مار کر اپنا چوغہ سامنے سے پھاڑ ڈالا، اور یکایک خلا میں مایوسی سے گھورتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی روشن مُسکراہٹ آ ئی، اور وہ چِلّا پڑا۔

"ہاں، میں دیکھ سکتا ہوں ۔۔۔ دیکھ سکتا ہوں۔ راکو دیوتا کا خفیہ نام مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ مجھے خلاؤں میں لکھا ہوا نظر آ رہا ہے۔ میرے کانوں میں سُنائی دے رہا ہے۔ میرے دل میں گُونج رہا ہے۔ وہ نام جس سے بے پناہ قوّت ملتی ہے، آج اِس وقت مجھے بتا دیا گیا ہے۔ مَیں جیت گیا ہوں۔"

چینن کے دونوں بازو پھیل گئے۔ پھر اس کا سَر جھک گیا۔ اور وہ کانپتے ہوئے فرش پر اوندھا گر پڑا۔

ستّی نائین خوفزدہ ہو کر بولی: "لالٹین کیوں بُجھ گئی؟ اندھیرا کیوں بڑھ گیا۔ ارے کوئی لالٹین لاؤ، مشعل لاؤ۔"

"گھبراتی کیوں ہو۔" کولات باہر سے ایک مشعل لاتے ہوئے بولا۔

"یہ لو مشعل، اپنی لالٹین جلا لو۔

روشنی میں ستّی نائین کی جان میں جان آ گئی۔ اتنے میں سردار بلوال جو سوتے ہوئے کاھن کے پاؤں چھو کر باہر نِکل رہا تھا ستّی نائین کو دیکھ کر غور سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

ستّی نائین بولی، "کیا سب طے ہو گیا؟"

"ہاں نائین، کیا اس لیئے اُداس ہو کہ تمہاری معرفت نہیں ہوا یہ کام ـــــ یہ لگن کا کام ہے۔ جس کے ہاتھوں بھی ہو جائے اچھا ہے۔ مَیں تو تم سے یہ کہہ رہی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ لوگ وعدہ کر کے مُکر جائیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے، بعد میں بڑے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔"

"جھگڑوں کی بات مت کرو، اس لمحے ستّی نائین ـــــ یہ خوشی کا موقعہ ہے۔ جا کر تم میرے گھر جاؤ اور بولو،

گھر پر کچھ کھانے پینے اور بیگی کے چار مٹکوں کا بندوبست کریں۔ یہاں سے سب لوگ وہاں چلیں گے۔"

چاکر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نیچے کی جانب روانہ ہوگیا۔

کولات بولا: "جب تک وہاں دعوت کا انتظام ہوتا ہے اس مٹکی میں سے ایک ایک گھونٹ پی لیا جائے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

سردار بلوال نے سب سے پہلے مٹکی میں سے ایک گھونٹ چکھا۔ پھر اس نے مٹکی آگے بڑھادی۔ سب نے خوشی خوشی بیگی چکھی۔

سردار بلوال اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا: "کوئی اچھا سا قصہ سناؤ سمی نائین، تمہیں تو بہت سے قصے یاد ہوں گے۔"

سمی نائین بولی: "سوساشاہ کاھن کے متعلق مشہور ہے ایک دفعہ اس کے پاس ایک بے حد امیر لیکن بے حد کنجوس آدمی آیا تو سوساشاہ کاھن اُسے اپنے کمرے کی کھڑکی میں لے گیا اور بولا "کیا دیکھتے ہو باہر"؟ امیر آدمی بولا: "باہر ایک گلی دیکھ رہا ہوں" پھر سوساشاہ اسے اپنے کمرے کے آئینے کے سامنے لے گیا اور بولا: "کیا دیکھتے ہو"؟

وہ امیر آدمی بولا: "اب میں اپنی صورت دیکھتا ہوں"۔

سوساشاہ نے کہا: "تو سمجھ لو کہ کھڑکی میں بھی کانچ لگا ہے اور آئینے میں بھی کانچ لگا ہے۔ مگر تم کھڑکی کے کانچ کے باہر دیکھ سکتے ہو اور تمہیں دوسرے لوگ نظر آتے ہیں۔ مگر آئینے کے شیشے میں تمہیں اپنے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اس کے کانچ کے پیچھے تھوڑی سی چاندی لگی ہے۔"

"واہ واہ، کیا بات پیدا کی ہے" کولات تالی بجاکر بولا۔

سردار بلوال نے ہنس کر سمی نائین کا ہات پکڑلیا۔ سمی نائین نے دوسرے ہات سے لالٹین نیچے رکھدی اور کولات کا ہات پکڑلیا۔ کولات نے ڈاگر کا، ڈاگر نے سوتما کا، سوتما نے ڈنجی کا، اور سب شاہ بلوط کے نیچے ایک گول دائرہ بناکر لالٹین کی جھلملاتی روشنی میں شاہ بلوط کے بڑھتے گھٹتے سایوں میں تال دے دیکر ناچنے لگے۔

یکایک سردار بلوال کی نظر زمین پر اوندھے پڑے ہوئے چنن پر گئی۔ وہ گھبرا توڑ کر اس کی طرف دیکھ کر بولا:

"یہ کون ہے؟"

"چنن ہے۔"

"واپس آگیا!"

"ہاں۔"

"تو اسے بھی بلاؤ، ہمارے سنگ ناچے۔"

کولات نے کہا: "وہ تھکا ہوا ہے، سوگیا ہے۔"

"اسے جگاؤ" سردار بلوال نے تحکمانہ لہجے میں بولا: "آج خوشی کا دن ہے، ایک بار اس نے میری بیٹی کی جان بچائی تھی آج جب وہ سنے گا کہ اُس کی منگنی پکی ہوگئی ہے تو بہت خوش ہوگا۔"

وہ سب لوگ غور سے زمین پر پڑے ہوئے چنن کو دیکھنے لگے۔ کولات نے آگے بڑھ کر اُسے آہستہ سے جھنجھوڑا۔ پھر پلٹا کر اُسے سیدھا کیا۔ جب کولات نے چنن کا منہ دیکھا تو اکدم بولا:

"مگر یہ تو مرچکا ہے"!

"کیا؟"— اکدم فضا میں بہت سی آوازیں گونجیں۔

"ہاں — چنن مرچکا ہے!!"

ساتواں باب

چنن کو تورا اور اس کے عاشق کے مدفن کے قریب اپنی قبر ملی۔ اس واقعے کے سات دن بعد بکروالوں کے گاؤں میں ایک پردیسی آیا۔ اور اس نے چنن کی قبر دیکھنے کی خواہش کی۔

ایک بکروال اسے قبرستان میں لے گیا اور بتانے لگا۔

"یہ مقدس راھبہ تورا اور اس کے عاشق کی قبر ہے... یہ اس سر پھرے لڑکے چنن کی قبر ہے۔ چنن نے کالا علم حاصل کیا تھا"———

ادھیڑ عمر کے مضبوط بدن کے آدمی نے پوچھا: "تمہیں کیسے معلوم ہے، اُس نے کالا علم حاصل کیا تھا؟"

"واہ کیوں معلوم نہیں، ساری دنیا جانتی ہے۔ وہ صوفی جال کے مدرسے میں گیا تھا۔ چھ مہینے وہ نند دھگت یوگی کے

ہاں رہا۔ سوسا شاہ کاہن کے مدرسے میں اُس نے تعلیم پائی مگر
کہیں پر سیدھا علم نہیں سیکھا۔ اُلٹے حرف پڑھتا رہا۔ اُسی غلط
پڑھائی میں اس کی جان گئی۔"

"وہ کیسے مرا؟"

"بس آپ ہی آپ مر گیا۔ ایک پل پہلے بھلا چنگا تھا، دوسرے
لمحے آپ ہی آپ گیا۔ جو اُلٹے حرف پڑھتے ہیں، اُن کا یہی حال
ہوتا ہے۔"

ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا: "جو مر گیا، اس کے متعلق ایسی
بُری بُری باتیں نہیں کہتے۔"

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔" بکروال نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔
اور توبہ کی۔ پھر پردیسی سے پُوچھنے لگا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"مَیں اُسی گاؤں کا ہوں، جس گاؤں کا یہ لڑکا ہے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"بورین داھل۔"

"بورین داھل؟"

"ہاں، بورین داھل ۔۔۔۔ مَیں یہاں اس کی قبر پر دُعا
پڑھوں گا اور کچھ دیر بیٹھوں گا۔ تم جاکر سردار بلوال کو خبر کرو کہ
بورین داھل تم سے ملنے کے لیئے آیا ہے۔"

بکروال بولا: "سردار بلوال تو یہاں نہیں ہے۔ اس کی لڑکی
کی منگنی کی بات چیت پکی ہو گئی ہے۔ وہ دعوت کے انتظام کے
سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔ کل شام تک لوٹے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ مَیں کل شام تک تمہارے گاؤں میں ٹھہروں گا
اس سے مل کر جاؤں گا، اجازت ہے؟"

"راکو دیوتا کی مہربانی ہے، ہمارے گاؤں پر۔" بکروال بولا۔
"جو پردیسی باہر سے آتا ہے، ہمارے لیئے قابلِ عزت ہوتا ہے۔"

"تو جاؤ۔" بورین داھل بولا: "سردار بلوال کے گھر والوں کو
خبر کردو۔ اُس کی ماں ہوگی، اُس سے کہہ دو، وہ مجھے جانتی ہے۔
اُس سے کہدو کہ جونہی سردار بلوال آئے، اسے میرا نام بتادے،
وہ مجھ سے آکے مل لے گا یا وہ مجھے اپنے گھر پر ملنے کے لیئے
بُلالے گا۔ اور ہاں میری پہچان کے لیئے اُسے یہ انگوٹھی
دے دینا۔" اتنا کہہ کر بورین داھل نے ایک انگوٹھی اپنی اُنگلی
سے نکالی اور بکروال کی ہتھیلی پر رکھدی۔ "جاؤ اتنا کہہ دو، اُس
کے گھر جاکر، جب تک مَیں اس لڑکے کے حق میں دُعا پڑھتا ہوں۔"

بکروال چلا گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب واپس لَوٹا تو اُس نے دیکھا کہ
وہ پردیسی چینن کی قبر سے لپٹا ہوا مُردہ پڑا ہے۔

یہ دونوں موتیں عجیب وغریب حالات میں ہوئی تھیں۔ گاؤں
میں ہراس سا پھیل گیا۔ لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔
مگر شوپان کاہن کے حکم کے مطابق اُس آدمی کو بھی چینن کی قبر کے
قریب دفن کردیا گیا۔

دوسرے دن جب سردار بلوال واپس اپنے گھر آیا تو اسے
انگوٹھی ملی۔ اس نے فوراً بکروال کو بُلایا اور اُس سے مرنے
والے کا حُلیہ پُوچھا۔ سب معلوم کرنے کے بعد سردار بلوال رونے لگا۔
معلوم ہوا، بورین داھل اُس کا بچپن کا دوست تھا۔ دونوں
دوست بچپن سے جوانی تک ساتھ رہے۔ جب دونوں کی شادی
ہوئی تو الگ الگ ہو گئے۔ ان لوگوں نے اپنی انگوٹھیاں بدل لی
تھیں اور اس وقت وہی انگوٹھی سردار بلوال کی ہتھیلی پر تھی۔

"مَیں نے بدھ کے روز منگنی کی دعوت طے کی تھی۔" سردار
بلوال افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ "مگر اب اپنے دوست کی
بے وقت موت کے سبب مَیں اس دعوت کو اگلے سنیچر تک
مُلتوی کرتا ہوں۔ ابھی میں دولہا اور اس کے خاندان والوں کو
نیوطہ دے کر آرہا ہوں، اب سیتی نائین کو بھیجوں گا اور انھیں
بتاؤں گا کہ میرا ایک نہایت عزیز دوست مر گیا ہے، اس لیئے یہ
منگنی کی رسم اگلے سنیچروار تک مُلتوی ہے۔"

دادی دورماں ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں: "جانے کیسی
گھڑی میں تم نے اس لڑکی کی بات چیت چلائی تھی، شادی تو کیا
ابھی تک منگنی پکی نہیں ہوئی۔"

سردار بلوال نے کہا: "منگنی ہو جائے تو مَیں فوراً شادی
کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا، اماں تم فکر مت کرو۔"

"کیسے فکر نہ کروں، بیچ بیچ میں وِگھن جو پڑ جاتے ہیں۔"

"راکو دیوتا کی مہربانی سے سب ٹھیک ہی ہوگا۔" سردار بلوال

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا : " آخر میری بھی تو ایک ہی اولاد ہے ، ایک ہی لڑکی ہے ، آگے پیچھے اور کوئی نہیں ۔ اسی لیئے ایک اچھا سا گھر داماد ڈھونڈ رہا ہوں ، ورنہ لڑکے تو سیکڑوں ملتے ہیں اب یہ لڑکا بہت اچھا مل گیا ہے ۔ اگلے سینچر کو منگنی ہو جائے گی تیری پوتی کی ۔"

بوڑھی دادی دور ماں اپنے بیٹے کی باتوں سے خوش ہو گئی، چٹ پٹ اپنے بیٹے کی بلائیں لینے لگی ۔

سردار بلوال، بوترین کی انگوٹھی کو دیکھتا ہوا غور اور فکر میں ڈوبا ہوا گھر سے باہر نکل گیا ۔

آٹھواں باب

قبیلے کے رواج کے مطابق سردار بلوال یا تو خیمے میں رہ سکتا تھا یا لکڑی کا مکان بنوا کر اس میں رہ سکتا تھا۔ مگر بکر والوں کو آج تک اپنے قبیلے کی طرف سے پکے مکان میں رہنے کی اجازت نہیں تھی ۔ اس لیئے سردار بلوال نے اپنا دوسرا مکان پہلے مکان کے جل جانے کے بعد بھی لکڑی ہی کا بنوایا ۔ مگر پہلے سے بڑا اور شاندار، ایک تو اسے اپنی بیٹی کی شادی کرنی تھی ، پھر اپنے گھر میں داماد کو رکھنا تھا ۔ اس لیئے اس نے یہ سب سوچ کر پہلے سے قریباً دُگنا بڑا مکان بنایا ۔ بڑے بڑے چوبی برآمدے جن میں سیکڑوں لوگ بیٹھ کر دعوت کھا سکتے تھے ۔ چوبی برامدوں سے پرے ایک وسیع آنگن پہلے سے بھی دُگنا ، جس میں سیکڑوں فقیر اور سادھو، غریب غربا بیٹھ کر شادی کا نظارہ کر سکتے تھے ۔ چھ کمرے نچلی منزل میں تھے، چھ اوپر کی منزل میں ۔ شادی کے بعد سردار بلوال نے طے کیا تھا کہ وہ اپنے داماد اور آنگی کو اوپر کی منزل دے دیگا ۔ جہاں وہ لوگ پوری شان و شوکت سے رہ سکتے تھے ۔ اور خود وہ نچلی منزل میں رہیگا ۔

آج سینچر کے روز منگنی کی دعوت پر سردار بلوال کے گھر کا نچلا حصہ مہمانوں، راھبوں ، فقیروں ، عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا ۔

ڈانچی نے جاکر سے کہا : " ایسی شاندار دعوت تو مَیں نے کبھی کھائی نہیں ۔ اپنی زندگی میں آج تک نہیں کھائی ۔ قورمہ قیمہ پسندے ، پلاؤ ، روٹی ، پنیر اور فیرنی ۔ ہر ایک راھب کیلئے ۔

اور دو گلاس ہیگی شراب کے ۔"

" ہاں جناب " ۔ کولات بولا : " یہ تو ہم راھبوں کے لیئے سامانِ دعوت ہے ۔ مگر ہمارا سردار بلوال ایسے موقع پر غریبوں کو بھی نہیں بھولا ۔ آنگن میں جاکر دیکھو ۔ وہ فقیر لوگ کیسی عمدہ دعوت اڑا رہے ہیں ۔ ان کے لیئے مچھلی کا قورمہ ہے ۔ چاول ہے ، ایک روٹی ہے ، کرم کا ساگ ہے اور آخر میں فیرنی ہے اور ایک گلاس ہیگی جو پینا چاہے پی لے ۔"

ڈاگر بولا : " سردار بلوال سمجھتا ہے کہ ایسے موقعوں پر فقیروں، سادھوؤں کی کیسے دلداری کی جاتی ہے ۔ ایسے موقعے پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس فقیر کے بھیس میں کون ہو ۔ ممکن ہے کوئی ولی اللہ ہو ، کوئی رِشی ہو ، مقدّس چھتیس بزرگوں میں سے کوئی بزرگ ہو، جنھیں عظیم داکو دُنیا دیکھنے کے لیئے بھیجتا ہے ۔ کیوں نہیں، خود مقدّس داکو بھی ہو سکتا ہے، بھکاری کے بھیس میں ۔"

" صرف غریبوں ہی پر دھیان دینا کافی نہیں ہے ۔ آجکل کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں آدمی پچھلے جنم میں کیا تھا اور اس جنم میں کیا کر رہا ہے ۔" سوما بولا : " اوپر سے دیکھنے سے کوئی بھی بنیا، لوہار یا بڑھئی دکھائی دے سکتا ہے ، مگر اندر سے کون جانے وہ کونسا گنی جنی ، گیانی دھیانی ، صوفی سنت اور مہاتما بھیس دھارے ہوئے ہے ۔"

" ہاں کچھ کہہ نہیں سکتے ۔" ڈاگر نے ہاں بھرتے ہوئے کہا ۔

" لو یہ سیتی نائین کدھر سے بھاگی بھاگی چلی آ رہی ہے ۔"

" دعوت کھانے کی خوشی میں بھاگی بھاگی آ رہی ہو نائین ۔"

سیتی نے مسکرا کر کہا : " کیوں نہ آؤں گی ، سارے علاقے میں اس شادی کی دھوم ہے ۔"

کولات نے پوچھا : " ابھی تک دُولہا نہیں آیا ، اور اسکی برات کے لوگ بھی نہیں پہنچے ۔"

نائین بولی : " میں انھیں کے گھر سے آ رہی ہوں ، وہ لوگ چل چکے ہیں ۔ اب آتے ہی ہوں گے ۔ پہاڑی سفر ہے ۔ وقت تو لگتا ہی ہے ۔ وہ اب آتے ہی ہوں گے ۔"

اتنے میں نائین کی نظر دولہن پر پڑی ۔ آنگی اسوقت

سبھی سنوری آنگن میں عورتوں کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

رتی نے اپنے سینے پر ہات رکھ کے بڑے پیار سے کہا:

"ہائے کتنی اچھی لگ رہی ہے دُلہن۔" ایک بھکارن رتی کے قریب آ کر پیار بھرے لہجے میں کہنے لگی: "میں بھی ناچی تھی دُلہن کے سنگ، میں بھی ناچی تھی۔"

ایک لنگڑی عورت بولی: "میں بھی ناچی تھی، اسے کمر سے پکڑ کر چار چک پھیریاں لیں، ہی ہی ہی۔"

لنگڑی کھانستی اور ہنستی ہوئی آگے چلی گئی۔

ایک کبڑا بولا: "رتی نائین، یہ کیا ہے، دُلہن صرف عورتوں کے سنگ ناچ رہی ہے۔ میں خود اس کے قریب جانے والا ہوں اور اس کے سنگ ناچنے والا ہوں۔ کمر پکڑ کے وہ چک پھیریاں دوں گا، وہ چک پھیریاں دوں گا کہ دُلہن کا سر چکرا جائے گا۔"

"ابے جا کبڑے۔" رتی نائین اسے دھتکارتے ہوئے بولی: "وہ بچی ہے، وہ مردوں کے سنگ نہیں ناچتی۔ ہاں جب اس کی عمر تیس سے اُوپر ہو جائے گی اور تین بچے ہو جائیں گے پھر وہ تیرے سنگ بھی ناچ سکتی ہے۔ ایسا رواج ہے ہمارے قبیلے کا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ ہر تین بچوں کے بعد کسی کا جی ناچنے کو چاہے گا۔" کبڑا بولا: "میرا جی تو ابھی اس کے سنگ ناچنے کو چاہ رہا ہے۔"

دادی دورماں نے رجی سے کہا: "منع کر آنگی کو، اب مت نا چے، نہیں تو اس کا سر پھر جائے گا، بہت ناچی۔"

رجی آنگی کو منع کرنے لگی۔ مگر ایک غریب بھکارن نے اس وقت آ کر بڑی لجاجت سے کہا: "میرے سنگ تو نہیں ناچی ہے، آنگی، دو چکر مجھے بھی لینے دے۔"

"نہیں، نہیں۔" رجی بولی: "وہ بہت تھک گئی ہے۔"

"کیوں مجھ میں کیا بُرائی ہے۔ یہ سب عورتوں کے سنگ ناچی ہے، کیا مجھے یہ موقعہ نہیں ملے گا۔" اور بھکارن جس کے کپڑے پھٹے پُرانے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور جو بے حد دُبلی پتلی بیمار نظر آ رہی تھی، بڑے تیکھے لہجے میں بولی: "میں کیوں دُلہن کے سنگ نہیں ناچوں گی۔"؟

رجی نے جیب میں ہات ڈال کر اسے ایک اٹھنی دیتے ہوئے کہا: "یہ لے ایک اٹھنی اور جان چھوڑ دے آنگی کی۔"

"ناں!" وہ ضدی بھکارن سر ہلا کے بولی: "مَیں اٹھنی نہ لوں گی، مَیں تو ناچوں گی آنگی کے سنگ۔ دلہن کے سنگ سبھی ناچی ہیں۔ مَیں کیوں نہ ناچوں؟"

اتنا کہہ کر اس عورت نے آنگی کو کمر سے پکڑ لیا اور اُسے اپنے سنگ گھما گھما کے چک پھیریاں دینے لگی۔ اور جب چک پھیریاں لیتے ہوئے آنگی بس کرنے کو کہتی تو بھکارن اُسے ایک نئی چک پھیری میں لے جاتی۔ اس کے بڑے بڑے میلے ناخنوں والے ہات آنگی کے خوبصورت لباس کو میلا کر رہے تھے اور کانٹوں کی طرح چبھتے معلوم دیتے تھے ایک اور ایک اور کہہ کر دس بارہ چک پھیریاں اس بھکارن نے ڈالیں پھر جو اس نے آنگی کو چھوڑا تو جلدی سے آنگن سے نکل بھاگی۔

آنگی کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ کانپتی ہانپتی وہیں آنگن میں لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور ماتھے پر ہات رکھ لیا۔

دادی دورماں اس کے قریب گئی اور پیار سے ایک ہات اس کے سر پر رکھ کر بولیں: "ہائے ہائے تھکا دیا، ان ظالموں نے میری بچی کو۔ ارے دیکھو تو کیسا ہلدی کی طرح اس کا رنگ ہو رہا ہے۔ آنگی، آنگی، میری بچی کیا بہت تھک گئی ہے تُو؟"

آنگی کی آنکھیں بند تھیں۔ اور وہ ایسے بول رہی تھی جیسے کسی گہرے خواب میں ہو۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"انھوں نے مجھے پکڑ لیا۔۔۔ اور چک پھیریاں دیتے ہوئے اپنے گندے میلے ہاتھوں سے میری کمر کو زور سے پکڑتے ہوئے مجھے یہاں سے بہت دُور لے گئے۔ پھر وہاں کوئی آیا، اور مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر بہت بہت دُور لے گیا۔"

دادی دورماں نے کہا: "چچ چچ۔۔۔ تمہارا دُلہن کا لباس کمر کے قریب سے کتنا گندہ میلا ہو رہا ہے۔ یہ کیا کیا ان بھکارن عورتوں نے۔۔۔۔ اب تم کیا کرو گی؟"

آنگی اس خوابناک لہجے میں بولی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ شادی سے پہلے اگر دُلہن کو اکیلا چھوڑ دیا جائے تو رُوحیں اُسے اُٹھا کے لے جاتی ہیں۔

دادی دورماں گھبرا کر بولیں۔ کیسے کیسے خیال تمہارے دل میں آ رہے ہیں۔۔۔ میری بچی اِن کالی رُوحوں کے متعلق

نہیں سوچا کرتے جو ہر وقت ہمارے اِرد گرد رہتی ہیں۔ کونوں کھدروں میں۔ موقعے کی تلاش میں کہ کہیں پر ہم لوگ ان کے نام لے دیں اور وہ ہمارے اُوپر پل پڑیں۔

یکایک آنگی نے آنکھیں کھول دیں اور بڑے دھیرج سے کہا "میری رُوحیں کالی اور بُری نہیں ہیں"۔

"ان کا بھروسہ مت کرو، بالکل بھروسہ مت کرو۔ جس لمحے تم نے ان پر بھروسہ کیا تو تم بھی ان کی طرح ہو جاؤ گی"۔

"دادی"! آنگی اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی چھوٹی سی زبان پھیرنے لگی۔ بولی: "دادی بُری رُوحیں ہمارے اِرد گرد نہیں گھومتی ہیں، اور چکّر لگاتی ہیں۔ ہمارے آس پاس منڈلانے والی وہ رُوحیں ہیں جو وقت سے پہلے مر گئیں۔ وہ پھر واپس آجاتی ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیئے کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کیا کہتے ہیں"؟

"اری میری بچی۔ کس نے تمہارے دل میں بے بُنیاد شبہے ڈال دیئے ہیں، کیا تُو نہیں جانتی کہ جتنی پاک اور صاف نیک اور اچھی رُوحیں ہوتی ہیں مر کر سیدھے راکو کے پاس چلی جاتی ہیں اور اُس کے قدموں تلے جنّت میں آرام کرتی ہیں۔

"نہیں دور ماں"۔۔۔۔ آنگی مکمّل یقین اور طمانیت سے بولی: "وہ سب یہیں پر ہیں"۔ یکایک یہاں پر اس کا لہجہ بدل گیا۔ اور وہ کہنے لگی۔ دادی ہم میں سے ہر شخص ایک لمبی عُمر لے کے پیدا ہوتا ہے۔ ایک طبعی عمر۔ اب اگر وہ وقت پہلے ہی مر جائے تو اس کی اس زندگی کا کیا ہوگا جو اس نے ابھی تک صَرف نہیں کی، ایں؟ کیا ہوگا اس رنج و مسرّت کا جن سے وہ ابھی دوچار نہیں ہوا کہاں جاتے ہیں۔ اس کے وہ ارادے اور خیال جن پر اسے سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ کہاں گئے اس کے وہ بچّے جن کی تخلیق وہ اِس دُنیا میں نہ کرسکا؟ وہ سب کہاں جاتے ہیں؟ کہاں؟

آنگی کچھ دیر اپنے خوابوں میں ڈُوبی ہوئی ان سوالوں کا جواب ڈھونڈتی رہی، پھر اندوہ گیں لہجے میں بولی: "ایک لڑکا تھا یہاں دادی، عقل مند اور پاکباز۔۔۔۔ ہاتھ پاؤں کا مضبوط، لمبی عُمر ہونے والی تھی اس کی۔ لمبی طبعی عمر۔۔۔۔ ایک دن اچانک اس کی زندگی ختم کردی گئی اور اسے اپنے گھر سے دُور یہاں پردیس میں دفن کردیا گیا۔۔۔۔ آنگی کے لہجے میں تیکھا پن آگیا اور وہ کہنے لگی تو اس کی باقی زندگی کا کیا ہوا، اُس آواز کا جو خاموش کر دی گئی۔ اس کی وہ دُعائیں اور خواہشیں جن پر حرفِ آخر لکھ دیا گیا۔ دادی ماں جب ایک موم بتی بُجھ جاتی ہے، ہم اسے پھر جلا لیتے ہیں اور وہ پھر آخر تک جلتی ہے تو کس طرح وہ زندگی ختم ہوسکتی ہے جو بیچ ہی میں بُجھا دی گئی۔۔۔ وہ نامکمل زندگی اس بُجھی ہوئی موم بتّی کی طرح ہے نا؟۔ دادی"

دادی دور ماں نے حیرت سے آنگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بیٹی۔۔۔ بیٹی۔۔۔ ایسی باتیں نہیں سوچا کرتے۔۔۔ وہ جو اُوپر والا ہے۔ راکو! وہی جانتا ہے کہ کیا سچ ہے کیا سچ نہیں ہے' ہم لوگ اندھے ہیں، کچھ نہیں جانتے!

اتنے میں ستّی نائین ان دونوں کے قریب آگئی۔ لیکن ذرا دُور ہی رہی۔ اور دادی پوتی کی گفتگو سُنتی رہی۔

آنگی زور سے سر ہلا کر بولی: "نہیں دادی ماں، کوئی انسانی زندگی بے کار اور رائیگاں نہیں جاتی۔ اگر ہم میں سے کوئی وقت سے پہلے مر جاتا ہے تو اس کی رُوح اسی دُنیا میں واپس آتی ہیں۔ اپنا کام ختم کرنے۔ اپنی عُمر پوری کرنے۔ اور وہ جو سب کچھ اس نے نہیں بھوگا ہے اسے بھوگنے یہاں آتی ہے۔ دادی ماں تم نے ہی تو مجھے بتایا تھا کہ آدھی رات کے سمے قبرستان سے رُوحیں نکلکر شاہ بلوط کے معبد میں راکو کے قدموں میں دُعائیں مانگنے آتی ہیں۔ کیسی ہوتی ہیں یہ دُعائیں؟ ـــــ یہ وہی دُعائیں ہیں نا' جو یہ رُوحیں اپنی زندگی میں نہ مانگ سکیں۔

میری ماں جوانی ہی میں مر گئی۔ اور وہ سب کچھ دیکھنے بھالنے کے لیئے زندہ نہ رہی، ان تمام کاموں کو پورا کرنے کے لیئے جو وہ کرتی اگر وہ زندہ رہتی۔ اس لیئے تو آج مجھ سے کہا جارہا ہے کہ آج میں منگنی کے بعد، مگر شادی سے پہلے اس کی قبر پر جاؤں اور اس کی رُوح کو اپنے ساتھ لاؤں۔ تاکہ وہ اور میرا باپ دونوں مل کر مجھے شادی میں اپنے دُولہا کو دے سکیں۔ اس لیئے میں اس کی قبر پر جاؤں گی اور اُسے ساتھ لے کر آؤں گی۔ وہ ساری رسموں کے سمے میرے پاس رہے گی۔ اور شادی کے بعد ہم دونوں اکھٹے دُلہن اور اس کی ماں ناچیں گی۔ تو جب میری ماں کی رُوح کے ساتھ یُوں ہوگا تو میں کیسے سمجھ لُوں کہ دوسروں کی رُوح

کے ساتھ یوں نہ ہوتا ہوگا جو وقت سے پہلے اِس دُنیا کو چھوڑ گئے یا وقت سے پہلے یہ دُنیا جن سے چھُڑا دی گئی ۔ وہ سب ہمارے درمیان واپس آتے ہیں، ہم اُنھیں دیکھ نہیں سکتے ۔ سُن نہیں سکتے ۔ لیکن اگر خواہش شدید ہے اور دل صاف ہے تو ہم انھیں سُن بھی سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں اور ان کے ارمان، خواہشیں، چاہتیں سب محسوس کر سکتے ہیں ۔ مَیں کر سکتی ہوں ۔۔۔ دیکھ سکتی ہوں، تورا اور اس کے عاشق کو جنھیں وقت سے پہلے سُلا دیا گیا ۔ اور وہ بھی ہمارے ہی پُرکھوں نے ۔۔۔ ایک ہی قبر میں تاکہ وہ دونوں ہمیشہ اکٹھے رہ سکیں ۔ اس لیئے آج اِس شادی کے موقعے پر مَیں کہتی ہوں ۔ اے مقدس تورا اور اس کے پاکباز عاشق تم دونوں آج کی رسمیں میرے ساتھ پوری کرو اور میری شادی میں شریک رہو ۔

یکایک آنگن سے باہر شہنائیوں کے زور زور سے بجنے کی صدا آنے لگی ۔ نفیریاں اور ڈھول بجنے لگے ۔ آنگی نے خوف سے ایک لمبی چیخ ماری اور تقریباً بے ہوش سی ہو گئی ۔

رجی نے اس کا بازو تھام کر کہا ۔ "کیا ہے آنگی ؟ کیا ہو رہا ہے تمہیں ؟ گھبرا کیوں رہی ہو ؟ شاید دُولہا آرہا ہے اس لیئے نفیریاں اور شہنائیاں بج رہی ہیں ۔ ایسا ہی ہوتا ہے ۔ دولہا کا استقبال اسی طرح کیا جاتا ہے ۔

اتنے میں ایک چنچل لڑکی جس کا نام بردا تھا ۔ دوڑی دوڑی آئی اور آنگی سے کہنے لگی ۔ مَیں باہر دیکھ کے آتی ہوں ۔ واپس آ کے بتاتی ہوں کہ دُولہا کالا ہے یا گورا ؟

رجی کے دل میں بھی شوق چرایا ۔ وہ بھی کہنے لگی ۔ "میں بھی باہر جاتی ہوں ۔ اور پھر واپس آ کے بتاؤں گی دُولہا کیسا ہے ۔ خوبصورت ہے یا بدصورت ؟ جاؤں ؟"

"نہیں نہیں!" آنگی نے گھبرا کر کہا ۔

بردا، رجی کا ہاتھ پکڑ کے بولی ۔ "چلو چلیں ۔ یہ لاج کے مارے ایسا کہہ رہی ہے ۔ ورنہ اس میں بُری بات کیا ہے ۔ ہم کوئی تمہارا نام تھوڑا ہی لیں گے کہ تم نے ہمیں باہر بھیجا ہے، چل رجی ۔"

رجی اور بردا باہر گئیں تو دادی ماں قریب آ گئیں اور آنگی کو پچکارتے ہوئے بولیں: "ایسا ہی ہوتا ہے ۔ دُلہن ہمیشہ اپنی سہیلیوں کو باہر بھیجتی ہے ۔ یہ معلوم کرنے کے لیئے کہ دُولہا کیسا ہے ؟

"دُلہن"! ستی نائین عجیب نگاہوں سے آنگی کی طرف دیکھ کر بولی ۔ ستی نائین کی آنکھوں میں دیکھ کر آنگی خوفزدہ ہو کر کانپی پھر بولی: "بولو، کیا کہتی ہو ۔"

"تم نے ٹھیک ہی سوچا تھا کہ مرنے والوں کی رُوحیں زمین پر واپس آتی ہیں ۔ لیکن وہ بے بدن رُوحوں کے لباس میں نہیں آتی ہیں ۔ ان رُوحوں کو پاک وصاف ہونے کے لیئے طرح طرح کے جسموں میں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ بُرے لوگوں کی رُوحیں حیوان یا درندے بن کر آتی ہیں، یا پرندے یا مچھلی بن کر، یا شاید پودے بن کر ۔ اور وہ خود سے اپنے آپ کو پاک وصاف نہیں کر سکتیں جب تک کوئی راکو کا بندہ کوئی صوفی سَنت آ کے ان کی رُوحوں کو پاک وصاف نہ کر دے ۔ دوسری طرح کی رُوحیں نئے پیدا ہونے والے بچوں کے بدن میں گھُس جاتی ہیں اور زندگی بھر پُرانے گناہوں کا کفارہ ادا کرتی ہیں ۔"

"اچھا ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ تو ؟" آنگی کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی ۔

نائین بولی: "ان کے علاوہ تیسری طرح کی رُوحیں ہوتی ہیں ۔ آوارہ، جنھیں کوئی گھر نہ ملا، نہ کوئی ٹھور ٹھکانا، وہ رُوحیں زندوں کے جسم میں گھُس جاتی ہیں، پریت بن کر اور اس طرح اپنے آپ کو پاک وصاف کرتی ہیں ۔"

نائین اِتنا کہہ کر باہر چلی گئی ۔ جہاں شور بڑھ رہا تھا ۔ اور پٹاخے چھُوٹ رہے تھے اور باجے گاجے کا شور انتہا تک پہنچا ہوا تھا ۔ اور دو جوڑی دار ڈھول بجانے والے ایک دوسرے سے ڈھول بجانے کا مقابلہ کر رہے تھے ۔ اور دَم بدم لے تیز کرنے جا رہے تھے ـــــــ

آنگی سوچ میں ڈُوبی ہوئی شامیانے کے نیچے بیٹھی تھی جہاں شادی کی رسمیں ادا کی جانے والی تھیں ۔ منگنی کے بعد ، اتنے میں سردار بلوال اندر آیا ۔ اور کہنے لگا ۔

"آنگی، تو ایسی اُداس یہاں کیوں بیٹھی ہے ؟ خیریت تو ہے ۔"

دادی دور ماں بیزاری سے سر ہلا کر بولیں : "یہ چند بھکارنوں کے سنگ ناچی، رواج کے مطابق، تو کمزور اور نازک تو تھی تھک گئی ہے ، اب آرام کر رہی ہے ۔ اور کچھ نہیں ہوا ہے میری بٹو کو ۔"

شاعر

بھکارنوں کے سنگ ایسے سمے میں ناچنا بھی ایک نیک کام ہے۔ مگر اب بہت دیر ہوئی جارہی ہے۔ دولہا والے بارات لے کے آپہنچے ہیں۔ کیا سب کچھ تیار ہے۔

"تیار ہے۔" دادی دورماں نے کہا: "پھر اسے ذرا تھوڑی دیر کے لیئے اپنی ماں کی قبر پہ جانا ہوگا۔"

"تو جاؤ۔ میری بچّی۔" سردار بلوال نے آنگی کو پچکار کے کہا "جاؤ، اپنی ماں کے پاس۔ اور اپنے آنسو گرادو اس کی قبر پر، اور اس سے پھر کہنا کہ وہ تمہاری شادی میں شریک ہو۔ تاکہ ہم دونوں تم کو رسم ورواج کے مطابق شادی میں دے سکیں۔ کہنا کہ میں نے اس کا آخری سمے پر کہا ہوا وچن پورا کر دیا ہے۔ جو وعدہ میں نے اس سے کیا تھا۔ جاؤ میری بچی۔ اپنی ماں کی روح کو ساتھ لے کر آؤ۔"

اتنا کہہ کر سردار بلوال کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور وہ ان آنسوؤں کو چھپانے کے لیئے گھر کے اندر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد آنگی نے پوچھا: "دادی، کیا ماں کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی اس شادی میں شرکت کے لیئے کہہ سکتی ہوں۔"

"صرف قریبی رشتہ دار کو بیٹی۔" دادی نے جواب دیا۔ "تم اپنے دادا کی روح سے کہہ سکتی ہو۔ اور اپنی ماں سے اور اپنی تائی کنجا سے جس کی قبر اسی قبرستان میں ہے۔"

آنگی آہستہ سے بولی: "ایک اور ہے۔ جسے میں بلانا چاہتی ہوں۔ پر وہ کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔"

"نہیں بیٹی، یہ منع ہے۔ اگر تم کسی اجنبی کو شادی میں بلاؤ گی تو دوسری اجنبی روحیں برا مانیں گی اور ممکن ہے تمہیں نقصان پہنچائیں۔"

"وہ کوئی اجنبی نہیں تھا دادی۔ وہ ہمارے ہی گھر میں رہتا تھا۔ اس نے میری جان بھی بچائی تھی۔"

"بچی... بچی... یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔" دادی ماں کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ "لوگ کہتے ہیں۔ وہ کالا علم جانتا تھا اور اسی کالے علم نے اس کی جان لی۔"

آنگی رونے لگی۔

دادی دورماں نے اس کی بلائیں لیں۔ اس کے آنسو پونچھے، پچکار کے کہا۔ "ارے رے رے روتی کیوں ہے، ایسی ہی ضد ہے تو اسے بھی بلالے، رومت۔ اسے بھی بلالے۔ میں خود تجھ سے کہتی ہوں، اور اس گناہ کا بوجھ میں اپنے سر پر اٹھالوں گی۔"

پھر ذرا رک کر شبہ سے بولی: "پر مجھے معلوم نہیں ہے: ان لوگوں نے اسے کہاں دفن کیا ہے؟"

آنگی نے آہستہ سے سر ہلا کے کہا: "میں جانتی ہوں!"

"تم جانتی ہو؟ کیسے؟"

"میں نے سپنے میں اس کا مدفن دیکھا تھا۔ اور میں نے سپنے میں اسے بھی دیکھا تھا۔" آنگی نے چند لمحوں کے لیئے آنکھیں بند کرلیں اور دھیرے سے بولی: "اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اپنی شادی پر اسے بلاؤں۔"

اتنے میں رجی اور بردا باہر سے بھاگی بھاگی آئیں اور تالی بجاتے ہوئے بولیں: "ہم نے دیکھ لیا اسے، ہم نے دیکھ لیا اسے ——"

آنگی نے چونک کر کہا: "کسے؟"

"کسے؟" رجی اور بردا رک کر آنگی کی طرف حیرت سے دیکھ کر بولیں: "دولہا کو اور کس کو؟" بردا بولی: "سانولا ہے تیرا دولہا!"

رجی بولی: "نہیں گورا ہے۔"

بردا، رجی سے بولی: "تو آؤ، ایک دفعہ اور جا کے دیکھ آئیں۔"

رجی اور بردا دونوں زیوروں میں چھم چھماتی پھر وہاں سے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد آنگی اٹھی اور بولی: "تو آؤ دادی ماں، ہم بھی تبرک قبرستان سے ہو آئیں۔"

دادی دورماں بولیں: "چلو بی چلو۔"

دادی نے اپنے گھٹنوں پر ہات رکھ کر ہائے کی۔ کیونکہ اب اٹھنے بیٹھنے میں اس کے جوڑ دکھنے لگے تھے۔

رواج کے مطابق دلہن نے ایک کالی شال قبرستان جانے کے لیئے اپنی دلہن کی پوشاک پر اوڑھ لی۔ جو ریشمی سوسی گھیرے دار مغلئی شلوار اور کرتے پر مشتمل تھی۔ دادی دورماں

اور آنگی بائیں طرف سے نکل کر برآمدے سے گذر کر باہر قبرستان کی جانب مڑ گئیں۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد سردار بلوآل اپنے ہونے والے داماد مناشی اور اس کے باپ نخمان کے ساتھ آنگن میں داخل ہوا۔ شامیانے کے نیچے پہنچکر وہ نخمان سے بغلگیر ہوا اور اپنے ہونے والے داماد مناشی کے چہرے پر بوسہ دیا۔

مناشی ایک اوسط قد کا سانولے رنگ کا گھبرایا ہوا نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی وحشت تھی اور وہ بار بار گھبرایا ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ مناشی اور نخمان کے ساتھ ان کے دوسرے رشتے دار اور باراتی بھی موجود تھے۔ جن سے نخمان نے باری باری سردار بلوآل کو ملوایا۔

سردار بلوآل نے خندہ پیشانی سے پوچھا: "سفر خیریت سے کٹا؟"

نخمان بولا: "راکو دیوتا کی مہربانی سے یہاں تک پہنچ پائے ہیں ورنہ سفر میں بڑی مشکلیں اور مصیبتیں پیش آئیں۔"

"کیا ہوا؟"

"پہلے تو ہم راستہ بھول گئے۔ اور کافی دیر تک ایک گھنے جنگل میں سے گزرتے رہے۔ جہاں پر جنگل ختم ہوا، وہاں پر راستے میں بڑی بھاری نشیبی دلدل ملی، جس میں ہم لوگ تقریباً دھنس کر ختم ہو جاتے۔ وہ تو کاہن سوساشاہ ہمارے ساتھ تھا۔ نوجوان کا دم غنیمت تھا جو ہم یہاں تک پہنچ پائے۔ ورنہ لگتا تھا کہ کوئی شیطانی قوت ہمارے راستے میں حائل ہے۔ اور ہمیں یہاں تک پہنچنے نہیں دے رہی ہے۔ مگر راکو کی مہربانی شاملِ حال تھی، اس لیئے خیریت سے پہنچ گئے۔"

سردار بلوآل نے کہا: "آپ تھک گئے ہوں گے۔ اندر گھر میں چل کے آرام کر لیجئے۔"

"نہیں۔" نخمان سردار بولا: "آرام کرنے کا وقت کہاں ہے؟ ابھی تو شادی کے سلسلے میں آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں جہیز اور تحفے، لڑکا میرے گھر کب آیا کرے گا بہو کو لے کر، اور کتنے عرصے تک رہ سکے گا۔ یہ سب باتیں طے ہو جانی چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے، آیئے اندر چلیں۔ سب باتیں طے کر لیں۔"

"نہیں برامدے میں کیوں نہ ٹہلیں۔" نخمان سردار نے صلاح دی۔

"ٹھیک ہے۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

سردار بلوآل، سردار نخمان کے کندھے پر ہات رکھ کر بڑی محبّت اور ملاطفت سے برآمدے میں ایک طرف لے گیا۔ جہاں وہ دونوں ٹہل ٹہل کر شادی کے معاملات طے کرنے لگے۔

کاہن سوساشاہ دولہا کو سمجھانے لگا۔ "خاموشی سے ایک جگہ بیٹھے رہنا۔ زیادہ اِدھر اُدھر دیکھنا مت۔ آنکھیں نیچی رکھو، اور تمیز سے دعوت کا کھانا کھاؤ۔ کھانا کھانے کے بعد میں منتر پڑھوں گا اور تم سے کہوں گا۔ اب دولہا شادی کے منتر پڑھیگا اس خاص موقع کے لیئے وہ منتر تمہیں یاد ہیں نا، جو ہماری مقدس کتابوں سے لیئے گئے ہیں۔ انھیں تم نے ازبر کر لیا ہے نا۔ ذرا زور زور سے پڑھنا۔ سُنتے ہو؟"

"ہاں۔" مناشی گھبرایا ہوا بولا: "مقدّس کاہن، مَیں سُن رہا ہوں۔ مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات سے کیا جو ڈرتا تھا وہ بھول گئے؟" سوساشاہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"نہیں، مقدّس کاہن، یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"مجھے خود معلوم نہیں۔" مناشی وحشت زدہ ہو کر بولا: "مگر جونہی ہم گھر سے نکلے مجھے ڈر لگنے لگا اور عجیب طرح کا خطرہ سا محسوس ہونے لگا۔ جس راستے سے ہم گزرے، حالانکہ وہ ہمارا دیکھا بھالا تھا۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے ہم کسی اجنبی راستے سے گزر رہے ہیں۔ اور ہزاروں اجنبی آنکھیں مجھے چاروں طرف سے گھور رہی ہیں۔"

"مَیں دعا پڑھوں گا۔ راکو تمہیں شیطان کی نگاہ سے محفوظ رکھیں گے۔"

"مقدّس کاہن، میرا جی کہیں اکیلے پڑ رہنے کو چاہتا ہے۔ کیونکہ یہاں بھی وہ سب اجنبی لگتا ہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ وہ مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔ مجھ سے

اُلٹے سیدھے سوال پُوچھ رہی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی مجھے پھانسی کے تختے پر گھسیٹ کر لیئے جا رہا ہے۔ مقدّس کاھن' مجھے اس کنواری سے بھی ڈر لگتا ہے جو میری دُلہن ہونے جا رہی ہے"۔

"اپنا دِل کڑا کرو"۔ سوساشاہ اس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا: "دل سے سب ڈر نکال دو۔ ورنہ ممکن ہے تم مقدّس مَنتر بھُول جاؤ۔ چلو باہر۔ مَیں اکیلے میں تم سے سب سُنتا ہوں اور یاد کراتا ہوں"۔

کاھن سوساشاہ، مناشی کو گھر سے باہر لے گیا۔ اور چلتے چلتے وہ دونوں قبرستان کے باغیچے میں جا نکلے۔ مَنتر یاد کرتے کرتے مناشی، تورا اور اس کے عاشق کی قبر کے قریب رُک گیا۔ اور گھبرا کر کہنے لگا "یہ عجیب سی قبر کس کی ہے"؟

سوساشاہ کاھن اور مناشی دونوں نے جُھک کر قبر کا کتبہ پڑھا۔ پھر سَر جُھکا کر قبرستان کے باہر نِکل گئے۔ کافی دیر تک مناشی تھر تھر کانپتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں کانپ رہا ہے؟

واپس آتے آتے انھیں بہت سے بھکاری راستے میں مِلے۔ وہ باتیں کر رہے تھے۔ ایک بوڑھی لنگڑی بھکارن کہہ رہی تھی: "لو، پہلے ہم کو جلدی جلدی سے نِبٹا دیا اس دعوت میں۔ غریبوں کا کھِلانا پِلانا ہو چکا"۔

"ہاں"۔ ایک اندھا بولا: "اصلی دعوت تو اب شروع ہو گی"۔

"شوربہ کتنا کم تھا"۔ تیسرا بھکاری بولا۔

چوتھے نے کہا: "اور روٹی بھی صرف ایک تھی۔ صرف ایک' ایسے موقعوں پر بڑے لوگ دو روٹی دیتے ہیں تاکہ پیٹ بھر جائے"۔

لنگڑی بھکارن بولی: "دینا چاہتے تو ہمیں بھی مُرغی دے سکتے تھے اور زَردہ پُلاؤ۔ مگر مرغی، تیتر اور زردہ پُلاؤ تو باراتیوں کے لیئے ہے"۔

"کیا فرق پڑتا ہے"؟ اندھا بھکاری بولا "سبھی پیٹ میں پڑتا ہے۔ جہاں مرنے کے بعد سب کچھ کیڑے کھا جاتے ہیں۔ ہی ہی ہی"۔

بھکاری ہنسنے اور پھر کھانسنے لگا۔

جب بھکاری چلے گئے تو اِدھر اُدھر پریشان نظریں ڈالتے ہوئے سردار بلوآل بولا۔

"اماّں کہاں ہیں"۔

رَجی بولی: "وہ ابھی قبرستان سے نہیں لوٹیں۔ آنگی کو لے کر گئی تھیں۔

"کتنی دیر ہو گئی وہاں گئے ہوئے"۔ سردار بلوآل بولا: "کیا کر رہی ہیں وہ دونوں وہاں پر، ابھی تک آئیں کیوں نہیں"؟

رَجی بولی: "میں جا کے دیکھتی ہوں"۔

رَجی جانے والی ہی تھی کہ آنگن کے بڑے دروازے سے دادی دوَرماں اور آنگی اندر آتے دکھائی دیں۔ آنگی نے قبرستان جانے کے لیئے جو کالا شال اوڑھ رکھا تھا، وہ ابھی تک اس کے کندھے پر تھا۔ اور چہرہ سُتا ہوا اور سفید تھا، اور دادی دورماں اُسے ہولے ہولے کہہ رہی تھیں: "اب جلدی چلو نا کتنی دیر لگا دی تم نے۔ ہائے مَیں تمہیں وہاں لے کر ہی کیوں گئی"؟

ان دونوں کو اندر آتے دیکھ کر سردار بلوآل نے چین کا ایک سانس لیا۔ اور بولا۔

"لو وہ آگئیں۔ اب رسمیں شروع کرو"۔

ایک عورت کہنے لگی۔ "مومی شمعوں کے سامنے اب دُلہن کو دُعا کرنی چاہیئے، قاعدے کے مطابق"۔

دادی دوَرماں نے رَجی کے کہنے پر بتایا۔ "یہ وہاں بیہوش ہو گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لائی ہوں۔ اب تک میرا سارا بدن کانپ رہا ہے"۔

"بے ہوش ہو گئی ہو گی۔ اس ہفتے اِس نے کتنے تو فاقے کیئے ہیں۔ فاقے کرنے سے بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ آخر لڑکی تو ہے۔ بے چاری ماں کی قبر پر بہت روئی ہو گی"۔

دادی دوَرماں سَر ہلا کر بولیں: "بس کچھ مَت پُوچھو کیا ہوا وہاں پر"۔

لال گدّوں والی نشِست پر دُلہن کو شامیانے کے نیچے بٹھایا گیا۔ عورتوں کے اشارہ پر دولہا مناشی، دُلہن کی شال لے کر آگے بڑھا، جسے اوڑھ کر آنگی نے شادی

میں رسمیں ادا کرتی تھیں۔

مناشی نے جونہی شال لپیٹ کر دُلہن کے کندھوں کے گرد رکھی آنگی نے گھبرا کر شال کھول دی اور اُسے زور سے پھینک کر بولی "نہیں ... نہیں ... تم نہیں ... تم میرے دولہا نہیں ہو۔"

لوگ سکتے میں آ گئے۔ چاروں طرف چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ فوراً سردار بلوال آگے بڑھا اور پچکارنے کے انداز میں آنگی سے کہنے لگا۔

"کیا ہوا میری بچی کو؟ اس قدر گھبرائی ہوئی وحشت زدہ کیوں ہے؟"

آنگی اپنی نشست سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی "تورا۔ تورا مجھے بچا لو۔"

"راکو دیوتا مہربانی کریں۔ یہ کیا بک رہی ہے۔" دادی دُور ماں بولی ــ یکایک آنگی نے زور کی چیخ ماری اور اب کے نسوانی لہجے میں نہیں بلکہ ٹھیٹ مردانہ لہجے میں گرج کر کہنے لگی "ہوں۔ اچھا۔ تم لوگوں نے مجھے دفن کر دیا تھا۔ مگر میں واپس آ گیا ہوں۔ واپس اپنی دُلہن کے پاس۔ اب میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

آنگی کے گلے سے مردانہ آوازیں نکلتے دیکھ کر بہت سے لوگ وحشت زدہ ہو گئے۔ مناشی نے جب آگے بڑھ کے دلہن کو پکڑنا چاہا تو وہ زور سے ہاتھ چھڑا کر اُسی مردانہ لہجے میں بولی "کتے .... پرے ہٹ۔!"

دادی دُور ماں بولیں۔ "پاگل ہو گئی ہے یہ شاید۔ پاگل۔"

"پاگل نہیں۔" کاہن سوسا شاہ اپنا عصا ٹیکتے ہوئے گہرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "پاگل بالکل نہیں .... اس لڑکی کے بدن میں کوئی پریت گھس گیا ہے۔"

نواں باب

پوری بارات میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ یہ بات کہ آنگی کے بدن میں کسی پریت نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں، اپچھن ڈھوک، بچھن ڈھوک اور آس پاس کے گاؤں اور قرب و جوار میں پھیلتی جا رہی تھی۔ کچھ لوگ لڑکے والوں کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ بارات واپس لیجائیں۔

بارات واپس لے جانے میں سردار بلوال کی بڑی سُبکی ہوتی۔ اُس نے منت و سماجت کر کے بارات کو رات بھر اپنے گھر رکھا۔ اور دوسرے دن صبح اپنی لڑکی کو اپچھن ڈھوک سے لے کر شاہ بلوط کے بڑے معبد کی طرف کاہن شوپان سے ملنے کے لئے رخصت ہوا۔

شاہ بلوط کے معبد میں بھی بڑی ہلچل تھی۔ کل شام ہی سے تمام نئے راہب آنگی کے بدن میں اصل پریت کے حلول کر جانے کا ذکر کر رہے تھے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اتنے میں سمی نائین اور کاکا نانی بھی آن پہنچے۔

سمی نائین کو دیکھ کر ڈنجی بولا۔ سمی نائین کے پاس بڑی اچھی اچھی کہانیاں ہیں۔ ایسی ڈراؤنی اور دلچسپ کہ سُنو تو بخار چڑھنے لگے۔

چاکر نے پوچھا۔ کیسی کہانیاں؟

بڑا گہرا مطلب ہوتا ہے ان کا۔ اور معنی بھی مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ صوفی داؤد جب یہاں آئے تھے تو ایسے قصے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

صوفی داؤد کا مذہب اور ہے، ہمارا مذہب اور ہے۔

اس شاہ بلوط کے معبد میں جب صوفی داؤد آئے تھے تو مہابیر جوگی کو بھی بُلا لیتے تھے۔ ایک رات صوفی داؤد اور ہمارے مقدس کاہن شوپان اور مہابیر جوگی کے درمیان ایسی ایسی اُونچی باتیں ہوئیں کہ تم سُنتے تو حیران رہ جاتے ہر مذہب میں دوسرے مذہب کو سمجھنے کا طریقہ چھپا رکھا ہے۔ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ مثالیں صوفی داؤد اور کاہن شوپان اور مہابیر جوگی ایک دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں تو ہم معمولی راہب بھی سُن سکتے ہیں۔

ڈاگر نے سمی نائین سے کہا۔ "تو سناؤ۔"

کہانی سننے سنانے کا یہ کون سا وقت ہے۔ سمی نائین ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ابھی کاہن شوپان نہیں آئے۔ کاہن سوسا شاہ نہیں آئے۔ سردار بلوال اپنی لڑکی کو لے کر نہیں آیا۔

"کوئی اچھی سی کہانی سناؤ۔ ابھی تو وقت ہے۔" چاکر

بولا۔

"سپی نائین بولی"۔ تو ستو، جہاں پر یہ دنیا ختم ہوتی ہے وہاں پر ایک اونچا پہاڑ ہے۔ اس اونچے پہاڑ کے اوپر ایک اونچی چٹان ہے جس سے صاف شفاف پانی کا ایک چشمہ بہتا ہے۔ یہ چشمہ دنیا کے ایک سرے پر واقع ہے۔ دنیا کے دوسرے سرے پر اس دنیا کا دل ہے۔ اب یہ تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس دنیا میں ہر شے کا دل ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اس دنیا کا اپنا بھی ایک بہت بڑا دل ہے اور وہ دل ہمیشہ دوسرے سرے پر بہنے والے صاف چشمے کے پانی کو اپنی نگاہ میں رکھتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دنیا کا دل ایک ہی جگہ پر ٹکا رہتا ہے کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلے تو چشمے کا پانی اس کی نگاہ سے ہٹ جائے گا اور اگر ایک لمحے کے لئے بھی وہ ہٹے تو اُسی لمحے میں دنیا کا دل اِس مصفّا چشمے کے پانی کی نگاہ سے محروم ہو کر زندگی کھونے لگتا ہے۔

دوسری طرف صاف شفاف چشمے کے پانی کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہے۔ وہ اس وقت تک صاف شفاف رہتا ہے جب تک دنیا کا دل اس کی اجازت دیتا ہے اور یہ وقت صرف ایک دن کا ہے۔

جب دن ختم ہونے لگتا ہے تو چشمے کا مصفّا پانی دنیا کے دل کی طرف دیکھ کر ایک گیت گاتا ہے اور دنیا کا دل بھی گیت کی شکل میں اس کا جواب دیتا ہے اور ان دونوں کے گانے کی آواز اور اس کی گونج ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے اور اس کے سروں کے تار چمکتے ہوئے دھاگوں کی طرح ہر زندہ اور جاندار شے کے بیچ اور اس کے دل میں سے گزرتے ہیں اور پھر ایک سچّا راہب ان تمام تاگوں کو دنیا کے تمام دلوں سے اکٹھا کرتا ہے اور ان سے وقت بنتا ہے اور جب وہ ایک دن بن لیتا ہے تو وہ اُسے دنیا کے دل کو دے دیتا ہے، جو اُس دن کو مصفّا شفاف چشمے کو دے دیتا ہے اور اِس طرح سے زندگی کے چشمے کو ایک دن اور مل جاتا ہے۔

کولات: واہ۔ واہ .... مزا آگیا۔

"کاہن شوبیان آگئے"۔ سومارا راہب باہر سے دوڑا دوڑا آیا۔

کاہن شوبیان کی عمر کوئی ستّر برس سے اُوپر ہوگی، مگر اس کا چہرہ سُرخ تھا اور داڑھی سپید تھی اور وہ بدن کا مضبوط اور لانبا آدمی تھا۔ بارُعب مگر نرم دل۔ وہ دن رات گھومتا رہتا تھا اور شاہ بلوط کے معبد میں بہت کم آرام کرتا تھا۔ اس کی ریاضت دراصل عملی ریاضت تھی۔ اس کی زندگی کا بہت سا حصّہ بکروالوں کے خیموں اور ان کے جانوروں کی دیکھ بھال میں گذرتا تھا۔ کیونکہ جمدیال فرقے کا سب سے بڑا کاہن ہونے کے علاوہ وہ ایک بہت اچھا طبیب بھی تھا اور نفسیات کا ماہر بھی ——— اور خدا ترس ہونے کے علاوہ وہ لوگ تنتر بدیا، ٹَنَد اور اپنے کافرستان کے تیرہ مقدس پارچہ جات پر مکمل عبور رکھتا تھا۔ بکروالوں کا عقیدہ تھا کہ وہ رُوحیں بُلا سکتا ہے اور بھگا سکتا ہے۔ وہ نیچے پاتال تک جا سکتا ہے اور اوپر گیارہویں آسمان تک جہاں لاکو دیوتا رہتا ہے اور جہاں تک جاتے ہوئے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ کاہن شوبیان کی راست بازی، رہبانیت اور روحانی قوت کی سارے علاقے میں دھوم تھی۔ وہ اپنا مضبوط عصا ٹیکتے ہوئے معبد میں آیا اور لاکو کے سامنے دو زانو ہونے کے بعد دُعا پڑھنے کے بعد اپنے نئے راہبوں سے یوں ہمکلام ہوا

ایک دفعہ نیچے اپھن ڈھوک میں جب میں لڑکا سا تھا، نٹوں کا ایک قافلہ آیا تھا۔ اُس سمے میرا باپ کاہن دُردان زندہ تھا اور اس کے سامنے نٹوں نے اپنا تماشہ دکھلایا۔ اُنہوں نے نیچے ندی کے کھلے پاٹ کے دونوں طرف ایک رسّہ لٹکا دیا اور پھر اس پتلے سے رسّے کے اوپر چل کر ندی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلے گئے۔ سارا گاؤں یہ تماشہ دیکھنے کو موجود تھا اور لوگوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میرا باپ مقدس کاہن دُردان بھی یہ تماشہ دیکھنے کو موجود تھا۔ جب ... سے راہبوں نے پوچھا کہ آپ کے یہاں موجود ...

کے معنی کیا ہیں؟ تو میرے باپ نے بتایا۔ میں دیکھ رہا تھا کس طرح یہ نٹ ایک پتلے رسّے پر ندی کے دونوں کنارے پاٹ جاتے ہیں اور اس سے مجھے خیال آیا کہ اگر انسان اپنی رُوح کو سدھارنے میں بھی ایسی ہی لگن اور ریاضت کا ثبوت دیں تو وہ زندگی کے اس پتلے سے رسّے سے گذر کر جنّت تک پہنچ سکتے ہیں۔

"کتنا گہرا فلسفہ ہے!" کولات بولا۔

"اور اسے آئینے کی طرح عیاں کر دیا ہے۔" ڈنجی نے کاہن کا عصا چُوم کر کہا۔

سوما بولا "آج یہاں راہبوں کے علاوہ سمی نائین بھی موجود ہے۔"

کاہن شوپان بولا۔ "میں سمی نائین کو جانتا ہوں۔ اس نے بہت سے مدرسے، بہت سے قبیلے، بہت سے معبد دیکھ رکھے ہیں۔ بہت سے کاہنوں کو وہ جانتی ہے اور ان سے بڑا علم حاصل کیا ہے اِس نے۔ اس کی عزّت کرو۔ اسے شہد اور روٹی کھلاؤ۔ آؤ آؤ سمی نائین، تم بھی پیچھے مت بیٹھی رہو آگے آجاؤ۔"

سمی بولی۔ "میں مقدس باتیں سُن رہی تھی۔"

کاہن بولا۔ "خدا کی بتائی ہوئی یہ زمین بھی مقدس اور متبرک ہے اور اس میں متبرک کافرستان کا علاقہ بھی ہے اور اس علاقے کی سب سے مقدس اور متبرک جگہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں اس کے تیرہ پارچہ جات رکھے ہوتے ہیں۔"

اس دنیا میں تین سو قومیں ہیں اور ایک قوم کافرستان کی بھی ہے اور کافرستان میں سب سے بڑا درجہ جدیالوں کا ہے، جن کا کاہن سب سے مقدس مانا جاتا ہے۔

سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں۔ ان دنوں میں سب سے مقدس دن بُدھوار کا دن ہے۔ جس دن راکو دیوتا اُوپر آسمان سے اس زمین پر آئے تھے۔

دنیا میں ستّر بڑی مذہبی کتابیں ہیں۔ ان میں ایک کتاب ژند بھی ہے، جس کی مقدس ترین تشریح ہمارے تیرہ پارچہ جات میں پائی جاتی ہے۔ اِن تیرہ پارچہ جات میں سب سے مقدس راکو کے احکام ہیں اور ان احکام میں سب سے مقدس راکو کا نام ہے۔

ایک خاص وقت میں ایک خاص دن پر ایک خاص سال میں نیکی کی چار صداقتیں ملتی ہیں۔ وہ دن کفّارے کا ہوتا ہے، جس دن سب سے بڑا کاہن سب سے مقدس معبد میں سب سے مقدّس نام لیتا ہے اور یہ لمحہ بڑا ہی قیمتی مگر خوفناک بھی ہوتا ہے۔ جب راکو کا دوسرا نام لیا جاتا ہے، جو بہت کم لوگوں کو معلوم ہے اور یہ لمحہ اِس لئے بھی خوفناک ہوتا ہے کہ خدا کا دوسرا نام لیتے وقت اگر مقدّس کاہن کے دل میں کوئی بُرا خیال یا اس کا سایہ بھی آجائے تو دنیا میں اسی وقت قیامت آسکتی ہے۔

اور یہ بھی سُنو کہ جہاں پر کوئی آدمی کھڑا ہو کر اُوپر آسمان میں جھانکتا ہے، وہ جگہ بہت مقدّس ہے۔ ہر انسان کو راکو نے اپنی شبیہہ میں اُتارا ہے اس زمین پر۔ اس لئے ہر انسان خود ایک کاہن ہے اور اس کی زندگی کا ہر دن کفّارے یا قیامت کا دن ہے اور ہر لفظ جو اپنے دل سے بولتا ہے، راکو کا لفظ ہے۔ اس لئے ایک غلط لفظ سے تباہی آسکتی ہے۔

یکایک بوڑھے کاہن کی آواز کمزور پڑگئی۔ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جنم جنمانتر سے دکھ اور درد کے ساحلوں سے گزرتے ہوئے انسانی روح مقدّس مرکز کے گرد اس طرح طواف کرتی ہے۔ جیسے بچّے کا منہ ماں کی چھاتی کی طرف بڑھتا ہے مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک روح جو تقدّس اور پاکبازی کے آخری مرحلے سے گُذر رہی ہوتی ہے، یکایک کسی بُرے خیال کا شکار ہو جاتی ہے تو پھر وہ رُوح جتنا اونچا اُڑ سکی تھی، اتنا ہی نیچے گہرائیوں میں گرتی جاتی ہے اور اُس کے گرنے کے ساتھ ایک دنیا نیچے گر جاتی ہے اور اس دنیا کے دائرے میں بھونچال آجاتا ہے، اور زمین پیروں تلے سے کھسک جاتی ہے اور آسمان اور پاتال کے درمیان زندگی کے دس دائرے اس گمشدہ رُوح کا ماتم کرتے ہیں۔

اتنے میں کاکانائی نے آکے کہا۔" مقدس کاہن، سردار ملوال آئے ہیں۔"

"کیا بات ہے؟" کاہن شویان نے پوچھا۔

کاکانائی بولا۔" ایک خوفناک مصیبت آن پڑی ہے ـــ مقدّس کاہن بےچارے کی اکلوتی بیٹی کے بدن میں ایک پریت گھس آیا ہے۔"

"ایک پریت؟" کاہن نے قدرے توقف کے بعد اپنی سفید داڑھی پر ہات پھیر کر اپنے سفید کفتان پر پہنی ہوئی مقدّس مالا کے منکوں کو چھُو کر کہا۔" میں جانتا ہوں ...."

"وہ اپنی بچّی کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔"

"میرے پاس کیوں؟" کاہن شویان بولا۔" میں تو یوں ہی نہیں۔ میری تو کوئی ہستی نہیں ہے، تو پھر وہ میرے پاس کیوں آئے گا؟"

"مگر مقدّس کاہن وہ اور کہاں جا سکتا ہے۔ ساری دنیا تمہارے پاس ہی آتی ہے۔"

"اندھی دنیا آتی ہے۔ اندھی بھیڑیں اندھے چرواہے کے پیچھے چلتی ہوئیں۔ اگر ان کے پاس آنکھیں ہوتیں تو وہ میرے پاس آنے کے بجائے مقدّس راکو سے ہدایت چاہتے، کیونکہ اس دنیا میں صرف وہی ایک سچّائی ہے، وہی ایک خودی ہے، وہی ایک "میں" ہے۔ ہم سب تو کوئی بھی نہیں۔"

"تم اُس کے قائم مقام ہو، اُس کے نمائندے!" سمی نائین بولی۔

"ایسا لوگ کہتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، میں آج بھی نہیں جانتا میں کون ہوں۔ چالیس برس سے میں اس بڑے معبد کا کاہن ہوں۔ مگر مجھے آج بھی یقین نہیں آتا کہ میں سچ مچ اس کا قائم مقام ہوں۔

ہاں کبھی کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب مجھے اندر سے محسوس ہوتا ہے کہ میں اس کے قریب ہوں۔ میرے دل کے اندر کوئی شبہہ نہیں۔ میں اس کی بے پناہ قوت اور طاقت کو اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں سچ مچ اس دنیا کا مالک ہوں۔ مگر پھر دوسرے ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب مجھے اس بات کا یقین نہیں ہوتا۔ جب میں اپنے آپ کو بہت چھوٹا اور کمزور اور ایک بچّے کی طرح محسوس کرتا ہوں۔ جب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مدد کی ضرورت اُن کو نہیں ہے جو میرے پاس مدد کے لئے آتے ہیں بلکہ خود مجھے ہے۔"

کولات بولا۔" ہاں مقدّس کاہن ایک رات آپ پر ایسی ہی بھاری آئی تھی جب آپ نے مجھے سونے سے جگا دیا تھا اور رات بھر ہم دونوں بلند آواز میں تیرہ مقدّس پارچہ جات پڑھتے رہے تھے۔"

وہ بہت دنوں کی بات ہے۔ مگر آج اس سے بھی کڑا وقت پڑا ہے۔ آخر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں مجھ سے .... ستّر برس کا ہو چکا ہوں میں، بوڑھا اور کمزور .... اب مجھے قاعدے سے آرام کرنا چاہیئے۔ مگر ایک دن کا آرام حاصل نہیں ہے۔ کتنی مصیبت اور کتنا دُکھ ہے اس دنیا میں ... یہ منّت سماجت کرتی ہوئی دُکھی مصیبت میں گرفتار دنیا۔ گویا ہر لحظہ میرا رُواں رُواں چھید ڈالتی ہے، ایک ساتھ ایک ہزار برسے میں اپنے بدن میں محسوس کرتا ہوں۔ لگتا ہے اب مجھ میں وہ طاقت نہیں رہی۔"

مقدّس کاہن! مقدّس کاہن ـــ

کاہن شویان کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ بولا۔ نہیں، مجھ میں وہ طاقت نہیں ہے۔ نہیں ہے ....

"ہے ... ہے مقدّس کاہن۔" کولات نے دھیرج سے لیکن بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔" آپ کیوں بھُولتے ہیں کہ آپ راکو کے سب سے بڑے معبد کے کاہن ہیں۔ آپ کے باپ کاہن تھے کاہن دُردان! آپ کے دادا کاہن تھے، جن کے معجزوں کی برکت سے ہم لوگ وہاں سے یہاں تک ایک نئی سرزمین میں پھل پھُول رہے ہیں۔"

یہ الفاظ سنتے ہی جیسے مقدس کاہن کے بدن میں طاقت دَوڑ گئی۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔" نہیں نہیں، میں بھول نہیں سکتا۔ مقدّس دُردان اور میرے دادا مقدّس جیران کے کارنامے۔ سُنا ہے ایک دفعہ مقدس جیران نے ایک

مرے ہوئے کوڑھی کو زندگی بخشی تھی اور اسے بالکل ٹھیک کر دیا تھا اور میرے دادا بدریت نکالنے کے ماہر تھے۔ اس کے لئے انہیں مقدّس پارچہ جات کے حوالے دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک لفظ "نکلو" سے بدریت کو بدن سے خارج کر دیتے تھے جیسے پاؤں سے کانٹا نکال لیا جاتا ہے۔ بس۔ ایک حکم۔ ایک لفظ تک کافی تھا اُن کا۔ میں خود جب بھی کسی مشکل میں پھنس جاتا ہوں، اپنے دادا کی روح کو یاد کرتا ہوں اور اُن کی مدد لیتا ہوں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ سردار بلوال کو اندر بلا بھیجو۔"

سردار بلوال نے اندر آتے ہی کاہن شوپان کے پاؤں پکڑ لئے اور رو کر بولا۔

"کاہن۔ مجھ پر مہربانی کرو۔ میری اکلوتی بچی کو بچا لو۔"

کاہن نے پوچھا "یہ بدنصیبی تم پر کیسے آ گئی؟"

سردار بولا "جونہی لڑکا ایک شال لے کے دُلہن کو رسم کے مطابق ...."

کاہن نے بیچ میں سے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے یہ نہیں پوچھا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں، یہ واقعہ کیسے ہوا؟ تم جانتے ہو پھل کو کیڑا اسی وقت لگتا ہے جب وہ اندر سے سڑنے لگتا ہے۔"

"مقدّس کاہن، مقدّس کاہن ..." سردار بلوال رو کر بولا "میری اکلوتی بیٹی پاکباز اور شریف بچی ہے۔ وہ حیادار اور نیک ہے۔ اس نے آج تک میرے حکم سے ناعدولی نہیں کی۔"

کاہن شوپان آہستہ سے کہنے لگا "کبھی کبھی بچوں کو ان کے ماں باپ کے گناہوں کی سزا بھی ملتی ہے۔"

"اگر مجھے میرا گناہ معلوم ہو جائے۔" سردار بلوال نے اپنی چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا "تو میں اس کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"تم نے بدریت سے پوچھا بھی ہے کہ اس نے کیوں تمہاری بچی کے بدن میں حلول کیا ہے۔"

"وہ کوئی جواب نہیں دیتا مقدّس کاہن۔" سردار بلوال بولا "لیکن ہم سب نے اسے اس کی آواز سے پہچان لیا ہے۔ وہ یہیں آپ کے مدرسے میں راہب کا کام سیکھتا تھا اور پڑھتا تھا اور وہ اچانک ایک دن اسی معبد میں گر کر مر گیا۔ اُس کی موت بھی عجیب ہوئی تھی۔ مگر یہ کئی مہینوں پرانی بات ہے۔ سنا ہے وہ کالا علم بھی حاصل کر رہا تھا اور اسی کی وجہ سے اس کی جان گئی۔"

"کن قوتوں نے اُسے تباہ کیا؟"

"بُری قوتوں نے! مقدّس کاہن۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اپنے مرنے سے دو ایک گھنٹے پہلے وہ اپنے ایک راہب دوست سے کہہ رہا تھا کہ گناہ کے خلاف جدوجہد کرنا فضول ہے کیونکہ بنیادی اعتبار سے شیطان بھی مقدّس ہے۔ پھر میں نے سنا ہے اُس نے کالے علم کے ذریعے سونے کے سکّوں سے بھری ہوئی ایک دیگچی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔

"تم جانتے تھے اُسے؟"

"جی ہاں۔ میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس نے اسے اپنے گھر میں آپ کے کہنے سے پناہ دی تھی۔ اب تو آپ کو وہ یاد آ گیا ہوگا؟"

"یاد کرو۔" شوپان کاہن بولا "ممکن ہے تم نے کسی طرح اس کی بے عزتی کی ہو، یا کسی طرح کا بُرا سلوک اس سے کیا ہو یاد کرو۔"

مقدّس کاہن کی آنکھیں سردار بلوال کے چہرے پر گڑی تھیں۔ سردار بلوال نے پہلے تو برابر مقدّس کاہن کی آنکھوں میں تاکا۔ پھر گھبرا کر اس نے نگاہیں نیچی کر لیں — اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا "میں نہیں جانتا۔ مجھے کچھ — یاد نہیں ہے مقدّس کاہن۔ میں آخر ایک انسان ہوں، ممکن ہے ....." وہ چپ ہو گیا۔

مقدّس کاہن نے نظریں ہٹا لیں۔ آہستہ سے بولا "لڑکی کو اندر لاؤ۔"

سردار بلوال باہر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنگی اور دادی دُور ماں اور رجی کو لے کر اندر آ گیا۔ آنگی کے سر کے اُوپر وہی سیاہ شال تھی جو اس نے قبرستان

جاتے وقت اوڑھی تھی۔ وہ مدرسے کی دہلیز پر آ کر رُک گئی۔ اور اندر جانے سے انکار کرنے لگی۔

سردار بلوال رشک آمیز لہجے میں بولا۔ "اپنے بیچارے باپ پر رحم کرو بیٹی اور اندر چلو۔ مقدّس کاہن تمہیں بُلا رہے ہیں۔"

آنگی آہستہ سے اپنی آواز میں بولی۔ "میں جانا چاہتی ہوں اندر.... مگر نہیں جا سکتی۔"

"بچی، میں تمہیں حکم دیتا ہوں، اندر آ جاؤ۔" مقدّس کاہن نے کڑے لہجے میں کہا۔

آنگی دہلیز پار کر آئی۔ اُن کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

مقدّس کاہن بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

آنگی فرش پر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہی یکایک وہ کھڑی ہو گئی اور چیخ چیخ کر مردانہ آواز میں کہنے لگی۔ "مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو، میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

آنگی نے بھاگنے کی کوشش کی مگر سردار بلوال، رجی اور دادی دورماں نے اسے سنبھال لیا۔ جانے سے روک دیا۔

"پریت! تم کون ہو؟" مقدّس کاہن گرج کر بولا۔ "میں تمہیں حکم دیتا ہوں، جواب دو۔"

جواب ملا۔ "مقدّس کاہن تم اچھی طرح جانتے ہو میں کون ہوں، میں دوسروں کو نہیں بتانا چاہتا۔"

"میں نے تم سے تمہارا نام نہیں پوچھا ہے۔ میں پوچھتا ہوں تم ہو کون؟"

آنگی مردانہ آواز میں بولی۔ "میں وہ ہوں، جس نے اپنا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کر لئے۔"

مقدّس کاہن شوپان بولا۔ "دوسرے راستے وہی اختیار کرتا ہے، جو سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔"

"سیدھا راستہ بہت تنگ تھا۔" پریت نے جواب دیا۔

"یہ جواب میں نے پہلے بھی اُن سے سُنا ہے، جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے اور پھر واپس نہیں آئے۔ مقدّس کاہن نے سر ہلا کر کہا۔ پھر ذرا دیر چُپ رہنے کے بعد پوچھا۔

"تم اس کے بدن میں کیوں گھس آئے؟"

پریت بولا۔ "میں اس کا اصلی دُولہا ہوں، ازل سے طے شدہ!"

مقدّس کاہن بولا۔ "ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک مُردہ رُوح کسی زندے کے جسم میں نہیں ٹھہر سکتی۔"

آنگی بولی (پریت کی آواز میں) "میں مرا نہیں ہوں۔"

کاہن بولا۔ "ایک ہی بات ہے، تم ہماری دنیا چھوڑ کر چلے گئے اور اُس وقت تک تم اُٹھ نہیں سکتے جب تک قیامت کا صُور نہ پھونکا جائے۔ اس لئے میں تمہیں حکم دیتا ہوں، تم اس کنواری کا بدن چھوڑ دو۔"

یکایک آنگی مردانہ آواز میں چیخ کر بولی۔ "مقدّس کاہن، میں تمہاری طاقت جانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم گیارہویں آسمان تک جا چکے ہو۔ فرشتے بھی تمہارا حکم ٹالنے سے قاصر ہیں۔ مگر مجھ پر تمہاری حکومت نہیں چل سکتی۔ کیونکہ میرے پاس اور کہیں جانے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہر سڑک مجھ پر بند ہے اور ہر دروازے کے پٹ، اور ہر طرف سے بدی کی طاقتیں گھات لگائے بیٹھی ہیں مجھے پکڑنے کے لئے۔"

پریت کی آواز کانپنے لگی۔ آنگی کا سپید ستا ہوا چہرہ سُرخ ہونے لگا۔ مردانہ آواز آئی۔ "ایک طرف اُوپر جنّت ہے، نیچے زمین ہے اور بیچ میں کون و مکاں کی حدود میں ہزاروں دنیائیں ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک میں میرے لئے جگہ نہیں ہے اور اب جبکہ میری رُوح نے پیچھا کرنے والوں کے خوف اور ڈر سے کترا کر اپنے امان کے لئے ایک جگہ ڈھونڈ لی ہے تم مجھے یہاں سے بھی نکالنا چاہتے ہو۔ رحم کرو۔ مجھے یہاں سے جانے کا حکم مت دو۔ مجھے مجبور مت کرو۔"

آنگی چُپ ہو گئی۔

چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ سب دم بخود سُن رہے تھے۔

مقدس کاہن کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ وہ بڑی نرمی سے بولا "میرے دل میں تمہارے لئے رحم کا جذبہ موجود ہے۔ اے آوارہ روح! میں اپنی پوری طاقت استعمال کروں گا تاکہ تم بدی کی قوتوں کے جنگل سے بچ سکو مگر تمہیں اس کنواری کے جسم کو چھوڑنا ہوگا۔"

یکایک آنگی چلا کر مردانہ آواز میں کہنے لگی "میں انکار کرتا ہوں۔"

"اے پریت" مقدس کاہن نے اُسے دھمکاتے ہوئے کہا۔ "اُس آدمی کی روح، جس نے یہ ہماری دنیا چھوڑ دی ہے، میں تم سے پھر مقدس ژند اور تیرہ پارچہ جات کا حوالہ دیکر تمہیں تمہارے بزرگوں کی قسم دلا کر کہتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کاہن شوپان ولد کاہن دُردان ولد کاہن جیران اعظم، جن سے بڑا کاہن ہمارے قبیلے نے آج تک پیدا نہیں، میں ان سب بزرگوں کا نام لے کر تم سے کہتا ہوں کہ تم آنگی ولد سردار بلوال قوم جندیال کا جسم چھوڑ دو گے اور جسم چھوڑتے وقت اُسے یا کسی دوسرے کو کوئی گزند نہیں پہنچاؤ گے۔

لیکن اگر تم نہیں مانے تو میں اپنی پوری قوت استعمال کروں گا اور تم پر اپنے علم کی پوری طاقت سے لعنت بھیجوں گا۔ پھر تم کہیں کسی کام کے نہیں رہو گے۔ لیکن اگر تم نے میرا حکم مان لیا تو میں اپنی ہر روحانی قوت ان بدمعاش جنات، چڑیلوں اور بدروحوں کو بھگانے میں استعمال کروں گا جنہوں نے تمہیں گھیر رکھا ہے۔ ورنہ میری لعنت کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"میں کسی کے لعنت بھیجنے سے نہیں ڈرتا ہوں" آنگی چیخ کر بولی۔ "اور نہ مجھے تمہارے وعدوں کا اعتبار ہے، کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اب میری مدد نہیں کر سکتی۔ آسمان کی اونچی سے اونچی جگہ پر میرے لئے ایسی کوئی عافیت نہیں ہے جو مجھے یہاں ملی ہے۔ اور اگر میں اس جگہ کو چھوڑ دوں تو پاتال کی ایسی گہرائیوں میں گرا دیا جاؤں گا جہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی، اس لئے میں نہیں جاؤں گا۔"

مقدس کاہن رک رک کر کہنے لگا "راکو دیوتا کی قسم کھلا کر تم سے کہتا ہوں۔ آخری بار کہتا ہوں۔ اس کنواری معصوم لڑکی کے جسم سے نکل جاؤ اور یاد رکھو اگر تم نہ گئے تو میں تمہیں شیطانی قوتوں کے حوالے کر دوں گا۔"

چند لمحے مکمل خاموشی رہی۔ پھر آنگی مردانہ آواز میں یوں گویا ہوئی "خدائے برتر کا نام لے کر میں کہتا ہوں کہ میں اپنی منگیتر کے پاس ہوں اور ہمیشہ ابد سے ازل تک اس کے پاس رہوں گا۔"

مقدس کاہن سیدھا تن کے کھڑا ہو گیا۔ کولات کو اشارے سے بلاتے ہوئے بولا "باہر معبد میں جاؤ اور وہاں سے نو نفیریاں اٹھا لاؤ، اور نو کالی شمعیں کالے شمعدانوں میں لگی ہوئی، اور تیرہ مقدس پارچہ جات کے بستے تہہ کر کے یہاں اُٹھا لاؤ اور پھر میرا یہ عصا لے جاؤ اور نیچے اچھن ڈھوک سے سردار بلوال کے گھر سے مقدس کاہن سوساشاہ کو میرا عصا دے کر کہنا کہ کاہن شوپان نے آپ کو بلا بھیجا ہے۔"

کولات نے مقدس عصاہات میں لیا۔ نو نفیریاں وہ باہر معبد سے لے کر اندر آیا۔ پھر نو شمعدانوں میں نو کالے رنگ کی شمعیں اُٹھا لایا۔ پھر وہ مقدس پارچہ جات کے بندھے بستے اٹھا کر لے آیا اور لکڑی کے ایک تخت پر اُس نے یہ سب سامان نہایت قرینے سے رکھ دیا اور پھر کاہن کا عصا اُٹھا کر نیچے اچھن ڈھوک کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد مقدس کاہن شوپان نے سردار بلوال سے پوچھا۔ "بلوال، دولہا اور اس کے گھر والے اور باراتی کہاں پڑے ہیں؟"

"نیچے میرے گھر میں۔"

"کاکا نائی کو اُن کے پاس بھیجو اور میری طرف سے کہلوا دو کہ وہ رُکیں اور میرے حکم کا انتظار کریں۔"

سردار بلوال اٹھا اور باہر جاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں ابھی کاکا نائی کو بھیجے دیتا ہوں، اور اگر کولات

نہ گیا ہوگا تو اُسی کے ہات یہ پیغام بھیجدوں گا۔"

سردار بلوال جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد مقدّس کاہن نے دیکھا کہ نیچے فرش کے غالیچے پر ایک کونے میں آنگی دبکی لیٹی ہے اور اس نے سیاہ شال چاروں طرف سے اپنے گرد اوڑھ رکھی ہے۔ وہ اِس وقت بالکل بے ہوش سی دکھائی دیتی تھی' یا نیند میں غلطاں ....

مقدّس کاہن بولا "دادی دورماں اور رجی تم دونوں اب اس لڑکی کو میرے کمرے سے لے جاؤ اور باہر میرا انتظار کرو۔"

رجی نے ہولے سے آنگی کو جگایا۔ وہ چونک کر جاگی' ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ نرم کمزور آواز میں بولی۔ "دادی' وہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے ... کیا کریں گے یہ لوگ اب ...."

دادی دورماں اُسے پچکارتے ہوئے بولی۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم مقدّس کاہن کے ہات میں ہو۔ شاہ بلوط کے مقدّس معبد میں ہو۔ یہاں کوئی تمہیں گزند نہیں پہنچا سکتا۔ میری عزیز بچّی بے فکر رہو۔"

"تسلّی رکھو۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔" رجی آنگی کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔ "چلو دوسرے کمرے میں۔ کاہن نے حکم دیا ہے۔"

آنگی سر جھکا کے دادی دورماں اور رجی کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

دسواں باب

کولات چلا گیا تھا۔ اِس لئے کاکانائی کو بھیجنا پڑا۔ جب کاکانائی اور کولات کاہن سوساشاہ کو لے کر واپس پہنچے تو تیسرا پہر ڈھل رہا تھا۔

مصافحہ کرنے کے بعد کاہن سوساشاہ کو مخاطب کر کے کاہن شویان کہنے لگے۔ "ایک پَریت حلول کر چکا ہے سردار بلوال کی لڑکی آنگی کے بدن میں۔"

"مجھے معلوم ہو چکا ہے۔" سوساشاہ بولے۔

"میں نے بہت سمجھایا مگر وہ پَریت کسی طرح وہاں سے نکلنے کے لئے تیار نہیں ہے' اِس لئے اس پر آخری حربہ استعمال کرنا ہوگا۔ آخری لعنت بھیجنی پڑے گی۔ آپ چونکہ دوسرے قبیلے کے کاہن ہیں جن کے گھر لڑکی بہو بن کر جائے گی' اِس لئے آپ کی اجازت بہت ضروری ہے۔"

سوساشاہ کاہن نے سر ہلا کر چند لمحے اپنی کھچڑی داڑھی پر خاموشی سے ہات پھیرا۔ پھر بولے۔ "لعنت بھیجنا بڑی بھاری سزا ہے زندوں کے لئے۔ لیکن جو مر جائے اُس کے لئے اور بھی بے رحم بات ہے۔ مگر جیسا کہ تم کہتے ہو وہ پَریت کسی طرح سے نہیں مانتا اور اس معصوم بچّی کو چھوڑنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے' تو مجھے بھی اجازت دینے میں کوئی عار نہیں ہے۔ لیکن اِس وقت جو میں تمہارے کہنے پر بھاگم بھاگ چلا آیا تو اس کی وجہ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مجھے بھی تم سے اِس سلسلے میں مشورہ کرنا ضروری ہو چلا ہے۔"

"کس بارے میں؟"

"اُسی قصّے کے بارے میں۔" کاہن سوساشاہ بولا۔

"ایک راز ہے جو میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں۔ کچھ عرصہ ہوا نیچے اچھن ڈھوک میں ایک اجنبی بورین داھل' سردار بلوال سے ملنے آیا تھا اور اس نے نشانی کے طور پر اپنی انگلی سے انگوٹھی اُتار کر سردار بلوال کو بھیجی تھی مگر سردار بلوال گاؤں سے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ جب وہ واپس لوٹا تو وہ اجنبی مر چکا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد آیا۔ اس کی لاش ہمارے قبیلے کے قبرستان میں دفن کر دی گئی تھی۔ اسی لڑکے کی قبر کے قریب ...."

"ہاں وہی ہے' بورین داھل .... وہ میرے گاؤں کا تھا اور کل رات وہ تین مرتبہ مجھے خواب میں ملا۔ کہہ رہا تھا کہ اُسے سردار بلوال کے خلاف شکایت ہے۔ وہ اپنا مقدمہ راکو دیوتا کے توسط سے ہمارے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔"

"سردار بلوال کے خلاف کیا شکایت ہے اُسے ـ؟" شوپان کاہن نے پوچھا۔

"خواب میں اس نے مجھے یہ سب کچھ نہیں بتایا۔ بس باربار وہ یہ کہتا رہا کہ سردار بلوال نے اس کے ساتھ بڑی نازیبا حرکت کی ہے' جان لیوا حرکت کی ہے ___ لفظ "جان لیوا" اُس نے تین دفعہ دُہرایا...."

"ہمارے مذہب میں زندوں اور مُردوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔ ہم دونوں کو راکو دیوتا کے حضور میں بُلا کر ان کا مقدمہ سُن سکتے ہیں اور منصفی کر سکتے ہیں لیکن میں تم سے یہ پوچھتا ہوں معزز کاہن کہ تمہارے اس خواب سے اِس لڑکی کے پریت کا کیا تعلق ہے؟"

"تعلق یوں ہوتا ہے" سوساشاہ بولا "میرے کانوں میں اُڑتی اُڑتی یہ خبر پڑی ہے کہ جس پریت نے سردار بلوال کی لڑکی کے بدن میں اپنا مسکن بنایا ہے' وہ دراصل بورین داہل کا بیٹا چنن تھا۔

"چنن؟ بورین داہل کا بیٹا"

اور یہ کہ جو انگوٹھی بورین داہل نے سردار بلوال کو بھیجی تھی وہ ایک خاص عہد یاد کرانے کے لئے تھی' جو اُن دونوں نے ایک دوسرے سے جوانی میں کیا تھا۔ سُنتا ہے کہ جوانی میں یہ دونوں ایک دوسرے کے بہت دوست تھے' یہ بھی میں نے سُنا ہے کہ سردار بلوال نے اپنی جوانی میں ___ بورین داہل سے کوئی ایک پیمان کیا تھا۔ وہ اس نے پورا نہیں کیا۔"

مقدّس کاہن شوپان کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پھر اپنی سفید داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا ___ "یہ بات ہے' یہ بات ہے۔ تو' تو میں پریت نکالنے کا عمل کل شام تک ملتوی رکھتا ہوں اور کل صبح کی دُعا کے بعد ہم بورین داہل مرحوم کی رُوح کو راکو کے حضور میں آنے کی دعوت دیں گے تاکہ وہ اپنا مقدمہ پیش کر سکے اور اس کے بعد سہ پہر یا شام کے قریب میں پریت کو لڑکی کے بدن میں سے نکال دوں گا۔"

"یہ معاملہ ہے بھی عجیب"۔ کاہن سوساشاہ بولا۔ "ایک زندے اور ایک مُردے کے درمیان مقدمے کی سماعت صرف ہمارے مذہب میں ممکن ہے"۔

پہلے پہل بہت سی جگہوں پر بہت سے پاکیزہ لوگوں کے درمیان اِس قسم کے مقدمات کو سُننا ایک فطری عمل تھا۔ مگر جوں جوں انسان کی تہذیب ترقی کرتی گئی' مُردوں اور زندوں کے درمیان دیوار اُوپر اٹھتی گئی اور اب ___ تو تہذیب یافتہ شہری علاقوں میں اس قسم کے مقدمات پر شدید حیرت ظاہر کی جائیگی۔

"تہذیب کے جہاں بہت سے فائدے ہیں' وہاں کچھ نقصان بھی ہوئے ہیں"۔

"مثلاً"

"مثلاً یہی کہ بہت سی آوازیں مہذب لوگ سُن نہیں سکتے۔ بہرے ہو چکے ہیں۔ بہت سی اشیاء دیکھ نہیں سکتے۔ چھٹی حس تقریباً تقریباً مر چکی ہے۔ نتیجہ ہمیں ان لوگوں سے کیا؟"

اتنا کہہ کر سوساشاہ چپ ہو گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا "میں چاہتا ہوں مقدّس کاہن شوپان کہ اس مقدمے کے اعلیٰ ترین جج آپ ہی ہیں۔ علم و فلسفہ' تجربے اور روحانیت کے اعتبار سے آپ ہر اعتبار مجھ سے بہتر اور بلند تر ہیں"۔

"لیکن زندہ اور مردہ کے درمیان مقدمہ سُننے میں اکیلے آدمی کے لئے بڑی صعوبتیں ہیں"۔ کاہن شوپان بولے۔ "میں چاہوں گا اس مقدمے کی سماعت کے دوران آپ بھی میرے ساتھ رہیں اور اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو دوسرے مذاہب کے صُوفی بزرگوں کو بھی بُلا لیا جائے۔ ایک صوفی داؤد۔ دوسرے مہا بیر جوگی۔ وہ لوگ بھی ان معاملات میں گہرا دخل رکھتے ہیں"۔

"بُلا لیجیئے"۔ کاہن سوساشاہ بولا۔ "لیکن آخری فیصلہ کرنا آپ کے ضمیر کا کام ہے"۔

"ٹھیک ہے"۔ کاہن شوپان نے سر ہلایا۔

اتنے میں کولات اندر آیا۔ کولات کو دیکھ کر کاہن شوپان بولے۔" جاؤ۔ سردار بلوال سے کہدو' بچّی کو لے کر اندر آ۔ ئے۔"

کولات کے جانے کے چند منٹ بعد سردار بلوال' دادی دُور ماں اور رجی آنگی کو سنبھالے ہوئے اندر آ گئے۔

اندر آتے ہی آنگی کاہن شوپان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے سر پر ہات رکھ کر کاہن شوپان نے بڑی نرمی سے کہا

" پریت۔ میں تمہیں کل سہ پہر تک کا وقت دیتا ہوں۔ اگر کل سہ پہر تک تم خود بخود اس معصوم لڑکی کے جسم سے نکل گئے تو میں تم سے کسی طرح کا تعرض نہ کروں گا۔ بصورتِ دیگر اپنی تمام قوت اور طاقت استعمال کر کے تمہیں اِس لڑکی کے بدن سے الگ کر دوں گا۔

جاؤ۔ بچّی کو لے جاؤ۔"

رجی اور دادی دُور ماں آنگی کو پکڑ کر کمرے سے باہر لے گئیں۔ سردار بلوال بھی ان کے پیچھے پیچھے جانے والا تھا کہ کاہن شوپان نے اسے روک کر کہا

سردار بلوال، کیا تم اپنی جوانی کے دوست بورین داہل کو جانتے ہو؟"

سردار بلوال یہ سُنکر گھبرا گیا۔" بورین داہل؟ —— مگر وہ تو مر چکا ہے نا؟"۔

" تو جان لو۔" کاہن شوپان نے بڑی سختی سے کہا " کل رات وہ تین بار مقدّس کاہن سوساشاہ کے خواب میں آیا اور عرض کی کہ تم نے اس کے ساتھ کوئی ایسی نازیبا اور جان لیوا حرکت کی ہے جس کا مقدمہ وہ ہماری عدالت میں راکو دیوتا کے سامنے شاہ بلوط کے معبد میں رکھنا چاہتا ہے۔ کل صبح کی دعا کے بعد تمہیں یہاں آکر جواب دہ ہونا پڑے گا۔"

" مقدمہ؟ —— میرے خلاف۔ مجھے آنا پڑے گا، ہے راکو، کیا میری مصیبتوں کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا۔

پھر وہ دونوں کاہنوں سے مخاطب ہو کے کہنے لگا۔" وہ مجھ سے کچھ چاہتا ہے۔ کس چیز کا طالب ہے کاہن۔ راکو کے لئے میری مدد کرو۔"

" اپنا مقدمہ وہ یہیں ہمارے سامنے پیش کریگا۔ اور اپنے الزامات میں ہمارے تمہارے سامنے رکھے گا اِس لئے کل صبح تمہیں ضرور آنا ہے۔"

" جس طرح آپ کا حکم ہوگا کاہن' میں ویسا ہی کروں گا۔" سردار بلوال نے سر جُھکا کے کہا۔

" کل صبح میں صوفی داؤد کو اور مہا بیر جوگی کو بھی بُلاوا بھیجدو کہ وہ بھی تشریف لائیں اور مقدمے کی سماعت میں میرے ساتھ شریک رہیں۔ پھر کل شام سے پہلے سہ پہر کے قریب تم سب باراتیوں اور لڑکے والوں اور دولہا اور اس کے باپ اور ان کے ساتھ آتی ہوئی عورتوں کو بھی مطلع کر دو' وہ بھی یہیں آجائیں۔ میں اسی وقت پریت کو خارج کر کے اپنے سامنے دولہا اور دلہن کی شادی کر دوں گا۔ شادی کا شامیانہ یہیں لگا دیا جائے۔"

سردار بلوال بولا۔" ہو سکتا ہے اب ان لوگوں کو اس شادی میں کوئی اعتراض ہو۔"

" کن کو؟"

" لڑکے والوں کو"

لڑکے والوں کی ذمے داری مَیں لیتا ہوں"۔ کاہن سوساشاہ بولا۔" میں ان کے ساتھ آیا ہوں۔ وہ نہ کاہن شوپان سے' نہ میرے حکم سے پھر سکتے ہیں۔"

کاکانائی۔ کاہن شوپان بولا۔ لڑکے والوں سے کہہ دو' وہ کل یہاں ٹھیک وقت پر شاہ بلوط کے معبد میں حاضری دیں۔

کاکانائی بولا۔ وہ سب کل یہاں سہ پہر میں حاضر رہیں گے۔"

کاہن شوپان اور کاہن سوساشاہ رات بھر عبادت میں مصروف رہے۔ صبح سویرے منہ اندھیرے

کولات کو جگا کر کاہن شوپان نے اپنا عصا اس کے ہات میں دیا اور اس سے بولا

" کولات تم میرا عصا لے کے قبرستان میں جاؤ۔ جب قبرستان کے اندر پہنچ جاؤ تو آنکھیں بند کر لینا اور اس عصا سے راستے ٹٹول کر آگے بڑھتے جاؤ اور پہلی قبر جو تمہیں ملے اُس پر اس عصا سے تین بار دستک دے کر جو میں کہتا ہوں وہی الفاظ لفظ بلفظ کہنا۔"

" جی ؟" کولات تھر تھر کانپتے ہوئے بولا۔

" گھبراؤ نہیں۔ جب تک یہ عصا تمہارے ہات میں ہے، تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ تین بار دستک دے کر کہنا اے پاک اور محترم مُردے، مجھے مقدس کاہن شوپان ولد کاہن دُردان ولد کاہن جیران اعظم نے بھیجا ہے۔ تکلیف معاف ہو، مگران کا حکم یہ ہے کہ آپ اپنے طریقے اور ڈھنگ سے جسے آپ خود بہتر سمجھتے ہیں، بورین داہل کو مطلع کر دیں کہ آج وہ صبح کی دُعا کے بعد شاہ بلوط کے معبد میں اپنی شکایت لے کر حاضر ہو۔ میں شوپان کاہن خود اس کے مقدمے کی سماعت کروں گا۔ میرے ساتھ تین مُنصف بزرگ ہوں گے کاہن سوسا شاہ، صوفی داؤد اور جوگی مہابیر۔ اس سے کہنا کہ وہ اُنہی کپڑوں میں حاضر ہو، جو آخری وقت اس نے پہنے ہوئے تھے۔ یہ الفاظ تین دفعہ دُہرانا کولات۔ صرف تین بار۔ پھر آنکھیں بند کیے، وہاں سے پلٹ کر قبرستان سے باہر آجانا اور آنکھیں کھول دینا۔ مگر زینہار کبھی پلٹ کے پیچھے نہ دیکھنا۔ ممکن ہے تم اپنے پیچھے چیخیں سُنو، ڈراؤنی دل دہلا دینے والی چیخیں، یا آوازیں، یا رونے کی آوازیں، یا ہنسنے کی آوازیں۔ مگر کبھی پلٹ کر نہ دیکھنا۔ کبھی اس عصا کو اپنے ہات سے نہ چھوڑنا، ورنہ سخت مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ سمجھ گئے۔"

" جی ہاں۔" کولات کانپتے ہوئے لہجے میں بولا مگر اس نے عصا کو مضبوطی سے تھام لیا اور نیچے اچھن ڈھوک کی طرف روانہ ہوگیا۔

آسمان پر ابھی سپیدۂ سحر نمودار نہ ہوا تھا۔

ہوا میں برفیلی خنکی تھی۔ کاہن شوپان نے اپنا کفتان ٹھیک کیا۔ پھر سجدے میں گر پڑا۔

اس کے قریب کاہن سوسا شاہ بدستور سجدے میں تھا۔

گیارھواں باب

رات کو صرف سردار بلوال نیچے اچھن ڈھوک میں اپنے گھر گیا تھا۔ کیونکہ لڑکے والے اس کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔

مگر آنگی کو واپس گھر نہیں لے جایا گیا۔ بڑے مندر سے کے ایک حصے کو الگ کر کے اس میں آنگی، دادی دُوردماں اور رجی کو سُلا دیا گیا، اور رات بھر راہب معبد خانے میں آنگی کے لئے دُعائیں مانگتے رہے، اور رات بھر آنگی نیند میں بڑبڑاتی رہی۔ کبھی اپنی آواز میں، کبھی پریت کی آواز میں۔ پھر رجی یا دادی دوردماں اسے اپنی باہوں میں لے لیتیں اور تھپک تھپک کر سُلانے کی کوشش کرتیں۔ تھوڑے عرصے کے لئے آنگی سو جاتی۔ پھر ایک ہلکی سی چیخ مار کر جاگ جاتی اور مُنہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتی۔ کبھی خاموش ہو جاتی اور بستر پر بیٹھ کر خلاؤں میں تکنے لگتی۔ کبھی ہولے ہولے کراہتی۔ کبھی نیند میں غافل ہو جاتی اور کچھ عرصے تک آرام سے سوئی رہتی، اچانک چونک کر پھر جاگ جاتی۔

رات بھر یہی عمل رہا۔

صبح سویرے البتہ آنگی کی آنکھ لگ گئی۔ پھر بہت دیر دن چڑھے تک وہ سوتی رہی۔ اس کے سو جانے کے بعد دادی دُوردماں اور رجی کی بھی آنکھ لگ گئی اور وہ بھی دیر تک سوتی رہیں۔

رات بھر بڑے زور کی بارش ہوئی۔ بہت گرج اور چمک تھی۔ لاکھوں توپیں ایک ساتھ چھوٹ رہی تھیں۔ طوفان بلند و بالا چوٹیوں سے نیچے کی ڈھوکوں تک پھیلا رہا، سردار بلوال کے گھر کے قریب بجلی گر پڑی۔ لیکن شکر ہے مکان بچ گیا اور کسی باراتی کو گزند نہیں پہنچا۔

ہوا کے تیز و تند جھکڑوں نے زمین و آسمان کو ہلا ڈالا۔ بارش کے تھپیڑے آتے تھے اور برستے

گرجتے نکل جاتے تھے۔ پھر چند منٹ خاموشی رہی پھر جیسے طوفان پھٹ پڑا۔ بڑے زور کی ژالہ باری ہوئی اور دُور دُور تک بجلیوں کے رقصاں لہرئیے ناچتے رہے۔

پھر طوفان برف باری میں تبدیل ہوگیا۔ چاروں طرف گہرا کہرا اور دھند چھاگئی اور اس میں برف کے گالے دُھنکی ہوئی رُوئی کی طرح چپ چاپ خاموشی سے زمین پر گرتے گئے۔ اب چمک تھی، نہ گرج۔ بجلی کے لہرئیے نہ طوفان۔ ایک سپید دھند میں لاکھوں کروڑوں گالے برف کے چھوٹے چھوٹے روتے ہوئے پھول، پہاڑ۔ جنگل۔ وادی۔ پیڑ۔ مکان انسان ہر شئے پر گرتے رہے، گرتے رہے۔ کہتے ہیں برسوں کے بعد ایسی شدید برف باری ہوئی تھی۔ صبح جب دُھند چھٹی اور برف باری رُکی تو گرجن سے نیچے اچھن ڈھوک تک پہاڑ، وادیاں، گھاٹیاں، اشجار سب برف کا سپید لبادہ اوڑھے کاہنوں کی طرح مقدّس اور پاکیزہ صورت ہو کر کھڑے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ مقدمے کے انتظار میں ہوں، جو ابھی شاہ بلوط کے معبد میں سب کے سامنے شروع ہونے والا تھا۔

شاہ بلوط کے گھنے سایوں تلے معبد بالکل محفوظ رہا تھا۔ نیچے پانی کی ایک بُوند نہ گری تھی۔ نہ برف کا کوئی گالہ۔ طوفان اس مقدّس معبد کے اُوپر ہی اوپر گزر گیا تھا شاہ بلوط کے تنے کے نیچے کی گھاس تک خشک اور سنہری تھی اور پاؤں کے نیچے چرچراتی تھی۔

صبح جس وقت سُورج نکلا اور کاہن شوپان اور کاہن سوساشاہ معبد میں دُعا پڑھ کر فارغ ہوئے، عین اُسی وقت معبد میں صوفی داؤد اور مہابیر جوگی بھی داخل ہوئے۔

صوفی داؤد نے آتے ہی کاہن سوساشاہ سے کہا۔
"تم نے اچھا خواب دیکھا۔ اچھا خواب۔ بہت اچھا خواب ......"

مقدّس کاہن شوپان بولا۔ "میں نے اس خواب کی تعبیر بھی ڈھونڈ لی ہے۔"

کاہن سوساشاہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں نے اچھا خواب دیکھا۔ اچھا خواب تھا۔ ٹھیک ہی خواب تھا وہ۔"

کاہن شوپان نے اپنی سفید داڑھی پر ہات پھیر کر کہا "صوفی داؤد اور مہابیر جوگی جب آ گئے ہیں تو اب مقدمے کی تیاری میں دیر نہ کرنی چاہیئے۔ مُردہ آدمی کی رُوح کو بلانے کے لئے میں نے کولات کو بھیجدیا ہے مگر اس کی آمد سے پہلے میں یہاں بائیں طرف معبد خانے کے اس طرف ایک گول ہالہ کھینچ دیتا ہوں۔ جس کے اوپر مرنے والے کی روح نہ جاسکے گی اور یہاں لکڑی کی تین کھپچیاں لگا کر اس دائرے کے گرد کپڑا کھینچ دیا جائے۔"

کاہن شوپان نے معبد کے بائیں طرف منتر پڑھ کر ایک ہالہ زمین پر کھینچ دیا اور پھر راہبوں کی مدد سے اُس کے چاروں طرف ایک چادر دائرے کی صورت میں تان دی گئی۔

اس کے بعد سردار بلوال کو بلایا گیا۔

جب سردار بلوال آیا تو اس سے کاہن شوپان نے پوچھا۔

"کیا تم نے دولہا اور اس کے باپ اور باراتیوں سے کہہ دیا ہے کہ شادی آج پریت نکالنے کے بعد اسی معبد خانے میں ہوگی، وہ لوگ دن ڈھلنے پر، سورج غروب ہونے سے پہلے پہنچ جائیں۔"

سردار بلوال بولا۔ "جی ہاں۔ میں نے کہہ دیا ہے مگر سب گھاٹیاں، پہاڑ، ڈھلوانیں، وادیاں برف سے پٹ گئی ہیں۔ سب راستے بند ہو چکے ہیں۔ میں خود بڑی مشکل سے پہنچا ہوں۔ رات کے تیسرے پہر اُٹھ کر چلا تھا اب پہنچا ہوں۔ وہ لوگ بھی دوپہر کا کھانا کھا کر وہاں سے چل دیں گے۔ راکو کا شکر ہے کہ آج برف باری بند ہے اور سورج بھی نکل آیا۔ ورنہ رات کو تو قیامت کا منظر تھا۔"

"سردار بلوال!" کاہن شوپان نے اس سے کہا۔ "میں نے کل رات ہی کولات کو لودین داہل کی مقدّس

روح کو بلانے کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ وہ اب آتا ہی ہو گا۔
لیکن روح کو اِس تنی ہوئی چادر کے مقدس کٹہرے میں بُلانے
سے پہلے میں تم سے یہ پوچھ لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تم اس
عدالت کے فیصلے کے پابند رہو گے۔"

"جی ہاں مقدس کاہن۔ میں اپنے آپ کو پابند سمجھوں گا۔"

"تو ذرا دو قدم پیچھے ہٹ کر دائیں طرف یہاں کھڑے ہو جاؤ
لکڑی کے اس تختے پر۔" سردار بلوال مقدس کاہن کے بتائے
ہوئے لکڑی کے تختے پر کھڑا ہو کر کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں
کہنے لگا۔

"مقدس کاہن مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ بورین داہل
کی شکایت شاید کسی حد تک اس وعدے سے تعلق رکھتی
ہے جس کے متعلق ہم دونوں نے اپنی جوانی میں عہد و پیمان
کیا تھا۔ مجھے اب وہ معاملہ یاد آ رہا ہے مگر اس معاملے
میں میں بے قصور ہوں۔"

"اِس سلسلے میں عدالت تم سے بعد میں پوچھے گی۔
پہلے مرحوم کو شکایت کرنے دو۔"

اتنے میں کولات معبد خانے میں داخل ہوا۔ مقدس
عصا اس کے ہات میں تھا، اور وہ بے حد تھکا ہوا اور
سہما ہوا اور ڈرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اندر آ کے
کچھ کہا نہیں۔ صرف عصا اس نے مقدس کاہن کے ہات
میں تھما دیا۔

کاہن شویان اس عصا کو لے کر تنی ہوئی چادر تک
گیا اور تین بار اس کے گرد طواف کر کے واپس آ گیا۔

پھر کاہن سوساشاہ، صوفی داؤد اور جوگی مہابیر
سے مخاطب ہوا۔

"اب بہت جلد ہمارے درمیان ایک مقدس رُوح
آنے والی ہے، سچی دنیا میں سے، یہاں کوئی جھوٹ نہیں
بولتا ہے اور یہ مقدمہ ایک اِس سچی دنیا میں رہنے والی
رُوح اور ہماری جھوٹ سے معمور دنیا کے ایک فرد
کے درمیان ہے، اور یہ عدالت اس امر کی گواہ ہے
کہ فطرت کے اعلیٰ ترین قانون ساری دُنیاؤں اور
کائناتوں میں تمام لوگوں کے درمیان سب پر یکساں حاوی
ہیں۔ مُردوں پر بھی اور زندوں پر بھی۔ بلکہ یہی وہ قوانین
ہیں، جو مُردوں کو زندوں سے ملاتے ہیں۔

پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ایسا مقدمہ بہت
ہی مشکل اور خطرناک ہوتا ہے۔ آج سب دنیاؤں کی
نگاہیں افلاک سے تحت الثریٰ تک اِس عدالت پر
ہیں اور اس لئے میں نے اپنے عقیدے کے معبد خانے
میں دوسرے عقیدے والے بزرگوں کو آنے کی دعوت
دی ہے، صوفی داؤد اور جوگی مہابیر کو، تاکہ یہ عدالت،
فطرت کے اعلیٰ ترین قوانین سے سرِ مُو انحراف نہ کر سکے۔
آخر میں پھر بھی ایک انسان ہوں اس لئے اس مقدمے
کی سماعت کے دَوران عجیب و غریب خوف اور ہراس
سے دوچار ہوں۔ ایک عجیب و غریب خوف اور ہراس
سے ....

یکایک کاہن شویان بولتا بولتا رک گیا اور حیرت
سے بائیں طرف تنے ہوئے حصار کی جانب دیکھنے لگا۔
اس کے بعد یکایک مہابیر جوگی نے دھیرے سے کہا۔

"میرے خیال میں وہ آ گیا ہے۔"

صوفی داؤد نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ مرحوم کی
مقدس رُوح موجود ہے۔"

سوساشاہ کاہن بولا۔ مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ
وہ یہاں آ گیا ہے۔"

بوڑھے مقدس کاہن شویان نے بائیں طرف کپڑے
کے کھنچے ہوئے حصار کی طرف دیکھ کر کہا۔" مقدس مرحوم
بورین داہل تم سے یہ عدالت درخواست کرتی ہے کہ تم
اس چادر کے اندر کھنچے ہوئے دائرے میں رہو گے اور
اس سے آگے آنے کی کوشش نہ کرو گے۔ مقدس اور
پاکباز رُوح، تم سے اب ہم درخواست کرتے ہیں کہ تم
اپنی شکایت اس عدالت کے سامنے رکھو وہ شکایت
جو تم اپنے بچپن کے دوست سردار بلوال کے خلاف
رکھنا چاہتے ہو۔"

اس کے بعد کئی لمحوں تک شدید سناٹا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب پتھر کے بن گئے ہوں اور سانس روک کر چادر کے پیچھے سے بائیں طرف کی کڑی روح کی آواز کو سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

مہابیر جوگی بولا: "میرا خیال ہے وہ بول رہا ہے۔"

صوفی داؤد نے کہا: "ہاں ایسا لگتا ہے۔"

کاہن سوساشاہ بولا: "میں اس کی آواز سن رہا ہوں" مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔"

مہابیر جوگی بولا: "میں الفاظ نہیں سن رہا ہوں مگر آواز نہیں سن سکتا۔"

پھر کچھ دیر سناٹا رہا۔

یکایک خاموشی کے اس طلسم کو توڑتے ہوئے کاہن شویان بولے: "جمدیال فرقے کے سردار بلوال! بورین داہل کی شکایت ہے کہ جوانی کے دنوں میں جب تم دونوں ایک ہی مدرسے میں طالب علم تھے، تم دونوں کی شادی ایک ہی ہفتے میں ہوئی تھی اور اسی ہفتے تم دونوں نے قسم کھائی تھی اور ایک دوسرے کو قول دیا تھا کہ اگر تمہاری بیویوں میں سے کسی کے ہاں لڑکا ہوا اور دوسری کے ہاں لڑکی، تو بڑے ہونے پر ان دونوں کو رشتۂ مناکحت میں باندھ دیا جائے گا۔ کیا تم نے ایسا کوئی معاہدہ کیا تھا؟"

سردار بلوال کانپتی ہوئی آواز میں بولا: "یہ سچ ہے۔"

"بورین داہل کی مقدس روح یہ بھی کہتی ہے۔" کاہن شویان بولے "کہ اس قول وقرار کے بہت جلد بعد وہ تم سے بچھڑ کر الگ ہو گیا اور دور کے کسی گاؤں میں چلا گیا، جہاں اس کی بیوی نے اسی دن اور اسی گھنٹے ایک لڑکا جنا کہ جب تمہاری بیوی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کی بیوی ملک عدم کو سدھار گئی اور بچے کی پرورش باپ نے کی اور بیٹا بڑا ہوتا گیا، اور کاہنوں کے علم وفن میں اپنے تمام ہم جماعتوں پر سبقت لے جا کر ایک سطح سے دوسری بلند تر سطح پر ترقی کرتا گیا، اور مقدس روح کا یہ بھی کہنا ہے کہ علم کی پیاس بجھاتے میں اس کا بیٹا گاؤں سے گاؤں، شہر سے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک گھومتا ہوا بالآخر تمہارے گھر پہنچا۔ جہاں اس کی قسمت میں ٹھہرنا بدا تھا اور جہاں اس کی روح نے تمہاری بیٹی کی روح سے ازل کے لئے اپنا ناطہ باندھ لیا۔

مگر تم امیر تھے اور بورین داہل کا بیٹا غریب تھا اور اس لئے تم نے اپنا منہ اس سے پھیر لیا اور دوسری جگہوں پر اپنی لڑکی کے لئے رشتے ڈھونڈنے لگے، کوئی ایک ایسا لڑکا، جو دھن دولت میں تمہاری برابری کر سکے۔

اور جب مرحوم بورین داہل نے دیکھا کہ اس کا بیٹا ناامید ہوتا جا رہا ہے اور تم اپنا قول بھول چکے ہو تو اس نے اپنے قبیلے کے چند گھڑ سواروں کی مدد سے تمہارے قبیلے پر حملہ کیا۔ یہ حملہ کسی لوٹ مار کی خاطر نہیں تھا بلکہ تم سے اس لڑکی کو چھین کر اس لڑکے کے حوالے کر دینے کا تھا جو ازل سے اس کی دلہن تھی۔ تمہارے اور بورین داہل کے وعدے کے مطابق۔

مگر بورین داہل کے بیٹے نے خود داہل کے گھوڑے پر چڑھ کر بورین داہل کو بے نقاب کر دیا اور جب بورین داہل نے دیکھا کہ خود اس کا اپنا لڑکا تمہاری لڑکی کے عشق میں غلطاں ہو کر اس سے منحرف ہو چکا ہے اپنے باپ پر حملہ آور ہے تو وہ اپنے قبیلے کے لوگ لے کر واپس شکستہ دل اور ناامید ہو کر چلا گیا۔ اسی رات اتفاق سے یا کسی کی شرارت سے جس میں مرحوم بورین داہل کا کوئی دخل نہ تھا، تمہارے گھر کو آگ لگ گئی۔ جس سے تمہاری بیٹی کی جان خود بورین داہل کے لڑکے نے اپنی جان خطرے میں رکھ کر بچائی مگر تم نے اس کا بھی پاس نہ کیا اور بدستور دوسری جگہوں پر لڑکے ڈھونڈتے رہے، پیغام بھیجتے رہے اور کوشش کرتے رہے، اور جب مرحوم بورین داہل کے منہ کھول کے تم سے وہ رشتہ مانگ لیا تو تم نے سونے کے سکوں بھری دیگچی کا مطالبہ کیا۔

یکایک سب نے دیکھا کہ اس طرح باتیں کرتے کرتے مقدس اور بزرگ کاہن شویان کا چہرہ اکدم سرخ ہو گیا اور آنکھیں انگارے کی طرح چمکنے لگیں۔

تب بورین داہل نے دیکھا کہ اس کا لڑکا صحیح علم و فن سے بدظن ہو کر جادو، ٹونے، ٹوٹکے اور کالا علم حاصل کرنے کے پیچھے پڑ گیا ہے اور سونے کی دیگچی کی تلاش میں اپنی روح کا سونا کھوتے چلا ہے، تو اسے بڑا دھچکا پہنچا۔

وہ لڑکا پھر سے آوارہ گرد بن گیا اور اس کے باپ کا دل خوف اور خطرے سے بھر گیا اور اس کے دل میں شبہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اپنی جوانی کی ناتجربے کاری میں اس کا لڑکا غلط راستے پر نہ چلا جائے اور بدروحوں کے ہات میں نہ آجائے۔ اس کے بدترین اندیشے ٹھیک ثابت ہوئے۔ بدروحوں اور بری طاقتوں نے جو جال ایک بھولی بھالی نیک روح کے لئے پھیلایا تھا، اس کا لڑکا اس میں پھنس گیا اور اپنی جان گنوا بیٹھا اور تمہارے قبرستان میں ایک اجنبی کی حیثیت سے دفن کیا گیا۔"

پھر کافی عرصے تک سناٹا رہا۔ سب دم بخود تھے۔

یکایک مقدس کاہن شویان پھر گرجتے لہجے میں برس پڑا۔

"بورین داہل کو اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کا شدید صدمہ ہوا۔ وہ اپنے بیٹے کی قبر پر دعا پڑھنے اور تم سے زبانی گفتگو کرنے کے ارادے سے تمہارے گاؤں میں اکیلا آیا۔ مگر تم اس وقت اپنے گھر پر نہ تھے۔ اس نے تمہیں پیغام بھیجا اور نشانی کے طور پر وہ انگوٹھی بھی بھیجدی جو تم دونوں نے جوانی میں بدلی کی تھیں تاکہ تم اپنی بدلی ہوئی انگوٹھی کو دیکھتے ہی پہچان لو مگر اس کے بعد بھی تم میں سے کوئی اس سے ملنے کے لئے نہیں پہنچا اور بورین داہل اپنے بیٹے کے غم میں چور چور اس کی قبر پر دعا پڑھتا پڑھتا مر گیا۔

اور اس کے بیٹے کی روح آوارہ ہو کر بدنوّارہ خلاؤں میں پرواز کرنے لگی۔ کہیں ٹھور ٹھکانہ اس کا نہ تھا۔ آخر بدی کی قوتوں سے بھاگتے بھاگتے اس نے تمہاری لڑکی کے بدن میں پریت بنکر پناہ حاصل کی۔

بورین داہل کا کہنا ہے کہ اس کے بیٹے کی موت نے خود بورین داہل کو دونوں دنیاؤں سے کاٹ کے رکھدیا ہے۔ کہیں پر اس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں۔ کوئی دوست ایسا نہیں جو اس کے حق میں دعائے خیر پڑھ سکے۔ اس کی روح کی روشنی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے اور اس کے دل کا تاج اپنی جگہ سے اتر کر تحت الثریٰ میں بھٹک رہا ہے۔

اس لئے بورین داہل بصد ادب ملتجی ہے کہ فطرت اور کائنات کے اعلیٰ ترین قوانین کی بنا پر سردار بلوال کا یہ جرم سب پر ظاہر کیا جائے۔ وہ میرا بھی قاتل ہے، میرے بیٹے کا بھی قاتل ہے اور میرے بیٹے کے بیٹے کے بیٹوں کا قاتل بھی ہے۔ وہ ہمارے خاندان کے پورے مستقبل کا قاتل ہے، اس لئے وہ قرار واقعی سزا کا مستحق ہے!"

مقدس کاہن اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ہولے ہولے اس کے چہرے کی بڑھتی ہوئی سرخی غائب ہوتی چلی گئی۔ اور اس کی انگارے کی طرح دہکنے والی آنکھوں کی روشنی بھی اپنے معمول پر آتی گئی۔

اتنے عرصے تک بالکل سناٹا رہا۔ پھر اس سناٹے میں دھیمے دھیمے سروں میں سردار بلوال کی سسکیوں کی آواز آنے لگی۔

"سردار بلوال!" مقدس کاہن نے ایک طویل وقفے کے بعد کہا۔ "تم نے بورین داہل مرحوم کی مقدس روح کا الزام سن لیا ہے، اب تمہیں اس باب میں کیا کہنا ہو۔"

سسکیوں کے درمیان سردار بلوال تتلانے لگا "میں ــ میں ــ کیا کہوں۔" الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس کا سینہ سسکیوں سے رندھا ہوا تھا "میرے پاس اس الزام کو رد کرنے اور اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔

میں یہاں اپنے پرانے بچپن اور جوانی کے ساتھی بورین داہل سے معافی مانگتے ہوئے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دے۔ میں نے جو کچھ کیا جان بوجھ کر نہیں کیا۔ قول و اقرار کرنے کے بعد ہم دونوں دوست ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ وہ کہیں چلا گیا — میں اِدھر آگیا۔ مجھے پتہ نہ چلا کہ اس کی بیوی کے ہاں ایک لڑکا ہوا ہے یا کوئی لڑکی ہوئی ہے۔ صرف انگوٹھی کے ملنے سے مجھے یہ پتہ چلا کہ قبرستان میں اس لڑکے کی لاش پر مرنے والا میرا بچپن کا دوست تھا۔ لیکن لڑکے اور باپ کا رشتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ بورین داہل مرحوم اور مقدس رُوح کے رشتے کی مجھے کوئی خبر نہ تھی۔"

کاہن شوپان نے پوچھا" تم نے چھان بین کیوں نہ کی۔ تم نے اس کے یا اس کے لڑکے کے متعلق اپنی لڑکی کا رشتہ تلاش کرنے سے پہلے پوچھا کیوں نہیں؟"

" ہمارے ہاں رواج یہ ہے کہ لڑکے والے اس معاملے میں پہل کرتے ہیں، لڑکی والے نہیں۔ میں نے سوچا اگر بورین داہل کے ہاں لڑکا ہوا ہوتا تو — تو — بعد میں سارا واقعہ میرے دماغ سے محو ہو گیا۔"

کاہن سوساشاہ بولا" مرحوم کی مقدس رُوح تم سے پوچھتی ہے کہ جب تم نے اس کے بیٹے کو اپنے گھر میں رکھا اور اُسے اپنے دستر خوان میں شریک کیا تو تم نے کبھی اس سے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ تم کون ہو، کس کے بیٹے ہو، کہاں سے آئے ہو؟"

"مجھے معلوم نہیں، میں نے کیوں نہیں پوچھا یا ایسا کیوں ہوا۔ لیکن اس کی میں قسم کھا سکتا ہوں کہ کبھی کبھی میرے دل میں اس لڑکے کو اپنا گھر داماد بنا لینے کی خواہش جاگ اٹھتی تھی۔ شاید اس لئے جب میری لڑکی کے لئے کہیں سے رشتہ آتا، میں ایسی کڑی شرطیں لگا دیتا کہ منگنی طے نہ ہونے پاتی اور وہ رشتہ ٹوٹ جاتا۔ چار دفعہ ایسے ہی یہ رشتہ بن بن کر ٹوٹ گیا۔ آخری بار لڑکے والوں نے میری ساری شرطیں مان لیں اور میرے سامنے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہ رہ گئی۔"

پھر سب لوگ خاموش ہو گئے۔

سوساشاہ کاہن نے پھر کہا" مرحوم بورین داہل کا کہنا ہے کہ تم اپنے دل میں اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے کہ چنگ کس کا بیٹا ہے، اس لئے تم اس سے ہمیشہ یہ سوال کرتے سے ڈرتے اور ہچکچاتے رہے، مبادا کہیں تمہیں اپنے قول کا پابند نہ رہنا پڑے۔ تم اپنے قبیلے کے امیر ترین سردار تھے اور تمہاری بیٹی عیش و عافیت میں پلی تھی۔ اور تم اسے کسی امیر کے پلے باندھ دینا چاہتے تھے، اس لئے تم نے مرحوم بورین داہل کے بیٹے کو زندہ دوزخ میں جھونک دیا۔"

اس کا سردار بلوال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جہاں کھڑا تھا، وہیں پر دوزانو ہو کر رونے لگا۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتوں میں چھپا لیا اور اس کی سسکیوں کی آواز بیچ بیچ میں سناٹے کو توڑتی رہی۔

بالآخر بزرگ کاہن شوپان نے اپنا عصا سنبھالا۔ کاہن سوساشاہ اور صوفی داؤد اور مہا بیر جوگی سے مشورہ کیا۔ وہ سب لوگ ایک کونے میں چلے گئے۔

بارھواں باب

چند منٹ کے بعد وہ چاروں بزرگ واپس آگئے۔ واپس آنے پر بزرگ کاہن شوپان نے اپنا مقدس عصا سنبھالا اور اسے سختی سے زمین پر پٹک کر کہا۔

" اس حق پسند اور انصاف پرست عدالت نے دونوں فریقوں کے بیان سن لئے ہیں اور ان کی روشنی میں اُن پر غور و خوض کر کے اپنا فیصلہ پیش کرتی ہے۔

بورین داہل اور سردار بلوال نے جس وقت یہ معاہدہ کیا تھا، اُس وقت اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ دونوں بچے حمل میں آچکے ہیں۔ پس اِس دھرتی پر جس سے جس شے کا کوئی وجود نہ ہو اُس کے متعلق کوئی معاہدہ معاہدہ گردانا نہیں جا سکتا، اس لئے اِس ضمن میں اس

مقدّس عدالت کا فیصلہ ہے کہ اس سلسلے میں ہم سردار بلوال کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔

لیکن یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس معاہدے کو اوپر کی روحانی دنیا میں قبول کیا گیا تھا اور وہ معاہدہ اوپر کی دنیا نے کسی وقت رد نہیں کیا، اور جبکہ بورین داہل کے لڑکے کے دل میں یہ یقین گھر کر گیا کہ سردار بلوال کی لڑکی ہی اس کی ہونے والی دُلہن ہے اور جبکہ سردار بلوال نے اس سلسلے میں اپنی حرکات سے اور اپنے اعمال سے بورین داہل اور اس کے بیٹے کی زندگیوں پر تباہی لائی ہے، اس لئے یہ حق پرست اور مقدّس، اور انصاف پسند عدالت یہ فیصلہ دیتی ہے کہ سردار بلوال اس تباہی کی پاداش میں اپنی آدھی جائداد خیرات میں دے دے اور ہر سال تاحیات۔ بورین داہل اور اس کے لڑکے کی قبر پر اُن کی رُوحوں کو تسکین پہنچانے کی غرض سے چراغ روشن کرے اور ان کی رُوحوں کے لئے دُعا مانگتا رہے، جیسے گویا کہ وہ اس کے اپنے ہی سگے رشتے دار رہے ہوں۔"

یہاں پر مقدّس کاہن شوپان نے قدرے توقف کیا۔ پھر بولا۔

"اِس فیصلے کے بعد عدالت بورین داہل مرحوم کی مقدس رُوح سے درخواست کرتی ہے کہ وہ سردار بلوال کو معاف کر دے اور باپ ہونے کے ناطے سے اپنے بیٹے سے کہے کہ وہ اُس کنواری کا جسم چھوڑ دے تاکہ سردار بلوال کی بیٹی آنگی کی نسل آگے چل سکے اور اِس قبیلے کے سردار کے خاندان کا نام و نشان باقی رہ سکے۔"

اُس کے بعد دیر تک خاموشی رہی۔

پھر مقدّس کاہن شوپان نے پوچھا

"مرحوم مقدّس بورین داہل کی رُوح کیا ہمارے فیصلے کو مانتی ہے؟"

پھر خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا۔

کاہن شوپان نے سردار بلوال سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سردار بلوال کیا تمہیں اس عدالت کا یہ فیصلہ منظور ہے؟"

سردار بلوال نے سر جُھکا کے کہا۔ "ہاں مجھے منظور ہے۔"

کاہن شوپان بائیں طرف چادر سے ڈھکے دائرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مرحوم بورین داہل کی مقدّس رُوح سے عرض کی جاتی ہے کہ اب اس کے اور سردار بلوال کے درمیان تنازعہ کا فیصلہ ہو چکا ہے، لہٰذا مقدّس روح اپنی آرامگاہ میں واپس چلی جائے اور واپس جاتے ہوئے کسی جاندار ذی رُوح سے تعرّض نہ کرے، نہ اُسے گزند پہنچائے۔"

چند لمحوں تک چاروں طرف مکمل خاموشی رہی۔ پھر مقدّس کاہن شوپان نے کولات کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کولات اور ڈاگر تم دونوں اس دائرے سے چادر کھینچ لو، میں حکم دیتا ہوں۔" کولات اور ڈاگر دونوں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے۔ ان کے پیچھے مقدّس شوپان عصا لئے کھڑا تھا۔

کولات اور ڈاگر نے دائرے کے گرد سے چادر کھینچ لی۔

کاہن شوپان نے عصا کی آخری نوک سے دائرے کو مٹا ڈالا۔ پھر اُس نے اُسی جگہ ایک نیا دائرہ کھینچا۔ پہلا دائرہ اس نے عصا کو دائیں سے بائیں طرف گھماتے ہوئے کھینچا تھا۔ یہ دائرہ اُس نے اپنے عصا کو بائیں سے دائیں طرف گھما کر کھینچا۔

پھر مقدّس کاہن شوپان نے ڈنجی کو اشارہ کیا۔ وہ مٹی کے ایک بڑے کوزے میں پانی لے کر آیا اور اس نے مقدّس کاہن شوپان، سوساشاہ، صوفی داؤد اور جوگی مہابیر کے ہات دُھلائے۔

اس کے بعد کاہن شوپان سردار بلوال سے مخاطب ہوا۔ "کیا دولہا اور اس کے باراتی اور گھر کے لوگ آ گئے ہیں؟"

سردار بلوال نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "وہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔"

"تو کسی کو گھوڑے پر سوار کر کے جلدی سے اُنکے پاس بھیجو۔ ان سے کہو جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں

حاضر ہوجائیں۔ شامیانہ لگوادو۔ شہنائی اور ڈھول والوں کو تیار رکھو۔ دُلہن کو اُس کا عروسی جوڑا پہنادو، تاکہ جس وقت میں دُلہن کے بدن سے بدرُوح کو نکال دوں، اُس کی شادی مناسب رسم و رواج کے مطابق دولہا سے ہوجائے اور اب ہمیں جو کام کرنا ہے وہ تو کرنا ہی ہوگا۔"

سردار بلوال مقدس کاہن کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے چلا گیا۔

مقدّس کاہن شوپان نے اپنی شال جو دُعا کے موقع پر پہنی جاتی ہے اُس وقت اُتار کر الگ رکھدی۔ پھر اُسے دھیرے دھیرے تہہ کرنے لگا۔

سوساشاہ اور صوفی داؤد اور مہابیر جوگی آپس میں سرگوشی کرنے لگے۔

صوفی داؤد بولا۔ "تم نے غور کیا، مرحوم بورین داہل کی رُوح نے سردار بلوال کو معاف نہیں کیا۔"

مہابیر جوگی بولا۔ "ہاں مجھے بھی یہی محسوس ہوا۔"

سوساشاہ نے کہا۔ "مقدّس رُوح بالکل چُپ رہی۔"

"مگر مرحوم کی رُوح نے مقدس کاہن کے فیصلے پر صاد نہیں کیا۔"

سوساشاہ بولا۔ "مرحوم کی رُوح کو آمین کہنا چاہیئے تھا، مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔"

مہابیر جوگی بولا۔ "یہ ایک بُری علامت ہے۔"

صوفی داؤد بولا۔ "بہت بُری ....."

سوساشاہ نے پوچھا۔ "کیا مقدّس کاہن شوپان اس امر سے ناواقف ہیں؟"

"کیسے ناواقف ہوسکتے ہیں۔" مہابیر جوگی بولا۔ "ان کے چہرے کی طرف دیکھو، ماتھے پر شکنیں ہیں اور ہات کانپ رہے ہیں۔"

"چلو ہم یہاں سے چلدیں۔" صوفی داؤد نے مہابیر جوگی سے کہا۔

وہ دونوں جانے لگے تو سوساشاہ بھی ان کے پیچھے پیچھے کھسکنے لگا۔ تو مقدّس کاہن نے اُنہیں جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اُنہیں روک کر بولا۔

"رُک جائیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی، اور سوساشاہ جی آپ کو تو اِس شادی کی ساری رسومات میں حصّہ لینا ہوگا۔"

وہ تینوں رُک گئے۔

کاہن سوساشاہ نے ایک لمبی سانس لی اور اُداس ہوکر ایک طرف بیٹھ گیا۔ صوفی داؤد اور مہابیر جوگی بھی ایک کونے میں کھڑے ہوگئے۔

مقدّس کاہن شوپان بولا۔ "افلاک کے دیوتا راکو۔! عجیب تیرے فیصلے ہوتے ہیں اور تیری مرضی کا شعلہ آج تک راز میں ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ وہی شعلہ میرے راستے کو منوّر کرے گا اور اِس وقت میری رہنمائی کریگا جس راستے پر میں چل رہا ہوں اُس سے میں ایک اِنچ اِدھر سے اُدھر نہ ہوں گا۔ نہ ایک قدم دائیں طرف، نہ ایک قدم بائیں طرف۔ اے سارے جہانوں کے دیوتا! مجھے قوت دے۔"

اس کے بعد مقدّس کاہن نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا پھر کولات سے پوچھنے لگا۔

"سب تیار ہے؟"

"جی مقدس کاہن!"

"تو کنواری لڑکی کو یہاں لے کر آؤ۔"

کولات باہر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سردار بلوال، آنگی، رجی اور دادی دُور ماں کو لے کر آگیا۔ آنگی نے عروسی جوڑا پہن رکھا تھا۔ مگر اُس کے اوپر وہی سیاہ شال اوڑھ رکھی تھی جسے پہن کر وہ قبرستان میں دُعا مانگنے گئی تھی۔

آنگی کو اُنہوں نے دائیں طرف مقدّس کاہن کے قریب منچ پر بٹھادیا۔

عصا لے کر مقدّس کاہن شوپان لڑکی کی طرف بڑھا۔ اُس کے پیچھے کاہن سوساشاہ کھڑا تھا۔

اُن دونوں کے پیچھے مہابیر جوگی اور صوفی داؤد کھڑے ہوگئے۔ مقدّس کاہن شوبان بولا "اے پریت۔ میں اپنے قبیلے کا مقدّس کاہن مقدّس راکو کا نام لے کر تم سے آخری بار کہتا ہوں کہ تم سردار بلوال کی کنواری لڑکی آنگی کا بدن چھوڑ کر الگ ہو جاؤ۔"

لکڑی کے منچ پر اکیلی بیٹھی ہوئی آنگی کے مُنہ سے یہ مردانہ آواز نکلی "میں نہیں چھوڑوں گا۔"

مقدّس کاہن شوبان نے کہا "کولات کفن کا سامان لے کر آؤ۔ تیرہ مقدّس پارچہ جات اٹھا لاؤ۔ اس کام کے لئے تیرہ راہب چاہئیں۔ ہر راہب صرف ایک مقدّس پارچہ اٹھا کر لائے گا۔ تین عصا بردار مقدّس عصا لے کر آئیں اور دو راہب کالی مومی شمعیں اٹھا کر لائیں۔"

کولات گیا اور پھر اندر آگیا۔ تیرہ راہب مقدّس پارچہ جات اپنے دونوں ہاتوں میں اٹھائے ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ دو راہب مومی شمعدان اٹھا کر لائے۔ اُس میں بڑی بڑی سیاہ شمعیں رکھی تھیں۔ تین عصا بردار مقدّس عصا لے کر آگئے۔

جب سب سامان تیار ہوگیا تو مقدّس کاہن نے ہات کے اشارے سے پہلے پانچ راہبوں کو پانچ پارچہ جات آگے لانے کے لئے کہا۔

سردار کاہن نے اپنے عصا سے آہستہ سے ہر مقدّس پارچے کو چھوا۔ پھر بائیں طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا "مبتدی رُوح! چونکہ تم نے اِس عدالت کی حکم عدولی کی ہے، اِس لئے ہم تمہیں اعلیٰ ترین افلاک کی مقدّس رُوحوں کے سُپرد کرتے ہیں۔ وہی تمہیں اس کنواری کے بدن سے نکالیں گی۔ تکبیر کی نفیری بجاؤ۔"

ایک نفیری زور سے زنج اٹھی۔

اس کی طویل کڑکتی آواز کے ساتھ ساتھ آنگی لکڑی کے منچ سے اُٹھ بیٹھی اور ہوا میں ہات پاؤں ہلا ہلا کر ایسی حرکتیں کرنے لگی جیسے بہت سے دشمن اس پر یلغار کر رہے ہوں اور وہ اپنا آپ اُن سے بچانے کی جدوجہد کر رہی ہو۔

وہ زور سے مردانہ آواز میں چیخی۔ "مجھے چھوڑ دو۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے گھسیٹنے کی کوشش مت کرو۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔ کبھی الگ نہیں ہوں گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد مقدّس کاہن بولا "چونکہ اعلیٰ ترین افلاک کی رُوحیں تمہیں اس لڑکی کے بدن سے نکالنے میں ناکام رہی ہیں اس لئے میں نیچے اُترتا ہوں اور تمہیں تیج کے افلاک کی رُوحوں کے سُپرد کرتا ہوں۔ یہ رُوحیں جو نہ اچھی ہیں، نہ بُری ہیں، اب میں ان کی قوت کا سہارا لے کر تمہیں گھمانے کی کوشش کرتا ہوں۔ دُوسری نفیری بجاؤ۔"

جب دوسری نفیری زور زور سے بجنے لگی تو پھر آنگی کے بدن میں سر سے پاؤں تک ارتعاش پیدا ہوگیا۔ وہ کانپنے اور تھرتھرانے لگی اور مردانہ آواز میں بولنے لگی۔

"آہ۔۔۔ آہ۔۔۔ سارے افلاک کی طاقتیں میرے خلاف ہو چلی ہیں۔ بھیانک ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہیں اور بڑی بے رحمی سے مجھے الگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تمام حق پرست سچی طاقتیں میرے خلاف ہیں۔ یہاں تک کہ خود میرے باپ کی رُوح مجھ سے یہاں سے نکل جانے کو کہہ رہی ہے۔ لیکن جب تک قوت کی ایک چنگاری بھی مجھ میں باقی ہے، میں آنگی کو نہ چھوڑوں گا اور وہیں رہوں گا جہاں میں ہوں۔"

مقدّس کاہن شوبان کا سارا چہرہ پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ معلوم ہوتا ہے، کوئی بڑی طاقت اس کے پیچھے ہے۔"

مقدّس کاہن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

پھر بولا۔

"کولات پارچہ جات تہہ کر کے باہر لے جاؤ۔ اس دائرے کے گرد ایک سیاہ پردہ طانگ دو اور سیاہ مومی شمعیں آگے لے کر آؤ۔

اب جتنے راہب یہاں کھڑے ہیں اپنی جان کی حفاظت کی خاطر ایک ایک کفن پہن لیں۔"

پھر مقدّس کاہن نے اپنے دونوں ہات فضا میں بلند کیے اور گرجتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اٹھو، مقدس راکو۔۔۔ دیوتاؤں کے دیوتا، اور اپنے دشمنوں کو جلا کر خاک کردو۔ اے ضِدّی اور گناہ گار رُوح۔ میں مقدّس راکو کی قوت سے اور تیرہ پارچہ جات کی حمایت میں مقدّس کاہن شوپان، تمہیں ہر اُس بندھن سے الگ کیے دیتا ہوں جس کے ذریعے تم سردار بلوال کی لڑکی آنگی سے چمٹے بیٹھے ہو۔ ایک ایک بندھن الگ الگ توڑ کر پھینک دیتا ہوں تاکہ یہ لڑکی تمہاری گرفت سے آزاد ہوجائے۔"

آنگی نے مردانہ آواز میں کہا۔ "ہائے میں مرگیا!"۔

"میں تمہیں اِس ارضی دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خارج کرتا ہوں۔ تیسری نفیری بجاؤ۔ مومی شمعیں جلاؤ۔"

پیچھے کھڑے ہوئے صوفی داؤد نے مہابیر جوگی سے کہا "آخری چنگاری شعلے میں جل گئی۔"

آنگی تھکے ہوئے مردانہ لہجے میں بولی۔ "اب میں لڑ نہیں سکتا۔ میرے حواس جواب دے رہے ہیں۔"

"نفیری زور سے بجاؤ۔" کاہن نے حکم دیا۔

تیسری نفیری زور زور سے بجنے لگی۔ آنگی کا بدن ڈھیلا پڑتا گیا۔ اُس کے جسم کی جدوجہد کم ہوتی گئی۔۔۔

کاہن شوپان نے آگے بڑھ کے کہا۔

"کیا تم میرا حکم ماننے کے لیے تیار ہو؟"

آنگی دھیرے سے بُریت کی آواز میں بولی

"میں تیار ہوں۔"

"تم وعدہ کرتے ہو کہ تم اپنی مرضی سے سردار بلوال کی لڑکی آنگی کے بدن سے نکل جاؤ گے اور کبھی اُس کے بدن میں واپس نہ آؤ گے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" آنگی نے کہا۔

چاروں طرف سنّاٹا چھاگیا۔

مقدس کاہن نے چاروں طرف مقدّس کٹورے میں سے پانی لے کر چھڑک دیا اور بولا۔ "جس مُقدّس طاقت کا سہارا لے کر میں نے تم پر لعنت کا بوجھ ڈالا ہے اُسی طاقت کا سہارا لے کر میں تم پر سے اُس لعنت کو اُٹھائے لیتا ہوں۔ اب تم مطمئن رہو۔ اے کولات، مومی شمعیں بجھادو۔ نفیری بند کردو۔ سیاہ پردہ اُٹھادو اور سب راہبوں کو باہر جانے دو۔ مگر باہر جانے سے پہلے وہ اپنی اپنی کفنی اُتار کر جائیں۔"

جب سب راہب چلے گئے۔ نفیری بند ہوگئی۔ شمعیں بجھادی گئیں۔

تو مقدّس کاہن شوپان نے کہا۔

"اے راکو۔ دیوتاؤں کے دیوتا! تُو جابر ہے تو رحم دل بھی ہے۔ تیری قوت اور رحمت کا سہارا لے کر میں نے اس رُوح کو ایک جاندار کے بدن سے نکال دیا ہے، اب میں تیرے رحم کا واسطہ دے کر تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ اِس تڑپتی دُکھی گناہ گار بھٹکی ہوئی رُوح کے زخموں پر اپنی شفاعت کا مَرہم رکھ دے۔ اس کی غلطیوں کو معاف کردے۔ اس طرح کہ اس کی غلطیاں، گناہ اور خامیاں اس کے باپ اور اس کے قبیلے کے بزرگوں کی دُعاؤں میں ایک سفید کہرے کی طرح دُھند میں بدل جائیں۔ اے دُنیاؤں کے مالک، اِس بھٹکی ہوئی رُوح پر اپنا ہات رکھ دے اور اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے۔"

"آمین!" صوفی داؤد بولا۔

"جے بھیروں!" مہابیر جوگی کے مُنہ سے نکلا۔

سوسا شاہ نے سر جھکا لیا۔

آنگی نے کھرکھرے کانپتی لرزتی آواز میں کہا۔

"میرے لیے دُعا پڑھو، میں جارہا ہوں، میں جارہا ہوں، میرے جانے کا سمے آگیا ۔۔۔"

وہ سب لوگ ہات اُٹھا کر دُعا پڑھنے لگے۔

یکایک آنگی زور سے کانپی۔ ایک چیخ اس کے مُنہ سے نکلی۔ پھر وہ فرش پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔

مقدّس کاہن شوپان نے دادی دُودرمائی سے کہا۔

"جب یہ ہوش میں آئے تو اسے باہر شامیانے میں

لے آؤ، وہیں اُس کی شادی ہوگی۔ دولہا ابھی آیا کہ نہیں کولات اے کولات۔"

کولات ہات باندھے اندر آکر بولا۔

"حضور وہ لوگ برف میں پھنس گئے تھے۔ دو خچر رگر کر کھائی میں جا گرے۔

رات کی برف باری نے سب راستوں سے نشان مٹا دیئے ہیں مگر اب وہ کسی نہ کسی طرح آخری موڑ پر آپہنچے ہیں اور وہاں سے ادھر آتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔"

مقدّس کاہن شوپان نے عصا اُٹھا کر اُوپر دیکھتے ہوئے کہا۔"اُس کی مرضی میں کس کو دخل ہے۔ وہی ہوگا جو وہ چاہتا ہے۔ آؤ ہم لوگ دولہا اور باراتیوں کے استقبال کو چلیں۔ دادی دورماں آنگی کے پاس رہیں گی۔"

مقدّس کاہن نے آنگی کے اِردگرد اپنے عصا سے ایک ہالہ کھینچدیا۔ اپنی کفنی نکال کر دروازے پر ٹانگ دی اور سردار بلوال، راہول، مہابیر جوگی، صوفی داؤد اور دوسرے لوگوں کے ساتھ دولہا کے استقبال کیلئے چلا گیا۔

تیرھواں باب

اُن کے جانے کے بعد دیر تک دادی دُورماں اپنی پوتی کے سُنہری بالوں پہ پیار سے ہات پھیرتی رہیں۔۔۔ یکایک آنگی کے بدن میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور کہا۔

"میرے پاس کون ہے دادی.... اوہ، تم ہو۔ دادی میں بہت کمزور ہوں۔ تھکی ہوئی ہوں۔ مجھے اپنی باہوں میں لے لو۔"

دادی دورماں نے اُسے اپنی باہوں میں لے کر کہا۔" نہ گھبراؤ میری ننھی بچی۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔ اُداس نہ ہو میری ننھی۔ اُداس ہو وے راستہ کاٹنے والی کالی بلّی۔ میری بچّی کا دل تو صبح کی طرح شفّاف ہے، سانس کی طرح ہلکا ہے۔ برف کی طرح پاکیزہ ہے۔ فرشتے تیری نگہبانی کریں۔"

یکایک باہر زور سے شہنائیوں کی آواز آنے لگی۔ آنگی گھبرا کر لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

شاید وہ لوگ تورا اور اُس کے عاشق کی قبر کے گرد ناچ رہے ہیں۔ میں اُنہیں دیکھ سکتی ہوں۔"

"گھبراؤ مت میری بچّی۔ اب تمہیں کوئی ہات نہیں لگا سکتا۔ ایک بہت بڑی طاقت تمہاری نگہبانی کر رہی ہے۔ ساٹھ جنّات تلواریں کھینچے تمہارے اِردگرد کھڑے تمہارے پہرے پر مامور ہیں۔ مرحوم مقدس والدین تمہیں بُری نگاہ سے بچانے کے لئے تمہارے اِرد گرد سائے کی طرح کھڑے ہیں۔ تم بالکل محفوظ ہو۔"

دادی دُورماں آنگی کو اپنی باہوں میں لے کر ایک لوری گانے لگی، جیسے وہ بچپن میں اُسے اپنی باہوں میں اُٹھا کر لوری گایا کرتی تھی۔ دھیمے دھیمے سُروں میں لوری گاتے ہوئے بوڑھی دادی ماں خود سو گئیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد آنگی کے بند ہونٹوں سے ایک گہری آہ نکلی۔ یکایک آنگی جاگ گئی اور اُس نے پوچھا۔

"یہ کس نے سسکی لی؟"

"یہ میں ہوں۔" چنن کی آواز آئی۔

آنگی بولی۔" میں تمہاری آواز سُن سکتی ہوں مگر تمہیں دیکھ نہیں سکتی۔"

چنن بولا۔" کیونکہ تم ایک دائرے کے اندر ہو۔ اُس جادو کے دائرے کے اندر جس کے اندر میں گھُس نہیں سکتا۔"

آنگی دھیرے سے بولی۔" تمہاری آواز کا لہجہ ایسا ہے جیسے اندھیری راتوں میں رباب روتے ہوں۔ تم کون ہو، مجھے بتا دو۔"

آواز آئی۔" میں اپنے آپ کو بھول چکا ہوں۔ سوائے تمہاری یاد کے میرا کہیں پر کوئی وجود نہیں ہے۔"

آنگی بولی۔" پر مجھے اب تم یاد آرہے ہو اُس ستارے کی طرح جس کی طرف دیکھ کر میرا دل پہلی بار دھڑکا تھا۔ راتوں کے اندھیارے میں میں نے جس کے لئے آنسو بہائے ہیں، وہ جو ہمیشہ میرے خیالوں میرے خوابوں

شاعر

میں رہا، کیا وہ تم ہی تھے؟"

"ہاں۔"

"مجھے یاد ہیں تمہاری زلفیں۔ اتنی سیاہ اور نرم اور بھیگی ہوئی جیسے آنسوؤں سے تر، اور تمہاری آنکھیں گداز، نرم اور اداس اور تمہارے ہات جنہیں چھونے کے لئے میں ہمیشہ بے قرار رہی۔ سوتے اور جاگتے میں تمہارے سوا مجھے اور کسی کا خیال نہ آیا۔ پھر تم چلے گئے اور میرے چاروں طرف تاریکی چھاگئی اور میری اکیلی روح اندر ہی اندر ایک بیوہ کی طرح مرجھانے لگی۔ پھر ایک پردیسی آیا اور تم ہی آگئے اور میرا مردہ دل پھر سے جاگ اٹھا، اور اداسیوں میں خوشیوں کے پھول کھلنے لگے —— اور اب تم نے پھر مجھے چھوڑ دیا ہے۔ کیوں چھوڑ دیا ہے۔"

"تمہارے لئے میں نے سب قیود توڑ ڈالیں۔ سب حدود پھلانگ ڈالیں۔ ساری دیواریں توڑ ڈالیں تمہارے لئے میں موت کے راستوں سے پھلانگتا چلا گیا۔ میں نے حال، ماضی اور مستقبل کے ہر قانون کو توڑ دیا۔ میں نے جبروتی جلالی طاقتور روحوں سے بغاوت کی۔ مگر ان کے پاس سب کچھ ہے میرے لئے رحم نہیں ہے۔ اس لئے آخر میں مجھے تمہارے بدن کو چھوڑ کر تمہاری روح میں پناہ گزین ہونا پڑا۔"

آنگی نے بڑی نرمی اور محبت سے کہا "آؤ۔ میرے پاس واپس آجاؤ۔ میرے دولہا۔ میرے شوہر۔ میں تمہیں مردہ ہی اٹھالوں گی اور اپنے دل میں لے چلوں گی اور ہم تم دونوں راتوں میں اور خوابوں میں اپنے ان بچوں کو آواز دیں گے جو کبھی پیدا نہ ہوں گے، اور میں ننھے ننھے کپڑے سیونگی ان کے ننھے پیارے جسموں کے لئے، جو اب کبھی کتم وجود میں نہ آئیں گے اور لوریاں سناؤنگی۔"

آنگی لوری گانے لگی۔

باہر سے شہنائی کی آواز قریب تر ہونے لگی۔

آنگی بولی: "وہ قریب آرہے ہیں مجھے لیجانے کے لئے۔ مجھے ایک اجنبی کے سپرد کرنے کے لئے۔ آؤ میرے دولہا میری باہوں میں آجاؤ۔"

"میں نے تمہارے بدن کو چھوڑ دیا ہے، وہاں میں نہیں آسکتا۔ لیکن میں تمہاری روح میں آسکتا ہوں۔"

یکایک آنگی نے دیکھا کہ دروازے پہ لٹکی ہوئی کفنی میں چنن کا عکس لرز رہا ہے۔ آنگی بولی: "میرے ہونے والے شوہر آؤ۔ میں تمہیں دیکھ سکتی ہوں۔ تمہارے میرے درمیان اب کوئی دیوار نہیں ہے۔ میرے پاس آجاؤ۔"

چنن کے عکس سے ہلکی سی گونج آئی "میرے پاس آجاؤ۔"

آنگی کے اداس چہرے پر مسرت کھل اٹھی۔ دھیرے سے بولی: "میں آتی ہوں۔"

"اور میں تمہارے پاس آتا ہوں۔" چنن کے لرزتے ہوئے عکس سے آواز آئی۔

یکایک باہر سے کاہن شوپان نے کہا

"دلہن کو باہر شامیانے میں لاؤ۔"

شہنائیوں کی تیز تر آوازوں میں آنگی اپنے دائرے سے نکل گئی۔ صرف سیاہ شال وہاں رہ گئی۔ آنگی دروازے پر لٹکی کفنی کی طرف چلی۔ یکایک دادی دورماں نے جاگ کر دیکھا کہ دروازے پر لٹکی ہوئی کفنی میں دو عکس لرز رہے ہیں، ایک چنن کا دوسرا آنگی کا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ وہ دونوں عکس لرز کر ایک دوسرے میں سما گئے۔ پھر وہاں کچھ نہ رہا۔

مقدس کاہن شوپان نے اندر آکر کہا

"دادی دورماں دلہن کو شامیانے میں لے چلو۔"

پھر وہ یکایک گھبرا کر بولا "یہ کیا؟"۔

دائرے کے اندر صرف ایک سیاہ شال پڑی تھی، اور دائرے کے باہر عروسی جوڑے میں ملبوس آنگی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر تبسم تھا!۔

▲

تین پہیے، ایک پُرانا ٹب

اور

دُنیا بھر کا کچرا
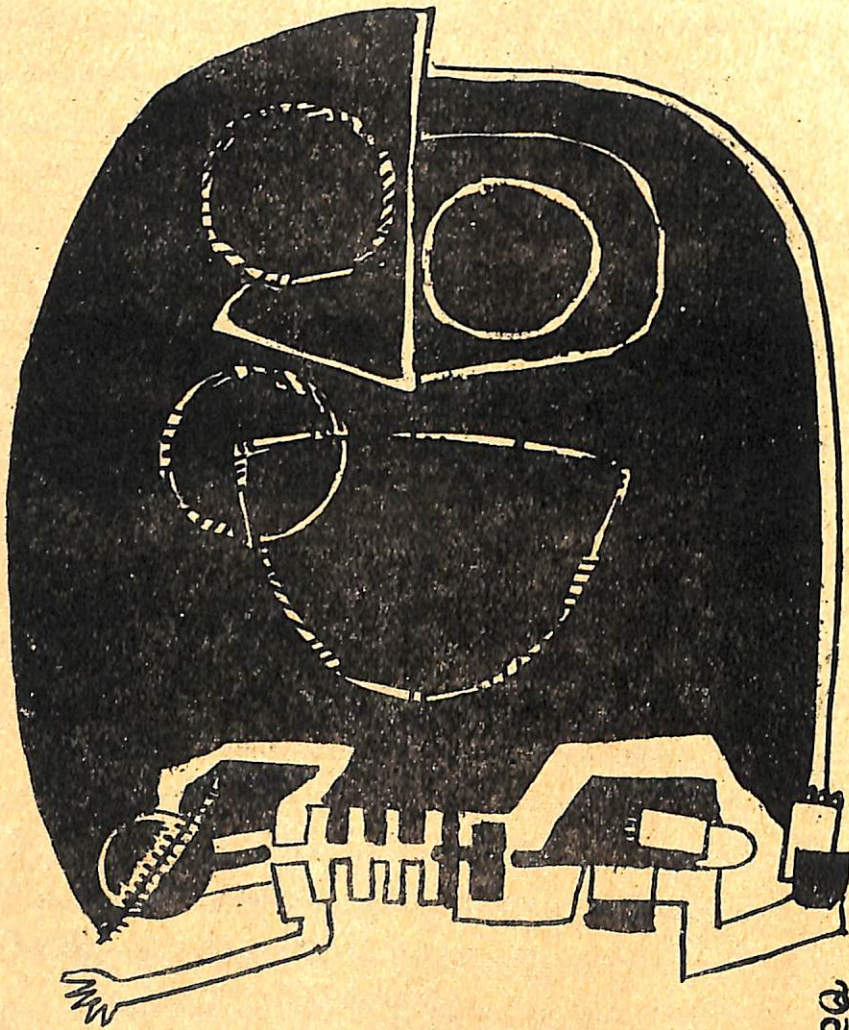
خواجہ احمد عبّاس

خواجہ احمد عبّاس

پانی پت میں ۷ رجون ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ ادبی ذوق وِرثے میں ملا۔ نانا اُردو کے مشہور شاعر مولانا الطاف حُسین حالی تھے۔ علیگڈھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا اور پھر وہیں سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء سے بمبئی میں صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ پہلی مختصر کہانی "ابابیل" ۱۹۳۶ء میں لکھی جو کافی مشہور ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اِس کہانی کو بہت سے ہندوستانی انتخابات میں شامل کیا گیا' بلکہ دنیا بھر کی "بہترین مختصر کہانیوں" میں بھی اِسے جگہ دی گئی۔ یہ انتخاب جرمن میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک روزنامہ "بامبے کرانیکل" میں فلمی مُبصّر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۳۸ء میں دنیا کا سفر کیا۔

۱۹۴۰ء میں ایک مثالی صحافی کی زندگی پر فلمی ڈرامہ "نیا سنسار" لکھا۔ یہ فلم بہت زیادہ کامیاب ہوئی۔ ۴۵-۱۹۴۴ء میں اِنڈین پیوپلز تھیئٹر ایسوسی ایشن کے لئے "دھرتی کے لال" نہ صرف لکھی بلکہ پروڈیوس اور ڈائریکٹ بھی کی۔ اُس میں تمام نئے چہرے تھے اور کوئی بھی پیشہ ور فن کار نہ تھا۔ یہ فلم پیرس میں منعقدہ یونیسکو فلم فیسٹول میں بے حد پسند کی گئی۔ CINEMATHEQUE FRA-NCAISE اور BRITISH FILM INSTITUTE نے بھی اِس فلم کو پسند کیا۔ یہی نہیں بلکہ فلمی تاریخ داں شخصیات GEORGES SADOUL اور PAUL ROTHA نے بھی اِس فلم کو دنیا کی بہترین فلم قرار دیا۔ یہ فلم ایک فنکارانہ شاہکار تھی لیکن عوامی مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ اس کے بعد مالی استحکام نہ ہونے کی بنا پر عباس چھ سال تک کوئی فلم نہ بنا سکے۔ پوری طرح ادب و صحافت ہی پر توجہ دی۔ ناول لکھے اور دُوسرے پروڈیوسروں کے لئے فلمی کہانیاں لکھیں جن میں راجکپور کی پیشکش "آوارہ" نے عالمی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں اپنے فلمی ادارہ "نیا سنسار" کی بُنیاد رکھی اور اِس ادارہ سے "انہونی" پیش کی۔ اِس فلم کی بُنیاد خاندانی ورثے اور ماحول پر تھی۔ دُوسری فلم "راہی" ملک راج آنند کے ناول TWO LEAVES AND A BUD پر مبنی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں فلم "مُنّا" پیش کی' جسکی کہانی ایک بچّہ اور اُس کی اپنی ماں کی تلاش کے گرد گھُومتی ہے۔ یہ فلم ۱۹۵۵ء میں منعقدہ ایڈنبرگ فلمی میلے میں بیحد پسند کی گئی۔ ۵۸-۱۹۵۷ء میں انڈو سوویت اشتراک سے اُنہوں نے رنگین اور سینما اسکوپ فلم "پردیسی" پیش کی۔ عبّاس نے اِس بین الاقوامی فلم کی ہدایات مشہور رُوسی ہدایت کار V. PRONIN کے ساتھ انجام دیں۔ اِس فلم کو ہندوستان اور رُوس میں فلمایا گیا تھا اور CANNES کے فلمی میلہ منعقدہ ۱۹۵۸ء میں یہ فلم JURY SELECTION میں آئی۔ ۱۹۵۹ء میں اُنہوں نے "چار دل چار راہیں" پیش کی اور اُسکی ہدایات بھی دیں۔ اِس فلم میں ہندوستان کے چار بڑے اور مایۂ ناز ستارے تھے اور اِس فلم کے بعد ہی عبّاس نے بڑے فلمی ستاروں کے بغیر فلمیں بنانا طے کیا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے تین سال کے وقفے میں عبّاس نے غیر معروف آرٹسٹوں کو ساتھ لیکر ۱۹۶۳ء میں فلم "شہر اور سپنا" بنائی جو بمبئی کے بے گھر لوگوں کی کہانی تھی۔ ڈسٹری بیوٹرز اور مالکانِ سینما کو اِس تصویر کی نمائش میں تامل تھا۔ اِسکے باوجود "شہر اور سپنا" کو ۱۹۶۳ء کی بہترین فلم کی حیثیت سے حکومتِ ہند نے "صدر گولڈ میڈل" دیا۔ ۱۹۶۴ء میں یہ فلم KARLOVY VARY میں دکھائی گئی اور اِسے اے۔ ایم۔ یو (اکیڈیمی آف آرٹس) کا انعام ملا۔ ۱۹۶۵ء میں عبّاس نے فلم "ہمارا گھر" بنائی جسے یو ایس اے میں تین بین الاقوامی انعامات ملے۔ ۱۹۶۶ء میں اُن کی دوسری فلم "آسمان محل" منظرِ عام پر آئی۔ یہ بھی مقصدی فلم تھی۔ ۱۹۶۷ء میں عبّاس نے "بمبئی رات کی باہوں میں" بنائی اور ۱۹۶۹ء میں "سات ہندوستانی" پیش کی جو قومی یکجہتی پر بہترین فلم قرار دی گئی۔ متعدد فلموں کے منظرنامے اور مکالمے لکھے' اُنہیں پروڈیوس اور ڈائریکٹ کرنے کے علاوہ خواجہ احمد عبّاس نے تقریباً ۴۰ کتابیں لکھی ہیں' جنمیں ناول بھی شامل ہیں۔ ان میں سے چند کتابیں بعض دوسری زبانوں میں بھی چھپی ہیں۔ اُنہیں حکومتِ ہند کی طرف سے "پدم شری" کا اعزاز مل چکا ہے۔ سالہا سال سے "بلٹز" کا آخری صفحہ اُن کا رہینِ قلم ہوتا ہے۔

تین پہیے، ایک پرانا ٹب اور دُنیا بھر کا کچرا

خواجہ احمد عباس

تین اُونچے نیچے پہیے

بھیکو نے خالی کھٹارے کو ڈھکیلتے ہوئے سوچا۔ میری زندگی بھی اسی کھٹارے کی طرح ہی تو ہے جس کو بمبئی بھر میں گھسیٹا پھرتا ہوں۔ جوہو سے باندرہ، دادر، ورلی، اگرگام، فورس روڈ۔ محمد علی روڈ، کالبا دیوی ہوتے ہوئے میرین ڈرائیو تک، جہاں بلڈنگیں شاندار ہیں اور سمندر کی ہوا خوشگوار۔ پھر بھی شام کو اِن کوڑے کے بدبودار ڈھیروں کے کنارے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں ہی لوٹ کر آنا پڑتا ہے۔ دِن بھر میں جتنا کچرا اکٹھا ہوا۔ ٹین کے پرانے ڈبے، خالی بوتلیں، ردّی کاغذ، موٹروں کے ٹوٹے پھوٹے کل پُرزے۔ اُس کا سودا کچرا والا سیٹھ سے کرتا ہوں جو شام کا اندھیرا ہونے تک اپنی لمبی کالی موٹر میں بیٹھا سب کھٹارے والوں کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ کام کی چیز کوئی نظر پڑ گئی تو اُس نے پانچ کا نوٹ دِکھا دیا، ورنہ روپے دو روپے میں کھٹارا خالی کروا لیا اور پھر اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلا گیا۔

کالینہ اور کرلا کے بیچ کا یہ سارا میدان کچرا والا سیٹھ کا تھا۔ اِس پر پڑی ہوئی کوڑے کی ڈھیریاں بھی اُس کی تھیں۔ پرانے زنگ لگے ہوئے لوہے اور ٹین کے انبار بھی اُسی کے تھے، ٹوٹی پھوٹی موٹروں کی باڈیز جن میں انجن نہیں تھے۔ اور پہیے نہیں تھے وہ بھی کچرا والا سیٹھ کی تھیں۔ بھیکو کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ سیٹھ اِن سب بیکار چیزوں کا، اِن بدبودار کوڑے کے ڈھیروں کا کیا کرتا ہے۔ مگر کوئی دھندا تھا ضرور۔ ہر دوسرے تیسرے دِن بڑی بڑی ٹرکیں آتی تھیں اور کاٹ کباڑ اُٹھا کر لے جاتی تھیں اور اُن کی جگہ بھیکو جیسے سیکڑوں کھٹارے والے شہر بھر سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر کچرا لاتے رہتے تھے اور سیٹھ کو روپے دو روپے، پانچ روپے کے عوض بیچتے رہتے تھے اور پھر قریب ہی تاڑی خانے میں جا کر (جو کچرا والا سیٹھ ہی کا تھا) تاڑی پیتے تھے یا ٹھرّے کی نوٹانک چڑھاتے تھے۔ اور جب وہ نشے میں دُھت ہو جاتے تھے تو اپنی اپنی جھونپڑیوں میں اپنی بیویوں کے پاس جا کر سو جاتے تھے اور کبھی کبھی نشے کی حالت میں اور اندھیری جھونپڑیوں میں کبھی بھول سے اور کبھی جان بوجھ کر بیویوں کی ادلا بدلی بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن اُس سب پر رات کے اندھیرے کا پردہ پڑا رہتا تھا اور کوئی اُس کا ذکر نہیں کرتا تھا اور نہ شکایت کرتا تھا۔

یہ سب جھونپڑیاں کوڑے کے ڈھیروں سے گھری ہوئی تھیں اور اُن کی بدبو کو بغیر تاڑی یا ٹھرّا پیئے ہوئے کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ تب ہی تو کھٹارے والوں کو جو کچھ سیٹھ سے ملتا تھا، اُس میں سے آدھا تو دارو خانے کے ذریعہ سے پھر سیٹھ کی جیب میں پہنچ جاتا تھا، باقی جو بچتا تھا، اُس میں سے بھی کافی حصّہ جھونپڑیوں کے کرائے کی شکل میں سیٹھ کے آدمی ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو وصول کر لیتے تھے۔

یہ تین اُونچے نیچے پہیّوں کا کھٹارا بھی سیٹھ کا ہی تھا جس کا کرایہ پانچ روپیہ مہینہ ہر کھٹارے والے کو دینا پڑتا تھا۔ تب ہی تو بھیکو سوچ رہا تھا کہ اُس کی زندگی بھی اُس کھٹارے کی طرح ہے جس کو ڈھکیلتا وہ ہے، مگر جس کا مالک اور مختار کچرا والا سیٹھ ہے۔ اِس کھٹارے کو تین پہیے ہیں۔ بھیکو نے سوچا۔ مگر تینوں الگ الگ سائز کے۔ دائیں کو ایک بڑا پہیّہ ہے، شاید کسی موٹر کا بنا ٹائر کا زنگ لگا ہوا وہیل ہے جو کئی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے۔ بائیں کو ایک سکوٹر کا چھوٹا سا پہیّہ ہے جس کا ٹائر شاید کسی کی غلطی سے اب تک سلامت ہے اور سامنے سب سے چھوٹا پہیّہ لگا ہے جو کسی بچّے کی ٹرائسکل سے چرایا ہوا ہے۔

۲

اسی طرح میری زندگی کے بھی تین پہیے ہیں۔ بھیکو نے کھٹارے کو ڈھکیلتے ہوئے سوچا۔ یہ دائیں طرف کا ٹوٹا، زنگ لگا ہوا پہیّہ تو میں خود ہوں۔ کبھی میں بھی آدمی تھا، جوان تھا۔ اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتا تھا۔ فلموں میں ہیرو بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ گھر سے بھاگ کر جب بمبئی آیا تھا تو وہ سپنے چکنا

چُور ہو گئے تھے، کبھی اسٹوڈیو کے گیٹ کی فولادی سلاخوں سے اُلجھ کر، کبھی فٹ پاتھ کے بے رحم پتھروں پر گر کے۔ کبھی کارخانوں کی اُونچی اُونچی دیواروں پر لگے ہوئے "کوئی جگہ خالی نہیں۔" کے بورڈوں سے ٹکرا کر۔

بیکار سے بیگار بھلی مگر آزادی کے اِس دَور میں کون کسی سے بیگار کام کرا سکتا ہے؟ ہاں ان سنگدل شہروں میں بیکاری سے چوری بہتر ہے، جیب کاٹنا بہتر ہے، آنکھوں میں پسی ہوئی مرچیں جھونک کر یا چاقو دِکھا کر دِن دہاڑے لُوٹ لینا تو بہت ہی بہتر ہے اور قید ہو جائے تو سب سے بہتر ہے، کیونکہ کھانا پینا مُفت اور تعلیم بالغاں کا بہترین انتظام ایک سے ایک قابل پروفیسر بنا فیس لئے لکچر دے رہا ہے، کوئی چوری پر، کوئی ڈکیتی پر، کوئی دھوکے بازی، چارسوبیسی پر، کوئی مار دھاڑ، قتل و خون پر، سب کو سبق پڑھا رہا ہے۔ پہلی بار جیل میں گیا تھا بالک رام — دوسری بار گیا تو رامو، تیسری بار گیا تو وہ بھیکو بن چکا تھا۔ وہ اب تک جُرم کے اِس کالج سے بہت اُونچی ڈگری یا ڈپلومہ لے چکا ہوتا لیکن دل کے ہاتھوں چوری چکاری کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

سو بھیکو اب کچرے کا کھٹارا لئے پھرتا تھا۔ اور سارا دن اُس گھڑی کا انتظار کرتا رہتا تھا جب وہ اپنی جھونپڑی میں واپس جائے گا جہاں بالو چراغ جلائے اُس کی راہ دیکھتی ہوگی۔

۳

بالو اُس کی زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیہ تھی۔ وہ اُس کی بیوی تھی۔ مگر اُن دونوں نے اگنی کے گرد سات پھیرے نہیں لگائے تھے، قاضی جی نے اُن کا نکاح نہیں پڑھایا تھا۔ نہ وہ گرجے میں گئے تھے نہ سرکاری شادی کرنے رجسٹرار کے دفتر میں۔ مگر پھر بھی وہ اُس کی بیوی تھی، اُس کی گھروالی تھی۔ کاش وہ یہ بھی کہہ سکتا کہ وہ اُس کے بچّے کی ماں تھی۔ بچّے کی ماں ضرور تھی، مگر وہ جانتا تھا۔ اور بالو جانتی تھی — دُنیا میں اور کوئی جانتا تھا — کہ وہ بھیکو کا بچّہ نہیں ہے۔

جب فٹ پاتھ پر اُس کی مُلاقات بالو سے ہوئی۔ بالو جس کی آنکھوں میں جادو تھا اور جس کا جوان گدرایا ہوا جسم، اُس کی پھٹی ہوئی چولی اور میلی ساڑی میں سے پھٹا پڑتا تھا تو بھیکو کو ایسا لگا تھا جیسے فٹ پاتھ پر یک بیک پھول کھل گئے ہوں۔ جیسے اُس کے جیون میں بہار آ گئی ہو۔

اُس زمانے میں بھیکو کھوٹا دھندا کرتا تھا۔ روپے پیسے سے اُس کی جیب بھری رہتی تھی۔ پہلے دِن ہی اُس نے کہا تھا "سینما چلتی ہے۔"

"چلو۔" بالو نے بلا جھجک ہاں کر دی تھی۔

بھیکو نے سوچا یہ لونڈیا تو چالو معلوم ہوتی ہے۔

سینما میں اندھیرا ہوا، فلم شروع ہوئی تو بھیکو نے بالو کی ران پر ہاتھ رکھ دیا۔

بالو نے بھیکو کا ہاتھ وہاں سے ہٹا دیا۔

کچھ دیر بھیکو خاموش بیٹھا فلم دیکھتا رہا۔ جب ہیرو ہیروئن نے پیڑ کے گرد گھوم گھوم کر گانا شروع کیا تو بھیکو کی کہنی بالو کے سینے سے ٹکرائی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بھیکو کی ہمّت بڑھی اور جہاں کہنی تھی وہاں اُس کا ہاتھ آ گیا۔ ایک پل کو تو معلوم ہوا جنگلی کبوتر پکڑا گیا۔ پھر دفعتاً بالو اُس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی اور اندھیرے میں لوگوں کے پیروں کو روندتی ہوئی باہر چلی گئی۔

رات کو فٹ پاتھ پر پھر اُن کی ملاقات ہوئی۔ بھیکو نے کہا۔ "بڑی شرافت کا ڈرامہ کرتی ہے، بھاؤ بڑھا رہی ہے کیا؟"

بالو نے جواب دیا۔ "کچھ بھی کر رہی ہوں تمہیں اِس سے کیا؟"

بھیکو نے کہا۔ "جانتی ہے میں کون ہوں؟"

بالو نے چمک کر جواب دیا۔ "جانتی ہوں۔ چور، اُچکا، جیب کترا۔ چارسوبیس ہو۔ دو بار تڑی پار ہو چکے ہو۔ تین بار جیل جا چکے ہو۔"

بھیکو نے غصّے سے دانت پیس کر کہا۔ "جانتی ہے میں تیرا کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم میرا کچھ نہیں کر سکتے۔ سمجھے۔ اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ اور آئندہ سینما جانا ہو تو فورس روڈ سے ایک چھوکری ساتھ لیجایا کرو۔"

بھیکو کا جی چاہا، ایک زنّاٹے دار تھپڑ دے اُس کو۔ مگر نہ جانے کیوں وہ خاموش رہا اور وہاں سے کھسک آیا۔ اگلے کئی دِن اُس نے اُس فٹ پاتھ کا رُخ نہیں کیا۔ مگر اب اُس کا اپنے پُرانے دھندے میں جی نہیں لگتا تھا، نہ قسمت ہی ساتھ دیتی تھی۔ جس کی جیب کاٹتا تھا خالی نکلتی تھی۔ کبھی ہاتھ بھی آتا تو ریلوے کا پاس یا ڈائری۔ وہ تنگ آ کر اُن کو کسی ڈاک کے ڈبّے میں ڈال دیتا۔

—— اگر اس کے کام نہ آسکے تو اصل مالک کے پاس ہی واپس پہنچ جائے۔

۴

اُس کی جان پہچان فوراس روڈ کی ایک طوائف سے تھی۔ جو جنگلی جانوروں کی طرح سلاخوں لگے ایک "پنجرے" میں رہتی تھی۔ جیسے اُس جیسی اور سیکڑوں لڑکیاں رہتی تھیں یا رہنے پر مجبور تھیں۔ ایک دن شام کو ایک خفیہ دارو خانہ میں (جو بہت خفیہ بھی نہیں تھا) بیٹھا پی رہا تھا کہ دفعتاً اُسے بانو کا کہنا یاد آیا۔ "آئندہ سینما جانا ہو تو فوراس روڈ سے ایک چھوکری ساتھ لے جایا کرو۔" اُس کے نشے سے دھندلے ہوتے ہوئے دماغ نے سوچا۔ "سالی سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟ میرے دھندے میں یہ چونچلے نہیں چلتے۔ نیلا بھی کیا بُری ہے۔ مانا کہ رنگ کالا بلکہ نیلا ہے۔ مانا کہ سالی بڑی بدزبان ہے۔ مگر بدن کتنا گٹھا ہوا ہے! اور اپنے کو لینا بھی کیا ہے؟۔ چلو وہیں چلتے ہیں آج پھر؟"

اور ایک بار پھر اُس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم فوراس روڈ پہنچ گئے تھے.... مگر اُس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ اُس کی نیلا سے آخری مُلاقات ہوگی۔ کھولی کے اندر جانے سے پہلے اُس نے گندی نالی کے پاس کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ بڑی بدبُو آرہی تھی، نالی میں سے کہ کھولی میں سے یا خود اُس کے اندر سے؟ پاس ہی ایک خارش زدہ کُتّا نالی کے گندے پانی کو پی رہا تھا۔ بھیکو کو ایک اُبکائی سی آئی۔ مگر اُس نے پتلون کے بٹن لگاتے ہوئے سوچا۔ آج تو ٹانگ کے ساتھ مچھلی جو کھائی تھی۔ وہ شاید سڑی ہوئی تھی۔ پھر وہ نیلا کی کھولی کے اندر چلا گیا۔

وہ خالی بیٹھی اپنے بالوں میں (جو ناریل کے تیل میں ڈوبے ہوئے تھے) پھولوں کی وینی لگا رہی تھی۔ اُس کا بدن تنگ فراک میں سے اُبلا پڑ رہا تھا۔ بھیکو کو دیکھ کر وہ اُٹھی اور ایک نقلی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "بڑے دنوں میں آئے ہو؟ کسی اور چھوکری کے چکر میں ہو گیا؟ یا پھر بڑے گھر کی ہوا کھانے چلے گئے تھے۔؟"

"نہیں ری۔ دھندے سے فرصت نہیں ملتی۔ آج تھوڑا ٹائم مِلا تو سوچا نیلا کے ہاں ہو آؤں۔"

"تو آؤ۔" نیلا نے کمرے کے اندر کے حصّے کی طرف اِشارہ کیا۔

"کچھ ایڈوانس ملے گا؟" بھیکو نے اُس کے بہت قریب آتے ہوئے اُس کے اُودے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ملیگا ملیگا۔ سب ملیگا۔" نیلا کو بھی یہ بازار کا نوجوان پسند تھا۔ جو محنت کراتا تھا مگر دام واجبی دیتا تھا۔

بھیکو اُن اُودے ہونٹوں کو چُومنے کے لئے جُھکا۔ نیلا نے بناوٹی شرمیلے انداز سے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ ناریل کے تیل اور موتیا کے پھولوں کی ملی جُلی میٹھی میٹھی خوشبو کا ایک بھبکا آیا جس میں پاس ہی بہنے والی گندی نالی کی بدبُو بھی شامل تھی۔ اُودے ہونٹوں پر لگی گھٹیا لپ اسٹک کا مزا چکھا ہی تھا کہ بھیکو کو ایک اور اُبکائی آئی اور اُس کا سر گھوم گیا۔

"چل جلدی کر۔" اُس نے اپنی طبیعت پر قابو پاتے ہی نیلا سے کہا۔

نیلا نے اپنا دایاں ہاتھ آگے پھیلا دیا۔ "میں نے ایڈوانس دے دیا۔ اب تم بھی پیشگی دِلواؤ۔"

بھیکو نے دو روپے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

نیلا نے سر ہلا کر اِنکار کیا۔ "ایک روپیہ اور لاؤ۔"

"وہ کاہے کا؟"

"مہنگائی بھتہ۔ ہر چیز کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے بھی اپنی قیمت بڑھا دی ہے۔"

"سالی کہیں کی!" بھیکو بڑبڑایا اور پھر ایک اور روپیہ نکال کر اُس کی لالچی ہتھیلی پر دھر دیا۔

"اب چل اندر۔" نیلا نے اپنا ہاتھ بھیکو کی کمر میں ڈالتے ہوئے اور پردے کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں پردے کے اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ باہر سے کسی کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ نیلا نے جھانک کر دیکھا تو منگو کو کھڑا پایا۔ منگو جو اُس کا دلال تھا۔

اُس نے اِشارے سے پُوچھا۔ کتنا ملا؟ نیلا نے دو روپے دکھائے۔ منگو نے غصّے سے کہا۔ "میں نے کہا۔ نہیں کہ ریٹ بڑھ گیا ہے۔ دو روپے نہیں چلیں گے۔"

نیلا نے تیسرا روپے کا نوٹ بلاؤز کے اندر سے نکال کر دکھایا۔ منگو نے دو روپے چھینتے ہوئے کہا۔ "چل جلدی کر۔ دھندے کا ٹائم ہے۔"

اندر گئی تو نیلا نے دیکھا کہ بھیکو نے اب تک کپڑے نہیں اُتارے دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے بیٹھا ہے

"کون تھا"؟ اُس نے سر اُٹھائے بغیر پوچھا۔

"منگو۔ میرا دلّال۔ کیوں تمہیں کیا ہوا؟"

"سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"اتنے دنوں میں میرے پاس آؤ گے تو سر میں درد ہی ہو گا؟" نیلا نے اپنے فراک کے پیچھے لگا ہوا "زپ" کھولتے ہوئے کہا۔

اب بھیکو نے سر اُٹھایا۔

سامنے بالو ننگی کھڑی تھی۔

نہیں نہیں۔ بالو نہیں۔ نیلا۔

نیلا۔ بالو۔ نیلا۔ بالو۔ تصویر جیسے سینما کے پردے پر پلک جھپکا رہی تھی۔

پلنگ کے پاس تپائی پر ایک اَدھ جلا چار مینار کا سگریٹ مٹی کی ڈھوبری میں پڑا تھا جو ایش ٹرے کا کام دیتی تھی۔ راکھ میں سے اب بھی دھواں اُٹھ رہا تھا

"سگریٹ پیو گے؟" نیلا نے اُسی اَدھ جلے سگریٹ کو جلا کر بھیکو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کس کا ہے؟ کیا تو اب سگریٹ پینے لگی ہے؟"

"میں بھی کبھی کبھی ایک سُٹّا لگا لیتی ہوں۔" نیلا نے ہنس کر سگریٹ کو اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ مگر یہ تو تم سے پہلے جو گاہک آیا تھا وہ جلدی میں چھوڑ گیا ہے۔ وہ پریم کے بعد سگریٹ ضرور پیتا ہے۔"

"پریم"؟ بھیکو نے تعجّب سے دُہرایا

نیلا اب اُسے سگریٹ پیش کر رہی تھی۔ "لو تم پریم کرنے سے پہلے پی لو۔"

بھیکو نے سگریٹ نیلا کے ہاتھ سے لے لیا۔ اب اُس کا سر اور چکرا رہا تھا۔ ہونٹوں کے قریب لایا تو دیکھا اب اُس سگریٹ پر نیلا کی لپ اسٹک کی مُہر بھی لگی ہوئی ہے۔

دفعتاً اُس کے دماغ کے سینما کی مشین جیسے ٹوٹ گئی ہو اور اَن مل بے جوڑ تصویریں ایک کے بعد کر کے پردے پر جھلکنے لگی ہوں۔

نیلا۔

بالو

نیلا

لپ اسٹک لگا کر سگریٹ۔

نیلا کا پہلا گاہک اُس سگریٹ کو پی رہا تھا۔

منگو دلّال۔

پھر لپ اسٹک لگا کر سگریٹ۔

گندی نالی

خارش زدہ کتا گندا پانی چپڑ چپڑ کر کے پی رہا تھا۔

نہیں وہ کتا نہیں تھا۔ وہ خود تھا۔ بھیکو۔

اُسے ایسا لگا کہ اُس کے ہونٹوں کے ذریعہ سگریٹ کا دھواں نہیں جا رہا تھا بلکہ گندی نالی کا گندا سڑا ہوا پانی تھا جو وہ پی رہا تھا۔

اور ایک دم اُسے بڑے زور کی اُبکائی آئی۔ پیٹ کے اندر سے ڈکار نکلی تو اُس میں دارو اور سڑی ہوئی مچھلی کی بُو آئی۔ پھر اُسے ایسا لگا کہ پیٹ کی سب انتڑیاں زور لگا کر باہر نکل رہی ہیں۔ ساتھ میں اُس کا بھیجا بھی سر پھاڑ کر نکلنا چاہتا تھا۔ نیلا کا ننگا جسم اب بڑے زور سے کمر کے گرد گھوم رہا تھا۔ یا سارا کمرہ ہی گھوم رہا تھا۔ اُس نے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالا۔ مگر اس بار متلی کی لہر آئی تو اُس کو ایسا لگا۔ اُس کے پیٹ میں جو کچھ بھی تھا۔ سڑی ہوئی مچھلی، شراب، گندی نالی کا بدبُودار پانی۔ سب کچھ اُچھل کر اُس کے مُنہ سے باہر نکل آیا۔

"ارے ارے"! نیلا چِلّائی۔ "تو نے تو سارے میں اُلٹی کر دی۔ چل باہر نکل یہاں سے!"

بھیکو کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ نہ صرف اُس کے پیٹ سے بلکہ اُس کے دماغ سے، اُس کے دل سے تمام گندگی باہر نکل گئی ہو۔ اب اُس کا سر نہیں چکرا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تصویریں نہیں ناچ رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ سامنے ایک کالی، بدصورت عورت ننگی کھڑی چلا رہی ہے۔ اِس کا بھلا مجھ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اُس نے سوچا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ مگر بڑی احتیاط سے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس گندگی میں جو اُس کے اندر سے باہر نکلی تھی اُس کا پیر پھسل جائے۔

اور اُس رات کو نل پر جا کر وہ صابن مل کر خوب نہایا۔ پھر دُھلے ہوئے کپڑے پہنے۔ پھر وہ فٹ پاتھ کے اُس کونے میں آیا جہاں

بالو سوتی تھی۔ وہ بیٹھی اپنے لمبے مُلائم بال میں کنگھی کر رہی تھی۔

"بالو۔ سینما چلے گی ؟"

بالو نے نگاہ اُٹھا کر خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا۔ ایک شرط پر"

"شرط مجھے منظور ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوگی۔"

وہ سینما دیکھنے چلے گئے اور پہلی بار بھیکو کو کسی لڑکی کے برابر میں بیٹھنا ہی اچھا لگا۔ اُن کے شریر ایک دوسرے کو نہیں چھو رہے تھے مگر ایک نرم نرم لہر اُن کے درمیان دوڑ رہی تھی۔ واپسی میں ایک بج چکا تھا۔ سارا شہر سنسان پڑا تھا۔ اِکّا دُکّا موٹریں سڑکوں پر دوڑ رہی تھیں۔ نیون سائن اپنی آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ شیشے کی دیواروں کے پیچھے دُکانیں جگمگا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا سارا شہر صرف اُن کے لئے سجایا گیا ہے۔ چلتے چلتے بھیکو نے پُوچھا۔

"بالو مجھ سے بیاہ کرے گی ؟"

"میں بیاہ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔"

"کیوں۔ ؟"

"اِس لئے کہ میں تین مہینے سے فٹ پاتھ پر رہتی ہوں۔ وہیں سوتی ہوں اور وہاں پاپ کے لئے کوئی دروازہ بند نہیں ہے۔"

"بالو، میں نے بھی مدّتوں گندی نالی کا پانی پیا ہے۔ بول اب کیا کہتی ہے ؟"

"کل جواب دوں گی۔ ہمارا فٹ پاتھ آگیا ہے۔ لوگ اُٹھ جائیں گے۔ اب تم جاؤ۔ رات بھر میں تم بھی سوچ بچار لینا۔"

اور بھیکو اُس سے کل ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ آج کی رات اُس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور ساری دُنیا میں پُھول ہی پُھول کھلے ہیں!

۵

اگلے دن بھیکو نے پھر بالو سے وہی سوال دُہرایا۔

"بالو مجھ سے بیاہ کرے گی ؟"

"میں بھی ایک سوال کروں ؟"

"پُوچھ، پُوچھ کیا سوال کرنا چاہتی ہے۔"

"چوری، چکاری، کھوٹا دھندا چھوڑ دو گے ؟"

"مگر بالو، کھوٹا دھندا نہیں کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے ؟ تجھے کہاں سے کھلاؤں گا ؟ کھولی جھونپڑی کا کرایہ کہاں سے دوں گا ؟ نوکری تو پہلے بھی نہیں ملتی تھی۔ لیکن اب تو میں دو بار تڑی پار ہو چکا ہوں۔ تین بار جیل کا ٹھپّہ لگ چکا ہے۔ ایسے کو کون کام دے گا ؟"

"کرنا چاہو تو کچھ بھی کر سکتے ہو۔" بالو نے کہا۔

"تو ہی بتا کیا کروں ؟"

بالو نے دیکھا کہ سڑک پر ایک آدمی کھٹارا لئے جا رہا ہے جس میں کاٹ کباڑ بھرا ہوا ہے اور پھر کھٹارے کو ٹھہرا کر وہ کچرے کے ڈرم کے پاس کھڑا ہوا اُس میں سے خالی ٹین کے ڈبّے نکال نکال کر اپنے کھٹارے میں ڈال رہا ہے۔

"جو کام وہ کرتا ہے وہی تم بھی کر سکتے ہو۔"

"تو کہتی ہے تو یہ بھی کر لوں گا۔ پھر تو تو میرے ساتھ رہیگی نا ؟"

بالو نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔

۶

بھیکو نے سوچا۔ اِس کھٹارے کا تیسرا پہیّہ ہمارا بچّہ منّو ہے۔

ہمارا بچّہ ؟

یا صرف بالو کا بچّہ ؟

بھیکو نے دل ہی دل میں یہ سوال دُہرائے اور پھر دل ہی دل میں اُن کا جواب دیا۔

بالو میری ہے (کیا ہوا اگر پنڈت نے اشلوک نہیں پڑھے اور اگنی کے گرد ہم نے سات پھیرے نہیں لگائے، زندگی کی آگ میں تو اکٹھے ہم کو دہی پڑے ہیں ؟) اور منّو نے بالو کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ منّو میرا نہیں تو پھر کس کا بچّہ ہے ؟ اگر کسی نے اُسے مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو میں اُس کا منہ نوچ لوں گا۔ اور پھر آج تو ہمارے منّو کی سالگرہ ہے۔ اِسی دن پچھلے برس اُس نے جنم لیا تھا۔ تب ہی تو بھیکو آج کے دن زیادہ سے زیادہ کچرا اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔ آج وہ سیٹھ سے پُورے دس روپے وصول کرے گا۔ پانچ روپے اُس نے پہلے سے بچا رکھے تھے۔ پندرہ میں سے پانچ روپے کی مٹھائی تو وہ اپنے پڑوسیوں میں تقسیم کرے گا۔ پانچ روپے کے کپڑے اور کھلونے منّو کے لئے لائیگا اور پانچ روپے میں بالو کو ساتھ لے جا کر سینما دکھائے گا۔ آج کی رات

وہ عیش کریں گے۔ آج منّو کی پہلی سالگرہ ہے نا؟

مگر ڈیڑھ برس پہلے جب اُس کو معلوم ہوا تھا کہ باؔلو ماں بننے والی ہے تو وہ خوش نہیں ہوا تھا۔ وہ دِن یاد کرکے آج بھی اُسے جُھرجُھری آجاتی تھی۔

ابھی اُنہیں ساتھ رہتے ہوئے تین دِن ہی ہوئے تھے اور وہ دونوں مِل کر اپنی جھونپڑی کی چار دیواریں بنا کر اُس پر چھت ڈال ہی رہے تھے کہ کام کرتے کرتے باؔلو ایک دم سے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بھؔیکو پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا کر لا سے ایک ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے باؔلو کا معائنہ کرنے کے بعد بھیکو کو ایک طرف لے جا کر مُسکراتے ہوئے کہا تھا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بہت جلد ہوش ہو جائیگا۔ تمہاری بیوی ماں بننے والی ہے۔!"

ڈاکٹر فیس لے کر چلا گیا۔ لیکن بھؔیکو کو دنیا گھومتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہتھوڑے کی چوٹ کی طرح سوالوں کی مار اُس کے دماغ پر پڑ رہی تھی۔ ابھی تو ہمیں ساتھ رہتے تین دِن ہی ہوئے ہیں!

پھر یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

باؔلو کو ہوش آیا تو اُس نے پُوچھا۔ "مجھے کیا ہوا تھا بھیکو؟" اور بھؔیکو نے گالی دے کر اُس کو خوش خبری سُنا دی تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

باؔلو کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ "ہے بھگوان' یہ کیا ہوا۔؟"

"بھگوان کو کیوں دوش دیتی ہے" بھؔیکو نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔ "اُس شیطان کو یاد کر جس کا نطفہ تیرے پیٹ میں پل رہا ہے؟۔ بول وہ کون تھا۔؟"

ایک زنّاٹے دار تھپّڑ باؔلو کے گال پر پڑا۔ "بول، بول وہ کون تھا؟" اور پھر ایک اور تھپّڑ۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔

"مارو، مارو مجھے خوب مارو۔" باؔلو روتی جا رہی تھی۔ "مجھے مار ہی ڈالو۔ میں نے پاپ کیا ہے۔ مجھے اِس کی سزا ملنی ہی چاہیے مگر میں نے تو پہلے ہی تجھے کہہ دیا تھا کہ میں بیاہ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔"

باؔلو کو مار پیٹ کر بھؔیکو باہر نکل گیا۔ کتنے ہی دِنوں کے بعد پہلی بار دارو پی۔ اور پھر دارو خانہ میں بھی چین نہیں ملا تو وہ نہ جانے کتنی دیر سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ رات اندھیری تھی۔ سردی کا زمانہ تھا۔ ماہم کے چوراہے کے پاس ایک جگہ روشنیاں جلتی دیکھیں اور اندر بھیڑ بھی کافی تھی تو وہ اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ عیسائیوں کا گرجا گھر ہے۔ اندر خاصی گرمی تھی۔ سب لوگ دوزانو ہو رہے تھے۔ سو بھیکو بھی دو زانو ہو گیا۔ سامنے کتنی ہی مورتیاں نظر آئیں۔ ایک آدمی تھا۔ خوبصورت جوان، بھوری بھوری ڈاڑھی والا۔ جس کو نہ جانے کس ظالم نے سولی پر چڑھایا ہوا تھا۔ کئی مورتیاں ایک عورت کی دِکھائی دیں جس کے چہرے پر بڑی معصومیت اور ممتا تھی۔ گود میں بچّہ تھا۔ اُس کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بھؔیکو کی آنکھوں میں اُس کی اپنی مری ہوئی ماں کی صُورت گھوم گئی۔

"یہ عورت کون ہے؟" اُس نے مورتی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے ایک آدمی سے پُوچھا۔ اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "اِن کا نام میرؔی ہے اِن کی گود میں اِن کا بچّہ ہے جو آگے چل کر حضرت عیسٰی کے نام سے مشہور ہوا۔"

"اور اِس بچّے کا باپ؟"

"اُس کا کوئی باپ نہیں تھا۔ اُس کا باپ خُدا تھا۔ بھگوان تھا۔"

اور بھؔیکو کو دفعتاً ایسا محسوس ہوا کہ اُس کے کان میں کوئی کہہ رہا ہے۔ جس بچّے کا کوئی باپ نہیں ہوتا اُس کا باپ خُدا ہوتا ہے۔ بھگوان ہوتا ہے! باؔلو کے ہونے والے بچّے کا بھی تو کوئی باپ نہیں ہے۔ تو پھر کیا....؟

اور ایک دم جیسے طوفان تھم گیا ہو۔ جیسے اُس کا نشّہ اُتر گیا ہو۔ اور اب وہ سوچنے لگا۔ کیا میں نے باؔلو کو' اپنی باؔلو کو جو مجھے جان سے زیادہ پیاری ہے' واقعی مارا پیٹا۔ نہیں وہ کوئی اور ہو گا۔ مگر وہ شیطان میرے اندر رہتا ہے۔ اب میں اُسے نکال باہر کروں گا۔

اور وہ گھر واپس آگیا۔ دیکھا کہ جھونپڑی میں لالٹین جلی ہے۔ کھانا پکا رکھا ہے۔ پاس ہی مُنہ دھونے کو پانی ہے۔

اُس کو دیکھ کر باؔلو نے کہا۔ "لو کھانا کھالو۔"

"تُو نے نہیں کھایا؟"

"گھر والے سے پہلے گھر والی کیسے کھا سکتی ہے؟"

بھیکو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔ "کتنی اچھّی ہے میری باؔلو۔" اُس نے سوچا۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔"

ہاتھ مُنہ دھوتے ہوئے اُس نے جھوٹ مُوٹ کی ڈانٹ

پلائی۔ "چل ہاتھ منہ دھوکے تو بھی بیٹھ جا۔ آج ہم اکٹھے کھانا کھائینگے۔"

اور جب وہ دونوں کھانے بیٹھے تو بھیکو نے کہا۔ "اب تیری فکر کرنی پڑے گی۔ تو ماں بننے والی ہے نا؟"

باآو نے شرماکر نظریں جھکالیں۔

بھیکو نے ایک نوالہ اپنی بیوی کو کھلاتے ہوئے کہا۔ "اری شرماتی کیوں ہے؟ اگر تو ماں بننے والی ہے تو میں بھی باپ بننے والا ہوں!"

اب باآو کو یقین ہوگیا کہ بھیکو نے اُس کے سب گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ اُس نے خاموش نظروں سے شکریہ ادا کیا اور بھیکو کے ہاتھ پر اپنا نرم ہاتھ رکھ دیا۔

سات مہینے کے بعد باآو نے بچہ جنا۔ دائی نے باہر آکر بھیکو سے کہا۔ "مبارک ہو۔ بیٹا ہوا ہے۔"

بھیکو نے پڑوسیوں میں مٹھائی بانٹی۔ بچے کا نام منوہر لال رکھا گیا۔ مگر ماں باپ اور اڑوس پڑوس والے سب اُسے منّو ہی کہتے تھے۔

اور آج وہی منّو سال بھر کا ہوگیا ہے۔

۷

یہاں تک ہی بھیکو نے سوچا تھا کہ سامنے جوہو کے ایک بہت بڑے ہوٹل کے باہر کچرے کے ڈرم کے پاس ایک پرانا ٹب پڑا دیکھا تھا۔ رک کر اُس نے سوچا، ہوٹل کے آس پاس تو بہت کام کا مال ملتا ہے۔ دارو کی بوتلیں۔ خالی ٹین جن میں کبھی مچھلی یا گوشت ہوتا تھا۔ مگر اتنی بڑی چیز جیسی کہ وہ ٹب تھا اُس نے آج پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ نہ جانے کیوں اچھے خاصے ٹب کو کوڑے پر پھینک دیا گیا تھا۔

ہوٹل میں ہڑتال ہو رہی تھی۔ اس لئے بیس بائیس بیرے، ویٹر وغیرہ ہوٹل کے باہر ہی کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک سے بھیکو نے "ٹب" کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیوں بھائی۔ یہ پرانا بیکار ٹب لے لوں؟"

بیرے کی سفید وردی پہنے ہوئے ایک نوجوان بولا۔ "لے لو بھائی کون منع کرتا ہے۔ ہماری طرف سے یہ سارا ہوٹل ہی لے لو۔ یہ ٹب تو انہوں نے جان بوجھ کر یہاں پھنکوائی ہے۔ تم اسے لینا چاہتے ہو تو لے لو۔ مگر اس کی کہانی بھی جانتے ہو؟"

بھیکو نے سر ہلا کر انکار کیا۔ مگر اُس نے دیکھا کہ وہ بیرہ ٹب کے اندر کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہا ہے۔ اب بھیکو نے غور سے دیکھا اندر کی طرف ایک دھبہ پڑا تھا کتھئی رنگ کا جو زمانے کے ساتھ اُڑتا جا رہا تھا، مگر ابھی تک تھا! "پان کی پیک ہے یا پینٹ کا دھبہ؟" بھیکو نے اُس بیرے سے سوال کر ہی دیا۔ جواب ملا۔ "یہ نہ پینٹ ہے نہ پان کی پیک ہے۔ یہ کسی کے خون کا دھبہ ہے!"

خون بھرے ٹب کی کہانی

ٹب سفید تھا، چکنا تھا، گرم پانی سے بھرا ہوا تھا۔ پاس ہی دو بڑے اور چار چھوٹے تولئے لٹکے ہوئے تھے۔ خوشبودار صابن کی ٹکیہ رکھی تھی۔ اوپر شاور باتھ کا فوارہ لگا تھا۔ ریکھا نے اپنی انیس برس کی عمر میں نہ اتنا خوبصورت باتھ روم دیکھا تھا نہ ایسا شاندار ٹب۔

اُس کی زندگی تو ایک چھوٹے سے قصبے سے بسر ہوئی تھی۔ باپ ایک اسکول میں ٹیچر تھا۔ ماں مر چکی تھی۔ ایک چھوٹی بہن اور دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے۔ باپ نے ریکھا کو اسکول میں میٹرک تک تعلیم دلائی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ ٹیچرس ٹریننگ کا سرٹیفکٹ لے کر وہ بھی وہیں گرلز اسکول میں ٹیچر ہو جائے اور اپنی تنخواہ سے گھر چلانے میں اور بھائی بہنوں کی تعلیم میں مدد دے۔ مگر ریکھا کو ٹیچری کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کی کلاس میں کئی لڑکیاں امیر خاندانوں کی تھیں۔ کوئی کسی کنٹراکٹر کی بیٹی۔ کوئی کسی افسر کی بہن۔ کوئی بمبئی ہو آتی تھی اور وہاں کی رنگین زندگی کے قصّے سُناتی تھی۔ اور ایک سندھی تاجر کی بیٹی، تو اپنے باپ سے ملنے ہانگ کانگ تک ہو آئی تھی اور وہاں سے لائی ہوئی شفون، نائلون کی ساڑھیاں پہن پہن کر دوسری لڑکیوں کا دل جلاتی تھی۔ یہ سب لڑکیاں ہر وقت ساڑھیوں، سلیکس، بیل باٹم، سٹریچ پینٹس کی باتیں کرتی تھیں۔ اُن کی بڑی آزاد زندگی تھی۔ جس کو غریب ریکھا رشک سے دیکھتی تھی اور دل ہی دل میں سوچتی تھی کہ کاش، میرے پاس بھی ایسے خوبصورت، قیمتی اور فیشن ایبل کپڑے ہوتے۔

بمبئی سے انگریزی میں کئی عورتوں کے رسالے نکلتے تھے۔ ریکھا کو جو پانچ روپے مہینہ جیب خرچ ملتا تھا۔ اُس میں سے

وہ ہر مہینے یا پندرھویں روز یہ سارے رسالے خریدتی تھی اور اُن میں عورتوں کے نئے فیشن، نئے بالوں کے سنگھار کے طریقے، خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں۔ امیر گھروں کی سجاوٹ کی تصویریں، یہ سب دیکھا کرتی تھی۔

ان رسالوں میں سے ایک نے اعلان کیا تھا کہ "مس انڈیا" کا انتخاب ہو گا۔ اُس کے لئے پندرہ ۱۵ برس سے لے کر پچیس ۲۵ برس کی لڑکیاں اپنی تصویریں بھیجیں۔ جو لڑکی "مس انڈیا" منتخب ہو گی اُس کو نہ صرف تاج پہنایا جائے گا۔ بلکہ دس ہزار روپے نقد، امریکہ کا سفر مفت اور مختلف کمپنیوں کی طرف سے ساڑھیاں، ڈریس، زیور، ریڈیو، اور ٹرانسسٹر انعام میں ملینگے۔ ریکھا کو ایسا لگا کہ اُس کے لئے اپنی قسمت بدلنے کا یہی ایک موقع ہے۔ کیونکہ قدرت کی طرف سے اُس کو یہی دو تحفے تو ملے تھے۔ اچھی خاصی صورت اور سڈول اور خوشنما بدن۔ صورت تو لوگوں کو ریکھا کی ملگجی ساڑھیوں میں بھی اچھی لگتی تھی مگر اپنے بدن کی نمائش کرنے کا موقع ابھی تک اُس کو نہ ملا تھا۔ صرف اپنے گھر کے غسلخانے میں جب وہ نہانے جاتی تو ریکھا خود ہی خود اپنے بدن کو دیکھ کر خوش ہو لیا کرتی تھی یا کچھ سوچ کر شرما جایا کرتی تھی۔

اِس مقابلے میں شریک ہونے کے لئے پہلی شرط یہ تھی کہ ہر لڑکی اپنی تین تصویریں بھیجے، جن میں سے ایک تصویر "سومنگ کاسٹیوم" میں ہو، تاکہ صورت کے ساتھ اُس کے بدن کی خوشنمائی کا بھی اندازہ کیا جا سکے۔ ریکھا کیلئے سوال یہ تھا کہ تصویریں کہاں کھنچوائی جائیں۔ اُس کے پاس تو اتنے پیسے تھے نہیں کہ فوٹو گرافر کی دکان پر جا کر تصویریں کھنچوائے۔ پھر اُس نے اپنی ایک سہیلی شیلا سے مشورہ کیا۔ جس کا باپ مقامی سینما کا مالک تھا۔ وہ خود اِس مقابلے میں حصہ نہیں لے رہی تھی کیونکہ اُس کی ایک آنکھ بھینگی تھی، جس پر وہ ہر وقت ایک فیشن ایبل کالا چشمہ چڑھائے رکھتی تھی۔ اُس نے ریکھا کو یقین دلایا کہ تصویروں کا انتظام ہو جائے گا۔ اُس کے بھائی کے پاس بہت اچھا جرمن کیمرہ ہے۔ اور اُسے خوبصورت لڑکیوں کی خوبصورت تصویریں کھینچنے کا شوق بھی ہے۔

۲

ایک دن اپنے باپ سے یہ بہانہ کر کے کہ اُس کی سہیلی کی سالگرہ ہے۔ ریکھا اپنی بہترین ساڑھی پہن کر شیلا کے ہاں پہنچی۔ وہاں شیلا نے اُس کی ملاقات اپنے بھائی گووند سے کرائی۔ گووند نے ریکھا کو گھور کر دیکھا جیسے اُسے "ایکس رے" کر رہا ہو یا اُس کے مقابلہ حسن میں آنے کے اِمکانات پر غور کر رہا ہو۔ پھر شیلا سے بولا۔ "تمہاری سہیلی کو پچاس فی صدی چانس تو ہے، شرط یہ ہے کہ تصویریں اچھی بن جائیں۔"

"وہ تو بن ہی جائیں گی! جب تم خود فوٹو گرافر ہو ــــ شیلا نے کہا۔ اور پھر ریکھا کی طرف مخاطب ہو کر۔ "اچھا ریکھا، بائی بائی۔ میں تو ممی ڈیڈی کے ساتھ ایک لنچ پر جا رہی ہوں۔ گووند بھیا بیچارے صرف تمہاری وجہ سے نہیں جا رہے۔ وہ تمہاری دیکھ بھال کریں گے۔ اور، اور۔ تم اُن کی دیکھ بھال کرنا!" اِس پر گووند اور شیلا نے ایک ایسا قہقہہ لگایا جس کو سن کر ریکھا کسی قدر سٹ پٹا گئی۔ ہاں میرے کپڑے جو چاہے تم فوٹو گرافی کے لئے اِستعمال کر سکتی ہو۔" اور پھر اپنے بھائی سے۔ "گووند بھیا۔ جس چیز کی ضرورت ہو، وہ میری الماری سے نکال لینا۔"

سب لوگ چلے گئے اور وہ دونوں شیلا کے بیڈ روم میں اکیلے رہ گئے تو گووند نے ریکھا کی طرف بڑھا اور اُس کی ساڑی کا پلّو نیچے گرا دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" ریکھا گھبرا کر بولی۔

"ڈرو مت۔ میں صرف فوٹو گرافر کی حیثیت سے تمہیں ہر زاویئے سے دیکھ رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ نہ یہ ساڑھی چلے گی نہ یہ بلاؤز۔ اور۔ اور۔ نہ یہ بریسیر جو تم نے بلاؤز کے اندر پہن رکھا ہے۔ تمہارے بال لمبے اور ملائم ہیں۔ لیکن یہ جوڑا نہیں چلے گا۔" یہ کہہ کر اُس نے ریکھا کا جوڑا کھول کر اُس کے بال شانوں پر لہرا دیئے۔

"یہ بہتر ہے۔ مگر کوئی معقول ساڑھی، بلاؤز اور بریسیر تلاش کرنے ہوں گے۔"

یہ کہہ کر گووند نے شیلا کی الماری کھولی اور اُس میں سے ساڑھیاں بلاؤز، پیٹی کوٹ، بریسیر نکال نکال کر بستر پر ڈال دیئے۔ ایک ایک ساڑھی کھول کر اُس کو ریکھا کے شانے پر ڈال کر دیکھا۔ کبھی کبھی "غلطی" سے اُس کا ہاتھ ریکھا کی چھاتی کے اُبھاروں کو بھی لگ گیا۔ ریکھا کے تن بدن میں ایک جھرجھری سی آگئی۔ آخر کار ایک سلک کی ساڑھی پسند آئی۔ پھر اُس کے ساتھ کا بلاؤز بھی تلاش کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے شیلا اور ریکھا کا قد و قامت ایک جیسا ہی تھا۔ مگر پھر بھی بلاؤز کو اُس کے بدن پر رکھ کر دیکھنا پڑا کہ گلے کا کٹاؤ کافی گہرا ہے کہ نہیں۔

"بس اب ایک برسیر رہ گیا ہے۔" گووند نے اعلان کیا اور پھر ایک ایک کر کے برسیروں کو اُٹھا اُٹھا کر اُن کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک برسیر پسند آیا کیونکہ اُس کا رنگ ریکھا کی جلد کی رنگ کے مُطابق تھا۔ بڑی بے شرمی سے برسیر کی کٹوریوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور ریکھا کی چھاتیوں کی طرف جو ساڑھی کا پلّو گر جانے سے اپنے بلاؤز کے اندر کسمسا رہی تھیں۔ گووند نے کہا۔ "بس اب ٹھیک ہے۔ تم باتھ رُوم میں جا کر کپڑے پہن لو۔ اور میں اپنا کیمرہ ٹھیک ٹھاک کر لیتا ہوں!"

برسیر اور ساٹن کا پیٹی کوٹ پہن کر اور بال شانوں پر بکھرا کر ریکھا نے باتھ رُوم کے آئینے میں دیکھا تو اُسے بالکل کوئی اور ہی لڑکی کھڑی دکھائی دی۔ کیا میں واقعی اِتنی خوبصورت ہوں؟" اُس نے سوچا۔ "ماڈل"۔ لڑکیوں کو ایسے لباس پہنے ہوئے اُس نے اکثر رسالوں میں چھپی ہوئی تصویروں میں دیکھا تھا۔ لیکن آج اُسے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی "ماڈل" سے کم نہیں ہے۔ "ایک دفعہ بمبئی پہنچ جاؤں تو بیوٹی کوئین بنوں نہ بنوں کامیاب "ماڈل" تو میں ضرور بن جاؤں گی۔"

یہ سوچتے ہوئے اُس نے بلاؤز پہن کر ساڑھی کو لپیٹنا شروع کیا۔ اُس نے دیکھا تھا کہ "ماڈل" لڑکیاں کس طرح کس کر ساڑھی باندھتی ہیں۔ جس سے بدن چھپتا نہیں اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اُسی انداز سے ریکھا نے ساڑھی باندھی اور پھر اُس کو پن لگا کر جسم سے چپکا ہوا لائی ڈریس بنا لیا۔ پلّو کو ایک کندھے پر سے گزار کر کمر کے گرد باندھ لیا گیا، جس سے اُس کا سینہ جو پہلے ہی بلاؤز کے گہرے کٹاؤ سے باہر نکلا پڑ رہا تھا اور بھی نمایاں ہو گیا۔

ریکھا شرماتی، کسی قدر ڈرتی، ہچکچاتی ہوئی باہر نکلی تو گووند نے واقعی کیمرہ لگایا ہوا تھا۔ فوٹو گرافروں والے بجلی کے تین لیمپ بھی رکھے تھے ریکھا کے بیٹھنے کے لئے ایک گول گھومنے والا اسٹول رکھا تھا۔ ریکھا کے آنے کی آہٹ ہوئی تو گووند نے مُڑ کر دیکھا اور بے اختیار اُس کے مُنہ سے ایک سیٹی بجی۔ جیسے ریکھا نے کبھی کبھی بازار میں گزرتے ہوئے آوارہ لوگوں کو بجاتے ہوئے سُنا تھا! وہ ایک دم بوکھلا گئی۔

گووند نے اُسے اطمینان دلایا۔ "گھبراؤ مت ریکھا۔ میں آج صرف ایک فوٹو گرافر ہوں۔" ریکھا کو محسوس ہوا کہ لفظ آج پر ہلکا سا زور ہے۔ گووند نے اپنا جملہ پورا کیا۔ "آج میں کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جو فوٹو گرافر نہیں کرتے۔ لیکن اچھی تصویر کھچوانے کے لئے "ماڈل" کو جھینپنا یا شرمانا نہیں چاہئے۔ اب تم اطمینان سے اِس اسٹول پر بیٹھ جاؤ۔"

ریکھا بیٹھ گئی۔

لیمپوں کو اِدھر اُدھر کیا گیا تاکہ روشنی ٹھیک زاویئے سے اُس کے چہرے پر پڑے۔ بجلی کی روشنی میں بھی اِتنی گرمی ہوتی ہے، یہ آج معلوم ہوا۔ مگر ریکھا کے گالوں پر یہ آنچ اچھی لگ رہی تھی۔

"اِدھر دیکھو۔"

ریکھا نے اِدھر دیکھا۔

"نہیں نہیں اُدھر دیکھو۔"

ریکھا نے اُدھر دیکھا۔

"تھوڑا بائیں کو۔ نہیں نہیں دائیں کو۔ بدن پروفائیل میں ہونا چاہئے۔ پھر پیچھے کی طرف مُڑ کر کیمرے کی طرف دیکھو۔ یہ ٹھیک ہے۔"

ریکھا کو محسوس ہو رہا تھا کہ گووند کیمرے میں سے اُس کے سینے کے اُبھاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کو ریشمی بلاؤز کے نیچے چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"ٹھہرو، ٹھہرو۔" یہ کہتا ہوا گووند اُس کی طرف آیا اور اُس نے بالکل پاس آ کر ریکھا کے گالوں کو چھو کر اِدھر اُدھر کیا، پھر ٹھوڑی کو ہاتھ سے اُٹھایا۔ "ذرا اُوپر۔ ذرا اور اُوپر۔ گردن کا خم بُرا نہیں ہے۔ یہ بھی تصویر میں آ جانا چاہئے۔" مگر اس تمام عرصہ اُس کی کُہنی شاید غلطی سے ریکھا کے سینے کو چھوتی رہی اور خود ریکھا کو تعجب ہوا کہ اُس نے ایک بار بھی گووند کو پرے ہٹنے کو نہیں کہا۔ شاید اُس کا لمس ریکھا کے لاشعور کو اچھا لگ رہا تھا۔

آخر کار گووند اپنے کیمرے کے پاس گیا۔ تصویریں لینی شروع کیں۔

"اِدھر دیکھو۔"

کلک۔

"اُدھر دیکھو۔"

کلک۔

"اُوپر دیکھو۔"

کلک۔

ایک کے بعد ایک تصویریں کھنچتی جا رہی تھیں، اور

گووِند کا کیمرہ ریکھا کے پاس آتا جاتا جا رہا تھا۔ اب کیمرہ اُس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"ریکھا۔ اب ہونٹوں کو ایسے کرو جیسے کسی کو پیار کر رہی ہو۔"

ریکھا نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا تھا۔ سوائے اپنے چھوٹے بھائی بہن کو۔ ویسے ہی اُس نے ہونٹ آگے کو کر دیئے۔

کلک۔

تیز روشنی، گرمی، ریکھا کے گال تمتما رہے تھے۔ سارے تن بدن میں ایک ہیجان مچ رہا تھا۔ سوئے ہوئے سپنے جاگتے جا رہے تھے۔ مگر ریشمی بلاؤز، ساٹن کے پیٹی کوٹ۔ شفون کی ساڑی کے لمس سے نیند سی آ رہی تھی۔ لیمپوں کی تیز روشنی عین اُس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ روشنیوں کے سوا کچھ بھی تو نظر نہیں آتا تھا۔ نہ گووِند نہ گووِند کا کیمرہ۔ نہ کمرہ۔ بس ایک ہی آواز کان میں آ رہی تھی۔

کلک، کلک، کلک۔!

پھر ایک دم روشنیاں غائب ہو گئیں اور ریکھا کو ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر کی لہروں نے اُسے ایک قدم کنارے پر لا پٹخا ہو۔

ایک ہاتھ نے ریکھا کے بالوں کو چھوا۔ پھر اُنگلیاں گالوں پر اُتر آئیں۔ گالوں پر سے ہو کر بغیر آستین کے بلاؤز میں سے نکلے ہوئے شانے کو سہلاتی ہوئی اور نیچے۔

"گووِند بھیا!" ریکھا چلائی جیسے خطرہ اُس نے پہلی بار محسوس کیا ہو۔

گووِند الگ ہٹ گیا۔ "دیکھو، میں کسی خوبصورت لڑکی کا بھیا ویا بننا پسند نہیں کرتا ہوں۔ مگر آج میں صرف فوٹوگرافر کا رول ادا کروں گا۔ بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ جاؤ، اب سوئمنگ کاسٹیوم پہن لو۔ یہ تصویر بھی ہو جائے۔"

سوئمنگ کاسٹیوم پہن کر ریکھا آئی تو لجاتی ہوئی۔ مگر گووِند نے کہا۔ "دیکھو۔ بیوٹی کوئین بننا ہے تو یہ سب نہیں چلے گا۔ جھجھک۔ مجھ سے مت ڈرو۔ مجھے کیمرے کا ہی ایک حصہ سمجھو۔ میں نے کہہ دیا ہے آج کے دن میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔"

ریکھا کیمرے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

گووِند نے کیمرے کے اندر دیکھتے ہوئے فوکس ٹھیک کیا۔

"نظر اُٹھاؤ۔"

ریکھا نے نظر اُٹھائی۔ دیکھا کہ گووِند اُس کو صرف کیمرے کے اندر سے دیکھ رہا ہے۔

"اب دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھاؤ۔ بالکل سیدھے نہیں۔ تھوڑا خم ہونا چاہیئے، جیسے ہاتھوں میں ایک فٹ بال پکڑے ہو۔ پاؤں ایک دوسرے سے پرے کرو۔ اب ایڑیاں اُٹھا کر لمبا گہرا سانس لو۔ سانس روکو۔ شاباش۔"

کلک۔

اب گووِند نے کیمرے سے اپنا چہرا ہٹایا اور اُس کی نظروں نے ریکھا کے بدن کا جائزہ لیا۔ کتنی بھوکی نگاہیں تھیں اُس کی۔ جیسے ریکھا کو کچا چبا جائیں گی۔ ریکھا کو ایسا محسوس ہوا کہ گووِند کی نگاہیں اُس کے بدن سے سوئمنگ کاسٹیوم بھی اُتارنا چاہتی ہیں۔ ریکھا کو اُس کا اِس طرح گھورنا بہت بُرا لگ رہا تھا جیسے کوئی اُسے گالی دے رہا ہو۔ اور بہت اچھا بھی لگ رہا تھا۔

"جاؤ، کپڑے بدل لو ریکھا۔ اب وہ لوگ واپس آنے والے ہی ہوں گے۔"

ریکھا جلدی سے باتھ رُوم کی طرف چلی گئی۔

"مگر، سُنو ...."

ریکھا گھبرا کر رُک گئی۔

"اِدھر دیکھو۔"

ریکھا نے مُڑ کر دیکھا

"میرا انعام ؟"

"میں کیا انعام دے سکتی ہوں ؟"

"بہت کچھ دے سکتی ہو۔ مگر میں یہ انعام صرف اُس صورت میں وصول کروں گا اگر میری فوٹوگرافی کا جادو "حور بیگم" کے ایڈیٹروں پر چل گیا اور تم بیوٹی کوئین چُن لی گئیں۔ وعدہ کرنے کی ضرورت نہیں، میں تمہاری خاموشی کو ہاں سمجھوں گا۔ نا کرنا چاہو تو کر سکتی ہو مگر صرف اُس صورت میں، میں کیمرے میں سے فلم نکال کر سب تصویریں ابھی خراب کر دوں گا۔"

ریکھا کا جی چاہا کہ ایک بار کہہ دے۔ "نا۔ نا۔ نا۔ ہزار بار نا" تصویریں جائیں چولہے میں۔ اِن کا جو جی چاہے کرو۔ مگر میں تمہاری بات ماننے والی نہیں۔"

مگر اُس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے باتھ روم کے اندر چلی گئی۔ وہاں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ باہر سے گووِند کے

دیا سلائی گھس کر سگریٹ جلانے اور پھر سیٹی بجانے کی آواز آئی۔

۳

تصویریں بھیجنے کے ڈیڑھ مہینے بعد "بیگم" کے ایڈیٹر کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ہزاروں اُمیدواروں میں سے ریکھا کو پہلی دس لڑکیوں میں چُن لیا گیا ہے۔ اب اُس کو بمبئی آنا ہوگا۔ ٹکٹ کا خرچہ "بیگم" کے ایڈیٹر دیں گے، ہوٹل میں اپنے خرچے پر رکھیں گے اور پھر ان دس لڑکیوں کو ایک بھرے مجمع کے سامنے پیش کیا جائیگا۔ اور تب "مس انڈیا" کا انتخاب ہوگا۔!

ریکھا جس نے ایسے ہی اپنی تصویریں کھنچوا کر چُپکے سے بھیج دی تھیں۔ یہ خط پڑھ کر خوشی سے پاگل ہوگئی۔ اُس کو تو کامیابی کی ذرا سی بھی اُمید نہیں تھی۔ سارے ہندوستان کی خوبصورت، امیر اور فیشن ایبل لڑکیوں نے اپنی تصویریں بھیجی ہونگی، اُن سب سے بازی لیجانا کوئی معمولی بات تھوڑا ہی تھی۔ خط ملتے وہ بھاگی بھاگی اپنے باپ کے پاس گئی اور خط دکھایا۔ پڑھتے ہی اُس کے ماتھے پر شکنیں پڑگئیں "بیٹی یہ کس چکر میں تو نے اپنے آپ کو پھنسا دیا ہے۔؟"

"پتاجی۔ آپ تو اگلے وقتوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اتنا بڑا اخبار ہے۔ سارے ہندوستان کی تعلیم یافتہ خواتین اُسے پڑھتی ہیں۔ اُس کی ایڈیٹر ایم اے پی ایچ ڈی ہے۔ اِس مقابلہ حُسن کے ساتھ جج ہوئیں اُن میں منسٹر، ڈاکٹر، بیرسٹر، ایڈیٹر سب ہی ہیں۔ بھلا کوئی بُری بات ہوتی تو یہ معزز لوگ اِس میں شریک تھوڑا ہی ہوتے؟"

"بیٹی اُن لوگوں کی اور بات ہے۔ اُن کے لئے تو گھڑی دو گھڑی کی تفریح کا ذریعہ ہے۔ مگر تیری تو ساری زندگی کا سوال ہے۔ عزت، آبرو کو لئے کونے میں بیٹھے ہیں تو کیوں دنیا کے سامنے آکر اپنی اور میری جگ ہنسائی کا سامان کرتی ہے؟"

"پتاجی"۔۔۔ وہ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولی۔ آپ تو کبھی اپنے بچوں کی ترقی کی سوچتے ہی نہیں ہیں۔ جانتے ہیں جسے اول انعام ملے گا۔ اُسے دُنیا کے سفر کو بھیجا جائے گا۔ واپسی پر فلم اسٹار بننے کا کنٹراکٹ بھی مِل سکتا ہے۔ اول انعام نہیں بھی مِلا تو "ماڈل" کا کام تو دس کی دس لڑکیوں کو مِل جائے گا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ماڈلنگ میں آج کل کتنی آمدنی ہے۔ ہزار پندرہ سو روپیہ ماہوار تک کماتی ہیں لڑکیاں۔ اور پھر کپڑے، ساڑھیاں، جُوتے وغیرہ جن کو پہن کر تصویر کھنچواتی ہیں وہ سب مُفت۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آئیگا"

اُس کے باپ نے ٹھنڈی سانس لے کر ہتھیار ٹھیک دیئے۔

"اچھا بیٹی، ہمارا کام تو سمجھانا بُجھانا تھا۔ تو نے فیصلہ ہی کرلیا ہے کہ یہ خطرناک قدم اُٹھائے گی تو جا۔ تجربہ کرکے دیکھ لے۔" اور اُس نے عملی مُشکلات کی طرف اشارہ کیا۔ "تو وہاں پہنچ گی کیا؟۔ تیرے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔؟"

"اُس کی فکر مت کرو پتاجی"۔ ریکھا نے اپنے باپ کو یقین دِلایا تھا "میری سہیلی شیلا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سب کپڑے مجھے اُدھار دے گی۔ جب لوٹوں گی تو اُسے واپس کردوں گی۔"

اور پھر وہ شیلا کے پاس گئی تھی اور شیلا نے کمال فیاضی کے ساتھ اپنی ساری وارڈروب کھول کر رکھ دی تھی۔ "جو جی چاہے لے جاؤ۔"

کپڑوں کا چُناؤ۔ ریکھا کی زندگی کا سب سے انوکھا سب سے پیارا موقع تھا۔

"یہ چار ساڑھیاں لے لوں؟"

"لے لو۔"

"اور یہ چار بلاؤز بھی؟"

"بڑی خوشی سے۔"

"اُس پر چوڑی دار پائجامے کے ساتھ یہ قمیص کیسا رہے گا؟"

"بہت اچھا۔"

"مگر اِس کے ساتھ کا دوپٹہ؟"

"اب ڈراپ دوپٹہ کا زمانہ ہے۔ دُلہنوں کی طرح دوپٹہ اب کوئی نہیں اوڑھتا۔"

"یہ ڈریسنگ گاؤن بھی لے لوں؟"

"ضرور لے لو۔"

"اور یہ بیل باٹم؟"

"یہی تو آج کل کا فیشن ہے۔ یہ ضرور پہننا۔"

کپڑوں کا چناؤ ہوگیا تو شیلا نے رازدارانہ طریقے سے ریکھا سے باتیں کیں۔

"ریکھا، تیری صُورت شکل، جسم تو بہت اچھا ہے۔ تو مِس انڈیا بن سکتی ہے۔ مگر مجھے ایک بات کی فکر ہے۔"

"وہ کس بات کی۔؟"

"تو وہاں جا کر گاؤں والوں کی سی باتیں کریگی تو امپریشن اچھا نہیں پڑے گا۔ اور یہی بیوٹی کوئین بننے میں ایک رکاوٹ بن سکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہاں بمبئی کے امیر اور روشن خیال نوجوان تمہیں لینے اسٹیشن پر آئیں گے۔ تمہیں اپنی موٹروں میں لئے پھریں گے۔ تمہاری مہمان داری کریں گے۔ اگر تم نے اُن کی دل شکنی کی تو اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔"

"جب وہ میری اتنی مہمان داری کریں گے تو میں اُن کا دل کیوں توڑنے لگی۔؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں ڈرنک کرنے کو کہیں اور تم پرانے خیال کی لڑکیوں کی طرح انکار کردو۔"

"مگر میں نے تو شراب کبھی چکھی بھی نہیں۔"

"کامیابی کا بھی تو تجربہ نہیں ہوا تمہیں۔ وہاں یہ سوشیل ایٹی کیٹ میں شامل ہے۔ پسند نہ ہو تو بھی دو ایک گھونٹ پی لینے چاہئیں تاکہ۔"

"اُن لوگوں کی دل شکنی نہ ہو؟"

"بالکل۔ اب تم بات سمجھتی جا رہی ہو؟ اِن میں سے کئی فلم پروڈیوسر، ڈائرکٹر ہوں گے، جو تمہیں فلم اسٹار بنا سکتے ہیں۔ کئی ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کے مالک اور افسر ہوں گے۔ جو تم فلم اسٹار نہ بنیں تو ماڈل کا کام تمہیں دے سکتے ہیں۔ کتنی ہی لڑکیاں "ماڈلنگ" کرتے کرتے فلم اسٹار بن گئی ہیں۔ سمجھ گئیں نا؟"

"سمجھ گئی۔"

"ہاں، ایک بات اور ہے۔ وہ گووند بھیا سے کیا شرط ہوئی ہے تمہاری۔؟"

"شرط؟ میری؟ — اوہ — وہ تو ایسے ہی تصویریں کھینچتے وقت مذاق کر رہے تھے۔"

"خیر جو بھی ہو۔ وہ کہتے ہیں ریکھا کو یاد دلانا کہ مس انڈیا بن جائے تو میری شرط — اور میرا انعام — نہ بھولے۔ گووند بھیا بڑے اچھے ہیں نا؟"

"ہاں شیلا بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے میری اتنی اچھی تصویریں نہ کھینچی ہوتیں تو آج یہ دن دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوتا۔"

۴

اور اب ریکھا باتھ روم میں کھڑی دروازے میں لگے قدِ آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

"کہاں سے میں کہاں آ گئی ہوں! اُس نے سوچا۔ مگر اُس نے یہ بھی سوچا کہ اِس حالت میں کیا میں کچھ سوچنے کے قابل ہوں؟ سُنا تھا کہ شراب پینے سے عقل خبط ہو جاتی ہے۔ انسان کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ پھر اُس نے تو شامپین کے کئی گلاس پئے تھے۔ اُس کے سر میں زور کا درد ہو رہا تھا۔ سر چکرا بھی رہا تھا یا یہ باتھ روم چکر کھا رہا تھا؟ اُسے بار بار اُبکائی آتی تھی اور ہر ڈکار میں شامپین کا کھٹا میٹھا پھیکا کڑوا مزا تھا۔ کیا اِسی کو نشہ کہتے ہیں؟ اُس نے لاپرواہی سے کپڑے اُتارتے ہوئے سوچا۔ کیوں کہ آئینے میں اُسے اپنی صورت کے علاوہ وہ ٹب بھی نظر آ رہا تھا اور وہ گرم پانی سے بھرا سفید خوب صورت ٹب اُسے بلا رہا تھا کہ آؤ، میری باہوں میں آجاؤ، اپنے بدن کو، اپنی ہستی کو، اپنی مستی کو، اپنی زندگی کو میرے پانی میں ڈبو دو۔ میری قبر جیسی گہرائی میں دفنا دو۔

میں بھی کہاں سے کہاں آ گئی ہوں! اُس نے پھر سوچا جیسے شرابیوں کو ایک ہی بات دُہرانے کی لت لگ جاتی ہے اُس کو ایک ہی خیال بار بار آ رہا تھا۔ کبھی اُس کو گُدگُداتا تھا کبھی اُس کو چھیڑتا تھا کبھی اُس کا مُنہ چڑھاتا تھا۔ اُس کو آئینہ دکھاتا تھا۔ میں بھی کہاں سے کہاں آ گئی ہوں۔

مدھیہ پردیش کے قصبے رائے پور سے بمبئی۔

رام گلی سے جوہو کے سن رائز ہوٹل میں۔

ایک ٹوٹے پھوٹے مکان سے ہوٹل کے اُس کمرے میں جس کا باتھ روم اِتنا بڑا تھا کہ جتنا اُن کا سارا آنگن۔ جہاں گرمی کے موسم میں تین چارپائیاں بچھا کر اُن کا سارا خاندان سویا کرتا تھا۔

اور گووند جیسے بھدّی اور بھونڈی حرکتیں کرنے والے چھچھورے سے رمیش جیسے امیر، خوبصورت، اسمارٹ، مہذب اور شریف آدمی تک۔ اُس نے اپنی میل ملاقات کے حلقے میں کتنی ترقی کی ہے! مانا کہ رمیش کے بال کھچڑی ہو گئے ہیں، مگر جیسا اُس نے بتایا وہ تردّد کی وجہ سے بچپن سے ہی ایسے ہیں۔ مگر کتنا شاندار اور مردانہ

جسم پایا ہے اُس نے۔ کتنی نرم گفتگو کرتا ہے وہ۔ جیسے اُس کے منہ میں گلاب جامن گھُلے ہوئے ہوں۔ جب سے ریکھا کو اُس نے ریلوے اسٹیشن "پرمس انڈیا" کے مقابلے کی کمیٹی کی طرف سے خوش آمدید کہا تھا۔ اُس کا کتنا خیال رکھتا تھا۔ وہ اپنی لمبی چوڑی موٹر میں خود ڈرائیو کرکے وہ ریکھا اور اُس کے ٹوٹے پھوٹے ٹین کے سوٹ کیس کو ہوٹل تک لایا تھا۔ راستے میں کتنی مزیدار باتیں کی تھیں۔ بمبئی کی مشہور عمارتیں دکھائی تھیں۔ ریکھا کا کمرہ اُس نے پہلے سے پسند کر رکھا تھا۔ اُس کو پہنچانے وہ کمرے تک آیا تھا۔ اُس کے آرام کی ہر چیز وہاں موجود تھیں۔ سنگھار میز پر ہر قسم کا میک اپ کا سامان لگا ہوا تھا۔ بستر پہ ایک ہلکا نیلا نائیلون کا جھاگ جیسا نائٹ گاؤن پڑا تھا۔ نیچے نازک سے ہلکے نیلے سلیپر پڑے ہوئے تھے۔ باتھ رُوم کا دروازہ کھول کر اُس نے دکھایا تھا۔

"دیکھئے، ٹب میں گرم پانی بھی موجود ہے آپ کے غسل کے لئے۔"

"تو میں نہالوں؟"

"ضرور نہائیے۔ راستے کی تکان دُور ہو جائے گی۔ آج رات کو میری ایڈورٹائزنگ کمپنی کی طرف سے جو اِس "مس انڈیا" کے مقابلۂ حسن کا سارا خرچہ برداشت کر رہی ہے اُن سب لڑکیوں کی دعوت ہے جو اِس مقابلے کے لئے آئی ہیں۔"

ریکھا انتظار کرتی رہی کہ رمیش صاحب جائیں تو میں اپنا سوٹ کیس کھولوں۔ کپڑے نکالوں اور نہانے کے لئے جاؤں۔ کیونکہ اِس شاندار ماحول میں اُس کو اپنے ٹین کے سوٹ کیس کو ہاتھ لگاتے شرم آتی تھی۔ مگر رمیش وہیں صوفے پر بیٹھا ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ جلاتا رہا۔

"کچھ پی لیجئے۔" آخر اُس نے مسکراتے ہوئے تجویز کیا۔

"کیا؟۔ چائے؟ منگا لیجئے۔" ریکھا نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ سوچا چائے پی کر یہ چلے جائیں گے تو میں اطمینان سے نہا کر کپڑے بدل سکتی ہوں۔

"چائے؟" اور رمیش اِس طرح کھلکھلا کر ہنسا جیسے ریکھا نے کوئی بڑا مذاق کیا ہو۔ بھئی واہ، کیا بھولی بات کی ہے آپ نے ریکھا جی۔! آپ اپنی زندگی کے حسین ترین موڑ پر کھڑی ہیں اور صرف چائے پینا چاہتی ہیں؟ آج کے دن تو آپ وہسکی، برانڈی، جن، ورموتھ کی بھی فرمائش کرتیں تو میں رد کر دیتا۔ آج تو صرف شامپین پینے کا دن ہے، ریکھا جی۔ کیوں؟"

ریکھا نے ایک رسالے میں تصویر دیکھی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی شامپین کے گلاس ہاتھ میں لئے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے۔ بڑا رومانی منظر تھا۔

پھر بھی اُس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "شامپین میں نشہ زیادہ تو نہیں ہوتا؟"۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے آج تک کبھی شراب چکھی نہیں، مگر شیلا کی وارننگ یاد آ گئی۔ "میں زیادہ پینے کی عادی نہیں ہوں رمیش جی۔"

تو آپ کو زیادہ پینے کو کون کہہ رہا ہے۔ بس آپ کی کامیابی کے لئے ایک جام صحت پئیں گے۔ اور یہ آپ سے کِس نے کہہ دیا کہ شامپین میں نشہ ہوتا ہے۔ اِس سے زیادہ نشہ تو کوکا کولا میں ہوتا ہے۔"

اور یہ کہہ کر اُس نے بجلی کی گھنٹی بجائی اور جب بیرا داخل ہوا تو اُس کو آرڈر دیا۔ "وہ جو شامپین کی بوتل ہم نے برف میں لگوا رکھی ہے وہ لے آؤ۔ اور دو شامپین گلاس۔"

بیرا گیا تو ریکھا نے پوچھا۔ "رمیش جی۔ شامپین میں کیا ہوتا ہے؟"

"شامپین تو بس انگوروں کا رس ہوتا ہے۔ مگر یہ انگور فرانس کے خوبصورت مقام شامپین میں پیدا ہوتے ہیں۔ اِس لئے اِن میں فرانس کا حسن، فرانس کی نزاکت، فرانس کی کلچر گھلی ہوتی ہے۔"

بیرا ایک چاندی کے ٹرے میں رکھ کر "آئس بیل" میں لگی ہوئی شامپین کی بوتل اور دو نازک سی ڈنڈی کے بلوری گلاس لایا اور میز پہ رکھ کر چلا گیا۔

رمیش نے بوتل کو برف میں سے اُٹھایا۔ اُسے چھو کر دیکھا۔ پھر مشاقانہ ہاتھوں سے کاگ کھولا۔ دفعتاً ایک پٹاخے جیسی آواز ہوئی۔ جسے سُن کر ایک لمحے کے لئے تو ریکھا ڈر گئی کہ کہیں بوتل نہ پھٹ گئی ہو۔

"ڈر گئیں، ریکھا جی؟" رمیش نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ تو آپ کی نئی زندگی کو شامپین کی بوتل نے سلامی دی ہے۔" اور پھر اُس نے دونوں گلاسوں میں ایک ہلکے سُنہری رنگ کی سیال ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ انگوروں کا رس نہیں ہے ریکھا جی۔ یہ حسن اور جوانی کا رس ہے۔ نوش فرمایئے۔"

ریکھا نے ہچکچاتے، ڈرتے ڈرتے گلاس اُٹھایا۔ گلاس

ـ اُس کی اُنگلیوں کو اچھی لگی۔ خوشبو بھی بُری نہیں تھی۔

ـیدمزیدار بھی ہو۔ انگوروں کا رس ہی تو ہے۔“

رمیش نے ریکھا کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا اور کہا۔ ”ہیرز ٹو یور سکسیس۔ یہ آپ کی کامیابی کے لئے ہے۔“

یہ کہہ کر اُس نے ایک گھونٹ لیا۔ اور ہونٹوں سے چٹخارا لیا۔

”بہت بڑھیا ہے۔ آپ لیجئے نا، ریکھا جی۔“

دل کڑا کر کے ریکھا شامپین کا ایک گھونٹ پی ہی گئی۔ کچھ کھٹا کچھ میٹھا۔ کچھ پھیکا۔ عجیب سا مزا تھا۔ مگر یہ ہلکی ہلکی سی آنچ اُس کے گلے میں کیسی محسوس ہو رہی تھی؟

”لیجئے لیجئے، ایک گھونٹ اور پی جئے نا۔ ریکھا جی۔“

ریکھا نے ایک گھونٹ اور پیا اور ہنس پڑی۔ میں شامپین پی رہی ہوں! میں! رائے پور کی رہنے والی ریکھا! شیلا دیکھیگی تو کتنی جلے گی، بھسنگی کہیں کی! اور یہ سوچ کر وہ پھر ہنس پڑی۔

اُس کا گلاس کب خالی ہوا اور کب بھر اگیا، یہ کچھ ٹھیک سے نہ معلوم ہو سکا۔ مگر گلاس میں شامپین کے بُلبلے ہنس رہے تھے۔ جیسے ریکھا خود ہنس رہی تھی۔ بُلبلے بنتے تھے، ٹوٹتے تھے، اُبلتے تھے، اُس کے ہونٹوں کو گدگداتے تھے، اُس کی زبان پر سے پھسلتے ہوئے اُس کے حلق میں گرتے جاتے تھے۔ کیا یہ بُلبلے آگ کے بنے ہوئے ہیں؟ اُس نے سوچا۔ اگر آگ نہیں ہے تو پھر میرے تن بدن میں یہ آنچ کہاں سے آئی؟ گرمی بڑھتی جا رہی تھی، اُس نے ساڑی کے پلّو سے اپنے آپ کو پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔

”گرمی لگ رہی ہے کیا؟“ رمیش نے گلاس میں شامپین اُنڈیلتے ہوئے پُوچھا۔ مگر اُس کی نگاہیں وہاں تھیں جہاں کچھ عرصہ پہلے ساڑی کے پلّو نے سینے کو ڈھانپا ہوا تھا۔

نہ جانے کیوں جواب میں ریکھا ہنس دی۔ جی ہاں، گرمی کیا، ایسا لگتا ہے سارے بدن میں آگ لگ رہی ہے۔“

اب رمیش بھی ہنس پڑا۔ گلاس بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آگ لگ رہی ہے تو اِس آگ کو شامپین سے بُجھایئے۔“

ریکھا نے گھور کر رمیش کو دیکھا۔ اُسے وہ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ کتنا اچھا آدمی ہے! اور کتنا سمجھ دار۔ آگ بُجھانے کے لئے شامپین فوراً حاضر کر دی۔

”شکریہ، رمیش جی۔“ اور اُس نے گلاس گلے میں اُنڈیل لیا۔

”دیکھو بھئی۔ اب یہ رمیش جی، ریکھا جی والا تکلف نہیں چلے گا۔ کیوں ریکھا؟“

ریکھا کو بھی رمیش جی کہنا نہایت نامناسب معلوم ہوا۔ ”یس رمیش۔“ اُس نے کہا۔

”ریکھا۔“

”ہاں رمیش۔!“

”ریکھا۔!“

”یس رمیش!“

”ریکھا ڈیر!“

”رمیش ڈیر!“

”تم کتنی اچھی ہو۔ کتنی سویٹ!“

”تم خود کتنے اچھے ہو رمیش۔“

پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ اِتنے قریب کہ رمیش کی گرم سانس ریکھا اپنے گالوں پر محسوس کر سکتی تھی اور پھر دفعتاً اُس کے اندر کی سوئی ہوئی ریکھا بیدار ہو گئی۔

”نہیں نہیں۔“ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

”کیا ہوا ریکھا؟ میرے پاس آؤ۔“

”نہیں۔ نہیں۔“

”کیوں نہیں۔“

بوتل خالی ہو گئی!“ ریکھا نے اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے نہیں میرے تن بدن میں آگ لگی ہے، اِس آگ کو بُجھانے کے لئے اور شامپین چاہیئے۔ آپ نے ہی تو کہا تھا۔“

”نو، ریکھا ڈیر۔ اب تم نے کافی پی لی ہے۔ بلکہ کافی سے بھی زیادہ۔ تم اب باتھ رُوم میں جاؤ۔ نہانے کے لئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

ریکھا پھر ہنس پڑی۔

”آپ آئیں گے نا؟“

”ہاں ہاں ضرور آؤں گا۔“

ریکھا نے خالی بوتل کی گردن پکڑ کر اُٹھالی اور اُسے ہتھیار کی طرح سنبھالتے ہوئے کہا۔ اور اگر نہیں آئے؟“

”تو جو چور کی سزا سو میری سزا۔ بائی بائی، ڈارلنگ۔“ یہ

کہا اور وہ چلا گیا۔ اور اُس وقت ریکھا اِس بات پر چوکنی ہونے کے قابل نہیں تھی کہ رمیش باہر نہیں گیا بلکہ اندر کے ایک دروازے سے برابر والے بیڈروم میں داخل ہو گیا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

۵

اور اب ریکھا کپڑے اُتار کر اپنے آپ کو قدِ آدم آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ واقعی میں ہوں؟ اُس نے سوچا اور پھر آپ سے آپ ہی مسکرا دی۔ رمیش اِس حالت میں اُسے دیکھ لے تو کیا سوچے، کیا کہے، کیا کرے؟ وہ باتھ رُوم میں ننگی کھڑی تھی۔ لیکن اُس کے بدن میں آگ ابھی تک لگی ہوئی تھی۔ "آگ لگے تو کیا کرنا چاہیئے؟" رمیش نے کہا تھا۔ شامپین پینی چاہیئے۔ آگ بجھانے کے لئے آگ؟ بھئی واہ، یہ تو خوب بات ہوئی۔ ریکھا خود ہی خود ہنس پڑی۔ پھر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو پیچھے سفید ٹب نظر آیا جس میں لبالب بھرا ہوا پانی چھلک رہا تھا۔ گلاس میں بھری ہوئی شامپین کی طرح۔ اب اُس نے مرمر کے ٹب کو دیکھا جو گویا باہیں کھول کر اُس کو اپنی آغوش میں بُلا رہا تھا۔ پانی میں کوئی خوشبو بھی ملی ہوئی تھی۔ ٹب کا پانی گرم تھا۔ اُس میں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور بھاپ کے ساتھ مستی بھری خوشبو کا بھپکا ریکھا کے نتھنوں کو گُدگُدا رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ ڈبو کر دیکھا پانی گرم تھا۔ لیکن صرف خوشگوار حد تک۔

اُس نے پہلے ایک ٹانگ ٹب میں دھری۔ پھر دوسری۔ پھر پانی میں بیٹھ گئی۔ پھر لیٹ گئی۔ آج اُسے اپنے جسم کے حسین ہونے کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر پیار آ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ اپنے سارے جسم کا جائزہ لے رہے تھے۔ سوئے ہوئے احساسات جاگ رہے تھے اور اُس کے دماغ کو نیند آ رہی تھی۔ نرم گرم پانی تھپک تھپک کر لوریاں سُنا رہا اور آخر کار ٹب کی آغوش میں اُسے نیند آ ہی گئی۔

اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ پریوں کے دیس میں ہے اور اُڑنے والے مخملی قالین پر لیٹی ہوئی ہے۔ قالین ساری دنیا کے اُوپر سے اُڑتا جا رہا ہے اور دنیا والے کہہ رہے ہیں وہ دیکھو۔ ملکۂ حُسن۔ سندرتا کی رانی۔ بیوٹی کوئین ریکھا کی سواری آ رہی ہے اور ریکھا کو خواب میں بھی یہ محسوس ہوا کہ اُس کے تمام سنہری سپنے سچے ہو گئے ہیں۔

مگر پھر نہ جانے کہاں سے ایک طوفان آیا۔ تیز ہوا کے جھکڑ۔ آندھی، بارش، مُوسلا دھار، گیلا ہو کر اُڑنے والا قالین اُڑنے کے قابل نہ رہا۔ ریکھا نے محسوس کیا کہ وہ تیزی سے زمین کی طرف جا رہی ہے اور بارش کے قطرے جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں اور تیروں کی طرح تیز ہیں اُس پر مُوسلا دھار برس رہے ہیں اور اُس کو نہیں معلوم کہ یہ تیر پہلے اُس کے سینے کے پار ہو جائیں گے یا وہ آسمان سے زمین پر گر کر پاش پاش ہو جائے گی۔

جب اُس کو ہوش آیا تو وہ بدستور ٹب کے گرم پانی میں لیٹی ہوئی تھی۔ مگر اُس کے اُوپر "شاور باتھ" کے فوارے سے ٹھنڈی بُوندوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سر پر ٹھنڈے پانی کی مار سے شامپین کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی ریکھا نے سوچا۔ یہ فوارہ تو بند تھا۔ اسے کس نے کھولا؟

جواب میں ایک مردانہ قہقہہ سُنائی دیا۔ نظر اُٹھا کر دیکھا۔ کہ رمیش ایک تولیئے کی باتھ گاؤن پہنے باتھ میں کھڑا ہے، اور ایک بڑا تولیہ اُس کی طرف بڑھا رہا ہے۔

"ڈارلنگ بہت سو چکیں۔ اب ٹب سے باہر نکل آؤ تو کام کی بات کریں۔"

دفعتاً ریکھا کو یاد آیا کہ وہ پانی سے باہر نکلیگی تو برہنہ ہوگی۔ سو وہ ٹب میں اور نیچے سرک گئی۔

"آپ یہاں کیسے آئے؟ باتھ رُوم کے باہر جایئے تب ہی میں نکل سکتی ہوں۔"

"ڈارلنگ ریکھا۔ میں تو سمجھا تھا آدھ گھنٹہ تمہارے غسل کے لئے کافی ہوگا۔ کیا معلوم تھا تم یہاں سو رہی ہو۔ وہ تو اچھا ہوا، میں آ گیا ورنہ حیادار لڑکیوں کے لئے ڈوبنے کے لئے ٹب کا پانی بھی کافی ہوتا ہے۔"

رمیش کو مسکراتا دیکھ کر ریکھا کو احساس ہوا کہ بے خیالی میں سینے تک اُس کا دھڑ پانی سے باہر آ گیا ہے۔ وہ فوراً اندر کو ہو گئی۔ مگر اب اُس کا نشہ کافور ہو چکا تھا۔ وہ ڈانٹ کر بولی۔

مسٹر رمیش میں بھی ایک حیادار لڑکی ہوں۔ آپ باہر جایئے۔"

"یہ کیا تکلف ہے ڈارلنگ۔ یہ لو میں تولیہ لئے کھڑا ہوں،

تمہیں شرم آتی ہے تو اس کا پردہ کئے لیتا ہوں۔"
یہ کہہ کر اُس نے تولیے کو اُن دونوں کے درمیان دیوار بنالیا۔ اور منہ دوسری طرف کرلیا۔
ریکھا نے اَنکھیوں سے رتیش کو دیکھتی ہوئی، پانی چھلکاتی ہوئی ٹب کے باہر نکلی اور تولیہ جھپٹ کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔
اب رتیش نے پلٹ کر دیکھا۔ "ڈارلنگ اب تو تم اور بھی سُندر دکھائی دیتی ہو۔ پارٹی میں جانے کو گھنٹہ بھر باقی ہے۔ کیوں نہ اُس وقت کا کوئی خوبصورت استعمال کیا جائے۔"
یہ کہہ کر وہ ریکھا کی طرف بڑھا اور تولیہ سمیت اُس کو اپنی باہوں میں گرفتار کرلیا۔ اب ریکھا نے رتیش کے چہرے کو اپنی آنکھوں کے بالکل قریب دیکھا۔ ایسا لگتا تھا یہ چہرہ اُس نے پہلی بار دیکھا ہے۔ گالوں پر جھُرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بال نزلے سے سفید نہیں ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ مگر اُن میں ہَوَس کی چنگاری چمک رہی تھیں۔ دن بھر کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور مُنہ سے بدبُو کا بھبکا اُٹھ رہا تھا اور اب یہ بھبکا اُس کے ہونٹوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔
"ڈارلنگ، میں زبردستی کبھی نہیں کرتا۔ بُلانے سے آتا ہوں۔"
ریکھا نے اپنی مجبوری اور لاچاری کی حالت کا لگا لیا تھا۔ اگر اُس کو دھکا دے کر علیحدہ کرتی ہے تو تولیہ کا پردہ بھی جائیگا۔ اور اگر نہیں کرتی تو ......
"آپ کو کس نے بلایا تھا؟"
"ڈارلنگ ریکھا بھولتی ہو۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ اگر نہ آئے تو جو چور کی سزا ہوتی ہے وہ دُوں گی؟"
شامپین کے نشے میں اُس نے کیا کہا تھا۔ کیا نہیں کہا تھا، اس پر بحث کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ریکھا نے کہا۔ "رتیش جی مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔"
اب رتیش کے چہرے پر ایک خوفناک کرختگی کے آثار پیدا ہوئے۔ "دیکھو ریکھا۔ تم لڑکیاں ہر چیز کو مذاق سمجھتی ہو۔ جب جی چاہا۔ اُنگلی کے اشارے سے بُلا لیا۔ جب جی چاہا دھتکار دیا۔ رتیش کے ساتھ یہ چُوہے بلّی کا کھیل نہیں چلے گا۔"
"رتیش جی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی بیٹی کے برابر ہوں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"
"تو پھر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگو" اور اُس نے ریکھا کو اپنی پکڑ سے آزاد کردیا۔
وہ سمجھی جان بچ گئی۔ تولیے کو کندھے پر ڈالتے ہوئے ہاتھ جوڑے ہی تھے کہ رتیش کے بے رحم ہاتھوں نے اُس کے بدن سے تولیہ جھپٹ لیا اور سارا باتھ رُوم ایک خوفناک قہقہے سے گونج اُٹھا۔
"ڈارلنگ ایسا خوبصورت جسم چھپاتی ہو؟ تمہیں تو اس کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرنی چاہئے۔ بڑے کام کی چیز ہے۔ سچ کہتا ہوں کل ..."
اُس سے آگے رتیش کچھ نہ کہہ سکا۔ سر سے پیر تک ننگی ریکھا میں نہ جانے کہاں سے اس بلا کی ہمت اور طاقت آگئی تھی کہ شیرنی کی طرح وہ جھپٹ پڑی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں کو ہی ایک ہتھیار بنا کر رتیش کے مُنہ پر دے مارا۔ اُس کے ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ اُس وقت وہ پنجوں کی طرح نوچنے کھسوٹنے کے کام آئے۔ ایک حملے ہی میں رتیش کے چہرے پر خراشیں اُبھر آئیں۔
"حرام زادی!" اب تو رتیش بھی اپنی اصلیت پر اُتر آیا تھا۔ ہانپتا ہانپتا گالیاں دیتا جا رہا تھا۔ "حرام زادی، شریف آدمیوں پر ہاتھ اُٹھاتی ہے۔" ریکھا کا ہاتھ اُس کی پکڑ میں آگیا تو اُس کو ہی اُس نے مروڑ ڈالا۔ ریکھا کے مُنہ سے چیخ نکل گئی رتیش نے بانہہ کو اور مروڑا۔ ریکھا جانتی تھی کہ ذرا اور دبایا تو اُس کی کلائی ٹوٹ جائے گی۔ رتیش کا مُنہ اُس کے مُنہ کی طرف آرہا تھا۔ "کیوں سالی بول۔ اب کیا کہتی ہے؟"
ریکھا نے آنکھیں بند کرلیں۔ ہونٹ بھینچ لئے۔ جب بدبُو دار بھبکا بالکل قریب آگیا تو اُس نے بظاہر لاچاری سے ہونٹ کھول دیئے۔ رتیش کے جلتے ہوئے ہونٹ اُسکے ہونٹوں میں پیوست ہوگئے۔ اور اُس کی گرفت کلائی پر سے ڈھیلی ہوگئی۔ اُس دم رتیش کو ایسا محسوس ہوا کہ کسی شیرنی کے دانتوں نے اُس کے ہونٹوں کو کاٹ کھایا ہے۔ درد سے بلبلا کر اُس نے بے تحاشا اس زور کا دھکا دیا کہ ریکھا کا سر پہلے دیوار سے ٹکرایا اور پھر ٹب کے تیز کنارے سے۔ اور انیس برس کی لڑکی کے تمام سنہری خواب، اُس کی تمام اُمنگیں اور حسرتیں، اُس کے تمام ارمان اُبلتے ہوئے

خُون کے بھنور میں ڈوب گئے۔

رمیش نے گھبرا کر پہلے لڑکی کی پتھرائی ہوئی مگر کھُلی آنکھوں کو دیکھا جو خاموشی سے اُسے تکے جا رہی تھیں۔ پھر تکلیف کا احساس ہوا تو ہاتھ میں جو گیلا تولیہ تھا۔ اُس سے اپنے ہونٹوں کو چھُوا۔ دیکھا تو تولیئے کے کنارے پر خون کا بڑھتا ہوا دھبّہ پایا

اُس نے تولیہ پانی کے ٹب میں پھینک دیا۔ پھر خاموشی سے جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا باہر چلا گیا۔ اپنے کمرے میں جا کر ہونٹوں کے زخم پر پوڈی کولون لگایا۔ پھر شیو کیا تاکہ معلوم ہو شیو کرتے ہوئے غلطی سے کٹ گیا ہے۔ پھر کپڑے بدل کر اُس نے گھنٹی بجائی اور اُسی بیرے کو بُلایا جس نے اُنہیں شامپین دی تھی۔

"شامپین کا بل لاؤ۔"

"ابھی لایا صاحب۔"

بیرا جب بل لے کر واپس آیا تو صاحب کو ٹیلی فون پر برابر کے کمرے والی میم صاحب سے باتیں کرتے پایا۔

"ہیلو ریکھا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ تم اب تک نہا کر تیار نہیں ہوئیں؟ مجھے تو انتظام کرنے کے لئے پہلے جانا ہے۔ میں جا کر موٹر بھجوائے دیتا ہوں۔ تم گھنٹہ بھر میں تیار رہنا۔ اچھا، بائی بائی۔"

فون نیچے رکھ کر رمیش نے بل کے علاوہ بیرے کو دس روپے ٹپ دیا۔ پھر بیرے کو کمرہ ٹھیک کرنے کے لئے چھوڑ کر وہ سیٹی بجاتا ہوا باہر نکل گیا اور موٹر لے کر اپنی پارٹی میں چلا گیا۔

٦

اگلے دن جب بیوٹی پریڈ ہوئی تو صرف نو لڑکیاں حاضر تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس دن کے اخبار میں چھپا تھا کہ مِس ریکھا رام داس رائے پُور کی اُنّیس سالہ حسینہ اپنے ہوٹل کے باتھ رُوم میں مری ہوئی پائی گئی۔ اِس افسوسناک موت کی وجہ ایک صابن کی ٹکیہ بتائی گئی جس پر پھسل جانے سے بیچاری لڑکی کا سَر کے بل ٹب کے تیز فولادی کنارے پر جا گری تھی۔

مگر مہینوں تک ہوٹل میں اُترنے والے مسافر کمرہ نمبر تیرہ "۱۳" میں ٹھہرنے سے انکار کرتے رہے، کیونکہ اُس کے باتھ روم کے ٹب پر وہ خون کا نشان اب تک پایا جاتا تھا اور اُس کو کسی تیزابی مسالہ سے بھی دُور نہ کیا جا سکا۔ آخر کار ہوٹل کے مالک نے کمرہ نمبر بدل کر بارہ (۱۲) کر دیا اور وہ ٹب نِکال کر باہر کمپاؤنڈ میں کوڑے پر پھنکوا دیا جہاں سے بھیکو نے اِسٹرائیک کرنے والے بیروں کی مدد سے اُسے اُٹھا کر اپنے کھٹارے پر رکھ لیا۔ ٹب کے بعد تو کھٹارے پر رکھنے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں رہی تھی۔ لیکن بھیکو نے سوچا چھوٹی موٹی چیزیں ملیں تو ٹب کے اندر ہی رکھ لوں گا۔

ایک چھوٹی موٹی اور کام کی چیز تو تھوڑی دُور پر ہی ایک مکان کے پاس پڑی مِل گئی۔ یہ ایک پیتل کا اسٹوو تھا جو جل جانے سے کالا پڑ گیا تھا۔ مگر شاید تھوڑی سی مرمّت کر کے اب بھی اُسے چالو کیا جا سکے۔ اور بھیکو سوچتا رہا کہ ایسی کام کی چیز کو کس بے وقوف نے کوڑے پر پھینک رکھا ہے۔ اور کیوں؟

قِصّہ ایک جلے ہُوئے اِسٹوو کا

شانتا اپنے کچن میں کھڑی پرائمس اسٹوو میں ہوا بھر رہی تھی. اور سوچ رہی تھی کہ ساری بمبئی میں اب گیس کے سلنڈر استعمال ہوتے ہیں صرف ہمارے گھر میں یہ دقیانوسی اور خطرناک چُولھا کیوں ہے؟

اُس کا شوہر شیئر بازار کا دلّال تھا۔ ہزار پندرہ سو روپے ہر مہینے گھر میں لاتا تھا۔ وہ اب بھی دو کمروں کے فلیٹ میں ہی رہتے تھے جس کا پُرانا کرایہ صرف پینتالیس روپیہ ماہوار تھا۔ مگر فلیٹ میں ضرورت کی سب چیزیں تھیں۔ صرف ایک گیس کا چُولھا نہیں تھا۔ اچھّا بڑھیا ریڈیو تھا۔ کیوں کہ ہر شام کو چھگن لال مارکیٹ کی خبریں بڑے غور سے سُنتا تھا اور اپنا لال کھاتہ لے کر اُس میں بازار کی اُونچ نیچ لِکھتا جاتا تھا۔ ریفریجریٹر تھا۔ کیونکہ چھگن لال اور اُس کی ماں کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ذرا سا بھی بچا ہوا کھانا پھینک دیا جائے یا کسی بھکاری کو دے دیا جائے۔ دو بھاری بھاری فولادی الماریاں تھیں، ایک میں سب کے کپڑے رہتے تھے، دوسری الماری میں چھگن لال اپنے بہی کھاتے رکھتا تھا۔ دیسی وہسکی کی بوتل رکھتا تھا جس میں سے ناپ تول کر دو پیگ ہر رات کو پیتا تھا۔ ایسی باقاعدگی اور اہتمام سے، جیسے کوئی پُوجا کرتا ہے۔

پہلے وہ نہاتا دھوتا، پھر دُھلی ہوئی دھوتی باندھتا۔ پھر اگربتیاں جلاتا۔ پھر دیوار پر لگی ہوئی دیوی دیوتاؤں کی تصویروں کو پرنام کرتا۔ تب وہسکی کی بوتل، پانی کی بوتل اور گلاس لے کر بیٹھتا تھا۔ اُس کی ماں اُس وقت ہنومان جی کے مندر سے پُوجا کرکے لَوٹتی۔ چھگن لال ماں کے دیئے ہوئے پرشاد کو ہاتھ جوڑ کر لیتا اور پھر وہسکی کے ایک گھونٹ کے ساتھ نِگل جاتا۔ اُن کے کمرے میں ایک بہت بڑا چھپر کھٹ بھی تھا۔ جس پر چھگن لال شراب پی کر، کھانا کھا کر سو جاتا تھا۔ بیوی چھپر کھٹ کے نیچے زمین پر بستر کرکے سوتی تھی۔ سونے سے پہلے پتی کی ٹانگیں دباتی تھی اور اکثر ٹانگیں دبواتے دبواتے ہی وہ خرّاٹے لینے لگتا تھا۔

شروع شروع میں ہر تیسرے دِن، پھر ہر ہفتے، پھر ہر مہینے۔ چھگن لال کا ہاتھ لٹک کر شانتا کے مونڈھے ہلاتا تھا۔ چند منٹ کیلئے اُس کو بھی چھپر کھٹ پر آنے کی اِجازت مِل جاتی تھی اور میاں بیوی کے رِشتے پر چھگن لال کی واسنا کی مُہر لگ جاتی تھی اور شانتا پھر چھپر کھٹ سے زمین پر واپس آجاتی اور بڑی دیر تک چُپ چاپ لیٹی اندھیرے کو تکتی رہتی۔

شانتا اور چھگن لال کی شادی کو چھ برس ہونے کو آئے تھے۔ چھگن لال بیوی کو راجکوٹ سے بیاہ کر لایا تھا۔ اُن کی سگائی جب ہوئی تھی تو شانتا کا باپ راجکوٹ کا بڑا بیوپاری کہلاتا تھا۔ اُس وقت چھگن لال نے بمبئی میں دلاّلی کا دھندا شروع ہی کیا تھا۔ مُشکل سے دو تین سو روپے کی آمدنی تھی۔ لیکن اُس کو — اور اُس کی بیوہ ماں کو اُمید تھی کہ شانتا کا باپ جہیز میں بڑی رقم دے گا۔ اور اُس سے چھگن لال کا دھندا چمک جائے گا۔ اِس لئے جب ماں نے کہا کہ شادی سے پہلے وہ اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ لے تو چھگن لال نے ہنس کر کہا تھا "ماں مجھے کیا دیکھنا ہے، تو نے دیکھ لیا تو بس کافی ہے۔ بھینگی نہ ہو۔ کانی نہ ہو۔ بہت کالی نہ ہو۔ کہ مِلنے جُلنے والے مجھ پر ہنسیں۔ بس، اور کچھ نہیں دیکھنا۔ ہاں جہیز میں جو رقم ملے وہ نوٹ گِن کر سنبھال لینا۔" یہ بات وہ ہنسی ہنسی میں کہتا تھا۔ مگر سچّی بات بھی یہی تھی کہ شانتا جہیز میں کتنی رقم لائے گی، اِس کے علاوہ چھگن لال کو اپنے بیاہ میں، اپنی بیوی میں کوئی خاص دِلچسپی نہیں تھی۔

لکشمی دیوی شاید چھگن لال سے یا شاید شانتا کے باپ سے روٹھی ہوئی تھیں۔ شادی سے چند روز پہلے اور دیوالی کے چند روز بعد شانتا کے باپ کا دِیوالہ نِکل گیا تھا اور وہ جہیز میں وہ رقم نہ دے سکا تھا جس کا چھگن لال کی ماں سے وعدہ کیا تھا۔ شادی کے کارڈ تقسیم ہو چکے تھے۔ پھر بھی ماں نے بیٹے سے کہا تھا۔ "تو کہئے تو اب بھی اِنکار کر دوں۔" پر چھگن لال نے نہ جانے کیا سوچ کر کہہ دیا تھا۔ "چھوڑو ماں۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہوگا۔ اب دوسری کہاں ملے گی؟" اور پھر کچھ سوچ کر۔ "کم سے کم تمہیں کھانا بنانے کی جھنجٹ سے تو چُھٹی مِل جائے گی۔"

شادی کی رات کو چھگن لال نے بیوی کو دیکھا جو پری یا فِلم اِسٹار جیسی خوبصورت تو نہیں تھی۔ لیکن بیاہ کے لال جوڑے میں اچھی خاصی لگ رہی تھی۔ چھگن لال نے خاموشی سے اپنا حقِ شوہری جتاتے ہوئے سوچا۔ "چلو اچھّا ہے۔ صحّت کے لئے اب باہر مُنہ کالا کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

"کچھ بات کیجئے نا"! اُس نے ایک رات کو ہمّت کرکے کہہ ہی دیا تھا۔ "مجھے اچھّا لگتا ہے۔"

"شش۔" چھگن لال نے اُسے چُپ رہنے کو کہا تھا۔

"بے شرم کہیں کی! ماں برابر کے کمرے میں سو رہی ہے۔"

اور سو شانتا کے من کی دنیا ویران، سُنسان ہی پڑی رہی۔ اِس کے بعد شانتا اور چھگن لال کے تعلّقات پر ایسا کالا سنّاٹا چھا گیا۔ جس میں کوئی ستارہ بھی نہیں ٹمٹماتا تھا۔

تیسرے دِن سے ہر ہفتہ۔ ہر ہفتے سے ہر مہینہ۔ جب شانتا کو چھپر کھٹ پر آنے کی دعوت دی جاتی تھی تو وہ پتی کی پیاس بُجھا کر وہاں سے خود پیاسی ہی لَوٹتی اور گھنٹوں اندھیرے کو تکتی رہتی۔

شانتا کے باپ کا دیہانت تو بیٹی کی شادی کے چند مہینے بعد ہی ہو گیا تھا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اِس لئے ایک دفعہ بمبئی آنی تو راجکوٹ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ دُور رشتے کے ماما، ماسی تھے۔ اُن کا کبھی کبھار خط آجاتا تھا۔ لیکن چھگن لال اور اُس کی ماں کو اُس کا بیس پیسے ڈاک پر خرچ کرنا بھی بُرا لگتا تھا۔ سو شانتا نے جواب دینا چھوڑ دیا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ اب اُس کی ساری زندگی ان دو کمروں تک محدود تھی۔ پھر بھی وہ اپنی زندگی سے غیر مطمئن نہیں تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ سب بیاہتا عورتوں کی زندگی ایسی ہی گُزرتی ہے۔ صبح اُٹھتی ہیں۔ جھاڑو دیتی ہیں

پوچا مارتی ہیں۔ چولھا جلاتی ہیں۔ چائے بنا کر پتی کو دیتی ہیں۔
پھر کھانا پکاتی ہیں۔ پتی کے لئے پروستی ہیں۔ پھر تھالی میں لگا کر
ساس کو دیتی ہیں۔ پتی کے کام پر جانے کے بعد کپڑے دھوتی ہیں
ساس کی ٹانگیں دباتی ہیں۔ دوپہر کو گھڑی دو گھڑی لیٹ رہتی
ہیں یا اپنی پڑوسنوں سے دو باتیں کر لیتی ہیں۔ شام کو پھر وہی
چولھا چکی۔"

شانتا نے سوچا شکر ہے آج کل چکی چلا کر اناج تو پیسنا نہیں
پڑتا۔ بجلی کی چکی سے پسا پسایا آٹا آتا ہے۔ دال چاول کے دانوں میں
سے کنکر پتھر ضرور چننے پڑتے ہیں۔ رہا چولھا تو سب گھروں میں
اب گیس جلتی ہے۔ نہ جانے ہمارے گھر میں ہی کیوں یہ مٹی کے تیل سے
جلنے والا چولھا ہے جس میں تھوڑی دیر کے بعد سائیکل کے پہیئے کی طرح
ہوا بھرنی پڑتی ہے۔ شانتا کو نہ جانے کیوں کسی کے سامنے پمپ کو جلدی
جلدی اندر باہر کر کے ہوا بھرتے ہوئے شرم آتی تھی۔

۲

شانتا کو اپنی، ساس اور شوہر سے کوئی شکایت نہیں تھی۔
ساس اُس سے دن رات کام ضرور لیتی تھی اور اُس پر کڑی نظر
رکھتی تھی کہ کس سے ہنستی بولتی ہے۔ بازار گئی تو کتنی دیر میں واپس
آتی ہے۔ مگر یہ سب تو ساس کے حقوق ہوتے ہی ہیں۔ وہ تو
اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی تھی کہ اُس کی ساس اور اُس
کا پتی کبھی اُسے مارتے نہیں۔ جیسے کہ اڑوس پڑوس کی کتنی
بہوئیں اکثر پیٹی جاتی تھیں۔ جھگن لال تو اُس سے اونچی آواز
میں بات بھی نہیں کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ براہِ راست وہ
کبھی کبھار ہی اُس سے کوئی معمولی بات کر لیتا تھا۔ ورنہ ہمیشہ
اپنی ماں کے ذریعہ ہی بیوی کو احکامات دیتا تھا۔ "ماں اُس سے
کہنا میری قمیص اور بنیان دھو دے۔" "ماں اُس سے کہنا
آج سبزی میں نمک زیادہ تھا۔" "ماں اُس سے کہنا آج
پلنگ کی چادر اور تکیے کے غلاف ضرور بدل دے۔" کبھی زمانے
میں تو شانتا یہ آخری حکم سُن کر من ہی من میں کھِل اُٹھی تھی
کیونکہ جس دن چادر اور تکیے کے غلاف بدلے جاتے تھے۔
اُس رات چھپر کھٹ کے اوپر سے خاموش بلاوا ضرور آتا تھا۔

شانتا اکثر سوچتی، میری ساس اور میرے پتی کتنے اچھے ہیں۔
کہ ہمارے بیاہ کو چھ برس ہونے کو آئے اور میرے ہاں ایک بچہ بھی نہیں
ہوا، پھر بھی کبھی انہوں نے مجھے دوش نہیں دیا۔ اور گھروں میں تو
بہو کے لڑکی پیدا ہو جائے تو اُسے قصوروار سمجھا جاتا تھا۔ اور بہو تب
ہی اپنے ادھیکار پا سکتی ہے۔ جب اُس نے بیٹا جنا ہو۔ نہ جھگن
لال نے نہ اُس کی ماں نے آج تک بے اولادی ہونے کا دوش
شانتا کو دیا تھا۔ بلکہ ماں تو اُس کو لے کر ڈاکٹروں، وید، حکیموں
یہاں تک کہ سوامیوں، سادھوؤں کے پاس بھی گئی تھی جنہوں
نے دوائیں، انجکشن، تعویذ، گنڈے، جنتر منتر سب کچھ دیا تھا۔
سب کچھ کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ماں نے بیٹے کو بہو کی موجودگی
میں یہ رپورٹ دی تھی۔ "اُس ابھاگن کی تو قسمت ہی میں اولاد
ہونا نہیں ہے۔"

اُس کے بعد شانتا نے دیکھا تھا کہ اکثر ماں بیٹا گھُسر پھُسر کرتے
پائے جاتے تھے۔ وہ بات کرتے ہوتے اور وہ اُدھر آ جاتی تو ساس
ڈانٹتی۔ "تو کیا کر رہی ہے یہاں، چل اپنا کام دیکھ۔ چولہے کو
یوں اکیلا نہیں چھوڑتے۔ لاپروائی سے آگ لگ جاتی ہے۔"
اور شانتا کچن میں واپس جا کر پھر سے اسٹو میں ہوا بھرنے لگتی۔

آج بھی وہ پمپ چلا کر ہوا بھرتی جا رہی تھی اور جی ہی
جی میں اپنی خوش قسمتی پر غور کر رہی تھی کیونکہ آج وہ اپنی ساس
کو اور اُس کے ذریعے اپنے پتی کو وہ خبر دینے والی تھی جس کا وہ
دونوں چھ برس سے انتظار کر رہے تھے۔ شبہ تو اُس کو کئی دن
سے ہو رہا تھا۔ لیکن آج بات پکی ہو گئی تھی۔ میونسپل ہسپتال
میں (جہاں وہ بازار جانے کا بہانہ کر کے گئی تھی) لیڈی ڈاکٹر نے
بھی معائنہ کر کے اس بات کی تصدیق کر دی تھی اور اب چند
گھنٹوں یا چند منٹوں کی دیر تھی کہ وہ یہ بات جھگن لال کی
ماں کو بتا دے گی۔ وہ بہو کو گلے لگائے گی۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو
بدھائی دے گی۔ اُس کے بعد شانتا کی زندگی ہی بدل جائے گی۔ اس
گھر میں اُس کا رتبہ اونچا ہو جائے گا۔ چند مہینے کے بعد بیٹا ہو گیا،
جیسا اُسے یقین تھا۔) تو پھر تو وہ اِس گھر کی رانی ہو گی رانی۔
یہ سوچ کر وہ ہوا بھرنے کے پمپ کو اور زور سے چلانے لگی۔

۳

شانتا نے پمپ چلاتے ہوئے سوچا۔ یہ شاید میری پُوجا پاٹھ اور چھگن لال کی ماں کی دُعاؤں کا اثر ہے کہ بھگوان نے میری سُن لی اور میری کوکھ میں سُکھ کے پھُول ڈال دیئے۔ یہ کیسے ہوا تھا، یہ سوچ کر وہ آپ سے آپ ہی مُسکرا دی۔

کوئی سال بھر کی بات ہے۔ چھپر کھٹ سے خاموش بُلاوا آئے کئی ہفتے بیت گئے تھے۔ چھگن لال اُن دِنوں کچھ پریشانیوں میں اُلجھا ہوا رہتا تھا۔ شاید دھندے میں گھاٹا ہو رہا تھا۔ جب بھی آتا وہسکی پیتا۔ کھانا کھاتا۔ اخبار کے ورق اُلٹ پلٹ کرتا، اور پھر چھپر کھٹ پر دیوار کی طرف مُنہ کر کے سو جاتا اور رات بھر شانتا اِس اِنتظار میں گزار دیتی کہ شاید چھگن لال کو اُس کی ضرورت محسوس ہو۔ اُس کا تو اکثر جی چاہتا تھا کہ کبھی اُس کا پتی اُس کو بے ضرورت بھی اپنے پاس بُلائے۔ خصوصاً اُن دِنوں تو اُس کا من چاہتا تھا کہ اپنے پتی کی ٹانگیں دبائے۔ سر میں تیل کی مالش کرے۔ اُس سے پُوچھے کہ تم کیوں پریشان ہو۔ کیا میں تمہاری کوئی سیوا کر سکتی ہوں۔ مجھ سے کچھ بات کر کے ہی جی ہلکا کرو۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوتا۔ ایسا کبھی نہ ہوا۔

شانتا پُرانے خیال کے ایک گھرانے میں پلی تھی۔ اُس نے نہ ناول پڑھے تھے نہ دھارمک فلموں کے علاوہ فلمیں دیکھی تھیں۔ اُس کو معلوم نہیں تھا پریم پیار کیسا ہوتا ہے۔ لیکن اُسے یہ معلوم تھا کہ چھگن لال دُکھی ہوتا ہے تو وہ دُکھی ہو جاتی ہے۔ خوش ہوتا ہے تو خوش ہو جاتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ پتی پتنی کے درمیان ایک نازک سا رِشتہ، ایک انوکھا لگاؤ ہوتا ہے جو اُٹوٹ ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دُنیا میں پتی پتنی ایک دوسرے کو چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ سُنا ہے ہندوستان میں بھی کہیں کہیں ایسا ہوتا ہے۔ مگر اُس کے لئے یہ ایسا ہی تھا جیسے کہ سُنا تھا کہ دو امریکن چاند کی زمین کو چھو کر لَوٹ آئے ہیں۔

پھر وہ زمانہ آیا جب چھگن لال کو قانون کی کتابوں کی جھک ہو گئی تھی۔ جب دیکھو یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھ رہا ہو۔ شانتا تو انگریزی کی اے بی سی ہی جانتی تھی۔ لیکن پھر بھی اتنا معلوم تھا اُسے کہ ایسی موٹی موٹی چمڑے کی جلد بند بھی کتابیں قانون کے بارے ہی میں ہوتی ہیں پھر LAW تو وہ پڑھ ہی سکتی تھی۔ پھر کسی وکیل نے اُن کے گھر آنا شروع کیا۔ جب وہ گنجے وکیل صاحب آتے چھگن لال بیوی کو رسوئی گھر میں چائے بنانے کے لئے بھیج دیتا۔ اور دیر تک وہ دونوں کھُس پھُس کرتے رہتے باتیں وہ انگریزی میں کرتے تھے۔ گجراتی یا ہندی کم ہی بولتے تھے۔ ایک بار "طلاق" کا لفظ شانتا کے کان میں پڑا تھا لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کِس کی طلاق کی بات کر رہے ہیں۔ شاید وکیل کے پاس کوئی پیچیدہ مقدّمہ آیا تھا۔ اُس کے بارے میں وہ چھگن لال سے مشورہ کر رہا تھا۔

پھر ایک بار اُس نے وکیل کو کہتے سُنا ...۔ "بہت مُشکل ہے چھگن لال جی __"

اور ایک بار اُس کا پتی کہہ رہا تھا ...۔ "اگر آپ اِتنا بھی نہیں کرا سکتے تو وکیل کس مرض کی دوا ہیں؟"

ایک دفعہ چائے لے کر وہ کمرے میں گئی تو وکیل صاحب یہ کہتے کہتے رُک گئے تھے کہ ...۔ "دیر بھی لگے گی اور آپ کا خرچہ بہت ہوگا۔" اور پھر دونوں گجراتی کے بجائے انگریزی میں باتیں کرنے لگے تھے، وہ چائے کی پیالیاں اُن کے پاس رکھ کر چلی آئی تھی۔ مگر دروازے کے پیچھے اُس نے چھگن لال کو کہتے سُنا تھا ...۔ "یوں تو ساری عمر جان نہیں چھُوٹے گی۔" اور اُس نے سوچا تھا کہ یہ کس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں؟ اور اُس کے دِل میں چوروں کی طرح یہ خیال آیا تھا ... کہیں یہ مجھ سے چھٹکارا پانے کی تو نہیں سوچ رہے ہیں؟ کیا چھگن لال طلاق لے کر اُسے چھوڑ دے گا؟

لیکن (شانتا نے سوچا تھا) چھگن لال کو اُس سے طلاق لینے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ وہ تو اُس کی، اُس کی ماں کی سیوا کرتی ہے، کھانا پکاتی ہے، گھر کی صفائی کرتی ہے، کپڑے دھوتی ہے کبھی سینما جانے کی فرمائش نہیں کرتی، نئی ساڑھیوں اور گہنوں کیلئے ضد نہیں کرتی، وہ جانتی تھی کہ بنا جہیز ساتھ لائے جو بہو ہوتی ہے اُس کے کیا ادھیکار سمجھے جاتے ہیں۔ اُس کے دِل میں کبھی بھُولے سے چھگن لال کے سوا کسی دوسرے مرد کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو اپنے پتی کو دیوتا سمان سمجھتی تھی۔ وہ کہتا تو اُس کے پانوں دھو کر پیتی۔ اُس کی پُوجا کرتی۔ جب کبھی چھپر کھٹ پر سے

بُلاوا آیا۔ اُس نے خاموشی سے اپنا فرض نبھایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ گنگا کی لہروں میں ڈوب کر بھی وہ خود ہر بار پیاسی ہی رہ گئی تھی۔ مگر یہ تو اُس کی اپنی بدقسمتی تھی۔ اس میں چھگن لال کو کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ جہاں تک اُس کا خیال تھا اُس کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔ وہ تو ہمیشہ شانتا کے چلے آنے کے بعد گہری چَین کی نیند سو جاتا تھا۔

پھر اُس کو یاد آیا کہ اتنے برسوں کے بعد بھی وہ بے اولاد تھی۔ شاید اسی لئے چھگن اُسے چھوڑنا چاہتا تھا۔ ضرور یہی وجہ ہوگی۔ ؟ مگر اس میں طلاق لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ایک بیوی سے اولاد نہ ہو تو دوسری بیوی کر لینی چاہئے۔ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دوسری بیوی کے زیادہ ناز نخرے ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو قسمت کی بات ہے۔ بھاگیہ چکر ہے جو جس کی جنم پتری میں لکھا ہے، وہی ہوگا۔ ویسے پہلی بیوی بھی اگرچہ جی جان سے سیوا کرے تو شوہر اُس کا خرچہ بھی اُٹھاتا رہتا ہے۔ روٹی کپڑا تو دے ہی دیتا ہے۔ شانتا نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ طلاق کی بات آگے بڑھے اُسے چھگن لال کی ماں سے بات کر لینی چاہئے۔

"ماں جی!" اُس نے موقع پاکر کہا۔

"کیا ہے ری؟" چھگن لال کی ماں نے کسی قدر جھڑک کر کہا۔

"کچھ بات کرنی ہے۔"

"کیا بات ہے؟"

"میں ابھاگن ہوں نا...."

"وہ تو تو ہے ہی۔ پانچ برس سے زیادہ ہو گئے، تو نے ایک چوہیا کے بچے کو بھی جنم نہیں دیا۔"

"اسی لئے میں سوچتی ہوں وہ ایک دوسرا بیاہ کر لیتے تو اچھا تھا۔"

"پاگل ہو گئی۔ ہے! یا اُس کو اس بہانے سے قانون کے پھندے میں پھنسانا چاہتی ہے۔"

"جی، سمجھی نہیں۔"

"ایسی بھولی ہی تو ہے۔ جانتی نہیں اب قانون پاس ہو گیا ہے کوئی ہندو دوسری بیوی نہیں کر سکتا۔ کیا اُس بیچارے کو جیل بھجوانا چاہتی ہے؟"

بات ختم ہو گئی۔ مگر شانتا کے دل میں کھٹکتی رہی۔ یہ تو سرکار کی بڑی ناانصافی ہے۔ دوسری شادی کیوں نہیں کرنے دیتے۔ جب وہ سوت لانے پر راضی ہے تو سرکار کو اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر ایسا ہے تب ہی تو چھگن لال بیچارہ طلاق دینے کی سوچ رہا ہے۔ مگر طلاق ہو گئی تو اُسے روٹی کپڑا کون دے گا؟ وہ دنیا میں بے سہارا تھی۔ ایسی زندگی سے تو موت اچھی ——!"

اگلے چند مہینوں میں سوتے جاگتے موت شانتا کے لاشعور پر سوار رہی۔ میرے جیسے بدقسمتوں کو تو موت بھی نہیں آتی۔ آتما ہتیا کرنے کے لئے۔ ریل کے نیچے آنے کے لئے۔ زہر کھانے کے لئے تو بہت جگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں ویسے ہی اُسے موت آجائے تو وہ اُس کے لئے تیار تھی۔ کم از کم چھگن لال بیچارہ کو تو اس فکر سے چھٹکارا مل جائے گا کہ کیسے دوسری شادی کرے تاکہ باپ دادا کی نسل آگے بڑھے۔

بارش ہو کر بمبئی میں تھوڑی سردی ہو گئی تھی۔ شانتا بار بار بالکنی میں صبح شام کھڑی بوچھاڑ میں بھیگتی رہتی۔ وہ سوچتی کاش مجھے نمونیہ ہو جائے۔ مگر اُس کو تو ایک چھینک بھی نہیں آئی۔

اور پھر ایک رات کو جب وہ زمین پر لیٹی زندگی اور موت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اُس کے مونڈھے کو ہلکے سے چھگن لال کے ہاتھ نے چھوا۔ کئی مہینے کے بعد چھپر کھٹ سے بُلاوا آیا تھا۔

۴

وہ رات شانتا کبھی نہ بھول سکے گی۔ اُس رات تو وہ ہوا تھا جو چھ سال سے آج تک نہ ہوا تھا۔

پہلے تو وہ چھگن لال کی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مہربانی ہوگی۔ ذرا ٹانگیں دبا دو۔ آج میں بہت تھک گیا ہوں۔"

مہربانی! یہ تو اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اتنی سی سیوا کے لئے اُس کے پتی نے آج اُسے یاد کیا تھا۔ وہ اندھیرے میں بھی اپنے گالوں کو خوشی سے تمتماتا ہوا محسوس کر سکتی تھی۔

ٹانگیں دباتے دباتے شانتا نے محسوس کیا کہ چھگن لال کا جسم بیدار ہو گیا ہے۔ آج اُس نے اشارے سے نہیں زبان سے دعوت دی۔ "آؤ، شانتا۔ تم بھی لیٹ جاؤ۔ دن بھر کام کیا ہے تھک گئی ہو گی۔"

شانتا کو ایسا لگ رہا تھا جیسے آج رات اُس کے لئے خوشیوں کے سب دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔

وہ لیٹ گئی، مگر ذرا ہٹ کر۔ چھگن لال نے کہا۔ "میرے پاس آؤ نا؟" اور یہ کہہ کر شانتا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ "ہے بھگوان!" شانتا کی آتما خوشی سے ناچ اُٹھی اور دل کی دھڑکنوں نے حیرت سے پوچھا۔ "آج کیا ہو رہا ہے۔؟"

چھ برس کے بعد اپنے پتی کی محبت کا سہارا پا کر وہ اُس کے سینے سے لگ گئی۔ اُس کے جذبات آنسو بن کر آنکھوں سے نکل پڑے۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

ہائیں۔ یہ کیا؟ تم رو رہی ہو۔" چھگن لال نے نرمی سے پوچھا۔ آج اُسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ دوسرے کمرے میں ماں سُنے گی تو کیا کہے گی۔

شانتا نے اُس کے کان میں کہا۔ "یہ آنسو تو خوشی کے ہیں" اور یہ کہہ کر وہ بے اختیار اپنے پتی کے سینے سے لپٹ گئی۔ اُس کی باہیں چھگن لال کے گلے کا ہار بن گئیں۔ دونوں کے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

کہنے کو وہی ہوا جو پہلے بھی کتنی بار ہوا تھا۔ لیکن اُس رات شانتا کے سوکھے جیون میں بہار آ گئی۔ اندھے کنوئیں میں پانی کے چشمے اُبل پڑے۔

"میں مر گئی۔ میں مر گئی۔ میں۔ زندہ ہو گئی۔ تم نے مجھے زندہ کر دیا چھگن۔" ہائے رام یہ کیا ہوا۔ اُس کے مُنہ سے پتی کا نام نکل آیا۔ یہ سوچ کر اُس جادو بھرے لمحے میں بھی وہ سہم سی گئی۔ مگر آج کی رات تو چھگن نے نہ اُسے مارا نہ ڈانٹا۔ صرف اُس کا ہاتھ اپنی پتنی کو تھپکتا رہا۔ یہاں تک کہ ہاتھ کا تھپکنا تھم گیا۔ اب چھگن آرام کی نیند سو رہا تھا۔

شانتا کھڑکی میں سے آتی ہوئی ستاروں کی دھندلی روشنی میں کچھ لمحے اپنے پتی کو دیکھتی رہی۔ کتنے آنند سے سو رہا تھا اور یہ آنند اُسے کس سے مِلا تھا؟ اپنی پتنی سے۔ مگر آج تو شانتا کا بدن بھی بڑی لذّت بھری تھکاوٹ سے ٹوٹ رہا تھا۔ اتنی تھکاوٹ کہ اُس کا جی چھپرکھٹ سے اُٹھنے کو نہ چاہتا تھا۔ اُس نے سوچا کچھ دیر یہیں آرام کر لوں۔ پھر نیچے اپنے بستر پر چلی جاؤں گی۔ اُس نے اپنا ہاتھ پتی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر نیند کی ایک لہر آئی اور اُس کی آنکھیں اُس میں ڈوب گئیں۔

۵

اُس رات کے دو تین دن بعد چھگن لال انگریزی میں چھپے ہوئے کچھ فارم لایا اور شانتا سے کہا۔ "تیری انشورنس کرا رہا ہوں۔ پورے پچاس ہزار کی۔ لے یہاں دستخط کر دے۔"

شانتا گجراتی میں دستخط کر رہی تھی کہ چھگن لال بولا۔ "میں نے بھی انشورنس کرائی ہے اور تیرے نام کر دی ہے اگر مجھے کچھ ہو گیا تو روپیہ تجھے ملے گا۔"

"بھگوان نہ کرے تمہیں کچھ ہو۔" شانتا نے جلدی سے کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو؟ سہاگن کی ارتھی تو پتی کے کندھوں پر ہی جاتی ہے۔" اب تو وہ دونوں ایک دوسرے سے دن دھاڑے باتیں کرنے لگے تھے۔ "میرا بیمہ ضرور اپنے نام کروا لو۔"

"تو پھر کر یہاں دستخط۔" چھگن لال ہنس کر بولا۔ "مگر یہ پالیسی ایسی ہے کہ نہ مجھے مرنا پڑے گا نہ تجھے۔ اور بیس برس بعد سود سمیت سب روپیہ ہمیں اپنی زندگی میں ہی مل جائے گا۔"

شانتا کہنا چاہتی تھی۔ "وہ روپیہ ہمارے بچوں کے شادی بیاہ کے کام آئے گا۔" لیکن ادھر سے اپنی ساس کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی اور چھگن لال کاغذوں پر دستخط کرا کے لے گیا۔

اگلے دن چھگن لال شانتا کو پہلی بار سینما دکھانے کو لے گیا۔ اڑوس پڑوس والوں نے اُسے مبارکباد دی کہ اُس کا پتی اُس کا بڑا خیال کرنے لگا ہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہا۔ "اری یہ تو ایسا ہو رہا ہے جیسے تمہارے بیاہ کو ہفتہ بھر ہی تو ہوا ہو۔"

"ہاں اور کیا۔" شانتا نے عجیب طریقے سے مُسکرا کر کہا۔ "پچھلے ہفتے ہی تو ہوا ہے۔"

اُس مہینے ایک دن کی دیر ہوئی تو شانتا کو اُمید کی

ہلکی سی کرن دکھائی دی۔ دو دن کی دیر ہوئی تو اُس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ تین دِن کی دیر ہوئی تو وہ آپ ہی آپ گنگنانے لگی۔ مگر ابھی اُس کی ہمت نہ ہوئی تھی کسی سے کہنے کی۔ چوتھے دِن کرواچوتھ کا برت تھا۔ اُس نے ہاتھوں میں مہندی لگائی۔ اپنے سہاگ کو برقرار رکھنے کے لئے۔ اپنے پتی کی سلامتی کے لئے۔ بھگوان سے پرارتھنا کی۔ آج وہ شام کو چاند دیکھ کر اپنے پتی کا چہرہ دیکھے گی۔ اگر آج وہ اُسے یہ خوش خبری بھی دے سکے! اُس سے رہا نہ گیا۔ شوہر کے کام پر جاتے ہی وہ بازار جانے کے بہانے سے میونسپل ہسپتال میں ہو آئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "کرواچوتھ کے دن یہ خوش خبری لے کر گھر جا رہی ہو۔ مبارک ہو۔"

وہاں سے واپس آئی تھی کہ جھگن لال کی ماں باہر جاتی ہوئی ملی۔ "میں مندر جا رہی ہوں، تو کھانا پکا کر لینا۔ اور ہاں جھگن تیرے لئے نئی ساڑھی لایا ہے۔ آج تو نے کرواچوتھ کا برت رکھا ہے نا؟ وہ چاہتا ہے تو آج ہی وہ ساڑھی پہن لے۔"

یہ کہہ کر ماں جی تو مندر کو سدھاریں اور شانتا جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے گھر پہنچی۔ دروازہ کھول کر دیکھا کہ ایک ساڑھی کا ڈبہ رکھا ہے۔ جلدی سے کھولا تو اندر سے اتنی بڑھیا ساڑھی نکلی جتنی اُس نے آج تک کبھی نہ پہنی تھی۔ "کتنی ملائم ہے۔ بالکل جیسے ریشم۔" اُس نے ساڑھی کو کھولتے ہوئے سوچا۔ "بڑی مہنگی ہوگی۔ شاید نائیلون کی ہے۔"

اُس نے سوچا آج کا دِن ہی تو یہ ساڑھی پہننے کا ہے۔

آج کرواچوتھ کا برت ہے۔

آج میرے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے۔

آج کے دِن میں نے بھگوان سے اپنے پتی کیلئے لمبی عمر مانگی ہے۔

آج وہ خوش خبری اپنے شوہر کو دوں گی کہ اُس کا من بھی ناچ اُٹھے گا۔

آج میں کھانا بھی بڑھیا بناؤں گی۔ ہر وہ چیز جو میرے پتی کو پسند ہے۔

مسالے دار بھنڈی۔

اَروِیوں کا سالن۔

مٹر پلاؤ۔

پکوڑیاں۔ دہی بڑے۔

دال والی کچوریاں۔

بیسن کے لڈو۔

وہ یہ سوچتی جا رہی تھی اور بے خیال اِسٹوو میں پمپ سے ہوا بھرتی جا رہی تھی۔

اسپرٹ کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ آج کچھ زیادہ ہی بھڑک رہا تھا۔

اور اُس کے لاشعور میں کہیں دُور دبا ہوا یہ سوال بھی تھا۔ کہ جب سب گھروں میں گیس کے سلنڈر ہیں جن کی مدد سے چولہا فوراً جلایا جا سکتا ہے تو ہمارے ہاں یہ دقیانوسی اور خطرناک چولہا کیوں؟"

شاید اُس کے سوال کے جواب میں....

شاید اُس کے ضرورت سے زیادہ ہوا اندر پمپ کرنے سے۔

شاید اِس لئے کہ چولھے پر اور اُس کے اِرد گرد نہ صرف مٹی کا تیل بلکہ اسپرٹ پھیلی پڑی تھی.....!

شاید شانتا کی اپنی غلطی سے۔

شاید اتفاقیہ حادثے سے۔

شاید کسی اور وجہ سے۔

مگر ایک دھماکہ ہوا۔ چھوٹا سا شعلہ ایک دم بہت بڑا شعلہ بن گیا، جس نے پل بھر میں شانتا کے گرد لپٹی ہوئی نائیلون کی ساڑھی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور وہ ساڑھی ایسی بھڑکی کہ شانتا سر سے پیر تک ایک جلتی ہوئی مشعل بن گئی۔

شاید وہ چیخی۔

شاید وہ چلائی۔

اُس نے دیکھا کہ پڑوسی پڑوسنیں دوڑے بھاگے آرہے ہیں۔

پانی لاؤ۔

پانی لاؤ۔

کمبل لاؤ۔

مگر اب کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا سوائے آنکھوں کے جو جھگن لال کی دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ "میں آپ کو یہ خوشخبری

بھی نہ دے سکی!" اور پھر آنکھیں بھی جل گئیں اور جس جلتی ہوئی مشعل کو کمبل میں لپیٹا وہ صرف شانتا کا مردہ جسم تھا۔

چھگن لال کی ماں جب مندر سے پوجا کر کے واپس آئی تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "ہائے ہائے۔ میں تو لٹ گئی۔ میں اپنے چھگن کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

جب تک چھگن لال کو اطلاع دی گئی اور آنکھوں میں آنسو لئے وہ داخل ہوا پولیس آچکی تھی۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے جانا ضروری تھا۔

کورونر کی کورٹ میں اسٹوو کے پھٹ جانے کے حادثے سے موت کا فیصلہ سنایا گیا۔ مگر ڈاکٹروں کی رپورٹ جو پڑھی گئی اس سے چھگن لال کو معلوم ہوا کہ مرتے وقت اس کی بیوی گربھ وتی تھی۔

اس دن سے کسی نے چھگن لال کو کبھی مسکراتا نہ دیکھا۔

اس دن سے مٹی کے تیل کے اسٹوو پر ان کے گھر میں کھانا پکنا بند ہو گیا۔ اگلے دن ہی چھگن لال کی ماں نے گیس کا سلنڈر اور چولہا منگوا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ چھگن لال کی دوسری بیوی کبھی تیل کے اسٹوو پر کھانا نہیں پکائے گی۔

اور اس منحوس اسٹوو کو تو جس نے بیچاری شانتا کی جان لی تھی اٹھا کر چھگن لال نے باہر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ جہاں سے آخر کار وہ بھیکو کے کھٹارے برتنوں کے ٹب میں پہنچ گیا۔

بھیکو اب ایک اور کوڑے کے ڈھیر میں کرید رہا تھا۔ کیونکہ کبھی کبھی کچرے میں سے بڑے کام کی چیز نکل آتی ہے۔

اس بار تو اس کو ایسا لگا رہا تھا کہ اس کی قسمت بہت ہی زوروں پر ہے کیونکہ کوڑے کے ڈھیر میں سے ایک اچھا خاصا موٹر کا ربڑ ٹائر نکل آیا تھا۔ البتہ اس پر بھی خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ مگر جو غریب کوڑے میں کریدتا ہے اس کو اتنی کہاں فرصت ہے کہ یہ سوچے یہ کسی موٹر کا ٹائر ہے اور یہ کسی کے خون کے چھینٹے ہیں۔

ڈرامہ ایک خونی موٹر کے ٹائر کا!

موٹر مچھلی کی طرح لمبی اور سڈول تھی۔ پنچھی کی طرح پر پھیلائے تھی۔ بطخ کی طرح سفید تھی۔

موٹر کا پچھلا پہیہ جو کرشنن کے بالکل سامنے آکر رکا تھا۔ اور اسی جگہ اس موٹر کا وہ پہیہ ہر شام کو آکر رکتا تھا۔ گول تھا جیسے روپیہ گول ہوتا ہے۔ جیسے سنا تھا دنیا گول ہوتی ہے۔ اس کا ٹائر نیا تھا۔ بڑے مضبوط ربر کا بنا ہوا تھا۔ اس پر نمبر DPX 173524 پڑا ہوا تھا۔ یہ سب کرشنن فٹ پاتھ پر جہاں بیٹھا بوٹ پالش کر رہا تھا وہیں سے دیکھ سکتا تھا۔ بلکہ اب تو دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ کیوں کہ روز دیکھتا تھا۔ اس لئے اس کو اب تک اس موٹر کے بارے میں سب کچھ زبانی یاد تھا۔ دیکھے بغیر موٹر کا نمبر بھی وہ بتا سکتا تھا۔ BMX - 4795

شام کو چھ اور ساڑھے چھ کے درمیان یہ چمکتی ہوئی سفید موٹر چرچ گیٹ کی طرف سے آتی ہے اور ''میرینا'' ریسٹوران کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کو ایک سفید وردی پہنے کالا سا ڈرائیور لاتا تھا۔ وہ پیچھے کا دروازہ کھولتا تھا۔ پھر اس میں سے ایک خوبصورت سا نازک سا لڑکا اترتا تھا۔ اس لڑکے کا نام بھی شروع میں کرشنن کو معلوم نہیں تھا۔ لیکن اس کو اکثر ایسا لگتا تھا کہ ان دونوں کا آپس میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ان دونوں کی عمر ایک ہی تھی۔ قد بھی برابر ہی ہوگا۔ دونوں کے سر کے بال بھی کندھوں تک بڑھے ہوئے تھے۔ اس لڑکے کے فیشن کے مطابق کرشنن کے بال کٹانے میں ایک روپیہ لگتا ہے۔ اور بے کار کسی چیز پر خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا...

مگر اس لڑکے کے بدن پر سلک کی قمیص یا بش شرٹ ہوتی تھی جبکہ کرشنن میلی جیکٹ، آدھی آستینوں کی شرٹ یا پھٹی ہوئی بنیان پہنے ہوتا تھا۔ وہ لڑکا سلک یا ٹیریلین کی تنگ مہری کی پتلون پہنے ہوتا تھا، جبکہ کرشنن کی کالی لمبی ٹانگیں ایک پھٹے ہوئے نیلے نیکر میں سے نکلی رہتی تھیں۔ وہ لڑکا نرم چمڑے کے "موکاسن" یا بڑھیا چپل پہنے ہوتا تھا کرشنن (جو دنیا بھر کے جوتوں پر پالش کرتا تھا) ننگے پاؤں ہوتا تھا۔

پھر بھی کرشنن کو ایسا لگتا تھا جیسے اس کا اس امیر چھوکرے سے بڑا نزدیکی رشتہ ہے۔ یہ رشتہ کیسے قائم ہوا تھا۔ ایسے ہی۔ مگر دنیا میں اکثر رشتے ایسے ہی قائم ہو جاتے ہیں۔ کوئی لمبی چوڑی وجہ تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ رشتہ اس وقت سے قائم ہے جب وہ دونوں پیدا ہوئے تھے۔

۲

کرشنن کیرالا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔

گاؤں سمندر کے کنارے تھا۔ پیدا ہو کر سب سے پہلے اُس نے سمندر کی لہروں کی آواز ہی سُنی ہوگی۔ گاؤں کے چاروں طرف، اُن کے جھونپڑے کے چاروں طرف ناریل کے اُونچے اونچے پیڑ اُگے ہوئے تھے۔ پیدا ہو کر اُس نے آنکھ کھولی ہوگی تو ہوا میں ہلتے ہوئے ناریل کے پیڑ ہی نظر آئے ہوں گے۔

ابھی چار پانچ برس کا تھا کہ اُس نے ناریل کے پیڑوں پر چڑھنا سیکھ لیا تھا۔ ابھی چھ برس کا ہوا تھا کہ سمندر میں تیرنے لگا تھا۔

اُس کے ماں باپ دونوں ناریل کی چھال سے رسّی بنانے کا کام کرتے تھے۔ وہ دونوں اَن پڑھ تھے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ اُن کا بیٹا پڑھ لکھ کر گاؤں کی مُفلسی کے چکّر سے باہر نکل جائے۔ اُنہوں نے کرشنن کو پکڑ کر اسکول میں بھرتی کرا دیا۔ مگر اسکول بھی سمندر کے کنارے ہی تھا۔ اسکول کے چاروں طرف بھی ناریل کے پیڑ ہی لگے ہوئے تھے۔ کرشنن کی توجّہ کتاب سے ہٹانے کے لئے نیلے سمندر کی ایک جھلک یا ناریل کے پتّوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ ہی کافی تھی۔ ماسٹر جی پڑھاتے پڑھاتے اُونگھنے لگتے تو کرشنن ناریل توڑنے پیڑ پر چڑھ جاتا یا بھاگ کر سمندر میں تیرنے پہنچ جاتا۔ کبھی کبھی مار بھی پڑتی، لیکن وہ باز نہ آتا۔

کسی نہ کسی طرح اُس نے آٹھ جماعتیں پاس کرلیں۔ پڑھا لکھا لڑکا کہیں رسّی بُننے کا کام کرسکتا ہے؟ کرشنن نوکری کی تلاش میں گاؤں سے نکل کر پہلے کوئی لون آیا۔ پھر ترِیوندرم گیا۔ کبھی کسی ہوٹل میں بیراگیری کی۔ کہیں کسی گیرج میں موٹر کی صفائی کی۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ سارے کیرالا کے لاکھوں نوجوان نوکری کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ نوکری کبھی ایک کو ملتی ہے کبھی اُس کی نوکری چھُوٹ کر دوسرے کو مل جاتی ہے۔ آدمی پیدا ہوتے رہتے ہیں نوکریاں تھوڑا ہی پیدا ہوتی ہیں۔

پھر ٹریوندرم میں ایک دن نرائنن سے اُس کی ملاقات ہوگئی جو چھُٹی لے کر بمبئی سے آیا ہوا تھا۔ اُس سے بمبئی کے قصّے سُنے، تو کرشنن پر جیسے جادو ہوگیا ہو۔ یہ بڑی بڑی اُونچی عمارتیں۔ یہ چوڑی سڑکیں۔ بجلی سے چلنے والی ریلیں۔ پچاس لاکھ کا بڑا شہر۔ سیکڑوں ہوٹل۔ ہزاروں دفتر۔ لاکھوں نوکریاں۔ نرائنن وہاں ٹائپسٹ کا کام کرتا تھا۔ ڈھائی سو تنخواہ۔ ڈیڑھ سو روپے میں گزارا کرتا تھا۔ سَو روپے گھر بھیجتا تھا۔ مگر نرائنن بی اے تک پڑھا ہوا تھا۔ اور کرشنن نے آٹھ جماعتیں ہی پاس کی تھیں۔ پھر بھی اگر اُس کو ڈھائی سَو کی نہیں تو سَو دو سَو کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔

اور پھر اُس پر جیسے بمبئی جانے کا بھوت سوار ہوگیا ہو۔۔۔ کسی نہ کسی طرح کچھ روپیہ قرض لیا۔ کچھ راستہ ٹکٹ لے کر طے کیا۔ کچھ راستہ بے ٹکٹ، دو دن ریلوے پولیس کی قید میں رہا۔ تنگ آکر انہوں نے بھی چھوڑ دیا۔ اور آخرکار ایک دن وہ بمبئی پہنچ ہی گیا۔ یہاں پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ نہ صرف کیرالا میں بیکاری ہے بلکہ ملک کے ہر خطّے میں اور ہر جگہ سے بیکار نوجوان بمبئی ہی کا رُخ کرتے ہیں۔

چیونٹیوں کی ایک فوج ہے جو ہر طرف سے رینگتی چلی آرہی تھی ..... ایک گُڑ کی ڈلی کی طرف جس کا نام بمبئی ہے۔

کیرالا کے بے کار۔

تامل ناڈ کے بے کار۔

آندھرا کے بے کار۔

میسور کے بے کار۔

گجرات کے بے کار۔

خود مہاراشٹرا کے بے کار۔

اُتّر پردیش، بہار، بنگال کے بے کار۔

راجستھان، مدھیہ پردیش کے بے کار۔

ہر ٹرین سے، ہر بس سے، بے کاروں کی ایک فوج تھی جو بمبئی چلی آرہی تھی۔ مگر یہ جان کر کرشنن کو مایوسی نہیں ہوئی۔ بلکہ ہمّت بندھی۔ اُس نے سوچا جب یہ سب کسی نہ کسی طرح کام تلاش کرلیتے ہیں، تو میں بھی کرلوں گا۔

سو وہ بھوکا رہا۔

فٹ پاتھ پر سویا۔

ہوٹلوں میں کھانے کے عوض برتن مانجھے۔

اسٹیشن پر جاکر بوجھ ڈھویا۔ پہلے دِن دو روپے کمائے، دوسرے دِن جو قلی پہلے سے یہ کام کرتے تھے، اُنہوں نے دھکّے مار کر نکال دیا۔

دھکّے، مکّے، بھیڑ، گالی، بھوک، پیاس، تھکن، ہر چیز کی عادت پڑتی گئی۔ رات کو جہاں بھی۔ جس فٹ پاتھ پر بھی پڑ رہتا وہیں نیند آ جاتی۔ لیکن سب سے اچھی نیند آتی اُسے سمندر کے کنارے۔ جُوہو یا چوپاٹی۔ ریت کا نرم بستر، لہریں رات بھر اُسے لوری سُناتی رہتیں، ناریل کے پیڑوں میں ہوا کی سرسراہٹ اُسے اپنے گاؤں کی یاد دلاتی رہتی۔ اور صُبح سویرے وہ پھر بمبئی سے، اور اپنی قسمت سے کشتی لڑنے کے لئے تازہ دم ہو جاتا۔

چھ مہینے کے بعد ایک دن اتفاقیہ ـــ اُس کا تجربہ تھا کہ دُنیا میں ہر بات اتفاقیہ ہی تو ہوتی ہے۔ اُس کی مُلاقات ایک مَلیالی نوجوان جوزف سے ہو گئی جو بُوٹ پالش کا دھندا کرتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ دن بھر میں اُس کی نو دس روپے کی آمدنی ہو جاتی ہے۔

"بس تو مجھے بھی اِس دھندے پر لگوا دو۔" کرشنن نے کہا تھا۔

جوزف نے بتایا تھا کہ اِس کے لئے اُسے فیس داخلہ دینی پڑے گی۔

"فیس داخلہ؟" اُس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

جوزف نے بتایا تھا کہ اِس علاقے میں جتنے بُوٹ پالش والے چھوکرے ہیں اُن سب نے ایک کلب بنا رکھا ہے۔ داخلہ کی فیس ہے پہلے تین مہینے کی کمائی کا آدھا حصّہ۔ پھر بھی کلب میں داخلہ مُشکل سے مِلتا ہے۔ اور جو کلب کا ممبر نہیں ہے اُسے وہ سب کام نہیں کرنے دیتے۔ مار بھگاتے ہیں۔ پولیس میں اُس کی رپورٹ کر دیتے ہیں۔

"پولیس؟ مگر تم لوگ پولیس سے نہیں ڈرتے؟"

"نہیں رے۔ ہم تو باقاعدہ ہفتہ دیتے ہیں۔"

جوزف کی سفارش پر کرشنن کو ممبر بنا لیا گیا تھا۔ بُوٹ پالش کی ڈبیہ، برش، کپڑا، ڈبہ، سب اُدھار دے دیا گیا تھا۔ چند ہی مہینے میں اُس نے کلب کی فیس داخلہ بھی بھر دی تھی۔ قرضہ بھی اُتار دیا تھا۔ اب وہ آٹھ دوسرے بُوٹ پالش والے چھوکروں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتا تھا جس کا کرایہ وہ سب مل کر دیتے تھے اور جس کا نام اُنہوں نے "کیرالا لاج" رکھا ہوا تھا۔ اِس میں سب مَلیالی ہی رہتے تھے۔ لیکن اُن میں کرشنن جیسے ہندو بھی تھے۔ جوزف جیسے عیسائی بھی تھے۔ رحمٰن جیسے مُسلمان بھی۔ اُن کے ساتھ رہ کر کرشنن کو وطن سے دُور ہونے کا احساس جاتا رہا تھا۔ اُس نے سوچا اب میں خُوب محنت کروں گا۔ ساری دُنیا کے جُوتے چمکاؤں گا۔ اور اپنی قسمت خُوب روپیہ کماؤں گا۔ خرچ کروں گا کم۔ اور اپنے ماں باپ کو روپیہ بھیجتا رہوں گا۔

لیکن پھر اُس کے اور اُس کی کامیابی کے درمیان یہی سفید رنگ کی لمبی چوڑی موٹر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

۳

بُوٹ پالش کرنا بھی اور دھندوں کی طرح ایک دھندا ہے اِس میں کتنی ہی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کس علاقے میں، کہاں دھندا کیا جائے تو زیادہ فائدہ ہوگا؟ کس وقت کیا جائے؟ سینما کے پاس یا ہوٹل کے سامنے؟ مثلاً جہاں سے غیر مُلکی ٹورسٹ گزرتے ہوں وہاں زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ دفتروں کے آس پاس دھندا ملتا ہے، مگر چھوٹا۔ بابو لوگ افسروں کے سامنے جاتے وقت جوتا پالش کراتے ضرور ہیں۔ لیکن بیس پیسے سے زیادہ نہیں دیتے۔ اِس کے مقابلے میں ایک ٹورسٹ سے "کریم پالش" کے نام پر تین روپے بھی وصول کئے جا سکتے ہیں۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں اندر جانے سے پہلے یا وہاں کسی کا انتظار کرتے ہوئے اکثر لوگ پالش کراتے ہیں۔ لیکن جو بہت بڑھیا ہوٹل ہیں وہاں تو لوگ موٹروں میں بیٹھ کر آتے ہیں اور سیدھے اندر چلے جاتے ہیں۔ بُوٹ پالش والے چھوکرے کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔

اِس لئے بُوٹ پالش والے چھوکروں نے طے کر لیا تھا کہ "میرینا" ریستوران کے سامنے والی جگہ اپنے گروہ میں سب سے اناڑی کو دی جائے کیوں کہ وہاں آمدنی بہت ہی کم ہوتی ہے۔

جوزف نے کرشنن سے کہا تھا۔ "تو یہاں دو چار ہفتے کام کر۔ پھر میں تجھے کوئی اور اچھی جگہ لگوا دوں گا۔"

پہلے دن ہی چار ویٹروں اور دس بارہ راہ چلنے والوں کے سوا کسی نے پالش نہیں کرائی۔

دوسرے دن اِس سے بھی کم آمدنی ہوئی۔ وہ کرشنن کا جنم دن تھا۔ بیس دسمبر۔ جب اُس کا جی چاہتا تھا کہ آج خوب کمائی کروں۔ تاکہ اپنے دوستوں کی دعوت کر سکوں۔ کم سے کم اُن کو چائے اور گرم گرم بھجیا کھلا سکوں۔

دن بھر یوں ہی گزر گیا تو کرشنن نے سوچا۔ یہاں تو میں

بھو کام جاؤں گا۔ آج رات کو جوزف سے کہوں گا۔ مجھے یہاں سے کہیں اور لگوا دو۔

مگر اُسی وقت یہ سفید لمبی چوڑی موٹر آئی اور عین اُس کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی۔

ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔ اُس نے اتر کر دروازہ کھولا۔ اندر سے وہ نازک سا دُبلا پتلا سا لمبے بالوں والا لڑکا اُترا، اور کرشن کے پاس سے ہوتا ہوا اندر چلا گیا۔ اُس کے کپڑوں میں کوئی خوشبودار سینٹ لگا رکھا تھا جہاں سے وہ گزرا تھا وہاں سینٹ کی خوشبو کا ایک جھونکا رہ گیا۔

مگر کرشن چھوکرے کو نہیں۔ اُس کے کپڑوں کو نہیں، اُس کی موٹر کو دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں ایسی موٹر اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہاں تک کسی نے اپنا جوتا پہنے ہوئے پَیر اُس کے ڈبّے پر رکھ کر کہا۔ "چل بھئی پالش کر۔ فرسٹ کلاس۔"

کرشن نے چونک کر کہا تو اُس موٹر کا سفید وردی پہنے ہوئے ڈرائیور تھا۔ موٹے تلے کا کالا بوٹ پہنے تھا۔ کئی دن سے پالش نہیں ہوئی تھی۔ کرشن نے بڑے زور سے برش پھرانا شروع کر دیا۔

"کیوں جی یہ موٹر آپ ہی چلاتے ہیں؟"

"ہوں"

"بڑی زبردست موٹر ہے۔ کیوں جی یہ کتنے کی ہو گی۔؟"

"کوئی ایک لاکھ سے زیادہ کی ہے۔ ولایتی ہے نا؟"

"کیوں جی، یہ چھوکرا جو اِس میں بیٹھ کر آیا ہے کون ہے؟"

"ہمارے مالک کا بیٹا ہے۔"

"یہ کیا کرتا ہے۔؟"

"اِسی سال کالج میں داخلہ لیا ہے۔ باپ نے کالج آنے جانے کے لئے یہ گاڑی اُسے ہی دے دی ہے۔"

ٹھک ٹھک۔ کرشن نے برش سے ڈبّے کو دو بار مارا۔ دائیں طرف کے جوتے کا پالش ہو گیا۔ دوسرا جوتا سامنے آیا۔

"کیوں جی آپ کے مالک کے چھوکرے کی عمر کیا ہو گی۔؟"

"اٹھارہ برس۔ آج ہی تو اٹھارہ کا ہوا ہے۔ برتھ ڈے پارٹی ہے اندر۔"

ٹھک ٹھک۔ کرشن نے برش کی لکڑی کو ڈبّے کے اُوپر مار کر اعلان کیا کہ دوسرا جوتا بھی پالش ہو گیا ہے۔

ڈرائیور نے بیس پیسے نکال کر دیئے اور کرشن نے خالی پالش کی ڈبیہ میں ڈال دیئے۔ ڈرائیور ٹہلتا ہوا پان کی دکان پر چلا گیا۔ مگر کرشن کی نگاہیں اُس کار پر جمی رہیں۔

یہ کار ایک اٹھارہ برس کے چھوکرے کی ہے۔

جو اسی دن پیدا ہوا تھا۔ جس دن میں پیدا ہوا تھا۔

شاید دونوں ایک دن ہی نہیں ایک وقت پیدا ہوئے ہوں۔

کہتے ہیں جنم پتری کے حساب سے جس دن اور جس وقت کوئی پیدا ہوتا ہے، اُس وقت کے ستارے بتاتے ہیں کہ ہونے والے بچے کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔

پھر دو لڑکے جو ایک ہی دن پیدا ہوئے اُن کی قسمت میں اتنا فرق کیوں؟

ایک لاکھ روپے کی موٹر میں بیٹھ کر آتا ہے۔

ایک فٹ پاتھ پر بیٹھا اُس کے ڈرائیور کا جوتا پالش کرتا ہے۔

ایک کا باپ بہت بڑی بزنس کا مالک ہے۔

دوسرے کا باپ، گاؤں میں رسّی بٹ کر ایک روپیہ روز کماتا ہے۔

کرشن جوتوں پر پالش کرتا رہا۔

مگر اُس کی نگاہیں اُس کار پر ہی لگی رہیں۔ اور خطرناک خیالات اُس کے دماغ میں گھومتے رہے۔

بے خیالی میں ایک گاہک کے سفید موزوں پر پالش بھرا ہوا برش لگ گیا۔ وہ چلایا۔ "اے چھوکرے تیرا دھیان کدھر ہے؟ موزے کا ستیہ ناس کر دیا۔"

"سوری سر!" کرشن نے کہا۔ انگریزی کے کچھ لفظ اُس نے سیکھ لئے تھے۔ کیونکہ اُس کے دھندے میں کام آتے ہیں۔ کوئی غلطی ہو، انگریزی میں "سوری" بول دو۔ پھر کوئی کچھ نہیں کہتا۔

اُس دن سے کرشن نے دیکھا کہ وہ موٹر اُسی وقت شام کے چھ ساڑھے چھ بجے اُسی جگہ آ کر رکتی ہے اور وہ چھوکرا اُتر کر اندر جاتا ہے۔ ریستوران میں اُس وقت اُس کے دوستوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ تیسرے دن ڈرائیور نے پھر جوتا پالش کرایا تھا تو کرشن نے اُس چھوکرے کا نام بھی معلوم کر لیا تھا۔ اُس کا

نام تھا۔ کرشنا۔ کرشنن ۔ کرشنا ۔ کرشنا۔ کرشنن اُن دونوں کے درمیان ایک اور رشتہ قائم ہوگیا تھا۔

مگر اصل رشتہ کرشنن کا کرشنا کی کار سے تھا۔

یہ رشتہ اتنا مضبوط تھا کہ ہر روز "مرینا" کے سامنے بُوٹ پالش کے لئے بیٹھنا کرشنن کے لئے ضروری ہوگیا۔ جوزف نے کئی بار کوئی دوسری جگہ اُس کے لئے تجویز کی۔ لیکن ہر بار کرشنن نے اِنکار کردیا۔ اُس کو اصرار تھا کہ "میرینا" کے سامنے ہی کام کرتا رہیگا۔

"پاگل ہوگیا ہے کیا؟" جوزف نے کرشنن سے کہا۔

شاید وہ پاگل ہی ہوگیا تھا۔ محبت بھی تو ایک قسم کا پاگل پن ہی ہوتا ہے اور نفرت دوسری قسم کا پاگل پن۔

اب ہر شام کو اُس کار کو دیکھے بنا اُس کی زندگی مکمل نہیں تھی۔

وہ کار اُس سے کام کراتی تھی۔ وہ اُس کار کو دیکھتا رہتا یا اُس کار کا اِنتظار کرتا رہتا اور پہلے سے دُگنے انہماک سے بُوٹ پالش کرتا رہتا۔ "میرینا" کے سامنے سے کسی نے چار روپے نہیں کمائے تھے۔ کرشنن کی آمدنی چھ سات روپے ہونے لگی۔

وہ کار اُس کی زندگی کا سہارا تھی۔ جس دن وہ کار نہ آتی اُسے زندگی پھیکی اور بے معنی دکھائی دیتی۔

وہ اُس کار کا اِنتظار اتنی بے تابی کے ساتھ کرتا جیسے کوئی عاشق اپنے معشوق کا۔

مگر وہ کار اُس کی محبوبہ نہیں تھی۔

وہ کار اُس کی دشمن تھی۔

کیوں دشمن تھی۔ بس تھی۔ ہر چیز کی وجہ تھوڑا ہی ہوتی ہے۔

جب تک وہ کار اُس کے سامنے کھڑی رہتی کرشنن اپنے خیال ہی خیال میں پتھر لے کر اُس کے آگے کے شیشے کو چکنا چور کرتا۔ پھر آگے لگی ہوئی روشنیوں کو پتھر مار کر توڑ پھوڑ ڈالتا۔ پھر ایک تیز چاقو لے کر اُس کی سیٹوں کو کاٹ ڈالتا۔ پھاڑ ڈالتا۔ اُن کے اندر بھرا ہوا ناریل کا کاتھا باہر نکل آتا۔ یہ وہی ناریل کا کاتھا ہے جس کو کوٹ کوٹ کر بُٹ بُٹ کر اُس کا باپ گاؤں میں رسّی بناتا ہے۔!

مگر یہ سب ڈراما اُس کے دماغ میں ہی ہوتا۔ بظاہر وہ پالش کرتا رہتا۔ گاہکوں سے بات کرتا رہتا۔ اُن سے پیسے وصول کرتا رہتا۔ مگر اُس کی نگاہیں اُس کار پر جمی رہتیں۔

وہ کار اُس کا منہ چڑھاتی۔ "تم معمولی بُوٹ پالش کرنے والے چھوکرے، میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔!"

وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کار پر اپنا غصّہ اُتارتا۔ اُس کو توڑتا پھوڑتا، نوچتا کھسوٹتا، کاٹتا، چیرتا، اُس کی فولادی انتڑیاں باہر نکالتا۔ تب ہی جاکر اُس کو تسلّی ہوتی۔

پھر نو، دس بجے کرشنا اپنے دوستوں کے ساتھ "میرینا" سے باہر آتا۔ اُن دوستوں میں کچھ لڑکیاں بھی ہوتیں۔ مگر کرشنن کو لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کرشنا کے دوست کچھ اُس کار میں بیٹھتے کچھ اور کاروں میں۔ پھر ڈرائیور اُس کار کو اسٹارٹ کرتا۔ کرشنن اُس پر آخری نگاہ ڈالتا اور پھر غرّاتی ہوئی، اکڑتی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی، نازو انداز دکھلاتی ہوئی وہ کار وہاں سے چلی جاتی۔ اور جاتے جاتے کرشنن کا منہ چڑا جاتی۔

"دیکھا، تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

پھر کرشنن کا من اُچاٹ ہوجاتا۔ وہ اپنے بُوٹ پالش کے سامان کو اکٹھا کر کے ڈبّے میں ڈالتا۔ ڈبّہ چمڑے کے پٹے سے اُٹھا کر کندھے پر لٹکاتا اور "میرینا" کی جگمگاتی روشنیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا فریر روڈ کے اندھیروں میں کھو جاتا۔

۴

اور پھر کئی مہینے کے بعد آج پھر وہ موٹر وہاں کھڑی تھی۔

اور آج اُس کی حفاظت کرنے کے لئے کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔

آج کرشنا ایک خوبصورت لڑکی کو ساتھ لئے خود ڈرائیو کرکے لایا تھا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑے سیٹی بجاتا اندر چلا گیا تھا۔

اُس وقت کرشنن کسی کا بُوٹ پالش کر رہا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن ایک پل کے لئے رُک گئی۔ جب اُس نے دیکھا کہ کار ڈرائیور کے بغیر آئی ہے۔ آج کوئی پہرہ دار نہیں ہوگا۔ آج وہ کر سکتا ہے جس کا بہرسل وہ اپنے دماغ میں کئی بار کر چکا تھا۔ جس کی پُوری تیاری اُس نے کر رکھی تھی۔ کئی مہینے ٹری وِنڈرم کے ایک موٹر گیرج میں اُس نے یونہی نہیں گزارے تھے۔

موٹر اندھیرے میں کھڑی تھی۔

اندر ڈانس ہو رہا تھا۔ آج بڑا ہنگامہ تھا۔ فٹ پاتھ پر

چلنے والے بھی شیشے کی دیواروں میں سے اندر کا تماشا دیکھ رہے تھے، اُس وقت کوئی گاہک بھلا کہاں آتا۔ کرشن نے اپنے ڈبے میں سے ایک جیک نکالا۔ ایک سپینر اور ایک نٹ بولٹ ڈھیلا کرنے کا پانا۔"

یہ سب لے کر وہ موٹر کار کے دوسری طرف گیا۔ جہاں دیوار تھی۔ وہاں کسی نے اُسے بیٹھا دیکھ بھی لیا تو سمجھے گا کوئی پیشاب کر رہا ہے۔

جیک لگانے پہیہ اُوپر اٹھانے اُس کے نٹ بولٹ ڈھیلے کرنے میں صرف چند منٹ لگے، پھر وہ اپنی جگہ واپس آکر بیٹھ گیا اور اوزار پھر سے ڈبے میں بند کر دیئے۔

اب اُس نے پہلی بار اپنی توجہ جان بوجھ کر کار سے ہٹا کر ریستوران کے اندر نظر کی۔

ریستوران ایرکنڈیشنڈ تھا۔ اِس لئے دروازے کھڑکیاں ایک بار بند ہو جاتے تھے تو اُن میں سے آواز بھی باہر نہ آتی تھی۔ شیشے کی دیواروں میں سے آپ امیر گھرانوں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو تھرکتے، کولھے مٹکاتے، سینہ سے سینہ ملا کر ناچتے، عجیب عجیب حرکتیں کرتے دیکھ سکتے تھے، لیکن جس سنگیت پر یہ سب اچھل کود ہو رہی تھی اُس کو نہ سُن سکتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے شیشے کے تالاب میں رنگ برنگی مچھلیاں خاموشی سے تیر رہی ہیں۔

اِن ہی مچھلیوں میں کرشنا اُس خوبصورت سی نازک سی لڑکی کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا۔ یہ کچھ عجیب قسم کا ڈانس تھا۔ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ ناچ رہے تھے۔ مگر اُن کی حرکتوں میں ایک عجیب قسم کا لگاؤ، ایک عجیب قسم کا آہنگ تھا۔ وہ ایک ہاتھ اُٹھاتا تھا، پھر وہ ایک ہاتھ اٹھاتی تھی وہ دوسرا ہاتھ اُٹھاتا تو وہ بھی اُسی طرح دوسرا ہاتھ اٹھاتی تھی۔ پھر جیسے وہ تھرکتا تھا ویسے ہی وہ بھی تھرکتی تھی۔ جیسے وہ جھکتا تھا ویسے ہی وہ جھکتی تھی۔ غرض عجیب قسم کی جمناسٹک کر رہے تھے وہ دونوں۔

بڑی دیر تک ——— نہ جانے کتنی دیر تک ———

کرشن کھڑا شیشے کی دیوار میں سے اُن دونوں کو اور اُن جیسی اور کتنی ہی دو ٹانگ کی مچھلیوں کو تیرتے، اُچھلتے، کودتے، خاموشی سے ناچتے گاتے، ہونٹ ہلاتے، ہونٹ ملاتے، ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر اَن سُنے سنگیت کی لہروں پر ڈولتے دیکھتا رہا، اور وہ بھول گیا اُس سفید کار کو، جس سے اُس کو محبت تھی یا نفرت تھی۔ جس کو وہ ٹوٹا پھوٹا، چکنا چور ہوتے دیکھنا چاہتا تھا، کیوں کہ وہ کار اُس کی دشمن تھی اور وہ اُس کار کا دشمن تھا۔ پھر بھی اُس کو اتنی شدید نفرت کیوں تھی جو صرف محبت میں ہوتی ہے؟

اور پھر جیسے کسی دوسری دنیا سے ایک جانی بوجھی آواز اُس کے کان میں آئی۔ وہ اُس آواز کو خوب پہچانتا تھا۔ وہ تھی اُس کار کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز۔ مگر انجن کون اسٹارٹ کر سکتا تھا۔ کار کا مالک تو اندر ڈانس کر رہا تھا۔ ڈرائیور آج آیا نہیں تھا۔ اور کون ہو سکتا ہے؟ کوئی اور کار ہوگی۔ یہ سوچ کر اُس نے بڑے اطمینان سے مُڑ کر ایک چھچلتی ہوئی نظر اُدھر ڈالی جدھر وہ کار کھڑی تھی۔ مگر وہاں اب وہ کار نہیں کھڑی تھی۔ جگہ خالی تھی انجن کی ٹھڑٹھڑاہٹ اور گھرگھراہٹ کے ساتھ وہ کار تیزی سے جا رہی تھی اور جب تک کرشن کی سمجھ میں آئے کہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہو چکا ہے۔ وہ کار ایک سفید چھلاوے کی طرح پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

"اے اے ٹھہرو۔" کرشن پیچھے بھاگتا ہوا چلایا۔ "میری کار چُرا کر کہاں لئے جا رہے ہو؟" اُن لوگوں نے کرشنا کی موٹر نہیں چرائی تھی۔ کرشن کے خواب چرائے تھے۔!

جن اِکّا دُکّا لوگوں نے ایک بوٹ پالش والے چھوکرے کو میلا بنیان اور میلا نیکر پہنے سڑک کے بیچ میں کھڑے چلاتے دیکھا۔ وہ سمجھے کہ زیادہ پی لینے سے بیچارہ اول فول بک رہا ہے اور وہ اُس کی کنی کاٹ کر گزر گئے۔

پھر کرشن کچھ سوچ کر "میرینا" ریستوران کی طرف بھاگا۔ دروازہ گھسیٹ کر کھول ڈالا تو ایک دم سنگیت کا دھماکہ اُس کے کانوں پر پڑا۔ کچھ دیر تو بھیڑ اور سنگیت کی چیخ اور پکار سے وہ بوکھلا سا گیا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور وہ سیدھا اُدھر بڑھا جدھر کرشنا اُس لڑکی کے ساتھ اُلٹا سیدھا ڈانس کر رہا تھا۔

مگر ابھی اُس نے ایک قدم ہی اُٹھایا تھا کہ ریستوران کے منیجر، اسسٹنٹ منیجر اور دو تین ہٹّے کٹّے بیروں نے کرشن کو آگھیرا۔

"اے، کیا چاہئے یہاں؟"

"م — م — میری — م — م — مو — ٹر —"

یہ کہہ کر کرشن نے کرشنا کی طرف اشارہ کیا۔

اب تو ہوٹل والوں کو یقین ہو گیا کہ یہ میلے کچیلے کپڑے پہنے یہ چھوکرا "پیلا" ہے۔ تو ٹانک چڑھا کر بہک گیا ہے۔

"چلو باہر نکلو۔"

"مگر سنو تو۔"

"اگر مگر کچھ نہیں ——— نکالو۔"

"جی حضور۔" ایک بیرے نے کہا۔

"اس شرابی کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

انہوں نے یہی کیا۔ مگر پھینکا نہیں۔ دھیرے سے فٹ پاتھ پر اس کو گٹھری کی طرح اٹھا کر رکھ دیا۔

ایئر کنڈیشنڈ ریستوران کا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

ڈانس جاری رہا۔ کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی، کیا ہوا کیا نہیں ہوا۔

باہر فٹ پاتھ پر کرشن نے بوٹ پالش کا اپنا سامان بھی نہیں اٹھایا۔ اس کے احساس کو بڑی ٹھیس لگی تھی بلکہ لگائی گئی تھی۔ اس کو شرابی سمجھا گیا تھا۔ حالاں کہ اس نے تو آج تک کبھی دارو کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیا تھا۔ ایک گھونٹ نہیں۔! جوزف وغیرہ روز اس کو کہتے تھے، پیو میرے یار۔ غم غلط کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ پھر بھی اس نے دارو کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

ایک راستہ چلتی پرچھائیں سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا۔ "کیوں بھائی۔ کیا میں شراب پیئے ہوئے ہوں؟"

"بالکل نہیں۔" پرچھائیں نے جواب دیا۔

"پھر وہ مجھے شرابی کیوں کہتے ہیں۔"

"وہ بے وقوف ہیں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔ پیسہ ہے جیب میں؟"

کرشن نے جیب میں سکے کھنکھنا کر کہا۔ "ہے۔ مگر کہاں چلو گے۔؟"

پرچھائیں نے اس کے کان میں کہا۔ "دارو خانے، میرے یار۔ اور کہاں۔؟"

چند منٹ بعد دارو خانے میں دوسرا گلاس چڑھاتے ہوئے کرشن بولا۔ "روز کہتا تھا پیو میرے یار۔ اب دیکھے آکر۔!"

"کس کی بات کر رہے ہو؟" اس کے ساتھی نے گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ایک دوست ہے میرا۔ جوزف۔ نہ جانے اس وقت کیا کر رہا ہے۔؟"

۵

جوزف سفید کار کو چلا رہا تھا جو مچھلی کی طرح سڈول تھی۔ پنچھی کی طرح پر پھیلائے ہوئے تھی اور اس وقت ورلی کی سڑک پر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہی تھی۔

جوزف کے برابر میں رحمٰن بیٹھا تھا اس کے برابر میں مینن۔ اس وقت تینوں پیئے ہوئے تھے۔ تینوں ہنس رہے تھے، تینوں اپنے ساتھی کرشن کو یاد کر رہے تھے۔

"سالا کرشن۔" جوزف نے کہا۔ کیا یاد کرے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے کار اڑا لی۔"

"مزا تو جب آئے گا۔" رحمٰن نے اپنے ساتھیوں سے چلا کر کہا۔ کیوں کہ کھلی گاڑی میں ہوا ابھی فراٹے سے چلتی ہے۔ "جب موٹر کا مالک ہوٹل سے نکل کر کرشن سے پوچھے گا۔ ابے تو نے ہماری کار کو کو لے جاتے تو نہیں دیکھا۔"

"سالا۔" جوزف گالی دے کر بولا۔ "کار کی کنڈیشن تو ٹپ ٹاپ ہے۔ مگر پچھلا بایاں پہیہ ذرا وابل کر رہا ہے۔ سالا کبھی اِدھر جاتا ہے کبھی اُدھر۔"

"کرنے دے وابل۔ پٹھے۔" مینن بولا۔ "ذرا جوہو کی ہوا کھلا دے۔"

دراصل کرشن گھبراہٹ میں نٹ بولٹ کافی حد تک ڈھیلا نہ کر پایا تھا۔ ورنہ اس کے پلان کے مطابق تو اب تک پہیہ نکل جانا چاہیے تھا۔ اور کار کو الٹ جانا چاہیے تھا۔

جوہو ساحل کے کنارے پہنچ کر رحمٰن نے کہا کہ پیاس لگ رہی ہے۔ چلو ایک ایک کوکا کولا پی لیں۔ مگر مینن نے ایک طرف اشارہ کیا۔ جہاں ایک کونے میں پولیس کی وائرلیس لگی ٹرک کھڑی تھی۔ "ٹھہرنے کا ٹائم نہیں ہے۔ چلتے رہو۔"

جوزف نے بھی کن انکھیوں سے پولیس کی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے مینن۔" اور یہ کہہ کر سٹیرنگ وہیل زور سے موڑا۔ اس بار ڈھیلے پہیئے نے اس زور سے وابل کیا کہ موٹر تقریباً "مسکٹ" کر گئی۔ مگر جوزف نے سنبھال لیا اور ایکسیلیریٹر دبا کر تیزی سے موٹر دوڑاتا ہوا لے گیا۔ یہ وقت روک کر دیکھنے

کا نہیں تھا۔ کہ پہیئے میں کیا خرابی ہے۔ کیوں کہ پیچھے سے پولیس کی ایک پھڑپھڑاتی ہوئی سیٹی سنائی دے رہی تھی۔

"لگتا ہے کار کی چوری کی خبر پولیس تک پہنچ گئی ہے۔" رحمٰن نے کہا۔ اُس کو کیا معلوم تھا کہ پولیس والوں نے سیٹی اِس لئے بجائی تھی کہ کار والوں کو آگاہ کردیں کہ اُن کا پچھلا پہیہ خطرناک طریقے سے ڈھیلا ہو رہا ہے۔

"چوری"۔ جوزف گاڑی کو بھگاتے ہوئے بولا۔ "تو اِسے چوری کہتا ہے۔ ارے ہم نے تو دوستانہ طریقے سے گاڑی استعمال کی ہے ابھی جا کے وہیں "میرینا" کے آگے کھڑی کردیں گے۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔"

"سوائے ایک کرشنن کے۔" میتن بولا۔ "وہ سالا بڑی گالی دے گا کہ مجھے بھی سواری کیوں نہیں کرنے دی۔"

"اُس کو بھی سواری کرادیں گے ایک دِن۔ مگر آج نہیں کراسکتے۔"

جوزف کو اپنی ڈرائیونگ پر بڑا ناز تھا وہ کہا کرتا تھا کہ تین پہیوں پر بھی میں گاڑی پچاس میل کی رفتار سے بھگا سکتا ہوں۔

دراصل بوٹ پالش کے دھندے سے پہلے وہ ایک بڑے سیٹھ کے ہاں ڈرائیور ہی تھا۔ دو سو روپے پگار۔ وردی، کھانا، کپڑا۔ اوور ٹائم سب ملتا تھا۔ پھر ایک دِن اُس بزنس مین کی بیوی سے ایک ایکسی ڈنٹ ہوگیا۔ جس میں ایک بچہ مارا گیا۔ سیٹھ نے نوکر کے پیروں پر ٹوپی رکھ دی کہ اب تم ہی ہمیں بچا سکتے ہو۔ میری بیوی کے پاس تو ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں ہے۔ تم یہ الزام اپنے سر لے لو۔

جوزف نے کورٹ میں جا کر بیان دیا کہ موٹر تو میں چلا رہا تھا۔ میم صاحبہ تو صرف برابر بیٹھی تھیں۔

خطرناک لاپرواہی سے موٹر چلانے کا اِلزام ثابت ہوگیا۔ مجسٹریٹ نے جوزف کو سال بھر قید اور تین ہزار روپے جرمانہ کی سزا دی۔ تین ہزار روپے جرمانہ سیٹھ نے بھرا جو مرے ہوئے بچے کے ماں باپ کو دِلوایا گیا۔

سال بھر کے بعد جب جوزف باہر نکلا تو اُس کا ڈرائیونگ لائسنس ضبط ہو چکا تھا۔ سیٹھ نے اُسے رکھنے سے اِنکار کردیا۔ کہا، سو دو سو چاہئیں تو لے جاؤ۔ مگر ہم جیل کاٹے ہوئے آدمی کو نوکر نہیں رکھ سکتے۔ وہ بھی جبکہ اُس کا لائسنس ضبط ہو چکا ہو۔

جوزف کا جی چاہا دو سو روپے سیٹھ کے مُنہ پر دے مارے۔ مگر پھر وہ غصّہ پی گیا اور روپے لے کر چلا آیا۔ کئی دِن تک اُس کی شراب پیتا رہا۔ پھر جب آخری پندرہ روپے رہ گئے، تو اُس کا بوٹ پالش کا سامان خریدا، اور یہ دھندا شروع کردیا۔

۶

اور اب برسوں کے بعد پھر ایک بڑی شاندار موٹر جوزف کے قبضے میں تھی۔ اُس کے ہاتھ سٹیرنگ وہیل پر تھے۔ اُس کے پیر کے نیچے اکسیلریٹر تھا۔ جتنا دباؤ اُتنی تیزی سے موٹر بھاگتی تھی۔ مگر اِس موٹر میں کچھ خرابی تھی ضرور۔ بائیں طرف کا پچھلا پہیہ وابل کر رہا تھا۔ اُس طرف سٹیرنگ کھینچتی تھی۔ مگر جوزف جیسے ڈرائیور میں اور معمولی ڈرائیور میں کیا فرق ہوا۔ اگر جوزف نے بھی موٹر روک دی یا سو جو ہو سے کھار، باندرہ۔ ماہم، دادر، ورلی ہوتے ہوئے اب وہ پھر میرین ڈرائیو پر چلے آرہے تھے۔ دو ایک منٹ میں وہ "میرینا" کے آس پاس ہی کہیں اندھیرے میں اِس کار کو پارک کردیں گے اور پھر ہنستے کھیلتے ہوئے چلے جائیں گے، گھنٹہ سوا گھنٹہ کا ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔

مگر یہ کیا۔؟ یہ کون عین سڑک کے بیچ و بیچ چلا آرہا ہے؟ کرشنن؟ یہ کرشنن یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیا شراب پی رکھی ہے اُس نے۔؟

"کرشنن۔ آگے سے ہٹ جاؤ۔"

"کرشنن۔!" رحمٰن نے آواز دی۔

"کرشنن!!" میتن چلّایا۔

مگر کرشنن سامنے سے گاڑی کی روشنیوں کو دیکھ کر چکا چوند ہو چکا تھا۔ نشے میں ویسے بھی اُس کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ چلّائے جا رہا تھا۔ "کوئی ہے۔ ہماری موٹر لاؤ۔! ہماری موٹر ــــــ"

جوزف نے پورے زور سے بریک لگایا۔ گاڑی ایک پل کے لئے عین کرشنن کے پاس آکر رک گئی۔ جوزف نے سوچا۔ "آخر کون ڈرائیو کر رہا ہے۔؟"

مگر اُسی وقت بائیں طرف کے پچھلے پہیئے کا آخری نٹ بولٹ گر پڑا اور پہیہ لڑھکتا ہوا الگ چلا اور کار بے قابو ہو کر اُس کے پیچھے تین پہیوں پر دوڑی۔ اب جوزف دائیں کو سٹرنگ گھماتا ہے تو گاڑی پوری دائیں کو گھوم جاتی ہے۔ بائیں کو گھماتا ہے تو پوری بائیں کو۔ نشے میں مدہوش کرشنن سوچ رہا تھا۔ یہ میرے دماغ کا قصور ہے۔ یا میری آنکھوں کا کہ یہ موٹر کی روشنیاں مجھے ناچتی دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی اِدھر جاتی ہیں کبھی اُدھر پھر وہ روشنیاں ایک خطرناک رفتار سے اُس کی طرف آئیں اور وہ ڈر کے مارے ایک بجلی کے کھمبے سے لپٹ گیا۔ مگر اُن روشنیوں نے اُس کو وہاں بھی جا دبوچا۔ اور پھر ایک زبردست دھماکے کے ساتھ جس میں شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار بھی شامل تھی وہ روشنیاں بجھ گئیں اور مرنے سے پہلے کرشنن نے دیکھا کہ اُس کی دیرینہ خطرناک آرزو پوری ہو گئی ہے۔ اور وہ سفید موٹر جو مچھلی کی طرح سڈول تھی اور پنچھی کی طرح پر پھیلائے تھی۔ آخر کار ایسی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے کہ اُس کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ جیسے کسی نے سفید بطخ کے پر نوچ لئے ہوں۔ یہ اُس کی زندگی کا آخری لمحہ تھا۔

بائیں طرف کا پچھلا پہیہ لڑھکتا لڑھکتا گٹر میں جا گرا۔ اگلے دن صبح کو ایک میونسپلٹی کے جمعدار نے جھاڑو دیتے ہوئے اُس کو دیکھا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ اُس کے ٹائر پر خون کے چھینٹے پڑے ہیں۔ اُس کو نہیں معلوم تھا کہ یہ چھینٹے کرشنن کے خون کے ہیں، جو کیرالا کے سمندر اور ناریل کے جھنڈوں سے اِس خون کو اپنے بدن میں بمبئی لے کر آیا تھا۔!

جمعدار نے سوچا۔ لوہے کا پہیہ تو چور بازار میں بک جائے گا لیکن ٹائر لے گیا تو اس پر پڑے ہوئے خون کے چھینٹے مجھے مصیبت میں پھنسا دیں گے۔ آدھا ٹائر پہلے سے پھٹنے سے اُتر گیا تھا۔ باقی کو اُس نے گھسیٹ کر اُتار دیا اور اُسے کوڑے کے ڈھیر میں چھپا دیا۔ جہاں سے اُس کی قسمت میں بھیکو کے کھٹارے میں آنا لکھا تھا۔

ٹائر کو ٹب کے اندر اسٹوو کے پاس رکھنے کے بعد بھیکو نے سوچا، آج کے لئے کافی چیزیں اکٹھا ہو گئی ہیں، ایک صحیح سالم ٹب۔ ایک اچھا خاصا اسٹوو، اور ایک تقریباً نیا ٹائر۔ ان کے ہی دام سیٹھ ٹھیک لگائے تو تیس چالیس تو مل جانے چاہئیں۔ اب واپس گھر چلنا چاہئے۔ سو اُس نے کھٹارے کا رُخ کمالینہ کی طرف موڑ دیا۔ لیکن اندھیری سے جاتے ہوئے ایک فلم اسٹوڈیو کے پاس سے گزر رہا تھا، جس کے سامنے کئی ٹین کی چھت کے جھونپڑے بنے ہوئے تھے کہ اُس نے دیکھا کہ گٹر کے پاس درجن بھر خالی فلم کے ڈبے پڑے ہوئے ہیں۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر کی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر اُس نے جلدی سے وہ ڈبے قبضے میں کر لئے۔ اور ٹب میں نیچے کو دبا کر رکھ دیئے۔

ڈبے اندر رکھتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ پرانے لیبلوں پر فلم کا نام لکھا تھا۔ روشنائی سے، جو وقت کے ساتھ دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ "نئی دھرتی، نیا آکاش۔" بھیکو نے جو سب ہٹ فلموں کو ایک زمانے میں بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا۔ سوچا کہ اِس نام کی تو کوئی فلم میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ نام بھی عجیب ہے۔ "نئی دھرتی۔ نیا آکاش۔"

سینیریو فلم کے تیرہ خالی ڈبوں کا

ایک کے اوپر ایک بارہ فلم کے ڈبے اسٹول پر دھرے تھے۔ تیرھواں ڈبہ اِس ٹین کے قطب مینار کے اوپر رکھتے ہوئے نرمل نے سوچا۔ واہ۔ میں نے بھی کیا نام رکھا تھا اپنے ناول اور اپنی فلم کا۔ "نئی دھرتی۔ نیا آکاش۔" دھرتی اور آکاش ہیں، کیسے دلچسپ ہے۔؟ اور وہ بھی نئی دھرتی اور نئے آکاش ہیں! ہاں کچھ "نئی" اور "نیا" قسم کے فلم چل سکتے ہیں۔ جیسے۔

نئی محبت

نیا پیار

نئی بہار

نیا اقرار

نئی جوانی

نئی سجنی

نیا سجنا

نیا گیت

نیا سنگیت

نئی پریت ۔۔۔۔

مگر یہ تو وہی "نئی محبت" والی بات ہی ہو گئی۔ تو کیا ہوا۔؟ ہماری فلموں کا یہی تو کمال ہے۔ ہر نئی فلم جو بنتی ہے اُسی پرانے ڈھانچے پر بنتی ہے۔ وہی پرانی کہانی۔ وہی پرانا پلاٹ۔ وہی

پُرانے کیریکٹر۔ وہی پرانے ایکٹر اور ایکٹریسیں۔ وہی پُرانے خیالات۔ مگر پبلک ہر فلم میں کچھ نیا پن بھی مانگتی ہے، سر اُس کا بھی انتظام ہے۔ کبھی نیا ہیرو، کبھی نئی ہیروئن، مگر صورت شکل، انداز، آواز، وہی پُرانے ہیرو، ہیروئنوں جیسی!) ہاں ہیرو ہیروئنوں کی پوشاک بدلتی رہتی ہے۔ کبھی شلوار قمیص مقبول ہے تو کبھی غرارہ، تو کبھی چوڑی دار۔ آج کل سلیکس اور بیل باٹم کا زمانہ ہے۔ فیشن ایبل خواتین، پنجابی دیہاتیوں کی طرح لنگی پہنے ہوئے گھومتی ہیں۔ اس کے بعد سومنگ کاسٹیوم اور بکنی BIKNI کا زمانہ آئے گا۔ اور اُس کے بعد۔۔۔۔؟ دنیا گول ہے؟

انسان کا ارتقاء بھی ایک چکر ہے۔ اکیسویں صدی میں ہم شاید جانوروں کی کھالیں لپیٹنے لگیں اور پتھر کے ہتھیاروں سے ایک دوسرے کا شکار کریں اور اس کے بعد؟ پھر تو جانوروں کی کھال لپیٹنے کا تکلف بھی کیوں۔ کیا انسان کو ڈھانپنے کے لئے خود انسان کی اپنی کھال کافی نہیں ہے؟ ساری دنیا ایک سوِیڈیشن یا فرانسیسی "آرٹ فلم" ہو جائے گی جو آج بغیر سینسر کے فلم سوسائٹی میں دکھائی جا رہی ہے۔ کل وہ آرٹ نہیں رہے گا۔ زندگی کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔ کیا، تب حقیقت سے فرار کرنے کے لئے ایسی فلمیں بنائی جائیں گی جن میں برقعہ پوش عورتیں نقاب اُلٹ کر اپنے حُسن کی ایک جھلک دکھائیں گی اور سینما گھروں میں بھری ہوئی ننگی پبلک اُن کو دیکھ کر جنسی تسکین حاصل کرے گی؟

میں بھی کیا اونٹ پٹانگ باتیں سوچ رہا ہوں۔ یہ لمحہ ایک تاریخی لمحہ ہے۔ کم سے کم میرے اپنے لئے ۔۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ انسان جب موت کے قریب ہوتا ہے تو اُس پر زندگی کی سب حقیقتیں کُھل جاتی ہیں۔ میرے حساب سے میری موت میں ۔۔۔ اور میری فلم کی موت میں ۔۔۔ اب صرف چند منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ مگر اب تک مجھے تو کوئی زندگی کا بھید نہیں معلوم ہوا۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیوں ہوں؟۔ ان تیرہ ڈبّوں میں جس فلم کا نیگیٹیو رکھا ہوا ہے وہ کیا ہے؟ کیا وہ ایک آرٹ فلم ہے، حالاں کہ اس میں تو ایک عورت کا ننگا جسم بھی نہیں دکھایا گیا ہے۔ کیا یہ ایک کامیاب فلم ہے۔ حالاں کہ کسی سینما میں کسی نے آج تک اُس کا ایک ٹکٹ بھی نہیں خریدا ہے۔ کیا یہ بکواس ہے ۔۔۔ ایک پاگل ڈائرکٹر کا پاگل پن ہے؟ کیا اس میں لگا تین لاکھ روپیہ سب بے کار گیا ۔۔۔ جیسا اُس کا فنانسر مُول چند بھائی کہتا ہے؟ "اِس سے تو اچھا تھا میں تین لاکھ روپے کے نوٹوں کو جلا کر اُن سے چائے بنا لیتا!" مگر پھر وہ اُس مخمل کے ڈبّے میں کیا رکھا ہے؟ کچھ نہیں رکھا ہے ۔۔۔ جو رکھا تھا وہ تو مُول چند بھائی سب چیزوں کے ساتھ قُرقی کرا کے لے گیا ہے۔؟

اور یہ سوچ کر نرمل ہنسنے لگا۔ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

مول چند بھائی اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتا ہے نا؟ قُرقی کرانے آیا تھا۔؟ کیا ملا اُس کو؟۔ ایک تین ٹانگ کی ٹیبل۔ دو ٹوٹی پھوٹی کُرسیاں۔ ایک کتابوں کی الماری۔ دو ڈھائی سو کتابیں، اخباروں، رسالوں کی تین چار من ردّی۔ دو پیوند لگی پتلونیں، تین کالر سے پھٹے ہوئے قمیص، اخبار کے تراشوں کا ایک فائیل جس میں نرمل نامی ایک GENIUS کے فلم "نئی دھرتی، نیا آکاش" کی تعریف میں کالم کے کالم سیاہ کئے گئے تھے اور ایک سونے کا گول ٹکڑا۔ تین تولے کا۔ راشٹرپتی سورن پدک، پریسیڈنٹس گولڈ میڈل۔ جو اُس کو ۔۔۔ نرمل کو ۔۔۔ انعام مِلا تھا۔

اور رکھا کیا اس جھونپڑے میں ہے؟۔ دراصل مُول چند بھائی کو تلاش تھی اُن تیرہ ڈبّوں کی جن میں فلم کا نگیٹیو تھا۔ مگر اِن ڈبّوں کو تو نرمل نے جھونپڑے کی ٹین کی چھت میں چُھپایا ہوا تھا۔ بالکل جیسے ایک فلم اِسٹار اور اُس کے ڈیڈی نے انکم ٹیکس والوں سے بچنے کے لئے نو لاکھ روپے "بلیک" کے نوٹ اپنے باتھ رُوم کی نقلی چھت میں چُھپائے ہوئے تھے۔!

بار بار مُول چند بھائی نے کہا تھا "نرمل۔ اب بھی بتا دے کہ نیگیٹیو کہاں ہے۔؟ ہم تیرے گھر سے ایک تنکا بھی اُٹھا کر نہیں لے جائیں گے۔ صرف نگیٹیو پر قبضہ چاہئے۔ اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"سیٹھ سب جل کر خاک ہو گیا۔ اب تو نہ دھرتی ہے نہ آکاش۔"

"جل گیا۔ کب؟۔ کوئی ثبوت؟"

چند گھنٹوں ہی میں ثبوت بھی مل جائے گا۔ سیٹھ" اور دل ہی دل میں نرمل سوچ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا جھوٹ تو نہیں بولا میں نے۔ صرف چند گھنٹوں کی دیر ہے۔ پھر تو نگیٹیو جل کر خاک ہی ہو جائے گا۔

"اچھا تو پھر فی الحال میں یہ سونے کا تمغہ ہی لے جاتا ہوں۔ واپس چاہئے تو نیگیٹیو جو تم نے لیبارٹری سے چُرا کر منگوا لیا ہے میرے ہاں پہنچا دو۔"

"میڈل شوق سے لے جاؤ۔ مجھے اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں ضرورت نہیں ہے تو میں سوچتا ہوں کہ یہ میڈل تمہاری ہیروئن کو دیتا جاؤں۔ آخر درگا نے بھی تو بڑی محنت کی ہے تمہاری فلم کے لئے۔ اور اس کو پیسے بھی تم نے پورے نہیں دیئے۔ پانچ ہزار کا وعدہ کیا تھا۔ دیئے صرف تین ہزار، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

درگا!

درگا!

درگا!

سیٹھ سب سامان بٹور کر لے گیا تھا اور اس ویران جھونپڑے میں اس نام کی گونج چھوڑ گیا تھا۔

بارہ سلیپنگ پلز (خواب آور دوا کی گولیاں) لینے کے بعد بھی نرمل کے دماغ میں ایک ہی نام گونج رہا تھا اور ایک ہی چہرہ گھوم رہا تھا۔

درگا!

درگا!

درگا!

اگر درگا نے مجھے ہمت نہ دلائی ہوتی (سلیپنگ پلز کے اثر سے نرمل کے گھومتے ہوئے دماغ نے سوچا۔) تو میں کبھی فلم نہیں بنا سکتا تھا۔

اگر درگا کی بے مثال اداکاری نہ ہوتی تو "نئی دھرتی نیا آکاش" ایک بے جان فلم ہوتی جو کبھی پریذیڈنٹس گولڈ میڈل پانے کی مستحق نہ ہوتی۔

اور درگا نے اس سے بے وفائی نہ کی ہوتی، اگر وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر مول چند بھائی کے پاس نہ چلی گئی ہوتی، تو آج وہ اس آدھی رات کو اس بے تابی سے موت کا انتظار نہ کرتا ہوتا۔

۲

بمبئی میں کم سے کم پانچ چھ سو وہ "فلم رائٹر" ہیں جن کے نام کم سے کم ایک فلم کے ٹائٹلوں میں پردے کے اوپر آچکے ہیں اور جو ایسوسی ایشن کے باقاعدہ ممبر ہیں۔

ان میں ناول نویس بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی جو اسٹنٹ فلموں کے ڈائیلاگ لکھ کر اپنا گزارہ کرتے ہیں۔

ان میں "صاحب دیوان" شاعر اور کوی بھی ہیں جو پیٹ پالنے کے لئے میوزک ڈائرکٹروں کی دھنوں پر تک بندی کرتے ہیں۔ (بقول ایک شاعر کے "کفن موجود ہے اس سائز کا مردہ لے آیئے۔")

ان میں وہ "اسکرین پلے رائٹر" بھی ہیں جو ہفتہ بھر میں ولایتی تصویر یا ناول کو ہندوستانی کپڑے پہنا دیتے ہیں۔

اور ان ہی میں وہ چند سر پھرے بھی ہیں جو تجارتی فارمولوں سے تنگ آکر اپنے پیٹ پر خود لات مار کر اپنی ان کہانیوں کو فلمانے کی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں جن کو ہر بیوپاری پروڈیوسر REJECT کر چکا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ان کہانیوں میں زندگی کی (اور اکثر ان کی اپنی زندگی کی) سچائی ہے۔ جیتے جاگتے، جانے بوجھے کردار ہیں۔ جو تجارتی فلموں کی دنیا میں نہیں ملتے اور جن میں انسان کی اندرونی زندگی کے کسی نفسیاتی یا سماجی پہلو کو فن کارانہ خوبصورتی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔

ایسا ہی ایک سر پھرا ادیب نرمل تھا۔

اس کا خیال تھا کہ سینما سیمنٹ اور فولاد کی طرح ایک انڈسٹری نہیں ہے، بلکہ ایک آرٹ ہے جس کا مقصد گانوں اور ناچوں اور سستے جذباتی مناظر سے لبھا کر عوام کی جیب سے پیسے نکالنا نہیں ہے بلکہ ان کے احساس کو جگانا ہے۔ ان کے دماغوں کو جھنجھوڑنا ہے۔ ان کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی جھلک دکھانی ہے تاکہ انہیں اپنی موجودہ زندگی کی بے انصافیوں، محرومیوں، حماقتوں اور وہموں سے نفرت ہو جائے۔

اس کا خیال تھا کہ سینما نہ ناول ہے نہ افسانہ، نہ تھیٹر کا ڈرامہ ہے نہ ڈائیلاگ رائٹر کی لفاظی ہے، بلکہ سینما ایک علیحدہ آرٹ ہے، ایک فن ہے۔ جو دوسرے فنون لطیفہ کے مقابلے میں بہت نو عمر ہے۔ مگر جس میں موجودہ صنعتی دور کی سی تیزی، تیز رفتاری اور طراری ہے، اور جو کیمرے کے جادو سے انسانی زندگی، نفسیات اور کردار کے ان پیچیدہ اور تاریک کونوں کو روشن کر سکتا ہے جو اور کسی آرٹ کی پہنچ سے باہر ہیں۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا اور مانتا تھا کہ ان امکانات کو ممکن بنانے کے لئے بہت سے لوگوں کو بہت محنت کرنی پڑے گی۔ بہت سے خطرے مول لینے پڑیں گے۔ بہت سی قربانیاں دینی پڑیں گی۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس فن کی ترقی کے لئے

سب سے پہلے اُسے اپنی جان کی بھینٹ چڑھانی ہوگی۔

جب وہ دہلی سے بمبئی آیا تھا تو اوروں کی طرح اُس کو ہر پروڈیوسر کے گھر کی گھنٹی نہیں بجانی پڑتی تھی۔ اُس کا ایک ناول اور درجنوں افسانے شائع ہو کر کافی مقبول نہیں تو کافی مشہور ہو چکے تھے۔ نقادوں کا خیال تھا کہ ادب کے آسمان پر ایک نیا ستارہ چمکا ہے۔

لیکن پبلشر کے حساب سے مُطابق "نئی دھرتی نیا آکاش"۔ ناول کی صرف ایک ہزار کاپیاں شائع ہوئی تھیں۔ تین سو روپے رائلٹی کے ملے تھے، رہے افسانے تو اُردو ہندی کے رسالے پچیس روپے سے لے کر پچاس روپے تک معاوضہ دیتے تھے اور وہ سال بھر میں دس بارہ افسانوں سے زیادہ نہیں لکھتا تھا، نہ لکھ سکتا تھا۔!

سو ایک دن اُس کو کہنا پڑا۔ "ہم نے یہ مانا رہیں دلّی میں پر کھائیں گے کیا؟" اور بمبئی کے لئے بوریا بستر باندھنا پڑا۔

بمبئی آکر (جیسا اُس کا خیال تھا) اُس کو فٹ پاتھ پر نہ سونا پڑا، نہ بھوکا رہنا پڑا۔ نہ ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو کے چکر لگانے پڑے۔ نہ پروڈیوسروں، ڈائرکٹروں، فلم اسٹاروں کی خوشامد کرنی پڑی۔ اُس سے پہلے ہی اُس کی شہرت بمبئی پہنچ چکی تھی۔ جہاں بھی گیا اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کافی آؤ بھگت ہوئی۔ نئی دھرتی نیا آکاش"۔ ناول کے بارے میں تو لوگوں نے کہا کہ یہ "لٹریری کلاسیک" ہے لیکن اُس کو فلمانے کی ہمت اُن میں نہیں ہے۔ لیکن ہفتہ بھر میں ایک کہانی بک گئی۔ اسکرین پلے اور ڈائیلاگ کا کنٹراکٹ ہوگیا۔ ایک ہزار روپے پیشگی مل گئے۔ اتنی رقم تو نرمل نے ساری عمر میں نہیں دیکھی تھی۔ اُس نے حساب لگایا کہ کم سے کم تین ناول لکھنے پر اتنی رائلٹی مل سکتی ہے۔!

اسکرین پلے مکالموں پر سال بھر تک محنت کرنی پڑی اور بہت جلد نرمل کو معلوم ہوگیا کہ پروڈیوسروں کو صرف اُس کی کہانی کا بُنیادی ڈھانچہ چاہئے تھا۔ اُس کا نام چاہئے تھا۔ باقی تو وہ اپنی پسند کا "مال مسالہ" بھرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے یہ کام خود اُس کے قلم سے کرایا تھا۔ اپنی کہانی کا خون اُس نے خود کیا تھا۔ اپنے کرداروں کا گلا اُس نے خود گھونٹا تھا۔ لیکن پھانسی ریشم کی رسّی کی تھی۔

مگر فلم — جس کی کہانی پر اُس کا نام تھا۔ مگر جو واقعی اُس کی کہانی نہیں تھی۔ کامیاب ہوگئی۔

اگلا کنٹریکٹ بیس ہزار روپے کا ہوا۔

جب یہ کہانی فلم کے پردے پر آئی تو نرمل کے لئے پہچاننا مشکل ہو گیا کہ اُسی کی لکھی ہوئی ہے۔

ہر سال اُس کی کہانی اُس کے مکالموں کی قیمت بڑھتی گئی۔

ہر سال اُن کا فنی معیار گرتا گیا۔

مگر اس عرصہ میں نرمل کے پاس ایک فلیٹ ہوگیا۔ فرنیچر لیا گیا۔ نوکر رکھ لیا۔ ہر مہینے روپیہ گھر بھیجنے لگا۔ ماں باپ خوش ہو گئے کہ بیٹا آخر کار کمائی کرنے لگا ہے۔

مگر نرمل کا من خوش نہیں ہوا۔

ہر بار اپنی کہانی میں جو چیز وہ پیش کرنا چاہتا تھا وہ فلمی بازار کے سمجھوتوں سے ختم ہو جاتی تھی۔ اور اُس کی جگہ وہی ناچ اور گانے، وہی مار دھاڑ، وہی گھٹیا کامیڈی۔ اگر وہ اپنے مکالموں میں بدمذاقی کی نچلی تہ تک نہیں پہنچتا تھا۔ تو ڈائرکٹر یا ایکٹر خود ڈائیلاگ لکھ کر وہ کمی پوری کر دیتے تھے۔

اور یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ یہاں تک کہ نرمل کا فنی ضمیر ہمیشہ کے لئے سو جاتا اور وہ بھی فلم انڈسٹری کی روپیہ کمانے کی مشین کا ایک پُرزہ بن کر رہ جاتا۔ اگر اُس وقت اُس کی ملاقات دُرگا سے نہ ہو جاتی۔

۳

دُرگا!

دُرگا!

درگا!

آدھی رات کے سناٹے میں نرمل کو ہر طرف سے یہی نام گونجتا سُنائی دیتا تھا۔ چھت میں لگے ہوئے پُرانے پنکھے کی گھوں گھوں" کرتی آوازیں۔ پاس سے گزرنے والی ریل کی دھڑ دھڑاہٹ میں — اور اس سے بھی زیادہ زور سے خود اپنے دل کی دھڑکن میں جو سلیپنگ پلز کے اثر سے اب بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور سوتے ہوئے دماغ کو یاد دلا رہا تھا کہ وہ سب سے پہلے کب اور کہاں اور کیسے ملے تھے۔

" فلم فورم " کے زیر اہتمام چیکوسلاویکیہ کی فلموں کا ایک

فیسٹول ہو رہا تھا۔

ترمل شروع سے اس فلم سوسائیٹی کا ممبر تھا اور ہر غیر ملکی اور ہندوستانی آرٹ فلم جو دکھائی جاتی تھی اُس کو دیکھنے باقاعدگی سے جاتا تھا۔ کیونکہ کچھ دیر کے لئے وہ جس تجارتی فلمی ماحول میں ڈوبا ہوا تھا اُس کو بھول جانا چاہتا تھا۔ جب وہ اِن آرٹ فلموں کو دیکھتا تو سینما کے اندھیرے میں اُس کو اتنی ہی خوشی اور تسکین حاصل ہوتی جیسے یہ فلمیں خود اُس نے بنائی ہیں۔ مگر روشنی ہوتے ہی وہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے رات کے اندھیرے میں کھو جاتا۔ کہ کہیں کوئی دیکھ کر پہچان نہ لے کہ "یہ جا رہا ہے ترمل کمار، جس نے "آمیرے سجنا"۔ اور "پریت کی ریت" قسم کی فلمیں لکھی ہیں!"

اور رات کو دیر تک وہ جاگتا رہتا اور سگریٹ کے دھوئیں میں اپنے ناول پر مبنی فلم کی جھلکیاں دیکھتا رہتا۔ اُس نے ایک بات طے کر لی تھی۔ یہ ناول وہ کسی تجارتی پروڈیوسر کو خراب کرنے کے لئے نہیں دے گا۔ اگر کسی باشعور فنکار نے اِس کو نہ پسند کیا تو وہ ایک خود اُس کی فلم بنائے گا۔ چاہے اُس کو ممکن بنانے کے لئے اُس کو دس گھٹیا ناچ گانوں کی تجارتی فلمیں کیوں نہ لکھنی پڑیں۔

ایک رات کو وہ چیکوسلاواکیہ کی ایک مشہور فلم دیکھنے گیا۔ جس میں زیادہ تر فلم میں بس دو کردار تھے، ایک نوجوان نازی فوجی اور ایک چیکوسلواکین کسان عورت۔ جس کا شوہر جنگ میں نازیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

نازی نوجوان جو تقریباً بچہ ہی لگتا ہے۔ اپنے ایک زخمی ساتھی کو چیکوسلواکین بیوہ کی گھوڑا گاڑی میں ڈال کر اُسے ویانا (VIENNA) لے جانا چاہتا ہے۔ راستے بھر وہ اُس عورت کو بندوق دِکھا کر گاڑی چلواتا رہتا ہے اور راستے بھر وہ بیوہ اُس نوجوان نازی کو اپنی کلہاڑی سے مار کر اپنے شوہر کے خون کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔۔۔۔ یہاں تک کہ جب جرمن فوجی کا ساتھی دم توڑ دیتا ہے تو اُس کی لاش کو گاڑی سے اُتار کر پتھروں سے ڈھانپ کر "دفن" کر دیا جاتا ہے۔ اور تب اُس نوجوان بیوہ کو موقع ملتا ہے تو وہ اُس جرمن فوجی پر (جو دراصل پندرہ سولہ برس کا لڑکا ہی ہے جسے زبردستی نازی فوج میں بھرتی کر لیا

گیا تھا) برس پڑتی ہے۔ اُس کو مارتی ہے، پیٹتی ہے۔ نوچتی ہے، کھسوٹتی ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ پاگل ہو گئی ہے۔ وہ ہنس رہی ہے اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اُس کے دل میں بھری ہوئی نفرت، اُس کے من کا سارا زہر، آنسو بن کر نکل گیا ہے۔ رفتہ رفتہ مارنے پیٹنے کی جسمانی قربت اور تعلق اُن دونوں کے درمیان ایک اِنسانی جذبہ بیدار کر دیتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی باہنوں میں لپٹ کر سو جاتے ہیں۔

ترمل اُس نوجوان چیکوسلواکین ایکٹریس کی اداکاری سے بے حد متاثر ہوا۔ فلم ختم ہوئی اور روشنیاں ہوئیں تو ترمل رومال سے چشمہ صاف کرنے کے بہانے سے اپنی آنکھیں پونچھ رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ اُس کے قریب ایک خوبصورت سی مگر سنجیدہ سی لڑکی بھی۔ (جو اندھیرا ہونے کے بعد آکر بیٹھ گئی ہو گی) اپنی ساڑھی کے پلّو سے آنسو پونچھ رہی ہے۔

اِتنا سنجیدہ اور غمناک فلم دیکھنے کے بعد بھی اُس لڑکی کو دیکھ کر ترمل کو ہنسی آ گئی۔

لڑکی جوان تھی، بچی نہیں تھی۔ لیکن اُس کا قد (جو چھ فٹ ایک انچ لمبے ترمل کے برابر بیٹھے ہوئے اور بھی مختصر لگتا تھا) اِتنا چھوٹا تھا کہ سینما کی کرسی پر بیٹھ کر اُس کے پیر زمین پر نہیں ٹک سکتے تھے۔ اور اب وہ بچوں کی طرح کرسی سے اُتر کر اپنے چپل تلاش کر رہی تھی۔

ترمل نے ہنستے سُن کر لڑکی نے کسی قدر خفگی بھری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور اِتنا لمبا تڑنگا آدمی دیکھ کر دیکھتی ہی رہ گئی۔

ترمل جلدی سے سینما سے باہر نکل آیا اور حسبِ معمول بھیڑ سے کتراتا ہوا ٹیکسی اِسٹینڈ کی طرف لپکا۔

وہاں کوئی ٹیکسی نہیں تھی۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ایک ٹیکسی آتی ہوئی دِکھائی دی۔ ترمل نے آواز دی "ٹیکسی"!

لیکن ساتھ ہی ایک زنانہ آواز بھی بلند ہوئی۔ "ٹیکسی"۔

ٹیکسی آکر رُکی تو ایک طرف سے ترمل نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف سے ایک لڑکی نے ۔ اُسی چھوٹے سے

قد کی لڑکی نے۔

نرمل لڑکیوں سے جھینپتا تھا، شرماتا تھا۔ کتراتا تھا۔

اُس نے کہا۔ "آپ لے لیجیئے" اور پیچھے ہٹ گیا۔

لڑکی ٹیکسی میں بیٹھ گئی تو لڑکی نے ادھر اُدھر نگاہ کی اور جب کوئی دوسری ٹیکسی نہیں نظر آئی تو پُوچھا۔ "آپ کہاں جائینگے؟"

"کھار" نرمل نے جواب دیا۔

"مجھے تو صرف دادر تک ہی جانا ہے" لڑکی نے کہا اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے ڈرائیور کی برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ چاہیں تو آپ بھی آجائیے۔ میں دادر اُتر جاؤں گی۔ اُس کے بعد آپ آگے لے جائیے گا۔"

نرمل نے سُنا تھا، بمبئی میں اِس طرح ٹیکسی میں ساتھ بٹھا کر لڑکیاں انجانے مردوں کو بلیک میل کرتی ہیں۔ سو وہ کسی قدر جھجکا۔ اگرچہ ڈرائیور کے پاس بیٹھنے میں کچھ زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس پیشکش کو قبول کرے یا نہ کرے کہ اتنی دیر میں ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "بابو جی، آیئے نا۔ میرا بھی بھلا ہو جائے گا۔ مجھے بھی اُدھر اندھیری ہی جانا ہے۔"

سو نرمل ڈرائیور کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹیکسی چل پڑی۔

وہ نہایت شریفانہ طریقے سے آگے کو ہو کر بیٹھا تھا اور آگے ہی دیکھ رہا تھا۔ صرف کبھی کبھی کن انکھیوں سے ڈرائیور کے سامنے لگے ہوئے آئینے میں ایک کتابی چہرے کی جھلک دیکھ لیتا تھا۔ جس پر سڑک کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

مگر اُس کے کان میں لڑکی کی آواز آئی۔ "آپ کو پکچر کیسی لگی ہے؟"

اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ لڑکی سیٹ کے اگلے سرے پر بیٹھی تھی اور اُس کی ٹانگیں مشکل سے ٹیکسی کے فرش کو لگ رہی تھیں۔ جواب دیتے وقت وہ آپ سے آپ مسکرا دیا۔ "تصویر تو واقعی ماسٹر پیس ہے مگر اُس لڑکی نے کمال کر دیا۔ افسوس ہے کہ ہمارے مُلک میں ایسی ایکٹریسز نہیں ہیں۔"

لڑکی کے جواب دینے کے انداز میں ایک للکار تھی۔ "آپ کو کیسے معلوم کہ ایسی ایکٹریسز نہیں ہیں۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا کام کرنے والی کوئی فلمسٹار نہیں ہے۔ کیا ہمارے ڈائرکٹروں نے کوشش کی ہے اچھی ایکٹریسز کو تلاش کرنے کی۔ وہ تو صرف چینی کی گڑیاں پیش کرتے رہتے ہیں۔"

نرمل نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" اور سوچنے لگا کہ یہ چھوٹی سی لڑکی باتیں تو دلچسپ کرتی ہے۔

لڑکی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور ایک بات یہ بھی ہے کہ کہانی ہی ڈھنگ کی نہ ہو تو ایکٹریسز بیچاری کیا کر سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں کتنے اچھّے ناول لکھے گئے ہیں مگر مجال ہے جو ہمارے پروڈیوسروں نے اُن میں سے ایک کو بھی فلمانے کی جُرأت کی ہو۔"

"لڑکی پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔" نرمل نے سوچا اور پھر پُوچھا۔ کسی ایک ناول کا تو نام بتایئے جو فلم بنانے کے قابل ہے؟"

"کئی نام بتا سکتی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔ مگر سب سے زیادہ تو مجھے "نئی دھرتی نیا آکاش" پسند ہے۔" اپنے ناول کا نام سُن کر نرمل کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ لڑکی بولتی گئی۔ "اگر اُس کو ایمانداری سے بنایا جائے تو جو فلم ہم دیکھ کر آئے ہیں اس پائے کی فلم بن سکتی ہے۔"

"ایمان داری سے بنانے سے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

اُس نے پُوچھا اور سوچا نہ جانے میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے۔

"مطلب یہ ہے کہ پروڈیوسر اپنے فارمولے لگا کر ناول کا ستیاناس نہ کر دیں جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"جیسے ۔ ؟" نرمل نے پُوچھا۔

"جیسے اُس ناول کا لیکھک بے ایمانی سے اپنی کہانیوں کو تجارتی ڈھرّے پر لے آیا ہے۔ سچ کہتی ہوں، میرا جی چاہتا ہے کہ وہ نرمل کمار کہیں مل جائے تو اُس کا مُنہ نوچ لوں۔"

نرمل بے اختیار گھبرا کر پیچھے کو ہو گیا۔ مگر اُس نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا کہ اندھیرے میں لڑکی نے اُس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ نہ دیکھا تھا۔

ٹیکسی اب دادر کے علاقے میں پہنچ گئی تھی۔ ایک چال کے پاس لڑکی نے ڈرائیور سے کہا۔ "یہاں روک دو بھائی۔ میٹر کتنا ہوا؟"

نرمل نے کہا۔ "رہنے دیجیے۔ میں تو آگے جا ہی رہا ہوں۔"

مگر لڑکی نے کسی قدر سختی سے کہا۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ دادر تک کا کرایہ میں دوں گی۔"

ڈرائیور نے قصّہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے جی، پانچ

روپے اسّی پیسے دید یجئے۔" اور یہ کہہ کر اُس نے میٹر کو اُٹھا کر گھنٹی بجائی اور پھر گرا دیا۔

نرمل پچھلی سیٹ پر جانے کے بہانے سے اُتر آیا اور کن انکھیوں سے چال کو دیکھنے لگا۔ کہ شاید کبھی اِس پتے پر آنے کی ضرورت پیش آئے۔

لڑکی نے خود ہی کہہ دیا "اُس چال کا نام ہے سونا والا چال۔ ہم دوسرے مالے پر رہتے ہیں۔"

"اچھا جی نمستے۔"

"نمستے۔"

ٹیکسی چل پڑی۔ لڑکی نے مُڑ کر آواز دی "ذرا ٹھہریئے۔"

ٹیکسی رُک گئی۔

"اپنا نام تو بتاتے جایئے۔"

نرمل ایک پل کے لئے جھجکا۔ پھر بولا "میں نرمل کمار ہوں۔"

اب اُس لڑکی کی باری تھی حیران ہونے کی۔

"نئی دھرتی نیا آکاش والے" نرمل ——؟"

"جی ہاں وہی۔ اور آپ کا نام —؟"

اب ٹیکسی پھر چل پڑی تھی۔ لیکن لڑکی کی آواز آئی۔

"دُرگا۔"

اور اب ٹیکسی ڈرائیور نے نرمل سے ہنس کر کہا۔ "قد چھوٹا ہے۔ مگر چھوکری بُری نہیں ہے۔"

نرمل کو ڈرائیور کی بے تکلفی بُری لگی۔ مگر ایسے لوگوں کا کوئی کیا کر سکتا ہے۔ خصوصاً جب ڈرائیونگ وھیل اُن کے ہاتھ میں ہو، پھر بھی اُس نے اپنے لہجے سے اُسے ڈانٹا۔ "جی؟"

مگر ڈرائیور کا مُنہ کون بند کر سکتا ہے، "کیوں بابوجی، آپ وہی نرمل کمار ہیں جو فلم کی اِسٹوری لکھتا ہے۔؟"

"جی ہاں۔ ہوں تو وہی۔"

"بابوجی، مجھے آپ کی پچھلی فلم "آمیرے سجنا" بہت اچھی لگی۔ کیا فسٹ کلاس گانے ہیں۔ اور وہ پتنگ ڈانس تو واہ واہ۔!"

مگر اُس وقت نرمل ڈرائیور کی باتیں نہیں سُن رہا تھا۔ اُس کے کان ایک نئی لے، ایک نیا سنگیت، ایک نئی دُھن سے گونج رہے تھے۔

"دُرگا!"

"دُرگا!"

"دُرگا!"

۴

دوسری بار نرمل اور دُرگا پھر "فلم فورم" کے شو میں ملے۔

نرمل نے سوچا۔ یہ تو گھٹیا رومانی فلم کا سینیریو بنتا جا رہا ہے۔ میں تو اُصولاً "BOY MEETS GIRL" (لڑکا لڑکی سے ملتا ہے) قسم کی حادثاتی رُومانٹک کہانیوں کے خلاف ہوں حالاں کہ ہر فلم میں ایسے ہی سین لکھنے پڑتے ہیں کبھی امیر لڑکی کی موٹر بگڑ جاتی ہے۔ غریب لڑکا گیرج کا میکانک ہے، فوراً کار ٹھیک کر دیتا ہے۔ یا لڑکا زمیندار کا بیٹا ہے۔ موٹر میں گاؤں دیکھنے جا رہا ہے۔ لڑکی گاؤں کی گوری ہے، گھڑا لے کر پانی بھرنے جا رہی ہے۔ موٹر کی آواز سے گھبرا کر بھاگتی ہے۔ گھڑا گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ لڑکا اُس کے پیچھے کار بھگاتا ہے، وہ پتھر مار کر کار کا شیشہ توڑ دیتی ہے، دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ پھر اُن کا پیار کرنا تو لازمی ہوا، یا لڑکا لڑکی دونوں متوسّط درجے کے ہیں، دونوں سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ برابر کی سیٹوں پر بیٹھتے ہیں۔ لڑکا چھ فٹ ایک انچ لمبا ہے۔ لڑکی چھوٹی سی ہے۔ سینما ختم ہونے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ لڑکا بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ لڑکی کھسیا جاتی ہے۔ پھر ٹیکسی اسٹینڈ پر ملاقات ہوتی ہے۔ ٹیکسی ایک ہی ہے، دونوں اُس کو لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر دونوں ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتے ہیں۔ راستے میں فلم کے بارے میں باتیں ہوتی ہیں۔ لڑکا ایک ناول نویس ہے۔ اُس نے ایک بہت اچھا ناول لکھا ہے۔ مگر اب تجارتی فلموں کے لئے کہانی ڈائیلاگ وغیرہ لکھتا ہے۔ لڑکی ناول کی تعریف کرتی ہے۔ ناولسٹ کی بُرائی کہ اپنے قلم کو اُس نے بیچ ڈالا ہے۔ جب لڑکا نام بتاتا ہے، تو لڑکی حیران و پریشان رہ جاتی ہے اور ....

پھر دوبارہ سینما میں اُن کی مُلاقات ہوتی ہے؟ ارے یہ تو اُس کی اپنی آپ بیتی ہے۔ کیا زندگی میں بھی ایسے دلچسپ واقعات ہوتے ہیں۔؟ ہاں تو پھر کیا ہوا؟ اِس بار اُسے سینریو لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ زندگی، وقت، قسمت، بھگوان یا کارل مارکس سینریو لکھ رہا تھا۔ وہ دونوں تو اِس فلم میں صرف اداکاری کر رہے تھے، جو کچھ سکرپٹ میں لکھا تھا وہ کرتے جا رہے تھے۔

وقت گزرتا گیا اور لکھنے والے نے یہ دکھانے کے لئے کہ وقت گزرتا جا رہا ہے اور دو انجانے ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ اُس کا مونتاژ کچھ اِس طرح بنایا تھا ۔۔۔

دوبارہ وہ "فلم فورم" کے شو میں ملے۔ ایک دوسرے کو پہچانا۔ مگر اُن کی سیٹیں پاس پاس نہیں تھیں۔ انٹرول میں مُلاقات ہوئی، مگر بھیڑ اتنی زیادہ تھی اور ہر شخص بیک وقت بول رہا تھا کہ بات نہ ہو سکی۔ نرمل نے آلو کے ویفروں کا ایک پیکٹ دُرگا کی طرف بڑھایا۔ اُس نے کچھ کہہ کر لے لیا جو سُنائی نہیں دیا۔ مگر مُسکراہٹ سے معلوم ہوتا تھا۔ "تھینک یو" کہا ہوگا۔

پھر شو ختم ہونے کے بعد ٹیکسی اسٹینڈ پر مُلاقات ہوئی۔ مگر آج ٹیکسی نہیں تھی اور نہ دُرگا کا ارادہ ٹیکسی لینے کا تھا۔ اُس نے صاف کہہ دیا کہ میری پرس میں آج اتنے پیسے ہی نہیں ہیں اور جب نرمل نے کہا۔ میں آپ کو ٹیکسی میں پہنچا دوں گا تو اُس نے کہا کہ معاف کیجئے گا۔ میں انجانے لوگوں کے ساتھ رات کو ٹیکسی میں نہیں جاتی۔

"تو آیئے، جان کاری بڑھانے کے لئے سامنے والے ریستوران میں چائے پی لیں۔ پھر میرین لائنز اسٹیشن سے ٹرین لے لیں گے۔"

"چلیئے۔" دُرگا نے کہا۔

مگر دونوں کا ساتھ چلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ چھ فٹ ایک انچ کا نرمل لمبے لمبے قدم لیتا تھا۔ چھوٹی سی دُرگا کو اُس کا ساتھ دینے کے لئے بھاگ کر چلنا پڑتا تھا۔

یہ دیکھ کر نرمل ٹھہر گیا۔ "معاف کیجئے گا۔ میں بہت لمبے لمبے قدم لیتا ہوں نا؟"

"دُرگا کا سانس پھُول رہا تھا۔ پھر بھی اُس نے اُوپر نظر کر کے مُسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے آپ جیسے لمبے قد کے آدمی کے ساتھ چلنا عجیب لگتا ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کہے گا۔ ایک اچھے خاصے آدمی کے ساتھ ایک پستہ قد بونی جا رہی ہے۔"

"عجیب تو مجھے محسوس کرنا چاہیئے۔ کوئی دیکھے گا تو کہے گا 'ایک شریف لڑکی کے ساتھ کوئی رکھشش چلا جا رہا ہے۔"

پھر وہ دونوں ہنس پڑے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر۔ نرمل کو نیچے دیکھنا پڑا۔ دُرگا کو اُوپر دیکھنا پڑا۔ مگر اِس ہنسی نے اُن کے درمیان جو جھجک اور تکلّف کے پردے تھے وہ ہٹا دیئے۔

اُس وقت سے وہ دوست ہو گئے۔

اگلے سین میں وہ کئی دن کے بعد ایک پارک میں بینچ پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

"دُرگا۔ کیا تم نے کبھی فلم میں کام کرنے کے بارے میں سوچا ہے۔؟"

"سچ سچ بتاؤں؟"

"اگر تم مجھے اِس کے قابل سمجھتی ہو۔"

"میں بمبئی اِس ارادے سے آئی تھی۔ ماں باپ کو بھی راضی کر لیا تھا کہ بی اے کرنے کے بعد ٹیچری کرنے کی بجائے فلم میں کام کروں۔"

"تو تم بی اے ہو۔ کس مضمون میں؟"

"سائیکالوجی میں۔"

"فلم انسٹی ٹیوٹ کے ایکٹنگ کورس میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟"

"سچ سچ بتاؤں؟"

"بتاؤ۔"

"میرے پتا سرکاری نوکری سے اِسی سال ریٹائر ہوئے ہیں۔ میری پڑھائی پر اب ڈھائی سو ماہوار نہیں خرچ کر سکتے۔ اِس کے علاوہ میں چوبیس برس کی ہو گئی ہوں۔"

"چوبیس برس؟ تم تو سولہ سترہ برس کی لگتی ہو۔!"

"لگتی ہوں ۔۔۔ اپنے قد کی وجہ سے۔ لیکن دو برس میں چھبیس برس کی ہو جاؤں گی۔ پھر شاید مجھے کوئی لے گا ہی نہیں۔"

"پھر کیا کیا۔؟"

یہاں آ کر کتنے پروڈیوسروں، ڈائرکٹروں سے ملی۔ ایک فنانسر سے بھی مُلاقات ہوئی۔ وہ کہتے ہیں اتنے چھوٹے قد کی لڑکی ہیروئن نہیں بن سکتی۔"

"کیوں نہیں بن سکتی۔ میں کتنی ہی ہیروئنوں کے نام بتا سکتا ہوں۔ دیویکا رانی ہی کو دیکھ لیجئے۔"

"میں نے صرف یہ بتایا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ سب سائڈ رول آفر کرتے ہیں۔ ہیروئن کی سہیلی، ہیروئن کی بہن قسم کے ۔۔۔ مگر ایک شرط پر۔"

"وہ کیا۔"

"وہ آپ جانتے ہیں۔"

"اوہ۔ اور وہ تمہیں منظور نہیں ہے۔"

"نہیں۔ اس لئے اب میں نے فلموں کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے، اب لائبریرین کا ڈپلومہ لے رہی ہوں۔ چھ مہینے بعد کسی لائبریری میں کام مل جائے گا۔"

"مگر لائبریرین کی ناک پر تو عینک لگی ہونی چاہیئے۔"

"وہ میری ناک پر بھی لگ جائے گی۔ یہ دیکھو۔"

اور اُس نے اپنی پرس سے ایک عینک نکال کر لگا لی۔"

"پڑھنے کے لئے لگانی پڑتی ہے۔ اب تو میں بچی نہیں لگتی۔"

"اب تم ایک بچی لگتی ہو جس نے بچوں کے ڈرامے کے لئے اپنے پتا کا چشمہ لگا لیا ہو۔"

اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ یہ ہنسی بہت خطرناک ہے (نرمل اکثر سوچتا تھا) یہ ایک دن ہمیں بہت خطرناک حد تک ایک دوسرے کے قریب لے آئے گی۔

۵

وقت گزرتا گیا۔

موتاژ میں نئے ٹکڑے آکر جڑتے رہے۔ جیسے وہ سین جس دن نرمل نے اپنی زندگی —— اور —— موت کا فیصلہ کیا اور "نئی دھرتی نئے آکاش" نام کے فلم کی مہورت ہوئی۔

یہ مہورت (جیسے اور مہورتیں ہوتی ہیں) کسی اسٹوڈیو میں نہیں ہوئی۔

اس مہورت میں اُن لوگوں کو نہیں بلایا گیا تھا —— فنانسرز، پروڈیوسرز، ڈائرکٹرز، فلم اسٹار اور چھوٹے موٹے ایکٹر —— جن کو ملا کر "فلم انڈسٹری" کہا جاتا ہے۔

نہ اتنے بڑے "مہورت کارڈ" بٹے تھے جو سردی میں لحاف کا کام دے سکتے ہیں۔ اور جن کے لفافوں میں میلے کپڑے رکھ کر لانڈری میں بھیجے جا سکتے ہیں۔

اس مہورت کے لئے نہ کوئی منسٹر بلایا گیا نہ کوئی سیاسی لیڈر۔ نہ کسی فلم اسٹار سے کلیپ دلوایا گیا نہ کسی فنانسر سے کیمرہ چلوایا گیا۔

نہ لڈو بٹے نہ پیڑے۔ نہ ٹھنڈی چائے اور گرم کوکا کولا مہمانوں کو پیش کیا گیا۔

پھر بھی یہ ایک اہم فلم کی تاریخی مہورت تھی۔ اس فلم کو آگے چل کر پریسیڈنٹ گولڈ میڈل ملنے والا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن کو ملک کی بہترین ایکٹریس کا "اُروشی ایوارڈ" ملنے والا تھا۔ اس فلم کا پروڈیوسر رائٹر، ڈائرکٹر، ایکٹر GENIUS کہلایا جانے والا تھا۔ مگر اس فلم کو کبھی کسی سینما میں نہیں دکھایا جائے گا۔ اس فلم کو بنانے میں نرمل کمار کی سب بچت لگ جائے گی۔ اُس کا سارا فرنیچر بک جائے گا۔ فلیٹ کو چھ ہزار پگڑی پر دیکر فلم نگیٹو کے بارہ ڈبے خریدے جائیں گے اور خود نرمل ایک ٹین کی چھت جھونپڑے میں اپنی دو ڈھائی سو کتابوں سمیت رہنے لگے گا۔ اس اُمید کے ساتھ کہ جب ہماری فلم چل جائے گی تو ہم پرانے فلیٹ سے بھی اچھا گھر کرائے پر لے لیں گے۔" اور اس فلم کے لئے سیٹھ موتی چند بھائی سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ قرض لینا پڑے گا۔ جو دو برس میں سود در سود ملا کر تین لاکھ روپیہ ہو جائے گا۔ اور وہ ہنڈیوں کی بناء پر مقدمہ کرکے نرمل کے خلاف ڈگری لے لے گا، اور علاوہ اور چیزوں کے تین تولے کا پریسیڈنٹ گولڈ میڈل بھی قرقی کرا کے لے جائے گا۔ اور نرمل کے پاس صرف فلم کے نگیٹو کے تیرہ ڈبے رہ جائیں گے۔

لیکن یہ سب تو مستقبل میں ہونے والا تھا جس کے بارے میں اُن دو افراد کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ جنہوں نے "نئی دھرتی نیا آکاش" کی مہورت میں شرکت کی تھی۔

ایک تھا نرمل۔

ایک تھی درگا۔

جگہ تھی نرمل کی دو کمروں کی چھوٹی سی فلیٹ جہاں آج درگا پہلی بار آئی تھی۔ اس فلیٹ کو نرمل نے بڑے چاؤ اور بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔ تصویریں۔ ٹیبل لیمپ کا ٹراشیڈ جس پر مہورتوں کے دعوتی کارڈ، نئے سال کی مبارکباد کے کارڈ، اور اخباروں کے تراشے اور تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

لمبی نیچی کافی ٹیبل جو اخباروں، رسالوں، کتابوں کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی چاروں طرف دیوار سے لگی ہوئی الماریاں تھیں۔ جن میں کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

"بڑا اوٹ پٹانگ کمرہ ہے میرا۔ تمہیں تو کیا پسند آئے گا!" درگا نے ادھر اُدھر دیکھا پھر کتابوں کی مخصوص بو یا خوشبو

کو ناک سکوڑ کر سونگھا۔ پھر بولی۔ "نہیں مجھے تو یہ کمرہ بہت اچھا لگتا ہے۔"

پھر وہ کتابوں کی الماری کے پاس گئی۔ ادھر اُدھر سے کتابیں نکال کر دیکھنے لگی۔ ایک پتلی سی کتاب نکالی اور کہنے لگی۔ آپ نے اس ناول کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ سب سے پہلے آپ کو اس کا فلم بنانا چاہئے تھا۔"

"نئی دھرتی نیا آکاش؟ جتنے پروڈیوسروں نے پڑھا ہے، سب کہتے ہیں یہ بہت بلکہ عظیم ناول ہے مگر اس کو فلمایا نہیں جا سکتا۔"

"اور آپ کیا کہتے ہیں؟"

"میں نے تو بہت دنوں سے اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔"

"اب سوچ لیجئے۔ بہت وقت پڑا ہے۔"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد نرمل نے کہا، درگا کی نقل کرتے ہوئے۔

"سچ سچ بتا دوں؟"

اور درگا نے مسکرا کر نرمل کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔"

"تو سنئے۔ اس ناول میں وہ سب ہے جس کو ایک ذہین، حساس اور قابل ڈائرکٹر ایک خوبصورت فلم میں ڈھال سکتا ہے۔"

"کیا ایسا کوئی ڈائرکٹر ہے آپ کی نظر میں؟"

نرمل جو بے چینی سے اپنی لمبی ٹانگوں کو ہلاتا ادھر اُدھر پھر رہا تھا۔ دیوار پر لگے ہوئے آئینے کے سامنے ٹھہرا اور بولا۔ "ہے نظر میں۔"

"اور وہ کون ہے؟"

"سچ سچ بتا دوں۔"

"بتایئے نا۔"

"وہ میں خود ہوں۔ عام طور سے میں اس قسم کے دعوے کرنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ میں بڑا خاکسار قسم کا آدمی ہوں۔ مگر نہ جانے کیوں آپ کے سامنے خاکساری جتانے کو جی نہیں چاہتا۔ سچ بولنے کو جی چاہتا ہے۔"

"شکریہ کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب تو نہ ہو گا کہ میں بھی ایسا ہی سمجھتی ہوں۔؟"

"شکریہ، مگر ہم دو کے ایسا سوچنے سے کیا ہو سکتا ہے؟"

"کیا نہیں ہو سکتا؟ ایک ہمت والے آدمی کے سوچنے سے بہت کچھ ہو سکتا ہے؟ اور پھر ہم تو دو ہیں۔"

"آپ میرا ساتھ دیں گی؟"

"ایک شرط پر۔"

"منظور ہے۔"

"کہو کہ تم میرا ساتھ دو گی؟"

"تم میرا ساتھ دو گی؟"

"ضرور۔ جب سے میں نے یہ ناول پڑھا تھا، اُس وقت سے اُس کے فلمی امکانات پر غور کر رہی ہوں۔ اور اُس دن کا انتظار کر رہی ہوں جب اُس کے جیتے جاگتے کردار سکرین پر نمودار ہوں گے۔"

"تم اس میں میری کیا مدد کر سکتی ہو؟"

"درگا نے نرمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ایک لفظ کو بڑے یقین کے ساتھ ادا کر کے کہا۔ "اس فلم کے لئے میں ہر ممکن اور ناممکن بات کر سکتی ہوں۔ مگر سب سے پہلے میں اس فلم کی نوراں بن سکتی ہوں۔۔۔ اگر آپ کو — میرا مطلب ہے، تم کو — کوئی اعتراض نہ ہو۔ دیکھا آپ نے خاکساری جتانے کی بجائے میرا جی بھی سچ بولنے کو چاہتا ہے۔"

"درگا! نوراں! درگا! نوراں! درگا! نوراں!

نرمل کے دماغ کے پردے پر یہ دو تصویریں ایک کے بعد ایک جھلکتی رہیں — درگا! نوراں! درگا! نوراں! — ایک جو ناول نگار کے دماغ کی تخلیق تھی، دوسری جو گوشت پوست کی جیتی جاگتی نوجوان عورت تھی — یہاں تک یہ دو تصویریں ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔ اور آخر کو ایک ہو گئیں۔

نوراں کے بارے میں نرمل نے لکھا تھا "نوراں عورت نہیں تھی۔ مگر نوراں بچی بھی نہیں تھی۔ نوراں کی آواز میں پھولوں کی سی نرمی تھی۔ مگر اُس کے انداز میں فولاد بھی تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کتنے برس کی ہے۔ شاید وہ سولہ سترہ سال کی ہی تھی جیسی کہ وہ لگتی تھی۔ لیکن کم عمری ہی میں زندگی نے اُس کو اتنے تلخ سبق سکھائے تھے کہ اُس کی عقل اور سوجھ بوجھ بڑی بوڑھیوں سے زیادہ تھی۔ نوراں ایک حسین و دل فریب محبوبہ تھی۔ نوراں ایک ذہین دماغ تھی۔ بظاہر وہ ایک نازک سی چھوٹی سی لڑکی تھی، مگر بنیادی طور سے نوراں ایک مکمل عورت تھی جو دنیا کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور جس کی کوکھ سے دنیا جنم لیتی ہے۔"

واقعی (اور یہ حقیقت نرمل کے ذہن پر اس طرح آشکار ہوئی تھی جیسے بجلی کی چمک اندھیرے کا سینہ چیر کر ایک لمحے کے لئے روشنی کر دیتی ہے۔) درگا نوراں بننے کے لئے ہی پیدا ہوئی تھی اور نوراں کا کردار اسی لئے لکھا گیا تھا تاکہ ایک دن درگا اس فلمی خاکے میں زندگی کا رنگ بھر دے۔

آخر کار نرمل بولا۔ "بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ تم ہی نوراں بن سکتی ہو۔ ملاؤ ہاتھ اس بات پر۔"

مگر درگا نے نرمل کے پھیلائے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ نہیں رکھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ اس فلم کو بنانے کے لئے آپ کو بڑی تپسیا کرنی پڑے گی۔ بڑی قربانیاں دینی پڑیں گی؟"

"جانتا ہوں درگا۔ فلم سازی کے تجارتی ماحول سے رشتہ توڑنا پڑے گا۔"

"۔۔۔ سوکھی روٹی اور ٹھنڈے پانی پر گزارہ کرنا پڑے گا؟"

"یہ بھی جانتا ہوں۔"

"۔۔۔ کوئی پیسے والا آپ کی مدد نہیں کرے گا۔؟"

"جانتا ہوں۔"

"۔۔۔ ایسی تجرباتی فلم بنانے والے کو تجارتی فلموں کو لکھنے کا کام ملنا بند ہو جائے گا۔؟"

"جانتا ہوں۔"

"تو ملاؤ ہاتھ۔" درگا نے کہا، اور جب اس کا چھوٹا سا ہاتھ اچھل کر نرمل کے طاقتور پنجے کی طرف بڑھا تو ایسا محسوس ہوا کہ ایک چھوٹی سی چڑیا اڑ کر اپنے گھونسلے میں جا بیٹھی ہے جہاں گرمی ہے اور نرمی ہے۔ اور مکمل حفاظت ہے۔!

"تو پھر مہورت کب کریں؟" نرمل نے ہنس کر پوچھا۔

"ابھی، اسی وقت۔"

"اسی وقت۔؟"

"ہاں اسی وقت۔ اسی جگہ۔"

"مگر کیسے؟"

"مہورت ہوتی کس طرح ہے؟"

"ہیرو یا ہیروئن، یا دونوں کیمرے کے سامنے آتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا سین ایکٹ کرتے ہیں اور اس سے پہلے فلم کا نام لے کر اور مہورت شارٹ ٹیک نمبر ایک کہہ کر کلیپ بورڈ کے دونوں حصّوں کو ایک دوسرے سے کھٹاک سے ملا دیا جاتا ہے، ایسے ہوتی ہے مہورت۔"

"ہمارے فلم کی مہورت بھی ایسے ہی ہوگی۔" یہ کہہ کر درگا نے نرمل کو آرام کرسی پر ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں بیٹھو۔ تم ہو ہیرو۔"

"میں ہیرو؟ میں نے تو کبھی ایکٹ نہیں کیا!"

"وہ تو میں نے بھی کب کیا ہے سوائے کالج کے ڈرامے میں جون آف آرک بننے کے لئے۔"

کالج کے ڈرامے میں تو میں نے بھی محمد بن تغلق کا پارٹ کیا تھا۔"

"بس تو تم ہو گئے ہیرو۔ دیکھو ورنہ میں کام نہیں کروں گی۔"

جب نرمل بیٹھ گیا تو درگا نے کہا۔ اور میں ہوں ہیروئن۔" وہ خود کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی۔ "اب آواز آتی ہے۔" نئی دھرتی نیا آکاش۔" مہورت شارٹ ٹیک نمبر ایک۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تالی بجائی۔ پھر نرمل کی طرف دیکھ کر پورے وشواس کے ساتھ بولی۔ "یہ دھرتی یہ آکاش پرانے ہو چکے ہیں، ہم چین نہیں لیں گے۔ جب تک ایک نئی دھرتی ایک نیا آکاش نہ بنا لیں گے۔ ایک دن ہمارے خواب ضرور پورے ہوں گے۔" یہ فقرہ اس نے ناول کا دہرایا تھا۔

اور یہ کہہ کر ہیروئن نے ہیرو کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ نرمل اس دلفریب لمس سے کچھ بوکھلا سا گیا۔ مگر اس لمحے درگا چمک کر علیحدہ ہو گئی اور زور سے چلائی "کٹ۔۔۔ مہورت مبارک ہو مسٹر نرمل۔"

اور پھر دونوں ہنس پڑے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر دیر تک ہنستے رہے، یہاں تک کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

۶

تین مہینے کے بعد جب فلم چار ریل بن گئی اور اس کا ایک ٹرائل ہوا تو باوجود اس کے کہ ابھی ایڈیٹنگ مکمل نہیں ہوئی تھی اور بیچ میں کتنی ہی جگہ سین ابھی لئے نہیں گئے تھے۔ پھر بھی دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستانی سینما میں ایک انقلاب آگیا ہے۔ نرمل نے ایکٹر اور ڈائرکٹر دونوں حیثیتوں سے

ثابت کر دیا تھا کہ ایک ذہین دماغ اور حسّاس دل کو لمبے چوڑے تجربے کی ضرورت نہیں تھی۔ مشاہدے کی پکڑ مضبوط ہونی چاہئے۔

مگر فلم کی جان تو درگا کی اداکاری تھی۔ ایک غریبوں کی بستی کی الھڑ لڑکی جس کا حسن اور جوانی اس کے میلے کچیلے کپڑوں سے پھوٹ رہی تھی جو بچپن ہی میں یتیم ہو گئی تھی ــــ نہ ماں نہ باپ۔ ــــ مگر تین بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری اُس کے کندھوں پر تھی۔ جو اُن بچوں کی ماں بھی تھی باپ بھی۔ بہن بھی۔ شروع کے سب سین غریبوں کی بستی کے ہی تھے۔ ایسا لگتا تھا یہ فلم نہیں ہے زندگی ہے۔ صرف چپکے سے بغیر کسی کو بتائے ہوئے کسی نے فلم بنا دی ہے۔ مگر یہ نرمل جانتا تھا اور درگا جانتی تھی اور اُن کے ساتھ کام کرنے والے جانتے تھے کہ اس حقیقت اس زندگی کو فنکارانہ سادگی سے پیش کرنے میں کتنی محنت کرنی پڑتی تھی۔ کتنا خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ کیمرہ مین انسٹی ٹیوٹ کا پڑھا ہوا ایک لڑکا تھا اور اُس نے بھی اپنے غیر معمولی زاویوں سے ہاتھ میں کیمرہ لے کر اداکاروں کے ساتھ ساتھ چل کر مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر کھائیوں اور گندے گڑھوں میں لیٹ کر اپنے آرٹ کا مظاہرہ کیا تھا اور اس کالے اور سفید فلم میں زندگی کی اصلیت کا رنگ بھر دیا تھا۔

اُس رات کو ٹرائل دیکھ کر اُن کی پروڈکشن کمپنی کی میٹنگ ایک ایرانی چائے خانے میں ہوئی۔ کیونکہ پروڈکشن منیجر کے اکاؤنٹ کے مطابق آج اُن کی کمپنی ــــ آکاش فلمز ــــ صرف ایک ایک سنگل چائے کا خرچہ برداشت کر سکتی تھی۔

اس کانفرنس میں نرمل اور درگا کے علاوہ کیمرہ مین سدھیر پروڈکشن منیجر ماتھر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر دادر کر شامل تھے۔

نرمل نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ چار ریل تک تو فلم ہم نے بنا پیسے کے بنا لی ــــ "

درگا نے بات کاٹ کر کہا۔ بنا پیسے کے کیسے کہتے ہو؟ تم نے جیب سے چار ہزار روپے جو بینک میں جمع تھے وہ لگا دیئے ــ چھ ہزار میں فلیٹ بیچ ڈالی۔ اپنے دوستوں سے قرض لیا۔ لیباریٹری کا قرضہ دینا ہے۔ کیمرہ والوں کا حساب بھی تمہیں ہی چکانا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" نرمل نے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے ــ ؟"

ماتھر نے کہا۔ کسی فنانسر کو یہ چار ریلیں دکھا کر قرضہ لینا چاہئے۔ اور اُس سے تصویر مکمل کرنی چاہئے ــ"

"ہے کوئی ایسا فنانسر جو تمہارے خیال میں ایسی فلم میں بلا شرط روپیہ لگائے گا ــ ؟"

"مشکل ہے۔" ماتھر نے کہا۔ شرطیں تو رکھے گا۔ کم سے کم چار گانے تو ڈالنے ہوں گے ہیں۔ ایک آدھ باکس آفس آرٹسٹ بھی لینا پڑے گا ــ"

"میں اس فلم میں کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گا۔"

"پھر تو ہمیں روپیہ ملنا مشکل ہے ــ" دادر کر نے کہا۔

اور ماتھر نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ناممکن ــ"

"تو پھر کیا کیا جائے ؟" نرمل نے سوال کیا۔

"کہیں نہ کہیں سے روپیہ تو لینا ہی پڑے گا۔" ماتھر نے کہا۔ "اور فنانسر جو روپیہ لگائے گا وہ کچھ نہ کچھ تو شرطیں رکھے گا ہی۔"

اور نہ جانے کیا سوچتے ہوئے درگا نے آہستہ سے کہا جیسے وہ اپنے آپ سے بات کر رہی ہو۔" لیکن اِن شرطوں کا کوئی اثر "نئی دھرتی نئے آکاش" پر نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ فلم ایسے ہی بنے گی جیسے نرمل صاحب چاہتے ہیں۔"

اوروں کے سامنے درگا "نرمل صاحب" کہتی تھی، مگر جب وہ دونوں گھر جاتے ہوئے ٹرین میں سوار ہوئے ــ پہلے کمپنی اُنہیں فرسٹ کلاس پاس بنوا کر دیتی تھی۔ مگر اب کئی دن سے وہ تھرڈ کلاس ہی میں آنے جانے لگے تھے ــ اور اس وقت رات کو بھیڑ کا وقت تھا۔ دونوں دروازے کے پاس کھڑے تھے۔

"درگا!" نرمل نے جھک کر اُس کے کان میں کہا۔

"کیا کہا؟" درگا نے ریل کی دھڑ دھڑاہٹ کی وجہ سے اونچی آواز میں کہا۔

"درگا! ــ بُرا تو نہ مانو گی؟"

"نہیں ــ کہو۔ میرا کام بہت خراب ہے نا؟"

"ہاں درگا۔ تمہارا کام بہت ــ" اُس نے وقفہ لیا، پھر مسکرایا۔ پھر کہا۔ تمہارا کام بہت بہت، بہت ہی

اچھا ہے۔ مگر دُنیا کو اُس کو دیکھنے کا موقع نہ ملے گا۔"

"کیوں نہیں ملے گا۔؟"

"اِس لئے کہ یہ فلم مکمّل نہیں ہوگی!"

"بس تین مہینے میں ہمّت ہار دی۔ یاد نہیں مہورت شارٹ کے لئے کیا ڈائیلاگ بولا گیا تھا؟"

"کیا بولا گیا تھا؟ مجھے تو اِس وقت کچھ بھی یاد نہیں۔"

"ہمارے خواب ایک دِن ضرور پُورے ہوں گے۔"

اِتنے میں دادر کا اِسٹیشن آگیا۔ دُرگا نے اُترتے اُترتے نرمل کے ہاتھ کو اپنے چھوٹے سے ہاتھ سے چھُوا — کتنی نرمی، کتنی گرمی۔ کتنی دوستی، کتنا پیار، کتنا بھروسہ تھا اُس لمس میں! پھر وہ اُتر گئی اور اسٹیشن کی بھیڑ میں غائب ہوگئی۔

ریل پھر چل دی۔ مگر نرمل دیر تک اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔ جیسے اُس پر دُرگا کے ہاتھ کی چھاپ اب تک موجود ہو!

۵

دو دِن کے بعد دُرگا نرمل کے جھونپڑے نما کمرے میں آئی تو دیکھا ایک پروڈیوسر بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے۔ "نرمل، اب اس بیکار فلم کی ڈائرکشن پروڈکشن کے چکر سے نکلو۔ اور ہماری کہانی لکھنے کا کنٹراکٹ کرلو۔"

"کر ہی لوں گا۔" نرمل نے جواب دیا۔ "تھوڑے دِنوں تک اور اگر میری فلم نہ بن سکی۔"

"فلم کیوں نہیں بنے گی۔" دُرگا نے آتے ہی اِعلان کیا۔ "ضرور بنے گی۔" اور پھر پروڈکشن منیجر سے مخاطب ہوکر جو ایک کونے میں رُوتی شکل بنائے بیٹھا تھا۔ "ماتھر۔ تم اگلی شوٹنگ کا اِنتظام کرو۔"

پروڈیوسر جو ایک پنجابی نوجوان تھا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مسٹر نرمل۔ سوچ لیجئے۔ میں دو دِن اور آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔"

جب وہ چلا گیا تو نرمل نے کہا۔ "تم، بڑی خوش نظر آرہی ہو۔ کیا کہیں سے خزانہ مِل گیا ہے یا بینک لُوٹ کر آئی ہو۔؟"

"یہی سمجھو۔ روپے کا اِنتظام ہوگیا ہے۔ تم بجٹ بناؤ، کتنا چاہیے۔؟"

جھونپڑوں کی شوٹنگ تو ہم نے کرلی،" دُرگا۔ "اب ہمیں اگلے سین لینے کے لئے دو ایک خاص سیٹ بنانے پڑیں گے۔ عالیشان بلڈنگوں میں شوٹنگ کرنی ہوگی۔ اِسٹاف کی تنخواہیں بھی دینی ہونگی۔ اِن سب کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟ کم سے کم ڈیڑھ لاکھ روپیہ چاہیئے تب جاکر ہم اطمینان کے ساتھ جیسی فلم ہم چاہتے ہیں ویسی بنا سکتے ہیں۔"

"فلم ویسی ہی بنے گی۔ ڈیڑھ لاکھ کا اِنتظام ہوگیا ہے۔"

"کون دے گا۔"

"مُول چند بھائی۔"

"وہ کیوں دے گا؟" "ضرور وہ شرطیں لگوائے گا۔ گانے ڈلوائے گا۔ سین بدلوائے گا۔ کہے گا کوئی باکس آفس اِسٹار لو۔"

"نہیں نرمل۔ تمہیں کوئی شرط پُوری کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ بس ہُنڈیاں سائن کرنی ہوں گی۔"

"وہ میں کردوں گا۔ وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔" نرمل نے کہا۔ مگر اُس وقت اُس نے اِس پر غور نہ کیا کہ جب دُرگا نے کہا تھا۔ "تمہیں کوئی شرط پُوری کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔" اور اُس کے لہجے میں لفظ "تمہیں" پر ہلکا سا زور دیا گیا تھا۔

مُولچند بھائی نے ہُنڈیاں سامنے رکھیں۔

"یہ اصل رقم کی ہیں۔"

نرمل نے دستخط کردیئے۔

"یہ سُود کی ہیں۔"

نرمل نے دستخط کردیئے۔ پھر کچھ ہنڈیاں سامنے آئیں جن پر کوئی رقم درج نہیں تھی۔

"یہ کیا ہیں۔؟"

"وقت پر رقم واپس نہیں ہوئی تو آگے جو سود لگے گا یہ اُس کی ہیں۔" نرمل نے اُن پر بھی دستخط کردیئے۔

پھر سیٹھ نے ایک لمبا چوڑا کنٹراکٹ سامنے رکھا۔

"یہ کیا ہے —؟"

"یہ کچھ نہیں۔ جب تک ہمارے پیسے نہیں لوٹاؤ گے۔ نگیٹیو ہمارے نام گروی رہے گا —"

نرمل نے پڑھے بغیر اِس پر بھی دستخط کر دیئے۔

مُول چند بھائی نے ڈیڑھ لاکھ کی رقم سامنے رکھ دی۔

"تھینک یو، سیٹھ صاحب"

"مجھے سیٹھ نہ کہو، صرف مُول چند بھائی کہو۔ اور شکریہ ادا کرنا ہے تو دُرگا بہن کا کرو، جنہوں نے اتنی اچھی فلم فنانس کرنے کا موقع ہم کو دیا۔ ہم تو سمجھے تھے ہمیں بھول ہی گئیں دُرگا بہن۔"

اور پھر مُول چند بھائی ہُنڈیوں کو اپنے کالے تھیلے میں بھر کر چلا گیا اور نرمل اور دُرگا اکیلے رہ گئے۔

"دُرگا!"

"کہیئے۔"

"پھر کہیئے!"

"کہو۔"

اِن ہُنڈیوں پر دستخط کرنے میں میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ یہ سیٹھ کوئی بے ایمانی تو نہیں کرے گا۔"

"نہیں۔ اگر مُولچند بھائی کو روپیہ وقت پر واپس مل گیا تو کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔"

"دُرگا اگر تم نے بھاگ دوڑ کر کے روپیہ کا انتظام نہ کیا ہوتا تو میں تو ہمّت ہار بیٹھا تھا۔ تم کتنی اچھی ہو ––!"

یہ کہہ کر اُس نے دُرگا کو گلے لگا لیا۔ اُس کو چُوم لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ لیکن آج دُرگا کی طرف سے کچھ کھچاؤ محسوس ہوا۔

"میں اچھی ہوں یا بُری ہوں یہ تو وقت آنے پر معلوم ہوگا۔"

دُرگا نے نرمی سے اپنے آپ کو نرمل کے بازوؤں سے آزاد کراتے ہوئے کہا۔ فی الحال تو یاد رکھیئے کہ اگر اچھی فلم بنانی ہے تو ڈائرکٹر۔ ایکٹر کو اپنی ہیروئن سے کسی قدر دُور ہی رہنا چاہیئے۔ یہ کہکر وہ کچھ کھسیانی سی ہنسی ہنسی۔ نرمل نے بھی ہنس کر کہا۔ کیا ہر تخلیق کے لئے برہمچاری رہنا ضروری ہے؟

اور پھر وہ دونوں روپیہ لے کر بینک میں جمع کرانے اور حاتھر کو اطلاع دینے کہ شوٹنگ کا انتظام کرنے چل پڑے۔

اور اب دو مہینے بعد "نئی دھرتی نیا آکاش" کی شوٹنگ کا آخری دن آن پہنچا۔

یہ وہ سین تھا جب نُوراں اپنے بھائی بہنوں کی خاطر اپنے آپ کو ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچ ڈالتی ہے۔

نرمل نے میک اپ رُوم میں ڈائیلاگ ریہرسل کراتے ہوئے دُرگا سے پُوچھا۔

"دُرگا، ہم میلوڈرامہ سے ہٹ کر ایک حقیقت پسند تصویر بنا رہے ہیں۔ کہیں یہ سین غیر حقیقی تو نہیں سمجھا جائے گا؟ کیا کوئی لڑکی اپنے بھائی بہنوں کے لئے واقعی اپنی عصمت کو بیچ سکتی ہے؟"

کچھ دیر تک تو دُرگا اپنے آپ کو خاموشی سے آئینے میں دیکھتی رہی۔ پھر مُڑے بغیر جواب دیا کیوں کہ آئینے میں اُس کا عکس نرمل ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں، نرمل، عورت جس سے پیار کرتی ہے تو اُس کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے ––– کچھ بھی۔"

اِس سے پہلے کہ نرمل اِن الفاظ کی اہمیت کے بارے میں کچھ سوچ سکے، اِسٹوڈیو سے بلاوا آگیا کہ شاٹ تیار ہے۔ ڈائرکٹر اور ہیروئن کا اِنتظار ہے۔

اِسٹوڈیو جاتے ہوئے نرمل نے کہا۔ "کیوں، دُرگا۔ آج ہماری تصویر مکمل ہو جائے گی۔ تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟"

"سچ سچ بتا دوں؟"

"اگر تم مجھے اِس قابل سمجھتی ہو۔"

مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ لوگ تصویر کے بارے میں کیا کہینگے؟ میرے کام کے بارے میں کیا کہیں گے۔ ؟"

"گھبراؤ مت دُرگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نے ہی تو کہا تھا۔ ہمارے سپنے ضرور پُورے ہوں گے۔"

اور پھر وہ اپنی تصویر کے آخری سین کی شوٹنگ کے لئے اِسٹوڈیو کے دروازے میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند ہو گیا۔

۸

نرمل کا خیال تھا کہ یہ دروازہ بند ہونے کے بعد کامیابی کے سب دروازے کھلتے جائیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

فلم کی بیک گراؤنڈ میوزک ایک بین الاقوامی شہرت کے موسیقار نے دی تھی۔ مگر فلم والے سب یہی کہتے تھے کہ "اس میوزک ڈائرکٹر کا تو کبھی نام بھی نہیں سنا ہم نے کوئی ہٹ گانا بنایا ہے اِس نے؟

جب تصویر مکمل ہو گئی تو نرمل نے دس بارہ چھوٹے ڈسٹری بیوٹروں کو ٹرائل کے لئے بلایا۔ ساتھ میں کچھ اخبار والوں کو۔ اپنی کمپنی والوں کو۔ جس میں اب مول چند بھائی بھی شامل تھا۔

ٹرائل ختم ہوا تو اخبار والوں نے اور نرمل کے ساتھیوں، دوستوں نے تالیاں بجائیں۔ لیکن جب روشنیاں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ زیادہ تر ڈسٹری بیوٹر تو پہلے ہی کھسک چکے تھے، چار باقی رہ گئے تھے۔

ایک نے نرمل سے ہاتھ ملایا۔ ایسے جیسے کسی مُردے کا کریا کرم کرنے کے بعد اس کے وارثوں کو تسلی دینے کے لئے ہاتھ ملایا جاتا ہے۔ خاموشی سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

دوسرے نے بھی یہی کیا۔ صرف "تھینک یو مسٹر نرمل" کہا۔ پھر وہ بھی چلا گیا۔

تیسرے سے نرمل نے خود پوچھا "کیوں سیٹھ جی۔ کیسی لگی پکچر؟"
اس نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ فلم پوری دیکھیں تو رائے دیں۔
"مگر جو آپ نے دیکھی ہے یہی تو پوری فلم ہے۔"
"صرف دو گھنٹے کی؟"
"جی ہاں۔ ایک گھنٹہ پچپن منٹ ہے۔"
"اور گانے۔ وہ ابھی نہیں لگائے نا؟"
"جی اس میں کوئی گانا نہیں ہے۔"
"ایک بھی نہیں۔!"
"جی نہیں۔"

اس نے جلدی سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "یہ تو ایوارڈ پکچر ہے مسٹر نرمل۔ میری بات یاد رکھیئے گا۔ اسے ایوارڈ ضرور ملے گا۔" پھر وہ بھی چلا گیا۔

اب صرف ایک ڈسٹری بیوٹر رہ گیا، جو برابر مڑ مڑ کر درگا کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"کہیئے سیٹھ صاحب، آپ کا کیا خیال ہے؟"
"اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے۔"

نرمل خوش ہوا کہ ایک کو تو اچھی لگی، شاید یہ کسی علاقے کے لئے فلم ڈسٹری بیوشن کے لئے لے لے۔ مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ سیٹھ صاحب فلم کی بات نہیں کر رہے تھے، اس کی ہیروئن کی بات کر رہے تھے۔

"چھوکری اچھی ہے۔ کتنے پیسے دیئے آپ نے؟"
"جی! ہمارے سب کام کرنے والے تو ساجھے دار ہیں اس پکچر میں۔ ویسے اب تک مس درگا داس کو ہم نے تین ہزار روپے دیئے ہیں۔"
"ہم دس ہزار دے گا۔ اپنے پارٹنر نے ایک پکچر شروع کی ہے "دلربا"۔ اس میں اس کو فرسٹ کلاس ویمپ بنا دے گا۔ ولین کے ساتھ جو سین ہے وہ اچھا کیا ہے۔"

نرمل نے اسے ٹالنے کے لئے کہا۔ "بہت اچھا۔ میں مس درگا سے کہہ دوں گا۔ وہ آپ کو فون کر لیں گی۔"

سب سے آخر میں مول چند بھائی کی باری تھی۔
نرمل نے کہا۔ "کہیئے مول چند بھائی۔ آپ کو کیسی لگی۔؟"
"ہم کو کیا سمجھ ہے، نرمل صاحب۔ آپ نے تو آرٹ اور فلاسفی بھر دی ہے۔ ہم تو بنیئے ہیں بنیئے۔ ہم کو تو یہ بتاؤ ہماری رقم کب ملے گی۔؟"
"جیسے ہی کوئی بزنس ہوا ساری رقم پہلے آپ کے گھر ہی آئے گی۔"
"اچھا تو نمستے نرمل صاحب، نمستے درگا بہن!" اور مول چند بھائی کن انکھیوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے چلے گئے۔

سب اخباروں میں لمبے لمبے آرٹیکل چھپے کہ "نئی دھرتی نیا آکاش"۔ ہندوستانی فلم سازی میں ایک انقلاب لے آئی ہے۔ اس کا مقابلہ غیر ملکی آرٹ فلموں سے کیا گیا۔

مگر بار بار ٹرائل رکھنے پر بھی کوئی ڈسٹری بیوٹر فلم کو لینے پر راضی نہ ہوا۔

کئی فلمی دلالوں نے رائے دی کہ اس میں چار گانے اور ہیلن کا ڈانس ڈال دیجئے پھر ہم بزنس کرا دیں گے۔

ایک ڈسٹری بیوٹر نے کہا۔ یہ آرٹ فلم ہے، ایوارڈ فلم ہے۔ میں ایسی کتنی ہی فلمیں چلا چکا ہوں۔ آپ مجھے دے دیجئے تو میں اسے مارننگ شوز میں چلاؤں گا۔ آرٹ فلم لوگ صبح سویرے ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔!"

نرمل نے پوچھا۔ کتنا ایڈوانس دے سکیں گے آپ؟
ہم کو تین لاکھ مول چند بھائی کو لوٹانے ہیں۔"

ڈسٹری بیوٹر نے کہا۔ "ہم تو بس کمیشن پر چلا دیں گے۔ پبلسٹی کا خرچہ نکال کر صرف پچیس فی صدی کمیشن لیں گے۔ باقی جو آئے آپ کا۔"

"مگر ایڈوانس ۔۔۔۔؟"

"آرٹ فلموں کو ہم ایڈوانس نہیں دے سکتے۔ آپ تو بس پرنٹ بنوا کر ہمیں دے دیجئے۔ باقی سب ہم دیکھ لیں گے۔"

نرمل نے مول چند بھائی سے بات کی۔ اُس نے ڈسٹری بیوٹر کو گالی دی کر کہا۔ "اُس سالے کا کیا اعتبار؟ ہم تو بس آپ کو جانتے ہیں۔ ہمارا چکتا کر دیجئے پھر ہماری طرف سے آپ پکچر چلانے کے لئے کالے چور کو دیدیجئے۔ بات ختم ہوگئی۔"

نرمل کو ایسا لگا رہا تھا کہ بات ہر طرف سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ دروازے بند ہوتے جا رہے ہیں۔"

اسٹاف کے لوگوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ کوئی آتا تھا تو پیسے مانگنے۔

جس دن ایوارڈ کے لئے فلم دہلی بھیجنی تھی اُس دن کوئی ایسا بھی نہیں تھا جو اسٹیشن پر جا کر بلٹی کرا آتا۔ نرمل کو خود جا کر کیو میں کھڑا ہونا پڑا۔

درگا نے بھی آنا جانا کم کر دیا تھا۔ وہ اب پھر لائبریرین کے ڈپلوما کے لئے پڑھ رہی تھی۔ اگلے مہینے اُس کا امتحان تھا۔

نرمل اکثر سوچتا کہ اندھیرے میں سایہ بھی انسان سے جدا ہوتا ہے۔

مالی مشکلات سے تنگ آ کر ایک دن نرمل نے فیصلہ کیا، کہ اُس پروڈیوسر کے یہاں چلا جائے جو گھر آ کر کنٹراکٹ آفر کر رہا تھا۔

جب پروڈیوسر کے یہاں پہنچا تو اُس نے بڑی آؤ بھگت کی۔۔۔۔

"آیئے آیئے نرمل جی۔ آپ تو عید کا چاند ہوگئے۔" پھر اپنے اسسٹنٹ کو چلا کر۔ "ارے بھائی، نرمل جی کے لئے چائے لاؤ۔ پیسٹری بھی لانا۔۔۔۔"

نرمل سمجھا اب کام بن گیا۔

مگر پروڈیوسر اپنی پکچر کے بجائے نرمل کی پکچر کی بات کر رہا تھا۔

"نرمل جی بڑی تعریف سن رہے ہیں آپ کی پکچر کی۔ اب کے ٹرائل ہو تو ہمیں ضرور بتایئے۔"

نرمل نے کہا کہ فلم کا ابھی ایک ہی پرنٹ بنا ہے اور وہ دہلی گیا ہوا ہے ایوارڈ کے لئے۔

"ایوارڈ تو سمجھئے آپ کی جیب میں ہے نرمل جی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ناول کو فلمانے کی ہمت آپ ہی کر سکتے تھے۔ سبجکٹ کے ساتھ کوئی انصاف کر سکتا ہے تو رائٹر ہی کر سکتا ہے!"

آخر کار نرمل نے ہمت کر کے بات چھیڑ ہی دی۔ "وہ آپ اُس دن آئے تھے نا۔ کہانی کے بارے میں بات کرنے؟"

"کب؟" پروڈیوسر نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ اوہ، اب یاد آیا۔ چھ سات مہینے ہوگئے اُس بات کو تو۔ اس عرصہ میں ہم نے تو دو رائٹروں سے کنٹراکٹ کر لیا ہے۔ ایک پکچر تو آدھی ہوگئی۔ آئندہ ضرورت ہوئی تو ضرور آپ کو تکلیف دیں گے۔"

"اچھا تو پھر میں چلا۔ نمستے۔"

"نمستے نرمل جی۔ کبھی کبھی آتے رہیئے۔"

اُس رات کو ادھر اُدھر ہوتا ہوا نرمل تھکا ہارا گھر پہنچا تو دروازہ کھلا ہے اور اندر روشنی ہو رہی ہے۔

اُس کو معلوم تھا کہ ایک چابی درگا کے پاس ہے، مگر درگا کو کہاں فرصت ہے آج کل اُس سے ملنے آنے کی؟

"کاش درگا ہی ہو!" اُس کے دل نے کہا۔

"بھاڑ میں جائے درگا!" اُس کے دماغ نے کہا۔

اندر گیا تو دیکھا درگا ہی ہے، اُس کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نرمل تم نے ریڈیو سنا؟"

"تم جانتی ہو کہ میں ریڈیو نہیں سنتا۔ میرا ریڈیو کب کا بک چکا ہے۔"

"نرمل ہمیں ایوارڈ ملا ہے!" درگا چلائی۔

"کیا ملا ہے؟" نرمل نے پوچھا۔

"ایوارڈ۔ گولڈ میڈل۔"

"پھر کہو کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"نئی دھرتی نیا آکاش" کو پریسیڈنٹ گولڈ میڈل ملا ہے۔"

"دیکھو درگا مذاق مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں۔"

"کیا میں تمہیں دکھ دینا چاہتی ہوں۔ نرمل میں سچ کہہ رہی ہوں، تمہاری فلم کو ۔۔۔ ہماری فلم کو ۔۔۔ ملک کا سب سے اونچا فلمی اعزاز ملا ہے۔" اور مجھے ۔۔۔ تمہاری ہیروئن کو بہترین ایکٹنگ کے لئے اُروشی ایوارڈ ۔۔۔۔"

اب جاکر نرمل کو یقین آیا۔

"درگا!" وہ چلّایا۔

"نرمل!" وہ چلّائی اور دوڑ کر نرمل کو لپٹ گئی۔ نرمل نے اُسے باہوں میں لپیٹ کر اونچا اُٹھالیا۔ اُس کے منہ کو چوم لیا۔ نرمل کے شانے پر سر رکھ کر وہ رونے لگی۔ نرمل میں نے کہا نہیں تھا کہ تمہارے سپنے ایک دن ضرور سچّے ہوں گے۔"

"تمہارے سپنے؟" نرمل نے اُس کو آہستہ سے زمین پر اُتارتے ہوئے تعجب سے دُہرایا۔ "ہمارے سپنے کہو درگا!"

اور درگا نے کہا۔ "تمہارے سپنے ہی میرے سپنے ہیں۔ نرمل چلو اب مٹھائی کھلاؤ۔ یا کم سے کم ایک پیالی چائے پلاؤ۔"

۹

اب مرنے والے نے اپنی موت کا اِسٹیج سجالیا تھا۔

دو چار منٹ کی دیر ہے۔ پھر سب جل کر خاک ہو جائے گا۔ نرمل۔ اُس کے سپنے۔ اُس کی فلم کا نگیٹیو 'نئی دھرتی نیا آکاش'۔ (میرے بعد میری نشانی بھی کیوں رہے؟ اُس کے سوتے ہوئے دماغ نے سوچا)

سو اُس نے تیرہ ڈبّوں میں سے فلم کے فیتے کو (جو تیرہ ناگنوں کی طرح کنڈلی مار رہا تھا) نکال کر ڈھیر لگا دیا تھا۔ اُس پر جتنی کتابیں اور اخبار باقی رہ گئے تھے وہ رکھ دیئے تھے۔ اُن پر مٹی کا تیل چھڑک دیا۔ ایک دیا سلائی گھسنے کی دیر تھی۔ اور دھرتی آکاش ـــــ زندگی اور موت ـــــ سب ایک ہو جائے گا۔

مگر اس فلم کو جلانے کا مجھے کیا ادھیکار ہے۔ (سلیپنگ پلز کے نشے سے دُھندلے ہوئے دماغ نے سوچا) یہ فلم درگا کا بھی تو ہے۔ کون سی درگا کا؟ ـــــ میری درگا؟ مگر وہ تو کب کی مر چکی ہے۔ وہ ننھی مُنّی چھوٹی سی لڑکی جس کو میں نے فلم فورم کے شو میں بیٹھا دیکھا تھا۔ اور یہ درگا جس نے مُول چند بھائی سے چھ فلموں کا کنٹراکٹ کیا ہے، یہ تو ایک فرسٹ کلاس ویمپ ہے۔ بے وفائی کی ملکہ۔ وشواش گھات کی دیوی۔

وہ دن آج بھی ـــــ اس حالت میں بھی ـــــ جب اُس کے قدم موت کے کنارے لڑکھڑا رہے تھے ـــــ اُسے یاد تھا جب درگا نے خود آکر اُسے بتایا تھا کہ اُس نے مُول چند بھائی کی کمپنی میں کام کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

"تم جانتی ہو مُول چند بھائی کون ہے؟ کیوں اُس نے فلم کمپنی بنائی ہے؟"

"جانتی ہوں۔"

"یہ بھی جانتی ہو کہ اُس نے وہ پچیس ہزار روپے جو مجھے گورنمنٹ سے انعام ملے تھے اپنے قرضہ میں وصول کرلیے ہیں؟ اور اب وہ میرے فلم کے نگیٹیو پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔"

"جانتی ہوں۔ وہ اُس کا قانونی حق ہے۔"

"قانونی حق سب کچھ ہے۔ اخلاقی حق کچھ نہیں۔ جذباتی حق کچھ نہیں؟"

درگا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف سر جھکالیا۔ نرمل نے سوال جواب جاری رکھا۔

"اس قسم کے آدمی سے رشتہ جوڑنے کا مطلب سمجھتی ہو، درگا؟"

"سمجھتی ہوں۔"

"پھر بھی تم یہ قدم اُٹھا رہی ہو؟"

"ہاں!" مگر اس ہاں میں مایوسی تھی، مجبوری تھی۔ کوئی فخریہ اعلان نہیں تھا۔

"وجہ۔"

"کئی وجہیں ہو سکتی ہیں جو تمہیں بتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سمجھ لو، میں غربت کی زندگی سے تنگ آچکی ہوں۔ کامیابی چاہتی ہوں۔ آرام کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔"

اب نرمل نے وہ سوال کر ہی دیا جو اُس کی زبان کی نوک پر کب سے لرز رہا تھا۔

"تو تم میں اور فورس روڈ کی رنڈی میں کیا فرق ہے؟"

درگا نے نرمل کی طرف دیکھا اور بولی۔ "کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ بھی حالات سے مجبور ہے۔ میں بھی مجبور ہوں۔"

نرمل زخم کو اپنے زہریلے نشتر سے کریدتا رہا۔

"اب معلوم ہوا کہ اتنی آسانی سے تم کیسے اِس فلم کے لیے مُول چند بھائی سے فنانس لے آئی تھیں؟ ـــــ تمہارا اور اُس کا رشتہ پرانا معلوم ہوتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" درگا نے جواب دیا۔

"بدچلن، آوارہ، ایک تو چوری اُس پر سینہ زوری۔" نرمل

پاگلوں کی طرح چلّایا۔ "تو یہ لے ۔"
سو اُس نے ایک زنّاٹے دار ہاتھ دُرگا کے گال پر مارا جس کی آواز دُرگا کے جانے کے بعد بھی اُس کے کمرے میں ـــــ اُس کے دماغ میں گونجتی رہی۔

اور اتنے دِنوں کے بعد آج بھی گونج رہی تھی۔

آج جب سارے پڑوسیوں کے سامنے مُولچند بھائی اُس کی قُرقی لے کر آیا۔

اُس کو بے عزّت کر کے اُس کے گھر کا سامان اُٹھا کر لے گیا۔

اُس کو عدالت سے دیوالیہ قرار دِلوایا۔

اب وہ جو کچھ کمائے گا وہ مُول چند بھائی کو دینا پڑے گا۔ (اور یہ خیال اُسی دم اُس کے دماغ میں آیا۔) اُس رُوپے میں سے مولچند بھائی دُرگا کی قیمت جو مُقرر ہوئی ہے اُس کی قِسطیں ادا کرے گا۔

اور پھر وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

میں مَر جاؤں گا تو مُول چند بھائی کس سے روپیہ وصول کریگا؟ قرض دار کو سزا دی جا سکتی ہے۔ دیوالیہ سے روپیہ وصول کیا جا سکتا ہے۔ مگر مُردے سے روپیہ وصول کرنے یا مُردے کو سزا دینے کا کوئی طریقہ سپریم کورٹ کو بھی نہیں معلوم تھا!"

نیگیٹو جب جل جائے گا تو نہ صرف اُس کی نشانی مٹ جائیگی۔ بلکہ دُرگا کی بھی ـــــ دُنیا دُرگا کا آرٹ کیوں دیکھے جب اُس نے خود اُس آرٹ کو بازار میں بیچ ڈالا ہے۔؟

یہ سوچ کر وہ اور زور زور سے ہنسا۔

پھر اُس نے اپنی جھلنگا چارپائی کو فلم اور کاغذوں کے انبار کے اوپر رکھ دیا۔

دیاسلائی جلانے ہی والا تھا کہ اُسے وہ فلم کے خالی ڈبّوں کا قُطب مینار نظر آیا۔

یہ خالی ڈبّے کیوں جلیں ؟ اُنہوں نے کیا قصور کیا ہے ؟ یہ خالی ڈبّے بازار میں آٹھ آٹھ آنے میں بِکتے ہیں۔ کسی غریب کے کام آسکتے ہیں۔

سو اُس نے ڈبّوں کو اُٹھا اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکنا شروع کیا۔ اور اُس وقت اُسے یہ خیال آیا کہ فلم کو ڈبّوں سے نکال کر باہر پھینکنا تاکہ وہ نہ جلیں ایسا ہی ہے جیسے مرتے ہوئے آدمی کے کپڑے اُتار لئے جائیں۔ تاکہ اُس کے مرنے کے بعد وہ کسی زندہ آدمی کے کام آسکیں۔

پھر وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ بڑی نیند آرہی ہے۔ لیٹنے میں کتنا آرام ہے، سوچنا نہیں چاہئے۔ سو جانا چاہئے۔ سو جانا چاہیئے۔ مگر سونے سے پہلے اُسے کوئی کام کرنا تھا۔ کیا کام کرنا تھا؟۔ کوئی بہت ضروری کام تھا۔! ہاتھ چارپائی سے نیچے لٹکا تو دیاسلائی کی ڈبیہ بجی۔ اب اُس کے سوئے دماغ کو یاد آیا کہ اُسے سونے سے پہلے کاغذوں اور فلم کے فیتے کے انبار کو جو اُس کی چارپائی کے نیچے پڑا تھا۔ آگ لگانی تھی۔ اپنی جاگتی ہوئی زندگی کی آخری کوشش سے اُس نے دیاسلائی جلائی اور کاغذوں میں آگ لگا دی۔ پھر آرام سے چارپائی پر لیٹ کر سو گیا۔ ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

۱۰

مگر اُس کی موت جلنے سے نہیں ہوئی۔ زیادہ سلیپنگ پلز کھانے سے اور دُھوئیں سے گھُٹ کر ہوئی۔

مٹّی کے تیل میں پانی کی مِلاوٹ تھی۔ اخباروں میں آگ لگی مگر شُعلے نہیں بھڑکے۔

نرمل یہ بھول گیا تھا کہ فلم فیتہ اب نائٹریٹ کا نہیں، ایسے مسالے کا بنتا ہے جو فوراً آگ نہیں پکڑتا۔ فلم جھلس گیا۔ مگر اُس کے شُعلے نرمل تک نہیں پہنچے۔ ہاں سِلولائیڈ کا زہریلا دھواں آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھتا ہوا نرمل کے بے ہوش جسم میں داخل ہوتا رہا۔ اور دھیرے دھیرے بڑے پیار سے اُس کا گلا گھونٹتا رہا ـــــ جیسے دُنیا نے دھیرے دھیرے بڑے پیار سے اُس کا گلا گھونٹا تھا۔

نرمل کا کریا کرم بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

سارے لوگوں نے ـــــ مشہور فلمسٹار، بڑے اور کامیاب ڈائرکٹر، پروڈیوسر، رائٹر ـــــ جن کو "فلم انڈسٹری" کہا جاتا ہے اُس کی ارتھی میں شرکت کی۔

شمشان بھومی میں اُس کی یاد میں تقریریں کی گئیں۔

اُس کو ہندوستانی فلم انڈسٹری کا انقلابی ڈائرکٹر بتایا گیا جس نے اپنی پہلی فلم بنا کر ہی اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ "ہمیں آج نرمل مرحوم کے کارنامے پر ناز ہے۔" ایک پروڈیوسر نے کہا ـــــ "وہ

مرکر ہمیں زندہ رہنے کا بھید بتا گئے ہیں۔" تقریر اُن کو ایک ڈائلاگ رائٹر نے لکھ کر دی تھی۔

ایک تقریر مُول چند بھائی کی بھی ہوئی۔ اُنہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "ہمیں اِس بات پر ناز ہے کہ سور گباشی نرمل پر جب کڑا وقت پڑا تھا اور اُن کی مہان فلم "نئی دھرتی نیا آکاش" ادھوری پڑی تھی تو ہم نے آگے آگے آکر اُن کو فنانس کیا اور اُن کی فلم ختم کرنے میں اُن کی سہائتا کی۔"

ایسی ہی تقریریں ہوتی رہیں اور چتا کے شعلے لپک لپک کر آکاش کی طرف جانے کی ناکام کوششیں کرتے رہے۔ مگر کالے کالے دھوئیں کے بادل نہ صرف اُس شمشان پر بلکہ ساری دھرتی اور سارے آکاش پر چھا گئے۔

اور ایک کونے میں پلّو سے سر ڈھانکے درگا کھڑی رہی۔ وہ کچھ سُن نہیں رہی تھی۔ وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھی۔ وہ صرف یاد کر رہی تھی اُس دن کو جب فلم فورم کے شو میں اندھیرے سے روشنی ہوئی تھی اور اُس نے اُس لمبے قد کے نوجوان کو پہلی بار دیکھا تھا جو اُس کے جیون میں اُجالا کر کے خود اندھیرے کی گود میں سو گیا تھا! اُس کے بٹوے میں ایک لائبریری کے سکریٹری کے نام خط تھا جو آج ہی اُس نے لکھا تھا اور جس میں اُس نے کہا تھا کہ میں آپ کے ہاں ڈھائی سَو روپے ماہوار پر اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے کام کرنے کو تیّار ہوں۔

اور اُسی وقت جب یہ سب ہو رہا تھا بھیکو اپنا کھٹارا لے کر گرلا روڈ اندھیری سے گزر رہا تھا جہاں وہ تیرہ خالی ڈبّے پڑے تھے۔ ارتھی اُٹھنے کے ہنگامے میں کسی نے اُن کی طرف توجّہ ہی نہیں کی تھی۔

اب بھیکو کھٹارے کو ڈھکیلتا ہوا کالینہ کی طرف جا رہا تھا۔ کہ ایک جھونپڑ پٹی کے اُس نے ایک چھوٹا سا گڈیلنا جس سے بچّوں کو چلنا سکھاتے ہیں پڑا دیکھا۔ اُس نے سوچا کہ یہ گڈیلنا ہمارے منّو کے کام آئے گا۔ اب اُس کے گڈیلناں چلنے کی عمر ہو گئی ہے کیوں نہ اِس کو بھی ڈال لوں۔

اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ کی تو صرف ایک بھکاری جو شاید پگلا تھا کھڑا نظر آیا۔ اُس کی نگاہیں بھی اُس گڈیلنے پر تھیں۔

"کیوں بھائی یہ گڈیلنا بیکار ہے تو میں لے لوں۔"

بھکاری نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔ "بے کار ہے۔ مگر ذرا سوچو کہ کیوں بے کار ہے؟" اور پھر وہ خوفناک طریقے سے قہقہے لگا کر ہنسے۔

بھیگو نے گڈیلنے کو جلدی سے ٹب میں ڈال لیا اور اُس پگلے بھکاری کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کھٹارے کو ڈھکیلتا رہا۔ جواب اِتنا بوجھل لگ رہا تھا جیسے دُنیا بھر کے پاپ اُس میں لدے ہوں۔

ایک بچّے کے گُڈیلنے کی کہانی

ایک گُڈیلنا۔

دو گُڈیلنے۔

تین گُڈیلنے۔

چار، پانچ، چھ، سات گُڈیلنے۔ گڈیلنوں کی لمبی قطار یہاں سے وہاں تک لگی رہتی تھی۔ سستے گُڈیلنے، مہنگے گُڈیلنے، سادہ گُڈیلنے خراد کے کام کے رنگین گُڈیلنے۔

رحمت بخش بڑھئی لکڑی کے کام کا ماہر تھا۔ پالم پور میں اُس کے نام کو سب جانتے تھے۔ خراد کا اتنا بڑھیا کام کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ پلنگوں کے پائے، کرسیوں، میزوں کی ٹانگیں، لال سبز رنگ چڑھائے ہوئے، منقّش پیڑھے۔ اور گُڈیلنے۔ سب سے زیادہ مزا اُس کو گُڈیلنے بنانے میں آتا تھا۔ مدّتوں کنوارا۔ پھر ایک جوان لڑکی سے شادی کے بعد بھی بے اولاد رہا تھا نا؟۔ اُس کے دل میں اپنا بچّہ ہونے کی بڑی خواہش تھی۔

بیوی سے اکثر کہتا۔ "اری نیک بخت۔ بس ایک بچّہ دیدے، تاکہ میں تجھے، ننّا کی ماں کہہ پکار سکوں۔"

سال گزرتے گئے مگر اُس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔

وہ اپنی اِس خواہش، اِس آرزو کو دوسرے بچّوں کے لئے گُڈیلنے بنانے میں ڈھالتا رہا۔ خراد کے کام کے خوبصورت گُڈیلنے رنگین گُڈیلنے۔ گھنگرو لگے گُڈیلنے۔ سارے پالم پور

کے بچے چاچا رحمت بخش کے گُڈیلنوں پر چلنا سیکھتے۔ پالم پور ہی میں کیوں۔ گجرات بھر میں رحمت بخش کے ہاتھ کے بنے ہوئے لکڑی کے سامان کی ـــــ خاص کر گڈیلنوں کی شہرت تھی۔ راجکوٹ بڑودہ۔ سورت تک کے دکاندار آتے اور اُس سے گڈیلنے بنوا کر لے جاتے۔ ہزاروں بچے رحمت بخش کے گڈیلنوں کو پکڑ کر اپنے ننھے ننھے قدموں سے چلنا سیکھ رہے تھے۔ کیا اُس کو کبھی اپنے بچوں کو آنگن میں گڈیلنا چلاتے ہوئے دیکھنا نصیب نہ ہوگا؟ آخر اُس کی اور اُس کی بیوی کی منتیں، مُرادیں، دُعائیں، تعویذ اور گنڈے کام آئے اور خدا نے ایک جیتا جاگتا ہنستا کھیلتا بچہ اُن کی جھولی میں ڈال دیا۔

"مانگ کیا مانگتی ہے؟" اُس نے اپنی بیوی سے خوش ہو کر کہا۔ جیسے وہ ایک شہنشاہ ہو ـــــ اور دُنیا کی سب نعمتیں اُس کے ہاتھ میں ہوں۔ "تو نے ہمیں خوش کیا ہے۔ ہم تجھے خوش کریں گے۔"

"جو میں کہتی ہوں وہ کرو گے؟"

ہاں ہاں۔ تو ایک دفعہ مانگ تو کیا مانگتی ہے۔" رحمت بخش نے ننھے سے لال لال بوٹے سے بچے کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو بمبئی چلو۔" کریمن نے لیٹے لیٹے کہا۔ اور اپنے ہاتھ سے بچے کو تھپک کر سُلاتی رہی۔

"بمبئی ـــــ ارے۔ بمبئی میں کیا کرے گی؟"

"بمبئی میں بس ہم رہیں گے۔"

"رہتے تو ہم یہاں بھی ہیں نیک بخت۔ پھر وہاں ایسی کونسی نئی بات ہوگی۔؟"

"تم تو سمجھتے ہی نہیں ہو۔ اس گاؤں میں ہم پڑے ہیں۔ بھلا ہے کیا یہاں؟"

"پالم پور کو تو گاؤں کہتی ہے۔"

"ہاں ـــــ اور کیا۔ بمبئی کے مقابلہ میں تو گاؤں ہی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ وہاں بجلی کی ریلیں چلتی ہیں۔ بجلی کی روشنی سے سارا شہر جگ مگ کرتا ہے۔ بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ بڑی بڑی بلڈنگیں ہیں، بڑے بڑے ہوٹل ہیں۔ سینما ہیں۔ وہاں سب کچھ ہے۔ اور یہاں کچھ بھی نہیں۔"

بوڑھے شوہر کو نوجوان بیوی کی بات ٹالنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً اگر وہ اُس کے بچے کی ماں بھی ہو۔ آخر کار ایک دن اپنا بنا بنایا ہوا سب سامان بیچ کر گھر میں تالا ڈال کر ایک بوری میں اپنے بڑھئی کے سب اوزار رکھ کر۔ دو ٹین کے ٹرنک اور ایک موٹا تازہ بستر لے کر رحمت بخش، اُس کی بیوی کریمن اور اُن کا گود کا بچہ (جس کا نام انہوں نے الٰہی بخش رکھا تھا کیونکہ اللہ نے ہی تو اُسے بخشا تھا ـــــ مگر جسے پیار سے وہ دونوں "بُبوا" کہتے تھے) بمبئی کی ریل میں بیٹھ گئے۔

ریل میں اُن کو گجرات کا ہی ایک نوجوان مل گیا۔ جو برسوں سے بمبئی ہی میں رہتا تھا۔ نام تھا سکندر خاں۔ وہ بمبئی میں نہ جانے کیا کرتا تھا۔ لیکن اچھا خاصا ہی کماتا ہو گا۔ کیونکہ بدن پر سلک کی قمیص۔ ٹیری لین کی پتلون۔ سر کے بالوں میں تیل۔ پیروں میں بڑھیا چپل۔ ناک کے نیچے تلوار کٹ مونچھیں۔ اُس سے رحمت بخش نے کہا کہ ہم بمبئی جا رہے ہیں۔

وہ کہنے لگا۔ "چاچا۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرنا۔ سکندر خاں تمہاری دیکھ بھال کرنے کو ہے۔ پھر کریمن کی طرف ایک پھسلتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ "یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ تمہاری بیٹی ہے کیا؟"

رحمت بخش نے اس بات کا بُرا نہیں مانا۔ بوڑھے شوہر اور جوان بیوی کے بارے میں ایسی غلط فہمی اکثر ہو جاتی ہے۔ "نہیں رے، یہ تو میری بیوی ہے۔ اور اُس کی گود میں ہمارا بچہ ہے۔"

بچے کو دیکھتے ہی سکندر نے باہیں پھیلا دیں۔ "آجا منّے۔ میرے پاس آئے گا۔"

کریمن نے کہا۔ بظاہر اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر۔ "اجی اِن کو بتایا نہیں کہ بچے کا نام منّا نہیں ببوا ہے۔"

"ببوا ـــ ببوا۔ آ بیٹا۔ اپنے چاچا سکندر کے پاس آجا۔ بچہ ہُمک کر سکندر کی گود میں چلا گیا۔ سکندر بچے کو بہلاتا رہا۔ دیکھ بیٹا ہم تجھے بمبئی کی سیر کرائیں گے، وکٹوریہ گاڑی میں بٹھائیں گے۔ ٹیکسی میں بٹھائیں گے۔ ٹیکسی کیسے چلتی ہے۔ پوں، پوں، پوں۔ پوں۔ پوں ـــ اور تجھے سینما دکھائیں گے۔ دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، وجینتی مالا مینا کماری سب سے ملائیں گے، اور تجھے بڑے بڑے ہوٹلوں میں لے چلیں گے۔ ہاں ـــ تو چلے گا ناہمارے ساتھ؟"

رحمت بخش تو چلتی ہوئی ریل کی کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ کریمن سکندر کی یہ سب باتیں سنتی جارہی تھی اور اُس کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھٹی جارہی تھیں۔

سکندر سے کچھ کہنے کے لئے کریمن نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ "لاؤ ببوا کو اِدھر لاؤ۔ خواہ مخواہ بچے کو جھوٹی سچی باتیں کہہ کر مت بہلاؤ۔" سکندر نے بچے کو واپس ماں کی گود میں دے دیا اور اُس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے پر کریمن کے تن بدن میں جھرجھری آگئی۔

رات کو احمد آباد پر ریل بدلی گئی۔ بھیڑ بھاڑ۔ دھکم دھکا میں بیچارہ رحمت بخش تو بوکھلا جاتا۔ بیوی کو سنبھالتا کہ بچے کو، کہ اپنے سامان کو۔ مگر خدا بھلا کرے سکندر خان کا اُن کو صحیح سلامت ڈبے میں بٹھا دیا۔ خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو چاچا مجھ سے کہنا۔" سکندر نے کہا۔ اور پھر صراحی اور لوٹے میں پانی بھر کر لایا۔ اور ساتھ میں ایک دونے میں مٹھائی بھی لے آیا۔ درجے میں گھسا ہی تھا کہ ریل چل پڑی۔

"ہم نے تو مٹھائی نہیں منگائی تھی۔" کریمن نے بڑے نخرے سے شکایت کی۔"

"بھابی — یہ تو ببوا سے آج پہلی ملاقات ہوئی۔ اُس کی خوشی میں مٹھائی ہے۔"

اب تو ضروری ہو گیا کہ رحمت بخش اور کریمن بھی اپنا کھانا نکالیں تو اُس میں سے دو گھی کی روٹیاں، قیمہ، اچار، سکندر خاں کو بھی دیں۔

"کیوں تکلیف کرتے ہیں چاچا۔" سکندر نے کھانا لیتے ہوئے کہا۔ "کہیں آپ کو کھانا کم نہ ہو جائے۔"

"نہیں نہیں۔ بیٹا۔ اللہ کا دیا بہت ہے۔ تو نے اتنی محنت کی ہے ہماری خاطر۔ کیا ہم تجھے دو روٹیاں بھی نہیں کھلا سکتے۔"

تینوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

رحمت بخش نے پوچھا۔ کیوں سکندر بمبئی میں کہاں رہتے ہو؟ اُس نے کسی قدر توقف کے بعد کہا۔ "چاچا میں تو کالینہ کے پاس ایک جھونپڑپٹی ہے اُس میں رہتا ہوں۔"

"بیوی بچے تو ہوں گے؟" کریمن نے سوال کیا۔

"نہیں چاچی۔ ایسی قسمت کہاں اپنی۔"

"کمال ہے بھائی۔" رحمت بخش نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ "اتنے بڑے ہو گئے اور تمہارے ماں باپ نے اب تک تمہاری شادی نہیں کی۔"

سکندر نے لمبی ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ماں باپ تو اللہ کو پیارے ہو گئے چاچا۔ سر پہ ہے کون جسے اپنا کہہ سکوں۔ یا جو میری فکر کر سکے۔"

"فکر نہ کر تو۔" رحمت بخش نے اُسے دلاسہ دیا۔ "ہم بمبئی میں ایک بار رہ پڑیں پھر کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر تیری بات کرتے ہیں۔"

"سکندر خاں نے نظروں ہی نظروں میں اپنے چاچا کا شکریہ ادا کیا۔

اب کھانا ختم ہو گیا تھا۔ سکندر نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "چاچا۔ میں سوچتا ہوں اُوپر کی سیٹ پر سے سامان اُتار کر وہاں آپ کا بستر لگا دوں۔ چاہے آپ سو جائیں یا چاچی۔"

کریمن نے جلدی سے کہا۔ "بستر تو لگا دو مہربانی ہوگی۔ مگر میں بچے کو لے کر کہاں اُوپر چڑھوں گی۔ رات کو چار بار تو پیشاب کرتا ہے۔"

"اچھا تو میں ہی اُوپر سو جاؤں گا۔" اور پھر رحمت بخش اُوپر کی سیٹ پر چڑھ گیا۔ اور وہاں سے سکندر کو آواز دی۔ "بیٹا سامان کا اور اپنی چاچی کا خیال رکھنا۔"

"پھر رحمت بخش بستر پر لیٹ گیا۔ کئی دن کا تھکا ہوا تھا جلد ہی سو گیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو بمبئی کا اسٹیشن آگیا تھا۔ سب مسافر اپنا اپنا سامان اُتار رہے تھے۔

"سکندر — اے سکندر — یہ بمبئی ہے کیا۔؟"

"سکندر کی آواز تو نہیں آئی۔ جواب میں ایک قلی نے کہا۔ "ہاں بمبئی سینٹرل ہے۔ آگے گاڑی نہیں جائے گی۔ کوئی سامان وامان ہے؟"

"سامان تو بہت ہے۔ اے سکندر! ارے کریمن اٹھو بھی؟"

——— آواز دیتے ہوئے وہ نیچے اُترا۔ دیکھا کہ درجہ تقریباً خالی ہو گیا ہے۔ نہ سکندر ہے، نہ کریمن کا کوئی پتہ ہے، نہ دو ٹین کے دو ٹرنک ہیں۔ نہ اوزاروں کی بوری ہے۔ صرف بنچ پر ایک گدڑی میں لپٹا ہوا ببوا رو رہا ہے!

۲

بچے کو گود میں لئے ہوئے، حیران و پریشان، رحمت بخش

پیدل جوتیاں گھستا ہوا، بمبئی کی موٹروں، بسوں، ٹرکوں سے بچتا بچاتا کالینہ کے پاس کی جھونپڑپٹی میں پہنچ تو گیا۔ ایک ایک جھونپڑی میں پوچھا۔ لیکن یہاں کسی نے کسی سکندر خاں کا نام ہی آج تک نہیں سُنا تھا۔

بھو کا بچّہ روئے جا رہا تھا۔

ایک عورت نے رحم کھا کر پُوچھا۔ پہلے مرہٹی میں۔ جب رحمت بخش نہیں سمجھا تو بمبئی کی ہندی میں۔ "بابا یہ بچّہ کیوں روتا ہے۔ اِس کی آئی ــــ اس کی ماں ــــ کہاں ہے!"

رحمت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر اُس نے کچھ سوچ کر اور جی کڑا کر کے کہہ دیا۔ "بیٹی، اِس کی ماں مر گئی ہے ــ سویرے سے دودھ کے لئے بلک رہا ہے۔"

"لاؤ۔ مجھے دو۔ میں دودھ پلاتی ہوں۔"

رحمت بخش نے دیکھا کہ اندر کپڑے کی جھولی نما پالنے میں ایک ننھا سا بچّہ جھول رہا ہے۔

اُس عورت نے اپنی چولی کی گرہ کھولی۔ اور بچّے کے مُنہ میں چھاتی دے دی۔ رحمت بخش نے مُنہ پھیر لیا اور آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر خاموشی سے خُدا کا شکریہ ادا کیا کہ اِس بے رحم شہر میں بھی اِنسانیت مر نہیں گئی تھی۔

سو رحمت بخش اُسی جھونپڑپٹّی میں، ایک جھونپڑی لیکر رہنے لگا۔ پڑوسیوں کی مدد اور مہربانی سے کچھ اوزار بھی حاصل ہو گئے۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ بمبئی میں سوراشٹرا کے ایک بڑھئی کو کام مُشکل سے مل سکتا ہے۔ نہ یہاں کوئی پلنگوں کے پائے خراد سکتا ہے نہ کوئی پیڑھے بنواتا ہے۔ نہ ہی یہاں کے جھونپڑیوں، چالیوں یا فلیٹوں میں رہنے والوں کے پاس آنگن کہاں ہیں۔ ــــ جگہ کہاں ہے۔ جہاں اُن کے بچّے گڈیلنے کے سہارے چلنا سیکھ سکیں؟ ــ یہاں تو زمین پر مٹّی اور دھول اور کیچڑ ہی میں بچّے گڑ ٹھلیوں چلتے ہیں اور پھر دیواروں کا سہارا لے کر ایک دن چلنے لگتے ہیں۔

مگر کچھ ہی دن میں ساری جھونپڑپٹّی میں چاچا رحمت بخش کی شہرت ہوگئی۔ کسی کے جھونپڑے کی ٹین کی چھت ہوا سے اُڑی جا رہی تھی۔ چاچا نے کیلیں ٹھوک کر اُس کو مضبوط بنا دیا۔ کسی کے لکڑی کے کھپٹوں سے بنی دیوار ٹوٹ گئی تھی۔ چاچا نے اُس میں لکڑی کا ٹکڑا ٹھونک دیا۔ کسی کے پاس لکڑی کے ڈبّے تھے چاچا نے اُن کا صندوق بنا دیا۔ تھوڑے دنوں میں آس پاس کے مکانوں، جھونپڑوں، دکانوں سے جہاں بھی ٹھوکم ٹھاکی کی ضرورت پڑتی تھی ــــ چاچا کا بُلاوا آنے لگا۔ چاچا کا کام چل نکلا۔ مگر پھر بھی اُنہوں نے وقت نکال کر ایک گڈیلنا بنایا اور اُس مزدور عورت کے بچّے کو دیا جس نے پہلے دن ببّوا کو دودھ پلایا تھا ــــ اپنے بیٹے کا حق مار کے!

"لو بہن تمہارا مُنّا جب گڈیاں چلنے لگے تو اُس کو چلنا سکھانے کے کام آئے گا۔ یہ میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے؟"

دوسرا گڈیلنا رحمت بخش نے اپنے ببّوا کے واسطے بنایا۔ اور اُس میں اُس نے اپنی ساری کاریگری خرچ کر دی۔

یہ دُنیا کا سب سے خوبصورت گڈیلنا ہوگا۔

اِس گڈیلنے پر اُس کا اپنا بیٹا ــــ الٰہی بخش ــــ چلنا سیکھے گا۔

اُس کے لکڑی کے تینوں پہیئے گول اور سڈول ہوں گے۔

اِس کا ہتّہ جس پر ببّوا اپنے ننّھے ننّھے ہاتھ رکھے گا۔ بیلن کی طرح ہموار اور چکنا ہوگا۔

اُس کے ہتّے کے نیچے چھوٹے چھوٹے گھنگرو لگے ہوں گے، تاکہ جب ببّوا چلے تو ننّھی ننّھی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

اور پھر وہ دِن آیا جب رحمت بخش نے گڈیوں چلنے والے ببّوا کو گڈیلنے کے سہارے چلنا سکھایا۔ جھونپڑی کے سامنے کی جگہ اونچی نیچی تھی۔ دو بار گرا۔ پھر چلنے لگا۔ رحمت بخش بیوی کے بھاگ جانے کے بعد آج پہلی بار مُسکرایا۔ اُس کے سُوکھے دُکھی جیون میں پھر سے بہار آگئی۔

۳

اب تو رحمت بخش آس پاس کہیں کام کرنے جاتا تو ببّوا گڈیلنا لئے بستی بھر میں گھومتا پھرتا۔ سب اُس بن ماں کے بچّے کو پہچانتے تھے۔ کوئی عورت اُس کو دودھ کا گلاس پلا دیتی۔ کوئی آدمی چُوسنے والی میٹھی گولیاں اُسے دے دیتا۔

بچّے اُس کے ساتھ کھیل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ببّوا

جیسے جیسے بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ بہت خوبصورت ہوتا جا رہا تھا۔ رحمت بخش کبھی کبھی سوچتا۔ کیوں نہ ہو۔ اُسکی ماں کمبخت بھی تو بڑی خوب صورت تھی۔!

اور جب رحمت بخش گھر لوٹتا تو ببوا گڈ ریلنے کو دوڑاتا ہوا آتا اور باپ اُسے گود میں لے لیتا۔ بچّہ باپ کی داڑھی سے کھیلتا۔ داڑھی کے بال نوچتا۔ اِس سے بڑی خوشی باپ کے لئے کیا ہو سکتی ہے کہ بچّہ اُس کی داڑھی کے بال نوچے۔ ببوا ابھی بول نہیں سکتا تھا۔ ورنہ رحمت بخش سے ضرور پوچھتا۔ "بابا۔ یہ تمہاری آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ رہے ہیں؟ دیکھو تمہاری داڑھی ساری گیلی ہو گئی۔" اور اگر وہ یہ سوال کرتا تو رحمت بخش اُسے جواب دیتا — "بیٹا یہ خوشی کے آنسو ہیں۔"

اب تو رحمت بخش کی ساری زندگی اپنے ببوا کی ہستی پر، اُس کی زندگی اور اُس کی خوشی پر مرکوز ہو گئی تھی۔

رات کو بیٹے کو گلے سے لگا کر جب وہ لیٹتا اور تھپکتے تھپکتے ببوا سو جاتا تو رحمت بخش سوچتا کہ اپنے ببوا کو میں پڑھاؤں گا، لکھاؤں گا۔ اسکول بھیجوں گا۔ مگر ساتھ میں اُس کو اپنا کام بھی سکھاؤں گا تاکہ پڑھ لکھ کر جب وہ بڑا ہو جائے گا تو اُس کو کسی گندی جھونپڑپٹی میں نہ رہنا پڑے — وہ معمولی بڑھئی تھوڑا ہی ہو گا۔ کاریگر مستری ہو گا۔ گڈ ریلنے تھوڑا ہی بنائے گا۔ فرنیچر بنایا کرے گا۔ اُس کا اپنا کارخانہ ہو گا۔ جہاں میز کرسیاں، الماریاں صوفہ سیٹ بنیں گے۔ شروع میں وہ اپنے ہاتھ سے بنائے گا۔ پھر دوسرے بڑھئیوں سے کام لیا کرے گا۔ خود فرنیچر ڈیزائن کیا کرے گا۔ پھر اُس کا بڑا سا گھر ہو گا۔ جہاں وہ اور میں رہا کریں گے۔ اور پھر ایک دن ببوا سے کہوں گا۔ "بیٹا۔ اب گھر سونا سونا لگتا ہے۔ بہو لے آ تو چاندنا ہو جائے۔" اور پھر ایک خوبصورت سی لڑکی دیکھ کر میں اُس کی شادی کر دوں گا۔ شادی کا چھپر کھٹ اپنے ہاتھ سے بناؤں گا۔ اُس کو پھولوں سے سجاؤں گا۔ ببوا کے سہرا باندھوں گا۔ دُلہن کیلئے لال جوڑا سلواؤں گا۔ پھر میں دونوں کو دُعا دوں گا۔ "خوش رہو میرے بچو!۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔"

اور پھر اُس کے تخیّل میں ببوا کی دُلہن کی مُنہ دکھائی ہوتی۔ رحمت بخش ایک سو روپے مُنہ دکھائی میں دیتا۔ ببوا مُسکرا کر اپنی دُلہن کا گھونگھٹ اُٹھاتا۔

اور خواب میں بھی رحمت بخش کے مُنہ سے چیخ نکل جاتی۔ — کیوں کہ ببوا کی بیوی کا خوبصورت چہرا ہو بہو کریمن جیسا ہوتا!۔

۴

اُس صبح رحمت بخش سویرے سو کر اُٹھتا۔

ببوا ابھی سو ہی رہا تھا کہ اُس نے نماز پڑھ کر دُعا مانگی۔ "اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے بن ماں کے بچّے کا خیال رکھنا پروردگار۔"

پھر اُس نے دودھ گرم کرنے کے لئے چولھے میں آگ جلائی۔ پتیلی اُس پر رکھی۔ بچّے کو اُٹھایا۔ اُس کا مُنہ ہاتھ دُھلایا۔ پھر اُس کو دودھ پلایا۔ کپڑے بدلوائے۔ پھر خود باسی روٹی کا ناشتہ کیا۔ پھر گڈ ریلنا نکالا۔ بچّے کو پیار کیا۔ اُس کو گڈ ریلنے کا سہارا دے کر جھونپڑپٹی سے باہر نکالا۔ پڑوسن اپنی جھونپڑی کے آگے جھاڑو دے کر صفائی کر رہی تھی۔ اُس سے کہا۔ "بیٹی۔ میں کام پر جا رہا ہوں، ببوا یہاں کھیل رہا ہے۔ ذرا خیال رکھنا۔"

"تم فکر نہ کرو بابا۔" پڑوسن نے کہا۔

نہ جانے کیوں جانے سے پہلے رحمت بخش کا جی چاہا کہ ایکبار ببوا کو پھر پیار کرے۔

پھر وہ اوزاروں کا تھیلا کندھے پر لٹکا کر اپنے کام پر چلا گیا۔ ببوا پڑوسن کے جھونپڑے کے آگے کھیلتا رہا۔ پڑوسن نے سوچا۔ کتنا خوبصورت بچّہ ہے۔ اِسے کہیں نظر نہ لگ جائے۔" اور اُس نے ایک کالا ٹیکہ ببوا کے گورے چٹّے ماتھے پر لگا دیا۔

ببوا گڈ ریلنے کو دھکا دیتے ہوئے دور تک لے گیا۔ پڑوسن نے آواز بھی دی۔ "ببوا۔ دُور نہ جانا بیٹا۔"

پھر وہ جھونپڑے کے اندر چولھا جلانے چلی گئی۔ کیونکہ اُس کا پتی مِل میں رات پالی کر کے آنے والا ہی تھا۔

ببوا گلی کے پرلے سرے سے اپنا گڈ ریلنا موڑنے ہی والا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ دو آدمی ایک جھونپڑے کے پیچھے کھڑے ہیں۔ اور اُن کے ہاتھ میں ایک بڑا تھیلا ہے۔ اور اُس میں سے بڑے خوبصورت اور رنگین کھلونے — گیند اور جھن جھنے اور چھوٹی سی موٹر — نکال کر اُسے دِکھا رہے ہیں۔ ایک کے مُنہ پر چیچک کے داغ تھے دوسرے کی بڑی بڑی

مونچھیں تھیں۔ اشارے سے اُنہوں نے کہا، یہ سب تمہارے ہی لئے لائے ہیں ہم۔ اِدھر تو آؤ۔

گڈیلنے کو دھکا دیتے ہوئے بتوا اُدھر جھونپڑوں کے پیچھے چلا گیا۔

رنگین گیند بڑھا کر اُس کو دینے کے بہانے سے ایک آدمی نے ایک رومال بتوا کی ناک پر رکھ دیا۔ بڑی تیز بدبو آ رہی تھی۔ بتوا کا جی چاہا چیخے، مگر وہ چیخ نہ سکا۔ اُس کا تو ایک دم گھٹ رہا تھا۔ اور نیند بھی آ رہی تھی۔

دونوں آدمیوں نے بے ہوش بچّے کو گڈیلنے سے جُدا کرنا چاہا، مگر بتوا نے اتنے زور سے گڈیلنے کا ہتّہ پکڑ رکھا تھا۔ کہ اُن اُنگلیوں کو زبردستی کھول کر ہاتھ کو آزاد کرانا پڑا۔ پھر جلدی سے اُنہوں نے بچّے کو تھیلے میں ڈالا اور پھر ایک آدمی نے تھیلے کو کندھے پر ڈال لیا اور دونوں وہاں سے سرک گئے، اور آگے جاکر آواز لگانے لگا۔ "جوتا پرانا سامان!"

چولھے پر چلنے کا پانی رکھ کر اور اُس میں پتی ڈال کر پڑوسن باہر نکلی کہ بتوا کو دیکھ لوں تو دیکھا گلی میں بچّہ نہیں ہے۔ اِدھر اُدھر تلاش کرتی ہوئی دوسرے کنارے پر گئی تو دیکھا بتوا نہیں۔ جھونپڑیوں کے پیچھے صرف اُس کا گڈیلنا پڑا ہوا ہے۔

۵

اُسی شام کو بتوا کو (جو اب ہوش میں تھا) ایک اچھا سا بابا سوٹ پہنا کر وہی دونوں آدمی ایک عالیشان فلیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔

نوکر سے ایک نے کہا۔ "صاحب اور میم صاحب سے کہو، ہم بچّہ لے آئے ہیں۔"

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور اُس کی موٹی سی بیوی داخل ہوئے اور بچّے کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"بچّہ تو بہت پیارا ہے۔" سیٹھانی نے کہا۔

"اس کا نام کیا ہے؟" سیٹھ نے پوچھا۔

بڑی بڑی مونچھوں والے نے چیچک کے داغوں والے کی طرف دیکھا۔ اور سیٹھ سے کہا۔ "یہ اس کے باپ ہیں۔"

چیچک کے داغوں والے نے کہا۔ "حضور، اِس کا نام مُنّا ہے۔"

"کیوں مُنّا ہمارے پاس رہو گے؟" سیٹھانی نے پوچھا۔

بتوا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی اُس کو بولنا ہی نہیں آتا تھا۔ صرف چلنا آتا تھا، وہ بھی گڈیلنے کے سہارے۔

"رہیگا کیوں نہیں حضور۔ مگر اِس کو پیار سے رکھیئے گا۔" چیچک رو آدمی کی آنکھوں میں اب ڈرامائی آنسو تھے۔ "بن ماں کا بچّہ ہے۔ اِس کو جُدا کر کے میرے کلیجے پر تو چھریاں چل رہی ہیں. حضور۔ مگر کیا کروں۔ اسی کی بھلائی کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔"

سیٹھانی نے بچّے کو گود میں لے لیا۔

سیٹھ نے پانچ سو روپے چیچک رو آدمی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اور کہا "شکریہ بھائی۔ تمہاری مہربانی سے ہمارے من کی سوکھی بگیا میں بھی بہار آجائے گی۔ اطمینان رکھو، ہم اسے اپنا بچّہ سمجھ کر پالینگے۔ تم جب چاہو آکر اسے دیکھ سکتے ہو۔"

"بھگوان آپ کا بھلا کرے۔" نقلی باپ نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا بیٹا منّا۔ اب ہم جاتے ہیں۔ بھگوان تمہیں سُکھی رکھے۔"

اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔

فلیٹ کا دروازہ بند ہوتے ہی نوٹوں کا بٹوارہ ہو گیا۔

"یہ لے بھئی تیرے ڈھائی سو۔" بڑی بڑی مونچھوں والے نے کہا۔

"مجھے پچاس اور ملنے چاہئیں۔" چیچک رو آدمی نے کہا۔

"آخر باپ میں بنا تھا۔"

"مگر تھیلے میں کس نے ڈالا تھا؟"

"کلوروفارم کس نے سُنگھایا تھا؟"

"بچّے کا پتہ کس نے لگایا تھا؟"

"تو پھر ڈھائی ڈھائی سو ٹھیک ہیں۔ چلو کوئی اور دھندا سوچیں۔ بچّے تو بہت مارے مارے پھرتے ہیں۔ لیکن بے اولادوں کا پتہ مشکل سے ملتا ہے۔"

۶

اُس دن سے بتوا کا گڈیلنا وہیں جھونپڑیوں کے پیچھے پڑا تھا۔

رحمت بخش نے اپنے بچّے کی تلاش میں سارا بمبئی چھان مارا۔ پولیس میں رپٹ لکھوائی۔ بچّے کا حُلیہ لکھوایا۔ "خوبصورت بچّہ ہے۔ گورا چٹّا ـــ نام ہے الٰہی بخش۔ مگر ہم سب بوا بوا کہہ کر پکارتے ہیں۔"

رحمت بخش جب اپنے جھونپڑے میں رات گئے واپس آیا۔ تو نہ کھایا نہ پیا۔ چُپ چاپ اپنے جھونپڑے میں چلا گیا۔ لالٹین جلائی۔ پھر پڑوسیوں کو کچھ ٹھک ٹھک کی آواز آئی۔

جھانک کر دیکھا تو رحمت بخش لکڑی کاٹ کر اُس کو خراد کر رہا تھا۔

"کیا بنا رہے ہو رحمت چاچا۔؟"

"شش ـــ بوا سو رہا ہے۔ میں اُس کے لئے گُڈّیلنا بنا رہا ہوں۔"

لوگ کہتے ہیں رحمت چاچا پاگل ہو گئے ہیں۔

مگر پاگل کسے کہتے ہیں؟

وہ کسی سے لڑتے نہیں جھگڑتے نہیں چیختے نہیں، پکارتے نہیں۔ وہ تو روتے بھی نہیں۔

صرف دن رات گُڈّیلنے بناتے رہتے ہیں۔ کوئی پڑوسی رحم کھا کر روٹی کا ٹکڑا دیتا ہے تو کھا لیتے ہیں اور پھر گُڈّیلنے بنانے لگتے ہیں۔

ایک گُڈّیلنا۔

دو گُڈّیلنے۔

تین گُڈّیلنے۔

چار گُڈّیلنے۔

پانچ، چھ، سات گُڈّیلنے۔ سارے جھونپڑے میں یہاں سے وہاں تک گُڈّیلنوں کی قطاریں لگی ہیں۔

مگر یہ گُڈّیلنے بکتے نہیں۔ یہ سب گُڈّیلنے بوا کے لئے ہیں جو (رحمت چاچا کو یقین ہے) ایک دن ضرور اپنا گُڈّیلنا لینے آئے گا۔

اور بوا کا اپنا گُڈّیلنا اِس تمام عرصہ جھونپڑپٹّی کے باہر دھوپ، بارش، آندھی طوفان میں پڑا رہا۔ جہاں سے گزرتے ہوئے بھیکو نے اُسے دیکھا۔ اور اُس کو اُٹھا کر اپنے کھٹارے پر لدے ہوئے ٹب میں ڈال لیا تھا یہ سوچ کر یہ میرے منّو کے کام آئیگا۔

دُنیا بھر کا کچرا

شام ہو رہی تھی۔ جب بھیکو کالینہ سے اپنے گھر کی طرف کھٹارا لے کر چلا۔

آج نہ جانے کیوں کھٹارا بہت بھاری لگ رہا تھا۔ کھینچتے کھینچتے اُسے پسینہ آ گیا۔ اور وہ ہانپنے لگا ـــ ایک ٹب۔ ایک اسٹوو۔ ایک موٹر کا ٹائر ـــ تیرہ فلم کے خالی ڈبّے اور ایک بچّے کا گُڈّیلنا۔ اِتنی بھاری تو کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ مگر ایسا لگتا تھا۔ جیسے کھٹارے پر پتھر لدے ہوئے ہوں۔

کھٹارے میں ٹب تھا۔ ٹب میں سب چیزوں کے اُوپر بچّے کا وہ گُڈّیلنا رکھا ہوا تھا۔

بھیکو کھٹارے کو ڈھکیل رہا تھا اور اس گُڈّیلنے کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ اُس پگلے بھکاری نے کیا کہا تھا بھلا ـــ "بیکار ہے مگر ذرا سوچو کیوں بے کار ہے؟" اِس کا کیا مطلب ہوا؟

گُڈّیلنے کو دیکھ کر بھیکو کو اپنا ـــ یا صرف بالو کا ـــ بچّہ منّو یاد آیا۔ اب منّو گُڈّلیاں تو چلنے لگا ہے ـــ بس اب گُڈّیلنے کے سہارے جلد ہی اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چلنے لگے گا۔

نہ جانے کیوں بچّے کے بارے میں سوچتے سوچتے اُس کو ایک بھیانک خیال آیا۔ کہیں بالو اُسے لے کر چلی نہ گئی ہو؟ ـــ جائے گی کہاں بے چاری؟ ـــ کہیں بھی جا سکتی ہے! ممکن ہے بچّے کا اصلی باپ ہی کہیں سے نکل آئے۔؟ تب کیا ہوگا۔؟

یہ خیال آنا تھا کہ بھیکو نے پورے زور سے جلدی جلدی کھٹارے کو ڈھکیلنا شروع کیا۔ مگر یہ کھٹارا جلدی جلدی چل ہی نہ سکتا تھا۔ تینوں پہیّے نیچے اُونچے تھے نا۔ اب دُور سے کوڑے کے ڈھیر دکھائی دینے لگے تھے۔ دو تین ٹرکیں بھی کھڑی تھیں۔ کچرا والا سیٹھ کی کالی لمبی موٹر بھی کھڑی تھی۔ جاتے ہی اِن سب چیزوں کے کم سے کم پچاس روپے آج مانگوں گا۔ دیکھوں دیتا ہے یا نہیں۔ نہیں دے گا تو کیا کرنا ہوگا۔؟ کروں گا بھی کیا ـــ جب دوسرا کوئی خریدار ہی نہیں ہے۔ کچرے کی ڈھیریاں صرف یہاں لگتی ہیں۔ یہ زمین سب کچرا والا سیٹھ کی ہے۔ اور کوئی یہ دھندا کرتا بھی نہیں ہے۔ سُنا ہے کئی لوگوں نے چھوٹے موٹے پیمانہ پر یہ دھندا شروع کیا تھا۔ مگر کچرا والا سیٹھ نے یا تو انہیں اور اُن کے کچرے کے ڈھیروں کو خرید لیا یا انہیں مار بھگایا۔ غنڈوں کو یوں بھی کمی نہیں

پگھار نہیں دیتا تھا وہ ــــ اُس نے سوچا جو بھی کچرا والا سیٹھ دیگا وہ لے لے گا۔

دو چار غنڈے ویسے بھی کچرا والا سیٹھ کے اِدھر اُدھر بوڈی گارڈ کی طرح لگے رہتے تھے۔ کھٹارے والوں سے سیٹھ جب بھی بات کرتا تھا۔ گنڈے آس پاس ضرور ہوتے تھے۔ نہ جانے کب کوئی کھٹارے والا قیمت پر اصرار کرتے کرتے سیٹھ پر حملہ ہی کر دے۔ عقل مندی اِسی میں تھی کہ سیٹھ ہر چیز کے لئے تیّار رہے۔

اب کوڑے کے ڈھیر قریب آتے جا رہے تھے۔ اُن کی بُو اُن سے بھی قریب تھی۔ ابھی دو ڈھائی سو فٹ باقی ہوں گے کہ ایک سڑی ہوئی بساند آئی، جس میں دُنیا بھر کی بدبوئیں شامل تھیں، اِسی بدبو میں کچرا والا سیٹھ ایک کوڑے کے ڈھیر پر چڑھا ہوا تھا۔ تاکہ وہ بھی دیکھ لے کہ اُس کی سلطنت کہاں تک پھیلی ہوئی ہے، اُونچائی سے کسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ شاید اپنے ٹرک والوں کو بتا رہا تھا کہ کدھر سے کچرا اُٹھانا ہے اور اُسے کہاں لے جانا ہے۔

بھیکو کی جھونپڑی اب قریب ہی تھی۔ اُس نے سوچا کچرا والا سیٹھ سامنے ہی تو کھڑا ہے کہیں بھاگا تھوڑا ہی جاتا ہے۔ کیوں نہ میں بھاگ کر پہلے بالو اور منّو کو دیکھتا چلوں۔ مجھے بھی اطمینان ہو جائے گا۔ اور اُن کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں واپس آ گیا ہوں۔

کھٹارا سڑک پر چھوڑ کر بھیکو بھاگتا ہوا بستی میں آیا۔ سیدھا اپنی جھونپڑی میں گیا۔ وہاں دیکھا کوئی نہیں ہے۔ نہ بالو اور نہ منّو۔ کہاں گئے یہ دونوں۔ باہر نکل رہا تھا کہ اُس کا پڑوسی فضلو مِلا۔ وہ بھی ابھی کام سے واپس آیا تھا۔

"فضلو بھیّا۔ کہیں میری عورت کو دیکھا ہے۔ ؟"

"بھابی ابھی کوڑے کے ڈھیروں کی طرف گئی ہے۔"

بھیکو کا ماتھا ٹھنکا۔ کوڑے کے ڈھیروں کی طرف تو کبھی بالو جاتی ہی نہیں تھی۔ اُس نے تو کچرا والا سیٹھ کی صورت بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

فضلو نے بتایا۔ "دراصل وہ منّو کو ہی ڈھونڈ رہی تھی۔ تمہارا بچہ شاید گھٹنیاں چلتے چلتے اُدھر چلا گیا ہے۔ تم بھی....."

بھیکو نے فضلو کی پُوری بات نہیں سُنی۔ اب وہ تیزی سے کوڑے کے ڈھیروں کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں کچرا والا سیٹھ کھڑا تھا۔ اور اُس کی ٹرکیں کھڑی تھیں جو کچرا لاتی تھیں۔ اور کچرا لے جاتی تھیں۔ اُس کے گنڈے کھڑے تھے اور تین چار کھٹارے والے کھڑے تھے۔ اور سب باتیں نہیں کر رہے تھے۔ خاموشی سے نیچے کوڑے کے ڈھیروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بھیکو ایک ٹرک کے پاس پہنچا جو سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ اور جس کے پیچھے کا تختہ کھلا ہوا تھا۔ شہر بھر کی گندگی بھر کر لائی ہو گی اور وہ لا کر یہاں ڈالی ہے۔ ٹرک کے پاس ایک کھٹارے والا کھڑا تھا۔ وہ بھیکو کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیوں رامو کیا ہوا ؟"

جواب دینے سے پہلے رامو جھجکا۔ پھر اُس نے اِتنا ہی کہا۔ "بھیکو تمہارا بچّہ ....." اور پھر نیچے کی طرف اِشارہ کیا۔

"منّو۔!" بھیکو نے دُہرایا۔ "کیا ہوا منّو کو....؟" اور اُس نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں کم سے کم چھ فٹ گہری کھائی کو کوڑے سے بھرا جا رہا تھا۔

بدبُو کے زہریلے انجرات کی وجہ سے بہت کم لوگوں کو ہمّت ہوتی تھی اُدھر جانے کی ــ لوگ تو عام طور سے اُدھر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

بھیکو نے نیچے نظر کی تو دیکھا کہ بالو پاگلوں کی طرح نیچے کی طرف دوڑتی جا رہی ہے۔ اور وہاں کوڑے کے نئے ڈھیر میں جو ابھی ابھی ٹرک نے لا کر ڈالا تھا۔ کُرید کر کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ بھیکو کے دماغ نے جو ایک دم سالت ہو گیا تھا۔ سوچا۔ بھلا وہاں کوڑے کے ڈھیر میں کیا ڈھونڈ رہی ہے۔ ؟ اور دفعتاً ایک بھیانک خیال اُس کے دماغ میں آیا۔

"منّو! منّو!" چلّاتا ہوا بھیکو بھی کوڑے کی ڈھلان پر سے بھاگتا ہوا نیچے کی طرف چلا۔ اُس کے پیچھے دو کھٹارے والے اور بھاگے۔ رامو اور فضلو۔

جب تک وہ وہاں پہنچے۔ بالو نے کوڑے کے ڈھیر میں نیچے سے منّو کو نکال لیا تھا۔

اب بچّے کی لاش اُس کے ہاتھوں میں تھی اور وہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ ہوا کیسے ؟" بھیکو کی آواز آنکھ کے آنسوؤں سے

رُندھی ہوئی تھی۔

رامو نے کہا۔" مجھ سے پوچھو۔ گُڈلیاں چلتا چلتا ہوا منو ٹرک کے پاس کھڑا ہوا کوڑے کے ڈھیروں کو دیکھ رہا تھا سیٹھ نے دس پیسے پھینک کر بچے کی طرف اشارہ کیا۔ بچہ" گُڈلیوں چلتا، لڑھکتا پھڑکتا نیچے کی طرف چلا۔ اُس وقت اُوپر سے ٹرک کا پچھلا پٹ کھلا اور منوں گندگی نیچے گری اور ——

بس بھیکو نے اشارے سے رامو کو منع کیا۔ وہ چلّایا نہیں، چیخا نہیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور اُس کے دل میں گہرا زخم لگا تھا۔ جس کو کوئی چیز اب بھر نہ سکے گی۔

منو کی لاش لینے کے لئے اُس نے بالو کی طرف ہاتھ پھیلا دیئے۔

مگر بالو نے سر کے اشارے سے "نا" کہا۔

اور اب وہ واپس اُوپر جا رہے تھے۔ اُدھر جدھر کچراوالا سیٹھ کھڑا تھا۔

آگے آگے بچے کی لاش لئے ہوئے بالو۔

اُس کے پیچھے بھیکو۔

اُس کے پیچھے رامو۔

کوڑے کے ایک ڈھیر کے اُوپر کھڑے ہوئے کچراوالا سیٹھ نے دیکھا کہ اُس کی پھیلی ہوئی گندگی کی بدبودار ڈھیریوں اور ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے انباروں میں سے تین آدمی اُوپر کی طرف چلے آ رہے ہیں نہیں۔ اُن میں سے ایک عورت ہے۔ اُس کی گود میں ایک بچہ ہے۔ بچہ شاید مر چکا ہے۔ شاید یہ وہی بچہ ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے دس پیسے کی خاطر نیچے لڑھکتا لڑھکتا گیا تھا۔ یہ لوگ، کچراوالا سیٹھ نے سوچا، گندگی کے ڈھیروں ہی میں سے کلبلاتے ہوئے کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور انہیں گندگی کے ڈھیروں میں ان کی موت ہوتی ہے۔ کوئی شریف آدمی اِس کا کیا کر سکتا ہے سوائے ہمدردی کے —— اور یہ لوگ شاید ہمدردی کے بھی قابل نہیں ہیں۔

کچراوالا سیٹھ کے سامنے پہنچ کر بالو ایک دم ٹھٹکی۔ پھر پیچھے ہٹی، اپنے بچے کی لاش کو اُس نے اپنے پلّو سے ڈھانپ لیا جیسے اُسے ڈر ہو اسیٹھ اُس کو چھین لے گا۔

بھیکو نے بالو کی طرف دیکھا۔ کیا وہ ایک دم پاگل ہو گئی ہے؟ بالو نے نظریں جھکا لیں۔ آہستہ آہستہ اُس کے ہونٹ ہلے۔

بھیکو نے کان اُس کے پاس لے جا کر سننے کی کوشش کی۔

"یہ سیٹھ وہی ہے۔ وہی ہے۔ منو کا اصلی باپ یہی ہے!"

"نہیں!" بھیکو کی بھیانک آواز بلند ہوئی۔

اور وہ وہاں سے بھاگا۔

سب سمجھے کہ بھیکو اپنے بچے کی موت سے پاگل ہو گیا ہے۔ پاگلوں کی طرح ہی بھاگتا وہ اپنے کٹھارے کے پاس گیا اور اُس کو ڈھکیلتا ہوا کچراوالا سیٹھ کے پاس لایا۔

"سیٹھ۔ دیکھتے ہو اِس کٹھارے میں کیا بھرا ہے؟"

سیٹھ نے کٹھارے کی طرف ایک چھچلتی ہوئی نظر ڈالی۔

"کچرا ہے اور کیا ہوگا ...؟"

"اور اب اِس کچرے ہی میں تم جا رہے ہو۔" یہ کہہ کر اِس سے پہلے کہ سیٹھ کے باڈی گارڈ گنڈے اُس کو روک سکتے۔ اُس نے پیچھے سے آ کر سیٹھ کو اتنے زور کا دھکا دیا کہ وہ اُڑتا ہوا چھ فٹ نیچے گندگی کے ڈھیریوں میں جا گرا۔ دو گنڈے اپنے سیٹھ کو بچانے نیچے جانے کے لئے پگڈنڈی ڈھونڈنے لگے۔ تیسرا بھیکو کی طرف بڑھا۔ مگر بھیکو بھی کبھی گنڈا تھا۔ کھوٹا دھندا کرتا تھا۔ مار دھاڑ، چاقو چلانا جانتا تھا۔ اور اِس وقت تو اُس کی طاقت غصّے اور جنون کی قوت تھی۔ گنڈے نے ایک وار کیا۔ مگر بھیکو نے اُس کو مار مار کر بھرتہ بنا دیا۔ پھر اپنے کٹھارے میں سے وہ ساری چیزیں اُتار اُتار کر بھیکو نے نیچے پھینکنی شروع کیں۔ جہاں کچراوالا سیٹھ گندگی میں سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پہلے ہی اُس کے ہاتھ میں گڈیلنا آیا (اُس نے کبھی سوچا تھا اُن کا منو اِس کے سہارے چلنا سیکھے گا۔ مگر وہ تو اپنی ننھی ننھی ٹانگوں پر بہت دُور چلا گیا تھا!) اُس کو گھما کر مارا تو سیٹھ کے سر میں لگا۔ اور سیٹھ کچرے کے ڈھیر میں پھر گر گیا۔ اٹھا نہیں تھا کہ ایک تانبے کا اسٹوو اُس کی کمر میں آ کر لگا۔ پھر فلم کے خالی ڈبّوں کی بارش ہونے لگی۔ اُوپر سے ایک رتھ کا ٹائر آیا اور ان سب کے بعد ایک سفید لوہے کا ٹب اُڑتا ہوا آیا اور عین سیٹھ کے اُوپر گرا —— اور اُس کے وزن سے سیٹھ زہریلی گندگی میں اور دھنس گیا اور ٹب کی سفید قبر میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔!

اب کٹھارے والوں، آس پاس کے گزرنے والوں کی

بھیٹر لگ گئی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کیا ہوا بھائی۔؟"

"کسی کو مار ڈالا کیا؟"

"ہاں اِس آدمی نے کچرا والا سیٹھ کو اُٹھا کر نیچے پھینک دیا ہے۔"

بھیکو نے دانت پیس کر کہا۔ "کچرا والا سیٹھ نہیں۔ کچرے کو کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیا ہے۔"

پولیس نے آکر بھیکو کو گرفتار کر لیا تو اُس نے پہلی بار اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو اب بھی اپنے بچّے کی لاش کو آنچل سے ڈھانپے اور کلیجے سے لگائے کھڑی تھی۔ مگر اُس کی آنکھوں میں کوئی پہچان نہیں تھی۔ کوئی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ وہ گُم سُم تھی۔ ایک پتھر کی مورتی کی طرح مگر پتھّر کی مُورتی کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے۔

بھیکو اب چودہ برس کے لئے جیل میں ہے۔ جہاں ہر ہفتہ جس دن جیل خانے کی صفائی ہوتی ہے اُس سے کچرا ڈھونے کا کام لیا جاتا ہے۔

بالو اب پاگل خانے میں ہے جہاں وہ ہر وقت ایک موم کی گڑیا کو گود میں لئے لوریاں سُنایا کرتی ہے۔

منّو کو رامو اور فضلو اور بھیکو کے دوسرے ساتھیوں نے کوڑوں کے ڈھیر کے پاس ہی دو فٹ زمین میں دفنا دیا ہے۔ ایک ننھی سی قبر بھی بنا دی ہے۔ وہاں دو چار پھولوں کی جھاڑیاں بھی لگا دی ہیں۔ سُنا ہے اُس قبر پر آج کل بڑے خوبصورت گُلاب کے لال لال پھول کھِلے ہیں۔ اور ممکن ہے یہ واقعہ نہ ہو۔ صرف ہماری خواہش ہو۔!

▲

عہدِ ماضی کا ایک مختصر ترین ناولٹ

شہر لکھنؤ جو اہلِ کمال اور اہلِ فن کا گہوارہ تھا۔ جہاں کی تہذیب لاجواب، تمدّن انتخاب اور اخلاق اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ جہاں کی نفاست اور نزاکت کے افسانے ہمیشہ سے مشہور چلے آئے ہیں۔ وہاں کسی زمانے میں ایک پہلوان رہا کرتے تھے۔ وہ اپنی پہلوانی کے ساتھ ساتھ اپنی خوراک میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ بیک وقت ایک بکرے کی یخنی اور گوشت اُن کا روزانہ کا معمول تھا۔ ہوتے ہوتے ان کے کھانے کی شہرت نواب صاحب تک بھی پہنچی۔ نواب سُن کر زیرِ لب مسکرائے۔ حکم دیا کہ پہلوان کو دعوت نامہ بھیجا جائے۔ میرِ مطبخ کو خبر دی جائے اور کھانے کی تیّاری کسی باکمال کے سپرد کی جائے۔ ہم بھی دیکھیں کہ پہلوان کس طرح ایک بکرا ہضم کر جاتے ہیں۔

چنانچہ پہلوان بصد ذوق و شوق دعوت میں آئے۔ کھانے کا وقت ہوا لیکن دسترخوان نہ بچھا۔ پہلوان بھوک سے بےتاب ہونے لگے۔ تہذیب مانع تھی۔ مجبور ہو کر وقت دریافت کرنے پر ہی اکتفا کی۔ نواب صاحب بھی اشارہ سمجھ گئے۔ فرمایا ذرا توقّف فرمائیں۔ ابھی کھانا تیّار ہوا جاتا ہے۔ بس ذرا سی کسر ہے۔ اِسی طرح ہوتے ہوتے کافی وقت گزر گیا۔ پہلوان کا بھوک سے بُرا حال ہونے لگا۔ مزاج کی برہمی کی وجہ سے اُن کی پیشانی شکن آلود دیکھ کر اور نواب صاحب کا اشارہ پاتے ہی ایک بہت بڑا خوان اُن کے سامنے لایا گیا۔ پہلوان ایک چھوٹی سی طشتری میں دو چھٹانک بریانی رکھی دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے کہ یہ کیا مذاق ان کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ پُورا ایک بکرا کھانے والے پر دو چھٹانک بریانی کا کیا اثر ہوگا۔ نواب صاحب نے اس وقت، موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بڑی انکساری سے کہا۔ آپ کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اس لئے یہ منگوایا ہے۔ آپ ذرا اِسے چکھیں۔ اتنے میں دسترخوان ابھی لگا جاتا ہے۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش پہلوان نے بریانی کھا لی۔ پندرہ منٹ بعد نواب صاحب نے کھانا لگانے کا حکم دیا۔ اور پہلوان سے کہا۔ آیئے کھانا حاضر ہے۔ لیکن پہلوان نے کہا۔ حضور اِس بریانی سے ہی خوب شکم سیر ہو گیا ہوں۔ مزید کھانے کی گنجائش نہیں۔ اُس وقت پہلوان کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ غذا کی اہمیت وزن سے نہیں۔ مقوّی اور لذیذ اجزاء سے ہوتی ہے۔

صحت بخش اور لذیذ غذاؤں کی یہ روایات آج بھی زندہ ہیں۔

کوثر چاندپوری

گونگا

ہے

بھگوان
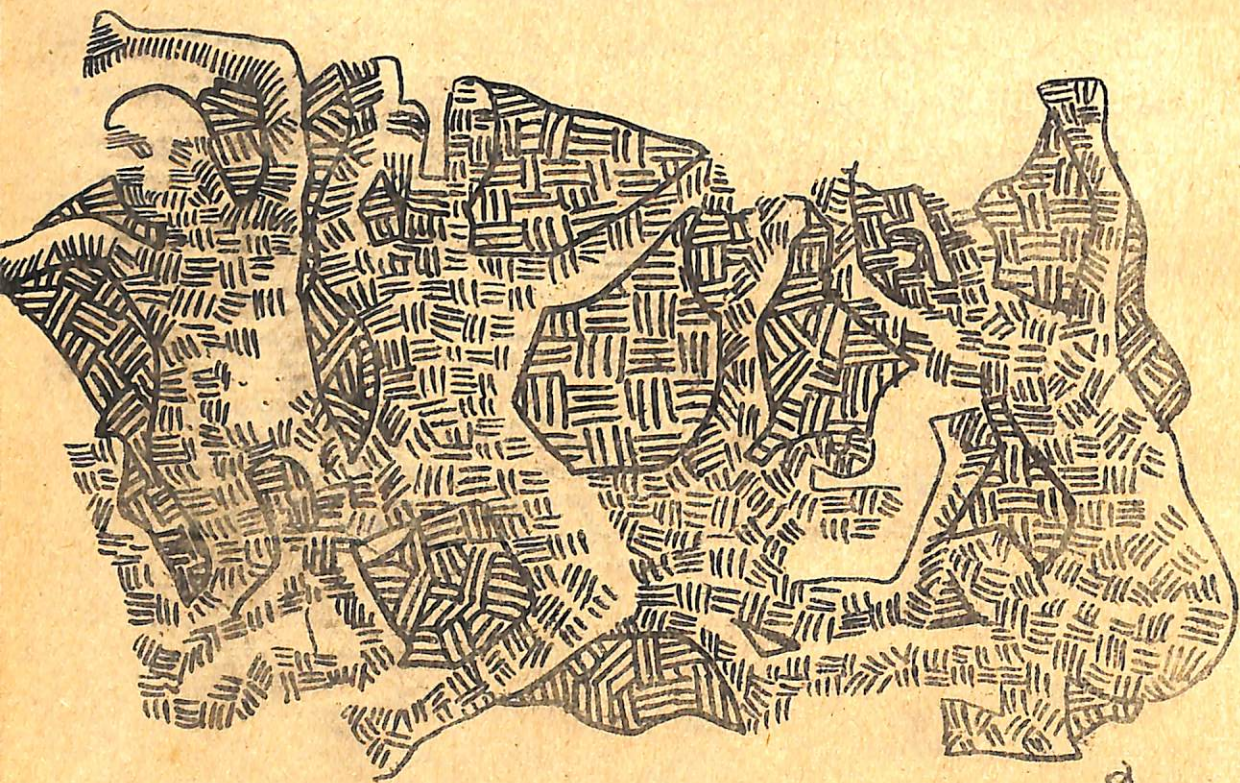
کوثر چاند پوری

چاند پور ضلع بجنور (یو۔ پی) میں ۸ اگست ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پھر بھوپال پہنچ کر آصفیہ طبیہ کالج میں داخل ہو گیا۔ بھوپال ہی کے محکمۂ طباعت میں ملازم رہا۔ جب تک باہر رہا سیر و شکار میں وقت گزارا۔ لکھنے سے بہت زیادہ دلچسپی رہی۔ شروع میں انشائیے لکھے جو کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک انشائیہ افسانہ ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب "اردو کے بہترین انشائیے" میں شامل ہے۔ ۱۹۳۰ء یا اس سے ذرا پہلے سے افسانے اور تاریخی مضامین بھی لکھنے لگا۔ اسی زمانے میں "بیرم خاں ترکمان" کے سوانحِ حیات بڑی تحقیق و کاوش سے قلمبند کیے۔ یہ کتاب شائع ہونے کے بعد بہت مقبول ہوئی۔ روسی محقق غضنفر علی یوف نے اپنے تحقیقی مقالے میں اس کا حوالہ دیا ہے یہ مقالہ روسی زبان ہی میں لکھا گیا ہے اور بیرم کو ترکمانی زبان کا پہلا شاعر ثابت کیا گیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مطبوعہ لندن میں بھی ایک مقالہ اس کتاب کے حوالے سے شائع ہوا ہے۔ تنقیدی اور تحقیقی مضامین کافی لکھے ہیں۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اب تک ایک درجن ناول اور اتنے ہی افسانوں کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے آغاز تک بھوپال میں رہا۔ پھر اسی سن میں دہلی آ گیا۔ ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم میں میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ میں نے کسی ادبی یا سیاسی جماعت سے باقاعدہ تعلق قائم نہیں کیا۔ انسانیت کی فلاح اور انسان کی سربلندی اور خوشحالی کے لئے لکھتا رہا اور اب بھی لکھ رہا ہوں۔ مذہبی اور جغرافیائی حد بندیوں کا قائل نہیں۔ تمام دنیا میں پھیلی ہوئی انسانیت کو ایک برادری سمجھتا ہوں۔ مظلوم اور کچلے ہوئے عوام کو خوشحال اور مسرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ ادب کو انہیں مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہوں۔ محبت کو ایک ایسا جذبہ خیال کرتا ہوں جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔ سماجی اور اقتصادی ناہمواریوں کو دور کرنے اور اشتراکی سماج قائم کرنے کی بیتاب تمنائیں رکھتا ہوں۔ وقت کی تبدیلیوں پر نظر رکھتا ہوں، جو ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ اس کی تبدیلی اور ارتقائی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا قائل ہوں۔ خلوص کا ہمیشہ سے پرستار رہا ہوں۔ موجودہ معاشرے میں اسے حماقت سمجھا جاتا ہے، میں دانشوری سے تعبیر دیتا ہوں۔ آدمی مخلص نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

(خود نوشت)

گونگا ہے بھگوان

کوثر چاندپوری

۱

چلتے چلتے عزیز کی نگاہیں اوپر اٹھ گئیں۔ آسمان ابر آلود تھا۔ سفید اور کالے بادل اِس طرح آگے پیچھے دوڑ رہے تھے جیسے افریقہ کے سیاہ رنگ باشندے یورپ کی سفید فام اقوام سے آگے نکل جانے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ ایک شفاف ٹکڑا امن کے پرچم کی مانند اُس کے سر پر لہراتے لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکے دل میں بھڑکتی ہوئی اشتیاق کی آگ کو اور بھڑکانے لگے۔ وہ تیزی سے اسکوٹر کی طرف لپکا۔ جو قریب ہی سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ ڈرائیور پیڈل پر ٹانگ جمائے بیڑی سُلگانے کی دُھن میں لگا ہوا تھا۔ ماچس ہر بار بُجھ جاتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے امن کی خنک ہوائیں لڑائی کے شعلوں کو بھڑکنے سے روک رہی ہوں۔ وہ برسات کی بہار آفریں فضا کو گرمی کے زہر سے بچانا چاہتی ہوں۔ ڈرائیور جُھنجلا کر آخری تیلی پھینکنے ہی والا تھا کہ عزیز نے اُس کی اُلجھن کا اندازہ کئے بغیر گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔

اسٹیشن!

صرف اتنا کہنے سے بات نہیں بنتی۔ دو ہیں اسٹیشن۔ ایک نئی دِلّی کا، دُوسرا پُرانی دلّی کا۔ کہاں چلوں؟

نئی دلّی، کیا لوگے؟ دونوں سوال آگے پیچھے اِس طرح ہونٹوں سے ٹپک پڑے جیسے بارش کی بوندیں آسمان سے زمین پر برس جاتی ہیں۔

جو میٹر بتائے گا بادشاہو۔ ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ہونٹوں میں دبی ہوئی بیڑی پھینک کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اسکوٹر بے ہنگم سی آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہوگیا اور بیسویں صدی کے برقی کچھوے کی مانند سڑک پر دوڑنے لگا۔ عزیز دونوں جانب سجی ہوئی دکانوں سے بے نیاز آگے آنے والے مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے منزل قریب آتی جا رہی ہو اور شانتا کی رنگین ساری ہوا میں پھڑپھڑا کر اُس کا خیر مقدم کر رہی ہو۔ اُس نے شانتا کو دیکھا نہ تھا مگر اُس کے خطوں نے جذبات کو اپنا محکوم بنالیا تھا۔ پانچویں خط کے ساتھ جب اُسے شانتا کی تصویر ملی تو اُس نے چند بار غور سے دیکھا۔ لبوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔ پھُول کی تازہ پتّیوں کے سے مہکتے ہوئے رنگ تھے۔ آنکھوں میں بھرے آنسوؤں میں معصومیت اِس طرح گھل گئی تھی جیسے شکر نمکین پانی میں حل ہوگئی ہو۔ محبت اور انسانیت کے نقوش یوں گڈ مڈ ہوگئے تھے کہ انہیں اُلجھے ہوئے تاروں کی طرح الگ الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انسانیت سے محبت اور محبت سے انسانیت الگ ہے بھی نہیں۔ اُن کے تانے بانے خُوب گُتھے ہوئے ہیں۔ دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں۔ اِنہی دو چیزوں کی بدولت اُسے شانتا سے ایک ایسا ربط پیدا ہوگیا تھا جس کا تجزیہ کرنے کے بعد بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس کی تہہ میں کوئی ایسا جذبہ کارفرما ہے جس کو ذوقِ جمال یا کسی ایسی ہی چیز سے موسوم کیا جا سکے۔

کیا شانتا رو رہی ہے، اُس نے تصویر دیکھ کر سوچا تھا۔

رونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔

عورتیں بے وجہ بھی تو رونے لگتی ہیں۔

اِس دَور کی عورتیں بے وجہ ہنس سکتی ہیں، رونے کی اُنہیں عادت نہیں۔

بہرحال عورت مختلف عناصر کا ایسا مجموعہ ہے جس میں ہنسنے اور رونے کی حِس بڑی فراوانی سے موجود ہے۔

شانتا اور عزیز کے تحریری تعارف کا آغاز عزیز کے تحقیقی مقالے کی بنا پر ہوا تھا جس کا عنوان تھا:

ہندوستان کی آزادی کا پس منظر

یہ مقالہ انگریزی میں شائع ہوا تو سب سے پہلا

حوصلہ افزا خط جو اُسے وصول ہوا وہ شانتا دت نے احمد آباد سے لکھا تھا۔ اُس نے دل کھول کر طرزِ بیان اور ریزن ایبل ریسرچ کو سراہا تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ دونوں ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے۔ یہاں تک کہ تصویروں کے تبادلے کی نوبت آ گئی۔ پھر شانتا نے اُسے احمد آباد آنے کی دعوت دیتے ہوئے لکھا۔

یہاں بہت بڑا صنعتی علاقہ ہے۔ اِسی میں باپو نگر اور گومتی پور ہے۔ یہاں سندھی مارکیٹ ہے اور سابرمتی دریا ہے جو شہر کو دو حصّوں میں بالکل اِس طرح بانٹتا ہے جیسے سُہاگن کی سیندور بھری مانگ سر کو دائیں بائیں دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اِسی کے کنارے شہر کے شمالی رُخ پر آشرم ہے جہاں سے پچاس سال تک محبّت، امن اور بھائی چارے کی میٹھی آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں جس نے اہنسا کے سمندر کو ایک بوند میں موجیں مارتے نہیں دیکھا وہ یہاں آئے اور یہ تماشہ دیکھے۔

وہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے بے حد مشتاق تھے۔ عزیز اس وقت احمد آباد ہی جا رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ جاتے ہی اپنے وجود کو شانتا کی ہستی میں سمو دے۔ اس طرح نفرت اور دُوری کی وہ خلیج باقی نہ رہے جو دو قوموں کے درمیان اب تک موجود تھی سیاسی جماعتیں اسے پُر کرنے کی جگہ اور بڑھا رہی تھیں۔ شانتا کا ایک جملہ اس کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔

ملک کو اُس نسل کی ضرورت ہے جس کی نسوں میں مِلا جلا خون ہو۔

اُس نے واضح طور پر کوئی بات نہیں لکھی تھی پھر بھی اپنا دل کھول دیا تھا اور عزیز دیر تک اس میں جھانکتا رہا تھا اور اب وہ اُس شہرِ نگاراں کی طرف چل پڑا تھا جہاں دن رات چمنیوں کا دھواں حسین دوشیزاؤں کی سیاہ زلفوں کے مانند بکھرا رہتا ہے اور آدمی کو محنت اور اس کے نتائج کی رعنائی کا یقین دلاتا رہتا ہے۔ اسی گنجان شہر کے ایک کونے سے آزادی کے سُورج کی وہ کرن پھوٹی تھی جو اب دلّی کے قلزمِ خوں میں ڈوب کر ابدی بن چکی ہے۔

اسکوٹر اسٹیشن کے سامنے مقررہ جگہ پر رک گیا۔ ڈرائیور نے بھینگی آنکھوں سے میٹر دیکھتے ہوئے کہا۔

دو بیس۔ سامان کا ایک روپیہ الگ ہوگا۔

عزیز نے تین روپے بیس پیسے ڈرائیور کو دے دیئے۔ اور سامان قلی کے سر پر رکھوا کر مسافر خانے میں چلا گیا جہاں انسانوں کا ہجوم جمنا کی طغیانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر نئے نئے تاثرات کی جھلک تھی۔ بیکاری اقتصادی دباؤ، عشق و محبّت کی بے چینی، بچّوں کا خیال، بیوی کی فرمائش پوری نہ کر سکنے کا ملال۔ غرض ہر شخص کا چہرہ ایک ایسا دفتر تھا جس پر ملک کی پندرہ زبانوں میں نئے نئے انداز کی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ سب کا رسم الخط الگ تھا۔ اور مضمون بھی جُداگانہ تھا۔ عزیز برتھ پہلے ہی ریزرو کرا چکا تھا۔ احتیاط کے طور پر اس نے ہولڈال، سوٹ کیس، اٹیچی اور دوسری چیزوں کا وزن بھی کرا لیا۔ قلی کہتا ہی رہا کہ آپ اس سے زیادہ بھاری اسباب لے جا سکتے ہیں۔ دوسرے دو مسافروں نے محصول ادا کرنے کے بعد ونڈو سے منہ پھیرا تو ایک بولا

آزادی کے دو دہائیاں بیت چکیں اور مہنگائی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہر چیز سونے کے مول بک رہی ہے۔ بابو نے بارہ روپے جھٹک لئے مجھ سے اِن تین بنڈلوں کے۔

دوسرا بھی سات روپے دے کر خوش نہ تھا۔ بولا صرف مہنگائی ہی نہیں بڑھی بے روزگاری اور لڑائی جھگڑوں کا مسئلہ بھی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور نہ جانے کب تک یہی کیفیت رہے گی۔

عزیز گیٹ کی سمت چلا ہی تھا کہ اس کی نگاہ تھرڈ کلاس کاؤنٹر کے سامنے لگے ہوئے کیو میں اُلجھ کر رہ گئی لوگ آہستہ آہستہ آگے سرک رہے تھے۔ ایک موٹا تازہ ادھیڑ عمر کا دیہاتی لمبے لمبے سانس لیتا کچلے ہوئے کیڑے کی مانند کھڑکی کے رُخ پہ رینگ رہا تھا۔ اچانک وہ ذرا ٹھٹکا۔ ہلکی سی کھانسی آئی اور زمین پر گر پڑا

اسی لمحے اُس کی جگہ پچھلے شخص نے حاصل کرلی جیسے اُسکا گرجانا کوئی بہت بڑا چانس ہو۔

کیا مرگیا؟ ایک آواز آئی۔ انداز سوالیہ تھا، ہمدردانہ نہیں تھا۔

ہارٹ اٹیک ہوا ہوگا۔

عزیز نے قلی کو وہیں ٹھہرنے کی ہدایت کی اور لاش کے قریب پہنچکر اسے ہلاجلا کر دیکھا۔ واقعی وہ ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ عزیز سوچنے لگا، بڑھے ہوئے کرایے پر تیسرے درجے کا ٹکٹ لینے کے لئے بھی جان دینی پڑتی ہے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں تو لوگ مرتے ہی رہتے ہیں، اب مسافر خانوں میں بھی کھڑکی تک پہنچنے کی کوشش میں دل فیل ہونے لگا۔

کیوں ہوتا ہے ہارٹ اٹیک ہمارے دیس میں ڈیڈی؟ ایک خوبصورت دوشیزہ نے جو ٹیڈی ڈریس پہنے ہوئے تھی، مُردے کو حیرت کے ساتھ زمین پر پڑے ہوئے دیکھ کر سوال کیا۔

وہ تو امریکہ اور انگلینڈ میں بھی ہوتا ہے۔ بلکہ اس طرح مرنے والوں کا اوسط وہاں زیادہ ہے۔ ڈیڈی جو شاید پارلیمنٹ کے ممبر تھے، تعلیم یافتہ بیٹی کو مطمئن کرنے کے لئے اپنی رائے میں بہت عمدہ بات کہہ چکے تھے۔ اُسی وقت کوئی اور بول اُٹھا۔

آپ بھول رہے ہیں، وہاں زیادہ کھانے پینے سے اس قسم کی موتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں ان کے پس منظر میں بھوک، بیکاری اور طرح طرح کی دماغی پریشانیاں کام کررہی ہیں۔ بولنے والا غالباً مخالف گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔

عزیز کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ کیو میں لگے ہوئے اُمیدوار ٹکٹ لے کر گیٹ میں داخل ہوتے جارہے تھے۔ عزیز بار بار رسٹ واچ دیکھ رہا تھا۔ وقت بہت دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یقیناً وہ اس مُردے کی رُوح کا بوجھ کندھے پر رکھ کر دوڑ نہیں سکتا تھا۔ ابھی کیو ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کی لمبائی ضرور کم ہوگئی تھی کہ پندرہ سولہ سال کا ایک نوجوان بڑی مایوسی کے ساتھ کھڑکی سے واپس ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

کیا بات ہے، رونے کیوں لگے؟ عزیز نے پُوچھا۔

ٹکٹ نہیں دیا بابُو نے۔

کیوں؟

پیسے زیادہ مانگتا ہے۔ میرے پاس دو رُوپے ہیں۔

کہاں جاؤ گے؟

متھرا۔

گھبراؤ مت۔ میں ابھی ٹکٹ لاتا ہوں تمہارے لئے۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوا تیزی سے فرسٹ کلاس ونڈو پر گیا اور چند منٹ کے اندر ہی ٹکٹ نوجوان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

آؤ میرے ساتھ۔

عزیز فرسٹ کلاس بوگی کے آگے جا کھڑا ہوا۔ نوجوان نے اندر جھانک کر دیکھا اور سہم کر بولا

یہاں نہیں بیٹھوں گا۔

کیوں؟

ڈیوڑھا درجہ ہے، پیسے بہت دینے پڑیں گے۔

ٹکٹ موجود ہے تمہارے پاس، ڈرنے کی کیا وجہ ہے۔

نہ جانے تم مجھے کہاں لے جارہے ہو۔ تم بیٹھو، میں تیسرے درجے میں جارہا ہوں۔

جہاں میں بیٹھتا ہوں وہیں تم بیٹھو۔ کیا کچھ فرق ہے ہم دونوں میں۔ دیکھو میرے اور تمہارے ٹکٹ کا رنگ بالکل ایک ہے۔

تم بڑے آدمی ہو، میں کسان ہوں۔

کسان دیس کا سب سے بڑا آدمی ہے۔ وہ اناج پیدا کرتا ہے جس کو ہم کھاتے ہیں۔ کسان نہ ہوتا تو ہم اب تک باہر سے منگایا ہوا غلّہ ہی کھاتے رہتے۔

گارڈ ہری جھنڈی اوپر اُٹھا کر منہ میں وسل دبا چکا تھا۔ عزیز نے نوجوان کو بوگی میں ڈھکیلتے ہوئے کہا

جو بوئے گا وہ کاٹے گا
چھیننے والا جائے گا
نیا زمانہ آئے گا

بہت دنوں سے یہی سُن رہے ہیں۔ آخر کب آئے گا نیا زمانہ اور ہمارے لئے کیا لے کر آئے گا۔ برتھ پر لیٹے لیٹے ایک شخص نے عزیز کو مخاطب کیا۔

بس آرہا ہے۔ اس کی چاپ سُنائی دے رہی ہے۔ بڑی گھن گرج کے ساتھ آرہا ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی اور اس کے آنے پر ہی اینجلز کے اِس قول کی سچّائی معلوم ہوگی۔

Physical labour happened before mental labour.

کیا مطلب؟

یعنی جسمانی محنت کو دماغی محنت پر ترجیح ہے ــ میں پروفیسر کی حیثیت سے روپیہ کما کر یہاں بیٹھ سکتا ہوں تو یہ کِسان جو سچ مچ ملک کا اَن داتا ہے، جسمانی ورزش میں پسینہ بہاکر میرے پاس کیوں نہیں بیٹھ سکتا۔ اُونچ نیچ اگر پیدائشی نہیں تو اسے مِٹنا ہی چاہیئے۔

وہ تو مٹ ہی رہی ہے۔ راجے مہاراجے اور نواب لوگ صرف "شری" رہ گئے۔

بالکل ٹھیک کہا آپ نے ــــ کیا نام ہے تمہارا؟

عزیز نے برتھ والے مسافر کو مطمئن کر کے نوجوان سے سوال کیا۔

عجب سنگھ

یقین کرو عجب سنگھ، بنجر زمین پر ہل چلانے کا کام کاغذ پر قلم چلانے سے زیادہ قیمتی ہے۔

عجب سنگھ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے عزیز اُسے چاند کی طرف لے جا رہا ہے۔ وہ زمین سے بہت اونچا ہو گیا تھا۔ وہ عزیز کی باتیں سُن کر تعجب کرتا رہا۔ اُس کے نزدیک عزیز جو دیکھنے میں شریف معلوم ہو رہا تھا، جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ زمینداری ختم ہو سکتا ہے تو وہ وقت بھی آسکتا ہے جب زمین جوتنے اور بیلوں کی دُم مروڑنے والے کسان کو بھی کوئی اُونچی جگہ مِل جائے۔

گاڑی پہلے آہستہ اور پھر بہت تیز دوڑنے لگی ــــ مناظر بدلنے لگے، بالکل وقت اور زمانے کی طرح، روایات اور اقدار کی مانند۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وقت کا آبشار ترکِ موالات، عدم تشدّد اور ستیہ گرہ کی منزلوں سے گذر کر زمین ہتھیاؤ کی تحریک اور صرفِ خاص کی منسوخی تک پہنچ چکا ہے۔ آگے نہ جانے کونسا مرحلہ آنے والا ہے۔ عزیز کے دماغ میں خیالات کا ہجوم ہو گیا۔ وہ عجب سنگھ اور برتھ پر لیٹے ہوئے دوسرے مسافروں کو بھول کر شانتا کے تصوّر میں گُم ہو گیا۔ شانتا جس سے ملنے کا شوق دل میں لئے وہ ایک ایسے شہر کی جانب جا رہا تھا جو اُس کے لئے بالکل نیا تھا۔ اس نئے شہر کی آغوش میں اس کے لئے مسرّتوں کا بہت بڑا خزانہ تھا۔ شوق اور اُمید کے ستارے اس کے تصوّر میں جگمگاتے رہے۔ گاڑی اور زیادہ تیز ہو گئی اور مناظر کی تبدیلی کا اندازہ لگانا بھی دُشوار ہو گیا ــــ اور جس وقت عجب سنگھ متھرا کے اسٹیشن پر اُترنے لگا تو عزیز چونک کر خیالات کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ ٹرین رُکتے ہی اس نے کھڑکی کھول دی۔ عجب سنگھ نے تشکر آمیز نگاہوں سے اس کو دیکھتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

جے ہند!

عزیز نے جواب میں یہی الفاظ دُہرا دیئے اور عجب سنگھ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جو بہت احتیاط سے چل رہا تھا جیسے فرسٹ کلاس میں بیٹھ کر اس نے کوئی بہت بڑا جُرم کیا ہو، جس کی سزا فوراً ہی ملنے والی ہو۔ اس کے بعد عزیز برتھ پر لیٹ گیا۔

۲

بڑودے پر گاڑی تبدیل کرنی تھی۔ وہ احمد آباد جانے والی ٹرین پر سوار ہو گیا۔ پورا کیبن خالی تھا۔ وہ آرام سے لیٹ کر کتاب دیکھنے لگا۔ زیادہ دیر تک پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ ڈبے میں بہت سے آدمی آگئے اور اُنہوں نے خالی برتھوں پر قبضہ کر لیا۔

فوراً ہی عزیز کی توجہ اُن دو عورتوں نے جذب کر لی' جنکے ہاتھ میں ایک ایک پرس تھا۔ قلی کے سر پر ایک بکس اور ہولڈال تھا۔ اس نے بکس سیٹ کے نیچے سرکا دیا اور ہولڈال برتھ پر رکھ دیا۔ عورتیں اِدھر اُدھر دیکھنے میں مصروف رہیں۔ ایک نے قلی کے ہاتھ پر دو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ وہ سلام کر کے چلا گیا۔ ان دونوں کی عمر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک پچیس سال کی ہوگی' دوسری تیس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ لباس بالکل یکساں تھا۔ وہ ذرا دیر بعد برتھ پر بیٹھ گئیں جو غالباً انہیں کے لئے مخصوص تھی۔

میں کھڑکی کے پاس بیٹھوں گی جسودا بہن۔

جسودا نے کچھ نہیں کہا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی' پھر وہ سنجیدہ ہو گئی۔ چند منٹ بعد بولی

فریدہ تم نے بال بھی نہیں سنوارے۔

وقت اتنا کم تھا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ انجینیر صاحب کو دورے پر جانا تھا۔ میں تمہارا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکی تھی۔ ادھر گھر چھوڑتے وقت نہ جانے کیوں دل دھڑکنے لگا اور آنکھیں بھر آئیں۔

دھڑکنیں تو تمہارے دل کے لئے وقف ہو چکی ہیں۔ نہ جانے تم کتنی مرتبہ ان دھڑکنوں کا رونا رو چکی ہو۔ اتنا اچھا ساتھی مل گیا' اب کس کے لئے دھڑکتا ہے تمہارا دل؟

ہزاروں غم ہیں دنیا میں دنیا میں جسودا بہن۔ فریدہ نے لمبا سانس لے کر کہا۔

عزیز ان کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ جسودا اور فریدہ کا تعلق الگ الگ فرقوں سے ہے۔ فریدہ کی ساڑی کا پلو بار بار شانوں سے نیچے سرک آتا تھا۔ وہ عجلت کے ساتھ اسے ٹھیک کر لیا کرتی تھی۔ عزیز نے غور سے فریدہ کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر پان کی ہلکی سُرخی تھی۔ دانتوں میں سیاہ ریکھیں جمی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پان بہت کھاتی ہے۔ لیکن پاندان ساتھ نہیں تھا۔ اس کے گورے رخساروں پر شفق سی کِھلی ہوئی تھی' جو قدرتی تھی' مصنوعی نہیں تھی۔ فریدہ کا قد لمبا نہیں تھا۔ بالکل چھوٹا بھی نہ تھا۔ بس درمیانہ تھا۔ آنکھوں میں خمار تھا۔ اس کی تہہ میں تجسس کا جذبہ رقص کر رہا تھا جیسے وہ کوئی چیز تلاش کر رہی ہو' کوئی خط یا تصویر۔ جسودا ذرا گداز بدن کی تھی۔ اُس کے گال پھولے ہوئے تھے۔ وہ بہت لمبی تھی۔ ایک دم مرد کی طرح دراز قامتی نے حُسن کے ساتھ ہی اُس کے وقار میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ بظاہر وہ بہت متین اور خاموش معلوم ہو رہی تھی لیکن بڑی بڑی شربتی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک کے ساتھ ایک شریر سی شوخی بھی تھی۔ چھت میں بجلی کا چھوٹا سا پنکھا نہایت بے تابی سے گھوم رہا تھا۔ وہ اپنی مسلسل حرکت سے سُکون کی نفی کر رہا تھا' جیسے زندگی اور سکون میں کوئی ربط ہی نہ ہو۔ فریدہ نے پنکھے کو دیکھا۔ اُس کی نگاہیں اس کی جُنبشوں پر مرکوز ہو گئیں۔

کیا دیکھ رہی ہو فریدہ؟

کچھ نہیں   پنکھے کا ناچ مور کے ناچ سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔

ٹھیک ہے' مصنوعی چیزوں میں اصلی چیزوں سے زیادہ دلکشی ہوا کرتی ہے۔ افسانہ حقیقت کے مقابلے میں ہمیشہ دلفریب ہوتا ہے۔

فریدہ نے باتیں کرتے کرتے پرس کھول کر پانوں کا ڈبہ نکال لیا اور ایک بیڑا جسودا کو دیتے ہوئے بولی

مُنہ کھولو جسودا رانی

نہیں کھاؤں گی۔

بس ایک کھالو۔

دوسری گلوری اُس نے اپنے ہونٹوں میں دبالی۔ جسودا نے عزیز کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

ان سے بھی پوچھ لیا ہوتا۔

فریدہ نے عزیز کو دیکھا جس کی آنکھیں اُسی پر مرکوز تھیں۔

پان حاضر ہے!

شکریہ! ــــ لائیے۔

اس کے ذہن میں دیر سے مختلف سوالات گھوم رہے تھے۔ وہ اُن کے حالات معلوم کرنے کا مشتاق تھا۔

فوراً ہی اس نے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔
کہاں جا رہی ہیں آپ؟ ـــــ عزیز نے عادت کے خلاف دونوں کو مخاطب کیا۔ فریدہ خاموش رہی۔
ہم لوگ بمبئی جا رہے تھے۔ جسودا بولی۔ اسٹیشن پر آنے کے بعد ارادہ بدل گیا اور احمد آباد کا رُخ کر لیا احمد آباد سے ادھر ہی ایک اسٹیشن پر اُتر جائیں گے۔ ویسے ہماری اصل منزل دہلی ہے۔
بہت لمبا راستہ اختیار کیا ہے آپ نے دہلی جانے کا۔
ذوقِ سفر کا تقاضا یہی تھا۔ ایک گاؤں میں میری سہیلی کا باغ ہے، بہت بڑا فارم بھی ہے۔ باغ میں امرود بہت اچھے ہوتے ہیں۔ دو چار روز فارم پر قیام رہے گا۔ پھر احمد آباد چلے جائیں گے۔ وہاں فریدہ کی خالہ رہتی ہیں، جو کچھ دنوں سے بیمار ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر بمبئی چلے جائیں گے۔ وہاں سے دہلی کا راستہ بالکل سیدھا اور مختصر ہے۔ جسودا پہلی بار مسکراتے ہوئے بولی۔ اُس کی مسکراہٹ میں کشش تھی اور رعنائی تھی۔
معلوم ہوتا ہے آپ کالج میں ساتھ رہی ہیں۔
کالج تک ہم میں سے کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اسکول ہی سے تعلیم چھوٹ گئی۔
پڑوسی ہیں آپ ایک دوسرے کی۔
یہ بات بھی نہیں۔ بس دوست ہیں۔ میرے شوہر اسی شہر میں انجینئر ہیں۔ اُنہوں نے جسودا کے ہزبینڈ کا جو دہلی میں تجارت کرتے ہیں، بہت عمدہ مکان بنوایا ہے۔ دوستی شاہد اور رنجیت میں تھی۔ اسی رشتے سے ہم دونوں میں میل ہوگیا۔ جسودا میری سہیلی ہی نہیں، گائڈ بھی ہے۔ اس نے بڑے نازک مرحلوں پر مجھے سہارا دیا ہے۔ چند بار میری کشتی کو بھنور سے نکالا ہے۔ عمر میں جسودا مجھ سے بہت بڑی نہیں مگر اُن کا دل کافی بڑا اور گہرا ہے۔ دلّی میں بھی ان کے رنجیت نے فلیٹ لے رکھا ہے، ڈیونگو کالونی میں ہے۔ میں اکثر وہاں جا کر رہتی ہوں۔
آپ کہاں جا رہے ہیں؟ جسودا نے پوچھا۔

احمد آباد۔
کارخانہ ہے وہاں آپ کا؟
ابھی تو نہیں ہے، جلد ہی بن جائے گا۔ کارخانہ کھولنے ہی جا رہا ہوں۔
سُنا ہے وہاں کے حالات بہتر نہیں ہیں۔ جیپ اور ٹھیلے کی ٹکر ہو گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہوائیں زہریلی ہوتی جا رہی ہیں۔ کیونکر کھول سکیں گے آپ کارخانہ۔
میں وہاں کپڑے کا مل نہیں چلاؤں گا۔ محبّت کا کاروبار چلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔
اس میں کیا مل جائے گا۔ جسودا جلدی سے بول اُٹھی محبّت میں نقصان کے سوا اور کیا ہے۔
اور وہی نقصان سب سے بڑا فائدہ ہے میرے لئے۔
کوئی جانتے والا ہے احمد آباد میں؟
کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ سفر کرنے والوں کو مسافر نواز بہت مل جاتے ہیں۔ ویسے میں مس شانتا کے بلانے پر جا رہا ہوں۔
لگتا ہے اپائنٹمنٹ ہو چکا ہے۔ فریدہ بولی۔
یوں ہی سمجھئے۔
شاید آپ وہاں تک پہنچ نہ سکیں گے۔ جسودا نے کہا۔
کیا پُل ٹوٹ گیا ہے سابرمتی کا، یا اُس میں طوفان آ گیا ہے؟
پُل ابھی نہیں ٹوٹا ہے مگر اندیشہ ہے کہ جلد ٹوٹ جائے گا۔
کچھ بھی ہو، میرے بڑھتے ہوئے قدم رک نہیں سکیں گے۔ میں ضرور جاؤں گا۔
ضرور جائیے۔ فریدہ بولی۔ عشق پانی کا نہیں، آگ کا سمندر ہے۔ یقین ہے کہ آپ اُسے ضرور پار کر لیں گے۔ میری نیک تمنّائیں آپ کے ساتھ ہیں۔
جسودا قہقہہ مار کر بولی۔ تیری نیک تمنّائیں خود تیرے ہی کام نہ آئیں تو ان کو کیا سہارا دیں گی۔

عزیز نے ہنستے میں جسودا کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

کیا آپ کی سہیلی کوئی بازی ہار چکی ہیں۔

نہ جانے یہ کتنی بازیاں ہار چکی ہیں۔

جسودا اور فریدہ عزیز سے اتنی ہی دیر میں کافی بے تکلف ہو گئی تھیں۔ فریدہ تو اپنی فطرت کے لحاظ سے بہت ہی شوخ اور چلبلی تھی۔ لیکن جسودا نے بھی اس وقت سنجیدگی کے بہت سے پردے اپنے اوپر سے سرکا دیئے تھے

دیکھئے۔ فریدہ نے کہا۔ جسودا عقل کی بات کر رہی تھیں جو تماشائے لبِ بام سے آگے نہیں بڑھا کرتی اور آپ کا شمار ان لوگوں میں ہے، جو شاید بے جھجک آگ میں کود جاتے ہیں۔

بڑی اچھی اردو بولتی ہیں آپ۔ معلوم ہوتا ہے، یوپی کی رہنے والی ہیں۔

کیا اردو صرف وہیں کی زبان ہے؟

ایسا نہیں ہے۔ عزیز شرمسار ہو کر کہنے لگا۔ وہ تو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دیس کے ہر فرقے اور مذہب کے آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔

پھر لوگ اسکرپٹ تبدیل کرانے پر کیوں تُلے ہوئے ہیں۔ بولنے والوں کے لیے اس کا پڑھنا بھی مشکل نہیں۔

یہ سب سیاست کی باتیں ہیں، ورنہ اسکرپٹ ہر زبان کی جان ہے۔ ڈس کوری آف انڈیا (Discovery of India) میں کہا گیا ہے کہ آپ کسی قوم کو تباہ کرنا چاہیں تو اس کی زبان کو برباد کر دیں اور اگر زبان کو مٹا ڈالنے کی آرزو ہو تو اس کا رسم الخط بدل دیں۔ لوگ اردو کا اسکرپٹ بدل کر اس کی جڑیں کاٹنا چاہتے ہیں۔

جسودا بھی بڑی صاف اردو بولتی ہیں۔ ان کی تقریر سنیئے کبھی آبشار کی طرح بہتی ہیں۔ بیچ بیچ میں شعر بھی پڑھتی جاتی ہیں۔ آواز بڑی رسیلی پائی ہے۔ اقبال انکے پسندیدہ شاعر ہیں۔ غالب کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔۔ میں شاعروں پر ان سے بات کرتی ہوں کبھی تو فوراً ہار جاتی ہوں۔ ٹھیک ٹھیک بتائیے آپ کیوں جا رہے ہیں۔

کہہ دیا کہ شانتا سے ملنے جا رہا ہوں۔

کون ہیں وہ آپ کی؟

ابھی تو کوئی بھی نہیں ہیں۔

جلد ہونے والی ہوں گی۔

شاید!

کہاں رہتی ہیں؟

معلوم نہیں۔ کالج کے پتے پر اُنہیں خط لکھا کرتا ہوں۔

دیر تک!!

دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ٹھنڈی ہواؤں نے جسودا اور فریدہ پر نیند کا خمار برسانا شروع کر دیا۔ وہ اونگھنے لگیں۔ ان کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ جلد ہی عزیز کو سوچنے کا ایک نیا موضوع دے کر وہ سو گئیں۔ عزیز حُسن کو اسیرِ خواب دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ لیکن اُس کے پاس پہلے ہی سے ایک اتنا وسیع موضوع تھا کہ عمر بھر سوچنے کے بعد بھی وہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتا تھا—— فریدہ اور جسودا کو سوتا دیکھ کر اُس نے دبی زبان سے ایک شعر پڑھا اور پھر اِس ہنگامی کیفیت کو ذہن سے جھٹک دیا۔ گاڑی شدید جھٹکے کے ساتھ کسی اسٹیشن پر رکی تو عزیز چونک گیا اور بلند آواز سے بولا

کیا سچ مچ پل ٹوٹ گیا۔

میں درمیان میں رک نہیں سکتا۔ احمد آباد کی فضائیں میری منتظر ہیں۔ اُس کے گلی کوچے مجھے بلا رہے ہیں۔ مزدور بستی میرا انتظار کر رہی ہے۔ اِن سب کے علاوہ ایک ایسی ہستی میری راہ دیکھ رہی ہے جس کا سر صنعتی علاقوں میں اُٹھی ہوئی چمنیوں سے بھی اونچا ہے۔ اُس میں انسانیت کا جلال بھی ہے اور جمال بھی۔ وہ ایک ایسا سنگِ میل ہے جہاں محبت بھی سجدے کرتی ہے۔ وہاں ہر طرف انتظار ہی کی کار فرمائی ہے۔ کتنی دلچسپ ہے انتظار کی یہ خمار انگیز کیفیت۔

احمد آباد جس قدر قریب آتا جا رہا تھا، عزیز کے دل کی رفتار اتنی ہی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اسٹیشن آتے ہی اس پر خود فراموشی اور خود رفتگی کا عالم طاری

ہو گیا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ فریدہ اور جسوداد و گھنٹہ قبل ٹرین سے اُتر چکی ہیں۔ سیٹ خالی دیکھ کر چونکا لیکن اُسی وقت یاد آ گیا کہ وہ گاڑی میں نہیں ہیں۔ صبح کا وقت تھا۔ مسافر جاگ رہے تھے۔ عزیز نے کھڑکی کا آئینہ چڑھا کر باہر جھانکا۔ شہر پر دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ دھوئیں کے مرغولے فضا میں رقص کرتے معلوم ہو رہے تھے۔ اُوپر اٹھی ہوئی ملوں کی چمنیاں خاموش تھیں۔ وہ دُھواں نہیں اُگل رہی تھیں۔ اِس کے باوجود زمین اور آسمان کے درمیان دھوئیں نے ایک نیا آکاش بنا دیا تھا۔ اسٹیشن پر بہت بڑا ہجوم ٹرین کا منتظر تھا۔ لوگ ہراس اور پریشانی کے عالم میں جگہ کی تلاش کرنے لگے۔ وہ تیزی سے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے جیسے اِس ٹرین کے بعد کوئی اور گاڑی نہ آئے گی۔ عزیز اُن کے چہروں پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ رہا تھا۔ لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کے نیچے کس قسم کے جذبات کار فرما ہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ احمد آباد میں آتش فشاں پھٹ گیا ہے اور اب بھی وہاں جوالا کھول رہی ہے جس سے لاوا اُبلنے لگا ہے۔ اُس نے نہایت اطمینان کے ساتھ انگڑائی لیتے ہوئے برتھ چھوڑ دی اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر پھر ایک لمبی سی انگڑائی لی جیسے وہ تھکن کے ساتھ ہی مستقبل کی مشکلات کے احساس کو بھی جھٹک رہا ہو۔ اب تک اُس نے قلی کو بھی نہ پکارا تھا۔ ایک قلی نے آپ ہی پوچھ لیا۔

سامان اُٹھاؤں؟ ـــــ باہر نکالوں؟

ہاں اُٹھاؤ۔

قلی نے سامان اٹھاتے وقت بھی اسے غور سے دیکھا اور باہر جاتے وقت بھی۔ شاید وہ اس کی سادہ لوحی پر افسوس کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شہر کی فضا مسموم ہے۔ ہواؤں میں زہر گھلا ہوا ہے۔ ان میں سانس لینے والے زندہ نہیں بچ سکتے۔ یہ اتنے ساز و سامان کے ساتھ موت کی جانب کیوں بڑھ رہا ہے۔ کیا اسے خطرے سے آگاہ کرنا میرا فرض نہیں؟ ـــــ ہے مگر میں مالی مشکلات کے اس دَور میں جب ہر شخص نے اپنے فرائض کو بھلا دیا ہے، خاموش رہنا ہی پسند کرتا ہوں۔ قلی اُس کے آگے آگے چلتا رہا مگر پیروں میں وہ تیز گامی نہ تھی جو عام طور پر قلیوں کی آہنی پنڈلیوں میں ہوا کرتی ہے۔

(۳)

عزیز نے گیٹ سے نکل کر پھر ایک بار شہر کی جانب دیکھا۔ دھوئیں نے آسمان کے نیچے ایک وسیع پردہ تان دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ زمین کے پرت کم ہو کر چھ رہ گئے ہیں اور آسمان آٹھ ہو گئے ہیں۔ اُس وقت اس کے ذہن میں فردوسی کا ایک مصرع گھوم رہا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ سواروں کے دوڑنے سے اتنی دُھول اُڑی تھی کہ آسمانوں کی تعداد میں ایک کا اضافہ ہو گیا تھا اور زمین کا ایک طبقہ گرد میں تبدیل ہو کر ایک نئے آسمان کی شکل میں آ گیا تھا۔ اُسی وقت اُس نے ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے تنقید شروع کر دی، کون کہتا ہے کہ زمین سات پرتوں میں بٹی ہوئی ہے اور آسمان بھی سات ہیں۔ یہ سب پُرانی باتیں ہیں ـــ ان چیزوں کو شاعر نہیں، سائنسدان ہی طے کر سکتے ہیں۔ اُسی لمحہ میں اسے غالب کا ایک شعر یاد آیا ؎

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

شاعر نے بڑے لطیف انداز سے، عزیز زیرِ لب بولنے لگا، دوسرے مصرع کو جمع کا سوال بنا کر آسمانوں کو شمار کیا ہے۔ وہ بھی ان کی تعداد سات ہی سمجھتا ہے۔ ان شاعرانہ تصوّرات کو موجودہ عہد میں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ سائنس کا فیصلہ ہی قابلِ تسلیم ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے باہر ہزاروں آدمی پناہ گزین کی حیثیت سے پڑے ہوئے تھے۔ چند سوشل ورکر اُن کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ عزیز کا جی چاہا کہ سامان یہیں چھوڑ کر آگے بڑھے اور دریافت کرے کہ یہ لوگ کون ہیں، کہاں جا رہے ہیں۔ اتفاق سے ایک عورت دواؤں کا بکس لئے قریب سے گذری۔ عزیز نے انگریزی میں پوچھا۔ یہ ہجوم کیسا ہے؟

آپ کو نہیں معلوم۔ اُس نے عزیز کی بے خبری پر تعجب کرتے ہوئے کہا۔ یہ غریب شہر سے آئے ہیں۔ ان کے گھروں کو جلا دیا گیا ہے یا لُوٹ لیا گیا ہے۔ اب یہ کسی ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں جان و مال کو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔

کیا کوئی دنگا ہو گیا ہے؟

بہت بڑا جھگڑا ہوا ہے۔ آپ کے سامنے اس وقت ہر فرقے کے مظلوم موجود ہیں۔ میں اُن کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھنے ہی یہاں آئی ہوں لیکن جن لوگوں کا دل رویا کرتا ہے، ان کی آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں۔ احساس کے زخموں پر مرہم رکھنا بہت دُشوار ہے۔ دل کے آنسو بھی روئی میں جذب نہیں کئے جا سکتے۔ میونسپل کی جانب سے یہاں ایک ڈسپنسری کھول دی گئی ہے۔

اور آپ اسی میں کام کر رہی ہیں۔

جی ہاں کوشش کی جا رہی ہے کہ کالرا اور دوسری بیماریوں کو یہاں نہ پھیلنے دیا جائے۔

جہاں اتنا زہریلا پلیگ پھوٹ پڑا ہو وہاں کسی اور بیماری کی کیا گنجائش ہے۔

عورت چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی پوری تیزی سے چلی گئی۔ عزیز اُس کے نقوشِ قدم میں انسانیت اور ہمدردی کے چراغ جلتے دیکھتا رہا۔ اُس کے دل میں یہ خواہش پوری بے تابی کے ساتھ سر اُبھارنے لگی کہ چراغوں کے اس دمکتے ہوئے جادہ پر گامزنی کرنے سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں۔ اُن کی تھرتھراتی ہوئی لَویں زبانِ حال سے اُس کے خیال کی تائید کر رہی تھیں۔ عزیز نے دیکھا کہ ٹیکسی اسٹینڈ پر چند گاڑیاں کھڑی ہیں۔ کچھ تانگے بھی ہیں۔ مگر مسافر نہ ٹیکسیوں کو دیکھتے ہیں نہ تانگوں کو۔ وہ خاموش مسافر خانے میں بیٹھے بڑے محتاط انداز سے باتیں کر رہے ہیں۔ بہت سے اپنے بچّوں کو دلاسا دینے میں مصروف ہیں۔

گھبراؤ مت رامو، ہم دوسرا گھر بنا لیں گے۔

روتا کیوں ہے رحمٰن، لڑائی دیر تک نہیں چلے گی۔

اوشا تو کیا سوچ رہی ہے کالج یاد آ رہا ہوگا۔

عزیز کے کانوں میں یہ اُداس نغمے کھولتے ہوئے سیسے کی مانند داخل ہوتے رہے۔ اس کا مقصد ان میں گھلتا رہا۔ شانتا کی تصویر کے نقوش معصوم چہروں پر بہتے ہوئے ان آنسوؤں سے دُھلنے لگے۔ ایک محبوب کی جگہ اَن گنت محبوب اس کی توجہ جذب کرنے لگے۔ اُس نے پوری بے باکی کے ساتھ آگے قدم بڑھائے اور ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

شہر چلو گے؟

کہاں جانا ہے

آشرم پہنچا سکتے ہو، سابرمتی کے کنارے وہی ایسی جگہ ہے جہاں اطمینان سے ضمیر کی آواز سُن کر آنے والی زندگی سے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔

وہاں جانے کا کوئی راستہ نہیں اِس وقت۔

کیوں؟

جگہ جگہ سڑکوں پر چھُرے چل رہے ہیں۔ قطبی محلہ لے چلوں؟

وہاں چھُرے تو نہیں تو لاٹھیاں ضرور چل رہی ہوں گی۔

اسٹیشن پر اور قطبی محلّے میں بالکل خاموشی ہے۔

گویا دونوں جگہ انسانیت سستاتی محسوس ہو رہی ہے۔

کیا امن کا فرشتہ انہیں دو مقامات میں بند ہو گیا ہے۔ اس کی قوتِ پرواز دم توڑ چکی ہے۔ اُس کے پر نوچ لئے گئے ہیں ڈرائیور عزیز کی باتیں خاموشی کے ساتھ سُنتا رہا۔ پھر بولا بیٹھو، مومن پورہ کے آس پاس کہیں چھوڑ دوں گا۔

کیا کوئی محلہ ہے مومن پورہ۔ وہاں مسلمان ہی رہتے ہونگے میں کسی ست رنگی آبادی میں چلنا چاہتا ہوں جہاں گیتا، بائیبل اور قرآن کی ملی جلی آوازیں گونجتی ہوں، کوئی ہندو پورہ، پارسی نگر اور سکھ کوٹ بھی ہے یہاں؟ اگر نہیں تو کسی کالج تک پہنچا دو۔

نہ جانے کیسی چلی چلی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ کالج سب بند ہیں۔

بالکل سنک گیا ہوں یہاں آکر۔ گرلس کالج بھی بند ہے کیا۔ چلنا ہے تو بیٹھو جلدی! ــــــ ورنہ بتاؤ کہاں لے چلوں کالج کوئی کھُلا ہوا نہیں ہے۔

شاعر

پھر ایسا کرو میرے بھائی تم مجھے مومن پورہ اور رام گڑھ کے بیچ میں کسی ایسی جگہ چھوڑ دو، جہاں پاگلوں کا بہت بڑا مجمع ہو۔

کیا لڑنے آئے ہو؟

کوئی بہت بڑی جنگ ہو رہی ہے یہاں۔

جیسے آپ کو خبر ہی نہیں۔ ایسی سخت جھڑپیں ہو رہی ہیں کہ چین اور بھارت کے درمیان بھی نہ ہوئی ہوں گی۔ ہر طرف چھرے اور چاقو چل رہے ہیں۔ ان گنت لوگ گھائل ہو چکے ہیں۔ انہیں جیپوں اور ٹرکوں میں لاد کر ہسپتال لیجا رہے ہیں۔

کون لے جا رہا ہے؟

کس کس کا نام لوں! — کل بہت سی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔

عورتوں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔

کہاں تک تمہاری باتوں کا جواب دوں۔ چلنا ہے تو چپ چاپ بیٹھ جاؤ، ایسی جگہ چھوڑ دوں گا جہاں کوئی گڑبڑ نہ ہوگی۔ آگ یوں تو ہر طرف بھڑک رہی ہے پھر بھی کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں تک اس کی لپیٹ ابھی تک نہیں پہنچی۔

تو آپ مجھے کسی گلزار ابراہیمی میں لے چلنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ میرے دل میں اس آتش نمرود کو بجھانے کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے۔ اچھا آپ کہیں بھی لے چلئے مجھے۔

ڈرائیور نے سامان ڈگی میں رکھ دیا اور عزیز پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی دیوانہ وار دوڑنے لگی۔ کبھی کسی شاہراہ پر آجاتی کبھی کسی تنگ سڑک پر گھوم جاتی۔ جس سڑک پر ہجوم ہوتا، ڈرائیور اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا۔ ایک جگہ اس نے ٹیکسی کو پوری عجلت سے ٹرن دیتے ہوئے کہا۔

اتر جاؤ جلدی، ورنہ واپس لئے چلتا ہوں۔ آگے نہیں جا سکوں گا۔

واپس نہیں جاؤں گا۔ یہیں اتار دو۔ کیا نام ہے اس جگہ کا؟

جمال پور۔ ڈرائیور نے ڈگی کھولتے ہوئے کہا اور جلدی جلدی ہولڈال اور سوٹ کیس وغیرہ اتار کر ہارن بجاتا ہوا چلا گیا۔ عزیز نے سب چیزیں اٹھا کر سڑک کے کنارے رکھ لیں اور خاموش کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا۔

ایک دم اس کے کانوں میں شور و غل کی آوازیں آنے لگیں، جو دم بدم بلند ہوتی گئیں۔ اور پھر بلوائیوں کی ایک بہت بڑی ٹولی نمودار ہوئی جس میں بہت سے آدمی لاٹھیوں اور بھالوں سے مسلح تھے۔ ان کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا۔ چہروں پر وحشت کے آثار تھے۔ عزیز ان کے قریب آنے کا انتظار اس طرح کر رہا تھا جیسے کوئی بہادر انسان موت کا استقبال کیا کرتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی بلوائی ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور عزیز سے مختلف سوالات کرنے لگے۔

کہاں سے آئے ہو

مسلمان ہو

عزیز خاموش رہا۔ اس نے لب تک نہ ہلایا۔ اسے خوب اندازہ تھا چکا تھا کہ ان پر مذہب کا بھوت سوار ہے۔ یہ بالکل پاگل ہو چکے ہیں اور صرف ذات پات کی بنا پر مختلف انسانوں کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آدمیت کو جانچنے کا یہی ایک معیار ہے۔ چند آدمیوں نے عزیز کا سامان اپنے قبضے میں کر لیا اور ایک سنگدل نے دونوں ہاتھوں سے اس کے گالوں پر چپت مارنے شروع کر دیئے وہ تلملا گیا اور منشی گنپت رائے کے چانٹے یاد آگئے۔ اس کے رخساروں پر منشی جی کی انگلیوں کا پرانا لمس رینگنے لگا۔ ان کی ضرب سے احساس پر کبھی چوٹ نہیں لگا کرتی تھی بلکہ وہ ندامت اور شرمساری کے ان جذبات کو بیدار کر دیا کرتے تھے جو ضمیر میں کسی جگہ دبے پڑے رہتے ہیں اور سزا کا عمل شروع ہوتے ہی شرمندگی کے بوجھ میں دب جاتے ہیں۔ وہ ایک استاد کی دی ہوئی سزائیں لگا کرتے تھے یہاں بے قصور ہی مرمت کی جا رہی تھی۔ اس لئے عزیز مارنے والوں کو جانور سمجھنے پر مجبور تھا۔ منشی جی کی مار نے اسے ڈاکٹر بنایا تھا۔ ان ظالموں کی انگلیوں میں موت کی حرارت تھی۔ جب مارنے والوں کا ہاتھ رکا تو عزیز بولا

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بہت بڑی زحمت سے بچا لیا۔

وہ کیونکر؟ ظالم اُس کے منہ سے صدائے تحسین سُن کے حیران رہ گیا۔

آپ نے ایک ساتھ دونوں گالوں پر چپت مارنے شروع کر دیئے۔ ایک پر مارتے تو میں عیسٰی کی تعلیم کے مطابق دوسرا گال پیش کرتا اور یہ ایک طرح کی زحمت ہی ہوتی جس سے آپ نے بچا لیا۔

رامو یہ تو فلاسفر معلوم ہوتا ہے سالا، ایک لات لگا زور سے، یوں تو پھانسی کا مستحق ہے۔ یسوع مسیح کو سُولی پر ہی لٹکایا گیا تھا۔

رامو راون کی طرح سچائی کو ٹھکرانے کے ارادہ سے بڑھا اور پُوری قوت سے عزیز کے لات رسید کی۔

ایک اور۔ عزیز بولا۔

بدمعاش! ہمیں فریب دیتا ہے۔ جانتا ہے اس مشغلے میں ہم تیری جیب پر ہاتھ نہ ڈال سکیں گے میرا حکم ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے سب میرے حوالے کر دو۔

عزیز نے اندر کی جیب خالی کر دی۔ اُس میں سے صرف دو سو روپے نکلے۔ ایک لفافہ بھی تھا۔ اس میں شانتا کی تصویر تھی۔ اس نے روپے رامو کو دے دیئے۔

لفافے میں کیا ہے؟

فوٹو!

کس کا۔ اس نے لفافہ چھینتے ہوئے کہا اور پھر غصے کے ساتھ بولا

عشق بازی کرنے آیا ہے یہاں۔

تصویر رکھنے کا کوئی اور مقصد بھی تو ہو سکتا ہے۔

اغوا کرنا چاہتا ہوگا اس لڑکی کو!

رامو بھیا فوٹو مجھے دے دو۔ یہ بہت قیمتی ہے اس پر شانتا کے دستخط ہیں۔

کون شانتا؟

وہی جس کی یہ تصویر ہے اور اس پر اُسی کا آٹوگراف بھی ہے۔

فوٹو تجھے نہیں دیا جا سکتا، بدمعاش کہیں کا۔

اِس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ عزیز نے فوٹو رامو کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھی نے لمبا سا چاقو نکال لیا۔ اس کے کُھلنے میں ذرا دیر ہوئی اس دوران میں پولس وان آگئی اور فسادی نہایت بدحواسی کے ساتھ فرار ہو گئے۔

کہاں جا رہے ہو؟ ـــ پتہ نہیں یہاں دنگا ہو رہا ہے، پولس افسر نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

شہر جاؤں گا۔

کس کے یہاں؟

ہوٹل میں۔

مرنا چاہتے ہو۔

مر گیا تو قتل کا کیس رجسٹرڈ نہیں کراؤں گا۔

بڑے سرپھرے معلوم ہوتے ہو۔ کس پارٹی کو بلانگ کرتے ہو۔

صرف انسانی برادری کو۔ بلکہ عالمگیر انسانی برادری کو۔

یہاں اِس برادری کا کوئی تصور نہیں۔ انسانیت کے پاؤں اُکھڑ چکے ہیں شہر سے۔ یہاں بہت بڑا جھگڑا ہو گیا ہے جس طرح ہو سکے اسٹیشن چلے جاؤ، وہاں بالکل امن ہے

میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ بھاگنے والوں میں اپنا نام لکھانا نہیں چاہتا۔ آشرم کو کون سی سڑک جاتی ہے۔

وہاں جا کر کیا کرو گے

سامان لُٹ گیا۔ روپے چھن گئے۔ تھوڑے سے پیسے باقی رہ گئے ہیں۔ غالباً آشرم میں سر چھپانے کی جگہ مل جائیگی

وہاں سر چھپا کر تم آشرم کو بھی برباد کراؤ گے۔

اور کہاں جاؤں، مجھے ایک قیمتی چیز لُٹ جانے کا بڑا غم ہے۔

کوئی ڈائمنڈ تھا۔

جی ہاں۔ بہت بیش قیمت ہیرا یعنی ایک تصویر۔

کس کی۔

ایک لڑکی ہی کہہ سکتا ہوں میں تم سے۔

ہندو ہے یا مسلمان۔

ہندو!

ہندو عورت کی تصویر دیکھنے کا مطلب؟

عجیب سوال کر رہے ہیں آپ، کیا کوئی جرم ہے ہندو عورت کی تصویر دیکھنا۔

ہاں اور اتنا بڑا جرم کہ اس کی سزا صرف قتل ہی ہوسکتی ہے۔ دیکھتے نہیں ہو جو افراد صدیوں سے امن اور سکون سے رہتے آئے تھے، ایک دم درندے بن گئے۔ بھائی چارے کے تمام رشتے ناتے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئے۔ اب ان کے سرے شاید کبھی جوڑے ہی نہ جا سکینگے۔

معاف کیجئے، یہ رشتے ٹوٹ نہیں سکتے۔ ایک وقت آئے گا کہ انسانیت کے پھول کھلیں گے، چمن مہک اُٹھیگا اور پھر وہی شب و روز ہوں گے جن میں امن کے فرشتوں کی گنگناہٹ بکھر جائے گی اور زندگی کا روندا ہوا پودا سرسبز ہو جائے گا۔

خیر میرے پاس وقت نہیں، سیدھے چلے جاؤ۔ کسی کا چھُرا جلد ہی اُس دنیا میں پہنچا دے گا جہاں نہیں کسی تصویر کا غم نہ ستائیگا۔

وان جس پر ٹرانسیسٹر لگا ہوا تھا سنسناتی چلی گئی۔ اسی وقت عزیز نے اپنی منزل تبدیل کر دی۔ اس نے سوچا اس وقت آشرم جانا بیکار ہے۔ وہاں صرف دُعاؤں سے امن کے گیسو سنوارنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وقت خون چاہتا ہے۔ جب تک رگوں میں لہو دوڑ رہا ہے اس وقت تک سر چھپانے کی کوشش بہت بڑا اخلاقی جُرم ہے۔ عزیز تیز تیز آگے بڑھنے لگا۔ اس کی نسوں میں جیپ کی سی سنسناہٹ ہونے لگی۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی وہ ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ہواؤں میں دواؤں کی مہک تھی اور ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا Silence Zone

کیا یہ ہاسپٹل ہے؟ اس نے ایک شخص سے پُوچھا جو پھلوں کا ٹھیلا ڈھکیلتا ہوا اُسی طرف جا رہا تھا۔

جی ہاں سول ہسپتال یہی ہے۔

عزیز ابھی کھڑا ہی تھا کہ پولس وان پھر آئی اور اس کے پہلو میں رُک گئی۔

آشرم پیچھے رہ گئی۔ اُسی پولس افسر نے کہا۔ بیٹھ جاؤ میں دروازے پر ڈراپ کر دوں گا۔

عزیز کو پھر شانتا یاد آگئی جس نے وہیں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ پھر عشق کے کلیسا کی سمت مڑ گیا اور انسانیت کا کعبہ پیچھے چھوڑ کر جیپ میں بیٹھ گیا۔

اُتر جائیے۔ آپ کے بائیں ہاتھ پر آشرم ہے۔

عزیز وان سے کود پڑا اور وان چلی گئی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک جانب سے گولی چلنے کی آواز آئی، پھر ایک دھماکہ ہوا جیسے کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ آشرم کے قریب ہی ایک مکان سے لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ آگ بجھانے کے ارادے سے دوڑا۔ سڑک پر بہت سے کاغذات بکھرے پڑے تھے۔ اُن سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ اس نے جُھک کر دیکھا، کچھ کتابیں بھی پھٹی پڑی تھیں۔ ان میں آگ لگنے ہی والی تھی۔ پیچھے سے اچانک قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ عزیز نے مڑ کر دیکھا۔ فادروں جیسا لباس پہنے ایک بوڑھا عیسائی جس پر دیوانگی سی طاری تھی، بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ کتابوں کو جلتے دیکھ کر اس نے آگ بُجھانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے خوف اور حیرت کی نگاہوں سے جلتی ہوئی کتابوں کو دیکھ کر کہنا شروع کیا۔

بائیبل

گیتا

قرآن

پھر وہ بھیانک انداز سے چلایا۔

بھگوان کی تینوں زبانیں کاٹ ڈالیں اُنہوں نے۔ وہ ہزاروں سال سے انہیں زبانوں سے بول رہا تھا۔ اب کیونکر بول سکے گا۔ بوڑھے نے بڑی دلکش آواز میں بائبل کی ایک لائن پڑھی، پھر گیتا کا اشلوک پڑھا، اس کے بعد قرآن کی آیت تلاوت کی اور زور سے زمین پر پاؤں مارتے ہوئے چیخا۔

گونگا ہے بھگوان!

یہ الفاظ دُہراتا وہ بڑی والہانہ رفتار سے دوڑتا چلا گیا۔

عزیز سہم گیا۔ اُس پر ایک عجیب قسم کا خوف طاری ہوگیا جیسے سچ مچ بھگوان گو ننگا ہوگیا ہو' اس کی زبانیں کاٹ ڈالی گئی ہوں۔ ابھی وہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک مشتعل ہجوم آتا دکھائی دیا۔ عزیز آشرم میں پناہ لینے کے خیال سے چلا کہ ایک بھاری پنجہ اُس کی گردن پر جم گیا۔

کہاں جاتا ہے' بچ نہیں سکے گا۔ موت تجھ سے زیادہ تیز گام ہے۔ اُسی لمحہ عزیز نے اپنے پہلو میں کوئی نوکدار چیز چبھتی محسوس کی' خون کی سُرخی بھی کپڑوں پر نظر آئی اور پھر اُسے کوئی خبر نہ رہی۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

(۴)

ذرا ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ بیدار ہو چکا ہے۔ جسم میں ایک نئی طاقت دوڑ رہی ہے۔ آنکھیں کھول کر اُس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ ایک ایسی جگہ تھا جو بالکل نئی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ آس پاس بہت سے پلنگ تھے اور بجلی کی تیز روشنی تھی جو آنکھوں کو چکا چوند نہیں کر رہی تھی بلکہ اس سے ایک سکون بخش ٹھنڈک پھیلتی معلوم ہو رہی تھی۔ بہت سی عورتیں سفید لباس میں ابر کے ٹکڑوں اور دودھ کے جھاگوں کی مانند تھرک رہی تھیں۔ اُن کی رفتار میں زندگی اور طاقت کا جوش تھا۔ عزیز تیزی سے توانائی کا احساس کرنے لگا۔ اس کے پلنگ سے ملی ہوئی ایک اونچی سی چیز رکھی تھی' اُس میں سُرخ سیال سے بھری بوتل اس انداز سے اُلٹی لٹک رہی تھی جیسے داستانوں کی لال پری کو آدمی کے قتل کی پاداش میں کنویں میں اُلٹا لٹکا دیا گیا ہو۔ عزیز نے دیکھا کہ وہ سیال نلکی سے گذر کر کلائی میں بندھی ہوئی سُوئی کی راہ سے رگوں میں پہنچ رہا ہے۔ دم بدم آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں' گرد و غبار چھٹ رہا ہے۔ بدن میں زندگی آندھی کی مانند سنستا رہی ہے جیسے کوئی نسوں میں توانائی کا صُور پھونک رہا ہے۔ اس نے شعوری طور پر پلکوں کو جُنبش دی اور یقین کر لیا کہ اس وقت وہ صرف صفِ مژگاں ہی پر کمانی کرنے کی قوت نہیں رکھتا بلکہ اپنے پلنگ کو بھی ہلا سکتا ہے۔ اس کے حواس نہایت عجلت سے عود کر رہے تھے۔ اگلی پچھلی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ وہ احمد آباد آیا تھا جہاں لوگ آپس میں لڑ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے جیبوں میں شانتا کی تصویر تلاش کرنی شروع کر دی مگر وہاں لباس میں کوئی جیب ہی نہ تھی' جلد ہی اس نے پوری صورتِ حال کو سمجھ لیا اور طے کر لیا کہ اس وقت وہ کسی ہاسپٹل میں ہے جہاں اُسے خون دیا جا رہا ہے۔ مگر میں تو آپ ہی خون دینا چاہتا تھا کسی زخمی کو' مجھے لہو چوسنے کی بالکل آرزو نہ تھی' لیکن یہ خون کس کا ہے' وہ غصّے میں بھر کر مختلف باتیں سوچنے لگا تھا۔ میں کسی فسادی کا لہو اپنے بدن میں جانے نہیں دوں گا۔

یہ خون کس کا ہے؟ اس نے ایک مرتبہ بلند آواز سے سوال کیا اور پھر اسے دُہرایا۔

یہ خون کس کا ہے؟

دو نرسیں تیز گامی کے ساتھ آئیں۔ ایک نے نبض پر ہاتھ رکھ کر اُس کی حرکات شمار کرنے کے بعد ساتھ والی نرس سے کہا پلس ریٹ نارمل ہے' چارٹ پر نوٹ کر دو' یہ شخص خطرے سے نکل چکا ہے۔ یہ آؤٹ آف ڈینجر ہے۔

یہ بتائیے کہ میں کتنا خون پی کر خطرے سے باہر آیا ہوں۔ خون سڑکوں پہ بہہ رہا ہے' خون آدمیوں کو دیا جا رہا ہے۔ آخر اس شہر میں یہ جنسِ گراں اتنی ارزاں کیوں ہے۔ یہاں اس کی کوئی قیمت کیوں نہیں۔

چُپ پڑے رہیے' بولیے مت۔

خاموشی موت ہے' میں چپ نہیں رہوں گا۔ یہاں انسانی خون کی توہین کی جا رہی ہے۔ بتائیے یہ خون کس کا ہے؟

اچھی ذات کے ایک ڈونر نے دیا ہے۔

آدمی سب اونچی ذات ہی کے ہوتے ہیں' میں پوچھتا ہوں وہ کون تھا۔

ایک سکھ جوان تھا۔ ہماری ڈونر لسٹ میں اُس کا نام گردت سنگھ لکھا ہے۔ اُس نے تین سو سی سی بلڈ ڈونیٹ کیا ہے۔ اچھی طرح گروپنگ کر لی گئی تھی۔

وہ تو ضرور کر لی گئی ہوگی یہ بتائیے کہ وہ کوئی بلوائی تو نہیں تھا۔

نہیں وہ بہت بڑا نیشلسٹ ہے۔ اپنی جیپ سے زخمیوں کو ہسپتال پہنچا رہا ہے۔ آپ کو بھی وہی لایا تھا۔ بڑا تندرست اور ہینڈسم جوان ہے۔ جان ہتھیلی پر لئے پھر رہا ہے۔

اُس نے مسلمان سمجھ کر تو مجھ پر رحم نہیں کیا۔

یہاں ہندو مسلمان کا کوئی ذکر نہیں۔ سب لوگ ایک دوسرے کو انسان سمجھتے ہیں۔

عزیز نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس تصور سے ہی اس کا سر گھومنے لگا تھا کہ اُس نے ایک سکھ نوجوان کا بہت زیادہ خون ضائع کر دیا ہے۔ اس کا حُسن ماند پڑ گیا ہوگا۔ خوبصورتی انہیں سُرخ قطروں کی رہین منت ہوتی ہے جو دن رات، بدن میں گردش کرنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی شاعرانہ جذبے سے آنکھوں سے بھی ٹپک پڑتے ہیں ــــ گوردت سنگھ کا چہرہ اتنا بلڈ دے کر نیلا پڑ گیا ہوگا اس کی آنکھوں کے سامنے زرد سایہ (Pale Shadow) ناچنے لگا ہوگا۔ اس کی زندگی میرے جسم میں دوڑ رہی ہے۔ میں اسے باپ کہوں یا بھائی، وہ میرا ہی نہیں پورے ملک کا باپ ہے۔ ہمارے دیس میں خون پینے کا رواج ہے، دینے کا نہیں۔ گوردت نے اپنے عمل سے نام کی سچائی ثابت کی ہے۔ نرس نے خیال کیا کہ بیمار بولتے بولتے چُپ ہو گیا ہے، اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ کہیں بلڈ پریشر ڈاؤن تو نہیں ہو گیا، وہ بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔ وہ بول نہیں رہی تھی، خاموش تھی۔ اس نے چارٹ پر ایک لکیر سی کھینچ دی۔

بابا اسی طرح چُپ پڑے رہنا، بولنا نہیں۔

یہ ہدایت دے کر وہ دوسری نرس سے باتیں کرتی چلنے لگی۔ عزیز نے سُنا، وہ کہہ رہی تھی، یہ کیسی لڑائی ہے۔ لوگ سڑکوں پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور ہسپتال میں آ کر زخمیوں کو بلڈ دے رہے ہیں۔ ڈونرس کا بہت بڑا کیو لگ جاتا ہے ہسپتال میں۔

اپیلیں جو کی جا رہی ہیں۔ دوسری نرس بولی۔

وہ تو امن کے لئے بھی ہو رہی ہیں۔ لڑائی کیوں بند نہیں ہو جاتی۔ میں تو حیران ہوں سسٹر یہ تماشہ دیکھ کر۔ گوردت نے اس پے شنٹ کو بلڈ دیا۔ غفور جو ایک بہت بڑا غنڈہ ہے شام ہی کو میرے ایک اور پے شنٹ کملیش کو لہو دے کر گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ یہ میرا محلہ دار ہے، ماں اسے بیٹا کہہ کر پکارتی ہے۔

وہی غفور، جو کملیش کے لئے پھل بھی لایا تھا آج۔

ہاں وہی۔ اِس دنگے میں نہ جانے اُس نے کتنے آدمی مار ڈالے ہوں گے۔

نرسیں ایک جگہ کھڑی ہو گئی تھیں۔ ساتھی نرس نے آگے جانے والی نرس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا تھا، وہ انگریزی میں کہہ رہی تھی

Sister, humanity will never die.

پھر وہ چلی گئیں۔ عزیز نے اُن کی باتیں ہی دلچسپی سے سُنیں، یہ نہیں دیکھا کہ وہ کس رُخ پر چل رہی ہیں۔ اُس نے نرس کی بات پر پورا اعتماد کیا کہ آدمیت کبھی نہیں مرے گی، اس یقین کے بعد اسے بڑی خوشی ہوئی۔ گوردت کا بخشا ہوا خون مقدار میں دُگنا تگنا ہو گیا۔ یہی مسرت صحت اور تندرستی کا غیر فانی پیام بن کر شرائین (Arteries) میں دوڑنے لگی۔ کچھ دیر گذرنے پر دو عورتیں اور آتی دکھائی دیں۔ ان کا لباس نرسوں سے مختلف تھا۔ وہ دونوں بڑے دلفریب انداز سے مسکراتی ہوئی عزیز کی طرف آ رہی تھیں۔ ذرا اور قریب آئیں، عزیز نے انہیں پہچان کر اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ سو رہا ہو۔ پہلے انہوں نے کھڑکی کے سامنے والے بیڈ پر ایک مریض کو دیکھا۔ پھر عزیز کو غور سے دیکھنے لگیں۔ ابھی وہ اُسے پہچاننے کی کوشش ہی کر رہی تھیں۔ اس کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ یہ نہیں یاد آ رہا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔ عزیز کی دھیمی آواز نے ان کی کشمکش ختم کر دی۔ وہ آہستہ سے کہہ رہا تھا۔

آپ مجھے فریب نہیں دے سکتیں۔ کیسا ہی لباس پہن کر
آئیے میں ہر رنگ اور ہر صورت میں شناخت کر لوں گا۔ ایک
فریدہ دوسری جسودا۔ ٹھیک ہے نا، آپ دونوں کو ٹرین میں
دیکھے ہوئے زیادہ دن بھی تو نہیں ہوئے۔

بالکل ٹھیک ہے۔ آپ قطعی اپنے حواس میں ہیں! آہستہ
بولیے۔

کیوں؟

کمزور ہیں آپ! اسٹرین پڑے گا۔

میں گھنٹوں چلّا کر بولنے کی ہمّت رکھتا ہوں۔ پھر
آپ دونوں کو دیکھتے ہی میرے اندر نہ جانے کتنی طاقت
آ گئی ہے۔ تازہ خون سے بھری ہوئی بوتلوں سے کیا کم ہیں
آپ لوگ۔

بلکہ زیادہ ہیں، ہمارے دیکھتے ہی سے زخمیوں کے
منہ پر رونق آجاتی ہے۔ فریدہ شوخی سے بولی۔

جواب دیجیے کہ یہاں کیا کر رہی ہیں آپ، کوئی زخم تو
نہیں لگا۔

بالکل نہیں، اور کرتے کیا ذرا یوں ہی حج اور یاترا کو
آ گئے ہیں۔ جسودا بولی۔

کیا مطلب؟

مطلب یہ کہ ہسپتال زخمیوں سے بھرا پڑا ہے، اسٹاف
کم پڑ گیا ہے، ہم نے اپنی خدمات پیش کر دی ہیں۔ سُنا کرتے
تھے بھگوان کبھی آدمی کے رُوپ میں بھی آجاتے ہیں۔

پھر مجھے دیکھیے غور سے۔

میں تو ہر اس شخص کو بھگوان سمجھ رہی ہوں جو کسی کے
چھرے یا چاقو سے گھائل ہو گیا ہے۔

بندوق کی گولی کا نام نہیں لیا آپ نے۔ جس کے گولی لگی
ہے اُسے آپ یسوع مسیح کہیں گی۔ اچھا جلدی سے سرگزشت
سنائیے اپنی۔

سُنیئے پہلے اور دوسرے درویش کی کہانی۔ فریدہ
بولنے لگی۔ اپنی سہیلی کے فارم پر چند گھنٹے ٹھہر کر
ہم خالہ جان کے یہاں آ گئے۔ ان کی طبیعت خراب
تھی، اسی دن یہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایسے وقت میں ہاتھ پر
ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا ممکن نہ تھا۔ ہم نے اپنے وقت کا ہر لمحہ
زخمیوں کے لئے وقف کر دیا۔ ناقوس پر ایمان رکھنے والوں کو
میں دیکھ رہی ہوں اور مسجدیں تعمیر کرنے والے جانداروں
کی نگرانی جسودا نے اپنے ذمّے لے لی ہے۔ جسودا ہی نے
بتایا کہ آپ بھی محفلِ عشاق میں آ گئے ہیں۔

بڑی کرامت تھی اس چھرے کی نوک میں، جس نے مجھے
یہاں بھیجکر آپ لوگوں سے ملا دیا۔ شانتا کو دیکھنے کی حسرت
ہی رہ گئی۔ شاید گولی لگ جاتی تو یہ آرزو بھی پوری ہو جاتی۔
خدا کے لئے جسودا میرا زیادہ وقت برباد مت کراؤ۔ جلدی
سے ڈسچارج کرا دو۔

کیا آپ کو یقین ہے کہ میں خدا کو اب بھی مانتی ہوں۔

نہ مانتی ہوتیں تو یہاں کیوں آتیں۔

اور کیا آپ باہر نکل کر بدلہ لینا چاہتے ہیں۔

نہیں، میں تمہارے رُوپ میں آنا چاہتا ہوں، لوگوں
کی خدمت کرنے کے لئے بے چین ہیں۔

عزیز صاحب میں مختلف ہسپتالوں میں۔ جسودا بولی
عجیب پکچر دیکھتی پھر رہی ہوں۔ شاعر ہوتی تو نہ جانے کتنی
نظمیں کہہ چکی ہوتی۔ ہر طرف زخموں کے چراغ جل رہے ہیں۔
ہسپتالوں میں دیوالی منائی جا رہی ہے۔ میں بھی ان دیوں
کو پُوج رہی ہوں، مجھے ان کے اندر لکشمی دیوی مسکراتی دکھائی
دے رہی ہے۔

فریدہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن جسودا نے اُسے
روکتے ہوئے کہا۔ میرے مریض سے زیادہ باتیں مت کرو
فریدہ۔

تم نے جو ابھی کنول کو ہنساتے ہنساتے بے حال کر دیا
تھا، میں ڈر رہی تھی کہیں اس کے زخم نہ پھٹ جائیں، کیا
وہ میرا پیشنٹ نہیں تھا۔

ضرور تھا مگر ہنسنے سے کہیں زخم پھٹتے ہیں پگلی زخم
پھٹا کرتے ہیں رونے سے۔

اچھا، آپ آرام کریں عزیز صاحب! فریدہ نے کہا۔

آپ لوگوں سے باتیں کر کے مجھے جس قدر آرام مل رہا ہے وہ کسی اور مشغلے میں نہیں مل سکتا۔ سچ کہتا ہوں کہ عورت بجائے خود ایسی راحت ہے جس کا دنیا میں جواب نہیں۔ آپ لوگ مجھے کمزور سمجھ کر کنارہ کشی نہ کریں۔ میں بہت زیادہ طاقت ور ہوں اِس وقت۔

اِسی لئے تو ہسپتالوں میں نرسیں رکھی جاتی ہیں کہ وہ آرام بن کر مریضوں کی بیماریاں دُور کریں۔ فریدہ نے کہا۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب میل نرس کے نام سے بھی نرسوں کی ایک نئی جنس پیدا ہو گئی ہے۔ میں اُس کے خلاف سخت احتجاج کروں گا۔

ویسے کچھ مرد ہماری طرح سوشل ورکر کی حیثیت سے بھی کام کرنے آگئے ہیں۔

آپ کو ان کے خلاف پروٹسٹ کرنے کا حق حاصل ہے۔

یہ تو بتایئے کہ شانتا سے ملاقات ہوئی آپ کی۔

ابھی نہیں ہو سکی۔ اس کا گھر معلوم نہیں اور کالج بند ہیں، مگر میں اسے برابر تلاش کئے جاؤں گا۔

فریدہ اور جسودا کا بہت زیادہ وقت باتوں میں صرف ہو گیا تھا۔ وہ عزیز سے معذرت کر کے چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی عزیز سوچنے لگا کہ ساری دنیا ابھی پاگل نہیں ہوئی، ایسے فرزانوں کی تعداد کم نہیں جو سماج کے بہت سے مشکل مسائل حل کر سکتے ہیں۔ وہی مستقبل میں تہذیب اور کلچر کے اُلجھے ہوئے گیسو سلجھائیں گے۔ تبدیلیاں بڑی تیزی سے آ رہی ہیں۔ بالکل آندھی اور طوفان کی رفتار سے، وقت آدمی کے لئے ایک چیلنج بن گیا ہے۔ یقین ہے کہ نئی نسل اس چیلنج کو قبول کرے گی۔ وہ مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ ماضی سے تجربہ اور مستقبل سے روشنی لے کر زندگی کے ناہموار جادوں کو صاف ستھری شاہراہوں میں تبدیل کر دے گی۔ کائنات ہر لمحہ ترقی کر رہی ہے۔ اس کا ارتقا نئے نئے سوالات اپنے ساتھ لا رہا ہے، اُن کا حل کرنا انسان ہی کا فرض ہے

اور خاص طور پر نئے انسان کا، جو دنیا میں رہ کر بھی آسمانوں کی بلندیوں کو ناپتا ہو۔

(۵)

ہسپتال چھوڑ کر عزیز آزاد نہیں رہ سکا۔ فریدہ اور جسودا نے اُسے شہر میں گھومنے کی ممانعت کر دی اور خالہ جان کے یہاں بالائی منزل میں اس کے رہنے کا انتظام کر دیا۔ حالات معمول پر نہیں آئے تھے۔ مختلف مقامات پر روز ہی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ کرفیو کے باوجود قتل، غارت گری اور آتش زنی کی لرزہ خیز واردات کا سلسلہ جاری تھا۔ عزیز کے دماغ میں بار بار یہ خیال آتا کہ جو لوگ آسمانی کتابیں جلا سکتے ہیں، وہ شانتا کا گلا بھی گھونٹ سکتے ہیں۔ جہاں انسانیت کی بنیادی قدروں ہی کا احترام نہیں کیا جاتا، وہاں ایک فرد کی کیا اہمیت ہے، اُسے قتل بھی کیا جا سکتا ہے اور اغوا بھی۔ فوراً ہی وہ اپنی تردید آپ کر دیتا اور سوچتا کہ شانتا مرے گی نہیں، وہ زندہ رہے گی اور جب تک اُس کے جسم میں سانس کی آمد و شد جاری رہے گی وہ میری راہ دیکھتی رہے گی۔ میں بھی زندگی کے آخری لمحے تک اُسے ڈھونڈتا رہوں گا۔ انہیں خیالات کے ہجوم میں اُس نے ہسپتال چھوڑنے میں بیحد عجلت سے کام لیا۔ ویسے زخم بھی معمولی تھا۔ احتیاطاً خون دے دیا گیا تھا۔ جب وہ خالہ جان کے یہاں پہنچا ہے، بالکل تندرست تھا۔ بعض اوقات وہ حملہ آور کی اِس حماقت پر ہنسنے لگتا کہ اُسے چاقو مارنے کی مشق بھی نہیں، وہ وار کرنا بھی نہیں جانتا، ورنہ مجھ جیسا نحیف و زار اس کے ہاتھ سے بچ کر نہیں آ سکتا تھا۔ جس کمرے میں اُسے رکھا گیا تھا وہ ہوادار اور روشن تھا۔ باہر کی آوازیں آسانی سے اس کے کانوں میں آ سکتی تھیں مگر باہر جانے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ ناشتہ اور کھانا مقررہ وقت پر وہیں آ جاتا تھا۔ کتابیں الماری میں رکھی ہوئی تھیں۔ اخبارات سویرے ہی اُس کے پاس بھیجدیئے جاتے تھے۔ اس کی حیثیت بالکل ہاؤس ارٹسٹ کی سی تھی۔ اُسے

بار بار شانتا کا وعدہ یاد آتا۔ اُس نے لکھا تھا کہ میں آشرم ہی میں ملوں گی، تم سیدھے وہیں آجانا۔ عزیز جانتا تھا کہ وہی ایسی جگہ ہے جہاں بہت سے عقیدوں اور قوموں کے دھارے مل جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسا سنگم ہے جہاں ہر جگہ کا پانی آتا ہے اور گھُل مل کر ایک ہو جاتا ہے۔ وہ ایک دم کھڑا ہو جاتا اور سڑک کی جانب جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا۔ وہ ضرور وہاں آئے گی۔ اس وقت جب شہر جل رہا ہے۔ اس کی تہذیب اور کلچر کے دامن سے شعلے لپٹے ہوئے ہیں۔ ہر چیز میں آگ لگائی جا رہی ہے، شانتا اور اس کے قومی جذبے کو آشرم کے علاوہ اور کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ ہم دونوں ایک ہو کر اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں گے۔ ہماری کوششوں سے ایک ایسی روایت جنم لے گی جو انسانیت کے راستے ہموار کر دے گی۔ ان میں کوئی نشیب و فراز باقی نہ رہے گا۔ اچانک اس کا طرزِ فکر بدل جاتا۔ وہ سوچنے لگتا کہ شانتا پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ وہ فوراً بحث کرنے لگے گی اور بگڑ کر کہے گی کہ انسانیت کی سطح اِس وقت بھی ہموار ہے، مذہب بھی جھگڑے کی بنیاد نہیں۔ یہ تو نہ جانے کب سے اپنے سیدھے راستے پر گامزن ہے۔ ہمارا ملک بہت سے مذہبوں کا سدابہار چمن ہے، اس میں رنگ رنگ کے پھُول کھِلتے ہیں مگر پھُولوں کی مہک میں کوئی فرق نہیں۔ سچائی کی خوشبو مختلف ہو بھی نہیں سکتی۔ کب سے ہمارے دیس میں عیسائی، پارسی، مسلمان اور سکھ اپنے دھرم کے آئینے لئے بیٹھے ہیں۔ اُن کو ٹھیس تک لگانے کی کِسی نے ہمّت نہیں کی تھی۔ ان پر کبھی گرد بھی نہیں جمی تھی۔ یہ ساری گندگی سیاست کی پھیلائی ہوئی ہے۔ سیاسی برتری اور اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ ہی فسادات کی تہہ میں کام کر رہا ہے۔ انسانی مفاد کا خیال دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں جمہوریت پہلے آئی، تعلیم اُس کے بہت بعد اب آ رہی ہے اور وہ بھی غلط راستوں سے۔ بلکہ ابھی پُورے طور پر آئی بھی نہیں۔ جمہوری نظام کو وہی دماغ سنبھال سکتے ہیں جن میں علم کی روشنی ہو اور جو سائنس کو صرف سچّائی کی تلاش کے لئے استعمال کریں۔ عزیز اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے دل ہی دل میں کہتا، شانتا کے خطوں کا انداز بھی منطقی ہوتا۔ وہ میرے بہت سے جملوں پر تنقیدیں کر چکی ہے۔ مذہب اور سیاست کے مسئلے پر ضرور طویل گفتگو کرے گی۔ اُس کا احساس بھی مجروح ہو گا۔ خیالات پوری روانی سے بہہ رہے تھے۔ ان کے دھاروں میں چھوٹی چھوٹی لہریں بن رہی تھیں۔ اَن گنت بُلبُلے سر اُبھار رہے تھے۔ کہیں کہیں بھنور بھی پڑ رہے تھے، اور پھر طوفان بھی آگیا۔ شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ عزیز تخیّلات کی دنیا میں قید نہ رہ سکا۔ کھُلی فضا میں آگیا۔ اُس نے ایک جھروکے سے دیکھا کہ بہت سے آدمی لاٹھیاں، بھالے اور چھُرے ہاتھوں میں لئے گھُوم رہے ہیں۔ اُس نے کمرے سے نکلنا ضروری سمجھا اور اسی آن فیصلہ کر لیا کہ مرد کی اس سے بڑی توہین نہیں ہو سکتی کہ اُسے بے عمل بنا کر جہدِ حیات سے الگ کر دیا جائے۔ جس کی خلقت میں اس جذبے کی چنگاری شامل ہے، وہ بے کاری کو موت سمجھتا ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے جُوتے پہن لئے، کوٹ کندھے پر ڈال لیا اور رجّو بُوا کے نام ایک پرچہ لکھ کر میز پر رکھ دیا۔ وہی اس کے لئے کھانا اور ناشتہ لاتی تھی۔ اُس کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے پنسل سے ایک مختصر عبارت لکھی تھی:

رجّو بُوا، میں ابھی آ رہا ہوں، بھاگوں گا نہیں۔ فریدہ سے کہہ دو کہ میں امن کے پرچم کو جلنے نہیں دوں گا۔ جو شعلہ اس کی طرف لپک کر آئے گا، اُسے بُجھا دوں گا۔

اس گھر میں وہ رجّو بُوا ہی کو جانتا تھا اس لئے اسی کو مخاطب کیا۔ اسے بُوا کے مہندی سے رنگے ہوئے بالوں میں جوانی کا ایسا اسٹیچو نظر آتا تھا جس کا سر کٹ گیا ہو، چلتے وقت بھی وہ اس کے سُرخ اور چکنے بالوں کا تصوّر کر رہا تھا، وہ پرچہ میز پر ڈال کر کواڑوں کو دیکھنے لگا۔ اتفاق سے باہر کی زنجیر کھُلی چھوڑ دی گئی تھی، اُس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور زینہ اُتر کر پھاٹک پر پہنچ گیا۔ یہ دیو قامت آہنی گیٹ اندر سے مقفّل تھا مگر خوش قسمتی

سے کُنجی وہیں ایک کیل میں اُلجھی ہوئی تھی۔ عزیز تالا کھول کر سڑک پر آگیا۔ سامنے ایک مکان سے دھوئیں کے مرغولے بلند ہوکر فضا میں کانپ رہے تھے جیسے وہ اپنے وجود سے ڈر رہے ہوں۔ اُن کی تخلیق میں جو نرم و نازک چیزیں شامل تھیں وہ ان سے بہت خوبصورت پیکر بنا سکتی تھیں، لیکن جب امن ہی نہ ہو تو پیکر تراشی کا تصوّر ہی مٹ جاتا ہے۔

عزیز آگ بجھانے کی غرض سے چلا، راستے میں ایک زبردست مزاحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ دس بارہ نوجوان غصّے میں بھرے ہوئے اُس کے آگے کھڑے ہوگئے۔

کیا کر رہے ہو؟ ایک نے پوچھا

دُھواں اپنے اندر داخل کر رہا ہوں۔

کیوں؟

ٹھنڈک ملتی ہے اِس سے دل کو۔ نہ جانے اس میں کتنی قیمتی ساریوں، دوپٹّوں اور کرتوں کا عطر ہوگا ــــ اس کی خوشبو سے بڑی تسکین مل رہی ہے۔

پاگل بھاگ یہاں سے۔

کہاں جاؤں بھاگ کر؟

جہنّم میں! ــــ جلدی کرو، ورنہ مار ڈالے جاؤ گے۔

راستہ بتاؤ مجھے جہنم کا۔

ذرا ٹھہرو، ابھی چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

کیا! اس لڑکی کو مار ڈالا تم نے، جس کی تصویر بھی مجھ سے چھِن چکی ہے اور جس کے بلانے پر میں یہاں آیا ہوں۔

بے وقوف کہیں کا۔ کسی چالاک عورت کے جال میں پھنس گیا ہے۔ وہ کوئی چالاک ہندو عورت ہوگی۔

عورت نہیں، وہ دوشیزہ ہے اور بڑی مخلص ہے۔

یہاں دوشیزگی اور خلوص کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ سینکڑوں دوشیزائیں عورتوں کے رُوپ میں آ چکی ہیں اور اَن گنت عورتوں کی لاشیں سڑکوں پر پڑی سڑ رہی ہیں۔

کیا مطلب؟

ایسے بکواس کرتا ہے۔ بتا ہندو ہے یا مسلمان۔

کچھ بھی نہیں، صرف آدمی ہوں۔

پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہاں آدمیّت کو ختم کیا جا رہا ہے۔

مرنے کے لئے تیاری کی ضرورت نہیں۔

باتوں سے ہمارے بھائی معلوم ہوتے ہو۔ چھُرا ہاتھ میں لو اور چلو ہمارے ساتھ، یہ میدانِ جہاد ہے۔

میں کسی لُٹیرے کو بھائی نہیں سمجھتا۔ چھُرا قبول نہیں کروں گا۔ امن کا جھنڈا ہو تو مجھے دو۔ میں اِس مردم کُشی کو جسے تم جہاد کہہ رہے ہو، ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ آپ قومی ایکتا کے جنون کے شکار ہیں، دیکھتے نہیں، یہاں ایک بہت بڑے مہاتما نے جنم لیا تھا۔ وہ پچاس برس تک ایکتا اور بھائی چارے کے گیت گاتا رہا اور آج اس کی جنم بھُومی دھوئیں سے بھری ہوئی ہے، سانس لینے کی گنجائش بھی نہیں۔

آدمی زندہ ہے پھر بھی۔ یاد رکھو میرے دوستو، اِس راکھ اور دھوئیں سے اس وقت تک پریم کے نغمے پھوٹتے رہیں گے جب تک دریائے سابرمتی میں بہنے کی طاقت ہے، مہاتما، رشی اور پیغمبر مر جاتے ہیں، ان کا پیغام رہتی دنیا تک باقی رہتا ہے۔ ایک دن آئے گا جب لڑائی ختم ہو جائے گی اور فضا سے محبّت کے گیت اُبل پڑیں گے ــــ میرے ساتھ آؤ، ہم سب مل کر اُن بے گناہوں کے زخم دھوئیں گے جو ہسپتالوں میں پڑے کراہ رہے ہیں۔

وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ آج اور کل کے درمیان صرف ایک کالی رات حائل ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ رات کبھی ختم نہ ہوگی اور سورج ڈوب کر دوبارہ نہیں نکلے گا۔ کم سے کم تو اُس کی روشنی نہیں دیکھ سکے گا۔

قریب تھا کہ عزیز کو موت کے کالے سمندر میں دھکیل دیا جاتا، بہت سے چمکتے ہوئے نیزوں کی آنکھیں اُسے گھُور رہی تھیں اور چھُروں کی زبانیں لپک رہی تھیں۔ اُسی وقت رتھو بوا دیوانہ وار بھاگتی ہوئی آئی اور دُور ہی سے چلائی

اللہ کا واسطہ اسے مت مارو، ہمارا مہمان ہے۔ دماغ چل گیا ہے۔ ہسپتال لے جانے کا وقت نہیں۔

ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ یہ سالا جنونی ہے۔ اِس پر ہاتھ مت اُٹھاؤ۔

لہو میں دریا میں ڈُوب ڈُوب کر اُبھرنے والے آہنی بھالے سرنگوں ہو گئے جیسے جنوں کو سجدہ کر رہے ہوں اور دُنیا کا ہر ستکی اُن کا امام ہو۔ بُوا عزیز کا ہاتھ پکڑے اُسے گھسیٹتی ہوئی گھر لے جانے لگی۔

میں پاگل نہیں ہوں! — عزیز نے زور سے کہا۔ اُس کی آواز بہت سے شیطانوں کے مُنہ سے اُبلے ہوئے قہقہوں میں دب کر رہ گئی۔

(۶)

بُوا نے زینے کے پاس عزیز کو چھوڑ دیا اور آگے دھکیل کر کہا۔

جا اُوپر۔ اب اِدھر مت آنا۔

وہ سر جھکائے اوپر چلا گیا جیل خانے سے بھاگے ہوئے مجرم کی مانند۔ آخری سیڑھی پر کھڑے ہو کر اس نے دیکھا کہ سڑک کے ایک کنارے پر مندر ہے، اُس کے سامنے دوسرے سرے پر مسجد کے مینار سر اُبھارے کھڑے ہیں۔ دونوں کے بیچ میں ہم مہادیو اور اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے بلوائی بھاگے جا رہے ہیں۔ ان میں خطرناک جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ مسجد پر خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ مندر سوگواری کے غبار میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے — ناقوس اذان سے اور اذان ناقوس سے شرمندہ ہے۔ وہ ایک دوسرے سے پُوچھ رہے ہیں۔

یہ کیا ہو رہا ہے
ہم دونوں میں کوئی جنگ نہیں
پھر یہ کیوں لڑ رہے ہیں؟

شاید کوئی اور ہے جو ہمارے نام پر انہیں لڑا رہا ہے۔

عزیز بیتاب ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ دوبارہ یہاں سے بھاگ جائے اور لڑنے والوں سے کہے

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
تمہیں ہندو یا مسلمان کہنا غلط ہے

تم سیاسی بازیگر ہو
کوئی اور ہے جو تتلیوں کی طرح تمہیں نچا رہا ہے۔

راجو کے بار بار ڈانٹنے پر عزیز کمرے میں داخل ہو گیا۔ بُوا نے باہر سے کواڑ بند کر لئے۔ اُسی وقت عزیز کو محسوس ہوا جیسے شانتا کی آواز خلا میں تیر رہی ہو، وہ کہہ رہی ہو

عزیز کہاں ہو، آنکھیں پتھرا گئیں راستہ دیکھتے دیکھتے۔
کب آ رہے ہو تم؟
ہم آشرم میں نہیں مل سکیں گے۔
اُسے ہماری وجہ سے نقصان پہنچ گیا ہے

لیکن بننے اور بگڑنے کا چکّر تو دنیا میں چلتا ہی رہتا ہے۔ آشرم میں پھر وہی کام شروع ہو جائے گا۔ دو دِلوں کو ملایا جاتا ہے توڑا نہیں جاتا۔

چند منٹ گذرنے پر دروازہ کُھلا اور ایک خوبصورت دوشیزہ کھانے کی ٹرے ہاتھوں پر اُٹھائے اندر آئی۔ دُور ہی سے پوچھا۔

میں آ سکتی ہوں؟

عزیز کے کانوں میں نغمگی سی بھر گئی۔ وہ موسیقی کو بہت سی بیماریوں کا علاج سمجھتا تھا مگر یہاں ایسی نغمہ ریز آوازیں بھی لاشعور کی گتھیوں کو نہ سُلجھا سکتی تھیں۔ وہ مینیا کے بیماروں کو اچھا نہ کر سکی تھیں۔ اس نے یہی سوچتے ہوئے بڑی حیرانی کے ساتھ سوال کیا۔

کون؟ شانتا!

میرا نام رابعہ ہے۔ شانتا تمہاری کیا لگتی ہے، اِس طرح اس کا نام نہ لو، ورنہ لوگ گھر کو پھونک ڈالیں گے۔ لڑنے والے ایک دوسرے کا نام و نشان تک مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔

بہت ڈری ہوئی معلوم ہوتی ہو۔

صرف میں ہی نہیں ڈر رہی ہوں، در و دیوار پر خوف طاری ہے۔ خون کا دریا بہہ رہا ہے سڑکوں پر۔ پہلے کھڑیا میں لاوا اُبل پڑا تھا اب شاہ پور اور خان پور میں انسانی خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ گولیاں اور لاٹھیاں چل رہی ہیں۔ ایسڈ بلب پھینکے جا رہے ہیں۔

اور میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ اِس آگ پر پانی ڈالنے کے لئے مجھے فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔

ہم نوا میں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں
نالۂ بلبل کے سُنوں اور ہمہ تن گوش رہوں

آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟

جہاں یہ ہنگامے ہو رہے ہیں۔ آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔

میری آپا ہسپتال میں کام کر رہی ہیں۔ اماں کی وجہ سے میں کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ بیمار ہیں۔

کیا نام ہے آپ کی آپا کا، فریدہ؟

جی ہاں، کھانا کھالیں آپ۔

یہ وقت کھانے کا نہیں، قیامت کے دن بھوک نہیں لگ سکتی۔

نہیں تھوڑا بہت کھانا ہی پڑے گا۔

رابعہ نے کھانا عزیز کے سامنے رکھدیا۔ مجبوراً اُس نے کھانا شروع کیا لیکن کوئی لطف نہیں آیا۔ وہ مسلسل رابعہ کی طرف دیکھتا رہا۔

کیا مختصر طور سے آپ مجھے بتائیں گی کہ خون ریزی کا آغاز کیونکر ہوا یہاں۔

لوگ کہتے ہیں کہ قرآن اور رامائن کی توہین سے جھگڑا شروع ہوا۔

گویا خدا اور بھگوان نے براہِ راست اعلانِ جنگ کیا اور اُنہیں لوگوں نے اس کی آواز سُنی جو کبھی ناقوس اور اذان کی صداؤں پر کان نہیں دھرتے۔

ان دونوں میں تو سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اذان نے ناقوس کو گلے لگا لیا تھا۔ جگدیش مندر کے مہنت جی نے برت توڑ دیا تھا۔ اس طرح بظاہر وہ چنگاری بجھ گئی تھی، جو اب شعلہ بن کر شہر کو جلا رہی ہے۔ اس نے رائے پور اور سارنگ پور میں دو لانڈریوں کو پھونک ڈالا۔ ایک سبزی فروش کی دکان جل گئی۔

عزیز کا موڈ کھانے کا بالکل نہ تھا۔ وہ ان المناک واقعات سے اتنا متاثر تھا کہ بھوک کا احساس ہی فنا ہو گیا تھا۔ دماغ میں عجیب قسم کا انتشار تھا۔ بار بار اس پر خود فراموشی کا خمار چھا جاتا تھا اور وہ بے سروپا باتیں کرنے لگتا تھا۔

مجھے جانے دو! ـــ کیا نام ہے تمہارا؟

رابعہ ابھی بتا چکی ہوں۔ کہاں جانا چاہتے ہیں آپ؟

میں نہیں جانتا کہاں جاؤں گا۔ شاید کسی ہسپتال میں بیٹھ جاؤں یا کسی لاش سے لپٹ کر رونے لگوں۔

کس کس لاش سے لپٹ کر روئیں گے آپ، جگہ جگہ لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ کوئی انہیں اُٹھانے اور پہچاننے والا بھی نہیں۔ میرے کالج کے احاطے میں دو لڑکیوں کو مار ڈالا گیا تھا۔ ان کے گھر کسی نے فون تک نہیں کیا۔ میں بڑی مشکل سے بچ کر آئی۔ خدا بھلا کرے سردار گوردت سنگھ کا، وہ اپنی جیپ میں یہاں چھوڑ گئے۔

گوردت کا نام سُنتے ہی عزیز کے بدن میں جھرجھری آ گئی ـــ گوردت، گوردت اُس نے دو مرتبہ یہ نام لیا۔ ایسا لگا کہ اس کی زبان الفاظ کو چُوم رہی ہے۔

آپ کہاں سے آ رہے ہیں مجھے آپ پر بڑا ترس آ رہا ہے۔

دہلی سے آیا ہوں، کیوں ترس آ رہا ہے آپ کو مجھ پر، رحم کے مستحق تو وہ ہیں جن کے پہلوؤں میں چاقو کی دھاریں تیر رہی ہیں اور جن کے گھروں سے لپٹیں نکل رہی ہیں۔ اگر واقعی آپ کو مجھ سے کوئی ہمدردی ہے تو مجھے یہاں سے نکل جانے دیجئے، میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ نہ جانے کب سانس رُک جائے اور آپ کو میری لاش نالی میں پھینکنا پڑے گوردت کو تلاش کر کے اُس سے کہوں گا کہ اپنا خون واپس لو، یا اُسے کسی اور کے بدن میں داخل ہو جانے دو۔

دماغ چل گیا ہے آپ کا۔ کرفیو لگا ہوا ہے۔ چلنے پھرنے کی آزادی بھی باقی نہیں رہی ہے۔ میں فریدہ آپا کو کیا جواب دوں گی۔

مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔

دیکھیے میں صاف بتائے دیتی ہوں کہ عزیز اور شانتا کا یہاں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس قسم کے سارے ناتے ٹوٹ چکے ہیں۔

فریدہ اور جسودا کا رشتہ بھی کیا باقی نہیں رہا؟

اُسے کون توڑ سکتا ہے۔

پھر رام اور رحمٰن کی دوستی بھی قائم رہے گی۔ عزیز اور شانتا کے خطوں کو جلایا نہیں جا سکے گا۔

اتنا اور کہہ دوں کہ شہر میں صرف دو ہی مقامات ایسے ہیں جہاں پاگل پن کا اثر نہیں۔ ایک قطبی محلہ، دوسرا اسٹیشن۔ امن کا فرشتہ ان دونوں کو اپنے پروں میں چھپائے بیٹھا ہے۔

میں اس سے کہوں گا اپنے بازو اچھی طرح کھول دے اور دُور دُور تک پھیلی ہوئی آگ کو فوراً بجھا دے۔ میں اسٹیشن اور قطبی محلے کی ٹھنڈی ہوائیں شہر بھر میں پھیلا دوں گا۔

کیا ٹھنڈی ہوائیں پھیلا دیں گے آپ۔ سابرمتی کی خنک لہریں بھی ان انگاروں کو نہ بجھا سکیں تو اور کون بجھا سکے گا۔

رابعہ دیکھو تم بڑی خوبصورت اور بڑی ہی دلکش ہو، عزیز نے ایک کامیاب نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ تمہاری بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھوں میں سابرمتی سے زیادہ گہرائی اور ٹھنڈک ہے۔ ان میں ایسی پاکیزگی ہے جس پر گندگی کا نشان تک نہیں۔ تمہارے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر اس قسم کی بُری باتیں نہیں آنی چاہئیں۔ اُمید کا دیا بجھا نہیں کرتا، جلتا ہی رہتا ہے۔ رابعہ مت بھولو کہ بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جو ٹوٹا نہیں کرتے۔ عزیز اور شانتا، یا گوردت اور رابعہ میں اِسی قسم کا رشتہ ہے۔ سارا ملک احمد آباد بن جائے تو بھی دوستی کا یہ دھاگہ جس کا ایک سِرا مہاتما کے چرخے کی اس تلی سے جُڑا ہوا ہے جو نصف صدی سے امن اور محبت کی تان لگا رہی ہے، کبھی نہیں ٹوٹ سکے گا۔ اچھا مجھے جانے کی اجازت دو رابعہ، مجھے نہ روکو۔

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

رابعہ پگھل گئی۔ وہ بالکل بھول گئی کہ فریدہ نے عزیز کے متعلق کیا ہدایات دی تھیں اور جسودا نے چلتے چلتے کیا کہا تھا

رابعہ اس بگولے کو اُڑنے نہ دینا

پھر وہ چپکے سے ہنستے ہوئے بولی تھی،

طوفان کو رسیوں سے نہیں جکڑا جا سکتا مگر زلفوں میں اُسے ضرور اسیر کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ قابو سے باہر ہو، تم اپنے گیسو ہوا میں لہرا دینا۔

رابعہ، عزیز وہ سُرخاب ہے جو سائبریا سے ہندوستان تک کا فاصلہ ہوائی جہاز کی رفتار سے طے کر لیتا ہے۔ اسے اُڑنے نہ دینا۔

میں ابھی آپ کو چھوڑے دیتی ہوں۔ رابعہ بولی قسم کھائیے کہ لوٹ کر یہیں آئیں گے۔

تمہارے لمبے کالے بالوں اور گلاب کی طرح شاداب رخساروں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہیں واپس آؤں گا۔ کسی خانہ زادِ زلف سے یہ بدگمانی نہیں کی جا سکتی کہ وہ زنجیروں سے ڈر کر بھاگ جائے گا۔ یقین رکھو کہ میں آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔

پتہ معلوم ہے؟

نوٹ کیے لیتا ہوں۔

اُس نے ایک کاغذ پر پتہ لکھ لیا۔

آپ کے عشق کا میں احترام کرتی ہوں۔ رابعہ بولی اگر یہ رشتے جن پر ابھی بات ہو رہی تھی، قائم رہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ انہیں ہر جگہ جھٹکا دیا جا رہا ہے۔ آشرم ہی کو لیجیے، وہاں ستر سال کا ایک بوڑھا جس کی بھنویں تک سفید ہو چکی ہیں سینتالیس سال سے بالکل گھر کے فرد کی حیثیت سے رہتا آیا تھا اور بھائی چارے کا پرچار ہی اُس کی زندگی کا مقصد تھا لیکن لہو کا مینہ برسانے والے انسان دشمنوں

نے اس پر بھی حملہ کر دیا۔

ستر سال کا بوڑھا تو چراغِ سحری سے کم نہ تھا۔ وہ تو ایک پھونک ہی میں بجھ گیا ہوگا۔

امن اور محبت کے دیے اس طرح نہیں بجھا کرتے۔ اسے لوگ مار نہیں سکے۔ وہ اپنے اصول پر قائم رہا اور آشرم ہی میں ڈٹا رہا۔ جب اس سے کہا گیا کہ یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ۔ راج بھون کے دروازے بھی اس کے لئے کھل گئے مگر اُس نے صاف کہہ دیا کہ میں نے یہاں عمر بھر عبادت کی ہے اگر یہیں میری حفاظت نہیں ہو سکتی تو جینا بے کار ہے، ایسی صورت میں موت زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

رابعہ نے بڑے جوش کے ساتھ یہ باتیں کہیں۔ اس کا لہجہ بلند ہو گیا۔ چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ آواز میں جذباتیت کا ساز بجنے لگا۔ عزیز تاثرات میں ڈوب گیا۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔

پھر کیا ہوا؟

کیا بتاؤں کیا ہوا۔ وہ ہوا جس کو بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ ایک گروہ نے کلہاڑیوں، بھالوں اور چھُروں سے لیس ہو کر آشرم کو گھیر لیا جو احمد آباد کے شمالی سرے پر ہے اور جہاں ہمیشہ پریم کی اوس برستی رہتی ہے۔ دروازہ توڑ دیا گیا اور پتھر پھینکے گئے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ بہت سے نمرود جمع ہو کر خدا پر تیر برسا رہے تھے۔

شاید میں بھی اسی موقع پر زخمی ہوا تھا۔

ہاں اُسی روز قریب کے مکانات میں آگ لگائی گئی تھی۔ یہ گھر نورنگ پور میں تھے۔ ان میں رکھی ہوئی بہت سی آسمانی کتابیں اور دستاویزیں جل کر راکھ ہو گئیں۔

بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو رابعہ، جگہ کا نام مجھے معلوم نہیں مگر میں نے ان مذہبی کتابوں سے لپٹیں اُٹھتی دیکھی ہیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے خدا شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔

اُس کا پیغام جل رہا تھا اور سابرمتی کی لہریں یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ طوفان کا رُوپ دھار کر ادھر نہیں آئیں ـــــ رابعہ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ دروازہ

کھول دو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے نکل کر آدمی کا تجسس کروں۔ دیکھوں کہ وہ کہاں ہے۔ بتاؤ رابعہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔

میں کیا بتا سکتی ہوں؟ اور اگر کہیں وہ آپ کو مل بھی گیا تو اس کے جسم پر انسانی لباس نہ ہوگا۔ یہاں صرف آدمی کا نام انسان نہیں۔

وہ ضرور ملے گا۔ اسے موت نہیں آ سکتی۔ جن ہاتھوں نے زندگی کے خوبصورت محل بنائے ہیں، وہ ٹوٹ نہیں سکتے۔ آدمی نہ کبھی مرا ہے، نہ آئندہ اسے موت آ سکے گی۔ وہ کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہے گا۔

غلط! ـ آپ نے تاریخ نہیں پڑھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے بڑی بڑی شخصیتیں رُخصت ہو گئیں۔ اور زندگی انہیں پناہ نہیں دے سکی۔ سقراط، عیسیٰ اور حُسینؑ نے کیا حیات کی زلفیں سنوارنے کی کوشش نہیں کی تھی، کیا وہ انسان دوستی کے علمبردار نہیں تھے؟

ضرور تھے رابعہ، مگر وہ مرے نہیں۔ زندہ ہیں۔ ان کے لہو کی ہر بُوند سے نئے نئے انسان جنم لے رہے ہیں۔ انہیں کے دم سے سچائی کا نُور برقرار رہے گا اور دنیا میں خلوص کے پھول کھلتے رہیں گے۔

رابعہ کے لبوں پر بڑی حسین اور معصوم مسکراہٹ دوڑ گئی، جیسے گلاب کی کلی کھل گئی ہو اور اس کی نازک پتیاں اپنی مسلسل جنبشوں سے عزیز کی تائید کر رہی ہوں۔ وہ غور سے عزیز کو دیکھتی رہی۔

میں جا رہا ہوں۔ عزیز نے کہا۔ میرا انتظار کرنا، میں ضرور آؤں گا۔

جائیے! ـــــ میں انتظار کروں گی۔ جانتی ہوں، سورج ڈوب کر دوبارہ ضرور نکلتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے خزاں کے بعد بہار کا آنا لازمی ہے۔

میں نہ سُورج ہوں، نہ بہار، مگر زندہ لوٹ کر آنے والا ایک حوصلہ مند آدمی ضرور ہوں۔

وہ دروازے سے نکل گیا جیسے مہک پھُول کا سینہ

چاک کرکے نکل جاتی ہے۔ رابعہ کواڑوں کی دراز سے جھانکتی رہی۔ وہ اُس کے جانے سے پریشان تھی۔ عزیز آخری سیڑھی پر ذرا ٹھٹکا۔ مُڑ کر رابعہ کو دیکھا۔ اُس کا جی چاہا کہ یہیں کھڑا رابعہ کو دیکھتا رہے۔ لمحات کا تیز رو آبشار اسی جگہ منجمد ہو جائے اس سے سیلان کی طاقت چھین لی جائے، وہ روانی بھول جائے اور ہم دونوں ایک دوسرے کو اسی طرح دیکھتے رہیں۔ اچانک عزیز کو اپنا مقصد یاد آ گیا اور اس نے رابعہ کو سُناتے ہوئے کہا

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

(۷)

سڑکوں پر آمد و رفت بند تھی۔ ہُو کا عالم تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جگہ جگہ اینٹوں، پتھروں اور سوڈے کی ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ عزیز نے ان کانچ کے ٹکڑوں کو دیکھ کر سوچا، کتنے دنوں میں بنائی گئی ہوں گی اتنی بوتلیں۔ یہ انسانوں کو گھائل کرنے کے لئے نہیں ڈھالی گئی تھیں۔ انہیں آرام پہنچانے کی غرض سے آبگینے کو بھٹیوں میں پگھلا کر اسے بوتلوں کا رُوپ دیا گیا تھا۔ ان کا استعمال بہت غلط ہوا ہے۔ اس وقت عزیز کو آدمی سے ڈر لگنے لگا۔ اس کے خیال میں وہ ایک خوفناک درندے کی شکل میں آ گیا تھا۔ اسی وقت ایک فلاسفر کے یہ الفاظ اُس کے ذہن میں اُبھر آئے۔

Human beings are the only animals of which I am thoroughly and cravenly afraid.

کہاں جا رہے ہو؟
ایک بوڑھی عورت نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا۔ اس کے بال امن کے پرچم کی طرح سفید تھے۔

کچھ نہیں کہہ سکتا کہاں جا رہا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ موجِ حوادث سے اُلجھنے کا عزم کرکے سڑکوں پر نکل آیا ہوں۔

لوٹ جاؤ۔ یہ وقت اس طرح گھومنے کا نہیں۔

کوئی رشتہ دار بھٹک گیا ہے تو ہسپتال یا پولس اسٹیشن میں فون کرکے معلوم کر لو۔

اُسی وقت ایک نوجوان نل پر پانی بھرنے آیا۔ پلاسٹک کی ہری بالٹی اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سبز انقلاب (Green revlution) کا علمبردار ہو۔ وہ بڑی احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتا چل رہا تھا۔ عزیز نے پوچھا اندر نل نہیں؟

ہے تو سہی، پر ڈر رہا ہوں پانی میں پائزن نہ ملا دیا گیا ہو۔ دُودھ میں زہر ملایا جا سکتا ہے تو پانی میں کیوں نہیں ملایا جا سکتا۔

سُنا ہے کہ یہ تو محض افواہ تھی۔

آپ نے سُنا ہے اور میں اخبار میں پڑھ چکا ہوں مگر یقین نہیں آتا۔

اور کیا ہو رہا ہے یہاں، کچھ پتہ ہے آپ کو؟

کیوں نہیں، پل پل کی خبریں معلوم کر رہا ہوں۔ ریڈیو ہر وقت کھُلا رکھتا ہوں۔ ٹیلی پرنٹر بھی ہے اُوپر آفس میں۔ اب تک تیئیس ۲۳ جگہ گولی چل چکی ہے۔ نہ جانے بھارت ماتا کے کتنے سپوت مر چکے ہوں گے۔ کرفیو لگا ہوا ہے مگر اُسے توڑا جا رہا ہے۔ آٹھ سو ایسے مجرموں کو پکڑا جا چکا ہے جو کرفیو توڑ رہے تھے۔ انہوں نے اُسے کھریا مٹی کی ریکھا سمجھ رکھا تھا۔

کہاں جا رہے ہو اس وقت؟ آؤ میرے دفتر میں چلو کوئی تمہیں نہیں پکڑ سکے گا۔ میں اخبار نویس ہوں۔

نہیں بتا سکتا کہاں جا رہا ہوں۔ مجھے کسی پناہ گاہ ضرورت نہیں۔ سڑک پر پناہ نہیں مل سکتی تو آفس میں جا کر کیا کروں گا۔ آپ کا ٹیلی پرنٹر میرا دماغ خراب کر دے گا۔

پھر ہوشیاری سے چلو خوب دیکھ بھال کر۔ اُوپر سے کوئی الیکٹرک بلب نہ پھینک دے۔ سچ مچ ہم پاگلوں کی بستی میں رہ رہے ہیں۔ یہ شہر بہت بڑا پاگل خانہ ہے۔ آج ایک سب انسپکٹر تیزاب سے جل گیا ہے۔ چار راستہ میں بھی نوجوانوں پر تیزاب کے بلب پھینکے گئے ہیں۔ کہہ چکا ہوں میں اخبار نویس ہوں۔ مجھے ساری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں

کھرپا میں تیزاب کا بہت بڑا ذخیرہ ملا ہے پولس والوں کو۔

اور کیا خبر بن ہیں ؟

کہہ دیا کہ جرنلسٹ ہوں۔ مجھے اتنی خبریں معلوم ہیں کہ سننے والے کا کلیجہ پھٹ سکتا ہے انہیں سن کر۔ باپو نگر یہاں کا مشہور صنعتی مرکز ہے۔ وہاں کی ہواؤں میں بھی پس گھل گیا ہے۔ سڑکوں پر خون کا فوارہ اُبل رہا ہے۔ شہر کے اندر بھی بڑا تناؤ ہے ــــ آؤ میرے آفس میں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔

اخبار نویس کچھ اور کہتا مگر دو تین فائر بریگیڈ گھنٹیاں بجاتے آگے پیچھے دوڑتے ہوئے آئے اور سامنے سے گذر گئے۔ جرنلسٹ دوڑ کر اندر چلا گیا۔ عزیز کو محسوس ہوا کہ وہ کسی محاذ جنگ پر کھڑا ہوا ہے۔ گھمسان کا رن پڑ رہا ہے۔ وہ ایک گلی میں گھس گیا۔ جن محلوں میں کرفیو لگایا گیا تھا اُسے اُن کے نام معلوم نہ تھے مگر جانتا تھا کہ خلاف ورزی کرنے والوں کو گولی سے اُڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ شدید خطرے کے وقت بھی اپنے مقصد سے غفلت نہیں برت سکتا تھا۔ چاہتا تھا کہ کسی امن دوست جماعت کے ممبران سے ملنے کا موقع مل جائے اور وہ اپنے آپ کو رضاکار کی حیثیت سے پیش کر دے۔ گلی بہت تنگ تھی۔ وہ عزیز کے حوصلوں کی وسعت کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ وہ سڑک پر آگیا۔ فولادی خود والے سپاہی بندوقیں سنبھالے ٹولیاں بنائے گھوم رہے تھے۔ اُن کے جوتوں کی بھاری آوازیں سنسان فضا کو بڑے بھیانک انداز سے جھنجھوڑ رہی تھیں۔ عزیز اس وقت جس بازار سے گذر رہا تھا اس کی دکانیں بند تھیں اور رہائشی مکانات تھے، اُن کی کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی نہ تھیں۔ کُتوں کے بھونکنے سے بار بار خاموشی اور سناٹے کو شدید جھٹکا لگتا تھا۔

عزیز پھر ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ اس کے اختتام پر بہت چوڑی شاہراہ تھی جس پر بجلی کی روشنی روتی بسورتی محسوس ہو رہی تھی۔ آدم زاد کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ دُھندلکے بڑھتے جا رہے تھے۔ اُنہیں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اُسے رابعہ کا گھر چھوڑے کتنی دیر ہو چکی ہے۔ وہ اپنے محبوب مقصد سے اب تک ہمکنار نہ ہو سکا تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ بجلی کی روشنی اس اندھیرے کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی عزیز نے سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر دونوں جانب دیکھا۔ دُور چوراہے پر بڑا جمگھٹا تھا۔ دو ٹولیوں میں دست بدست جنگ ہو رہی تھی۔ آزادی سے آتشیں اور دھار دار اسلحہ کا استعمال کیا جا رہا تھا۔ دُوسری طرف آہنی ٹوپیوں والی پولس کے جوان بندوقیں کندھوں پر رکھے ٹہل رہے تھے اور اب وہ عزیز کی سمت تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ وہ اس چوراہے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے، جہاں مورچہ لگا ہوا تھا۔ دفعتہً ان کی رفتار سست ہو گئی غالباً وہ اس مقابلے میں دخل دیتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ عزیز کے پاس آ کر ٹھہر گئے۔ ایک سپاہی نے بندوق کی نالی چھاتی کی سیدھ میں کر کے پوچھا۔

کہاں سے آئے ہو؟

یہیں رہتا ہوں۔

بتاؤ اس وقت تم کہاں ہو؟

نہیں بتا سکتا کہاں ہوں۔

پردیسی ہو؟

نہیں اِسی ملک کا باشندہ ہوں۔

کوئی فسادی معلوم ہوتے ہو، باہر سے دنگا کرانے آئے ہو۔

نہیں، میں فسادی بالکل نہیں ہوں۔ نہایت بے ضرر شہری ہوں۔

جھوٹ! ــــ اسے گرفتار کر لو۔

اُسی لمحہ لوہے کی چمکدار ہتھکڑی اُس کے ہاتھوں میں پہنا دی گئی۔ ایک جوان نے زور سے ہتھکڑی کی رسّی کو جھٹک کر کہا

چلو پولس اسٹیشن۔

عزیز دو سپاہیوں کے درمیان فولادی کنگن پہنے

بھاری قدموں کے ساتھ چلنے لگا۔ رفتار ذرا سست ہوتی
تو سپاہی کمر میں لپٹی ہوئی رسّی کو جھٹکا دے کر کہتا۔
پاؤں کیوں نہیں اٹھتے، کیا جان نہیں پیروں میں؟
ایک مرتبہ سپاہی نے شانوں کے درمیان بندوق کا کندا
مار کر کہا۔

جلدی جلدی پاؤں اٹھاؤ بدمعاش۔

کوئی بہت بڑا غنڈہ معلوم ہوتا ہے۔

چھ سات فرلانگ چلنے کے بعد تھانہ آگیا۔ بڑی شاندار مگر
ہیبت ناک بلڈنگ تھی۔ سامنے بہت سے ٹرک کھڑے
ہوئے تھے۔ ایک میں لوہے کی ٹوپیوں والے جوان چار چار
کی قطار میں اوپر کے گزوں پہ ہاتھ جمائے کھڑے تھے
ٹرک کہیں جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اس کے آگے
ایک جیپ تھی۔ اس میں چند افسران بیٹھے ہوئے تھے۔
وائرلیس بھی لگا ہوا تھا۔ اسی وقت مائک پر اعلان کیا
گیا۔

کھڑیا، بیخ کوا، شاہ پور، دریاپور، رائے پور، کالپور، گومتی
پور اور جمال پور میں بہت بڑے جھگڑے ہو رہے ہیں۔
ایک سپاہی نے دوسرے سپاہی کو دیکھ کر کہا
جھگڑے کیا ہو رہے ہیں، خون کا چھڑکاؤ ہو رہا ہے۔
سڑکوں پر۔

اسی لمحہ جوانوں سے بھرا ہوا ٹرک حرکت میں آیا اور
بلڈگ کی طرح غراتا چلا گیا۔

ان جوانوں کو، ایک انسپکٹر بولا' اروا' چمن پورہ'
گومتی پور اور امراؤ واڑی بھیجا گیا ہے۔

یہ تو سب انڈسٹریل ایریا ہے۔ دوسرے افسر نے کہا
ہاں، وہاں بھی گرم اور زہریلی ہواؤں کے جھونکے
چلنے لگے ہیں۔

میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر نے
دانستہ ریسیور اٹھا کر کانوں سے نہیں لگایا۔ گھنٹی
مغموم اور اداس فضا میں میٹھے رسیلے نغمے بکھیرتی رہی۔
مجبور ہو کر انسپکٹر نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

ہیلو ___ سمیر سنگھ اسپیکنگ۔

سمیر سنگھ نے فون سنتے سنتے تیوری چڑھائی اور
اونچی آواز میں پوچھا۔

مسٹر چھیدی مر گئے؟

کس نے مار ڈالا؟

لو سنو بہادر خاں۔ سمیر سنگھ نے سامنے کرسی پر بیٹھے
ہوئے افسر سے کہا۔

امراؤ واڑی میں کئی آدمی قتل ہو چکے ہیں۔ چھیدی بھی گیا
وہ برابر یہی کہتا رہا کہ ہم مزدور علاقوں پر توجہ نہیں کرتے
عزیز یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ سپاہی نے ہتھکڑی کی
رسی مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ انسپکٹر نے اسے دیکھ کر پوچھا
کہاں سے لائے ہو

آوارہ پھر رہا تھا سڑک پر۔

غنڈہ معلوم ہوتا ہے۔ کسی دوکان کا تالا توڑنے والا تھا۔

ڈال دو سالے کو حوالات میں۔

رحمن خاں۔ وہ زور سے چلّایا۔ اسے بند کر دو۔

کہاں بند کروں' حوالات بالکل بھر چکی ہے۔

پروا مت کرو۔ اسے بھی اسی میں ٹھونس دو' جانتے
نہیں ہو تاریخ اپنے آپ کو دہرایا کرتی ہے۔ وہ پھر ایک
بلیک ہول بنا رہی ہے۔

میں نے کوئی قصور نہیں کیا جناب!

یوں ہی پکڑ لائے ہیں یہ آپ کو ___ کیونکر یقین کیا
جائے آپ کی بات کا۔ کہاں سے آئے ہو؟

ہندوستان کی راجدھانی سے۔

نام لو کہاں ہے راجدھانی؟

دلی میں۔

کیا کرتے ہو؟

بزنس۔

کاہے کی؟

ٹرنک بنانے کا ایک کارخانہ ہے چھوٹا سا۔

انکم ٹیکس تھیف معلوم ہوتے ہو شاید' کارخانے کو

چھوٹا بتا رہے ہو، مالک ہو اُس کے ؟

جی ہاں۔

یہاں فساد کرانے آئے تھے ؟

نہیں، اپنی ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔

فرہاد ہو اپنے زمانے کے، کون ہے وہ لڑکی ؟

میں نہیں جانتا۔

بے جانے بوجھے دوستی کرلی۔ کوئی بازاری عورت ہوگی۔

نہیں، بہت شریف ہے۔

اِسی لئے اُس نے تمہیں یہاں بُلایا ہے۔

اسے کیا خبر تھی کہ ہنگامہ ہو جائے گا۔

خبر نہ ہوتی تو بُلاتی کیوں۔ کتنے کارتوس لائے ہو۔ کوئی پستول ہوگا دیسی ساخت کا جیب میں۔ ابھی چورا ہے پر دو آدمیوں کو مار ڈالا ہے کسی نے۔ جانتے ہو قاتل کون تھا؟ کس گینگ سے تعلق ہے تمہارا ؟

کسی سے بھی نہیں۔ میں نہیں جانتا قتل کس نے کیا ہے۔

اپنی دوست سے پُوچھ کر بتا سکتے ہو؟

ہاں بشرطیکہ وہ مجھے مل جائے۔ اُسے میں نے دیکھا نہیں لیکن میرے دل کی دھڑکنوں میں سمائی ہوئی ہے۔ ہر لمحہ اس کی آوازیں شعور میں گونجتی سُن رہا ہوں۔ ڈر ہے اُسے کسی نے مار نہ ڈالا ہو۔

ارے واہ شاعر معلوم ہوتے ہو۔

نہیں، میں شاعر واعر نہیں ہوں۔

کہاں تک پڑھے ہو ؟

ڈاکٹریٹ لی ہے میں نے، میرا تھیسس چھپ گیا ہے۔

ڈاکٹر اور فلاسفر ہی تو جھگڑے کراتے ہیں۔ جب تک یہ لوگ نہ تھے، لڑائی کا نام تک نہ جانتا تھا کوئی۔ دیس میں یہ مصیبت تعلیم ہی کے ساتھ آئی ہے۔

علم جہالت کو مٹاتا ہے اسے جنم نہیں دیتا غلط قسم کی تعلیم ضرور کردار کو بگاڑ دیتی ہے۔

کس پارٹی کے آدمی ہو ؟

کسی کا بھی نہیں۔

کسی کو جانتے ہو یہاں ؟

فریدہ، جسودا اور رابعہ کو جانتا ہوں۔

یہاں کی سب لڑکیوں کو پھانس رکھا ہے تم نے۔

کون ہیں وہ ؟

سوشل ورکر ہیں۔ ہسپتالوں میں زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ وہ بھی کسی کو خون دینے جا رہا تھا۔

انسپکٹر نرم پڑ گیا۔ پوچھا

کوئی غزل سُنا سکتے ہو؟

ضرور !

پھر سُناؤ یار کوئی اچھی سی غزل۔ تین دن سے آنکھ تک نہیں لگی۔ کانوں میں ہر لمحہ رونے چلّانے کی صدائیں ہی آتی ہیں۔ پورا شہر قسائی کی دوکان بنا ہوا ہے۔ موسیقی اور شاعری سے جذبات میں گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ سُناؤ دوست کوئی اچھی سی چیز۔

عزیز نے بڑی مدھرلے میں گانا شروع کر دیا :

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا\
ہم بلبلیں ہیں اُس کی وہ گلستاں ہمارا

وہ اس ترانے کے اثر سے واقف تھا۔ دلّی کی اردو کانفرنس کا افتتاح اِسی سے ہوا تھا اور پنڈت جی جھُوم اُٹھے تھے۔ پنڈال میں بھری ہوئی ہواؤں سے رس ٹپکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت بھی ترانے کی تاثیر عزیز کی میٹھی اور درد آمیز آواز میں مل کر کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ انسپکٹر بالکل اسطرح جھُومنے لگا جیسے سپیرے کی بین پر کالا سانپ وجد کرنے لگتا ہے۔ بہت سے سپاہی اور افسران جمع ہو گئے۔ وہ سب بیداری کے عذاب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُنہیں نیند سی آنے لگی۔ بعض کی آنکھیں بھیگ گئیں اور جب اُس نے ذرا اُونچی تان میں یہ شعر گایا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

تو سننے والوں کے مُنہ سے بے ساختہ واہ وا کی صدائیں

نکلنے لگیں۔

کیا نام ہے دوست تمہارا؟ انسپکٹر نے رومال میں آنسو جذب کرتے ہوئے سوال کیا۔

عزیز!

یہ فسادی نہیں ہو سکتے۔ ان کی آواز میں پریم کا رس گھلا ہوا ہے۔ کھول دو ہتھکڑی ـــــ کہاں جانا چاہتے ہو ڈاکٹر؟

عزیز نے رابعہ کا پتہ بتا کر کہا۔ رابعہ کے گھر۔

انسپکٹر نے عزیز کو اپنے ساتھ چائے پلائی اور دو سپاہیوں کو بُلا کر کہا۔

انہیں جیپ میں بٹھا کر گھر پہنچا دو اور جب تک یہ اندر نہ چلے آئیں آپ لوگ وہیں کھڑے رہیں۔

(۸)

رابعہ کے گھر میں داخل ہو کر عزیز کو یوں لگا جیسے وہ کسی ایسے باغ میں آ گیا ہو جہاں پھول ہی پھول ہوں۔ ان کی مہک اور رنگینیاں ہوں۔ کوئی شور یا ہنگامہ نہ ہو بڑی فردوسی فضا تھی رابعہ کے مکان کی۔

اتنی رات گئے تک کہاں رہے؟ رابعہ خفا ہو کر بولی، جیسے وہ اس بھیانک رات میں جاگ کر برابر اسی کا انتظار کرتی رہی ہو۔

تھانے میں تھا رابعہ۔

کیا پکڑ لئے گئے تھے؟

ہاں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مجھے ہتھکڑیاں لگا دی گئی تھیں۔

کلائی اب تک دُکھ رہی ہے۔

اور آزادی کیونکر ملی؟

راجو بُوا بھی موجود تھیں، بولیں

بھاگ کر آئے ہوں گے، اچھے مہمان ہیں ہم پر بھی تباہی لائیں گے۔

کیا کروں بُوا، تباہی میرے قدموں سے چمٹی پھر رہی ہے۔

بُوا نے اندر جا کر عزیز کے آنے کا ذکر کیا۔

فریدہ اور جسودا دونوں وہیں موجود تھیں۔ وہ اوپر آئیں۔ رابعہ کو عزیز سے باتیں کرتے دیکھا تو بولیں

کہاں چلے گئے تھے یہ؟

یوں ہی ذرا گھومنے نکل گیا تھا۔

یہ وقت گھومنے کا ہے؟ فریدہ بولی۔

وقت تو ایسا نہیں ہے مگر میں چلا گیا تھا۔

غنیمت ہے زندہ لوٹ آئے۔ آپ کو معلوم نہیں قیامت برپا ہے یہاں۔ ہسپتال زخمیوں سے بھرے ہوئے ہیں ـــ اسٹیشن پر آدمی ہی آدمی ہیں۔ آج میں نے وہاں کی ڈسپنسری میں کام کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شہر بھر کو کینسر نے جکڑ لیا ہے۔ اس کے ریشے اندر ہی اندر اِس طرح پھیلتے جا رہے ہیں جیسے اکاس بیل کسی سرسبز پیڑ پر پھیل جاتی ہے اور اس کا سارا رس چُوس لیتی ہے۔ جسودا نے کہا۔

سُنا ہے برت بھی تو شروع کر دیا ہے کسی نے؟ فریدہ نے پُوچھا۔

ہاں ایک مشہور لیڈر نے روزہ رکھ لیا ہے۔

یہ بھی خوب رہی۔ رابعہ قہقہہ لگا کر بولی۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کیا حالت ہے آپ کے شہر کی۔ عزیز نے جسودا اور فریدہ کو مخاطب کیا۔

سڑکوں پر جدھر دیکھو لاوا بہتا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں چنگاریاں نہ اُڑ رہی ہوں۔ آدمی کا خون پانی سے زیادہ ارزاں ہو گیا ہے۔ لوگ لہو کی ندی میں غوطے لگا رہے ہیں۔ ہمارا شہر تاریخ میں ایک ایسے باب کا اضافہ کر رہا ہے جو اب تک کسی کتاب میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ آئندہ نسلیں اسے دیکھ کر اپنے اسلاف کے ان کارناموں پر نہ جانے کب تک شرماتی رہیں گی۔

لیکن اِس اندھیرے میں۔ جسودا نے کہنا شروع کیا۔ کہیں کہیں کوئی چراغ بھی جگمگا اُٹھتا ہے جو انسانیت کی بقا کا پتہ دیتا ہے اور اُس کی مدّھم جوت نشانِ منزل

کی طرح گھٹاٹوپ اندھیری میں چمکتی محسوس ہوتی ہے۔ احمد آباد میں ایسے کئی منارۂ نور ہیں اور قطبی محلے کی حیثیت تو اس طوفان میں کشتیٔ نوح سے کسی طرح کم نہیں۔ جو لوگ اُس میں رہتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ کوہ جودی کی چوٹی پر کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

ذرا فریدہ سے بھی پوچھیے کہ بڑودے پر کیا گذر رہی ہے۔

کیا بتاؤں کیا گذر رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عین جشن کے موقع پر جہاں آرا کے کپڑوں میں موم بتی سے آگ لگ گئی ہے اور اُس کے جسم پر آبلے پڑ گئے ہیں۔ بڑودہ سچ مچ ایک ایسی دوشیزہ کا حکم رکھتا ہے جس کی چمکدار اور رنگین ساری پر کھلے ہوئے پھول سدا مہکتے ہی رہتے ہیں۔ مگر اس میں بھی اس وقت بگولے ناچ رہے ہیں، شیطان قہقہے لگا رہا ہے۔

ان کا مکان یاقوت پورے میں ہے۔ میں کہہ رہی ہوں کہ فوراً چلی جاؤ۔ اپنا گھر ہے۔ جل گیا ہو تو ذرا سی راکھ اٹھا لاؤ۔ سابرمتی میں گھول دیں گے۔

کیا کروں گی وہاں جا کر عزیز صاحب۔ فریدہ بولی۔ کرفیو آرڈر یا دفعہ ۱۴۴ نہیں ہوں کہ جاتے ہی نافذ ہو جاؤں اور فساد رک جائے۔ دیکھ رہی ہوں کہ یہاں یہ سارے حربے بے کار ہو چکے ہیں۔ تہذیب اوپر سے نہیں ٹھونسی جا سکتی۔ وہ تو اندر سے اُبلتی ہے۔ شہر کو فوج کے حوالے کیا جا چکا ہے پھر بھی لہو کی چادر شفق کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔

بڑودہ میں بھی گیارہ گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ وہاں چوکنڈی، راؤپورہ روڈ اور جاپا پیر میں وہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے جو یہاں کے اسٹیج پر دکھایا جا رہا ہے۔

کچھ بھی ہو۔ فریدہ نے سرد آہ کھینچ کر کہا۔ گھر کی خاطر اتنے آدمیوں کو تڑپتا نہیں چھوڑ سکتی۔ زخمیوں سے اتنی محبت ہو گئی ہے مجھے کہ ایک پل کے لئے بھی انہیں چھوڑ کر کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ آج محسوس کر رہی ہوں کہ میرا گھر بڑودے ہی میں نہیں، ہندوستان کے ہر گاؤں اور شہر میں ہے۔ میں سارے ملک کو سرسبز دیکھنا چاہتی ہوں۔

بالکل ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ عزیز نے کہا۔

آدمی کے زخم پر مرہم رکھنے سے جو خوشی ملتی ہے وہ اب تک کسی چیز میں نہیں ملی تھی۔

انجینئر صاحب کی آغوش میں بھی نہیں؟ جسودا نے ہنس کر سوال کیا۔

بے شک نہیں۔ آغوش بہت تنگ ہوتی ہے جسودا، میرا دیس بیکراں ہے۔

جانتی ہو وہ دلّی میں ہیں، ورنہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جاتیں۔

فریدہ شرمیلے انداز سے مسکرا کر بولی

آغوش تو وہاں بھی اُن کے ساتھ ہے۔

نہیں ہسپتال پہنچنا ہے عزیز صاحب بہت دیر ہو گئی ہے۔

جائیے، بیمار منتظر ہوں گے آپ کے!

جسودا یہ معنی خیز جملہ سن کر ہنسی، فریدہ نے بھی ساتھ دیا۔ ذرا دیر کو ایسا محسوس ہوا جیسے امن کی ہوائیں سنک رہی ہوں۔

ڈونرس لسٹ میں میرا نام ضرور لکھا دیا جائے۔

کیا ابھی لہو ہے آپ کی سوکھی رگوں میں، ہم تو سمجھے تھے اسے عشق کی آنچ نے بالکل سکھا دیا۔

ایسا نہیں ہے۔ میں کم سے کم ایک آدمی کو خون دے سکتا ہوں۔

اتنی فضول خرچی ٹھیک نہیں، اسے شانتا کے لئے بچائے رکھیے۔

جسودا قسم کھا کر کہتا ہوں کہ احمد آباد کی ہر زخمی دوشیزہ مجھے شانتا سے زیادہ محبوب ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے۔ جب وقت آئے گا آپ کو فون کر دیا جائے گا۔

ان کے جاتے ہی رابعہ نے پوچھا

کیا شانتا نہیں ملیں اب تک؟

میں انہیں ڈھونڈنے نہیں آیا تھا، آدمی کی جستجو میں نکلا تھا۔

کیا انہیں بھلا دیا؟

ایسا تو نہیں ہے مگر ان کی بہنوں کا بھی کچھ حق ہے مجھ پر، پھر بھی چاہتا ہوں کہ ایک بار شانتا کو اور دیکھ آؤں۔ آشرم میں ممکن ہے کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہو۔

ضرور جا سکتے ہیں آپ، لیکن اب یہاں سے نکلنے کے لئے آپ کو جسودا سے اجازت حاصل کرنی ہوگی۔

میری رائے میں آپ کی رضامندی کافی ہے! سُنا ہے رابعہ عورتیں اپنی ہم جنسوں کی بہت ہمدرد ہوتی ہیں۔

ٹھیک سُنا ہے آپ نے، لیکن آپ کا عورتوں کی ہم جنسوں سے کیا تعلق؟

کاش مجھے یہ عزت حاصل ہوتی۔

اگر یہ اعزاز آپ کو مل جاتا تو نہ جانے کتنے عزیز آپ کی تلاش میں سرگرداں ہوتے۔ رابعہ نے بڑی شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ عزیز چونک گیا۔ اس نے غور سے رابعہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں چمک تھی جیسے سمندر کی خاموش سطح پر بجلی کا عکس پڑ رہا ہو۔ رخساروں پر ہلکی سُرخی جھلک رہی تھی۔ وہ پیازی رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ عزیز حواس دُرست کرتے ہوئے بولا۔

رابعہ تم شانتا کے تصوّر سے کم حسین نہیں ہو مگر اس کو بُھلا دینا ممکن نہیں۔ یہ نام شہر بھر کی عورتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

میں کب کہتی ہوں آپ انہیں بُھلا دیں۔ آپ کے سامنے جو حسین تتلی اُڑ رہی ہے، اسے ضرور گرفتار کرنے کی کوشش کیجئے۔ میری تمنّا ہے کہ آپ کامیاب ہوں۔

تتلی کی جگہ تتلیاں کہنا زیادہ صحیح ہے۔ میں ہر دوشیزہ کو تباہی سے بچانے کی آرزو رکھتا ہوں۔

باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔

آج کئی دن میں گھنٹی بجی ہے، رابعہ یہ کہتی ہوئی فون کی جانب دوڑی اور رسیور اٹھا کر بولی۔

ہیلو ـــــ میں رابعہ بول رہی ہوں۔

اور میں جسودا ہوں، سول ہسپتال سے بول رہی ہوں۔ عزیز کو ایک دلچسپ خبر سُنانی ہے۔ اُن سے کہو کہ ایک آدمی آیا ہے، اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے۔ سر پر بھی چوٹ آئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے پڑوسیوں نے بچایا ہے، وہ سب مسلمان تھے۔ اگر وہ حفاظت نہ کرتے تو میں زندہ نہ بچتا۔ یہ لوگ حملہ آوروں کا اُس وقت تک مقابلہ کرتے رہے، جب تک پولس وہاں نہ پہنچ گئی۔ ایک ہی فرقے کے دو گروہوں کو ایک ہندو کے لئے لڑتے دیکھ کر ہر وہ شخص خوش ہوگا جس کے احساس میں انسانیت کا درد ہے۔

عزیز خوشی سے رقص کرنے لگا اور رابعہ سے رسیور چھین کر بولا

جسودا، انسان ابھی زندہ ہے۔ گھائل ضرور ہے، لیکن مرا نہیں۔

اسے کون مار سکتا ہے ـــــ میں جا رہی ہوں، اس کے بازو کا ایکسرے ہو رہا ہے۔ فریدہ پلاسٹر کی تیاری کر رہی ہے۔

(۹)

اگلے دن سویرے ہی عزیز رابعہ سے اجازت لے کر گھر سے نکل آیا۔ وہ سڑک کے ایک کنارے پر سر جُھکائے چل رہا تھا۔ ایک جیپ کو اسی طرف آتے دیکھ کر وہ بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک مرتبہ اس کی پُشت پر زور سے ہارن بجا، عزیز چونک گیا۔

کہاں جانے کا ارادہ ہے؟

آشرم جانا چاہتا ہوں۔

میں زخمیوں کو ہسپتال لے جا رہا ہوں۔ آپ زخمی نہیں ہیں، آپ کو آشرم میں چھوڑتا جاؤں گا۔

عزیز نے جیپ چلانے والے کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ ایک سکھ نوجوان تھا۔ چہرے پر بڑی رونق تھی۔ عزیز نے جلدی سے کہا

کیا گوردت سنگھ ہیں آپ؟

میرا نام کیونکر معلوم ہوا آپ کو؟

میرا دل آپ کی طرف کھنچ رہا ہے۔ لہو کی وہ بوندیں آپ کے نام کی مالا جپ رہی ہیں جو اس وقت میری رگوں میں دَوڑ رہی ہیں۔ آپ نے تو خون دیا تھا نا مجھے۔

کیا نام ہے آپ کا ؟

عزیز ۔ بیڈ نمبر ۶۵ پر تھا میں۔

میرے بھائی ہو، آؤ میری برابر بیٹھ جاؤ۔ کئی دن سے زخمیوں کو ادھر اُدھر سے اُٹھا کر ہسپتال لے جا رہا ہوں۔

بڑا اچھا کام کر رہے ہیں آپ !

سڑک پر فائر بریگیڈ دوڑ رہے تھے۔ گوردت نے جیپ ایک فائر بریگیڈ کے پیچھے ڈال دی۔ وہ آشرم ہی کے رُخ پر دوڑ رہا تھا۔ گوردت اسٹیرنگ گھماتے ہوئے بولا۔

عزیز صاحب ہسپتال میں ان گنت گھائل موجود ہیں اسٹاف جیسے سب نے آرام نہ کرنے کی قسم کھالی ہے۔ وہ ہر وقت سرگرم رہتے ہیں۔ بہت سے پرائیویٹ ڈاکٹروں نے اپنی خدمات پیش کردی ہیں۔ خون دینے کا بہت اچھا انتظام ہے۔ عوام سے بلڈ ڈونیٹ کرنے کی اپیلیں کی جا رہی ہیں۔ پرسوں نرائن سرلیا ستوانے ایک ہندو سوشل ورکر کھیکھے سے رشید حسین کو خون دیا جو ایک گہرا زخم کھا کر بہت کمزور ہو گیا تھا۔

کیا بات ہے گوردت بھائی، اتنے بڑے جہنم میں ایک چھوٹی سی جنت بھی بنا رکھی ہے آپ لوگوں نے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی کسی کو خون دوں۔ آپ کے لہو نے میرے دل میں آدمی کی محبت کا ایک ایسا جذبہ بھر دیا ہے، جو کبھی فنا نہ ہوگا۔ چاہتا ہوں کہ جلدی سے میرا لہو کسی دم توڑتے ہوئے نوجوان کی رگوں میں داخل ہو جائے۔

آشرم کے سامنے پہنچ کر گوردت بولا

شاید دعا ہو رہی ہے، جلدی سے شریک ہو جائیے۔ کسی اور موقع پر میں آپ کو ہسپتال لے چلوں گا۔ آپ کا نام آج ہی ڈونرس لسٹ میں لکھا دوں گا۔

عزیز جیپ سے اُتر کر اندر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اُسے بڑا سکون ملا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سابرمتی کی موجیں آرام و راحت کے ایسے پیغام لا رہی ہوں جن کے اندر فردوسی ہواؤں کی خنکی ہو۔ دعا ختم ہو چکی تھی۔ چند آدمی نہایت دھیمے لہجے میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے دل یا سینے میں درد ہے۔ وہ بلند آواز میں گفتگو نہیں کر سکتے۔ ایک بوڑھے آدمی نے عزیز سے پوچھا۔

کیوں آئے ہو یہاں ؟

امن کی تلاش میں۔

امن کی فاختائیں یہاں سے اُڑ چکی ہیں۔ زیتون کی ہری بھری شاخیں بھی بالکل سوکھ چکی ہیں۔

مجھے ان چیزوں کی بالکل ضرورت نہیں، میں اپنے دل کی جلن مٹانا چاہتا ہوں۔

اُسے کیونکر مٹا سکیں گے ہم ؟

میرے یوسفِ گم گشتہ کا پتہ بتا دیجئے۔

کیا نام ہے اس کا ؟

شانتا۔ وہ مجھے یہاں ڈھونڈنے آئی ہوگی۔

نہ جانے ایسی کتنی شانتائیں اور آمنائیں ماری جا چکی ہیں۔

ہو سکتا ہے تمہاری شانتا اس دنیا ہی میں نہ ہو۔

ایسا نہ کہئے مقدس باپ، وہ زندہ ہے اور آشرم میں ضرور آئے گی۔

بوڑھا آدمی خاموش ہو گیا لیکن عزیز کو اپنی بوجھل آنکھوں سے دیکھتا رہا جن میں سمندر سے زیادہ گہرائی اور وسعت تھی۔ اس دوران میں وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھتا رہا۔ عزیز برابر یہ محسوس کرتا رہا کہ وہ اس کے احساس سے خوف، دہشت اور عداوت کا زہر چوس رہا ہے۔ عزیز لمحہ بہ لمحہ ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں اطمینان و مسرت کی لہریں دوڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔

شام کو ۵ بجے عزیز آشرم سے نکلا اور سڑک پر آ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ خوب تیز تیز چلے۔ اسی طرح تیز رفتاری سے چلتا وہ چھ بجتے بجتے وہاں پہنچ گیا جہاں سات بجتے ہی کرفیو لگ جاتا تھا۔ ایک فوجی نے بندوق جھکا کر پوچھا

کون ؟

ایک شہری۔ عزیز نے جواب دیا۔

جانتے ہو کرفیو لگا ہوا ہے ؟

گولی چلاؤ بڑی خوشی سے۔

کہاں سے آرہے ہو؟
آشرم سے۔
واپس ہوجاؤ۔ بڑی گڑبڑ ہے۔ بسیں بند ہوچکی ہیں
سینما گھر بھی نہیں کھلیں گے۔
گھڑی دیکھ کر چلا ہوں، کرفیو کا ٹائم ہونے تک کسی ہسپتال
میں پہنچ جاؤں گا۔
سپاہی راستے سے ہٹ گیا اور عزیز پھر چلنے لگا۔ آہنی
ٹوپیوں والے جوان گشت کر رہے تھے۔ انہوں نے بار بار ٹوکا'
عزیز مناسب جواب دے کر آگے بڑھتا رہا۔ در و دیوار اور
کوچہ و بازار پر ویرانی اور سوگواری برس رہی تھی۔ جن دکانوں
کو جلایا گیا تھا' ان سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ سڑک پر اینٹوں
کے ڈھیر تھے۔ اسے کسی ہسپتال تک پہنچنے کا موقع نہیں ملا۔
مجبوراً وہ ۹ بجے کے قریب رابعہ کے یہاں پہنچ گیا۔ وہ اُس
کے لئے بہت پریشان تھی۔ فریدہ اور حسودا سے فون پر کئی
بار بات کرچکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔
ایسا جی چاہتا ہے کہ....
دھکے دے کر نکال دوں۔ عزیز نے جملہ پورا کیا۔
میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔
وہ عزیز کی بات سن کر رونے لگی۔
روئیے نہیں۔ جانتا ہوں آپ کچھ اور ہی کہنا چاہتی تھیں
مگر خفا ہونے سے پہلے سوچ لینا چاہیئے کہ اضطراب شوق اور
جنون میں کوئی فرق نہیں۔
آپ کو بھی میں میرا یہی مشورہ دیتی ہوں۔
عزیز دیر تک رابعہ کو دیکھتا رہا۔ اُس نے بڑی دلچسپ بات
کہی تھی۔
شہر میں چلنا پھرنا موت کو دعوت دینے کی برابر ہے۔
پورا سندھی بازار لوٹ لیا گیا ہے۔
تم نے موضوع کیوں بدل دیا رابعہ' بہت عمدہ گفتگو
شروع ہوگئی تھی۔ تمہارے جواب کی شوخی پر دل تڑپ گیا
تھا۔ تم سچ کہہ رہی ہو کہ آج کل گھر سے نکلنا بہت خطرناک
ہے لیکن خطرات سے مقابلہ کئے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا۔

میں تو ریڈیو کی خبریں سنتے سنتے ہی نیم بیہوش ہوجاتی
ہوں۔ تازہ اطلاع ہے کہ چاچا چل بسے۔ اور بھی بہت سے
آدمی پولس فائرنگ میں مرگئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔
کیا نام تھا اس کا؟ اور چاچا کیا عزیز تھے تمہارے؟
نہیں، وہ یہاں کی بائیں بازو والی جماعت کے لیڈر تھے'
عورت کا نام مجھے معلوم نہیں ہوسکا۔ بہرحال اطمینان رکھیئے
وہ شانتا نہیں ہوسکتی۔

(۱۰)

صبح ہوتے ہی عزیز نے رابعہ سے جانے کی اجازت مانگی۔
کہاں جانا چاہتے ہیں آپ؟
نہیں بتا سکتا کہاں جاؤں گا۔
جانے بھی دو پگلے کو۔ مگر پاس دے دو کرفیو کا
راجو بوا غصے میں بھر کر بولیں۔
رابعہ چپ ہوگئی۔ بوا نے دروازہ کھول دیا اور عزیز
ناشتہ کئے بغیر ہی نہایت عجلت کے ساتھ زینہ اتر کر نگاہوں
سے اوجھل ہوگیا۔ رابعہ کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ اس کا دل
دھڑکنے لگا۔ معلوم نہیں عزیز دوبارہ آئیں گے یا نہیں، وہ
یہی سوچتی اندر چلی گئی۔ سڑک پر آمد و رفت شروع ہوچکی تھی۔
لوگ بہت زیادہ سہمے ہوئے تھے۔ وہ بڑی بے تابی کے ساتھ
ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ کوئی دوا لینے جارہا تھا۔ کسی کو
دودھ کی تلاش تھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے پیٹ میں انگارے
دہک رہے تھے' انہیں روٹی یا اناج کی جستجو تھی۔ کچھ وہ تھے
جو اپنے عزیزوں یا دوستوں کو ڈھونڈنے اُن علاقوں میں جا
رہے تھے جہاں رات بھر چھروں کی دھاریں سورج کی کرنوں
کی مانند چمکتی رہی تھیں۔ عزیز اپنی دانست میں گومتی پور کو
جانے والی سڑک سے گذر رہا تھا۔ ایک عورت نے اُسے
روک کر پوچھا۔
بھیا تم نے میری لڑکی کو دیکھا ہے کہیں؟ لمبی سی
گوری چٹی ہے۔ اوشا نام ہے اُس کا۔ چودہ سال کی ہے۔
آنکھیں بڑی بڑی شربتی سی ہیں۔
جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ سڑک کے کنارے

پڑی ہوئی لاش کو جھک کر دیکھنے لگی۔

اوشا! ـــــ عورت لاش سے چمٹ کر چیخیں مارنے لگی۔

عزیز نے بھی اوشا کو دیکھا۔ کپڑے خون میں بھیگے ہوئے تھے۔ کالی اور لمبی لٹیں دلکشی سے محروم ہو چکی تھیں ـــــ وہ آنکھیں بند کئے دائمی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ نہ جانے ایسی کتنی کلیاں پیروں میں روندی جا چکی ہوں گی۔

کیا پہچان لیا تم نے اوشا کو؟

عورت نے لاش کو بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا اور اوشا کے ٹھٹھرے ہوئے گالوں پر منہ رکھے زار زار رو رہی تھی۔

عزیز اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈتے دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ دل سے بہتا ہوا یہ آبِ حیات اوشا کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ چھرے سے مارے ہوئے آدمیوں کو عیسیٰ بھی زندگی نہیں دے سکتے۔ ہاں ان کے لہو سے جو نسلیں جنم لیں گی وہ انسان کو زندہ رکھنے کے آرٹ سے ضرور واقف ہوں گی۔ انہیں کو اس کی قیمت کا صحیح اندازہ ہوگا اوشا ایسی حسین لڑکی نہ جانے سورج کی کتنی گردشوں کے بعد عالمِ وجود میں آئی ہوگی۔ اس کی معصوم سانسیں برسوں پھولوں کی مہک میں تیرتی رہیں گی۔ اس وقت شہر میں سکون ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ تو اس لئے کہ لوگ اتنا خون بہا چکے تھے کہ ان کے سروں میں خمار سا بھر گیا تھا۔ انہیں نیند آنے لگی تھی اور کچھ اس لئے کہ وہ بہت زیادہ تھک چکے تھے۔ دراصل یہ وقت لڑائی کے لئے موزوں نہیں تھا۔ لڑائی کا اچھا وقت وہ ہوتا ہے جب کرفیو لگ جاتا ہے اور بلوائی لاٹھیاں اور بھالے سنبھال کر گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ وہ Shoot at sight کے حکم کو ٹھکرا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چار سے زیادہ آدمیوں کے مجمع پر فوراً گولی چلا دینے کا آرڈر تھا لیکن لوگ اس کی خلاف ورزی میں شروع ہی سے دلچسپی لے رہے تھے۔ عزیز اطمینان سے دن بھر مختلف شاہراہوں پر گھومتا رہا۔ اگرچہ اور آدمی بھی چل پھر رہے تھے پھر بھی سڑکیں روتی بسورتی محسوس ہو رہی تھیں۔ عزیز سڑکوں کی ویرانی سے اکتا کر گلیوں میں گشت کرنے لگا۔ اسے کوئی شخص مل جاتا تو اسے امن کا سبق پڑھانے لگتا مگر عام طور پر یہ لفظ سننے والوں کو برافروختہ کر دیتا تھا۔ وہ اسے فریب دینے کا ایک حربہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اس کا کوئی مطلب نہ تھا۔ ایک دوکان کا آدھا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ اندر چلا گیا۔ دوکاندار بروک بونڈ کا چورہ کھولتے ہوئے پانی میں ڈال کر اسے چھاننے کا ارادہ ہی کر رہا تھا۔ کہ اس کی نگاہ اوپر اٹھی۔ دو آدمی پرانی میز کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ سامنے عزیز تھا۔ دوکاندار نے پوچھا

کون ہو؟

مسافر۔

وہ کوئی چیز نہیں۔ بتاؤ ہندو ہے یا ...

کرسچین

عیسیٰ کو مانتے ہو؟

ہاں انہیں خدا کا بیٹا سمجھتا ہوں۔

بکتے ہو۔ بھگوان سے یسوع مسیح کا کوئی سمبندھ نہیں تمہارا دھرم جھوٹا ہے

جھوٹا ہی سہی مگر میں بھوکا ہوں۔

شام تک ٹھہرو آہنی ٹوپی والا کوئی جوان تمہارا پیٹ حلق تک بھر دے گا۔

اگر میں ہندو ہوتا تو کیا چائے مل جاتی؟

یہ دونوں ہندو ہی ہیں جو یہاں بیٹھے چائے پی رہے ہیں ہندو کی تعریف یہ ہے کہ وہ جیو ہتیا نہیں کرتا دوسروں کی جان نہیں لیتا، سب کی خدمت کرتا ہے۔ سوامی وویکانند جی کہتے ہیں:

The true religion must mean Service to humanity.

اور ان دونوں کے چہروں پر وحشت برس رہی ہے۔ معلوم نہیں رات میں انہوں نے کتنے آدمیوں کی جان لی ہوگی۔ اچھا نکل جاؤ یہاں سے۔

ایک شخص نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے طیش میں آ کر حکم دیا۔

عزیز پھر گلی میں آ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ہوٹل دکھائی دیا۔ اس کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ عزیز بے جھجک ہوٹل میں داخل ہو گیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت منیجر نے اخبار دیکھتے دیکھتے قریب بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا

ایک گروہ نے جنتا ایکسپریس اور احمد آباد کرنجا لوکل کو اسٹیشن پر گھیر لیا۔ ایکسپریس پر آمبلی یا سنی اسٹیشن کے پاس اور لوکل پر کلول اور دھنگردا کے قریب حملہ کیا گیا بہت سے ڈبوں کو آگ لگا دی گئی۔ بہت سے مسافر ہلاک ہو گئے۔

اچانک منیجر نے عزیز کو دیکھ لیا۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

چائے ہو گی؟ عزیز نے سوال کیا۔

مل جائے گی، بیٹھ جاؤ، اور کچھ؟

اور جو مل جائے گا، کھا لوں گا۔

ایک بائے اور منیجر کے علاوہ ہوٹل میں کوئی اور ملازم نہیں تھا۔ منیجر نے آپ ہی چائے میز پر رکھ دی۔ بائے تشتری میں دو توس لے آیا۔

ایک گاہک کو اس سے زیادہ میں کچھ نہیں دے سکتا۔

یہ نہیں پوچھا آپ نے کہ میں کس دھرم سے تعلق رکھتا ہوں۔

اس کی کیا ضرورت تھی، دیکھنے میں آدمی معلوم ہوتے ہو۔

صرف آدمی ہی نہیں، مسلمان بھی ہوں۔

یہاں تو چائے پینے آئے ہو یا اذان بھی دو گے۔ نماز پڑھ سکتے ہو۔ اذان دے دی تو ہوٹل سے ابھی لپٹیں اٹھنے لگیں گی۔ ویسے چپ چاپ تم یہاں سب کچھ کر سکتے ہو۔ میں ہندو ہوں مگر کسی سے بیر نہیں رکھتا۔ دنگا یہاں ضرور ہو رہا ہے لیکن سچ پوچھو تو مذہب سے اس کا تعلق نہیں۔ اوپر جا کر دیکھو دس مسلمان فرش پر سو رہے ہیں۔ رات بھر بلوائی دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھتے رہے۔

کیا اندر کوئی مسلمان ہے؟

میں ایک ہی جواب دیتا رہا۔

مسلمان کا یہاں کیا کام، میں بھی تو تمہاری طرح ہندو ہوں۔

میری رائے میں آپ ہی سچے ہندو ہیں۔

عزیز نے چائے پی اور ہوٹل کا پتہ نوٹ کر کے وہاں سے چلنے لگا۔ منیجر نے اسے مشورہ دیا کہ اس طرح گھومتے نہ پھرو اور جب دیکھو کہ لڑنے والے گروپ سڑک پر دوڑ رہے ہیں تو ان کی نگاہ بچا کر کسی تنگ گلی میں گھس جاؤ ضرورت پڑے تو نالی میں لیٹ جاؤ۔ لڑنے والے ایک ایک جگہ ٹھہرتے نہیں، ہر لمحہ بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ وہ گوریلا طرز کی جنگ کرتے ہیں۔

عزیز نے شام تک کئی بار منیجر کے مشورے سے فائدہ اٹھایا۔ سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے وہ ایک لمبی اور سیدھی سڑک پر پہنچا تو گوردت کی جیپ بغیر ہارن بجائے اس کے پہلو میں ٹھہر گئی۔ اس پر ریڈ کراس کا فلیگ لہرا رہا تھا۔

گھر چلیے، اندھیرا ہونے ہی والا ہے۔

عزیز جلدی سے گوردت کے پاس آ بیٹھا۔ جیپ میں زخمی بھرے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑوں پر خون کے دھبے تھے۔ منہ سے ہلکی ہلکی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ عزیز انہیں دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

پہلے مجھے ہسپتال جانا ہے۔ گوردت نے کہا۔

ضرور پہلے وہیں چلیے۔

جیپ میں اس وقت ہر فرقے کا آدمی موجود ہے۔ میری گاڑی ایک چھوٹی سی غیر مذہبی جمہوریت کا بہترین نمونہ ہے۔

بے شک، گوردت بھائی آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔

ایسا نہ کہیئے۔ میں بہت چھوٹا ہوں، بڑوں کے پیچھے چلنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔

ہسپتال کی باؤنڈری میں داخل ہوتے ہی گوردت نے ہارن بجادیا۔ آواز سنتے ہی چند رضاکار اسٹریچر لے کر آگئے۔ اور مجروحین کو اتارنے لگے۔ گوردت نے گنگنانا شروع کر دیا۔

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس کے ترنّم میں بڑی تاثیر اور دلکشی تھی۔ عزیز کی رگوں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پتہ چلا کہ فریدہ بھی یہیں ہے۔ عزیز اس سے ملنے چلا گیا۔ وہ اتفاق سے باہر ہی مل گئی۔ اس نے عزیز کی خیریت معلوم کرنے کے بعد کہا

ٹرنک کال سے خبر آئی ہے کہ یہاں سے دُور ایک مقام ہے مہسانہ، وہاں فائرنگ ہوئی ہے۔ بہت سے زخمی ٹرک میں بھر کر بھیجے جارہے ہیں۔ میں زیادہ نہیں ٹھہر سکوں گی معاف فرمائیے۔

جائیے جلد ان لوگوں کو دیکھئے۔

عزیز گوردت کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے جلد ہی اسے رابعہ کے گھر پہنچا دیا۔ جب وہ نصف زینہ چڑھ چکا تو گوردت نے اسے بتایا کہ باہر کے چند مقامات پر پولیس بھیجی جارہی ہے۔ شعلے دُور دُور تک بھڑک اٹھے ہیں۔ میری مصروفیت بہت بڑھ جائے گی، شاید دو ایک روز تک نہ مل سکوں۔

کوئی بات نہیں۔ عزیز نے کہا اور کمرے میں چلا گیا۔

(۱۱)

شام کو سات بجے جسودا نے ہسپتال سے فون کیا کہ ابھی ایک لڑکی بے ہوشی کی حالت میں داخل ہوئی ہے اس کا نام شانتا بتایا جاتا ہے۔ عزیز کو بہت جلد احتیاط سے بھیجدیا جائے۔ اُن سے خون لینے کا وقت آگیا ہے۔

عزیز یہ اطلاع پاتے ہی ہسپتال جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ رابعہ اسے روک نہیں سکی۔ اس نے کرفیو کے وقت سڑک پر چلنے پھرنے کا اجازت نامہ اسے دیتے ہوئے کہا، اس کو جیب میں رکھ لیجئے۔

وہ بہت زیادہ عجلت میں تھا۔ اسے ہسپتال کا راستہ بھی معلوم نہ تھا۔ ٹیکسیاں بند تھیں۔ وہ پیدل ہی چل دیا۔ دو گھنٹے تک بھٹکنے کے بعد بھی وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ نہ سکا۔ ادھر آفتاب غروب ہوتے ہی قیامت جاگ اٹھی تھی۔ لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات ہو رہے تھے عزیز خطرات میں گھر گیا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ اس وقت اپنی موت کا یقین آگیا۔ وہ مختلف شکلوں میں اس کے سامنے آرہی تھی۔ گولیاں چلنے کی صدائیں ہر لمحہ پیامِ اجل پہنچا رہی تھیں۔ ہر جگہ کرفیو کی خلاف ورزیاں ہو رہی تھیں۔ ایک جگہ لکڑیوں کا بہت اونچا انبار لگا ہوا تھا۔ اس سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ کبھی شعلوں کی زبانیں لپلپانے لگتی تھیں عزیز کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بچے کو اس کی ماں کے سامنے آگ میں جھونک دیا گیا۔ ماں بُری طرح بین کرنے لگی۔

عزیز نے محسوس کیا کہ آدمی سچ مچ درندہ بن گیا ہے۔ اسے ایک فلاسفر کا قول یاد آیا کہ انسان فطرت کے لحاظ سے وحشی اور خونخوار ہے۔ تہذیب نے اس کے اُوپر ملمع چڑھا دیا ہے جو ذرا سی رگڑ میں اُتر جاتا ہے اور نیچے سے اصل سطح جھانکنے لگتی ہے۔ درندے بے سوچے سمجھے حملہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ پوری ذہانت اور چابکدستی کے ساتھ ایک دوسرے کا سر کاٹ رہے ہیں۔ وہ ایک چوراہے پر ٹھٹھک گیا۔ دو طرف سے بلوائی آرہے تھے۔ قریب کوئی گلی دکھائی نہ دی۔ عزیز اپنے چاروں طرف موت کا ننگا ناچ دیکھ رہا تھا۔ وہ مرنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ عین اس وقت جب موت کا ہاتھ اس کی سمت بڑھ رہا تھا ایک تنگ و تاریک گلی نظر آئی۔ وہ دوڑ کر اس میں گھس گیا۔ تاریکی میں اس کا سایہ تک کسی کو دکھائی نہ دیا۔ گلی کے نکڑ پر ہی دو گروپ جنگ و جدل میں مصروف ہو گئے۔ ان کے نعروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اذان اور ناقوس میں لڑائی ہو رہی ہے لیکن ایسا نہ تھا۔ اصل کشمکش دو مختلف قسم کے جانوروں میں تھی۔ پانچ منٹ تک ہنگامۂ کارزار گرم رہا۔ پھر پولیس وان کی

آنکھیں اس طرح چمک اٹھیں جیسے چوہوں کے ہجوم میں بلّی کی
آنکھیں جگمگانے لگتی ہیں۔ لڑنے والے چوہوں کی مانند بھاگ کھڑے
ہوئے۔ وان بہت آہستہ آرہی تھی۔ وہ غالباً لائیٹ ڈال کر
اس منظر کا فوٹو لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ عزیز باہر نکل آیا
تھا۔ سڑک پر پہلے سے دس بارہ آدمی کھڑے ہوئے تھے۔
اُن میں چند عورتیں بھی تھیں۔ یہ لوگ کسی گلی سے نکل کر ہی
آئے تھے اور محفوظ جگہ کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے ایک
دوسرے کا مذہب معلوم نہیں کیا بلکہ بھیڑیئے کے ڈر سے
بھاگی ہوئی بکریوں کے مانند سر سے سر ملا کر کھڑے رہے۔ اُن
کی حیثیت ان حشرات الارض کی سی تھی جو طوفان کے وقت
پیڑ یا ٹیلے پر چڑھ جاتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنی جان بچانے
کی کوشش میں اپنی فطرت کے تقاضوں کو بھول جاتے ہیں۔ ان
کے دانت کُند ہو جاتے ہیں اور زہریلے ڈنک ٹھٹھر جاتے ہیں۔
ان میں سے بھی ہر شخص اپنی جگہ پریشان اور سہما ہوا تھا۔
اچانک سڑک پر بھاگتے ہوئے آدمیوں کی چاپ سنائی دی
اور بائیں جانب کے مکان کا آہنی گیٹ کھلا۔ ایک بوڑھے
نے آہستہ سے کہا

اندر آجاؤ!

جلدی سے!

یہ مختصر سا مجمع گیٹ میں داخل ہو گیا۔ دروازہ سب کو
اپنی آغوش میں لے کر بند ہو گیا۔ اندر کافی گنجائش تھی۔
بہت سے کمرے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ بعض خالی تھے۔
ان پر ان تازہ واردوں نے قبضہ کر لیا۔ فرش پر سیل تھی۔
تاریکی میں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ باہر بھڑکنے والی آگ
کی روشنی میں کبھی کبھی ایک دوسرے کا چہرہ نظر آجاتا تھا۔
دیر تک آپس میں کوئی بات نہ ہوئی۔ سب خاموش بیٹھے
آئندہ پیش آنے والے واقعات کے تصور سے لرزتے رہے
پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ کمروں سے نکل کر
بڑی بے ترتیبی سے بھاگنے لگے۔ عزیز کے ساتھیوں نے
بھاگنے میں اوروں کا ساتھ دیا۔ عزیز وہیں بیٹھا رہا۔
جب ایک شعلہ بھڑکا تو اس نے دیکھا کہ دائیں بازو
پر ایک عورت بیٹھی ہے۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے
اس کی حیثیت آدم کی سی ہے جس کی داہنی پسلی سے ابھی ابھی
حوّا نے جنم لیا ہے۔ عورت پریشان یا سہمی ہوئی نہیں تھی۔
بہت مطمئن تھی۔ شاید اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا
اور موت کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہ رہی تھی۔ آس
پاس سے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دھواں کمرے
میں بھرتا جا رہا تھا، اُس سے پیٹرول کی بُو آرہی تھی۔ عزیز ہمت
کیے بیٹھا رہا۔ عورت بھی اپنی جگہ جمی رہی۔ سانس دونوں کا
گھٹنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ شور دب گیا۔ دُھواں چھٹنے لگا۔
دونوں کو آکسیجن ملنے لگی۔ عورت نے دھیرے سے کہا

نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں، اتنا ہی سمجھ سکی ہوں کہ مرد
ہیں اور میں ایک لڑکی ہوں۔ اگر ہمارے درمیان کوئی فاصلہ
نہ رہے تو اچھا ہے۔ ذرا اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائیے۔

عزیز ڈرا کہ وہ ضرور چھری سے اس کا ہاتھ قلم کر دیگی
پھر بھی وہ ایک لڑکی کی فرمائش رد نہ کر سکا اور ہاتھ بڑھا
دیا۔ اس نے عزیز کی کلائی پکڑ لی اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے
اُس میں ایک چندی باندھ دی۔

میں نے ساری پھاڑ کر آپ کے راکھی باندھ دی ہے، آپ
میرے بھائی بن چکے ہیں اور درمیانی فاصلے مٹ چکے ہیں۔

عزیز سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ ایسا لگا کہ اس کی
رُوح قالب سے پرواز کر رہی ہے۔ شاید اس میں اب
کوئی اور ہی چیز سماتی جا رہی ہے۔ وہ بہت زیادہ جذباتی
ہو گیا۔ اُس کا گلا رُندھ گیا۔ اندر سے اُمنڈ کر آنے والے
الفاظ ہونٹوں پر جم گئے۔

میرے پاس کچھ نہیں اس وقت۔ میں دریا میں ڈوبتا
ہوا بدنصیب ہمایوں ہوں۔ تم نے تاریخ کا ایک سنہری ورق
الٹ دیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میں سچ مچ ہندوستان کا
فرمانروا ہوں اور تم میواڑ کی رانی کرناوتی ہو۔ کیا میں نام پوچھ
سکتا ہوں اپنی بہن کا؟

شانتا! ___ اس کے منہ سے نکلا۔

شانتا تم نے میری دنیا ہی بدل ڈالی۔ جذبات کا آبشار

الٹا بہنے لگا۔

وجہ ؟

میرا نام عزیز ہے، میں تم سے ملنے یہاں آیا تھا اور تمہیں خون دینے ہسپتال جا رہا تھا مگر پہنچ نہ سکا۔

اور میں وعدے کے مطابق آشرم جا رہی تھی، راستے میں بھٹک گئی۔ کئی دن سے آگ کے سمندر میں ایک تنکے کی طرح بہتی پھر رہی ہوں۔ اس وقت تقدیر نے آپ سے ملا دیا۔ سوچ رہی ہوں کہ اسی اندھیرے کمرے سے صبح کا سورج نکل رہا ہے۔

مجھے بھی اجالا پھیلتا نظر آ رہا ہے شانتا۔

یہاں کب تک بیٹھے رہیں گے ؟

اب ہمیں چلنا چاہیئے۔

(۱۲)

گجرات امن اور محبت کا گھر ہے۔ اس پاگل پن کو روکنا گجرات والوں ہی کا فرض ہے۔ شانتا نے کہا۔

میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ انگاروں پر بڑے انوکھے ڈھنگ سے پانی ڈالا ہے۔ تاریکی زیادہ عرصے تک نہیں رہا کرتی۔ رات کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، سویرا ضرور ہوتا ہے۔

اور سورج نکل چکا ہے۔

اندھیرا بھی چھٹ جائے گا۔ آہستہ آہستہ انگارے کجلا رہے ہیں اور آدمی ہوش میں آ رہا ہے۔

عزیز شانتا کو لے کر رابعہ کے یہاں آ گیا تھا۔ یہ گفتگو وہیں ہو رہی تھی۔ راجو لوا چائے بنانے چلی گئی تھیں۔ رابعہ اپنی والدہ کو دوا پلانے میں مصروف تھی۔

تمہارا گھر کیا بالکل جلا دیا گیا شانتا ؟ عزیز نے پوچھا۔

اسے جل ہی جانا چاہیئے تھا، بہت پرانا ہو چکا تھا۔ نئی روحوں کا سانس وہاں گھٹنے لگا تھا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ میرا پورا کنبہ باہر چلا گیا ہے، اس پر آنچ بالکل نہیں آئی۔

امید ہے کہ سب لوگ یہاں آ سکیں گے۔

فضا کے تیور بدلتے ہی میرے سارے عزیز مجھ سے آ ملیں گے۔ سوچتی ہوں کہ شام کو آشرم چلیں۔

کوئی ہرج نہ ہو تو میں جسودا اور فریدہ کو بھی بلا لوں۔ ان سے ابھی تمہاری ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔

ضرور بلائیے !

دونوں ہسپتال میں ہیں، فون کر کے کہہ دوں گا کہ چار بجے وہاں پہنچ جائیں۔

بالکل ٹھیک ہے۔

عزیز، شانتا اور رابعہ کو ساتھ لے کر دوپہر ہی کو آشرم چلا گیا۔ شہر میں امن تھا۔ بازار میں دوکانیں کھلتی جا رہی تھیں۔ ان لوگوں کو آشرم پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہاں زیادہ آدمی نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بھگوان بول رہا ہے، اس کی آوازیں لگاتار کانوں میں آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ رابعہ سابرمتی کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ ادھر سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں اس کے احساس پر خنکی برسا رہی تھیں۔ ایک بار اس نے عزیز اور شانتا کو دیکھا پھر وہ مسکرانے لگی۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر گلاب کی پتیاں لرزنے لگیں۔ اندر سے سفید دانت چمک اٹھے، جیسے چنبیلی کی بہت سی کلیاں کھل گئی ہوں۔

دیکھیئے یہاں آ کر دل کو کتنا سکون ملتا ہے۔ یہ امن اور محبت کا ایسا گہوارہ ہے جہاں ہر آن فرشتے مسکراتے محسوس ہوا کرتے ہیں۔

عزیز اور شانتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہلکی سی مسکراہٹ دونوں کے لبوں پر پھیل گئی۔ رابعہ مسلسل شانتا کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے بہت گہرے نقوش تھے۔ ان کو ایک ہی نظر میں پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ کبھی کبھی رابعہ اس کی جھیل سے زیادہ گہری اور نیلی آنکھوں میں بھی جھانک لیا کرتی تھی اور رخساروں کی دلکشی سے بھی متاثر ہو رہی تھی۔ ہارن کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ باہر گوردت کی جیپ آ کر رکی۔ وہ اتر کر عزیز کے پاس آیا۔ عزیز نے اسے دیکھتے ہی رابعہ اور شانتا سے کہا

یہ ہیں میرے بھائی گوردت، اور گوردت جی یہ رابعہ ہیں اور یہ شانتا ہیں میری اکلوتی بہن۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ رابعہ آپ کی بہن نہیں ہیں۔ اُن سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟

رشتے کی بات ابھی نہ کیجئے۔ یہ ایک ایسا راز ہے جس سے جلد ہی کوئی عمدہ سی کہانی جنم لے گی۔

گوردت نے ہنستے ہوئے کہا۔ وقت زیادہ نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ آپ کو ابھی سول ہسپتال چلنا ہے۔ عبدالکریم اور بھگوان داس کو خون دیا جائے گا۔ لسٹ میں آپ کا نام سب سے اوپر ہے۔ گروپنگ کے بعد رام یا رحیم کو آپ کا بلڈ دے دیا جائے گا۔

عزیز، رابعہ اور شانتا کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ بھگوان داس سے اس کا خون مل گیا اور اسی وقت عزیز کا لہو اُس کے جسم میں پہنچا دیا گیا۔ جسودا اور فریدہ وہیں تھیں۔ عزیز دو گھنٹے بعد انہیں لے کر آشرم لوٹ آیا۔ راستے میں اس نے شانتا کے ملنے کی پوری داستان انہیں سُنا دی۔

آپ نے محبت کا کاروبار بڑے اچھے ڈھنگ سے شروع کیا۔ جسودہ بولی۔

اچھا تو شانتا سے آپ نے یہ نیا رشتہ پیدا کر لیا۔ فریدہ نے پوچھا۔

میں نے نہیں پیدا کیا، قدرتی طور پر پیدا ہو گیا۔

شانتا اور رابعہ نے آنے والوں کے راستے میں بہت سی مسکراہٹیں پھیلا کر ان کا استقبال کیا۔ فریدہ نے شانتا کو گلے سے لگا لیا اور بولی

ہم تو کچھ اور سمجھ رہے تھے۔

شانتا نے بڑی شوخ سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔ اُس کی شرمیلی آنکھوں میں بڑھتی ہوئی سُرخی اور چمک اس وقت بہت دلکش ہو گئی تھی۔

رابعہ سب کچھ سُن رہی تھی مگر موڈ ایسا بنا لیا تھا جیسے اس کے کانوں میں کوئی آواز ہی نہیں آتی۔

شکر ہے۔ جسودا لمبا سانس لے کر بولی۔ ہسپتالوں میں زخمیوں کی آمد کم ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خون کا دریا پار کر چکے ہیں۔

لیکن خوف ہے کہ آنسوؤں کا سیلاب ہمیں غرق نہ کر دے۔

کس کے آنسوؤں کا؟ عزیز نے سوال کیا۔

ان کے!۔۔۔ فریدہ نے رابعہ کی جانب انگلی اُٹھائی۔

اور وہ سچ مچ رونے لگیں۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

رونے کا وقت بیت چکا بیگی۔ فریدہ نے کہا۔ جن کو مرنا تھا وہ مر چکے، ان کو زندہ کرنا ممکن نہیں۔ قیامت تک ان کی لاشیں سابرمتی کی لہروں پر روتی پھریں گی۔ اُن کے آنسو نئی نسل ہی اپنے دامن میں جذب کر سکے گی۔

رابعہ کے آنسو۔ فریدہ بولی۔ میری رائے میں خوشی کے ہیں۔

آپ نے ٹھیک کہا جسودا بہن، فریدہ بولی، اندھیرا چھٹ چکا ہے۔ سورج نکلنے ہی والا ہے۔ وہ وقت بہت قریب ہے جب یہاں کی فضا میں امن اور محبت کی کلیاں کھلیں گی، انکی خوشبو سے دماغوں میں بھرا ہوا زہر پانی ہو جائیگا لوگ، اپنے کئے پر شرماتے رہیں گے۔

اُسی وقت ایک فوٹو گرافر کیمرا گلے میں ڈالے اُدھر آ نکلا۔ اسے اپنی بہن کی تلاش تھی جو کئی دن سے غائب تھی۔

جسودا نے اُسے بلا کر کہا

ایک گروپ کھینچ ڈالئے۔

فلمیں صرف دو ہیں، زیادہ تصویریں نہیں لے سکوں گا وقت بھی بہت کم ہے۔

ایک ہی گروپ لینا ہے۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

جسودا نے عزیز، شانتا اور رابعہ کو برابر برابر کھڑا کر کے کہا

کھینچ ڈالئے تصویر۔

اور فوٹو گرافر نے ریڈی کہہ کر بٹن دبا دیا۔

جب تصویر کھنچ گئی تو جسودا نے کہا۔

کئی روز سے چرچ کا فادر کہتا پھر رہا ہے کہ بھگوان گونگا ہے۔ اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ وہ کتابیں جلا دی گئیں جن میں اُس کا پیغام تھا۔ میں کہتی ہوں اُس کی سب سے اچھی زبان انسان ہے۔ جب تک وہ موجود ہے بھگوان گونگا نہیں ہو سکتا۔

اور میں کہتی ہوں، فریدہ نے عزیز، شانتا اور رابعہ کو دیکھتے ہوئے کہا، جب تک یہ تینوں زندہ ہیں، انسان بھی موجود رہے گا۔ ▲
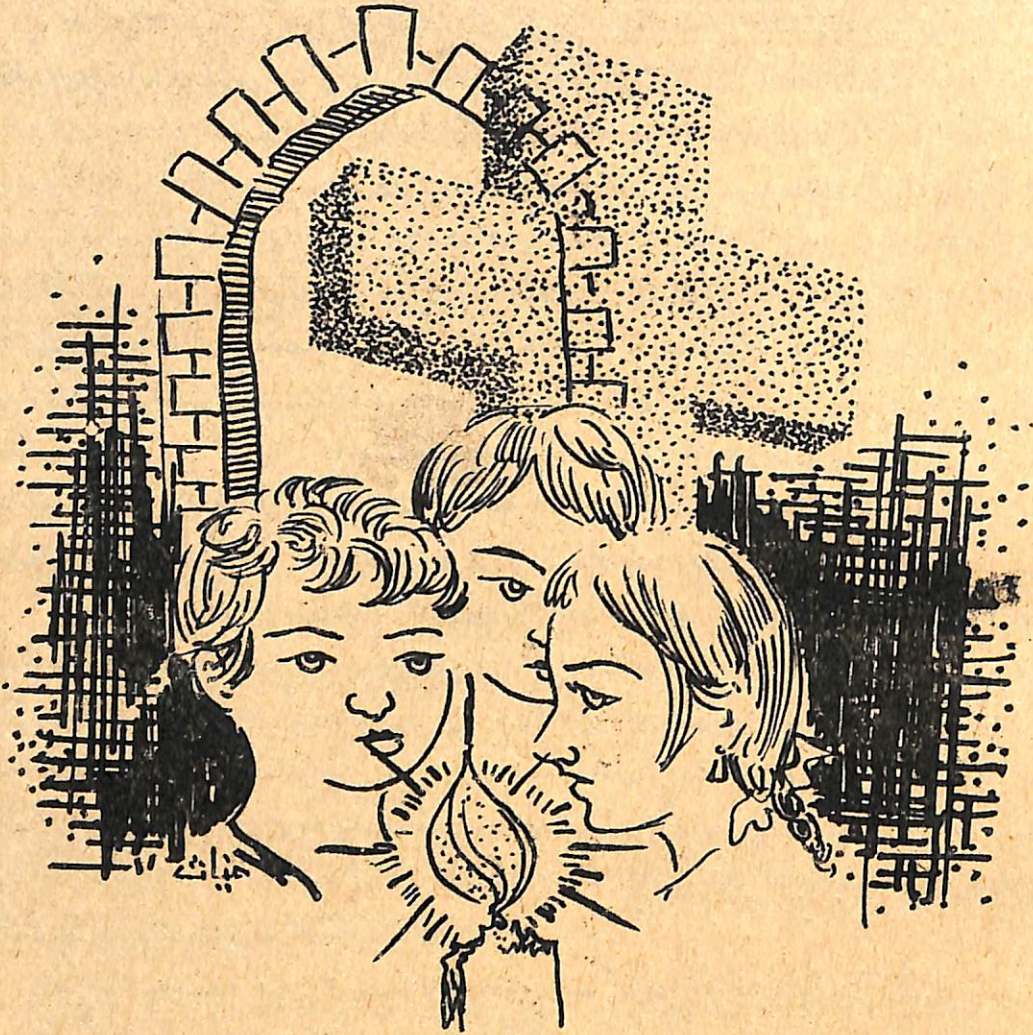
سہیل عظیم آبادی

بے جڑ کے پودے

سہیل عظیم آبادی

نام مجیب الرحمن ہے لیکن سہیل عظیم آبادی کے نام سے مشہور ہوں۔ بہار کے ایک زمیندار گھرانے میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوا۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہے۔

ابتدا میں پڑھانے کے لئے گھر پر معلّم رکھے گئے۔ والد مرحوم بہت مذہبی آدمی تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ حافظِ قرآن اور عالمِ دین ہوں اور اسی لئے مدرسہ شمس الہدیٰ میں داخل بھی کر دیا گیا۔ لیکن دل نہیں لگا اور مولوی بننے سے صاف انکار کر دیا۔ انگریزی تعلیم شروع ہوئی لیکن حساب راہ کا کانٹا بن گیا اور بار بار ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میٹرکیولیشن میں ناکامی کے بعد کلکتہ بھیج دیا گیا۔ لیکن وہاں بھی حساب نے پہاڑ بن کر راستہ روکا اور دراصل اسی حساب نے باضابطہ تعلیم کا سلسلہ ختم کرا دیا۔ ادب میں بہت جی لگتا تھا خاص کر انگریزی اور اردو میں بہت اچھے نمبر آتے تھے لیکن اس کے برعکس حساب میں جی نہ لگتا تھا۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر کلکتہ کے اخباروں میں کام کرنے لگا۔ کچھ شاعر، کچھ ادیب اور کچھ سیاسی آدمی بن گیا۔ اسی زمانے میں پریم چند، مولانا آزاد، آغا حشر کاشمیری، جے پرکاش نرائن وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر اسد مرحوم ایک دوست تھے جنہوں نے افسانے لکھنے پر مجبور کیا اور جب وہ شائع ہوئے تو علامہ جمیل مظہری نے مشورہ دیا کہ شاعری ترک کر کے افسانے لکھوں اور یہی ہوا بھی۔ کچھ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سے دل بڑھا اور باقاعدہ لکھنے لگا۔ ۱۹۳۶ء میں کلکتہ سے واپس آیا تو کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں شریک ہو گیا۔ اسی زمانے میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق سے ملاقات ہوئی۔ ان کی شخصیت کا بہت اثر ہوا اور ان کی نگرانی میں رانچی میں اردو کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ قائم کیا "چھوٹا ناگپور اردو مرکز"۔ مقصد تھا اس علاقے کے آدی باسیوں میں اردو کو مقبول بنانا۔

۱۹۵۱ء میں پٹنہ واپس آیا اور روزنامہ "ساتھی" جاری کیا لیکن دو سال کے بعد اس سے الگ ہو گیا اور اپنے عزیز دوست عبدالقیوم انصاری کے ساتھ مل کر ماہنامہ "تہذیب" جاری کیا جو مقبول تو بے حد ہوا لیکن بدانتظامیوں کی نذر ہو گیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی رسالے نکالے۔ مثلاً چندن۔ ہندوستانی۔ کہانی وغیرہ۔ ۱۹۵۵ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی اور کشمیر چلا گیا۔ وہاں سے تبدیل ہو کر دہلی اور دہلی سے تبدیل ہو کر پٹنہ آیا۔ جون ۱۹۷۰ء میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ اب تک تقریباً دو سو کہانیاں لکھ چکا ہوں، جو ہند و پاک کی تقریباً سبھی اہم زبانوں میں شائع ہوئی ہیں اور پسند کی گئی ہیں۔ ہند و پاک کے علاوہ روس۔ فرانس۔ چیکوسلواکیہ اور دوسرے ملکوں میں بھی کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ امریکہ میں اردو ادیبوں کی کہانیوں کی ایک انتھولوجی شائع ہو رہی ہے اس میں میری کہانی "ناک"[1] شامل ہے۔

اب تک افسانوں کے صرف دو مجموعے (۱) 'الاؤ' اور (۲) 'نئے پرانے'، مکتبۂ اردو لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔

اردو کی خاموش خدمت پسند کرتا ہوں۔ اب تک جو کچھ کیا "پروپیگنڈہ"، گروپ بازی اور نعرے بازی سے الگ رہ کر کیا ہے۔

افسانوں کے علاوہ تنقیدی مضامین۔ شخصی خاکے۔ ڈرامے۔ فیچر۔ مزاحیہ خاکے وغیرہ بھی لکھ چکا ہوں۔ ریڈیو ڈرامے بھی کافی لکھے۔ ان میں سے بہت سے ڈرامے نشر ہو کر بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔ خاص کر دارا شکوہ۔ جہاں آرا۔ بینا جوگن۔ انار کلی۔ شیر شاہ۔ بہادر۔ روشنی۔ میرزا پھجّو وغیرہ۔

۱۵/ اگست ۱۹۷۰ء سے ایک ہفتہ وار اخبار 'حال' جاری کیا۔ لیکن ابھی یہ مستقل نہیں ہوا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران ادبی دنیا سے کسی قدر دور ہو گیا۔ اب وقت ملا ہے۔ اس لئے آج کل لکھنے میں مصروف ہوں۔ فی الحال ایک ناول لکھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنے نامکمل ناول اور دوسری چیزوں کو مکمل کرنے کی فکر میں ہوں۔

---

[1] یہ کہانی شاعر میں شائع ہوئی تھی۔

بے جڑ کے پودے

سہیل عظیم آبادی

شام ہو چکی تھی اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر لڑکے چرچ کے میدان میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور شور مچا رہے تھے، آرنسٹ کو خیال نہیں رہا تھا کہ لڑکوں سے ڈرو مٹری جانے اور کتابیں نکال کر پڑھنے کو کہے۔ نورا آ گئی تھی۔ اور وہ میدان کے کنارے برگد کے نیچے کھڑا اُس سے باتیں کرنے میں بھول گیا تھا۔ دونوں پندرہ بیس دنوں کے بعد ملے تھے۔ اور بہت سی باتیں کرنی تھیں نورا نے آرنسٹ کو بتایا کہ فریڈی اُسے بہت تنگ کرتا ہے۔ جب ملتا ہے تو چھیڑ کر باتیں کرتا ہے۔ ایک دن راستے میں ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا کہ گھر پر آؤ تم سے باتیں کرنی ہیں۔ مگر وہ نہیں گئی۔ ایک دن اُس کی بہن مرتھا بہت ضد کر کے اُسے اپنے گھر لے گئی۔ فریڈی آ گیا تو اُس نے ویسی ہی باتیں شروع کیں اور وہ ہوسٹل چلی گئی۔

مرتھا نے اُسے بتایا کہ فریڈی اُس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسری لڑکیوں نے بھی اُس سے یہ بات کہی۔ اِس لئے سب سے کہہ دیا ہے کہ فریڈی سے وہ بیاہ نہیں کر سکتی۔ مگر پھر بھی جب وہ کہیں ملتا ہے تو اُسے چھیڑتا ہے۔

ارنسٹ نے نورا کو بتایا کہ جب سے وہ اِمتحان دے کر آیا ہے بشپ کا رُخ بدلا ہوا ہے۔ چار دن پہلے جب اِمتحان کا نتیجہ نکلا اور وہ بی اے پاس کر گیا تو بشپ نے اُسے بلایا اور کہا کہ ٹیٹر گنج چلا جائے۔ اور وہاں مشن کے مڈل اِسکول میں کام کرے، وہاں کا ہیڈ ماسٹر مر گیا ہے اور کوئی آدمی نہیں مل رہا ہے۔ اُس نے بشپ سے کہا کہ وہ ابھی نوکری کرنا نہیں چاہتا۔ ایم اے کرنا چاہتا ہے۔ لیکن بشپ نے کہا ہے کہ وہاں ضرورت ہے اور تم کو جانا پڑے گا اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر نہیں جاؤ گے تو مشن کوئی مدد نہیں کریگا۔ مگر وہ طے کر چکا ہے کہ ٹیٹر گنج نہیں جائیگا۔ اُس نے مِس گرین سے یہ بات کہی تو اُس نے کہا کہ بشپ نے اُسے آئندہ پڑھنے کے لئے مدد دینے سے منع کر دیا ہے اور اب وہ پڑھنے کے لئے رُوپے نہیں دے سکتی۔ بشپ رُولینڈ پادری سے زیادہ انگریز افسر ہے۔ اُس کا حکم سرکاری افسروں سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اُسے یہ بھی خیال نہیں کہ ٹیٹر گنج رانچی سے چالیس میل دُور جنگل میں ہے۔ جہاں بیل گاڑی اور سائیکل کے سوا کوئی دوسری سواری نہیں جا سکتی، وہاں اِسکول میں ہیڈ ماسٹر بننے کا مطلب ہے کہ زندگی وہیں ختم ہو جائے گی۔ اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ اور اُس کی دِلی تمنّا ہے کہ ایم اے کر کے کالج میں لکچرار بنے۔ ٹیٹر گنج نہیں جانے کا مطلب یہ بھی ہے کہ اُسے مشن کے کمپاؤنڈ کو چھوڑ کر اپنے رہنے کا کوئی دوسرا اِنتظام کرنا ہو گا۔

اُس نے نورا کو یہ بھی بتایا کہ ساری شرارت فریڈی کی ہے، وہ پادری بن گیا ہے اور بشپ کے پاس جاتا رہتا ہے اور اسے بہکاتا رہتا ہے اور یہ رائے اُسی کی دی ہوئی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ فریڈی کی بہن مرتھا اُس سے کئی بار ملی اور محبّت جتاتی رہی۔ مرتھا نے اُس سے یہ بھی کہا کہ فریڈی نورا سے بیاہ کریگا۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور بات پکّی ہو چکی ہے۔ اُسے یقین نہیں آیا تھا اور اُس نے مرتھا کو ڈانٹ دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ آئندہ اس سے نہ ملا کرے اور تھوڑی دیر کے لئے دونوں چُپ ہو گئے تھے۔ پھر نورا بولی تھی، اگر پھر فریڈی نے اُسے چھیڑا تو یہ خیال نہیں کرے گی کہ وہ پادری ہے۔ اُسے مزا چکھا دے گی۔

مِس گرین کی آواز آئی۔

"لڑکا لوگ، اب تک تم سب میدان میں ہلاّ کر رہا ہے۔ ڈرو مٹری جاؤ"۔

مِس گرین کی آواز سُن کر نورا آہستہ سے لڑکیوں کی ہوسٹل کی طرف چلی گئی۔ اور ارنسٹ مشن کے احاطے سے باہر سڑک پر چلا گیا۔

ارنسٹ جیسے ہی سڑک پر آیا۔ مسٹر سنہا سے اُس کی ملاقات ہو گئی وہ ٹہل کر اپنی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ ارنسٹ نے اُن کو سلام کیا۔ وہ رُک گئے، مُسکرائے اور بولے۔

"بہت دِنوں پر تم کو دیکھا۔ اب تو تم جوان ہو گئے ہو۔"

"ارنسٹ کچھ نہ بولا۔ چُپ چاپ کھڑا رہا۔ مسٹر سنہا نے پُوچھا۔

"اب تم کیا کر رہے ہو۔ ؟"

ارنسٹ نے جواب دیا۔

چار دِن ہوئے اِمتحان کا نتیجہ نکل آیا ہے۔ آنرز کے ساتھ بی اے

کرلیا ہے۔ ایم اے کرنے کا ارادہ ہے..... مگر.....؟"

ارنسٹ رُک گیا۔ مسٹر سنہا نے سوال کر دیا۔

"مگر کیا۔ ؟"

ارنسٹ کا جی چاہا کہ سارا حال کہہ دے، مگر اُس کی زبان نہ کھُلی وہ چُپ رہا۔ مسٹر سنہا مسکرائے اور بولے۔

"اچھا کسی وقت آکر ملو۔"

وہ اپنی کوٹھی کی طرف چلے گئے۔ مسٹر سنہا کی کوٹھی "روز وِلا" مشن کے احاطے سے تھوڑی دُور پر تھی۔ وہ بیرسٹر اور شہر کے بڑے آدمی تھے۔ عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ مگر ہٹے کٹے اور مضبوط تھے۔ جب لندن میں بیرسٹری پڑھ رہے تھے تو وہیں انہوں نے بیاہ کر لیا تھا۔ اُن کے ماں باپ پُرانے خیال کے آدمی تھے اور اُن کی انگریز بیوی اُن دونوں کو پسند نہ تھی۔

وہ واپس آئے تو کچھ دن کرایہ پر کوٹھی لے کر رہے۔ پھر اپنی کوٹھی بنوالی۔ اُن کی بیوی روز میٹی سنہا بہت خوبصورت اور نیک عورت تھی۔ مگر زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہی۔ تین سال کے بعد ہی اُس کے مُرا ہوا بچہ ہوا۔ وہ خود بھی بیمار ہو گئی۔ بہت علاج ہوا، لیکن بچ نہ سکی۔ مسٹر سنہا کو بہت رنج ہوا۔ اور پھر انہوں نے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ مسٹر سنہا نیک اور شریف آدمی تھے۔ خوب کماتے تھے اور اچھے کاموں میں خوب خرچ کرتے تھے۔ شہر کے سارے لوگ اُن کی عزت کرتے تھے۔ مس گرین سے اُن کی بڑی دوستی تھی۔ ایک تو اُن کی بیوی روز میٹی سنہا کی ملاقات لندن سے تھی۔ دوسرے مس گرین بھی ہندوستان اسی جہاز سے آئی تھی۔ جس سے مسٹر اور مسز سنہا آرہے تھے۔ مسز سنہا کے مرنے کے بعد بھی مس گرین اُن سے ملتی رہتی تھی۔ اور وہ مس گرین کی مدد کرتے رہتے تھے۔

مس گرین جب آئی تو لڑکیوں کے ہائی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن پڑھانے کے کام میں اُس کا جی نہ لگتا تھا۔ وہ ایسا کام کرنا چاہتی تھی جس میں سارا دن اُلجھی رہے اور نئے عیسائی بنا سکے۔ اُس کے لوگ دولت مند تھے اور اُس کا بھائی اُسے ہر مہینہ پانچ سو روپے بھیجا کرتا تھا۔ پھر اُس نے اسکول میں پڑھانا چھوڑ دیا اور نیا کام شروع کیا۔

ہوا یہ کہ ایک رات مس گرین کی نیند ٹوٹی تو ایک بچے کے رونے کی آواز اُس کے کان میں آئی۔ اُٹھی اور دروازہ کھولا تو پاس ہی ایک ننھا بچہ کپڑوں میں لپٹا ہوا ملا۔ اُس نے بچے کو اُٹھا لیا اور کمرے میں لے آئی۔

دوسرے ہی دن اُس نے ایک آیا رکھ لی اور اُسے پالنے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد اُسے دوسرا بچہ مل گیا۔ اُسے بھی لے آئی اور پالنے لگی۔ پھر تیسرا اور چوتھا بچہ بھی آ گیا۔ اور اُس نے یہی کام اپنے ذمّہ لے لیا۔ بے ماں باپ کے بچوں کو لاتی اور اُنہیں پالتی، پڑھاتی اور اُن کے آرام کا سامان کرتی۔ جب تک چند ہی بچے رہے۔ یہ کام مشکل نہ تھا۔ لیکن ایسے بچوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ تو زیادہ روپوں کی ضرورت ہوتی تھی اور روپے اکٹھا کرنے میں اُسے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ وہ صبح سویرے سائیکل لے کر شہر نکل جاتی۔ لوگوں سے ملتی اُن سے پُرانی چیزیں اور کتابیں مانگ لاتی۔ پھر ان چیزوں کو دوسروں کے ہاتھ بیچتی۔ کچھ لوگ اُسے نقد روپے بھجوا دیتے تھے۔ انگلینڈ میں بھی کچھ لوگ تھے جو اُسے روپے بھیجتے رہتے تھے۔ اُسکا بھائی جو پانچ سو روپے بھیجتا تھا اُس میں سے دو سو روپے اپنی ذات پر خرچ کرتی تھی۔ باقی روپے ان بچوں پر۔ مسٹر سنہا پابندی کے ساتھ کچھ روپے مس گرین کو دیا کرتے تھے، مگر کتنے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ مسٹر سنہا سے جب بھی مس گرین کی ملاقات ہوتی تھی۔ تو وہ ہنس کر سوال کرتے تھے۔

"تمہارے بچے کیسے ہیں ؟"

اور وہ مسکرا کر جواب دیتی تھی۔

"سب اچھے ہیں۔"

مس گرین لوگوں سے ہنس کر کہتی تھی۔ "میں ماں نہیں ہوں۔ مگر میرے بہت بچے ہیں۔" اُس نے کئی بار ارنسٹ کو خط دے کر مسٹر سنہا کے پاس بھیجا تھا اور مسٹر سنہا نے ہر بار خط کا جواب بند لفافہ میں دیا تھا۔ ارنسٹ سمجھتا کہ لفافہ میں روپے ہیں۔ لیکن کتنے؟ یہ جاننے کی اُس نے کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

ارنسٹ کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کے ماں باپ کون تھے اور نہ نورا کو۔ مس گرین کے پاس زیادہ بچے ایسے ہی تھے۔ جن کو اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر مس گرین کی آیا نے بتایا تھا کہ اُس کو اور نورا کو مس گرین ہسپتال سے لائی تھی۔ دونوں کو اُن کی مائیں ہسپتال میں چھوڑ کر بھاگ گئی تھیں۔ ہسپتال والوں کو بھی اُن کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ وہ کون تھیں اور کہاں سے آئی تھیں۔ ہسپتال میں جو اُن کا پتہ تھا وہ یقینی طور پر غلط تھا اتنی بات صاف تھی کہ ارنسٹ اور نورا کے ماں باپ، ادیباسی

نہیں تھے، دونوں کا رنگ بہت گورا تھا۔ اور سارے بچے ادی باسی تھے۔ فریڈی اور مرتھا کے ماں باپ ادی باسی تھے۔ اُن کی ماں مر گئی تھی اور باپ دوسرا بیاہ کر کے آسام چلا گیا تھا۔ اُن کا کوئی نہ تھا اور مشن کا پرچارک دونوں کو مس گرین کے پاس لے آیا تھا۔

ارنسٹ جب ڈرومڑی پہنچا تو مس گرین وہاں موجود تھی۔ سارے لڑکے کتابیں کھولے پڑھ رہے تھے اور مس گرین بیٹھی ہوئی تھی۔ جب کوئی کچھ پوچھتا تو بتا دیتی تھی۔ ارنسٹ ڈرا، کہ مس گرین ضرور اُس سے سوال کرے گی۔ مگر یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کوئی سخت بات نہیں کہے گی۔ بلکہ چار سوال کر کے مُنہ بنائے گی اور ہنس کر رہ جائیگی۔ اُس نے جیسے ہی ارنسٹ کو دیکھا۔ سوال کیا۔

"تم کہاں تھا لڑکا؟"

ارنسٹ نے جواب دیا۔

"مسٹر سنہا مل گئے تھے۔ وہ بہت سی باتیں پوچھنے لگے، اُن سے باتیں کر رہا تھا۔"

مس گرین مُسکرائی اور بولی۔

"اچھا میرا ساتھ چلو۔"

ارنسٹ مس گرین کے ساتھ بنگلے پر پہنچا۔ بنگلہ بہت بڑا تھا۔ مگر مس گرین اکیلی نہیں رہتی تھی۔ اُس کے پاس ایک ہی کمرہ تھا۔ دوسرے کمروں میں دوسری مشنری عورتیں رہتی تھیں، ایک کمرے میں مس آولی لیڈی ڈاکٹر رہتی تھی دوسرے کمرے میں لڑکیوں کے ہائی اسکول کی پرنسپل مس جون۔ ایک کمرے میں مس منو رہتی تھی۔ وہ گونگے، بہرے بچوں کا اسکول چلاتی تھی۔ ایک کمرہ مس کیلے کا تھا۔ وہ اندھے بچوں کا اسکول چلاتی تھی اور ایک کمرے میں مس وائلٹ رہتی تھی۔ وہ لڑکیوں کیلئے دست کاری کا اسکول چلاتی تھی۔ سب کی سب دن رات اپنے کاموں میں لگی رہتی تھیں۔ صرف چائے اور کھانے کے وقت ملاقات ہوتی تھی، ورنہ ایک بنگلے میں رہ کر بھی سب ایک دوسرے سے اتنی دُور تھیں۔ جیسے الگ الگ محلوں میں رہتی ہوں۔ بس خاص خاص موقعوں پر آپس میں مل کر بیٹھتیں اور مشورہ کرتی تھیں۔

مس گرین کی سائیکل ارنسٹ نے برآمدے میں رکھ دی، اور کتابیں کمرے کے اندر ایک کونے میں، مس گرین نے کمرے کا دروازہ بند کر کے کہا۔

"بیٹھ جاؤ تم سے بہت بات کرنا ہے۔"

ارنسٹ گھبرایا ہوا تھا۔ نہ جانے مس گرین کیا کہے گی۔ حالات اُس کے خلاف ہو رہے تھے، مس گرین اپنی مسہری پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ ارنسٹ کھڑا رہا، تو بولی۔

"اسٹول کھینچ کر بیٹھو۔!"

جب ارنسٹ بیٹھ گیا تو مس گرین بولی۔

"بشپ، تم سے رنج ہے۔ تم کو وہ پیٹر گنج بھیجنا چاہتا ہے۔ تم اُس کا بات نہیں مانا۔"

ارنسٹ کا حلق سُوکھ گیا۔ وہ بڑی کوشش کر کے بولا۔

"مگر میں ابھی نوکری کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ ایم اے کرنا چاہتا ہوں۔ بشپ سے میں نے کہا ہے۔"

مس گرین بولی

"ہم بھی سوچا تھا تم ایم اے کرو۔ ہم اپنا بھائی کو لکھتا تو تم کو لندن بُلا لیتا۔ اور آگے پڑھتا۔ مگر اب ہم کچھ نہیں کر سکتا۔ تم کو بتایا کہ بشپ نے آگے پڑھنے کو روپیہ دینا منع کیا ہے۔ آج ہم کو بُلا کر بشپ بولا ہے کہ تم سب کا بات اٹھا دیا۔ تم سے ریو برنڈ للّٹرا بولا۔ تم نہیں مانا۔ ریو برنڈ ٹوپو بولا۔ اُس کا بات بھی اُٹھا دیا۔ بشپ خود بولا۔ تم اُس کا بات بھی نہیں مانا۔ بشپ بولا ہے کہ تم پیٹر گنج نہیں جائے گا تو کل ہی مشن کمپاؤنڈ چھوڑ دو۔ بشپ کا حکم ماننا ہی ہوگا۔"

بولتے بولتے مس گرین نے گردن جُھکا لی۔ بولنے میں اُس کی آواز اُلجھ رہی تھی۔ مگر وہ بولتی جا رہی تھی۔ بشپ کا حکم اُسے پسند نہیں تھا۔ مگر وہ مجبور تھی۔ بشپ کا حکم ٹالنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہر مشنری کو بشپ کی نگرانی میں، اور اس کے حکم کے مطابق کام کرنا ہوتا تھا۔ ارنسٹ مس گرین کی باتیں سُنتا رہا۔ اُس پر بے دلی چھا رہی تھی۔ آخری سہارا ابھی ٹوٹ رہا تھا۔ مس گرین بولی۔

"بشپ تمہارا اور شکایت کرتا تھا۔ تم نُورا سے بہت ملتا ہے۔ یہ بات بھی اُس کو پسند نہیں۔"

ارنسٹ کا دِل دُھک سے ہو گیا۔ وہ نُورا سے ملتا تھا تو اِس میں بشپ کا کیا تھا۔ لڑکیوں سے ملنا منع نہیں تھا اور وہ دونوں تو ساتھ پلے اور بڑھے تھے۔ جب وہ چھ سال کا تھا تو نُورا کو مس گرین ہسپتال سے لائی تھی۔ اُس وقت اِتنا چھوٹا بچہ کوئی اور نہ تھا۔ اور اُسے اُس سے دِلچسپی ہو گئی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ دوسرے لڑکے کھیلتے

رہتے تھے اور وہ نُورا سے کھیلتا رہتا تھا۔ کُل آٹھ بچّے تھے اور سب کے سب بنگلے سے باہر نوکروں کے کمرے میں رہتے تھے۔ میری ان سب کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ فریڈی اور مرتھا بہت بعد میں آئے تھے۔ اور بڑے بڑے تھے۔ اور جب زیادہ لڑکے آئے تھے تو ڈورومٹری کی عمارت بنی تھی۔ لڑکوں کے لئے الگ اور لڑکیوں کے لئے الگ۔ بچپن ہی سے دونوں کا بہت میل تھا۔ جتنا بڑھتے گئے ایک دوسرے کو زیادہ چاہنے لگے۔ اب وہ میٹرک کرنے کے بعد لڑکیوں کے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ دونوں نے طے کرلیا تھا کہ بیاہ کریں گے۔ اب بشپ اس کی راہ میں آرہا تھا۔ مس گرین کی باتیں سُن کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر وہ پی گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔ مِس گرین بولی۔

"تم کل مشن کمپاؤنڈ چھوڑ دو۔"

باتیں کرتے کرتے مس گرین کے چہرے پر اُداسی چھاگئی۔ اُس نے گردن جھکالی اور آہستہ سے پُردرد آواز میں بولی

"ہم مجبور ہے۔ ہم کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"

ارنسٹ جیسے نیند سے چونک پڑا۔ اِس میں نئی ہمّت آگئی اور وہ بولا۔

"کل مشن کمپاؤنڈ چھوڑ دوں گا۔ اور اپنے لئے کوئی کام ڈھونڈ دوں گا۔"

مس گرین نے اُسے گردن اُٹھا کر دیکھا۔ ارنسٹ نے محسوس کیا کہ اب اُس کے چہرے پر پہلی سی اُداسی نہیں ہے۔ شاید اُس نے اُس کے جواب کو پسند کیا تھا۔ اس کی ہمّت اور بڑھی اور وہ بولا۔

اب میں بچّہ نہیں ہوں۔ نُورا سے میری دوستی میرا اور نُورا کا معاملہ ہے۔ ہم لوگوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ ہم بیاہ کرینگے بشپ کو اُس میں کچھ بولنا نہیں چاہیئے۔"

مس گرین مُسکرا اٹھی اور بولی۔

"لڑکا گستا مت کرو۔"

ارنسٹ نے مس گرین کی آنکھوں میں وہی محبت پائی جو ہمیشہ اُسے ملی تھی۔ اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اُسے دوسرے پادریوں اور بشپ کے رنجیدہ ہونے کی پرواہ نہ تھی۔ مگر وہ مس گرین کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بولا۔

"آپ نے مجھے پالا ہے۔ میں ماں کی طرح آپ کی عزّت کرتا ہوں۔ آپ کا ہر حکم مانوں گا۔ لیکن دوسرے کی غلط بات نہیں مانوں گا۔ ساری شرارت فریڈی کی ہے۔ وہ پادری بن گیا ہے۔ مگر دل کا کھوٹا ہے۔ وہ نُورا سے بیاہ کرنا چاہتا ہے اور وہی بشپ کو بہکا کر مجھے یہاں سے دور ہٹانا چاہتا ہے۔"

مس گرین کے چہرے کا رنگ پھر بدل گیا اور اُس نے گردن جھکالی۔ کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔

"ہم سب سمجھتا ہے، ہم نہیں جانتا تھا۔ فریڈی اِتنا گندا آدمی ہوگا۔"

ارنسٹ بولا۔

"فریڈی سمجھتا ہے کہ میں دور ہو جاؤں گا تو نورا اُس سے بیاہ کرلے گی۔ فُول۔"

مِس گرین نے ارنسٹ کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مِس گرین کے چہرے کی جھرّیوں میں، پھر پھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ یکایک اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا اور بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ارنسٹ گھبرا گیا۔ شاید مِس گرین کو اُس کی کوئی بات بُری لگی۔ اور وہ رو رہی ہے۔ وہ کھڑا ہوگیا۔ اور بولا۔

"چُپ ہوجائیے۔ آپ جو حکم دیں گی میں وہی کروں گا۔"

مگر مِس گرین روتی رہی۔ ارنسٹ بوکھلایا ہوا کھڑا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے کیسے چُپ کرائے۔ اُسے شرم محسوس ہو رہی تھی کہ مِس گرین کو اُس سے رنج پہنچا اور وہ رو رہی تھی۔ مِس گرین نے اُسے بڑی محبت سے پالا تھا۔ خود بوتل سے اُسے دودھ پلاتی تھی اور ماں کی طرح محبت کرتی تھی۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی بہت سے لڑکے آئے۔ اُس نے سب کو پالا۔ لیکن اِتنی محبت کسی سے بھی نہیں کرتی تھی اور نہ کسی کے پڑھنے پر اتنا روپیہ اُس نے خرچ کیا تھا۔ مِس گرین روتے روتے اُٹھی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ ارنسٹ کھڑا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ تھوڑی دیر میں وہ غسل خانے سے مُنہ ہاتھ پونچھتی ہوئی نکلی۔ تولیہ کو ایک طرف پھیلا کر بولی۔

"ہم سب سمجھتا ہے۔ مگر بشپ کا حکم ہے۔ ہم کچھ نہیں کرسکتا۔"

اتنے میں گھنٹی کی آواز سُنائی دی جس کا مطلب تھا کہ کھانا ڈائننگ رُوم میں میز پر لگا دیا گیا ہے۔ مِس گرین چونک پڑی۔ کچھ سوچنے لگی۔ پھر میز کی دراز سے کُنجی نکال کر اُس نے الماری کھولی۔ تین سو روپے نکال کر اُسے دیئے اور بولی۔

"اِسے رکھ لو۔ بس مشن کمپاؤنڈ چھوڑ دو۔ کہیں اور رہو۔ ہم سب سمجھتا ہے۔ سب فریڈی کا بدمعاشی ہے۔"

ارنسٹ نے روپے لے لئے اُس کا جی چاہا کہ مس گرین سے لپٹ جائے اور اپنا سر پیار سے اُس کے سینے پر رکھ دے، جیسے بچے ماں کے سینے پر رکھ دیتے ہیں۔ مگر وہ چُپ کھڑا رہا۔ مس گرین بولی۔

"اچھا تم جاؤ۔ کسی سے مت بولنا کہ ہم تم کو روپیہ دیا ہے۔"

ارنسٹ چُپ چاپ کمرے سے نکلا اور ڈرومٹری کی طرف چلا گیا۔ اُس کا دل بھرا ہوا تھا اور دماغ پریشان تھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے گا۔؟

صُبح سویرے اُٹھ کر ارنسٹ آرتھر کے گھر چلا گیا۔ آرتھر اُس کا کالج ساتھی تھا۔ اُس کا باپ کیتھولک مشن کے مڈل اسکول میں ماسٹر تھا۔ اس نے آرتھر سے سارا قصّہ کہہ سُنایا اور یہ بھی کہا کہ اب ایم اے کرنا ممکن نہیں اب وہ کوئی کام ڈھونڈھے گا۔ آرتھر کو سارا قصّہ سُن کر دُکھ ہوا۔ دونوں کا پروگرام ساتھ ایم اے کرنے کا تھا۔ آرتھر پٹنہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مگر ارنسٹ کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ آرتھر نے دِلاسا دیا۔ ہمّت بندھائی۔ لیکن ارنسٹ جانتا تھا کہ وہ کِس حال میں ہے اور نہیں جانتا تھا کہ دوسرے پَل میں کیا ہونے والا ہے۔

آرتھر کا باپ کٹّر کیتھولک تھا۔ وہ صُبح اُٹھ کر چرچ گیا ہوا تھا۔ اُس کی بہن مونا چائے بنا لائی۔ دونوں نے پی اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آرتھر چاہتا تھا کہ ارنسٹ بھی کسی طرح ایم اے کرلے۔ لیکن اُسکی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ وہ خود غریب آدمی تھا۔ اُس کے باپ نے تکلیف اُٹھا کر اُسے بی اے تک پڑھایا تھا۔ اور تکلیف اُٹھا کر ایم اے تک پڑھانے کو تیار تھا۔ مگر ارنسٹ کا حال جان کر وہ بہت فکرمند ہو گیا۔

چائے پینے کے بعد ارنسٹ آرتھر کے گھر سے نکل پڑا۔ اِس کے دماغ میں دو باتیں تھیں ایک تو یہ کہ شہر میں اپنے لئے کوئی کام ڈھونڈھے، دوسرے نُورا کو کسی طرح خبر بھجوا دے کہ وہ مشن کمپاؤنڈ چھوڑ کر آرتھر کے گھر پر ہے۔ لیکن ابھی بہت سویرا تھا۔ وہ پچھتایا۔ پھر بھی مشن کمپاؤنڈ کی طرف بڑھتا گیا۔ شاید نُورا ہی مل جائے۔ صبح کا چرچ ختم ہونے اور لوگوں کے لوٹنے کا وقت ہو گیا تھا۔ مگر کسی سے مُلاقات نہیں ہوئی اور وہ چلتا گیا۔ تھوڑی دُور اور گیا تو اُس نے دیکھا۔ مسٹر سنہا صبح کی سیر کے بعد اپنی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کا السیشین بھی تھا۔ اُسے دیکھتے ہی بھونکنے لگا۔ مسٹر سنہا نے دیکھا۔ ارنسٹ نے سلام کیا۔ مسٹر سنہا بولے۔

"تم سویرے ٹہلا کرتے ہو، اچھّی عادت ہے۔!"

ارنسٹ جھجھکا۔ لیکن کچھ جواب دینا ضرور تھا۔ بولا۔

"نہیں نہیں۔ اپنے لئے کام ڈھونڈنے نِکلا ہوں۔"

مسٹر سنہا کھڑے ہو گئے اور بولے۔

"کیا بات ہے۔۔؟"

ارنسٹ نے سارا قصّہ کہہ سُنایا اور یہ بھی بتایا کہ بشپ کے حکم سے اُس نے مشن کمپاؤنڈ چھوڑ دیا ہے۔ اور ایک دوست کے یہاں سامان رکھ کر نکلا ہے۔ مسٹر سنہا نے اُس کی ساری باتیں سُنیں۔ پھر بولے۔

"اچھّا تم ایک کام کرو۔"

ارنسٹ ان کی طرف دیکھنے لگا کہ اب وہ کیا کہتے ہیں۔ لیکن مسٹر سنہا نے جیب سے ایک سِگار نکالا، اُسے جلایا اور مُنہ سے۔ دُھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔

"تم ابھی اپنا سامان لے کر میرے پاس آجاؤ۔ پھر میں سوچوں گا۔"

ارنسٹ کو حیرت نہیں ہوئی۔ مسٹر سنہا نیک اور شریف آدمی تھے۔ اور مشہور تھا کہ اُن کے پاس جو بھی مدد کیلئے جاتا ہے اُس کی وہ مدد کرتے ہیں مسٹر سنہا نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم ابھی آجاؤ۔ میں تمہارا اِنتظار کروں گا۔"

اور آہستہ آہستہ اپنی کوٹھی کی طرف چلے گئے۔ ارنسٹ آرتھر کے گھر واپس پہنچا۔ آرتھر کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس کا باپ پوٹوس ماسٹر گرجا گھر سے واپس آچکا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی بولا۔

"اے لڑکا تم کہاں چلا گیا تھا رے۔"

آرتھر نے اپنے باپ کو سارا قصّہ بتا دیا تھا۔ پوٹوس ماسٹر نیک آدمی تھا۔ اور اُسے ارنسٹ سے ہمدردی تھی۔ مگر اُس کی اپنی حالت اچھّی نہ تھی۔ ارنسٹ نے دونوں کو بتایا کہ مسٹر سنہا اُسے مل گئے تھے اور اُنہوں نے فوراً سامان لے کر اپنی کوٹھی پر بُلایا ہے اور وہ سامان لینے آیا ہے۔ پوٹوس ماسٹر بولا۔

"چلا جاؤ رے۔ مسٹر سنہا سینٹ ہے سینٹ۔"

ارنسٹ نے اپنا سوٹ کیس اور بستر اُٹھایا تو پوٹوس ماسٹر بولا۔

"تم کیسا دوست ہے رے آرتھر۔ اکیلے کیسے لے جائے۔ ایک چیز تم لے لو۔"

آرتھر ارنسٹ کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں راستے بھر خیال آرائی کرتے رہے۔ مسٹر سنہا نے سامان لے کر کیوں بُلایا ہے اور اس کے لئے کیا کرینگے آرتھر بار بار سوال کرتا تھا۔ اور کیا باتیں ہوئیں۔ انہوں نے کیا کہا۔ مگر وہ کیا بتاتا۔ اُسے خود حیرت تھی کہ انہوں نے اتنی دلچسپی کیوں لی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نیک آدمی تھے اور مس گرین کے بے ماں باپ کے بچوں کی پرورش میں دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن اتنی دلچسپی انہوں نے پہلے کبھی نہیں لی تھی۔ پھر اس نے خود ہی اس سوال کا جواب بھی ڈھونڈ لیا۔۔ پہلے کسی لڑکے کے ساتھ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور نہ اُن سے کوئی ملا تھا۔ شاید وہ بھی مدد کے لئے اُن کے پاس نہیں جاتا۔ یہ تو سنجوگ کی بات تھی کہ وہ نکلا اور اُن سے ملاقات ہوگئی۔ بات نکل آئی اور اُس نے سب کچھ بتا دیا۔

جب آرتھر کے ساتھ سامان لے کر وہ مسٹر سنہا کے بنگلے پر پہنچا تو وہ برآمدے میں سر جھکائے ٹہل رہے تھے، اُن کا کُتا اُن کے پاؤں سے لپٹ رہا تھا۔ اُن دونوں کو دیکھ کر کُتا بھونکنے لگا۔ مسٹر سنہا نے دیکھا۔ کُتے کو ڈانٹا اور بولے۔

"آجاؤ۔ کچھ نہیں کرے گا۔"

مگر کُتا زور سے بھونکنے لگا۔ دونوں پر جھپٹنے لگا تو انہوں نے نوکر کو آواز دی اور وہ کُتے کو پکڑ کر لے گیا۔ مسٹر سنہا بولے۔

"پہچان جائے گا تو کچھ نہیں بولے گا۔"

پھر وہ خود ہی ارنسٹ کو ایک کمرے میں لے گئے اور بولے۔

"تم اس کمرے میں رہوگے، سامان رکھ دو۔"

دونوں نے سامان رکھ دیا تو مسٹر سنہا بولے۔

پہلے چائے پی لو۔ پھر بتاؤں گا۔ تمہیں کیا کرنا ہے۔

دونوں مسٹر سنہا کے ساتھ کمرے سے نکلے اور ڈرائننگ روم میں پہنچے۔ لمبی سی میز پر ناشتے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ مسٹر سنہا ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے دو ادھ پکے انڈے توڑ کر پئے۔ پھر توسٹ میں مکھن لگا کر اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولے۔

"شروع کرو۔"

مسٹر سنہا نے دوسرا توسٹ نہیں لیا۔ ایک توسٹ کھا کر چائے پینے لگے۔ اُن کے چہرے پر فکر کا نشان تھا۔ وہ چائے پی رہے تھے۔ اور کچھ سوچ رہے تھے۔ ایک پیالی چائے ختم کر کے انہوں نے پیالی دوسری بار بھرلی اور بولے۔

"چائے پی کر اپنا کمرہ ٹھیک کر لو۔ پھر میں باتیں کروں گا۔"

پھر وہ کچھ نہ بولے، چائے ختم کر کے وہ چُپ چاپ چلے گئے۔ ارنسٹ اور آرتھر چائے ختم کرنے کے بعد کمرے میں آگئے، وہاں ضرورت کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ پلنگ، میز، کرسی، الماری اور کمرے سے ملا ہوا غسل خانہ۔ ارنسٹ نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی آسانی کے ساتھ آرام کی ساری چیزیں مل جائیں گی۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اُسے یاد آیا۔ اسکول کے دنوں میں اُس نے اپنی انگریزی کتاب میں ایسی ایک کہانی پڑھی تھی۔ ایک لڑکے نے خواب دیکھا کہ وہ بادشاہ ہوگیا ہے اور رات بھر خواب میں حکومت اور عیش و آرام کرتا رہا اور جب صبح کے وقت اُس کی نیند ٹوٹی تو پھر اپنی جھونپڑی میں زمین پر پڑا تھا۔ وہ آرتھر سے باتیں کرتا رہا۔ آرتھر اُسے یقین دلاتا رہا کہ مسٹر سنہا اُسے ایم اے کرانے کے لئے روپے ضرور دیں گے اور وہ ایم اے کرلیگا۔ لیکن خود آرنسٹ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کہ آئندہ کیا ہوگا۔؟

آرتھر تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھر چلا گیا۔ ایک بار وہ کمرے سے باہر نکلا اور ادھر اُدھر گھوم کر کمرے میں پھر آگیا۔ مسٹر سنہا اپنے آفس میں بیٹھے تھے اور تین چار دوسرے آدمی بھی تھے۔ وہ سمجھا کسی مقدمے کی بات کر رہے ہوں گے۔ وہ ٹہل رہا تھا تو مسٹر سنہا کے کلرک عمر منشی نے اُس سے پوچھا تھا۔ کیسے آئے ہو اور کیا چاہتے ہو۔ اور اُس نے ایسے بتایا تھا کہ وہ یہاں رہنے کو آیا ہے۔ مسٹر سنہا نے اُسے بُلایا ہے اور منشی عمر کو حیرت ہوئی تھی۔ جب وہ کمرے میں آگیا تو سوچنے لگا، اب کیا کرے، کوئی آدمی بھی نہ تھا جس سے باتیں کرتا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے، وہ چپ چاپ پلنگ پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔

اُسے نورا یاد آئی۔ اور پھر وہ سوچنے لگا۔ نورا کو کس طرح خبر دے۔ حالات بدل چکے تھے اور تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے اور معلوم نہیں تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ اگر اُس سے ملاقات ہو جاتی تو اچھا تھا۔ لیکن وہ مشن کے احاطے کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا، بلکہ نورا کو یہ خبر دینا چاہتا تھا کہ وہ مسٹر سنہا کی کوٹھی میں آگیا ہے اور وہ چاہے تو مل سکتی ہے۔ لیکن اُسے پھر خیال آیا کہ نہ جانے نورا سے اُس کا ملنا مسٹر سنہا کو پسند آئے یا نہ آئے۔ اور نہ جانے مسٹر سنہا اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے۔ بیسیوں باتیں اُس کے دماغ میں آئیں اور نکل گئیں اور اُس کی طبیعت گھبرانے لگی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ کمرے میں قید کر دیا گیا ہو۔ اگر یہی حال رہا تو اُس کا کیا حال ہوگا۔ وہ اکیلے رہنے کا عادی نہیں تھا۔

جب تک لڑکا تھا دوسرے لڑکوں کے ساتھ ڈرومٹری میں رہتا تھا یا اسکول میں۔ پھر کالج میں بھی لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ہوسٹل میں بھی اُس کے ساتھ کمرے میں آرتھر تھا۔ مگر اب تو اُسے اِسی حال میں رہنا ہی تھا۔ اور دیکھنا تھا کہ آئندہ کیا ہوتا ہے۔

وہ نہ جانے کتنی دیر تک ایسی باتیں سوچتا رہا۔ عمر منشی اُس کے کمرے میں آیا۔ اور بولا۔

"صاحب تم کو بُلا رہے ہیں۔"

وہ اُسکے ساتھ ہو لیا۔ مسٹر سنہا اپنے آفس میں بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی بولے۔

"تم کہیں جانا چاہو تو جاؤ۔ کھانے کے وقت آجانا۔"

وہ آفس سے باہر نکل کر آیا، تو رمضانی خانساماں بولا۔

"ایک بجے کھانا تیار رہے گا۔ صاحب دِن کے وقت کھانا نہیں کھاتے"

ارنسٹ کو اندازہ ہوا کہ اُس کی موجودگی عمر منشی اور رمضانی خانساماں کو گراں ہوئی۔ دونوں نے اُس سے اِس طرح بات کی تھی جیسے وہ بات کرنا نہ چاہتے ہوں۔ وہ کمرے میں آیا اور کپڑے پہن کر باہر چلا گیا۔ جب سڑک پر آیا تو سوچنے لگا کہ کہاں جائے۔ وہ اب تک بندھی زندگی گزارتا رہا تھا اور مشن کمپاؤنڈ سے باہر صرف آرتھر کے گھر جاتا تھا اور کسی دوسرے کے گھر کبھی نہیں گیا تھا۔ اُس نے سوچا بازار چلا جائے اور کچھ ضروری چیزیں خرید لائے۔ بازار دُور تھا۔ مسٹر سنہا کی کوٹھی شہر کے آخری حصّے میں تھی۔ پھر بھی وہ بازار کی طرف چل دیا۔ اور جب مشن کے نزدیک پہنچا تو اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شاید کوئی پہچانی ہوئی لڑکی مِل جائے تو نورا کو خبر بھیج دے۔ مگر کوئی لڑکی نہیں ملی اور وہ ٹہلتا ہوا بازار پہنچ گیا۔ اور چند چیزیں خرید کر لوٹ پڑا۔ راستے میں اُسے خیال آیا کہ پھر کمرے میں بند رہنا ہوگا۔ اور اِس خیال سے اُسے بڑی وحشت ہوئی۔ لیکن اور کہاں جاتا۔ کھانے کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ اور وہ کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتا تھا جو مسٹر سنہا کو پسند نہ آئے۔ وہ آخری سہارا تھے۔

مسٹر سنہا کچہری جا چکے تھے اور مالی پھلواری میں کچھ کام کر رہا تھا سارے مکان میں سناٹا تھا۔ جیسے کوئی آدمی نہ ہو۔ وہ چُپ چاپ اپنے کمرے میں پہنچا اور وہاں پہنچتے ہی بہت سے خیالوں نے اس کو گھیر لیا۔ اور وہ اُلجھ گیا تو پلنگ پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر کیلئے سو جانے کی کوشش کرنے لگا۔ پچھلی رات اُسے اچھی طرح نیند نہیں آئی تھی۔ لیکن اُس وقت بھی نیند نہیں آئی اور وہ سوچتا رہا۔

رات کے وقت کھانے کی میز پر مسٹر سنہا کا ساتھ ہوا۔ ارنسٹ چُپ تھا۔ مسٹر سنہا نے کہا۔

"میں اکیلا ہوں۔ کوئی نہیں جس سے کبھی باتیں کروں۔ تم آگئے، تو جی بہل جائے گا۔"

ارنسٹ سُنتا رہا۔ مسٹر سنہا بہت سی باتیں کہتے رہے اور برابر یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ اُس کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔ لیکن مسٹر سنہا نے مِس گرین کے پالے ہوئے بچوں کی بات چھیڑ دی اور اُسے قصّے سُناتے رہے۔ دیر تک مِس گرین کی تعریف کرتے رہے۔ عیسائی مشنریوں کی تعریف کرتے رہے۔ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں جو اپنی ساری زندگی ایک کام کیلئے وقف کر دیتے ہیں اور اپنے لئے کچھ بھی نہیں کرتے بہت سی باتیں کہنے کے بعد مسٹر سنہا نے پُوچھا۔

"اور وہ لڑکی کہاں ہے جسے مِس گرین ہسپتال سے لائی تھی۔؟"

ارنسٹ کے لئے اِس سوال کا جواب دینا مشکل تھا۔ مس گرین تو ہسپتال سے کئی لڑکیوں کو لائی تھی۔ ایک ہوتی تو سمجھ جاتا اور بتا دیتا، اُس نے کہا۔

"ہسپتال سے تو کئی لڑکیاں لائی گئی ہیں۔"

مسٹر سنہا نے کہا۔

"کیا نام بتایا تھا اُس کا مِس گرین نے، یاد نہیں آتا۔ اچھا تم سب کے نام لو۔"

ارنسٹ نے سب کے نام لینا شروع کئے

"رمولا۔ بنکی۔ آئیڈا۔ کیتھی۔ نورا۔"

"ہاں ہاں نورا۔"

مسٹر سنہا بولے۔

"یہی نام بتایا تھا مِس گرین نے۔ خوبصورت سی بچّی تھی۔ اب کیا کرتی ہے۔؟"

ارنسٹ بولا۔

"میٹرک کر کے اُس نے ٹریننگ لی اور اب بچیوں کے اسکول میں پڑھاتی ہے۔"

مسٹر سنہا بولے۔

"اچھا، اچھی ہے نا؟!"

یہ عجیب بات تھی مسٹر سنہا نے اُس میں دلچسپی لی تھی، اور اب نورا میں دِلچسپی لے رہے تھے۔ اُسے شک ہوا کہ کہیں مسٹر سنہا کو اُس

کی اور نُورا کی محبت کی خبر تو نہیں ہوگئی ہے۔ اور کسی لڑکی یا لڑکے میں اُنہوں نے دلچسپی نہیں لی۔ حالاں کہ سب کو مس گرین نے پالا تھا اور وہی سب کو پال رہی تھی۔ مس گرین کی مدد مسٹر سنہا کرتے تھے تو سارے بچوں کیلئے، صرف اُس کے یا نُورا کے لئے نہیں۔ اُس کا جی چاہا کہ پُوچھے کہ اُس سے اور نُورا سے اُنہیں کیسے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ لیکن وہ اُن کی باتیں سُنتا رہا۔ اور اُسی سوال کا جواب دیتا رہا، جو وہ پُوچھتے رہے۔

"کھانا ختم ہوا تو کافی آئی۔ مسٹر سنہا نے کافی کا ایک گھونٹ پیا اور بولے۔

"میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم اطمینان سے رہو۔ بہت سی کتابیں موجود ہیں جو جی میں آئے نکال کر پڑھو۔ بہت اچھی اچھی کتابیں اِن الماریوں میں ہیں۔ اِتنا خیال رکھنا، کتابیں خراب نہ ہوں۔"

مسٹر سنہا کافی پی کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

"جاؤ آرام کرو۔ میں رات میں تمہارے بارے میں فیصلہ کروں گا۔"

وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ لیکن عجیب بےچینی سی محسوس کر رہا تھا۔ مسٹر سنہا نے ساری لڑکیوں کو چھوڑ کر نُورا کے بارے میں کیوں پُوچھا۔ اُس نے اُن کے پُوچھنے پر سب کے بارے میں بتایا تھا۔ لیکن اُنہوں نے کسی میں بھی دلچسپی نہیں لی۔ آخر کیوں؟ وہ جتنا سوچتا گیا اتنا ہی اُلجھتا گیا۔ یہ بھی سوچتا رہا کہ آخر مسٹر سنہا نے اِس میں اتنی دلچسپی کیوں لی اور وہ اُس کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گے۔ وہ آخر کیا چاہیں گے۔ اُسے اِس کا یقین تھا کہ مسٹر سنہا اُس کی بھلائی چاہتے ہیں اور مدد ضرور کریں گے۔ لیکن کس طرح؟ اُس نے خود کو ایسا پَودا محسوس کیا جو پھیلتا جا رہا تھا، مگر جس کی جڑ تھی ہی نہیں۔ ایسی بیل کی طرح جو دوسرے پیڑوں پہ پھیل جاتی ہے۔ اور اُس کی جڑ کہیں نہیں ہوتی۔

نُورا کا خیال آتے ہی وہ دوسری فکر میں پڑ گیا۔ اب وہ مشن کمپاؤنڈ میں نہیں ہے تو نُورا سے مُلاقات اور بھی مشکل ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی لڑکیوں کو مشنری عورتیں سخت نگرانی میں رکھتی ہیں اور اُنہیں اکیلے کہیں باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ معلوم نہیں نُورا یہ جان سکی یا نہیں کہ وہ مشن کمپاؤنڈ سے باہر آگیا ہے اور اب آخری کوشش اِس بات کی کرے گا کہ ایم اے کرے اور جیسے ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا، اُس سے بیاہ کرے گا۔

مگر یہ ساری باتیں نُورا کو کیسے معلوم ہوں، یہ بڑا سوال تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اُس تک خبر کیسے پہنچائے

یکایک اُسے خیال آیا اور اُس نے ایک خط لکھنا شروع کیا۔ اور دیر تک لکھتا رہا۔ خط ختم کرکے اُسے اطمینان ہوا۔ دوبارہ پڑھ کر خط لفافے میں بند کرکے اُس نے سرہانے چھپا کر رکھ دیا اور طے کر لیا کہ صبح اُٹھ کر چرچ جائیگا اور کوئی بھروسے کی لڑکی مل گئی تو اُس کے حوالے کر دیگا کہ نُورا کو دیدے۔ اگر نُورا خود مل گئی تو کسی طرح خود ہی خط اُس کے حوالے کر دے گا۔ اِس کے سوا اور کوئی دوسری صورت نہیں تھی۔

ارنسٹ نے دل ہلکا محسوس کیا۔ اُس کی دو ہی تمنائیں تھیں، ایک ایم اے کرنے کے بعد کسی کالج کا لکچرار بننا اور دوسرے نُورا سے بیاہ۔ اور اُسے کوئی خاص فکر نہ تھی۔ کچھ دِنوں پہلے تک اِن دونوں باتوں کو وہ آسان سمجھتا تھا، لیکن اب اُسے دونوں باتیں مُشکل نظر آ رہی تھیں۔

دو دن گزر گئے۔ لیکن کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ مسٹر سنہا نے اُس سے کوئی بات کہی اور نہ نُورا کو خط بھیج سکا۔ یوں تو اُس کو یقین تھا کہ نُورا کو خبر مل چکی ہوگی۔ یہ ایسی بات نہ تھی کہ چھپی رہے۔ تب سب اُس سے خفا ہو گیا تھا اور یہ بڑی بات تھی کہ اُسے یہ بھی یقین تھا کہ اُس کے چلے آنے کی خبر سے نُورا کو دُکھ پہنچا ہوگا۔ اور وہ پریشان ہوگی۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے، اِس کے ساتھ ہی وہ اِس سے بھی پریشان تھا کہ مسٹر سنہا اِس پر زیادہ مہربان ہوتے جاتے تھے، دوسرے دِن اُنہوں نے یہ تو نہیں بتایا کہ اُس کے بارے میں اُنہوں نے کیا فیصلہ کیا۔ لیکن اُنہوں نے چار سو روپے نکال کر دیئے کہ کپڑے اپنی پسند سے بنوا لے اور ضرورت کی چیزیں خرید لے۔ اُن کی باتوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اِس میں وہ غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اگر اُس کا باپ ہوتا تو وہ بھی اِس سے زیادہ دلچسپی نہیں لے سکتا۔ جب تک وہ مشن میں مس گرین کی مدد سے پڑھ رہا تھا اُسکے پاس ضرورت کی معمولی چیزیں تھیں لیکن دو دِن میں مسٹر سنہا کے ساتھ رہتے ہی اُسکے پاس ضرورت کی ساری چیزیں تھیں۔ مسٹر سنہا کے نوکروں کا انداز بدل گیا تھا۔ عمر منشی جس نے پہلے دن اُسے دیکھ کر منہ بنایا تھا اُسے ارنسٹ بابو کہنے لگا تھا۔ اور رمضانی خانساماں اُسے صاحب کہنے لگا تھا اور یہ بھی پُوچھا تھا کہ کس وقت کھانے میں وہ کیا پسند کرے گا۔

مسٹر سنہا کی مہربانیاں جتنی بڑھتی جاتی تھیں، اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسٹر سنہا اتنے مہربان کیوں ہوتے جا رہے ہیں، اور کبھی کبھی اُسے یہ خیال بہت ستانے لگتا کہ اگر کسی وجہ سے بھی مسٹر

سنہا بدل گئے تو پھر اُس کا کیا ہوگا؟ تیسرے دِن جب آرتھر سے
اُس کی مُلاقات ہوئی اور اُس نے پُوچھا تو ارنسٹ نے ساری باتیں بتادیں
اور اپنی پریشانی بھی ظاہر کی۔ آرتھر نے اُسے رائے دی کہ وہ مسٹر سنہا سے کہے
کہ اب یونیورسٹی میں داخلے کا وقت آگیا ہے اور اُسے پٹنہ جانا چاہیئے لیکن
ارنسٹ خود سے کوئی بات کہنا نہیں چاہتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ مسٹر سنہا جو کچھ
بھی کر رہے ہیں وہ اُن کی مہربانی ہے اور اُن سے فرمائش کرنے کا اُسے کوئی
حق نہیں ہے۔ یونوس ماسٹر نے کہا کہ وہ جاکر مسٹر سنہا سے کہے گا لیکن
ارنسٹ نے اُسے منع کر دیا۔

رات کے کھانے پر مسٹر سنہا نے اُس سے ایسی بات کہی جس سے وہ
پریشان ہوگیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مسٹر سنہا کیا چاہتے ہیں، اور
وہ جس قدر سوچتا رہا، اُسی قدر اُلجھتا رہا۔ مسٹر سنہا نے اُس سے عجیب
سی بات پُوچھی تھی۔ کیوں؟ انہوں نے کہا تھا۔

"نُورا یہاں آسکتی ہے؟"

اب نُورا سے مسٹر سنہا کو دلچسپی کیوں ہوئی۔ وہ تو خیر مس گرین کے خط
لے کر اُن کے پاس آیا کرتا تھا اور اُسے وہ بچپن سے جانتے تھے۔ لیکن نُورا کو وہ
نہیں جانتے تھے۔ مس گرین صرف کرسمس میں بے ماں باپ کے بچّوں کو
لے کر آتی تھی اور مسٹر سنہا سارے بچّوں کو کیک اور مٹھائی کھلاتے تھے، اور
چھوٹے چھوٹے تحفے دیتے تھے۔ مس گرین کہتی تھی کہ مسٹر سنہا کو بچّوں سے دلچسپی
دِلچسپی اس لئے تھی کہ ان کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا۔ اور کرسمس اِس لئے
مناتے تھے کہ مسز سنہا کی رُوح کو خوشی ہو، اور اس خوشی کے موقع پر وہ سارے
بچّوں کو بُلا لیتے تھے۔ اب وہ آگیا تھا تو مسٹر سنہا کو نُورا سے بھی دلچسپی ہوگئی
تھی۔ اُسے یہ بھی خیال ہوا کہ شاید نُورا سے مسٹر سنہا کی دلچسپی اُسی کی وجہ سے
ہے۔ شاید انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے
ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ دونوں مِل جائیں ورنہ مسٹر سنہا کو نُورا سے اور
کیا دِلچسپی ہو سکتی ہے۔

شام کے وقت ارنسٹ چائے پی کر آرتھر کے گھر جانے کو نکلا ہی
تھا کہ پھاٹک پر مس گرین سے مُلاقات ہوگئی۔ وہ مسٹر سنہا سے ملنے آئی تھی۔
دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہوئے مس گرین نے پُوچھا۔

"تم بھی مسٹر سنہا سے ملنے آئے تھے۔؟"

ارنسٹ مُسکرایا اور بولا۔

"میں تو اُن کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"اچھا۔!"

مس گرین خوشی اور حیرت سے چلّا اُٹھی۔ ارنسٹ نے سارا واقعہ
اُسے بتایا، اور یہ بھی بتایا کہ اُسے ہر طرح آرام ہے۔ لیکن ایک بڑی اُلجھن
ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ مسٹر سنہا اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟
مس گرین نے اُسے دِلاسا دیا۔ مسٹر سنہا ضرور کچھ کریں گے۔ اتنا تو
خود ارنسٹ بھی سمجھتا تھا، لیکن وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ کیا سوچ
رہے ہیں۔ اِس طرح اکیلے اور بے کار بیٹھے رہنا اُسے پسند نہیں تھا۔ وہ
بے کار بیٹھا رہتا یا کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ اور جب جی گھبرا جاتا تھا تو شہر
کی طرف ٹہلنے جایا کرتا تھا۔ مس گرین دیر تک کھڑی باتیں کرتی رہی۔
مسٹر سنہا کچہری سے واپس نہیں آئے تھے۔ اِس لئے مس گرین واپس چلی
گئی۔ اور ارنسٹ آرتھر کے گھر پہنچا۔ آرتھر اُس کا اِنتظار کر رہا تھا۔ وہ یہ جاننے
کے لئے پریشان تھا کہ مسٹر سنہا نے ارنسٹ سے کیا کہا اور وہ ایم اے کرنے کے
لئے اُس کے ساتھ پٹنہ جائے گا یا نہیں۔ لیکن ارنسٹ کو خود بھی معلوم
نہ تھا۔ مسٹر سنہا اُس سے بہت سی باتیں کرتے تھے لیکن یہ نہیں بتاتے تھے
کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اُس نے کئی بار سوچا کہ ہمّت کر کے سوال کرے مگر پُوچھنے
کی ہمّت نہیں ہوئی۔ آرتھر پٹنہ جا کر ایم اے میں داخلہ لینے کی ساری تیاریاں
کر چکا تھا۔ اُسے صرف ارنسٹ کا اِنتظار تھا۔ لیکن ارنسٹ کو خود معلوم نہ تھا،
کیا جواب دیتا۔ آرتھر نے جب اُسے بتایا کہ اب وقت نہیں رہ گیا ہے، اور
چار دنوں میں وہ پٹنہ چلا جائے گا تو اُسے بڑی پریشانی ہوئی۔ لیکن وہ کر
بھی کیا سکتا تھا۔ اُس نے بڑی مایوسی کے ساتھ کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اب ایم اے نہیں کر سکوں گا اور کوئی معمولی
نوکری کر کے زندگی کے دِن کاٹنے ہوں گے۔ مشن سے اُمّید ختم ہو چکی ہے۔
اور مسٹر سنہا کچھ بولتے ہی نہیں۔"

اور دونوں سوچ میں پڑ گئے، اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے
رہے۔ پھر ارنسٹ واپس آگیا۔

رات کے وقت کھانے کی میز پر مسٹر سنہا نے ارنسٹ سے سیدھا سا
سوال کر دیا۔

"اگر نُورا آجائے اور ہم لوگوں کے ساتھ رہے تو تمہارا کیا خیال ہے؟"

ارنسٹ کا دِل دھک سے ہوگیا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کیا
جواب دے۔ اُسے ایسا لگا کہ وہ اُس کا دِل ٹٹول رہے تھے، اُسے
یقین ہوگیا کہ مسٹر سنہا کو نُورا سے اُس کی محبت کا حال معلوم ہو

چکا ہے اور وہ صرف اُسے آزمانے کیلئے پوچھ رہے ہیں۔ مسٹر تنہا نے کہا۔

"اب اکیلا رہتے اچھا نہیں لگتا۔ کبھی کبھی دل گھبرانے لگتا ہے اور چاہتا ہوں کہ کوئی پاس ہو، جو میرا خیال کرے جس سے باتیں کر سکوں اور جس کی کچھ سُن سکوں۔"

ارنسٹ میں نور آنے کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی۔ اور بولا۔

"آپ کی مرضی۔"

مگر اُس کے دل کی کھٹک بڑھتی ہی گئی۔ مسٹر تنہا کو نور آسے دلچسپی کی کوئی وجہ نہیں تھی، پھر بھی وہ دلچسپی دکھا رہے تھے۔ مسٹر تنہا نے کہا۔

"میں نے تم کو اسی غرض سے بلالیا تھا کہ ساتھ رہو۔ لیکن تم ابھی پڑھنا چاہتے ہو۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہاری تعلیم خراب ہو۔ تم ایم اے کرلو بلکہ ساتھ ساتھ بی ایل بھی۔ لیکن سوچتا ہوں کہ تمہارے جانے کے بعد میں پھر تنہا رہ جاؤں گا۔ اس لئے کسی کو ساتھ رکھنا ضروری ہے اور مجھے وہ لڑکی پسند ہے۔"

ارنسٹ کی ایک اُلجھن ختم ہوئی۔ لیکن دوسری اُس سے بھی بڑی اُلجھن نے اُس کو گھیر لیا۔ آخر نور آ ہی سے اُنہیں دلچسپی کیوں ہوئی، اور کسی غیر لڑکی سے اس طرح دلچسپی دکھانا کیسی بات ہے۔ ارنسٹ کا جی چاہا۔ کہہ دے کہ کسی دوسری لڑکی یا لڑکے کو رکھ لیجئے، لیکن پھر اُس کی زبان نہ کھلی۔ وہ چپ رہا۔ مسٹر تنہا بولے۔

"تمہیں کب داخلہ لینا ہے۔"

ارنسٹ نے جواب دیا۔

"اب زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ وقت اور رہ گیا ہے۔"

مسٹر تنہا نے کہا۔

"تم پٹنہ جاکر ایم اے اور لا کالج میں داخلہ لے لو۔ اور جانے سے پہلے ضرورت کی ساری چیزیں بنا ڈالو۔"

ارنسٹ کچھ بھی نہ بولا۔ مسٹر تنہا اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

"اب کل باتیں ہوں گی۔ تم پٹنہ جانے کی تیاری کرو۔"

اور ڈائننگ روم سے نکل کر اپنے آفس میں چلے گئے۔

ارنسٹ اپنے کمرے میں آگیا۔ لیکن اُس کی اُلجھن بڑھتی گئی۔ طرح طرح کی باتیں اُس کے ذہن میں چکر لگاتی رہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ نور آمشن چھوڑ کر آجائے وہ مشن کے قاعدوں کو جانتا تھا۔ اُن لڑکیوں کو مشن کے احاطے سے باہر جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اُن کی حیثیت مشنری عورتوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کو ہر کام اُن مشنری عورتوں کے اشارے پر اُن کی ہدایت کے مطابق کرنا پڑتا تھا۔ بہت دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچا۔ اور وہ یہ کہ مسٹر تنہا اُس پر بہت مہربان ہیں اور اُنہیں نور آسے اُس کی محبت کا حال معلوم ہو گیا ہے اور اسی لئے وہ نور آ کو بھی بلا لینا چاہتے ہیں۔

دوسرے ہی دن سے ارنسٹ پٹنہ جانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔

مسٹر تنہا نے اس طرح اُس کو پٹنہ بھیجنے کی تیاریوں میں دلچسپی لی جیسے اپنا ہی کوئی بزرگ ہو۔ اُس کے پاس اب اتنی چیزیں تھیں، جتنی پہلے کبھی نہیں تھیں۔ اتنا ہی نہیں ارنسٹ کے ساتھ بہت سی چیزیں خرید کر اُنہوں نے آرتھر کو بھی دیں اور ہر ماہ کچھ روپئے کا بھی وعدہ کر لیا، اور دونوں کو پٹنہ میں ایک ساتھ رہنے کی ہدایت کی۔

ارنسٹ نے بہت سوچا کہ آخر مسٹر تنہا کو اُس سے اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ سے اُنہیں نور آ اور آرتھر سے بھی اتنی دلچسپی ہے۔ لیکن کیوں؟ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مسٹر تنہا کے اپنا کوئی بچہ نہیں اور جب عمر زیادہ ہو گئی تو اُنہیں اپنی تنہائی کا احساس ہو رہا ہے۔ جوانی میں بیوی مر گئی۔ اور اُنہوں نے اُس کے غم میں شادی نہیں کی۔ جوانی میں اُنہیں اپنی دوسری دلچسپیوں میں تنہائی کا احساس زیادہ نہیں ہوا۔ لیکن اب جب عمر بڑھ رہی تھی تنہائی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا، جو لوگ، اُن کے ساتھ تھے وہ کم پڑھے لکھے لوگ تھے اور ایسے نہ تھے جن سے باتیں بھی کر سکیں، یا پھر اُن کے اپنے لوگ تھے، بیوی بچے تھے، اور سب اپنے بیوی بچوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ رہنے کا وقت کسی کے پاس نہیں تھا۔ ایک بار اُنہوں نے کوشش کی تھی کہ کسی رشتہ دار لڑکے کو لے کر پالیں۔ لیکن کسی رشتہ دار نے اُنہیں اپنا لڑکا پالنے کو نہیں دیا۔ سارے رشتہ دار اُن کی آزاد خیالی سے نالاں تھے اور کوئی اُن کے یہاں آتا جاتا نہیں تھا اگر کوئی کسی ضرورت سے آتا تھا تو اُن کے یہاں پانی بھی نہیں پیتا تھا۔ اُن کے نوکر مسلمان تھے عیسائی تھے، ادیباسی تھے، اور اُن کے رشتہ دار ہندو تھے، سب کو اپنا مذہب پیارا تھا۔ مسٹر تنہا سے ملنے جلنے یا اُن کو اپنا بچہ دے دینے کا مطلب اُسے بھی مسٹر تنہا کی طرح بے ذات اور بے مذہب بنانا تھا۔

ارنسٹ خوش تھا۔ ساری باتیں اُس کی خواہش کے مطابق ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔

جو اُس پر اتنا مہربان تھا کہ بیچ سمندر میں کشتی کے ٹوٹنے کے بعد اُس نے صرف کنارے پر نہیں پہنچا دیا تھا، بلکہ اُسے پھلوں، پھولوں کے جزیرے میں اُتار دیا تھا۔ اُسے بشپ کی رنجش اور مشن کے احاطے سے باہر نکل آنے کا کوئی غم نہیں رہ گیا تھا۔ مشن سے اُس کا تعلق صرف چرچ تک رہ گیا تھا۔ اُس نے دو بار پادری فریڈی کو راستے میں دیکھا تھا تو اُس کی طرف مخاطب بھی نہیں ہوا تھا اور اُس نے محسوس کیا تھا کہ فریڈی اُس کو دیکھ کر جل اُٹھا تھا۔ مگر اس کی پروا اُسے نہ تھی۔

یکایک اُسے خبر ملی کہ فریڈی کو رانچی سے بہت دُور ایک گاؤں کے مشن میں بھیج دیا گیا۔ بشپ اور دوسرے پادری اُس سے بہت خفا ہو گئے تھے اور اُسے وہاں سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ فریڈی تو بشپ کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ پھر یہ سب کیسے ہو گیا اور وہ پتہ چلانے کیلئے بے چین ہو گیا۔ لیکن وہ مشن کے احاطے کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے ڈروتھی چھوڑتے وقت عہد کر لیا تھا کہ چرچ اور مس گرین کے سوا مشن سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ ایک دو آدمیوں سے اُس نے پوچھا، لیکن پتہ نہیں چلا۔ آخر بشپ کے کلرک عمانوئل کچھپ نے اُسے سب کچھ بتا دیا۔ دو تین لڑکیوں نے بشپ سے شکایت کی تھی کہ فریڈی اُن لوگوں کو چھیڑتا ہے اور ایک لڑکی نے تو اُسے چپل نکال کر مارا تھا اور یہ کہ بشپ تو اُسے نکال دینے والا تھا، لیکن دوسرے پادریوں نے کسی طرح بچا لیا۔ اُسے اپنے کو سدھارنے کا موقع دیا گیا ہے اور اس خبر سے اُسے خوشی ہوئی تھی۔ اُس کی راہ کا کانٹا ہٹ گیا تھا۔

پٹنہ جانے سے ایک دن پہلے یکایک نُورا سے اُس کی ملاقات ہو گئی۔ اُس نے بتایا کہ مس جون اُس سے بہت خفا رہتی ہے اور اس کی وجہ مرتھا ہے۔ مرتھا مس جون کے کان بھرتی رہتی ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُسی نے فریڈی کو مارا تھا، لیکن سارے قصّے کو دبا دیا گیا، مشن کی بدنامی تھی۔ لیکن مرتھا اُس کی دشمن ہو گئی ہے اور اُس نے مس جون کے کان بھرے ہیں۔ مس جون نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر وہ خود کو نہیں سُدھارے گی تو اُسے اسکول سے نکال دے گی اور اس کا مطلب ہو گا کہ اُسے اپنا انتظام کرنا ہو گا، کہیں اور جانا ہو گا۔ اب وہ یتیم لڑکی نہ تھی، بلکہ اسکول میں پڑھانے والی اُستانی تھی اور اُس کی حیثیت اسکول میں کام کرنیوالی اُستانی کی ہے۔

ارنسٹ کو اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی اور اُس نے رائے دی کہ مس جون سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر وہ نوکری سے الگ کر دے، تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہ سیدھی آ کر مسٹر تنہا سے ملے اور وہ اُس کیلئے کوئی بہتر انتظام کر دیں گے۔ اُن کو ان کی ذات سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی خود ارنسٹ سے۔

نُورا کو اس خبر سے خوشی ہوئی وہ جانتی تھی کہ مسٹر تنہا بہت نیک اور شریف آدمی ہیں۔ اکثر لڑکیوں میں اُن کا ذکر آتا تھا وہ غریب بچوّں کی مدد کیا کرتے تھے۔ لیکن اب ارنسٹ اُن کے ساتھ تھا۔ اُنہوں نے اُسے پناہ دی تھی اور اُس کے پڑھنے کا سامان کر رہے تھے، اِس لئے اُس کی دلچسپی مسٹر تنہا سے زیادہ ہو گئی تھی۔ کئی بار اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ مسٹر تنہا سے ملے۔ لیکن مشن کے احاطے سے باہر نکل کر کہیں جانے کی اُس میں ہمّت نہیں تھی۔ البتہ مس جون کے خفا رہنے کے بعد اس میں بہت ہمّت آ گئی تھی اور وہ سمجھنے لگی تھی کہ اب وہ یتیم خانے میں پالی جانے والی لڑکی نہیں رہی بلکہ بڑی ہو چکی ہے اور اسکول میں پڑھانے والی اُستانی ہے۔ اب وہ اپنی مرضی سے ہر کام کر سکتی ہے۔ اب اُس کو مس گرین اور مس جون کی ہدایت کی ضرورت ہے۔ لیکن لڑکیوں کے ہوسٹل میں جو آرام تھا وہ دوسری جگہ نہیں مل سکتا تھا۔

پٹنہ پہنچ کر ارنسٹ نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا اور آرتھر بھی ہوسٹل میں اُس کے ساتھ تھا۔ لیکن ہر وقت وہ اپنے دل کے اندر بے چینی محسوس کرتا تھا۔ نُورا سے دُوری اِس بار زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے اُس نے اتنی زیادہ کسک کبھی محسوس نہیں کی تھی اور یہی مسٹر تنہا سے دور ہو کر محسوس کر رہا تھا۔ مس گرین سے بچپن میں اُسے ماں کی محبّت ملی تھی اور مسٹر تنہا سے باپ کی۔ یہ ایسی محبّت تھی جو اُسے بہت دیر کر کے ملی تھی اسی لئے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ مسٹر تنہا کی محبت کو نزدیک رہ کر اُس نے اتنا زیادہ محسوس نہیں کیا تھا جتنا اُن سے دُور ہو کر محسوس کر رہا تھا۔

اُس نے پٹنہ پہنچ کر مسٹر تنہا کو خط لکھا تھا کہ نُورا کو بھی۔ مسٹر تنہا نے بڑے پیار سے اُسے خط لکھا، ویسا ہی جیسا کوئی سمجھدار باپ خط لکھ سکتا ہے اور اُنہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ایک دن نُورا مس گرین کے ساتھ اُن سے ملی تھی اور وہ چاہتے ہیں کہ نُورا کو بھی اپنے ساتھ رکھیں اور پڑھائیں۔ اِس خبر سے اُسے بڑی خوشی ہوئی تھی اور اُسے یقین ہو گیا تھا کہ مسٹر تنہا کو نُورا سے اُس کی محبّت

کے بارے میں کسی طرح معلوم ہو چکا ہے اور وہ اُسے اُس کے لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اُسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ اب نُورا اور اُس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی۔

نُورا نے اُسے لکھا تھا کہ مس جون اُس سے اُسی طرح خفا ہے اور بات بات پر اُسے بُلا کر ڈانٹتی ہے اور اسکول سے الگ کر دینے کی دھمکی دیتی ہے۔ وہ مس گرین سے ملی تھی اور اُس کے ساتھ ہی ایک دن مسٹر سنہا سے ملی تھی۔ مس گرین نے کہا تھا کہ وہ مسٹر سنہا سے کہیں گی اُس کی بھی مدد کریں اور اُونچی تعلیم دلائیں اور مسٹر سنہا نے سوچنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر وہ مدد دینے پر آمادہ ہو گئے تو وہ بھی مزید تعلیم کیلئے پٹنہ چلی جائے گی لیکن ابھی تک مسٹر سنہا نے صاف لفظوں میں کوئی بات نہیں کہی تھی۔ وہ جلدی کوئی بات کہنے کے عادی نہیں تھے۔ ارنسٹ اسے اچھی طرح جانتا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ وہ نُورا کو اپنے پاس بُلا لیں گے اور اُونچی تعلیم ضرور دلائیں گے۔

ارنسٹ کبھی کبھی بڑے بڑے سہانے خواب دیکھا کرتا تھا۔ لیکن ایک نئی الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اُس کی یہ اُلجھن اُس سے بھی زیادہ تھی۔ جب اُسے مس گرین نے مشن کے احاطے سے باہر چلے جانے کی رائے دی تھی وہ اک رات میں ختم ہو گئی تھی۔ وہ رات جتنی تاریک تھی صُبح اُس سے زیادہ روشن اور سنہری تھی۔ لیکن یہ اُلجھن ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ بڑھتی ہی جاتی تھی۔

ایم اے کلاس میں اُس کے ساتھ ایک لڑکی تھی فلورا رائے۔ یہ بنگالی عیسائی تھی اور اچھی طالب علم تھی۔ گوری، خوبصورت اور ہنس مکھ لڑکی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ فلورا اُس کی طرف زیادہ متوجہ تھی اور آرتھر فلورا کی طرف۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر فلورا اور آرتھر میں دوستی ہو جائے اور ان کی شادی ہو جائے تو اچھا ہو۔ آرتھر اُس کا اکیلا دوست تھا۔ کوئی دوسرا دوست اُس نے نہیں بنایا تھا اور اُس کے جذبات سے اُسے بڑی ہمدردی تھی۔ فلورا اُس سے بار بار ملتی تھی۔ باتیں کرتی تھی۔ اور اپنے گھر بُلاتی تھی۔ اُس کا باپ سکریٹریٹ میں اچھی جگہ پر مُلازم تھا۔ لیکن یہ بات اُسے زیادہ پریشان کرتی تھی۔ اُسے فلورا سے ہمدردی تھی۔ اُس کی ساتھی تھی۔ لیکن اُسے نُورا سے محبت تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ فلورا کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔ دوسری طرف اُس کا دوست آرتھر تھا۔ وہ اسے اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ آرتھر فلورا سے محبت کرنے لگا ہے۔ آرتھر نے اُس سے کبھی کہا نہیں تھا۔ لیکن اُس کی ہر بات سے یہ ظاہر تھا کہ وہ فلورا کو اپنانا چاہتا ہے لیکن فلورا اُس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ بس کلاس کے ساتھیوں میں جس طرح وہ دوسروں سے ملتی تھی اُسی طرح اُس سے بھی ملتی تھی۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ آرتھر اُداس اُداس اور ایک کمرے میں ساتھ رہ کر بھی اُس سے الگ الگ رہنے لگا تھا۔ یہ بات اُسے کھٹکی بھی تھی۔ لیکن وہ کیا کرتا۔ اُسے اپنے اوپر بھروسہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا اور سمجھتا تھا کہ وہ فلورا سے نہ محبت کرتا ہے اور نہ کرے گا، وہ اپنی محبت نُورا کو دے چکا ہے۔ لیکن فلورا سے صاف لفظوں میں کہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اِس سے اُس کا دل ٹوٹ جاتا اور اُسے یہ پسند نہ تھا۔ لیکن فلورا سے اُس کا میل جول آرتھر کا دل توڑ رہا تھا، وہ عجیب کشمکش میں تھا۔ اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

آخر اُس سے ضبط نہیں ہوا۔ ایک دن فلورا نے اُس سے ارنسٹ کے سامنے کہا کہ اُس کے بھتیجے کا جنم دن ہے اور وہ کھانے میں اُن لوگوں کے ساتھ ضرور شریک ہو۔ اُس نے آرتھر کو بھی دعوت دی تھی لیکن آرتھر اور ارنسٹ دونوں نے محسوس کیا تھا کہ آرتھر کو اُس نے اِس خوش دلی اور جوش کے ساتھ نہیں کہا تھا جیسے ارنسٹ سے کہا تھا۔ آرتھر نے اُس سے کہا تھا کہ شریک نہیں ہو سکے گا اُسے کچھ ضروری کام ہیں اور ارنسٹ اُلجھن میں پڑ گیا کہ وہ دعوت قبول کرے یا نہیں کرے۔ وہ چُپ رہا تھا۔ لیکن فلورا نے اتنی ضد کی کہ اُسے ہاں کہنا ہی پڑا تھا۔

رات کے وقت جب ارنسٹ فلورا کے یہاں سے کھانا کھا کر واپس آیا تو آرتھر سو رہا تھا۔ اتنا سویرے سو جانا آرتھر کی عادت کے خلاف بات تھی۔ اُس نے آرتھر کو پکارا، مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے پھر پکارا تو آرتھر اُٹھ بیٹھا۔ لیکن بالکل چُپ رہا۔ ارنسٹ اُس کے پاس گیا اور بولا۔

"تم اتنا سویرے سو گئے۔"

آرتھر نے جواب دیا۔

"طبیعت اچھی نہیں لگتی۔ شاید بُخار ہے۔"

ارنسٹ نے آرتھر کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اُسے بُخار تھا۔ وہ پریشان ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ آرتھر کو کسی اور وجہ سے بُخار نہیں آیا بلکہ اُس کو رنج پہنچا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ادی باسی لڑکے بہت سیدھے سادے ہوتے ہیں اور جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو ٹوٹ کر۔ اور اس کے علاوہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور یہی حال آرتھر کا بھی تھا۔ وہ فلورا سے محبت کرنے لگا ہے۔ اور فلورا اُس کی طرف خاص طور پر متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی ساری توجہ اُس کی طرف ہے اور وہ فلورا کو محبت نہیں دے

سکتا۔ لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس سے ایسی بات کہے جس سے اُس کو رنج ہو۔

وہ آرتھر کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس سے کیا کہے، لیکن اُس نے ضروری سمجھا کہ ساری باتیں کہہ کر اپنا دل ہلکا کرے اور اُس نے کہنا شروع کیا۔

"سنو آرتھر، مجھے فلورا سے کوئی خاص دل چسپی نہیں۔ اور اُس سے بیاہ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، کہ میں تم سے سب کچھ کہہ چکا ہوں۔ مجھے نُورا سے محبت ہے اور ہم دونوں طے کر چکے ہیں کہ شادی کریں گے۔ کسی دوسری عورت کا خیال بھی میرے دماغ میں نہیں آ سکتا۔ لیکن فلورا ہم لوگوں کی ساتھی ہے اور کلاس میں ہم تینوں کے علاوہ کوئی اور عیسائی نہیں ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کسی سے وہ نہیں ملتی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہارا خیال کرے، تمہاری محبت کا جواب محبت سے دے۔ لیکن جانتے ہو، یہ زبردستی کی بات نہیں۔ اگر اُس سے میرا ملنا تم کو ناگوار ہے تو میں کل سے اُس سے ملنا اور باتیں کرنا چھوڑ دوں گا۔"

ارنسٹ نے اپنا دل ہلکا محسوس کیا۔ آرتھر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ارنسٹ بولا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو، میں کیسی طبیعت کا آدمی ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ ہزاری باغ میں کئی لڑکیاں مجھ سے قریب آنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں سب سے الگ رہتا تھا۔ لیکن فلورا سے الگ ہونا بھی ممکن نہیں، وہ روزانہ آتی ہے۔ ایک کلاس میں ہے، اُس کی وجہ سے اگر ممکن ہوتا تو کلاس چھوڑ دیتا۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔۔۔۔"

آرتھر بولا۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ ــ اِس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ میری کمزوری ہے کہ اپنے دِل میں اُس کے لئے کسک محسوس کرتا ہوں اور وہ نہیں محسوس کرتی۔ میں ادیباسی ہوں۔ میں کالا ہوں وہ گوری ہے، خوبصورت ہے۔ تم خوبصورت ہو۔ وہ سمجھتی ہے کہ مسٹر سنہا کے بیٹے ہو۔ ادیباسی نہیں ہو۔ یہ غلطی میری ہے کہ میں نے غلط محسوس کیا۔ تمہاری کوئی غلطی نہیں۔ اب میں بھی اُس کے خیال کو اپنے دل سے نکال دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔

آرتھر بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ ارنسٹ پریشان تھا۔

آرتھر اُس کا دوست تھا اور اُسے اُس سے محبت تھی۔ فلورا سے بھی اچھے تعلقات تھے، اُس نے کئی بار سوچا تھا کہ اگر فلورا اور آرتھر کے تعلقات اتنے قریبی ہو جائیں کہ دونوں بیاہ کر لیں تو پھر بہت اچھا ہو۔ لیکن یہ اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ دونوں کے درمیان دو بڑی رکاوٹیں تھیں ایک تو ادیباسی تھا، دوسرے کیتھولک، اور فلورا بنگالی تھی، دوسرے پروٹسٹنٹ۔ اور سب سے آخری بات تھی کہ فلورا اُس کی طرف متوجہ نہیں تھی اور کسی کو زبردستی کسی کی طرف متوجہ نہیں کرایا جا سکتا۔ اُسے اس صورت سے بے حد دکھ تھا لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر کپڑے اُتارنے لگا۔ ذرا دیر کے بعد آرتھر بولا۔

"تمہارے خط سرہانے رکھ دیئے ہیں۔"

"ارنسٹ نے سرہانے سے خط نکالے، دو خط تھے، اُس نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ایک خط مسٹر سنہا کا تھا، دوسرا نُورا کا۔ اُس نے بیٹھ کر دونوں خطوں کو پڑھا۔ دونوں نے ایک ہی بات لکھی تھی۔ مسٹر سنہا نے لکھا تھا کہ تمہارے جانے کے بعد تنہائی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی اور میں نے مسز گرین سے باتیں کیں اور نُورا کو مانگ لیا اب وہ میرے ساتھ ہے اور نُورا نے لکھا تھا کہ مسز گرین نے اُس سے کہا تھا کہ مسٹر سنہا اُسے بیٹی بنا کر اپنے ساتھ رکھنا اور پڑھانا چاہتے ہیں۔ اُس نے اِسکول کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ مسٹر سنہا کے ساتھ اُن کی کوٹھی میں رہتی ہے، اور کہیں باہر جا کر کالج میں نام لکھوانے کا پروگرام بن رہا ہے۔

ارنسٹ کو دونوں خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ساری باتیں اُس کے لئے خود بخود آسان ہوتی جا رہی تھیں۔ مسٹر سنہا نے اُسے ایسے پیار کے ساتھ رکھا جیسے وہ اُن کا ہی لڑکا ہو، اور اب نُورا کو اُنہوں نے بیٹی بنا کر اپنے پاس بُلا لیا ہے اور وہ سرِ دست اُن کی دیکھ بھال، خدمت اور اُنہیں زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ مسٹر سنہا اُس کو ویسے ہی مانتے ہیں جیسے وہ اُن کی اپنی بیٹی ہو۔ بس ایک اُلجھن رہتی ہے اور وہ یہ کہ مسٹر سنہا زیادہ بولتے نہیں۔ ایک تو اُن کو اپنے کاموں اور پڑھنے سے فرصت نہیں ملتی، دوسرے وہ زیادہ باتیں کرنے کے عادی نہیں ہیں اور اُس کو اپنی پُرانی ساتھیوں سے ملنے کا موقع نہیں ملتا۔

ارنسٹ یہ باتیں اچھی طرح جانتا تھا اور دس بارہ دنوں

تنگ تنہائی کی قید سی محسوس کر چکا تھا۔ مسٹر تنہا کے ساتھ رہنے میں یہ
بڑی الجھن تھی۔ لیکن یہ ساری باتیں اُس کے دماغ سے نکل گئیں
اور آرتھر اور فلورا کے بارے میں سوچنے لگا۔ کپڑے بدل کر جب وہ
بستر پر لیٹا تو اُس کے دماغ میں کوئی دوسری بات نہیں تھی۔ فلورا کو
آرتھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن یہ اُس کے بات نہیں تھی۔ کسی کے دل پر
کسی کو اختیار نہیں۔ البتہ اُس نے یہ طے کر لیا کہ فلورا سے ملنا جلنا کم کر دیگا
اور اگر ضرورت ہوئی تو بالکل ترک بھی کر دے گا۔

دوسرے دن کلاس میں فلورا سے ملاقات ہوئی۔ وہ مسکراتی
ہوئی اُس کی طرف بڑھی، لیکن وہ کترا کر دوسری طرف چلا گیا۔ اُس
نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ فلورا سے اُتنا ہی ملے گا کہ آرتھر کو اُس
کی طرف سے کسی طرح کا شک نہ ہو۔ فلورا کو اُس سے محبت کرنے پر
مجبور کرنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی طرف سے چاہتا تھا
کہ آرتھر کا دل صاف ہو جائے، اور بس۔!

فلورا نے پہلی بار سمجھا کہ ارنسٹ نے اُسے دیکھا نہیں۔ دوسری بار
بھی یہی سمجھی۔ پھر سمجھی کہ کوئی ضروری کام ہوگا۔ لیکن بار بار اسی طرح کترا
کر نکل جانے اور الگ الگ رہنے سے اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اُس سے الگ
رہنا چاہتا ہے۔ اس سے اُس کو دلی تکلیف ہوئی۔ لیکن کیا کرتی اُسے
ارنسٹ سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ اُس نے بھی کنارے کنارے رہنا شروع
کر دیا۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، وہ آرتھر کی طرف مخاطب نہیں
ہوئی۔ بلکہ وہ سختی کے ساتھ کلاوتی اور منورما کے ساتھ رہنے لگی۔ یہ دو
لڑکیاں ساتھ تھیں۔ ارنسٹ اپنے اس طریقے پر نادم تھا۔ سوچتا تھا کہ
اس کا کیا فائدہ۔ اور فلورا کو اُس کی اس ترکیب سے تکلیف ضرور
پہنچی ہوگی اس کا اُسے افسوس بھی تھا۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ
آرتھر کے دل پر اُس کی طرف سے میل پیدا ہو۔

ایک دن ارنسٹ لائبریری میں اکیلا بیٹھا ایک کتاب سے
کچھ نوٹ لے رہا تھا کہ فلورا آ گئی اور دوسری کرسی کھینچ کر اُس کے پاس
بیٹھ گئی۔ لائبریری میں اور کوئی نہ تھا۔ صرف لائبریرین دُور
بیٹھا تھا۔ فلورا نے کسی جھجک کے بغیر سوال کر دیا۔

"کیا بات ہے، کچھ خفا ہو۔"

"نہیں تو ـــ"

"پھر تم ملتے نہیں، اور میں نے محسوس کیا ہے کہ میں نے ملنا
چاہا تو تم کترا کر دوسری طرف چلے گئے۔ آخر کیا بات ہے۔؟"

تھوڑی دیر تک تو اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُس کو کیا جواب دے۔
لیکن پھر اُس نے ہمت کی۔ چاروں طرف دیکھا جب اُسے یقین ہو گیا کہ
کوئی اور نہیں ہے، تو بولا۔

"فلورا! بات یہ ہے کہ تم بہت اچھی دوست ہو۔ میں تمہاری دوستی
کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن کئی حیثیتوں سے میری اور تمہاری یہ دوستی غلط
ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری دوستی جہاں ہے اُس سے آگے بڑھے۔ اسے
اور صاف لفظوں میں کہوں۔ میں تم سے محبت اس اصطلاح میں نہیں
کر سکتا جسے ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کے درمیان محبت کہا جاتا ہے۔
میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور آج سے نہیں بلکہ اُس زمانے سے جب
ہم دونوں بچے تھے۔ بچپن کی محبت اب آخری صورت اختیار کر چکی
ہے اور ہم دونوں نے شادی کرنے کا عہد کر لیا ہے، اُس لڑکی کا نام نورا
ہے اور میں اُس کو دھوکا نہیں دوں گا۔ ویسی محبت تم سے نہیں ہو سکتی۔
دوسری بات یہ ہے کہ آرتھر میرا دوست ہے اور دُنیا بھر میں میرا کوئی
دوسرا دوست نہیں اور وہ تم سے بُری طرح محبت کرتا ہے ـــــ۔"

فلورا ارنسٹ کو تکتی رہی اور ارنسٹ نظر اُٹھا کر اُسے دیکھے بغیر
سر جھکائے بولتا رہا۔

"ـــ تم میری ساتھی ہو، دوست ہو اور بہت اچھی لڑکی ہو۔
میں تمہیں دھوکا دینا نہیں چاہتا کہ تم کو مجھ سے شکایت ہو۔۔۔۔"

میں تم کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ تم نے دو لفظوں میں میرے خوابوں
کے محل کو مسمار کر دیا۔"

ارنسٹ بولا۔

"میں تم کو فریب دینا نہیں چاہتا فلورا۔ یہ بات میری طبیعت
کے خلاف ہے۔ میں نے آج تک کسی کو دھوکا نہیں دیا ہے اسی لئے الگ
رہنا چاہتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم میرے بارے میں غلط
رائے قائم کر رہی تھیں۔"

فلورا نے لمبی سانس لی جسے اُس نے سُنا۔ وہ بولتا گیا۔

"اور بھی باتیں ہیں۔ تم کو بتا دوں۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں، کہ
میرے ماں باپ کون ہیں۔ مجھے ہسپتال سے لایا گیا تھا۔ ایک
مشنری لیڈی نے مجھے پالا ہے اور اب مشن میں بھی نہیں ہوں۔"

ایک نیک اور شریف آدمی مسٹر سنہا مجھے پڑھنے کا خرچ دے رہے ہیں۔ وہ ہندو ہیں اور میرے کوئی بھی نہیں، صرف مدد کے خیال سے پڑھا رہے ہیں ۔۔ اور ......!"

وہ ذرا دیر کے لئے رُکا۔ اُس نے گردن اُٹھائی، فلورا کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں اور چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ بولتا گیا۔ "تمہارے ماں باپ دولت مند ہیں۔ تم عیش و آرام میں پلی ہو۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ غریب سے بھی کچھ بدتر۔ میں کسی لحاظ سے تمہارے لائق نہیں ہوں۔"

فلورا ایک لفظ نہیں بولی۔ اُس نے پھر لمبی سانس لی۔ اُٹھی اور تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی لائبریری سے باہر چلی گئی۔

ارنسٹ نے محسوس کیا کہ اُس نے فلورا سے وہ باتیں کہی ہیں جو اُسے نہیں کہنی چاہیئے تھیں۔ لیکن ایک دن اُس کو ختم کرنا ہی تھا۔ فلورا کو دھوکے میں رکھنا بھی غلط تھا اور یہ پردہ ایک دن چاک ہونا ہی تھا۔ اُس نے اپنا دل ہلکا محسوس کیا۔ لیکن فلورا کے جانے کے بعد اُس کی طبیعت نوٹ لینے میں نہیں لگی اور وہ بھی لائبریری سے نکل گیا۔

ارنسٹ کئی دنوں تک کالج جاتا تو فلورا سے دُور دُور رہتا۔ اسی درمیان اُسے نُورا کا خط مِلا کہ مسٹر سنہا نے اُسے الٰہ آباد مشن کالج میں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہاں وہ ہوسٹل میں رہے گی اور کالج میں پڑھے گی۔ پٹنہ میں لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں تھا اور نہ ہوسٹل ہی تھا اور عام طور پر پڑھنے والی لڑکیوں کو بہار سے باہر جانا پڑتا تھا۔ اسی میں یہ بھی لکھا تھا کہ کس دن وہ رانچی سے دوسری لڑکیوں کے ساتھ روانہ ہوگی اور کب الٰہ آباد پہنچے گی۔ مس گرین خود کئی لڑکیوں کو لے کر الٰہ آباد جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ یہ موقع اچھا ہے۔ وہ فلورا کو ریلوے اسٹیشن لے جا کر نُورا سے ملا دے تاکہ یہ نہ سمجھے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ لیکن فلورا سے بات کرنے کی اُسے ہمت نہیں ہوئی۔

وقت گزرتا گیا۔ ایک سال ختم ہو گیا۔ ارنسٹ کا ایم اے آخری سال تھا۔ اور وہ دن رات امتحان کی تیاریاں کر رہا تھا اور بار بار سوچتا تھا کہ ایم اے کر لینے کے بعد وہ کسی طرح مسٹر سنہا سے کہہ دے گا کہ وہ نُورا سے بیاہ کرنا چاہتا ہے اور نُورا اُس سے۔ اور وہ دونوں کو اپنے بچوں کی طرح چاہتے ہیں۔ اس لئے اُن کو خبر دینی اور اُن کی رائے جاننا ضروری ہے۔ کئی دنوں تک وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ اُن سے کس طرح کہے گا۔ آخر میں اُسے ایک صُورت نظر آئی تھی اور وہ مس گرین سے مدد لینے کی بات تھی۔ مس گرین دونوں کو جانتی تھی اور وہ اُس سے پہلے کہہ چکا تھا اور مس گرین نے اُسے بُرا نہیں کہا تھا اِس کا مطلب تھا کہ وہ اُسے پسند کرتی تھی۔ اور اُسے دونوں کو بیاہا دیکھ کر خوشی ہوگی۔ اُسے یقین تھا کہ مس گرین ہی یہ بات مسٹر سنہا سے کہے گی۔ اور مسٹر سنہا دونوں کا بیاہ کر کے بہت خوش ہوں گے، اتنے دِنوں میں اُس نے محسوس کیا تھا کہ مسٹر سنہا اُسی خوشی کے ساتھ اُس کے سارے اخراجات برداشت کرتے تھے، جیسے اپنے بچّے کے لئے۔ اور مسٹر سنہا کے لئے اُس کے دِل میں ویسی ہی عزّت اور ویسا ہی احترام کا جذبہ تھا۔ جیسا اپنے باپ کے لئے۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی ماں کون تھی اور باپ کون تھا۔ مگر مس گرین کی صُورت میں اُسے ماں مِل گئی تھی اور مسٹر سنہا کی صورت میں باپ۔

آرتھر فلورا کی طرف سے مایوس ہو کر کچھ دن تو اُداس اُداس رہا۔ لیکن اُسے ارنسٹ کی دوستی کا پکّا بھروسہ ہو گیا۔ ارنسٹ سے اب فلورا کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسا کلاس کے دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ تھا اور اُس کی وجہ سے اُس کے دِل کی کسک میں بھی کمی آگئی تھی اور ایک کیتھولک خاندان میں اُس کا آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ مس نارمن ایک پریس کے مینیجر تھے اور کیتھولک تھے، آرتھر کی ملاقات اُن لوگوں سے چرچ میں ہوئی تھی اور ملنا مِلانا بڑھ گیا تھا۔ مسٹر نارمن کی ایک لڑکی تھی روزی۔ اور اُس سے آرتھر کی دوستی ہو گئی تھی۔ ارنسٹ کبھی مسٹر نارمن کے یہاں نہیں گیا تھا اور کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ خود آرتھر نے اُسے بتایا کہ روزی سے اُس کی دوستی ہو گئی ہے۔ اُس نے تعریف کی تھی کہ روزی بہت اچھی لڑکی ہے۔ کلکتہ میں بی اے میں پڑھتی ہے اُس کا بھی آخری سال ہے اور اُس نے طے کر لیا ہے کہ امتحان کا نتیجہ معلوم ہو جانے کے بعد اُس سے بیاہ کر لے گا۔ اِس خبر سے ارنسٹ کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اب فلورا کا جادو اُس کے سر سے اُتر گیا ہے اور وہ مطمئن ہے۔ لیکن وہ خود اپنے لئے پریشان تھا، وہ پٹنہ میں تھا اور نُورا الٰہ آباد میں تھی۔ دونوں میں خط و کتابت ہوتی رہتی تھی، دونوں ایک دوسرے کے بارے میں ہر بات جانتے تھے، اور خوش تھے۔

دونوں کی زندگی توقع کے خلاف بہتر سے بھی بہتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مس گرین نے ایک خط میں اُسے لکھا تھا۔ اُس کی باتیں مسٹر سنہا سے ہوتی رہتی ہیں اور دونوں سے بہت خوش ہیں اور مس گرین کو یقین تھا کہ مسٹر سنہا مرنے سے پہلے دونوں کیلئے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں، اگر ساری جائداد نہیں تو بھی اُن دونوں کو کافی روپے اور کچھ جائداد ضرور دیں گے۔ نُورا نے بھی اپنے خطوں میں ایسی ہی باتیں لکھی تھیں۔ مس گرین نے اُسے بھی خط میں یہی سب کچھ لکھا تھا۔

زندگی آرام اور خوشی کے ساتھ گزر رہی تھی۔ ایک دن ارنسٹ شام کے وقت باہر سے آیا تو اُس نے دیکھا، آرتھر پلنگ پر مُنہ لپیٹے پڑا ہے۔ اُس نے آرتھر کو اُٹھایا۔ آرتھر کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ وہ بہت گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ارنسٹ نے گھبرا کر پُوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

آرتھر نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم ڈیوڈ کو جانتے ہو نا۔ وہی جو ریلوے میں گارڈ ہے آیا تھا اور کہہ گیا ہے کہ اگر روزی سے ملنا جلنا نہیں چھوڑو گے تو تمہارے حق میں بہت بُرا ہوگا۔"

ارنسٹ نے اُسے دلاسہ دیا۔

"وہ مذاق کر رہا ہوگا۔ اُس کا تو بیاہ ہو چکا ہے اُسکے بیوی بچے ہیں،"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں، مگر وہ کہہ رہا تھا کہ بیوی کو طلاق دے دے گا۔ اور اُس سے شادی کرے گا۔"

"اور روزی کیا کہتی ہے۔"

"روزی کچھ نہیں بولتی۔"

"تم سے اب بھی اسی طرح ملتی ہے یا بدلی ہوئی ہے۔"

"بہت بدل چکی ہے، چُپ اور کھوئی کھوئی سی رہتی ہے کچھ نہیں بولتی۔"

یہ نئی پریشانی تھی۔ آرتھر اس قدر کمزور دل کا تھا کہ جلد ہی کسی لڑکی پر پھسل جاتا تھا اور اُس کا اثر لیتا تھا۔ پہلے اُس نے فلورا کا اثر لیا تھا۔ لیکن جلد ہی بات ختم ہو گئی تھی۔ اب یہ دوسری مصیبت تھی۔ اُس نے سوچا کہ روزی سے بات کرے گا۔ اور اس کی رائے جاننے کی کوشش کرے گا۔ اگر روزی نے خود ہی ارادہ بدل دیا ہے تو بات ختم ——— اگر صرف ڈیوڈ چاہتا ہے اور روزی نہیں چاہتی تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن آرتھر کی اس عادت سے وہ پریشان تھا کہ جب کوئی لڑکی اُس سے ذرا ہنس کر بات کر لیتی ہے تو اُس سے متاثر ہو جاتا ہو جاتا ہے اور اُس کے لئے اپنے دل میں کھلبلی محسوس کرنے لگتا ہے اُس نے ذرا زور دے کر کہا۔

"سُنو پیارے، پہلے ایم اے کر لو۔ عشق کرنے کو ساری زندگی پڑی ہوئی ہے۔ اگر اس چکر میں تمہارا ایم اے خراب ہوا تو سب دھرا رہ جائے گا۔ تم پہلے اپنا اور اپنے بوڑھے باپ کا خیال کرو۔ روزی اگر واقعی تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہے تو ڈیوڈ اُسے نہیں روک سکتا اور اگر وہ ڈیوڈ سے بیاہ کرنا چاہتی ہے تو تم اُسے نہیں روک سکتے، اِس لئے اِس معاملے کو ابھی اُٹھا رکھو۔ ایم اے کر لینے کے بعد سوچنا۔"

"لیکن لیکن میں روزی کو کیسے بھلا دوں۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"

"ایک کام کرو۔ اُسے بھلانے کی ضرورت نہیں، بس تم اپنی کتابوں میں لگ جاؤ اور اُس کے یہاں جانا کم کر دو۔ مفت میں وقت خراب ہوتا ہے۔"

"وہ تو کل کلکتہ چلی بھی گئی۔ اس لئے اُس کے گھر جانے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ روزی ڈیوڈ سے بیاہ نہیں کرے گی، تم سے کرے گی۔ اس کی ذمّہ داری میں لیتا ہوں۔ لیکن تم اپنا پڑھنا خراب مت کرو۔ ایم اے سے پہلے تو بیاہ کرنے کا تمہارا بھی ارادہ نہیں ہے۔"

آرتھر کی سمجھ میں بات آ گئی اور بولا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔"

ارنسٹ کو ذرا اطمینان ہوا، اگرچہ وہ ڈرتا تھا کہ اب روزی کے جانے کے بعد آرتھر کہیں کسی دوسری لڑکی پر نہ مرنے لگے، اُس کی یہ کمزوری ایسی تھی کہ اُس پر اُسے ہنسی بھی آتی تھی، اُلجھن بھی ہوتی تھی، اور غصّہ بھی آتا تھا لیکن آرتھر کے لئے خود اُس کے دل میں کمزوری تھی۔ اُس کی ہر بات سے وہ اثر لیتا تھا۔ وہ خوش رہتا تھا تو اُسے خوشی ہوتی تھی اور وہ رنجیدہ رہتا تھا تو اُسے رنج ہوتا تھا۔ آرتھر اُٹھ بیٹھا اور بولا۔

"میں نے ساری باتیں دماغ سے نکال دی ہیں اور اب صرف ایم اے پاس کر لینے کی بات سوچوں گا۔" آرتھر کا یہی حال تھا تھوڑی دیر میں اُس کا فیصلہ بدل جاتا تھا۔ آرتھر کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔

دوسرے ہی دن آرنسٹ کو مسٹر سنہا کا خط مِلا۔ اُنہوں نے

بڑے پیار سے خط لکھا تھا کہ اُنھوں نے اپنی ساری جائداد اُس کے اور نورآ کے نام وصیّت کردی ہے اور وصیّت نامہ جج کے حوالے کردیا ہے اور یہ اِس لئے کیا ہے کہ اُن کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ وہ روز بروز اپنی تنہائی کو زیادہ شدّت کے ساتھ محسوس کرنے لگے ہیں اور اُن دونوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ کرسمس کی تعطیل میں ضرور آؤ۔ نورا کو بھی خط لکھ کر اُنہوں نے بُلایا تھا۔

مسٹر سنہا کا خط پڑھ کر ارنسٹ کو خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی ہوا اب وہ مجبور نہیں تھا۔ مسٹر سنہا نے اُسے محبّت دی تھی اور جائداد بھی دی تھی نورآ بھی اب نوکری کرنے پر مجبور نہیں تھی، اُسے یہ یقین تھا اور کرسمس میں دونوں کو بُلانے کا مطلب وہ یہی سمجھا کہ مسٹر سنہا دونوں کی شادی کرادینا چاہتے ہیں۔ اِس موقع پر اُن دونوں کے بیاہ کا اِعلان کرادیں گے، اُسے یقین تھا کہ مس گرین نے اُنہیں ضرور بتایا ہو گا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہیں اور بیاہ کرنے کا فیصلہ کرچکے ہیں اور رنج اِس بات کا تھا کہ مسٹر سنہا نے اپنی صحت کی خرابی کے بارے میں لکھا تھا۔ ساری چیزیں ہونے پر بھی مسٹر سنہا جیسی بے غرض محبت اُسے کہاں سے مِل سکتی تھی۔

ارنسٹ نے ساری باتیں آرتھر کو بتائیں، وہ بھی خوش ہوا۔ اور اُس نے بھی کرسمس میں رانچی جانے کا پروگرام بنالیا۔

ارنسٹ کی زندگی پھولوں کے راستے سے ہو کر گُزر رہی تھی۔ اب ڈیڑھ برسوں کے اندر وہ، وہ نہیں رہا تھا جو پہلے تھا۔ پہلے جتنا بے سہارا تھا اب اُتنا ہی مضبوط حیثیت کا مالک تھا۔ یہی نہیں کہ مسٹر سنہا کی محبّت اُسے حاصل تھی، مسٹر سنہا نے اپنی جائیداد کا مالک بھی اُسے بنادیا تھا۔ آدمی جانتا تھا کہ مسٹر سنہا نے اُسے اپنا بیٹا اور نورآ کو اپنی بیٹی بنالیا ہے اور یہ دونوں مِل جائیں گے، ساری جائداد اُن دونوں کی ہوگی۔ اور شہر کے دولت مند لوگوں میں ہوں گے۔

کرسمس سے چار دن پہلے وہ رانچی پہنچا۔ نورآ ایک دِن پہلے ہی الٰہ آباد سے آگئی تھی۔ مسٹر سنہا ہندو تھے۔ لیکن یہ دونوں عیسائی تھے۔ اُنہوں نے کبھی یہ اثر اُن پر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ عیسائی ہیں، تو اُن سے کچھ دُوری محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ایک بڑی بات ضرور تھی اور وہ یہ کہ مسٹر سنہا کی صحت اچھی نہیں تھی، وہ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ علاج چل رہا تھا۔ کوئی خاص بیماری نہیں تھی۔

لیکن طبیعت گڑبڑائی رہتی تھی۔ بھوک مرگئی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ کوئی خاص مرض نہیں لیکن وہ روز بروز کمزور ہوتے جارہے تھے۔

ارنسٹ اور نورآ ایک بار ساتھ ہوگئے تھے، آزادی کی فضا میں اُن پر کوئی پابندی نہیں تھی، دِن رات ساتھ رہتے تھے اور کبھی کبھی آئندہ کے بارے میں پروگرام بناتے تھے۔ دونوں خوش تھے۔

ایک دِن چائے کے وقت مسٹر سنہا نے کہا۔

" آج رات کے وقت مس گرین کو بھی کھانے پر بُلایا ہے، اور اُس کے سامنے تم دونوں سے باتیں کرنی ہیں۔ تم دونوں جانتے ہو کہ میں نے تم دونوں کو بیٹا بیٹی بنالیا ہے، اپنی ساری جائداد تم لوگوں کو دے دی ہے۔ اور تم ہی دونوں میرے لئے سب کچھ ہو۔ مگر میں تم دونوں سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں اور مس گرین کے سامنے۔ تاکہ تم دونوں کو آئندہ کوئی اُلجھن نہ ہو۔ "

دونوں اُن کی باتیں سُنتے رہے، دونوں خوش تھے۔ اب آخری بات سوائے دونوں کی شادی کے اور کیا ہوسکتی ہے۔ اب یہی ایک بات رہ گئی تھی اور قدرتی طور پر مسٹر سنہا چاہتے ہوں گے کہ اُن کے سامنے یہ بات بھی طے ہوجائے گی۔ مس گرین کو اُنہوں نے اِسی لئے بُلایا تھا۔

رات کے وقت خاص طور سے نورآ نے تکلّف سے بنوایا تھا۔

مس گرین نے اُسے پالا تھا اور ماں کی محبّت دی۔ پہلا موقع تھا کہ وہ اُس کے لئے کچھ کرسکتی۔ اب وہ صرف مسٹر سنہا کی طرف سے یہ تیاری نہیں کررہی تھی بلکہ ارنسٹ اور اپنی طرف سے بھی۔ اور یہ خوشی کا موقع بھی تھا۔ کرسمس کے دِن نزدیک تھے اور مسٹر سنہا دونوں کی شادی کے بارے میں مس گرین سے باتیں کرنے والے تھے۔

کھانے کی میز پر مسٹر سنہا کچھ بھی نہیں بولے، چپ چاپ کھانا کھاتے رہے، وہ کچھ فکرمند بھی تھے اور کچھ خوش بھی۔ کسی کو اندازہ نہ تھا کہ مسٹر سنہا کیا کہنے والے ہیں۔ کھانا ختم ہوگیا۔ کافی آئی اور سب نے پی۔ پھر بھی مسٹر سنہا کچھ نہ بولے۔ مس گرین نے کہا۔

"آپ کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔ "؟

"ہاں۔ ابھی کہوں گا۔"

جب سب نے کافی ختم کرلی تو وہ اُٹھے اور مس گرین سے بولے۔

"آیئے، میرے کمرے میں۔ "

سب کے سب مسٹر سنہا کے کمرے میں پہنچ گئے۔ سردی کچھ زیادہ تھی۔ نوکر نے آتشدان میں لکڑی جلادی تھی اور کمرہ گرم تھا۔ مسٹر سنہا اپنی مسہری پر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُنہوں نے نوکر سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ اُن کے بستر کے پاس پہلے ہی سے کرسیاں رکھی تھیں۔ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مسٹر سنہا بولے۔

مِس گرین میرے دِل پر ایک بوجھ ہے جسے میں آج ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ساری زندگی اِس بوجھ کو ڈھویا ہے۔ لیکن اب اسے ہٹا دینا ضروری ہے۔ آپ نے دو بار مجھے رائے دی کہ ارنسٹ اور نورا کی شادی ہو، اور میں جانتا ہوں، دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔ آج میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں سچ مچ میرے بچے ہیں۔ اُن کی ماں بھی اب مر چکی ہے۔ مجھ میں کبھی پہلے ہمت نہیں ہوئی کہ اس کا اعلان کردوں۔ حالاں کہ آپ جانتی ہیں کہ ان دونوں بچوں کی پرورش کے سلسلے میں دِل کھول کر میں آپ کی مدد کرتا رہا۔ لیکن مجھ میں سچی بات کہہ دینے کی جُرأت نہیں ہوئی۔ لیکن اب ضروری ہوگیا ہے۔ کہیں اصل حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے دونوں بیاہ نہ کرلیں۔"
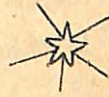
سارے کمرے میں سنّاٹا چھا گیا۔ ارنسٹ نورا کو اور نورا ارنسٹ کو تکنے لگے۔

▲

آمد آمد
جوگندر پال

جوگندر پال
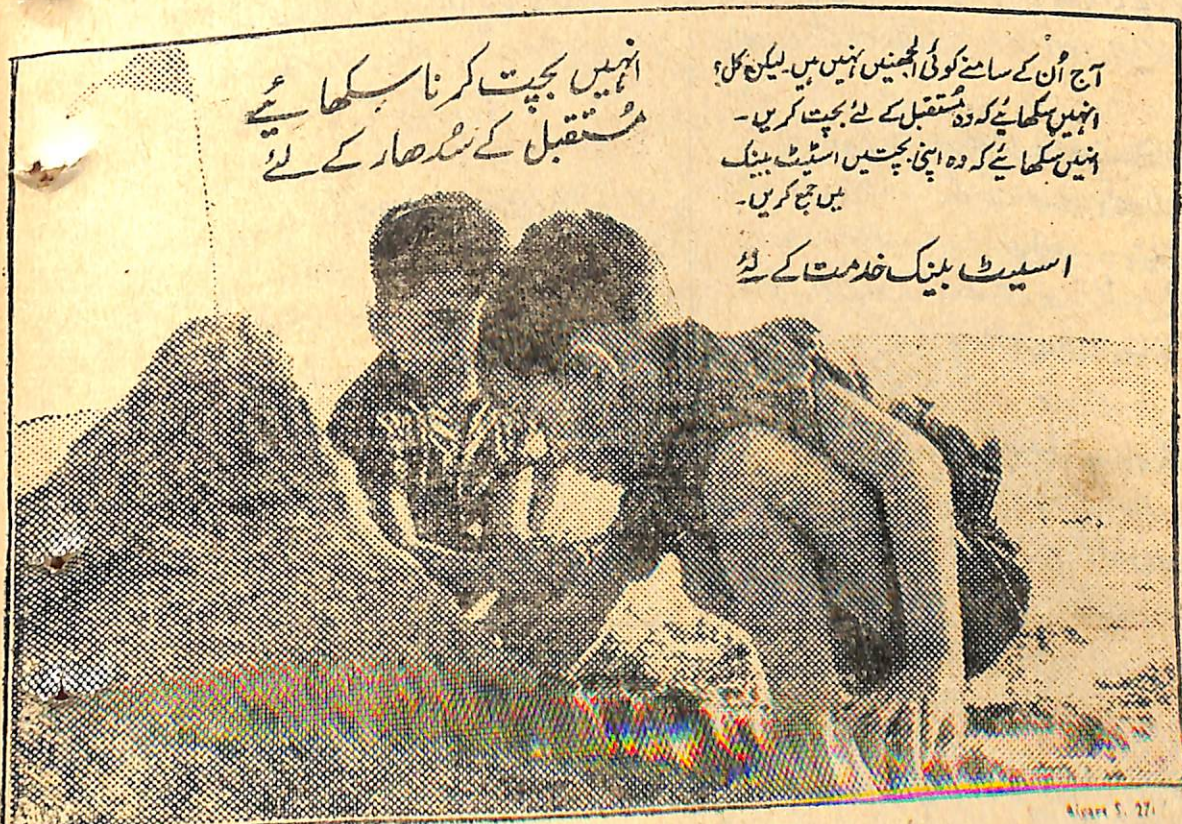
۱۹۲۵ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوا۔ مرے کالج سے بی۔ اے کیا۔ کالج کے دنوں میں بیشتر وقت اپنی غریبی اور لاچاری کے بارے میں سوچنے اور اپنی پڑھائی کا خرچ پورا کرنے کے لئے بھانت بھانت کے کام کرنے میں گذر جاتا۔ اپنے بوڑھے ماں باپ کی مالی پریشانیوں کو دیکھ کر کتابیں پھاڑ دینے کو جی چاہتا لیکن کالج سے نام نہ کٹوایا۔ شاید اس لئے کہ نوکری ملنا محال تھا، اس لئے کہ پڑھائی کی بچکانہ سی خواہش تھی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے دس سال بعد ایم اے کیا جب میں ایسٹ افریقہ سے لانگ ہوم لیو پر ہندوستان آیا ہوا تھا۔

۱۹۴۸ء میں انبالہ میں ایسٹ افریقہ کی ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی ہوئی۔ ملک کی تقسیم کے بعد سیالکوٹ سے انبالہ میں آئے ہمیں ابھی سال چھ ماہ ہی ہوئے تھے۔ اپنے باپ کی ڈیری میں میری یہ ڈیوٹی تھی کہ ہر روز تیس چالیس میل کی سائیکلنگ کرکے دو تین دیگر لڑکوں کی رفاقت میں قریبی دیہات سے دودھ فراہم کروں۔ میری بیوی کا کہنا ہے کہ وہ تو تمہاری توانا سی بےچارگی تھی جو مجھے پسند آگئی۔ ورنہ ان دنوں تو تمہیں دودھ بیچنا بھی نہ آتا تھا۔

سیکھنے سے شاید سکھانا آسان ہے، اس لئے کینیا میں کئی سال مزے (؟) سے سکھاتا (پڑھاتا) رہا۔ اپنی کھاتی پیتی متوسط الذہنی کو خوب کھلاتا اور خوب تر پلاتا رہا اور کہانی سے فلرٹ کرنے کا موقع بھی نہ جانے دیتا۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے آس پاس میں نے اپنے آپ کو اس طوائف کے عشق میں گرفتار پایا اور میڈ سا فیصلہ کر لیا کہ اب سب کچھ تج کر صرف عشق ہی کریں گے۔

جنوری ۱۹۶۴ء میں اپنے کام وام سے استعفٰے دے کر ہندوستان لوٹ آیا۔ دراصل میری یہی دیوانگی کارفرما تھی مگر یہاں پہنچ کر چند ہی ماہ میں ہوش ٹھکانے آگئے اور چپ چاپ کام ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ گذشتہ پانسات سال اورنگ آباد (دکن) کی سفید پوش پیشہ ور زندگی کے بعد اب پھر پاگل پن کی سوجھ رہی ہے۔ بس پانی سر سے اوپر چڑھنے کا انتظار ہے، پھر بچنا بھی چاہوں گا تو ڈوب مرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ ہوگا۔

میری زندگی ایسے ڈرامائی واقعات سے خالی ہے جن کی بدولت جینے والا کہانی بن جاتا ہے۔ دراصل مجھ سے ایسے واقعات کی بجائے خیالات پیش آتے رہتے ہیں، بڑے عجیب و غریب خیالات جن سے میں جھٹ مایوس ہو جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ خیالات واقعات کے مانند "ہو" گئے ہیں اور انہیں رقم کرکے میری کہانی بن جانے کی خواہش کی تسکین ہو جاتی ہے۔ لکھ لکھ کر "بننے" میں شاید ہماری بزدلی اور ذہانت کا ہاتھ ہوتا ہے، پر اسے کیا کیا جائے کہ میں نے جب بھی اپنی بزدلی کو کاٹ پھینکنا چاہا، میری ذہانت بزدلی کے اندر کہیں جا گھسی۔ لو کا ٹو اب!

میں کہانیاں کیوں لکھتا ہوں؟ ـــــ ٹھہریئے، مجھے بھی آپ سے ایک سوال کرنا ہے: سانس چڑھا کر آپ اسے ہمیشہ کے لئے روک کیوں نہیں لیتے؟ اس کا اخراج کرکے ڈھیلے سے ہو کر از سرِ نو سانس کیوں چڑھاتے ہیں؟ ـــــ کہانیاں لکھنا یا اپنے اظہار کے لئے کوئی اور بے قاعدہ یا باقاعدہ راہ اختیار کر لینا میرے نزدیک ایک پورا فطری عمل ہے، جیسے کوئی اسٹریٹ سنگر بھیک مانگنے کے لئے گلی گلی گاتا پھرے اور گاگا کر اپنی لَے میں کچھ اس طرح سے کھو جائے کہ اسے بھیک مانگنا یاد ہی نہ رہے ـــــ اگر آدمی کو اپنے اظہار کا کوئی مناسب آؤٹ لیٹ میسّر نہ آئے تو اس کے وجود میں زہر جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے، اظہار کی روک تھام کا احساس کسی اپاہج کے تیز تیز چلنے کی خواہش کے مانند بڑا کربناک ہوتا ہے۔

میں نہ لکھتا تو کیا ہو جاتا؟ ـــ کچھ بھی نہ ہوتا۔ لیکن جو کچھ ہو گیا ہے، وہ نہ ہوتا۔ میرے ہو جانے کا فی نامیتن! ـــــ

(خود نوشت)

آمد آمد

جوگندر پال

مارگن

مَیں اپنی مرحوم انگلش ماں کی واحد اولاد ہوں اور میں نے اپنے مرحوم ہندوستانی باپ کو کبھی نہیں دیکھا کیونکہ میری ماں حمل ٹھہرتے ہی اُس سے قانونی طور پر الگ ہوگئی اور میرے نصف باپ شادی کرنے کیلئے وطن لوٹ آئے اور اُنکی شادی کے ساڑھے سات ماہ بعد میرا جنم ہوا۔ میری پُوری ماں نے آدھے باپ کو میری پیدائش سے پہلے ہی باور کرا رکھا تھا کہ میں اُسی کا بیٹا ہوں۔ پہلے تو میری ماں نے سر توڑ، پیٹ توڑ، کوشش کی کہ میں پیدا ہونے سے پہلے ہی ضائع ہو کر خارج ہو جاؤں۔ اُسے بڑا ڈر تھا کہ میرا بدن مشرق کے بھورا پن سے آلودہ ہوگا، پر میں اُس کے گناہ کے مانند سارے کا سارا گورا چِٹّا بر آمد ہوا تو خوشی سے اُس کی باچھیں کِھل گئیں اور اُس نے میرے نصف باپ کو میرے نزدیک کھڑا کر کے دکھایا، دیکھو، مجھے تو یہ تمہارا ہی ننھا سا چہرہ معلوم ہوتا ہے ——— ہے نا؟۔ اور میرا نصف باپ شاید جی ہی جی میں گاڈ آل مائٹی کا شکر بجالایا کہ میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں ہوں، ورنہ اُسے ساری عمر مُنہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑتا۔

میں اپنی ولدیت کے قصّے سے اُس وقت تک لاعلم رہا جب تک میری ماں نے بستر مرگ پر اِس حقیقت کا اعتراف نہ کیا۔ میری ماں کی اِس کنفیشن کے وقت میرے نصف باپ کو مرے دس برس ہو چکے تھے اور میری عمر چالیس تک پہنچ چکی تھی اور میں نے اپنے پورے باپ کو ایک بار بھی نہ دیکھا تھا: لاشعوری طور پر، ہندوستان ہمیشہ میری کشش کا باعث رہا۔ ——— ہندوستانی موضوعات پر ہی میں نے اپنی پہلی اور دوسری پی، ایچ، ڈی، کے مقالے لکھے، انگلینڈ اور اقوامِ متحدّہ کے بااثر حلقے ہندوستانی اُمور پر میری رائے کو اتھارٹی سے کم تسلیم نہ کرتے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میرے اندر دراصل میری بجائے میرا باپ بولتا ہے۔

میرے نصف باپ کو مجھ پر پیار آنے لگتا تو وہ مجھے مہاراجہ کہہ کر پکارتا۔ میری ماں پر یقین کر لینے کے باوجود شاید وہ میری بڑی بڑی مشرقی آنکھوں اور کالے بالوں کو دیکھ دیکھ کر شک میں پڑ جاتا تھا کہ میں اُس کا بیٹا نہیں ہوں، لیکن مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ اگر میری ماں اُس کی زندگی میں اپنے اِس بھید کو افشا کر دیتی تو وہ اُس سے کہتا، کیا یہ ضروری ہے کہ میں تمہاری ہر بات پر یقین کر لوں؟ اُس وقت اگر تم نے اِتنا پکّا جھوٹ بولا تھا تو اب تمہاری اِس کچّی پکّی سچائی کو کیسے ہضم کر جاؤں؟ ——— بس اب مجھے اور تنگ نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے مارگن میرا ہی بیٹا ہے ——— اور اُس کا یہ کہنا سچ ہی ہوتا۔ اپنی ماں کی کنفیشن کے بعد میں نے کئی بار اپنے باپ کو تصوّر میں دیکھنا چاہا مگر میرے ذہن میں اُس کا پورا چہرہ کبھی نہ بنا۔ میری ماں نے طلاق کے بعد انگلینڈ لوٹ کر اُس کی کوئی چھٹّی، فوٹو یا کوئی بھی نشانی نہ رہنے دی، بس اُسے ذہن سے ہی نکال دیا، پر نہیں، میرا خیال ہے، وہ اُس کے ذہن میں ہر موسم میں کسی فالتو پودے کے مانند اُگ آتا تھا، اور وہ سب کی نظریں بچا کر جلدی جلدی اُسے اُوپر اُوپر سے کاٹ دیتی تھی ——— جس شخص کے چہرے کو میں ایک بار بھی نہ دیکھ سکا، اُس سے جان پہچان تو درکنار، میں اُس سے اجنبیّت بھی کیسے اختیار کر سکتا تھا۔

میرے لئے میرا باپ اپنا بھُوت سا ہے جس کی پوری شکل مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ اب بڑی بڑی مُونچھیں ہلتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں، اب کٹے ہوئے ہاتھ ہوا میں لہرا رہے ہیں، اب صرف ناک اُبھر آئی ہے ——— میرا پورا باپ مجھے آدھا بھی دکھائی نہیں دیتا ہے،

آدھا باپ کم از کم دیکھنے میں تو پُورا تھا۔

"مہاراجہ بیٹے، جی لگا کے کھایا کرو۔ کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی اُٹھنے کی تیاری شروع کر دیتے ہو" ——

یہی شخص میرا باپ ہے۔ میرا باپ میرا کچھ نہیں لگتا، وہ بھی میرے اِن والدین کے مانند مَر کھپ چکا ہوگا، اُس کی قوم کے افراد کی اوسط عُمر تیس پینتیس برس ہے، وہ بہت جیا ہوگا تو پچاس یا پچپن کی عُمر تک جیا ہوگا —— کیا اُسے میرا پتہ تھا؟ مجھے یقین ہے تُم نے میرے اُس کے پیٹ میں ٹھہر جانے کا ذکر بھُول کے بھی نہ کیا ہوگا۔ اُس کا تو جی چاہ رہا ہوگا کہ میرا گلا جو ابھی 'بنا بھی نہ ہوگا' اپنے پیٹ کے اندر ہی اندر گھونٹ دے' تاکہ یہ نشانی بھی باقی نہ رہے: تُم کے مانند میرے باپ نے بھی اپنی دوسری شادی کر لی ہوگی —— ہندوستانی تھا، اُس کے بچّے ایک درجن سے کم کیا ہوں گے؟ میرے یہ آدھے بھائی بہن کیسے ہوں گے؟ شاید بہت موٹے موٹے ہوں، یا شاید بہت کمزور ہوں، کیونکہ نارمل صحت کے ہندوستانی بہت کم ہوتے ہیں۔ اپنے باپ کے اِن ایک درجن بچّوں سے میرا کوئی ذاتی رشتہ نہیں، یہی میرے نصف بھائی ہیں، پورے پچاس کروڑ ہندوستانی میرے نصف بھائی ہیں۔ ہندوستان میرے لہُو میں ہے۔ مَیں نے ایک بار بھی ہندوستان نہیں دیکھا، مگر ہندوستان ہر دم میرے ذہن میں رہتا ہے۔ اِس کے بارے میں مَیں نے لگاتار سوچا ہے، پڑھا ہے، لکھا ہے —— مَیں انگلینڈ کے سب سے اہم اسکول آف انڈین سٹڈیز کا ڈائرکٹر ہوں، ہندوستان میرا پیشہ ہے۔

۲

مارگن کے نام

مائی ڈیر مسٹر مارگن، ——

مَیں نے حال ہی میں ہندوستان کے مستقبل پر آپ کا ایک اہم آرٹیکل پڑھا ہے اور اُسی سے متاثر ہو کر آپ کو مخاطب کرنے کو جی چاہ گیا ہے۔

اپنے وطن پر برٹش مصنّفین کی تحریریں پڑھ کر عام طور پر مجھے لگتا ہے کہ وہ یا تو بڑے بھائی کا شفیق لہجہ اختیار کر لیتے ہیں یا انگلش پبلک سکول کے کسی اولڈ ٹیچر کے مانند اپنی ہر سطر میں موٹی موٹی سی ججمنٹ اور وارننگ دینے کو بے تاب رہتے ہیں، یا پھر انڈیا کے اولڈ برٹش سول سرونٹس کی طرح ہندوستانیوں کو سرے سے انسانی برادری میں شامل ہی نہیں کرتے۔ آپ کے مضمون سے اختلاف کی گنجائش تو بہت ہے مگر آپ ہمارے مسائل کے مطالعے میں اتنے مُنہمک معلوم ہوتے ہیں کہ آپ کے کسی کامپلیکس کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ ہندوستان کے تعلق سے آپ جیسے چند اور مغربی سکالر ہوں تو یورپ ہمیں سچ مُچ کے لوگ سمجھنا شروع کر دے۔

گزشتہ دنوں کی بات ہے کہ میرا ایک یورپی صحافی دوست میرے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم بڑی بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے کہ اُس نے اچانک مجھ سے سوال کیا:

آخر آپ ہمیں ہمارے مانند سچ مُچ کے لوگ معلوم کیوں نہیں ہوتے؟

کیونکہ آپ نے ابھی تک ہماری سچّائی کو قبول نہیں کیا۔

تو کیا ہماری سچّائی اتنی علاقائی ہے کہ غیر مُلکیوں کو اجنبی معلوم ہوتی ہے؟

نو، مسٹر مارگن، اِس وقت میرے ذہن میں انسان کی وہ ہمہ گیر سچّائیاں نہیں ہیں جن کی بدولت دُنیا بھر کے درویش ایک ہی مملکت کے شہری معلوم ہوتے ہیں۔ میں کسی مُلک کے عوام کی معمول کی سچّائیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ شاید یہ غلط نہیں کہ متمدّن دور میں ساری دُنیا کے عوام کی معمول کی سچّائیوں کی پہچان یکساں ہونی چاہیے۔

مگر —— سچّائی کی پہچان تو ذرا سخت کام ہے ——

ہماری مشکل یہ ہے کہ ابھی تک دُنیا کے نمائندوں کے نزدیک تمدّن کی پہچان بھی وہی ایک نہیں،

کوئی تمدّن کو کھانے اوڑھنے کی شئے سمجھتا ہے اور کوئی اِسے سجا کر رکھنے کی۔ دراصل ہر شئے کی پہچان کے تعیّن کا اِنحصار لوگوں کی اپنی اپنی فوری ضرورت پر رہتا ہے۔

مَیں آپ کی سہولت کے لیئے ایک اور مثال پیش کرتا ہوں۔ ہمارے ہی مُلک میں دو خطّے ہیں۔ ایک خطّے میں بارش بہت کم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ قحط کا دَور دَورہ رہتا ہے اور دوسرے خطّے میں بارش اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ہر برسات میں بھری پُری بستیاں دیکھتے ہی دیکھتے سیلاب سے اُجڑ پُجڑ جاتی ہیں، سو قحط زدہ علاقے والے حق کو ' بارش بھیجنے والا ' کے نام سے یاد کرتے ہیں اور سیلاب زدہ علاقے والوں کے نزدیک وہی حق ' بارش روکنے والا' ہے۔ ہماری مشکل بھی دراصل یہی ہے کہ اپنی سہولت کی خاطر ہم جہالت کو ہی سچّائی کا نعم البدل سمجھ کر قانع ہو گئے ہیں ـــــ اور ہماری تہذیب کا کوئی بھی رُخ ہماری اِسی قناعت سے معرضِ وجود میں آتا ہے: یہاں یہ تہذیب ہاتھی کی چار ٹانگوں کے مترادف ہے اور اِن چار ٹانگوں پر اندھوں کو چلتے پھرتے بھاری بھرکم سُتونوں کا گمان ہو رہا ہے' اِنھیں اپنی راہ چلنے دو، ورنہ روند ڈالیں گے ـــــ ہٹ ـــ جاؤ! ـــ

اور یہاں یہی تہذیب ہاتھی کی آرام دہ پیٹھ ہے۔ مزے سے اس لمبی چوڑی پیٹھ پر بیٹھیئے، یا چاہیں تو لمبی تان کر سو جائیں۔ اتنی محفوظ اُونچائی پہ اِس قدر کشادہ رہائش مُہیّا ہو تو فکر کیسی؟ ـــــ آرام سے پڑے پڑے ہی آپ کا سارا سفر از خود طے ہو جائے گا ـــ بول رانا سنگرام کی جے! ـــــ اور رانا سنگرام بیدار ہو کر آنکھیں مَلنے لگا ہے ـــ ہائیں! ہمارا محل آ پہنچا؟! ـــــ یعنی آپ نے محل تک ہی پہنچنا ہے نا؟ آپ چین سے پڑے رہیئے، آپ کا محل آپ تک آ پہنچے گا، یہی نہیں، بلکہ آپ چاہیں گے تو آپ تک پہنچ کر ہاتھی کی پیٹھ پہ بھی آ کھڑا ہو گا تاکہ آپ کو نیچے بھی نہ اُترنا پڑے۔

سچّائی کے مانند تہذیب و تمدّن شاہ پورے کا پورا ہاتھی بھی بیک وقت کیسے نظر آتا۔ [illegible] جو کچھ جس کی سمجھ میں آ جاتا ہے وہی ٹھیک ہے۔ ہر شخص کی اپنی ہی سمجھ اُس کے لیئے مناسب ہے۔

آپ شاید مجھ پر ہنس رہے ہیں مسٹر مارگن! مگر ذرا سوچ کر بتائیے، کیا آپ اپنے باپ کی سمجھ بُوجھ سے اپنی ماں سے پیار کریں گے، یا اپنی سمجھ بُوجھ [illegible] جو خاتون آپ کے باپ کی بیوی ہے، وہی خاتون آپ کی ماں ہے۔ اندھا بیچارہ بڑی مشکل سے ہاتھی کا ایک رُخ ٹٹول ٹٹول کر دیکھ لیتا ہے تو ہاتھی چُپکے سے اپنا [illegible] بدل لیتا ہے۔ آیئے، اب پھر دیکھنا شروع کیجئے، اِس حیوان نے دُم ہلا ہلا کر ہمارے سارے کیئے کرائے پہ پانی پھیر دیا ہے۔

اصل میں ہمارا پرابلم یہی ہے مسٹر مارگن، کہ ہم سچ اور جھوٹ کا کوئی فارمولا بناتے ہوئے بھُول ہی جاتے ہیں کہ انسان کے اندر اچھا خاصا حیوان بھی ہے۔ جس کی فطرت سچ اور جھوٹ سے بے لاگ ہو کر جینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا تاریخی شعور ہمارے مُستقبل کے رویّے میں ہمارا مؤثر رہبر ثابت نہیں ہو سکتا۔

میرا ایک چچیرا بھائی ہے جو ہمارے مُلک کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی میں تاریخ کے شعبے کا صدر ہے۔ اُس کی سپیشل سٹڈی ' پراچین بھارت میں ہندو راجیہ' ہے، اور میرا چچا یعنی اُس کا باپ سنسکرت بھاشا کا ایک مانا ہوا وِدوان ہے ـــــ مجھے اپنے تاریخی شعور کے بیان سے بے اختیار اپنے چچیرے بھائی کا خیال آ گیا ہے جو نئے ہندوستان کے مسائل کا حل پراچین ہندو راجیہ کے سیاق میں ڈھونڈنے کا حامی ہے۔ اُس میں اور اُس کے باپ میں کوئی فرق نہیں، یا صرف یہی فرق ہے کہ سارے باپ کو اپنے وجود میں سمیٹ کر وہ اُسکی توسیع بھی معلوم ہوتا ہے، یعنی اپنے باپ کا بھی باپ معلوم ہوتا ہے ـــــ مَیں آپ کی خوشنودی کے لیئے محض تکلّم کے ہندسوں کا سہارا نہیں لے رہا ہوں

محترم! ـــــ بلکہ میری بات چیت کے ٹرمز ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں اور اس کے ثبوت میں مجھے اپنے چچیرے بھائی کی بے بچہ بیوی کا ایک 'پرائیویٹ' بیان پیش کرنا ہے جو اُس نے اپنے ڈاکٹر کے روبرو دیا تھا: اپنے شوہر سے محبت کرتے ہوئے مجھے لگنے لگتا ہے کہ میں نے اپنی باہیں اپنے سُسر کے گلے میں ڈال رکھی ہیں اور یوں اپنے فعل کا مجرمانہ احساس مجھے کسی کام کا نہیں رہنے دیتا۔

بتائیے ڈاکٹر مارگن! ـــــ آپ کے تاریخی شعور کی بنیادیں اِس بھونچال سے ڈھیر ہوئی ہیں یا نہیں؟ جینے کا مجرمانہ احساس جینے والوں کے بانجھ پن کا باعث ہی تو ہوگا۔ آپ نے بھی اپنے مضمون میں ہندوستان کے تاریخی شعور کو بہت اہمیت دی ہے مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ ہمارا تاریخی شعور ہمارے معاصرانہ اقدام کی نفی کرتا ہے۔ ہمارے آقاؤں کے بیٹوں نے اُن کے آباؤاجداد کے تہذیبی ترکے کی گیس سے پھول پھول کر انھیں اپنی ہمت سے دو قدم چلنے کا بھی اہل نہیں رہنے دیا اور ہم جن کے عمل کا انحصار انہی کی حکمتِ عملی پر ہے، اُن کے پیچھے پیچھے چلنے کے لئے قدم قدم پر کئی کئی سال اِس انتظار میں رُکے رہتے ہیں کہ وہ اُٹھیں اور ہماری رہبری کریں۔

اگر آپ کو ہمارے قدیم ذہن کی ضرورت ہو مسٹر مارگن تو بخوشی لے لیجئے، اور اگر ہم اسے دینے پر رضا مند نہ ہوں تو جنگ کا اعلان کر کے ہم سے چھین لیجئے تاکہ ہماری ساری کی ساری قوم اِس بوجھ سے ہلکی ہو جائے۔ آپ کے عجائب گھر کی توقیر ہمارے قدیم ذہن سے کئی چند بڑھ جائے گی: ہمارے ذہن کے عوض آپ ہمیں ہمارے روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اپنی حاضر دماغی دے جائیگا جو آپ کے لئے فالتو ہے، کیونکہ آپ کی روزمرّہ کی ساری ضرورتیں آپ کے کمپیوٹر پوری کر دیتے ہیں ـــــ بس ہمیں آپ کی ایک کامن سنس مُہیا ہو جائے تو ہم از خود عصری سماج میں شامل ہونے کے قابل ہو جائیں۔ آج اپنے عمرؔ ذہن کی وجہ سے ہم غائب الدماغ ہو کر رہ گئے ہیں اور کھانا کھاتے وقت کھانا بھول کر کھانے کے فلسفے پر غور کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، لہٰذا اگر کوئی مغربی ماہر شماریات اپنی باقاعدہ تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری قومی بھوک کا ایک بڑا سبب ہماری بے سبب غور و فکر کی عادت ہے تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔

میرا ایک دلچسپ مشاہدہ ہے: ہمارے رجّھے پیٹ فلسفی براہِ راست سوچنے کی بجائے سوچنے سے پہلے اپنے آپ پر بھوک کی کیفیت طاری کر لیتے ہیں، گویا انہیں ڈر ہو کہ بھوک کے بغیر اُن کی سوچنے کی صلاحیت سلب ہو جائے گی۔ بھرے پیٹ کی بھوک کے ذکر سے مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک بار بہت زیادہ کھا کھا کر اکبرِ اعظم کی بھوک مر گئی اور اُسے فکر لاحق ہوئی کہ اب میں کیوں کر خیالات کی گہرائی تک پہنچوں گا۔ بھوک نہ لگنے سے اُس کا دماغ مٹی کے خالی مٹکے کے مانند بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ بہت حیلے کئے پر بھوک نہ لگنا تھی، نہ لگی۔ آخر اُس نے بیربل کو حکم دیا کہ اگر تم فوری طور پر علاج کی کھوج میں کامیاب نہ ہوئے تو تمہارا سر اُڑا دیا جائے گا۔ بے چارے بیربل کے مُنہ سے بوکھلا کر نکل گیا! "ظلِ الٰہی، آپ کبھی بھوکے رہیں تو آپ کو بھوک بھی لگے۔"

"ارے ہاں بیربل، اتنی موٹی بات ہے"

"شاید اپنے مضحکہ خیز موٹاپے کے باعث ظِلّ الٰہی کے دماغِ عالی میں باریابی کے قابل نہیں!"

اِس باب میں ہماری تاریخ جسے آپ ہمارے مستقبل کا ضامن قرار دیتے ہیں، شاہد ہے کہ ہم نے ہمیشہ کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ ہمارے آقاؤں کو بھوک لگتی رہے اور اُن کی بھوک مِٹتی رہے۔ خدانخواستہ اگر ہمارے بھوک رُیے مسئلے کے باوجود اُن کے سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جائے تو ہماری بہبود کا سامان کون کرے؟

لیکن ہمارے عوام کا پرابلم جُدا نوعیت کا ہے۔ اِن بے چاروں پر فلسفیوں کا گمان ہوتا ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے صرف یہی سوچتے رہتے ہیں، ہم بھوکے ہیں،

ہم بھُوکے ہیں' ــــ ہم بھُوکے ہیں ــــ

اور یہ سوچ سوچ کر اُنھیں اپنا پچھلا جنم یاد آنے لگتا ہے' جب وہ بھُوکے نہ تھے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ ہمیں آواگون کے گھیرے بُھگتوں کی ٹوہ اسی طرح ہوئی۔

مَیں نہ جانے اپنی رَو میں کیا کیا بَک گیا ہوں مسٹر مارگن، پر اپنے وطنِ عزیز میں آپ کی اتنی دلچسپی دیکھ کر میرا جی چاہا کہ آپ سے کھُل کر باتیں کروں۔

آپ کے مضمون سے آپ کی سرگرم فکر کا تو احساس ہوتا ہے مگر یہ بھی لگتا ہے کہ ہندوستان کے بارے میں آپ کا مطالعہ و مشاہدہ اکادمی زیادہ ہے۔ شاید آپ ہندوستان کبھی نہیں آئے۔ اگر ایسا ہے تو آپ ایک بار ضرور آئیے۔ ہم عادتاً پردہ پسند لوگ ہیں اور باہر کے لوگ جب تک ہمارے اندر نہ گھُس آئیں، ہمیں سمجھنے میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔

اگرچہ ہمارا مُلک بہت بڑا ہے لیکن یہاں چاروں طرف روز افزوں آبادی کی بھیڑ بھاڑ کو دیکھ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اجنتا کے غاروں میں گھوم رہے ہیں۔ آج بھی یہاں ہماری وہی قدیم تہذیب آباد ہے' بھیڑ بڑھتی جارہی ہے۔ اجنتا کے غاروں میں دیواروں سے جُڑ جُڑ کر بے شمار مرد و زن بیک وقت ہمہ تن و ہمہ رُوح جنسی مباشرت میں مشغول ہیں اور جو لوگ نرودھ کے پیکٹ یا پلز یا اپریشن کے اوزار لیے اُن کے آس پاس کھڑے ہیں، اُن کی طرف کسی کو دیکھنے کی فرصت نہیں، اور اچانک کسی کی آنکھ اُٹھتی بھی ہے تو:

تم دیکھ نہیں رہے' مَیں ــــ مَیں ــــ؟ ــــ جاؤ بابا ــــ جاؤ یہاں سے! ــــ گیٹ آؤٹ! میری لائف میری اپنی لائف ہے۔ جمہوریت میں کسی کی شخصی آزادی میں خلل انداز نہیں ہوا جاسکتا' ــــ

مگر پھر ہمارے یک سالہ' پنج سالہ یا دہ سالہ قومی پروگرام ــــ؟

ہاں، ہاں' وہ سب بہت اِمپارٹنٹ ہیں۔ ہم اُن کی طرف پُوری توجہ دے رہے ہیں۔ مگر اس وقت اِن بیچاروں کو ڈسٹرب نہ کرو۔

ہاں بابا' کیوں خواہ مخواہ ہمیں پریشان کر رہے ہو؟ جاؤ اپنا دھندا کرو۔

اپنے دھندے کے لیئے تو مَیں آیا ہوں' ورنہ مجھے کیا پڑی تھی کہ ــــ

ہر لمحہ اَن گنت بچّے پیدا ہو رہے ہیں' اَن گنت بچّے پیدا ہونے کے لیئے کنُوئیں اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں' اَن گنت بچّوں کی پیدائش کے اسباب ہو رہے ہیں ــــ

(جاؤ بابا' کیوں ڈسٹرب کر رہے ہو؟)

بیش تر، خوش تر! ــــ غار کی بھیڑ اور گہری ہوتی جارہی ہے۔ بھیڑ کنٹرول سے باہر ہوتی جارہی ہے ــــ لاٹھی چارج؟ ــــ نہیں' کہاں جائیں گے بے چارے؟ بس یہی تو ساری جگہ ہے ــــ بھیڑ اور بڑھ گئی ہے! ــــ

یا خدا! اتنے ہجوم میں تو سانس لینا بھی دشوار ہے ــــ

انقلاب زندہ باد! ــــ اب اور کونسا انقلاب چاہتے ہو؟ اِس غار میں اپنی نیم نسل کی پیہم افزائش کیئے جانے کا تمھیں پُورا اختیار ہے۔ کس کی مجال ہے تمہاری آزادیوں میں سدِّراہ ہو؟ تم کُلیتاً آزاد ہوگئے ہو' آزادی کی پابندیوں سے بھی آزاد ــــ مزے کرو میاں' جب تک مزے سے بنی رہتے بنی رہتے دو ــــ بعد میں جو ہوگا' دیکھا جائے گا!

ہونا کیا ہے؟ سب ٹھیک ہوگا ــــ دو کروڑ ہندوستانی آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں بھیج دیئے جائیں گے، ڈیڑھ کروڑ افریقہ چلے جائیں گے، ایک کروڑ کینیڈا ــــ خدا کی زمین سب کی ساجھی زمین ہے ــــ ہماری زمین تمہاری' تمہاری' ہماری ــــ

ٹھیک ہے! ــــ پھر؟ ــــ

پھر کیا؟ تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے ہمیں خطرے کا علم ہی نہیں۔ ہم پُوری کوشش کر رہے ہیں بابا' پھر بھی حالت نہ سُدھری تو دیکھا جائے گا۔

ہاں، دیکھا جائے گا!

ہماری پاپولیشن ایکسپلوژن سے متعلق بھی آپ نے کوئی کار آمد سوشیولوجیکل ریسرچ ضرور کی ہوگی،

مسٹر مارگن ؟ -

جب ہمارا کوئی بوڑھا کسی سُہاگن کو یہ دُعا دیتا ہے کہ تیرے آنگن میں اتنے بچّے جمع ہو جائیں کہ تمہارے باہر جانے کا راستہ رُک جائے، تو وہ دھرم کرم کی ناری شردھا سے اُس کے پاؤں چھُونے کے لیئے جھک جاتی ہے۔ زمین ہلنے لگے مسٹر مارگن تو بھونچال آجاتا ہے۔ زمین کا تو بس یہی کام ہے کہ اپنی اُسی جگہ پر جم بس کر پیدا کرتی رہے۔ جتنی زیادہ پیدائش ہوگی اتنے زیادہ گھر بسیں گے، مگر پیداوار ـــــ پیدائش کے پیٹ بھرنے کے لیئے خوراک۔ خوراک کے لیئے فرٹیلائزز ؟ ـــــ چھوڑیئے ہماری ہڈیاں کیا کم ہیں ؟ انسانی ہڈیوں سے بڑھ کر اور فرٹیلائزز کیا ہوں گے ؟ ـــــ جاؤ سہاگن، اطمینان سے اپنا آدرش پُورا کرو۔ جلدی کر، ناری، سوچ سوچ کر ہی سُوکھ گئیں تو سات پتروں کی ماتا کی پدوی کیسے پراپت کروگی۔ دَھرم کی پُستکوں میں ماتا کے کلیان کے لیئے بس یہی ایک اُپائے ہے۔

ڈاکٹر مارگن، ہم اپنے دَھرم کے سیوک ہیں۔ ہمارا مُلک ہماری آبادی کے لیئے کافی نہیں تو کیا ہوا ؟ ـــــ ہمارے بھگوان کی یہ ساری سرشٹی کیا کم ہے ؟ یہاں مرجائیں گے تو کسی اور دُنیا میں جا بسیں گے۔ ہماری یہ دُنیا تو بہت چھوٹی ہے، ایسی کئی کروڑ، کئی اَرب دُنیائیں ہمارے بھگوان کی کروڑوں اَربوں دُنیاؤں کی ایک ایک دُنیا میں ہمارے لیئے خالی پڑی ہیں۔ ہماری سوُرگ پوری میں ہماری جگہ ریزرو ہے، اِدھر ہم مَرے اور اُدھر وہاں ٹھاٹ سے جا پہنچے، ہمارے بھوگ بلاس کے لیئے وہاں اَپسراؤں کے جھُنڈ کے جھُنڈ ہوں گے، سونے چاندی کے محل ہوں گے، محلوں کے عین سامنے دُودھ کی نہریں، دُودھ کی نہروں سے پرے پھلوں کے باغات، اَمر جیون، بس ایک ہم ہی ہم ! ـــــ ہمارے وِدوان پنڈت اِسی لیئے دھرم پرچار میں لگے رہتے ہیں کہ یہ جیون برباد ہو جائے تو ہو جائے، پَر اگلے جیون کے رنگ میں بھنگ نہ ہو۔

ہمارے خاص خاص سمجھدار لوگ تو اِس جیون میں بھی خُوب سُکھ بھوگ لیتے ہیں۔ یہ معزّز لوگ دَھرم سیوا کو بھی کروڑوں کی کمائی کا حیلہ بنا لیتے ہیں، سیوا کی سیوا اور میوہ کا میوہ ـــــ اِس جیون کا سکھ بھی بھوگتے ہیں اور اپنی بےحساب کمائی سے اُس اَمر جیون کی اچھی خاصی اِن ویسٹمنٹ بھی فراہم کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہ لوگ بڑے محتاط اور ہوشیار تاجر ہیں مسٹر مارگن، جیسے اِس دُنیا میں اِنھیں یہ دُھن ہوتی ہے کہ سات پُشتوں کی جائداد بنا جائیں، ویسے ہی بعد از مرگ تحفّظ اور آرام کا سامان بھی یہیں سے بُک کرا لیتے ہیں اور وہاں پہنچ کر اپنا سارا سرمایہ وصول کر لیتے ہیں۔ سیدھا سادا لین دین ہے۔ پَر ایسے خوش نصیب ہم کروڑوں میں سے چند ایک سیکڑوں پر ہی مُشتمل ہیں۔ یہ تھوڑے سے لوگ ـــــ ذرا سے زیادہ نمک سے بھی اچھی خاصی پکی ہوئی ہانڈی بدذائقہ ہو کر رہ جاتی ہے ـــــ دگر سب کو اپنے دھندے میں گھُسنے سے روک کے رکھتے ہیں۔ ان کی ساکھ ہماری ساری دُنیا میں ـــ یعنی آپ کے مُلک میں بھی ـــــ اور اگلی دُنیا میں ہر جگہ بنی ہوئی ہے۔ یہ لوگ آپ کے مُلک کو آنے کا قصد کریں یا بھگوان کے دیش کو جانے کا، ایکسچینج کنٹرول اِن کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ آپ کے مانند کبھی بھگوان کو بھی اِن سے اختلافِ رائے ہو تو وہ اِن سے وہی، آئی، پی کا ہی سلوک رَوا رکھتا ہے۔ آپ بھی مجبور ہیں، وہ بھی، بس قادر ہیں تو اِک یہی لوگ۔ مجھے اپنے اِن بھائیوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ لوگ میرے ہم وطن ہیں لیکن مجھ سے بہت دُور ہیں، جادُوگر ہیں۔ کیا آپ نے ہندوستانی جادوگروں سے متعلق بھی کوئی تحقیق شروع کر رکھی ہے ؟ اِنڈیا اِز اے متھ مائی ڈیئر ڈاکٹر مارگن ! اِسے سارے کا سارا بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ ایک بار یہاں ضرور آئیے اور اپنی آنکھوں سے دیکھیئے کہ ہندوستان کیا ہے، کتنا عجیب ہے، ہاؤ سٹرینج اینڈ فیمیلیئر ! ـــــ

آپ کا ایک ہندوستانی مدّاح ـــــ

(۴)

شیلا

مارگن میرا گائیڈ ہے۔ مَیں اُس کی رہبری میں ’دی رِیل وَیلیس آف دا پریزنٹ انڈیا ٹو دا فیوچر آف دا وَرلڈ سوسائٹی‘ کے موضوع پر اپنے پی ایچ ڈی کے لیئے مقالہ لکھ رہی ہوں۔

پہلی بار جب مَیں اُس سے ملی تو وہ اپنے آفس میں دروازے کی جانب پُشت کرکے میز پر بچھے ہوئے ہندوستان کے ایک بہت پُرانے نقشے پر جُھکا ہوا تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں اُس وقت یہ لگا کہ کوئی نوجوان ڈاکٹر کسی دم توڑتے ہوئے بوڑھے کے دوا دارو میں مصروف ہے۔

”پلیز بیٹھ جاؤ مِس شرما“ اُس نے میری طرف مُڑے بغیر مجھ سے کہا اور بدستور اپنے کام میں منہمک رہا۔

مَیں نے سوچا تھا کہ ڈاکٹر مارگن کوئی بوڑھا اور بہرہ آدمی ہوگا، جس سے مجھے کافی اُونچی آواز میں بات کرنا ہوگی اور اُس سے بات کرتے ہوئے میری نظریں اُس کے چہرے کی جُھرّیوں میں گر گر بمشکل سنبھل پائیں گی اور میرا لہجہ اُکھڑ جائے گا اور میری سمجھ میں نہ آئے گا کہ اُسے اپنی بات کیسے سمجھاؤں۔

اُس نے ابھی تک میری طرف مُڑ کر نہ دیکھا تھا۔ اور مَیں سوچ رہی تھی کہ کیا وہ واقعی اِسقدر مصروف ہے، یا اپنی مصروفیت کی نمائش کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر مارگن کے بال کسی ایشیائی کے بالوں کے مانند گھنے اور سیاہ تھے اور پُشت پر بے حرکت توانا بازو گویا کسی عورت کو (مجھے؟) اچانک پکڑ لینے کے لیئے بے چین۔ اپنی پیٹھ سے وہ بھرپُور مرد معلوم ہوتا تھا ـــــ مَیں نے اپنے آپ کو ڈانٹنا چاہا! تم اپنے ٹیچر اور گائیڈ سے ملنے آئی ہو یا ـــــ

اگرچہ مَیں نے سوچا تھا کہ ڈاکٹر مارگن کوئی حواس باختہ بُوڑھا کھوسٹ ہوگا تاہم میری خواہش تھی کہ وہ کوئی خوش باش جوان آدمی ہو۔ عورت پہلی بار جب اپنے آپ کو کسی اجنبی مَرد سے ـــــ خواہ وہ مَرد اُس کے باپ کا کوئی ہم عُمر دوست ہو ـــــ ملنے پر آمادہ کرتی ہے تو اُس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ اور ہو نہ ہو، دیکھنے میں پورا مَرد ضرور ہو، کہ اُسے دیکھ کر ہی طبیعت خوش ہوجائے۔

ڈاکٹر مارگن اچانک اپنی پیٹھ کے اندر ہی اندر میری طرف مُڑ گیا ہے۔

ارے، یہ تو نرا بُرا ایشیائی ہے ـــــ اِتنا خوبصورت اور نیا نویلا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی تعلیم بھی اُس کی پھبن سی بن گئی ہے، ورنہ اِسقدر پڑھے لکھے لوگ اِتنے بوسیدہ اور بدزیب ہوتے ہیں کہ سر نیچے کرکے ہی اُن سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہم دونوں باتیں کرنے لگے ہیں۔

”میرا نام شیلا ہے ـــــ مِس شیلا شرما“۔

”وہ تو آپ نے اپنی چِٹھی میں بھی لکھا تھا، اور آپ کے اِس کارڈ پر بھی درج ہے جو آپ نے یہاں داخل ہونے سے پہلے اندر بھیجا۔“

(کِتنا چُلبلا ہے! بات کرنے کے لیئے کوئی بات شروع کرنا ہی پڑتی ہے۔ اب کیا یہ کہوں، آپ کی شکل بڑی پیاری ـــــ؟)

”آپ یہ بھی اپنی چِٹھی میں لکھ چُکی ہیں مِس شرما کہ آپ میری مدد سے رِیسرچ کرنا چاہتی ہیں ـــــ مجھے آپ کا گائیڈ بننا قبول ہے ـــــ اور؟“

اور کیا؟ مَیں بوکھلا سی گئی۔ مجھے بھلا اور کیا پُوچھنا تھا؟ بس ہوگئی ساری بات۔

”نہیں، ساری بات ابھی نہیں، آپ ـــــ“ (ہائے اتنی کُھلی کُھلی جھجک سے بات کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے کِھلتا ہی چلا جائے) ”مِس شرما، آپ کا رِیسرچ پرابلم اور میرا ایمان

دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ مجھے یقین ہے ہم ایک دوسرے کی بہت مدد کرسکیں گے۔"

(ایسا گائیڈ مجھے کہاں ملے گا جو سمجھائے بھی اور سمجھے بھی)

"میرے بیشتر یورپی دوست آج کے ہندوستان سے بہت مایوس ہیں مس شرما، لیکن میرا خیال ہے اپنی مایوسی کا باعث وہ خود آپ ہیں ــــ بوڑھے لوگوں کو نوجوان اِس لیئے اچھے نہیں لگتے کہ وہ اُن کے مانند بوڑھے نہیں۔"

"مگر ڈاکٹر، تاریخی اعتبار سے ہندوستان تو یورپ سے بھی بوڑھا ہے۔"

"نہیں مس شرما، مَیں نئے ہندوستان کی بات کررہا ہوں نئے ہندوستان نے ابھی اپنی زندگی کی تیسری دہائی میں قدم رکھا ہے۔ وہ بالغ ہورہا ہے اور اپنے تازہ خون کی افراط سے بےچین ہے کہ کچھ کر دکھائے۔ مگر اُس کی بےچینی یورپ کو خام معلوم ہوتی ہے، لیکن نئی قوموں اور افراد کو اپنا ادراک خود آپ دریافت کرنا پڑتا ہے، اِس لیئے اُن کی ابتدائی بلند آوازی اور بےچینی فطری ہے"

کتنا عجیب شخص ہے! ــــ مَیں اتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہوں۔ وہ یہ ابھی منہ موڑے اپنے کام پر جُھکا ہوا ہے۔ اگر اتنا ہی مصروف تھا تو مجھے کسی اور وقت پر بُلا لیتا۔

"دیکھیئے مس شرما" ڈاکٹر مارگن اچانک اپنی پیٹھ موڑ کر میری طرف دیکھنے لگا، "آج مَیں بے حد مصروف ہوں، آپ مجھ سے کوئی سات روز کے بعد ملیئے۔"

"تھینک یُو، ڈاکٹر" میرا چہرہ اُتر گیا۔ "مَیں اگلے سنڈے کو آجاؤں گی" اپنی خفگی کو دبا کر مَیں مُسکرانے کی کوشش کرنے لگی اور میری گھومتی ہوئی نظر اُس کے چہرے پر ذرا سی رُک گئی۔ وہ بھی کچھ چونک کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

مجھے ــــ اور مجھے لگا کہ اُسے بھی ــــ لگا کہ ہم پہلے بھی کہیں مِل چکے ہیں۔ کہاں؟ میری مشکل یہ ہے کہ مجھے کوئی بھی شخص اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔ کسی سے پہلی بار ملتی ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو، ہماری پہلے بھی ملاقات ہوچکی ہے۔ ابھی پچھلے سنڈے کی ہی بات ہے، مَیں فُٹ پاتھ پر ٹیکسی کی منتظر کھڑی تھی کہ میرے پاس سے ایک پینتیس چالیس سالہ آدمی گزر گیا ــــ وہی! ــــ بیس برس پہلے ہر سنڈے کو ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔

"تم بہت بُرے ہو انکل رچی۔ پچھلے سنڈے کو کیوں نہیں آئے؟"

"پچھلے سنڈے کو مَیں بیمار تھا شیلی، سارا ویک فلو سے تڑپتا رہا۔"

"پُوور انکل رچی! ــــ انکل رچی، تم شادی کیوں نہیں کرلیتے؟ ہمارے ڈیڈی بیمار ہوتے ہیں تو ممی اُن کا بہت خیال رکھتی ہیں"

"تم جو میرا خیال رکھتی ہو بے بی۔"

"لیکن انکل، مَیں تمہاری وائف تھوڑا ہی ہوں، مجھ سے شادی کرنا ہے تو ابھی کئی سال انتظار کرنا پڑے گا۔ میرے گیارھویں برتھ ڈے میں بھی ابھی تین مہینے باقی ہیں"

وہی! ــــ وہ شخص میرے قریب ہی نیوز پیپر لینے کے لیئے رُک گیا اور نیوز پیپر لے کر آگے بڑھنے لگا تو مَیں نے اُسے پکارا۔

"ٹھہریئے" مَیں تیزی سے اُس کی طرف بڑھی۔

"نو، نو، ہنی! اگلے سنڈے کو اِسی وقت یہیں ملو، آج نہیں، آج میری جیب خالی ہے۔"

تو ــــ تو پھر یہ آدمی انکل رچی نہیں ہے ــــ ارے ہاں! انکل رچی تو اب ساٹھ سے بھی اُوپر ہوچکا ہوگا، یا شاید مر کھپ گیا ہو ــــ!

"ڈاکٹر مارگن" مَیں نے ڈاکٹر سے پوچھنا چاہا: "کیا ہم پہلے بھی کہیں ایک دوسرے سے مِل چکے ہیں؟"

مگر وہ پھر میری طرف پیٹھ کرکے اپنے ہندوستان کے نقشے پر جُھکا ہوا تھا۔ کتنا نامعقول ہے! جیتا جاگتا ہندوستان، یہاں اُس کی پیٹھ کی جانب اُس کی توجہ کا منتظر ہے مگر یہ اُسی کاغذی نقشے پر ہندوستان کو کھوج رہا ہے۔

"مس شرما" مجھے اُس کی پیٹھ سے اُس کی آواز سنائی دی۔ "ہندوستان کا الگ تھلگ نقشہ دیکھ کر

ہندوستان میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا یہ ضخیم حصّہ بحرِ ہند میں ڈوب رہا ہے ——— مگر جب مَیں ہندوستان کو ساری دُنیا کے نقشے میں دیکھتا ہوں۔" اُس نے پھر اپنا مُنہ میری طرف کر لیا۔" تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری دھرتی نے ساگر سے اُبھر اُبھر کر ہندوستان کا رُوپ اختیار کر لیا ہے اور پھر آس پاس کے مُلکوں کا، اور پھر باقی ساری دُنیا کا ——— تمہارے تھیسِس کا کیا عُنوان ہے؟ ——— نہیں بتاؤ نہیں، مجھے پتہ ہے ——— دا رَیل وَینس آف انڈیا ٹو دا فیوچر وَرلڈ سوسائٹی ——— مجھے تمہارا یہ موضوع بہت پسند ہے مِس شرما۔ مَیں تمہیں بخوشی قبول کرتا ہوں۔"

"تھینک یُو، سر" (اور مَیں تمہیں قبول کرتی ہوں)

اِس پہلی مُلاقات کے چند ہی روز بعد ہم اتنے قریب ہو گئے گویا ایک دوسرے کو شروع سے ہی جانتے ہوں ——— شروع سے ہی، جب ہمارے ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ نا معلوم کہاں تھا اور مَیں کہاں، مگر اپنے محبوب سے ہم ملے ہوں یا نہ ملے ہوں، بالآخر وہ ہمیں ضرور مل جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر مارگن کو مَیں کسی اور شکل میں بھی فوراً پہچان لیتی، کیونکہ مَیں اُسے شروع سے ہی جانتی تھی ——— ٹھہریئے، کئی بار مل چکی ہوں مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں واقعی اُس سے پہلے بھی مل چکی ہوں۔ اپنے خیال میں! میرے خیال میں اُس کی شکل نہ جانے کیا تھی، دراصل اُس کی کوئی شکل تھی ہی نہیں، بس وہ میرا ایک جذبہ تھا، بس یہی ڈاکٹر مارگن، بس یہی ڈاکٹر مارگن، جو ڈاکٹر مارگن نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا، پر ہوتا یہی میرا جذبہ ہی۔

جب ایک دِن ڈاکٹر مارگن نے اپنی محبت کا بے اختیار اظہار کیا تو مَیں اپنا تھیسِس چھوڑ کر بلا جھجک اُس کی آغوش میں آ بیٹھی۔

"مارگی ڈارلنگ۔"

"ہاں، شیلی۔"

"مجھے یقین ہو رہا ہے کہ آج کے ہندوستان کو مستقبل کی عالمگیر برادری میں بڑا اہم رول ادا کرنا ہے۔"

"ہاں شیلی، تم ٹھیک کہتی ہو۔" وہ میرے تھیسِس کے موضوع کو غیر رسمی طور پر برتنے کے لیئے مجھ پر جھک رہا تھا اور اُس کی دھیمی آواز کے فطری رِدھم سے ظاہر تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ "شیلی، ہندوستان کی صداقتوں کو دریافت کرنے کے لیئے مَیں نے کئی سال گھور تپسیا کی ہے اور اپنی تپسیا کا پھل مجھے مل گیا ہے۔" اُس نے میرے ہونٹ چُوم لیئے۔ "مَیں نے ہندوستان دریافت کر لیا ہے۔"

"مگر کپلنگ نے بھی تو اپنی دانست میں ہندوستان دریافت کر لیا تھا۔"

"نو، مائی ڈیر! کپلنگ کی دریافت کی اہمیت اِس سے زیادہ نہ تھی کہ اِسے ہمارے انگلش گرامر سکولوں کے نصاب میں شامل کر لیا جائے ——— نیوَر دا ٹوین شیل میٹ! نان سنس! ——— مشرق اور مغرب زندگی کی دو مختلف انواع نہیں، ایک ہی زندگی کی دو جغرافیائی سمتوں کے سہولتی نام ہیں ——— مگر یہ سہولتی نام بھی اب ہمارے کسی کام کے نہیں، کیونکہ جغرافیائی سمتیں اب پہلے کے مانند ساکن و جامد نہیں، گھومتی رہتی ہیں۔ کونسی سمت نہ جانے کدھر آباد ہے۔"

مارگی کا کہنا غلط نہیں۔ ہمارے خاندان کو مغرب میں بسے ہوئے تین نسلیں ہو گئی ہیں۔ ہندوستان اب ہمارے لیئے گرم مصالحوں، ساڑھیوں اور ہندو دیوتاؤں کے بُتوں کا لگژری ایکسپورٹر ہے اور بس۔

"شیلی ڈارلنگ، کیا تمہاری یہ خواہش نہیں کہ اپنے باپ دادا کے دیش کو جا کے دیکھو؟ ——— تم چاہو تو ہم اپنا ہنی مُون ہندوستان میں ہی منائیں گے۔"

"ہاں مارگی، ہم ہندوستان جائیں گے ——— وہاں ہم نہرو کی بیٹی سے ملیں گے اور کم سے کم ایک مہاراجہ سے، جو اب اپنی پرجا پر راج کرنے کی بجائے اپوزیشن کے ساتھ بیٹھ کر گورنمنٹ کی مخالفت کرتا ہے۔"

"مَیں نے سُنا ہے شیلی، کہ پُرانے ہندوستانیوں کی عُمریں بہت طویل یا بہت مختصر ہُوا کرتی تھیں ——— شاید میرا باپ بھی ابھی زندہ ہو۔"

"تمہارا باپ؟!"

"ہاں میرا باپ ہندوستانی تھا"
"تمہارا باپ تو"
"نہیں، وہ تو میرا سوشل فادر تھا۔ میرا اصل باپ ہندوستانی تھا شیلی، مَیں اُس کا اَتہ پتہ نہیں جانتا، مگر میری ماں نے مرنے سے پہلے اعتراف کیا تھا کہ وہ ہندوستانی تھا"
"تعجب ہے!"
"ہندوستان میرے خون میں ہے ڈارلنگ، دراصل میرے اندر میرا باپ ہی تم سے عشق کرنے لگا۔ میرے باپ نے میری ماں کو طلاق دے کر کسی ہندوستانی عورت سے شادی کر لی تھی ——— دی انڈین وومن از اے ٹریٹ! ——— اے فیسٹ!"
اور مَیں اپنے لانبے لانبے بال کھول کر اپنی ڈوبی ڈوبی آمادہ آنکھوں سے اُس کی جانب دیکھنے لگی اور ہزاروں میل کھارے پانیوں کے بیچوں بیچ بہہ بہہ کر میٹھی میٹھی گنگا ہمارے پاس پھُوٹ پڑی اور اُس کا پانی ہمارے گھٹنوں تک آپہنچا، اور اب کمر کمر تک، اب گلوں تک ——— ہم ڈوب مرنے پر آمادہ تھے ——— اب پانی ہمارے سروں سے بھی اُوپر چڑھ آیا، ہم ڈوب گئے، اپنے آپ کو کھو بیٹھے ———!
دی انڈین وومن از اے فیسٹ!
اینڈ دی انڈین مین؟
دی انڈین مین ہنر ٹری مینڈس اپیٹائیٹ!
"ہاں، ہندوستانی کو بھوک کا احساس نہ رہے تو اُسے جینے کا مزہ ہی نہ آئے"
اور ایک ہندوستانی ناولسٹ کی اِن مبہم سطور کا مفہوم کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا:۔
گنگا سے ہندوستان کی بھوک مٹتی ہے، اِس لئے اُس کے دونوں کناروں پر ہر روز ہزاروں لاکھوں ہندوستانی پیدا ہوتے ہیں اور یہیں بڑے ہو ہو کر لاکھوں کروڑوں اور ہندوستانی پیدا کرتے ہیں۔ جے گنگا! گنگا میں ڈوب بھی مرو تو ہمیشہ زندہ رہو گے ——— جے گنگے!

(۴)

آج کے اخبار میں چھوٹی خبروں کے کالم میں

نئی دلّی، ۱۳ ستمبر۔ ہمارے نمائندۂ خصوصی مُقیم لندن، کی اطلاع کے مطابق انڈین اسکول آف اسٹڈیز کے ڈاکٹر ایل، ایل، مارگن، جنہوں نے حال ہی میں ایک انڈین برٹش نیشنل، شیلا شرما سے شادی کی ہے، اگلے ہفتے اپنے ہنی مون پر ہندوستان آرہے ہیں۔ ڈاکٹر اور مسز مارگن یہاں پہلی بار آرہے ہیں۔ وہ کم سے کم ایک سال ہندوستان میں قیام کریں گے اور مُلک کے سارے اہم مقامات کی سیر کرنے کے علاوہ ہندوستانی طرزِ زندگی کا مطالعہ بھی کریں گے۔
ہمارے نمائندہ کے بیان کے مطابق ڈاکٹر اینڈ مسز مارگن نے ایک بڑی دلچسپ خواہش ظاہر کی ہے:
ہندوستان ہم دونوں کا ایک پرسنل سینٹی مینٹ ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا پہلا بچہ ہمارے قیام کے دوران یہیں پیدا ہو اور ہم اُسے انڈیا کے نام سے کرسچین کریں۔

(۵)

فادرلینڈ

(۱) پالم کے ہوائی اڈہ پر: اِمی گریشن اور ہیلتھ
نام پلیز؟
مارگن، ڈاکٹر ایل، ایل، مارگن؛ اور یہ میری وائف، مسز شیلا مارگن۔
اینی تھنگ ٹو ڈکلیئر، پلیز؟
(مُسکرا کر) اوور ہیبیشن فار انڈیا۔
(سنجیدہ) کیا یہ نام کسی قدیم ہندوستانی ہیرے کا ہے جناب؟ آپ نے اِسے مادام کے نیکلس میں جڑوا

رکھا ہے ؟ ـــــ پرپز آف وزٹ ؟ ـــــ

ہالی ڈے کم بزنس ۔

آپ کون سا بزنس کرتے ہیں ؟ ہیرے جواہرات کا ؟

(ذرا سٹپٹا کر) میں اور میری بیوی ہندوستان کو پیشے کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔

کیسے ؟

بڑے باعزّت طریقے سے : میں لندن میں ڈائرکٹر آف انڈین سٹڈیز ہوں اور میری بیوی، ریسرچ سکالر اِن انڈین سٹڈیز ۔

تھینک یُو، سَر! تھینک یُو، میڈم، یہ لیجئے اپنے پاسپورٹ ۔ وَیل کم ٹُو انڈیا! ـــــ نیکسٹ!

(ب) اِمی گریشن اینڈ ہیلتھ کاؤنٹر سے باہر۔

وَیل کم ٹُو دا ہوٹل آف انڈیا، سَر! وَیل کم، میڈم!

ـــــ ہم ہوٹل سے آپ کے استقبال کو آیا ہوں ۔

تھینک یُو! میرا سامان گاڑی میں رکھوا دیجئے ۔

ہاؤ ڈو یُو ڈُو، ڈاکٹر مارگن ؟ ـــــ میں ڈاکٹر راجمجس ہوں، لیکچرر، سکول آف اورینٹل سٹڈیز ـــــ ہاؤ آر یُو، گریشس لیڈی ؟

ہاؤ ڈُو یُو ڈُو، ڈاکٹر راجمجس ؟ ـــــ شیلی، یہ وہی ڈاکٹر راجمجس ہیں جو ہمارے سکول سے ہندوستان کے توادر پر ریسرچ کرنا چاہتے ہیں ۔

او یس! ـــــ ہیلو ؟

ڈاکٹر مارگن، میری خواہش ہے آپ میرے ہی یہاں قیام کریں ۔

تھینک یُو ڈاکٹر، مگر شیلی اور میں ہنی مون پر آئے ہیں ـــــ ہماری بے راہ روی دیکھ کر آپ ہمیں دو روز میں ہی اپنے گھر سے نکال دیں گے

آپ ہمارے معزز مہمان ہیں ڈاکٹر۔

تھینک یُو وَیری مَچ، لیکن ہم ہوٹل میں ہی جائیں گے ۔

میری ایک اور خواہش ہے ڈاکٹر: آپ ہمیں ہمارے ہندوستان پر کم سے کم وَن سیریز آف لیکچرز

ضرور دیجئے ۔

لیکن میں تو اِس لیئے یہاں آیا ہوں کہ انڈین ایکسپرٹ ہندوستان کے بارے میں میرے علم میں اضافہ کریں ۔

ہم ناچیز کیا اضافہ کر سکتے ہیں ڈاکٹر مارگن ؟

اپنے مُلک کے تعلق سے ہمارا علم تو صرف نصاب و درس تک محدُود رہے ۔

!؟

آپ کا متعجب ہونا غلط نہیں ۔ ہم ہندوستان میں رہ ضرور رہے ہیں مگر ہندوستان پر کوئی معقول ریسرچ کرنے کے لیئے ہمیں انگلینڈ کے ماحول کی ضرورت ہے ڈاکٹر مارگن ۔

تو پھر ریسرچ کو چھوڑ دیجئے اور اپنی روزمرّہ کی انڈین لائف کا سیدھا سادا مشاہدہ کر کے اپنے نتائج اَخذ کیجئے ۔

ہاں ڈاکٹر، یہ آپ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے ۔

آپ کا سامان ٹیکسی میں رکھدیا گیا ہے سَر ۔

تھینک یُو! چلئے ہم آ رہے ہیں ـــــ او، کے، ڈاکٹر راجمجس ـــــ

تھینک یُو اِن ڈیڈ! ـــــ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بُلائیے گا!

ہیلو سَر، مے آئی ـــــ

یس ؟ ـــــ

میں ٹُورسٹ آفیسر ہوں، آپ کے استقبال کے لیئے مجھے خاص آرڈرز ملے، مگر معاف کیجئے میں یہاں پہنچنے میں لیٹ ہو گیا ۔

تھینک یُو آفیسر! میرا ہوٹل والا آ گیا ہے ۔

میری خدمات کی ضرورت ہو تو ـــــ

نو تھینک یُو! ہم اپنے ہوٹل جا رہے ہیں ۔

معاف کیجئے، میں لیٹ ہو گیا، ورنہ آپ کو ذرا بھی تکلیف نہ ہونے دیتا ۔

ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی آفیسر ـــــ گڈ بائی!

معاف ـــــ ک ـــــ

(ج) ہوٹل آف انڈیا میں ۔

لو شیلی، یہ ساری کی ساری دھسکی ایک ہی

ٹھیک میں پی جاؤ۔ تم بہت آہستہ پی رہی ہو۔

نہیں تو۔

کیا تمہیں لگتا ہے تم ہندوستان آگئی ہو؟

مَیں تو جب سے یہاں آیا ہوں ہندوستان ڈھونڈ رہا ہوں۔

بس اتنی سی بات! مجھ سے پہلے ہی پُوچھ لیا ہوتا۔

مَیں مذاق نہیں کر رہا ہوں ڈارلنگ، ہندوستان کہاں ہے؟

مَیں بھی مذاق نہیں کر رہی ہوں ڈارلنگ، تمہارا ہندوستان تمہارے ذہن میں ہے۔

تو کیا مَیں ـــــ؟ ـــــ ارے ہاں، تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ مجھے اُمید تھی کہ ہندوستان پہنچ کر مَیں سیدھا اپنے ذہن میں آ پہونچوں گا اور وہاں میرے مرحوم ہندوستانی باپ کی رُوح میرے استقبال کو موجود ہوگی۔ رُوح مجھے نظر نہ آرہی ہوگی، مگر مَیں اور وہ بغلگیر ہوں گے۔ مَیں اپنے باپ سے بغلگیر ہونے کے لیئے آیا تھا ڈارلنگ، مگر وہ یہاں کہیں نہیں ہے، شاید ـــــ شاید اُسکی رُوح بھی مر چکی ہے ـــــ

تم نے بہت وِہسکی چڑھالی ہے ڈارلنگ، اب اور نہیں پیو۔

نہیں، شیلی، میں وِہسکی کی بات نہیں کر رہا ہوں، مَیں اپنے مرحوم باپ کی بات کر رہا ہوں ـــــ مَیں اپنے باپ کی رُوح سے گلے مِلنا چاہتا ہوں شیلی ـــــ آؤ شیلی ڈارلنگ، آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔

او ـــــ مائی پُوئر ـــــ ڈیئر!

ہندوستان کہاں ہے، شیلی ڈیئر؟ مجھے تھام کر میرے ذہن میں لے جاؤ تاکہ مَیں اپنے باپ سے گلے مِل سکوں۔ میرے باپ نے میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی مجھے چھوڑ دیا تھا ـــــ شیلی ڈارلنگ، اپنی ماں کی کوکھ میں مَیں، ہندوستانی تھا اور کوکھ سے باہر آیا تو کوئی اور ـــــ نہ جانے کون؟ ـــــ

آؤ مَیں تمہیں سُلائے دیتی ہوں مارگی ـــــ

تمہاری طبیعت شاید بہت خراب ہے

نہیں شیلی، میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس تم میری باتیں سُنتی رہو ـــــ میری باتیں اچھی ہیں یا بُری، اِن میں اِتنی دلچسپی لو کہ مجھے اپنی تنہائی کا احساس نہ رہے۔ مجھے معلوم ہونے لگے کہ میرا باپ جی اُٹھا ہے، میری اُکھڑی اُکھڑی باتوں کو بڑے شفیق اِنہماک سے سُن رہا ہے ـــــ ڈیڈی، تم مجھے گھر سے نکال دیتے، اپنے دیش سے تو نہ نکالتے۔ مَیں نے ہوش سنبھالا ڈیڈی تو مجھے پتہ چلا کہ جسے میں اپنا باپ سمجھتا تھا وہ میرا باپ نہیں، میری ماں کا شوہر ہے اور میرا باپ؟ ـــــ نہ جانے میرا باپ کون تھا شیلی، کیا تھا، کہاں تھا؟ اُسے تو میرے ہونے کا بھی علم نہ تھا۔

اب اور مت پیو، مارگی ڈیئر!

نہیں، ڈارلنگ، مَیں چاہتا ہوں کہ پی پی کر مجھے اپنا باپ نظر آنے لگے۔ مجھے اُس کی شکل کا پتہ نہیں۔ بس جو شکل نظر آتی ہے، وہی میرا باپ ـــــ شاید تم ہی میری باپ ہو ـــــ نہیں، تم تو شیلی ہو ـــــ یا شاید وہ۔ کیا نام ہے اُس کا؟ ہمارے رُوم کا بوڑھا سٹیورڈ ـــــ میرا باپ ہے۔ میرا جی چاہتا ہے، اُسے ڈیڈی کہوں ـــــ بلاؤ اُسے شیلی ـــــ بوائے! ـــــ بوائے ـــــ ڈیڈی! یہ ہمارا ہندوستانی سٹیورڈ ہے نا ـــــ وہ بھی میرے باپ کے مانند مجھے بالکل نہیں جانتا، اِسے بھی مجھے جاننے کی قطعاً خواہش نہیں ـــــ میری بڑی عزّت کرتا ہے مگر مجھ سے بالکل بے خبر ہے، اِتنا بے خبر کہ مَیں مر جاؤں تو وہ مجھے سٹریچر میں ڈال کر اسطرح باہر لے جائے جیسے تمہارے سامان کو، جو تمہارے کام کا نہ رہا ہو ـــــ

یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟

سچی باتیں شیلی، سچی ہیں اِس لیئے جھوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ میری ہندوستانیت نے مجھے انگلینڈ میں آؤٹ سائیڈر بنا دیا ہے اور چونکہ میرے لیگل بونا فائیڈز برٹش ہیں اِس لیئے میری ہندوستانیت مشکوک ہے۔ مَیں کہیں کا نہیں رہا، نہ یورپ کا، نہ ایشیا کا، نہ افریقہ

اور امریکہ کا‘ ــــ ساری دُنیا مجھے اجنبی سمجھتی ہے ــــ اور جانتی ہو‘ کیا ؟

کیا ؟ (شاید میرا شرابی شوہر اپنی بے تُکی تکرار کے بعد اب کوئی بڑی بات کہنے جا رہا ہے)

چاند کی دریافت میں مجھ جیسے بین الاقوامی اجنبیوں کی جہد کام کر رہی ہے شیلی‘ تاکہ وہ خلاء میں کسی سرزمین پر جا بسیں ۔ تم میری محبوبہ اور بیوی اور شاگرد ہو شیلی ۔

میری باتوں کو عقیدت سے لوحِ دل پر رقم کر لو : چاند کی دریافت کے معرکے میں دراصل نئے آدمی کی اجنبیت کے الیئے کا ٹھنڈا ہاتھ ہے ۔ ہمارا خلاباز جب چاند سے لوٹ کر بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے بچّے کے مُنہ کو چوم رہا ہوتا ہے تو ذہنی طور پر وہ بدستور خلاء میں لٹکے ہوئے چاند کی سطح سے کنکر چُن رہا ہوتا ہے‘ تاکہ ہمارے سائنسدان پتہ لگا سکیں کہ اِن کنکروں کی ہماری زمین سے مماثلت ہے یا نہیں‘ یہ کنکر ہمارے ہی لختِ جگر ہیں یا نہیں ۔

بس اب تم سو جاؤ ڈارلنگ ۔ کل سویرے ہمیں اجنتا کیوز کے لیئے فلائی کرنا ہے ۔

ہاں شیلی‘ مَیں اُڑ کر اپنی ماں کی کوکھ میں پہنچ جانا چاہتا ہوں ۔ ہندوستان ابھی تک اپنے پہاڑوں میں سجا ہوا ہے‘ اپنے اندر محبت اور جنگ کر رہا ہے اُس کی قدیم اور سالم زندگی جوں کی توں وہیں ہے ۔ مجھے وہیں جانا ہے‘ ہندوستان کے پہاڑوں کے باہر یورپ اور امریکہ ہے ــــ یورپ اور امریکہ میں میرے آدھے بھائی بستے ہیں مگر مجھے اپنے پورے بھائیوں سے ملنا ہے شیلی ــــ شی ــــ ل ــــ ی ــــ !

اب تم سو جاؤ ڈارلنگ ۔

(ہٰ) بمبے وکٹوریہ ٹرمینس ۔

کتنی بھیڑ ہے شیلی !

ہاں معلوم ہوتا ہے‘ سارا ہندوستان یہاں ریلوے سٹیشن پر جمع ہو گیا ہے ۔

تم ٹھیک کہتی ہو‘ آج سارا ہندوستان یہاں ریلوے سٹیشن پر جمع ہے اور کہیں جانے کا انتظار کر رہا ہے ۔

کہاں جانے کا ؟ یہ گاڑیاں تو جہاں بھی جائیں گی اُسے کہیں اُس کے اندر ہی لے جا کر ڈال دیں گی‘ ہندوستان سے باہر تو نہیں جائیں گی ۔

ہاں‘ نادان لوگ ہیں‘ انھیں پتہ نہیں کہ یہاں سے وہاں تک سارا سفر طے کر کے ہندوستان سے ہندوستان ہی پہنچیں گے ــــ مگر نہیں‘ ٹھہرو ! ہندوستان میں ہندوستان ہے کہاں ؟ ہندوستان میں پنجاب ہے‘ مہاراشٹر ہے‘ آندھرا‘ تامل ناڈو یا بنگال ہے ۔ اِن سب گاڑیوں کو وہیں کہیں جانا ہے‘ انہیں ہندوستان نہیں جانا ہے ۔ ہندوستان کہاں ہے ؟ بتاؤ‘ ابھی تک کہیں نظر آیا ۔

آؤ مارگی‘ اُس ریستوران میں بیٹھتے ہیں‘ یہاں تو میرا دَم گھُٹا جا رہا ہے ۔

ہاں‘ آؤ ــــ ذرا دیکھ کے چلو ــــ اِدھر ــــ اِس دروازے سے ــــ آؤ‘ وہ میز خالی ہو رہی ہے ۔ جلدی کرو‘ ورنہ کوئی اور قابض ہو جائے گا ۔ ہم خواہ مخواہ ہندوستانیوں بیڈ مینرز پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں‘ اتنے بڑے کراؤڈ میں پھنسا ہوا کوئی بھلا مانس اپنی جان بچانے کی فکر کریگا یا بار بار رومال سے مُنہ پونچھنے کے لیئے جیب میں ہاتھ ڈالے گا ــــ ارے ! مَیں تمہیں ایک دلچسپ بات بتانا بھول گیا شیلی‘ جب ہم پلیٹ فارم نمبر تین پر کھڑے تھے تو ایک آدمی‘ میری پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال رہا تھا ۔ مَیں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر چھوڑ دیا‘ یہ سوچ کر‘ کہ اتنی بھیڑ میں اسقدر جُڑ جُڑ کر کھڑے ہوں تو کیا پتہ چلتا ہے کہ اپنی پتلون کی جیب ہے یا کسی اور کی ؟ ــــ مَیں نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھا‘ بے چارہ شرمندہ ہو کر رہ جاتا ــــ ارے ! میرا بٹوہ ؟! ــــ شیلی وہ آدمی سچ مچ میرا بٹوہ اُڑا لے گیا ہے‘ اُس وقت مجھے چیک کرنے کا خیال ہی نہ آیا ــــ اب بھی یُونہی ــــ

بٹوے میں کیا رکھا تھا ؟ ــــ

چلو‘ چھوڑو‘ دو ڈھائی سو روپے ہوں گے‘ اُس

بھلے آدمی کی کوئی ضرورت پُوری ہوجائے گی۔ یُوں بھی مَیں چاہ رہا تھا کہ یہاں کسی فرد یا جماعت کی مَدد کے لیئے بجٹ کو تھوڑا ایڈجسٹ کروں —— بئیرر' دو چائے —— کچھ کھاؤ گی شیلی؟ —— نہیں؟ —— ٹھیک ہے۔

تم بہت بے پرواہ ہو مارگی ——

اِتنا بے پرواہ نہ ہوتا ڈارلنگ' تو تم بھی مجھے میرے پاکٹ سے کیسے اُڑا لے جاتیں؟ تم نے تو میرے دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ کیا اور وہ بے چارہ چُپکے سے لے اُڑا۔ چلو چھوڑو —— لو چائے آگئی ہے۔

مارگی' تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہندوستان میں وہ شخصیت کہاں ہے' جسے ہم ہندوستان کہتے ہیں؟

اُس شخصیت نے گھر بار تیاگ کر سنّیاس اختیار کرلیا ہے اور غاروں میں جا کر اپنی پراچین سنسکرتی کی تصویروں میں جا گھُسی ہے۔

ہاں' شاید اسی لیئے اجنتا کی تصویریں سیکڑوں سال مُردہ پڑا رہنے کے بعد اب اچانک زندہ ہوگئی ہیں۔ دیوار پر کھِنچا ہوا ایک بیل تو مجھے اِتنا خوبصورت لگا کہ میرا جی چاہا اُس کے گلے میں رَسّہ ڈال کر اپنے ساتھ لے لُوں —— یہ دیکھو لوگو' یہ صدیوں پُرانا بیل! —— کتنا خوبصورت ہے! —یہی ہندوستان ہے' یہی میرے باپ دادا کی رُوح ہے!

وَ یٹس اِٹ' شیلی! —— ہندوستان آکر مَیں اسلیئے مایُوس ہوا ہوں کہ جب بھی کسی سے مِلا' یہی معلوم ہوا کہ اُس کے باپ دادا سے مِل رہا ہوں —— ہمارا پُرانا کلچر —! ہمارے باپ دادا —— ! —— ارے بھائی' وہ بوڑھے بے چارے مَر کھَپ چکے ہیں' اُنھیں بار بار جھنجھوڑ کر کیوں کیوں اُن کے آرام میں خلل پیدا کرتے ہو؟ اپنا کام کرو' اپنی بات کرو ——

اپنی بات کیا کریں؟ ——

ٹھہرو' بتاتا ہوں —— اِدھر آؤ' بچّے!

تم اِس ریستوراں میں کام کیوں کرتے ہو؟ —— یہ بھی کوئی پُوچھنے والی بات ہے صاحب؟ آپ —— جہاں بھی کام کرتے ہیں' کیوں کرتے ہیں؟ —— مگر تمہاری عُمر ابھی پڑھنے لکھنے کی ہے —— مگر مجھے روٹی کمانا ہے صاحب —— اپنے باپ سے کہو' روٹی کمائے —— میرا باپ اتنی کم روٹی کماتا ہے صاحب' کہ موقع مِلنے پر میری کمائی ہوئی روٹی بھی چُرانے سے باز نہیں آتا۔

یہ کیا بات ہوئی مارگی۔ خود ہی سوال کیا اور خود ہی اپنی مرضی کا جواب دے دیا۔ ہوسکتا ہے وہ بچّہ شام کو یہاں کام کرتا ہو اور دِن بھر سکول میں پڑھتا ہو۔

چلو یونہی سہی شیلی —— اِدھر آؤ' بچّے' بتاؤ تم بار بار اپنے امتحان میں فیل کیوں ہوتے ہو؟ —— ساری رات یہاں کام کرکر کے صبح کو سکول جاتا ہوں صاحب' تو کلاس میں نیند آجاتی ہے۔ مَیں سوچتا ہوں اِسطرح نہیں تو اُسطرح سہی: ٹیچر نے مجھ سے کہہ رکھا ہے' کہیں سے کسی طرح ایک سو روپے لے آؤ' امتحان کا سارا پیپر تمہیں اپنے سامنے بِٹھا کر کروا دُوں گا۔ ہمارا ٹیچر بڑا شریف ہے صاحب' بس سو روپے کی بات ہے' پھر ——

وہ دیکھو مارگی' ہمارے ٹریولنگ ایجنٹ کا آدمی ہماری حیدرآباد کی بُکنِگ کروا کے لوٹ آیا ہے۔ شاید ہمیں ہی ڈھونڈ رہا ہے —— آؤ۔

ٹھہرو' مجھے چائے ختم کر لینے دو —— شیلی' یہ آدمی ہے نا —— یا آدمی نہیں' تو بے چارہ جو کچھ بھی ہے —— یہ بھی حیدرآباد کا ہی ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا' ہمارا شہر حیدرآباد بڑا خوبصورت ہے۔ مَیں نے پُوچھا' پھر تم وہیں کیوں نہیں رہتے؟ جواب دیا' پچھلے سال کئی برس کے بعد گیا تھا کہ وہیں رہ جاؤں گا' لیکن شاید غلطی سے کہیں اور جا پہنچا۔ یا شاید مَیں ٹھیک وہیں پہنچا' پر حیدرآباد ہی وہاں سے کہیں اور چلا گیا تھا' اُس اجنبی سرزمین نے مجھ سے پُوچھا' تمہیں تلگو آتی ہے؟ اور جب اُسے پتہ چلا کہ نہیں آتی تو اُس نے اپنا مُنہ موڑ کر جانے کسے بتایا' کوئی غیر مُلکی ہے بیچارہ! —— دیکھو شیلی' غریب ہمیں اِسطرح ڈھونڈ رہا ہے' جیسے اپنے مُلک کی بے سُود تلاش کرتے کرتے یہاں' ہندوستان کے

کنارے پر آپہنچا ہو۔

آؤ چلیں، مارگی، دیر ہو رہی ہے۔

(ح) کسی ہندوستانی یونیورسٹی کی اسپیشل کانووکیشن پر،

لیڈیز اینڈ جنٹلمین!

مجھے آپ سب کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ کی یونیورسٹی نے مجھے ڈاکٹر آف لیٹرز کی آنریری ڈگری عطا کرنے کے لئے اِس اسپیشل کانووکیشن کا انعقاد کیا ہے۔ مَیں نے چھ ہندوستانی اور چار عالمی زبانوں میں ایم۔ اے کر رکھا ہے، اِس کے علاوہ چھ مزید ہندوستانی اور عالمی زبانوں میں سرٹیفیکیٹ آف پرافی شینسی حاصل کیا ہے۔

(یونیورسٹی کے مہمانِ خصوصی کو بڑے دھیان سے سُنتے ہوئے مارگن کو کسی انگلش سرکس کلاؤن کا خیال آگیا جو اپنے مُنہ سے سبھی آوازیں بخوبی برآمد کر لیتا تھا)

لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ـــــ مَیں دُنیا بھر کی آدھی سے زائد معروف زبانیں بخوبی سمجھ سکتا ہوں اور کم سے کم ایک چوتھائی بول سکتا ہوں ـــــ

(شیلی ـــــ

ہاں، مارگی ـــــ

ہر شخص کے مُنہ میں کتنی زبانیں ہوتی ہیں؟ ـــــ

ہا ہا ہا ـــــ ہا!

ہنسو نہیں مارگی۔ اگر میرے حلق میں ایک کی بجائے دس زبانیں فِٹ ہوتیں ـــــ

ہا ہا ـــــ ہا ہا!

اور مَیں تمہاری طرح ہنسنا چاہتا تو اپنے حلق میں دس لوتھڑوں کو بیک وقت اُوپر نیچے ہلتے ہوئے پاکر میرا دم نکل جاتا۔)

لیڈیز اینڈ جنٹلمین، مَیں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ اعزاز بخشا ہے ـــــ مگر میرا کام ابھی ادھورا ہے میری خواہش ہے مَیں دُنیا کی ساری زبانیں بول سکوں۔

(دُنیا کی ساری زبانیں بول بول کر اِس فاضل مقرر نے کہنا کیا ہے؟ ـــــ)

لیڈیز اینڈ جنٹلمین ـــــ مجھے یہی کہنا ہے کہ ـــــ

(کہ مَیں دُنیا کی ساری زبانیں بول سکتا ہوں۔)

(د) رانچی کے پاگل خانے میں ـــــ

وہ بوڑھا کون ہے، ڈاکٹر؟ ـــــ وہ، جو سب سے الگ تھلگ بیٹھا ہے؟

ایک مسلمان ہے بے چارہ۔ پچھلے سال یہاں ہندو مسلم فساد ہوا ڈاکٹر مارگن، تو اس کے گھر کے سبھی لوگ مارے گئے۔ اپنے ہاتھوں سے اُنھیں قبروں میں لٹا کر گھر پہنچتے پہنچتے پاگل ہوگیا ـــــ اور جانتے ہیں، کیا؟ ـــــ آجکل وہ سمجھتا ہے کہ وہ مر چکا ہے اور بیوی بچوں کو مرنے کے لئے اپنے پیچھے زندہ چھوڑ آیا ہے۔

کیا ہم اُس سے مِل سکتے ہیں ڈاکٹر؟

ہاں، کیوں نہیں؟ ـــــ آئیے! ـــــ

آؤ، شیلی ـــــ

یس، مارگی ـــــ ارے! یہ تو آپ ہی آپ ہونٹ ہلائے جارہا ہے۔؟ ـــــ آواز نہیں نکل رہی ہے، مگر لگتا ہے کہ کچھ کہہ رہا ہے ـــــ آؤ مارگی، رُک کیوں گئے؟

گُڈ مارننگ، بابا! ـــــ یہ میرا شوہر مارگی ہے اور مَیں شیلی ہوں اور آپ ـــــ؟

ہاں، بیٹی، میرے بارے میں بھی مجھے بتاؤ، مَیں کون ہوں؟ مجھے یاد ہی نہیں آرہا کہ مَیں کون ہُوں۔

تم خان بابا ہو، خان بابا۔

ہاں ڈاکٹر صاحب، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جب مَیں زندہ تھا تو لوگ مجھے خان بابا ہی پکارا کرتے تھے ـــــ میری ایک بیٹی تھی، بیٹی ـــــ بالکل تمہاری طرح، نہیں، تمہاری طرح نہیں، اپنی طرح تھی ـــــ نہیں، تمہاری طرح ہی تھی، کیا ـــــ کیا تم ہی تو ـــــ ہاں، تم ہی تو ہو ـــــ آؤ بیٹی، آؤ، میرے گلے لگ جاؤ ـــــ تمہاری ماں کہاں ہے؟ محمود کہاں ہے؟ ـــــ وہ سب لوگ کہاں، چھوڑ آئی ہو؟ ـــ بولو ـــــ بولو! مریں تو انھیں بھی کیوں نہ

ساتھ لے آئیں ___ اُن سے کہتیں تو وہ آنکھ جھپکنے
میں تم سب کو بیک وقت ڈھیر کر کے رکھ دیتے۔ اُن جنگجوؤں
کے سامنے یہ کوئی بڑا کام تھا ___ بس یہ اب جا رہے ہو
اور یہ اب مر گئے ___ شکر ہے اللہ کا مر گئے ہو ورنہ
مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ کیسے جیو گے ___ چلو چھٹی ہوئی۔ خدا
نے ہماری سن لی ___ بیٹی اِس جنت میں یہ جو ڈاکٹر ہے نا،
ہندو ہے ___ ہاں، ہندو ہی ہے ___ ڈرو نہیں، اِتنا
شریف آدمی ہے کہ خدا نے اُسے جنت کا ڈاکٹر بنا دیا ہے،
ڈرو نہیں ___ بڑا شریف آدمی ہے، اِک ذرا نماز نہیں
پڑھتا، ورنہ اُس سے تمہاری شادی کر دیتا۔

آپ اب آرام کیجئے بابا خان۔

آرام ہی کر رہا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ قبر میں آرام ہی
آرام ہوتا ہے، مگر ایک بات بتائیے : میں مر چکا ہوں تو
سوچتا کیوں ہوں ! ___ کیا مرنے کے بعد بھی آدمی کو سوچ
سوچ کر مرنا پڑتا ہے ؟ ___

آپ کیا سوچتے ہیں خان بابا ؟ ___

سوچتا کچھ نہیں، پر سوچتا ہوں کہ جس شخص نے
مجھے ڈھیر کیا وہ میں تھا اور میں وہ۔ اُس نے جب مجھے
قتل کیا تھا تو دراصل میں ہی اُس کے قتل کا مرتکب ہوا
تھا۔ میں ہی قصوروار ہوں، کوئی بھی خون کرے، انسان
ہی خونی ہے، میں ہی خونی ہوں، مجھے سزا دو، سولی پر
چڑھا دو ___ اُس وقت تک سولی پر چڑھائے رکھو،
جب تک میرا ضمیر نہ جی اُٹھے ___ مگر مجھے کوئی سزا نہیں دیتا۔
میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں، مجھے سزا دیجئے۔ مجھے اپنے آپ
سے ڈر لگتا ہے ___ مجھے سخت سے سخت سزا دیجئے۔

آپ آرام کیجئے خان بابا۔

خان بابا ؟ ___ کہاں ہے خان بابا ؟ جلدی بتائیے
میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا ___ دیکھو خان بابا، ایک
صورت ہے ___ میں تمہیں ہندو ہونے کو نہیں کہتا،
میرا کہنا صرف یہی ہے کہ اپنی قرآن سنسکرت میں پڑھو،

بولو ___ بولو! ___ ب ___ !

خان بابا ___ خا ___ !
پھر چُپ ہو گیا ہے، مگر ہونٹ بدستور ہلائے جا رہا
ہے ___

ہاں، اب چُپ رہے گا ___ آئیے چلیں ڈاکٹر مارگن،
آئیے میڈم ___ میں نے ایک بار خان بابا سے پوچھا، بابا
چُپ چاپ ہونٹ ہلائے جا رہے ہو، کچھ کہنا چاہتے ہو ؟ ___
اُس نے جواب دیا، ہاں، بہت کچھ ___ تو کھل کر کیوں
نہیں بولتے خان بابا ؟ ___ بابا بول اُٹھا، میری زبان کو بند
ہی پڑا رہنے دو ڈاکٹر، کھل گئی تو بیچاری اُردو پر سچ مچ
لشکر کا گمان ہونے لگے گا۔

(ظ) کلکتہ کی ایک شاہراہ

رات کا وقت۔ چکاچوند روشنی۔ کولڈ ویو ___
مارگن اور شیلا اپنے اپنے بدن کو اچھی طرح لپیٹ کر بند
دوکانوں کے سامنے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔
کہیں کہیں وِنڈو شاپنگ کے لئے تھوڑا سا ٹھہر جاتے
ہیں ___ ایک بہت بڑی فرنشنگ کی دوکان کی وِنڈو
کے شیشے کے پیچھے ایک بڑا آرام دہ بیڈ نما صوفہ بچھا ہوا
ہے۔ صوفے پر ایک خوبصورت لڑکی کا بُت نرم و گرم پلش
کے کمبل میں لپیٹ کر اِس طرح لیٹایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا
ہے کہ وہ مٹی کا بُت وِنڈو کے شیشے کے اندر حیات
آفریں جدّت سے جی اُٹھا ہے، بڑی گہری نیند سو رہا ہے،
بڑے میٹھے سپنے دیکھ رہا ہے اور ہر سانس کے ساتھ
اُس کے چہرے پر نئی مُسکان سی آجاتی ہے ___ نہیں !
مارگن اور اُس کی بیوی کو مغالطہ ہوا ہے کہ یہ بُت نہیں،
سچ مچ کی لڑکی ہے۔ ابھی ابھی اِس کی گردن بائیں طرف
مڑی ہوئی تھی، اب دائیں طرف جُھک گئی ہے ___
اور وِنڈو کے نیچے فٹ پاتھ پر ایک ننگا دھڑنگا،
میلا کچیلا نوجوان لمبا ہوا پڑا ہے، اُس کی بے سانس
شکل پر کسی اچھے بُرے سپنے کا سایہ نہیں، بس بُت سا
بُت ہے۔ اِس بے جان مٹی کے بُت پر سردی کا اثر
کیا ہوگا ؟ ___

مارگن۔ کے جی میں آئی کہ وِنڈو کے شیشے میں ذرا سا سُوراخ کر دے تاکہ باہر کی سردی تیز تیز اندر گھس جائے اور وہ خوبصورت لڑکی چھینک مار کر جاگ اُٹھے اور پھر وہ اُس لڑکی سے مخاطب ہو کر کہے، اِس نوجوان کے بُت کو اپنے ساتھ ہی لٹا لو بھئی، یہاں بے چارہ بے جان پڑا ہے، وہاں تمہارے مخملیں بستر میں جی اُٹھے گا!

ارے! یہ کیا کر رہی ہو شیلی؟

فوٹو اُتارنے کے لیئے کیمرا سیٹ کر رہی ہوں مارگی؟

ٹھہرو! تین چار آدمیوں نے اچانک کہیں سے وارد ہو کر مارگن اور شیلی کو گھیر لیا ہے۔

آپ کیا کر رہے ہیں؟

مَیں فوٹو اُتارنا چاہ رہی ہوں۔

زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کیجئے۔ فوٹو آپ اُتار چکی ہیں۔ آپ لوگ ہماری مُفلسی سے روپیہ کمانے کے لیئے ہمارے اُلٹے سیدھے فوٹو لے جاتے ہیں —— آپ کون ہیں؟ ——

ہم —— ہم ——

جلدی بتایئے! کیا آپ کسی اِمپرئیلسٹ پریس یا ریڈیو کے ایجنٹ ہیں؟ —— یا جاسوس ہیں؟ ——

ہم ——

اگر آپ اپنی جان بچانا چاہتے ہیں تو یہ کیمرا ہمارے حوالے کر دیجئے —— تھینک یُو! —— اب اپنی جیبیں بھی خالی کر دیجئے۔

مگر ——

مگر وگر نہیں چلے گا۔ چلو، جلدی کرو! ——

(٦)

بدستور فادر لینڈ

(ایک)

مارگن اور شیلی کو اچانک آج شام کو کناٹ سرکس کے کسی کافی ہاؤس میں وہی رائٹر مل گیا، جس سے چند روز پہلے ڈاکٹر راجنس نے اُن کا تعارف کروایا تھا۔ اس وقت وہ سوبر دکھائی دے رہا تھا، ورنہ پہلی ملاقات میں وہ نشے میں دُھت تھا۔ ڈاکٹر راجنس نے اُنھیں بتایا تھا کہ بڑی عمدہ کانٹروورشل رائٹنگ کرتا ہے پر ہر وقت شراب پیئے ہوتا ہے۔

”میرے بچے پچپن کروڑ سے بھی زائد ہیں۔“ رائٹر نے مارگن سے کہا تھا۔ ”جس شخص کی اتنی بڑی اولاد ہو، وہ پیئے بغیر کیسے ہوش میں رہ سکتا ہے۔“

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو گویا ساری ہندوستانی قوم کے باپ ایک تم ہی ہو۔“

”قانون بیک وقت دو باپوں کو تسلیم نہیں کرتا، لہٰذا میری اِس ساری اولاد کا کوئی باپ ہے تو ایک مَیں ہی ہوں۔“

”ہمارے عبدل بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔“ ڈاکٹر راجنس نے تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔ ”انہوں نے اپنا سرنیم، فرسٹ نیم اور فادرز نیم عبدل عبدل عبدل ہی مشہور کر رکھا ہے۔ اب آپ اِسے کسی بہت ہی تیز رفتار ریس ہارس کا نام سمجھ لیجئے، یا کسی بہت اچھے ہندوستانی رائٹر کا۔“ ——

”ہاؤ آر یُو، مسٹر عبدل؟ —— کیا ہم آپ کے ساتھ یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟“ کافی ہاؤس میں مارگن اور شیلی اُسکی میز کے پاس چلے آئے۔

”آیئے مسٹر —— مسٹر —— معاف کیجئے مَیں آپ کا نام بھول گیا ہوں —— ہاں —— ڈاکٹر مارگن —— ہاؤ ڈو یُو ڈو، میڈم؟ —— بیٹھیئے —— آپ ٹھنڈی کافی پیئیں گے یا گرم؟ —— بیئرر! —— اِدھر آؤ، دو ٹھنڈی کافی لاؤ —— ہاں، ہاں، مجھے بخوبی یاد ہے ڈاکٹر مارگن، ہفتہ بھر پہلے ڈاکٹر راجنس کے ساتھ آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹر راجنس کو یہ غلط فہمی ہے کہ مجھے شراب کی لت لگی ہوئی ہے، اِس لیئے مَیں جب بھی اُس سے ملتا ہوں ایسے بن جاتا ہوں جیسے بہت زیادہ شراب پیئے ہوئے ہوں۔ مجھے یقین ہے ڈاکٹر، اگر ڈاکٹر راجنس کسی دِن مجھے ہوش میں دیکھ لے تو پہچان ہی نہ پائے کہ مَیں مَیں ہوں۔ اب آپ ہی بتایئے، اِتنے

اچھے دوست کی نظروں میں خواہ مخواہ اجنبی کیوں ہو جاؤں ـــــ میں نے سُنا ہے آپ ہندوستان میں خوب گھوم رہے ہیں۔

"ہاں، گھوم تو رہے ہیں مگر ابھی تک ہمیں اصل انڈیا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں مِلا۔"

"آپ کو کیا اصل کی نقل اُتارنا ہے مسٹر مارگن؟ جہاں جو کچھ اپنی دو آنکھوں سے نظر آجائے وہی اصل ہے ـــــ چلیئے، خالی ہوں تو آج ہوٹل مہاراجہ میں سپیشل انڈین نائٹ ہے: لباس، کُرتا پائجامہ؛ ڈرنک، بھنگ اور بادام کا پانی؛ فوڈ، پنیر پکوڑے اور چھولے بٹھورے؛ ـــــ اِنٹرٹین منٹ، یورپی دُھنیں اور ہندوستانی جادو کے کھیل" ـــــ

"وَیری اِنٹرسٹنگ! مگر ہم کُرتا پاجامہ کہاں سے لائیں گے؟"

"آپ اطمینان رکھیئے ڈاکٹر، مَیں سب بندوبست کردوں گا یہ لیجیئے میڈم، آپ کی ٹھنڈی کافی آگئی"

(دو)

ہوٹل مہاراجہ کا لونج کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، ہوٹل کی اِس سپیشل اِنڈین نائٹ کے موقع پر تین چوتھائی سے بھی زیادہ لوگ غیر مُلکی ہیں، جو دیسی لباس پہن کر اِسطرح خوش ہیں، گویا فینسی ڈریس شو میں حصّہ لے رہے ہوں۔

"جان، اِس لباس کو پہن کر مجھے اپنا آپ اِتنا ہلکا محسوس ہو رہا ہے جیسے مَیں نے اپنی جِلد کے سِوا اور کچھ نہ پہنا ہو" ـــــ ایک یورپی خاتون نے اپنے ساتھی سے کہا ہے۔

"ہاں، نینسی، تم اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ میرا جی چاہتا ہے تمہاری جِلد کو اُتارنا شروع کر دوں۔"

"مگر میری جِلد اُتار دوگے تو مجھ میں اور اُس مرحوم عورت میں تمیز کیسے کروگے جسے تم ماں کہاں کرتے تھے ـــــ تمہیں بھنگ بہت پڑھ گئی ہے جان" ـــــ

اُن کے ساتھ ہی کی میز پر عبدل اپنے مہمانوں کو لیئے بیٹھا ہے۔

"یہ لو مسٹر مارگن بھنگ اور بادام کا گلاس، اِسے تیز تیز پی جائیے، پھر دیکھیئے، بینائی کتنی روشن ہو جاتی ہے۔ اِسے پیتے ہی آدمی ایکس رے مشین بن جاتا ہے اور جسے دیکھ لے، اُس کا سارے کا سارا باطن سامنے آجاتا ہے"۔

"نہیں، مسٹر عبدل" شیلا نے اُسے بتایا ہے ـــــ "باطن دیکھ لینے سے کسی کی پہچان تھوڑا ہی ہو جاتی ہے، سب کے باطن کی ساخت ایک جیسی ہوتی ہے۔"

"ہاں، مسٹر عبدل، آدمی کی اصل شناخت تو باہر سے ہوتی ہے۔" مارگن نے اپنی بیوی سے اتفاق کیا ہے۔ "اُس کی سوچ کا وسیلہ تو اُس کا چہرہ ہے۔"

"تو پھر مجھے یہ کہنا ہے ڈاکٹر، کہ ہم سب کو بھول جانے کے لیئے بھنگ پیتے ہیں، کہ وہ ہمارے سامنے بھی آکھڑے ہوں تو ہمیں نظر نہ آئیں، یا اِسطرح نظر آئیں گو یا سب ایک جیسے ہیں، کوئی کسی کا دوست نہیں، کسی کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں، سب رشتے کچھ یوں اُدھڑ گئے ہیں کہ سب کا سب سے رشتہ ہو گیا ہے، یا" ـــــ

"چھوڑیئے میرے دوست، پی کر دیکھ لیتے ہیں، اپنے آپ سب کچھ سمجھ میں آجائے گا ـــــ چیئرز!" ـــــ

"چیئرز!" ـــــ

"چیئرز! ـــــ مَیں تو اِس لیئے پیتا ہوں ڈاکٹر مارگن، کہ اپنی تھکی ہاری سمجھ بُوجھ کو زبردستی ہالی ڈے پر بھیج دُوں۔ سمجھ بُوجھ، جب سمجھ بُوجھ سے کام لینے کے قابل نہ رہے تو اُس سے کام لیئے جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ ـــــ اب دیکھیئے نا، میری سمجھ بُوجھ کی حماقت، اِس وقت مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ میرے آس پاس دیسی لباس پہنے ہوئے یہ سارے غیر مُلکی ہی ہماری آزاد حکومت کے سربراہ ہیں" ـــــ

"کیا مطلب؟"

"کوئی مطلب کی بات ہو تو مطلب بھی سمجھاؤں، مجھے لگ رہا ہے کہ ہماری آزادی سے صِرف یہ ہُوا ہے کہ ہمارے پُرانے انگریز آقاؤں نے اب دیسی لباس پہن کر حکومت کرنا شروع کر دیا ہے ـــــ یہ بھنگ تو واقعی بہت

مزیدار ہے ۔ آپ آہستہ آہستہ پیجئے مسز مارگن ، ورنہ منہ سے پیتے ہی سیدھی دماغ میں جا پہنچے گی ۔"

" تو کیا ہرج ہے ؟ دماغ بیچارہ بھی پی لے گا ۔"

" آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر ـــــ یہ پنیر پکوڑے کھائیے ، بہت مزیدار ہیں ـــــ آپ ٹھیک کہتے ہیں ۔ اگر ہم اپنے منہ کو اجازت دیتے ہیں کہ پی لے تو انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ دماغ کو بھی پینے دیں ۔ مجھے اپنے یورپی دوستوں سے یہی شکایت ہے کہ منہ سے تو گھڑوں پی جاتے ہیں ، پر دماغ کو ایک بوند بھی نہیں پینے دیتے ـــــ یہ کہاں کی جمہوریت ہے ؟"ـــــ

" ہندوستان کی جمہوریت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے مسٹر عبدل ؟"

" ہمارے ہندوستان کی جمہوریت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے میڈم مارگن ۔ پوری ہتھنی کی ہتھنی ہے ۔ جنگلوں سے نکل کر ہماری شاہراہ کے عین درمیان آ کھڑی ہوئی ہے ۔ ہماری ساری ٹریفک رکی پڑی ہے کہ یہ ہتھنی ذرا پالتو سی معلوم ہونے لگے اور ایک طرف ہٹ جائے تو آمدورفت شروع ہو ـــــ لیجئے آپ ایک اور گلاس لیجئے ڈاکٹر مارگن ۔

آپ آہستہ آہستہ پیجئے مسز مارگن "

" میں کیوں آہستہ آہستہ پیوں ؟"

" کیونکہ آپ شرابی ہو گئیں تو ـــــ معاف کیجئے مجھے بڑا عجیب سا خیال آیا ہے ۔ مجھے ڈر ہے آپ"

" نہیں ، آپ ضرور کہئے مسٹر عبدل "ـــــ

" تو لیجئے ، کہے دیتا ہوں : آپ شرابی ہو گئیں مسز مارگن ، تو آپ کو مجھ پر ہی میرے دوست ڈاکٹر مارگن کا دھوکہ ہونے لگے گا ۔ میرا تو کچھ نہیں ، پر ڈاکٹر مارگن کہاں جائیں گے ـــــ اگر انھیں عبدل بننا پڑ گیا تو وہ بے چارے میرے گھر کے راستے سے بالکل ناواقف ہیں ۔"

" نان سنس !"ـــــ

" نہیں شیلی ، میری مشکل واقعی یہی ہے کہ مجھے کسی ہندوستانی کے گھر کا راستہ معلوم نہیں ، اور تو اور ، مجھے اپنے باپ کا بھی اتہ پتہ نہیں ـــــ میں قطعاً لاعلم ہوں کہ میرے نصف بھائی کہاں رہتے ہیں ، کیسے رہتے ہیں ؟"

" نصف بھائی ، سے آپ کی کیا مراد ہے ڈاکٹر ؟ میرے خیال میں تو پورے بھائی بھی دراصل نصف بھائی ہوتے ہیں اور چونکہ وہ نصف بھائی ہوتے ہیں ، اس لیئے وہ اصل چوتھائی بھائی ہیں ، اور چوتھائی ہیں ، اس لیئے ـــــ اینڈ سو آن ـــــ کون کس کا پورا یا آدھا یا چوتھائی بھائی ہے ڈاکٹر ؟ سب کے سارے رشتے اپنے بدن کے اندر ہی ہوتے ہیں "ـــــ

" لیڈیز اینڈ جنٹلمین !"

اسٹیج پر ایک جادوگر مہاراجہ کے لباس میں کھڑا ان سے مخاطب ہے ۔

" مہاراجہ کی فل یونی فارم پہنے ہوئے ہے پر "ـــــ

" ہاں ، پر پریوی پرسز کے بغیر اپنی رائل یونی فارم کے باوجود صاف کوئی پیشہ ور جادوگر معلوم ہوتا ہے ۔"

" اٹینشن لیڈیز اینڈ جنٹلمین !"

سب نے اپنے اپنے بھنگ کے گلاس روک کر نشے سے اکھڑی اکھڑی توجہ سے اپنے کان کھڑے کر لیئے ہیں ۔

" میں یہاں جادو کے روائتی کرتب دکھانے کے لیئے حاضر نہیں ہوا ہوں ، بلکہ باتوں باتوں میں اپنا کمال پیش کروں گا "ـــــ

" ہندوستانی باتیں بہت کرتے ہیں ۔" نینسی کے ساتھی نے کہا ہے ۔

" ہاں ۔" نینسی نے اسے جواب دیا ہے ۔ " پچھلے سال ہم ہوم لیو پر انگلینڈ گئے ہوئے تھے ، وہاں اپنے گھر بیٹھے بیٹھے جب بھی مجھے شور سنائی دیتا ، یہی لگتا کہ ہندوستان سے ہی چلا آ رہا ہے ـــــ پر ایک بات ہے جان : اپنی کنٹری میں پہنچ کر ہندوستان کا شور بہت بھلا معلوم ہوتا ہے ۔" نینسی نے بھنگ کے گلاس اور چھولوں بھٹوروں کی طرف دیکھ کر سوچا ہے کہ

پہلے بھنگ کا گھونٹ بھرے یا پکوڑے کا لقمہ اُٹھائے، مگر اُس کا شرابی ذہن اُس سے تعاون نہیں کر رہا ہے۔ "ہندوستان کو چاہیئے جان، کہ کم سے کم اپنا آدھا شور ایکسپورٹ کر دیا کرے، اِس طرح اِس کا فارن ایکسچینج کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

"پُر نینسی ڈیئر"۔ جان بھنگ کے نشے سے اچانک اِتنا سنجیدہ ہو گیا ہے کہ اُسے دیکھ کر ہنسی چھوٹ جائے۔ "پرابلم یہ ہے کہ ہندوستان اپنا شور ایکسپورٹ کیسے کرے۔"

"یہ بھی کوئی پرابلم ہے۔" اُن کے ایک ہندوستانی دوست نے پرابلم کا حل پیش کیا ہے۔ "آپ لوگوں کے سائنسدان ہمارے پرابلم چٹکیوں میں حل کر دیں گے۔ آپ کے سائنسدان بھی ہمارے جادوگروں سے کم نہیں ___ ارے، وہ جادوگر کہاں گیا؟ ابھی ابھی تو یہیں اسٹیج پر تھا۔" ___

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین، میرا کمال ملاحظہ ہو: مَیں آپ کے سامنے اسٹیج پر ویسے ہی موجود ہوں مگر آپ کو نظر نہیں آ رہا ہوں"

ایکا ایکی اسٹیج کے پاس سے ہی ایک یورپی نے اپنی سیٹ سے اُٹھ کر صدا بلند کی ہے۔

"میرے دوستو، وہاں اسٹیج کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ وہ جادوگر یہاں میرے ذہن میں گھس آیا ہے، یہیں میرے ذہن سے بول رہا ہے، یا شاید اِس وقت میری میری بجائے وہی بول رہا ہے۔ ہندوستان کا جادو میرے سر چڑھ گیا ہے۔"

"جادو وہ، جو سر چڑھ کے بولے۔" عبدل بول پڑا ہے۔

"شٹ اَپ!" اُس یورپی نے عبدل کی طرف دیکھ کر کہا ہے۔ "آئی ایم ساری! ___ میرا مطلب ہے مجھے ٹوکو نہیں، مجھے سنو: مَیں اکثر سوچا کرتا تھا، آخر یہ شے ہے کیا، جسے ہم ضمیر کہتے ہیں؟ بھلا ہو اس بھنگ کا، آج مَیں نے اپنا یہ مسئلہ حل کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے، پچھلے ہفتے میری اپنے ضمیر سے ہی ملاقات ہوئی تھی، وہ ایک ہندوستانی تھا جو دس دن کی لگاتار بھوک سے نڈھال ہو کر زمین پر گرا ہوا تھا۔ اُس کی جان نکل رہی تھی، یا ہو سکتا ہے اِس لیئے اٹکی ہوئی ہو کہ پہلے کچھ کھا پی لے۔ میرے دوستو، مَیں اپنے ضمیر کو اِس حالت میں پا کر تڑپ اُٹھا اور اُس کی طرف تیزی سے بڑھا۔" یورپی تقریباً رو رہا ہے۔

"مگر میرا ضمیر مجھے اپنی طرف سُرعت سے بڑھتے ہوئے پا کر ہڑبڑا اُٹھا۔ 'نہیں! نہیں! نہیں! مجھے زندہ رہنے دو! مجھے ___' اُس کی جان نکل گئی! وہ بھلا آدمی مجھے ملک الموت سمجھ رہا تھا دوستو! ___ مَیں نے بڑی نیک نیتی سے اپنے ضمیر کو جان سے مار ڈالا۔ مَیں ایک نہایت خوشحال مُلک کا شہری ہوں مائی فرینڈز۔ میرے سبھی ہم وطنوں کو بھی میرا ہی مسئلہ درپیش ہے ___ ضمیر کا مسئلہ، مگر وہ بے سُود اُسے اپنے ہی مُلک میں ڈھونڈ رہے ہیں، پہلے زمانے کی اور بات تھی، سفر کے ذرائع بہت محدود تھے۔ ہمارا ضمیر ہمارے اپنے ہی مُلک میں رہائش پذیر تھا، مگر آج جیٹ کی اِیج میں ہمارا ضمیر محترم یہاں ہندوستان میں آ بسا ہے۔ میرے دوستو، یہ کیا سِتم ظریفی نہیں کہ ہمیں تو جینے کی ہر لگژری مُہیا ہے مگر ہمارے بوڑھے باپ کو بھوک سے جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں ___ ہندوستان سے میری یہ التجا ہے کہ ہمارا ضمیر ہمیں لوٹا دیا جائے، ہمارے واجب التعظیم باپ کو ہمارے حوالے کر دیا جائے" ___

"نہیں۔" عبدل پھر اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا ہے، تمہارا ضمیر اب ہندوستانی شہریت اختیار کر چکا ہے، وہ اب ہمارا ہو گیا ہے، ہم ہی میں سے ہے، ہم اُسے واپس نہیں دیں گے۔ اپنے ضمیر کو اب ہمارے ساتھ مر جانے دو۔"

"چلو، مسٹر عبدل، اب چلیں"۔ مارگن نے عبدل کو کرسی پر بٹھا کر کہا ہے۔ "ہم تمہیں راستے میں تمہارے گھر چھوڑ دیں گے۔"

"مجھے اپنے گھر کا محلِ وقوع یاد نہیں رہا مسٹر مارگن، آپ جائیے، مَیں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ میرا گھر کہاں ہے کہ میرے ماں باپ امریکہ میں رہتے ہیں یا رُوس میں ___ آپ جائیے ڈاکٹر مارگن ___

مجھے سوچنے دیجئے!"

(۷)

مارگن

نامعلوم مَیں کہاں بیٹھا ہُوا ہوں ـــــ باہر یا کہیں اندر؟ ـــــ اور مجھے اپنے سامنے ایک بوڑھا اجنبی نظر آرہا ہے، اور نہ مَیں اُس اجنبی سے باتیں کر رہا ہوں، نہ وہ اجنبی مجھ سے، مگر اِس وقت میرے ذہن میں اُس کے سوا اور کچھ نہیں ہے ـــــ میری آنکھیں اُس کے سر پر ٹِکی ہوئی ہیں:

یہ سارے کا سارا کُرۂ اَرض، جیسے مَیں گویا اپنے راکٹ سے جھانک کر دیکھے جارہا ہوں اور میرا راکٹ بڑی تیزی سے خلاؤں کو پار کر کر کے کرۂ اَرض کی جانب چلا آرہا ہے، ابھی ابھی یہاں دھند دھند تھی، کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا مگر اب پانی اور خشکی جُدا جُدا دکھائی دینے لگے ہیں ـــــ کتنا زیادہ پانی ہے ـــــ پانی ہی پانی ـــــ موت کی اجنبی وُسعتیں اور گہرائیاں، جنھوں نے زندگی کو گھیر رکھا ہے مگر زندگی کا باعث بھی ہیں۔ ہماری زمین غرقاب کے اِس منظر میں بھرپُور زندہ معلوم ہوتی ہے ـــــ بڑے بڑے پہاڑوں اور وادیوں اور میدانوں کی سانسوں سے آس پاس کا خلاٗ بھی ذی جان سا لگ رہا ہے ـــــ مَیں نے کرۂ اَرض کو چُھو لیا ہے۔ مَیں نہ جانے کہاں سے آیا ہوں مگر مجھے یہیں آنا تھا۔ جب میرے ماں باپ ملے تھے تو مَیں نے کسی نامعلوم سیارے سے اپنا یہ کائناتی سفر شروع کیا تھا، پیہم سفر کرتا رہا، اور اب اِس عجیب کُرّے میں پہنچ کر مجھے لگ رہا ہے کہ مَیں اِس سے مانُوس ہوں، اِس اجنبی کو پہلی بار دیکھا ہے لیکن اِسے جانتا ہوں ـــــ پر یہ ہے کون؟

آپ کون ہیں؟

پہلے تم بتاؤ، تم کون ہو؟

آپ میرے سوال کا جواب دیں گے تو شاید ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں۔

لیکن مَیں تمہیں بالکل نہیں جانتا۔

مَیں نے کب دعوےٰ کیا ہے کہ مَیں آپ کو جانتا ہوں؟

مگر اپنی لاعلمی کے باوجود مجھے اُس سے مانوسیت کا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ اجنبی میرے لئے یکسر اجنبی ہے ـــــ یہ میرا ـــــ ہاں، کہیں یہ میرا ـــــ

تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے کوئی یتیم اپنے مرحوم باپ سے ہمکلام ہو۔

ہاں، یہ اجنبی بوڑھا میرا باپ ہی ہے۔

تم کون ہو؟

اگر آپ میرے باپ ہیں تو آپ کو پتہ نہیں مَیں کون ہُوں؟

گلوب اپنے ہی اِرد گرد گھوم رہا ہے اور مَیں نے لڑکھڑاتے ہوئے اُسے اپنی باہوں میں لے لیا ہے اور سمندر کا پانی چڑھنے لگا ہے اور جُوں جُوں پانی چڑھ رہا ہے، مَیں اُونچا ہوتا جا رہا ہوں اور چاہ رہا ہوں کہ گلوب میری باہوں میں ٹھہر جائے مگر وہ بدستور گھومے جا رہا ہے ـــــ ٹھہرئیے ـــــ ایک جگہ ٹھہر جائیے! ـــــ ٹھہر جائیے!

گلوب اپنے اِرد گرد گھُومتا جا رہا ہے اور مجھے خیال گزرا ہے کہ اگر وہ ٹھہر جائے تو اُس کے سارے پہاڑ دھڑام سے نیچے آگریں، تین چوتھائی سمندر چار چوتھائی ہو جائے، قیامت آجائے۔

ہم کہاں ہیں؟

ہندوستان کے بیچوں بیچ۔

گلوب بدستور گھوم رہا ہے۔

ہندوستان سدا ایک ہی جگہ پر نہیں رہتا، میرے اجنبی دوست ـــــ میرا مطلب ہے، میرے بیٹے! اب ہندوستان یہاں ہے، اب وہاں ـــــ اب یہاں آپہنچا ہے، جہاں انگلینڈ ہے ـــــ اب

ہندوستان پھر ہندوستان میں لوٹ آیا ہے ــــــ اب ہندوستان پھر ہندوستان سے باہر جا رہا ہے ــــــ

کرۂ ارض خلا میں معلّق ہے اور اپنے محور کے ارد گرد پیہم حرکت پذیر۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ہماری زمین سورج کی ایک ہی جانب، جامد ہو جائے اور طلوع و غروب کی کیفیات نہ رہیں تو کیا ہوتا، زندگی اپنے موجودہ سیاق سے نکل کر کس کُرے میں چلی جائے؟ کیا پتہ اپاہج ہو کر گھٹتی گھٹتی ڈھیر ہی ہو جائے ــــــ رُتیں اِسی لیے بدلتی ہیں کہ ہماری دھرتی ہمیشہ چلتی پھرتی رہتی ہے۔ زندگی کی گہما گہمی چلنے پھرنے کی خواہش سے ہی وابستہ ہے، اِسی فطری خواہش کے باعث زندگی کی ٹانگیں ہیں، اور جہاں اُس کی ٹانگیں نہیں وہاں وہ رینگ رینگ کر چلتی ہے۔ اُس کی حرکت پذیر کیفیات سے ہی اُس کی ایک ایک شکل سے ہزار ہزار شکلیں وجود میں آتی ہیں۔ یہاں ایک بیج ڈال دیجئے، نا معلوم کہاں کئی نو بہ نو زندگیاں اُگ آئیں گی ــــــ فرطِ محبت سے یہاں اپنی محبوبہ کے گلے میں باہیں ڈال دیجئے اور گھومتی ہوئی دھرتی پر جھول جھول کر کہیں سے کہیں جا نکلئے ــــــ اور نہ جانے وہاں یا وہاں ــــــ یا کہاں پہنچ کر آپ کی محبوبہ کے سوئے ہوئے تخلیق کے درد جاگ اُٹھیں اور جاگ جاگ کر اُس کے پیٹ سے باہر آنے کو بے تاب ہو ہو جائیں۔

میں یہاں پیدا ہوا ہوں، میرے وجود کے اندر اپنے اُسی باپ کا خون ہے اور وجود کے باہر اُسی ماں کی گود۔ یہ یورپ کی عظیم الشان رہائش گاہیں ہیں، یورپ کی تعلیم گاہیں ہیں، آرٹ گیلریاں ہیں، لیبارٹریاں ہیں، رنبو لائف کی سبھی اِنسٹی ٹیوشنیں ہیں، یہی ہندوستان ہے! ہندوستان یورپ کے نقشے میں نظر آ رہا ہے، ہندوستان ہندوستان سے باہر چلا آیا ہے، گھر بار چھوڑ کر اپنے مستقبل کے سفر پر نکلا ہوا ہے ــــــ اور اب ہندوستان پھر اپنے گھر بار کی جانب مُنہ موڑے گا، باہر کا سارا چکر کاٹ کر پھر اپنے نقشے میں لوٹ آئے گا اور پہلی نظر میں اُس کا بدلا ہوا چہرہ اجنبی سا معلوم ہوگا۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ میں کسی ہندوستانی جھیل میں، اپنے ہی چہرے کا عکس دیکھ رہا ہوں ــــــ اپنے آپ سے گھڑی بھر کی اجنبیت، دائم کی رفاقت پر کیسے حاوی ہو سکتی ہے۔ کرۂ ارض متواتر اپنے محور کے ارد گرد گھومتا جا رہا ہے۔

اور میں اپنی دونوں آنکھیں کھول کر اپنے ہی وجود میں بیٹھے اپنی ساری کائنات کا تماشہ کر رہا ہوں۔

مادر گی! ــــــ ما ــــــ ر ــــــ!

مجھے بہت دُور سے سُنائی دیا ہے اور اپنے وجود سے باہر نکل کر میں نے دیکھا ہے کہ شیلی میرے سامنے کھڑی مُسکرا رہی ہے اور بڑی اچھی لگ رہی ہے۔

اور میں نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اُسے اپنے پاس بٹھا لیا ہے اور زرخیز دھرتی کو سُونگھ سُونگھ کر مجھے بے اختیار خواہش ہونے لگی ہے کہ ہل چلانا شروع کر دوں۔

اور دھرتی نے شرما کر اپنا سَر جھکا لیا ہے اور اپنے خیال ہی خیال میں دیکھ رہی ہے کہ اُس کے خوبصورت چہرے پر نئی زندگی کا بور پھوٹ رہا ہے۔

▲

لیڈر

جوگندرناتھ

مہندر ناتھ ——

یوں پیدا ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس دنیا میں ہر روز سیکڑوں آدمی پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں پھر بھی پیدائش کا سال بتانے میں کیا ہرج ہے تاکہ سند رہے کہ میں ریاستِ بھرت پور میں سن ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ ہمارے والد صاحب اس ریاست میں بحیثیت ڈاکٹر کام کرتے تھے۔ ہمارے والد صاحب ریاست بھرت پور کو چھوڑ کر ریاست کشمیر میں نوکر ہو گئے۔ کشمیر میں ایک چھوٹی سی ریاست پونچھ تھی۔ یہیں ہمارے والد صاحب کا زیادہ عرصہ گذرا۔ اسی ریاست میں آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی، پھر لاہور میں آکر پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا اور میرے بڑے بھائی کرشن جی ایم۔ اے، ایل ایل بی کر چکے تھے اور افسانہ نگاری کے میدان میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ میں نے ۱۹۴۰ء میں لکھنا شروع کیا۔ میرا پہلا افسانہ بعنوان "ریاضت" رسالہ "ساقی" میں چھپا جس کے ایڈیٹر مرحوم شاہد احمد دہلوی تھے۔ میرے افسانے ہندوستان اور پاکستان کے تمام مشہور رسالوں میں چھپ کر خراجِ تحسین پا چکے ہیں اور ابھی تک میرے افسانوں کے نو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے مندرجۂ ذیل نام ہیں۔ (۱) چاندی کے تار (۲) گالی (۳) پاکستان سے ہندوستان تک (۴) مائی ڈارلنگ ہوٹل (۵) یہاں سے وہاں تک (۶) تیغ بیماری (۷) جہاں میں رہتا ہوں (۸) برات (۹) تنہا تنہا۔

میں نے پہلا ناول ۱۹۵۰ء میں لکھا جس کا نام تھا "آدمی اور سکّے"۔ یہ ناول کافی مقبول ہوا۔ اس ناول کے تقریباً چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس ناول کے علاوہ اُن ناولوں کے نام لکھے دیتا ہوں جو چھپ چکے ہیں: رات اندھیری ہے۔ وعدہ۔ سُورج، ریت اور گناہ۔ ایک شمع ہزار پروانے۔ تیری صورت میری آنکھیں۔ منزل ایک مسافر دو۔ درد کا رشتہ۔ زیرو سے ہیرو۔ ارمانوں کی سیج۔ پیار کا موسم۔ پیاسا دل۔ ٹھوکر اور لیڈر جو شاعر کے ناولٹ نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ میرا تازہ ترین ناولٹ ہے۔ اس کا اندازِ بیان اور تکنیک بالکل نئی ہے۔

کشمیر سے لیکر بمبئی تک کا سفر کافی دلکش، دلفریب اور تکلیف دہ رہا۔ سکھ اور دکھ کی پرچھائیوں سے ہمیشہ کھیلتا رہا۔ زندگی کے نشیب و فراز دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان مجموعۂ اضداد ہے۔ اچھائیوں اور برائیوں کا پتلا۔

بمبئی میں لکھنے کے علاوہ پانچ چھ فلموں میں بحیثیت ایکٹر کام کیا۔ "سرائے کے باہر" اور "دل کی آواز" میں بحیثیت ہیرو کام کیا۔ ان دونوں فلموں کے پروڈیوسر ڈائرکٹر کرشن جی تھے۔ یہ پیشہ مجھے راس نہ آیا۔ پھر مختلف فلموں کے ڈائیلاگ لکھے۔ جیسے: دل کی آواز۔ مُنّا۔ باغی شہزادہ۔ ممّی ڈیڈی۔ تاج اور تلوار۔ مہارانی۔ گستاخی معاف۔ اُمید اور اسی طرح چند اور فلموں کے ڈائیلاگ لکھے جن کے نام اس وقت یاد نہیں۔ چند اور فلموں کے ڈائیلاگ لکھ رہا ہوں۔ میرے دو محبوب موضوع ہیں۔ ایک تو انسانوں کے "جنسی مسائل" اور دوسرا "عوام کی غربت"۔ ان دو موضوعات کے اِرد گرد میں افسانوں اور ناولوں کے تانے بانے بُنتا رہتا ہوں۔ اس ٹکنالوجی کے دَور میں غربت تو مٹائی جا سکتی ہے جو ابھی تک ہندوستان سے نہیں مٹائی گئی۔ یوں میرا ایمان اشتراکیت پر ہے، ایسی اشتراکیت، جہاں فرد کی انفرادی شخصیت پروان چڑھ سکے اور ہندوستان سے بھوک اور بیکاری کا خاتمہ ہو۔ جہاں تک ادب اور انسانوں کے بنیادی مسائل کا تعلق ہے، انہیں کس طرح ادب میں سمونا چاہیئے، اس کے بارے میں یہ عرض کروں گا کہ چاہے افسانہ ہو یا ناول۔ غزل ہو یا نظم —— ان میں اگر جاذبیت نہیں، کشش نہیں، شگفتگی نہیں، جمالیاتی حس نہیں ہے تو ادب پھیکا اور بے رس رہے گا۔ زبان کی لطافت اور چاشنی، اندازِ بیان، لفظوں کی نشست، تکنیک، جذبے اور خیال کا ہم آہنگ ہونا۔ کردار اس قسم کے تخلیق کئے جائیں کہ ہم کہہ سکیں، ایسے کردار ہم نے دیکھے ہیں یا ایسے کردار اس دنیا میں ہو سکتے ہیں۔ اگر ان تمام چیزوں پر نظر رکھی جائے تو ایسا ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے —— یوں اچھے ادب کی کنجی کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ بڑھیا گیہوں تو پیدا کیا جا سکتا ہے مگر بڑے ادیب کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ ابھی تک انسان کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں کر سکا جس کی مدد سے وہ ٹالسٹائے، داستوفسکی، غالب، کرشن چندر یا فیض احمد فیض پیدا کر سکے ——

(خود نوشت)

مہندر ناتھ

تم چالیس برسوں کے بعد ملے ہو۔ یہ عجیب سی بات ہے۔ ساتھ ہی حیرت انگیز بھی، کہ اتنا عرصہ تم زندہ رہے اور میں بھی۔ حالانکہ ہم دونوں کو مرجانا چاہیئے تھا۔ یوں فکر کرنے کی کوئی بات نہیں، موت کی سزا ہم دونوں پر شمشیر کی طرح لٹک رہی ہے۔ اور ہم کسی وقت بھی مر سکتے ہیں۔ یا مارے جا سکتے ہیں۔ حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں، کہ موت بہت سستی ہو گئی ہے، اور زندگی بہت مہنگی، بہرحال یہ تو بتاؤ۔ تم اتنا عرصہ کیا کرتے رہے، تمہاری خاموشی سے میں یہ سمجھ گیا کہ تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میں اتنا عرصہ کیا کرتا رہا۔ دراصل کچھ کرنا یا نہ کرنا خاص اہمیت نہیں رکھتا، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تم اس سے پہلے کہاں ملے تھے۔ کس جگہ ملے تھے۔ کیوں ملے تھے۔ اور اگر ملے تھے۔ تو ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ کیوں ہوئے، اور اگر الگ بھی ہوئے تھے تو آج اچانک ملاقات کیوں ہو گئی۔

یوں ماہ و سال گزرتے دیر نہیں لگتی، دراصل ماہ و سال تھمے ہو۔ یہ وقت کی نشانیاں ہیں۔ وقت تو اندھیرے اور روشنی سے بے نیاز رہتا ہے، وقت ایک جامد چیز ہے، جس کو ہم نے رواں دواں بنایا ہے۔ مجھے وہ دن یاد آرہے ہیں جب ہم دونوں بچے تھے۔ اور سیب اور ناشپاتیوں کے باغ میں اکٹھے کھیلے تھے۔ چاروں طرف گرانڈیل پہاڑ۔ چھوٹا سا گھر۔ نیلا آسمان، ٹھنڈی ہوا۔ دور ایک ندی بہتی تھی۔ اس وقت تمہاری آنکھیں نیلی نیلی سی تھیں۔ آج کچھ پیلی پیلی سی ہو گئیں۔ شاید میری آنکھوں کا بھی یہی حال ہوگا۔ شاید تم بولنے کی کوشش کر رہے ہو۔ مگر میں تمہیں بولنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں تمہیں بہت سی باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ تم شہری تہذیب و تمدّن سے کافی دور رہے۔ اور جنگلی تہذیب میں پلتے رہے۔ اور میں نے جدید تہذیب و تمدّن میں آنکھیں کھولیں۔ دراصل تہذیب و تمدّن کا چکر ہم نے انسانوں کو بے وقوف بنانے کیلئے چلایا ہے۔ چند لفظ گھڑ گئے ہیں۔ اُنہیں ترازو میں رکھ کر آدمی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں۔

تم میری الٹی سیدھی باتیں سن کر گھبرانا نہیں۔ میں کافی بے ربط اور بے تکی باتیں کروں گا۔ اور تم صرف ہاں میں ہاں ملانا۔ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں اور تمہیں باتیں سننی پڑے گی۔

کیا پیو گے شراب۔ ارغوانی شراب۔ جوان عورت کی آنکھوں کی طرح بدمست کر دینے والی شراب، کسی دوشیزہ کے رخساروں کی طرح سُرخ شراب۔ شراب پینا اس شہر میں قانوناً منع ہے۔ کاش جینا بھی ممنوع کر دیا ہوتا تو بہتر بات ہوتی۔ یوں شراب پینا ممنوع ہے مگر پرمٹ مل سکتا ہے۔ اور جہاں تک دیسی شراب کا تعلق۔ یعنی ٹھرّا۔ وہ تو ہر جگہ ملتی ہے۔ ہر کونے میں ہر گھر میں۔ شراب کشید کی جاتی ہے۔ کہو تو منگوا دوں۔ شراب پینے سے شرماؤ نہیں۔ اس شہر میں اگر تم شرماؤ گے تو بھوکے مر جاؤ گے، جو بات دل میں آئے اُسے بے دھڑک کہہ دو۔ اپنے حقوق کو ریاست کے سربراہوں کے سامنے رکھو۔ چلّا چلّا کر اور بہ بانگِ دہل۔ کہو۔ ڈھول پیٹ کر کہو۔ تاکہ حکمران طبقے کو یہ معلوم ہو کہ تم کیا چاہتے ہو۔ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ شرم و حیا کا زمانہ کب کا ختم ہو چکا۔ اگر تم چُپ رہے جلد راہیِ ملکِ عدم ہو جاؤ گے۔

ارے تم بولتے نہیں۔ چپ کیوں ہو۔ تم تو میرے بچپن کے ساتھی ہو۔ میں نے تمہیں بچپن میں دیکھا تھا۔ مجھے ابھی یاد ہے۔ میری قوت یادداشت بڑی تیز ہے۔ قریب آؤ نا۔ سائے کی طرح مجھ سے دور کیوں کھڑے ہو۔ کیا تم مجھے پہچانتے نہیں۔ کیا دیکھ رہے ہو۔ میں کیا ہوں، میں کیا تھا۔ اور کیا بن گیا ہوں۔ شاید تمہیں میری صورت پسند نہیں آئی۔ حیران کیوں ہو رہے ہو۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو پتھروں سے باتیں کیا کرتا تھا۔ پتھر میری باتیں سنتے تھے۔ اور خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھتے تھے میری باتوں کو اپنے پتھریلے سینے میں دبا لیتے تھے۔ اور میری باتوں کا جواب نہ دیتے۔ آج کل میری یہی حالت ہے۔ بلکہ میری یہ عادت بن چکی ہے کہ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ لوگ میری باتیں سنتے رہیں۔ اور میری باتوں کا جواب نہ دیں۔ تم جواب دے کر کیا کرو گے۔ میں جواب سننے کیلئے تیار ہی نہیں۔ تو سنو۔ ہاں تم یہ پوچھنا چاہتے ہو۔ کہ میں آج کل کیا کر رہا ہوں۔ یہ بھی خوب بات پوچھی تم نے۔ نہایت بے معنی اور فرسودہ بات پہلے یہ بتاؤ کہ تم اتنا عرصہ کیا کرتے رہے۔ تم نے شادی کر لی ضرور کی ہوگی۔ اس کے علاوہ ایک انسان کیا کر سکتا ہے۔ اشرف المخلوقات ہونا۔ دانش ور انسانی نسل کو بڑھانے کیلئے ہر مرد کو شادی کرنا چاہیئے۔ اس نسل کو فصل کہا جائے تو بہتر بات ہوگی۔ دنیا کا کاروبار کیسے چلے اگر افزائش نسل کا کاروبار نہ چلے، اشرف انسان کیا کرے۔ اتنی لمبی عمر پا کر کچھ تو کرنا ہی پڑے گا، شادی کرنا سب سے آسان بات ہے۔ چلئے صاحب آپ نے شادی کر لی بچے ضرور پیدا کئے ہوں گے۔ کتنے بچے پیدا کئے۔ پانچ صرف پانچ، بہت کم ہیں۔ زیادہ پیدا کئے ہوتے۔ تو کم سے کم گلی محلے میں تو نام مشہور ہو جاتا۔ کیا کر رہے ہیں تمہارے بچے۔ اسکول میں پڑھتے ہوں گے۔ اور بیچارے کیا کر سکتے ہیں۔ جی ہاں۔ پڑھا لو۔ چند اسکول اور کالج کی کتابیں پھر ایک ڈگری مل جائیگی تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔ ان آزمودہ نسخوں کے بغیر نوکری کا ملنا مشکل ہے۔

دراصل دنیا کا چکر چلانے کا یہی طریقہ ہے۔ کہ جو کچھ تم نے اپنے والدین سے سیکھا اور جو کچھ تمہارے والدین نے اپنے والدین سے سیکھا تھا۔ اُن سب کو ملا کر کھرل میں پیس کر یہ ساری تعلیم اپنے بچوں کو پلا دو۔ تاکہ جب وہ ماں باپ بن جائیں۔ تو پوری نسل کی ذہانت، ساری [illegible] اور ساری ریاکاری بچوں کے حوالے کر دیں۔ تاکہ سند رہے کہ تم باپ بن کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے تھے۔

میں باپ نہیں بنا۔ لو جی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ کیا میں نے غلطی کی۔ حضورِ انور میں لیڈر بن گیا۔ لیڈر بھی باپ ہوتا ہے۔ باپ گھر میں حکومت کرتا ہے۔ لیڈر ساری ریاست پر حکومت کرتا ہے۔ باپ گھر کے اخراجات کیلئے محنت مزدوری کرتا ہے۔ اور بچوں کو کھلا پلا کر اور ڈانٹ ڈپٹ پر حکومت کرتا ہے۔ مگر لیڈر دوسروں کی محنت پر زندہ رہتا ہے۔ اور بڑے ٹھاٹ سے عوام پر حکومت کرتا ہے۔ اور اُنہیں بتاتا ہے۔ کہ کام اس طرح کرنا چاہیئے۔ خود لیڈر بڑے آرام سے خراٹے لیتا ہے۔ اور عوام کی کمائی پہ زندہ رہتا ہے۔ ان پر حکومت کرتا ہے۔ کتنا اعلیٰ کام ہے۔

تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو۔ کہ میں لیڈر کیوں بنا۔ دیکھو تم بولو نہیں۔ میں تمہاری خاموشی سے سمجھ گیا کہ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ جب سے میں لیڈر بنا ہوں۔ میں یہ پسند نہیں کرتا۔ کہ کوئی مجھ سے کوئی سوال کرے۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہ تم باپ کیوں بنے۔ باپ بن کر تم نے کون سی حاتم طائی کی قبر پر لات ماردی جو میں نہ مار سکا۔ آخر تم نے انہیں لکھا پڑھا کر کیا بنا دیا جو میں قوم کو الٹا سیدھا پڑھا کر بگاڑ دوں گا۔ ارے بھئی۔ یہ لوگ بھیڑ بکریوں سے کم نہیں۔ بیچارے بولتے ہی نہیں۔ صرف حکم الٰہی سننا چاہتے ہیں۔ اور میں ہر روز حکم الٰہی۔ صادر کرتا رہتا ہوں۔ لوگ بجا خوش اور مطمئن رہتے۔ میرا چرچا کرتے ہیں۔ میرا جلوس نکالتے ہیں میرے گلے میں پھولوں کے ہار پہناتے ہیں۔ جگہ جگہ میرے بت نصب کرتے ہیں۔ میری تقریروں کو بار بار سنتے ہیں۔ اور سر دھنتے ہیں۔ کبھی کبھی چیختے ہیں چلاتے ہیں۔ گلا پھاڑ کر نعرے لگاتے ہیں۔ اور آزادی کے دن سارے شہر میں چراغاں کرتے ہیں۔ پاگلوں کی طرح گھومتے پھرتے ہوئے۔ گلی کوچوں میں نعرے لگاتے ہوئے

بازاروں سے گزرتے ہوئے میرا نام لے کر زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ اور جب نعرے لگاتے لگاتے تھک جاتے ہیں، تو پھر اپنے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔ دن کا ہنگامہ رات کی خاموش فضا میں مدغم ہو جاتا ہے۔

اچھا۔ تو تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ میری باتوں سے اوب گئے ہو۔ کیا تم یہ شہر دیکھنا چاہتے ہو۔ بھئی دکھا دوں گا۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ میں نے ان خوبصورت عمارتوں کو دیکھا ہے۔ باغوں میں گھوما ہوں۔ تمہیں گھوما دوں گا، کبھی تم نے اس شہر کو بلندی سے دیکھا ہے۔ یعنی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر۔ یہ واقعی بڑی خوبصورت بندرگاہ ہے۔ چاروں طرف پھیلا ہوا سمندر، اور بیچ میں یہ چھوٹا سا جزیرہ۔ اور اس جزیرے میں لوگوں نے رہنے کیلئے مکان بنوائے ہیں، بڑی بڑی اونچی بلڈنگیں، عظیم الشان عمارتیں۔ جہاز۔ موٹریں۔ فیکٹریاں، ریلیں بس، گاڑیاں، سب کچھ دوڑتی نظر آتی ہیں۔ آج کل —— SKY SCRAPERS بہت بن رہے ہیں۔ جن کی آخری منزل پر نہانے کیلئے تالاب ہیں۔ جہاں جواں لڑکیاں نہاتی ہیں، خوبصورت چمکتے ہوئے جسم ان نیلے پانیوں میں تیرتے ہیں۔ جب بجلی کی تیز روشنی تالاب کے پانی پر پڑتی ہے، اور پانی سے گزرتے ہوئے جوان جسموں کو چھوتی ہے، تو وہ بلوریں جسم قوسِ قزح کی روشنی میں جل پریاں سی بن جاتے ہیں۔ اور اتنے جاذب نظر اور پُرکشش ہو جاتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ کسی ماہ جبیں ماہ لقا۔ دلربا کو پکڑ کر ——

مگر اس سے ذرا دور تمہیں جھونپڑوں کی بستی بھی نظر آئے گی۔ اونچی اونچی بلڈنگوں کے نیچے اتنی گندگی۔ اتنی غربت دکھائی دے گی۔ کہ تمہارے من میں یہ بات ضرور آئے گی کہ ان اونچی عمارتوں کا کیا مصرف ہے۔ زندگی میں اتنا۔ تضاد اتنی امیری اور پھر اتنی غربت ——

تم مسکرا رہے ہو۔ اور میں دیکھ رہا ہوں، کہ تم مسکرا رہے ہو۔ تمہاری مسکراہٹ ایک مکھیہ منتری سے ملتی جلتی ہے۔ بھلا سا نام ہے اس مکھیہ منتری کا۔ اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے، جانے دو۔ جب تم مسکراتے ہو۔ کتنے معصوم اور بھلے لگتے ہو۔ خاص کر جب میں باتیں کرتا ہوں اور تم مسکراتے ہو، تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یوں جب میں تقریر کرتا ہوں تو لوگ بے تحاشہ تالیاں پیٹتے ہیں۔ اس وقت میں کتنا خوش ہوتا ہوں، اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔ یہ مسکراہٹ بڑی اچھی چیز ہے، عمر کو بڑھانے کیلئے ایک مجرب نسخہ ہے۔ اس نسخے کو اپنے سینے سے لگا کر رکھو۔ اور جب تک میں مسکراتا رہوں تم بھی مسکراتے رہو۔ بولو نہیں۔ تم کو نہیں، دوسروں کا بولنا مجھے اچھا نہیں لگتا، اس دنیا میں چند لوگ صرف بولنے کیلئے آئے ہیں۔ باقی محض سننے کیلئے تم صرف محض ہو اور جو کچھ میں ہوں۔ تمہارے سامنے ہوں۔ میں تمہارا فیصلہ سننے کیلئے تیار نہیں۔ میں کسی کا فیصلہ نہیں سنتا۔ میں فیصلہ کرتا ہوں۔ میں فیصلہ سناتا ہوں۔ سنتا نہیں۔

اب تم بتاؤ تم اس شہر کو دیکھنے کیلئے بیتاب کیوں ہو۔ میں یہ شہر تمہیں ضرور دکھاؤں گا۔ لیکن شہر دکھانے سے پہلے میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ میں اس شہر سے کتنا بیزار ہوں۔ تمہیں بتا نہیں سکتا۔ میں ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھ کر کبھی خوش نہیں ہوا۔ میں نے ان کے باغوں میں بیٹھ کر کبھی سکون حاصل نہیں کیا۔ سمندر کو دیکھ کر بچوں کی طرح میں نے کبھی تالیاں نہیں بجائیں۔ نیلا آسمان سمندر کا شفاف سینہ۔ یہ ہلکی ہلکی ہوائیں۔ جھومتے ہوئے ناریل کے درخت آج کل بالکل اچھے نہیں لگتے۔ اب تم یہ پوچھ رہے ہو مجھے کیا اچھا لگتا ہے۔ اب مجھے صرف اپنے بت اچھے لگتے ہیں اپنی تصویریں اچھی لگتی ہیں۔ جب کسی مجمع کے سامنے تقریر کرتا ہوں۔ اور اس تقریر میں دا ہی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، لفظوں کی جادوگری ضرور ہوتی ہے، میں تقریر کرتے ہوئے رونے لگتا ہوں۔ آواز میں درد اور کرب ہوتا ہے، جس سے لوگ بیحد متاثر ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی رونے لگتے ہیں، اس وقت میں بیحد خوش ہوتا ہوں۔ اور یہ سمجھتا ہوں۔ جیسے میں سورگ میں ہوں، میرے سامنے اس وقت کچھ نہیں ہوتا۔ صرف میں یا میرا وجود، یعنی میرے سوا اور کوئی نہیں۔ لوگ تالیاں پیٹتے ہیں۔ اس وقت یہ لوگ مجھے حقیر نظر آتے ہیں اور میرا وجود کتنا بڑا، اس وقت میں جو چاہوں کرا لوں اُن سے اس وقت وہ لوگ میری مٹھی میں ہوتے ہیں۔ میری خطابت کی مقناطیسی قوت انھیں میرا اسیر بنا لیتی ہے، اس وقت میں ان سے کچھ بھی کہوں کر بیٹھیں گے۔ سارے شہر

یں آگ لگا دیں گے۔ بچوں کو مار ڈالیں گے۔ عورتوں کی عصمت دری کریں گے، پاگلوں کی طرح ناچیں گے۔ یہ کلبلاتے ہوئے کیڑے۔ بے عقل، جاہل، بے جان۔ بے حس لوگ، اس وقت تالی بجاتے ہیں، اور اُس تالی سے میری صدا آتی ہے، ہیں۔ ہیں۔ ہیں۔ تم ان لمحات کی قدر نہیں کر سکتے، تم ان لمحات سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے، تم لفظوں کی جادوگری، ان کی خطابت۔ تقریر کی ساحری اس کی جادوگری سے بے بہرہ ہو۔ ہائے تم نے اِن لمحات سے کبھی حظ حاصل نہیں کیا۔ اِن کا لطف وصل کی لذت سے زیادہ ہوتا ہے۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں، کیسے بتاؤں۔ تم بہت دُور سے آئے ہو، ان چیزوں سے ناواقف ہو۔ اس لطیف کیفیت کی سرشاری سے آگاہ نہیں ہو — ان سے وہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں، جو لیڈر ہیں، تم اس شہر کو دیکھنے آئے ہو ضرور دیکھو اس کو، لیکن اس شہر کو دیکھنے سے پہلے میری باتیں سُنتی ہوں گی۔ دراصل میں ایک لیڈر ہی نہیں۔ ایک انسان بھی ہوں، صرف ایک انسان ہی نہیں، ایک مرد بھی ہوں۔ ایک عرصہ ہوا ایک باپ کا بیٹا بھی تھا۔ جو ایک زمانے میں بیحد غریب تھا، اور جب مرا تو لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر مرا، جو کچھ میں کہتا ہوں۔ اس پر مجھے یقین نہیں، اب جو کچھ میں کہتا ہوں لوگ اس پر یقین کرتے ہیں۔ اور تالیاں بجاتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں، جیسے میں کوئی مداری ہوں۔ اور وہ محض تماشائی،

میرے عزیز دوست میرے ہمدم، میرے ہمسفر، تم میرے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہو۔ یعنی میں نے پچاس برسوں میں کیا کیا، ایک لیڈر رہنے کے علاوہ، یعنی تقریریں کرنے کے علاوہ، قوم کو بہتر یا بدتر بنانے کے علاوہ میں نے کیا کیا؟

اس پر غور کرنا ہوگا۔ میرے دوست، ایسی باتیں، میں صرف بچپن کے دوستوں کو بتا سکتا ہوں۔ مجھے میں یہ باتیں بتائی نہیں جاتیں۔ ہاں تو بڑی بڑی باتیں کہی جاتی ہیں۔ دیس اور پردیس کی باتیں۔ جنگ اور امن کی باتیں، ظلم اور استبداد کی باتیں، کمیونزم اور سوشلزم کی باتیں، ایکتا اور یک جہتی کی باتیں، فاشزم اور حق اور احدیت کی باتیں۔ آمریت اور جمہوریت کی باتیں، قومی اور بین الاقوامی باتیں۔ پانچ سالہ یوجنا کی باتیں، بھوک اور غربت کو مٹانے کی باتیں، انسان کو بہتر بنانے کی باتیں۔ یعنی لوگوں کو بہکانے کی باتیں۔ لیکن چھوٹی چھوٹی باتیں، جن سے انسان ہنستا ہے۔ جس سے اُس کی بڑائی یا کم ظرفی کا پتہ چلے۔ اس قسم کی باتیں وہاں نہیں بتائی جاتی۔ ہاں آج موقع ملا ہے کہ میں اپنی روح کا سارا کرب تمہارے سامنے رکھوں۔ اور اپنے درد کو بیان کروں، — اچھا یہ بتاؤ۔ اس بکواس کو سننے کے علاوہ اس شہر کا کون سا حصہ دیکھو گے، اِدھر آؤ میرے دوست۔

۲

دیکھو کیا یہ جگہ تمہیں پسند ہے۔ سمندر کے سوا یہاں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جہاں تک نظر جاتی ہے، سمندر ہی نظر آتا ہے۔ سمندر کے سینے پر شوخ چنچل لہریں، مچلتی ہوئی ساحل کی طرف بڑھ جاتی ہیں ہوا کافی تیز اور تُند ہے۔ ہوا نظر نہیں آتی مگر ہم اُسے محسوس کر سکتے ہیں۔ عزیز دوست میری طرف یوں نہ دیکھو، میں جانتا ہوں تم مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو، تمہاری آنکھوں میں سوالیہ نشان کیوں ہیں، تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میں لیڈر کیوں بنا۔ یعنی مجھ میں کیا خوبیاں تھیں، کہ میں لیڈر بن گیا، کلرک کیوں نہ بنا، ٹرک ڈرائیور کیوں نہ بنا۔ ڈاکٹر، وکیل۔ انجینئر اور پروفیسر کیوں نہ بنا۔ بھنگی یا موچی کیوں نہ بنا۔ دنیا میں ہزاروں کام ہیں جو میں کر سکتا تھا۔ اور نہ کر سکا، اور سیدھا لیڈر بن گیا۔ آخر کیوں۔ کیا ساری قوم کا دُکھ مجھے کھائے جا رہا تھا۔ کیا قوم بے سہارا رہتی۔ اگر میں لیڈر نہ بنتا۔ مجھ میں اتنی جرأت کیسے ہوئی۔ تمہارا سوال عجیب ہے۔ دراصل میں تمہیں اس قدر ذہین نہ سمجھتا تھا، کہ تم اس قسم کا سوال کرو گے۔ اگر تم میرے بچپن کے دوست نہ ہوتے۔ تو میں تم سے پوچھتا۔ حضور انور آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے یہ پوچھنے والے، کہ میں لیڈر کیوں بنا۔ اور گیدڑ کیوں نہ بن گیا۔ دراصل لیڈر اور گیدڑ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ جب تک مجھے لیڈر مانتے رہیں گے میں لیڈر رہوں گا۔ جس دن ان کا بھروسہ مجھ پر نہ رہا میں دُم دبا کر بھاگ جاؤں گا۔ یعنی گیدڑ بن جاؤں گا۔ میرے بہت

سے دوستوں کا ہی حشر ہوا۔ جو پہلے جنتا کے جانے پہچانے لیڈر تھے۔ جب لوگوں کا بھروسہ اُن پر سے اُٹھ گیا۔ تو وہ دُم دبا کر بھاگے۔ اس طرح کہ پیچھے دیکھنے کی مہلت نہ ملی۔ بہر حال تمھارا سوال بنیادی ہے۔ اور میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں، یوں چند سوال ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ مثلاً تم اور ہم پیدا ہی کیوں ہوئے۔ یہ زمین بنجر ہی کیوں نہ رہی، اگر یہ کرہ ارض۔ چاند کی طرح بنجر۔ ویران۔ بغیر ہوا کے ہوتا۔ تو کیا فرق پڑ جاتا یا ہم کیڑے مکوڑے ہی ہوتے، انسان نہ ہوتے تو کیا ہو جاتا۔ یوں تو ہم بندروں کی اولاد ہیں۔ اور ہمارے بزرگ گوریلا تھے، تہذیب و تمدّن کا ہلکا سا غازہ تھوپ لیا ہے ہم نے۔ ورنہ جہاں آپ نے ہماری ذرا جلد کھرچی ہم نے گوریلا کی طرح دانت نکالنے شروع کئے۔ اس قسم کے بے شمار سوال ایسے ہیں جن کا جواب دینا گناہِ عظیم ہے، جو کچھ ہم ہیں۔ ان پر پردہ پڑا رہنے دو۔ اسی میں ہماری عظمت ہے۔ باقی رہا یہ سوال جس کا جواب میں دینا نہیں چاہتا۔ مگر اس وقت دینا ہی پڑے گا۔ کہ میں لیڈر کیوں بنا۔ تو اس کا جواب صرف یہ ہے کہ میں باقی لوگوں سے زیادہ ذہین تھا۔ لیکن میں نے کسی کو روکا نہیں کہ وہ لیڈر نہ بنے۔ میں بن گیا۔ میں کیا کروں۔ اور تم بھی کیا کر سکتے ہو۔ یہ تو لیڈر بننے کی بات ہے۔ خیر۔۔۔ چھوڑو ان باتوں کو، ایک آخری بات بتاتا ہوں، کسی کو نہ بتانا، ذرا میرے قریب آؤ، ذرا جھک جاؤ اور جھک جاؤ تاکہ میری بات تم تک ہی رہے۔ کوئی اور نہ سن سکے، لیڈر بننے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ میں اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ مجھے کام کرنے سے نفرت تھی، کسی اور کو نہ بتانا۔ اس لئے میں لیڈر بن گیا۔ ارے تم ہنس رہے ہو۔ مسکرانے کے بعد ہنسنا اچھا نہیں۔ غضب کر دیا تم قہقہے لگا رہے ہو۔ یہ تو بدتمیزی ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا' یہ آواز جو تمھارے گلے سے نکل رہی ہے۔ یہ تہذیب و تمدّن اور آج کل کے سیاستدانوں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ میں تم سے یہ اُمید نہیں کر سکتا۔ کہ تم میرا مذاق اڑاؤ گے۔ دراصل بات یوں ہوئی۔ میرے عزیز بھائی ـــ دوست کے بعد بھائی کا رشتہ عزیز ہوتا ہے۔ میں دوست بات ٹال جاتا ہوں لیکن بھائی کی بات نہیں ٹال سکتا۔ خیر۔۔۔ میرا کوئی بھائی نہیں، اس لئے ہر ایک کی بات ٹال جاتا ہوں، اب سُنو جب میری عمر ۲۰ برس کی تھی۔ تو بی۔ اے پاس کر لیا۔ ان دنوں میرے والدین کا کاروبار ٹھیک چل رہا تھا، اتنے امیر نہ ہوئے تھے، میں نے باپ کے کہنے پر کلرکی کیلئے درخواست دے دی ان دنوں میں بھی پریشان تھا۔ اور میرے والدین مجھ سے زیادہ پریشان کیوں کہ میں نکمّا تھا، کام بھی نہ کرتا تھا۔ دو وقت گھر میں کھاتا اور آرام سے سو جاتا۔ میرے والدین چاہتے تھے، کہ کوئی نوکری کر لوں اور جو کچھ تنخواہ ملے لا کر اُن کے حوالے کر دوں۔ اسی لئے تو انھوں نے مجھے پالا۔ اور پڑھایا لکھایا۔ اور بی۔ اے۔ کی ڈگری دلوائی۔ بہر حال میں نے نوکری کیلئے درخواست دیدی ان دنوں جنگ زوروں پر تھی، کلرکوں کی عام بھرتی ہو رہی تھی۔ میری درخواست منظور کر لی گئی۔ اور مجھے چھ ماہ کی ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا، میں نے سوچا کہ ٹریننگ میں نااہل قرار دیا جاؤں گا۔ اور اس طرح سے اس مکروہ نوکری سے جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے ٹریننگ کے دوران بہت کم پڑھائی کی۔ جب امتحان ہوا تو بڑی مشکل سے چند سوالوں کا جواب دے سکا۔ مجھے پورا وشواس تھا کہ یہ لوگ مجھے جاہل اور بے وقوف قرار دے کر مجھے فیل کر دیں گے۔ مگر ان کمبختوں نے مجھے پاس کر دیا۔ اور نوکری کیلئے میرے ہاتھ میں ایک چٹ تھما دی اور کہا کہ کام پر حاضر ہو جاؤ۔ چٹ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا۔ میں ایک کلرک۔ میں ایک ادنیٰ غلام۔ میں کام کروں اور باقی لوگ کھائیں، میں صبح سے لے کر شام تک کام کروں اور دوسرے لوگ مجھ پر حکومت کریں۔ جی نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا میں خود حاکم ہوں کسی کا محکوم نہیں۔ میں کسی کا حکم نہیں مانوں گا۔ میں گھر واپس آیا تو والدین کو بتایا کہ مجھے نوکری مل گئی ہے۔ سب لوگ اچھل پڑے۔ میری ماں تو پیڑے بانٹنے کو تیار ہو گئی۔

دراصل میں اپنے باپ کی سازش سمجھ گیا۔ میں نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر ایک اور وار کیا۔ اور وہ وار کارگر [illegible] ہوا۔ میں رونے لگا۔ اس دن مجھے احساس ہوا [illegible] آنسوؤں میں کتنی شکتی ہوتی ہے۔ میرے آنسوؤں

کو دیکھ کر میرے ماں باپ پگھل گئے۔ اور میرے والد نے مجھ سے پوچھا تم نوکری نہ کرو۔ جو کچھ تمہارے من میں آئے کر لو۔ میں نوکری پر ڈٹ گیا۔ یہ تھا میری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ۔ جو ٹرننگ زیادہ ہے پوائنٹ کم۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ کام کرنے سے مجھے نفرت ہے۔ اگر اس دن میں نہ روتا۔ یا اُس دن میرے باپ کی جگہ کوئی ظالم اور جابر باپ ہوتا۔ تو کان سے پکڑ کر دفتر میں لے جاتا۔ اور میں ساری عمر ایک کلرک رہتا۔ دراصل مجھے اُن آنسوؤں نے بچایا۔ اور آج تک جب میں تقریر کرتا ہوں، تو تقریر کے دوران ایک دو بار ضرور روتا ہوں۔ مجھے روتا دیکھ کر تقریر سننے والے بھی رونے لگتے ہیں۔ اور میری خطابت کا چرچا کرتے ہیں۔

اُس دن کے بعد مجھے کام سے نفرت ہو گئی۔ شدید نفرت۔ میں سست الوجود کا بادشاہ بن گیا۔ یہ ہے میری زندگی کا بنیادی پوائنٹ۔ جس نے مجھے قوم کا لیڈر بننے پر مجبور کر دیا۔ ایک مشفق اور مہربان باپ کا سایہ، کام نہ کرنے کی صلاحیت۔ کتنا بے رحم ہوں میں، کہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو گن کر بتا سکتا ہوں۔ تمہیں اجازت نہ دوں گا۔ کہ تم میری خامیوں کو گنواؤ۔ میں دوسروں کی خامیوں کو گنوا سکتا ہوں۔ مگر کوئی شخص میری ذات۔ میری شخصیت کا تجزیہ کرے۔ اس کی کبھی اجازت نہیں دوں گا۔ یوں دنیا میں گناہ اور ثواب نیکی اور بدی۔ اچھائی اور بُرائی، انسانوں کے بنائے ہوئے اصول ہیں۔ یا قدریں ہیں۔ یا قوانین ہیں۔ انہیں قدروں پر ہم انسانوں کو تولتے ہیں۔ اور جو کام ہمیں اچھا نہیں لگتا اُسے گناہ کہتے ہیں۔ یا اُسے بُرا کہتے ہیں۔ اور جس کام کو ہم پسند کرتے ہیں۔ اُسے اچھا کہتے ہیں۔ نیکی اور بدی کا چکر محض اضافی ہے۔ اور اضافت محض خباثت ہے۔

اچھا یہ بتاؤ یہ لڑکی جو جا رہی ہے۔ کیا تمہیں پسند ہے۔ تم چپ کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں مجھے تو پسند ہے دوست، تمہاری پسند یا ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ میری نگاہ میں تمہاری پسند کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ تم شہر دیکھنے آئے ہو دیکھو... میں تم کو خوبصورت ... ہینگنگ گارڈن

گیٹ وے آف انڈیا۔ یہ پھیلا ہوا سمندر، جوہو کا ساحل۔ پکی سڑکیں، نیشنل پارک۔ کشادہ بازار۔ اور فٹ پاتھ پر بھاگتی ہوئی مخلوق۔ اور بے ان گنت خدا کی مخلوق۔ جو دن رات محنت کرتی ہے۔ سویرے اپنے ڈربوں سے نکل کر فیکٹریوں میں گھس جاتے ہیں۔ اور شام کو تھکے ماندے واپس آتے ہیں۔ ایک عرصہ تک زندہ رہ کر مر جاتے ہیں۔ چپ چاپ بغیر کسی احتجاج کے۔ اس دھرتی کو چھوڑ جاتے ہیں۔ کوئی ان سے کیا کہے۔ بڑے بھلے لوگ ہیں یہ، جو کچھ کہو بیچارے مان جاتے ہیں۔

اُس لڑکی کے بارے میں جو کچھ تم سے کہہ رہا تھا وہ بھی چلی گئی، نظروں سے اوجھل ہو گئی، کیا تم نے کسی سے محبت کی۔ بتاؤ یار شرماؤ نہیں۔ میرے جنگل کے شہزادے، کیا وہ لڑکی تمہیں پسند تھی، وہ لڑکی جو ابھی ادھر سے گزری تھی، اور پھر چلی گئی، دراصل تم مجھ سے پوچھ رہے ہو، کیا وہ لڑکی مجھے پسند تھی، ہاں کیا میں نے محبت کی، ہاں کی۔ یہ باتیں اس لئے بتا رہا ہوں، کہ تم ان باتوں کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔

سنو تو۔ کیا تم میری باتیں سنتے سنتے تھک گئے ہو، کیا آئسکریم کھاؤ گے۔ یا گرم گرم کافی پیو گے۔ آؤ کچھ کھا لیں، چند روز تو تمہیں یہاں ٹھہرنا ہی پڑے گا پہلے میری باتیں سن لو پھر شہر دیکھ لینا۔ شہر تو ہر شخص دیکھتا ہے۔ مگر میری باتیں ہر شخص سن نہیں سکتا۔ تقریروں کی بات اور ہے، وہ تقریریں ہوتی ہیں۔ باتیں نہیں ہوتی۔ تقریریں بے جان اور بے حس ہوتی ہیں۔ مجھے تو اس وقت کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا بک رہا ہوں۔ بس زبان ہلتی رہتی ہے، آوازیں نکلتی رہتی ہیں۔ الفاظ شتر بے مہار کی طرح ذہن سے زبان تک چلے آتے ہیں، بغیر کسی روک تھام کے ذہن کا کوئی تعلق ان لفظوں سے نہیں ہوتا۔ صرف زبان چلتی ہے، قینچی کی طرح، اور لوگ تالیاں پیٹتے ہیں۔ میرے کانوں میں تالیوں کی گونج سنائی دیتی ہے، میں بولتا رہتا ہوں، اور جب تالیوں کی گونج ختم ہو جاتی ہے۔ تو میں تقریر ختم کرتا ہوں۔ سمجھ جاتا ہوں کہ اب لوگ تالیاں پیٹتے پیٹتے تھک گئے ہیں، کہیں اپنا سر پیٹنا شروع نہ کر دیں۔ یعنی اب وہ

گھر جانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے گھروں میں اُن کی بیویاں اور بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔ بچے بلک رہے ہوں گے، انہیں بھوک لگی ہوگی، صرف لفظوں سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اس لئے میری تقریر کا آخری حصہ بڑا جاندار اور شاندار ہوتا ہے۔ اسوقت وہ الفاظ استعمال کرتا ہوں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا، وہ باتیں کرتا ہوں جو بے معنی ہوتی ہیں۔ وہ مسائل پیش کرتا ہوں جن کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ لیکن میرے الفاظ پُرشکوہ، رنگین، پُراثر، ولولہ انگیز جذباتیت سے لبریز ہوتے ہیں، ان کی رنگینی اور میری آواز کا جادو اور سحر انگیزی ان پر رقت طاری کر دیتی ہے۔ اور روتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے گھر چلے جاتے ہیں۔

یہ تو میری زندگی کا ایک رخ ہے۔ یہ تو میرے جیون کا ایک پہلو ہے، یہ میری زندگی کا ایک چہرہ ہے۔ میرے پاس بہت سے چہرے ہیں، لیڈر ہونے کے علاوہ میں ایک انسان ہوں مجھے بھوک لگتی ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہوں۔ محبت میرے خیال میں تم میری باتیں سنتے سنتے اُکتا گئے ہو۔

آج موسم اچھا نہیں ہے، وہ لڑکی جو اس وقت میرے اور تمہارے سامنے سے گزر کر چلی گئی تھی۔ تم شاید اُسے بھول گئے۔ میں بھولا نہیں۔ جب کبھی میں ایک حسین چہرے کو دیکھ لیتا ہوں تو ذہن چند لمحات کیلئے ایک بھٹی کی طرح آتشین ہو جاتا ہے۔ اس وقت میرے ذہن سے الفاظ مجھے الوداع کہہ کر چلے جاتے ہیں، صرف کسی کا تاثر باقی رہتا ہے۔ شاید حُسن کا تاثر۔ ایک نشہ جو عارضی ہوتا ہے، مگر بڑا پیارا، بڑا ہی خوابناک بڑا ہی خوبصورت، حسین، مخملیں، اور بیحد نرم نرم۔ جو میرے ارد گرد گھومتا رہتا ہے۔ بس اُس کی سرشاری میں مدہوش رہتا ہوں۔

خیر... محبت کا کل ذکر کروں گا، آج کچھ مضمحل اور پریشان سے نظر آتے ہو۔ میری تقریر سے بور ہو گئے ہو گیا۔ چلو آگے روڈ پر چلتے ہیں، وہاں تمہیں بالائی سے تر بتر ایک بھنا ہوا چکن کھلاؤں گا چلو تو۔

یہ رہا بمبئی کا مقبول ترین بیحد خوبصورت رستوران۔ دیواروں پر ننگی تصویریں ہیں۔ عورت اور مرد کے اختلاط کی تصویریں، خوبصورت چھاتیوں کی تصویریں، لچکتی ہوئی کمر کی تصویر، گول گول سڈول اور گنبد نما کولہو اور پنڈلیوں کی تصویریں رخساروں کی تصویریں غزالی آنکھیں۔ بادامی آنکھیں، نرگسی آنکھیں، گیسو جو کھل جائیں، تو گھٹائیں بن کر برس پڑیں، مختلف چہرے کلاسکی نقوش۔ آرین اور رومن نقوش کی امپریشن۔ کہیں ہیلن آف ٹرائے ہے۔ تو کہیں کلوپٹرا کا کلاسکی چہرہ۔ دیواروں پر افرو ایشیائی چہروں کی نمائش کی ہے۔ پرانے زمانے میں مندر ہماری تہذیب و تمدن کا نمونہ ہوتے تھے۔ آج کل یہ ہوٹل اور رستوران پرانی تہذیب سے لے کر جدید تہذیب و تمدن کی آماجگاہ ہیں ننگی تصویروں کی بھتات ہے چند پینٹنگ ہیں قابل تعریف، مجھے اس ننگے پن میں کوئی بد اخلاقی نظر نہیں آتی۔

بہر حال اس وقت تم یہ دیکھو، کہ جب سے یہاں آیا ہوں، لوگ میری طرف دیکھ رہے ہیں، لیڈر ہوں نا، میری طرف نہ دیکھیں گے تو کس کی طرف دیکھیں گے، میں یہاں کبھی نہیں آتا۔ آج تیرے ساتھ آگیا، میں بھیڑ سے دور بھاگتا ہوں۔

دیکھتے نہیں، یہ لوگ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ زیر بحث میری شخصیت ہی ہو سکتی ہے، وہ جانتے ہیں میں بڑا لیڈر ہوں۔ ان بیچاروں کو آج موقعہ ملا ہے، مجھے دیکھنے کا۔ میرے درشن کرنے کا۔ کر لینے دو درشن ورنہ میرے پیچھے بھاگیں گے۔

ارے بھئی ان کی طرف مت دیکھو، انہیں دیکھنے دو۔ ورنہ ان کی عادت بگڑ جائے گی، میں یہ چاہتا ہوں جنتا میری طرف دیکھتی رہے، تم عوام کی نفسیات کو نہیں جانتے ہو، جہاں تک مجھے گیان ہے، انہیں صرف یہ حق ملنا چاہیئے، کہ وہ لیڈر کی طرف دیکھتے رہیں۔ لو دیکھ لو۔ سب دیکھ رہے ہیں، بیرہ بھی آگیا، کیا کھاؤ گے؟ تندوری چکن دو۔ تم نے دیکھا نہیں۔ یہ بیرہ میری طرف دیکھ رہا تھا کتنا خوش تھا، کتنے ادب سے جھکا تھا، یہ میری ذات کے کرشمے ہیں، دیکھو میرے عوام میرے سامنے جھک کر آداب بجا کر گزرتے ہیں حیرت سے میری طرف دیکھتے ہیں، اور اپنی اپنی جگہوں پر براجمان ہو جاتے ہیں۔ میرے قریب آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

یہ فاصلہ جو میرے اور ان کے درمیان ہے، اس کی وجہ سے میری لیڈری قائم ہے، ورنہ جو کچھ میں کہتا ہوں، کرتا کہاں ہوں، میرے قول اور فعل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خیر.... چھوڑو ان باتوں کو تمہیں تو لیڈری کرنا ہیں، اس لئے اس لڑکی کی طرف مت دیکھو جو میری طرف دیکھ رہی ہے، خوبصورت لڑکی ہے، میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ محبت کے بارے میں یعنی لڑکیوں کے بارے میں، لڑکیوں کی طرف مت دیکھو۔ انہیں دیکھنے دو، ان سے بالکل بات مت کرو۔ اُنہیں بات کرنے دو۔ اپنے دل کا حال نہ کہو۔ اُنہیں اپنے دل کا حال کہنے دو۔ یعنی اپنی کمزوری ان کے آگے بیان نہ کرو۔ ان کی کمزوری تمہارے سامنے آجائے تو کیا بات ہے۔ یہ گُر جو میں تمہیں بتا رہا ہوں لڑکیاں پھانسنے کا سب سے بڑا گُر ہے۔ اور تم میری طرف دیکھ رہے ہو، جیسے میں انسان نہیں صرف لیڈر ہوں۔ حضور والا لیڈر ہونے کے علاوہ انسان بھی ہوں، بحیثیت انسان کے میرے چند فرائض بھی ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونا میرا سب سے بڑا فرض تھا۔ میں اُن دنوں کی بات کرتا ہوں جب میں لیڈر نہیں بنا تھا۔ اُن دنوں جب مات جواں تھی، اور رگوں میں خون جوش مارتا تھا۔ اُن دنوں میں خوبصورت تھا، شاید اب بھی ہوں، کیا خیال ہے تمہارا۔ مرغ کھاؤ نا۔ کیا یہ دونوں مرغ مجھے ہی کھانے پڑیں گے سال میں ایک دو بار یہاں آتا ہوں۔ اور گزرے ہوئے شباب کی یاد میں ایک حسین شام یہاں گزارتا ہوں۔ میں بچپن میں دبلا پتلا سا تھا، جسمانی دلکشی مفقود تھی، جونہی مری عمر تیرہ برس کی ہوئی، کہ میں نے ڈنڈ پیلنے شروع کر دیئے۔ اور تین سال کے عرصے میں ایک خوبصورت نوجوان بن گیا۔

لڑکیوں کو راغب کرنے کیلئے جسمانی دلکشی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تم بھی ایک مریل عورت کے ساتھ بات کرنا پسند نہ کرو گے، اسی طرح لڑکیاں یا عورتیں بھی ایک دبلے پتلے لڑکے سے راہ و رسم بڑھانا پسند نہ کریں گی۔

ان دنوں میں نے محسوس کیا، کہ جسمانی دلکشی سے لڑکیوں کو مرعوب کیا جا سکتا ہے، جسمانی دلکشی کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا۔ کہ آپ گاما پہلوان یا کنگ کانگ بن جائیں، اگر میرا مقولہ درست ہوتا تو لڑکیاں زیادہ گاما پہلوان پر مرتیں مگر ایسا نہیں ہوا، بائرن اور شیلے پر لڑکیاں زیادہ فریفتہ ہوئیں، پہلوانوں پر کم۔

تو ہاں اس جسمانی دلکشی کے علاوہ ایک بات کا اور خیال رکھو، اپنے دل کا راز کسی پر افشا نہ کرو۔ آہستہ آہستہ لڑکی کو اپنے قریب آنے دو۔ پہلی ملاقات میں ادھر ادھر کی باتیں، محبت کا ذکر غائب، جیسے آپ کا لڑکی سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسری ملاقات میں لڑکی کی خوبصورتی کے بارے میں ایک دو فقرے چسپاں کرو۔ لڑکی خوبصورت ہو یا نہ ہو۔ اس کی بدصورتی کا خوبصورتی میں بدل کر ذکر کیجئے گا، آنکھیں چاہے بھینگی ہوں، مگر انہیں آپ نرگسی آنکھیں کہیئے گا، اسی طرح رخساروں، ہونٹوں اور جسم کے دیگر اعضا کا ذکر کیجئے گا تاکہ لڑکی کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ واقعی خوبصورت ہے۔ اور پھر اس عرصے میں یہ بھی تجزیہ کر لیجئے گا کہ جو باتیں آپ نے کی ہیں ان کا لڑکی پر کیا ردِ عمل ہوا۔ اس کے بعد اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حالات آپ کے موافق ہیں تو پھر اپنی محبت کا اظہار کیجئے گا۔ جب تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ لڑکی آپ کو چاہتی ہے یا نہیں، تو ہاں، تم مجھ سے پوچھ رہے ہو، کہ میں نے کسی لڑکی سے محبت کی یا نہیں کی محبت کی۔ اور ایک بار نہیں کئی بار کی۔ صرف ایک لڑکی سے نہیں کئی لڑکیوں سے۔

شاید تم مجھ سے یہ سوال کرو کہ میرے دل میں عورت کے لئے کوئی تقدس کا جذبہ ہی نہیں، شاید تم نہیں جانتے کہ میں عورت کی بیحد عزت کرتا ہوں۔ جب کبھی میں کسی بس میں سفر کرتا ہوں، اوّل تو میں بس میں سفر کرتا ہی نہیں، کیونکہ بس تو عام لوگوں کیلئے ہوتی ہے، یہی حال لوکل ٹرین کا ہے، میں تو اُن دنوں کی بات کرتا ہوں جب میں ایک عام انسان تھا، اُس وقت جب کبھی کوئی خاتون میرے قریب کھڑی ہو جاتی تو میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر اُسے جگہ دے دیتا، اگر کسی عورت یا لڑکی کا رومال گر جاتا تو فوراً اُٹھا کر اُس کے حوالے کرتا، اگر کسی ادھیڑ عمر کی عورت کو فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے دیکھتا، تو اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے سڑک پار کرا دیتا، اگر کوئی عورت بچوں کے ساتھ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی نظر آتی، تو میں ٹیکسی رکوانے میں اُس کی مدد کرتا، سینما ہاؤس میں اگر کسی لڑکی کو ٹکٹ خریدنے کی ضرورت ہوتی تو اُسے روپے لے کر اُسے ٹکٹ خرید کر دیتا، کسی ٹرین میں کسی لڑکی کو

کی جگہ نہ ملتی تو میں اپنی سیٹ آفر کرتا۔ کوئی نوجوان لڑکا اگر کسی نوجوان لڑکی سے مذاق کرتا، تو میں لڑکے کو جھاڑ دیتا، اگر کسی طوائف کو چھیڑتے ہوئے دیکھتا تو فوراً اس انسان کو جلی کٹی سناتا۔ بھلا اس طوائف کا کیا قصور ہے۔ اگر پیٹ بھرنے کیلئے بیچاری کو پیشہ اختیار کرنا پڑا تو پہلے اس سماج کو سدھاریئے، اس کو بدلئے۔

اب تم ہی بتاؤ کیا میرے دل میں عورتوں کی عزت اور عفت کیلئے کوئی مقدس جذبہ نہیں، میں تو اس لڑکی یا اُس عورت کی بات کرتا ہوں۔ جو محبوبہ ہے۔ محبت اور چیز ہے۔ یعنی جہاں تقدس ہوتا ہے وہاں محبت نہیں ہوتی۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تقدس نہیں ہوتا اور میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ کہ میں نے صرف ایک بار ہی محبت نہیں کی کئی بار کر چکا ہوں، تو پھر وہی بات کہوں گا جو کئی بار کہہ چکا ہوں، کہ یہ محبت محض ہوس پرستی ہے۔

محبت صرف ایکبار ہوتی ہے' بار بار نہیں ہوتی، لیکن دوست میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے، کہ ایک عورت کے ساتھ ساری عمر گذارنا بہت مشکل ہے۔ انسان بور ہو جاتا ہے۔ آخر محبوبہ بھی ایک انسان ہوتی ہے چاہے وہ کتنی ہی حسین ہو۔ چاہے وہ اجنتا اور ایلورا کی جیتی جاگتی ایک تصویر ہو، آخر کتنے سال تم اسکے پرستار رہو گے۔ اگر وہ ذہین ہے تو ایک نہ ایک دن وہ تمہیں چھوڑ دے گی، اور اگر آپ زیادہ عقلمند اور حساس ہیں تو اس سے پہلے کہ وہ تم سے بور ہو جائے۔ تمہیں یہ چاہئے کہ اس سے بور ہو کر اسے چھوڑ دو۔

میں نے زندگی میں ہمیشہ اِسی فارمولے پر عمل کیا، تم سوچ رہے ہو، کیا محبت بھی فارمولے کے تحت کی جاتی ہے، جی جناب اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے، یار تم ہی بتاؤ۔ آج کل کون سا فعل ہے جو کسی فارمولے کے تحت نہیں کیا جاتا۔ فلمیں بنتی ہیں' فارمولے کے تحت۔ حکومتیں بنتی ہیں' فارمولے کے تحت۔ یعنی ہر حکومت کی بنیاد پارٹی سسٹم پر ہے، ایک پارٹی، دو پارٹیاں، تین یا چار پارٹیاں۔ الکشن ہوتا ہے، اور جس پارٹی کے زیادہ امیدوار چنے جاتے ہیں، وہی پارٹی ہم پر حکومت کرتی ہے یعنی حکومت ہے ایک فارمولہ، کسی بیماری کو مدِ نظر رکھو۔ اس کا علاج بھی ایک فارمولے کے تحت ہوتا ہے۔ آج کل تو ضبطِ تولید کی یوجنائیں بن گئی ہیں۔ سٹیل پلانٹ کا پانچ سالہ پلان، حکومت کو تباہ کرنے کا پلان، ایک فارمولے کے تحت کیا جاتا ہے۔ جیسے آپ سوشلزم کہہ لیجئیگا یا کمیونزم یا کوئی اور ازم۔ ہم لوگوں کی زندگیاں ایک نئے پلان کے تحت رواں دواں نظر آتی ہے،

محبت بھی کیا ہے، ایک پلان۔ محبت کے بعد شادی، یا شادی کے بعد پھر بچے، انہیں لکھائیے پڑھائیے۔ اُن کی شادیاں کیجئے۔ بہو آتی ہے ماں سے لڑائی ہوتی ہے، اور اس طرح ماں اور باپ کے جھگڑے کا آغاز ہوتا ہے۔ بیٹا باپ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ بہو ساس کے رویئے سے تنگ آکر خودکشی کر لیتی ہے۔ بھائی ایک دوسرے سے تنگ آجاتے ہیں، ایک دوسرے کو اتنا جان پہچان لیتے ہیں کہ ایک دوسرے سے کوئی محبت نہیں رہتی، ماں باپ اتنے چھوٹے اور کمینے نظر آتے ہیں کہ کبھی تو یہ شک ہونے لگتا ہے، کہ یہی ہمارے والدین تھے؛ خاوند اور بیوی اکٹھے رہتے رہتے اتنے ایک دوسرے سے تنگ آجاتے ہیں، کہ جی چاہتا ہے دونوں ایک دوسرے کا گلا گھونٹ دیں، یا پھر دنیا کو چھوڑ کر ہردوار کی طرف نکل جائیں یا آخری عمر میں حج کے لئے روانہ ہو جائیں۔

دراصل بورڈم سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ جس طرح سے میں کہہ رہا ہوں، وہی کرو، محبت ایک فارمولے کے تحت کرو، جب ایک محبوبہ سے تنگ آجاؤ۔ تو دوسری لڑکی سے محبت کرلو۔ دراصل میں محبت نہیں کرتا۔ کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔ محبت کے رومانی افسانے دیوانوں کی داستانوں کے سوا اور کچھ نہیں حضور۔

اس ایٹمی دور میں مجنوں، فرہاد۔ رومیو، بننا کوئی شرافت ہے کیا، یعنی سوچئے تو سہی، کہ امریکہ میں عورتوں نے یہ تحریک چلائی ہے، کہ مرد عورت کے درمیان کوئی تفریق نہ رہے، اور زندگی کے سارے کام اگر مرد کر سکتا ہے۔ تو عورت بھی کر سکتی ہے۔ مردوں نے عورتوں کو زنجیروں سے جکڑ کر کئی شعبوں سے الگ رکھا ہے، مگر عورتوں نے جتا دیا ہے کہ وہ اتنی بہادر اور باہمت ہیں جتنا کہ مرد۔ امریکہ کی عورتوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم رسوئی خانے تک نہیں جائیں گی، اگر مرد بچے پیدا کرنا چاہتا ہے تو انہیں پالے بھی، یہ بھی کیا کہ بچے بھی ہم جنیں اور پالیں بھی ہم۔ اس دور میں جب کہ

پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا جا رہا ہے، جس میں کہ حمل گرانے کا ذکر ہے اور جس طرح نرودھ اور پلز کے استعمال کیلئے پرچار ہوتا ہے۔ ہماری اخلاقی قدریں قرونِ وسطیٰ سے وابستہ نظر آتی ہیں ___ مغرب میں اسکول کے لڑکے لڑکیوں کو جنسی تعلیم دی جاتی ہے۔ بلکہ وہاں تجرباتی شادیوں کا رواج بڑھ چکا ہے۔ اور میری تو یہ پیشن گوئی ہے، کہ پچاس برسوں کے اندر اندر جب کہ ہم اور تم نہ ہوں گے، شادی کا ادارہ ختم ہو جائیگا۔ جب عورتوں کو مرد کے مقابلے میں مساوی حقوق مل جائیں گے کہ وہ مرد کی طرح ہر شعبے میں کام کر سکتی ہیں اور بچے جننا کوئی اہم کام نہیں ہے۔ تو شادی اور بیاہ کا سلسلہ ہی ختم ہو جائیگا۔ ارے یہ کیا۔ تم تو حیرت سے میری طرف دیکھ رہے ہو، جیسے مجھے اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، دراصل اس ٹیکنالوجی کے دور میں سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ پرانی روایات، پرانی قدریں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں سائنسدان کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ اُس کی ایک ایجاد کروڑوں لوگوں کی بھوک مٹا سکتی ہے، اس نے انسان کو پھینک کر چاند تک پہنچا دیا ہے، بھلا ایسے دور میں دو انسانوں کی محبّت کیا اہمیّت رکھتی ہے، زلف، رخسار، صراحی دار گردن نرگسی آنکھیں، ناف، کولھے، کمر، رانیں، پنڈلیاں، چھاتیاں ان کے لئے آہیں بھرنا، شکوے کرنا۔ دیواروں سے ٹکریں مارنا۔ کہاں کی دانشمندی ہے، اور پھر خودکشی کرنا۔ کیونکہ ایک لڑکی آپ کو نہیں ملتی، آپ ہی بتائیے۔ ہم لوگ باقی لوگوں سے کتنے پیچھے ہیں۔ ہم ابھی تک جاگیردارانہ نظام سے آگے نہیں بڑھے۔ سرمایہ داری نظام کی تمام رحمتیں جو باقی ملکوں پر نازل ہو چکی ہیں، ابھی تک ہم ان کی بلندیوں کو نہیں چھو سکے، مجھے تو ہنسی آجاتی ہے۔ جب کبھی میں یہ سنتا ہوں۔ یا کسی اخبار میں پڑھتا ہوں کہ فلاں صاحب نے فلاں صاحبہ نے خودکشی کرلی۔ کیونکہ انہیں اپنی مطلوبہ چیز نہیں ملی، موت کے بعد کچھ نہیں رہتا، کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا، اور محض چند جذبات، چند تصویریں، چند مکان رہ جاتے ہیں، قریبی رشتہ دار مرنے والے کے لئے

چند آنسو بہائیں گے، اس کے بعد پھر غم دوراں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ساری عمر کوئی کسی کے لئے روتا ہی نہیں، رو سکتا ہی نہیں یہ زندگی کا کارواں اسی طرح چلتا رہے گا۔ ایک انسان کے بعد دوسرا انسان پھر تیسرا انسان، پھر چوتھا، ایک نسل کے بعد دوسری نسل، پھر تیسری نسل، پھر چوتھی نسل۔ انسانوں اور نسلوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ایک فلسفے کے بعد دوسرا فلسفہ، پھر تیسرا، پھر فلسفوں کا کارواں جس کا کوئی اختتام نہیں۔ اس لئے قبل از وقت مرنا، بے وقوفی ہی نہیں بڑے درجے کا احمق پن ہے۔

اس لئے جب کبھی میں بیمار ہوتا ہوں، تو فوراً ڈاکٹر کو بلواتا ہوں۔ سارے جسم کا چیک اپ کراتا ہوں، دل پھیپھڑے، گردے پیٹ، دماغ، یعنی جسم کے ہر حصّے کو مشین کے پرزوں کی طرح دکھاتا ہوں۔ اور صاف کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ جسم ایک مشین ہے، غذا اچھی ملے۔ تو یہ مشین چلتی رہے گی، غذا نہ ملے تو انسان جلدی موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ انسان زیادہ کھائے، مگر کم کھانے میں کیا کمال ہے۔ یعنی انسان اتنا ضرور کھائے کہ تن بدن میں طاقت کی برقی لہر دوڑتی رہے۔ اگر انسان کمزور ہو تو وہ زندگی کی مسرتوں سے محروم رہتا ہے، جینے کی تمنّا کم ہوتی ہے۔ فلسفیانہ باتیں زیادہ کرتا ہے، جیسا کہ اس وقت میں کہہ رہا ہوں، دراصل میں موضوع کو بدلنا چاہتا ہوں۔

کیا خیال ہے اس لڑکی کے بارے میں تمہارا، وہ لڑکی جو ہماری میز سے ذرا آگے والی میز پر تشریف فرما ہے حُسن سے لطف اندوز ہونا کوئی بری بات نہیں یعنی ہمارے اور اس لڑکی کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ ہے، تم چاروں طرف نگاہیں دوڑاؤ تو معلوم ہوگا، کہ ہر شخص اس لڑکی دیکھ رہا ہے، آخر یوں کیوں ہوتا ہے، میں اس لڑکی کو نہیں جانتا تم بھی نہیں جانتے، کیا ایک مرغ اور منگواؤں۔ بیٹھنے کا ایک بہانہ چاہیئے نا، یوں تو اس رستوران کا مالک مجھے باہر نہیں نکال سکتا۔ کیوں کہ میری موجودگی اس کے لئے قابلِ فخر ہے، تم نے شاید اس امر پر غور نہیں کیا، کہ جب ہم دونوں اس رستوراں میں

داخل ہوئے تھے، تو ہر شخص کی نگاہ ہم پر تھی، لیکن اب ہر شخص اس لڑکی کو دیکھ رہا ہے، میں بھی اس لڑکی کی طرف بار بار کیوں دیکھ رہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ تمھاری نگاہوں میں میری عزّت کم ہو جائے گی

بھئی عزّت کم ہوتی ہے تو ہو جائے، میں کیا کروں، اس خوبصورت لڑکی کو کیوں نہ دیکھوں۔ بس یہی سوچتا ہوں کہ آپ کی نگاہوں میں میری عزّت کم ہو جائے گی، بھاڑ میں جائے ایسی عزّت، جو خوبصورتی کی راہ میں دیوار بن جائے، اس دھیمی دھیمی روشنی میں جسے آپ نہ اندھیرا کہہ سکتے ہیں، نہ روشنی، یہ وہ وقت اور وہ جگہ ہے جہاں روشنی اور اندھیرے کا سنگم ہوتا ہے، میں تو کچھ نہیں کہتا اس لڑکی کے بارے میں، کہ اے جانِ جہاں کہاں دیکھا ہے تمہیں۔ دیکھا ہے یا نہیں دیکھا، مگر اسوقت ضرور دیکھ رہا ہوں، کل شاید نہ دیکھ سکو لہٰ

کسی کو دیکھنا جرم نہیں، اسکے بال کس قدر ملائم اور ریشمی ہیں، اور جسم کی رنگت عجیب و غریب ہے جلد کی ایسی رنگت تو میں نے کبھی نہیں دیکھی جب سورج غروب ہوتا ہے اور شفق آسمان پر پھیل جاتی ہے کیا وہ رنگت اس رنگت سے ملتی جلتی ہے، جی نہیں، کیا قوسِ قزح کا کوئی رنگ اس رنگت سے ملتا جلتا ہے، سونے کی رنگت سے میل کھاتی ہے کیا

اس لڑکی کا جسم مدھم مدھم روشنی میں ایک دھیمی دھیمی آنچ سی دے رہا ہے۔ گردن کا ہلکا سا خم اور سیاہ بالوں کا کندھوں سے ہم آغوش ہو جانا، لڑکی کا اپنی دو کہنیوں کو میز پر رکھنا، اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو تھام لینا۔ خوابیدہ پلکوں کا آہستہ آہستہ آپس میں ملنا۔ یہ سوئی سوئی سی آنکھیں جن میں نیند کا خمار ہے، یا شراب کا، کوئی نہیں جانتا، رات بھر یہ لڑکی جاگی ہے۔ یا محض اس نے شراب پی ہے، یہ کمبخت سُرخ روشنی کہاں سے آگئی، اس سُرخ روشنی میں اس لڑکی کے رخسار سورج مکھی کے پھول کی طرح تمتما اٹھے ہیں۔ یہیں سے بیٹھ کر دیکھو، یہ محسوس ہو رہا ہے، جیسے میں نے اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے، یادوں کے پردے آہستہ آہستہ سرک رہے ہیں، ماہ و سال آہستہ آہستہ رینگ رہے ہیں، جیسے یادوں کے سمندر میں ایک حسین، اور دلفریب شاہراہ بن گئی ہے، اور دُور اُس شاہراہ کے اختتام پر جہاں سمندر موجزن ہے، ایک اسی قسم کی لڑکی میرا انتظار کر رہی ہے، یہ

بھی عجیب سی بات ہے، کہ انسان اس دنیا میں، بہت سی باتیں بھول جاتا ہے، مگر وہ دلنواز شامیں، وہ غمناک آہیں، وہ پیار بھری مسکراہٹیں انسان نہیں بھول سکتا، وہ دل کے گوشے میں چپکے سے ننھی ننھی قندیلیں جلائے بیٹھی رہتی ہیں، اور ایک شام وہ یادیں، کسی وقت کسی ایسے موقعہ پر انسان کو گھیر لیتی ہیں، کہ انسان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

میں رونے کا قائل نہیں، میں بالکل نہیں روتا، کسی کے سامنے کبھی نہیں روتا، ہاں روتا ہوں۔ تو اکیلا روتا ہوں، تاکہ لوگوں کو میری کمزوری کا علم نہ ہو۔ آخر لیڈر ٹھہرا۔ میں تو دوسروں کے آنسو پونچھنے کیلئے پیدا ہوا ہوں۔ کیا میں دوسروں کے غموں کو غلط کرنے کیلئے آیا ہوں، کیا میں لیڈر ہوں، یا کسی سرکس کا جوکر، مسخرہ۔ تم ہی بتاؤ۔

لو بھئی وہ لڑکی چلی گئی، اچھا ہوا، وہ لڑکی چلی گئی، وہ لڑکی نہ جاتی تو لوگ میری طرف نہ دیکھتے۔ دراصل اس رستوران میں لڑکیوں کی زیادہ اہمیّت ہے، مجمع میں ہزاروں لڑکیاں ہوتی ہیں، کوئی ان کی طرف نہیں دیکھتا۔ اگر کوئی دیکھے گا تو پل بھر کے لئے۔ اس کے بعد سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو جاتی ہیں، میرا خیال ہے یہاں سے اٹھنا چاہئیے۔ یہ جگہ ہمارے بیٹھنے کے قابل نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی دوسری لڑکی، یعنی خوبصورت لڑکی اس رستوران میں آگئی۔ تو سب لوگ اس کی طرف دیکھیں گے اور ہماری طرف کوئی نہ دیکھے گا، دراصل جب انسان کی شہرت بامِ عروج پر ہو، اس وقت اُسے پروفیشن سے الگ ہونا چاہئیے، جیسا کہ دیلوکا رانی نے کیا۔

اٹھو یار۔ ایک گہرا راز میں تمہیں نہ بتا سکا، جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ ذرا باہر تو آؤ۔ ناراض نہ ہونا۔ اپنا پروفیشن ہی ایسا ہے، کبھی اندر کبھی باہر، انسان پیدا ہوتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ ہم بھی یہی کچھ کرتے ہیں، ایک حکومت بناتے ہیں، ایک نیا سوانگ رچاتے ہیں۔ پھر ایک نئے نظام کا ذکر کرتے ہیں۔ جہاں ہر شخص آرام سے رہ سکے گا۔ اُس کیلئے جدوجہد کرتے ہیں، کبھی یہ

جدوجہد کامیاب ہو جاتی ہے، اور کبھی نہیں۔ کبھی ہم ہٹلر، مسولینی، نپولین کی طرح شکست خوردہ ہو کے راہیِ ملکِ عدم ہوتے ہیں اور کئی بار یہ بھی ہوتا ہے کہ ہماری جدوجہد کامیاب ہوتی ہے، ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ جو کچھ عرصے کے لئے پائیدار رہتی ہے۔ آخر میں ملک مختلف حصّوں میں بٹ جاتا ہے پھر کوئی نیا لیڈر پیدا ہوتا ہے، ایک نیا فلسفہ جنم لیتا ہے۔ اس کے ارگرد خدا کی مخلوق طواف کرتی ہے، ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی جاتی ہے، دراصل لوگ وہی ہوتے ہیں، لیڈر بدلتے رہتے ہیں، اس لئے تو کہتا ہوں، ذرا باہر آؤ، ایک ایسا راز بتانا چاہتا ہوں، جسے بتائے بغیر میرا جی ہلکا نہ ہوگا۔ باہر دیکھو ہوا کتنی سرد اور تند ہے، بجلی کے کھمبے اداس کھڑے ہیں، اور پرانا کی مخلوق اپنے گھروں کی طرف رواں دواں ہے۔

۴

کیا تم میری باتیں سنتے سنتے بور نہیں ہوگئے۔ میں واقعی تمھاری قوتِ برداشت کی داد دینا چاہتا ہوں میں اب زیادہ تمہیں بور نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں خود اپنی باتوں سے بور ہو گیا ہوں۔ میں اپنی زندگی کا آخری المیہ سنانا چاہتا ہوں۔ دراصل یہ میری زندگی کا المیہ نہیں ہے، پوری نسل کا المیہ ہے، یہ المیہ اُس چیز سے البتہ ہے، جسے ہم روپیہ کہتے ہیں، روپے کے پیچھے بھاگ دوڑ ایک اندھی جدوجہد ہے، ایک بہتر زندگی گزارنے کی جاہلانہ کوشش بہرحال میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ جب میرے والد اس بمبئی میں آئے تھے، وہ بیحد غریب تھے، اتنے غریب کہ ان کی غربت بیان نہیں کی جاسکتی، اُس وقت اُن کے چار بیٹے تھے، چاروں بیٹوں کی روزی روٹی کیلئے ہمارے والد کو اتنی محنت کرنی پڑتی تھی، کہ بتا نہیں سکتا۔ پھر وہ امیر ہوگئے۔ کاروبار ایسا چلا کہ روپوں کی بارش ہونے لگی، یعنی خدا جب دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ مالابار ہل پر انھوں نے ایک شاندار کوٹھی بنوائی، چار فیکٹریوں کے مالک ون کاریں، پھر چاروں لڑکوں کو پڑھائی کیلئے ہندوستان سے باہر بھیج دیا۔ کوئی انگلینڈ میں پڑھ رہا تھا تو کوئی امریکہ میں کوئی جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، تو کوئی پیرس میں، جب دولت بے تحاشہ ہو، انسان بھی کچھ کرسکتا ہے، میرے بھائیوں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں شادیاں کرلیں۔ کسی نے انگریز خاتون سے شادی کرلی کسی نے پیرس کی ایک نوجوان حسینہ سے پیار کرلیا، کسی نے امریکی لڑکی کو اپنی داشتہ بنالیا۔ والدِ محترم نے بزنس کیلئے سب کو روپے دیئے۔ میرے بھائیوں نے بزنس ایسا جمکایا کہ لاکھوں کے مالک بن گئے۔

ایک بات تمہیں بتانا بھول گیا۔ وہ یہ ہے کہ میری ماں بیحد خوبصورت تھی، اس کا قد لانبا تھا اور چہرے کے نقش کلاسکی تھے، گوری رنگت، سرو قد، ناک ستون، لمبوترا چہرہ۔ بادامی آنکھیں۔ اور بال تو کمر تک لٹکتے تھے۔ جوانی کی حد کو پار کرکے جب میری ماں نے بڑھاپے میں قدم رکھا۔ تو اس کے حسن وجمال میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اُنھوں نے اپنے جسم کی دلکشی کو برقرار رکھا۔ مگر ایک بات کا میں ضرور قائل ہوں اپنی ماں کا، کہ ان کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ آیا۔ بڑی مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی، حسن میں نسائیت کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ میری ماں محبت خلوص۔ اور پیار کا پیکر تھی۔ اگر اس کے انداز تخاطب میں سلیقہ تھا، تو باتوں میں رس تھا۔ اور کپڑوں کے انتخاب سے ذوقِ جمال ٹپکتا تھا، ایسی عورت ہی دلوں پر راج کرتی ہے۔ میرے والدِ محترم میری ماں کے آگے ذرا بھی چوں چراں نہ کرتے تھے۔

میں اس وقت صرف وہ واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ جس کا تعلق میرے باپ کی موت سے ہے۔ اتنا سرمایہ اکٹھا کرنے کے بعد۔ اتنی کوٹھیاں اور فیکٹریاں بنانے کے بعد اچانک اُن پر لقوہ کا حملہ ہوا۔ دائیں حصے پر شدید فالج گرا، کہ دایاں حصّہ بالکل بے حس ہوگیا۔ یہاں تک کہ زبان سے وہ ایک لفظ تک نہ کہہ سکتے تھے، وہ شخص جو گفتار کا غازی تھا، اور جو ٹیلیفون کے بغیر بات نہ کرتا تھا۔ آج اپنے بیڈ روم میں پلنگ پر خاموش لیٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر، نرسوں اور علاج کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ جرمنی اور پیرس سے ڈاکٹر بلوائے گئے۔ مگر بیماری میں ذرا بھی فرق نہ آیا بیماری بڑھتی گئی۔ ہر روز موت قریب آتی گئی۔ اس حالت میں وہ صرف

اشارے سے اپنی بات سمجھاتے کہ اُنھیں کیا چاہیئے۔ گو اُنہیں اشارہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نرسوں، نوکروں کی کمی نہ تھی، اس کے علاوہ میری ماں نے جو سیوا اُن کی، وہ باقابلِ فراموش تھی، ایک سائے کی طرح ان کے ساتھ رہیں، میرے والد حضور کی ذرا سی جنبش انہیں بتا دیتی کہ اُنہیں کیا چاہیئے۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے باوجود بھی میری ماں نے اپنے خاوند کی خدمت میں کوئی کسر نہ رکھی۔ جب موت آتی ہے تو ڈاکٹر، حکیم، وید بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ کوئی دوا کارگر ثابت نہیں ہوتی، کبھی کبھی وہ سب کو کمرے سے نکال دیتے، اور صرف میری ماں اس وقت کمرے میں موجود ہوتیں۔ آدھا گھنٹے کے بعد کمرہ کھل جاتا، اور پھر لوگ ملنے آتے۔

ڈاکٹروں نے ہر شخص سے کہہ دیا تھا کہ سوائے اپنوں اور ماں کے کسی دوسرے کو کمرے میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ ڈرائینگ روم میں لوگ آتے اور والد صاحب کی حالت پوچھ کر چلے جاتے۔

ہر روز ان کی حالت بگڑتی جاتی۔ چاروں بیٹے فارن سے آ چکے تھے۔ ان کی بیویاں اور بچے بھی آئے ہوئے تھے۔ سب کے سب ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ صرف میں ہی تھا جو کوٹھی میں رہتا تھا، مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ مگر کہہ نہیں پاتے۔ میں ہی ان کا ایک بیٹا تھا، جس نے شادی نہیں کی تھی، جس نے کوئی بزنس نہیں کیا تھا، جسے لیڈر بننے کا شوق تھا۔ جسے شاید دولت سے نفرت تھی۔ جو اس کوٹھی کو چھوڑ کر فارن نہ گیا تھا۔ ایک دن تو ایسا ہوا، کہ ماں جی باہر گئیں، کہ انھوں نے مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا، میں ان کے قریب گیا، ان کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لایا، کہ ماں اندر آ گئیں۔ انھوں نے مجھے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا، ماں نے گھبرا کر میرے باپ کی طرف دیکھا، ماں جی کی پیشانی پر اچانک شکنیں ابھر آئیں۔ اور خوبصورت چہرہ اچانک بدصورت ہو گیا۔

آج اُن کی زندگی کی آخری رات تھی، اُن کا چہرہ کتنا کربناک تھا۔ آنکھوں میں ایک وحشت سی نمایاں تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر کہہ نہ پاتے تھے، رات کے بارہ بج چکے تھے، میں اور میری ماں ان کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے، نرسیں کھڑی تھیں۔ اُنھوں نے باری باری سب کو اشارہ سے سمجھایا جانے کیلئے۔ پہلے ایک نرس گئی، پھر دوسری نرس گئی، پھر انھوں نے میری ماں کی طرف دیکھا۔ ماں جی نے ان کی طرف دیکھا۔ سمجھ گئیں کہ وہ جانے کیلئے کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ والد صاحب کا چہرہ غصّے سے تمتما اٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اگر وہ نہ گئیں تو شائد میرے والد صاحب کے دماغ کی نس پھٹ جاتی، گو ماں بھی چلی گئیں۔

اور صرف میں اکیلا رہ گیا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ کالی سیاہ رات تھی۔ انھوں نے اشارے سے مجھے سمجھایا کہ اب دروازہ بند کر دیا جائے اور چٹخنی لگا دی جائے، میں نے چٹخنی لگا دی، انھوں نے مجھے اشارہ کیا، کہ میں اپنی کرسی لے کر ان کے قریب آؤں، میں اپنی کرسی ان کے قریب لے آیا۔

پھر اُنھوں نے زبان کھولی اور آہستہ سے بولے۔ بیٹا

"ڈیڈی!" میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"چپ رہو۔" انھوں نے دھیرے سے کہا،

"میں مر چکا ہوں۔ تیرا باپ مر چکا ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم مجھے سمجھتے ہو۔ اب میرا اور تمھارا کوئی رشتہ نہیں۔ میں جانتا ہوں یہ سب لوگ کیوں آئے ہیں۔ میرے بیٹے، میری بہویں کیوں آئی ہیں۔ یہ سب لوگ میری جائیداد کا بٹوارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور ٹھیک بھی ہے۔ میں نے جائیداد کا بٹوارہ کر دیا ہے، وصیت نامے پر دستخط کر دیئے ہیں میں اب نہ کسی کا باپ ہوں، نہ کوئی میرا بیٹا ہے۔ میں تمہیں چاہتا ہوں، شاید اس لئے تمہیں میں وہ بات بتانا چاہتا ہوں۔ جو آج تک میں نے کسی کو نہیں بتائی۔ تیری ماں حسین تھی۔ اور آج بھی خوبصورت ہے، تمھاری ماں شریف تھی اور آج تک شریف ہے۔ میں غریب تھا جب میری اس سے شادی ہوئی تھی۔ میں نے کافی کوشش

کی کہ کوئی نوکری مل جائے۔ کوئی بزنس کر سکوں، مگر ہر کوشش
بیکار ثابت ہوئی۔ میں اپنے بچوں کو لے کر اس بڑے شہر میں آیا۔
ابھی تک تم پیدا نہیں ہوئے تھے، ہم ایک دوست کے ہاں
ٹھہرے، اس بیچارے نے ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ لیکن
دوڑ دھوپ کے باوجود بھی نوکری نہ ملی۔ روپیہ تو تھا نہیں،
بزنس کیا کرتا۔ میرے دوست کے ہاں ایک بزنس مین آتا تھا۔
اُس کی نظر میری بیوی پر پڑ گئی۔

تم نے شاید اپنی ماں کو عالم جوانی میں نہیں دیکھا۔ اس بڑھاپے
میں تم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ عالم شباب میں کیا
ہو گی۔ یوں تمہارے سامنے اس قسم کے جملے استعمال کرنا بداخلاقی
ہو گی، لیکن کیا کروں جو حقیقت ہے اُسے بیان کرنے میں کیا
ہرج ہے۔

"ذرا پانی دینا بیٹا گلا سوکھ رہا ہے۔"

"آپ زیادہ باتیں نہ کیجئے ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔" میں نے
پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

پتا جی نے پانی پیا اور پھر کہنے لگے۔ "یہ بزنس مین میری
بیوی پر عاشق ہو گیا، یہ یکطرفہ عشق تھا۔ میں تعریف کرتا ہوں۔
تیری ماں کی۔ اُس غربت اور افلاس کے ہوتے ہوئے کبھی
اس کے پاؤں نہ ڈگمگائے۔ یہ بزنس مین لاکھوں کا مالک
تھا۔ اس نے مجھ سے تو کچھ نہ کہا۔ ہاں جس دوست کے ہاں
ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس سے ضرور کہا۔ اگر ایک رات
کیلئے یہ عورت میرے پاس رہے، تو جو کچھ اس عورت کا خاوند
مانگے گا، میں دوں گا۔

یہ بات مجھ تک پہونچی۔ کبھی کبھی غربت اور افلاس اس
قدر بڑھ جاتا ہے کہ انسان وہ باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے
جو اس کا ضمیر کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ اب میرا
دوست بھی مجھ سے تنگ آ چکا تھا۔ آخر کب تک کوئی انسان
کسی کے اتنے بڑے کنبے کو پال سکتا ہے۔ یا گھر میں رکھ سکتا ہے
جو کچھ میرے دوست نے مجھ سے کہا، میں نے مان لیا اور
ساری رات جاگتا رہا۔ تیری ماں بھی نہ سو سکی۔ آخر میں
تیری ماں نے مجھ سے پوچھا، کیا بات ہے۔ آپ کو نیند
نہیں آ رہی ہے۔"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم زندگی کے دن کیسے گزار رہے
ہیں، اب مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میرا دوست مجھ سے کہنے والا
ہے، کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اس کے بعد ہم کہاں جائیں گے، کہاں
رہیں گے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہاں ایک بات اس نے کہی
ہے۔ جو مجھے تم سے نہیں کہنی چاہیئے۔ اور اس سے پہلے کہ میں
تم سے وہ بات کہوں مجھے مر جانا چاہیئے۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت
نہیں۔ میں اس وقت اپنے ضمیر کو بیچ کر تم سے کہہ رہا ہوں۔ ایک
بزنس مین یہاں آتا ہے"

"ہاں وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتا ہے"

"وہ کہتا ہے اگر تم ایک رات اس کے ساتھ سو جاؤ، تو جو کچھ
میں مانگوں گا وہ مجھے دے گا، تیری ماں چپ ہو گئی اور زار و قطار
رونے لگی۔

میں اسے چپ کرانے لگا۔

"روتی کیوں ہو۔"

"اس لئے کہ بات کہہ کر تم نے اپنے ضمیر کو بیچ دیا۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو،

جب میرے دوست نے مجھ سے یہ بات کہی تھی، اس وقت
مجھے اس کے منہ پر تماچہ مارنا چاہیئے تھا، اور میں نہ مار سکا مجھ
میں ہمت نہ ہوئی۔

تیری ماں نے اپنے بچوں کو دیکھا، اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔
پھر کنبے کی غربت کو دیکھا۔ اپنے آپ کو دیکھا، اور چپ ہو گئی۔
دوسرے دن وہ بزنس مین آیا۔ اور رات کے اندھیرے
میں تیری ماں اس کے ساتھ چلی گئی۔ جب واپس آئی تو اس نے
میرے ہاتھوں میں نوٹوں کا ایک بنڈل تھما دیا۔

یہ میری انسانیت، شرافت، نیکی، خلوص کی آخری رات
تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو بیچ دیا تھا۔ اور میری بیوی نے اپنے
بچوں کی خاطر اپنی عصمت اور شرافت کو بیچ دیا تھا۔ پھر
ان روپوں سے میں نے کاروبار شروع کیا۔ نہ جانے
ان نوٹوں میں کیا کرامت تھی، کہ میرا کاروبار چل نکلا
جس کاروبار میں ہاتھ ڈالا اُسی سے روپوں کی

بارش ہونے لگی۔ میں نے چوڑیوں کا بیوپار شروع کیا۔ اس میں فائدہ ہوا۔ پھر ساڑھیوں کو کاڑھنے کی ایک فیکٹری قائم کی۔ روپیہ مینہہ کی طرح برسنے لگا۔ پھر SPARE PARTS کی دوکان کھولی۔ اس بزنس میں بھی گھاٹا نہ ہوا۔ بس اس کے بعد کچھ نہ پوچھو، ایک مل کے شیئر خریدے۔ ان میں فائدہ ہوا۔ سٹّہ بھی کھیلنے لگا، سب میں فائدہ ہوا، اس کے بعد میں نے ایک فیکٹری کی بنیاد رکھی، جس میں پن بننے لگے، اور اس طرح کاروبار بڑھتا گیا۔ بنکوں میں روپے جمع ہونے لگے، میں ایک بہت بڑا سرمایہ دار بن گیا۔ پانچ فیکٹریوں کا مالک، بنکوں میں لاکھوں روپے ہیں۔ میرے بیٹے شادی شدہ ہیں سوائے تمہارے۔ کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن جب تمام واقعات پر نگاہ ڈالتا ہوں، تو معلوم ہوتا ہے، سارا سرمایہ جو اکٹھا کیا ہے، اس کی بنیاد ہے ضمیر فروشی پر، اس کی بنیاد ہے پاپ پر، جو میں نے کیا، میں نے سب کچھ پاکر سب کچھ کھو دیا، اور جب اس بستر پر لیٹا ہوا اپنی گھناؤنی زندگی کو دیکھتا ہوں اور کامیابیوں اور کامرانیوں پر نگاہ ڈالتا ہوں، اور یہ دیکھتا ہوں کہ دولت کے شیدائی میری جبہ سائی کرتے ہیں، بیٹے میری عزّت کرتے ہیں، اور شہر کے لوگ میری جدوجہد اور محنت اور کاوش کے گیت گاتے ہیں، میری کامیابیوں اور فتح یابی پر مضامین اور تقریریں کرتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں ان سب کو بیوقوف بنا رہا ہوں، میں نے اس کامیابی کا راز کسی کو نہیں بتایا۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ مجھے کیوں ملا، کیسے ملا، اور مجھے اس کے عوض کیا دینا پڑا۔ اور تیری ماں کو بھی ——

اس پاپ میں ہم دونوں شریک تھے، میں نے اپنا ضمیر بیچا، اور اس نے تیری ماں نے میری بات مانی، مجھے تمہاری ماں کی ایک بات پسند نہ آئی۔ کہ اُس نے اُس وقت کیوں ہتھیار ڈال دیئے، کیوں۔ کیوں ——؟

میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں، یہ عالیشان کوٹھی ضمیر فروشی پاپ اور گناہ کے بل بوتے پر کھڑی ہے، عمارتیں فیکٹریاں، میری ضمیر فروشی کا نتیجہ ہیں، میں سب کچھ حاصل کرکے اُس رات کو نہ بھول سکا، وہ رات میری زندگی کی سب سے کالی اور سیاہ رات تھی، جو میری زندگی کی ساری راتوں پر بھاری رہی، جب کہ تیری ماں چلی گئی تھی، ایک ایک پل، ایک ایک چھن ناگ کی طرح ڈستا تھا مجھے، اب زیادہ بتانے سے کیا فائدہ،

میں تمہیں یہ تمام باتیں اس لئے بتا رہا ہوں، کہ اس دولت کے پیچھے کتنے گناہ چھُپے ہیں، اِس دولت، شہرت اور شان و شوکت کے پیچھے کتنی گھناؤنی کتنی گھٹیا، کتنی ذلیل، رذیل نفرت انگیز حرکتیں چھپی ہیں۔ کہ بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لیکن بیٹا، جو کچھ میں نے کہہ دیا اس سے میرے من کا بوجھ ہلکا ہوگیا، ایسا معلوم ہوتا ہے، یہی کچھ کہنے کیلئے میں آج تک زندہ تھا۔ بیٹا جب مجھ پر فالج گرا، تو میں بول سکتا تھا۔ اور جب کمرہ بند کرتا تھا، تو میں تیری ماں سے باتیں کرتا تھا، وہ مجھے ہمیشہ منع کرتی تھی کہ میں یہ راز تمہیں نہ بتاؤں لیکن نہ جانے ان چاروں بیٹوں میں سے تم مجھے ایسے انسان نظر آئے۔ جسے میں نے یہ بات بتائی، لیکن مجھے تم سے یہ امید ہے کہ تم اپنی ماں کی جو ایک عورت بھی ہے، اُسی طرح سے عزت کروگے، جس طرح کرتے آئے ہو۔ اسے یہ پتہ نہ چلے، کہ میں نے تمہیں یہ بات بتائی، گو اُسے اس بات کا پتہ چل گیا ہوگا، کہ میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے، اور سب کو اسی لئے باہر نکالا ہے، کہ تمہیں اپنی کامیابی کا راز بتا دوں۔

اب تم اپنی ماں کو میرے پاس بھیج دو۔

میں کمرے سے نکل کر ماں کے کمرے میں گیا، ماں بستر پر لیٹی ہوئی تھی،

"ماں، ماں، پتاجی آپ کو یاد کر رہے ہیں!"

ماں نے کچھ کچھ جواب نہ دیا۔

میں زور سے چلایا۔ "ماں"

وہ پھر نہ بولی۔

"میں نے چیخ کر کہا۔ "ماں"

وہ پھر نہ بولی۔

میں نے نبض دیکھی، ماں مر چکی تھی، قریب کی میز پہ ایک چھوٹی سی شیشی پڑی تھی۔ جو خالی تھی، جس پر لکھا تھا۔

میں چپ چاپ والد صاحب کے کمرے میں گیا، پتا جی بھی موت کی آغوش میں جا چکے تھے، شاید یہی بات کہنے کیلئے وہ زندہ تھے۔

۵

ارے تم سو گئے، میری زندگی کا المیہ سنتے سنتے، میرے دوست اس سے بڑی ٹریجڈی اور کیا ہو گی، اتنی شاندار، اتنی دھانسو، اتنی گریٹ، سچویشن گھڑی تھی میں نے کہ انسان کا دل دہل جائے، حضور میں نے، میں نے اپنی ماں کو طوائف بنا دیا۔ اور باپ کو دلال، اور آپ مزے سے آرام فرما رہے ہیں۔ جیسے ہوا ہی کچھ نہیں، اتنی بڑی توہین۔ میری سچویشن کی، خدا کی قسم تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو کوڑے مار مار کر ختم کر دیتا۔ میں نے سوچ سمجھ کر، جان بوجھ کر تمہیں یہ سچویشن سنائی تھی۔ تاکہ تمہیں SH-OCK لگے اور اس SHOCK سے تمہیں دل کا دورہ پڑ جائے۔ حضور پر رتی بھر اثر نہیں ہوا، آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ پرماتما قسم ایسی سچویشن کسی پروڈیوسر کو سنائی ہوتی تو مجھے سینے سے لگا لیتا۔ میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتا، مجھے کہانی کے ڈپارٹمنٹ میں رکھ لیتا۔ دس پندرہ ہزار کا ایک چیک میرے حوالے کرتا، اور جب یہ سچویشن کسی فلم میں فلمائی جاتی، تو ہیرو دیواروں سے ٹکریں مارتا، اور اس کے ساتھ سامعین روتے روتے بیہوش ہو جاتے، اور آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایسے المناک واقعہ کا، میری ذہانت، میری چالاکی اور عیاری کی اتنی بڑی بے عزتی کسی نے نہیں کی، میرا آخری وار بھی خالی گیا، مجھے غصہ آ رہا ہے، اب کیا کروں، مہمان نہ ہوتے تو کھال ادھیڑ دیتا۔ بہر حال سوئے رہو۔ جاگو نہیں، اگر تمہاری آنکھ کھل گئی، تو تمہیں میری توہین کا پتہ چل جائیگا، سوئے رہو، اور میری باتیں سنتے رہو۔ میں باپ کے مرنے سے پہلے ایک چھوٹا لیڈر تھا، لیڈر چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔ میاں چھوٹے لیڈر کو بڑے لیڈر کی بات ماننی پڑتی ہے، اگر وہ نہ مانے تو اسے پارٹی سے خارج کر دیا جاتا ہے، سمجھ گئے، بہت سی باتیں میں بھی اب تک نہ سمجھ سکا۔ اس لئے میں تمہیں کیسے سمجھا سکتا ہوں۔ بڑا لیڈر بننے کیلئے کافی روپیوں کی ضرورت پڑتی ہے، اور چند اس قسم کی باتیں کرنی پڑتی ہیں جن کا تعلق ضمیر اور یقین سے ہوتا ہے، جب مجھے اس المیہ کا پتہ چلا، تو میرا ہر شخص سے بھروسہ ہٹ گیا۔ میں قنوطی ہو گیا، یقین اور بھروسہ کا لفظ میرے ذہن سے نکل گیا، کیونکہ والد کافی سرمایہ چھوڑ گئے تھے، اس لئے بڑا لیڈر بننے کا راستہ صاف ہو گیا۔ میں نے بے تحاشہ روپیہ صرف کیا، پارٹیاں کیں، شراب کی بوتلیں کھول دیں۔ پریس والوں کو بلایا، فوٹو، تصویریں، انٹرویو، مختلف مسائل پر میرے اوٹ پٹانگ بیانات چھپنے لگے۔ صوبے کے وزیروں اور منسٹروں کو گھر پر بلایا۔ انہیں خوب کھلایا پلایا، فوٹو کھنچوا کر اخباروں میں چھپوائے، بس کیا تھا، ایک چھوٹے لیڈر سے بڑا لیڈر بن گیا۔ کم بخت کلرکوں کی طرح لیڈروں کے گریڈ ہوتے ہیں۔ اب تو میں اے گریڈ کا لیڈر ہوں، یعنی ہر مسئلے پر میرے بیان کا چھپنا بہت اہم ہے، اسی درمیان میں نے اپنی اسٹیڈی کی خوب دھاک جمائی، اور خالی الذہن ہو کے تقریریں کرنا شروع کر دیں، جو کوئی مجھے بلاتا، میں چلا جاتا۔ اگر کسی کے گھر کا کسی مارکیٹ کا ادگھاٹن ہوتا، اور مجھے ادگھاٹن کیلئے بلایا جاتا تو میں ضرور جاتا۔ اور اس بات کا خیال رکھتا کہ فوٹو لیا گیا۔ یا نہیں، اور میری ہدایت کے مطابق ان فوٹوؤں کو اخباروں میں چھپوایا۔ بڑا لیڈر بننے کا سب سے بڑا گر یہ ہے کہ آپ لفظوں سے کھیلیں، تقریر کے نشیب و فراز اس کی جادوگری، اور ساحری سے آپ اچھی طرح واقف ہوں۔ لفظوں کا ایک بے پناہ ذخیرہ آپ کے پاس ہونا چاہیئے۔ تاکہ آپ لوگوں کو اچھی طرح بہکا سکیں ہمارے عوام بڑے سیدھے سادے ہیں، انہیں بہکانا بہت آسان ہے، آپ کی نگاہ ہر مسئلے پر ہونی چاہیئے۔ آج نکسلائٹ کا زور ہے، چند لوگ مارے جا رہے ہیں، مگر چند لوگوں کو قتل کرنے سے کیا ہو گا، کیا اس طرح انقلاب آسکتا ہے، مجھے ان نوجوانوں کو سمجھانا پڑے گا۔ انہیں راہ راست پر لانا ہو گا۔ دراصل کامیاب لیڈر وہی ہوتا ہے، جس کے پاس ہر مسئلے کا حل ہو، اور وہ کسی مسئلے کو حل نہ کرے، ایک مسئلے کا حل ہو تو اسے کبھی نہیں کرنا چاہیئے۔ ورنہ اس کی لیڈری خطرے

میں پڑ جائے گی، اور وہ مسئلہ ہے غربت کا، اور بیروزگاری کا، ان دونوں مسئلوں کا رشتہ وہی ہے جو ماں اور بیٹے کا ہوتا ہے، یعنی اگر غریب ہے، تو بیروزگاری ہے، اور اگر بیروزگاری ہے، تو غربت رہے گی، اس لئے غربت اور بیروزگاری کے مسئلے پر شاندار جاندار پُر اثر ولولہ انگیز تقریریں کیجئے گا، مگر خدا کیلئے اس غربت کو بھارت سے مت مٹائیے، ورنہ لیڈری کا پیشہ نیست و نابود ہو جائیگا۔ تو پھر ہم لوگ کیا کریں گے، جہاں تک چھوٹے موٹے مسئلوں کا تعلق ہے، جیسے فرقہ وارانہ فساد، صوبائی تعصب، لسانی جھگڑے، ہندی اردو کا جھگڑا، کمیونسٹ پارٹی کی مقبولیت، نکسلائٹ ازم، ایک صوبے کے دو صوبے کرنا، چند گاؤں اس صوبے میں ضم کردو، چند گاؤں دوسرے صوبے ہیں۔ اسٹیل پلانٹ کس صوبے میں لگایا جائے، اسٹرائک گھیراؤ — کسی لیڈر کے مرنے پر صرف ایک صوبے میں چھٹی کی جائے، یا پورے ہندستان میں، بمبئی بند ہو یا پورا ہندوستان بند ہو جائے، ریلوے ہڑتال، مل مزدوروں کی ہڑتال، بونس، قیمتوں کا بڑھنا، کھوسلہ کمیشن کی رپورٹ، فلموں میں کس کیا جائے یا نہیں، اشتہار چھاپے جاتے ہیں اخباروں میں، ان میں ننگا پن زیادہ ہوتا ہے یا کم، فلموں میں عریانی زیادہ بڑھتی جا رہی ہے، کتنے ہی مسئلے ایسے ہیں، جن کے متعلق بیان دے کر عوام کو الجھایا جا سکتا ہے، یا فیصلہ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ ایک اور اہم مسئلہ میرے سامنے ہے اور وہ ہے روحانیت کا مسئلہ۔ مشرق اور خاص کر ہمارا ہندستان تو روحانیت کی آماجگاہ رہا ہے، آج کل بین الاقوامی سطح پر اس مسئلے نے کافی اہمیت اختیار کر لی ہے، اور یہ تحریک کافی زور پکڑ رہی ہے، ایک دو بار میں نے سوچا کہ میں بھی سوامی بن جاؤں، ماڈرن سوامی، جو ایرکنڈیشنڈ کمروں میں رہتے ہیں، اور جیٹ میں سفر کرتے ہیں، اگر ریل میں سفر کرنا پڑے تو صرف ایرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں سفر کرتے ہیں، یہ دونوں پیشے ایک جیسے ہیں، دونوں کا کام لفظوں سے کھیلنا ہے۔ اچھا خاصہ مجمع ملتا ہے۔ تقریر کرنے کیلئے، عزت اور شہرت بھی ملتی ہے۔ بڑے چھوٹے مرد عورتیں سب احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ایک کامیاب یوگی — سوامی، یا آل انڈیا شہرت کا روحانی لیڈر، سال میں ایک دو بار نیویارک، لندن پیرس کے چکر لگا سکتا ہے، وہاں کیرتن کے اڈے کھولے جا سکتے ہیں، اور اسی طرح فارن ایکسچینج میں اضافہ بھی ہو رہا ہے، اور جہاں تک امریکہ اور انگلینڈ کا تعلق ہے۔ وہاں اس تحریک نے کافی زور پکڑا ہے، بہت سے اخباروں میں امریکہ اور برطانیہ کے باشندوں کی تصویریں چھپی ہیں، کہ وہ کس طرح روحانیت سے مرعوب ہوکے، اور دھوتی پہنے ہوئے گلے میں مالا ڈال کر ڈھولک بجا کر پاگلوں کی طرح ناچ کود کر رہے ہیں۔ انھیں ناچتے کودتے دیکھ کر میں بہت خوش ہوتا ہوں کہ آخر ہندستانی قوم نے اپنی غلامی کا بدلہ لے لیا، امریکہ ایٹمی ہتھیاروں سے ہمیں ڈراتا ہے، اور کبھی کبھی ہماری بے عزتی بھی کرتا ہے، لیکن جو درگت آج کل امریکی اور برطانوی نوجوانوں کی ہو رہی ہے۔ جنھوں نے مشرقی روحانیت کو اپنا کر اپنا حلیہ بگاڑ لیا ہے، اور کام نہ کرنے کی صلاحیت ان میں اتنی بڑھتی جا رہی ہے کہ مجھے مشرق کے تمام روحانی لیڈروں کو مبارکباد دینا پڑے گی، کہ انھوں نے وہ معجزہ کر کے دکھا دیا جو گاندھی اور جواہر لال نہ کرسکے، اگر مغرب والے اسی طرح مشرقی روحانیت پر ایمان لاتے رہے، تو خدا کے فضل سے جس طرح ہم ناکارہ ہو گئے ہیں، اسی طرح امریکہ اور برطانیہ کی پوری نئی اور پرانی نسل ناکارہ ہو جائے گی۔ دوسری قوموں کو ناکارہ بنانے کی جو یوجنا ہمارے سنتوں اور روحانی لیڈروں نے بنائی ہے میں اس کا تہ دل سے سواگت کرتا ہوں، ہم تو پہلے ہی ناکارہ تھے، پوری دنیا کو ناکارہ بنا دینا دراصل کسی معجزے سے کم نہیں۔ یہ تجارت بُری نہیں، یہ تحریک دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، اس کی مقبولیت بے پناہ ہے، اس پیشے کو اپنایا جا سکتا ہے ابھی دل نہیں مانتا، راہ میں صرف ایک رکاوٹ ہے اور وہ یہ چولا بدلنے کی رسم، یعنی دھوتی، لنگی، یا بھگوے کپڑے پہننے پڑیں گے اور مجھے پینٹ اور بش شرٹ پہننے کی عادت ہے، ہو سکتا ہے۔ ہمارے یوگی دو تین سال میں پینٹ اور بش شرٹ پہننا شروع کر دیں۔ اس وقت میں اپنے یوگیوں اور سوامیوں کی صف میں فوراً کھڑا ہو جاؤنگا

ایک اور دقت ہے، کہ بحیثیت ایک سیاسی لیڈر کے مجھے معاشی اقتصادی، صوبائی، قومی اور بین الاقوامی مسئلوں پر سوچنے کی کافی مہارت ہے، اور خاص کر ان مسئلوں پر خوبصورت لفظوں، تشبیہات، استعاروں اور شعروں کا ذخیرہ اتنا ہے میرے پاس، کہ زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور تقریریں کرتے کرتے مجھے اتنی مہارت ہوگئی ہے کہ کس فقرے پر تالی پڑے گی، اس کا مجھے علم ہے، جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے، اس کے بارے میں مجھے کافی کتابیں پڑھنی ہوں گی، کہیں یہ نہ ہو جائے، کہ بھگوے کپڑے پہن کر سوامی تو بن جاؤں اور تقریر کرتے ہوئے ہوٹ ہو جاؤں۔ اس ذلت کو برداشت کرنے کیلئے میرا ذہن تیار نہیں۔

روحانی موضوع پر کافی دھاکڑ سوامیوں کا مقابلہ کرنا پڑیگا چھوٹا موٹا سوامی بننے سے کیا فائدہ، اگر چولا بدلنا ہی ہے تو اے گریڈ کے سوامیوں میں میرا شمار ہونا چاہئیے۔ یوں میں نے ہر قسم کے مجمعوں میں شرکت کی ہے، جہاں بین الاقوامی شہرت کے سوامیوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اُن کے طرزِ تخاطب، اندازِ گفتگو، اُن کے تبلیغی جوش کا مطالعہ کیا ہے۔ اور خاص کر یہ بات جاننے کی کوشش کی کہ وہ کونسی دکھتی رگ ہے، جس پر وہ انگلی رکھتے ہیں، کہ لوگ واہ واہ کا نعرہ بلند کرتے ہیں، ایک بات جو میں نے نوٹ کی اور جو آپ کو بتا دیتا ہوں، کہ میں نے اس قسم کے مجمعوں میں عورتوں کی تعداد زیادہ دیکھی، عورتوں کو آسانی سے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے، اوّل تو ان میں عقل ہوتی ہی نہیں، اگر مان لیا جائے کہ ہوتی ہے، تو وہ بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ میں سادھو یا سوامی کب کا بن گیا ہوتا۔ اگر میں اپنے آپ کو چولا بدلنے پر راضی کر لیتا۔ میرے لئے دل کا بدلنا بہت آسان ہے۔ مگر لباس کا بدلنا مجھے اکھرتا ہے، گو بہت سے سنت سوامی، اور سادھو لنگی پہنتے ہیں۔ اور آج کل لنگی پہننے کا رواج کافی مقبول ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے، جب مجھے یہ محسوس ہونے لگے تو میں سوامیوں کی صف میں کود پڑوں گا۔ یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور سوئے ہوئے تمہیں بڑا بڑا نازیب نہیں دیتا کہ جب انسان اپنا ضمیر بیچ دے اور دماغ کو ماؤف کرے۔ دل جذبات سے عادی ہو جائے تو پھر لباس بدلنے میں کیا ہرج ہے۔ تمہارا مشورہ درست تو ہے دوست۔ لیکن میرے سوئے ہوئے دوست لیڈری کے جس زینے پر میں ٹھہرا ہوں، وہ لیڈری کا آخری زینہ ہے دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میری زندگی اندر سے اتنی کھوکھلی اور گھناؤنی ہوگئی ہے کہ میں اسے اور گھٹیا نہیں بنا سکتا، یہ گھٹیا پن کی آخری منزل ہے۔ جہاں اچھائی اور بُرائی میں کوئی تفریق نہیں رہتی، جہاں امیری اور غریبی میں کوئی تمیز نہیں، جہاں حقیقت نگاری، مبالغہ آرائی میں کوئی فرق نہیں، جہاں سُود و زیاں کی کوئی فکر نہیں۔ جب انسان اس منزل پر پہنچ جائے اور اس کی بات کو الہام کا درجہ دیا جانے لگے، اس وقت پر فیشن بدلنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

اس لئے اے میرے سوئے ہوئے دوست، اس وقت میں تمہیں الوداع کہوں گا۔ تم سوئے رہو۔ جاگو نہیں۔ تم اگر جاگ گئے تو ہم کیا کریں گے، اچھا ہی کیا، تم میری تقریر سنتے رہے اور خاموش رہے، اور چپکے سے سو گئے، جنھوں نے میری تقریریں سنی ہیں، انھوں نے کیا کر لیا۔ اگر تم سن لیتے تو کیا کر لیتے۔

اس وقت میں یہ محسوس کر رہا ہوں، کیا تم موجود بھی ہو، کیا تمھارا وجود بھی ہے۔ کیا میں اپنے آپ سے باتیں تو نہیں کر رہا تھا۔ یعنی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہوں، تم نظر نہیں آئے۔ کیا ہوا میں تحلیل تو نہیں ہوگئے۔ یا تمہیں سونے میں چلنے کی بیماری ہے۔ بہر حال تم چلے گئے، اچھا ہی کیا۔ تمہیں ایک دن جانا ہی تھا، تم نے میری باتیں سنی یا نہیں، تم میرے لیکچر سے متاثر ہوئے کہ نہیں، مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرا کام ہے، تقریر کرنا۔ لفظوں اور خطابت کے ذریعے لوگوں کو مرعوب کرنا، جب تک لوگ میری خطابت اور لفاظی سے متاثر ہوتے رہیں گے، میں بحیثیت لیڈر تقریر کرتا رہوں گا۔ مجھے معلوم ہے، ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب سامعین نہیں رہیں گے۔ صرف میں اپنے آپ سے گفتگو کروں گا۔ میرا سایہ بھی مجھ سے جدا ہو جائیگا۔ وہ دن قیامت کا دن ہوگا، جب میری تقریر سننے کیلئے کوئی نہ آئے گا۔ اس دن کے آنے سے پہلے مجھے مر جانا چاہئیے، اچھا الوداع۔ میرے بھائی، میرے ہمدم، میرے دوست، میرے رفیق ——

الوداع۔۔!

حریفِ آتشِ پنہاں

(شمس الرحمٰن فاروقی کے نام)

رام لعل

رام لعل ——

تاریخ پیدائش	تین مارچ ۱۹۲۳ء
مقام	میانوالی مغربی پنجاب (پاکستان)
تعلیم	ہائی اسکول
تربیت	(مکینک) لوکو ورکشاپ مغلپورہ (کمرشیل کلرک) والٹن ٹریننگ اسکول لاہور چھاؤنی
پہلی کہانی	'تھوک'، ۱۹۴۳ء میں ہفتہ وار 'خیام' لاہور میں۔
افسانوی مجموعے	'آئینے' ۱۹۴۵ء (تعارف: احمد ندیم قاسمی) وہ مسکرائے گی ۱۹۵۲ء انقلاب آنے تک ۱۹۴۹ء (دیباچہ: قاضی عبدالغفار) نئی دھرتی پرانے گیت ۱۹۵۸ء گلی گلی ۱۹۶۰ء آواز تو پہچانو ۱۹۶۳ء کل کی باتیں ۱۹۶۷ء انتظار کے قیدی ۱۹۶۷ء چراغوں کا سفر ۱۹۶۷ء
ناولٹ	حریفِ آتشِ پنہاں ۱۹۷۱ء
ڈرامے	لہو اور چراغ، فیصلہ، اجنبی، آنگن، ایک شہری پاکستان کا، منزل کہاں ہے تیری، گذرتے لمحوں کی چاپ (زیرِ طبع)۔
رپورتاژ	کون ہنسا ابھی ابھی، احساس کی یاترا (زیرِ طبع)
نیا مجموعہ	اکھڑے ہوئے لوگ (زیرِ طبع)
مشہور افسانے	ادّی، ایک شہری پاکستان کا، قبر، سیواداد، تماشا، چاپ، اکھڑے ہوئے لوگ، بھیڑ اور بھیڑ، سفرِ مسلسل، اماں، ہیڈلیس بدھا، آنگن، انتظار کے قیدی۔
جن کتابوں پر حکومت اترپردیش سے انعامات ملے	نئی دھرتی پرانے گیت، گلی گلی، آواز تو پہچانو۔
سفر	پاکستان سے ہندوستان تک قریب قریب ہر بڑے شہر میں۔
موجودہ پتہ	R-39-II ملٹی اسٹوری، چار باغ لکھنؤ ۱

حریفِ آتشِ پنہاں

رام لعل

وہ تعداد میں چھ تھے، لمبے، چھوٹے اور درمیانے قد کے۔ اٹھارہ سے بیس سال کی عمر کے دائرے میں۔ سبھی سب بیحد مسرور۔ اپنی حرکتوں پر نازاں۔ سفید، سُرخ، نیلی، پیلی ہر طرح کی بُش شرٹوں اور ٹانگوں کے ساتھ چپکی ہوئی پتلونوں اور نوکدار جوتوں کی وجہ سے اُن کے بدن میں کچھ زیادہ ہی پھرتی پیدا ہو گئی تھی۔ اُن کے بال بھی جدید وضع قطع کے تھے، کسی کے ماتھے پر گرے ہوئے، کسی کی گردن کے پیچھے بڑھے ہوئے، کانوں کے نیچے تک سب کی قلمیں اُتری ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں دو، دو، ایک ایک کاپیاں، کتابیں اُٹھائے وہ گلی کے موڑ پر گنے کا رس بیچنے والے سردار کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ رس پی کر وہ سردار کو کبھی پیسے نقد دے دیتے، کبھی اُدھار کر دیتے۔ کبھی کبھی تو اُسے ایک پیسہ تک نہیں دیتے تھے۔ پھر بھی سردار اُنہیں رس پلانے سے انکار نہیں کرتا تھا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب مل کر اُس کا ٹھیلا اُلٹ دیتے۔ لیکن کالج سے نکل کر اُن کا اُس موڑ پر کھڑے ہونے کا مقصد گنے کا رس ہی پینا نہیں ہوتا تھا۔ روزانہ چار بجے سرسوتی بھون گرلز کالج کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ گرے رنگ کی بدن کے ساتھ چپکی ہوئی قمیص، سفید چوڑی دار پاجامے اور سفید دوپٹوں والی کتنی ساری لڑکیوں کے جھنڈ کے جھنڈ اسی موڑ پر سے گزرتے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر وہ خاموش بھی کھڑے رہتے۔ تب بھی اُنہیں خوبصورتی، دلکشی اور مٹھاس کے درجنوں گلاس رگ رگ میں سماتے ہوئے محسوس ہو سکتے تھے۔ لیکن اس عمر میں فطری طور پر لڑکوں کے لئے نچلا بیٹھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جب تک وہ لڑکیوں پر آوازے نہ کس لیں، اُنہیں چین نہیں پڑتا۔ لڑکیوں کو وہ عجیب عجیب ناموں سے پکارتے۔ اُن کی چال پر پھبتیاں کستے، اُن کی شان میں فلمی گیت گاتے۔ لڑکیاں بیچاری گھبراتی، سہمتی، منہ بناتی شکایتی نظروں سے بھی تاکتی ہوئی جلدی جلدی گزر جاتیں۔ بعض کے ساتھ گارجین ہوتے تھے۔ بعض تنہا ہونے کی وجہ سے ٹولیاں بنا کر جاتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی پولیس والا اُدھر آ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اُس وقت تو یہ لڑکے خاموش رہ جاتے تھے۔ لیکن آنکھوں سے اشارے کرنے اور مسکرانے سے باز نہیں آتے تھے۔

جب سب لڑکیاں نکل جاتیں تو وہ سگریٹ کے کش لگاتے، اور ہاتھوں میں کالے چشمے گھماتے، پان چبا چبا کر اِدھر اُدھر تھوکتے ہوئے اجمل خاں روڈ کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ آزادی کے بعد یہ سڑک بہت بڑی مارکیٹ بن گئی ہے۔ صبح سے شام تک خریداروں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ ہر قسم کے سامان کی بے شمار دکانیں اور ریسٹورانٹ ہیں۔ دکانیں بھی خوبصورت اور گاہک بھی خوبصورت۔ ہندوستان کا پیرس اب دلّی ہے۔ کبھی لاہور ہوا کرتا تھا۔ دلّی کا دل صرف اسی علاقہ میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اس علاقے میں تیز رفتار کاریں، بسیں اور ٹرک نہیں دوڑتے۔ یہاں پہنچ کر پیدل چلنے والوں کی رفتار بھی ایک میل فی گھنٹہ سے کم ہو جاتی ہے۔ ہر شخص ہر کسی کو دیکھتے ہوئے چلتا ہے۔ لوگ دکانوں میں سجے ہوئے سامان کو گھورتے ہیں، اور دکانوں میں سجا ہوا سامان اُنہیں گھورتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

وہ سب رین بو ریڈی میڈ گارمنٹس نام کی سب سے بڑی دکان کے سامنے رُک گئے، جس کا ایک حصّہ زمین کے اُوپر تھا، دوسرا حصّہ زمین کے نیچے۔ وہاں دو درجن سے زیادہ سیلز گرلز کام کرتی تھیں۔ سب کی سب حسین اور جوان۔ رین بو کے سندھی مالک نے اپنے یہاں سیلز گرلز کو ملازم رکھنے کیلئے ایک کڑی شرط لگا رکھی تھی۔ کوئی بھی اٹھارہ سال سے کم اور پچیس سال سے زیادہ کی نہ ہو اور کسی صورت میں بھی شادی شدہ نہ ہو۔ اس سے دکان کی شہرت میں بے حد اضافہ ہوا تھا۔ صبح سے شام تک کئی ہزار گاہک اس دکان میں ریڈی میڈ کپڑے خریدنے کے لئے پہنچ جاتے۔ اُس دکان میں روزانہ ایک آدھ چکر لگانا بھی لڑکوں کا معمول تھا۔ وہاں سے اُنہوں نے شاذ و نادر ہی کوئی قمیص یا پتلون خریدی تھی۔ اُن کے لئے وہاں ہر چیز بہت مہنگی تھی۔ لیکن دکان میں گھس کر چیزوں کے محض ریٹ ہی پوچھ کر اُنہیں بہت سا اطمینان مل جاتا تھا۔ کیونکہ ریٹ بتانے والی سیلز گرلز ہی ہوتی تھیں۔ اگرچہ وہ ایسے لڑکوں کو خوب پہچانتی تھیں۔ جان گئی تھیں، وہ کچھ خریدنے نہیں آتے ہیں، اُن کے ساتھ محض باتیں کرنے اور نظریں ہی لڑانے کیلئے

آتے ہیں۔ اس لئے انہیں دیکھتے ہی وہ شیشے کی الماریوں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتیں۔ صرف مسکراتی رہتیں۔ لڑکے الماریوں میں رکھی ہوئی قمیصوں اور بُش شرٹوں کے دام پوچھتے تو وہ انہیں زبانی بتا کر ٹرخا دیتیں۔ کوئی چیز نکال کر نہیں دکھاتی تھیں۔ کوئی لڑکا کسی سیلز گرل کے ساتھ بیہودہ مذاق نہ کر سکے یا ان کے جسم کے کسی حصّے کو ہاتھ لگا کر چھیڑ نہ سکے، اُس کو روکنے کے لئے رین بو کے مالک نے ایک ریٹائرڈ فوجی کو ملازم رکھ چھوڑا تھا جو اپنی پرانی لیکن ہمیشہ تازہ پریس شدہ یونیفارم پہن کر دکان کے دونوں حصّوں میں ہر وقت گھومتا رہتا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی سفید مونچھیں تھیں۔ اُس کے چہرے پر بڑی خوفناک آنکھیں تھیں۔ اُس کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک ڈنڈا ہوتا تھا۔ وہ بھی اس قسم کے لڑکوں کو خوب پہچانتا تھا، جیسے ہی کوئی لڑکا اندر آتا وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا۔ وہ جس کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہوتا بوڑھا فوجی بھی اُس کے عین سر پر جا موجود ہوتا۔ اُسی کی وجہ سے کوئی شرارت نہیں کر پاتا تھا۔ لیکن لڑکے وہاں جاتے ضرور تھے۔ ایک دو چکر لگا ہی لیتے۔ نظروں ہی نظروں میں جوان اور حسین سیلز گرلز کے جسموں کو تولتے اور پھر منہ میں ہنسی بھرے باہر نکل جاتے تھے، باہر جاتے ہی وہ زور زور سے ہنس پڑتے اور ایک دوسرے کو بڑے فخر سے بتانے لگتے۔

"یار آج تو میں نے سویتا جھا کو آنکھ ماردی اور وہ بھی مسکرا دی۔"

اور "میں نے گیتا بنرجی کی انگلیوں کو چھوا تو ایسا لگا جیسے ایسی کی کرنٹ لگ گئی مجھے۔!"

"اماں، شاہین افروز کو دیکھا آج! کتنا بڑا جوڑا بنا کر آئی ہے!"

"میں تو یار ایک روز کانا ٹھا کر کے نام خط لکھ کر اسی رین بو کے فلور پر خودکشی کر لینا چاہتا ہوں!"

(۲)

وحید عالم اپنی جیپ میں بیٹھے بیٹھے گردن کو ذرا گھما کر سڑک کے پار گنے کا رس بیچنے والے پر گہری نظر جمائے ہوئے تھا۔ اُس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے لڑکے ہاتھوں میں رس کے بھرے ہوئے گلاس اُٹھائے بڑا ہلڑ مچا رہے تھے۔ انہی کی وجہ سے کالج سے لوٹتی ہوئی لڑکیاں بے حد گھبرائی ہوئی وہاں سے گزر رہی تھیں۔ لڑکوں کے فحش اور بیہودہ فقرے سُن کر وہ چونک اُٹھتیں، پھر جلدی سے سر جھکا کر ایک دوسری کے ساتھ چپکی ہوئی سی نکل جاتیں۔ وہ اُس علاقے کے تھانے کا انچارج تھا

جوان، خوبصورت زندگی سے بھرپور، اُس وقت پوری وردی میں تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ جیپ کے اسٹرنگ پر جمے ہوئے تھے، جو لڑکوں کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر کانپ اُٹھتے تھے۔ اُس کی انگلیوں کی گرفت کبھی سخت ہو جاتی کبھی ڈھیلی پڑ جاتی۔ اچانک جیسے اُس سے برداشت نہ ہو سکا۔ گود میں پڑا ہوا سیاہ بیٹن اُٹھا کر وہ جیپ میں سے باہر کود پڑا۔ دوڑتا ہوا پیچھے سے اچانک ہی لڑکوں کے عین سر پر جا پہنچا۔ وہ قد میں اُن سب سے لمبا اور مضبوط تھا۔ اُس نے جاتے ہی دو لڑکوں کو گردن سے پکڑ کر زمین پر دے مارا۔ پہلے تو اُن پر بیٹن سے ضربیں لگائیں پھر اُن کے پیٹ پر اور چوتڑوں پر اپنے جوتے سے ٹھوکریں لگائیں۔ —"بد معاشو! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ نہیں تو تھانے لے جا کر کھال اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔!"

دونوں لڑکے حیران رہ گئے۔ اچانک مار پڑنے سے اُن کی آنکھوں میں توہین کی ندامت جھلک پڑی۔ لیکن وحید عالم کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔

وحید عالم نے اب دو اور لڑکوں کو دبوچ لیا جو بھاگنے والے تھے، اُن کی رنگین بُش شرٹوں کے کالروں سے پکڑ کر اُن کے سر ایک دوسرے کے ساتھ زور سے ٹکرا دیئے۔ دونوں لڑکے چکر کھا گئے۔ وحید عالم نے ایک سے پوچھا

"تمہارا نام کیا ہے بے۔؟"

"جی۔ جی آروند کمار!" اُس نے خوفزدہ نظریں اُٹھا کر اوپر دیکھا۔

"اور تمہارا ——؟"

"اشفاق۔!"

اشفاق نے جان بوجھ کر سر نیچا ہی رکھا۔ لیکن وحید نے اُسے بالوں سے پکڑ کر اُس کا سر اونچا کر دیا۔ کچھ لمحوں تک اُس کی آنکھوں میں گھورتا رہا۔ پھر اُس نے دونوں کو نیچے فرش پر گر پڑنے کے لئے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اُن پر جیسے تھوکتے ہوئے کہا۔ "کتے، آوارہ جاؤ — بھاگ جاؤ۔ نہیں تو کپڑے اُتروا کر اسی بازار میں ننگا پھراؤں گا۔! لوگوں سے کہوں گا۔ تمہارے چوتڑوں پر تھوکیں! گندگی پھینکیں، جاؤ۔!"

باقی لڑکے اپنے ساتھیوں کو مار کھاتے دیکھ کر ہی بھاگ نکلے تھے۔

اِدھر اُدھر سے سڑک کے کنارے جتنے لوگ جمع ہو گئے تھے وہ سب وحید عالم کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھنے لگے، لیکن وہ سب سے بے نیاز بیٹن گھماتا ہوا اپنی جیپ میں جاکر بیٹھ گیا اُسی وقت دو سپاہی بھاگتے ہوئے اُس کے پاس پہنچے۔ اُسے سیلوٹ کرکے بولے۔!

"انسپکٹر صاحب، کوئی حکم ہمارے لئے!"

وحید عالم نے اُن کی طرف غصّے سے دیکھا۔ پوچھا۔ کہاں تھے تم لوگ؟۔ تم سے کہہ رکھا ہے ایک نہ ایک آدمی اِس موڑ پر ضرور رہا کرے!"

"حضور! ہم اُدھر سُناروں کی گلی میں تھے۔ دو شرابیوں میں جھگڑا ہو گیا تھا اُس کو نپٹا رہے تھے، دونوں کو پکڑ کر تھانے بھجوا دیا ہے۔ اِدھر سے لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو سبب معلوم کرنے کیلئے یہاں بھی آ گئے۔ آپ تو صاحب جانتے ہیں ہم۔"

"اچھا اچھا بیٹھو جیپ میں۔ ایک دو راؤنڈ اور لگالوں، پھر گھر جاؤں گا۔"

دونوں سپاہی لپک کر چلتی ہوئی جیپ میں پیچھے سے سوار ہو گئے" وحید عالم نے ابھی جیپ گھمائی ہی تھی کہ رین بو کے اندر فرش پر گھومنے والا ریٹائرڈ فوجی اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ سفید مونچھوں کے پیچھے اُس کے ہونٹ مُسکرا رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر وحید عالم نے جیپ روک لی۔ بوڑھے کو ادب سے سلام کرکے پوچھا۔ "ابّا چلیے گا کہیں!"

نہیں بیٹے، میں تو تمہیں دیکھ کر دُکان سے باہر چلا آیا۔ میری ڈیوٹی تو آٹھ بجے ختم ہوتی ہے۔

"ذکیہ کہہ رہی تھی ابّا، امّی سے ملنے جاؤں گی۔ شاید کل صُبح جائیگی آپ کے یہاں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اچھا تو میں چلوں، السّلام علیکم!" یہ کہہ کر اُس نے جیپ پھر اسٹارٹ کرلی۔ اُسے گھما کر بڑی مُشکل سے چوراہا پار کیا۔ پانچ، چھ بجے ہی اِس سڑک پر بے پناہ بھیڑ ہو جاتی ہے۔ راستہ پانا دشوار ہو جاتا ہے اسی لئے اِدھر سے موٹریں اور ٹیکسیاں لے جانے کی ممانعت ہے۔ جہاں ایک بھی موٹر پھنسی سارا ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر شام کے وقت کے لئے اِس علاقہ میں دو انسپکٹر اور دو درجن سپاہی ٹریفک کو جاری رکھنے کے لئے تعیّنات کئے گئے تھے۔

(۳)

سبزی منڈی کے علاقے میں شام کو بھیڑ کم رہتی ہے۔ یہ اُس سبزی منڈی سے بہت مختلف ہے جو شہر کے پُرانے علاقے میں پچاس ساٹھ سال سے قائم ہے۔ نئی کالونیوں نے اپنے ساتھ چھوٹی چھوٹی منڈیوں کو بھی جنم دیا ہے۔ گلیوں کے موڑوں پر، گلیوں کے بہت اندر تک بھی لوگوں نے اپنے مکانوں کے بیرونی حصّے دُکانوں میں تبدیل کرکے کرائے پر اُٹھا دیئے ہیں۔ بعض نے فٹ پاتھوں کو بھی گھیر کر ٹٹّر اور چھپّر کھڑے کر لئے ہیں۔ یہاں پھلوں، ترکاریوں، گوشت، انڈوں، مرغیوں، تیتروں، بٹیروں اور مچھلی کی بڑی مانگ ہے۔ اِسی علاقے کے بعض گھروں میں چوری چھپے پیشہ بھی ہوتا ہے۔ پیشہ قانونی طور پر ختم کیا جا چکا ہے لیکن اُس کے بجائے شہریوں کے محلّوں میں چھوٹے چھوٹے ڈانسنگ اور میوزک اِسکول کھُل گئے ہیں۔ پیشہ ور عورتوں نے اپنے صدیوں پُرانے رویّے اور رہن سہن کے طور طریقے بدل لئے ہیں، اب وہ اپنی پوشاکوں سے ایک نظر میں نہیں پہچانی جا سکتیں۔ اُن کے دلاّل بھی بالکل بدل چکے ہیں۔ وہ اب گلیوں میں راستہ روک کر اپنے گاہکوں کو نہیں ورغلاتے ہیں۔ اب وہ دُکانوں، فیکٹریوں، ہوٹلوں اور دفتروں میں ملازم ہو گئے ہیں، اپنے گاہکوں کو وہ وہیں سے ورغلا کر لے آتے ہیں، اُن کے دوست بن کر۔ پیشہ ور عورتیں بھی سینما گھروں اور شاپنگ سینٹرز سے گاہک پھنسا کر لے آتی ہیں۔

شہر کے کسی بھی حصّے میں بار کھولنے کی اِجازت نہیں ہے، لوگ دکانوں سے شراب خرید کر یا تو اپنے گھروں کے اندر لے جاتے ہیں یا کسی رسیٹوران میں چائے کی پیالیوں میں ڈھال کر پیتے ہیں۔ بعض لوگ کوکا کولا کی بوتلوں میں شراب بھر کر رسیٹورانوں کے سامنے سڑک پر ہی کھڑے ہو کر پیتے رہتے ہیں۔

اچانک، ایک تنگ گلی میں سے ایک ادھیڑ عورت بھاگتی اور چلّاتی ہوئی کھُلی سڑک پر آگئی۔ "بچاؤ بچاؤ" اُس نے میری بیٹی کے گلے پر چھُری پھیر دی! بچاؤ، بچاؤ۔!"

اُس کے گرد لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ سب دُور سے ہی اُس مکان کی طرف دیکھنے لگے، جدھر وہ اشارے کر کرکے چلّا رہی تھی۔ لیکن کسی میں ہمّت نہیں تھی کہ اُس مکان کی طرف بڑھ جائے۔ جیسے وہ مکان آسیب زدہ ہو۔ اُس میں ابھی ابھی کسی بھوت

کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا گیا ہو۔!

وحید عالم کی جیپ ذرا فاصلے پر ایک اور گلی کے موڑ پر رُکی ہوئی تھی۔ شورش زدہ اور اُس کے دونوں سپاہی بھیڑ میں گھس گئے۔ وحید عالم بھیڑ کو چیر کر اُس مکان کے سامنے چلا گیا۔ ڈیوڑھی میں روشنی نہیں تھی۔ اُس کے بعد ایک نیم تاریک سا آنگن تھا۔ جس میں پھلوں کے خالی کھوکھوں کا انبار لگا تھا۔ آدھی دیوڑھی بھی آہنی بکسوں اور ٹوکریوں سے پٹی پڑی تھی۔ وحید عالم نے اندر جا کر اِدھر اُدھر کے کچھ کمروں کی کھڑکیوں اور نیم وا دروازوں میں سہمی ہوئی عورتوں کو دیکھا۔ وہ سب ایک اندر کمرے کی سمت میں دیکھ رہی تھیں جس میں روشنی تھی۔ ایک باوردی پولیس اِنسپکٹر کو دیکھ کر سب نے اُسی کمرے کی طرف اِشارہ کیا۔

فرش پر ایک نوجوان لڑکی خون میں لت پت پڑی کراہ رہی تھی۔ مرنے کے قریب تھی، اُس کے گلے سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس کے پاس ہی ایک آدمی ہاتھ میں چاقو لئے کھڑا تھا۔ خون سے بھرا ہوا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں کچھ کرنسی نوٹ تھے۔ وحید عالم اُسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ پڑھے لکھے لوگوں میں مسٹر ہمپ کے نام سے مشہور تھا۔ اُس کا رابطہ کئی عورتوں کے ساتھ تھا جو چوری چھپے پیشہ کراتی تھیں۔ اُس آدمی کی تھانے میں کئی مرتبہ پٹائی کی جا چکی تھی۔ وہ بھی وحید عالم کو دیکھ کر چونک پڑا۔ لیکن اُس کے چہرے پر ایک خوفناک مُسکراہٹ اُبھر آئی۔

وحید عالم اُس پر نگاہ جمائے کچھ لمحوں تک کھڑا سوچتا رہا گیا، وہ دراصل گرد و پیش کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کی پیٹی میں خالی پستول تھا۔ گولیاں الگ پڑی تھیں۔ لیکن اُس کے ہاتھ میں مضبوط بیٹن تھا جس پر اُس کے ہاتھ کی گرفت بہت سخت ہو چکی تھی۔ ہمپ کے پاس چاقو تھا اور کھلا ہوا۔ وہ ابھی ابھی ایک خون کر چکا ہے۔ یہ عمل وہ بڑی بے خوفی سے دُہرا بھی سکتا ہے۔ خون اُس کے سر پر یقیناً سوار ہے۔ لیکن وحید عالم نے کسی قسم کی جھجک دکھائے بغیر اُسے حکم دیا۔

"ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو تیری خیر نہیں۔ تو میری حراست میں ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اُس کے سپاہی نہ جانے کہاں رہ گئے ہیں۔ ہمپ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ہمت ہے تو مجھے پکڑ لو داروغہ صاحب"!

وحید عالم کے کانوں کی لویں سُلگنے لگیں۔ لیکن اُس کے کان ابھی تک اُن چیخوں پر بھی لگے تھے جو گلی میں سے ہو کر اندر آ رہی تھیں۔ لیکن وہ عورت ابھی تک نمودار نہیں ہوئی ہے۔ اُس نے ہمت نہ ہاری۔ جلدی سے آگے بڑھ کر ہمپ کا ہاتھ پکڑ لیا جس میں چاقو تھا۔ اُس کے پیٹ میں زور سے گھٹنا مارا، اور اُسے زمین پر دُہرا ہو کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ہمپ درد سے کراہنے لگا۔ لیکن وہ چاقو کو بدستور مضبوطی سے تھامے رہا۔ وحید عالم کے ہاتھ میں اُس کی وہی کلائی تھی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ کو بہت اونچا اُٹھا کر اپنا بیٹن اُس کی کھوپڑی پر دے مارا۔ بالکل عمودی۔ ایک بار، دوسری بار اور پھر تیسری بار۔ تیسری بار اُسے محسوس ہوا بیٹن کا سرا ہمپ کی کھوپڑی میں دھنس گیا ہے اور اُس کا سر کڑھک گیا ہے اور خون سے اُس کی پوری کھوپڑی لت پت ہوتی جا رہی ہے۔ اُسی لمحے بہت سے لوگ اندر گھس گئے۔ اُن میں اُس کے دونوں سپاہی بھی تھے۔ چیخنے والی عورت بھی تھی، اُس نے اپنے سپاہیوں کو الگ لے جا کر کچھ ہدایات دیں۔ جن میں ایمبولینس لے آنا بھی شامل تھا۔ اُس نے تھانے سے اپنے ایک اسسٹنٹ کو بھی بلوا بھیجا، جو وہاں بیٹھ کر لوگوں کے بیانات قلمبند کرنے لگا۔

وحید عالم کو اپنی خالہ کے یہاں جانا تھا۔ گھر سے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر۔ اُن کا رات کا کھانا وہیں تھا۔ ذکیہ کو معلوم تھا، وہ کپڑے بدل کر تیار بیٹھی ہوگی۔ اُس نے جیپ گھر کی طرف دوڑائی، بہت تیزی سے۔ ذکیہ سچ مچ اُس کی منتظر تھی۔ نیو پولیس لائنز کی ملٹی اسٹوری کے ایک فلیٹ کی بالکنی میں کھڑی نیچے جھانک رہی تھی۔ اُس نے ہارن بجا کر اُسے نیچے آجانے کا اِشارہ کیا۔ لیکن ذکیہ نے اُسے اُوپر آنے کیلئے کہا۔

وہ اُوپر پہنچا تو ذکیہ نے کہا۔ "اب آپ پر ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔ یونیفارم اُتار کر بھلے آدمیوں کے سے کپڑے پہن لیجئے۔"

ذکیہ کے لہجے میں ایک عجیب سا تحکم تھا، لیکن وحید عالم مُسکرا دیا۔ اُسے دیکھ کر اُس کا سارا غصہ آناً فاناً کافور ہو جاتا تھا، وہ پچیس سال کی ایک دلکش عورت تھی، دُبلی پتلی اور اُسی طرح کی چلبلی۔ وہ اُسے گھر واپس آنے کے بعد تھانے سے متعلق کوئی بات نہیں کرنے دیتی تھی۔ وہ ایسے قصے سُننا کبھی پسند نہیں کرتی تھی کس نے کس کو کتنی بے دردی سے قتل کیا! کس نے کس کے یہاں کب نقب لگائی۔ اِن باتوں سے اُسے وحشت ہوتی تھی۔ وہ اُس کی یونیفارم سے بھی خوف کھاتی تھی۔ اپنے شوہر کو یونیفارم میں دیکھ کر اُس کا جی ڈوبنے لگتا۔ اُس کے پاس سے بھاگ جانے کی خواہش پیدا ہو جاتی۔ کسی سوشل فنکشن میں اُس کا ساتھ دینے سے صاف

انکار کر دیتی اگر وہ یونیفارم میں ہوتا۔

وحید عالم نے چاہا اُسے پیار کر لے۔ آج وہ اُسے بہت دلکش دکھائی دی۔ لیکن ذکیہ نے اُسے ہاتھ نہ لگانے دیا۔ "دور ہی رہیئے جناب! پہلے یونیفارم بدلیئے!"

ایک لمحے کے لئے اُس کا خون پھر کھول گیا۔ چاہا ہنٹر سے اس عورت کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکراتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا کپڑے بدلنے کیلئے۔

وہاں سے سفید ٹیری لین کی شرٹ اور پینٹ پہن کر وہ باہر آیا، تو ذکیہ خود ہی بڑھ کر اُس سے ملی۔ اُس کی شرٹ کی بٹن بند کرتی ہوئی بولی۔ "خالہ کے یہاں لے جانے کے لئے میں نے کچھ پھل منگائے ہیں۔ ایک کلو سیب ہیں۔ اور ایک درجن کیلے۔ کافی ہوں گے۔؟"

"بہت کافی! راستے میں کچھ انڈے بھی لیتے چلیں گے۔ اب جلدی سے چلو۔"

باہر نکلتے نکلتے وحید عالم نے اپنا بیٹن بھی اُٹھا لیا۔ لیکن ذکیہ نے بیٹن اُس کے ہاتھ سے لے کر پھر اندر پھینک دیا۔ "اِسکی کیا ضرورت ہے؟ کبھی تو بھول جایا کیجئے کہ آپ تھانیدار ہیں۔"

وحید عالم نے بڑی میٹھی نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ ایسی نظر سے جس سے سارے پولیس والے اور فوجی اپنی عورتوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ جس میں محبت بھی ہوتی ہے۔ ملکیت کا احساس بھی ہوتا ہے اور خاص طرح کے رحم کا جذبہ بھی۔ وہ اُسے سارے راستے میں چھیڑتا رہا اور وہ ہنستی رہی۔

(۴)

وہ خالہ کے یہاں پہنچے تو خالہ اُن کے لئے میز پر کھانا چن رہی تھی۔ اُدھیڑ بیوہ اُنہیں دیکھتے ہی مسکرا دی۔ کوئی کوئی مسکراہٹ اپنے ماحول کی وجہ سے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہے، بڑا کرب رکھتی ہے۔ جس مکان میں وہ رہتی تھی وہ چیلی قبر کے بوسیدہ مکانات کے سلسلے کا ایک معمولی سا حصّہ تھا۔ ننانک شاہی کی چھوٹی اینٹ کی دیواریں۔ جگہ جگہ اُکھڑا ہوا فرش، ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے بھی جھولتے ہوئے اور لٹکتے ہوئے بجلی کے تار اور ٹپکتے ہوئے واٹر پائپ اور پرنالے۔ لیکن اُس کی مسکراہٹ میں ایک اطمینان یہ بھی تھا کہ یہ مکان اُس کا اپنا ہے جو اُس کے مرحوم شوہر نے چھوڑا تھا۔ وحید عالم اپنی خالہ کی ایسی مسکراہٹ کے آگے ہمیشہ جھک جاتا تھا۔ اُسے خالہ کے سانولے چہرے پر جس قسم کے صبر کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی، اُس کی تاب لانا اُس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اشفاق کہاں ہے؟"

"شام کو آتے ہی پڑ کر سو گیا۔ صبح سے کچھ کھایا ہے نہ پیا۔!"

اشفاق کی عادتیں اچھی نہیں تھیں۔ خالہ نے اکثر اس سے شکایت کی تھی۔ وہ اپنی بیوہ ماں کا واحد سہارا تھا۔ لیکن اُس کا دل نہ پڑھائی میں کبھی لگا نہ ہی کسی کام کاج میں۔ کئی بار فیل ہونے کے بعد ہائی اسکول پاس کیا۔ وحید عالم نے اُسے ایک میکینکل انسٹی ٹیوٹ میں بھرتی کرایا تاکہ کچھ تربیت پا کر کمانے کے قابل ہو جائے۔ لیکن وہاں سے وہ دو ماہ کے بعد بھاگ آیا۔ وحید نے اُسے ٹائپ کرنا سکھانا چاہا، اُس میں بھی اُس کا جی نہ لگا۔ اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ ہر وقت گھومتا رہتا تھا جو اب کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ گھر میں اپنی والدہ سے ہر وقت لڑتا رہتا تھا۔

وحید عالم نے خالہ سے کہا۔ "اُسے جگا کر باہر لے آیئے تو!"

خالہ اندر چلی گئی۔ پھر واپس بھی آ گئی۔ بولی۔ "سونے دو اُسے، میرے بلانے پر کوئی جواب نہیں دیا۔ تم لوگ کھانا شروع کرو۔ کب تک اُس کا انتظار کیا جائے گا۔!"

وہ سب دسترخوان کے گرد بیٹھ گئے۔ خالہ نے حسبِ معمول بہت عمدہ کباب بنائے تھے۔ وحید عالم کو خالہ کے ہاتھوں سے بنائے ہوئے کباب بے حد مرغوب تھے۔ جب بھی کباب کھانے کو اُس کا جی مچل اُٹھتا وہ اُن کے یہاں گوشت بھجوا دیتا تھا اور کہلا بھیجتا۔ "فلاں وقت پر ہم ضرور پہنچ جائیں گے۔"

خالہ بھی اُس کی بڑی قدر کرتی تھی۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد وحید نے اُس کی بڑی مدد کی تھی۔

کھانا ختم کر کے جب وہ وحید اور ذکیہ کے لئے پان لگا رہی تھی، اچانک اشفاق اندر سے باہر نکل پڑا۔ دونوں کو سلام کئے بغیر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو کولھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر والدہ سے بولا۔ "آج مجھے بھوکا مارنے کا ارادہ ہے کیا؟ کھانا وانا نہیں کھلاؤ گی۔؟"

اُس کے لہجے میں بے حد تلخی تھی۔ بڑی نافرماں برداری! وحید عالم کو دھچکا سا لگا۔ اُس نے اپنی خالہ کی طرف دیکھا۔ سفید بالوں والی نیک دل خاتون کے چہرے پر اپنے بیٹے کی حرکت کی وجہ سے ندامت بھی تھی اور بیچارگی کا شدید احساس بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں وہ اپنی ماں کو بہت دِق کئے ہوئے ہے، وحید عالم خود کو روک نہ سکا۔ بجلی کی سی سُرعت سے اُٹھ کر اشفاق کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اُسے اپنی طرف گھسیٹ کر اُس کے مُنہ پر کئی تھپڑ جڑ دیئے۔ پھر بالوں سے پکڑ کر نیچے بھی گرا دیا۔ فرش کے ساتھ اُس کا سر ٹکرا ٹکرا کر پوچھا۔ "بول اب تو میری خالہ کو پریشان کرے گا؟" اُسے پھر رُلائے گا؟ میں تیری ہڈیاں توڑ ڈالوں گا! سمجھا کہ نہیں!"

اُسے گھسیٹتا ہوا خالہ کے قدموں کے آگے جا گرایا۔ کہا۔ معافی مانگ اِس غریب سے! نہیں تو اور ماروں گا!"

اشفاق کے ہونٹوں سے اور ماتھے سے خون بہنے لگا۔ جسے دیکھ کر اُس کی ماں بیقرار ہو اُٹھی۔ اُسے چھاتی سے لگا کر بار بار اُس کا سر چُومنے لگی۔ وحید عالم کے سامنے ہاتھ بھی جوڑ دیئے۔ "اِسے بخش دے میرے بچے! اِسے چھوڑ دے اب بیٹا! میں نے اِسے معاف کیا۔ پھر مجھے نہیں ستائے گا۔ ستائے گا بھی تو میں تم سے نہیں کہوں گی۔ اِسے ایسی مار کھاتا ہوا تو کبھی نہیں دیکھ سکتی!"

وحید عالم ایک طرف کھڑا ہانپ رہا تھا۔ ہونٹ بھی چباتا جاتا تھا۔ اچانک اُس کی نظر اپنی بیوی پر پڑی۔ ذکیہ اُس کی طرف بڑی نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ وحید عالم کو اپنی طرف متوجہ پا کر غصّے سے بولی "چلیئے اب، بہت ہو چکی تھانیداری۔ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا یہ سب!"

"کیا نہیں دیکھا جاتا تم سے؟ یہ لڑکا ہاتھ سے بالکل ہی نکل جائے! دیکھتی ہو، خالہ کو کس قدر پریشان کر رکھا ہے اِس نے! خدا جانے آگے چل کر چور بنتا ہے یا لٹیرا؟"

"بس بس، آپ کو تو ہر کوئی چور اور لٹیرا ہی نظر آتا ہے!" یہ سُن کر وحید عالم نے ذکیہ کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ چند لمحوں تک دیکھتا ہی رہا۔ جن کی تاب نہ لا کر ذکیہ رو پڑی، روتے روتے بولی۔ "اب چلیئے نا گھر! میں کہتی ہوں!"

یہ کہتے کہتے وہ باہر جا کر جیپ میں بیٹھ گئی۔ وحید عالم کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر اچانک بڑی کھسیانی سی ہنسی ہنس کر خالہ سے بولا۔ "ذکیہ تو بالکل پاگل ہے۔ ذرا نہیں سمجھتی۔ خیر، اب میں جاؤں گا۔ اشفاق اب کوئی شرارت نہیں کرے گا۔ کرے تو مجھے بتلایئے گا۔ اسے ٹھیک کرنے کے لئے کچھ اور ذرائع بھی سوچوں گا۔ میں نے تو بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیا ہے خالہ جان! یہ تو بالکل بے حقیقت سا کل کا چھوکرا ہے۔۔!"

جاتے جاتے اُس نے اشفاق کی طرف پھر گھُور کر دیکھا اور باہر نکل آیا۔

ذکیہ جیپ میں مُنہ پھیر کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وحید عالم کو ہنستے ہوئے آتا دیکھ کر اُس نے اور بھی مُنہ پھُلا لیا۔ وحید عالم اُس کے پاس کھڑا ہو کر اُسے گھُورتا رہا، مُسکراتا رہا۔

"ذکیہ نے کہا۔ بیٹھئے نا۔ کھڑے کھڑے میرا مُنہ کیوں تاکے جا رہے ہیں! مجھے اپنے ابّا کے یہاں چھوڑ آیئے۔ اِسی وقت۔ میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گی۔"

"کیوں نہیں رہو گی؟" اُس نے ایک بازو ذکیہ کے گرد حمائل کرنا چاہا۔ لیکن ذکیہ نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میں کہتی ہوں مجھے گھر پٹ لے جایئے۔ میں سیدھی ابّا کے پاس جاؤں گی۔ اُن سے کہوں گی مجھے طلاق دِلوایئے!"

وحید عالم اُسی طرح ہنستا رہا۔ آخر کیوں؟ میں نے کون سا قصور کیا ہے؟ معلوم تو ہو!"

اُس نے ایک سُنسان جگہ پر اچانک جیپ روک لی۔ ایک ہاتھ بڑھا کر ذکیہ کے بالوں پر پھیرا۔ اُس کی کمر تک لے گیا۔ کہا۔ "بتاؤ نا! تم مجھ سے اِس قدر خفا کیوں ہو؟"

ذکیہ پھُوٹ پھُوٹ کر رو پڑی۔ آپ بہت ظالم ہیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

"نہیں ذکیہ ایسا مت سوچو۔ میں جانتا ہوں۔ میرا غصّہ بہت تیز ہے۔ مجھے اپنے اُوپر اختیار نہیں رہ جاتا۔ لیکن یہ میری ڈیوٹی میں بھی تو شامل ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں۔ وہ مجھے مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ میں دوسروں کی طرح آنکھیں بند کر کے نہیں رہ سکتا۔ تم دیکھتی ہو میرے ساتھی اپنے فرائض سے کس طرح چشم پوشی کر کے اپنی جیبیں بھرنے میں لگے رہتے ہیں۔ میں تو کسی سے پھُوٹی کوڑی تک لینے کا روادار

نہیں ہوں، لیکن میں اپنے کام میں بھی کوتاہی نہیں کر سکتا۔"

"لیکن میں کیا کروں آپ کی ایسی ڈیوٹی کو اور فرائض کی انجام دہی کو! مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔" وہ روتے روتے بولی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں بھی آپ کی قیدی ہوں۔ آپ کی جیل میں بند ہوں!

وحید عالم ہنس پڑا۔ بولا "جیل تو یہ ساری ہی دنیا ہے۔ کون پوری طرح آزاد ہے؟ کہیں سرکاری فرائض ہیں۔ کہیں سماجی بندھن ہیں۔ کہیں مذہب کی اونچی دیواریں ہیں۔ کہیں کہیں اپنے ذہن کی اپنی ہی سوچوں کی چار دیواری ہے۔ تم تو پڑھی لکھی ہو، بولو، کیا واقعی ایسا نہیں ہے؟ لیکن قیدی بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے کے دوسرے درجے کے اور پہلے درجے کے۔ تمہیں معلوم ہے پہلے درجے کے قیدی کس ٹھاٹ سے رہتے ہیں۔"

ذکیہ نے جواب دیا۔ "لیکن ذہنی تناؤ اُن کے یہاں بھی موجود ہوتا ہوگا ــ!"

وحید عالم اسی طرح ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہارے ذہنی تناؤ کا پورا احساس ہے۔ لیکن اپنے ابا سے جا کر یہ سب کہو گی تو وہ ہنسیں گے نہیں؟ وہ تم ہی پر ہنسیں گے، کیونکہ تم نے اُن کی مرضی کے خلاف میرے ساتھ شادی کی تھی۔"

لیکن اُس وقت تمہارے سامنے یہ پولیس کا کیریئر نہیں تھا اور مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ تمہارا مزاج اِس محکمے کے لئے اِس قدر ہم آہنگ ہے۔"

ذکیہ یہ محکمہ اتنا بُرا نہیں ہے۔ ہمارے لوگ بُرے ہیں، ہمارا سماج بُرا ہے۔ ہمارا سماجی ماحول ہی اِس قسم کے چوروں اور بدمعاشوں کو جنم دیتا ہے، وہ سمجھانے پر بھی نہیں سُدھرتے تو میرا خون کھول اُٹھتا ہے۔"

اکیلے آپ ہی نے سماج کو بدلنے کا ٹھیکہ کیوں لے لیا ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ تنِ تنہا اِس سماج کو بدل سکتے ہیں۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے، اتنے بڑے معاشرے میں؟ آپ تو ایک بہت بڑے کارخانے کا جس میں ہزاروں لاکھوں مشینیں چل رہی ہیں محض ایک چھوٹا سا پرزہ ہیں۔ آپ ٹھیک طرح سے کام نہیں کریں گے، تو آپ کی جگہ کوئی دوسرا پُرزہ فٹ کر دیا جائے گا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔"

"تم چاہتی ہو میں اِس سروس کو خیر باد کہہ دوں؟۔ لیکن جاؤں گا کہاں؟ جہاں بھی جاؤں گا، مجھے کسی نہ کسی سے ٹکرانا ضرور پڑے گا؛ چاہے کسی محکمے میں جاؤں۔ بزنس میں بھی یہی حال ہوگا۔!"

پہلے آپ اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کیجئے! آپ کسی سے ٹکرانے کی بات ہی کیوں سوچتے ہیں؟ دراصل یہ آپ کے اپنے رویّے کا قصور ہے، میں چاہتی ہوں آپ صرف اپنے لئے اور میرے لئے جینا سیکھئے۔ بہت سے لوگ اِسی طرح جیتے ہیں۔"

وحید عالم چُپ ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ ذکیہ نے اُس کی زندگی میں آکر ایک تعلیم یافتہ اور رومانٹک شوہر کا جو امیج بنایا تھا وہ پاش پاش ہو چکا ہے۔ وہ اُس کی محبت کی چار دیواری میں تو ایک قیدی بن کر رہ سکتی ہے۔ لیکن اُس کی حد سے بڑھی ہوئی سخت کوشی کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرے گی۔ آج اُس نے شکایتاً علیحدہ ہونے کی دھمکی دی ہے۔ کل وہ واقعی علیحدہ ہو جانے کے لئے عملی قدم بھی اُٹھا سکتی ہے۔

وحید عالم نے ذکیہ کی طرف دیکھا، اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "جب ہم خالہ کے یہاں کھانا کھا رہے تھے اُس کھانے کا ذائقہ کتنا عمدہ تھا، اُس وقت میں تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کسی چیز کا لذیذ ترین ذائقہ انسان کو کتنا رومانٹک بنا دیتا ہے۔ آج تم مجھ سے خفا بھی ہو، میں دُنیا بھر کو خفا کر سکتا ہے۔ لیکن تمہاری خفگی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھ پر یقین رکھو، میں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبت تم سے کرتا ہوں۔"

ذکیہ نے اُس کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھا۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

"چلیں گھر۔؟"

"چلیئے ــ"

"پرامز۔"

"کس بات کا؟" ذکیہ نے اُس کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔

جواب میں وحید عالم نے مسکرا کر آنکھ میچ لی۔ ذکیہ نے اوہنہ کہہ کر ــ منہ پھیر لیا۔ وحید عالم نے اسٹیرنگ پر دونوں بازو رکھ کر سر بھی ٹکا دیا۔ کہا۔ تب تو میں گھر نہیں جاؤں گا۔"

عجیب ضدّی شخص سے پالا پڑا ہے! چلیئے نا اب۔" ذکیہ نے اُسے کندھے سے جھنجھوڑا۔

"پہلے پرامز کرو۔" وحید عالم اسی طرح اسٹیرنگ پر سر ڈالے

پڑا رہا۔

"اچھا بابا پہلے گھر تو چلیئے۔" ذکیہ کی نظروں میں شکایت بھی تھی اور ایک خاموش سپردگی کا جذبہ بھی۔

"تو یہ بات ہوئی نا!" وحید عالم نے جلدی سے جیپ اسٹارٹ کی۔ اُس کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھتا بھی رہا۔

"اب تو میں سو کلومیٹر کی رفتار سے جاؤں گا۔"

"دیکھئے دیکھئے کہیں ایکسی ڈنٹ نہ کر بیٹھئے گا!" ذکیہ کی آواز میں اُس کی فطری شوخی پھر سے لوٹنے لگی۔ لیکن وہ اُس کے مردانہ حسن پر اب بھی بھرپور تعریفی نظر ڈالنے سے احتراز کر رہی تھی۔ اُسے یقین نہیں تھا، یہ آدمی اُس کی پوری محبت پا کر بھی اپنے مزاج کو بدلنے کی کوشش کریگا۔

وحید عالم نے اچانک جیپ روک لی۔ وہ اُس علاقے کی ایک بیرونی سڑک پر سے ہو کر جا رہے تھے جس میں اُس کا تھانہ تھا۔ فٹ پاتھ پر اُس نے اپنے خسر کو کھڑا ہوا دیکھ لیا ـــــ اُسی پرانی فوجی وردی میں۔ اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکی اور ایک مرد اور بھی تھا۔ وحید عالم چکرا کر رہ گیا۔ اُس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ اُس کے خسر کی آٹھ بجے ڈیوٹی ختم ہو جاتی تھی۔ یہ مرد اور عورت کون تھے؟ اُس کا ذہن اِس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکا کہ اُس کے خسر جیسا باعزت ریٹائرڈ فوجی رین بو کی کسی سیلز گرل کے لئے دلّالی بھی کرتا ہوگا۔ ذکیہ کی نگاہ ابھی تک اپنے والد پر نہیں پڑی تھی۔ وہ اچانک جیپ روک لینے پر وحید عالم کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

اچانک مرد اور عورت گلی کے اندر چلے گئے۔ بوڑھا فوجی فٹ پاتھ پر اکیلا چل پڑا۔ سر جھکا کر۔ اُس کے ہاتھ میں وہی ڈنڈا تھا جو ہمیشہ اُس کے پاس رہتا تھا۔ وحید عالم جیپ بڑھا کر اُس کے قریب لے گیا۔ اُس کے پاس لے جا کر روک لی اور سر باہر نکال کر پوچھا۔ "ابّا! آپ اِس وقت؟"

بوڑھا فوجی چونک کر کھڑا رہ گیا۔ اُس نے وحید عالم کی آواز پہچان لی۔ اُس نے اسکرین میں سے اپنی بیٹی کو بھی دیکھ لیا۔ اُس کا جھرّیوں سے بھرا چہرہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند لمحوں تک وہ بول بھی نہ سکا۔

آخر وحید عالم نے ہی کہا۔ "ابّا اندر آجائیے۔"

بوڑھا فوجی پیچھے سے ہو کر اندر آ بیٹھا۔ اُس نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ذکیہ نے کہا۔ "ہم لوگ خالہ کے یہاں گئے تھے، آپ اتنی دیر تک کہاں تھے؟"

5

"میں ایک عجیب سی اُلجھن میں گرفتار ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا گھر کیسے جاؤں؟ کون سامنا نے کر جاؤں۔ گوبند رام اور اُس کی بیوی رات بھر سو نہیں سکینگے، وہ میرے پاس ضرور آئیں گے۔ مجھ سے ہی پوچھیں گے اُنہیں کیا جواب دوں گا؟ میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جن کی مدد سے اُنہیں تسلی دے سکوں۔ اُنہیں ساری بات سمجھا سکوں اور جو کچھ ہوا ہے اُس پر اُنہیں راضی بھی کر سکوں، جو کچھ میں کہوں گا اُسے سن کر وہ ضرور بھپر اُٹھیں گے۔ مجھ ہی کو سارا الزام دیں گے۔ پنجابیوں کا غصّہ تم جانتے ہو۔ سب جمع ہو کر میری بوٹی بوٹی نوچ لیں تو کچھ عجب نہیں۔ لیکن خدا گواہ ہے، میرا اِس معاملے میں کوئی قصور نہیں۔ جو کچھ ہوا وہ میرے منع کرنے کے باوجود ہوتا رہا۔ میں نے پدما کو سمجھانے کی پوری کوشش کی۔ کمل کو بھی رین بو میں آ کر اُس سے ملنے سے روکتا رہا۔ لیکن میں جانتا تھا وہ میری مخالفت کے باوجود ملتے ہیں۔ پدما لنچ کے وقفہ میں کسی ریسٹوران میں چلی جاتی تھی۔ رین بو کے آس پاس کتنے ہی ریسٹوران ہیں۔ وہ پہلے سے ہی کسی متعینہ جگہ پر مل جاتے تھے، ایک مرتبہ تو میں پدما کے پیچھے پیچھے بھی گیا تھا۔ وہ کناٹ پیلیس کے ایک بیس منٹ کیفے میں کمل سے ملنے کے لئے آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر کچھ پریشان بھی ہو اُٹھی۔ مجھ سے ڈرتی بھی تھی۔ میں نے ہی اُسے رین بو میں ملازمت دلوائی تھی۔ لیکن اُس دن مجھ سے صاف صاف کہدیا۔ "چچا میں کمل کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہمارے والدین کے درمیان سخت دشمنی ہے۔ میں جانتی ہوں۔ وہ ہمارا ملنا جُلنا کبھی پسند نہیں کریں گے۔ لیکن ہم مجبور ہیں جو ہوگا دیکھا جائیگا۔ آپ مہربانی کر کے ہم پر سی آئی ڈی کرنا بند کر دیجئے۔" یہ بچّی میرے ہاتھوں میں کھیلی ہے۔ گوبند رام جب میرے مکان میں کرایہ دار بن کر آیا تو پدما دو سال کی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں نے گود میں اٹھا لیا تھا۔ کتنی پیاری اور بھولی بھالی تھی وہ۔ اُس زمانے میں گوبند رام اور کرم چند پارٹنر تھے۔ بعد میں الگ ہو گئے۔ بزنس میں یہ سب ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو

اُٹھے تھے۔ گوبند رام کو میں نے ہی کتنی بار بچایا۔ اُسے تو مار دیا گیا ہوتا۔ پدما بڑی ہو گئی، پڑھ لکھ گئی تو اُسے میں نے سندھی سیٹھ سے کہہ کر رین بو میں ہی رکھوالیا۔ تین سو روپے مل جاتے ہیں۔ کیا بُرا ہے! کبھی کبھی لڑکے اُسے پریشان کرتے تھے تو میں ہی اُس کے ساتھ ہو لیتا تھا' اپنی بچی کی حفاظت کرنا میرا فرض تھا۔ لیکن اُسی لڑکی نے آج اچانک ایک دوسرا فیصلہ کر لیا۔ اِس کے لئے بھی مجھے اُس کے ساتھ رہنا پڑا۔ آج اُس نے اور کمل نے شادی کر لی' چپکے سے۔ مجھے بطور گواہ بلایا گیا۔ آج وہ گھر واپس نہیں جائے گی۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ گوبند رام اور اُس کی بیوی کو کیسے سمجھاؤں گا؟ وہ اپنی بیٹی کی تلاش میں گلی میں گھوم رہے ہوں گے۔ سخت بے چین ہوں گے۔ !"

پدما اور ذکیہ ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔ ایک ہی اسکول اور کالج میں تعلیم پائی تھی۔ بہت اچھی فرینڈز تھیں۔ ذکیہ نے کمل کو بھی دیکھا ہوا تھا، اچھا خوبرو لڑکا تھا۔ پدما جیسی لڑکی کے لئے ہر نقطۂ نظر سے موزوں۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ دونوں نے شادی کر لی۔ لیکن اپنے والد کی پریشانی کا بھی اُسے احساس ہوا۔ گوبند رام اور اُس کی بیوی اُسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اُنہیں سمجھانے میں کئی دن لگ جائیں گے۔

وحید عالم کو پوری روئداد سُن کر افسوس ہوا۔ اُس نے اپنے خسر کو فٹ پاتھ پر دیکھ کر شک کیوں کیا؟ یہ یقیناً اُس کا اپنا قصور تھا۔ وہ بے حد شکّی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جیب کو پہلے پولیس لائینز کے رہائشی سلسلے کے اندر لے گیا۔ وہاں ذکیہ کو اُتار کر ہی وہ اپنے خسر کو اُس کے گھر تک چھوڑنے کے لئے جاتا۔

جب اُس کی جیپ رُکی تو اچانک ایک باوردی پولیس مین اُس کی طرف لپکا جو وہاں ٹہل رہا تھا۔ اُس نے وحید عالم کو سیلوٹ کر کے بتایا۔ "حضور آج تو بڑا غضب ہو گیا۔ جس آدمی کو آپ نے سبزی منڈی میں پیٹا تھا نا وہ ہسپتال پہنچتے ہی مر گیا۔ لوگوں نے بڑا بلوہ کر رکھا ہے۔ تھانے کے سامنے جمع ہو کر نعرے لگا رہے ہیں۔ ہندو مسلم سوال کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اُن کے ساتھ کچھ پولٹیکل لیڈر بھی ہیں۔ آپ پر قتل کا مقدّمہ چلانے کا مطالبہ کر رہے ہیں !"

وحید عالم ہکّا بکّا رہ گیا۔ بولا۔ لیکن وہ تو سالا دلّال تھا! شریف آدمی ہرگز نہیں تھا۔ اگر مر بھی گیا تو کیا ہوا؟"

"جی ہاں صاحب یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن پولٹیکل ذہن رکھنے والے لوگ اِس واقعے سے ضرور کچھ فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ آپ کو ایس پی صاحب نے طلب کیا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے آپ کو مُعطّل کر دیا جائے گا۔"

وحید عالم نے ذکیہ کی طرف دیکھا جو ابھی تک جیپ کے اندر ہی بیٹھی تھی۔ وہ حیران اور پریشان ہو اُٹھی تھی۔ اُس کے والد بھی چُپ بیٹھے رہ گئے تھے۔ کچھ لمحوں تک وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اُس نے اپنے سپاہی سے کہا۔ رام آدھار، تم اِنہیں کشمیری گیٹ چھوڑ آؤ۔ گاڑی تھانے میں لے آنا۔ میں پیدل چلا جاتا ہوں۔"

رام آدھار جیپ کے اندر بیٹھ گیا۔ وحید عالم اپنی بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ ذکیہ نے مُنہ پھیر لیا تھا۔ جیپ بھی حرکت میں آ کر گھوم گئی۔ گیٹ میں سے نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

وحید عالم چند لمحوں تک تو اپنی جگہ پر جم کر کھڑا رہا جیسے حرکت کرنا اُس کے بس میں ہی نہ رہا ہو۔ یکساں طرز کی بنی ہوئی چار منزلہ اُونچی اُونچی عمارتوں کے درمیان سفید قمیص اور سفید پتلون والے بُت نے بالآخر آہستہ آہستہ حرکت کی۔ وہ گیٹ سے نکل کر تھانے کی طرف بڑھنے لگا۔ جو چند فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ اُسے لگا اُس کی پولیس کی زندگی اب ختم ہو چکی ہے۔ تھانے میں پہنچتے ہی اُس کے ہاتھ میں معطلی کا حکم دے دیا جائے گا۔ اُس کے بعد ہو سکتا ہے' وہ ڈسمس بھی کر دیا جائے۔ اِس میں بھی کچھ وقت لگے گا۔ دو سال چار سال' تب تک ہو سکتا ہے' ذکیہ بھی اُسے چھوڑ دے۔ اب وہ اُسے روک نہیں سکے گا۔ وہ بھی اپنے مزاج کی عورت ہے۔

اچانک اُسے یاد آیا۔ اُس نے آج رات گزارنے کا کتنا سُہانا پروگرام بنایا تھا۔ اُسے ذکیہ کا خوبصورت جسم یاد آیا۔ اُس کے جسم کی حسین توسیں یاد آئیں۔ اُس نے ذکیہ کا سارا غصّہ دُور کر دیا تھا۔ آج رات اُس نے پونے چھ فٹ لمبی خوبصورت بلا پر بڑی بے صبری سے حملہ کیا ہوتا وہ اِس حملے کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتی۔ اُس نے ایک خاموش رضامندی ظاہر کر ہی دی تھی۔ جب وہ جنسی فعل کے لئے رضامند ہوتی تھی تو اُسے خوشیوں کے بہترین لمحات بھی مہیّا کر دیا کرتی تھی۔ اُس سے حاصل کئے ہوئے وحشی پیار کا ایک ایک لمحہ اُسے یاد تھا۔ لیکن وہی سارے لمحے اب اُس سے کتنے دُور ہو گئے'

تھے! اپنی ساری خوشیاں اور سارے جلوے اور سارے تصوّرات بھی ساتھ لے گئے تھے، پیچھے چھوڑ گئے تھے، بجلی کے بےجان اور پُرسکوت اور زرد رُو کھمبے۔ جن کے پاس پہنچ کر وہ کتنی دیر سے آگے بڑھ رہا تھا۔ خاموش۔ لب سِیئے ہوئے۔

"اوہ!۔ آج میں کتنا افسردہ ہوں! میرے خدا میں کس قدر تھک گیا ہوں! میرے بدن کی پُھرتی یکایک کیا ہوئی؟ میں تیز کیوں نہیں چل سکتا ہوں؟ اس طرح مریضوں کیطرح گھسٹ گھسٹ کر کیوں چل رہا ہوں؟ فٹ پاتھ پر جگہ جگہ رُکے ہوئے کھمبوں نے یکایک سر کیوں جُھکا لئے ہیں؟ اُن کے قمقموں کی روشنی اچانک کم کیوں ہوگئی ہے۔ اوہ خدا!۔ کیا تو نے انہیں بتا دیا مجھے کہاں پہنچنا ہے؟ میری سوچیں کس نکتے پر پہنچ کر رُکنے والی ہیں؟ میرے انجام کا فتویٰ انہیں سُننے کا موقع کیوں دے دیا؟۔ کیوں، کیوں؟؟"

وحید عالم چلتے چلتے ایک کھمبے کے پاس اچانک رُک گیا۔ سر اُٹھا کر اُسے غور سے دیکھنے لگا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ تو کون ہے؟ میرا خیال ہے تو وہی ہے۔ تیرا سخت اور سُست جسم ہی دیکھ کر تجھے پہچان گیا۔ اگرچہ پہلے تو اس قدر لمبا نہیں تھا۔ لمبا اب ہو گیا ہے۔ لیکن تو میرا راستہ روک کر کیوں کھڑا ہے؟ کیا چاہتا ہے تو؟ بےحِس، کُند ذہن، ناپاک سُست کیڑا۔ بولتا کیوں نہیں تو؟ میں تجھ سے پُوچھ رہا ہوں۔ بول! تو میری بےبسی پر مُسکرا رہا ہے۔ کیونکہ میں تجھے پِیٹا رہا ہوں۔ انتہائی طیش میں مُبتلا ہو کر تیری چمڑی تک اُدھیڑ ڈالتا تھا نا! تو کبھی بُھول نہیں سکے گا۔ میں جانتا ہوں۔ ایک روز اچانک تو میرا راستہ اِسی طرح روک کر کھڑا ہو جائے گا! مجھ سے بدلہ ضرور لے گا۔ ذکیہ کہتی تھی تو بھی پولیس میں بھرتی ہونا چاہتا ہے، یہ بات اُس نے تیری نادانی پر ہنستے ہنستے بتائی تھی مجھے۔ لیکن میں نہیں ہنس سکا تھا۔ تجھے وہ رات ابھی تک یاد ہے تجھے، جب وہ اچانک تیرے کمرے میں سے اُٹھا کر لے آئی تھی۔ تجھے میرے ساتھ ہی پلنگ پر سُلا کر ہنستے ہنستے کہا تھا۔ ڈر گیا ہے بچارا! اسے سینے سے لپٹا کر سُلا لیجئے! میں نے تجھے کتنی محبت سے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا تھا! تو نے میری محبت کی گرمی محسوس نہیں کی تھی؟ لیکن تو رات کو سوتے سوتے اچانک ذکیہ کے پہلو میں جا لیٹا تھا۔ میں نے اچانک دیکھ لیا تھا۔ ذکیہ نیند میں بالکل بےخبر تجھے اپنی باہنوں میں سمیٹے سو رہی تھی۔ میں کتنی دیر تک سُلگتی ہوئی آنکھوں سے تم دونوں کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ جی میں آئی تھی تم دونوں پر پستول کی ساری گولیاں خالی کر دوں۔ لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔ تم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ نیند تم لوگوں کے ساتھ کس بےدردی سے کھیل رہی ہے۔ میں نے ہر لحظہ زہر کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اُتار کر خود پر قابو پا لیا تھا اور تم دونوں کو معاف کر دیا تھا اور دھیرے سے پھر لیٹ گیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر تجھے بہت آہستہ سے اپنی طرف سرکا لیا تھا۔ تجھے ذکیہ سے چھین لیا تھا۔ صُبح تم دونوں کے چہروں پر گزشتہ شب کے واقعے کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان نصیب ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی تجھے دیکھ کر میرے ہاتھوں میں ایک عجیب سی سرسراہٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ تجھے پیٹ کر مجھے کوئی مسرّت بھی نہیں ملتی تھی۔ پتہ نہیں تو اس قسم کی مسرّت کے کرب کی نوعیّت سمجھتا بھی ہے یا نہیں! جو مسرّت نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی مسرّت ہی لگتی ہے جو مسرّت ہو کر بھی کرب ہی رہتی ہے۔ لیکن میں نے تیری آنکھوں میں ہمیشہ ایک خونخواری اور انتہائی نفرت ہی دیکھی۔ توہین کا شدید احساس! جیسے تو ایک روز مجھ سے بدلہ ضرور لے گا!

کھمبا اور وحید عالم کتنی دیر تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ ایک کار اُن کے قریب سے اچانک نکل گئی تو دونوں جیسے سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ وحید عالم وہاں سے چل پڑا۔ مُڑ مُڑ کر دیکھتا ہوا۔ ایک عجیب سی بےچارگی سے، ایک عجیب سی خوشنودی سے بھی۔ ایک عجیب سے علیحدگی کے احساس سے بھی۔!

چلتے چلتے وہ بس اسٹاپ کے قریب پہنچ گیا۔ بس اسٹاپ دُور سے ہی دکھائی دینے لگا تھا۔ خالی پڑا تھا۔ بالکل سُنسان۔ کمرشل بینک کی تین منزلہ عمارت کے ماتھے پر جُھکے جُھکے سیاہ آسمان کے ٹھیک نیچے نیون لائٹ میں اُس کا نام چمک رہا تھا۔ کسی خوبصورت ہندوستانی عورت کے ماتھے پر دمکتی ہوئی بندی کی طرح، سیاہ بالوں کی حسین محراب کے نیچے۔ آگے ایک ڈرائی کلیننگ فیکٹری تھی۔ فیکٹری کے کئی سائن بورڈ تھے۔ آس پاس چھوٹی بڑی کئی دکانیں تھیں۔ ریڈی میڈ کلوز کی۔ اُن کے بڑے بڑے شوکیس بند ہو چکے تھے اُن بند تابوتوں میں حسین عورتوں کی قدِ آدم مورتیاں تھیں۔

جو صبح ہوتے ہی اپنے تابوتوں کو توڑ کر باہر نکل آتی تھیں، فوٹو گرافر کی دکان بھی بند تھی۔ جس کے شوکیس میں ہر روز درجن بھر نئی نئی لڑکیوں کے پورٹریٹ رکھ دیے جاتے تھے اور فٹ پاتھ پر سے گزرنے والوں کے قدم آپ سے آپ رُک جاتے تھے۔ اُس کے آگے سرسوتی بھون گرلز کالج کی دو منزلہ پیلی عمارت تھی۔ اُس کی لمبی مضبوط دیوار تھی۔ دیوار پر بے شمار پوسٹر چپکے ہوئے تھے۔ سیاسی پارٹیوں کے تازہ ترین پروگرام لیے ہوئے، ایک دوسرے پر غراتے ہوئے۔ کارپوریشن میں جن سنگھ کی دھاندلی! آندرا سرکار کا تختہ اُلٹنے کے لئے کمربستہ ہو جاؤ۔! "کپّا" پارٹی کی اِس سال کی سب سے بڑی گپ! مسلم لیگ کا سانپ بِل سے پھر باہر آ گیا! راشٹریتی کے چناؤ نے عوامی مورچہ مضبوط بنا دیا! ریلوے کرمچاریوں نے لال جھنڈی دِکھا دی! بینک امپلائز ایسوسی ایشن کا الٹی میٹم!

لگتا تھا پوسٹروں کی ہی آپس میں ایک جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ وہی ایک دوسرے کو مکّے دِکھا دکھا کر چیخ رہے تھے۔ وحید عالم اُن کی طرف ایک عجیب سی حیرانی سے مُنہ اُٹھا کر دیکھتا ہوا نکلا چلا گیا۔ بس اسٹاپ پر پہنچ کر وہ رُک گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اب وہاں ایک بھی کیو نہیں تھی۔ بس بھی نہیں تھی کوئی۔ ساری بسیں گزر چکی تھیں۔ سارے مسافر جا چکے تھے، فٹ پاتھ پر جا بجا رس نچوڑے ہوئے گنوں کے چھلکے اور پھٹے ہوئے پوسٹر بکھرے پڑے تھے۔

وہ مُنہ اُٹھا کر جونہی ایک پلیٹ پر لکھے ہوئے بسوں کے نمبر پڑھنے لگا اُس نے اپنی گردن کی پُشت پر کسی سخت نوکیلی چیز کی چبھن محسوس کی۔ کوئی چیز تازیانے کی طرح اُس کی گردن کے پیچھے آ کر ٹکرائی۔ اُس نے چونک کر اپنی گردن کی پُشت پر ہاتھ رکھ لیا۔ اِدھر اُدھر حیران ہو کر دیکھا، کوئی بھی تو نہیں تھا۔ پھر یہ چبھن کیسی ہے؟ اُس کا دِل کیوں دھڑک رہا ہے؟

اچانک، وہ سیٹ کے سیٹ ریلنگ کے عقب سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ایسے گھیر کر کھڑے ہو گئے، اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں، اُن کی ننھی ننھی بالغ ہوتی ہوئی وحشی نظریں اور مونچھیں، اُن کے پتلے پتلے جسموں پر چپکی ہوئی رنگدار قمیصیں اور پتلونوں اور جوتوں کی لمبی لمبی نوکیں۔ سب کے ہاتھ میں اپنی اپنی بیلٹ تھی۔ پلاسٹک یا چمڑے کی پیٹی، جنہیں اچانک اُنہوں نے اپنی کمر سے کھینچ لیا تھا۔ اُن کی پیٹیوں کے سروں پر لگے ہوئے نکل شدہ بکل چمک رہے تھے۔ نیزے کی انیوں کی طرح۔ وہ وہی چھ تھے، اروند، اشفاق، کالیہ، جوزف، خالد اور امرجیت سنگھ۔ وہی چھ۔ وہ اُنہیں پہچانتا تھا۔

اُنہوں نے چاروں طرف کھڑے ہو کر بیلٹیں لہرائیں اور مُسکراتے رہے۔ ایک لڑکے نے ذرا آگے بڑھ کر اُس پر وار کیا۔ تیز نوکیلا بکل اُس کے رُخسار پر آ لگا۔ اُس نے پھر درد کی شدّت محسوس کی۔ لیکن وہ اُن پر غرا نہ سکا۔ نہ ہی خود کر اُن پر حملہ آور ہو سکا۔ وہ اچانک خوفزدہ ہو گیا۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اُس نے اپنے اندر بے پناہ کمزوری محسوس کی، وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا۔

آہستہ آہستہ وہ اپنا حلقہ تنگ کرنے لگے، اُس کے اور قریب آنے لگے۔ پھر اچانک ایک ساتھ اُس پر حملہ آور ہو گئے۔ پے در پے واروں سے وہ چیخ اُٹھا۔ اُس کی قمیص پھٹ گئی۔ اُس کے بدن سے جا بجا خون رِسنے لگا۔ وہ چیختا ہوا اُن کا حلقہ توڑ کر بھاگ نکلا۔ لیکن لڑکے اُس کے پیچھے پیچھے نہ آئے۔ وہیں رُک کر قہقہے لگاتے رہے۔

تھانہ بہت دُور نہیں تھا۔ وہ وہیں جا کر خود کو محفوظ سمجھتا تھا۔ جہاں بہت سے لوگ اکٹھے منتظر کھڑے تھے۔ لاٹھی بند سپاہیوں کی دیوار کے سامنے کھڑے نعرے لگا رہے تھے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہے تھے۔ "پولیس شاہی نہیں چلے گی۔" "نہیں چلے گی۔ نہیں چلیگی۔"

وہ ہجوم کے اندر سے تیر کی طرح نکلتا ہوا تھانے کے برآمدے میں بہت سی کرسیوں کے پاس جا کر گر پڑا۔

Telegram : ANGLOSWISS
صنعت گھڑی سازی میں
Phone : 44-7116/18
ہندوستان کی مشہور اور قدیم
اینگلو سوِس واچ کمپنی
قائم شدہ سنہ ۱۹۰۸ء
اعلیٰ ترین گھڑیوں کے لئے یاد رکھئے
اینگلو سوئس واچ کمپنی - ۲۵ - پھول بگان روڈ - کلکتہ ۱۴
شوروم :- ۶ ڈلاہوزی اسکوائر ایسٹ - کلکتہ ۱
ANGLO-SWISS WATCH CO.
25, PHULBAGAN ROAD, CALCUTTA-14.
— Show Room —
6, DALHOUSIE SQUARE EAST, CALCUTTA-1.

شاہی
طیبی دواخانہ کی مایۂ ناز ایجاد
حیاتین (وٹامنس) اور کیلشیم سے بھرپور
افزائشِ خون کے لئے بہترین، عمدہ، مقوی دل و دماغ، معدہ و جگر کی مقوی و ہاضم طعام ہے
صحت دماغ اور اعصاب کے لئے
تندرستی قائم رکھتے ہوئے مدافعت کو بڑھاتی ہے
امراض سے محفوظ رکھتے ہوئے، حوصلہ، اُمنگ اور تازگی بخشتی ہے۔
ضعفِ دماغ کے مریض عموماً نسیان میں مبتلا ہوتے ہیں
شاہی بہترین مقوی دل و دماغ ہے۔ دماغ کا بوجھ، خیالات کی
پراگندگی اور کام کی طرف عدم رغبت کو دور کرتی ہے۔
ضعف اعصاب کے لئے بہترین ٹانک ہے۔ اعصابی کمزوری،
کسل و واماندگی کی ضامن ہے۔
طیبی
فون :- ۳۳۳۳۴ سٹی
طیبی دواخانہ (یونانی) اندور (پرائیویٹ) لمیٹڈ - ۵۱ - بوہر بازار اندور
۷۷ محمد علی روڈ بمبئی ۳ فون :- ۳۲۴۸۸۳
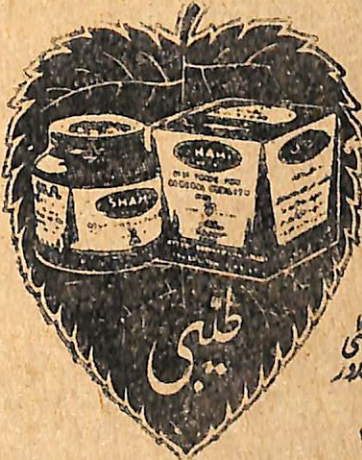
پرچھائیوں سے پرے
ستیش بترا
غیاث

ستیش بترا
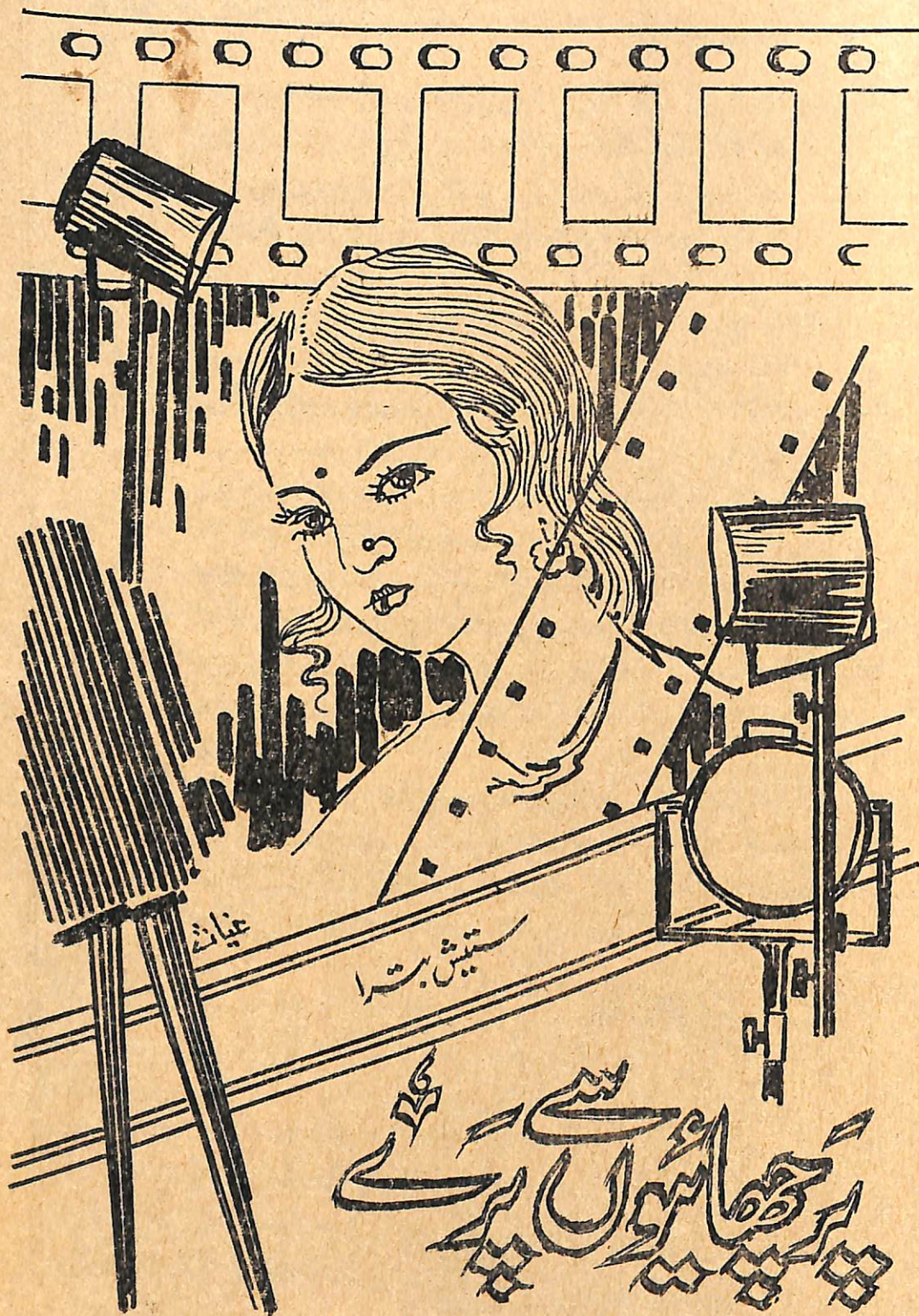
مارچ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے ماں باپ کے سائے سے محروم ہوں۔ جب پانچ سال کا تھا تو ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اور ۱۲ سال کی عمر میں والد صاحب کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔

بی اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ اور ایم اے سینٹ جارج کالج آگرہ سے۔ "مدیر شاعر" جناب اعجاز صدیقی سے پہلی ملاقات اُسی زمانے میں آگرہ میں ہوئی تھی۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں بہت سی ادبی ہستیوں سے متعارف ہوا۔

ایم اے کے بعد ایک پبلک اسکول میں شعبۂ انگریزی کا انچارج رہا۔ ایک سال کے بعد ہی یہ محسوس کیا کہ ایسی زندگی سے اُمیدوں کے خواب کبھی پورے نہ ہوں گے۔ چنانچہ کاروباری زندگی اختیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور ایک انجینئرنگ کمپنی سے منسلک ہوگیا۔ ۲۲ سال کی اس طویل کاروباری زندگی کو حال ہی میں خیرباد کہہ کر فارمنگ (FARMING) اختیار کرلی۔ شاید یہ تقاضا اُس ادیب کا تھا، جو اندر چھپا ہوا ہے اور جو لکھنے پڑھنے کے لئے ایک پُرسکون ماحول چاہتا ہے۔ اُمید کہ اب میں پہلے سے زیادہ باقاعدگی کے ساتھ ادب کی خدمت کرسکوں گا۔

ادب سے لگاؤ شروع ہی سے رہا ہے۔ ۱۲ سال کی عمر ہی میں میرا پہلا افسانہ چھپ گیا تھا۔ سوائے کہانی کار بننے کے کسی اور صنفِ ادب کی طرف رُجحان نہ تھا۔ میں نے کالج کی زندگی سے باقاعدہ طور پر افسانے لکھنے شروع کئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی ماحول نے میرے فن کو آگے بڑھانے میں بہت مدد کی۔ اب تک ڈیڑھ سو سے زیادہ افسانے لکھ چکا ہوں۔ تقریباً ہر ادبی پرچے میں چھپنے کا فخر حاصل ہے۔ ہمایوں، عالمگیر، شاعر، صحیفہ، نقوش، افکار، ساقی، نیا دور، سیپ، جادہ، کتاب، آہنگ، اور نہ جانے کتنے دوسرے ادبی پرچوں کی خدمت کا موقع ملا ہے۔

افسانوں کے دو مجموعے "ویران بہاریں" اور "بوند بوند ساگر" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بعد کی کہانیوں کا مجموعہ بھی جلد شائع ہوگا۔ اب یہ ناولٹ حاضر ہے۔ "مدیر شاعر" سے تعلقات ایک بہت لمبے عرصے سے ہیں۔ یہ "شاعر" ہی کا حق ہے کہ اس رسالے نے کئی غیر معروف اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس لمبی فہرست میں کمترین کو بھی شامل ہونے کا فخر حاصل ہے۔

(خود نوشت)

پرچھائیوں سے پرے

ستیش بترا

ٹیکسی میں بیٹھی سونیا بہت خوش تھی۔ وہ اپنی بچپن کی سہیلی نینا سے ملنے جا رہی تھی۔ وہی نینا جو اُن کے پڑوس میں رہا کرتی تھی۔ جس کا ناک نقشہ بھی بہت معمولی تھا۔ لمبوترا سا چہرہ اور جو کسی بھی لحاظ سے ذہین اور سمارٹ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لیکن آج اُس کی بات دوسری تھی۔ اُس کا جسم بھر آیا تھا۔ اُس کا چہرہ بھی اب غیر معمولی طور سے جاذبِ نظر تھا۔ جوانی نے اُس کے جسم کے خطوط کو اِس طرح سے اُبھار دیا تھا کہ اب نگاہیں نہیں ٹکتی تھیں۔ اور سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ وہ اُس کے محبوب فلمی دنیا میں اُبھرتے ہوئے حسین ہیرو نیرج کی دُلہن بن چکی تھی۔

ابھی پرسوں ہی چرچ گیٹ اسٹریٹ میں شاپنگ کرتے ہوئے سونیا کی مُلاقات نینا سے ہوئی تھی۔ وہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں کراکری کا ایک نیا سیٹ خرید رہی تھی جبکہ نینا نے اُسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے جھجکتے انداز سے اُس کا نام پُوچھا تھا۔ اور یہ جان کر کہ وہ اُس کے بچپن کی سہیلی سونیا ہی تھی۔ نہایت گرمجوشی سے بغل گیر ہوئی تھی۔ اُس کے بعد وہ دونوں اسٹورز میں ہی واقع ریسٹورنٹ میں ہی چلی گئی تھیں۔ اور کافی کے پیالوں پر اُنہوں نے بچپن کی کئی یادوں کو دُہرایا۔ سونیا کے دل کی دھڑکن ایک لمحہ کے لئے رُک گئی تھی جب اُس نے بتایا کہ حال ہی میں اُس کی شادی فلمی دُنیا کے نئے خوبصورت ہیرو نیرج کے ساتھ ہوئی تھی۔ سونیا نے نہایت گرمجوشی سے نینا کا ہاتھ دبایا اور اُس نے چُبھتی ہوئی کئی اجنبی نگاہوں کی پروا کئے بغیر ساتھ بیٹھی ہوئی نینا کو بے اختیار چُوم لیا۔ جاتی بار نینا نے اُسے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

نینا کا فلیٹ جوہو کے ساحل کے پاس تھا۔ ایک خوبصورت نئی بنی ہوئی بلڈنگ کے پانچویں فلور پر ___ بلڈنگ کے پورچ پر پہنچ کر اُس نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ ایک خوبصورت وردی میں ملبوس دربان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ بلڈنگ اور آس پاس کی خوبصورتی سے مرعوب ہوتی لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اُس کا دل بُری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ وہ نہایت اشتیاق سے دیکھنا چاہتی تھی کہ ایک فلمی ہیرو کا گھر کس طرح کا تھا۔ نینا سے زیادہ اُسے نیرج کی پرستش وہاں کھینچ لائی تھی۔ نینا تو کسی حد تک اِس موقع کو فراہم کرنے کا سبب بن گئی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ آٹومیٹک لفٹ نے اُسے پانچویں فلور پر پہنچا دیا۔ لفٹ کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ وہ لفٹ سے نکل کر نیرج کے فلیٹ کے دروازے پر رُک گئی۔ کال بیل دباتے ہی ایک مترنم جلترنگ سی بج اُٹھی۔ اُس کی پیٹھ کے پیچھے لفٹ کا دروازہ اپنے آپ بند ہو گیا۔ اور پھر نیرج کے گھر کا دروازہ کھل گیا۔ ایک نیا مدھر جگمگاتا مینار لئے ___

سامنے نینا مُسکرا رہی تھی۔!

وہ اُسے پکڑ کر اندر لے گئی۔ خوبصورت، دلفریب رنگوں کے امتزاج نے سونیا کو محسوس کرایا کہ وہ دھنک سے پرے کسی نئی دنیا میں پہنچ گئی ہو۔ دبیز قالینوں سے ڈھکے ہوئے فرش پر گہرے سُرمئی رنگ کا ایک نہایت آرام دہ صُوفہ سیٹ اور نشستیں تھیں۔ گدّے دار صُوفہ پر بیٹھنے کے لئے علیٰحدہ گدّیاں تھیں جو کہ صُوفہ کے اسٹائلش خطوط کو اور بھی نمایاں کر رہی تھیں۔ کھڑکیوں پر ہلکے گُلابی رنگ کے نیٹ کے پردے ہَوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ اور اُن سے پرے ناریل کے جھُنڈ اور جھاگدار سمندر کا نظارہ اِن پردوں میں سے چھَن کر آتا معلوم دیتا تھا۔ ایک طرف خوبصورت سی الماری میں کتابیں سجی تھیں، الماری پہ اُو پر نٹ راج مہاتما بدھ اور کھجوراؤ اسٹائل کی خوبصورت مُورتیاں تھیں۔ دوسری طرف ایک ریڈیو گرام رکھا تھا۔ ساتھ والے کمرہ میں کھانے کا نئے ڈیزائن کا میز تھا۔ جس کے چاروں طرف گجراتی اسٹائل کی کُرسیاں تھیں، جن کی پُشتیں رنگ برنگے تختوں سے بنی تھیں۔ دروازے پر کوڑیوں اور شیشے کے منکوں کی لڑیوں کا پردہ تھا۔ ڈرائینگ رُوم کی دوسری طرف بیڈ روم کا دروازہ تھا۔ جس کا ذرا سا پردہ سرکانے پر بھی مترنم گھنٹیاں بج اُٹھتیں۔ بیڈ روم کے اندر زمین کو چھوتا معلوم ہوتا ایک نہایت خوبصورت ڈبل بیڈ تھا۔ جس کے سرہانے دونوں طرف فریم میں ہی پڑھنے کے لئے لیمپ

کئے گئے تھے۔

سونیا فلیٹ کی ہر چیز کو دیکھ کر جھوم سی گئی۔ وہ بے اختیار ڈبل بیڈ پر بیٹھ گئی۔ جو کہ بے حد گداز اور آرام دہ تھا۔ اسی نے شوخ نگاہوں سے نینا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی اور قریب آ کر بیٹھ گئی۔

سونیا نے ایک انگڑائی سی لی اور پھر اپنا جسم بیڈ پر پھیلا دیا۔

"کیوں تھک گئی ہو سونیا...؟" نینا نے پوچھا۔ "تھوڑا آرام کر لو۔"

"نہیں بھئی۔ میں تو صرف تمہارے آرام کا قیاس لگا رہی ہوں۔ اتنے آرام دہ پلنگ پر تمہیں نیند کیسے آتی ہوگی۔" اس نے شرارت بھری نگاہوں سے نینا کی طرف دیکھا۔

"چل ہٹ شریر کہیں کی۔" نینا اسے پکڑ کر ڈرائینگ روم میں لے گئی۔

سونیا ڈرائینگ روم کی ہر چیز کو نہایت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہر چیز پرکھ تول کر نہایت احتیاط سے مناسب ترین جگہ پر لگائی گئی ہو۔ وہ ہر چیز کے بارے میں نہایت اشتیاق سے سوال پوچھ رہی تھی۔ یکایک اس کی نگاہ کتابوں کی الماری کے ایک خانے پر پڑی جہاں پھٹی ہوئی جوتیاں، انڈوں کے چھلکے نہایت قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ وہ ایسی آرائش میں ایسی بے ترتیبی کا خیال بھی نہ لا سکتی تھی۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ "نیرج جی کہتے ہیں کہ یہ وہ تمغے اور میڈل ہیں جو سامعین نے ان کو ان کی بہترین اداکاری پر دیئے ہیں۔!"

"یہ یہ پھٹی جوتیاں ۔۔۔۔ یہ انڈوں کے چھلکے۔!"

"ہاں یہ ---- یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب نیرج جی ابھی اسٹیج پر ہی کام کرتے تھے۔ یہی دو تین سال پہلے کا۔ نیرج جی ڈرامہ میں میر جعفر کا پارٹ ادا کر رہے تھے۔ وہی میر جعفر جس نے غداری کر کے سراج الدولہ اور دیش کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ نیرج جی نے اس خوبصورتی سے پارٹ ادا کیا کہ لوگوں کے دل نفرت اور گھناؤنا سے بھر گئے۔ اور انہوں نے ان پر یہی جوتے اور انڈے برسانے شروع کر دیئے۔ نیرج جی نے سین ختم ہونے پر انہیں بٹورا اور سینے سے لگا لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک کلاکار کا اس سے بڑا مان اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ لوگوں نے اسے اس لمحے میں حقیقی میر جعفر ہی سمجھا۔

"سچ! نیرج جی واقعی مہان کلاکار ہیں۔!"

"سونیا! کاش تم نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا! میں وہیں تھی۔"

"سچ! تو اس طرح سے شروع ہوئی تمہاری پریم پوجا!" سونیا نے نینا کے بازو میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ نینا مسکرانے لگی۔

"تمہیں اتنے بڑے کلاکار کی بیوی ہو کر کیسے لگتا ہے!" وہ دونوں صوفے پر آ کر بیٹھ گئیں۔ نوکر میز پر چائے کی طشتری لگا کر چلا گیا تھا۔

"مجھے فخر ہے کہ نیرج جی نے مجھے اپنے قابل سمجھا۔ اتنے کلاکار ہونے پر بھی ان میں کوئی غرور نہیں۔ سبھاؤ تو میں انہیں ایک بچہ ہی مانتی ہوں۔ چنچل۔ نٹ کھٹ۔!"

"جانتی ہو وہ آج کل فلم "نورجہاں" میں شہزادہ سلیم کا پارٹ کر رہے ہیں۔" اس نے چائے کی پیالی سونیا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں" میں تو دیکھ رہی ہوں۔ ادھر سلیم شاہی حقہ پڑا ہے۔ ادھر دیواروں پر مغل آرٹ کی تصویریں ہیں۔"

"ہاں پتہ نہیں انہیں کیا سوجھا۔ وہ اس روز گھر میں دو کبوتر لے آئے۔ مجھے تھما کر خود ریڈیو گرام میں ریکارڈ لگانے لگے۔ زندگی میں پہلی بار کبوتر تھامے تھے۔ مجھ سے سنبھالے نہ گئے۔ ایک کبوتر میرے ہاتھوں سے پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔ انہوں نے مڑ کر میری طرف قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ تو میں نے بڑبڑا کر کہا۔ "کبوتر تو اڑ گیا۔" اور انہوں نے شاید حقیقی سلیم کی طرح ہی گرج کر پوچھا۔ "کیسے۔؟" تو میرے ہاتھ پھر لرزنے لگے اور دوسرا کبوتر بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ "ایسے!" اور وہ سچ مچ اسی سلیم کی طرح مسکرانے لگے!"

"کیا ماڈرن VERSION ہے سلیم نورجہاں کا۔!"

سونیا ہنسنے لگی۔

"بھئی کچھ بھی کہو۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بیچاری نورجہاں کا ایسے ہی حالات میں کیا حال ہوا ہوگا!"

"واہ ری میری نورجہاں! قربان جاؤں تم پر!"

"بھئی کیا بتاؤں تم کو! آج کل تو اکثر معلوم ہوتا ہے کہ وہ... وہ خود ہی سلیم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں!"

"مزے آ رہے ہیں میری ننو کو!" اور سونیا نے فرطِ مسرت سے نینا کا بازو زور سے دبایا۔

"چل ہٹ! نیل ڈال دیا!"

"اور جب اس سے گہرا نیل پڑتا ہو گا تو۔۔۔۔"

"تو بڑی بے شرم ہے! — اور ابھی تو تیری شادی بھی نہیں ہوئی!"

"تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔!" سونیا نے ذرا بن کر جواب دیا۔ اور وہ پھر دونوں مسکرانے لگ گئیں۔

وہ کافی عرصہ بیٹھیں، ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔

"نیرج جی ابھی تک نہیں آئے۔؟" سونیا نے آخر پوچھا۔

"فلمی لوگوں کا کیا ٹھکانہ ہے! جب بھی شوٹنگ ختم ہو گی۔ وہ سیدھا گھر ہی آئیں گے۔"

"تو اچھا میں چلتی ہوں۔"

"ٹھہر۔ میں ابھی ٹیکسی کے لئے فون کئے دیتی ہوں۔!"

چند ہی منٹوں کے بعد ٹیکسی آ گئی۔ نینا خود اُسے چھوڑنے نیچے تک آئی۔ وہ اگلی بار جلد ہی آنے کا وعدہ کر کے ٹیکسی میں بیٹھ کر چل دی۔

ٹیکسی ابھی مُڑ ہی رہی تھی کہ ایک خوبصورت اِمپالا اُس کے پاس سے گزری۔ اِمپالا کی پچھلی سیٹ پر شاید نیرج ہی بیٹھا تھا۔ اپنے خیالات میں کھویا ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت گلاب تھا، جس سے وہ انجانے میں کھیل رہا تھا۔ وہ سچ مچ شہزادہ سلیم ہی معلوم ہوتا تھا۔۔۔

۲

بیڈ روم کا پردہ سرکانے پر مترنم گھنٹیاں اُبھر اُٹھیں۔ آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی نینا نے دروازے کی طرف نگاہیں اُٹھائیں۔

"شہنشاہِ ہند ملکۂ عالم سے باریابی کی اجازت کے خواہاں ہیں۔" نیرج نے گلاب کا پھول ایک ادا سے سونگھتے ہوئے کہا اور پھر وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ گھنٹیاں چند لمحوں تک بجتی رہیں۔ نینا اُسے سر سے پاؤں تک دیکھتی رہی۔ اُس نے چوڑی دار پاجامہ اور کُرتہ پہن رکھا تھا اور اُس کے پاؤں میں سلیم شاہی جوتے تھے۔

"مابدولت کو افسوس ہے کہ وہ اس طرح سے آپ کی تنہائی میں مخل ہوئے۔" لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ہی وہ اس زیارت کو اپنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔ سلطنت کے بے پناہ کام کاج کے باوجود انہیں اپنے خانگی فرائض کا مکمل احساس ہے۔ اُمید ہے ملکۂ عالم اُن کی کوتاہیوں کو نظر انداز کریں گی۔"

نینا یہ تیموری جلال دیکھ کر مسکرا اُٹھی۔ اُس نے بھی نیرج کو اُسی انداز میں جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ڈرائینگ ٹیبل سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ ناچیز آپ کی راہ میں دیر سے نظریں بچھائے ہوئے ہے۔!" نیرج نے گلاب کا پھول نینا کی گالوں سے مَس کر دیا۔ اور پھر نینا کو اپنی باہوں میں بھرتے ہوئے پکار اُٹھا۔ "تخلیہ" جیسے اُس نے خیالی طور پر تمام موجود کنیزوں کو باہر جانے کا حکم دے دیا ہو۔

ایک لمبے وقفے کے بعد نینا نے اپنے آپ کو گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

"آیئے — چائے پئیں۔"

وہ دونوں باہر ڈرائینگ روم میں آ گئے۔ نوکر ایک نیا لیمپ اسٹینڈ فٹ کر رہا تھا۔ اسٹینڈ سے ملحق ایک کٹاؤ دار بند قسم کا شیشہ تھا۔ چھلنی نما سوراخوں سے روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ یہ شیشہ بالکل مغل اسٹائل کا تھا۔ پیتل کا بنا ہوا یہ اسٹینڈ اپنی نظیر خود تھا۔ نینا اُسے دیکھ کر جھوم اُٹھی۔ وہ اُسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

ہمیں یقین تھا کہ ملکۂ عالم کو ہمارا یہ تحفہ پسند آئے گا۔ آپ ہماری نظرِ انتخاب کی داد نہ دیں گی کیا؟"

"یہ بے حد خوبصورت ہے جہاں پناہ!" نینا نے مسکراتے شعوری طور پر لفظ چُنتے ہوئے کہا۔ اُسے یہ مغل اسٹائل کی بات چیت کرنے میں دانستہ طور پر کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔ اور نیرج تھا کہ اسقدر بے جھجک اور حیرت انگیز روانی سے بول رہا تھا، جیسے کہ وہ واقعی مغل عہد سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ وہ نیرج ہرگز نہ تھا جس سے اُس کی شادی ہوئی تھی۔ شاید یہ نیرج اصلی نیرج سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔

"لیجئے۔ چائے حاضر ہے۔"

"ملکۂ عالم یہ تو چائے ہے" نیرج نے پیالہ تھامتے ہوئے کہا۔ "اللہ گواہ ہے کہ آپ کے دستِ مبارک سے تو ہمیں زہر پینے میں بھی کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں، بھگوان نہ کرے۔ زہر پئیں آپ کے دشمن!" نینا کو یہ کہہ چکنے کے بعد فوراً ہی ایسے ہی مکالموں میں اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ نیرج مغل بادشاہ ہو تو ہو وہ ایک مغل ملکہ بننے میں سخت ناکامیاب تھی۔ وہ واپس اپنی

رندگی کی سطح پر لوٹ آئی ——

"آج میرے بچپن کی ایک سہیلی آئی تھی۔ سونیا مجھے اُس روز اچانک بازار میں مل گئی تھی۔ وہ بڑی شریر ہے۔ یہاں ایک لائبریری میں کام کرتی ہے۔ آپ سے ملنے کے لئے کافی دیر انتظار کرتی رہی۔ آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی گئی ہے!"

"یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم آپ کی عزیز سہیلی سے نہ مل سکے۔" نیرج نے ہلکا سا سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پاک پروردگار نے چاہا تو کوئی دوسرا موقع جلد ہی آئے گا۔ ہمیں بھی اُن سے ملنے کا بڑا اشتیاق رہے گا۔"

وہ دیر تک چائے پیتے رہے۔ نیرج متین، سر سے پا تک مکمّل جلال، نینا خاموش، اُس کی ہر ادا کا شکار۔ آخر نیرج نے مُہرِ خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"ہم نے رات کو ایک خواب دیکھا۔ آسمان پر ہزاروں ستارے رقصاں ہیں۔ چھوٹے بڑے۔ آسمان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کہکشاں کھنچی ہے۔ اتنے میں ایک بہت بڑا ستارہ اُفق پر نمودار ہوتا ہے۔ بے حد روشن، پُرجلال، اُس کے نُور کے سامنے دوسرے ستارے اپنی رنگت کھو بیٹھتے ہیں۔ بالکل زرد، بے جان سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ستارہ سب کو شکست دیتا معلوم ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ سب ستارے غائب ہو جاتے ہیں اور صرف یہی ستارہ چمکتا رہ جاتا ہے۔ کہکشاں اِس کے اِردگرد رقص کرتی ہے، ملکۂ عالم! آپ اِس خواب کی تعبیر جانتی ہیں؟"

"نہیں تو!" نینا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نیرج مُسکرا دیا۔

ہم حیران ہیں کہ ملکۂ عالم اِس خواب کی تعبیر نہیں جانتیں!"

اور پھر تھوڑے سے وقفہ کے بعد بولا۔

"آسمان کے ستاروں اور فلمی ستاروں میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ ملکۂ عالم!"

"اوہ!" نینا نے یک دم سمجھتے ہوئے کہا۔ "تو یہ پُرجلال —— روشن ستارہ جہاں پناہ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔"

اور وہ دونوں ہنسنے لگے۔

اتنے میں کال بیل کی مترنم جلترنگ سی بج اُٹھی۔ تھوڑی دیر میں نوکر ایک کارڈ لے کر آیا۔ نیرج نے ایک نظر کارڈ پر ڈالی۔ کارڈ پر لکھا تھا "جھگن بھائی مگن بھائی فلم پروڈیوسر۔ نیرج نے ایک نگاہ نینا پر ڈالی اور تیموری جلال میں کہا۔" تخلیہ "جب نینا دوسرے کمرے میں چلی گئی تو اُس نے اُسی باوقار لہجہ میں کہا۔

"پیش کیا جائے۔" نوکر ایک لمحہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ جیسے وہ اُس کا مطلب نہ سمجھ سکا ہو۔" ارے اُلّو کی دُم۔ بُلاؤ اُنہیں!"

اب کی بار نوکر کی سمجھ میں فوراً آ گیا۔ وہ "اچھّا جی" کہتا ہوا باہر بھاگ گیا۔

تھوڑی دیر میں جھگن بھائی، مگن بھائی اپنے سکریٹری لالو بھائی کے ساتھ بڑی بے نیازی سے وارد ہوئے۔

"بھئی نیرج جی۔ آپ نے تو کمال کر دیا۔ کیا رول ادا کیا ہے آپ نے 'شکنتلا' میں راجہ دُشینت کا۔ واہ واہ۔ واہ واہ!" —— اُنہوں نے اِتنا لمبا ڈائیلاگ کمرے میں داخل ہونے سے کُرسی سنبھالنے تک ادا کر دیا۔

؎ "تن بھی چھینا من بھی چھینا۔ چھین لیا گھر بار۔
جگ میں ناہیں دیکھی تجھ سی سُندر نار"

لالو بھائی نے ایک ادا سے 'شکنتلا' میں راجہ دُشینت کے مکالمے نہایت رس سے دُہراتے ہوئے کہا۔ واہ! 'واہ!' کس خوبی سے آپ نے ادا کیا ہے۔ نیرج جی واہ! 'واہ!

نیرج اُن دونوں کی طرف دِل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اُنہوں نے اِسے رسمی طور پر سواگت کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔

"مابدولت خوش ہوئے۔ پاک پروردگار کی قسم۔ وہ آئندہ بھی پوری کوشش کریں گے۔ کہ کامرانی اُن کے قدم چُومے اور وہ اُسی طرح اپنا فرض ادا کر سکیں!"

"بھئی واہ، واہ، واہ!۔ جھگن بھائی نے حیرت اور پسندیدگی کی نگاہوں سے نیرج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اُنہوں نے ایک نِگاہ کمرے پر دوڑائی۔ کونے میں مُغل اسٹائل کا کٹاؤ دار لیمپ۔ دوسرے کونے میں سلیم شاہی پیچدار حُقّہ۔ دیواروں پر مُغل اِسٹائل کی تصویریں۔ پھر اُن کی نگاہیں سلیم نیرج کے اپنے لباس پر رُک گئیں۔ چوڑی دار پائجامہ اور اُس

پر منقش کرتہ ــــ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی۔

"بھئی مان گئے۔ کیا سلیم جچ رہے ہو۔! بھئی واہ!"

"اجی اصلی سلیم آجائے تو وہ بھی ایک بار دھوکا کھا جائے!"

لالو بھائی لقمہ دیا۔ سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

اب کے چھگن بھائی گرام جیوں پر پھلیم بنائے جا رہے ہیں۔ مجھ سے ہیرو کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا۔ نیرج جی سے بڑا ہیرو کون ہو سکتا ہے۔! ۔ آہا! آہا! کیا رول ہے اُس دیہاتی ہیرو کا۔ امن کا صاف اور سچا۔ وہ تو دنیا کے ہر چھل کپٹ کو بھی من کی سچائی سے پرکھتا ہے۔!"

"نیرج جی، مجھ سے کسی نے کہا کہ راج کپور کو لے لوں، کسی نے کہا دلیپ کمار کو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جس طرح سے آپ اپنے رول میں کھپ جاتے ہیں۔ کوئی دوسرا نہیں کھپ سکتا۔"

آپ کہانی بھجوا دیں۔ اگر یہ کردار ہمیں پسند آیا تو مابدولت کو انکار نہ ہوگا۔!"

"اجی آپ ایک بار کہانی پڑھ لیں گے تو انکار کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔! لالو بھائی نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"اور پھر کہانی سالی کا کیا ہے۔ میں کل ہی منشی جی کو بھجوائے دیتا ہوں۔ آپ کہانی سن لیں اور اگر کوئی تبدیلی کرنی ہوگی تو کر لینگے۔ مجھے تو آپ کو اور سپنا جی کو لے کر فلم بنانی ہے۔!"

"سپنا جی! سپنا جی اور نیرج جی واہ کیا جوڑی رہیگی ایک ساگر دوسری سرتیا۔! جھرنوں کا مدھر سنگیت اور تڑپتا ساز۔"

"واہ! واہ! واہ!۔ چھگن بھائی نے کرسی سے آگے سرکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ آپ کو سپنا جی کے ساتھ پارٹ کرنے میں تو کوئی اعتراض نہیں؟"

"نہیں تو!" نیرج جیسے من ہی من میں سپنا کو تول رہا تھا۔

"مجھے کسی بھی اچھے اداکار کے ساتھ کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے"

"میں مانتا ہوں سپنا جی ابھی نئی نئی ہیں۔ ابھی دو چار فلموں میں ہی کام کیا ہے۔ لیکن ہے بہت ہشیار ــــــ میں نے اُسی دن "دھوبن" کے POSE دیکھے۔ کیا جچتی ہے ۔ واہ! واہ! واہ!"

"اور کیا لہک کر چلتی ہے" لالو بھائی کو جیسے اچانک کرنٹ لگا ہو۔ وہ کرسی سے اُچک کر فرش پر اُس کی ہلکتی چال کا نمونہ پیش کرنے لگ گیا۔

نیرج لالو بھائی کی طرف غور سے دیکھتا رہا اور پھر اچانک تالی بجا اٹھا۔

"مابدولت کو تو آپ کے ساتھ بھی پارٹ کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔!" وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ لالو بھائی فوراً رک گیا اور پھر نیرج کے ہاتھ تھام کر فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

نیرج جی اب آپ ہی چھگن بھائی کو سمجھایئے کہ میں کتنا TALETED ACTOR ہوں۔ اِن سے میری بھی سفارش کر دیجئے نا، پلیز!" اور پھر ایک قابل اور مشہور ایکٹر کا سوانگ بھرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی آپ کے ساتھ پارٹ کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا!" اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ پھر لالو بھائی تھا جو نیرج سے سفارش کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ "اِن سے کہہ دیجئے نا پلیز ــــــ!"

۳

سونیا لہکتی لہکتی نیرج کے گھر پہنچی۔ اُس نے بالکل ایک نئی خوبصورت پھولدار ساری پہن رکھی تھی۔ اُس نے اُسے اِس طرح سے پہن رکھا تھا کہ اُدیچے سے مختصر بلاؤز سے کولہوں تک کا حصہ اچھا خاصہ ننگا دکھائی دیتا تھا۔ کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ اُس کا بیضوی چہرہ اور بھی دل آویز لگ رہا تھا۔ وہ پلو کو ایک عجیب بے نیازی کے ساتھ کندھے پر ڈالتے ہوئے، بنا گھنٹی بجائے نیرج کے فلیٹ میں داخل ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اچانک اندر پہنچ کر نیرج کو متحیّر کر دے۔

وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئی۔ کمرے کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ کمرے میں فرنیچر اگرچہ وہی تھا لیکن ساری ہیئت بدلی ہوئی تھی۔ ساٹن اور ریشم کی بجائے کھدر اکھدر اور جوٹ جا بجا فرنیچر کو اوڑھے ہوئے تھے۔ کمرے میں پچھلی بار پڑا ہوا سلیم شاہی حقہ غائب تھا۔ اُس کے بجائے نیچی چوکیاں رکھی تھیں۔ دیوار پر چھاج ٹنگا تھا۔ جس پر ایک نہایت خوبصورت دیہاتی سین پینٹ کیا گیا تھا۔ دوسری طرف بانس کی کھپچیوں سے بنا ایک فریم ٹنگا تھا جس میں سجاوٹ کی چھوٹی چھوٹی چیزیں نہایت قرینے سے لگی تھیں۔ اُسے شک گزرا کہ وہ کہیں غلط فلیٹ میں نہ

آ گئی ہو یا کہیں نیرج جی ہی کسی دوسرے فلیٹ میں نہ اُٹھ گئے ہوں ان فلمی لوگوں کا کیا ٹھکانہ۔! وہ باہر فلیٹ کا نمبر دیکھنے کیلئے مُڑی۔ کہ پیچھے سے ایک آواز آئی۔

"اے چھوری اِدھر کا ہے گھس آئی۔"

سونیا جیسے بنا چابی گھوم گئی۔ سامنے لانگ، دھوتی، کُرتہ پہنے ایک مرد کھڑا تھا۔

"کس کو پوچھت ہین!"

"ایہہ ما نیرج بابو رہن!۔ اُو جو پھلموں میں پارٹ کرت ہیں۔" نہ جانے سونیا نے کیوں اُسی بھاشا میں سوال کر دیا۔

"باپ رے۔ اری تو بھی ہماری بھاشا بول سکت ہے۔ ہمیں سوچت رہن کہ کھالی ہمیں گنوار لھپئیں۔!"

"آؤ۔ آؤ اِدھر بیٹھیں۔" اُس نے اُسے کھینچ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ سونیا یکدم اس طرح سے پکڑے جانے سے ہکی بکی رہ گئی۔

"کون گاؤں رہن تمرن!" وہ بھی قریب کرسی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

"دیوا جانت ہو؟" ضلع بارہ بنکی"۔ سونیا نے بھی ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اری اُو دیوا۔ جہاں بڑا بھاری میلہ لگت ہے! کا بولت ہیں دیوا شریف۔ اُو گاؤں ہے تمرن؟" اور وہ ایک لمبا ٹھنکا رہ لے کر بولا۔ "ہمرو گاؤں بھی نجدیک رہن۔ پر ہمرے گاؤں کی اتا پھیشن ناہیں کرت ہیں۔"

اور وہ اُس کے قریب آ کر سونگھتے ہوئے بولا۔ "باپ رے "کیسی بھینی بھینی باس آوت۔ رہن تمرے جسموا سے! ایسے لگت ہے جیسے چمیلی جل سے اشنان کرکے آوت رہت ہو۔

وہ مسکرا دی۔" ای چمینلی جل ناہیں نیرج جی! لیونڈر واٹر!"

وہ اب نیرج جی کو پہچان گئی تھی۔

"لیونڈر وا۔ ہم دیہاتی گنوار بھلا کا جانئیں!۔ اور پھر وہ اُٹھ کر گلدان کے پاس گیا اور اُس میں سے ایک سفید پھول توڑ کر بولا۔ "لے چھوری۔ ای پھول کے بنا تو تمرا سولہ سنگار اَدھورا رہن۔ ای پھول لگا لو نا اپنے جوڑوا میں۔"

سونیا نے خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔" ای بھی کوئی بات بھئی۔ کسی کو شوق ہے تو لگا دیوے مورے جوڑوا میں۔"

"اری تو بڑی نٹ کھٹ ہے رے۔!۔ اور نیرج نے بڑھ کر پھول سونیا کے جوڑے میں ٹانک دیا۔ سونیا نے ایک ادا سے نیرج کی طرف دیکھا۔ اور پھر بولی۔ "تھینک یو۔"

"ارے باپ رے۔ تو تو انگریزی بھی جانت ہے!"

وہ صوفے کے قریب آ کر فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ اِتنے میں دروازے کی مترنم گھنٹی بج اُٹھی۔ نیرج جلدی سے دروازہ کھولنے کیلئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ایسے دیکھت ہے، جیسے بی بی جی آ گئیں ہوں!"۔ اور سچ مچ دروازے پر نینا ہی کھڑی تھی۔

"اری سونیا، تم کب آئیں۔؟"

"ای؟ سونیا۔؟۔ ایہہ تو کہت رہن کہ دیوا شریف سے آئین ہیں۔"

"دیوا شریف، کبھی زندگی بھر بھی گئی ہے وہاں!"۔ ارے یہ تو پکی سنارھن ہے۔!" نینا ہنستے ہوئے بولی۔ سنارھن۔! باپ رے۔!"

"اور آپ کا گاؤں، کب سے انبالہ شہر چھوڑ کر دیوا شریف آ گیا ہے۔ سونیا نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ مڑ کر بولی۔" یہ کسی نئی فلم کے ڈائیلاگ ہیں کیا۔؟"

آج کل ان پر بھی پوربی بھاشا نے اپنا جادو جگایا ہوا ہے۔ "جے گنگا مائی" میں پارٹ کر رہے ہیں نا۔!"

"نیرج جی میں نے بہت سنا تھا آپ کے بارے میں۔ لیکن آج میں بھی آپ کی کلا کی قائل ہو گئی ہوں۔

"نیرج جی نے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

سچ۔ اگر مجھے پہلے سے ہی آپ کے بارے میں اتنی خبر نہیں ہوتی تو میں تو آپ کو ایک دیہاتی نوکر ہی سمجھتی۔ اب میں سمجھ سکی ہوں کہ آپ کس طرح سے ہر کردار میں بس جاتے ہیں۔ دھنیہ ہیں آپ۔!"

اوہ۔ تو یہی وہ دیوی جی ہیں جن سے تم مجھے ملوانا چاہتی تھیں نینا۔ ارے باپ رے یہ تو میری بھی گرو ہیں۔ ایکٹنگ۔ تو میرا پیشہ ہی ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اس ساڑھی کے بجائے لہنگا چولی پہنا ہوتا تو دیوا شریف کی چھیل چھبیلی ہونے میں ان کی بھی کیا کسر تھی! سچ، آپ کو تو فلموں میں آ جانا چاہیئے۔!"

سونیا کی آنکھیں اس تعریف سے چمک اُٹھیں، اور وہ نیرج کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ارے آپ سب کب تک کھڑے رہیں گے!، بیٹھئے نا۔ نینا نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی میں تو آج کافی تھک گئی ہوں۔ گرم گرم کافی پینے کو من ہو رہا ہے۔!" اور پھر اُس نے نوکر کو بیٹھے بیٹھے آواز دی۔ نیرج اُچک کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"بی بی جی، آپ کا ہے تکلیف کرت ہیں۔ ابھی جا کر نوکر کو بلا لات ہوں۔ کافی کے سنگ کا کھاوے کا من کرت ہے یا پیسٹری!" اور وہ یہ کہہ کر اندر بھاگ گیا۔

نینا اور سونیا دونوں ہنسنے لگیں۔

نینا، تمہارا من تو خوب لگا رہتا ہوگا۔ نیرج جی بڑے ہی دلچسپ ہیں۔! سچ تم بڑی ہی بھاگوان ہو۔!"

تھوڑی دیر میں کافی آ گئی، نیرج بھی آ کر شامل ہو گیا۔

"تو آپ لائبریری میں کیا کرت ہیں؟"

"لائبریرین ہوں۔ ہر وقت کتابوں سے گھری رہتی ہوں۔!"

"پھر تو آپ بہت گیانی دھیانی ہو گئین۔!"

"ہوں۔!" اس نے کچھ ایسے ڈھنگ سے کہا جیسے اس میں شک کی گنجائش کہاں تھی۔

"کتابوں سے مغزپچی کے علاوہ کیا کرتی رہتی ہو۔ تمہیں تو کالج کے دنوں میں ناچنے کا شوق بھی تھا نا؟" نینا نے پوچھا۔ "کتھک سیکھ رہی تھی نا؟"

"دیدی اب وہ موقع کہاں! ہاں تھوڑی بہت پینٹنگ کر لیتی ہوں۔ کبھی کبھار۔!"

"پینٹنگ! باپ رے!" نیرج نے بڑی بڑی آنکھیں نکال کر اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"او، کوچی رنگ کو پینٹنگ بولت ہیں نا؟ او کوئی بڑی بات نہیں۔! ہمرے گاؤں میں بھی دلدارا رہئت تھا۔ او کوچی رنگ لے کر ٹیلی بجات میں بڑو بڑو کمرہ ما سفیدی کر دیت تھا۔ ہاں نٹ سیکنڈ میں!" نیرج نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

سونیا اور نینا کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ان کو ہنستا دیکھ کر وہ انہیں یقین دلانے کے انداز میں بولا۔ "ہاں بڑا ہوشیار تھا۔ تنک جھوٹ نہیں بولتا۔"

"تمہار دلدروا کا ہم مقابلہ کر سکت ہیں کا؟" "ہم تو چھوٹن چھوٹن تصویر بناوت رہن۔!" سونیا نے کہا۔

"باگھ، چیتن کا تصویر بناوت، یا کھالی چڑیا، کبوتر کا بناوت ہن۔!" نیرج نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "نا بابا، ہم کو ان سب سے ڈر لاگت ہے۔ ہم تو کھالی آدمی لوگن کا تصویر....."

"آدمی لوگن کا؟ تو ہمری بھی تصویر بنا سکت ہو؟"

"آدمی تھوڑا ڈھنگ کا ہوت رہن تو کاہے نہیں بنا سکت۔ پر تمہار کھوپڑی تھوڑی الٹی رہی۔!"

"اے چھوکری! ہمرے گھر میں ہمیں کو گالی دیت ہو!! اے نینا دیدی ان کو منع کر دینا۔"

"اچھا بابا اچھا! کوسس کروں گی؟" اس نے منانے کے انداز میں کہا۔ نیرج اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ سونیا نے نینا کی آنکھ بچا کر نیرج کو چڑاتے ہوئے بالکل دیہاتی انداز میں زبان نکالی۔ نیرج کو سونیا کا یہ بیباکانہ انداز بہت پسند آیا۔ جواب میں اس نے بھی بہت بڑی زبان نکال دی۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نیرج ٹیلیفون سننے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نینا، سونیا کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔

سونیا۔ بھئی تم نے یہ پوربی بھاشا کب سیکھی۔ تم تو واقعی کمال کرتی ہو۔!"

اری دیدی۔ نیرج جی سے تو خواہ مخواہ لڑنے میں مزا آتا ہے۔ سچ، نیرج جی تو بہت ہی دلچسپ ہیں۔!"

اتنے میں نیرج نہایت جوش سے کمرے میں داخل ہوا۔

لو بھئی، راج کا بلاوا آ گیا، اب تو مجبوراً جانا ہی ہوگا۔! وہی COME AS YOU ARE پارٹی میں! کم بخت نہ جانے کب وقت چنتا ہے۔ اٹھو چلیں۔ سونیا تمہیں بھی چلنا ہوگا۔!"

"کہاں۔؟" سونیا نے پوچھا۔

یہیں پاس ہی! بہت زیادہ دور نہیں!" نیرج نے کہا۔

"اس حالت میں!" اس نے اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا،

"تمہاری حالت تو ہم دونوں سے اچھی ہے۔" نینا نے سونیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"COME AS YOU ARE پارٹیوں میں تو آپ جس حالت میں ہوں، اسی حالت میں جانا لازمی ہے۔ ابھی اس روز ہی کسی نے صبح دس بجے ہی فون کر دیا۔ نریش بالی جب پارٹی میں پہنچا تو اس نے ابھی تک سلیپنگ سوٹ ہی پہن رکھا تھا کندھے پر تولیہ تھا اور ہاتھ میں ٹوتھ برش۔ ارے بڑے بڑے سوانگ ملینگے وہاں پر!"

سونیا نے ایسی پارٹیاں نہیں دیکھی تھیں۔ نریش بالی ایک مشہور فلمی ڈائرکٹر تھا۔ اسے فلمی دنیا کو اور بھی قریب سے دیکھنے کا اشتیاق ہونے لگا۔ وہ تھوڑے پس و پیش کے بعد چلنے پر رضامند ہو گئی۔

۴

راج کی کوٹھی ساحل کے عین کنارے پر تھی۔ نیرج نے جان بوجھ کر کار کوٹھی کے باہر کھڑی کر دی۔ وہ نینا اور سونیا کو لے کر پیدل ہی کوٹھی میں داخل ہوا۔ نینا اور سونیا باتیں کرتے کرتے پیچھے رہ گئی تھیں۔ جوں ہی دربان نے نیرج کا دیہاتی لباس دیکھا وہ وہیں سے چل دیا۔

"ارے کہاں گھسے چلے آتے ہو؟ ادھر ٹھہرو۔!"

سونیا نے مسکراتے ہوئے پہلے نینا کی طرف دیکھا اور پھر نیرج کی طرف!" نیرج بڑی بے بس نظروں سے ان دونوں

کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ارے ایک طرف ہٹو نا! میم صاحب کو اندر جانے دو۔"

سونیا، نینا کا بازو پکڑا اور آپ سے گھسیٹتی ایک شانِ بے نیازی سے سے کوٹھی میں داخل ہوگئی۔ نینا مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ وہ نیرج کے اِس طرح پکڑے جانے کی وجہ سے کسی قدر بوکھلا گئی تھی۔ لیکن سونیا کو جیسے مزا آرہا تھا۔

"نمستے بھابی!" راج نینا کو دیکھتے ہی آگے بڑھ آیا۔ "وہ نیرج مہاشے کہاں ہیں؟ کشمیر میں یا مدراس میں، یا پھر ہردوار، رشی کیش میں؟" راج کو جیسے "جے گنگا مائی" کا اچانک دھیان آگیا ہو۔ پیشتر اِس کے کہ نینا کچھ جواب دیتی۔ سونیا بول اُٹھی۔

"فی الحال تو آپ کے دربان سے اُلجھ رہے ہیں! وہ اُنہیں اندر ہی نہیں آنے دیتا۔"

"وہاٹ نون سینس۔!" راج نے قریب کے ایشٹرے اسٹینڈ میں سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔ نیرج تو اچھا خاصا بہروپیہ ہوگیا ہے۔

"اور آپ؟" سونیا کے مُنہ سے نکل گیا۔ راج نے ہاف پینٹ اور تولیئے کے کپڑے کی بنی ہوئی رنگین ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ دراصل وہ خود لان میں گھاس کاٹنے کی مشین چلا رہا تھا۔ اور پسینے سے تر بتر تھا۔ تازہ کٹے ہوئے گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو اُس کے کپڑوں میں سے آرہی تھی۔ کپڑوں پر مشین کی سیاہی اور جوتوں میں گھاس، اُس کی اِس مصروفیت کی چغلی کھا رہے تھے۔ نہ جانے اُس وقت راج کی بیوی شوبھا کو کیا سُوجھی کہ اُس نے دم بھر میں ٹیلی فون کرکے اپنی اِس کلب کے تمام ممبروں کو جمع کر لیا۔

اوہ! یہ!" راج نے سونیا کے سوال کے جواب میں اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ یہی تو میں کہتا ہوں ہم سب سے الگ ہیں اِس بڑی دُنیا میں!" اُس نے گھائل نظروں سے سونیا کی طرف دیکھا —— سوائے آپ دونوں کے! مجھے تو صرف آپ ہی حقیقت دِکھائی دیتی ہیں۔!" سونیا کا چہرہ کِھل اُٹھا۔ اُس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا، لیکن پیشتر کہ وہ کچھ کہہ سکے، راج نے اُن دونوں سے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا۔ "بھابی، میں ابھی تمہارے پتی دیو کو اُس دربان کے پنجے سے چھڑا کر لاتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ اُس مایۂ ناز داکار کی کچھ زیادہ ہی بے حُرمتی ہو جائے۔"

راج کے جانے کے بعد وہ کچھ لمحے وہیں کھڑی رہیں، پھر وہ ہال کی طرف بڑھیں —— کمرے کے باہر ہی کوئی شخص کُرتہ اور لانگ دھوتی لگائے اُونگھ سا رہا تھا۔ جیسے وہ بستر سے سیدھا اُٹھ کر آیا ہو، سونیا نے ایک اُچٹتی نِگاہ اُس شخص پر ڈالی۔ کہاں تو وہ جمائی لینے لگا تھا۔ اور کہاں وہ جمائی بیچ میں ٹوٹ گئی۔ اور وہ ہوشیار آنکھوں سے اُن دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"ارے نینا دیدی!، تم! بھالوشے!،

ہاں خُوب بھالو —— مکل دادا —— یہ میری سہیلی سونیا ہے۔

یہ ہیں فلم سنسار کے مشہور ڈائرکٹر مکل بوس!، سونیا مکل بوس کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ کل کی بات، بچپن، جیون جیوت اور بنجارہ جیسی اُونچی فلموں کو جنم دینے والے مکل بوس اِس قدر سادہ اور بے جان سا شخص۔

لیکن اب مکل دادا نے جیب میں سے پائپ نکال لیا تھا۔ اور وہ اُسے سُلگاتے ہوئے اُس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سونیا نے نہایت عقیدت سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ سچ بات ہے کہ میں آج تک بچپن اور بنجارہ جیسی فلموں کو بُھلا نہیں سکی۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج میری زندگی کی ایک بہت بڑی آرزو پُوری ہوگئی ہے۔"

"آپ کلا کی بڑی رسیا معلوم ہوتی ہیں۔ نینا دیدی، اِنہیں کبھی گھر لے آؤ۔ فُرصت سے باتیں کریں گے۔ مجھے یہ ہنگامے اچھے نہیں لگتے، لیکن آجاتا ہوں۔ دو چار دوستوں سے بھینٹ ہوجاتی ہے، دوسروں کو ہنستا کھیلتا اور جوان دیکھ کر میں بھی کچھ جوانی محسوس کر لیتا ہوں۔؟

"کہو مکل دادا۔ بھالوشے!" نیرج نے جو راج اور دربان کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ دُور ہی سے جوش بھری آواز میں کہا۔

"ارے نیرج، ٹھیک ہے جو ٹائم بھی گُزر جائے۔ لیکن یہ تم نے اپنی کیا درگت بنا رکھی ہے!" مکل دادا نے پائپ کا کش لیتے ہوئے پُوچھا۔

"کچھ نہیں —— یہی دربان نے روک رکھا تھا۔ راج نے پھر نینا کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔ بھابی جانتی ہو، یہ دربان کون ہے؟"

نینا نے دربان کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن سوائے اِس کے کہ وہ کوئی جانی پہچانی صُورت ہے۔ اِس سے آگے نہ بڑھ سکی۔"

نہ جانے کہاں سے شوبھا آگئی۔ "ارے نینا دیدی! ٹھہرو، میں پہچانتی ہوں!" وہ ایک لمحہ دربان کی طرف دیکھتی رہی۔ اور پھر اُس نے لپک کر دربان کی لمبی مونچھوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ارے یہ کیا کرتی ہو۔!" بھئی یہ زیادتی ہے، کی آوازوں کے درمیان شوبھا نے دربان کی آدھی مونچھ نوچ لی۔ اور پھر سب ایک ساتھ چلا اُٹھے۔ "جگ موہن کرشن۔"

—— سونیا حیران رہ گئی —— یہ جگ موہن کرشن تھا —— مشہور کیریکٹر ایکٹر!

وہ مُسکرا دی۔ فلمی دنیا میں بھی کیسے کیسے سوانگ تھے۔! سب کی ہنسی رو کے نہیں رُکتی تھی۔

کمال کر دیا ہے جگ موہن تم نے!"

بھئی میں سوچ رہا تھا۔ کہ میرے ہاں کوئی دربان نہیں تھا۔!" راج کہہ رہا تھا۔ "پھر یہ دربان کہاں سے آٹپکا۔"

" دیکھو بھائی، یہ بھابی کی زیادتی ہے۔ کہ میری آدھی مونچھ صفا کر ڈالی۔" جگ موہن کرشن نے شکایتی لہجہ میں کہا۔ "اور پھر یہ تمہاری پارٹیوں کے قاعدہ قانون! کہ بھئی جو بھی کر رہے ہو۔ جیسے بھی لباس میں ہو۔ بھاگے چلے آؤ۔!" اب میں جگو کے رُول کے لئے میک اپ کر رہا تھا۔ کہ ٹیلیفون پر بھابی کے وارنٹ آپہنچے!"

"ہاں بھئی، کمبختی میری ہی تھی!" نیرج بول اٹھا۔ میں تو اس مُشٹنڈے کو دیکھ کر واقعی گھبرا گیا تھا۔ سوچ رہا تھا نہ جانے راج نے کیسے کیسے نوکر چن کر رکھ چھوڑے ہیں۔!"

" اور حضرات آپ نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی ہے نا!" جگ موہن نے واپس چوٹ کی۔

بھئی نہلے پر دہلے والی بات ہے۔ راج نے دونوں کو باہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

اور یکایک تمام نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں جہاں زینت ابھی ابھی داخل ہوئی تھی۔ زینت جس کا رقص کرتا ہوا مرمریں جسم ہزاروں فتنے اٹھاتا۔ جس کی لہکتی چال تماشائیوں کی سانس روک لیتی اور جو تقریباً ہر فلم میں کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں رقاصہ کا رول کرتی۔ وہ اب بھی نہانے کے لباس میں تھی اور اُس کا متناسب جسم اس مختصر سے لباس میں قیامت برپا کر رہا تھا۔ شوبھا اور راج دونوں اس کے سواگت کے لئے آگے بڑھے۔

" او، شوبھا ڈارلنگ!" اس نے شوبھا کے رخساروں پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ بھئی تم اس پارٹی کیلئے بھی کیا وقت چُنتی۔!۔ ابھی ابھی بیچ سے (BEACH) لوٹی ہی تھی کہ تمہارا ٹیلیفون آگیا۔ جیسے تھی ویسے ہی چلی آئی!" اور پھر وہ کولہے مٹکاتی، سب سے ہنسی مذاق کرتی، ہر کسی سے مخاطب ہوتی، آگے بڑھنے لگی۔ وہ سونیا کے پاس آکر رک گئی۔ "بھئی ہمیں ان سے بھی ملواؤ نا!" اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ سونیا کی صورت و شباہت سے بہت متاثر ہوئی ہو۔۔۔۔ شوبھا نے بتایا کہ وہ نینا کی ایک سہیلی تھی۔

" اری نینا! تم اپنی اتنی خوبصورت سہیلیاں چھپا چھپا کر رکھتی ہو۔!" اس کے لہجے میں ایک عجیب مردانہ بے باکی سی تھی۔ نسوانی جسم اور مردانہ بے باکی کا وہ ایک عجیب مرکب تھی۔

" کیوں نینا! کہاں تھی یہ اتنے دن سے۔!"

" یہ میرے بچپن کی سہیلی ہے۔ مدتیں گزر نے پر ابھی پچھلے مہینے ہی دکھائی دی ہے۔!"

" دیکھنا یہ اب پھر کہیں گم نہ ہو جائے!"

ایک کونے میں چھگن بھائی بیئر کا گلاس سنبھالے رنگین بھارتی سے شعر سنتے جا رہے تھے" اور واہ واہ کے نعروں کے درمیان بیئر کے گھونٹ بھی بھرتے جا رہے تھے۔ چھگن بھائی گجراتی ہوتے ہوئے بھی اردو شاعری کے بڑے رسیا تھے۔ رنگین بھارتی کو شاید ہی کسی نے کوئی ذاتی شعر کہتے سنا ہو۔ لیکن دوسرے شاعروں کا کلام اُن کی زبان کی نوک پر رہتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ بھارتی کا موقع کے مطابق برجستہ کلام پڑھنے میں شاید ہی کوئی مقابل ہو، اسی وجہ سے کوئی بھی پارٹی اُن کے بنا مکمل نہ ہوتی۔

"چھگن بھائی نے جونہی زینت کو کولہے مٹکاتے اس توبہ شکن لباس میں دیکھا تو وہ بھڑک اُٹھے۔

" ارے بھائی بھارتی۔ تم دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں!" بھارتی نے سامنے سے آتی ہوئی فتنہ بدن کو دیکھا اور پھر اس نظارے کو نگاہوں میں سمیٹتے ہوئے آنکھیں بند کر کے کہا۔

جل گئیں میکشوں کی آنکھیں بھی
اُف ترے جسم کے نشیب و فراز (علم)

اور پھر وہ کچھ دیر رکنے کے بعد بول اٹھا

" اُف وہ مرمر سے تراشا ہوا شفاف بدن
دیکھنے والے جسے تاج محل کہتے ہیں!"

بھارتی نے قیس کا ایک شعر پڑھ دیا۔ شعر کی بھنک زینت کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ وہ خوشی سے پھول اٹھی۔

" بہت اچھا شعر پڑھا آپ نے بھارتی جی۔ اب ذرا دیکھو۔ آپ ان کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں۔!" اور اس نے سونیا کو پکڑ کر آگے کر دیا۔ سب لوگ اُن کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ بھارتی چند لمحوں تک سونیا کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر اس نے

آنکھیں بند کرکے یہ شعر پڑھ دیا ؎

کس کے سانسوں کی مہک لے کے ہوائیں آئیں
جسم سے پھول چٹکنے کی صدائیں آئیں

"واہ! واہ! واہ!" چھگن بھائی بے اختیار بول اُٹھے۔ "پھول چٹکنے کی صدائیں آئیں!۔ واہ، واہ، واہ!"

"بھئی کس کا شعر ہے۔ بہت ہی خوبصورت شعر ہے۔!" نیرج نے داد دی۔ "کیا نازک خیالی ہے۔"

"ساحر کے سوائے کس کا شعر ہوسکتا ہے۔ بھارتی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ تمام نگاہیں سونیا پر مرکوز تھیں۔ اور اُس کے گال نسوانی حیا اور تعریف سے تمتمانے لگے۔

اگر محترمہ بُرا نہ مانیں تو مجھے ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک اور بہت اچھا شعر یاد آگیا ؎

تمتماتے ہیں سُلگتے ہوئے رُخسار ترے
آنکھ بھر کر کوئی دیکھے گا تو جل جائے گا
(احمد ندیم قاسمی)

بھئی BEAUTIFUL!۔ کیا شعر ہے۔ آہاہا۔!" زینت اپنے آپ کو روک نہ سکی۔

"واہ، واہ!" چھگن بھائی اپنے تکیہ کلام سے مجبور ہوکر بول اُٹھے۔

سونیا کو اس طرح گھِرے ہوئے اب بہت غصّہ آرہا تھا۔ وہ جھینپ بھی رہی تھی۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی اُسے احساس ہورہا تھا کہ تمام لوگ اُسے شِکار بنائے بیٹھے تھے۔ اُس نے ابرو اُٹھاکر اُس کی طرف چبھتی نگاہوں سے دیکھا۔ بھارتی اُس کے جذبات کو بخوبی بھانپ رہا تھا۔ اُس نے سونیا کی طرف بھرپور نظر سے دیکھا اور پھر اُس نے معمول کی طرح آنکھیں بند کرکے یہ شعر پڑھا ؎

اس دل میں ابھی اور بھی زخموں کی جگہ ہے
اَبرو کی کٹاری کو دو آب اور زیادہ (حسرت)

"ابرو کی کٹاری کو دو آب اور زیادہ!"۔ بھئی کیا سماں باندھ دیا ہے۔!" جگ موہن کرشن بول اُٹھا۔

"اجی کیا حقیقت پیش کی ہے!۔ واہ! واہ! واہ!"

چھگن بھائی تڑپ اُٹھے۔

"جواب نہیں تمہارا بھارتی!" مکل دادا نے جو ابھی تک خاموش تھے۔ آہستہ سے کہا۔

سونیا جیسے اندر ہی اندر پگھل رہی ہو۔ اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے اُبھرنے لگے۔ بھارتی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ؎

عَرَق کے قطرے نہیں دیکھتے ہیں اُس رُخ پر
ستارے دھوپ میں ہم دوپہر کو دیکھتے ہیں (ذوق)

اب تو واہ واہ کا ایک شور چاروں طرف بلند ہوگیا۔

بھئی بس!۔ اب توبہ میری!۔ بہت پِٹ گئے! بھارتی صاحب اب آپ اپنی شاعری کا دھارا کسی دوسری طرف موڑیں۔ سونیا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "مجھ کنیز پر عنایت ہوگی"

لیکن بھارتی جی مُوڈ میں تھے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُنہیں اس بات کا بھی خیال تھا کہ کہیں سونیا سچ مچ ناراض ہی نہ ہوجائے۔

"لیجیے، اب ایک آخری شعر اور عرض کروں گا۔ اُمید ہے آپ بخوشی اجازت دیں گی۔" اور پھر جواب کا انتظار کیے بنا بھارتی نے یہ شعر پڑھ دیا ؎

"ہاں تم کو بھول جانے کی کوشش کریں گے ہم
تم سے بھی ہوسکے تو نہ آنا خیال میں" (سیماب)

"ارے صاحب، توبہ میری! خیال کیا، میں تو آپ کے دو میل پاس سے بھی نہیں گزروں گی!"

سونیا نے ہاتھ جوڑ دیئے اور رینا اُس کو ساتھ لیکر آگے چل دی۔

اب ایک زور کا قہقہہ اُٹھا اور بیچارے بھارتی جی ٹھنڈے پسینے میں نہاگئے۔

"مکل دادا، لو بیئر پیو!" راج نے مکل دادا کے ہاتھ میں بیئر کا مگ پکڑاتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ قریبی میز پر اپنا مگ رکھ کر سگریٹ سُلگانے لگ گیا۔

بھئی تمہاری آج کی پارٹی بہت کامیاب ہے۔۔۔ بھارتی نے تو آج کمال کر دیا۔۔۔ اور سونیا کی موجودگی نے بھی آج پارٹی کو خوب گرما دیا۔!"

"دادا، تم نے اپنی نئی پکچر کی کاسٹ مکمل کر لی۔! پکچر تو راج ہی بنا رہا تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ اُس کا ڈائرکٹر مکل باسو اُسے اپنی ہی پکچر سمجھے۔

"ابھی نہیں! ہیرو کے لئے تو نیرج خوب رہے گا۔! ہیروئن کے لئے کوئی اچھا سا نیا چہرہ ڈھونڈ رہا ہوں!"

"میرے خیال میں ——"

"یہ سونیا کیسی رہے گی!"

FIGURE AND PROFILE تو بہت ہی اچھی ہے!

"میں سمجھتا ہوں۔ ہماری تلاش ختم ہو گئی ہے۔" مکل دادا نے پائپ جلاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہے بھی ہماری کہانی کی ہیروئن کے کردار کے مطابق۔"

"اگر تم چاہو تو بات کروں۔"

"ضرور" — مکل دادا نے پائپ کا کش لیتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں سر ہلا دیا —

۵

سونیا اور نیرج ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ نیرج کو سونیا کے ادا کئے ہوئے مکالمے بار بار یاد آ رہے تھے۔ آج سونیا کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا۔ لیکن سونیا کی اداکاری میں کسی نئی ہیروئن کی سی ذرا بھی جھجک نہ تھی۔ جیسے یہ اُس کا روزمرّہ کا معمول ہو۔ وہ کیمرے کے سامنے بھاری میک اپ کئے، لائٹوں میں نہائی، ذرا بھی نہ گھبرائی تھی۔ اُس نے کپکپاتے ہونٹوں سے، دل کی گہرائیوں سے اُسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پہلی بار یہ مکالمے ادا کئے تھے۔

"تم نہیں جانتے۔ میری پیاسی آتما کتنے یگوں سے تمہارے لئے بھٹک رہی ہے!"

اور سیٹ پر موجود ہر ایک شخص نے محسوس کیا تھا۔ جیسے سات آسمانوں کو چیرتی ہوئی اس آواز نے ہیرو کی محبت کے لئے ایک پُرخلوص اعتراف کیا ہو۔! اور جس میں یقین دلانے والی اداکاری کو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ یہ آواز سامعین کے دلوں کی گہرائیوں کو چھوتی چلی گئی۔

"تم کبھی رام رہے تو میں سیتا۔ تم کبھی کرشن بنے تو میں رادھا۔ تم اپنی سیتا اور رادھا کو آج تک نہیں پہچان سکے ہو!"

"سیتا" کہتے ہوئے سونیا کے چہرے پر سیتا کی سی معصومیت اور رادھا کا سا بھولا پن تھا۔ جیسے وہ سمجھ نہ رہی ہو کہ ایک رام سیتا کو کیوں کر ٹھکرا سکتا ہے۔ اور ایک کرشن رادھا سے کیونکر الگ رہ سکتا ہے۔ "کٹ" کہتے ہی ڈائرکٹر مکل دادا سیٹ کی طرف لپکے۔ اور اُنہوں نے سونیا کے بازوؤں کو جھلاتے ہوئے مبارکباد پیش کی۔ سیٹ پر حاضر دوسرے لوگوں نے مبارکبادی کا ایک تانتا باندھ دیا۔ سونیا فلمی دُنیا کے آسمان پر ایک نیا کامیاب روشن ستارہ بنکر چمکی تھی۔

نیرج نے اپنا ہاتھ ڈھیلا کر دیا۔ اُسی لمحے سونیا کی گرفت مضبوط ہو گئی جیسے اُسے سہارے کی سخت ضرورت تھی۔ سمندر میں موجوں کے ریلے چلے آ رہے تھے۔ ایک موج دوسری کو آغوش میں لیتی دبوچتی، جھاگ پر جھاگ پھیلاتی۔ اُن کے قدموں تک پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔ کبھی کبھی تو جھاگ بھرا دودھیہ پانی اُن کے پاؤں میں سے گزرتا دور تک نکل جاتا۔ سونیا کا آنچل تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ پانی کے قطرے اُس کے سیاہ بالوں میں موتیوں کی طرح لگے ہوئے تھے۔ نیرج کو وہ یوں دکھائی دی گویا وہ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں سے ایک جل پری نکل کر اُس کے پاس آ گئی ہو۔ وہ اُسے نہایت پیار سے پکڑ کر — ذرا دور ایک ریت کے ٹیلے پر لے گیا' اور وہ دونوں وہاں سے بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کرنے لگے۔

سمندر کی موجوں سے پرے آسمان کے سینے پر شام کی ارغوانی روشنی میں سے پھوٹتی ہوئی کرنیں سطح سمندر پر ایک عجیب جادو بکھیر رہی تھیں۔ اِس روشنی میں مچھیروں کی لوٹتی ہوئی کشتیوں کے پھڑپھڑاتے بادبان نہایت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ ایسے سین کئی بار نیرج کی فلموں میں فلمائے گئے تھے۔ لیکن نیرج کبھی حقیقی زندگی میں ایسے نظاروں سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اُسے اب بھی یہی گمان تھا کہ وہ اِس وقت بھی کسی تڑپتی ہوئی داستان کا ہی ایک حصّہ ہو۔ اور اُس کے بغل میں بیٹھی ہوئی سونیا بھی کسی فلمی کہانی سے ہی تعلّق رکھتی ہو۔ دراصل نیرج کے لئے یہ طے کرنا ہمیشہ سے ناممکن رہا تھا کہ حقیقی زندگی اور فلمی زندگی میں کیا فرق ہے۔ وہ تو ہمیشہ ہر کہانی کا زندہ کردار رہا تھا۔

اور پھر وہ نئی فلمائی جانے والی کہانی "نیلا آکاش"

بھی بے حد رومانٹک تھی۔ جب یہ کہانی اُس کے سامنے لائی گئی اور جب اُس نے اسے پڑھا اور ہر سین میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کی تو اُسے فوراً احساس ہوا تھا کہ اُسے یہ نیا کردار نبھانے میں معمولی سی دقت بھی نہ ہوگی۔ کہانی کے ہیرو کا ایک بیحد جذباتی کردار تھا۔ عملی اور ارادی طور پر کمزور۔ اور اُسے کہانی کی ہیروئن حیا کی حدوں میں رہتے ہوئے بھی جدھر چاہے کھینچ کر لیے جاتی ہے۔ فلم کی کامیابی کا دارو مدار ہیروئن کے کردار کو صحیح طور سے نبھانے پر تھا۔ وہ من ہی من میں مکل داد کی تعریف کئے بنا نہ رہ سکا۔ جن کی کردار شناس نگاہوں نے سونیا کا انتخاب کیا تھا۔ سونیا کی نسوانی شخصیت میں واقعی وہ دلفریب کشش تھی جو اُسے مقناطیس کی طرح کھینچ لیتی تھی۔ وہ سونیا کی طرف ایک نئی دلچسپی کے ساتھ دیکھنے لگ گیا۔ گویا وہ اُس کی رُوح کے اندر جھانک کر اپنی تسلی کر لینا چاہتا ہو

"آپ اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں ؟"

"نہیں۔"

"مجھے !۔۔ ایک اداکارہ بن کر مجھ میں کیا کوئی زیادہ فرق آ گیا ہے۔! میں تو وہی پُرانی سونیا ہوں۔ ہاں، مجھے بیحد خوشی ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے کا سوبھاگیہ مِلا ہے۔ میں کبھی سپنوں میں بھی اِس کی کلپنا نہیں کر سکتی تھی !۔ میں بے حد خوش ہوں !۔ اور پھر وہ نیرج کے اور قریب آ گئی۔ سمندر میں یکایک ایک شور ہوا۔ اور ایک بہت بڑی سی موج نہایت تیزی سے چھوٹی چھوٹی موجوں کو رَوندتی، مٹاتی، اُن کی طرف دوڑی دوڑی آئی اور ٹیلے کے بہت پاس سے اُن کے قدموں کو چھوتی، جھاگ بکھیرتی واپس لَوٹ گئی۔

"سونیا میں دیکھ رہا تھا کہ فلمی کہانی کی گوری اور سونیا میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ سونیا مجھے پُورا وِشواش ہو گیا ہے، کہ سونیا گوری کے رول میں بہت کامیاب ثابت ہوگی۔!"

"سچ۔ !۔ آپ کا آشیرواد چاہیئے۔!" اور پھر وہ کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد بولی !۔ ایک بات کہوں، آپ بُرا تو نہ مانینگے!"

"کہو !"

آپ مجھے اب سے گوری ہی کہکر پکارا کریں۔ میں آپ کو ہریش ہی کہوں گی۔ !کیوں ٹھیک ہے نا!" سونیا نے نیرج کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ جیسے تم چاہو۔ میں تو رول ملتے ہی کب کا ہریش بن چکا ہوں۔!"

"لو دیکھو!" اور سونیا گوری کی ہی طرح مٹکتی، کولھے ہلاتی اُٹھ کر چل دی۔ نیرج بیٹھا اُس کی ہلکتی چال سے متاثر ہو کر دیکھتا رہا۔ کچھ دُور جانے پر گوری نے واپس مُڑ کر نیرج کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں دعوت تھی اور پھر نیرج میں بسا ہوا ہریش جاگ اُٹھا۔ اور وہ اُس کے پیچھے لپک کر بھاگا۔ سونیا میں بسی ہوئی گوری اُس کے قریب آنے کا انتظار کرتی رہی۔ اور جونہی نیرج اُس کے قریب پہنچا گوری بھاگ کھڑی ہوئی اور پھر گوری اور ہریش کے قہقہے فضاؤں میں گونج اُٹھے۔

ایک جوان جوڑے کی ہنسی، لڑکی کا لڑکے کو بے معنی سا ٹھینگا دکھانا۔ لڑکے کا اُس کو پکڑنے کے لئے بھاگنا اور پھر کچھ ہی دیر میں لڑکی کا تھک کر اُس کی باہوں میں جھول جانا۔۔۔۔۔

ریت پر اُن دونوں کے ٹیڑھے ترچھے پاؤں کے نشانات، اُمڈتی ہوئی موجوں کا ساحل پر بکھر بکھر جانا۔ فضاؤں میں سنگیت، لوٹتی ہوئی موجوں کا اُن کے پاؤں کے نشانات کو مسخ کر دینا اور پھر بالکل مٹا دینا۔ ہواؤں کا ناریل کے پیڑوں میں سرگوشیاں کرنا۔ سورج کے تھال کا سمندر میں ڈوب جانا اور ہلکے ہلکے گہرے ہوتے اندھیروں میں دو نوجوان دھڑکتے ہوئے دِلوں کا ایک ہو جانا۔۔۔۔۔

یہ سب اُس فلمی رُومانوی کہانی "نیلا آکاش" کا ضروری حصّہ ہی تو ہے۔ جس کے کردار تھے گوری اور ہریش۔

۶

نینا گھر میں بیٹھی نئی میگزین الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسی فلمی پرچہ یا رسالہ ہو جس میں نیرج اور سونیا کی تصویریں یا اُن کا ذکر نہ ہو۔ اکثر پرچوں نے لکھا تھا۔ کہ نیرج اور سونیا کی نئی جوڑی اِس صدی کی بہترین دریافت ہے۔ اِس نئی رومانوی جوڑی نے فلمی دنیا میں ایک ہل چل مچا دی تھی۔ ایک بھونچال لا دیا تھا۔ راج کا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ اُن دونوں کو پبلسٹی دینے میں دن رات ایک کر رہا تھا۔ راج نے اِس نئی فلم کے چند حصّے دیکھنے کے بعد ہی اُن دونوں کو اپنی نئی تین فلموں کے لئے بک کر لیا تھا راج چاہتا کہ یہ نئی جوڑی خوب مشہور ہو، تاکہ اُس کی فلموں کی بکری زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ اِسی لئے عام فلمی پرچے

نیرج اور سونیا کی ملاقاتوں کی، پکنکوں کی، موقع پر شوٹنگ کی، نئی
نئی تصویروں اور پوزوں سے بھرے پڑے تھے۔ وہ کسی تقریب میں
اکٹھے دیکھے گئے، کس ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ کون سے
مہورت یا شادی میں موقع پر کیا کر رہے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی
تفصیلات بھی ہر پرچے میں چھپتیں، کسے کھانے میں کیا پسند تھا۔
کس نے کس وقت کون سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ فیشن میگزینیں
اور نسوانی پرچے ان تفصیلات کو چھاپنا باعثِ فخر سمجھتے۔ اور پھر کبھی
کبھی بے پر کی بھی اڑاتیں ۔۔۔۔ ایسی ایسی خبریں جو نینا کے دلی
سکون کو بھبکے سے اڑا دیتیں اور بار بار دل مسوس کر رہ جاتی۔
نینا کو کبھی کبھی یوں معلوم ہوتا گویا وہ نیرج کی بیوی نہ ہو کر نیرج اور
سونیا کی جوڑی میں ایک تیسری شخصیت ہو۔ یہ احساس اس کے
کلیجے پر سانپ بن کر لوٹتا۔

اگرچہ اس کا تعلق فلمی دنیا سے براہِ راست نہ تھا۔ لیکن
ایک مشہور فلمی ہیرو کی بیوی کے ناتے اسے فلمی دنیا کے طور طریقوں
کا علم ضرور تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس قسم کی پبلسٹی پروڈیوسر، ڈسٹری
بیوٹر اور فائننسر کے لئے کتنی ضروری ہوتی ہے۔ ایسی پبلسٹی سے
فلموں کی فلم سے متعلقہ تمام لوگوں کی ساکھ کیونکر بڑھتی تھی حتیٰ کہ
خود ہیرو اور ہیروئن کے شوہر کو چکانی پڑتی تھی۔ زخمی دل کو لئے مسکرا
کر خون کے آنسو پی کر، لبوں پر مہرِ خاموشی لگا کر۔ کبھی کبھار کوئی فوٹو
گرافر غلطی سے اپنی تصویریں، ہیرو کی پتنی یا ہیروئن کے پتی کو بھی
شامل کر لیتا۔ لیکن شاذ و نادر ایسی تصویریں کور کی زینت نہ بنتیں،
بلکہ کسی رسالے کے کسی اندر کے صفحے پر کسی کونے میں چھپتیں، جیسے وہ
ہیرو یا ہیروئن کی شخصیت پر بدنما داغ ہو۔ جس پر لوگوں کی نظر
نہ پڑنی چاہئے۔ لوگوں کو ہیرو کی بیوی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ
ہیرو کی محبوبہ کو زیادہ چاہتے تھے۔ چاہے محبوبہ بیوی سے کہیں بدصورت
بد ذوق کیوں نہ ہو۔ بیوی سے محبت کوئی خاص بات نہ تھی۔
کھلے عام خم ٹھونک کر محبوبہ کا ذکر کرنے میں مردانگی بھی تھی ۔۔۔
مردانگی ۔۔ اونہہ!

نینا میگزینوں کے صفحے الٹ رہی تھی۔ ہنستا نیرج!
مسکراتا نیرج! شیر کی کھوپڑی پر پاؤں رکھے ہاتھ میں
بندوق پکڑے ہوئے نیرج! واہ صاحب واہ! آج تک
جنگل تو جنگل درختوں کے جھنڈ کے پاس تک بھی نہیں گئے
ہوں گے ۔۔۔ نیرج مہاشے! لیکن یہ تو پبلسٹی کے چمتکار تھے۔
اور اس تصویر میں نیرج نے وہی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جو وہ بنگلور
سے لائی تھی اس کے لئے پچھلے دنوں۔! وہ تصویر کو غور سے
دیکھنے لگی۔ اور پھر اگلے صفحے پر سونیا کی تصویر تھی۔ تصویر میں اس
کے جسم کی نمائش پر زور دیا گیا تھا۔ وہ سونیا سے کسی طرح ناراض نہ
تھی۔ وہ اس کے بچپن کی سہیلی تھی۔ اگرچہ اس وقت کون کہہ سکتا تھا۔
کہ وہ ایک دن فلموں میں ہیروئن بنے گی اور اس کا تذکرہ ہر اخبار،
اور ہر رسالے میں ہوگا۔! اور پھر ایک طرح سے وہ خود اور نیرج
ہی تو ذمہ دار تھے۔ اس کے ہیروئن بننے کے لئے وہ بھی تو اسے نیرج
کی پارٹی میں لے گئے تھے۔ جہاں سکل دادانی نے اسے دیکھا اور اسے
ہیروئن کا چانس ملا۔ وہ خوش تھی کہ سونیا کی کامیابی میں ان
دونوں کا ہاتھ بھی تھا۔ لیکن جب سے اس نے سنا کہ راج اسے نیرج
کے مقابل ہر فلم میں لانا چاہتا ہے تو اسے اچنبھا لگا۔ وہ نیرج کو اس
طرح سے سونیا کے ساتھ بانٹنا نہیں چاہتی تھی۔ اور اب تو سونیا
اور نیرج کی باقاعدہ پبلسٹی شروع ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اسے
نیرج پر اپنی گرفت ڈھیلی معلوم ہونے لگی۔

یہ دوسری بات تھی کہ نیرج کی اس کے لئے محبت اور گرم
جوشی میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ نیرج ابھی بھی معمول کی طرح اسے
آتے ہی گلے لگا لیتا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس اس کے جسم کو ٹٹولتا
رہتا۔ اس کے کان اس کی آواز سننے کے منتظر رہتے۔ اس کے طور
طریقوں میں اسے خوش کرنے اور رجھانے کی نمایاں کوششیں
ہوتیں۔ عورت ان تمام باتوں سے مرد کی محبت کا عام طور سے
صحیح اندازہ لگا سکتی ہے۔ اسے تسلی تھی کہ نیرج اب بھی وہی
نیرج تھا۔ لیکن شکوک کا ناگ پھن اٹھائے اس کے دل میں
کنڈلی مارے بیٹھا رہتا۔

سونیا کا ان کے گھر آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ شاید سونیا کی
اپنی ہی مصروفیات تھیں۔ اس کی اپنی زندگی اپنی مصروفیات کے
گرد گھومنے لگی تھی۔ شوٹنگ، ریہرسل، ڈائرکٹر، پروڈیوسروں کا آنا،
اس کے وقت کے بہت بڑے حصے کے حقدار بنتے تھے۔ لیکن
جب بھی مہینے دو مہینے میں ان کے گھر آتی تو ایسا لگتا جیسے

ہر بہار آگئی ہو۔ نیرج کے ساتھ ہنسی مذاق، پہلے ہی کی طرح سے نوک جھونک چلتی رہتی۔ نینا بھی اپنا درد بھول کر اُن کی باتوں سے لطف اندوز ہوتی۔ دراصل وہ سونیا سے غصّہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ شاید کسی سے بھی اِس طرح ناراض ہونا اُس کی فطرت میں شامل نہ تھا۔ سونیا اُس کے سامنے پڑوس والی وہی معمولی سی لڑکی تھی۔ اور پھر سچ بات تو یہ تھی کہ سونیا نے کبھی کسی حرکت یا اشارے یا کنائے سے اُسے محسوس ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی ہیروئن یا ایکٹریس تھی۔ وہ عموماً خوبصورت لیکن سادہ کپڑوں میں ہی اُن کے گھر آتی۔ اُس کی بات چیت، بول چال میں وہی اپنا پن تھا جو ایک کم عمر سہیلی کا اپنے سے ذرا بڑے مرتبہ والی سہیلی کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ اب بھی وہ اگر نینا کو کچھ بھی کام کرتے دیکھتی تو اپنی ساڑھی کو کمر کے گرد کستی ہوئی، مدد کرنے کی نیّت سے جُٹ جاتی۔

نینا دیدی! بس بس۔ کچھ سونیا کے لیئے بھی کام رہنے دے۔ ورنہ وہ بالکل بے کار ہو جائے گی۔" اور پھر وہ کسی قسم کے جواب کا انتظار کئے بغیر، ہر گھریلو کام میں حصّہ بٹانے کیلئے کود پڑتی۔ نینا اُس کی طرف دیکھتی رہ جاتی۔

"اری بابا! اگر تمہارے Fame نے تمہیں اِس حالت میں دیکھ لیا، تو تیری فلمی دنیا کی ساری ساکھ دھری دھرائی رہ جائے گی۔"

" دیدی! اب تم سے اور نیرج جی سے بڑے Fame اور کون ہو سکتے ہیں۔! مجھے اور کسی کی پروا نہیں۔!"

کس قدر عزت کرتی تھی وہ اُن دونوں کی۔!۔ وہ ایسی لڑکی پر کیسے الزام لگا سکتی تھی کہ وہ دھیرے دھیرے اُس کے پتی کو اُس سے چھین رہی ہے۔ شاید یہ اُس کا وہم تھا، گمان تھا۔ اِس حسد اور رشک کے جذبے میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ لیکن یہ میگزینوں میں چھپی ہوئی اُن دونوں کی تصویریں، یہ آرٹیکل، یہ کانا پھوسی، یہ چہ میگوئیاں!۔ جہاں دھواں ہوتا ہے، وہاں چنگاری کا ہونا لازمی تھا!"

اُسے یوں جان پڑتا جیسے وہ دوسروں کی نگاہوں میں خود گرتی جا رہی ہو۔ اُس کی اپنی اہمیت کم ہو گئی ہو۔۔۔

لوگ دبی زبان سے اُس کی ہنسی اُڑاتے ہوں، اُس پر پھبتیاں کستے ہوں۔ یا پھر ترس کھاتے ہوں۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے۔ کس طرح سے سونیا سے کہے اور کہے بھی تو کیا کہے۔:

وہ نیرج سے کہے؟۔ اور پھر اُس نے نیرج سے کہنے کا فیصلہ کر لیا۔

رات کا کھانا ختم ہو چکا تھا۔ نیرج نے ریڈیو گرام پر اُسی شام لائے ہوئے ریکارڈ لگا دیئے تھے۔ یہ اُس نئی فلم کے اسٹوڈیو ریکارڈ تھے جس میں وہ اور سونیا پارٹ کر رہے تھے۔ فلم کی شوٹنگ تیزی سے جاری تھی اور اگلے دو تین دِنوں میں ہی اِس گانے کی شوٹنگ ہونے والی تھی۔ یہ ایک دوگانا تھا۔۔ نہایت رومانی، فلمی دنیا کے مشہور میوزک ڈائریکٹر ونود ماتھر نے کوی دنیش کے سحر انگیز گیت کی دھن تیار کی تھی اور جسے مشہور پلے بیک سنگر مایا منگیشکر اور فصیح نے دِل کی گہرائیوں کو اپنی آواز میں سمویا تھا۔ نیرج اِس گیت کو تیسری بار سُن رہا تھا۔ شاید وہ خیالوں میں سوچ رہا تھا کہ اُسے اور سونیا کو یہ گیت فلم میں کس طرح سے پیش کرنا چاہیئے۔ تاکہ سامعین اِس سین کو کبھی بھلا نہ سکیں اور اِس کا پرچا فلمی دنیا کی تاریخ کا ایک ضروری حصّہ ہو جائے۔ دراصل یہ گیت تھا بھی بہت ہی خوبصورت!۔ بول کے ساتھ ساتھ ونود ماتھر نے اِس کی دھن بنانے میں اپنے نام اور مقبولیت کی پوری بازی لگا دی تھی۔

" یہ دوگانا تم اور سونیا گا رہے ہو، اِس نئی فلم میں۔!"

نینا نے پوچھا۔

" نہیں بھئی، مایا اور فصیح۔!

وہ تو میں جانتی ہوں۔ لیکن فلم میں تو تمہارے اور سونیا کے ہی ہونٹ ہلیں گے نا!" اور پھر قدرے وقفہ کے بعد کہا۔ "گانا بڑا ہی رومانٹک ہے۔!"

"اوہ۔ پھر ہم تم ہی گا لیتے ہیں۔"

نیرج نے شرارت سے کہا۔

نینا مسکرا دی۔

" اچھے گانے اور کہانی کا یہی تو وصف ہے کہ وہ دیکھنے اور سُننے والے کو اِس حد تک محسوس کرا دے کہ وہ

یہ سمجھے کہ یہ سب کچھ اُنہی پر ہی بیت رہی ہے۔ جذبات اِس قدر
اُس پر طاری ہو جائیں کہ وہ اپنے آپ کو بھُول کر کرداروں
میں سما جائے ۔!"

"یہ تو ٹھیک ہی ہے ۔!"

"لیکن اِس سے کہیں پہلے اداکاروں کیلئے ضروری ہو جاتا ہے
کہ وہ اپنی شخصیّت کو بھُول کر خود اپنے کرداروں کا ذہنی اور جذباتی
چولا پہن لیں۔"

"ہاں، یہ تو میں آپ کے اور سونیا کے بارے میں دیکھ ہی رہی
ہوں!، آپ دونوں تو اپنی شخصیّت کبھی سے بھُول چکی ہیں۔ اُس
کے لہجے میں ایک چبھتا ہوا تیکھا پن تھا جسے نیرج محسوس کئے بنا نہ رہ سکا۔

"بینا یہ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ سب تمہارا وہم ہے۔ ایک
اداکار بہت مجبور انسان ہے ۔!، اُسے روز ناٹک رچنا پڑتا ہے،
جھُوٹ بولنا اور جینا پڑتا ہے۔ تاکہ دیکھنے والے یقین کر سکیں کہ وہ
جو کچھ دیکھ رہے ہیں۔ وہ بالکل سچ ہے ۔"

"لیکن ایسے جھُوٹ اور سچ میں تھوڑی سی دیوار تو ہونی
چاہیئے۔ تاکہ دوسروں کے کلیجے چھلنی نہ ہوں!"

"بینا اگر یہ دیوار رہ گئی تو وہ ایک اداکار کی اداکاری پر دھبّہ
ہے۔ وہ اداکار یقینی طور پر اپنے آرٹ میں کامیاب نہیں!"

"جہاں آرٹ کی جیت ہوتی ہے۔ وہیں سے زندگی کی ہار
شروع ہو جاتی ہے ۔"

"بینا یہ تو سمجھنے کی بات ہے۔ تم نے ایک آرٹسٹ سے شادی
کی ہے۔ تمہیں آرٹ اور اُس کی ضروریات کو سمجھنا ہوگا۔ تم یہ کیوں
نہیں سمجھتیں کہ نیرج سونیا سے پیار نہیں کرتا بلکہ ایک ہرنیش ایک
گوری سے پیار کرتا ہے۔"

"اِس لئے کہ میں نہیں جانتی کہ آرٹ کہاں ختم ہوتا ہے اور زندگی
کہاں سے شروع ہوتی ہے!"

"میں بتاؤں زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے ۔!" اُس نے
شرارت بھری نگاہوں سے بینا کی طرف دیکھا۔ اور پھر اُس کی کمر
کے گرد اُس کے ہاتھوں کا حلقہ تنگ ہوتا گیا۔

نیرج نے ریڈیو گرام پر دھنوں کا ریکارڈ ایک بار پھر لگا دیا۔
ہرنیش اور گوری دھیرے دھیرے نیرج اور بینا کا روپ لیتے گئے۔

"رات کے مہکتے ہوئے اندھیرے میں بھی بینا اپنے دل میں
ایک خوشی اور لبوں پر تھرکتی مسکراہٹ محسوس کر رہی تھی۔

۷

جہاں جہاں بھی "نیلا آکاش" ریلیز ہوئی تھی۔ فلم نے باکس
آفس کے تمام ریکارڈ قائم کر دیئے تھے۔ اُس کی کامیابی میں پرسی پبلسٹی
کو دخل تو تھا ہی، لیکن تماشائیوں نے نیرج اور سونیا کے نئے رُومانی جوڑے
کا بڑے اُتساہ سے سواگت کیا گیا تھا۔ وہ پبلسٹی کے اس نعرے کو کہ یہ جوڑی
صدی کی بہترین دریافت تھی۔ بغیر کسی مبالغے کے سچ ماننے پر مجبور ہو گئے
تھے۔ نیرج اور سونیا کی اداکاری سے ہرنش اور گوری ہی کے کرداروں کو زندہ
کر دیا تھا۔ دراصل اسے اداکاری کہنا ہی مبالغہ تھا۔ بھلا حقیقت کہیں
جھُٹلائی جا سکتی ہے ۔!۔ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کو ہرنش
اور گوری ہی کہنے لگ گئے تھے۔ اِس لئے محبّت کا ان کے علاوہ شاید ہی
کوئی دوسرا معیار ہو سکتا تھا ۔!، اور پھر اِس کے علاوہ ونود ماتھر کا
سنگیت، دنیش کے گانے۔ پھر مایا، نگیشکر اور فصیح کی سُریلی آوازیں ۔!
مکل باسو نے ایک بار پھر ثابت کر دیا تھا کہ فلم بنانے اور اُسے ڈائرکٹ
کرنے میں شاید ہی اُن سے کوئی بازی لے جا سکے۔ ایک ایک سین کی
کمپوزیشن۔ کیمرے کے انوکھے زاویئے ۔ کلوز اپ اور ایڈیٹنگ ۔ غرضیکہ
ہر چیز پر مکل دادا کی اعلیٰ ہدایت کاری کی مہر تھی۔ اور پھر وہ جس طرح
سے کسی گمنام چہرے سے بہترین اداکاری کروا لیتے، یہ اُن ہی کا خاص
حصّہ تھا۔ اور اِس سلسلے میں گمنام سونیا اِس حیرت انگیز کامیابی
کی ایک اور سند سے کم نہ تھی۔

نیرج بھی بے حد خوش تھا۔ کوئی بھی پروڈیوسر فلم کے کامیاب
ہونے پر خوش تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن یہ خیال کہ سونیا جیسی اداکار
کو ڈھونڈنے میں اُس کا بھی حصّہ تھا۔ اُس کے لئے ذاتی خوشی کا
خاص سبب تھا۔ بمبئی میں فلم کے پریمیئر سونیا اور نیرج فلم کی ساری
ٹیم کے ساتھ تو موجود تھے ہی، لیکن اب جگہ جگہ سے ڈسٹری بیوٹر
مانگ کر رہے تھے، کہ سونیا اور نیرج کو اُن کے شہروں میں ریلیز کے
وقت، نہ سہی تو اُس کے بعد بھی دو تین شو میں ذاتی طور پر حصّہ لینے
کے لئے ضرور بھیجا جائے۔ پبلک اِس نئی رُومانی جوڑی کو دیکھنے
کے لئے بے حد بے قرار تھی۔

سونیا اور نیرج جہاں بھی گئے۔ لوگوں نے انہیں ہاتھوں

ا۔ سینما گھروں میں ان کے خاص شو کی ٹکٹوں کے لئے چوبیس ۲۴ چوبیس گھنٹے پہلے قطاریں لگنی شروع ہوگئی تھیں۔ ان کے شو کی ٹکٹیں بلیک میں دُگنے تگنے داموں پر بکیں۔ لوگ اُن کی جھلک دیکھنے کے لئے گھنٹوں منتظر رہتے۔ جن ہوٹلوں میں اُن کا قیام ہوتا وہاں اکثر پولیس کے پہرے کی ضرورت ہوتی۔ درجنوں بار اُن کی کار کا گھیراؤ ہوا۔ ایک آدھ بار تو تماشائیوں کے ہجوم نے اُن کی کار پر حملہ سا کردیا۔ اور جس میں نیرج کو سونیا کا بچاؤ کرنا پڑا۔ اور اس بچاؤ میں بھی سونیا کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ سونیا اُس دن سے ایسے ہجوموں سے کافی خوفزدہ رہنے لگی تھی۔ لیکن نیرج کی رفاقت اُس کے لئے باعثِ تسلی تھی، وہ نیرج کے ساتھ کہیں بھی جاسکتی تھی۔

اِس دَور میں سونیا اور نیرج کو ایک دوسرے کے پاس رہنے اور قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ اُن دونوں کے کمرے اکثر ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ہوٹل کے ڈائننگ رُوم میں تو جانے کا سوال ہی کہاں اُٹھتا تھا۔ کھانا اُن کے کمروں میں ہی پہنچادیا جاتا۔ کبھی سونیا نیرج کے کمرے میں کھانے کے وقت پہنچ جاتی۔ اور کبھی نیرج سونیا کے کمرے میں۔ دونوں اپنی کامیابی سے بہت خوش تھے۔

سونیا ذہنی طور پر نیرج کے بہت قریب تھی۔ نیرج بہت ذہین تھا۔ اور اُس کا مطالعہ وسیع۔ سونیا کا بہت سا وقت لائبریری میں گزرا تھا۔ اُس نے بھی تقریباً ہر موضوع کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ اگرچہ نیرج کے مقابلے میں اُس کا مطالعہ اِتنا وسیع نہ تھا۔ لیکن سونیا ہر موضوع پر بخوبی بات چیت کرسکتی تھی۔ وہ بات چیت میں نکلے ہوئے پہلوؤں پر مزید واقفیت حاصل کرنا چاہتی ـــــ اور نیرج اُسے گھنٹوں نئے نئے نکتے سمجھاتا رہتا۔ کبھی کبھی سونیا جان بُوجھ کر بحث میں اُلجھتی۔ اُسے نیرج کو ستانے میں مزا آتا تھا۔ نیرج کو یہ سب اچھا لگتا۔ وہ ایک مٹّی کی گم سُم مُورت کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

اِس کے برخلاف نینا میں گُنوں کی کمی نہ تھی۔ اُس کی محبّت اور خلوص میں ایک سچّائی تھی۔ ایک شرمیلا بانکپن۔ وہ نیرج کو اپنا خُدا مانتی۔ اُس کی ہر بات کو ماننا اپنا اوّلین فرض سمجھتی۔ وہ اُس کے لئے اپنا سب کچھ تیاگ سکتی تھی۔ نیرج بھی اُس سے بہت محبّت کر[illegible]۔ اُسکے اِن گُنوں کی قدر کرتا۔

نینا نے کبھی اُس سے اُس کی زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ جیسے اُسے نیرج پر پُورا بھروسہ ہو، اعتماد ہو۔ اُس نے فلمی دنیا کی کش مکش، زندگی میں ہمیشہ نیرج کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ اُس نے گھریلو مسئلوں کو ہمیشہ خود نپٹایا تھا۔ تاکہ نیرج اپنی تمام تر صلاحیتیں اپنے آرٹ میں صرف کرسکے۔ وہ تو صرف پجارن تھی۔ نیرج کی اُس کی کلا کی۔ خاموش سُورج کی طرح روشنی کی کرنیں لُٹاتی ہوئی، نشکام، بے لوث!

اب جبکہ سونیا، نیرج کی زندگی میں آگئی تو اُسے انجانے میں احساس ہوا کہ وہ زندگی کے ایک پہلو سے ابھی تک محروم رہا تھا۔ وہ تھی شوخی، شرارت، گدگدانے والی مُسکراہٹیں۔ وہ سونیا میں ایک اچھے دوست اور ساتھی کو پاکر خوش تھا۔ لیکن وہ کبھی بھی نینا کا بدل نہیں ہوسکتی تھی۔ نینا کی اپنی جگہ تھی۔ بہت اُونچی پرستش کے قابل۔ پیار اور اُمڈتے پریم سے بھرپور۔ نیرج کو اِس کا پُورا احساس تھا۔

اِس لئے وہ سونیا کے قریب رہتے ہوئے بھی اُس سے دُور تھا۔ سونیا نے کئی بار اُس کے زیادہ نزدیک آنے کی کوشش کی۔ لیکن اُسے ہمیشہ ایسا لگا جیسے نیرج نے کہیں کوئی لکشمن ریکھا کھینچ رکھی تھی جسے وہ پار نہ کرسکتی ہو۔ سونیا محسوس کرنے لگی تھی جیسے اُس کی اپنی ذات میں کوئی کمی ہو، جس کی وجہ سے وہ نیرج پر وِجے نہیں پا سکتی تھی۔

یہ احساس اُس میں بڑھتا ہی جاتا۔ فلمی دُنیا میں آنے کے بعد اُس نے ہمیشہ دوسروں کو ٹھکرایا تھا۔ وہ خود کبھی ٹھکرائی نہیں گئی تھی۔

اُس نے اِس دَور میں بھی نیرج کے قریب آنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اُس کی نسوانیت کو ہار ماننی پڑی۔ وہ اب بھی جب کبھی اُسے ہریش بنانا چاہتی تو اُسے احساس ہوتا کہ نیرج اب اُسے گوری ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ فلم کے ختم ہوتے ہی جیسے نیرج ہریش کی شخصیت کو بھُول گیا تھا۔ وہ ایکبار پھر نیرج تھا۔ اور وہ سونیا، ایک دوست، ایک ساتھی، اور بس!"

سونیا اور نیرج کا یہ دَورہ بہت کامیاب ثابت ہوا تھا۔ ابھی اُنہیں دو چار جگہوں پر اور بھی جانا تھا کہ راج کے تار پر تار آنے لگے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اِس نئی جوڑی کو لیکر

جلد سے جلد اور فلمیں تیار کرے اور ان کے موجودہ دورے کی پبلسٹی کا
زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ نیرج اور سونیا دونوں اس دورے
کے بعد بہت تھک گئے تھے۔ نیرج کا ارادہ تھا کہ وہ اور سونیا دس پندرہ
روز کے لئے کسی گمنام سی جگہ پر آرام کے لئے جائیں گے۔ تاکہ وہ اس کے
بعد پھر پوری لگن سے دوبارہ کام کر سکے۔ سونیا تو پھر بھی تیار تھی۔
لیکن نیرج بضد تھا۔

راج کا کہنا تھا کہ اُس نے ایک بہت ہی اچھی کہانی اس نئی فلم
کے لئے چن رکھی تھی۔ وہ اور مکل دادا اُسے جلد سے جلد فلمانا چاہتے
تھے۔ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ صرف اُن دونوں کا انتظار
تھا۔ فلم کا نام بھی بہت رومانٹک رکھا گیا تھا۔ "سہانے سپنے"۔

" ارے تم اس کہانی میں ہیرو کے کردار کو دیکھو گے، تو
پھڑک اٹھو گے"۔ راج نے صبح سویرے ہی نیرج سے ٹرنک کال
پر بات کرتے ہوئے کہا۔ "یقین مانو یہ کردار کسی بھی اچھے اداکار کے لئے
چیلنج ہے۔" راج نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ اُسے یقین
تھا۔ کہ نیرج جیسا اداکار چیلنج کے نام پر پیچھے ہٹنے کے بجائے فوراً میدان
میں کودنے کی کوشش کرے گا۔

" راج، یار اگر یہ بات ہے تو تم مہورت کی تاریخ نکلوا لو۔
میں وہاں موجود ہوں گا۔ راج کا حربہ کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے
کل رات ہی پنڈت جی سے پوچھا تھا۔ وہ دس تاریخ کے لئے کہہ
رہے ہیں۔ !تمہیں اور سونیا کو تو کوئی اعتراض نہیں۔ نیرج
نے سونیا کی طرف دیکھا۔ اُسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ نیرج نے مہورت
کی تاریخ کے اعداد کو دل ہی دل میں جوڑا۔ آخری شمار پانچ آ رہا
تھا۔ اگرچہ یہ ہندسہ نیرج کے حق میں بہت اچھا تو نہ تھا۔ لیکن،
اس قدر برا بھی نہ تھا۔ نیرج کو علم ہندسہ (NUMERO-
LOGY) پر بہت وشواش تھا۔ اُس کا محبوب ترین ہندسہ ایک تھا۔

" بھئی اگر مہورت کے لئے ۱۵ تاریخ رکھو تو کیسا رہے گا۔"

" بھئی پندرہ بہت دور ہے۔ اور پنڈت جی اس کے
لئے ہی زور دے رہے ہیں۔"

" چلو دس سہی۔ پندرہ ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔"

" ہاں تو دس طے رہا۔ اور ٹیلی فون کٹ گیا۔

۸

" شام کے آٹھ بج رہے تھے اور سونیا ابھی نہا ہی رہی تھی
نیرج نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام کو ٹھیک آٹھ بجے اُس کے فلیٹ
پر پہنچ جائے گا۔ سونیا چاہتی تھی کہ نیرج کو کسی طرح سے دیر ہو جائے۔
تاکہ وہ اُس کے آنے سے پہلے ہی تیار ہو سکے۔ "سہانے سپنے" کی دو
مہینہ مسلسل شوٹنگ کے بعد آج قدرے فرصت کا موقع ملا تھا۔
راج اور مکل دادا نے شوٹنگ کا پروگرام اس طرح سے بنا رکھا تھا،
کہ جہاں تک ہو سکے وقت بالکل ضائع نہ ہو۔ فلم کی شوٹنگ ابھی
تک تین مختلف اسٹوڈیوز میں ہو چکی تھی۔ ہر اسٹوڈیو میں ایک
علیحدہ سیٹ بنا ہوا تھا۔ اور شوٹنگ کی تاریخیں اس طرح سے
رکھی گئی تھیں کہ ایک سیٹ کی شوٹنگ کے دوران دوسرے اسٹوڈیو
میں نیا سیٹ تیار ہو جاتا اور اس طرح سے وقت ضائع ہوئے
بنا شوٹنگ کا تسلسل قائم رہتا۔ اتفاق سے نئے سیٹ کے تیار
ہونے میں غیر متوقع طور پر دیر ہو گئی تھی اور اس طرح سے مجبوراً
دو دن کے لئے شوٹنگ روک دینی پڑی تھی۔ سارے اسٹاف
نے خوش ہو کر چین کا سانس لیا تھا۔

شوٹنگ یوں بھی کہانی کے ایک ایسے موڑ پر جا رکی تھی،
جو کہ کہانی کے لئے بہت ہی اہم تھا۔ مکل دادا کا خیال تھا کہ یہ مختصر
سا وقفہ ہیرو اور ہیروئن کو نئے موڈ میں لانے میں کامیاب ہو سکتا
ہے۔ اس لئے بھی کہ اس شوٹنگ کا تسلسل نہ ٹوٹے۔ اُس کے نزدیک
اُلٹا کہانی کے ماحول اور موڈ بگڑنے کا اندیشہ تھا۔

" سہانے سپنے" کی کہانی اور اسکرین پلے رنگین بھارتی نے
لکھا تھا۔ راج کے ہاں والی کم ایز آر یو (COME AS YOU
ARE) پارٹی کے بعد سونیا کو بھارتی سے دوبارہ ملنے کا گمان
تک بھی نہ تھا۔ وہ تو خیالوں کے بجائے دو میل پاس سے بھی نہ گزرنے
کا فیصلہ سنا چکی تھی۔ لیکن تب اُسے کہاں پتہ تھا کہ وہ عنقریب ہی
فلمی دنیا سے منسلک ہو جائے گی۔

لیکن اس میں کسی کو بھی شک نہ تھا کہ "سہانے سپنے" کی
کہانی ایک بالکل نئے انداز کی کہانی تھی اور اس کے ہیرو اور ہیروئن
کے کرداروں کو اداکاری کے جوہر دکھانے کے کئی مواقع تھے۔ سونیا
اور نیرج نے بھی کہانی کی کئی سچویشنز کو بہت پسند کیا تھا۔
سونیا کے دو ایک سجھاؤ کو تو بھارتی بھی ماننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اور اُس نے سونیا کی فرمائش کے مطابق ہی ان سینوں کو پھر سے لکھا تھا۔ ان سینوں کے آنے کی وجہ سے کہانی کی نشو ونما اور بھی نکھر آئی تھی۔ تمکنت داداء نے ان مصاحبوں کی بہت تعریف کی تھی۔

معمول کی طرح اب کی بار بھی سونیا نے نیرج کے سامنے ایک دوسرے کو فلمی ناموں سے ہی بلانے کی فرمائش کی تھی اور اسی لئے وہ ایک دوسرے کے لئے نیشتی اور منوج بن گئے تھے۔

باتھ رُوم میں بھی سونیا کے کان باہر کی کال بیل کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔ لیکن اُس کی نگاہیں ہلکی نیلی ٹائیلوں میں لگے ہوئے آئینہ پر جمی تھیں۔ جس میں سے اُس کے تراشے ہوئے جسم کے خموں پر سے پھسلتی ہوئی بوندوں کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔ بھری بھری کٹوراں جیسی چھاتیاں، پتلی سی کمر اور بھرے بھرے کولھے۔ ایک عجیب قوسوں اور خموں کا امتزاج۔ اور ان پر بوند بوند رکتا، پھسلتا پانی۔ سونیا نے یہ جسم آئینے میں پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔ لیکن آج اُس کی رعنائیاں جیسے ایک عجیب رنگ لا رہی ہوں۔ اُس کے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا اور پھر وہ اس خیال کی شدّت سے جیسے خود بخود شرما گئی ہو۔ سارے باتھ رُوم میں ایک بھینی بھینی خوشبو تھی۔ اُس نے یوڈی کلون کے پانی سے اشنان کیا تھا۔ وہ باتھ سیٹ پر کھڑی ہو گئی اور تولئے سے جسم پونچھنے لگی۔ جسم سُکھانے کے بعد جب اُس نے پاؤڈر لگا کر کپڑے پہننے چاہے تو اُسے یک دم احساس ہوا کہ وہ الماری میں سے کپڑے نکالنا بھول ہی گئی تھی۔ اُس نے آج نوکرانی کی شام سے ہی چھٹی کر دی تھی۔ کمرے میں خود جانے کے سوائے کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔ اُس نے باتھ رُوم کا دروازہ کھول کر باہر سر نکالا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہ جھجکتے جھجکتے باہر نکل آئی۔ اور پھر وہ اپنی بے وقوفی پر ہنس پڑی۔ باہر کا دروازہ تو اندر سے بند تھا۔ اور اُس کے کھولے بغیر کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ ایسے تھوڑی سی نڈر ہو کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومنے لگی۔ اُس نے ریڈیو گرام پر ہلکے ہلکے نار کنسرا کے ریکارڈ لگا دیئے۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کی پلیٹیں لگی تھیں۔ اُس نے گلدان میں لگے ہوئے پھولوں کی ترتیب کو تھوڑا سا سنوارا۔ ہاٹ کیس کھولا اور اُس میں لگے ہوئے کھانے کو دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئی۔ اتنے میں اچانک کال بیل (CALL BELL) بجی اور اُسے

یکایک احساس ہوا کہ وہ جس مقصد سے کمرے میں آئی تھی وہ تو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ اُس نے ابھی تک کپڑے الماری سے نہ نکالے تھے۔ اور وہ کمرے میں بالکل برہنہ پھر رہی تھی۔

وہ لپک کر الماری کی طرف گئی۔ اُس نے جلدی سے باڈی، بلاؤز، پیٹی کوٹ اور ساڑھی نکالی۔ کال بیل پھر بج اُٹھی۔ اُسے کپڑے پہننے میں دیر لگ گی اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ باہر نیرج مایوس ہو کر واپس چلا جائے۔ اُس نے وہیں سے آواز دی۔ نیرج جی ذرا دو منٹ ٹھہریئے گا!"

اُس نے کپڑے وہیں چھوڑ کر جلدی سے ڈریسنگ گاؤن پہن لیا اور پھر بالوں کو تھوڑا سنوارتی دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھی۔ وہ ڈریسنگ گاؤن کے نیچے بالکل برہنہ تھی، اور اُسے یہ احساس بُری طرح سے ستا رہا تھا۔ اُس نے ایڑیاں اُٹھا کر دروازہ کھول دیا۔

"بھئی! میں تو سمجھا کہ تمہارا ارادہ مجھے ساری رات باہر ہی کھڑے کرنے کا تھا۔!" اور پھر وہ سونیا کو ڈریسنگ گاؤن پہنے دیکھ کر کہتے کہتے رُک گیا۔ "اوہ! آئی ایم سوری!"

"آیئے آیئے نیرج جی۔" اور وہ نیرج کو ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے آئی۔ "میں ابھی ابھی باتھ رُوم سے نکلی ہی تھی۔ نوکرانی کی آج شام کی چھٹی تھی اِس لئے۔"

"آپ کو خود ہی دروازہ کھولنے کے لئے آنا پڑا۔!"

"جی نہیں۔ جی ہاں!" وہ نروس سی ہو رہی تھی۔ "نینا کہاں ہے۔؟"

"ھیکے! کل اُن کے بھائی پونہ سے آئے تھے۔ وہ ماں سے ملوانے اُسے دو ایک روز کے لئے لے گئے ہیں۔!"

"تو آج کل آپ بالکل فری ہیں!" سونیا کا اعتماد جیسے واپس لوٹ رہا ہو۔

"ہاں کسی قدر!"

سونیا چلتے چلتے اچانک رُک گئی۔ نیرج نے بھی رُکنا چاہا۔ لیکن اچانک جیسے سونیا اُس کی باہوں میں آ گئی۔ "اوہ! آئی ایم سوری!" سونیا کے جسم سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی یوڈی کلون کی سینٹ اُسے متاثر کئے بنا نہ رہ سکی۔

"آپ بیٹھئے!" اُس نے نیرج کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہسکی لیں گے آپ ؟"

"اگر آپ بھی لیں تو۔؟"

"نہیں، میں تو تھوڑی سی جن اور کارڈیل لے لوں گی!"

"تو مجھے بھی وہی دیدیجیے گا۔" اور پھر نیرج نے کل کے شوٹنگ کے ڈائیلاگ دہراتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اپنا ساتھی نہیں سمجھتیں نشی ۔۔۔!"

سونیا مکالمے کے اس حصّہ کو سن کر مسکرائی۔

"اگر تم مجھے اس قابل سمجھو منوج!" نشی نے بھی جواب دہرایا۔

وہ دو گلاس جن اور کارڈیل بنا کر لے آئی۔

"آپ شروع کیجیے۔ میں ابھی آئی۔" نشی کو ابھی اپنی برہنگی کا احساس ستا رہا تھا۔ یہ اچھا ہی تھا کہ نینا ساتھ نہ تھی ورنہ وہ اسے کچھ اور ہی سمجھ بیٹھتی۔ وہ جلدی سے بیڈ روم میں گئی۔ اس نے نکالے ہوئے کپڑے اٹھائے۔ وہ قدِ آدم آئینہ کے پاس سے گزر رہی تھی کہ اس کے قدم رک گئے۔ اس نے ڈریسنگ گاؤن کے بٹن کھول دیئے۔ اس کا دل آویز جسم آئینہ میں سے جھانکنے لگا۔ ایک خیال اس کے دل میں لہرایا۔ آخر کل شام والی شوٹنگ کا سین دہرانے میں کیا ہرج تھا؟ وہ ان کپڑوں کو واپس رکھ کر دوسرے کپڑے چھانٹنے لگی۔ اور پھر وہ ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ کر بال سنوارنے اور ہلکا سا میک اپ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس نے اب بھی ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ لیکن اس کا جسم اور کپڑے ایک بے حد رومانی خوشبو سے معطّر تھے۔ وہ آج جاننا ہی چاہتی تھی کہ نیرج آخر کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔

باہر کے کمرے کی خواب آلود روشنی میں آرکسٹرا کے ریکارڈ اپنی دھیمی لے میں بج رہے تھے۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی نیرج اس کی طرف دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے میز پر پڑا ہوا دوسرا گلاس اٹھایا اور اسے سونیا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے پکار اٹھا۔

"چیرز نشی۔ ٹو یور ہیلتھ اینڈ بیوٹی!" دو گلاس ہوا میں ہلکے سے لہرائے، ٹکرائے اور پھر دونوں نے ایک ایک گھونٹ پی لیا۔ نیرج کو یاد تھا کہ بالکل ایسا ہی سین انہوں نے کل شام کو "سہانے سپنے" کے لئے فلمایا تھا۔

"منوج تم اپنی نشی کو بالکل اسی طرح ہی تھامو، جیسے تم نے کل تھاما تھا۔ ہاں بالکل اسی طرح!" اور نشی منوج کی باہوں میں لپٹ گئی۔ اس کا ڈریسنگ گاؤن ہلکا سا ڈھلک گیا اور اس کے بالائی جسم کا بہت بڑا حصّہ عریاں ہو گیا۔ منوج کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ اس کا منہ اس کے گالوں پر جھک گیا۔ نشی نے منوج کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے کے ابھاروں پر رکھ لیا۔

"منوج!" نشی کی آواز ڈوبتے معطّر اندھیروں کو چیرتی ہوئی کسمسائی۔ "منوج، اس سین میں کوئی کٹ نہیں ہوگا!"

۹

یہ عجیب سانحہ تھا کہ "سہانے سپنے" کی کہانی نے سونیا اور نیرج کو بھی زندگی کے ایک عجیب موڑ پر لا کھڑا کر دیا تھا۔ سونیا کو جہاں نیرج کی تسخیر پر فخر تھا، وہاں اسے اپنا ضمیر بھی لعنت ملامت کرتا محسوس ہوتا۔ گویا ایک پھانس تھی جو اس کے دل میں اس لمحہ سے ہی چبھنے لگ گئی تھی۔ وہ لمحہ جو بیک وقت زندۂ جاوید ہو گیا تھا۔ اور جو اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی پھانس بھی بن گیا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ نیرج پر پچھلی رات کا کیا ردِ عمل ہوا تھا۔ وہ نیرج کے اس قدر قریب آنے پر بھی اسے صحیح طور پر پہچان نہیں سکی تھی۔ وہ گئی رات تک ایک دوسرے کے لئے نشی اور منوج ہی بنے رہے تھے۔ وہ دونوں ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئے تھے جس میں انسان اپنے وجود کو کھو کر صرف دو جسم بن کر رہ جاتے ہیں۔ جسم جو دو ہوتے ہوئے بھی ایک بننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ سونیا کے لئے یہ ایک یادگار رات تھی۔ لیکن اسے پورا یقین نہ تھا کہ دن کی روشنی ہوتے ہی اس کے سارے سپنوں کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

اس نے دن میں کئی بار نیرج کو ٹیلیفون کرنے کی کوشش کی۔ صبح جب اس نے نیرج کے گھر فون کیا تو نینا کی آواز سن کر اس کے ہاتھوں سے ٹیلیفون کا ریسیور پھسلنے ہی لگا تھا۔ اس نے کپکپاتی آواز میں نینا سے پوچھا تھا کہ وہ کب آئی۔

"بس ابھی ابھی آ رہی ہوں!" یہ سن کر سونیا کو جیسے ایک بہت بڑی تسلّی ہوئی۔

"نیرج جی کہاں ہیں؟"

"نوکر کہہ رہا تھا کہ نیرج جی رات کو بہت دیر سے گھر لوٹے

تھے ۔۔۔" سونیا کا دل ایک لمحے کے لئے ڈوب گیا۔

"مگر نہ جانے وہ میرے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی کہیں چلے گئے ہیں!۔ شاید آج شوٹنگ ہے۔ وہیں اسٹوڈیو ہی گئے ہوں گے۔ ابھی ٹیلیفون کرتی ہوں"۔۔ اور پھر ذرا رک کر" تمہاری شوٹنگ نہیں ہے کیا سونیا۔؟ نہیں تو تم یہاں کیوں نہیں چلی آتیں!۔ شاید ہوگی ۔ سیٹ تیار ہونے پر۔؟ اچھا فرصت ہو تو ضرور آنا ضرور"

"اور سونیا کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ نینا سے کیسے آنکھیں ملا سکے گی۔ یہ مسئلہ پیچیدہ ضرور تھا۔ اس نے اس مسئلے کو فی الحال ذہن کی گہرائیوں میں دبانے کا فیصلہ کرلیا۔

اگلے ہی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسٹڈیو کی طرف سے شام کو شوٹنگ کے لئے بلاوا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ نیرج اسٹڈیو ہی میں ہے۔ لیکن اس سے پیشتر ہی ٹیلیفون کٹ گیا تھا۔ اس نے پھر اسٹڈیو کا نمبر ملایا۔ ہاں نیرج جی اسٹڈیو میں ہی تھے۔ لیکن وہ ٹیلی فون پر نہیں آسکتے تھے۔ سونیا کو اپنے سوال کا جواب نیرج کے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوسکتا تھا۔ وہ شام کا بے چینی سے انتظار کرنے لگ گئی۔

اس نے بڑی بے دلی سے "سہانے سپنے" کا اسکرپٹ اٹھالیا، اور شام کی شوٹنگ کے بارے میں متعلقہ حصوں کو دیکھنے لگی۔ نشی اور منوج کا بھی وہی مسئلہ تھا جو ان دونوں کا تھا۔ ویسے تو یہ اسکرپٹ اس نے کئی بار پڑھ رکھا تھا۔ لیکن آج اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ اسکرپٹ ہی ان کے مستقبل کا فیصلہ کردے گا۔ اس کہانی میں بھی ہیرو اور ہیروئن جذباتی رو میں بہہ کر ایک رات کو ایسی ہی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ اگلے روز ان دونوں ہی کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ چونکہ اس کہانی میں بھی حوا ہی آدم کو بہکاتی ہے۔ اس لئے ہیروئن سے زیادہ ہیرو کو پشیمانی ہے۔ ہیرو محسوس کرتا ہے کہ اس سچی محبت میں وہ اپنے نفس پر قابو نہ پاکر خود اپنی نظروں سے گر گیا ہے۔ اسے احساس ہے کہ اس کشمکش کا تعلق صرف اس کی ذات سے تھا۔ اور وہ کسی بھی طرح ہیروئن کو اس کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہراتا۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ یہ رول بہت ہی مشکل رول تھا۔ اور یہ اداکار سے اس کے پورے جذباتی اور ذہنی تعاون کی مانگ کرتا تھا۔ لیکن جب پہلے ہی شاٹ میں نیرج نے جس طرح سے اسے نبھایا۔ سبھی اس کی اداکاری کا لوہا مان گئے۔ مکل دادا "واہ! واہ!" کرتے ہوئے نیرج کے گلے سے لگ گئے۔ انہیں ڈر تھا کہ شاید انہیں اس شاٹ کو کئی بار لینا پڑے گا۔ یہ سچویشن واقعی بے حد صبر آزما تھی۔ اور اچھے سے اچھے اداکار کا بھی اسے نبھانا بہت ہی مشکل تھا۔ مکل دادا کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ انہیں خوشی تھی کہ انہوں نے ہیرو کے لئے نیرج ہی کو منتخب کیا تھا۔ شاید کوئی بھی دوسرا اداکار اس رول کو اس خوبصورتی کے ساتھ ادا نہ کرسکتا۔ نیرج ان معنوں میں بے نظیر تھا۔ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔۔۔۔۔

اس شاٹ میں سونیا کو صرف صوفے پر ہی بیٹھنا تھا۔ شارٹ ختم ہونے کے بعد جب نیرج کو سب لوگوں نے گھیر لیا اور اسے مبارکباد دینے لگے تو سونیا کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بالکل اکیلی رہ گئی ہو۔ سب کی نظروں کا مرکز نیرج ہی تھا۔ وہ اٹھ کر میک اپ روم میں چلی گئی۔

وہ جب سے اسٹڈیو میں آئی تھی اسے نیرج سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ نیرج بھی کچھ اپنے آپ میں زیادہ ہی کھویا ہوا تھا۔ شاید یہ سین کا تقاضا بھی تھا۔ وہ نیرج کے موڈ کو بالکل خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہر اداکار اس کی توقع دوسرے اداکار سے رکھتا ہے۔

سونیا میک اپ روم میں بیٹھی پوڈر کیس سے کھیل رہی تھی۔ وہ ابھی تک رات کے واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی، کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک دینے والے نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور ایک جانی پہچانی آواز سونیا کو سنائی دی۔

"بھئی، میں مخل تو نہیں ہو رہی ہوں!" یہ زینت تھی۔ اس نے سرخ بھڑکیلے رنگ کے سلیکس پہن رکھے تھے، اور وہ سرخ اور سفید ٹیونک میں بہت ہی سمارٹ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کولھے مٹکاتی کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ اپنی نسوانیت جتانے کیلئے ہمیشہ کولھے مٹکاتی رہتی۔

"نہیں۔ نہیں۔ آؤ۔" سونیا نے پوڈر کیس میز پر رکھ دیا۔

"چشمِ بد دُور۔ تم اِس گہری سوچ میں بھی بہت حسین معلوم ہو رہی ہو! اور یہ سُرمئی ساڑھی تو تمہارے گورے انگ کے ساتھ بہت ہی پھبتی ہے۔"

اُس نے کولھے مٹکاتے ہوئے قریب آکر سونیا کے گالوں پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔ "سیٹ نمبر ۳ پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ابھی ابھی شوٹنگ ختم کر کے ہی آ رہی ہوں۔ بڑے دنوں سے تم سے مُلاقات نہ ہوئی تھی۔ پتہ لگا تھا کہ تمہاری شوٹنگ بھی اِسی اِسٹوڈیو میں ہو رہی ہے۔ سوچا مل ہی لوں۔!"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا زینت!۔ آؤ بیٹھو" سونیا نے پاس پڑے ہوئے تھرمس میں سے کافی کی دو پیالیاں اُنڈیلیں اور اُس نے ایک پیالی زینت کے ہاتھ میں تھمادی۔ "آہاہا! کافی! تھینک یُو۔" اُس نے کافی کی ایک چُسکی لینے کے بعد کہا۔

"کہو، نیرج جی کے ساتھ تمہارا رُومانس کیسا چل رہا ہے!" اور پھر اُس نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اور ایک اَدا سے گاتے ہوئے کہا۔ تیرے میرے پیار کے چرچے ہیں اِس جہان میں!"

"دیکھو زینت!۔ تم خواہ مخواہ کسی کو بدنام کرو، یہ ٹھیک نہیں۔" سونیا نے بناوٹی غصّے سے کہا۔ نیرج جی شادی شدہ ہیں۔ نینا میرے بچپن کی سہیلی ہے!"

وہ کہنے کو تو یہ سب کچھ کہہ گئی۔ لیکن اُسے اپنی باتوں میں کھوکھلے پن کا احساس ہو رہا تھا۔

"ارے میری بنّو! تم بگڑتی کیوں ہو!۔ اِس فلمی دنیا میں تو ایک ہیرو ہیروئن کا رُومان کوئی نئی بات نہیں۔ میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔" اُس نے کافی کا ایک اور گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"ویسے تم دونوں کے چرچے ہر جگہ خُوب ہوتے ہیں۔!"

"اِس کے لئے راج جی کا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ ذمّہ دار ہے۔ اُنہیں تو ہم دونوں کو پبلسٹی دے کر اپنی فلمیں بیچنی ہیں نا!۔"

"بھئی کچھ بھی کہہ لو۔" تم دونوں کی اداکاری دیکھ کر تو لگتا ہے۔ جیسے تم دونوں جنم جنم سے ایک رشتے میں ہی پروئے ہوئے ہو!"

"میں اِسے اداکاری کی تعریف سمجھوں یا...... اگر تعریف ہے تو بے حد شکریہ!"

مجھے تو تم پر رشک آتا ہے، تم کتنی بھاگوان ہو، جو تمہیں نیرج جی کے ساتھ ہیروئن بننے کا موقع مِلتا ہے۔!"

"تو تم کیوں نہیں نیرج جی کے ساتھ ہیروئن بن جاتیں!"

"کوئی بنائے تو نا! لیکن ہماری ایسی قسمت کہاں۔؟ یہ قسمت تو تم لے کر آئی ہو۔!" اُس نے سونیا کے رخساروں کی چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ ہماری طرف تو وہ ذرا پیار بھری نظروں سے دیکھ لیں تو وہی بہت ہے!" اُس نے انکساری کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ سونیا مسکرا دی۔

"ایسے اِنسان کے ساتھ کِس کا رُومان لڑانے کو جی نہ چاہتا ہوگا۔! مُفت میں جو مال آئے تو بُرا کیا ہے" یہ مصرع چچا غالب نے خاص تمہارے لئے لکھا تھا۔

"تو تمہاری اِس پیش کش کا نیرج جی سے ذکر کر دوں!"

"لیکن ایسا نہ ہو کہ 'بن جائے رقیب جو ہو رازداں اپنا!"

"ویسے تمہاری آفر کا بیحد شکریہ!۔ میں کسی دن خود ہی نیرج جی سے بات کروں گی!"

سونیا کو زینت کی باتوں میں مزا آ رہا تھا۔ وہ کتنی BOLD تھی اپنی باتوں میں!۔ اور اُسے کسی کو بھی بنانا خُوب آتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ زینت اپنی بات چیت میں بالکل SERIOUS نہ تھی۔ چند لوگوں کے ساتھ یہ صرف گفتگو کا اِسٹائل تھا۔ اور زینت ایسے ہی لوگوں میں سے تھی!۔ اِس کا اندازہ زینت سے دو چار مُلاقاتوں کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔

"آخر میری سفارش کی بھی تو کچھ وقعت ہے۔!"

"ارے میری بنّو! جب تم اپنے لئے ہی سفارش نہیں کر سکیں تو میرے لئے کیا کرو گی!"

"تو نینا سے کہہ دوں!"

"باپ رے! تم چاہتی ہو کہ میں سیدھا شیر کے مُنہ میں ہاتھ دے دوں!"

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

اِتنے میں مُکل دادا کا بُلاوا آگیا۔ سیٹ پر اُس کا انتظار ہو رہا تھا۔

"اچھا میں چلتی ہوں!" زینت کافی کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اُسی ناز و ادا سے

کو لِھے مٹکاتی باہر چلی گئی۔ سونیا دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی، اور پھر اُس نے جلدی سے میک اپ کو سنوارا، اور سیٹ کی طرف چل دی۔

۱۰

چار گھنٹے متواتر شوٹنگ ہوتی رہی۔ نیرج تو آج کمال کر رہا تھا، اتنی خوبصورت ایکٹنگ شاید اُس نے اپنی تمام فلمی زندگی میں نہیں کی تھی۔ مکل دادا بہت خوش تھے۔ وہ اُسے ہر شاٹ کے بعد گلے لگا لیتے... سونیا نے بہ مشکل دو چار لائنیں ہی بولی تھیں۔

یہ سارا سین نیرج کا تھا، اسلئے سب کی توجہ اُسی پر مرکوز تھی۔

سونیا خوش تھی۔ نیرج کی اس تعریف میں اُس کا بھی حصّہ تھا۔ شاید نیرج کے اِس بڑھیا ایکٹنگ کرنے میں اُس کا بھی دخل تھا، رات کے تمام واقعات اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے تھے۔ وہ اپنے تصورات میں ہلکورے لیتی رہی اور اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب مکل دادا نے کیمرہ اُس کے چہرے پر لا کر جلدی سے ایک شاٹ لے لیا۔ مکل دادا میں یہ ایک بڑی صفت تھی کہ وہ بندھے ٹکے ہوئے سینز کے قائل نہ تھے۔ ایسے ہی غیر متوقع شاٹ مکل دادا کی فلموں کی جان تھے۔

شاٹ ختم ہونے کے بعد سارا ماحول تالیوں سے گونج اُٹھا۔ سونیا کچھ دیر تک اِن تالیوں کی وجہ سمجھ نہ سکی تھی۔ لیکن اب جبکہ تمام نگاہیں اُس پر جمی تھیں۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اِن تالیوں میں سے سب سے اونچی آواز نیرج کی تالیوں کی تھی۔ اُس نے خفیف سا سر جھکا کر اِن تالیوں کا سواگت کیا۔ نیرج اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اُس نے بھی اُس کا جواب ایک دلفریب مسکراہٹ سے دیا۔

بھئی کمال کرتے ہیں دادا آپ!۔ سیٹ پر موجود بھارتی مکل دادا کو مبارکباد دے رہا تھا۔ آج کے سب شاٹ اُس کے اپنے تخیّل سے بڑھ کر تھے۔ نیرج اور سونیا نے اُس کی کہانی کے کرداروں میں ایک جان ڈال دی تھی۔ اُن سب کی رائے میں کہانی کے یہ سین فلمی دنیا میں ایک یادگار بن کر رہ جائیں گے۔ مکل دادا کا اِصرار تھا کہ فلم جلد سے جلد لیبارٹری میں بھیج کر اُس کے رش پرنٹ منگوائے جائیں۔ اب چونکہ کہانی کے اِس حصّے کے اہم شاٹ فلمائے جا چکے تھے۔ مکل دادا نے شوٹنگ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔

چند ہی لمحوں میں دیو قد لائٹیں بند ہو گئیں۔ سیٹ پر ایک اندھیرا سا ہو گیا۔ قدموں کا شور بڑھ گیا۔ سارا ماحول فلمی سامان سمٹنے اور بند ہونے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ بہت سے لوگوں کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کتنے اَن گنت گمنام اِنسان ایک فلم کو جنم دینے کے لئے درکار ہیں۔ اِن میں سے ایک بہت بڑی اکثریت کا سوائے متعلقہ اِسٹاف کے کوئی نام نہیں جانتا ——— اور فلم کے CREDITS میں تو اُن کے نام شامل کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

سونیا اپنے میک اَپ رُوم میں میک اَپ اُتروا رہی تھی۔ جب کمرے کے دروازے پر ایک دستک ہوئی۔ وہ اِس دستک کو پہچانتی تھی۔

"آ جائیے نیرج جی!"

"سونیا بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں بھارتی سے!"

"وہ آپ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے جو ملا رہا ہوگا!"

"اور وہ یہی قلابے مِلانے یہاں بھی آ رہا ہے!"

"باپ رے!" سونیا خوفزدہ ہو گئی۔ اُسے ذاتی تجربہ تھا کہ اگر ایک بار اُس کی زبان سے شعر نکلنے شروع ہو گئے تو اُس کی زبان بند کروانا جان جوکھوں کا کام ہوگا۔ "تو بھاگ چلیں!" سونیا نے رائے دی۔ اُس نے اِشارے سے میک اسسٹینٹ کو جلد سے جلد کام ختم کرنے کیلئے کہا۔ وہ اسسٹینٹ اِن دونوں کے بھاگنے کا پلان سُن کر مسکرا دی۔

چند ہی منٹوں کے بعد سونیا نیرج کی کار میں بیٹھی تھی، سونیا نے اپنی کار گھر بھیج دی تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

"کہاں چلا جائے نفشی۔؟"

"کہیں بھی۔ لیکن بھارتی جی سے دُور!" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ نیرج سے بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ نیرج اُس کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔

"میرا گھر کیسا رہے گا۔؟" وہ نیرج کے دل کی ٹوہ لینا چاہتی تھی۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔!"

نیرج نے کار سونیا کے گھر کی طرف موڑ لی۔ سونیا سوچنے لگی۔ کیا یہ اُس کے سوال کا جواب تھا؟ کیا وہ صرف ایک رات کی آسائش تھی؟ کیا نیرج سمجھتا تھا کہ یہ اُن

دونوں کی جذباتی غلطی تھی یا اُس کی نظروں میں اُس کی وقعت کچھ اور زیادہ تھی۔ خاموشی بڑھتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ سوچ کر بولی۔

"میں جانتی ہوں تم آج بہت تھک گئے ہوگے۔!"

"نہیں نشی۔ میں تو آج بہت موڈ میں تھا۔ انسان جب موڈ میں ہوتا ہے، تو وہ تھکتا نہیں۔!"

"ہاں منوج۔ تم نے تو آج کمال کر دیا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ آج سب سے بہترین شاٹ تو تمہارا تھا! مکل دادا نے تمہیں انجانے میں کیسے پکڑ لیا۔!"

"معلوم نہیں وہ شاٹ اچھا آئے گا بھی کہ نہیں!"

"اچھا کیوں نہیں آئے گا۔ مجھے مکل دادا پر پورا بھروسہ ہے! مکل دادا بھی کمال کے آدمی ہیں!"

"تم یقین مانو کہ دادا لیبارٹری کے اندر ساری رات ایک نئے ہونے والے بچے کے باپ کی طرح یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں ٹہلتے رہیں گے۔ اُس وقت تک جب تک وہ رش پرنٹ دیکھ نہ لیں"

تھوڑی دیر بعد سونیا کا گھر آگیا۔ نیرج نے اُتر کر سونیا کی طرف کار کا دروازہ کھول دیا۔

"آؤ، اوپر چلیں!" نیرج جیسے ایک لمحے کے لئے رُک گیا۔ سونیا کو لگا۔ جیسے وہ 'نا' کر دے گا۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا۔

"ہاں۔ لیکن زیادہ دیر نہ بیٹھ پاؤں گا!"

"نینا واپس آگئی ہے اِس لئے؟"

"نہیں ایسی بات تو نہیں!۔ ایسے ہی اب تھوڑی سی تھکاوٹ کا احساس ہو رہا ہے۔"

"تھوڑی وہسکی یا جن اور لائم لے لینا!"

"اچھا!" اور وہ دونوں لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔

آٹو میٹک لفٹ میں داخل ہونے کے بعد دروازے بند کر کے سونیا نے لفٹ کا سوئچ دبا دیا۔ لفٹ تیزی سے اوپر کی طرف چڑھنے لگی۔ سونیا نے مڑ کر دیکھا نیرج کی نگاہیں اُس پر جمی تھیں۔ وہ اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ اور پھر اُس نے آگے بڑھ کر نیرج کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ نیرج نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ سونیا نیرج کے ذہنی ردِّ عمل کا کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

پانچویں فلور پر لفٹ آکر رُک گئی۔ وہ لفٹ سے نکل کر فلیٹ میں داخل ہو گئے۔

"بیٹھو منوج!" اور سونیا ریفریجریٹر میں سے وہسکی سوڈا نکال لائی۔ اُس نے دو گلاسوں میں وہسکی اُنڈیل دی۔ نیرج نے گلاس تھام لیا۔

"منوج! تم اپنی نشی سے خفا تو نہیں ہو؟" سونیا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ وہ اُس کے قریب آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"نہیں نشی بالکل نہیں!"

"تم نہیں جانتے۔ آج جب مکل دادا نے اچانک میرا شاٹ لیا تو میں کل رات کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ اُن لمحوں کے بارے میں جو ہم دونوں نے اکٹھے گزارے تھے۔"

نیرج مسکرا دیا۔ سونیا کا حوصلہ بڑھ گیا۔

"نیرج جی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ بھی اتنی اچھی اداکاری کیوں کر کر سکتے ہیں۔ اور وہ اُس کے بالکل پاس آگئی۔ اُس کے ہونٹ نیرج کے ہونٹوں کے بالکل قریب آگئے۔ وہ اِنتظار کر رہی تھی کہ نیرج کے ہونٹ کب اُس کے ہونٹوں پر اپنی مُہر ثبت کریں لیکن اُسے صرف نیرج کے کانپتے ہوئے ہونٹ دکھائی دیئے۔ جیسے وہ ابھی تک مکمل طور پر فیصلہ نہ کر سکے ہوں۔ اور پھر سونیا نے آگے بڑھ کر نیرج کی باہیں اپنے گلے میں ڈال لیں اور شدتِ جذبات سے نیرج کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

نیرج کی باہوں میں پڑی ہوئی مدہوش سونیا کو جیسے کمرے کے باہر زینے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ نیرج نے بھی باہر کی طرف گھوم کر دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ شاید قدموں کی آہٹ بھی اُن دونوں کا وہم تھا۔

سونیا کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے نیرج اُس سے محبت کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ جیسے کوئی چیز اُسے اُس سے دور کھینچ رہی ہو۔ شاید وہ آہٹ اُن دونوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔

اُس نے ایک بار پھر نیرج کو اپنے جسم کی طرف راغب کرنا چاہا۔ لیکن نیرج نے آہستہ سے اُسے پرے ڈھکیل دیا۔

"میرے منوج! کیوں کل اور آج میں کچھ فرق ہے کیا؟"

"سونیا!" نیرج نے اُسے نشی کی بجائے سونیا کہہ کر پکارا تھا۔

"تم جاننا چاہتی تھیں کہ میری اداکاری آج کیوں بے مثل اور لاجواب تھی؟"
سونیا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اس کی وجہ سونیا تم نہیں تھیں! کل کی رات میں جاننا چاہتا تھا کہ منوج پر نشتی کی وجہ سے کیا بیتی تھی — میں نشتی کے روپ میں تمہارا شکر گزار ہوں جس نے مجھے یہ موقع دیا۔ اور جس کی وجہ سے مجھ پر وہی موڈ طاری ہوا جو منوج پر اُن حالات میں طاری ہوا ہوگا —؟"

"نشتی! نشتی! — نشتی!۔ سونیا کی آواز میں نشتی کے لئے سخت نفرت تھی!"

"تمہارے لئے سب کچھ نشتی اور منوج ہی ہیں۔ سونیا کچھ بھی نہیں!۔ اُس کی کوئی حقیقت نہیں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

۱۱

جب وہ گھر پہنچا تو رات کے دو بج چکے تھے۔ اُسے افسوس تھا کہ اُس نے سونیا کا دل دُکھایا تھا۔ لیکن وہ حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے سونیا کو سمجھانے میں بہت دیر لگی۔ اُس نے سونیا سے کہا تھا کہ وہ اوّل اور آخر ایک کلاکار تھا۔ اُس کی زندگی میں ہمیشہ کلا کو باقی تمام بندھنوں پر فوقیت حاصل تھی۔ کلا ہی اُس زندگی تھی اور وہی اُس کی زندگی کا نصب العین۔ وہ صرف اپنی کلا کے ذریعے ہی زندگی کو پہچانتا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی اُس کی روشنی تھی۔

لیکن سونیا یہ سب کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ وہ تو صرف اُس سے اپنی زندگی کی خوشیاں مانگتی تھی اور پھر جیسے اُسے اُس پر اُس کی ویران زندگی پر ترس آگیا ہو۔ سونیا نے اُسے دو گھنٹے روک کے رکھا۔ وہ سونیا نہیں، منوج کی نشتی بن کر بھی راضی تھی۔ وہ کلا کا روپ تو نہیں بن سکتی تھی۔ کم سے کم کچھ وقت کے لئے زندگی کی پرچھائیں تو بن سکتی تھی۔ نہ جانے اس نشتی کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ تو جنم جنم سے پیاسی معلوم ہوتی تھی۔ نیرج اُس کی پیاس بجھاتا رہا۔

جب وہ اپنی چابی سے فلیٹ کا دروازہ کھول کر بیڈ روم میں داخل ہوا تو نینا جاگ رہی تھی — اُس نے دبے پاؤں باتھ روم میں کپڑے تبدیل کئے۔ اور پھر وہ نینا کے ساتھ والے بیڈ روم میں گھس گیا۔

"رات کے اندھیرے میں سے نینا کی سرگوشی گونجی۔

"نیرج۔"

"نینا تم اتنی رات گئے جاگ رہی ہو!"

"میں اب راتیں جاگنے کی عادی ہو گئی ہوں! نیرج!"

نیرج خاموش ہو گیا۔ اندھیرے میں سے پھر نینا کی آواز اُبھری — ایک سرگوشی سے ذرا اونچی، لیکن بہت ٹھہری ہوئی۔

"نیرج سچ بتانا تم کہاں سے آرہے ہو؟ تمہیں میری قسم۔ اگر تمہیں میری قسم کا کچھ پاس ہے تو۔!"

نیرج کہنا چاہتا تھا۔ کہ وہ شوٹنگ ختم کر کے آرہا تھا لیکن وہ نینا سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

"میں شوٹنگ کے بعد سونیا کو اُس کے گھر چھوڑنے گیا تھا وہیں تھوڑی دیر ہو گئی۔!"

"تھوڑی دیر!۔ میں نے اسٹوڈیو فون کیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا۔ کہ شوٹنگ تو گیارہ بجے ختم ہو گئی تھی۔ اس وقت تو دو بج رہے ہوں گے!"

اُس کی آواز میں کوئی غصہ نہ تھا۔ کوئی جھلاہٹ نہ تھی اُس کا لہجہ اُکھڑا اُکھڑا تھا۔!" نیرج خاموش رہا۔

"نیرج، میں آج تک تم سے کبھی کچھ پوچھا نہیں کی۔ مجھے تو دھڑکا تھا کہ کہیں تمہارا کوئی ایکسی ڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔ اس لئے میں کئی جگہ گئی — سونیا کے ہاں بھی۔!"

"تو وہ قدموں کی چاپ نینا کے قدموں کی ہی تھی۔!" کمرے کی خاموشی بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک اندھیرے اور خاموشی کی کئی تہوں کو چیرتی نینا کی آواز آئی۔

"مجھے سچ بتانا نیرج! تم سونیا کے ساتھ خوش رہ سکو گے!"

نیرج اِس کے جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"نینا میں تمہیں وشواس دلاتا ہوں۔ تم مجھے بہت غلط سمجھ رہی ہو۔!"

میری آنکھیں مجھے دھوکہ نہیں دیتیں۔ میں بھی تمہیں وشواش دلاتی ہوں کہ میں تمہارے اور سونیا کے راہ میں کبھی نہیں آؤنگی۔"

"نینا۔ تم..... تم سمجھنے کی کوشش کرو!۔ میں ایک کلاکار ہوں! تم نہیں سمجھ سکتیں۔ کہ ایک کلاکار کو ایک رول نبھانے کے لئے کیا کیا کیفیتیں اوڑھنی پڑتی ہیں۔!"

"نیرج میں نے تو ہمیشہ تم سے کہا ہے کہ جہاں آرٹ کی جیت ہوتی ہے۔ وہیں سے زندگی کی ہار شروع ہو جاتی ہے۔ میں جانتی ہوں۔ میں زندگی کی بازی ہار ہو چکی ہوں! مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں۔ تم بڑے شوق سے مہان کلاکار بنو۔!"

ایک طویل خاموشی۔ جیسے نینا کچھ سوچ رہی تھی۔

"میری ایک بات مانو گے؟"

"کہو۔!"

"تم مجھے ایک بار پھر وہی پیار دو، جو تم نے مجھے اُس رات دیا تھا۔ جب تم مجھے بیاہ کر لائے تھے۔!"

"نینا۔!"

"ہاں نیرج!"

"نینا۔ میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں۔ نشتی کے ساتھ گزارے ہوئے اُن دو گھنٹوں نے اُسے بے حد تھکا دیا تھا۔

اُس نے اُس کی پیشانی پر ہلکی سی پیار کی مُہر ثبت کرتے ہوئے کہا۔"

تم بھی خواہ مخواہ بہت پریشان ہو۔ تم سو جاؤ۔ کل میں تمہاری ہر خواہش پُوری کر دوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل شام میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔ پھر ہم دونوں تاج چلیں گے اور پھر میں تمہیں ایک دن دُلہن کی طرح اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر۔!"

"کل... کل میں بہت دیر ہو جائیگی نیرج۔ نینا نے زیرِ لب کہا تھا۔ اور پھر جیسے وہ بددلی سے کروٹ بدل کر سو گئی تھی۔ نیرج آج بتانے سے قاصر تھا کہ زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ خود زندگی سے ہار گیا تھا۔ دن بھر کا تھکا نیرج جلد ہی نیند کی گود میں لڑھک گیا۔ صبح جب نیرج کی آنکھ کھلی تو نینا کا پلنگ خالی تھا۔

نیرج کو اچانک ایسے لگا۔ جیسے اُس نے انجانے میں نینا کو کھو دیا ہو۔ پچھلے دن کی تمام باتیں اور رات کے واقعات اُس کے کُہر آلود دماغ میں بادلوں کے بھٹکتے ٹکڑوں کی طرح تیرنے لگے۔ جیسے اُن میں رابطہ نہ ہو۔ کوئی تسلسل نہ ہو۔

اور پھر دھیرے دھیرے اُس کے دماغ میں یہ جما ہوا دھواں صاف ہونے لگا۔ واقعات ایک لڑی میں پروئے گئے۔ اور نیرج کے سامنے ایک واضح تصویر اُبھرنے لگی۔ اُس کا ایک حصّہ تھا سونیا۔ اور دوسرا حصّہ نینا۔ سونیا جو کہ ایک چنچل دھارا تھی۔ جو کلا کی پجاری تھی۔ جو کلا کو جنم دیتی تھی۔ بھیڑکاتی تھی۔ اُسے اپنے جیون کی آہوتی دے کر سینچتی تھی۔ اور نینا جس میں گہری ندی کا ٹھہراؤ تھا۔ جس کا پانی پوتر پریم تھا۔ اور جو کسی نامعلوم طریقے سے ایک چٹان کی طرح زندگی کو سہارا دیئے ہوئے تھی۔

نیرج کو احساس بھی نہ تھا کہ وہ کلا کی تکمیل کے لئے کسی کے جذبات اور ارمانوں کو روند بھی سکتا ہے۔ یا اُسے ہلکی سی ٹھیس بھی پہنچا سکتا ہے۔ کلا ہی اُس کا جیون تھا۔ اور کلا ہی اُس کا آدرش۔ وہ کبھی نینا کی بات سمجھ نہیں پایا تھا کہ کلا کی جیت جیون ہار کیونکر ہو سکتی ہے۔ سونیا نے اُسے جو کچھ کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ صرف اُس نے کلا کی خاطر ہی کیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس سے نینا کا اور اُن دونوں کی زندگی کا کیا تعلق تھا۔ آخر نینا اُسے کیوں سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ نینا کو اطمینان سے سمجھائے گا۔ کہ ہر انسان کی زندگی کئی لوگوں میں بٹی ہوتی ہے۔ انسان اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ایک ساتھ کئی لوگوں کا محتاج ہے۔ اگر وہ کپڑے سلوانے کے لئے درزی کے پاس جاتا ہے اور شیو بنانے کیلئے حجام کے پاس۔ تو یہ بالکل غیر ضروری ہے۔ کہ درزی یا حجام اُس سے اس بات کے لئے لڑ پڑیں کہ وہ دوسرے کے پاس کیوں جاتا ہے۔ کلا کی ضرورتیں اُس کی جنسی اور جذباتی ضرورتوں سے ہٹ کر ایک بالکل الگ بات تھی۔ اُسے یقین تھا کہ نینا اس بات کو سمجھ جائے گی۔ لیکن نینا آئے تو نا!۔

وہ بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ باتھ رُوم میں جا کر برش اور شیو کرنے لگا۔ اُس کے کان نینا کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ شیو ختم کر کے اُس نے نوکر کو بُلایا۔ نینا کے بارے میں پُوچھا۔ لیکن اُسے بھی معلوم نہ تھا۔ کہ نینا کہاں ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جاتا۔ اُس کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ آخر نینا کہاں چلی گئی۔ اُسے کچھ بھی بتائے بغیر۔ اُس نے دو ایک ممکن جگہوں پر فون کیا۔ لیکن نینا وہاں

بھی نہ تھی۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ شاید وہ سونیا کے پاس ہو۔ اُس نے بڑی بے تابی سے سونیا کو فون کیا۔ لیکن وہ بھی گھر میں موجود نہ تھی شاید دونوں کہیں اکٹھے باہر گئی ہوں۔ حالانکہ کل رات کے بعد سونیا کے ہاں نینا کا جانا کچھ غیر فطری سا تھا۔ مگر پھر - - - - -
وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

کچھ دیر بعد مکل دادا کا فون آیا۔ اُنہوں نے فلم کے رش پرنٹ دیکھ لئے تھے۔ اور وہ اُسے اُس کی بے پایہ اداکاری کے لئے مبارک باد دے رہے تھے۔ سونیا والا شارٹ بھی نیچرل ہونے کی وجہ سے بہت ہی اچھا آیا تھا۔ تمہاری ایکٹنگ (MERVELLOUS) انوکھی ہے۔ تم اب WORLD CLASS ایکٹر کہلائے جا سکتے ہو۔ مجھے وشواش ہے کہ تمہارے اِس سین کی وجہ سے یہ فلم کسی انٹرنیشنل کمپی ٹیشن میں کسی ایوارڈ کے لوگیہ سمجھی جائے گی.... سونیا تو گھر میں نہیں ہے میں اُسے بھی بدھائی دینا چاہتا تھا....
کیا کہا نینا بھی گھر میں نہیں ہے۔ اکٹھی گئی ہیں کہیں ؟.....
کہہ نہیں سکتا۔ ؟.... ضرور اکٹھے ہی کہیں گئی ہوں گی۔
..... کسی وقت بھی آجاؤ۔ تم دونوں بھی یہ پرنٹ دیکھ لو....
اچھا۔!۔ بائی۔ بائی۔!

مکل دادا کے ٹیلیفون کے بعد نیرج کا موڈ بدل گیا۔ انٹرنیشنل ایوارڈ.... ورلڈ کلاس ایکٹر.... وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُسے اب پہلے سے بھی زیادہ یقین تھا کہ سونیا کے ساتھ اُس رات گزارے ہوئے لمحوں نے اُس کی اداکاری کو حقیقت کے بالکل قریب پہنچا دیا تھا۔ اور وہ گناہ اور لذّت کی کشمکش کی بالکل صحیح طور پر عکاسی کر پایا تھا۔ کاش نینا اُس واقعہ کو صحیح روشنی میں دیکھ پاتی۔ اُسے سونیا سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اُس کی اداکارانہ صلاحیتوں کی عزّت کرتا تھا۔ وہ اُس کی دوست تھی.... اور بس! یہ بات نینا کیوں نہیں سمجھتی تھی۔!"

نینا کا خیال آتے ہی وہ واپس حقیقت کی دنیا میں پھر آگیا۔ نینا کہاں ہے؟ اُسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔ اور جیسے جواب میں ٹیلیفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

ٹیلیفون پولیس اسٹیشن سے آیا تھا۔ نینا کی لاش سمندر کے کنارے پائی گئی تھی۔ اُس نے خودکشی کر لی تھی۔!

۱۳

نینا نے خودکشی کر لی۔!" آخر کیوں ؟۔ یہ سوال بار بار اُس کے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برستا۔ وہ اِتنی نادان کیوں تھی۔!۔ وہ اِتنی چھوٹی سی بات کو کیوں نہیں سمجھ پائی۔!" اُسے نینا سے محبّت تھی۔ وہ اُس کے بنا اب کیسے زندہ رہ پائے گا" اُسے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا ـــــ جیسے اُس کی زندگی کو سہارا دینے والی چٹان یکایک کھسک گئی ہو۔ اور اُس کے جیون کی عمارت دھم سے نیچے آگری ہو۔ جیسے وہ اُس کے ملبے کے اندر دب کر رہ گیا ہو۔ اُس کا سانس بُری طرح سے گھُٹ رہا ہو۔ جیسے چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہو۔ اور اُسے روشنی کی ایک بھی کرن دکھائی نہ دیتی ہو۔ وہ کیا کرے کہاں جائے ؟۔

پرچھائیوں کے دیش کے سبھی دوست اُس کے غم کو سہارا دینے آئے۔ اُسے اب اچانک احساس ہوا کہ نینا اُس کے دوستوں میں کتنی مقبول تھی۔ وہ اپنے ہی انداز میں ایک خاموش لگن سے نیرج کے لئے ترقی کی راہیں ہموار کرتی رہی تھی۔ راج، مکل دادا، ونود ماتھر، دنیش، نریش بالی، بھارتی، مایا رنگیشکر، فصیح، جگ موہن کرشن، زینت اور نہ جانے کتنے ہی دوستوں کے لئے وہ ایک مشفق بھابی تھی۔ جس نے ہمیشہ دوسروں کا حوصلہ بڑھایا۔ ہر ممکن طریقے سے اُن کی مدد کی۔ اُن میں کتنوں کو فلمی دنیا کی جگمگاتی روشنیوں میں لا کھڑا کر دیا۔ اور خود اندھیروں میں رہ کر اُنہیں پھولتا پھلتا دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔

ایک عورت کا دل کتنا بڑا ہو سکتا ہے اور کتنا چھوٹا!؟ نیرج کے نزدیک نینا کی زندگی اُس کے دل کے وسیع ہونے کا اور اُس کی موت اُس کے دل کے چھوٹے ہونے کا ثبوت تھی۔! سونیا بھی آئی تھی۔ ایک نہیں کئی بار۔ لیکن نیرج نے اُسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید سونیا خود بخود نینا کی خودکشی کے بارے میں جان گئی ہو۔ اُس کا نیرج کو کوئی اندازہ نہ تھا۔
نینا کی خودکشی پر چہ میگوئیاں بھی ہوئی تھیں۔ اور

پھر کسی نے کہہ دیا تھا، کہ نینا کئی سالوں سے کینسر کے روگ میں مبتلا تھی۔ سبھی جانتے تھے کہ وہ کبھی کبھی کئی کئی دن گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ وہ سالوں سال خاموش اِس بیماری میں گھُلتی رہی تھی۔ اور پھر آخرکار خودکُشی کر کے اُس نے نجات حاصل کر لی تھی۔ کسی نے اِس کو اِس قدر سچ مانا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اِس سے زیادہ کسی نے کُریدنے کی کوشش نہیں کی۔

نینا کی موت کے بعد نیرج جیسے ایک خول میں بند ہو گیا ہو۔ وہ بالکل کھویا کھویا رہتا۔ وہ کسی سے بات چیت بھی نہ کرتا۔ کمرے میں لگی ہوئی نینا کی تصویر کی طرف خاموش تکا کرتا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں سے فریاد کر رہا ہو۔ نینا کو سمجھا رہا ہو۔ کہ اُس کی کوئی غلطی نہ تھی۔ اور اگر غلطی تھی تو وہ غلطی کا ہر خمیازہ بھگتنے کیلئے تیار تھا۔ بشرطیکہ وہ واپس زندہ ہو جائے۔ وہ کئی دنوں تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا۔ شوٹنگ میں جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

راج اور مکل دادا بہت گھبرا رہے تھے۔ نیرج کی لگاتار غیر حاضری کی وجہ سے کئی دِنوں سے شوٹنگ بند پڑی تھی۔ اخراجات بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ڈسٹری بیوٹروں کا الگ تقاضہ تھا کہ فلم جلد سے جلد مکمل ہو۔ راج اور مکل دادا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ اُنہوں نے الگ الگ اور پھر مشترکہ بھی نیرج کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اُسے رامائن اور گیتا کے انمول اُپدیشوں کا حوالہ دیا تھا۔ اُسے پھر کوئی جیون بتانے کے لئے اُکسایا تھا۔ لیکن وہ نیرج کو منا نہیں سکے تھے۔ اُنہوں نے اشاروں اِشاروں میں معاہدہ کی شرطوں کا حوالہ دیا۔ قانونی کارروائی کی دھمکیاں دِیں۔ فلمی دنیا میں مکمل بائیکاٹ کا ڈراوا دیا۔ لیکن سب بے سود۔ نیرج تو زندہ رہنے کی خواہش بھی تج چکا تھا۔

آخرکار راج اور مکل دادا نے فیصلہ کیا کہ شاید سونیا اِس گتھی کو سُلجھانے میں کچھ مدد دے سکے۔ اُنہوں نے سونیا سے نیرج کو اپنے بنائے خُول میں سے باہر نکالنے کیلئے کہا۔ سونیا خود نیرج میں اِس تبدیلی کو بُری طرح سے محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ نیرج نے اُسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن سونیا بخوبی جانتی تھی کہ نینا کی خودکُشی کا تعلق اُس کے اور نیرج کے بڑھتے ہوئے تعلقات سے تھا۔ نینا کو کینسر تھا۔ اُس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ یہ ضرور تھا کہ نینا کبھی کبھی طبیعت خراب ہونے کی شکایت ضرور کرتی تھی۔ لیکن اِس کا کوئی تعلق کینسر کی بیماری سے نہ تھا۔ یہ اُسے کبھی معلوم نہ ہوا تھا۔ پھر بھی یوں اُسے ایسی خبر کو جھٹلانے کی ضرورت کیا تھی۔۔!

نیرج کے ہاں وہ دو تین مرتبہ گئی ضرور تھی۔ لیکن ہر بار سوگواروں کا ایک تانتا سا بندھا ہوا تھا۔ اُسے کھُل کر بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ یوں بھی چاہتی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ اگر نیرج کے زخم مندمل ہو جائیں تو اُسے نیرج سے بات چیت کرنے میں آسانی رہے گی۔ اب جبکہ راج اور مکل دادا نے نیرج کو منانے کی ذمّہ داری اُس پر ڈالی تھی۔ اُس نے کہا تھا۔

بھئی، آپ ایک بہت مشکل کام مجھے سونپ رہے ہیں۔ نینا میری عزیز ترین سہیلی تھی اور نیرج اُسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ مجھے نیرج سے دلی ہمدردی ہے!

"سونیا جی! آپ سوچیں تو سہی، کیا نینا ہماری بھابی نہ تھی۔ نیرج سے ہمیں بھی اتنی ہی ہمدردی ہے۔ لیکن ہم سب کو اِسی دُنیا میں رہنا ہے۔ اور کسی بھی اہم ترین اِنسان کے چلے جانے سے دُنیا کے کام بند نہیں ہوتے۔!" راج نے کہا۔

"اور سونیا۔ جتنی دیر ہو گی اِس میں نقصان تمہارا ہی ہے۔" مکل دادا پائپ کو ہاتھوں میں نچاتے ہوئے بولے۔

مکل دادا الفاظ برتنے میں بیحد کنجوس تھے۔ کیا مکل دادا نیرج اور اُس کے تعلقات کو جانتے تھے۔ بہت ممکن تھا! اُن کی نظریں بہت گہری تھیں۔ اُنہیں اِنسانی نفسیات کا گہرا تجربہ تھا۔ یا شاید اُن کا مطلب ہو کہ اگر کوئی ہیروئن زیادہ دیر تک فلموں میں نہ آئے تو اُس کی مارکیٹ گرنے کا خدشہ رہتا ہے ـــــ وہ مکل دادا سے اور سوال پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ جان کر چُپ رہی۔ جواب میں اُس نے صرف اِتنا کہا تھا۔

میں نہیں جانتی کہ نیرج جی میری بات کس حد تک

مانیں گے!۔ لیکن میں وشواس دِلاتی ہوں کہ میں پُوری کوشش کروں گی!"

"تم کہہ کر تو دیکھو سونیا!" مکّل دادا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ جیسے اُنہیں اپنی بات پر پُورا یقین ہو۔ "لیکن ذرا طریقے سے اور احتیاط کے ساتھ۔!!"

اُس نے دروازے پر لگی ہوئی کال بیل کو دبایا۔ وہ عرصہ تک اُسے دباتی رہی۔ لیکن کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ اُس نے دروازے پر زور سے دستک دی۔

"کون۔؟" اندر سے ایک آواز آئی۔

"میں ہوں سونیا۔!"

کسی نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔ کمرے کے اندر اندھیرا تھا۔ اُسے اندھیرے میں نیرج کے خدوخال پہچاننے میں تھوڑی دیر لگی۔ اُس کے چہرے پر کئی دِنوں کی بڑھی داڑھی تھی۔

"آجاؤ سونیا!" اُس نے کمرے میں روشنی کر دی۔ اُس کی اپنی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے چندھیا گئیں۔

"معاف کرنا، تمہیں تکلیف ہوئی ہوگی۔ اُس کے لہجے میں ایک عجیب افسردگی تھی۔

"میں نے گھنٹی اُتروا دی ہے۔ اِس ماحول میں گھنٹی کی گاتی ناچتی آواز کچھ اچھی نہیں لگتی تھی۔!"

"سونیا اگر کسی اور موڈ میں ہوتی تو اُسے غالباً 'دیوداس' کہہ کر کہتی —— محلِ مُوقع کے اعتبار سے 'دیوداس' اور نیرج کے موجودہ کردار میں کتنی مطابقت تھی۔ دراصل اگر نیرج کو کسی 'دیوداس' کا پارٹ ادا کرنا ہوتا تو وہ شاید اسی قسم کا ماحول چنتا۔

"تم نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے نیرج!" وہ روہانسی سی ہو گئی۔

"جب دل ہی ٹوٹ گیا۔" وہ نینا کی تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تو جی کر کیا کریں گے!" اُس نے آہستہ سے پلٹ کر سونیا کی طرف دیکھا۔

سونیا دیر تک سوچتی رہی کہ وہ کیا کہے اور پھر وہ اچانک کہے بغیر نہ رہ سکی۔

نیرج میں سمجھتی ہوں کہ میں ہی نینا دیدی کی موت کے لئے ذمّہ دار ہوں!"

"سونیا۔ تم ایسا کیوں سمجھتی ہو؟"

"نیرج۔ نینا دیدی نے اُس رات ہم دونوں کو اکٹھے دیکھا تو اُن کے دِل پر کیا بیتی ہوگی!"

"غلط سونیا۔ بالکل غلط۔ اُس نے نیرج اور سونیا کو نہیں۔ منوج اور نیشی کو دیکھا ہوگا۔ وہ ایک کلاکار کی پتنی تھی۔ اُسے یہ سب سوچنا چاہئے تھا!"

"لیکن وہ ایک عورت تھی۔ بالکل اُسی طرح جیسے سونیا ایک عورت ہے۔!"

"تو کسی بھی عورت کو ایک کلاکار کی بیوی نہ ہونا چاہئیے!"

"یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ لیکن عورت کی محبت کے بنا ایک کلاکار، کلاکار بھی نہیں بن سکتا۔!"

سونیا کی آنکھیں بھر آئیں۔ نیرج اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اب تم اپنی ہی طرف دیکھ لو۔ نینا...... ایک عورت کے بنا۔ اِس فلمی دُنیا کا سب سے بڑا کلاکار اپنی کلا کی طرف دھیان نہیں دے سکتا!۔ جب سے نینا دیدی گئی ہیں۔ تم نے اپنے کام کی طرف دھیان نہیں دیا ہے۔"

نیرج خاموش رہا۔

"میں جانتی ہوں! مجھے تمہارے ساتھ پُوری ہمدردی ہے۔ لیکن جو میں کہہ رہی ہوں، وہ سچ ہے۔ ایک کلاکار عورت کی محبت کے بنا اَدھورا ہے۔"

"سونیا! میرے لئے عورت کی کوئی اہمیت نہیں۔!"

جیسے وہ اپنے ہی لفظوں کو تول رہا ہو۔ میں تو اپنے آدیش، اپنی کلا کو بھول گیا تھا۔!" اُس نے ٹیلی فون کے قریب لگے ہوئے لیمپ کو روشن کیا۔ اور ایک نمبر گھماتے ہوئے بولا۔

"ہیلو! کون مکّل دا۔! آپ کا سیٹ تیار ہے؟ میں کل شوٹنگ کے لئے آ رہا ہوں۔!"

اور سونیا اُس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھی۔

۱۴

مکّل دا، اور راج بہت خوش تھے۔ کہ سونیا نیرج کو واپس کام پر لانے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن اُنہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ نیرج وہ نیرج نہ تھا۔

اب گھنٹوں اُس پر موڈ ہی طاری نہ ہوتا تھا۔ وہ بولتے بولتے کھو سا جاتا تھا۔ ایک سین کے مکالموں کو دوسرے سین سے ملا دیتا۔ اُس کی خود اعتمادی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ سیٹ پر سب لوگوں کو اُس سے ہمدردی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ نیرج کتنے بڑے سانحے سے گزرا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک کی یہ ممکن کوشش رہتی تھی کہ وہ نیرج کے لئے زیادہ سے زیادہ مددگار ثابت ہوں۔

ایک ایک شاٹ کو اب کئی کئی مرتبہ دُھرانا پڑتا۔ جہاں دُوسرے یا تیسرے شاٹ کی پہلے کبھی کبھار ہی ضرورت پڑتی۔ اب اُسے پانچ چھ مرتبہ دُھرانا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ کبھی کیمرے کا زاویہ غلط ہو جاتا۔ کبھی آواز کم یا زیادہ اُونچی ہو جاتی کبھی نیرج اپنے مکالمے بھول جاتا۔ ایسا بار بار ہوتے پر بھی مکل دا کبھی نہیں جھنجلاتے اُسے ایک بچہ جان کر اُس کا حوصلہ بڑھاتے۔ اگر وہ کسی کیمرہ مین یا ساؤنڈ ریکارڈسٹ میں غصّے کے ذرا بھی آثار دیکھتے تو اُلٹا اُسے ہی ڈانٹ دیتے۔

سونیا اور خود نیرج کا خیال رکھتی۔ لیکن نیرج میں کچھ زیادہ تبدیلی نہ آسکی تھی۔ راج کو بڑھتے اخراجات کی فکر دامنگیر تھی فلم کی تکمیل میں الگ دیر ہو رہی تھی۔ لیکن سب بے بس تھے۔ بس اتنی تسلّی ضرور تھی کہ کام دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔

"مکل دا، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کام کیسے چلے گا۔ نیرج کو ہو کیا گیا ہے۔!"

"راج بابو۔ میں تو بہت کوشش کر رہا ہوں!۔ جیسے تیسے کر کے یہ فلم تو پوری کرنی ہی ہوگی۔ دیکھتے ہیں شاید نیرج سنبھل جائے!" مکل دا نے پائپ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

ہاں اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے اگلی پکچر کے لئے کوئی اور ہیرو لینا پڑیگا۔ نیرج میرا بہت اچھا دوست ہے۔ ہم سب اُس کی اداکاری کے قائل ہیں۔ لیکن اس طرح سے تو زیادہ دیر کام چلنا ناممکن ہو جائے گا۔"

میرے خیال میں اگر سونیا چاہے تو وہ ہماری مدد ضرور کر سکتی ہے۔ دیکھا نہیں وہ سونیا کے کہنے سے کتنی جلدی شوٹنگ پر لوٹ آیا۔"

مکل دا اور راج نے ایک بار پھر سونیا کا ذکر کیا۔ سونیا کی سمجھ میں خود نہیں آرہا تھا کہ وہ اُن۔ پچھلی مرتبہ بھی جب اُس نے نیرج سے بات چیت کی تھی تو اس کا مقصد نیرج کو عورت کی محبت کی طرف دھیان دلانے کا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اُس کے لئے نینا بننے کی کوشش کرے گی۔ اُس کی کلا کی جیوتی بنے گی۔ لیکن نیرج کے نزدیک تو کلا ہی سب کچھ تھی۔ اور وہ اُس کی نہیں کلا کی پکار سن کر دوبارہ شوٹنگ پر لوٹا تھا۔ نیرج کے سامنے اُس کی اپنی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ ایک کھلونا تھی یا راستے کے ایک طرف پڑا ہوا پتھّر، جسے راہگیر ایک نظر دیکھتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ نیرج کو اپنی طرف راغب کرنے میں سخت ناکام رہی تھی۔ وہ نیرج کے لئے ایک نشی۔ ایک کردار کی حیثیت سے بڑھ کر کچھ نہ تھی۔ اُس نے اُسے کبھی سونیا نہیں سمجھا۔ سونیا جو گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا پتلا تھی۔ جس کے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا تھا۔ جس کی اپنی بھی کچھ خواہشیں تھیں۔ ارمان تھے۔

اُسے وہ رات بخوبی یاد تھی جس کی اگلی صبح نینا نے خود کشی کی تھی۔ وہ سونیا بن کر نیرج کو نہیں جیت سکی تھی۔ صرف نشی بن کر اُسے اپنے قریب لا سکی تھی یہ کتنی توہین تھی سونیا کی۔ لیکن اُسے اُس کے اپنے جسم کی پکار نے اُسے نشی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُسے اگلے دن اپنے آپ پر بہت غصّہ آیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ نینا کی خودکشی کی ذمّہ دار تھی۔ بلکہ اس لئے کہ نشی جیتی تھی، سونیا ہاری تھی۔ اور وہ خود اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔

وہ اب راج اور مکل دا سے کیا کہے؟ وہ نیرج کو اپنی ہی بنائی ہوئی دنیا سے کیسے واپس لا سکتی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر اُن دونوں کو اپنی کوشش کا یقین دلایا تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی اُسے مکمل احساس تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ وہ اپنی توہین کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اور پھر وہی کچھ ہوا جس کی سونیا کو آشا تھی۔ سونیا نینا کی جگہ کبھی نہیں لے سکتی تھی۔ نیرج کے دل میں اُس کے لئے عزت تھی۔ مان تھا۔ وہ ایک اچھی دوست

تھی۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ سونیا کے دل کو کبھی بھی نینا کی طرح ٹھیس پہنچے۔ وہ کلاکار تھا۔ اور اُس کے نزدیک کلا کو عورت پر فوقیت حاصل تھی۔ وہ اپنے آپ کو کلا ہی میں کھو دینا چاہتا تھا۔

سونیا اب نیرج سے کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ فلم کے سیٹ پر بھی سونیا اور نیرج کے پریم کا ڈرامہ محض اداکاری ہی معلوم ہونے لگا۔ کھوکھلا، بے جان۔ اُس میں اب وہ پچھلا سا لگاؤ، اور شدّت نہ تھی۔ جیسے ایک دَور تھا۔ یُگ تھا۔ جو بیت گیا ہو۔ مکل دا نے اُن دونوں کو اپنی اداکاری میں جان ڈالنے کے لئے کہتے۔ لیکن وہ ایک ٹوٹے ہوئے سپنے کی کرچیں اکٹھی کرنے میں ناکامیاب تھے۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے سونیا اور نیرج ندی کے دو کنارے ہوں جو پاس پاس رہنے پر بھی کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ مکل دا کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کریں۔

فلم بنتی چلی جا رہی تھی۔ مکل دادا کے نزدیک اُن دونوں کی اداکاری بیشتر ہیرو ہیروئن کی طرح گوارا تھی۔ مکل دادا کو اس کا رنج تھا۔ وہ اِس فلم کو اپنی باقی دوسری فلموں سے بھی بڑھ کر ایک امتیازی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ فلم کی شروعات اور اُٹھان سے تو اُنہیں بہت اُمید بندھ گئی تھی۔ لیکن وہ عین منجدھار میں آکر پھنس سے گئے تھے۔ وہ تو اب بھی ایک ایک سین کے کئی کئی شاٹ دُہراتے۔ لیکن اُنہیں بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔ ہر شاٹ میں کوئی نہ کوئی خامی رہ جاتی تھی۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

راج کو بھی سونیا اور نیرج کی فلمی جوڑوں کی پبلسٹی میں خرچ کیا ہوا پیسہ ڈوبتا نظر آنے لگا۔ اُس کی نگاہیں کسی نئے ہیرو کو کھوجنے لگیں۔ اور پھر ایک دِن مکل دا، اور اُس نے اپنی نئی فلم کے لئے پُونہ فلمی انسٹی ٹیوٹ سے تربیت یافتہ ایک خوبصورت نوجوان سریش میر چنداني کو چُن لیا۔ ہیروئن کے لئے تو سونیا موجود تھی ہی۔!

سونیا کو جب معلوم ہوا کہ سریش بھی سندھی ہے تو بہت خوش ہوئی۔ سریش تھا بھی بہت خوبصورت۔ سونیا کا دِل زخموں سے چھلنی تھا۔ اور وہ نیرج سے بدلہ لینے کی خواہش میں تڑپ رہی تھی۔ اُسے اپنے آپ کو سریش سے ہم آہنگ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ سریش کی ذہانت اور خوش مزاجی پر مر مٹی۔!

نیرج کو جب پتہ چلا کہ راج نے نئی فلم کے لئے سریش کو ہیرو چُنا ہے۔ تو اُسے ایک دھکا سا پہنچا۔ اُسے احساس تھا کہ اُس کی اداکاری پر گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ وہ منوج بننے کی کوشش کرتا۔ لیکن منوج کا کردار جیسے اُس کے ہاتھوں سے بار بار پھسل جاتا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ دراصل وہ نینا کی موت کے بعد اپنے آپ میں نہ رہ سکا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اب مکل دادا کو ایک ایک شاٹ کئی بار لینا پڑتا۔ سونیا بھی تو اب پُورا تعاون نہیں دے رہی تھی۔ بہت سے شاٹ تو صرف اُس کی وجہ سے ہی لینے پڑتے تھے۔ وہ اُس کا موڈ بننے ہی نہیں دیتی تھی۔

جب اُس نے سریش کو دیکھا تو اُس کے اندر حسد کا جذبہ بھڑکنے لگا۔ وہ سب کو ایک بار بتا دے گا، کہ وہ اِن کل کے لونڈوں کے مقابلے میں کتنا مہان تھا۔ صرف اُس کو ایک اور چانس ملنا چاہیئے تھا۔

"سُہانے سپنے" کی شوٹنگ مکمّل ہو چکی تھی۔ فلم ایڈیٹنگ رُوم میں تھی۔ اور پھر وہ سینسر کے لئے تیار تھی۔ سونیا اور سریش کی نئی فلم پروڈکشن نمبر ۳ کی کاغذی کارروائیوں کے تمام مرحلے طے کر چکی تھی۔ اُس کے ریہرسل بھی شروع ہو گئے تھے۔ لیکن نیرج کا مستقبل ڈانواں ڈول تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ کنٹریکٹ کے مطابق نیرج کو نہیں بلکہ راج کو ہی اُس کی اگلی فلم کی فکر کرنی تھی۔ لیکن یہ لایقینی نیرج کی خود اعتمادی کو بُری طرح سے لرزا رہی تھی۔

سونیا جو نیرج کے گرد سیارے کی طرح گھومتی تھی، اب اُس سے دُور، دُور رہنے لگی تھی۔ اُس کا نیا مرکزِ توجّہ تھا سریش! اب وہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ وہ نیرج کو جہاں تک ہو سکے جلائے۔ نیچا دکھائے۔ وہ جان بُوجھ کر سریش کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، اُس سے لپٹی، چمٹی، نیرج کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتی، تاکہ نیرج کو مکمّل طور پر احساس ہو کہ اُس نے کیا کچھ کھویا ہے۔

اِدھر راج کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ نے سریش کو متعارف کرانے کے لئے ایک جانی بُوجھی اسکیم کے تحت اُس کی تصویریں، فلمی خاکے، فلم میگزینوں، اخباروں

کو بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ اور پھر اُس کے کچھ دنوں کے بعد ہی سُریش اور سونیا کی تصویریں چھپنے لگی تھیں۔ راج اِس بار اِس نئی فلمی جوڑی کی پبلسٹی کرنے میں قدرے مُحتاط تھا۔ جیسے وہ اِس جوڑی کو پہلے کامیاب دیکھنا چاہتا ہو۔ لیکن یہ سب کچھ نیرج کا ذاتی اندازہ تھا۔ نیرج کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اُس کی اپنی پبلسٹی قریب قریب ختم ہوتی جا رہی تھی۔ صرف اُسے ایک نئی فلم ہی زندہ رکھ سکتی تھی۔ !

نیرج کا اپنی نئی فلم کے لئے بے چین ہونا فطری تھا۔ اُس نے کئی بار راج سے اُس کے بارے میں بات چیت کی۔ لیکن راج ہمیشہ اُسے ٹال جاتا۔ وہ سُہانے سپنے کی ریلیز کے اِنتظامات میں سخت مصروف تھا۔ اُسے پروڈکشن ۹ کے لئے انتظام کرنے تھے۔ وہ نئی فلم کے لئے ایک نیا فائنسر ڈھونڈ رہا تھا۔ اُسے کوئی اچھی کہانی نہیں مِل رہی تھی۔ جو کہ نیرج کی شان کے مُطابق ہو۔ بس صرف ایک، آدھ مہینے میں وہ فارغ ہو جائے گا۔ اور پھر نہایت اطمینان سے نیرج کی نئی فلم کی شوٹنگ شروع ہو جائے گی۔

نیرج چاہتا تھا کہ "سُہانے سپنے" کی ریلیز سے پہلے ہی اُس کی نئی فلم کا اعلان ہو جائے۔ اُدھر شاید راج اِس بات کا مُنتظر تھا۔ کہ وہ نیرج کے بارے میں فیصلہ فلم ریلیز ہونے کے بعد ہی کرے۔ اور پھر نیرج نے ایک دِن اِس بات کا فیصلہ کروانے کے لئے ٹھان لی۔ اُس نے راج سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ سونیا کی نئی فلم کے بارے میں تو فیصلہ کر سکتا تھا۔ مگر اُس کے لئے کیوں نہیں۔ راج کا کہنا تھا کہ اُسے کوئی موزوں کہانی ہی نہیں مِل سکی تھی۔ جس میں کوئی نیرج جیسا کردار ہو۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ پایا راج ؟" نیرج نے ہمیشہ اپنے آپ کو ہر کردار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ !"

"کبھی تھا!، ایسا میرے دوست کبھی تھا۔! اب نہیں!" راج نے جواب دیا۔ !"

"اگر تم سچ مچ ایسا کرنے لگو تو میں پھر کل ہی تمہاری نئی فلم کا اعلان کر دوں گا۔"

"راج ہو سکتا ہے کہ نینا کی مَوت کی وجہ سے میں پچھلے دِنوں ڈگمگا گیا ہوں۔ لیکن راج میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں تمہیں مایُوس نہیں کروں گا۔ !"

اور اگلے روز نیرج کی نئی فلم "بہروپیئے" کا اعلان ہو گیا۔

۱۵

نیرج نے اگرچہ راج سے وعدہ کر لیا تھا لیکن اُس کے ذہن میں اپنی صلاحیتوں کے بارے میں اکثر شکوک جنم لیتے رہتے۔ اُسے خود بھی اپنے آپ میں تبدیلی محسوس ہوئی "سُہانے سپنے" کی ریلیز کے بعد میگزینوں اور اخباروں میں چھپے ہوئے تبصروں نے اُسے اور بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایک مشہور فلمی پرچے نے لکھا تھا۔

"سُہانے سپنے" کا خصوصی پہلو اور نمایاں کمزوری نیرج ہے۔ کہیں تو نیرج بلندیوں پر نظر آتا ہے اور کہیں وہ عمیق غاروں میں۔ نیرج جیسے بلند پایہ اداکار سے اِس قدر ناہموار اداکاری کی کبھی بھی اُمید نہ کی جا سکتی تھی۔ یہ فلم کسی بھی بین الاقوامی مقابلے میں اِنعام لے سکتی تھی۔ لیکن محض نیرج کی عدم توجہی کی وجہ سے غارت ہو گئی۔ !"

یہ فلم جہاں جہاں ریلیز ہوئی۔ وہاں سے ملی جُلی رپورٹیں آئیں۔ سونیا اور نیرج کے نام پر لوگ کھچے چلے آئے۔ لیکن دوسرے تیسرے ہفتے میں ہی فلم کی گرفت ڈھیلی ہوتی نظر آئی۔ فلم باکس آفس پر اگرچہ پہلی فلموں کی طرح کامیاب نہ تھی۔ لیکن مالی اعتبار سے اتنی گئی گزری بھی نہ تھی۔ راج کو فلم کی مالی کامیابی کی فکر نہ تھی۔ کیونکہ وہ سارا پیسہ تو ڈسٹری بیوٹروں سے وصول کر ہی چکا تھا۔ لیکن اُس کی ساکھ کی ضرور آزمائش تھی۔ اُسے بھی مُکل دادا کی طرح بڑی خواہش تھی کہ یہ فلم کسی اِنٹرنیشنل فلم فیسٹول میں دیش کے لئے کوئی ایوارڈ جیت کر لائے۔ لیکن یہ سپنا ادھورا ہی رہ گیا تھا۔

"بہروپیئے" کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ ہیروئن کے لئے سپنا کو چُنا گیا تھا۔ سپنا کے ساتھ نیرج پہلے بھی کام کر چکا تھا۔ سپنا ایک خاموش قسم کی عورت تھی۔ وہ اپنا کام نہایت لگن سے کرتی۔ مگر وہ نیرج سے اکثر دبی دبی رہتی۔ جیسے اُسے اِحساس ہو کہ نیرج ایک

بہت بڑا ہیرو ہے اور وہ اس کے مقابلے میں ایک گمنام سی ایکٹریس۔ نیرج اس سے جو بھی کہتا فوراً مان لیتی۔ نیرج کو اس لحاظ سے سونیا کی بہت یاد آتی۔ سونیا تو اس سے کبھی کبھی جھگڑ بھی پڑتی تھی۔ اور اس لڑائی میں نیرج کو مزا آتا تھا۔ لیکن سپنا تو موم کی ناک تھی۔ جس طرف مروڑا مڑ گئی۔ سپنا یوں بھی کچھ زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ سانولا سا رنگ۔ لیکن اس کے نقش قدم بہت تیکھے تھے۔ فلم میں اسی وجہ سے اس کا چہرہ نہایت جاذب نظر معلوم ہوتا ۔۔۔ سونیا کو دیکھ کر تو نیرج رومان پرور فضاؤں میں اڑنے لگتا تھا۔ لیکن سپنا کو دیکھ کر اسے کبھی بھی ایسا احساس نہ ہوا تھا۔ نتیجے کے طور پر ان دونوں کے LOVE SCENES بہت پھسپھسے تھے۔ کئی بار شاٹ لئے گئے۔ کہانی میں ڈائیلاگ اور سچوایشنز تک بدل دی گئیں۔ لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی جس کے لئے نیرج ایک کامیاب ہیرو کہلایا جاتا ۔۔۔ "جے گنگا مائی" کی بات دوسری تھی۔ اس فلم کا رومان نہایت ڈھکا چھپا تھا۔ اب تو باکس آفس کا بھی تقاضا تھا کہ رومان میں اضطراب اور ہیجان ضرور ہو۔ نیرج کے لئے سپنا جیسی ہیروئن کو لیکر یہ سب کام بہت مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے اصلیت لانے کی بہت کوشش کی۔ پبلک نے پکچر کو دیکھا اور اسے معمولی کہہ کر بھول گئی۔

نیرج کو فلم کی ناکامیابی کا سخت صدمہ ہوا۔ وہ ایک بار پھر کردار کے خول کو اوڑھنے میں ناکامیاب ثابت ہوا تھا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ یہ احساس اسے بری طرح کرید تا کہ یہ اسے کیا ہو گیا تھا؟!

راج بھی جیسے اس سے مایوس ہو گیا تھا۔ فلم نے مشکل سے خرچ پورا کیا تھا۔ اور ایک دن جب اس نے باتوں ہی باتوں میں اسے 'سیکنڈریٹ' ہیرو کہہ دیا تو نیرج غصے اور جھنجھلاہٹ سے چلا اٹھا۔

"سیکنڈریٹ! راج تم نے میری بے عزتی کی ہے۔! اگر تم مجھے اپنی فلموں میں نہیں چاہتے تو نہ سہی، پروڈیوسروں کی کمی نہیں۔ وہ لائن لگائے میرے دروازے کے باہر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں نے تم سے دوستی نبھا کر غلطی کی۔!"

اور دوسرے ہی دن اس نے چھگن بھائی سے "ناچے من مورا" کے ہیرو کے لئے کنٹریکٹ کر لیا۔ فلم کی ہیروئن زینت تھی۔!

جلد ہی نیرج کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے صرف راج کو یہ جتانے کے لئے کہ اسے پروڈیوسروں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اور فلمی دنیا اب بھی اسے چوٹی کا ہیرو مانتی ہے۔ جلد بازی میں آکر نہ کہانی کی تفصیل پوچھی تھی نہ کسی ڈائرکٹر، موسیقار یا ایکٹر کی۔ کہانی تفریحی کہانی تھی جیسی کہ عام ہندوستانی فلموں کی ہوتی ہے۔ چھگن بھائی کا مقصد پیسے بٹورنے کا تھا۔ اور اس نے صرف اس کے نام کی کشش کی غرض سے اس کے منہ مانگے دام دیئے تھے، ہیرو کے رول میں نہ کوئی ڈرامہ تھا اور نہ کوئی جذباتی کیفیت۔ وہ کنٹریکٹ پھاڑ دینا چاہتا تھا۔ لیکن اب یہ ناممکن تھا۔

یوں بھی اسے زینت کبھی پسند نہ تھی۔ اسے اس کی خودنمائی اور جسم کی نمائش کبھی بھائی نہ تھی۔ وہ البتہ اس کے بے باکانہ اور نڈر انداز سے متاثر ضرور تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد نیرج کو احساس ہونے لگا جیسے زینت اسے بھی نمائش کے طور پر مختلف پارٹیوں میں لے جانے لگی ہو۔ جیسے وہ اپنے ملنے والوں کو متاثر کرنا چاہتی ہو۔ کہ نیرج جیسا ہیرو اس کے قدموں میں تھا۔ وہ زینت سے دور رہنا چاہتا ۔۔۔ وہ اس کی خاطر ایک پالتو کتا نہیں بننا چاہتا تھا۔ جسے ہر کوئی پچکارے۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے اور پھر ایک ناز بھری مسکراہٹ سے پکارے۔

"کم آن ٹائیگر۔!"

اسے زینت سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ اس سے ملنے سے بھی کتراتا۔ زینت نے اپنا جسم بھی اسے پیش کیا تھا۔ اپنی کئی سہیلیوں سے بھی ملوایا تھا جو اسے دبوچنے کے لئے تیار تھیں۔ یہ سب اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ الٹا زینت کے لئے اس کے دل میں جو تھوڑی بہت عزت تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ زینت کو نیرج کا یہ روکھا

پن اچھا نہیں، لگا تھا۔ اُس کی توقعات بالکل پوری نہیں ہوئی تھیں۔

یہ سب باتیں نیرج کو اپنی اداکاری میں رکاوٹ بنتی معلوم ہوتیں۔ اُسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس ماحول میں کبھی کوئی یادگار فلم نہیں بنا سکے گا۔ فلم کا ڈائرکٹر ایک نوجوان راکیش مہرہ تھے۔ اُنہوں نے تین چار فلمیں بنائی تھیں، جو کہ باکس آفس پر خاصی کامیاب تھیں۔ راکیش مہرہ کے پاس نئے خیالات ضرور تھے۔ لیکن وہ اُن کا استعمال صرف فلم کے رومانی اور جنسی حصّے کو اُبھارنے پر ہی صرف کرتے۔

"ناچے من مورا" میں بھی اُنہوں نے ایسے ہی ایک، دو سین رکھے تھے۔ ایک سین میں ہیروئن بہت ہی مختصر لباس پہنے باتھ روم سے نکلتی ہے۔ اُسے ہیرو کے ساتھ ایک پارٹی میں جانا ہوتا ہے۔ وہ ہیرو سے انگیا کا ہک لگانے کے لئے کہتی ہے۔ تاکہ وہ جلدی سے تیّار ہو جائے۔ اِس سین کو فلمائے جانے والے دِن چھگن بھائی خاص طور پر فائنسر کو ساتھ لائے تھے۔ شوٹنگ دیکھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔

"سیٹ ریڈی ؟" ڈائرکٹر راکیش مہرہ کی آواز گونجتی ہے

"سیٹ او کے۔"

"لائیٹس آن ؟"

لائیٹس او کے۔"

"ذرا لائٹ ۲ کا زاویہ ٹھیک کیجئے۔۔۔۔ ہاں ذرا اور اِدھر۔!"

"ساؤنڈ ریڈی۔ ؟"

"ساؤنڈ او کے۔!"

کیمرہ ریڈی۔ ؟"

"کیمرہ او کے۔!"

زینت باتھ روم کے دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ اُس نے صرف انگیا اور ایک مہین سا انڈر ویر پہن رکھا تھا۔ تیز لائٹوں کی روشنی میں اُس کا جسم کُندن کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

"ایوری بوڈی ریڈی۔!"

"اِسٹارٹ" اور کیمرہ فلمانے لگا۔ پہلے ایک میڈیم شارٹ، پھر کلوز اپ۔ اور زینت آہستہ سے پکارتی ہے۔ "ڈارلنگ، ذرا یہ ہک تو لگا دینا۔!" وہ کولہے مٹکاتی منہ پھیر کر اُس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ڈنر جیکٹ میں ملبوس نیرج آگے بڑھتا ہے۔ اُس کا ہک لگاتا ہے۔ اُس کی اُنگلیاں اُس کے جسم کو چھوتی ہک لگانے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہک لگانے کے بجائے وہ باقی لگے ہوئے ہک بھی ایک جھٹکے سے کھول دیتا ہے۔ زینت اپنے بالوں کو ہاتھوں سے تھپتھپا رہی ہے۔ اچانک انگیا گر جاتی ہے۔ زینت ایک ہلکی سی چیخ مارتی ہے۔

"کٹ !"۔ ڈائرکٹر کی آواز گونج اُٹھتی ہے۔ ہال میں ایک شور سا مچ جاتا ہے۔ گردنیں زینت کے نیم برہنہ جسم کی طرف مُڑ جاتی ہیں۔ چھگن بھائی اور فائنسر اُٹھ اُٹھ کر زینت کی طرف دیکھتے ہیں۔

"لائیٹس آف، "لائیٹس آف" کا شور مچ جاتا ہے۔ لائیٹس آن، لائٹس آن !۔ فائینسر خوش ہو کر ایک بچے کی طرح تالیاں بجاتا ہے۔ چلاتا ہے۔ لائٹ اور کیمرہ بند ہونے میں تھوڑا وقت لگ جاتا ہے۔

"او ہیل !۔ وہاٹ ہیو یو ڈن ؟"۔ زینت کی آواز گونجتی ہے۔ اسٹوڈیو کی دیواروں پر اُن کی پرچھائیاں پھیل جاتی ہیں۔

"جو تم اتنے دنوں سے چاہ رہی تھیں زینت۔!"

نیرج کے لفظوں میں زہر بھرا طنز تھا۔ زینت اُس کی طرف تڑپتی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور پھر وہ تڑاخ سے نیرج کو تھپڑ رسید کرتی ہے۔ اپنی انگیا سنبھالتی سیٹ میں بنے ہوئے باتھ روم کی طرف بھاگ جاتی ہے۔

"یہ ٹھیک نہیں ہوا نیرج جی !" راکیش مہرہ کہہ اُٹھتے ہیں۔

"آپ کا کیمرہ رُک کیوں گیا۔ آپ بھی تو یہی چاہ رہے تھے۔ ڈائریکٹر صاحب۔ یہ پبلک اور سینسر لوگوں کو کیوں بے وقوف بناتے ہیں آپ لوگ!"

"آپ آرٹ کو نہیں سمجھتے نیرج جی!"

"میں شاید آرٹ کو سمجھوں یا نہ سمجھوں لیکن میں آپ کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں! آپ کو بھی!" اُس نے چھگن بھائی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کو بھی۔!" اُس نے فائنینسر کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا ——— کم سے کم آپ دُنیا کو فریب نہیں دیتے ہیں۔ آپ لائیٹس آن رکھنے کے حق میں ہیں نا!" شاید آپ اِس سے زیادہ کچھ اور بھی چاہتے ہیں۔"

اِتنے میں گاؤن پہنے ہوئے زینت غصّے سے تمتماتی ہوئی باہر آگئی۔

"چھگن بھائی! میں اِس ذلیل ہیرو کے ساتھ کام نہیں کروں گی۔! نیرج اپنے آپ کو بڑا ہیرو سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں میری بلا سے۔!"

"زینت بیگم! زینت بیگم۔!" کہتے ہوئے چھگن بھائی اُس کے پیچھے لپکے۔ "ارے ایسی کیا بات ہو گئی!" جیسے زینت کے لئے اس طرح سے برہنہ کیا جانا کوئی خاص معنی رکھتا ہو۔

"آخر میری بھی کچھ عزت ہے، آبرو ہے۔" زینت کہتی چلی جا رہی تھی۔

"عزت ہے، آبرو ہے!" نیرج نے زور کا ایک قہقہہ لگایا۔ کتنا بڑا ڈھونگ ہے، سامنے کی دِیوار پر اُن سب کی پرچھائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ فرش سے لے کر چھت تک ٹیڑھی میڑھی۔ جھکی ہوئی ——— !

"میں اِن پرچھائیوں کی حقیقت جانتا ہوں ——— میں اِن تمام پرچھائیوں کی حقیقت جانتا ہوں۔" وہ قہقہے لگاتا چلا جا رہا تھا۔

"نیرج جی! ہوش میں آیئے!" راکیش ہیرو اُسے جھنجھوڑ رہے تھے۔

"نیرج جی ہوش میں آیئے!" لیکن نیرج دیوانہ وار ہنستا چلا جا رہا تھا۔

"میں کلاکار ہوں! بہت بڑا کلاکار! اِن پرچھائیوں کی دُنیا کا سب سے بڑا کلاکار۔!" دیکھتے نہیں میری پرچھائیں سب سے بڑی ہے۔ ہاہاہا۔ ہاہاہا۔!"

۱۶

آپ نے سُنا!۔ آپ کا عزیز دوست نیرج پاگل ہو گیا ہے!" سُریش نے چائے کے چمچے سے کھیلتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

سونیا مالابار ہل کے OPEN AIR ریسٹورنٹ میں بیٹھی میرین ڈرائیو کا نظارہ کر رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ تیز بھاگتی ہوئی کھلونے جیسی کاروں کا پیچھا کر رہی تھیں۔ سُریش کی بات سُن کر وہ چونک گئی۔ وہ حیرت سے اُس کی طرف تکنے لگی۔

"ہاں، سچ! نیرج بالکل اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح سڑکوں پر دوڑتا پھرتا ہے۔ شام کے وقت وہ اکثر چوپاٹی پر لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ وہ کتنا بڑا کلاکار ہے۔!"

سونیا کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اُس نے بے صبری سے پوچھا "لیکن یہ سب کیسے۔؟"

"بیچارے کی ایک کے بعد ایک سب پکچریں فیل ہو گئی ہیں۔ چند لوگ ایسا صدمہ برداشت نہیں کر پاتے۔!"

سونیا نے سُریش کی طرف ایسے دیکھا گویا وہ اِس حالت میں ہوتا تو کیا کرتا۔ پھر اُس نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کہا "لیکن وہ ایک مہان کلاکار تھا۔!" وہ یہ کہہ کر چُپ ہو گئی۔

"سونیا جی! آپ اپنی کامیابی سے خوش ہیں نا!۔ دیکھئے ہماری پکچر "متوالے نین" سلور جوبلی منا رہی ہے!"

"سونیا کہنا چاہتی تھی کہ نیرج کی کئی پکچریں سلور جوبلی چھوڑ گولڈن جوبلی منا چکی ہیں۔ لیکن وہ خاموش رہی۔

"متوالے نین" پروڈکشن ۸! آٹھ کا ہندسہ میرے لئے ہمیشہ سے LUCKY رہا ہے!"

"آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ کی فلم کو ہی سلور جوبلی منانے کا فخر حاصل ہے!"

میں سمجھتا ہوں کہ یہ خوش قسمتی مجھے صرف آپ کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔!"

سُریش بولے جا رہا تھا۔ لیکن سونیا کو جیسے کوئی بات سُنائی نہ دے رہی ہو۔ اُس کے ذہن میں نیرج کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ جب سے سُریش نے نیرج کے بارے میں یہ بھیانک خبر دی تھی۔ وہ صرف اُسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ نیرج کو کبھی بھی بھلا نہ سکی تھی۔ وہ اگر سُریش سے زیادہ گھُلی ملی تھی تو صرف نیرج کو حسد دِلانے کے لئے۔ لیکن یہ اُس کی ہار تھی۔ وہ کبھی بھی نیرج کو اپنی طرف راغب نہ کر پائی تھی۔ اگر نیرج کو کسی سہارے کی ضرورت تھی تو وہ اُس کی طرف مخاطب کیوں نہیں ہوا۔ وہ ذرا سا اِشارہ پاتے ہی اُس کی طرف بھاگ اُٹھتی لیکن نیرج اگر ایسا کرتا تو وہ نیرج نہ ہوتا۔ اُسے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا۔

"آپ شاید میری بات سُن نہیں رہی تھیں۔"

"ہوں! ....." وہ جیسے چونک پڑی ہو۔ "ہاں! ..."

"میں کہہ رہا تھا کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں مکل دا جیسے ڈائرکٹر ملے ہیں۔!"

"ہاں، وہ تو ٹھیک ہی ہے!"

شام ڈھل رہی تھی۔ ہواہیں خُنکی بڑھ رہی تھی۔ سورج کا تھال سمندر کی سطح سے کچھ اُوپر نیلے آسمان کے سینے پر ایک بہت بڑے میڈل کے رُوپ میں لٹکا ہوا تھا۔

"چلیں!" سُریش نے چائے کا بل ادا کرنے کے بعد کہا۔

"چلو!" اور وہ دونوں زینے سے اُتر کر سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی بڑی سی 'پونٹیک' میں بیٹھ گئے۔ سُریش نے کار اِسٹارٹ کر دی۔

ابھی وہ تھوڑی دُور ہی جا پائے تھے کہ سونیا بے صبری سے پکار اُٹھی۔

"سُریش! مجھے چوپاٹی جانا ہے۔!"

"سُریش نے ایک لمحہ اُس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر اُس نے کار چوپاٹی کی طرف موڑ لی۔

"چوپاٹی کے ساحل پر معمول کی طرح بھیڑ تھی۔ شام کے وقت دِن بھر کے تھکے ہارے لوگ تھوڑی سی تفریح کے لئے سمندر کے کنارے کا رُخ کر لیتے ہیں۔

غریب لوگوں کے لئے سمندر کا کنارہ ہی کلب کا کام دیتا ہے۔ اِدھر اُدھر کے لوگ آپس میں مِل لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خیریت معلوم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھار اِسی ساحل پر بڑے بڑے سودے بھی طے ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی بہت سیر تفریح رہتی ہے۔ اِسی بھیڑ سے فائدہ اُٹھا کر اکثر خوانچے والے بڑی بڑی دُکانوں کے مالک بن گئے ہیں۔ بھیل پُوری۔ چاٹ، ناریل پانی، چوپاٹی کی خصوصی چیزیں قرار دی جا چکی ہیں۔

اکثر بڑے بڑے نیتا اپنی تقریریں فرماتے ہیں۔ لوگوں کو راہ پر لگاتے یا گمراہ کرتے ہیں۔ اور یہیں بندر والے ڈگڈگی بجا کر اپنے کرتب اور کھیل دکھاتے ہیں۔ آپ کسی بھی شام کو چوپاٹی چلے جائیں، کوئی ناٹک یا تماشا ہو ہی رہا ہوگا۔ چوپاٹی چلتا پھرتا سنسار جو ٹھہرا۔

چوپاٹی پہنچ کر سونیا کی نظریں نیرج کو ڈھونڈنے لگیں۔ لوگوں کی بھیڑ کو چیرتی ہوئی وہ مختلف مجمعوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہ نیرج کو ڈھونڈتی ہوئی ایک مجمع کو چھوڑ دوسرے مجمع کی طرف لپکتی۔ سُریش کے لئے پیچھے پیچھے بھاگنا مُشکل ہو رہا تھا۔

دفعتاً اُسے نیرج کی جانی پہچانی آواز سُنائی دی۔ اُس کے چاروں طرف ایک بہت بڑی بھیڑ اکٹھی ہو گئی تھی۔ وہ بھیڑ کو چیرتی ہوئی نیرج کے پاس اندرونی قطار میں پہنچ گئی۔

"میں ہوں پرچھائیوں کی دُنیا کا سب سے بڑا کلاکار۔! ہاں سب سے بڑا کلاکار!" نیرج نے ایک پینٹ پہن رکھی تھی۔ اور اُس کی پھٹی ہوئی قمیص پینٹ کے باہر نکلی ہوئی تھی۔ قمیص کی ایک آستین آدھی پھٹی ہوئی تھی۔ اور بٹن کھُلے تھے۔

"میں ہوں شہنشاہِ جہانگیر!" نیرج کی آواز گونجی۔ اُس نے ایک لمحے کے لئے پھٹی ہوئی قمیص کو سنوارا۔ پینٹ کو چوڑی دار پاجامہ بنانے کا سوانگ بھرا۔ مجمع میں کھڑی ہوئی کسی عورت کے جوڑے میں سے پھُول نکالا اور اُسے جہانگیری ادا سے سونگھتے ہوئے بولنے لگا۔

" شہنشاہِ ہند، ملکۂ عالم سے باریابی کی اجازت

کے خواہاں ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس طرح سے آپ کی تنہائی میں مخل ہوئے۔ سلطنت کے بے پناہ کام کاج کے باوجود وہ آپ کی زیارت کو اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے ہیں!"

سونیا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ نیرج کو اور زیادہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ اُس نے آنکھیں پھیر لیں۔ نیرج کا ایک ایک جملہ ہتھوڑے کی چوٹ کی طرح برس رہا تھا۔ اُس کی آواز میں وہی کشش تھی۔ وہی جادو تھا۔ جو آج سے کئی سال پہلے کی فلم کی جان تھا۔ وہ آگے بڑھ کر نیرج کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ اور جب نیرج نے اُس کی طرف دیکھا بھی جیسے اُس نے پہچانا نہیں۔ وہ اُس کے قریب سے ایسا گزر گیا۔ جیسے وہ اس مجمع کے کتنے ہی انجانے چہروں میں سے ایک ہو۔ وہ شاید کسی کو بھی نہ پہچانتا تھا۔

سونیا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اور زیادہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں سخت مایوسی تھی۔ وہ باہر نکلنے کے لئے مڑی۔ سامنے سریش تھا۔ وہ اُس کے کندھے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ سریش نے اُسے دلاسہ دیا۔ اور پھر اُسے پکڑ کر مجمع میں سے باہر نکلنے کے لئے راستہ بنانے لگا۔

مجمع کے گھیرے میں سے نیرج کی آواز آ رہی تھی۔

"میں ہوں راجہ دُشینت!" شاید اب وہ راجہ دُشینت کا سوانگ بھر رہا ہو۔ تھوڑی دیر میں پھر وہی آواز اُبھری۔"

"تن بھی چھینا، من بھی چھینا، چھین لیا گھر بار

جگ میں نہیں دیکھی تجھ سی سُندر نار..

"راجہ دُشینت شکنتلا کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ کچھ لوگ تالیاں بجانے لگے۔ چند ایک نے سونیا اور سریش کو پہچان لیا۔ تھوڑی سی چہ می گوئیاں ہوئیں۔ وہ اب مجمع سے باہر نکل آئے تھے۔ لیکن پھر جیسے سارے مجمع کو ایک ساتھ اُن کی موجودگی کی خبر ہو گئی ہو۔

سارے کا سارا مجمع نیرج کو چھوڑ کر اُن کے پیچھے ہو لیا۔

"نیرج کی آواز گونج رہی تھی۔ "میں ہوں پرچھائیوں کی دُنیا کا سب سے بڑا کلاکار۔!" لیکن اُس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔

دیکھو! سونیا اور سریش!" "متوالے نین" والے!" یہ سرگوشیاں اونچی آوازوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

" سریش بڑی مشکل سے سونیا کو کار تک لایا۔ اور پھر وہ دونوں کار میں بیٹھے، ہجوم کو چیرتے ہاتھ ہلاتے میرین ڈرائیو کی سڑک پر آ گئے۔ کار تیزی سے چل دی اور ہجوم پیچھے رہ گیا۔...

تالیاں بجاتا۔'

اُن میں سے اکثر بے حد خوش تھے۔ کیوں کہ انہیں اپنے محبوب ترین کلاکاروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا!

کار میں بیٹھی ہوئی سونیا کی نگاہیں مڑ مڑ کر ہجوم سے پیچھے اُس مہان کلاکار کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جو چوپاٹی کے ساحل کے بالکل قریب دُور اکیلا رہ گیا تھا۔ اور جس کے عین پیچھے سمندر میں ایک بہت بڑی سی موج اپنے سے آگے والی موج کو دبوچتی۔ روندتی، اُس پر فتح پاتی۔ ساحل سے ٹکرانے کے لئے دوڑتی، بھاگتی چلی آ رہی تھی ——!

آمنہ ابوالحسن

آمنہ ابوالحسن

آمنہ ابوالحسن حیدرآباد کے ایک معروف و معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے والد مولوی ابوالحسن سید علی مشہور ماہر قانون اور ممبر پارلیمنٹ تھے۔ بچپن ہی سے آمنہ صاحبہ کا رُجحان ادب اور آرٹ کی طرف رہا۔ پہلی کہانی اُسوقت لکھی، جب وہ مڈل اسکول کی طالبہ تھیں۔ اُن کی دوسری کہانی شاہد احمد دہلوی مرحوم کے رسالہ "ساقی" میں ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ اُس وقت سے اب تک کم و بیش ۳۰۰ کہانیاں لکھ چکی ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ اُن کی کہانیوں کے ترجمے ہندوستان کی کئی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

کہانیوں کا پہلا مجموعہ "کہانی" کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں اُن کا پہلا ناول "سیاہ سُرخ سفید" شائع ہوا جسے ادبی حلقوں نے بے حد سراہا۔ دُوسرا ناول "تم کون ہو!" اشاعت کے مراحل سے گذر رہا ہے۔

۱۹۵۵ء میں حیدرآباد کے مشہور صحافی مسٹر مصطفٰی علی اکبر سے، جو اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اُردو نیوز کے شعبے سے وابستہ ہیں، بیاہی گئیں۔

آمنہ صاحبہ نظریہ اور اعتقاد کے اعتبار سے بائیں بازو کے رُجحانات کی حامل ہیں۔ انسانی زندگی کی کشمکش میں اُن کے قلم نے ہمیشہ تاریکی کے خلاف اُجالے کی حمایت میں، ظلم کے خلاف مظلوم کی حمایت میں، جھوٹ کے خلاف سچائی کی حمایت میں آواز بلند کی ہے۔ دَورِ جدید کے انسان کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں، نفسیاتی اُلجھنوں، انسانی تاریخ کے کربناک دَور اور حیرتناک سائنسی ترقی کے گمنام سفر میں وہ انسان کی بنیادی خواہشوں اور آرزوؤں کی فتح کی قائل ہیں۔ صد ہزار مایوسیوں اور محرومیوں کے باوجود وہ انسان کے اُمید افزا مقدّر اور روشن مستقبل کا خواب دیکھنے کو ضروری سمجھتی ہیں۔

اپنے ادبی رجحان کی مطابقت سے وہ رُوسی اور فرانسیسی ادب سے بے حد متاثر ہیں۔ رُوسی ادب کی حقیقت پسندی اور فرانسیسی ادب کی بیباکانہ جراُت اور تلخی آمیز صاف گوئی کی دلدادہ ہیں۔ ادب اور معاشرے میں نراج و انتشار کو ناپسند کرتی ہیں، اِس لئے کہ انتشار اُصولوں اور عقائد کی قربانی طلب کرتا ہے اور اُصولوں کے بغیر زندگی ایک ڈراؤنے خواب کے سوا کچھ بھی نہیں ———

آخری دِن

آمنہ ابوالحسن

شام دُھندلی پڑ چکی تھی اور ڈھلوان پہاڑی پر سراسیمہ خرامی سے اُترتا ہوا اقبال محتاط ہو کر بھی کچھ بددل سا تھا۔ دفعتہً اُس نے لکڑی کے ایک ٹکڑے کو اپنے پاؤں کی اضطراری حرکت سے دُور پرے اُچھال دیا اور پھر نہایت کرخت اور کھوکھلی آواز میں وحشت کے ساتھ ہنس پڑا۔ دبیز سنّاٹے میں اُس کی وحشت بھری ہنسی دُور دُور تک پھیل گئی۔ گُونجنے لگی پھر ایک گنجلک صدا بن کر بڑی دُور کسی چیز سے ٹکرا کر خود اُس کے اپنے کانوں میں لوٹ آئی۔ لوٹنے تک اِس آواز کے کئی ٹکڑے ہو گئے اور گو کہ ہر ٹکڑا واضح طور پر اقبال کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تاہم اُسے یقینی اندازہ تھا کہ یہ اُس کی اپنی اوٹ آواز کے کئی ٹکڑے ہیں۔ مُنتشر اور بکھرے ہوئے۔ خود اس کے وجود کی طرح پامال۔

اُترتے اُترتے وہ یکایک رُک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر عجیب اشتعال بھری تھکن سے اُس گُل پوش زمین کو دیکھنے لگا جو پہاڑی کے قدموں میں ایک مخملی قالین کی طرح بچھی ہوئی تھی اور جس پر غروبِ آفتاب کا نظارہ عجیب طلسمی سماں پیش کر رہا تھا۔ بے شمار رنگ تھے مگر ہر رنگ، آخر کار سُرخ اور سُنہرے پن میں ڈوب گیا تھا۔

اقبال بڑی جذباتی بے چینی کے ساتھ مچلا۔ اُسے دفعتہً دوشیزہ بدن یاد آنے لگے مگر پھر وہ نہایت افلاطونی سنجیدگی کے ساتھ فوراً ہی گُل پوش زمین، ڈھلوان پہاڑی پر پُرپیچ راہ، تمام حسین رنگوں اور اپنی ہی صدائے بازگشت کو بالکلیہ نظر انداز کرتا ہوا تیز قدمی سے آگے بڑھ گیا۔ اُس کا ذہنی ارتقاء مدّت ہوئی رُک چکا تھا مگر اُس کے قدم ہنوز بڑھ رہے تھے۔ چلتے رہنے کے عادی سے ہو گئے تھے۔ کہیں رُکتے تھمتے نہیں تھے، جیسے رُکنا تھمنا اور ٹھیرنا بھول گئے ہوں۔ اب وہ ہمیشہ چلتا رہتا تھا اور چلنے کی اپنی حرکت کو ہی اپنی مجموعی بے خبری گردانتا تھا، کیونکہ جب بھی وہ رُک جاتا تو عین اُسی لمحے اُس کا ذہن جاگ جاتا۔ بغاوت کر دیتا اور جاگتے جاگتے وہاں جا پہنچتا جہاں اب اقبال کو کبھی نہیں پہنچنا تھا۔ اُس کے برخلاف جب تک اقبال حرکت میں رہتا اُس کا ذہن بھی اُس سے دُور، الگ تھلگ خاموش پڑا سویا رہتا اور حرکت کے دَوران کبھی بھول کر بھی ایک انگڑائی نہ لیتا۔ چنانچہ مدّتوں سے اقبال بس چل رہا تھا اور چلتے رہنا اب اُسکی سرشت بن چکی تھی۔ بیٹھنا اُسے عذاب معلوم ہوتا اور سونا تو بیٹھنے سے بھی کٹھن اور دُشوار اذیّت۔ نیند اس سے اتنا رُوٹھ چکی تھی کہ اب اقبال کو اُسے منانے کا یارا بھی نہ رہا تھا۔

اقبال کا چہرہ بالکل پتھرایا ہوا تھا اور اُس کے چہرے پر ہمیشہ ایک علانیہ بے تعلقی، بے گانگی اور سفّاکی کھیلتی نظر آتی۔ خدوخال کی یہ بے حسی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت بن چکی تھی۔ وہ شاذونادر ہنستا تھا اور محض اس لئے ہنستا تھا کہ کہیں وہ ہنسنا بالکل ہی بھول نہ جائے کیونکہ کسی کے قول کے مطابق انسان کی اصل آواز صرف اس کی ہنسی ہوا کرتی ہے۔ دل سے کھنچکر آنے والی اصل بے ساختہ ہنسی یا کہیں نہ کہیں سے زبردستی کھینچکر لائی جانے والی جبری ہنسی مگر اقبال خوب جانتا تھا کہ اِس ہنسی کی قیمت کیا ہے۔ یہ کتنی دُکھ بھری دردناک ہنسی ہے۔ اس میں عذاب کے کتنے تیز اور تند تیر و نشتر چُھپے ہوئے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھار ضرور ہنس لیتا تھا۔ کسی ہنسنے کی بات پر در اصل نہیں، بلکہ بلاوجہ اور خواہ مخواہ یونہی۔ کیونکہ وہ اپنی آواز بہرحال سُنتا رہنا چاہتا تھا اور اپنی ہی آواز سے نا آشنا نہ رہ جانا چاہتا تھا۔ اب اپنی آواز ہی اُس کی زندگی تھی اور زندہ رہنے کا عزم بھی۔ جب کبھی وہ ہنس پڑتا تو اُس کا تھکا ہوا اعتماد دفعتہً لرز اٹھتا تھا اور نگاہوں میں ایک گہری افسردگی پیدا ہو جاتی تھی۔ خدوخال زیادہ

بگڑ جاتے۔ زیادہ تلخ، مسخ اور پتھریلے ہو جاتے اور ٹھیک ہنسی
کے موقعوں پر ہی اُس کے فکری پیچ و خم کا ہلکا سایہ تو ایک
عجیب انفعالی انداز میں اُس کے نقش و نگار کو بجد وضاحت
عطا کر دیتا جیسے ہنسی ہر ہر نقاب چیر کر اسے سب سے
متعارف کرانے لگتی اور حالتِ ہنسی میں ہی ہراِک ٹنگتی
ہوئی خوابیدہ یا بے پروا نظر چونک چونک کر اقبال کے
گریزاں گریزاں وجود سے ایک گہری ملاقات کرنے لگ
جاتی جیسے پوچھنا چاہتی ہو۔ اِس ہنسی کا مطلب۔ ایسی
ہنسی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔؟؟

ویسے سب کی طرف سے اقبال کا رویہ بالکل کورا ہوتا
انجان اور بے نیازانہ مگر اس کی خاص ہنسی کے موقعوں پر
لوگ تجسس اور تحیر سے اسے دیکھنے لگتے اور اسے غیر دلکش
غیر دلچسپ اور بور سمجھ کر بھی اسے تاکنے لگ جاتے۔ اس
کی وحشت کا اتا پتہ ڈھونڈنے لگتے تو اقبال کچھ زیادہ
گھبرا جاتا، بوکھلا جاتا اور اپنی ہنسی سمیٹ کر بالکل خاموش
ہو جاتا، سکڑ اور اُلجھ جاتا۔ کیونکہ تمنّاؤں کا زمانہ بیت
چکا تھا اور بے خودی کا، خود سپردگی کا ایک بھی جیتا اور
جاگتا ہوا لمحہ اب اس کے پاس باقی نہیں رہا تھا۔ وہ کب کا
زندگی کے جھٹپٹے میں داخل ہو چکا تھا اور کسی فرسودہ
اصول یا خیال کی طرح نئے پن کی نظر سے ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے گر اور اُتر چکا تھا۔ زندگی کی شام مکمل طور پر اُسے
گھیر چکی تھی۔ آسودہ خاطری سے جینا یا طمانیت سے سوچنا
اور ہنسنا اب اُس کے نصیب میں نہ رہا تھا مگر بے چین
قہقہہ اُسے اب بھی اکسایا کرتا تھا اور سخت اضطراب
میں جب وہ کسی چیز کو نگاہ جما کے گھورتا تھا تو اُس کی
دھنسی ہوئی ماند آنکھوں میں بلاشبہ ایک گہری اور
قاتل نگاہ ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔ ہر قسم کی ملائمت اور
ذہانت سے خالی۔ زندگی کے تمام لوچ لچک اور لطافت
سے بے بہرہ دو کینہ پرور آنکھیں خونخوار جانوروں
کی نگاہوں کی طرح لو دینے لگ جاتی تھیں، اور
ہرچند کہ اقبال کی اس خونخواری تک کوئی پہنچ نہ
پاتا تھا، پھر بھی اکیلے دنوں اور سنسان راتوں میں، ہر ہر
رفاقت سے دور منجمد تنہائیوں کی طویل اور کٹھن راہ گذر
پر گھسٹتے ہوئے وہ اب تک اپنی ہمّت اور عزم کا کچھ
نہ کچھ حصّہ ضرور بچائے ہوئے تھا اور چاہتا بھی یہی تھا
کہ کوئی کبھی اس سے واقف نہ ہو، لہٰذا وہ سب سے
دور دور اور عمداً بے بہرہ رہتا تھا۔

اس کی آواز بھدّی، بھاری اور بوجھل ہو چکی تھی۔ ہر
کھنک سے خالی اور جسم کاٹھ گودام کی طرح سخت اور
جما ہوا۔ شہرِ خموشاں کی طرح ویران۔ آنکھوں میں خوف
کی بھیانک تحریر ہمیشہ سُرمے کی طرح کھنچی ہوئی اور ہونٹوں
پر ایسا بے مہر سکوت جو سردی کی شدید لہر کی طرح اُسے
ٹٹولنے والے ہر مقابل یا متمنّی کی ریڑھ کی ہڈی تک کپکپا
دے۔ انسانیت کا وقار اور دبدبہ اس کی شخصیّت کے
آس پاس کوسوں تک نایید، جیسے دنیا کی دلکشی کو پی
لینے، دنیا کے قد و قامت کو نگاہِ تحسین و طلب سے
دیکھ لینے، دنیا کو حاصل کر لینے، برت لینے کا ہر ہر اشتیاق
اُس میں بالکلیّہ دم توڑ چکا ہو اور دنیا کے لئے اُس کی
نگاہیں کوئی چمکیلی سطح اپنے پاس نہ رکھتی ہوں۔ تو پھر
وہ کیوں زندہ تھا۔ یہ عجیب سوال ہی در اصل اس کی
زندگی کا باعث تھا اور جینے کے ہر ہر جواز سے دور ہو کر،
منکر ہو کر بھی وہ ہنوز جیے جا رہا تھا اور کوئی اس کی
بابت کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ
وہ کہاں سے آیا اور آ کر اجنبی انسانوں میں رہ بس گیا۔
مگر جب رہ بس گیا تو متعلقہ لوگوں نے جان لیا کہ وہ ایک
مخبوط الحواس لیکن بے ضرر شخصیّت ہے، شاید
خود متضرر مگر دوسروں کے لئے ضرر رساں ہرگز ہرگز
نہیں۔ تب لوگوں کا نیا نیا تجسّس اور اشتیاق بھی اس
عجیب اور مخبوط الحواس انسان کے بارے میں خود بخود
ختم ہو گیا اور لوگوں نے اُسے بالکل اِس طرح قبول کرنا
شروع کر دیا جیسے گھنے جنگل میں ان گنت پرانے درختوں
کے درمیان ایک اور نیا درخت اچانک اُگ آیا ہو

اور قدرتی قوتِ نمو سے بتدریج اپنا تنا پھیلانے لگا ہو۔

پہلے پہل کچھ منچلوں نے خوب غور اور شوق سے دیکھا بھالا بھی تھا کہ اس تنے پر کوئی نام یا نشانِ پہچان تو کھدا ہوا نہیں ہے لیکن پھر انہیں ہو گیا کہ کوئی اس تنے کے قریب آیا ہی نہیں تھا یا اگر آیا بھی تھا تو خلوص و محبت سے۔ شوق اور اختیار سے کبھی اپنا نام بطور یادگار اس تنے پر کندہ نہیں کیا۔ سو پھر تمام شوقین لوگ بھی جان گئے کہ یہ تنا بالکل اکیلا ہے، بالکل یکا و تنہا۔ سخت اور کھردری اوپری چھال کی پرتوں کے اندر نرم و نازک کسی مقام پر کہیں کوئی خوبصورت چھیلن نہیں۔ زندگی کا کوئی راز یا اسرار نہیں۔ یہ کمبخت خود کسی کا ہمراز نہیں اور نفسیاتی ساخت کے لحاظ سے چاہے یہ جیسا بھی سہی مگر نہ چہکتے ہوئے رنگوں کی طرح شکوہ سرا ہے نہ فطری سادگی کی طرح نرم اور حلیم الطبع۔ نہ کسی آراستہ شہر کی طرح فسوں ساماں و قابلِ نگاہ، نہ ہی گھمسان کے رن کی طرح پُر شور اور متوجہ کن۔ بلکہ یہ تو بس ایک انسان تھا جو انسان بھی نہیں لگتا تھا۔ خندق یا کھائی لگتا تھا۔ لہٰذا پھر لوگ اسے قدرے تمسخر اور خوف سے دیکھنے لگے۔ اپنے مختلف موڈس اور کیفیات کے تحت۔

اور رفتہ رفتہ سبھی جان گئے کہ اس کی کسی حرکت میں متوالے پرندوں جیسی شوخی اور چستی نہیں بلکہ ہر ہر حرکت میں ایک مضمحل سنجیدگی ہے۔ وہ نرمی اور نزاکت کا دشمن ہے، نسائیت کا بیری۔ اُسے فلسفۂ حیات سے کوئی دلچسپی ہے نہ رنج و محن سے، نہ موت سے نہ مسرت سے۔ وہ تو کچھ اس طرح جی لیتا ہے، چل پھر لیتا ہے جیسے یہ سب کچھ وہ خود نہ کر رہا ہو بلکہ اس کے اندر چھپا بیٹھا کوئی اور ہی، جو اپنے انجام سے واقف بھی ہے اور جیسے آخرش مر جاتا ہے مگر زندگی میں کبھی کسی رائے کی کوئی پروا نہ کرنا۔ کسی مشورے کو کبھی قبول نہ کرنا۔ خود کسی کو کوئی رائے یا مشورہ نہ دینا۔ صرف اپنی ناتمام شخصیت اور مکمل غیر آسودگی سے نباہتا اور نہ جانے کیوں زندہ رہنا اور زندگی کی تہمت برداشت کرنا۔

وہ ہمیشہ اُکتایا ہوا اور ہکّا بکّا ہی نظر آیا۔ کبھی کچھ سوچتا ہوا بھی نہ ملا مگر وہ اکیلا جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ کیا سوچتا رہتا ہے۔ کیا کیا سوچ سکتا ہے۔ اُس کی سوچ اس سمندر کی تہہ کی طرح ہے، جس میں چھپی مچھلیوں، کیڑوں اور گرداب و بھنور کے بارے میں جس کی بدترین خطرناکیوں اور بہترین گہرائیوں کے بارے میں بہرحال سوچنا ہی پڑتا ہے۔ سوچنا ضروری ہے کیونکہ گو زمانۂ حال اُس کے لئے بے معنیٰ تھا اور مستقبل بھی گھٹاٹوپ اندھیروں میں چھپا ہوا اوجھل مگر زندگی کے باغی ترین اور بعید ترین لمحوں میں اندھی تاریکی اور یاس کی ایک ایک چلمن اٹھا کر اس کا تمام ماضی علانیہ اس کے روبرو آجاتا اور بار بار اس کے دماغ میں ایک دردناک پھوڑے کی طرح کپکپا اٹھتا تھا۔ ایک ٹیس کی طرح اس کے تمام جسم میں پھیل جاتا اور پوچھتا۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا؟

ارجمند اُسے ہوک کی طرح یاد تھی —!

ارجمند جو اس کی اپنی بہن تھی اور جس کا سارا بچپن اور لڑکپن اقبال کے ساتھ لڑتے جھگڑتے۔ میٹھے میٹھے ٹنٹے کرتے گذر گیا تھا۔ ان دنوں اقبال ارجمند کے بغیر جی نہ سکتا تھا، مگر جیسے جیسے وہ بڑی ہونے لگی، اقبال کی سمجھ سے دُور ہوتی گئی۔ اقبال اسے سمجھنے میں ناکام رہنے اور جھنجھلانے لگا کیونکہ وہ ازل کا کھلنڈرا اور گہرے جذبوں سے غیر آگاہ تھا۔ اسے عقل و فہم کی بیشتر باتیں یکسر ناقابلِ عمل اور انہونی سی لگتی تھیں۔ وہ مدّتوں ارجمند کے ساتھ رہا تھا۔ اس نے زندگی کا پل پل عرصہ ارجمند کی معیّت میں ہی سمیٹا اور حاصل کیا تھا۔ زندگی کو خود سے باندھ رکھا تھا مگر جب ارجمند اسے ایک نئی ہستی نظر آنے لگی تو وہ دفعتہً کچھ ٹھٹک سا گیا، ٹھٹھر سا گیا تھا۔ ارجمند کی تبدیلی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ محض ایک شوخ اور کھلنڈری لڑکی سے وہ کس طرح

یک بیک پرسوز اور گنجلک سی بن گئی۔ کسی نئی خواہش کی
گرمجوشی سے سرشار۔ زندگی کے استقبال کی شدید تمنّا اور
اور خفیہ جذبات کے خیر مقدم اور قوت کے نشے میں مبتلاً
جوش و خروش سے بھری ہوئی۔ خیال پرست نہیں بلکہ
استدلال پرست اور نہایت ہی فاتحانہ عزم و استقلا
کا نمونہ اور نمائندہ۔ بے انتہا بے تکلف اپیل اور فیصلہ
کُن قوت کے ساتھ محض اپنی ہی آرزو کی جانب لپکتی
ہوئی۔ جو کچھ کہتی ہوئی نظر بھی نہ آتی تھی مگر پھر بھی سب
پر حاوی ہو چکی تھی۔ جس نے اپنی طلب میں اقبال کو
بالکل گنوا دیا تھا کیونکہ اقبال محسوسات کی اس سطح
پر ارجمند کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ ادراک کی اُن
تہوں کو نہیں پا سکتا تھا۔ وہ زندگی کے شعور میں ارجمند
سے بہت پیچھے تھا۔ لیکن سخت کھوج کے بعد ایک دن
اقبال کو پتہ چل ہی گیا کہ ارجمند کی اس دفعتہً تبدیلی
کا راز کیا ہے ـــــــ یہ راز ان کا چچازاد بھائی اُشفاق
تھا۔ جو وجیہہ اساطیری دیوتا کی طرح سربلند، خوبصورت
اور ترشے ہوئے خدو خال رکھتا تھا جو اپنے ذہن اور
اپنی انفرادیت میں اور تمام انسانوں سے علانیہ مختلف
تھا۔ جو اپنی علمی مصروفیت کے علاوہ بہت کم کسی سے
آمیز ہوتا تھا مگر جو ارجمند سے یکایک اس طرح آمیز
ہو گیا تھا کہ جب اقبال نے زیادہ غور کیا تو اُسے فوراً
اندازہ ہو گیا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ
کر کے جانچنا اور زندہ رکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ ارجمند
بھی رفتہ رفتہ اشفاق کا عکس بن چکی تھی اور اب
اُسی عکس میں زندہ تھی۔ شاید ارجمند اشفاق کے لئے ہی
پیدا ہوئی تھی۔

اس موقع پر حالانکہ اقبال نے ایک نئے جذبے
کا اتا پتہ پایا تھا مگر وہ اس جذبے کی چھان بین کی پھر
بھی زحمت نہ کر سکا۔ اُسے اپنے اندر ایسا جذبہ
دُور دُور تک نہ ملا لہٰذا وہ ارجمند سے یہ بھی نہ
پوچھ سکا کہ یہ کونسا جذبہ ہے۔ یہ کیسا جذبہ ہے؟

یہ انسانوں کو اس قدر جلد تبدیل کرنے کی طاقت کیونکر
اپنے آپ میں رکھتا ہے، بلکہ وہ کچھ دل برداشتہ اور
خود کو زیادہ یکا و تنہا محسوس کرنے لگا اور جہاں کا تہاں
کھڑا رہ گیا۔ ارجمند اس کی دسترس سے نکل چکی تھی۔ ارجمند
اس کی کھلنڈری دنیا سے گم ہو چکی تھی۔ ارجمند پاس ہو کر
بھی اُس سے بچھڑ چکی تھی اور اس وقت چلتے رہنا بھی
اقبال کے لئے اتنا ضروری نہ ہوا تھا۔ نہ ہی وہ ٹھہر کر،
رُک کر چیزوں کو دیکھنے ٹٹولنے اور ان سے محظوظ ہونے
کا عادی تھا۔ وہ تو بس سراسر ایک شوق تھا اور کچھ
نہیں ـــــــ

پھر اس نے شہنائیاں بھی سُنی تھیں اور ارجمند کو
اشفاق کے ہمراہ ہمیشہ کے لئے سدھارتے ہوئے بھی
دیکھا تھا مگر وہ سوائے اس کے کچھ اور نہ سوچ سکا تھا کہ
بالآخر ارجمند چلی گئی۔ اس کے ہر ہر شوق کو منجمد کر کے محض
اپنے شوق کی خاطر مگر وہ پھر بھی ارجمند سے نفرت نہیں
کر سکا تھا بلکہ ارجمند کی طلب اور ارجمند کی محبت
زیادہ گہرائی اور ہمہ گیری سے اس کے وجود میں جڑ پکڑ گئی
تھی اور وہ ہمہ وقت ارجمند کے بارے میں ہی سوچتا
رہتا تھا۔ ارجمند کی شرارت۔ ارجمند کی شوخی۔ ارجمند
کی ہنسی۔ ارجمند کی رفاقت۔ ارجمند کی دلکشی۔ ارجمند
جب تک اس کے ساتھ تھی اس کی چہیتی بہن تھی مگر بچھڑ
کر ارجمند اس کے لئے ایک زخم بن گئی تھی جو کسی وقت
مُندمل نہ ہوتا تھا۔ اقبال کی محبت کے جسم سے علیحدہ نہ ہوتا تھا جو
نہ سُوکھتا تھا نہ اقبال کو سکھ کی سانس لینے دیتا تھا۔ اُس نے جان لیوا تنہائی
میں گذارے۔ نہ اس نے شوق سے کچھ کھایا نہ کھیلا نہ
پڑھا مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اِس تنہائی کا عادی ہونے
لگا اور انہی دنوں اس نے سوچا کہ کچھ تو کرنا ہی چاہیئے
جو زندگی کو زندگی بنا سکے اور تب اسے یکایک ارجمند
کی عزیز سہیلی، ناری انکل کی لڑکی سونیا کا خیال آیا۔
وہ فوراً سونیا کی طرف رجوع ہو گیا تا کہ ارجمند کی
خالی جگہ سونیا کو دے کے پھر اپنا سکون بحال

کر سکے۔ چنانچہ وہ زیادہ تر سونیا کے ساتھ رہنے لگا۔ دونوں
کافی مسرت۔ یگانگت۔ محبت اور شرارت کے ساتھ رہ رہے
تھے مگر اُن کے اس ملاپ کو ابھی کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ
عجیب وغریب صورت حال پیدا ہونے لگی۔ تارا آنٹی کی
بیوی جو بحیثیت پڑوسن خود اقبال کی اماں کی بے حد اچھی
سہیلی اور ساتھی تھیں اور بڑی ہمدرد و خلیق خاتون۔
دفعتہً عجیب عجیب نگاہوں سے اقبال کی سیماب صفتی کو
گھورنے لگیں اور اکثر اپنی لڑکی سونیا کو بھی بات بے بات
وجہ بلاوجہ ڈانٹنے ڈپٹنے اور گھرکنے لگیں۔ اقبال اُن کی
اس تبدیلی کو بھی خاک سمجھ نہ پایا۔ مگر سونیا تاڑ گئی، اور
اقبال سے بولی۔

"تم زیادہ وقت میرے ساتھ مت گذارا کرو اقبال۔
امّی کو بُرا لگتا ہے۔"

"مگر کیوں بُرا لگتا ہے؟" اقبال نے اپنی مخصوص
سادگی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں لیکن امّی کہتی ہیں ہمیں ساتھ ساتھ نہیں
رہنا چاہیئے۔ لوگ بُری بُری باتیں کرتے ہیں اس طرح۔"

"غلط۔ پھر ارجمند کے لئے کسی نے کبھی کوئی بُری بات
کیوں نہ کی۔؟"

"ارجمند تمہاری بہن تھی اس لئے۔"

"اور تم ــــ گویا تم میری بہن نہیں ہو۔ تم بھی تو ارجمند
کے ساتھ اکثر میرے ساتھ ہی رہتی رہی ہو۔ کیا ہم سب
اکٹھے نہیں کھیلا کرتے تھے۔ تب لوگوں نے کچھ نہیں کہا تو اب
کیوں کچھ کہنے لگے۔ نہیں۔ یہ سب آنٹی کی اپنے دل کی باتیں
ہیں۔ دراصل وہ خود نہیں چاہتیں کہ۔ کہ۔۔۔۔" اقبال عمداً
رک گیا۔

"کہ۔ کہ۔۔۔ کیا، اپنی بات پوری کرو نا۔" سونیا مسکرا کر بولی۔

"ارے بات کیا ہے۔ یہی کہ اب وہ میرا آنا پسند نہیں
کرتیں، شاید۔ وہ نہیں چاہتیں شاید کہ میں تمہیں اپنی بہن
بناؤں۔" وہ کچھ روہانسا ہو گیا۔

"بے وقوف۔" سونیا نے نہایت افلاطونی انداز
میں کہا۔ "میری امّی اتنی خراب نہیں، مگر یہ دنیا۔ دنیا واقعی
بُری ہے اقبال۔" وہ اپنا آنچل انگلیوں پر لپیٹنے کھولنے لگی۔

"بس بس۔ تم بھی اپنی امّی کی طرح بولنے لگیں۔ دنیا ونیا
کچھ خراب نہیں، مگر آخر کو تم اپنی ماں کی بیٹی ہو نا۔ انہیں کی
طرح سوچنے لگیں اور کیا۔" وہ میز دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "لو
میں چلا۔ خدا حافظ۔"

"ٹھہرو۔ سنو اقبال۔" سونیا دفعتہً متانت سے بولی۔
"میں بھی تمہیں اپنا بھائی سمجھتی ہوں مگر مشکل یہ ہے
اقبال کہ تم میرے بھائی ہو نہیں۔ تم تو بس اقبال ہو۔" وہ
بات کی شدّت کم کرنے کو شرارت سے مسکرائی۔ صرف اقبال۔
مگر اتنے میں ہی خود اقبال کا دل سونیا پر سے اُتر گیا۔

بھائی نہیں صرف اقبال۔ اس نے سوچا اور اسے لگا
کہ ارجمند جو جگہ خالی کر گئی ہے اب اُس کا بھرنا ناممکن ہے
شاید۔ جب سونیا جیسی مانوس لڑکی یہ جگہ نہیں بھر سکتی تو
پھر وہ کوئی اور لڑکی کہاں سے لائے۔ پھر اور کس طرح اُسے
ارجمند کی بات سمجھائے۔ وہ دل برداشتہ وہاں سے بھی
چلا آیا اور اپنی ماں سے بولا۔

"میں آنٹی کو ایسا نہیں سمجھتا تھا مگر افسوس کہ ــــ"

"کیا ہوا؟" اس کی اماں نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ ہونا ہوانا کیا ہے مگر اماں یہ بتائیے کیا
سونیا کبھی ارجمند نہیں بن سکتی ــــ؟"

"کیوں نہیں۔" اماں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "برابر بن
سکتی ہے بلکہ بنی ہوئی ہے پہلے ہی سے۔"

"خاک بنی ہوئی ہے۔" اقبال جل کر بولا۔ "آنٹی جو ہمیشہ
مجھے دل وجان سے چاہتی رہیں۔ اقبال اقبال کرکے ہمیشہ
مُنہ سُکھاتی رہیں۔ اب جب کبھی سونیا کے پاس جاتا ہوں
ایسی خفگی سے دیکھتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یا تو میں بدل گیا
ہوں یا خود آنٹی ــــ"

"یہ بات ہے۔" اماں مسکرائیں مگر اقبال کو اُن کی مسکراہٹ
بھی اس وقت زہر لگی۔ یہ بھی کوئی مسکرانے کی بات
ہے بھلا۔ وہ جل رہا ہے اور اماں مسکرا رہی ہیں

واہ ری اماں ـــــ!

"پاگل لڑکے"۔ پھر اماں نے اُسے نرمی سے جتایا۔ "سو نیا آخر کو پرائی لڑکی ہے۔ تم اُسے لاکھ بہن سمجھو مگر کیا دنیا بھی اُسے تمہاری بہن ہی سمجھے گی، ہرگز نہیں۔"

"تو دنیا کو ماریئے گولی۔ آخر ایک بھائی بہن کے درمیان یہ دنیا ناحق کہاں سے کود پڑی اور کیوں بھلا ـــــ"

"واہ واہ واہ۔ جیسے تو خود دنیا میں نہیں ہے۔ ارے پاگل جس دنیا میں رہتا ہے اس کا خیال تو کرنا ہی پڑیگا تجھے۔"

"مگر مجھے تو دنیا کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں ہے اماں۔ میرے معاملات میرے ہیں۔ پھر دنیا کو کیا ضرورت پڑ گئی ہے کہ میں چاہوں نہ چاہوں مگر وہ خواہ مخواہ اپنی ٹانگ ضرور اڑائے ـــــ"

"دنیا تو ایسی ہی ہوتی آئی ہے بیٹا۔ کسی کو دنیا کی ضرورت ہو نہ ہو مگر دنیا کو سب کی ضرورت ہوتی ہے اور تم مانو نہ مانو، قبول کرو نہ کرو مگر تم دنیا سے بچ نہیں سکتے۔ دنیا کے بغیر اپنی زندگی نہیں گزار سکتے۔ بس اب آنٹی سے خفا ہونا ختم کرو۔۔ وہ بہت اچھی عورت ہیں۔ اور پھر ہم مدتوں سے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ آخر اب کسی ناراضگی یا نفاق کی ضرورت ہی کیا ہے بھلا ـــــ"

"ہوں! تو آپ بھی اپنے مطلب کی بات کر رہی ہیں نا۔ میری کوئی مدد نہیں، خیر ـــــ" وہ ماں سے بھی روٹھنے لگا

"ارے گدھے"۔ ماں نے اپنی گود میں سر رکھے ہوئے اقبال کے بال آہستہ سے جھنجوڑے۔ "تو اتنا بڑا ہو گیا ہے اور تجھے اتنی بھی عقل نہیں۔ اِس دنیا میں صرف ارجمند ہی تیری بہن ہے جبکہ باقی سب لڑکیاں ......" وہ ہکلا کر رک گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا اگلی بات کس طرح کہیں اور سمجھائی جائے۔

"باقی لڑکیاں کیا ہیں، اب یہ بھی بتا دیجئے نا" اقبال نے جل کر کہا۔

"باقی لڑکیاں بس لڑکیاں ہیں جو تیری بہنیں کبھی نہیں ہو سکتیں"۔ اماں نے بات کا ایک ڈھنگ نکال ہی لیا مگر اقبال پھر بھی مطمئن نہ ہوا۔

"آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں اماں جیسے میں دنیا کی تمام لڑکیوں کو صرف اپنی ہی بہنیں بنا لینا چاہتا ہوں۔ نا بابا نا۔ مجھے تو بس ایک بہن چاہیئے۔ بالکل ارجمند جیسی"۔

ارجمند کے ذکر کے ساتھ ہی اُس کے ہونٹ اپنے آپ مسکرا پڑے۔ اُس کے تمام وجود کے منہ میں مصری کا ذائقہ سا محسوس ہونے لگا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں کلبلانے لگے۔ شرارت کے لیے، شوخی کے لئے بے تاب ہو ہو گئے اور اس کے تمام سراپا پر ایک ایسی تابناکی اور خیرگی پھیل گئی، جیسے صبح کی اوّلیں ساعتوں میں طلوع ہوتا، اپنا اُجالا پھینکتا ہوا سورج اور اماں کے دل میں اس سورج کی جگمگاہٹ محسوس کر کے دفعتہً ایک چاند مچل گیا۔ وہ بے ساختگی سے بولیں "۔ ارے تو پروا کیوں کرتا ہے دیوانے۔ میں تیرے لئے بھی ایک لڑکی لے آؤں گی۔ خالص الخالص۔ اچھی سی۔ پیاری سی۔ بالکل اپنی ارجمند جیسی"۔

"سچ اماں ـــ؟" وہ مارے اشتیاق کے اُن کی گود سے اُٹھ بیٹھا اور اس کے تمام کمھلائے ہوئے مرجھائے ہوئے جذبے رہ رہ کے انگڑائیاں لینے لگے۔

"بتائیے کب۔ کب آخر۔؟" اس نے بے چینی سے پہلو بدل کر سوال کیا۔

"ارے تو تو اس طرح کہہ رہا ہے جیسے لڑکیاں بھی دوکانوں میں آٹے دال یا گڑیوں کی طرح سجی ہوتی ہیں کہ جاؤں اور فوراً پسند کر کے لاؤں۔ تھوڑے دن لگیں گے بھئی۔ لڑکی دیکھنی بھالنی ہوگی، جانچ پرکھ کرنی ہوگی کیونکہ وہ تیرا کھلونا تو نہیں"۔

"مگر کتنے دن۔؟" اقبال تھرکنے ناچنے لگا۔ پھر اپنی انگلیوں پر گنتے ہوئے بولا "جلدی بتائیے اور صحیح صحیح بتائیے کہ کتنے دن لگ جائیں گے اس کام میں ایک دو تین یا چار پانچ دن۔ آخر کتنے ـــ؟"

"ارے احمق"۔ اماں اچنبھے میں پڑ گئیں۔ کہیں یہ

بن تو نہیں رہا ہے کمبخت یا واقعی اِسے کچھ معلوم نہیں۔ یہ پڑھتے ہوئے بھی بچّہ ہی ہے ابھی۔"

مگر احمق اپنی ہی خوشی میں مست تھا۔ وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں پا رہا تھا سوائے اس کے کہ ارجمند کی پہلی والی جگہ پھر بھر جائے گا اور ہر ہر خلاء پورا ہو جائے گا۔ زندگی کے پھر وہی مزے آئیں گے کہ پڑھنا ختم کر کے لوٹو تو بس پھر ارجمند ہی ارجمند۔ حالانکہ وہ اور بھی لڑکیوں کو دیکھنے کا عادی رہا تھا اور اور دوستوں کے جھنڈ میں مل کر اس نے کئی بار نت نئی لڑکیوں سے ہنسی مذاق دل لگی بھی کی تھی مگر زندگی میں ارجمند کی جگہ کا جو تصوّر اور تعیّن تھا وہ ارجمند کی موجودگی تک تو اقبال کسی اور لڑکی سے کبھی وابستہ ہی نہ کر سکا تھا اور ارجمند کے چلے جانے کے بعد بھی جب جب اس نے سوچا تھا تب تب اُسے محسوس ہوا تھا کہ ہر لڑکی ارجمند جیسی ہوتے ہوتے بھی ارجمند سے بے حد مختلف تھی اور کبھی ارجمند کی جگہ نہیں پا سکتی تھی کیونکہ کسی اور لڑکی کے لئے اقبال کے دل دماغ میں وہ جذبات تھے ہی نہیں جو صرف ارجمند کا حصّہ تھے۔ دوسری لڑکیاں تو محض چھیڑ چھاڑ کا نشانہ تھیں اور ہرگز ہرگز ویسی شائستہ اور معصوم چھیڑ چھاڑ کا نہیں جو ارجمند سے مخصوص اور متعلق تھی کیونکہ زندگی میں عورت کی قُربت، عورت کی رفاقت، عورت کے کسی اور لطف کا کوئی اور تصوّر اس وقت تک اقبال کے ذہن اور معلومات میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ عورت کے متعلق اس کی تمام معلومات صرف ارجمند کی حد تک محدود تھیں اور ارجمند کے علاوہ وہ عورت کے کسی اور رخ کو جانتا پہچانتا ہی نہیں تھا۔

"ہاں تو بتائیے نا اماّں پھر کب — آخر کب لائیں گی آپ وہ لڑکی۔؟"

کچھ دیر تک اپنی ہی سوچ میں، اپنے ہی لطف میں غرق رہنے کے بعد اقبال پھر اصرار کرنے لگا۔

اور اماّں مبہوت سی اپنے جوان ہوتے ہوئے بیٹے کے اِس بچپن اور کورے پن پر حیرت زدہ سی رہیں، پھر تکلّف سے بولیں "اچھا بیٹھ تو سہی اور یہ بتا کہ تجھے کیسی لڑکی چاہیئے بھلا۔ تیری پسند کیا ہے آخر—؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ آپ تو ایسی انجان بن رہی ہیں اماّں جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔"

"ارے میں کیا جانوں پگلے۔ تُو خود بتا۔ خوب سوچ کر بتانا۔ ایسا نہ ہو کہ لڑکی آجائے اور پھر تجھے پسند بھی نہ آئے ہاں۔"

"گویا آپ ارجمند کو نہیں جانتیں۔" وہ کافی خفگی سے بولا۔ اُسے لگا اماّں جان بُوجھ کر بن رہی ہیں۔ پوز کر رہی ہیں۔

"ارے نیک بخت۔ اب ارجمند کا پیچھا چھوڑ۔ ارجمند تو پرائی ہوئی۔ اب ٹھیک ٹھیک یہ بتا کہ تجھے اپنی بیوی کیسی چاہیئے۔"

"بیوی؟" یہ لفظ اقبال کو کسی اچانک چوٹ کی طرح لگا۔ وہ چونک پڑا۔ اچھل گیا۔ "مگر اماّں، میں نے آپ سے بیوی کی فرمائش کب کی۔ میں تو۔ میں تو......"

"بس بس، اِس گھر میں تیرا سُونا پن دُور کرنے، تیرا ساتھ دینے صرف تیری بیوی ہی آ سکتی ہے، کوئی اور نہیں۔"

"لیکن۔ لیکن سوچیئے تو......" وہ ہونٹ چبا چبا کر سوچنے لگا کہ یہ بات کس طرف جا رہی ہے آخر۔ بیوی کے تو فرشتوں کے بارے میں بھی ابھی اُس نے نہیں سوچا تھا اور پھر بیوی کا مسئلہ ہے بھی کس قدر ٹیڑھا اور نازک —!

مگر اماّں اپنی ہی ہانکے جا رہی تھیں۔

سوچنا کیا ہے، ایک نہ ایک دن تو تیری بیوی کو آنا ہی ہے لہٰذا ابھی جب تُو اتنا اکیلا پن محسوس کر رہا ہے کیوں نہ آجائے بھلا۔"

"لیکن اماّں جی.....!"

"دیکھو اقبال، اب تم بچے نہیں رہے ہو۔ تمہیں ہر وہ بات سنجیدگی سے سوچ لینا چاہیئے جس کی خواہش

تمہارے دل میں ہے۔ جو تم کہنا چاہتے ہو، مانگنا، اپنے لئے پسند کرنا۔ یہ نہیں کہ زندگی کو ہمیشہ بچپن یا مذاق ہی سمجھتے رہ جاؤ۔ اِس طرح کب تک چل سکتا ہے آخر——"

"اچھا اچھا۔" اقبال کچھ گھبرا سا گیا۔ اماّں کی لطیف آواز اور مہین لب ولہجہ دفعتہً اُسے بڑا گمبھیر اور سنجیدہ لگا "میں سوچ کر بتاؤں گا اماّں، سوچ کر بتاؤں گا۔" اس نے جوں توں کہا اور بات کو آگے بڑھائے بغیر ایک ہی چھلانگ اور جست میں ماں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر وہ شام حالانکہ اس نے ایک پسندیدہ پکچر دیکھ کر گذاری، مگر رات جب سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو وہ اقبال کی زندگی کی پہلی رات تھی، جب نیند نے اُس کی آنکھوں میں آنے سے بالکل انکار کر دیا۔ بھئی سوچ لو، پہلے سوچ لو۔ جیسے نیند نے بھی اس سے کہا اور وہ واقعی سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ یہ اماّں نے کیسا غیر ضروری مسئلہ اٹھا دیا۔ اسے بیوی کی توفی الحال مطلق ضرورت نہیں۔ پھر وہ بیوی لے کر کرے گا کیا۔ اچار ڈالے گا یا مربّہ بنائے گا، مگر اسے تو ان دونوں کی ترکیبیں بھی نہیں معلوم تھیں اور خوب غور کرنے کے بعد اسے صاف پتہ چل گیا کہ بیوی اماّں کی محض کوئی چال یا ٹرک ہے۔ اس کے لئے قطعی غیر ضروری، کیونکہ ابھی تو اس کے کسی دوست کی بیوی بھی نہیں آئی تھی پھر! اف یہ بیوی ہے کیا چیز بھلا؟۔ یوں اس نے متعدد مردوں کے ساتھ اُن کی بیویوں کو ضرور دیکھا تھا اور رشتوں ناطوں کے لحاظ سے بھی کچھ نہ کچھ بیویوں سے ضرور واقف و متعارف تھا مگر اپنی بیوی کا کوئی خیال یا ہیولا ابھی تک اس کی خواہش کے ذہن میں اُبھرا نہیں تھا اور اب بھی جب اماّں کی تحریک پر وہ دراصل سنجیدگی سے اُس ہیولے کی بابت سوچنے لگا تھا تو اُسے پھر بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کی خواہش کیا ہے۔ ایک بیوی کیسی ہونی چاہیئے۔

اقبال نے وہ ساری رات کروٹیں بدل کر گذار دی اور اتنا سوچا اتنا سوچا کہ اُس کا کھلنڈرا دماغ تھک کر بالکل شل ہو گیا۔ مگر صبح تک بھی آخر کار وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس کی سمجھ میں اپنی بیوی کا ناک نقشہ اور عادات و اطوار آئے ہی نہیں۔ ناچار وہ اماّں کے پاس پہنچا اور ناشتے سے فراغت پانے کے بعد بولا۔

"میں نے رات بھر سوچا اماّں مگر میری تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں۔ اب آپ خود بتائیے میں اس سے زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ اور کس طرح کر سکتا ہوں آخر——"

اماں ہنس پڑیں۔ اُنہوں نے آہستہ سے اس کے کان اینٹھے، پھر ماںتا کی پوری مٹھاس اور تجربے سے بولیں۔ "تو گویا ابھی تجھے کسی لڑکی کی بالکل ضرورت نہیں۔؟"

"ہاں اماّں۔ بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔" وہ اپنے اصرار اور ارجمند کی طلب سے ایسا پھر گیا جیسے اُسے ارجمند کا خیال تک نہ ہو۔ وہ ارجمند کو جانتا پہچانتا تک نہ ہو۔

اور پھر جیسے ارجمند کی طلب اس کا ایک ایسا خواب بن گئی جسے وہ پل پل دیکھتا ضرور مگر کسی کے آگے دُہراتے ہوئے بھی ڈرتا کہ مبادا اس ذکر سے پھر اس کی بیوی کا کوئی بے کار ذکر نہ چل پڑے اور یوں ارجمند کے اور اس کے بیچ میں ایک ایسی کھائی حائل ہو گئی جو دن بہ دن عمیق ہوتی جا رہی تھی اور وہ جب جب اس کھائی کو لانگھنا چاہتا، ایک نامعلوم خوف اُس کے ارادے کے قدم تھام لیتا اور وہ بجائے پھلانگ جانے کے مُڑ کر ہمیشہ پیچھے ہی چل دیتا اور آگے جانے کا ارادہ ہمیشہ ملتوی کر دیتا۔ مگر اس واقعے کے بعد غیر شعوری طور پر اقبال کو ایک نیا شوق چرّایا اور اس کے بعد جب کبھی سڑک پر، تھیٹر میں، کسی محفل یا مجلس میں، کسی تقریب میں، جہاں کہیں اس نے ایک مرد اور عورت پاس پاس دیکھے، فوراً ان کے قریب پہنچ جانے اور شعوری طور پر عورت کو تاکنے لگا۔ اب بیوی کی کھوج اور مشاہدہ کرنا اُس کی ایک محبوب اور دل پسند دلچسپی بن گئی۔ تاکہ وہ بیوی کے اچھے سے اچھے رُوپ سے واقف ہو سکے اور خود اپنے سے بھی انصاف کر سکے۔ پہلے پہل اسے کوئی دُشواری نہیں

پیش آئی مگر جب اقبال کی یہ عادت مستقل ہونے لگی تو وہ
کئی مرتبہ تاکا جھانکی قسم کے الزام میں پٹتے پٹتے بچا اور
جس دن درحقیقت ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی نے اس کا
شریفانہ گریبان پکڑ ہی لیا اور وہ خود کو بچا کر بھاگ نہ سکا
تو اقبال کے اس شوق کی آنکھوں کے آگے بھی دفعتہً
تارے سے ناچ گئے اور ٹھیک اسی دن سے اس کا یہ
نشہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بالکل ہرن ہو گیا۔

عورت اس کے لئے ایک محبوب دلچسپی ضرور بن
چکی تھی مگر ابھی ذوق نہیں تاہم زندگی کے اس موڑ اور
مقام پر اسے عورت کی ضرورت اور اہمیت کا کچھ نہ کچھ
اندازہ ضرور ہونے لگا۔ ہر عورت اور ارجمند کا فرق ضرور محسوس
ہونے لگا۔ تب اس نے لڑکیوں میں اپنی دلچسپی کچھ زیادہ ہی بڑھادی۔
وہ پہلے سوا مذاق کے انکا کوئی نوٹس نہیں لیتا تھا مگر اب باقاعدہ اکثر
ہنسنے بولنے اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ بغیر کسی جذبے کے
ایک سادہ خالی الذہنی کے ساتھ لیکن باضابطہ میل جول
سے لڑکیوں کی قربت میں کوئی نئی بات اور نیا احساس
بھی پیدا ہونے لگا جو اپنے قدم آگے بڑھانے لگا اور
پھر وہ موقع بھی جلد ہی اقبال کی زندگی میں آگیا، جب
سینما تھیٹر، پکنکیں ایک تسلسل سے اپنے قدم جمانے
اور اپنی ضرورت منوانے لگیں، اپنی اہمیت اور حسن سے
اقبال کو مسحور کرنے لگیں۔ اپنی رنگ رلیاں اور راز و نیاز
جتانے لگیں۔ پھر جب تفریحات اور آمد و رفت بہت
زیادہ ہو گئی، تب اقبال کو صریحاً ایک نیا مزہ آنے لگا اور
زیر نظر پیچ و دل اور در پیش ملاقاتوں کے خفیہ جذبات
اور پنہاں معنی مطالب بھی تیزی سے اس پر عیاں اور
آشکار ہونے لگے۔ اب وہ عمداً کسی لڑکی سے چھو جاتا
یا کوئی لڑکی دانستہ خود اس سے ٹکرا جاتی، متصادم ہو جاتی،
تو یہ تصادم علانیہ اقبال کو جھنجھنا دیا کرتا تا۔ سمجھا دیا کرتا
کہ ہر لڑکی ارجمند نہیں ہوتی، نہیں ہو سکتی جب کہ
ارجمند تو اکیلی ہے اور ہمیشہ اکیلی ہی رہے گی کیونکہ
ارجمند سے کسی لمس نے کبھی اقبال کو کچھ نہیں
سمجھایا تھا، کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس سے کچھ مانگا نہیں
تھا۔ اس میں ایسا جادو کبھی نہیں جگایا تھا اور ارجمند
سے ٹکرا کر کبھی اقبال کا جسم اس طرح نہیں سنسنایا تھا کہ
وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ سنسناہٹ کیسی ہے
کیوں ہے، یہ کہاں سے پیدا ہوئی اور کہاں جا کر ختم
ہوتی ہے جبکہ ہر نئی لڑکی کے ہلکے سے ہلکے لمس نے بھی
اقبال کو ہمیشہ بے حد بوکھلا دیا تھا، بہت کچھ سکھلا دیا
تھا اور یہ تمام لمس وقتی ہو کر بھی تہہ بر تہہ اقبال پر
جمتے جا رہے تھے۔ روئی کے گالوں کو سمیٹے اس دبیز لحاف
کی طرح جس کی اپنی ایک خاص ضرورت ہوتی ہے اور جس
سے ایک خاص موسم میں کسی کو مفر یا انکار بھی نہیں
ہو سکتا۔ حتیٰ کہ بہت جلد اقبال کو اچانک اپنے بھرپور مرد
ہونے کا قطعی احساس ہونے لگا اور تب اسے ارجمند
کی بجائے درحقیقت اس لڑکی کی ضرورت اور افادیت
محسوس ہوئی جو صرف اس کی شوخی اور شرارت کو ہی
نہیں بلکہ اس کی پوری مردانہ شخصیت اور جسم کو جگائے
اور بحیثیت مرد فوراً اسے قبول کرنے پر آمادہ بھی ہو جائے۔

اس مرحلے پر اس نے سوچا کہ اماں سے جا کر کہہ دے۔
بس بس اب میرا بیاہ کر دیجئے۔ میں بیاہ کی نوعیت
سے آگاہ ہو چکا ہوں۔ لہٰذا میرے لئے ایک اچھی سی
لڑکی ضرور لا دیجئے مگر ٹھیک اسی وقت بلقیس بڑے
ٹھسے اور عزم سے اس کے اس معصومانہ خیال پر
ہنس پڑی اور کافی مضحکہ خیز انداز میں بولی "ایک لڑکی
کافی ہے۔؟ کتنے بے وقوف اور بدھو ہو اقبال تم۔ ارے
جب سو سو لڑکیاں تمہیں مل سکتی ہیں اور کئی ایک مل
ہوئی بھی ہیں تو اب اس حماقت کی ضرورت ہی کیا ہے
بھلا کہ بس ہمیشہ ایک ہی لڑکی پر قناعت کرنے کی
بات سوچنے لگ جاؤ۔"

خیال برا نہیں۔ اقبال نے محسوس کیا پھر بھی ایک
طرح کی کشمکش اور تذبذب سے بولا۔

"لیکن یہ بھی تو سوچو بلقیس کہ اس طرح معاملہ

کب تک چل سکے گا آخر۔ کوئی مستقل بندوبست تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

"دنیا میں کوئی چیز پائیدار اور مستقل نہیں اقبال"۔ بلقیس نے ایک ہمکتا ہوا قہقہہ لگایا اور اس قہقہے نے اقبال کی ناتجربہ کاری کو بالکلیہ اپنے چنگل میں پھانس اور جکڑ لیا۔ اگر اُس وقت بلقیس آڑے نہ آجاتی تو شاید وہ زندگی کے صاف سیدھے اور متعین و مقررہ راستے پر بڑی آسانی سے فوراً چل پڑتا اور زندگی کا اگلا تمام سفر آرام داطمینان اور سہولت سے طے کر لیتا۔ سکھ، طمانیت اور راستی کی آغوش میں جگہ پاکر زندگی سے کوئی تحفہ، حسین لیتا۔ زندگی کو خود اپنی طرف سے بھی کوئی نذر دے سکتا مگر بلقیس ایسی لڑکی تھی جو خود کھڈ میں گر پڑی تھی اور اب سب کو اُسی کھڈ میں گرا کر سکون حاصل کرنا چاہتی تھی، خوش ہو سکتی تھی۔ جسے کھڈ سے بچنے یا پرے رہنے والے بُرے لگتے تھے، اپنے ساتھ جو ساری دنیا کو ممکنہ حد تک کھڈ میں ہی رکھنا چاہتی تھی۔ لہٰذا بلقیس نے اقبال کے زرّیں گلے میں اپنی پُرشوق باہیں ڈال کر بڑی تمکنت سے کہا "خیر چلو، کر لینا ایک بیوی بھی، مگر ابھی اتنی عجلت کی کیا ضرورت ہے پگلے۔ بیویوں کی دنیا میں کمی نہیں اور ابھی تو تم بیوی کے استعمال سے پوری طرح واقف بھی نہیں اور پھر کیا میں مر گئی ہوں جو تم مزید تجربات کے لیے کسی اور طرف دیکھنا چاہتے ہو۔ پلیز یہ بدذوقی ملتوی کردو اور کچھ عرصہ صرف شوق اور لطف کے ساتھ گزار دو۔ ذمہ داریوں کے لئے تو ایک عمر پڑی ہوئی ہے۔"

بات اقبال کے ذہن میں جمنے لگی۔

یقیناً بلقیس سچ کہہ رہی ہے۔ ذمہ داریوں میں جکڑے جانے سے پہلے اُسے زندگی کا کچھ عیش و طرب تو ضروری طور پر حاصل ہی کر لینا چاہیئے۔ تب اس نے بھی بلقیس کو بھینچتے ہوئے کہا "مگر تمہیں اتنا جلد اتنا سارا تجربہ کس طرح حاصل ہو گیا بلقیس۔؟"

بلقیس کے وجود میں کہیں کچھ بے حد مبہم آنسو تھرتھرائے مگر اس نے ہنس کر ان آنسوؤں کو بہت جلد پی لیا، چھپا لیا اور تب وہ بڑی ظاہری بشاشت سے بولی "جب میں پہلے پہل بچی سے لڑکی بنی تب ہمارے پڑوس میں ایک بڑا خوبرو لڑکا رہتا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا مگر پھر بھی وہ مجھے پسند تھا۔ نہ جانے کس جذبے سے مجبور جب میں ایک بار اس کے پاس گئی تو پھر بار بار جانے لگی اور ہر ملاقات کے بعد وہ مجھے زیادہ پسند آتا گیا۔ حتیٰ کہ ہم دونوں نے مل کر اپنے اپنے کُنبوں سے بچھڑ جانے اور کہیں دُور بھاگ کر اپنی ایک علیحدہ اور باہمی زندگی گذارنے کا پروگرام بھی بنا لیا۔ بس ہم بھاگ ہی جاتے اگر ابّا کی نظر بروقت مجھ پر نہ پڑ گئی ہوتی۔ مگر جب ابّا نے مجھے اس ارادے کے ساتھ دیکھ لیا تو وہ مجھے پکڑ کر لائے اور زبردستی ایک کوٹھری میں قید کر دیا۔ دنوں میں بالکل بند رہی اور کسی سے مل نہ سکی۔ اسی اثناء میں ابّا نے میری شادی طے کر دی۔ میں ایک بالکل ہی اجنبی آدمی کی دُلہن نہیں بننا چاہتی تھی۔ مگر جب ابّا کی نگرانی میں بیاہ دی گئی تو شادی کے فوراً بعد ہی میں نے اپنے شریکِ حیات کو اپنا پورا قصہ سُنا دیا۔ وہ بہت جھنّایا اور مجھے طلاق دے کر چلتا بنا۔ میں پھر ابّا کے گھر آگئی اور جب موقع پاکر اپنے چہیتے لڑکے کے پاس گئی تو معلوم ہوا کہ اس کے ماں باپ نے بھی زبردستی اسے بیاہ دیا ہے اور وہ بے وقوف اپنے بیاہ سے خوش بھی ہے۔ میں جل بھن کر لوٹ آئی اور زندگی سے بیزار رہنے لگی۔ میں ابّا سے انتقام تو لے چکی تھی مگر اس لڑکے سے انتقام لینا ابھی باقی تھا۔ چنانچہ نت نئی ملاقاتوں کا موقع پانے کے لئے میں پھر دل لگا کر پڑھنے لگی کیونکہ اب مجھے کسی خاص لڑکے کی ضرورت نہیں رہی تھی، بلکہ ہر وہ لڑکا چل سکتا تھا جو میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہو جائے، اب میں بغیر لڑکوں کے جی نہیں سکتی۔ جینا بھی نہیں چاہتی تھی، میں پھر ابّا کو اور خود اپنے بے وفا بے وقوف محبوب کو بھی بتا دینا چاہتی تھی کہ زبردستی اگر کسی کو مالا مال۔ مسرور بھی کر سکتی ہے تو کسی کو یقینی طور پر تباہ و برباد بھی۔ سدا کے لئے بیکار اور دشمنِ اخلاق و انسانیت بھی۔ چنانچہ تب میں نے کالج کا راستہ لیا اور خود ہی دیکھ لو اب

کہ ہر ہر مرد سے کتنا خوبصورت انتقام بھی لے رہی ہوں
میں کتنی اچھی طالبہ ہوں کہ خود پڑھ بھی رہی ہوں اور اپنے
نزدیک آنے والے ہر لڑکے کو وہ سبق پڑھا بھی رہی ہوں
جس کو پڑھانا ہی اب دراصل میری زندگی ہے، میرا مقصدِ
حیات۔ میں ایک ڈاکٹر کو بھی جانتی ہوں جو وقتِ ضرورت
ہمیشہ میری مدد کر دیتا ہے مگر کبھی مجھ سے نقد فیس نہیں
لیا کرتا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

بلقیس کچھ اس طرح ہنسی کہ اقبال پھر بوکھلا گیا۔ وہ
صرف آنکھیں مچکا کے رہ گیا کیونکہ بلقیس کی سنائی ہوئی
کہانی اول تو اپنی اصلیت کے ساتھ اس کے پلّے نہیں پڑی
دوم وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ آخر اتنے سارے پاکھنڈ
کی کیا ضرورت تھی۔ بلقیس اپنے دھوکا دینے والے کو
بھول کر آرام سے گھر بیٹھ رہتی۔ کھاتی پیتی۔ موج اڑاتی۔
پرانے تعلق سے قطع تعلق کر کے صرف اپنی ہی زندگی گذارتی۔
مگر انتقام کے نام پر کالج کا سہارا لینے اور بار بار۔ ہر بار
انتقام کو دہرانے کی حاجت ہی کیا ہے بھلا مگر چونکہ اس
کی لغت میں اُس وقت انتقام جیسا کوئی لفظ ہی نہیں تھا
لہذا اُسے وہ ساری کہانی من گھڑت معلوم ہوئی تھی اور
بلقیس نے اُس کے ذہن کو پڑھ لیا تھا۔ "تم بوکھلا سے
ہو۔۔؟" بلقیس کا لطف دوبالا ہونے لگا۔ "مگر پگلے وہ
سچ مچ میرا بڑا اچھا دوست ہے۔ بے حد مخلص اور اُس
کے پاس ایسی ایسی مؤثر دوائیں ہیں کہ جو۔ جو۔۔۔۔۔"
بلقیس تھم کر اقبال کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"تم خود بھی کسی ڈاکٹر سے واقف ہو۔۔؟"

"نہیں۔" اقبال نے بے دلی سے سر ہلایا۔

"تم نے کبھی کسی کو پسند کیا ہے۔۔؟ کسی سے پیار
کیا ہے؟"

"نہیں ۔۔"

"کرنا چاہتے ہو۔۔؟"

"نہیں۔!"

"ویری گڈ۔ شاباش۔!!" بلقیس نے کچھ
خوشی اور کچھ حیرانی سے اُسے تھپتھپایا۔ "جو لوگ پیار
نہیں کرتے وہ سدا خوش اور بے فکر رہتے ہیں لیکن
کیا تمہیں پیار کا دراصل کچھ اتا پتہ نہیں یا تم عمداً اس
چکر میں پھنسنا نہیں چاہتے۔؟"

"اگر پیار ہو جائے تو میں ضرور کر لوں گا مگر پہلے
پتہ تو ہو کہ یہ پیار ہوتا کس طرح ہے۔ کیسے آخر۔؟"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔" بلقیس لوٹ لوٹ کر
ہنسی اور پھر تاکیداً بولی۔ "اگر خوش رہنا چاہتے ہو تو کبھی کسی
سے پیار ویار نہ کرنا۔ بڑا جھنجھٹ ہوتا ہے یہ۔ اسے پالنا
ہی نہیں۔ بس سیدھے سیدھے زندگی کے میدان میں
بگٹٹ بڑھتے رہنا اور راہ میں جو کچھ بھی مل جائے، جو
آسانی سے مل سکے اسے حاصل کر لینا اور اُسی کو اپنا حصّہ
سمجھ کر خوش ہونا۔ سُنا نہیں کہ پیار میں بیچارے مجنوں نے
کتنے پتّھر کھائے تھے اور فرہاد نے کتنی تیشہ زنی کی تھی۔
رانجھے کو ہمیشہ دریا عبور کرنے پڑے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

پھر جب اس نے پُچکار کر دوبارہ اقبال کے گال مسلے
اور رغبت سے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں لئے تو اقبال
کو یقین ہو گیا کہ بلقیس ایک منجھی ہوئی ہستی ہے اور اسے
زندگی کا بے حد صحیح صحیح اور گہرا تجربہ ہے۔ بڑا عمدہ سلیقہ کیونکہ
بلقیس کی ان حرکات سے وہ کچھ اس بُری طرح سے جاگ
گیا تھا کہ دبائے نہیں دب رہا تھا اور رہ رہ کے یہی سوچ
رہا تھا کہ انتقام ونتقام سب لغو باتیں ہیں جبکہ بلقیس
سب سے سچ اور بڑی حقیقت، دنیا کی سب سے اچھی چیز۔
لہذا پھر وہ خود بھی بلقیس پر ٹوٹ پڑا مگر عین اسی موقع
پر اس کے اندر وہ آن بان والی نازک سی چیز بھی ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی جو ہر زندگی کا سرمایہ ہوا کرتی ہے
اور جس کے بغیر زندگی سنور نہیں پاتی۔ سنواری نہیں
جا سکتی۔ مگر اب اقبال بھی ایک گہرے کھڈ میں گر چکا تھا اور
وہاں کی اندھی تاریکی ہی کو سرمایۂ شوق سمجھ بیٹھا تھا۔ وہ
گرنے کے باوجود مسکرا رہا تھا۔ ایک نیا ہلکا پھلکا پن،
اور یقینی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ اقبال کو بالکل

پتہ نہیں تھا کہ اب اس کے لئے ہر چیز غیر یقینی ہو چکی ہے۔ کچھ بھی یقینی طور پر باقی نہیں رہا ہے۔ پھر چند ہی دنوں میں وہ بلقیس کا ایسا گرویدہ ہو گیا کہ سوائے بلقیس کے ہر دوسری چیز کو بالکل بھول گیا۔ ایک ایک ہر ہر لڑکی نے جو کچھ اُسے دیا تھا بلقیس نے اُن سب سے بڑھ کر دے دیا اور ایک ہی وقت میں ایک ہی لمحے میں اُسے ایسا سیراب کیا کہ اقبال کا رُواں رُواں سرشار ہو کر جھومنے لگا اور اقبال کو اپنی زندگی اتنی بامقصد نظر آنے لگی کہ وہ جینے اور اس زندگی کو حاصل کرنے کے لئے ہر ہر جتن کرنے کو تیار ہو گیا جیسے اور تمام زندگی سے کہہ دینا چاہتا ہو۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میرے اس راستے میں کبھی نہ آؤ ــــ مگر بلقیس کو اُس کی یہ وابستگی اور والہانہ پن بھی محض ایک ــــ جنون نظر آیا کیونکہ انتقام کی چبھن میں مبتلا بلقیس ہر جذبے کو بالکلیہ روند کر گزر چکی تھی نزاکت اور احتیاط کی پابندیوں سے دور گزر چکی تھی۔ وہ ہر شے کی نرمی سے منحرف ہو چکی تھی اور بالکل اُس ناند کی طرح بن چکی تھی جو ہر روز دانے پانی سے ضرور بھر جاتی ہے مگر خالی ہوتے ہی پھر کسی بھی کونے میں آسانی سے رکھ دی یا پھینک دی جا سکتی تھی۔ اس کے مسخ ناآشنا خدوخال لطیف چمک سے قطعی کورے تھے۔ لطیف دھڑکنوں سے یکسر لاپروا، اور چہرے کی طرح اس کی آواز بھی بے جان، رُوکھی اور تڑخی ہوئی۔ لہجہ ہمیشہ زخمی۔ خیالات ہمیشہ نڈھال اور درماندہ۔ جذبات بھنچے ہوئے۔ آرزوئیں نامکمل۔ تمنائیں محض دادِ عیش کی دلدادہ، متوالی غرض کہ بلقیس کا تمام وجود اُس دھوئیں کی طرح گاڑھا اور کثیف ہو چکا تھا جو اطراف کی منور اور معطر فضا کو بھی بگاڑ سکتا۔ میلا، دھندلا اور بدبودار بنا دیتا ہے۔ بالکل سیاہی مائل۔ اور بلقیس کو اب حقیقی پیار سے بھی کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا بلکہ شدید نفرت ہو چلی تھی۔ وہ پیار کو پیدا ہوتے ہی توڑ مروڑ دینا، کچل دینا، مار دینا چاہتی تھی۔ لہٰذا وہ اقبال کے پہلے پہل جذبات کو بھی ارادی طور پر خودکشی کی طرف لیجا رہی تھی۔ اُس مقام کی طرف جہاں

پہنچ کر اقبال پھر کبھی زندہ نہ ہو سکے۔ اپنی دلکش خطرناکی سے کسی کو دائمی طور پر مفلوج نہ کر سکے اور بلقیس خوش تھی نہال اور بحال۔ مرد نہ اب اس کے لئے محبت کی چیز رہا تھا نہ وابستگی کی۔ نہ ہی مرد کے اندر اس کے لئے کوئی تحیر یا اشتیاق باقی رہا تھا بلکہ مرد تو اس کی ایک ایسی دلچسپی بن گیا تھا جو جالے کی طرح اس کے خیالات سے لپٹی ہوئی تھی اور یہ جالا وہ خود بھی صرف اس لئے توڑنا نہ چاہتی تھی کہ اِسی میں لپیٹ کر تو وہ زندگی کو اتنا کسنا چاہتی تھی کہ زندگی بالآخر ٹوٹ پھوٹ جائے اور کچھ بھی کسی کے ہاتھ نہ آئے ــــ اور ہر بھولے مرد کو اپنا شکار بنا کر، ہر مکروہ حرکت سے گزر کر وہ خود تو دن بدن توانا اور تندرست ہوتی جا رہی تھی مگر اقبال نامعلوم طریقے پر آہستہ آہستہ بیمار اور لاچار۔ اپنے مرض سے بھی غافل دن بدن لاغر اور ذہنی طور پر بے پروا۔

اس کی تفریحات کا دائرہ بڑھتا پھیلتا جا رہا تھا مگر اس کا تمام شوق فقط بلقیس کے آگے سربسجود۔ بلقیس کو ہی اپنا مرکز اور محور مان لینا چاہتا تھا۔ ایسے میں اچانک عائشہ بھی اُس سے آٹکرائی تو اقبال کی جستجو کا ذائقہ کچھ بگڑ سا گیا کیونکہ اقبال کی پیش قدمی کے جواب میں عائشہ نے اُسے خود کو چھونے بھی نہیں دیا۔ بس صرف محبت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی مگر اقبال نے سخت کڑواہٹ محسوس کی اور پہلی مرتبہ اس کی شوخی کو دھکا سا لگا۔ اس کی چالبازی متاثر اور افسردہ ہونے لگی۔ کاش کہ ہر لڑکی بلقیس ہو جائے۔ اس نے سوچا۔ جو خود سپردگی کے سوا کچھ جانتی ہی نہیں۔ جو اپنی چاہت سے خود مزید چاہتیں پیدا کرتی ہے اور کسی کو اتنی اجازت بھی نہیں دیتی کہ اُسے روک سکے یا خود رُک جائے۔

اقبال کا جی چاہا وہ اِس فاخر و مغرور گٹھری کو اُٹھا کر پرے پھینک ڈالے۔ جب اِسے کچھ لینا دینا نہیں تھا تو وہ اس کی راہ میں آئی ہی کیوں۔ کیا صرف اُس کے طیش کا امتحان لینے یا اُسے مزید اُکسانے مگر

ابھی اقبال بلقیس کی طرح اتنا جری بیباک اور نڈر بھی نہ ہوا تھا کہ وہ عائشہ سے کھلم کھلا بازپرس کرنے لگ جاتا یا اُسے دبوچ ہی لیتا۔ لہٰذا چپ چاپ ٹھیرا اپنے گڈمڈ وجود کو کریدتا اور کھنگالتا رہا۔ وہ کیا چاہتا ہے۔ دراصل کیا۔۔۔؟؟ جذبات اور حرص و ہوس کی اِس جنگ اور کشمکش میں اس کا اصلی مطمحِ نظر کیا ہے۔ اس کا اپنا حقیقی کردار اور حصہ کیا۔؟۔ مگر چونکہ وہ دیر تک سوچنے کا عادی نہیں تھا لہٰذا ہر کشمکش کے موقع پر بھی بڑی آسانی سے ہمیشہ اپنی شکست قبول کر لیتا تھا اور کبھی سنجیدگی سے خود کو ٹٹولنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ اُسے سب سے آسان بلقیس کی زندگی معلوم ہوتی تھی جو جام کے ایک بڑے سے مرتبان میں بند تھی اور دھوپ چھاؤں سے کبھی گلتی یا متاثر ہی نہ ہوئی تھی، جو ہر قسم کی گرد سے محفوظ تھی اور ذرا بھی کرکرا پن اپنے ساتھ نہ رکھتی تھی۔ بس مرتبان سے نکلتے ہی گھلنے اور چاہت کی انگلیوں میں حل ہونے لگتی حتیٰ کہ چاہت کا نوالہ بنکر تن بدن میں اس طرح دوڑ جاتی اِس طرح پھیل جاتی کہ پھر اُسے نگلنے اور کھانے والا بھی سراسر ایک گھونٹ بن جاتا۔ جو طلب کے حلق سے ہمیشہ اس طرح پھیل جاتا جیسے مکھن سے چپڑا ہوا ہو۔ جو رُکنا، اَڑنا تو جانتا ہی نہیں مگر یہ موذی عائشہ؟ پارسائی کا ڈھونگ رچانے محض اُس کے پاس ہی کیوں آئی تھی جبکہ اور اور لڑکوں کی کچھ ایسی کمی بھی نہ تھی ۔۔۔ اس نے پھر گھور کر عائشہ کو دیکھا اور اس مرتبہ عائشہ بھی بڑی معنی خیز معصومیت اور اشاریت سے مسکرائی

"کیا چاہتے ہو، پیار لینا یا پیار دینا" عائشہ نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

اقبال خاموش رہا۔

"پیار کرنا چاہتے ہو نا۔؟"

اقبال کا جی چاہا چیخ کر کہے۔ نہیں ہرگز نہیں کیونکہ اب وہ پیار سے ڈرنے لگا تھا اور بلقیس کی ناصحانہ گفتگو اُسے ہردم یاد رہتی تھی۔ تاہم مصلحتاً بولا "ہاں"۔

"تو صحیح طریقے سے پیار کرو اقبال۔ یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں جو تم اختیار کرنا چاہ رہے ہو۔"

اوہ! اب یہ بھی تقریر کرے گی۔ اقبال نے سر تھام کر سوچا کیونکہ اب پیار کے خطرناک اور پیچیدہ ترین موضوع پر وہ مزید کچھ سننا نہیں چاہتا تھا مگر عائشہ کے غنائی لب و لہجہ اور نرم مترنم آواز نے کچھ ایسے بے ساختہ صوتی آہنگ سے اس کے کانوں کو جکڑ پکڑ لیا کہ وہ اپنا اشتغال بھول کر عائشہ پر نظر جمائے بغیر نہ رہ سکا۔

"آخر پیار کے کتنے طریقے ہوتے ہیں۔؟" پھر اس نے جل کر پوچھا۔

"کتنے۔۔؟ کیا مطلب۔۔۔؟؟

"چلو میرا مطلب چھوڑو، تم اپنا مطلب بتاؤ۔"

"تم مجھے اچھے لگتے ہو اقبال مگر۔۔۔۔"

"مگر کیا۔؟" اقبال نے کچھ تلخی، بے رُخی اور سرد مہری سے پوچھا۔

"مگر مجھے تمہارا یوں زندگی گذارنا پسند نہیں۔"

"لیکچر ختم کرو۔ مجھے لیکچر پسند نہیں۔"

"مگر زندگی اتنی سستی چیز بھی تو نہیں کہ اُسے بلا سوچے سمجھے ہمیشہ محض ضائع کیا جائے۔ اِسے اٹھا اٹھا کر پھینکا جائے اور پھر اس چکنا چور زندگی کو خود سے چمٹا کر رکھ لیا جائے۔"

"خدا کے لئے جو کچھ کہنا ہے مختصراً، آسان ترین الفاظ میں کہدو۔ مجھے پیچیدہ الفاظ سے نفرت ہے۔ اُلجھے ہوئے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آتے۔" اقبال زچ ہونے لگا۔

"تو سنو" عائشہ نے بڑے گمبھیر انداز میں کہا۔ "پیار جیسے پیارے جذبے کو اپنانے، پانے کے لئے، خود پیار کرنے کے لئے پہلے خود بھی نرم، ملائم اور سمجھدار بننا پڑتا ہے کیونکہ پیار کوئی بانس کی باسکٹ نہیں جس میں جو چاہا اٹھا کر رکھدو، ڈالدو۔ پیار کوئی بید کی ٹوکری بھی نہیں جسے خود سے لٹکائے لٹکائے پھرو مگر اس میں کبھی کچھ نہ رکھو۔ پیار انسان کی اصلیت ہے، بے وقوف۔ لہذا پہلے اپنی اصلیت سمجھو۔ خود کو کھوجو، کیونکہ جو

خود سے گریز کرتے ہیں، خود کو پہچاننا نہیں چاہتے، وہ پیار کے قابل نہیں۔ وہ کبھی پیار نہیں کر سکتے۔ پیار کرنے والے کو ملیامیٹ اور فنا ہونا پڑتا ہے۔ اپنے ذاتی استحکام پر پیار کی پوری شاندار عظیم عمارت کھڑی کرنا، ایک ایک اینٹ ایک ایک پتھر خود اپنے ہاتھ سے جمع کرنا جوڑنا پڑتا ہے۔ کیا تم اتنی محنت کر سکتے ہو۔۔؟"

"بالکل نہیں۔ کبھی نہیں" اقبال نے عاجز ہو کر کہا۔

"اور تم سے یہ کس کمبخت نے کہہ دیا کہ میں تم سے پیار کرنے چلا ہوں۔ اچھی طرح سُن لو کہ مجھے کسی سے پیار نہیں ہے، نہ کبھی میرا پیار کرنے کا کوئی ارادہ اور پروگرام ہی ہے۔ میں پیار کا دشمن ہوں۔ دشمن۔"

وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر ٹہلنے لگا۔

"تو پھر مجھ سے کیا چاہتے ہو۔۔۔؟"

"تمہارا جسم۔۔۔"

"تو بازار میں نکل جاؤ، وہاں جسموں کی کمی نہیں صرف میرے پاس ہی آنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔"

"اور اگر تمہارا ہی جسم درکار ہو تو۔۔۔؟"

عائشہ نے اپنا ننھا سا گداز ہاتھ اٹھا کر ایک زنّاٹے کا طمانچہ اقبال کے گال پر رسید کر دیا۔ "جہنم رسید ہو جاؤ اور پھر کبھی بھول کر بھی مجھے اپنی منحوس صورت نہ دکھانا۔"

وہ دفعتہً ہچکیاں لے لے کر رونے لگی اور اقبال نے جو اس کا ہاتھ مروڑ دینے کے لئے تھاما ہوا تھا، حیران اور پسپا ہو کر سوچا۔ عجیب لڑکی ہے یہ۔ خود ظلم زیادتی کر رہی ہے، خود مار رہی ہے اور آنسو اس طرح بہا رہی ہے جیسے میں ہی اسے تنگ کر رہا ہوں، میں ہی اسے مارنے چلا ہوں۔

عائشہ کا ہاتھ جھٹک کر وہ پھر از سرِ نو ٹہلنے لگا۔ اُسکی جسمانی بھوک دب چکی تھی اور اب اس کا جی چاہ رہا تھا، اس لڑکی سے، دنیا کی تمام لڑکیوں سے بہت دُور، پرے بھاگ جائے اور پھر کبھی کسی لڑکی کے قریب جانے کی کوشش بھی نہ کرے۔ عجیب گورکھ دھندا ہوتی ہیں یہ لڑکیاں بھی۔ جیسے ماہی گیروں کا مچھلی پکڑنے والا جال۔ خدا ان سے سمجھے۔ آخر زندگی میں ان کی اتنی ضرورت بھی کیا ہے بھلا۔ زندگی ان کے بغیر بھی تو گذار لی جا سکتی ہے، گذر جا سکتی ہے مگر جس طرح خون چکھنے والا بھیڑیا ہمیشہ کے لئے خونخوار ہو جاتا ہے، اسی طرح اقبال بھی اپنی تمام جھلاہٹ اور کسلمندی، تلخی اور ترشی کے باوجود عائشہ کو چھوڑ کر جا نہ سکا بلکہ وہ اپنے غصّے کو، اُلجھن اور کوفت کو طرح دے دے کر اُس لمحے کا، اُس موقع کا منتظر رہا جب عائشہ خود اس کے سامنے ہتھیار ڈال کر کہتی۔ مجھے سمیٹ لو، مجھے اٹھا لو، مجھے جانے نہ دو۔ میں چلے جانے کے لئے تمہارے پاس نہیں آئی ہوں۔ مگر عائشہ نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ دیر تک سسکتی رہی اور پھر خود ہی اپنے آنسو پونچھ کر اپنی سُبکیاں ضبط کر کے بولی۔

"میرے پاس زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے اقبال۔ میں ایک طالبہ ہوں، مگر میں نے بہت کچھ پڑھا ہے اور کتابوں نے مجھے بہت کچھ سکھا اور سمجھا بھی دیا ہے اور اتنا کچھ جان لینے کے بعد میں زندگی کو ردّی کی ٹوکری نہیں بنا سکتی، نہیں بنانا چاہتی۔ اگر میں پیار نہ کر سکوں، پیار نہ پا سکوں تو مر جاؤں گی، زندہ نہیں رہوں گی مگر میں کسی کو، خود اپنے آپ کو بھی یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ مجھے پامال کیا جائے۔ زندگی محض پانی کا بُلبلہ نہیں جو پیدا ہوتے ہی پھوٹ جائے یا پھوڑ دیا جائے، صرف پھوٹنے کے لئے ہی اُبھر آئے، بلکہ زندگی تو ایک گھنا درخت ہے اقبال، جو ہر نئے دن کے ساتھ مضبوط اور تناور ہوتا جاتا ہے، اپنی جسامت اور وزن بڑھاتا رہتا ہے، اپنی چھاؤں پھیلاتا رہتا ہے اور مجھے بُلبلہ نہیں، ایسا ہی درخت بننا ہے۔"

اُس نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے بغور اقبال کو دیکھا "زندگی نازک۔ خوبصورت۔ دلکش سہی۔ زندگی لطف سہی مگر حالات کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے" زمانے کو سہنے اور اپنے تابع رکھنے کے لئے انسان کو سخت، اٹل اور ضروری طور پر وزنی بھی ہونا چاہیئے۔ پائدار اور مستحکم۔ کیونکہ رشتے ناطے۔ گہرائیاں گو قوت کو

اپنے اختیار میں اختیار کر کے اسے، متاثر اور سلب بھی کر لیتی ہیں مگر وہ انہیں اپنی طرف سے کچھ عطا بھی کرتی ہیں۔ سب کچھ اپنے قابو میں بھی رکھتی ہیں۔ سطحی انسان دیر تک کسی چیز کو اختیار نہیں کر سکتا، دیر تک کسی چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور عروج تک پہنچنے کے لئے انسان کو اپنا کردار تراشنا پڑتا ہے اقبال۔ خود کو محنت اور ریاض سے گذارنا پڑتا ہے۔ خود میں گہرائیاں پیدا کرنی پڑتی ہیں کیونکہ اوج کے لمحوں میں منسخ ہونے والے انسان تہذیبی لحاظ سے پست، غیر منظم اور شاید ناخواندہ ہوتے ہیں، جو چیزوں تک پہنچ تو جاتے ہیں، انہیں قبول بھی کر لیتے ہیں مگر خود میں سما نہیں سکتے، جذب نہیں کر سکتے۔ آؤ، تم اور میں مل کر زندگی کی انتہاؤں پر پہنچیں۔ بلند، ہموار اور چمکیلی سطح پر ایک دوسرے سے ملیں۔ زندگی کو جیتنے کی کوشش کریں۔ پھر ہم کبھی نہیں ہار سکیں گے اقبال۔ ہم کبھی نہیں رو سکیں گے۔ فاصلے کی ہر ہر تہہ، لاعلمی اور اندھیرے کی ہر ہر چلمن اٹھا کر اُس سمت چلے چلو جہاں ہر طرف اُجالا ہے اور ہر چیز اپنی اصلیت کے ساتھ دمکتی ہوئی، حقیقی ہم مشربی اور رفاقت کی طلبگار اور متمنی۔"

عائشہ نے اپنا وہی ہاتھ جس سے کچھ دیر قبل اقبال کو طمانچہ مارا تھا، دوبارہ اس کی سمت بڑھایا۔ "زندگی صرف جھاگ نہیں، خدارا اتنا نہ اُبلو، اتنا نہ ٹکراؤ کہ پھر جھاگ بننے یا پیدا کرنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جائے۔ مجھ سے وعدہ کرو، وعدہ کہ تم اب اور بلقیس کے پاس نہیں جاؤ گے۔ خود کو یوں بیکار نہیں گنواؤ گے؟"

"تو صرف یہ کہنے کے لئے کہ میں بلقیس کے پاس نہ جایا کروں، تم نے اتنی دیر تک میرا مغز چاٹا۔ مگر جان لو کہ میں تمہاری خاطر بلقیس کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہارے پاس ہے کیا، سوائے بکواس کے میرے لئے کچھ بھی تو نہیں مگر بلقیس کے پاس بہت کچھ ہے۔ بہت کچھ۔ سب کچھ۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ زہریلی سی مسکراہٹ۔ اور عائشہ کو ایسا لگا جیسے اقبال نے اُسکی خواہش کے نازک گال پر بھرپور طمانچہ مار دیا ہو۔ اقبال نے اُس کے الفاظ کا اس کے جذبات کا، تمام جذباتی گہرائیوں کا منہ چڑا دیا ہو۔ جیسے اقبال اُسے کچل کر آگے بڑھ گیا ہو۔ جیسے اب وہ اقبال کو کبھی نہیں پا سکے گی۔ کبھی واپس نہیں لا سکے گی۔

آنسو اس کی آنکھوں میں سوکھ گئے۔ ایک خاموش عزم سے وہ اُٹھی اور اقبال کو تنہا چھوڑ کر اپنے راستے چل پڑی۔ اقبال اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہا مگر یہ نہ سوچ سکا کہ وہ بلقیس سے کتنی مختلف ہے۔ زندگانی کی کتاب میں اس کا کردار کتنی معنویت کے ساتھ عمدہ تحریر کی طرح درج ہو۔ اس کی رُوح کتنی منزہ، شفّاف اور ہر ہر قسم کی پیچیدگی اور دو رُخے پن سے نا آشنا۔ ایک سیمابی چشمے کی طرح شوخ اور متحرک ہو کر بھی غم آشنا حسن کی پوری شان اور دل آویزی اپنے آپ میں واضح رکھتی ہوئی۔ اس کے الفاظ اور لہجے میں، اس کی تمام تر گفتگو اور تخاطب میں، تمام شخصیت میں کہیں بھی تیز آگ نہیں بلکہ ایک خاموش بہاؤ اور مترنم روانی، دوستی، اشتراک اور تیز فہمی۔ اس سے خدوخال اور ہر ہر رویئے میں نمایاں عقلیت پسندی، اس کی تمام ہستی ایک نرم خوشگوار لطیف قسم کی روشنی میں سر بسر نہائی ہوئی منبع محبت وقوت ہے۔ وہ بے شک محبت کی طرح حساس اور مسرت کی طرح حسین ہے وہ کالج کو محض ایک بازی گاہ یا بساطِ شطرنج کبھی نہیں سمجھتی، مگر اپنی اخلاقی ثابت قدمی کو متاثر اور متزلزل کر لینے کے بعد اب اقبال کے پاس شاید وہ نگاہ رہ نہ ہی نہیں گئی تھی جو کسی چیز کی تہہ تک پہنچ سکتی۔ ظاہری پرتوں کو ہٹا کر، ٹٹول کر اصلیت جانچ پرکھ سکتی۔ سو پریشان، متذبذب، اپنی احمقانہ اُمیدوں میں غرق۔ بے فیض بے اعتدالیوں کی ظاہری کشش میں پھنسا اقبال اپنی ہی دُھن اور اپنے ہی خیالات کے ریلے میں کھویا رہا۔ اُس تیز دھارے میں ایک تنکے کی طرح بہتا ہوا جو اُس کی شخصیت کو اس کی وجودیت سے دُور بہائے لئے جا رہا تھا۔ اُسے ڈبوئے دے

رہا تھا۔ نہ جانے کس نامعلوم سمت لئے چلا جا رہا تھا۔ مگر اقبال کو اتنی سُدھ بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے کم از کم ہاتھ پاؤں ہی مار لیتا۔ بطور سہارا کسی چیز کو تھامنے پکڑنے اور روکنے کی کوشش کرتا۔ اپنے ذہن پر فکر و فہیم کا ذرا سا بوجھ ڈالے بغیر شاید وہ خود کسی نہ کسی چیز کے ساتھ بہتا رہنا چاہتا تھا۔ یہی اسے مطلوب تھا، یہی اُسے پسند۔ لہٰذا عائشہ سے مل کر بھی، عائشہ کو بغور دیکھ کر بھی، وہ دراصل اسے دیکھ، پہچان اور پا نہ سکا۔ کسی پہلو سے اس کا اعتراف نہ کر سکا۔ عائشہ چلی گئی مگر وہ اُس کے جذبات کی اطلسی سطح اور تراشیدہ الفاظ کی عظمت و معنویت تک نہ پہنچ سکا۔ وہ ہر ہر طرح قاصر رہا اور پھر خود بھی لااُبالی انداز میں سر جھٹک کر اپنی راہ ہو لیا جیسے کچھ سُنا اور محسوس ہی نہ کیا ہو۔ اس نے خود اپنے آپ سے کچھ پُوچھا تک نہیں۔ کسی دن اور رات سے کبھی کچھ نہ پوچھا اور اگر تمام گنوائے گئے شب و روز اور لمحات، زندگی خود اس سے یہ پوچھ لیتے کہ زندگی کی ہر نئی صبح کی قیمت کیا ہے تو شاید اقبال اِس سوال کا صحیح جواب بھی سوچ نہ پاتا ــــ

نہ ہی اس نے اس بات پر غور کیا کہ اگر بلقیس سے پہلے عائشہ اس کی زندگی میں آجاتی تو بے شک اسے بکھرنے، منتشر ہونے سے بچا کر سنبھال کر اُس صاف اور سیدھی راہ پر لے جاتی جو اس کا اچھا اور صحیح مستقبل بنتی مگر اب جبکہ عائشہ سدا کے لئے جا چکی تھی، اس کی زندگی سے نکل چکی تھی، اقبال کے لئے یہ سوچنے کا موقع بھی نہ رہا تھا کہ اس نے کیا کھو دیا۔ اس نے اپنی تمام زندگی کھو دی تھی اور کھوتے کے عمل سے لاعلم بھی تھا۔ تھکا ہارا، اپنے ہی حیوانی جذبات کے ناآسودہ جوش و خروش سے واماندہ جب وہ گھر پہنچا تو مطمئن و مسرور اماں نے فوراً اس کے قدم لئے اور ریک گونہ مسرت سے بولیں۔ " وہ لڑکی مل گئی ہے اقبال جسے اس گھر میں آنا ہے اور تمہاری زندگی بسانا ہے"۔

اماں کے چہرے پر پھول کھل رہے تھے اور مسرت کی مہک اُن کے سارے جسم و جاں کو معطّر کئے ہوئے تھی، لیکن اقبال کچھ ٹھٹک اور جھجک گیا۔ بلقیس کا ہیولا، بلقیس کی تمام موثر اور جاندار گفتگو صدائے بازگشت کی طرح اس کے وجود کے کانوں میں گونجی، بجی اور وہ رک کر بولا۔ "اماں ــــ!"

ماں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا کیونکہ اقبال کی یہ آواز جو ابھی ابھی اس کی ہستی سے اُبھری اور ہونٹوں سے طلوع ہوئی تھی، کچھ ایسی نامانوس اور عجیب تھی کہ اماں اس آواز کو اپنے بیٹے کی آواز کی طرح پہچان نہ سکیں۔ نہ جانے اس آواز میں کیا تھا۔ سادہ لوحی اور معصومیت یا عزم اور حوصلہ ــــ اور اماں کچھ نروس سی ہونے لگیں۔ "کیا تمہیں کوئی اور لڑکی پسند آگئی ہے۔؟" انہوں نے تھم تھم کر، آہستگی سے پوچھا۔

" نہیں۔ مگر اب میرے بیاہ کی بات بھول جائیے اماں۔ بیاہ ایک ضعیف روایت ہے اور بس۔ میرے بیاہ کی فکر کرنا چھوڑ دیجئے آپ"۔

برف ایسے سفید بالوں سے ڈھکی اماں کی باوقار پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ سچے الفاظ کی طرح مرقوم جگمگاتے ہوئے ان کے خدوخال تڑپ اور بھڑک اُٹھے۔ پورا چہرہ کورے کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا۔ انہوں نے گھور کر اقبال کو دیکھا اور اپنا گھبرایا ہوا چہرہ قدرے نیہوڑا کر اشتعال کا کڑوا گھونٹ خاموشی سے پی کر اپنی برہمی کو ضبط کر کے تشریح طلب دبازت اور دبدبے سے پوچھا "کیا مطلب۔؟"

غصّے کی آگ اور اس آگ کی تپش اُن کے نرم مہربان چہرے کو دفعتہً آہنی بنانے لگی۔ اقبال کی بدلی ہوئی سخت آواز۔ بے مہر اندازِ تخاطب اور منجمد لہجہ، بگڑتے ہوئے خیالات ان کے تجربے کو للکار نے چیلنج کرنے لگے۔ وہ اس ناگاہ صورتِ حال سے خود کو نجنے گرجنے گلیں۔

اور اقبال بھی جو اب بہت نادان اور ناتجربہ کار نہیں رہا تھا، اپنی شفیق ماں کی اس فوری تبدیلی کو

فوراً سمجھ گیا۔ وقتی بچاؤ کی خاطر وہ مکاری سے بناوٹی ہنسی ہنسکر بولا۔
"بات یہ ہے اماں کہ میں ابھی کچھ عرصے تک بیاہ کرنا نہیں چاہتا۔ صرف کچھ عرصے تک ہاں۔" وہ زمین کو گھور گھور کر جیسے زمین میں گھس جانے، چھپ جانے کی غیر شعوری کوشش کرنے لگا۔

"اور اب تو تم ارجمند کو بھی کبھی یاد نہیں کرتے۔ ہے نا۔؟" اماں نے برجستہ کہا اور زیادہ گمبھیر لہجے میں کڑکتے کے انداز میں بولیں "یہاں آؤ اقبال، میرے قریب۔ میں تمہیں بارہا، ہر بار دیکھ چکی ہوں لیکن اب پھر ایک بار بغور دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں تمہارے بتائے بغیر تمہیں مزید سمجھنا چاہتی ہوں۔ تم نے کیا کہا۔ بیاہ ایک ضعیف روایت ہے، یہی نا؟"۔

اور وہ اقبال کو نہایت طوفان زدہ احساسات کے ساتھ از سر نو دیکھنے لگیں۔ اقبال کانپ گیا۔ ان کی تیز بے پناہ، عمر رسیدہ نگاہ کی زد میں اقبال کی اپنی نوعمر، نوجوان نگاہیں لڑکھڑا کر نیچے جھک گئیں اور اگلی تمام من مانی زندگی کے لئے اس کی کل جسارت جیسے دم توڑتے پانی پانی ہونے لگی۔۔
"اماں۔ اماں!!" اقبال نے سنبھل کر نسبتاً مدھم، مبہم، موہوم آواز میں کہا مگر پھر خود اقبال کو اپنی یہ آواز بھی بڑی نئی اور محبت سے قطعی کوری محسوس ہوئی۔ ذرا سی دیر کے لئے اس نے ماں کے ساتھ بھی اپنے علانیہ دھوکے اور شدید فریب کو محسوس کر لیا اور سخت شرمساری سے گذر کر خود کو مزید سنبھالتا ہوا گلوگیر آواز میں بولا۔۔۔
"اگر آپ کہتی ہیں تو میں بسر و چشم تیار ہوں اماں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ۔۔ کہ۔۔۔" لیکن اسے آگے مناسب انداز میں کہنے کو اور الفاظ نہیں ملے۔
"مگر تم یقیناً مذاق نہیں کر رہے تھے اقبال۔؟" ماں نے ہنوز خفگی اور تندی سے کہا۔ "تمہارا وہ لہجہ کیسا تھا اقبال۔ کیسا۔ کیا تمہیں خود اپنے اس لہجے کی مضحکہ خیزی بالکل نہیں محسوس ہوئی؟"۔
اور اقبال نے علانیہ دیکھا کہ ماں کے چہرے پر کوئی عجیب سی فراست، کوئی پوشیدہ قوت اور قاتل غضبناکی ابھر آئی ہے۔ یہ کیفیت اقبال کے لئے سراسر نئی تھی۔ اس نے اپنی ماں کے چہرے پر ہمیشہ عرفانی نور کا جلوہ ہی دیکھا تھا مگر اب ان کے تنے اور کھنچے ہوئے ناراض خدوخال پر ہراس اور یاسیت کا غلبہ تھا۔ اقبال اپنی ماں کے اس نئے روپ، آہنی چہرے آہنی قوت اور بھیانک غضب ناکی سے کچھ تھرا سا گیا۔ کیا یہ اسی کی اماں ہیں۔ اس نے ایک بار لرز کر سوچا۔ زور لگا کر سوچا اور اس کا پتھر دل سرمہ سرمہ ہونے لگا۔ اس میں دفعتہً ایک عجیب سی پھسلن پیدا ہو گئی اور نہ جانے کس طرح وہ لڑھک کر ٹھیک اپنی ماں کے قدموں میں گرا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اس کے دماغ پر چھائی ہوئی اپنے ہی خیالات کی تمام دھند آندھی زدہ درختوں کی طرح کٹ کٹ کر چھٹنے لگی اور مدت بعد خود کو ایک بیٹے کی طرح محسوس کر کے، صاحبِ احساس انسان کی طرح اقبال ماں سے لپٹ گیا اور جھوٹی خاکساری کی بجائے بڑی وارفتگی سے بولا۔ "مجھے معاف کر دیجئے اماں، مجھے معاف کر دیجئے۔" اور اس میں لہراتے ہوئے سارے سانپ اس اس لمحے جیسے کچلے گئے، مر گئے۔
ماں نے بڑی شانِ دلپذیری سے اس کا بھیگا ہوا نم، شرمندہ چہرہ اپنی طرف پھیرا اور ایک پل تک دیکھنے کے بعد بغیر کچھ کہے چھوڑ دیا۔ سرد مہری اور سوگواری ان کے ہر ہر نقش سے مٹنے لگی اور رات کے قدرتی سکوت کی طرح وہ پھر مائل بہ سکوں ہوتے اور نرم پڑنے لگیں، اور ذہنی مفاہمت کے اس موڑ پر خود اقبال کی بھیانک خواہشات کی تمام نقابیں ایک ایک کر کے اٹھنے سرکنے لگیں۔ ذہنی زنجیریں ٹوٹنے لگیں اور اقبال نے خود کو ٹٹول کر سوچا۔ میں کہاں ہوں۔ کہاں؟۔ میں کیا ہوں۔ کیا؟۔ کیا میں خود اپنے آپ میں نہیں؟ اور میں کیسا ہوں در اصل؟ ویسا جیسا اماں مجھے سمجھنا چاہتی ہیں، یا ویسا جیسا میں خود بنتا جا رہا ہوں اور تب اندھیری رات کے مہیب چہرے کی طرح، ظلمت اور ناامیدی کی ہر ہر گھناؤنی، گمنام اور پوشیدہ کیفیت کی طرح، پھیلی ہوئی سیاہی کی

طرح تاریکی کے تمام پردے، تمام تاریک ارادے اور خیال، تمام مکروہ امیدیں حوصلہ ہار گئیں۔ جادۂ معصیت و مصیبت پر رواں دواں اُس کے قدم اپنے آپ لوٹ پلٹ آئے۔ وہ اخلاقی زوال اور اخلاقی نراج کی بے راہ روی کی اِس راہ پر اب کبھی نہیں جائے گا، کبھی قدم نہیں دھرے گا۔ وہ سنگدل کڑی نگاہوں سے خود کو کھوجنے لگا اور تڑختی ہوئی کھُردری اور کھِنچی ہوئی آواز میں خود سے بولا۔ ڈوب مر، کمبخت۔ ڈوب مر۔ آنسو اُس کے پپوٹوں میں چُبھنے لگے اور اپنا وجود پہلی مرتبہ اُسے ایسا کھوکھلا محسوس ہوا جیسے مغز سے خالی کوئی خول۔ اُس کا جی چاہا تاش کے پتوں کی طرح اپنی تمام موجودہ زندگی کو پھینٹ کے رکھ دے، تاکہ ہر پتہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر بکھر جائے اور کبھی کوئی ایسی سیڑھی یا سیریل نہ بنا پائے جو اُسے جیت کی غلط اُمید میں مبتلا کر دے۔ جو وقتی طور پر تو اُسے جِتا دے مگر پھر بعد میں وہ ساری عمر فقط اِس لئے روتا رہ جائے کہ اُسے تاش کھیلنے کی بُری عادت پڑ گئی تھی۔

وہ بڑی دیر تک اپنی ماں کی گود میں خواہ مخواہ لوٹتا رہا پھر جب کسی طرح ماں سے خود کو الگ کر کے نیند کے حوالے ہو جانے کے لئے اپنے بستر پر پہنچا تو اُن تمام لفظوں کا آبشار اُس کے ذہن میں از سرِ نو بہنے لگا، جو مختلف موقعوں پر مختلف لڑکیوں نے اپنے جذبات کی پائندگی اور دلکشی کا یقین دلانے کے لئے اُس سے کہے تھے اور وہ سارے لمس اطلس و ریشم کی طرح اُس کے جسم پر سرسرانے لگے، جو متعدد موقعوں پر متنوع جسموں کی بدولت خود اُس کے اپنے جسم کا حصہ بنے تھے، اور جنہیں بالکل بھول جانے کا وہ کچھ ہی دیر پہلے قطعی تہیہ اور عزم کر چکا تھا مگر ماں کی گود سے اُٹھتے اور بستر پر پہنچتے ہی وہ پھر ان جسموں کے گرداب میں گھومنے گردش کرنے لگا۔ اسے ان نرم گرم جسموں کی جُدائی کا افسوس ستانے لگا۔ اُن سے دائمی طور پر بچھڑ جانے کے تصور سے وحشت اور ہول ہونے لگی۔ آخر دنیا میں اِن کے علاوہ، ان کے سوا، رکھا بھی کیا ہے مگر ان شبنمی جسموں پر سے لپکتا اُچھلتا جب اس کی ماں کا جسم اور چہرہ پھر اس کی نظروں کے سامنے آیا تو اقبال کو یقین ہونے لگا کہ ماں کے جسم کے علاوہ اِس دنیا میں کوئی اور جسم اتنا قابلِ غور نہیں، اور ماں کے چہرے سے زیادہ کوئی اور چہرہ اس جہانِ فانی کا مکمل تجزیہ نہیں۔ اس نے ہر جسم اور ہر چہرے کی بے عزتی کی ہے شاید، مگر وہ اپنی ماں کی توہین نہیں کر سکتا۔ اُن کے کسی خیال و تصور کو غلط ثابت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے چپکے سے لحاف اپنے اُوپر تان لیا اور ہر ہر خیال و خواب کو، خواہش کو لحاف کی قبر میں ضم کر کے، مُدغم کر کے، دفن کر کے صرف نیند کی بابت سوچنے لگا اور اپنے سارے اضطرار و اضطراب کو بھُول کر پھر ایک عجیب و نامعلوم، اجنبی اور انجان تھکن سے شل، بہت جلد سو بھی گیا۔

اگلی صبح جب اقبال جاگا تو اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ کیا ماں کی خواہش کے مطابق فوراً بیاہ کر لے، یا ابھی خود کو مزید ٹٹولنے اور تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کی سوچ کا حل خود اس کے پاس نہیں تھا جیسے اس کا ہر ہر حل صرف ماں کی آنکھوں، ماں کی گفت گو، ماں کی خواہش اور ماں کے مقدس ہیولے اور فیصلے میں گھُل مل کر رہ گیا تھا اور اب اس میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ اپنی ماں کو الٹ پلٹ کر یہ حل اُن کے اندر سے برآمد کر لے، نکال لے، اُسے اپنے لئے محفوظ کر لے کیونکہ وہ گرہیں، جو واقعات کی الل ٹپ الٹ پھیر نے اُس کے مزاج میں لگا دی تھیں، اُس کے آسان لمحوں کے لئے کوئی حقیقت نہ رکھتی تھیں۔ مگر وہ گرہیں، جو اماں خوب کس کس کے ڈال رہی تھیں، اپنے کساؤ میں اُس کے بس کی نہ تھیں۔

بہت دنوں تک وہ خواہ مخواہ مارا مارا پھرتا رہا کیونکہ

گُل بدنی کے شوق میں مبتلا ہو جانے کے بعد اُس کے اکثر مخلص دوست بھی اس سے ٹوٹ اور چھوٹ گئے تھے اور جو خود اس کی طرح شوق ذوق میں مبتلا تھے۔ انہیں تو خود اپنی دوست نوازیوں اور دلداریوں سے اتنی فرصت نہ تھی کہ کسی دیگر موقع پر کسی اور کی سُدھ بدھ بھی لے سکتے۔ اِس موقع پر اقبال کو اچانک عائشہ کا خیال آگیا۔ جب جسم کے جال سے نکل بھاگنا ہی تھا تو عائشہ سے مناسب شاید کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ایک سوال یہ بھی تھا کہ وہ اب کونسا منہ لے کر عائشہ کے پاس جائے۔ کیسے، کس مُنہ سے کہے کہ وہ جبراً ناحق اپنے پسندیدہ جسموں سے بچھڑا دیا گیا ہے اور اسے اب تمہاری ضرورت ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد اقبال نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اسے ایک نئی ترکیب سُوجھنے لگی۔ کیوں نہ وہ اپنے اِس یاس و اندوہ کو نشے کی نذر کر کے دیکھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ نشہ دُکھی انسان کا بڑا معاون و مددگار ہوتا ہے۔ وہ ہر بات بُھلا دینے میں اپنا جواب نہیں رکھتا، سو وہ سیدھا اُس بار میں پہنچا جس کے بین کاؤنٹر پر اختر بیٹھتا تھا۔ اختر اُس کے دوست کا بھائی تھا اور بڑا شاندار آدمی مشہور تھا۔ اختر کو کبھی کسی نے بغیر نشے کے نہیں دیکھا تھا مگر اس کا نشہ بھی کمال کا تھا جو ہزار ہوشمندیوں سے زیادہ دانا مشہور تھا اور لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ اگر اختر نشہ نہ کرے تو اختر باقی نہ رہے۔ جس چیز نے اسے بنایا اور ہر احساس سے ہمیشہ دُور رکھا، وہ صرف نشہ ہی تھا، اور اختر صرف اسی لئے ہمیشہ چاق و چوبند اور خوش و خرم نظر آیا کرتا تھا کہ اُس کے پاس محسوس کرنے کیلئے کوئی احساس ہی باقی نہ رہ گیا تھا۔ سب کچھ اختر نے نشے میں ڈبو رکھا تھا اور ایسی کسی چیز کو کبھی نشے سے باہر نہ نکالتا تھا۔ جانے اختر کیا تھا مگر دیکھنے اور کہنے والوں کے لئے تو اختر صرف نشہ تھا۔ خالص نشہ۔ فقط نشہ۔ نشہ بیچتا تھا اور نشہ خریدتا تھا۔ نشے کے اِسی کاروبار میں، نشے سے نشے کے اِس ٹکراؤ میں اس ٹکراؤ میں اس کی ساری زندگی بڑی آسانی اور سہولت سے گذری اور پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ مگر جب اختر نے گہری نگاہ سے اسے ٹٹولا تو اقبال پھر ایک بار کچھ چکرا سا گیا۔ خدا جانے دنیا کے ہر مقام پر کچھ ایسی آنکھیں کیوں ہوتی ہیں جن کی تاب لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ گھر میں اماں نہیں اور اب یہاں اختر پیدا ہو گیا۔ وہ تو اختر کی آنکھوں کو اندھی، ماند اور لڑکھڑاتی ہوئی سمجھ کر آیا تھا مگر اب بار میں داخل ہونے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اس کا قیاس غلط اور دنیا والوں کا یقین بالکل صحیح تھا۔ اختر کی نگاہیں چاقو چھری کی طرح تیز تھیں اور منٹوں میں ہر غلطی کے پرخچے اُڑا سکتی تھیں۔ گھبراہٹ میں اقبال کو کچھ اور نہیں سُوجھا تو وہ اپنے دوست کو پوچھنے لگا۔ لیکن اختر یکایک ہنس پڑا اور اعتماد و غرور سے بولا۔

"مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہارا دوست نہیں، اس کا بڑا بھائی ہوں۔ سچ سچ بتاؤ، تم یہاں کیوں آئے تھے۔ نشہ کرنا چاہتے تھے نا؟"

"جی۔ جی ہاں۔" اقبال بولا۔ کیونکہ اسے اعتراف کر لینا ہی مناسب معلوم ہوا۔

"کونسا نشہ؟"

"یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں مگر نشہ کتنی قسم کا ہوتا ہے؟" اقبال بوکھلا کر خواہ مخواہ فرش کھجلنے لگا۔

"ہاہاہا۔" اختر ہنسا۔ "نشے کی وجہ ——؟"

"زندگی سے اُکتا رہا ہوں۔"

"تعلیم ترک کر دی؟"

"بس کرنے ہی والا ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اگر ——"

"اگر مگر چھوڑو، صاف صاف سچ سچ کہو۔ مجھے مثالوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کھرا واقعہ ہونا چاہیئے۔ جوں کا توں۔"

"دراصل —— دراصل ...."

"سمجھ گیا، تمہیں مرغوں نے تباہ کیا ہے لیکن کیا تعلیم

بالکل چھوڑ دینا تمہارے حق میں بہت غیر مفید تو نہیں۔؟"

"اجی میں کوئی ننگا بھوکا نہیں، صاحب جائیداد انسان ہوں اور یہ سب تو بس اماں کا پھیلایا ہوا کھڑاگ ہے کہ تعلیم ضرور حاصل کرو، وغیرہ وغیرہ۔"

"بہت اچھے۔ ختم کرو۔ یہ بتاؤ کوئی کام کر سکتے ہو۔؟"

"کام ---؟ کام کی بابت تو ابھی تک کبھی سوچا ہی نہیں"

"تو پھر جہنم رسید ہو جاؤ۔ یہاں کیوں آئے ہو۔؟ نشہ کرنے کا ہر ایک کو بے شک اختیار ہے مگر بے کار رہنے کا حق کسی کو نہیں۔ کیا سمجھے؟"

وہ دوسری طرف متوجہ ہونے لگا تو اقبال جلدی سے بولا۔

"سنیئے جناب۔ اگر آپ بتائیں گے تو میں کوئی کام بھی کر لوں گا، مگر کیا، کس طرح، کچھ تو بتائیے تو سہی۔ پلیز میری مدد کیجیئے۔"

"سنو بندۂ خدا۔ میں کسی کو کسی کام کے لئے مجبور نہیں کرنا چاہتا۔ جیسے اگر تمہارا جی تعلیم میں نہ لگتا ہو تو بے شک تمہیں نہیں پڑھنا چاہیئے لیکن جان لو کہ میں بیکاری کا سخت دشمن ہوں۔ جو کتابیں نہیں پڑھ سکتے انہیں بہر حال بیکاری کی بھی آزادی نہیں بلکہ انہیں کوئی نہ کوئی اور کام کرنا ہی ہے۔ مجھے بھی کتابوں سے الجھن ہوتی تھی، مگر زندگی سے مجھے کبھی کوئی الجھن نہیں ہوئی اور خود دیکھ لو کہ میں کتنا بڑا کاروبار چلا رہا ہوں۔ اگر تم یہ چاہو گے کہ میں تمہیں بے کار رہنے کی ترغیب دوں تو یہ ناممکن ہے۔"

"لیکن مجھے کرنا کیا ہوگا۔ مجھے تو کوئی کام آتا ہی نہیں"

"ہاں۔ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں نا اس لئے۔ مگر میرے دوست، تمام زمانہ ماں باپ نہیں بن سکتا نہ کسی کے ماں باپ سدا زندہ ہی رہتے ہیں۔"

"صرف ماں ---"

"اچھا تو تمہارے والد گذر چکے؟"

"مدت ہوئی۔ پتہ نہیں کب۔ میں نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ہر لڑکا کبھی نہ کبھی خود ایک باپ ہوتا ہے۔ کیا تم باپ بن چکے؟"

"نہیں، ابھی نہیں۔"

"اور تمہارے بھائی بہن؟"

"صرف ایک بہن، جو بیاہی جا چکی ہے۔"

"بہت اچھے۔ بہت اچھے۔ تو گویا اب تم بالکل اکیلے اور آزاد ہو۔ ہر ہر طرح خود مختار۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ خدا نے چاہا تو میں تمہاری جائداد کو پَر لگا دوں گا اور خود تمہیں بھی آسمان تک پہنچنا سکھا دوں گا ہاں۔"

وہ اقبال کو ایک چھوٹے سے پچھلے کمرے میں لے گیا

"بیٹھ جاؤ۔" اقبال بیٹھ گیا۔ "اب ایک مرتبہ پھر اچھی طرح غور کر لو کہ تعلیم چھوڑ دینے میں تمہارا بہت نقصان تو نہیں؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"کافی موٹی معلوم ہوتی ہے تمہاری سمجھ مگر دیکھو، میری مثال لو۔ میں نے بھی تعلیم کے عنوان کچھ حاصل نہیں کیا۔ مگر کوشش سے بہت کچھ پا لیا کیونکہ زندگی میں کچھ نہ کچھ بہر حال ہونا ہی چاہیئے۔ خالی خولی زندگی جچتی نہیں۔ کیا تم تعلیم چھوڑ کر کوئی ایسی ہی کوشش کر سکتے ہو ---؟"

سوال جواب سے اقبال زچ ہونے لگا تھا۔ لہذا جھٹ بولا۔

"اگر آپ میری مدد کرتے رہیں تو ---"

"شاباش۔ ضرور۔ مجھے لڑکوں کی بے راہ روی بھی اچھی لگتی ہے مگر کسی نہ کسی مقصد کے ساتھ۔ سڑک کے کتوں کی طرح نہیں جو صرف جھوٹن پر بسر کرتے ہوں اور بھونکنے کے قابل بھی نہ رہتے ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ ساتھ ساتھ اقبال بھی مسکرایا۔

"کل سے تم میرے ملازم ہو گے اور اگر اچھے ملازم ثابت ہو گے، پوری دیانت داری سے کام کرو گے، تو بھائی بند کا درجہ بھی حاصل کر لو گے مگر سنو، اپنی

اماں کی طرح مجھے بھی صریح دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ چھوٹے موٹے۔ ہلکے پھلکے دھوکے تو پسند ہیں مگر گہرے اور علانیہ دھوکے ہرگز نہیں۔ گاڑھے دھوکے بالکل نہیں ورنہ تمہاری کھال میں بھس بھروا کر اسی بار کے کسی کونے میں سجا دوں گا اور تم پر ایک تختی لٹکا دوں گا 'دھوکا باز' لکھ کر'۔ کیا۔؟"

اُس نے ملازم کو پکار کر ایک بوتل منگوائی اور اقبال کے سامنے رکھتا ہوا بولا "لو شغل کرو۔ آج تم میرے مہمان ہو۔ تم نے اب تک صرف لڑکیوں کا نشہ چکھا ہے زندگی کا نشہ نہیں، جو صرف میٹھا ہی نہیں، تلخ بھی ہوتا ہے — کل صبح نو بجے میرے کاؤنٹر پر مجھ سے ملنا۔"

اختر کمرے سے باہر نکل گیا مگر بوتل اقبال کے سامنے دھری رہی۔ خدا جانے کس نشے کی تھی۔ وہ جس خالی الذہنی سے گھبرا کر یہاں آیا تھا اب وہ اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اب اقبال کو شاید کچھ کرنا تھا۔ یہ نہ جانتے ہوئے بھی کہ کیا کرنا ہوگا وہ کچھ کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا۔ اس نے اچانک بوتل کھولی اور پینے لگا۔ ناگوار و نامانوس تلخی سے اس کی زبان اور حلق جل اٹھا۔ پیٹ سلگنے لگا۔ ذائقہ انتہائی شدید اور اس کی برداشت سے بہت آگے تھا مگر وہ جبراً پیتا گیا۔ سب کچھ بھولنے کے لئے اس کی دانست میں یہ تکلیف کم اور تھوڑی تھی اور اپنے مفاد کی خاطر اتنی تکلیف تو اسے برداشت کرنا ہی تھی۔ جلد ہی اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ کھو چلا جا رہا ہے اور کوئی دم میں اس کا تمام اندرون معہ غذا کے باہر اُلٹ پڑنے والا ہے۔ اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ڈال دیا اور چکرانے گھومنے لگا۔

بہت دیر بعد، نہ جانے کتنی دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو سکا تب کہیں گھر لوٹا۔ پھر اگلے دن ماں کو بالکل بتائے بغیر وہ اپنی پڑھائی کو بالکلیہ خیرباد کہہ کے ملازمت حاصل کرنے چلا گیا اور بڑی آسانی اور مزے سے اسٹور کیپر بن گیا۔

اختر اُسے اچھا بھی لگتا تھا مگر اختر سے اُسے ڈر بھی لگتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنا کام سوچ سمجھ کر سلیقے اور ہوشیاری سے نبھانے نپٹانے لگا۔ چند دنوں تک وہ وہاں کافی خوش رہا مگر رفتہ رفتہ جب اس نے اپنی حقیقی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ سب لڑکیاں جو اس کا آغوش گرما چکی ہیں گرماتی رہی ہیں، اپنی وفا اور وحدت کی قسمیں کھا چکی ہیں، اپنی خلوتوں کو صرف اُسی کے حوالے اور اُسی کے لئے وقف کر دینے کے وعدے کر چکی ہیں، مختلف لڑکوں کے ساتھ اب اسی "بار" میں دادِ عیش طلب کر رہی ہیں، تو جیسے وہ سناٹے میں آ گیا۔ وہ اُن لڑکیوں کو ایسی ناپسندیدہ حالت و کیفیت میں دیکھنے کے لئے پہلے سے تیار نہیں تھا۔ لہٰذا اس کی طلب اور شوق نے، اس کے اعتماد و یقین نے پھر ایک زبردست ٹھوکر کھائی اور اُس کی تمناؤں کے چہروں سے پھر صدہا نقابیں اُٹھ اُٹھ گئیں، بہت سٹپٹایا ہوا وہ گھر واپس ہونے لگا اور اپنے خاموش کمرے کی اندھیری تنہائی میں بستر پر گر گر کر زار و قطار رونے اور خود سے بار بار یہ سوال کرنے لگا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اب وہ زندگی سے کیسی اور قسم کی وفاداری چاہتا ہے۔ وہ جو خود کسی کا وفادار نہیں، ہر ہر جسم کو، بہت سے جسموں کو صرف اپنا ہی حق اور حصہ سمجھتا رہا۔ اپنی ہی ملکیت گردانتا رہا، اب اُنہی جسموں سے دھوکا کھا کر اس قدر برہم کیوں ہو رہا ہے۔ کیوں آنسو بہا رہا ہے کس لئے خود کو اور تباہ کر لینا، اور گنوا دینا چاہتا ہے۔ دنیا کا تو یہی دستور رہا ہے، کہ ایک اور ایک محض دو کی جوڑی بنی رہے۔ پھر اس نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ وہ خود اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس سے متصل ہونے والا ہر ہر جسم صرف اُسی کا جوڑی دار ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے جسم سے قریب یا پیوست ہونے کا کبھی حقدار یا طلبگار نہیں — وہ کسی کو روکنے یا اجازت دینے والا ہوتا بھی کون ہے۔ اسکی ممانعت یا اجازت کیا معنی رکھتی ہے اور یہ اجازت ہے کیا بلا؟"

یہ سب کچھ درست سہی مگر اب وہ کیا کرے۔ اب تک وہ اپنی ماں کے تنفر کے خوف سے نت نئی

لڑکیوں سے اجتناب اختیار کر رہا تھا۔ ماں کے خوف و عتاب سے بچنا اور نجات پانا چاہتا تھا لیکن اب جب خود اس کا اپنا تنفّر بھی اس میں شامل ہو چکا تھا، اب اس کی نجات کس میں تھی۔ کس کام کس قرار میں؟ سوچ سوچ کر تھک جانے کے بعد مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر کسی نتیجے کی گہرائی یا تہہ میں گئے بغیر ایک رات وہ چپکے سے گھر سے نکل پڑا۔ تعلیم اب اس کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھی اور ارجمند بھی مدّت گذری اُسے بالکل بھول چکی تھی۔ رو رو کر تھک جانے کے بعد اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ کسی خطرناک شکنجے میں پھنس گیا ہے کسی پیچیدہ جال میں اُلجھ گیا ہے جس کی ہر ہر پکڑ اور پھندہ اتنا مضبوط اور جکڑ لینے والا ہے کہ توڑے نہیں ٹوٹتا۔ سلجھائے نہیں سلجھتا بلکہ ہر حرکت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کسنا اور اُلجھنا، جکڑنا ہی جانتا ہے۔ سو وہ سیدھا اختر کے پاس گیا اور بولا کہ اسے ایک ضروری کام پر کچھ دن کے لئے باہر جانا پڑ گیا ہے مگر وہ جیسے ہی لوٹے گا، پھر سیدھا اختر کے پاس آ جائے گا۔ اختر نے اسے جانے کی اجازت بھی دے دی۔ کیونکہ اختر اسے نبھانا چاہتا تھا اور ذہن ہی ذہن میں اس کی شخصیت سے زیادہ اس کی کثیر جائداد کی توسیع کے پلان بنا رہا تھا جس میں اپنے موجب خود اس کا اپنا بھی ایک حصّہ پیدا ہو چکا تھا اور جسے وہ بہر حال تج دینا یا ہاتھ سے چھوڑ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اب لے دے کے ایک امّاں تھیں جنہیں بھلانے میں اگر اقبال کامیاب ہو جاتا تو پھر اس کا تمام مستقبل آسان ہی آسان اور سہل ہی سہل تھا۔ لیکن گھر سے بھاگ جانے کے باوجود امّاں سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔

امّاں امّاں —!! وہ سسک سسک کر کہتا۔ تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔ یہ سمجھ لو کہ میں تمہاری اولاد ہی نہ تھا۔ مگر دنیا کی ہر آواز اس کی ماں کی آواز میں ڈھل کر خود اس سے کہتی۔ لوٹ آؤ۔ لوٹ آؤ۔ نہیں تو میں گھل گھل کر مر جاؤں گی۔ میں اس دنیا میں باقی نہ رہوں گی اور جب میں نہ رہوں گی تبھی تمہیں معلوم ہو گا کہ میرا ہونا تمہارے لئے کتنا ضروری تھا۔

ایک ہفتے تک وہ مارا مارا پھرتا رہا لیکن آخر ش ایک روز اپنے آپ سے ڈر کر، اپنی تنہائی، اپنے فرار سے مقابلہ نہ کر پا کر وہ ایک ایسے شخص کے پاس گیا جو اُسے وقتاً فوقتاً لڑکیاں دلا سکتا تھا۔ رقم کی اقبال کے پاس کمی نہیں تھی۔ وہ گھر سے کافی کچھ اپنے ساتھ لے کر نکلا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ارجمند کے بیاہ کے بعد اب جو کچھ بھی ہے صرف اُسی کا ہے اور ماں کی موت کے بعد تو تمام کا تمام بالکلیہ اُسی کا حق اور حصّہ۔ اُسی کی حکمرانی کے تلے۔ تو کیا اس حکمرانی کی خاطر وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اُس کی ماں مر جائے؟۔

نہیں نہیں۔ اُس نے خود کو یقین دلایا۔ وہ ایسا نہیں چاہتا۔ قطعی نہیں چاہتا۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ امّاں اب اس کے کسی معاملے میں مداخلت نہ کریں، چنانچہ ایک بالکل ہی نئی اور اجنبی لڑکی کی آغوش میں سر رکھ کر، اس نے پہلی بات یہی کی۔

"مجھے بچاؤ۔ مجھے اپنی ماں سے کسی طرح بچاؤ — میں بہ منّت تم سے کہتا ہوں۔ خدارا مجھے اپنی ماں سے بچا لو۔"

لڑکی پہلے تو ہنستی رہی۔ اس نے سمجھا اس کا ساتھی نشّے کی زور دار ترنگ میں ہے۔ لہٰذا وہ خود مزہ لینے لگی اِس انوکھی گفتگو کا لطف حاصل کرنے لگی، مگر جب اقبال نے بس یہی رَٹ لگائے رکھی اور بات کو کسی اور رُخ بڑھانے کے لئے تیار ہی نہ ہوا تو پھر بالآخر وہ بھی کچھ سٹپٹا سی گئی۔ لڑکی کو اس بات کی حیرت ہونے لگی کہ وہ اُس کے جسم کی بجائے صرف اپنی ماں کے ذکر میں کیوں اُلجھا ہوا ہے۔ چنانچہ اس اُلجھن سے نجات پانے کی خاطر خود اس نے اقبال سے پوچھا "کیا تمہاری امّاں بہت ظالم ہیں؟

نہیں — بے حد نرم۔ بڑی ملائم" اقبال نے لڑکی

کو درندوں کی طرح گھورتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا تم اُن کی نرمی اور ملائمت سے ہی بچنا چاہتے ہو؟"
لڑکی نے سہم کر پوچھا۔

"ہاں - شاید - نہیں نہیں - بلکہ یقیناً۔"

"تو گھر سے بھاگ جاؤ اور پھر کبھی ان کا سامنا مت کرو۔"

"گھر سے تو بھاگا ہوا ہی ہوں۔"

"اور پھر بھی تم امّاں سے گھبرا رہے ہو۔؟"

"ہاں۔ کیونکہ اتنی دُوری کے باوجود وہ میرے پاس پاس میرے ساتھ ساتھ ہیں۔"

"ساتھ ساتھ۔ پاس پاس ؟؟" لڑکی نے ہڑبڑا کر جھجک اور گھبرا کر اسے دُور دھکیل دیا اور اپنا عُریاں تن ڈھانکتے ہوئے بولی۔ "کہیں تمہاری امّاں کوئی رُوح تو نہیں۔ وہ زندہ ہیں یا مُردہ ؟"

"بکواس بند کرو۔" اقبال دہاڑا۔ "تم میری امّاں کو مارنا چاہتی ہو مگر اچھی طرح سُن لو کہ وہ زندہ ہیں اور ابھی مر نہیں سکتیں۔"

لڑکی کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی مخبوط الحواس آدمی ہے۔ یہ اس کے پلّے نہیں پڑ سکتا۔ لہذا وہ اس سے اجازت لئے بغیر کچھ کہے بتائے بغیر اپنا عندیہ ظاہر کئے بغیر چپ چاپ کھسکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اُسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ نہ اقبال نشے میں ہے نہ اس کی بہکی بہکی گفتگو محض کوئی نشہ ہی ہے بلکہ یقیناً کوئی نفسیاتی مرض اور بیماری۔ عین ممکن اس کی علانیہ ذہنی غیر تندرستی۔ اور وہ خود بھی کسی نہ کسی کے کوئی نہ کوئی وقتی علاج کی خاطر ہی بک رہی تھی۔ برابر فروخت ہوتی آئی تھی مگر اس کے اپنے پاس صرف جسم کا علاج تھا، ذہن یا کسی اور بیماری کا ہرگز ہرگز نہیں۔ لہذا پھر اقبال کو پتہ بھی نہیں چلا اور وہ سرک کر دُور ہٹ گئی پھر لیٹرن جانے کے بہانے بگٹٹ بھاگی اور لوٹ کر پھر اقبال کے پاس نہیں پہنچی۔ تھک کر اقبال خود دوسری لڑکی کے پاس چلا گیا۔ وہ پہلی لڑکی کے بھاگ جانے سے کچھ ہوشیار اور خائف سا ہو گیا تھا۔ لہذا دوسری لڑکی سے اس نے اپنی ماں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اپنے کسی ذہنی شکنجے کی بابت بالکل ہی بات نہیں کی بلکہ وہ کچھ اس بوکھلاہٹ سے لگاتار ہنستا رہا اور خود کو ہر طرح بے فکر اور مسرور ظاہر کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ لڑکی اس کی کھوکھلی ہنسی اور مکاری کو تاڑ گئی اور بولی۔

"آپ اپنی محبوبہ کے چھن جانے کے غم میں میرے پاس آئے ہیں نا۔ وقتی پناہ ڈھونڈنے۔ خود کو دھوکا دینے۔ بہلانے۔"

"کیا کیا کیا۔؟" اقبال نے کچھ ایسی حیرانی یکایکی اور تعجب کا مظاہرہ کیا جیسے کوئی نئی مشین دفعتہً خراب ہو کر چرانے لگی ہو۔ لڑکی ہنس پڑی۔ "بڑے اچھے ایکٹر ہیں آپ۔ مرد بہروپیے تو ضرور بننا چاہتے ہیں مگر وہ اچھا سوانگ رچا نہیں سکتے مسٹر۔ اب خود دیکھ لو کہ اپنی جھوٹی اور مصنوعی خوشی کا کتنا بھدا، بھونڈا اور غیر فطری اظہار کر رہے ہو تم کہ علانیہ معلوم ہوا جا رہا ہے کہ تم دراصل وہ نہیں جو نظر آ رہے ہو ویسے نہیں جیسا خود کو ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ لہذا مہربانی کر کے کوئی اور طریقہ اپناؤ۔ اس طرح اختیار کرو کہ۔ کہ۔۔۔۔"

وہ یکایک چُپ ہو گئی۔ پھر اٹک اٹک کر رنجیدگی سے بولی۔

"میں تمہاری محبوبہ نہیں۔ محبوبہ کا بدل بھی نہیں۔ میرے پاس ایک نسوانی جسم ضرور ہے، نسائی چارم، آرام اور دلکشی ضرور، میری اپنی خود ایک کشش ضرور، لیکن تمہارے لئے، کسی کے لئے وہ جذبہ ہرگز ہرگز نہیں جو محبوباؤں کے پاس ہوا کرتا ہے۔ محبت کرنے والوں کا خاصہ ہوتا ہے، جو جو۔۔۔۔"

"پاگل پن ختم کرو۔" اقبال چلّایا۔ "نہ میری کوئی محبوبہ ہے۔ نہ میں نے کبھی عشق کیا ہے۔ میں جانتا ہی نہیں کہ یہ عشق وشق کیا بلا ہے۔ کس طرح ہو جاتا ہے آخر۔ مجھے تو بس لڑکی چاہیئے۔ بہت سی لڑکیاں۔ بے شمار نئے نئے جسم۔ خوبصورت اور مچلتے پھسلتے ہوئے۔ خواہ وہ کوئی ہوں۔ کسی کے ہوں۔ کیسے بھی ہوں ہاں۔"

"تب تو میں تمہاری خواہش ضرور بن سکتی ہوں، تمہاری اچھی ساتھی ضرور۔ اگرچہ کا ہمارا ملاپ بڑا

عارضی ہوگا مگر مجھے یقین ہے کہ میری طرح تم بھی اسی زندگی سے خوش اور مطمئن رہوگے کیونکہ ....."

"آگے کہو" اقبال نے لڑکی کو رکتے ہوئے دیکھ کر بے تعلقی سے کہا۔

"کیونکہ محبت وحبت سب ڈھونگ ہے۔ صریح دھوکا۔ شیریں فرہاد۔ لیلیٰ مجنوں۔ ہیر رانجھا کے تمام قصے من گھڑت اور دیوانوں کے گھڑے ہوئے۔ تم خود سوچو ایک انسان اپنے جسم سے علیحدہ اور اونچا کس طرح ہو سکتا ہے بھلا۔ اپنے جسم سے الگ صرف اپنے جذبوں کے ساتھ کس طرح اور کب تک رہ سکتا ہے آخر۔ تم اور میں ہی نہیں کوئی نہیں رہ سکتا۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ میرے تجربے نے ہی مجھے سکھایا بتایا ہے کہ صرف وہی لوگ اس جہان میں خوش اور مست ہیں جو ہر بات بھول کر صرف جسم کو یاد رکھتے ہیں۔ جسم سے گریز نہیں کرتے۔ جسم سے انکار نہیں کرتے بلکہ ایک کے بعد دوسرے دوسرے کے بعد تیسرے قصہ مختصر مسلسل جسموں پر چلتے پھسلتے، جسموں کو اپنے ساتھ گھسیٹتے پھلانگتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اگر جسم اتنا ضروری اور اہم نہ ہوتا تو انسان کو ایک مخصوص قالب کی ضرورت ہی کیا تھی آخر۔ وہ دھوئیں کی طرح پانی کی طرح تنکوں کی طرح کسی بھی طرح زندہ رہ لیتا اور خود کو کبھی محسوس نہ کرتا۔"

جب لڑکی اپنے مزاج کا ماحصل سمجھا کر چپ ہو گئی تو اقبال نے ذرا آنکھیں میچ کر اور بھی بغور اسے دیکھا۔ کافی عقلمند ہے بلقیس کی طرح۔ اس نے سوچا۔ مگر یہ کیسی لڑکیاں ہیں۔ نئے نئے خیالوں نئے نئے ارادوں میں مگن۔ خود اپنے آپ میں بند لپٹی لپٹائی مگر اوروں کے لئے بالکل پیش پیش اور عریاں؟ مگر اس طویل اور ناپسندیدہ گفتگو سے اس کا دماغ دفعتہً تھک گیا تھا۔ کیونکہ اب اقبال کم سے کم گفتگو کرنا اور سننا چاہتا تھا۔ وہ دن بدن بدلتا اور نئی نئی عادتیں اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کبھی وہ اپنی ماں سے بحث مباحثہ بھی کر لیتا تھا مگر اب تو ہر بحث اور کھوج سے بالکل کترانے لگا تھا۔ لہذا اس نے ہاتھ بڑھا کر پھر فوراً ہی بتی بجھا دی اور لڑکی کو اپنے اور بھی قریب کھینچ لیا۔ بڑی دیر تک وہ گڈمڈ اور خلط ملط رہا۔ پھر نرمی اور گداز سے خواہش اور ہوس سے گذر جانے کے بعد خود کو انڈیلنے اور لڑکی کو بھی خالی کر دینے کے بعد وہ حسب دستور اطمینان، مگر اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور شعوری طور پر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ حتیٰ کہ گہری گاڑھی رات نے بہت جلد اپنا بھاری تاریک لبادہ اس پر اوندھا بھی دیا، اڑھا بھی دیا اور اقبال مسرت کی قربت سے بغلگیر بالآخر سو بھی گیا۔

پھر نئی صبح جب وہ جاگا تو لڑکی جا چکی تھی اور اکیلا پن پھر اسے ناگ کی طرح ڈس رہا تھا۔ تو اب وہ کیا کرے۔ کب تک خود سے بھاگتا دوڑتا پھرے۔ کب تک خود کو خود سے چھپائے بچانے کی کوشش کرتا رہے۔ کیونکہ خود اپنے آپ سے اپنے خوف کو برداشت کرے۔ کب تک بے معنی طور پر سرگرداں رہے؟؟؟

سوالات اس پر ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگے اور پھر دفعتہً اس کے ذہن کے خالی افق پر ناامیدی کے گھور اندھیرے میں امید کا ایک تارا جھلملایا۔ چمک اٹھا۔ پرانا خیال پھر نیا روپ دھار کر سامنے آیا۔ اگر وہ بیاہ کرلے۔ اماں کا کہا مان جائے تو یقیناً اس مستقل تنہائی کا سدباب تو ہو سکتا ہے۔ اسے ایک ایسا ساتھی فراہم ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا جسم، جو اسے خود بھی پسند آئے نہ آئے مگر اس کی تنہائی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اسے تلاش سے اس زنداں سے نجات دلا سکتا ہے۔ تب بیاہ کی اہمیت اور خواہش پہلی بار اسے للچانے تڑپانے لگی۔ شدت سے اکسانے اور سکون بخشنے۔ اس نے فوراً اٹھ کر اپنا سوٹ کیس تھاما اور سیدھا اسٹیشن چلا گیا۔ پھر پہلی گاڑی پکڑ کر اماں کے حضور جا پہنچا۔

اماں بستر علالت پر تھیں۔ بیٹے کے فرار کی ہیبت و تشویش نے انہیں بالکل کھاٹ سے لگا دیا تھا اور راجبند پلنگ کی پٹی پکڑے اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ اقبال کو اچانک خلاف توقع دیکھ کر پہلے تو وہ بھونچکی رہ گئی۔ پھر

لپک کر اُس کے پاس آئی اور اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ کچھ دیر تک خاموش آنسو بہالینے کے بعد وہ غصّے سے بولی۔

"کہاں چلے گئے تھے تم۔ گدھے کہیں کے۔ دیکھو تو امّاں کی کیا حالت ہوگئی تمہارے غیاب میں۔ کوئی اطلاع دیکر تو جاتے۔" پھر وہ اقبال کی چُپ سے اکتا کر اسے کھینچتی ہوئی ماں کے پلنگ تک لے گئی اور اس بار سرگوشی میں تاکید کی "بس بس اب خود سنبھلو اور امّاں کو بھی سنبھالو۔ اُنہیں تمہارے سوا کوئی اور نہیں سنبھال سکتا کبھی ــــ" پھر اس نے ماں کا شانہ ہلاکر ہلکی پھلکی آواز میں کہا۔ "دیکھئے تو امّاں، کون آیا ہے بھلا" ماں نے اپنی نقاہت بھری آنکھیں کھولیں۔ دُھندلائی اور ڈگمگائی ہوئی آنکھیں۔ اور اقبال کو پاکر اسے تکتی ہی رہ گئیں، جیسے مسرّت سے انہیں سکتہ ہوگیا ہو۔ پھر کافی دیر بعد ارجمند کے جھنجھوڑنے پر انہوں نے ہاتھ بڑھاکر اقبال کے مادی وجود کو ٹٹولا تو وہ سرتاقدم بُری طرح کپکپا رہی تھیں، جیسے وہ ہنوز یقین اور بے یقینی کے عالم میں مبتلا ہوں مگر جب اُنہوں نے اقبال کو چھُولیا۔ پکڑ لیا اور خوب اچھی طرح محسوس کرلیا تو ان کی ناتوانی نے کچھ جان پائی اور کبھی مسرّت اور محبت سے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں تشکایتاً اُنہوں نے کہا۔ کہاں چلے گئے تھے اقبال۔ کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر ــ" اور درد و تکلیف کے، تشویش کے آنسو ٹپاٹپ، اُن کی بوڑھی آنکھوں سے خزاں رسیدہ پتّوں کی طرح جھڑنے لگے۔ ارجمند نے آہستہ سے اپنے اور ماں کے آنسو پونچھے اور بے فکری سے سوچا۔ ایک ماں مرنے سے بچ گئی۔ ایک ماں زندہ رہ گئی، مگر اقبال سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے نہ وہ قصوروار ہو نہ مجرم بلکہ ساری خطا خود ماں کی ہو جو بیمار پڑکر سب کو پریشان کربیٹھیں۔

اور پھر اقبال نے اپنے غائب ہوجانے کے متعلق نہ جانے کیا کیا عمدہ بہانے تراشے۔ کیسی اوندھی سیدھی پٹّی امّاں کو پڑھائی کہ اپنی ساری عقلمندی اور ہوشمندی بھول کر یا عمداً بھُلاکر امّاں کو فوراً اقبال ــــ کے چانسوں میں آجانا پڑا اور اسی لمحے سے فوراً انہوں نے تندرست ہونے کا پروگرام بھی شروع کردیا۔ انہیں اقبال کی مرضی معلوم جو ہوگئی تھی بیاہ کے لئے، اقبال رضامندی۔ لہٰذا اب انتظام اور اہتمام بھی تو ضروری تھا اور اُن کی تندرستی کے بغیر یہ سب ہو نہ سکتا تھا۔

نتیجۃً لڑکی بیاہی جاچکی تھی۔ وہ اقبال کی تاخیر کا ساتھ نہ دے سکی تھی لہٰذا اب اماں نے مصلحتاً اچھی سے اچھی لڑکی دیکھنے بھالنے یا ڈھونڈنے پرکھنے کے تمام وقت طلب پروگرام ترک کرکے فوراً ایک آسانی سے مل جانے والی سیدھی سادی لڑکی پھر منتخب کرلی اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہوگیا۔

اقبال ایک عدد بیوی کا مالک و مختار بن گیا اور بیوی کو ہاتھوں ہاتھ لے کر وہ اس طرح اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، جیسے بچپن میں اپنے نئے کھلونوں، دوستوں یا رنگین کانچ کی گولیوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اسے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی، نہ خیال ہی آیا کہ اس کی بیوی کے خدوخال کیسے ہیں۔ مزاج کیسا۔ وہ کس قسم کی ہستی ہے۔ کوئی ترشی ہوئی شخصیت یا محض ایک ناتراشیدہ وجود۔ اس کے جذبات اور روح کیسی ہے۔ وہ خود کیا چاہتی کیا مانگتی ہے۔ اپنی اصلیت میں آخر کیسی بلکہ وہ تو صرف یہ دیکھ رہا تھا اور یہی دیکھنا بھی چاہتا تھا کہ یہ نسائی چیز اس کے جسم کا شایانِ شان جواب دے بھی سکتی ہے یا نہیں۔ اس کی تمام مادی تنہائی بانٹ اور پاٹ بھی سکتی ہے یا نہیں۔ یہ امّاں کی پسند ہوکر بھی اس کی اپنی پسند ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اور اقبال کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ وہ اس کے کام کی چیز نکلی۔

پھر بہت سارے اگلے دن بڑی طرح گذر گئے۔ اپنے شوق اور شب بسری کے لئے اب اقبال کو آئے دن تلاش اور تگ و دو کی ضرورت نہ رہی۔ ہمیشہ لڑکیوں کو نت نئے طریقوں سے پھانسنے یا اپنی جیب پر بار ڈال کر حاصل کرنے اور خریدنے کی زحمت و کاوش سے وہ بالکل ہی بچ گیا۔ وہ اپنی ماں کی دانشمندی، فراست اور محبت کا

قائل بھی ہو گیا۔

اماں اماں آپ کتنی اچھی کتنی پیاری کتنی قیمتی ہیں۔ آپ نے میری سب سے اہم اور ناگزیر خواہش کی تکمیل کتنی آسانی اور سہولت سے کردی اور میں بے وقوف اب تک ایسی عقلمندانہ ترین ترکیب سے بھاگتا رہا۔ خواہ مخواہ خود کو بچاتا رہا۔۔۔!! وہ یکایک خود کو خاصہ سنجیدہ اور سوبر تسلیم کرنے لگا۔ اب وہ مستند طور پر ایک عورت کا بالکلیہ مالک جو تھا جسے اپنی ذات کی شمولیت سے نہ صرف اُس نے عورت بنایا تھا بلکہ اپنی رفاقت سے سماج میں ایک خاص رُتبہ اور درجہ بھی بخشتا تھا۔ ایک عمدہ سماجی شرف۔ وہ اُس سے کھیلتا رہا کھیلتا رہا۔ کھیلتا گیا حتیٰ کہ جی بھر کھیل لینے کے بعد جذبات سے کورا۔ ہوس سے متوالا۔ تنویر سے بالکل خالی اقبال کا ردی ذہن رفتہ رفتہ پھر بھٹکنے لگا۔ پھر سوا تر مانگنے لگا اور اس کا تمام جسم مدت تک ایک ہی عورت کی نسائیت برداشت کرتے کرتے پھیکا سیٹھا بدمزہ ہونے تھکنے اور دکھنے لگا۔ اُسے بلقیس یاد آنے لگی۔ بلقیس جو کہا کرتی تھی۔ عورت عورت برابر ہوتی ہے سب عورتیں ایک جیسی یکساں۔ کوئی کسی سے بہت مختلف نہیں تو پھر اس بے وقوفی کی ضرورت ہی کیا ہے آخر کہ ایک ہی عورت کو خاص طور پر ہتھکڑی بیڑی بنا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی کے ہاتھ پاؤں میں ڈال لیا جائے اور پھر ہر دوسری عورت سے خواہ مخواہ کنارہ اور گریز کر لیا جائے۔

لاحول ولاقوۃ۔ اقبال نے سوچا۔ اُس نے کتنی بڑی بے وقوفی۔ کتنی علانیہ نادانی۔ کتنی زبردست حماقت کا مظاہرہ کر ڈالا ہے۔ محض اماں کی باتوں میں آکر اس نے تو خود کا بالکل ستیاناس کر لیا ہے۔ اب وہ ایک قیدی کا منہ لے کر بلقیس کے پاس کس طرح جائے جو ہمیشہ سے آزادی کی متوالی رہی ہے اور آزاد لوگوں کو ہی پسند بھی کرتی ہے اور اب چونکہ وہ اپنی رہن شدہ آزادی اپنی بیوی کی تجوری سے چھڑا نہیں سکتا لہٰذا بلقیس کے پاس بھی نہیں جا سکتا۔ اُس کی بیوی تو خزانے کے سانپ کی طرح اپنی تجوری پر بیٹھی ہوئی تھی اور مانا کہ کسی عورت میں کوئی خاص نئی بات نہیں پھر بھی بدلتے ہوئے جسموں میں ایک تنوّع اور فرق ضرور ہوتا ہے جو دلچسپی کو بنائے رکھتا ہے۔ تنوع اور دلچسپی جو اقبال کی سب سے بڑی کمزوری اور کشش ثابت ہو چکی تھی۔

اماں اماں۔۔۔!! اُس نے جھنجلا کر سوچا۔ یہ تم نے مجھے کس گورکھ دھندے میں باندھ دیا۔ کتنی ہوشیاری سے پھانس کر مجھے ایک مضبوط پنجرے میں بند کر دیا۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ کیا تم دراصل میرے دوست نہیں۔ دشمن ہو دشمن۔۔؟

پھر اسے دفعتہً اپنی بیوی سے قلبی نفرت محسوس ہونے لگی جیسے اس کی بیوی اس کے دکھ سکھ کی ساتھی نہیں بلکہ کوئی خار دار جھاڑ جھنکاڑ تھی جس نے اسے زخمی کر کے بُری طرح خود سے اٹکا رکھا تھا اور اقبال کو یہ سوچ کر خوف بھی ہونے لگا کہ وہ اُسے ہمیشہ صرف اپنے لئے ہی مانگتی رہے گی اور خود کے لئے خرچ کر کر کے بالکل ختم بھی کر دیگی دوسرے ہر جسم ہر حسن ہر تفریح کے لئے بالکلیہ بے کیف، بدمزہ اور خاموش کر دے گی۔ اس میں ایسی یکسانیت اور ٹھہراؤ پیدا کر دے گی جو ایک جوہڑ کی طرح محدود رہے گا۔ ٹھہراؤ جو خاتمے کا دوسرا نام ہے۔ سو ایسی احمقانہ سوچ بچار اور خطرناک موڈ میں وہ ایک روز اپنی بیوی سے بھی لڑ جھگڑ پھر نامعلوم طریقے سے گھر سے نکل پڑا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اب وہ خود باپ بننے والا ہے۔ ایک اور نئی زندگی کا ذمے دار اور سرپرست بھی۔ اس موقع پر اسے پھر اختر کا کہا یاد آ گیا کہ اس دنیا میں ہر مرد کسی نہ کسی کا باپ یا بیٹا ہے اور یہ چکر اتنا منطقی اور لامتناہی کہ کہیں جا کر نہیں ٹوٹتا اور اس لحاظ سے ہر مرد ہمیشہ ایک سلسلہ ہے۔ ہر مرد خود ایک مشین۔ اپنے جیسے متعدد انسان بنانے اور وجود میں لانے والی۔ تو جب آئے دن بے شمار انسان بنتے اور ظہور پذیر ہوتے ہی رہتے ہیں تو اب اس میں بھی کونسی نئی بات یا

اہمیت ٹھہری کہ اس نے بھی اپنے جیسا ایک انسان بنا دیا۔
جہنم میں جائیں سب انسان۔ اس نے سوچا اور اُسے انسان کی پیدائش بڑی غیر ضروری اور مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ انسان کی وقوع پذیری بالکل خالی از مسرّت۔ نہ جانے اس سے پہلے بھی وہ کتنے انسانوں کو پیدا کرنے کا موجب بنا مگر یہ اور بات تھی کہ وہ سارے انسان وجود میں آنے سے پہلے ہی منظرِ عام پر نمودار ہونے سے قبل ہی کاغذ کی طرح توڑ مروڑ کر پھینک دیئے گئے۔

اور یہ اقبال کی بے حسی کی انتہا تھی۔ یہ اُس کے اندر خود ایک انسان کی بلکہ تمام انسانیت کی موت۔ ہر لطیف جذبے کی علی الاعلان خودکشی۔ جذبہ جو رفاقت سے پیدا ہوتا، محبّت کی غذا حاصل کر کے بڑھتا اور ملاپ کے زیرِ سایہ توجہ کے عنوان بنیتا، پروان چڑھتا نسل در نسل چلتا ہے۔ اب اقبال کی ہوس کے پیروں تلے کچلا جا کر ایسا خوفناک ہو گیا جو خود اقبال کو ڈراؤنا بنانے لگا اور اس دفعہ جب اقبال کے قدم اپنے گھر سے دُور ہٹ رہے تھے تو وہ شعوری طور پر اپنی ماں کو بھی بھول چکا اور خود سے بہت پیچھے اور پرے چھوڑ چکا تھا۔ اب نہ ماں کی محبّت اس کے ساتھ تھی نہ ماں کا خوف، نہ ماں کی خوشنودی۔ بلکہ صرف ایک نفرت، ایک علانیہ بغاوت، ایک شدید کڑواہٹ اور بے گانگی جو اپنے وجود کی چاہت کے علاوہ بقیہ ہر بات بھول چکی تھی۔ ہر احساس پھلانگ چکی تھی۔ تمام چہرے خلط ملط کر کے دھندلا چکی تھی اور اِدھر اُدھر کی ہر ہر اُس چیز کے لئے اُس کے دل دماغ کو کُند کر چکی تھی۔ اس کے وجود میں اِس طرح گھر کر چکی تھی، اِس طرح مسکن بنا چکی تھی کہ اس بار اقبال خود کوئی خوش آئند وقتی فریب کھانے یا کسی کو دینے گھر چھوڑ کر نہیں چلا تھا بلکہ شاید وہ فریب کو ہی اپنا شعار اور زندگی بنا چکا تھا۔ اپنا رویہ اور وطیرہ اور اس بار اُس کے پاس اپنی آئندہ تمام زندگی کا سوچا سمجھا پسندیدہ لائحہ عمل بھی تھا۔ ایک اٹل اور دیر پا پلان جس میں ارادی فریب کو ہی دخل تھا اور کسی خوش فہمی یا غلط فہمی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

جب وہ دوبارہ اختر کے کاؤنٹر پر پہنچا تو سب اُسے دیکھ کر مسکرائے۔ اختر نے دلچسپی سے اس کی پیٹھ ٹھونکی "تم اتنے دن تک غیر حاضر رہے" یہ میرے لئے کوئی خاص بات نہیں بلکہ تم نے مجھے یاد رکھا اور لوٹ کر میرے پاس آئے یہی میرے لئے سب سے خاص بات ہے تم آؤ گے یہ میں بھی جانتا تھا اس لئے میں نے تمہیں جانے سے بھی نہیں روکا، ورنہ شاید تمہیں میں جانے ہی نہ دیتا۔
وہ بڑے خاص انداز میں مسکرایا اور نرم نرم احتیاط سے بولا۔ "جاؤ اب پھر سے اپنا کام کرو۔ میرے پاس آدمیوں کی کمی نہیں مگر میں تمہیں دیا ہوا کام اب دوسرو کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ تمہیں ہی سونپنے، تمہارے ہی حوالے کرنے کیلئے میں نے اُسے جُوں کا تُوں اُٹھا رکھا ہے۔" چنانچہ اقبال نے پھر چارج لے لیا اور اس مرتبہ وہ زیادہ چابکدستی دکھانے لگا کیونکہ اب وہ کبھی گھر لوٹنا اور پابندیوں کے اس جہنم میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ اِس دفعہ اس کے ساتھ کوئی بھاری رقم ہی تھی۔ وہ کچھ ایسے سرسری انداز میں گھر سے نکلا تھا کہ کچھ سمیٹنے کا موقع بھی نہیں تھا اور جب سے اس کی بیوی آگئی تھی اماں نے سب کچھ اس کی تحویل میں دے دیا تھا۔ نادانستہ یا عمداً وہ یہ نہیں جانتا تھا مگر بیوی کے آجانے کے بعد وہ اماں کے حکم سے اپنی ہر ضرورت کے لئے بیوی کا دست نگر ہو گیا تھا اور پیار کا زمانہ گذر جانے کے بعد یہ خود اس کے لئے کوئی اچھی صورت نہیں تھی چنانچہ اب اس کے پاس صرف وہی تھوڑا سا پیسہ تھا جو ناگزیر اخراجات کے سلسلے میں اس کے پاس رہ گیا تھا اور اب جب تک پیسہ پیدا نہ کیا جاتا اس کی جمع پونجی یا اثاثہ کچھ نہ تھا۔ نہ پیٹ بھرنے کے لئے، نہ عیش کے لئے، نہ خفیہ سرگرمیوں کے لئے۔ لہٰذا اقبال نے زیادہ سے زیادہ محنت کرنا شروع کر دی۔ وہ

جانتا تھا کہ اب جب تک اپنی تھوڑی بہت رقم میں مزید رقم شامل اور شریک نہ کی جائے تب تک وہ کسی قابل نہیں، اور دنیا میں عیش کے بغیر رہنا اسے پسند بھی نہ تھا۔ اسے اسے کسی رشتے ناطے کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی مہربان یا ہمدرد کی ضرورت نہیں۔ کسی خلوص یا وابستگی کی حاجت نہیں۔ اس نے مکّاری کو قبول کر لیا تھا اور اب مکّاری ہی سے بدرجۂ اتم نبھانا بھی چاہتا تھا۔ اب وہ جی جان سے محنت کرنا اور بلا روک ٹوک زندگی بھر عیش کرنا چاہتا تھا اور اختر اس کی اس نئی چالاکی اور مستعدی سے خوش بھی تھا اور وہ خود دھیرے دھیرے اختر کو اپنے بس میں کر کے بے بس کرنے کے منصوبے میں ازحد مصروف۔ دونوں میں حصول کی ایک خاموش ہاتھاپائی شروع ہو چکی تھی اور اگرچہ اقبال ایک منصوبہ اپنے پاس رکھنے کے باوجود خاموش اور بے زبان تھا مگر اختر ہمہ وقت اس کی ذہنی دانائی پر اسے شاباشی دیتا اور اس کی جوانمردی پر مسرت سے اسے للکارتا ہوا ——

"تم درحقیقت مرد ہو اقبال۔ اصلی اور کھرے مرد۔ وہ سارے مرد جو زندگی کے جُوئے میں بیلوں کی طرح جُتے ہوئے قیدی بنے ہوئے ہیں وہ مرد کہاں۔ وہ تو غلام ہیں غلام۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچوں کے پھندوں میں اسیر۔ زندگی کا کڑا بوجھ دوسروں کے لئے ڈھوتے ہوئے، رشتوں ناطوں کی گہرائیوں میں گلے گلے تک دھنسے پھنسے، اپنے سوائے سب کے لئے زندہ اور باحیات۔ سب میں مدغم اور آمیز۔ مگر جو خود چاہیں بھی تو خود کو ناپ تول نہیں سکتے۔ خود کو الگ کر کے نہیں دیکھ اور جانچ پرکھ سکتے۔ خود کو نہیں ڈھونڈ اور پا سکتے۔ محض اپنے لئے زندہ نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ بہت گنوانے اور کھو جنے پر بھی جو چیز ان کے ہاتھ آتی ہے وہ یا تو باپ ہوتا ہے یا بیٹا یا بھائی۔ بس کچھ اور نہیں کبھی نہیں۔ اس لئے یاد رکھو کہ تم اُن سب سے بہتر مرد ہو جو فقط اپنے لئے زندہ ہو کہ زندگی کی شان بھی یہی ہے کہ آدمی سب سے پہلے خود سے انصاف کرے اور تب کہیں اوروں سے انصاف کرے ہاں۔" اور اس گفتگو کے ساتھ ساتھ اختر اقبال کو دھندے کی کامیابی کے بہت سے آثار چڑھاؤ، کارآمد گُر اور نکتے، پیچ و خم بھی سکھانے لگا۔

"اقبال، تم ایک جیوٹ، بہادر، غیر پابند، دلیر اور آزاد منش مرد ہو۔" وہ وقتاً فوقتاً اپنے منصوبے کی دھار تیز کرنے کیلئے اقبال سے کہتا رہتا۔ "اگر تم سب کچھ دل لگا کر سیکھ جاؤ اور احتیاط سے نپٹانے لگو تو ایک نہ ایک دن بلکہ بہت جلد خود میری طرح ایک علیحدہ کاؤنٹر پر بیٹھ سکتے ہو۔ اپنی خود ایک متعیّن جگہ بنا سکتے ہو کیونکہ تمہارے پاس جائیداد ہے۔ پیسے کی کمی نہیں۔ صرف تجربے اور ہوشیاری کی کمی ہے مگر غم نہ کرو میں تمہیں کندن بنا کر رہوں گا اور اپنے بازو کے برابر کھڑا کر کے رہوں گا پھر دیکھنا زمانہ تمہارے آگے بھی کس طرح جھکتا ہے۔ میں تمہاری جائداد کو برباد کرنا نہیں چاہتا دوست، بلکہ میں تو اس میں روز افزوں ترقی چاہتا ہوں اور جب تک تم اور میں پارٹنر نہیں بن جاتے تمہاری جائداد میں اضافہ ممکن نہیں۔ ہمیں مشترکہ طور پر بزنس چلانا چاہئے تاکہ میرا دماغ اور تمہاری محنت مل کر ہی کوئی زیادہ اچھا رنگ لا سکے۔ پیسے کی میرے پاس بھی کمی نہیں اور ایک مرد دوسرے مرد کے ساتھ تو بے شک زندگی گذار سکتا اور معاملت کر سکتا ہے مگر کسی بزدل، کم ہمت یا نامرد کے ساتھ نہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

اقبال کو اپنا خیال خود نہیں معلوم تھا مگر اپنے لالچ کا پتہ ضرور تھا اور پھر اختر کے ساتھ رہتے رہتے اور اس کی بات سُنتے سُنتے اسے یقین ہونے لگا تھا کہ ایک نہ ایک دن، جلد یا بدیر وہ بھی ایک صاحب ثروت آدمی ضرور بن جائے گا اور تب مالکانہ ٹھاٹ سے خود مالکوں کی طرح دھندا چلائے گا اور سب کو بتا دے گا کہ وہ سدا اپنی ماں یا بیوی کا محتاج

نہیں۔ اُسے اختر کی طرح ایک بلند اور چمکدار کاؤنٹر پر بیٹھنا بہت پسند آگیا تھا۔ چنانچہ اِس یقین کے ساتھ ساتھ اُس میں ایک ایسا غنا بھی پیدا ہوتا جارہا تھا جو اسے عام اور معمولی انسان سے برتر و بے نیاز ظاہر کرنے لگا تھا گویا اختر کا چہیتا بن کر اپنی دانست میں وہ خود کو وقت سے پہلے ہی ایک بلند اور شاندار مقام پر محسوس کرنے لگا تھا حالانکہ بلندی اور شانداری کے بارے میں وہ دراصل کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ رتی برابر بھی واقف نہ ہو سکا تھا اور جو کچھ جانتا تھا، جانتا جارہا تھا وہ روز بہ روز اُسے کسی نہ کسی پستی کی طرف لے جارہا تھا لیکن کوئی نہ تھا جو اقبال کو بلندی اور پستی کا اصل فرق سمجھا سکتا۔ اُس کے بھٹکے ہوئے ذہن کو جسم کی لذّت اور طلب سے توڑ کر حقیقی بالیدگی کی طرف واپس لا سکتا۔ اس کی تمام نشو و نما پر سے غیر حقیقی اور فرضی پردے اٹھا کر اس سے کہتا۔ اپنا جھوٹا زعم بھول جاؤ اور اصل کا نظارہ کرو کہ تمہاری اصلیّت وہ نہیں جو تم بنا اور مان رہے ہو بلکہ تمہاری اصلیت اس سے بہت مختلف ہے۔ بہت الگ۔ جس روز جبر کر کے تم خود کو پہچان جاؤ گے، پا لو گے وہی تمہاری زندگی کا آغاز اور سب سے سُنہرا دن ہوگا۔ تمہاری جھوٹی زندگی کی سب سے اچھی اور سچی ساعت۔ تمہارا اصل حوصلہ اور صحیح طاقت۔ لیکن جب یہ کہنے والا کوئی نہیں تھا تبھی اختر اپنے تمام وثوق کے ساتھ اُسے اپنے ساتھ لئے جارہا تھا اور اختر چونکہ خود جذبات سے عاری، نِرا کاروباری آدمی تھا لہذا خود اُسے کسی زندگی کی خوبصورت دھڑکن یا وفورِ شوق سے نہال جنبش، یا بے پناہ، بے تحاشہ معصوم احساسات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے کاروبار ہی سے ہمکنار رہنا چاہتا تھا یا پھر عورت سے۔ عورت جس کا اس کی زندگی میں کوئی خاص مقام نہیں تھا جو اس کی چاہت اور طلب کا ایک کھلونا تھی، جو اس کی دانست میں پیسے سے گھڑی اور پیسے سے ہی توڑی جا سکتی تھی، مگر پیسے کی طاقت اور حسن کے سامنے۔ پیسے کے رُعب سے چوں بھی نہ کر سکتی تھی۔ جو تلسّے کے بعد اس کا سب سے چہیتا شوق تھی۔

چنانچہ چند مہینوں تک جب اقبال اُس کے پاس جم کر رہ گیا اور بالکل اس کی مرضی کے مطابق نبھنے لگا تو ایک رات کو اختر اقبال کو اپنی بلڈنگ کے ایک ایسے حصے میں لے گیا جو ملحق اور متّصل ہوتے ہوئے بھی "بار" سے خاصہ الگ تھا اور جسے ایک موٹی چوبی دیوار نے "بار" سے اس طرح جدا کر رکھا تھا کہ اِدھر کے لوگوں کو اُدھر اور اُدھر کے لوگوں کو اِدھر آنے جانے کی کوئی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ حتیٰ کہ کوئی ایسا ہی خاص معاملہ درپیش نہ ہو۔ مگر جب اقبال وہاں لے جایا گیا تو وہ مارے مسرت کے کچھ حیران اور پریشان سا ہو گیا کیونکہ رات کے اندھیرے میں چوڑیوں کی جھنکار اور مدّھم مترنم نسوانی قہقہے لطیف حکایتوں کی طرح۔ چنچل شوخ متوالے پرندوں کی طرح اچھل ابھر کر پھر خاموشی کی سُونی تہہ میں دب جاتے تھے۔ جہاں نسائیت کا ایک ڈھیر سا جمع تھا اور گُنجلک اندھیرے کے باوجود کچھ ایسی ڈھکی چھپی روشنی جو علانیہ اقبال سے کہہ رہی تھی۔ آؤ۔ بس اب فوراً آجاؤ ــــ! جہاں پہنچ کر اختر نے اقبال سے پہلی بار کہا تھا۔ "یہ بھی اپنا ہی سائڈ بزنس ہے۔ اگر چاہو تو جی بہلانے کبھی کبھار آجایا کرنا۔ دل بہلائی کی تم سے کوئی قیمت نہیں لی جائے گی مگر ہنسو حد سے کبھی تجاوز نہ کر جانا کیونکہ مجھے حدوں کے اندر رہنے والے انسان ہی پسند ہیں۔ بے حد۔ بے سرحد انسان پسند نہیں۔ زندگی عیش ضرور ہے مگر زندگی کاروبار بھی ہے اور کاروبار کے لئے نظم و نسق بے حد ضروری۔"

تو یہ مزے بھی ہیں۔ اقبال نے سوچا تھا اور وہ اختر کی کاروباری وسعت پر دنگ رہ گیا تھا۔ اقبال کی پچھلی زندگی میں کبھی کوئی رکاوٹ یا دشواری نہیں تھی۔ نہ مالی نہ سماجی۔ وہ صرف اپنی ماں کا کفیل

تھا اور ہمیشہ ٹھاٹ باٹ کی شاندار زندگی گذارتا آیا تھا۔ ماں کے سوائے کوئی اور اس کے معاملاتِ حیات میں مداخلت کرنے والا نہیں تھا حتیٰ کہ بیاہ کے بعد بھی اس نے اپنی شان و شوکت برقرار رکھی تھی اور زیادہ تر بغیر تفکرات اور جد و جہد کے ہی جینے کا عادی تھا مگر اِن چند پچھلے اور حالیہ مہینوں میں اُس کی حالت ویسی نہ رہی تھی۔ موجودہ زندگی نے اسے بہت کچھ سکھا پڑھا دیا تھا اور اختر کے میلان نے اسے خلافِ رجحان کام کرنے کا عادی بھی بنا دیا تھا۔ تجربے کے عنوان وہ جان چکا تھا کہ جسم اور شوق و ذوق کے ساتھ ساتھ کاروبار کی بھی کچھ نہ کچھ ضرورت اور حقیقت ناگزیر ہے اور زمانے کو زیرِ نگیں رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا مقام ضرور درکار، جہاں انسان اپنی ساری بے اعتدالیوں کے باوجود خود کو ہر دست بُرد سے محفوظ رکھ سکے اور جس کے توسّط سے ہی تمام زمانے کو نیچے دبا دے اور خود ایک بادشاہ کی طرح زمانے پر حکومت کرے۔ چنانچہ جرم و گناہ کی بھیانک زندگی سے ملوّث ہو کر بھی وہ اختر کی ترغیب اور پیش کش کو فوراً قبول کرنے کو تیار نہ ہوا بلکہ کافی بے نیازی سے بولا۔

"ابھی نہیں اختر بھائی۔ کچھ دن بعد۔ پہلے میں کاروبار کی اہمیت سمجھ تو لوں۔ کاروبار پر حاوی تو ہو جاؤں۔" اور یہ اقبال کی محض مکارانہ شان ہی تھی۔ یہ اس کی اصلیت تھی نہ خواہش، بلکہ مرتے کو مارنے کا اختر کا سکھایا ہوا ہی ایک گُر فقط۔ اس داؤ پیچ کا ماحصل جس کے ذریعے جیتنے کی خواہش رکھنے والا ہمیشہ جیت پر قابض ہو جاتا ہے۔ جس طرح لاعلمی اور پیش کش کے پردے میں اختر اُسے اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا اُسی طرح اقبال کی بھی اب یہ شدید آرزو ہو چلی تھی کہ پہلے اختر کا غلام بن کر پھر اُسے خود اپنا غلام بنا لے۔ تاکہ اس کا ہر ٹیڑھا میڑھا راستہ بھی جلد سے جلد اور ممکنہ آسانی سے صاف، سیدھا اور ہموار ہو جائے۔ اپنی ملفوف شخصیت کی طرح وہ اختر کو اور ساری دنیا کو اپنی چالاکی کے لفافے میں لپیٹ کر اس طرح اپنی مٹھی میں لے لے کہ جب چاہے اس لفافے کے پُرزے پُرزے اڑا سکے۔ ورنہ اُسے ہمیشہ ایک ضروری تحریر کی طرح اپنی جیب میں رکھے اور یہی چالاکی اسے جلد سے جلد سیدھا اس کاؤنٹر تک لیجائے۔ جہاں عار اور انکار بھی اقرار بن جائیں اور زمانہ پرستی اور زمانہ سازی بھی خود اس کی کنیزیں اور وہ بس آقا ہی آقا۔ چنانچہ اختر اس کی اس ادائے بے نیازی سے بہت خوش ہوا اور اس بے نیازی کو اُس کی ذمہ داری کا احساس جان کر اسے بلا وجہ جلد جلد ترقیاں دینے لگا تاکہ اقبال بھی علانیہ جان جائے کہ وہ اس کا منظورِ نظر قرار پا چکا ہے اور اپنے کام سے زیادہ آمدنی محض اس کے کرم کی بنا پر رکھتا ہے۔ حالانکہ اختر دل سے اقبال کی ماں کے گزر جانے کا متمنی تھا تاکہ اقبال کے مختارِ کُل بنتے ہی اس کی تمام دولت سمیٹ لے مگر وہ ظاہر یوں کر رہا تھا جیسے اُس کا پیسہ ہی اقبال کا پیسہ ہے اور اس کی دولت بھی اقبال ہی کی دولت۔ یوں دونوں ایک دوسرے کو خاص انسان سمجھ کر اپنے اپنے انداز میں بڑے ہی خاص اور ڈرامائی طریقوں سے جیتنے کی دُھن میں لگے ہوئے تھے اور دونوں روحانی مسرت سے نابلد اور بیگانہ تھے۔ دونوں جنسی بھوک کے شکار۔ سوشل طور پر بالکل بیک ورڈ۔۔۔ انسانیت کی مہاب اور جذبات کے اعلیٰ پہلوؤں سے قطعی غیر واقف۔ مگر دونوں میں ایک مرکزِ اتصال پیدا ہو چکا تھا اور اسی جگہ پر مرکوز دونوں اپنی اپنی ہستیوں میں اس طرح اقامت گزیں جیسے بادشاہ شہنشاہ اپنی اپنی سلطنتوں اور دارالحکومتوں میں پوری شان۔ آن بان۔ تمکنت اور طمانیت سے متمکن ہوں۔ ٹھیک اُنہی دنوں میں، جدو جہد اور تگ و دو کے انہی دنوں میں "بار" میں آنے والی ایک لڑکی خود اتفاقاً اقبال پر آ پڑی۔ لڑکی ہرنی کی طرح چوکس اور غضب کی پھرتیلی تھی جس کے حسن میں وحشیانہ دل آویزی کسی دوامی موضوع کی طرح جلوہ گر تھی اور جو جسم کے معاملے میں اقبال سے بھی دس قدم آگے تھی۔ تب اقبال مصلحتاً بھی خود کو دبا اور روک نہ

سکا۔ وہ فوراً اس پر مفتوں ہو گیا۔ کسی تہنیتی پیغام کی طرح، جیسے اُس لڑکی کی اُمڈتی ہوئی جوانی نے اقبال کی ہوس کے کانوں میں کہا ـــ خوش ہو جاؤ اور مبارکباد وصول کرو۔ میں تمہارے لئے خود حاضر ہوں۔ چنانچہ بادلِ نخواستہ اختر کو رازدار بنا کر اقبال نے بلڈنگ کی دوسری طرف والے حصّے میں ایک کمرہ حاصل کیا اور لڑکی کو اپنانے میں مصروف ہو گیا۔ بہت دنوں بعد جب اقبال اس لڑکی سے متصل ہوا تو اپنے تمام حالیہ خیالات اور ہوشمندی کے باوجود وہ پھر اپنی کاروباری استقامت اور مزاجی استحکام کھونے لگا۔ اُس کا ذہن پھر بالکلیہ جسم کے حوالے ہو کر رہ گیا۔ وہ پھر اس حسین گورکھ دھندے میں پھنس جانا، پیوست ہو جانا پسند کرنے لگا۔ پھر خطرناک حد تک خالی الذہن ہونے لگا۔ اُس کاؤنٹر تک کو بھول بیٹھا جس تک اسے از بس پہنچنا اور جس پر بہرحال قابض ہونا تھا۔ جو شاید اس کا سب سے پہلا اور آخری نصب العین تھا جس کی خاطر اس نے بغیر کسی حجت شکایت یا تشکر رنجی کے جسمانی فاقے بھی قبول کئے تھے اور پھر بھی خوش رہا تھا۔ خوش رہنے کی پوری کوشش کی تھی مگر اب دفعتہً جیسے سب کچھ پھر اس کے ارادے اور استحکام کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھسل کر دُور جا پڑا جسے پھر گھوم کر دیکھنے کو بھی اب اقبال کا جی نہ چاہا۔ بلکہ اب تو نئے نئے جسموں کے ذائقے پھر اس کے تمام رگ ریشوں اور جسم کی تمام زبانوں پر مچلنے لگے۔ سرخوشی سے جھومنے اور اتصال کے لئے بے تاب ہونے لگے اور بے تابی کے انہی والہانہ دنوں میں پورے دوستانہ خلوص اور رازداری سے ایک شام اختر نے اسے بتایا "بس بس اب اپنا بھی انتظام ہو گیا۔ ایک بہت عمدہ، نہایت ہی خوبصورت، اپنی طرز کا خاص پرندہ بڑی خوش اسلوبی سے پکڑ کر پنجرے میں بند کر لیا گیا ہے، فقط اسے رام کرنے کی دیر ہے اور بس۔"

اقبال کھلکھلا کر ہنس پڑا اور دوگنی مسرت اور کیف سے بولا "فوراً اس کے پر کتر لو اختر بھائی تاکہ نہ پر مار سکے، نہ پھڑپھڑا سکے، نہ ہی اُڑ کر کہیں جا سکے اور بغیر دانہ پانی ڈالے اب آزاد نہ کرنا۔ آزاد پرندے بھی پنجرے میں بند جب دانہ پانی کھا پی لیتے ہیں تو یہ اس بات کا خاموش اشارہ ہوتا ہے کہ وہ قید کو مان چکے، ایک طرح سے اپنی قیدی حیثیت تسلیم کر چکے۔"

پتہ نہیں اختر کی پسند کیا تھی مگر اقبال کو تو اب وہی لڑکیاں زیادہ پسند آنے لگی تھیں جو پھسپھسی نہ ہوں۔ خود سپردگی کے عالم میں مبتلا نہ ہوں، بلکہ خوب سرکش اور شوریدہ سر ہوں۔ جو اپنی مدافعت میں پورا زور لگائیں۔ جو فوراً پسپائی کی حالت میں نہ پہنچ جائیں۔ پہلے پہل مقابل کی مدافعت اسے بدمزہ کر دیا کرتی تھی مگر متعدد جسموں سے گذر جانے کے بعد اب اُسے مقابل کی مدافعت ہی زیادہ پسند آنے لگی تھی، زیادہ باعث لطف محسوس ہونے لگی تھی لہٰذا جام پر جام چڑھاتے ہوئے وہ اس خیال سے لہرائے بغیر نہ رہ سکا کہ اب اختر بھی وہی لطف لُوٹنے والا ہے چنانچہ غیر شعوری طور پر اس نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا "زندہ باد اختر بھائی" اور پھر اپنے شغل میں مصروف ہو گیا۔

رات کا ابتدائی حصّہ گذر چکا تھا۔ "بار" بند ہو چکا تھا اور اقبال کی خوش قسمتی پر نازاں اختر بھی اب بے قراری سے اپنی خوش بختی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ دبیز خاموشی میں بند کمروں سے اُبھرتی ہوئی سرگوشیوں اور دبی دبی کانا پھوسی کی آوازیں، انکار یا اقرار، سسکیوں یا قہقہوں سے مل کر ہلکے سے تلاطم کا سماں پیش کر رہی تھیں اور اِرد گرد دُور دُور تک بس ایسا ہی اُجالا تھا جیسے خود انسان کی اونگھتی ہوئی آنکھ کا اُجالا ہوتا ہے۔ عمارت کے اُس حصّے میں گنے چنے کمرے تھے اور مخصوص گاہکوں کے لئے وقف تھے۔ یہاں نہ وسیع پیمانے پر کاروبار ہوتا تھا نہ کھلے بندوں ہوتا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی لڑکیوں کی بُہتات ہو جاتی تھی جو خود کو یوں چھپائے رکھتی تھیں جیسے اُجالے میں آتے ہوئے ڈرتی ہوں اور صرف اندھیرے کی خوگر ہوں۔ مگر جب وہ لوٹ جاتی تھیں تو ایسا سناٹا طاری ہو جاتا تھا جیسے یہاں کچھ ہو ہی نہ رہا ہو۔ بورڈنگ اور

لاجنگ کے تحت ویسے تو یہاں کے ظاہری قواعد اور احکامات
بہت سخت تھے مگر جاننے والے خوب جانتے تھے کہ لورڈنگ
اور لاجنگ کے علاوہ بھی یہاں بہت کچھ ہوتا ہے اور اختر
ان تمام باتوں کا کوئی لائسنس اپنے پاس نہیں رکھتا پھر بھی
ٹھاٹ کرتا ہے اور ٹھاٹ کراتا ہے مگر اس وقت اختر بھی
ان بے بس لوگوں کی طرح ٹہل رہا تھا جو اپنے بس میں کچھ نہ
رکھتے ہوں کیونکہ وہ بھی حالتِ انتظار میں تھا اور حالتِ
انتظار بڑی بے چارگی کی حالت ہوا کرتی ہے۔

دفعتہً اپنے شغل میں مشغول اقبال اپنے محفوظ کمرے
میں یکایک بے چین ہونے، کلبلانے، کسمسانے لگا۔ کیڑوں
کی طرح دفعتہً اس میں ایک عجیب ٹیڑھا پن پیدا ہو گیا جو
شوق کے تمام اشتعال اور آرزوؤں کی فراوانی کے باوجود
اسے چھبنے چھیدنے لگا۔ کوئی قوت اسے اپنے لطف
سے ہٹا کر کمرے سے باہر کھینچنے لگی اور اپنی اس نئی کیفیت
سے پریشان ہو کر، جھنجلا کر وہ کچھ وقت تازہ ہوا میں گزارنے
کے لئے کمرے سے باہر نکل بھی آیا۔ وہ اپنی چھان بین کے
لئے نہیں نکلا تھا مگر پھر بھی کمرے سے نکلنا اسے ضروری
معلوم ہوا تھا اور جب کھلی چھت پر پہنچنے کے لئے وہ درمیانی
راستہ طے کر رہا تھا تو راہداری میں اس نے دو سایوں کو اختر
کے خاص کمرے کی طرف سرکتے ہوئے دیکھا۔ ایک تیز قدمی
اور پھرتیلے پن سے بڑھ رہا تھا مگر دوسرا سستی اور کاہلی
سے جیسے خود چل نہ رہا ہو بلکہ کسی طرح چلایا جا رہا ہو۔ اقبال
مسکرایا اور اس نے چاہا کہ الٹے قدموں واپس ہو جائے۔
زبردستی ہی سہی خود کو وہاں سے ہٹا لیجائے مگر جیسے
فرش نے یکایک خود اسے جکڑ پکڑ لیا۔ اس کے قدم بلا ارادہ
ہی اپنی جگہ گڑ کر رہ گئے اور کشمکش و پیچ میں مبتلا اس کی
نظریں یونہی خواہ مخواہ بھٹکنے لگیں۔ حالانکہ نہ اقبال کو
بلا ضرورت کسی کے خدوخال دیکھنے کی عادت، نہ خواہش
نہ شوق بلکہ وہ ازل سے ہی چہروں سے کچھ لاپرواسا
رہا تھا مگر بھٹکتے بھٹکتے جب اس کی نظریں سست قدم
ہیولے پر اٹک گئیں تو معاً وہ کچھ لڑکھڑا سا گیا۔ پھر
اچانک اس کا دم گھٹنے لگا، نظریں سلگ گئیں اور تمام
وجود میں ایک زبردست دھماکہ محسوس ہوا۔ وہ پورے
یقین کے ساتھ وحشیانہ پن سے چلایا۔ "تم۔ تم۔ یہاں؟"
بتدریج آگے بڑھتے ہوئے دلال نے مڑ کر اسے دیکھا اور
گھبرانے لگا۔ اقبال نے اس کے ڈر کو بھانپ لیا اور اپنی
جگہ سے ایک جست بھری۔ رکے بغیر، جھجکے بغیر وہ آن کی آن
میں بھوکے بھیڑیئے کی طرح دلال پر جا پڑا اور پے بہ پے
کسی منصوبے کے بغیر اسے گھونسے رسید کرنے لگا۔
دلال ڈگمگا گیا اور اس کی گرفت میں اسیر نسائی بوجھ
اس سے چھوٹ کر الگ گر پڑا۔ اقبال نے فوراً آگے بڑھ کر
اسے سہارا مگر دلال کی چیخ اور کراہ شاید اختر کے
کمرے تک بھی پہنچ چکی تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے بھڑا ہوا دروازہ
بے آواز کھلا اور اختر باہر نمودار ہوا۔

"کیا بات ہے؟" وہ دلال کو بے بس اور اقبال کو
اپنے شکار پر غیر متوقع طور پر حاوی دیکھ کر بڑبڑایا۔

"حضور۔ حضور!!" دلال نے دہائی دی۔

اقبال نے چاہا صاف صاف کہہ دے تم اسے ہاتھ
نہیں لگا سکتے اختر۔ یہ میرا وقار ہے، خود میری عزت مگر
نہ جانے کیوں اس کی زبان اٹک گئی۔ گلا پھنس گیا۔ آواز
رندھ گیا اور وہ ہکلانے لگا۔

"اختر بھائی۔ اختر.... بھا.... ئی...."

"ختم کرو یہ تماشہ۔" اختر نے ناگواری سے کہا۔
"مجھے مردوں کی رحمدلی اور نسوانیت پسند نہیں اور تم اب
بچپن کا مظاہرہ کر رہے ہو اقبال۔ آخر اتنی بلانوشی کی کیا
ضرورت ہے کہ تم سے اپنا آپ بھی سنبھالا نہ جائے۔
اپنے کمرے میں واپس جاؤ اور خود پر قابو پاؤ۔ عقلمندوں
نے سچ کہا ہے کہ جو خود کو بھول لے وہ زندہ رہنے یاد رکھنے
کے قابل نہیں اور دھیان دے کر سن لو کہ میں یہاں کوئی
شور غل یا ہنگامہ نہیں چاہتا۔ نہ کوئی حد سے زیادہ

نشے میں مبتلا کوئی بچکانہ حرص و حماقت بس اب جاؤ اور جاکر ٹھنڈا پانی پیو۔ اپنی اس نئی حرکت اور جسارت کے بارے میں سوچو اور خود اپنے لئے سزا تجویز کرو۔ مجھے خلل برداشت کرنے کی عادت نہیں۔ لہٰذا یہ بے احتیاطی آئندہ پھر کبھی نہ ہو جاوَ ۔۔۔" اختر دہاڑا اور اب تک فضا میں جو سکون بھری لرزش قائم تھی وہ یکلخت متاثر ہوگئی۔ اذیت کی انتہاؤں پر پہنچکر اقبال کا تمام نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ تمام لطف غارت ہو چکا تھا۔ تمام جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور اب اُس میں کوئی ایسی چیز لہرا رہی تھی اُمڈ رہی تھی جو جسمانی جوش و خروش سے بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک تھی۔ اختر سے وہ ہمیشہ ڈرتا آیا تھا۔ ہمیشہ اختر کا لحاظ کرتا آیا تھا مگر اِس وقت ڈرنے ہچکچانے کی بجائے اُس کی کرخت، کوری اور خشمگیں نگاہوں کا مقابلہ کرتا ہوا خود بھی جواباً عزم اور استقلال سے دہاڑا۔ "ٹھہرو۔ رکو ورنہ میں آج ایک ایک کا خون پی جاؤں گا۔ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اختر ہکا بکا ہو کر اقبال کو نظر حیرت سے گھورنے لگا اور دلال پینترا بدل کر اقبال پر جھپٹنے کی کوشش کرنے لگا مگر اقبال ایک شیر کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا اور ہر ہر مقابلے کے لئے تیار نظر آنے لگا۔ دفعتہً اختر نے دلال کو تھم جانے کا اشارہ کیا اور قدرے نرمی قدرے صلاحیت سے اقبال سے بولا۔

"کبھی کبھی یہ سب کچھ گھناؤنا سہی مگر مرد و عورت کا رشتہ کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں۔ صرف مرد کا بنایا ہوا بھی نہیں اقبال۔ بلکہ یہ از خود بنا بنایا ہر انسان کو ملا ہے۔ پھر کسی کی معصومیت پر ترس کھا کر اس رشتے سے احتراز یا اجتناب کیا معنی۔ جس رشتے کے بغیر ساری دنیا شل اور معطل ہو سکتی ہے اُس کا بچاؤ کیسا۔ اور ایک اجنبی ہستی کے لئے ایک دوست اور محسن سے تمہاری یہ ٹکر کیسی ہے؟"

وہ آگے بڑھا کر اپنے شوق کو خود اقبال کے ہاتھوں سے لے لے مگر اقبال جیسے کچھ سُن نہیں پایا تھا۔ وہ بہرہ گونگا اور بے حس ہو گیا تھا۔ اُس پر اختر کا کوئی احتجاج کوئی فریاد کارگر نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اختر کے لئے اُس وقت مر چکا تھا۔ دو دو نشوں کی تھکن سے یکلخت آزاد ہو کر وقت کے اِس حصّے میں وہ فقط اپنے لئے زندہ تھا اور غیر متوقع طور پر اُمڈ آنے والی ابکائیوں کو روکتے ہوئے گرج رہا تھا "پیچھے جاؤ۔ سب واپس ہو جاؤ۔ کوئی ایک قدم آگے نہ بڑھے ورنہ۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔"

صورتِ حال کو سنبھلتا نہ دیکھ کر اختر نے اُلٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اقبال کے تمتماتے ہوئے چہرے پر رسید کیا۔ "ہوش میں آ کمبخت۔ نشّے میں تو سارا مزہ برباد کئے دے رہا ہے۔" مگر اناڑی اقبال بھی کسی ماہر جنگجو کی طرح اختر سے لپٹ گیا اور اسے رگیدتا ہوا دیوار تک لے جاکر دیوار سے اُسے رگڑنے اور پچھاڑنے لگا۔

"درندے، جانور، جانتا ہے یہ کون ہے۔ کون ہے؟"

"ہوگی تیری کوئی۔ لیکن مجھے اِس سے کیا۔ کیا تو نے کبھی لڑکیوں کو ٹھکانے لگاتے وقت یہ سوچا ہے کہ وہ بھی کسی کی کچھ نہ کچھ ضرور لگتی ہوں گی۔ ماں، بہن، بیوی، بیٹی۔"

"بکواس مت کر۔ تو اِسے چھو نہیں سکتا۔ کبھی نہیں چھو سکتا۔ میرے جیتے جی تو یہ ناپاکی نہیں کر سکتا۔ ہاں۔"

لیکن ٹھیک اُسی وقت جبکہ اختر اور اقبال کا آپس میں کوئی باہمی تصفیہ ہو جاتا، سہمے ہوئے دلال نے موقع پاکر دونوں کو گتھے ہوئے دیکھ کر اپنی لوہے کی مُوٹھ والی چھڑی سے اقبال کے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی اور اِس وار سے بے خبر ہٹا کٹا اقبال مچھلی کی طرح تڑپ کر، تیورا اور بل کھا کر فوراً زمیں بوس ہو گیا اور خون کے موٹے موٹے قطرے ایک تیز دھار کی صورت میں اُبل اُبل کر اس کے سر کے زخم سے اطراف کی زمین کو سرخ کرنے، بھگونے لگے۔ بڑی زور سے گھوم اور چکرا کر اقبال کا تڑپتا ہوا سر گیلی زمین پر بے حس ہو گیا۔ اور جب وہ جاگا تو سنسان سڑک پر بیچوں بیچ

پڑا ہوا تھا۔ نقاہت اُسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی اجازت بھی نہیں دے رہی تھی۔ ہڑبڑا کر اس نے سب کچھ یاد کیا اور اُٹھنے کی امکانی کوشش کر ڈالی مگر اُٹھ نہ سکا۔ پھر ہر ہر ساعت دھوئیں اور غبار کی طرح اقبال پر سے گذرنے اور سرکنے لگی۔ وہ تمام دلدوز، دل شکن اور رُوح فرسا نظارہ اقبال کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر اس کے تمام اعصاب پر اب تک سوار تھا اور اقبال کا کلیجہ جیسے نوچے کھرچے ڈال رہا تھا۔ زندگی بھر کا تمام کھایا پیا اُلٹنے کے لئے اس کے حلق تک آ چکا تھا۔ اس کا سر اب تک چکرا اور گھوم رہا تھا اور تیز اُبکائیاں رہ رہ کے اُسے دہلائے دے رہی تھیں۔ گلا بالکل سُوکھ چکا تھا۔ اور اس کی اپنی تمام ہوس اور شوق، تمام طلبِ جسم و طلبِ ناز نیں اُس کی نگاہوں میں بالکل بیتھر اچکی تھی۔ اب وہ کیا کرے۔ کیا۔ اُس نے سوچا اور ایک تیز چھیلن اُسے اپنے اندر ہر جگہ سرسراتی، سوراخ کرتی ملی جیسے کوئی اقبال کو سر تا قدم اُدھیڑنے لگا ہو۔ اقبال کا جی چاہا اپنے بال نوچ ڈالے، اپنے کپڑے تار تار کر دے، اپنے بدن کے چیتھڑے اڑا دے، اپنے وجود کی دھجی دھجی بکھیر دے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا ذلیل اور بھیانک واقعہ اس کی زندگی میں اچانک وقوع پذیر ہو جائے اور وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

اُس نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کے دیکھے۔ خود کو چُٹکی بھر کے دیکھا۔ کہیں یہ کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں؟ مگر یہ حقیقت تھی کہ جنسی بھوک کے دیوانوں، متوالوں بھوکے درندوں نے اس کی بہن ارجمند کو پھانس لیا تھا اور اب تک تو ارجمند کا جسم روندا بھی جا چکا ہو گا۔ اختر ارجمند کے جسم سے گذر بھی چکا ہو گا۔

"نہیں نہیں۔" وہ اضطراب سے چلایا مگر یہ ہولناک خیال یقین بن کر کسی ایسے زہر کی طرح اس کے جسم میں سرایت کرنے لگا جس کا اب کوئی تریاق نہیں تھا۔

بڑی دیر تک وہ اس شدید ناقابلِ برداشت، ناقابلِ اندمال ندامت سے لرزتا اور اپنا سر پٹختا رہا۔ مضطرب گرم گرم آنسو بہاتا رہا۔ بار بار اُٹھنے کی کوشش کرتا رہا مگر ہر بار پھر تیورا کر گر پڑا اور پھر آنسو بہانے لگا جیسے اُس کا تمام وجود آنسوؤں کی جھڑی بن کر رہ گیا ہو۔ اپنی بے رحمی سے اس کے تمام جسم کو پگھلا کر بہائے دے رہا ہو جیسے اس کا ذہن ایک پھوڑا بن گیا ہو، جو ناقابلِ علاج حد تک سڑ گل چکا ہو، متعفن اور بدبودار ہو چکا ہو جس کے تعفن سے عذاب سے وہ خود اب پناہ مانگ رہا ہو ڈر رہا ہو بھاگ رہا ہو بچ جانا چاہتا ہو مگر کیا دنیا میں اب کوئی ایسی جگہ بھی باقی تھی جو اسے پناہ دے سکتی اُسے صحت مند اور تندرست کر سکتی؟؟۔

زندگی کے پرخچے اُڑ چکے تھے اور اس کا جسم شل اور ماؤف تھا۔ وہ اب ایک بھی ایسے لمحے کا سامنا نہ کرنا چاہتا تھا جو خود اُس سے پوچھ بیٹھے۔ نسوانیت کی گلیوں کوچوں، شاہراہوں پر سیر کرنے کا جُنون اب کیا ہوا، کیا اسی انجام، اسی حشر کے لئے تم نے یہ شوق اختیار کیا تھا، یا یہ کوئی خدائی قہر تھا جو بالآخر تم پر نازل ہو کر رہا۔ کوئی ایسی تلوار جو ہمیشہ تمہارے ہاتھ میں رہی مگر صرف ایک بار خود تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر تمہارے ہی ٹکڑے ٹکڑے کر گئی ــــــ

زندگی کا تمام گھمنڈ۔ مردانگی کا تمام بھرم۔ ہر ہر جرأت و جسارت جیسے اقبال پر قہقہے لگانے لگی۔ تضحیک و حقارت سے کہنے لگی۔ بہت اچھا ہوا۔ یہی تمہاری سزا تھی۔ یہی تمہاری اخلاقی سنگدلی کا خمیازہ۔ تمہارے اخلاقی زوال کا انجام۔ اب پتہ چلا تمہیں کہ ہر عورت محض ایک کھلونا نہیں، بلکہ ایک مقام ہوتی ہے، خود اپنے تعین کا ایک مقام ہے۔؟

بس کرو بس۔ اقبال نے اس گونج سے گھبرا کر اپنے کان بند کر لیے۔ وہ اب ایک سانس بھی نہیں لینا چاہتا تھا مگر سانسیں جیسے انتقاماً اُس کا ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھیں۔

اُس کے زخم سے بہہ بہہ کر خون جم چکا تھا۔ سیاہ پڑ چکا تھا مگر زخم بے تحاشہ دکھ رہا تھا، چُبھ رہا تھا۔ بمشکل تمام اس نے خود کو ذرا سا اور آگے گھسیٹا

کہ صبحدم کوئی تیز رفتار موٹر اپنی انجانی تیزی میں اسے کچل کر آگے بڑھ جائے مگر شدید نقاہت میں اس ذرا سی حرکت و جنبش نے بھی اسے پھر بے ہوش و حواس اور نیم جان کر دیا۔

جب اس کی آنکھ دوبارہ کھلی تو وہ اسپتال میں تھا اور جب ٹھیک ہو کر اسپتال سے نکلا تو بھی اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس نے اسے موت سے بچایا اور زندگی کے بے رحم عذاب میں مبتلا رکھا ہے۔ نہ اس سے کچھ پوچھا گیا نہ کہا گیا بلکہ صرف اس کا علاج ہوتا رہا اور پھر وہ دواخانے سے خارج کر دیا گیا۔

ضرب، زخم، بھوک، اور نقاہت کی بے ہوشی اور بے جانی سے مدت ہوئی وہ بچ چکا تھا، سنبھل چکا تھا مگر اس کے ذہنی کرب اور ذہنی بے ہوشی کا علاج ابتک نہ ہو سکا تھا وہ مرجانا چاہتا تھا مگر ایکبار پھر خود میں زندگی کی طاقت پاکر وہ اب اختر سے اپنا حساب چکائے بغیر عادی طور پر مرجانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اُسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس کی ماں کا کیا انجام ہوا۔ اسکی بیوی اور بچے کا کیا بنا۔ ارجمند واپس جاسکی یا سدا کے لئے اپنی زندگی سے بچھڑ کر قید کر لی گئی۔ لیکن یہ سب جاننا اب اُس کے لئے اور بھی سوہانِ رُوح تھا۔ وہ خود ان میں سے کسی کی صورت دیکھنا چاہتا تھا، نہ کسی کو اپنی صورت دکھانا۔ اس کے رہے سہے جذبے بھی اب بالکلیہ ختم ہو چکے تھے۔ نسوانیت سے اُسے قلبی نفرت ہو چلی تھی۔ اسکے اندر کا مرد اس دھاکو صورتحال کے بعد سرد اور بے جان ہو چکا تھا۔ بالکل مرچکا تھا۔ وہ اپنے شہر سے کافی دُور مضافات میں چلا آیا تھا۔ اسمیں اب صرف وحشت کا بسیرا تھا۔ اُسے بس ایک ہی فکر اور ایک ہی دُھن کہ وہ بھی اختر سے ایسا ہی سلوک کرے۔ اختر کو دانستہ اُسی قسم کی تکلیف سے گذارے اور تب آرام سے مرجائے۔ لہذا اب وہ شاذونادر گفتگو کرتا تھا۔ کسی سے ملتا ملاتا نہیں تھا۔ اپنے ذہن کو خاموش رکھنے کے لئے سدا حرکت میں رہتا۔ سدا چلتا رہتا تھا اور اپنی تمام تر بے قراری کو چھپائے اپنے بارے میں لوگوں کی رائیں سُن سُن کر دل ہی دل میں ہنس لیا کرتا تھا کیونکہ سبھی جانتے اور مانتے تھے کہ وہ کوئی چور، اُچکا، ڈاکو یا اٹھائی گیرا نہیں۔ قاتل یا جاسوس بھی نہیں۔ اس کا لباس عام دیوانوں کی طرح چیتھڑے چیتھڑے بھی نہیں مگر یقیناً ذہن پھرا پھرا ضرور ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی لئے زندہ ہے، بالکل خواہ مخواہ ہی۔ اسی لئے کوئی اُسے مخبوط الحواس سمجھتا تھا، کوئی نامکمل، نا تمام ادھورا انسان اور کوئی محض بے ضرر دیوانہ مگر وہ خوب جانتا تھا کہ وہ ان سے کچھ بھی نہیں۔ وہ کسی سماجی سطح پر زندہ نہیں اور اصلی اقبال کو تو مرے ہوئے عرصہ بیت چکا مگر مسخ اور نقلی اقبال ہنوز باحیات تھا۔ جو نہ نیند بھر سوتا نہ پیٹ بھر کھاتا تھا جو زندگی کا کوئی بھی جواز اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ جو زندگی بھر ٹیڑھے میڑھے جذبوں سے گذرتے گذرتے اب خود ٹیڑھا ہو گیا تھا، جو ابتک سب کے ساتھ رہا بکھرا ہوا مگر جو اب بالکل اکیلا ہو کر اپنے آپ مضبوط ہو گیا تھا۔ جو تصور ہی تصور میں لاتعداد بار اختر کے مُنہ پر تھوک چکا تھا مگر حقیقت میں صرف ایکبار تھوکنے کی خواہش میں خود کو گھسیٹ رہا تھا جو ہر طرح ختم ہو چکا کھپ چکا تھا۔ مگر جسمیں ابتک ایک چوٹ کھایا ہوا ہوشیار دشمن باقی تھا جو گردش میں ضرور تھا مگر اپنے شکار کی گھات میں بھی۔ جو انتقام کی آگ سے جھلس جھلس کر اب صرف دشمن ہی دشمن باقی رہ گیا تھا اور اگرچہ زندگی بھر دھوکے کھاتا رہا تھا خود کو دھوکا دیتا رہا تھا مگر اب جو تمام دھوکوں سے بالکلیہ عُہدہ برآ ہو جانا چاہتا تھا۔ اپنے شکار کو گھیر کر سکھ کی ایک سانس کا متمنی تھا اور جو جانتا تھا کہ وہی اس کے وجود کی اصلی ساعت ہو گی اور اس دنیا میں اُس کا آخری دن ——!

آخری دن، جب ہر گناہ گار اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے اور ایک نئے سفر کا آغاز بھی جس میں کچھ اور ہو نہ ہو، سکون ضرور شامل رہتا ہے۔ سکون، جس کے لئے انسان سو دُکھ جھیلتا، جیتا اور مرتا ہے جو زندگی بھر ملے نہ ملے مگر آخری دن جس کا ملنا ضروری ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر

پیدائش :۔ ۸؍ اپریل ۱۹۱۷ء۔ مین پوری (یوپی)

ابتدائی تعلیم :۔ موروں۔ تحصیل پھلور۔ ضلع جالندھر۔ (آبائی گاؤں)

مادری زبان :۔ پنجابی۔

اکتسابی زبانیں :۔ اسکول میں فارسی اور کالج میں سنسکرت پڑھی۔

اعلیٰ تعلیم :۔ بی اے آنرز (ہسٹری) پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۱۹۴۰ء۔ فرسٹ پوزیشن۔ (اسکالرشپ)

ایم اے آنرز (ہسٹری) پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۱۹۴۱ء۔ فرسٹ پوزیشن

پی ایچ ڈی۔ پونہ یونیورسٹی۔ (گولڈ میڈلسٹ)

ملازمت :۔ پروفیسر ہسٹری ۱۹۴۲ء سے۔ دوآبہ کالج جالندھر۔ ڈی اے وی کالج لاہور۔ گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال۔ گورنمنٹ کالج مہو۔ مادھو کالج اجین۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز مدھیہ پردیش۔ چیف انسپکٹر آف اسکولز بھوپال۔ اسٹیٹ اسکاؤٹس کمشنر۔ ۱۹۶۰ء سے اب تک پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر ہوں۔

تحقیق :۔ "جرم و سزا عہدِ مغلیہ میں" فارسی مسودات پر مبنی۔

"عہدِ مغلیہ میں سماجی زندگی" خصوصاً ہندی مواد۔ اور اس وقت کے ہندی شعراء کے کلام پر مبنی۔

"کلاتھ انڈسٹری" محض انگریزی (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے مواد پر مبنی۔

دلچسپیاں :۔ پڑھنا، پڑھانا، سیر، ہسٹری اور ادب کے علاوہ فلسفہ کے مطالعہ سے گہری دلچسپی ہے۔

ادب :۔ پہلا اردو مضمون "نظامِ نو" ۱۹۴۶ء میں اور پہلا افسانہ "راہی" ۱۹۴۷ء میں ہمایوں لاہور میں شائع ہوا۔ "ہمایوں" میں دو درجن سے زائد افسانے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ شاعر، نگار، عالمگیر، خیابان، ادبی دنیا، ساقی، ماہِ نو، زمانہ، صبا۔ آج کل، شاخسار، پگڈنڈی، ادبِ لطیف، افکار، سیپ، جادہ، سب رس، نگارش، شیرازہ، آب و رنگ وغیرہ میں مضامین خصوصاً افسانے اور طنزیے شائع ہوئے ہیں۔

ہندی میں :۔ ۱۸؍ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۲ ناول، افسانوں کے آٹھ مجموعے۔ ڈراموں کے دو مجموعے۔ ایک رپورتاژ اور ایک طنزیہ ڈائری۔

اردو میں :۔ تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "آشا دیپ بجھے نا" (افسانوں کا مجموعہ) "چاند رانی" (ناول) "وہ لوٹے گی"۔ (ناول)

انگریزی :۔ "عہدِ مغلیہ میں جرم و سزا۔"

زیرِ طبع :۔ (انگریزی میں) عہدِ مغلیہ میں سماجی زندگی۔ عہدِ مغلیہ میں ٹیکسٹائل انڈسٹری۔

ہندی رسائل میں بے شمار افسانے، ناولٹ اور ڈرامے وغیرہ شائع ہوئے ہیں۔ انگریزی کے معیاری رسائل میں بھی ۲ درجن سے زائد تاریخی اور تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ایک افسانہ "انٹرویو" (مطبوعہ "شاعر" ۱۹۶۲ء میں) روسی زبان میں دنیا کے منتخب طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں چھپا۔ یہی افسانہ ۱۹۷۰ء میں بلغاریہ میں چھپنے والی کتاب "دنیا کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین" میں شائع ہوا۔ اردو اور ہندی کے علاوہ تمل، ملیالم، تیلگو اور کنڑ وغیرہ زبانوں میں بھی افسانوں کے تراجم شائع ہوئے۔

ادبی سرگرمیاں :۔ "حلقۂ دانشوران" بھوپال کا دس سال تک سکریٹری رہا۔ چنڈی گڑھ میں یونیورسٹی ساہتیہ سنگم کا کئی سال تک سکریٹری رہا۔

(خود نوشت)

اضطراب

ڈاکٹر ست پرکاش سنگھ

"سشما! یہاں آؤ۔ تمہارے نئے ماسٹر جی آئے ہیں۔"

"آئے ہوں گے نئے ماسٹر!" میں نے دل ہی دل میں جھنجھلا کر کہا۔

"دس منٹ میں آتی ہوں۔" بظاہر میں نے اپنے کمرے میں سے جواب دیا۔

"نئے ماسٹر!" میں نے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے حسن پر خود ہی فدا ہوتے ہوئے کہا۔ "ہر دو ماہ بعد ایک بڈھے کھوسٹ کو بلا لیتے ہیں۔ ماں کو تو جیسے ماسٹر اور نوکر رکھنے کا مالیخولیا ہو گیا ہے۔ تنخواہ دیتے نہیں اور اُسے بھاگ جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ ایک شخص کو ترغیب و تحریص دے کر گھر پر بلاؤ۔ اور پھر اُسے سبز جھنڈی دکھلا دو!"

میں جانتی تھی کہ اس میں دوش ماں کا نہیں، اُس کے پرس کا تھا۔ جو اکثر خالی رہتا۔ تنخواہ ملتے ہی بٹ جاتی تھی ہی کتنی! بارہ اشخاص والے گھرانے میں تو بڑی تنخواہ بھی ناکافی تھی۔ بابوجی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور جرمنی سے ڈگری لینے کے باوجود اچھی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ اُن دنوں "دو یا تین بچے۔ ہوتے ہیں بہت اچھے۔" جیسے نعروں نے ماحول کو خراب نہیں کیا تھا۔ پریوار کے بچوں کی تعداد سے والدین کے سوا حکام یا پڑوسیوں کو دُور کا واسطہ نہ تھا۔ اور والدین کثیر التعداد بچوں کو بھگوان کا عطیہ گردانتے۔ نو بھائی بہن، ماں باپ، نوکر۔۔ ایک نہیں دو وقت کا کھانا کھاتے۔ دو وقت ناشتہ لیتے۔۔ پھر کرایہ مکان، بچوں کی فیس اور کپڑوں ہی میں کئی روپے اُٹھ جاتے۔ ضروری اخراجات تک پورے نہ ہوتے۔ اس پر ماں فضول خرچی سے باز نہ آتی۔ اور اس کے لئے اُدھار مانگنے سے پرہیز نہ کرتی۔

ہر پریوار اور کنبہ اپنے لئے ایک خاص معیار قائم کر کے اُسی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ متوسط طبقہ کے لوگ اپنی آمدنی کی حدود کی پروا نہ کرتے ہوئے، پڑوسیوں کی نقل کرنا، اور جھوٹ کی شان قائم کرنا ہی کارِ نمایاں تصوّر کرتے ہیں۔ وہ بھی بھیڑ چال کے شکار ہو جاتے ہیں اور بھیڑوں کے گلّے کی طرح ہی زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر کسی سے دبنا اور ہر کسی کا مرہونِ منّت بنتا ہی شانِ امتیازی سمجھتے ہیں۔

ہمارا کنبہ متوسّط طبقے کی اِس فرسودہ روایت کا علمبردار تھا۔ زندگی کے متعلّق اُس کا اِس طرح کا رویّہ بن چکا تھا۔ پرانی ٹیک کو اپنانا، پٹے پٹائے رستے پر چلنا۔ ہمارا شیوہ بن گیا تھا۔ گو کہ فضول اخراجات سے بچنے کے متعلّق کوئی نہ سوچتا۔ اس ضروری امر کی طرف کوئی دھیان ہی نہ دیتا۔ دو نوکر مستقل طور پر رہتے۔ مستقل وہ نہیں، دو نوکروں کے رہنے کا عمل تھا۔ کسی بھی نوکر کے مستقل طور پر رکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کسی بھی ملازمہ کا کچھ ماہ سے زیادہ ٹکنا معجزہ تھا جو کبھی ظہور پذیر نہ ہوا۔ ایسا ہونے کا امکان ہی نہ ہوتا۔ ایک دو ماہ تو وہ لحاظ ہی میں کاٹ دیتا۔ تیسرے مہینے تنخواہ کیلئے تقاضا شروع کر دیتا۔ چوتھے مہینے بصد مشکل ایک چوتھائی پیسے، یعنی پہلے ماہ کی تنخواہ وصول کر سکتا۔ دو ماہ مزید گزرتے پیسے بڑھتے جاتے۔ ماں کی نیت بگڑ جاتی۔ بات نیت کی نہیں پیسوں کی تھی۔ اُس کے پاس ہوتے ہی کہاں تھے۔؟ بار بار مانگنے، تقاضا کرنے سے نوکر کی جھجک دُور ہو جاتی ہے۔ وہ شرم کا پردہ ہٹا کر اپنا مطالبہ پیش کرتا۔ اور ماں سے جھگڑنا شروع کر دیتا۔ وہ بھی ڈانٹنے لگتی۔ جھگڑا طول پکڑ جاتا۔ دوسرے بنگلوں میں رہنے والوں تک بات پھیل جاتی۔ لیکن اس کی پروا ہی کون کرتا؟۔ لمبے جھگڑے کے بعد نوکر ہار تسلیم کر کے بھاگ نکلتا۔ زیادہ سے زیادہ سڑک پر جا کر گالیاں بکنے لگتا۔ اِن گالیوں کا کون جواب دیتا۔ ہاں؟

یہی حال ٹیوٹرز کا تھا۔ اتنے بچوں کے لئے کم از کم ایک ماسٹر لازمی تصوّر کیا جاتا۔ گھر میں پیسہ نہ ہوتے ہوئے خستہ حالی کے باوجود ٹیوٹر کو رکھا جاتا۔ بچوں کو خود محنت کرنے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا موقع ہی نہ مِلتا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بھائی بہنوں میں سے صرف میں نے ایم اے پاس کیا۔ اور ایک بھائی بصد مشکل بی اے کر پایا۔ ٹیوٹر کا بھی نوکر جیسا حال ہوتا۔ دو مہینے وہ لحاظ ہی میں پیسے نہ مانگتا۔ تیسرے ماہ جب وہ دبی زبان سے پیسوں کی فریاد کرتا۔ کوئی اُس کی طرف توجہ ہی نہ دیتا اِس کے بعد تھوڑے بہت پیسے وصول کرنے میں کامیاب ہوتا۔ اور بعد ازاں بھاگ نِکلتا۔

"ششما! کیا کر رہی ہو۔؟ ماسٹر جی انتظار کر رہے ہیں۔"

"ڈیڈی پانچ منٹ میں آتی ہوں۔" میں نے آنکھوں میں کاجل لگاتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی انتظار کر رہے ہیں!۔ بعد ازاں تنخواہ کا اِنتظار کریں گے۔ بھولے پنچھی ایسے ہی پھنستے ہیں۔ اور بعد میں پچھتاتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ہر کوئی شخص، ہر کوئی کام کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ جیسے منوہر سٹینو گرافر بھی ماسٹر بن گیا تھا۔ یہ جناب بھی دوسرے منوہر ہی ثابت نہ ہوں۔ اُس کا نام دِل میں آتے ہی میری بھویں تن گئیں۔ کم بخت کہیں کا۔ گندہ، بدمعاش، پہلی ہی نگاہ میں میرے دِل میں اُس کے لئے جذبۂ حقارت پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا بدہیئت اور بدصُورت شخص بھی ہو سکتا ہے۔ ڈیڈی کے دفتر کی مکروہ شکل والا وہ سٹینو گرافر جب بچوں کو پڑھانے کے لئے گھر پر آتا، میں وہاں سے کھسک جاتی اور اُس کے ساتھ بات چیت کرنا بھی مناسب نہ سمجھتی۔ بچوں کو پڑھاتے وقت اُس کی گرسنہ آنکھیں کسی کی مُتلاشی ہوتیں۔ مجھے وہ اِس طرح گھُور کر دیکھتا۔ جیسے زندہ ہی کو نِگل جائے گا۔ اُس کی بھُوکی نگاہوں کو دیکھ کر میں کانپ اُٹھتی۔ میرے دِل کے کسی کونے سے ایک خیال انگڑائی لیتا۔ کہ یہ شخص اگر مجھے اپنی گرفت میں لے لے۔ ۔ ۔ ۔ اور ایسا ہی سوچتے ہی جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی۔ مجھے ڈیڈی پر خفگی آجاتی۔ اِسٹینو رکھا بھی تو اِتنا بھونڈا۔ کریہہ المنظر۔ جب میں ماں سے اُس کی بدصُورتی اور بد ہیئتی اور گستاخ نگاہی کی شکایت کرتی۔ وہ اُلٹا مجھے ڈانٹ پلاتی۔ ایسا کرنا ماں کے لئے فِطری امر تھا۔ اُسے اُس کی بدصورتی اور بدہیئتی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُسے تو اُس کی اِفادیت سے مطلب تھا۔ اپنی مقصد براری ہی اُس کا مطمحِ نظر تھا۔ ماں کے لئے تو وہ کار آمد شخص تھا۔ گھر کے جملہ فرائض انجام دیتا۔ بچوں کو پڑھانے کے علاوہ بازار سے سودا سُلف لاتا۔ آتے وقت بچوں کے لئے سستی میٹھی گولیاں خرید لاتا۔ ضرورت پڑنے پر ماں کو کچھ رُوپے اُدھار بھی دے دیتا!۔ جنہیں لوٹانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اپنی اِس دریا دلی سے اُس نے ماں کے دِل میں اِعتماد اور گھر کے اندر رسوخ پیدا کر لیا ہے۔ اور گھر کا رازدار بن گیا ہے۔

لیکن لاکھ کوشش کے باوجود، مجھ پر اُس کا جادو نہ چل سکا۔

ایک دِن گھر پر میں اکیلی تھی۔ بابو جی دفتر اور بچے اسکول میں تھے۔ ماں ڈسپنسری گئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی ایک جاسوسی ناول پڑھ رہی تھی اور اُس حصّے پہ پہنچی تھی۔ جہاں عاشق اپنی محبوبہ کے گھر روشن دان کے راستے داخل ہو کر اچانک اُس کے کمرے میں، اُس کے سامنے آن وارد ہوتا ہے۔ اِس عمر میں ایسے ناول خوب دِلچسپ لگتے ہیں۔ کاش میرے ساتھ بھی ایسا واقعہ پیش آتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تب ہی میں نے منوہر کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ اُس کی مکروہ شکل کو اپنے اِس قدر قریب دیکھ کر میں لرز اُٹھی۔ اِس سے پیشتر کہ وفورِ خوف سے میری چیخ نکل جاتی، اُس نے ایک دم آگے بڑھ کر مجھے اپنی باہنوں کی گرفت میں لے لیا۔ اور میرے مُنہ کو اپنے دائیں ہاتھ سے بند کر دیا۔ پھر دھمکی دیتے ہوئے بولا۔ اگر تم نے ذرا بھی آواز نکالی تو جاقو مار دوں گا۔ میں سہم گئی۔ ۔ ۔ ۔ اور کر بھی کیا کر سکتی تھی۔؟ اُس نے مجھے اپنی باہنوں میں بھینچ کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ میں اِس قدر خائف ہو گئی تھی کہ ذرا بھی اپنا دِفاع نہ کر سکی۔ اُس نے میری خاموشی سے پُورا فائدہ اُٹھایا۔

میری عمر اُس وقت محض بارہ برس کی تھی۔

اِس سانحے نے میری زندگی پر بہت اثر ڈالا۔ منوہر کی اِس حرکت نے میری کم سِنی کو جوانی میں بدل دیا اور وہ خود میرے لئے کشش کا باعث بن گیا۔ کوئی نہ کوئی موقعہ

ڈھونڈ کر مجھے تنہائی میں ملتا۔ لیکن وہ اچھا آدمی نہیں تھا۔
گھٹیا حرکتوں کا ارتکاب کرتا۔ ایک بار میں باتھ روم میں نہانے
کے لئے گھسی اور گنڈی لگانا بھول گئی۔ گھر پر اُس دن کوئی دوسرا
نہ تھا۔ منوہر اندر گھس آیا۔ اُس کی اِس حرکت پر مجھے بیحد غصّہ
آیا۔ اور کمال خفگی کی حالت میں مَیں نے پیتل کا لوٹا اُٹھا کر اُس
کے سر پہ دے مارا۔ چوٹ اتنی کراری تھی کہ وہ درد سے کراہنے
لگا۔ سر سے خون کی دھار فرش پر بہہ نکلی۔ میں گھبرا گئی۔ بصد
مشکل خون کو روک کے، اُس کے سر پر "پٹی" باندھی۔

اگلے دن میں نے ماں سے اُس کے خلاف شکایت کی۔
اور گھر کے اندر اُس کا داخلہ ایک دم ممنوع قرار دے دیا گیا۔
لیکن میرے لئے اور پیچیدہ معاملہ درپیش آگیا۔ اب وہ مجھے سکول
جاتے ہوئے راستے میں گھیر لیتا اور دھمکیاں دینے لگتا۔ میرے
لئے گھبرانا فطری تھا۔ اُس کے پاس میرے خطوط تھے۔ پہلے
سانحے کے بعد میرے دل میں سچ مچ اُس کے لئے پریم کا جذبہ اُبھر
آیا تھا۔ لاابالی پن میں اُسے کئی خطوط لکھ دیئے تھے۔ آج ان
باتوں کو سوچ کر میں سچ مچ حیران ہوتی ہوں۔ بھلا منوہر جیسے
بدصورت اور بدسیرت انسان کے محبت نامے کو میں نے قبول
ہی کیوں کیا؟ آج اِس حقیقت کا اپنی لڑکیوں سے اعتراف کرتے
ہوئے میرا سر شرم سے جھک جائے گا۔ دراصل جاسوسی ناولوں کے
لگاتار مطالعے نے میرے دل کے اندر عشق کا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔ اُس
جذبے کی تسکین کے لئے کوئی بھی پہلا شخص مجھے قابلِ قبول ہو
گیا۔ چاہے وہ بے ہنگم اور بے وضع قطع والا منوہر ہی کیوں نہ
ہو۔ وہ جسم کا "بھدا" اور دل کا کمینہ شخص تھا۔ دگرنہ بلیک میل
پر کیوں اُتر آتا؟ راستے میں مل کر مجھے ڈرانے دھمکانے لگا۔ کہ وہ
میرے خطوط باؤجی کو دکھلا دے گا۔ اُنہیں ہمارے رشتہ داروں
کے پاس بھیج کر مجھے خوار کرے گا۔ اُنہیں اخبارات میں شائع
کرائے گا۔ یہ کرے گا، وہ کرے گا۔

جب وہ مجھے تنگ کرنے سے باز نہ آیا تو مجھے سلیم کو
ہمراز بنانا پڑا۔ اُس نے اپنے بھائی اسلم سے اِس بات کا
تذکرہ کیا۔ اُس نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ اُسے پکڑ کر
اِس قدر پیٹا کہ اُس نے ایسی حرکت کو پھر کبھی نہ دُہرانے کا
وعدہ کیا۔ اور اِس وعدہ کو آج تک نبھایا۔

منوہر کی اِس بے حرمتی سے میرے دل کو قدرے تسکین
ہوئی۔ لیکن اُس کی جگہ کسی نے نہ لی۔ اُس نے میرے اندر عشق کے
جل خفیہ جذبے کو جگا دیا تھا۔ اب وہ پروان چڑھنے لگا تھا۔
مجھے ہر وقت کسی محبوب کی تلاش رہتی۔ میرے پیار کی پیاس تیز
ہو جاتی۔ اُس کی تشنگی دُور ہونے کا نام نہ لیتی۔

"سُشما! نہیں آئے گی۔؟"

"آئی۔ باوا۔ آئی۔"

ایک اور منوہر ہوگا۔ دل سے آواز آئی۔

میں نے ڈرائینگ رُوم میں قدم رکھا۔ تو آنکھوں پر
یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ ایک خوبرو اور خوشرو، خوش وضع، اور
خوش قطع، شکیل و جمیل نوجوان کو بیٹھے دیکھ کر میرا دل بلّیوں
اُچھلنے لگا۔ اٹھارہ، بیس کا سن، دل کش چہرہ اور دل آویز خطوط،
چھریرا جسم، لانبا قد، بڑی بڑی بادام جیسی آنکھیں۔ حُسن و جمال
کی اُس جیتی جاگتی تصویر کو دیکھ کر کون متحیّر نہ ہوتا؟۔ میں نے
اُسے جھک کر سلام کیا۔ میرے دل نے اُسے عقیدت کے پھولوں
کے ساتھ، خاموش زبانی سے محبت کا پیغام بھی دیا۔

اُس رات مجھے وفورِ مسرّت سے نیند نہیں آئی۔ اُس
حسین جوان چہرے کے دل فریب اور جاذب نقوش میری
آنکھوں کے سامنے رقصاں رہے۔ چلو اب جیون ساتھی
مل گیا۔ محبوب خود ہی گھر پر آ گیا۔ دل کے اندر جو زبردست
خلا پیدا ہو گیا تھا۔ خود بخود بھر جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی دل
کے تہہ خانے سے شکوک کا دھواں اُٹھ کر میرے حسین خوابوں
کو دھندلانے اور تیرہ و تار کرنے لگا۔ اگر اُس نے میری پیشکش کو
ٹھکرا دیا۔؟ اگر اُس نے میرے محبت نامے کو مسترد کر دیا۔؟ ایسا
بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عشق یک طرفہ ہو۔ اُس کا دل محبت کے
پاک جذبے سے عاری ہو۔ عام اُستادوں کی طرح وہ بھی بے
حس اور خشک ہو۔ ایک دم بور ثابت ہو۔ اگر وہ میری آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر میرے دل کی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکے۔
اور وہاں جلی حروف میں لکھے ہوئے "محبت" کے الفاظ کو پڑھنے
اور سمجھنے میں ناکام ثابت ہو، تب...... نہ جانے

اِس طرح کے کتنے وسوسے مجھے رات بھر پریشان کرتے رہے۔

ہو سکتا ہے کہ وہ میری بے قراری سے بیزار ہو کر کچھ دن کے بعد ٹیوشن ہی بند کر دے۔ پھر ٹیوشن کے پیسے بھی کہاں سے ملیں گے۔ اُلٹے اُسے ہی اُدھار دینا ہوگا۔ جو کبھی واپس نہیں ہوگا۔ تنگ آ کر وہ خود ہی چلا جائے گا۔ لیکن اُس کے چہرے بشرے سے اُس کی پوشاک سے اِس کی وضع قطع سے اِس بات کا گمان تک نہیں ہو سکتا کہ وہ پیسے کی غرض سے ٹیوشن کرنے آیا ہے۔ وہ اچھے خاندان سے متعلق نظر آ رہا تھا۔ اِس طرح کی ایک معمولی ٹیوشن قبول کرنے میں ضرور کوئی راز تھا۔ وہ غریب بالکل نہیں معلوم دے رہا تھا۔

اِس راز پر سے جلد ہی پردہ اُٹھ گیا۔

وہ سچ مچ ایک اونچے گھرانے سے سمبندھ رکھتا تھا۔ اُس کا باپ ایک ممتاز عہدے پر فائض تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ اختلاف رائے کے سبب گھر سے چلا آیا تھا۔ بلند آدرش والا لڑکا انگریز کی ملازمت کرنے والے باپ سے ناراض ہو کر آ گیا تھا۔ اور اُس سے مدد لئے بغیر تعلیم جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اُن دنوں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ اور ملک کے بیشتر نوجوان، گاندھی جی کے اُپدیش اور اعلیٰ جذبات سے متاثر ہو کر، اپنے ڈھنگ سے دیش سیوا کرتے تھے۔ لوگوں کے اندر آزادی کا جذبہ پیدا کرتے گاؤں میں جا کر کام کرتے کاشتکاروں، اور مزدوروں کو آزادی کا پیغام دیتے۔ سُدیش اُن نوجوانوں میں سے ایک تھا۔ لیکن اُس کا آدرش گھر کے حالات سے ٹکر کھانے لگا۔ سرکار کی کھلم کھلا مخالفت اور مزاحمت سے حکام کا نزلہ باپ پر گرنے لگا۔ ماں نے، باپ نے، رشتہ داروں، اور سبھی نے اُسے سمجھایا، لیکن وہ باز نہیں آیا۔ اُس پر ان لیکچروں اور اُپدیشوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ لیکن والدین سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے اُن سے قطع تعلق کرنا ہی مناسب سمجھا۔ نجی اخراجات پورے کرنے کیلئے سیلف سپورٹنگ، خود پرور اور خود بردار بننے کے لئے ٹیوشن کرنا لازم ہو گیا۔

شاید گھر والوں نے اُسے سنجیدگی سے نہ لے کر وقت کو ٹالنے کے لئے اُس کے ساتھ اس طرح کا سمجھوتہ کیا تھا۔ لیکن سُدیش اپنے قول پر برقرار تھا۔ حسین اور تندرست ہونے کے ساتھ، وہ راست گو، ایماندار، بے باک اور نڈر تھا۔ وہ بلا کا ذہین اور مُدبّر تھا۔ اُس کا دل شیشے کی طرح صاف، شفاف تھا۔ اُس کا چہرہ اُس کے دل کے آئینہ دار تھا۔ وہ ہر وقت خوش، ہشاش بشاش نظر آتا۔ صاف ستھری کھادی کی پوشاک پہننے سے اُس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

سُدیش عام نوجوانوں سے مختلف، اپنی وضع کا نوجوان تھا جو اعلیٰ تعلیم، بلند آدرش اور متوازن زندگی میں یقین رکھتا تھا۔ گو اُس کا تخیل بلند فضاؤں میں پرواز کرتا۔ وہ خود زمین پر رہنا پسند کرتا تھا۔ آدرش وادی ہونے کے ساتھ وہ حقیقت پسند تھا۔ شاعرانہ طبیعت رکھتے ہوئے وہ دُنیادار تھا۔ ذہین ہونے کے ساتھ وہ فراخ دل بھی تھا۔ اُس کے اِن اوصاف حمیدہ نے ہم سبھی کو اُس کا گرویدہ بنا دیا۔ ممی اُسے بہت پسند کرتیں۔ ڈیڈی تو اُسے اپنے بیٹوں پر ترجیح دینے لگے اور اُس سے بے پناہ عقیدت رکھتے۔

اُس کے آنے کے بعد میری زندگی میں زبردست انقلاب رُونما ہو گیا۔ سُدیش میرے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی ہو گیا۔ صبح شام، دن رات میرے خیالات پر چھا گیا۔ میرے سوچ بچار پر پوری طرح قابض ہو گیا۔ اسکول جاتے ہوئے راہ میں اُس کا خیال مجھے ستاتا اور کبھی کبھی وہ مجھے راستے میں مل جاتا۔ اور مجھے اسکول تک چھوڑنے جاتا۔ اُس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے فخر کا احساس ہوتا۔ راہ چلتے لوگوں کو مخاطب کر کے جیسے میرا دل کہتا "اب تو مانتے ہو۔؟ میری قسمت کو تسلیم کرتے ہو۔؟ اِس آدرش جوڑی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہو۔؟"

اور مجھے یقین واثق ہے کہ راہ چلنے والے میرے دل کی آواز کو ضرور سُنتے۔ اُس سے متاثر ہو کر وہ بھرپور نگاہ سے ہماری طرف تکتے۔ اور میری بات سے اتفاق رائے رکھتے ہوئے، اپنی گردنوں کو اثبات میں ہلاتے اور شاید اِس جوڑی کو سراہتے اور اسے بنانے والے اُس کارساز مطلق کو خراج تحسین ادا کرتے۔

ایسا سوچ کر میرے دل کے اندر برتری کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ ہم دونوں کے لانبے قد چھریرے جسم

اور خوبصورت چہرے تھے۔ ہمارے سارے خاندان میں ایسی آدرش جوڑی نایاب تھی۔ دونوں پتی پتنی ایک دوسرے سے ہر بات میں متضاد تھے۔ جسم کی بناوٹ میں۔ دماغی نشو ونما میں، عادات میں۔ میری بڑی چچازاد بہن بھی حسین تھی۔ اُس کا پتی موٹا، ناٹا اور کالا تھا۔ اُس کی توند اُس کی بدصورتی میں بے انتہا اضافہ کرتی۔ وہ جتنی باادب اور باشعور تھی' وہ اُس کا تضاد تھا۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر وہ اس قدر کھاتا کہ اُسے ہضم نہ کر پاتا اور بعد ازاں سبھی کے سامنے 'آئی ایم سوری' کہہ کر عجیب عجیب آوازیں نکالتا۔ میری بُوا بھینس کی طرح سے موٹی تھی۔ اور پھوپھا بانس کی طرح پتلے تھے۔ ایک دم سوکھے کے مارے ہوئے۔ چچی پانچ فٹ سے کم اور چچا جان چھ فٹ سے اُوپر تھے۔ سب کا یہی حال۔ ایک دراز قد، دوسرا پستہ قامت۔ خاوند کے مُنہ میں زبان نہیں، بیوی کی زبان قینچی سے بھی زیادہ تیز و طرار۔ ایک کالج میں پروفیسر، دوسری ہندی کا ایک اچھر بھی نہ واچ سکے۔ ایک بے حد فیاض۔ دوسری کنجوس کی چلتی پھرتی تصویر۔ یہی حال ممی ڈیڈی کا تھا۔ ہر جگہ تضاد نظر آتا تھا۔

لیکن میری اور سندیش کی دوسری بات تھی۔ ہماری ایک دم آدرش جوڑی تھی۔

ایسے خیالات میری پریشانی کا باعث بنتے۔ میرے دلی اضطراب میں اضافہ کرتے۔ دن کو مجھے سکون سے محروم رکھتے۔ اور رات کو میری نیند حرام کرتے۔ میں دن اور رات کی بیداری اور نیم خوابی میں سپنے دیکھتی۔ اُن سپنوں میں سندیش ہوتا یا اُس کی میٹھی میٹھی باتیں ہوتیں۔ وہ میرے دل کی خالی دُنیا میں آکر بس جاتا۔ ایک جادوگر کی طرح سحر جگاتا اور چلنے کا نام نہ لیتا۔

آج تیس سال کے بعد جب میں حالات کا جائزہ لیتی ہوں اپنی اُس کیفیت کا خیال کر کے حیران ہو اُٹھتی ہوں۔ آج میرے دل کے کسی کونے میں بھی عشق کا بھوت چھپ کر نہیں بیٹھا ہے' میرا دل عشق کے جذبے سے ایک دم عاری ہے۔ زمانے کی متواتر ٹھوکروں اور زندگی کے تلخ تجربات نے اُسے یکلم بھگا دیا ہے۔ اور مجھے زندگی کے ٹھوس حقائق سے آگاہ کر دیا ہے۔ لیکن تب اس دل نے عشق کی عظمت کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔

یہ جذبہ انسان کے اندر ایک زبردست تبدّل، ایک ناقابلِ بیان تغیّر پیدا کر دیتا ہے۔ اُس کی ہیئت، زندگی کی نوعیّت کو زندگی کے متعلق فرد کے نظریئے کو بدل دیتا ہے۔ اُسے ایک نیا انسان بنا دیتا ہے۔ زمین پر چلتے پھرتے مختلف انسانوں میں نمایاں فرق، اُن کی ناک کی بناوٹ اور ان کے جسم کی ساخت میں نہیں۔ یہ سارا فرق اُن کے دماغ میں رقصاں خیالات اور دل میں موجزن جذبات میں ہے۔ یہی ایک بشر کو دوسرے سے مختلف بناتے ہیں۔ اور ان سب میں قوی محبّت کا جذبہ ہے۔ وہ انسان کے جملہ احساسات کو ایک خاص رُخ میں بدل دیتا ہے۔ اُس کے تاثرات کے دھارے کو موڑ کر اُس کے نظریئے میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ دھرم کی ٹیکنکوں میں 'دِوّیہ درشٹی' یعنی رُوحانی آنکھ پیدا کرنے کے لئے خاص زور دیا جاتا ہے۔ دھرم کی ساری شِکشا اس کی جملہ تعلیم کو اس بات پر مرکوز کیا جاتا ہے۔ تیسری آنکھ کو ڈیولپ کرنے سے اس رُوحانی نگاہ کے تدریجی اِنکشاف سے، زندگی کے نظریئے میں اِس قدر زبردست انقلاب رُونما ہو جاتا ہے اور عشق کا بلند جذبہ انسان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر کے انہیں تازہ زندگی عطا کرتا ہے۔ زندگی کے رموز سے رُوشناس کراتا ہے۔

اور ایسی جذبے کے تحت میرے اندر زبردست ہیجان بپا ہو گیا تھا۔ میرے خیالات اور جذبات میں انقلاب آچکا تھا۔ میرے اپنے رویّے میں، دوسروں کے رویّوں کے متعلق ردِ عمل میں نمایاں تبدّل رُونما ہو چکا تھا۔

سندیش سے پہلی ملاقات کے بعد جب میں بستر سے اُٹھی تو جیسے میری آنکھوں کی بینائی تیز ہو گئی۔ ہر چیز کی جیسے نوعیّت بدل گئی۔ آنکھیں کھولتے ہی جیسے میں نے محسوس کیا کہ کمرے کی ہر چیز میں رنگینی آگئی ہے۔ موسم بہار نہ ہوتے ہوئے بھی بہار کمرے کے اندر چلی آئی ہے۔ باہر لان میں آئی تو ساری کائنات ہی نئی معلوم دینے لگی۔ جیسے ابھی ابھی

چشمۂ مہتاب سے نہا کر نکلی ہو۔ پودوں میں نئی شگفتگی، ان کی رنگت میں خوبصورتی اور ان کی خوشبو میں تازگی کا احساس ہوا۔ طیور کے گانوں نے میرے دلی نغموں کے تار کو چھیڑ دیا۔ اشجار کی شاخیں مستی سے جھومنے لگیں، اُن کی ٹہنیوں پر لگے پتّے وجد میں ناچنے لگے۔ ساری قدرت ہی محوِ رقص تھی۔

اُس دن ماں میری اس تبدیلی کو دیکھ کر میرے چہرے پر نئے جذبات کو اُبھرے دیکھ کر حیران ہو اُٹھی۔ اُس دن سے جیسے میرے دل سے سدا کے لئے غصّے، خوف اور حسد کے جذبات رخصت ہو گئے۔ بھائی بہنوں سے باہمی رقابت کے خیال دُم دبا کر بھاگ نکلے۔ مسرّت کے جذبات میرے چہرے پر عیاں تھے، میرے پاؤں خود بخود ناچنے کیلئے بے قرار تھے۔ گھر والے اِس تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ لیکن میرے دلی رموز سے ایک دم بے خبر تھے۔

سُدیش کو اُس دِن شام کے پانچ بجے آنا تھا۔ اور میں نے صبح پانچ بجے ہی سے تیار ہونا شروع کر دیا تھا۔ اشنان کے وقت میں نے کئی بار جسم کو صابن سے دھویا۔ بہترین کپڑے زیب تن کئے۔ چہرے کو کریم، پاؤڈر سے چمکایا۔ آنکھوں کو کاجل سے سجایا۔ اسکول سے دوپہر کو گھر آ کر میں واپس نہیں گئی۔ تین بجے کے بعد باہر چھجے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر کمرے میں لوٹ آئی۔ کچھ دیر بعد پھر وہاں چلی گئی۔ پڑوس میں بسنے والی میری سہیلی کانتا سے نہ رہا گیا۔ بولی، "آج کس کا انتظار ہے؟"

"کسی کا بھی کا نہیں۔" میں نے جھٹ کہا۔ انتظار کس کا ہو سکتا ہے۔؟ اور پھر مجھے؟"

وہ اِس جواب سے بظاہر مطمئن ہو گئی۔ لیکن اُسے تسلّی نہ ہوئی۔ ایک لڑکی ہی دوسری لڑکی کے دلی جذبات کو بھانپ سکتی ہے۔

پورے پانچ بجے سُدیش آتا ہوا دکھائی دیا۔ اُسے دور سے آتے دیکھ کر میں بھاگ کر کمرے کے اندر آ گئی اور ہاتھ میں کتاب لے کر ڈرامائی انداز سے بیٹھ گئی، تاکہ اُس پر میری ذہانت کی دھاک بیٹھ جائے۔ کتابوں میں میری دلچسپی کا اثر پڑ جائے۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ٹن۔ ن، ن، ن، ن۔

اور میرے دل کے ساز پر ہزاروں گھنٹیاں بج اُٹھیں۔

دل چھاتی کی دیوار سے اِس شدّت کے ساتھ ٹکرا رہا تھا کہ اُس کی دھڑکن کی آواز میرے کانوں میں سُنائی دے رہی تھی۔

نہ جانے آج کیا ہو۔ اُس اِمتحان میں کامیابی پر ساری زندگی کا دار و مدار تھا۔ جیسے اِس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے میں نے ساری بازی لگا دی تھی۔ گھنٹی کی آواز پھر سُنائی دی۔ میں سیٹ پر سے اُٹھی۔ پھر بیٹھ گئی۔ میرے لئے باہر جانا اور دروازہ کھولنا مُناسب نہ تھا۔ وہاں جاتے جاتے دِل کی دھڑکن تیز ہو جانے یا میرے گر پڑنے کا خدشہ تھا۔ جذبات کی شدّت پر قابو پانا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن دوسرا کوئی گھنٹی کی آواز سُنتا ہی نہ تھا۔ ماں تھی۔ بچّے تھے، دو نوکر تھے۔ اُن سب کو کیا ہو گیا تھا۔؟ کیا ماں نے نوکروں کو بازار بھیج دیا تھا؟ کیا اُنہیں برطرف کر دیا تھا؟ لیکن صبح تو موجود تھے۔ پھر دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟۔ گھنٹی کی آواز کو کیوں نہیں سُنتے؟ جان بوجھ کر بہرے کیوں بنے ہیں۔؟۔ اِس آواز سے تو قیامت کی نیند سونے والے بیدار ہو جائیں۔ لیکن میں خود ہی دروازہ کیوں نہ کھول دوں؟ شاید مُناسب نہ ہو.... مجھ سے کُھلے گا بھی نہیں۔ ہاتھوں میں رعشہ اور دِل ہاتھوں میں آ جائے گا۔

جُوں ہی سُدیش نے کمرے میں قدم رکھا، میرا جسم کانپنے لگا۔ بصد مشکل اپنے آپ پر قابو پا کر میں نے اُسے نمسکار کیا۔

اُس دِن سُدیش نے مجھے کچھ پڑھایا۔ شاید کچھ نہیں پڑھایا۔ ایسا لگتا ہے کہ اُس نے ضرور کچھ پڑھایا۔ اور میں نے کچھ نہیں سُنا۔ عجیب بات ہے کہ کان ہوتے ہوئے بھی ہم قریب بیٹھے اِنسان کی باتیں نہیں سُن پاتے۔ بات تو من کی ہے۔ جب تک وہ کانوں کا ساتھ نہیں دیتا، وہ بیکار ہیں۔ اُس کی مدد کے بنا بینائی رکھتے ہوئے بھی آنکھیں دیکھنے سے عاجز ہیں۔ میرے من نے میرے کانوں کا ساتھ دینے سے اور نتیجے کے طور پر سُدیش کی باتیں سُننے سے اِنکار کر دیا۔ اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور میری آنکھیں اُس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں، جب ایک سوال کی وضاحت کرنے کے بعد یہ دیکھنے کیلئے کہ میرے پلّے کچھ پڑا یا نہیں، وہ اُوپر نگاہ اُٹھا کر مجھ سے

پُوچھتا۔ "سمجھ میں آیا۔؟" تو میرا چہرہ سُرخی مائل ہو جاتا۔ کنپٹیاں بھی سُرخ ہو جاتیں۔ آنکھیں پلکوں کے بوجھ سے جھک جاتیں۔ مُنہ سے ایک لفظ نکالے بغیر، محض سر ہلا کر اثبات میں جواب دیتی۔ وہ کچھ نہ سمجھ پاتا بے چارہ۔!

لیکن میں نے بھی پاگل بن کر اُس پر اپنے دلی راز کو افشا نہیں کیا۔ کون عورت شروع میں ایسا کرتی ہے؟۔ ہاں! میرے من پر اب اُس کا راج تھا۔ میرے من مندر میں دیوتا کی جگہ وہی براجمان تھا۔ میرے وچاروں اور خیالوں پر وہی مُسلّط تھا۔

میرا دھیان اُسی میں رہتا۔ دن بھر اُس کی آمد کے اِنتظار میں گزر جاتا۔ شام کے وقت پاؤں خود بخود دریچے کی طرف اُٹھ جاتے، آنکھیں دُور سے اُس کی راہ تکتیں۔ نگاہیں اُس کے راستے میں بچھ جاتیں۔ دل ہزاروں دھڑکنیں لئے اُسے عقیدت کے پھول پیش کرتا۔

کچھ دنوں کے بعد دل کی دھڑکنیں کم ہو گئیں۔ اب میں خود بخود اُس کی عادات سے مانوس ہونے لگی تھی۔

وہ بے حد سادہ لوح، بے تکلّف اور آزاد مَنش تھا۔ سادہ لباس پہنتا۔ اُونچی قسم کی باتیں کرتا۔ اپنے کورس کے علاوہ جنرل کتابیں پڑھنے کا بے حد شوقین تھا۔ اُن دنوں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور امریکی زبان کے مقبول ادیبوں کو ضرور پڑھتا۔ اور اُن کی زندگی سے بہت متاثر تھا۔ اکثر اُن کی تخلیقات کا تذکرہ کرتا۔ رومن رولاں کے ادبی شاہ کار کو اُن دنوں پڑھ رہا تھا۔ اور اُس میں سے اقتباسات پڑھ کر مجھے سُناتا۔ دسویں جماعت کی طالبہ کو اتنے بلند مرتبت ادیب کی تخلیق سے کیا سمجھ آتا۔ حالاں کہ وہ اُسے ذہن نشین کرنے کے موثر طریقے برتتا۔ دراصل میرا من ہکسلے اور رومن رولاں، گورکی اور ٹامس مان کی تخلیقات میں نہیں، خود سُدکش میں اُلجھا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت اُسی کے نام کی مالا جپتا۔

لیکن یہ سارا معاملہ ایک طرفہ تھا۔ میرا سارا عشق، سُدکش کے اندر سوئے ہوئے پریم کے دیوتا کو نہ جگا سکا۔ وہ تو کسی دوسری مٹی کا بنا تھا۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ اُس کے پاس دل نہیں تھا۔ اُس کی دھڑکنیں تو میں روزانہ سُنتی، لیکن وہ دھڑکنیں میرے لئے نہیں، عشق کے مرض میں مُبتلا ایک مریضہ کے لئے نہیں، پُوری انسانیت کے لئے تھیں۔ انسانیت اس کے لئے مذہبوں اور ملکوں میں منقسم نہیں تھی۔ وہ سبھی دھرموں میں عقیدت رکھتا، تمام مذاہب کے بانیوں کی سوانح عمریاں پڑھتا۔ اُن کے اُپدیشوں میں سے انسانیت کے لئے کارآمد، مُشترکہ باتوں کو اخذ کرتا اور سبھی کو اُن پر عمل کرنے کی تلقین کرتا۔ ٹالسٹائی، ترگنیف، چیخوف، گورکی، ہکسلے، شا، اور ویلز، رام، کرشن، وویکانند کی تصانیف میں دلچسپی لینے والا شخص بھلا ایک لڑکی کے عشق کے جال میں کیسے پھنس سکتا ہے۔ ایک حسّاس دل کا مالک ہوتے ہوئے بھی وہ ایک عورت کی طرف کیوں توجہ دیتا؟ کسی کے حُسن کا جادو اُس پر چلنا محال تھا۔

کالج کے عام طلبہ سے وہ کس قدر مختلف تھا۔ راہ چلتی لڑکیوں پر آوازے کسنے والے، اُنہیں دیکھ کر بھونڈے مذاق کرنے والے، اور اُوا، توا بکنے والے نوجوان طلبہ سے وہ ایک دم علیٰحدہ تھا۔ اُن سب سے بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ وہ بلند کردار رکھنے اور سادہ زندگی بسر کرنے میں یقین رکھتا تھا۔ کپڑے خود ہی دھوتا، ایک سستے ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ کبھی کبھی خود ہی بناتا۔ ڈھونگ سے بچتا۔ جھوٹ کے نزدیک نہ جاتا۔ اُس کا قول تھا کہ انسان کی ذہنی اور رُوحانی نشوونما میں عظیم ترین سنگِ راہ دروغ گوئی کی خُوئے بد ہے۔ وہ ایک راست گو، صادق القول، نڈر اور ایماندار انسان کی زندگی بسر کرتا۔

اُس کا حسّاس دل عوام کے درد سے معمور تھا۔ اِس کارن تعطیلات کے دوران جب عام طلبہ اپنے والدین یا رشتہ داروں کے پاس یا پہاڑی مقامات پر موج بہار اُڑانے چلے جاتے۔ وہ سماج سیوا کے جذبے سے متاثر ہو کر، کسی گاؤں میں جا کر ڈیرہ لگا لیتا۔ گرام سُدھار کے لئے عموماً وہ شہر اور سڑک سے کوسوں دُور تہذیب کی روشنی سے ناآشنا، دُور افتادہ اور پسماندہ گاؤں کا انتخاب کرتا۔ جہاں نہایت ہی غربت زدہ اور مفلوک الحال لوگ بستے تھے۔ اور سو فیصدی مُسلمان آبادی والے غریب کسانوں اور جولاہوں کے ایک گاؤں

کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا۔ سخت گرمی کے دو مہینے وہیں کاٹتا۔ جھلسا دینے والی لُو میں، کھیتوں میں جاکر اُن کی مدد کرتا۔ اُن کے کام میں ہاتھ بٹاتا۔ شام کو اُن کے ساتھ کبڈّی یا فٹ بال کھیلتا۔ رات کو چراغ کی روشنی میں انہیں درس و تدریس دیتا۔ گاؤں والوں کو یہ جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اُس کے کسی کام میں مطلب پرستی اور خود غرضی کا جذبہ کار فرما نہیں تھا۔ غرض بینی کو وہ نزدیک نہیں آنے دیتا تھا۔ سیوا بھاؤ، خدمتِ خلق کا بلند جذبہ، اُس کی بے نفسی اور بے غرضی کا بہترین نمونہ تھا۔ وہ اُن مہا پرشوں میں سے تھا جو نشکام سیوا کی بھاوُنا کے زیرِ اثر، بے لوث خدمت کے جذبے سے متحرک ہو کر دیش اور مانوتا، ملک اور انسانیت، کے لئے پھانسی کے تختے پر چڑھ کر ہنسی خوشی موت کا جام پی لیتے ہیں۔

سُدیش پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھا۔ ہر نوجوان ایسا نہیں کر سکتا۔ اُس کے اندر دیش پریم، قومی خدمت، انسانیت کی سیوا کے جذبے کی موجودگی ہی کار نمایاں تھی، اُن دنوں جب انگریزی حکومت، ہندو مسلم تفرقات کو اُبھارنے اور فرقہ وارانہ منافرت کو برانگیختہ کرنے میں کوشاں رہتی۔ ایک خالص مسلمان کا گاؤں میں جاکر رہنا، لوگوں کی خدمت کرنا، اُن کے دُکھ سُکھ میں شرکت کرنا، اُن کے گھروں میں جاکر اُن کے برتنوں میں پانی پینا، اُن کے ساتھ مل کر کھانا، نہایت دلیرانہ اقدام تھا۔ اس بے لوث خدمت کا، اس زبردست ایثار کا اُسے صلہ ملتا۔ اُسے اُن بھولے بھالے دیہاتیوں کا تقدس سے بھرپور پیار ملتا۔ وہ اس کی بلائیں لیتے، اُس پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتے۔ اُسے اپنا نیتا تصور کرتے، اُس کی ہر بات کو مانتے۔ اُس کے ہر مشورے پر عمل کرتے۔ وہ اُسے مولوی جی کہہ کر پکارتے، گاؤں کا مولوی اُس کا مخلص اور بہترین دوست تھا۔ اُس کا دلدادہ تھا۔ اُس کی تعریف کرتے تھکنے کا نام نہ لیتا۔ وہ اُسے سچّا مسلمان کہتا۔ سُدیش انہیں جملہ مذاہب کے اعلیٰ اصلی اور مشترکہ نکات کو سمجھنے کی تلقین کرتا۔ اور اُن کی اپنی زبان میں نہایت عمدہ ڈھنگ سے انہیں سمجھاتا۔ اس کارن وہ اُن کا لیڈر بن جاتا۔ پڑوسی گاؤں میں بات پھیل جاتی۔ اُس کا چرچا ہونے لگتا۔

اور وہ اُسے بطور مہمان مدعو کرتے۔ وہ سحر گر وہاں جاکر بھی اپنا جادو جگاتا۔ اگلی تعطیلات میں اُس گاؤں کو اپنی سرگرمیوں کا، اپنی کارگزاریوں کا مرکز بنا لیتا۔ چند سالوں کے اندر وہ اُن مسلمان جولاہوں اور ہندو جاٹوں کے گاؤں میں بے حد پاپولر ہو گیا۔ اُس کی موجودگی میں لوگوں کے باہمی تنازعے، گاؤں کے آپس کے جھگڑے ماضی کی یاد بن گئے۔ لڑائی کی حالت میں تھانے میں رپورٹ کرنے اور وکیلوں کی شرن لینے کے بجائے وہ اُسے ثالث تسلیم کر کے اُس کے فیصلے کو بسر و چشم منظور کرتے۔

سُدیش کا دھیان آتے ہی فوق البشر کا تصور جاگ اُٹھتا ہے۔ اُس کے متعلق بیان کردہ باتیں ناقابلِ یقین ہوتے ہوئے بھی سچائی پر مبنی ہیں۔ اور کسی کو اُن کے بارے میں یقین دلانا میرا مقصد بھی نہیں۔ میں تو محض واقعات بیانی سے کام لے رہی ہوں۔ دل کے بوجھ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ان حقائق کو قلم بند کر رہی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ رازہائے خصوصی میرے فانی جسم کے ساتھ سپردِ آتش کر دیئے جائیں۔ اور دنیا والے ایک عظیم سچائی کی حقیقت سے محروم رہ جائیں۔ ایک مردِ خدا کے دل کی عظمت اور روح کی بلندی نا آشنا رہ جائیں۔

سُدیش اُن عظیم شخصیتوں میں سے تھا جو تباہ کن ہتھیاروں سے غیر مسلح رہ کر روحانی جنگ و جدل میں پیش پیش رہتا ہے۔ جو دوسروں کو مجروح کرنے کے بجائے خود ظلم کے وار سہتا ہے، جو دوسروں کے دُکھ درد دُور کرنے کے لئے جلتی آگ کی بھٹی میں کودنے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ ادھرم کے خلاف دھرم ایدھ میں، بدی کے خلاف نیکی کی لڑائی میں یقین رکھتا تھا۔ دراصل جنگ کا یہی درخشاں اور تاباں، دل آویز و دلفریب پہلو ہے۔ دوسروں کو موت کے گھاٹ اُتارنا، شہروں کو نیست و نابود کرنا، تہذیب اور زلیست کے نشانات معدوم کرنا۔ جنگ کے محض منفی اور تردیدی پہلو ہیں۔

سُدیش کے کردار کے اس روشن پہلو سے، میرے دل کے اندر اُس کے پریم کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔ اُسے جیون ساتھی بنانے کا، اُس کے ساتھ بیاہ کرنے کا، میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کسی دوسرے سے شادی کرنا تو در کنار اُس کے متعلق ذہن میں اس طرح کے خیال کو لانا بھی ناممکن

تھا۔ مندر میں ہمیشہ ایک ہی مورتی رہ سکتی ہے۔ من کا مندر ہو، یا اینٹ پتھر سے تشکیل دیا ہوا مندر ـــــ

اُس کی موجودگی نے میری کایا پلٹ دی تھی۔ اُس کی صُحبت سے میرے سوئے ہوئے شعور کی نیند کھُل رہی تھی۔ اُس کی تعلیم کے زیرِ اثر میرے اندر تبدیلی آرہی تھی۔ اب میں خُوب اِسٹڈی کرتی ـــــ اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کرتی معیاری اور بلند پایہ ناولیں پڑھتی اور اعلیٰ پایہ کی جنرل کتابوں کا مُطالعہ کرتی۔ حالاتِ حاضرہ پر بحث کرتی۔ اُنہیں سمجھنے کی ہر مُمکن کوشش کرتی۔ اور اپنی حدود کے اندر رہ کر اُن میں شمول پسند کرتی۔ سُدیش اِس بات پر زور دیتا کہ ہر ذی شعور اور ذی حس اِنسان کو سماجی معاملات میں اِن والومنٹ کرنا چاہئے۔ اُلجھاؤ میں ضرور پڑنا چاہئے اُسے تیسری نگاہ پیدا کرنا چاہئے جس سے وہ چیزوں کے اندر داخل ہو۔ واقعات کی رُوح میں سما کر سچائی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے، اُردو کے اشعار سُنا کر اُن کے مطلب کی وضاحت کرتا۔ اقبال کا ایک مصرع دُہراتا ۔ع :۔

" گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود ۔"

اِنسانی دماغ کی نشوو نُما کے مُختلف اَدوار میں ایک خاص قسم کے خیالات اور جذبات کا گروہ بَشر پر قابض ہوتا ہے، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک مُختلف قسم کے وچار اِنسان کو اُلجھائے رکھتے ہیں۔ آج مجھے بچپن میں نہ پیاری لگنے والی گُڑیوں سے پیار ہے، نہ کسی وقت عمدہ معلوم دینے والی مٹھائی اور چاٹ میں دِلچسپی ہے۔ الھڑ جوانی کے دوران پاگل بنانے والے جذبات سے بھی آج دِل عاری ہے۔ اِس عمر میں مُختلف تجربات سے گُزرنے کے بعد آج میری دُنیا مُختلف ہے۔ خیالات و جذبات میں زمین و آسمان کا فرق آگیا ہے۔ ظاہراً تو پھر میں وہی عورت ہوں۔ لیکن دراصل ایک نہیں، مُختلف عورتوں کی زندگی بسر کر چکی ہوں۔

سُدیش کی صُحبت میں آنے کے بعد، میرے خیالوں کی دُنیا ایک دم بدل گئی تھی۔ میرے دِل کی دُنیا، گھر والوں، پڑوسیوں، واقف کاروں اور سہیلیوں کی زندگی سے بالکل علیحدہ تھی۔ سُدیش کی موجودگی سے میرے دِل، دماغ

کی عجیب کیفیت رہتی۔ اُس کی حاضری میں کسی جادو کے زیرِ اثر اُس کی باتوں کو بغور سُنتی اور بعد ازاں اُن پر سوچ بچار کرتی۔ بولنے میں اُسے خُوب مہارت تھی۔ انگریزی، ہندی، اُردو، پنجابی میں اُسے تقریر کرنے کی زبردست مشق تھی۔ وہ ایک بار کسی بھی مضمون پر بولنے لگتا۔ تو الفاظ آبشار کی مانند گرنے لگتے۔ ذرا بھی رُکے بغیر جچے تُلے الفاظ اُس کی زبان سے بہنے لگتے۔ اُس کے جانے کے بعد اُس کے وہ الفاظ میرے دماغ میں گونجتے اور سوچنے کا مواد بن جاتے۔

وہ اپنے خیالات اور جذبات پر بھی اُسی طرح پورا ضبط رکھتا اور کبھی بہکے ہوئے انداز سے بات نہ کرتا۔ میرے ساتھ گھنٹوں تنہائی میں بیٹھ کر بھی دِلی اِضطراب کا اظہار نہ کرتا۔ مجھے ایسا لگتا کہ وہ خود دُور کھڑا ہو کر اپنے من پر نگاہ رکھ رہا ہو۔ خود اُس کی چوکسی کر رہا ہو۔ نہ جانے اُسے یہ ٹریننگ وِراثت میں ملی تھی یا اُس نے بعد ازاں خاص کوشش، اور ریاضت سے اپنے اندر یہ خاصیت پیدا کی تھی۔

میں نے اُسے بارہا آزمانے کی کوشش کی اور مُنہ کی کھائی۔ اُس کی ظاہرا شخصیت، جسم کی بناوٹ اور شکل و شباہت پر کوئی بھی حسینہ مر مٹنے کو تیار ہو سکتی تھی۔ لیکن اُس کی ذہنی اور رُوحانی بالیدگی مغرور نازنینوں کے دِلوں کو بھی جیت لیتی۔ اُسے قابو میں کرنے، اُس کے دِل کو جیت لینے کی تمنّا مجھے بے چین بنائے رہتی۔ اِس معاملے میں میری ناکامی میرے دِلی اضطراب میں گوناگوں اضافہ کرتی۔ جب میں کچھ نہ کر پاتی تو کفِ افسوس ملتی رہ جاتی۔ لیکن ہر وقت اُس کی یاد میری رُوح پر قابض رہتی۔ اُس کی موہنی صُورت میرے سپنوں پر راج کرتی۔ ایک غیبی طاقت میرے اعضأ پر مُسلّط رہتی۔ اُسے بس میں کرنے کی خواہش میرا پیچھا نہ چھوڑتی۔

ایک دِن میں خود کو قابو میں نہ رکھ سکی اور وفورِ جوش سے میں نے اپنا پاؤں اُس کے پاؤں پر رکھ دیا۔ کسی جذبے کے اظہار کے بغیر۔ اُس نے دھیرے دھیرے اپنا پاؤں پیچھے کو کھینچ لیا اور مجھے پڑھانے میں لگا رہا جیسے کوئی بات نہ ہوئی ہو۔ دوسری بار میں نے اپنا ہاتھ اُس

کے ہاتھ پر رکھ دیا تو اُس کی طرف سے وہی ردِّ عمل ہُوا۔

کیا وہ دیوتا تھا؟ لیکن دیوتا بھی حُسن کی موجودگی میں مات کھا جاتا ہے۔ ایک نوجوان حسینہ کے وار سے کون بچ سکتا ہے؟ رِشی مُنی بھی کام دیو کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ ایک شنکر ہی اُسے اپنی تیسری آنکھ سے بھسم کر پاتا تھا۔ لیکن سُدیش تو شنکر نہ تھا' پھر بھی اُسے اپنے نفس پر اِس درجہ ضبط تھا۔ پہل ہمیشہ لڑکے کی طرف سے ہوتی ہے۔ اِتنی دیر وہ اِنتظار ہی کب کرتا ہے؟

پھر میں پُورے جوبن پر تھی۔ اب میں بی اے میں تھی۔ وہ ایم اے پاس کر کے اچھے عُہدہ پر فائض ہو گیا تھا۔ میری جوانی پھُوٹ آئی تھی۔ چہرے پر نکھار اور چھاتی پر اُبھار آ گیا تھا۔ لانبے قد، چھریرے جسم، تیکھے نقوش، جوانی سے بھرپور اور جوبن کے نشے میں مست لڑکی کو سڑک پر چلتے دیکھ کر نوجوان آہیں بھرتے۔ کالج میں سبھی اپنی نگاہوں کو مجھ پر مرکوز کرتے۔ لڑکوں کے ریمارکس میرے لئے معمول بن گئے تھے۔ اُنہیں میں اپنی حسین جوانی کے لئے خراجِ عقیدت گردانتی۔

اب میرے لئے سندیسے بھی آنے لگے' رشتہ دار' اور واقف کار میرے لئے 'وَر' ڈھونڈنے لگے ماں اور بابوجی کے پاس سفارشی اور خوشامد سے بھرے خطوط آتے' وہ مجھے سمجھاتے' میری رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ میری حالت سے ناآشنا تھے۔ میرے دل کی کیفیت کو نہیں جانتے تھے' وہاں سُدیش کے بنا کسی دوسرے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا۔ اُس نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دیا۔ بابوجی کو بھی یہ رشتہ پسند تھا۔ گھر پر ہر کوئی سُدیش پر جان چھڑکتا تھا۔ اُس سے بے حد خوش تھا۔

اگر میں اُس پر مرتی تھی' وہ بھی مجھ سے مانوس تھا۔ مجھ میں غیر معمولی دلچسپی لیتا تھا۔ میرے ذہنی اور رُوحانی نشو و نما میں اُس کا نوّے فی صد ہاتھ تھا۔ میرے خیالات کو ایک سانچے میں ڈھالنے' میرے جذبات کو پرورش دینے میں اُس کا نمایاں حصّہ تھا۔ میرے شعور کو اُس نے بیدار کیا تھا۔ میری ہر بات سے میرے دل کے ہر کونے میں چھپے ہوئے جذبات سے وہ پُوری طرح واقف تھا۔ لیکن پھر بھی وہ مجھ سے بچتا تھا' خاص موقع پر آ کر وہ کترا جاتا۔ نازک وقت پر ہاتھ سے کھسک جاتا۔ اُس کی اِس بے رُخی نے میری پریشانیوں میں' میرے دِلی اِضطراب میں بے حد اِضافہ کر دیا۔

ایک دِن وہ ورڈزورتھ کی نظم کی تشریح کر رہا تھا۔ جب وہ جانے کے لئے کرسی سے اُٹھا۔ میں اُس سے چمٹ گئی۔ نہ جانے میرے جذبات نے مجھے کس قدر پاگل بنا دیا تھا۔ میرے اندر دہکتی ہوئی بھٹی نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اِن حالات میں توازن کھو بیٹھنا فطری امر تھا۔

لیکن سُدیش کے ردِّ عمل نے مجھے مایوسیوں کے سمندر میں ڈھکیل دیا۔ اُس کی سرد مہری نے میرے جذبات کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

نہ جانے کتنی دیر اُسی حالت میں اُس کے گلے سے چمٹے میں کھڑی رہی۔ پانچ یا پچاس منٹ۔ مجھے بالکل یاد نہیں۔ میں تو اُس وقت پاگل پن کی حالت میں تھی۔ بے خودی کی رَو میں بہہ رہی تھی۔ اور یہ جناب میری پیٹھ کو سہلا کر کہے جا رہے تھے۔

"اب بس کرو۔ بہت ہو گئی۔"

جیسے کسی گہری نیند سے آنکھیں کھلنے پر میں بیدار ہوئی۔ اپنی حماقت پر بے حد شرمندہ، میں شرم سے فرش پر نگاہیں گاڑے کھڑی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اِس واقعہ نے میرے دِل کو سخت ٹھیس پہنچائی۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ میرے پیار کو وہ اِس طرح ٹھکرا دیگا۔ میرے جذبات کو اِس بے دردی سے کُچل دے گا۔ میری خواہشات کو یوں بے رحمی سے پامال کر دے گا۔ مجھے اُس سے ایسی اُمید نہ تھی۔ وہ جوان تھا، حسین تھا۔ میں بھی جوان اور حسین تھی۔ دو جوان جسموں، دو دھڑکتے دِلوں، اور دو تڑپتی رُوحوں کے مِلن کو دیکھ کر تو فرشتے بھی مچل اُٹھتے ہوں گے۔ کیا اِس سے بڑھ کر بھی دنیا میں کوئی دل کش اور دلفریب نظارہ ہوتا ہو گا۔؟ مجھے دُکھ اِس بات کا تھا کہ

میری اس حالت میں آسمانی قوتیں کیوں خاموشی سے مشاہدہ کرتی رہیں۔ اور اُس نے آہنی دل کو موم بنا کر اُس کے اندر لطیف جذبات بھرنے میں کیوں ناکام رہیں۔

آیا ہے بڑا عالم فاضل! جیسے اُس کے سوا دنیا میں دوسرا کوئی لائق ہی نہیں۔ جیسے راست گوئی اور ایمانداری میں کوئی اُس کا ہم پلہ ہی نہیں، اور پھر عشق کی بھوکی، پریم کی ماری جوان لڑکی کو ان ڈھکوسلوں سے مطلب؟ دل کی دنیا سے اِنہیں کیا تعلق۔؟ اپنے اندر دیوتاؤں کی خوبی پیدا کرنی تھی تو میرے پاس آنے۔ مجھ سے اُنوتت جتلانے کا کیا فائدہ؟ مجھے دیوتا کی نہیں، اِنسان کی ضرورت تھی۔ اور وہ میرے معیار سے کسقدر گر گیا تھا۔ میری نظروں سے اُتر گیا تھا۔ بڑا آیا ہے دیش بھگت اور سماج سُدھارک! میرے نزدیک اِن خوبیوں کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ سُدیش کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ مجھے اُس کے آدرش واد کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔

میرا راستہ اُس سے مختلف تھا۔ میں نے اُس کے خیال کو دل سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے دن، میں نے اُس سے پڑھنے، اُس کے سامنے آنے اور اُس سے مُلاقات کرنے سے اِنکار کر دیا۔ اُس نے گھر پر آنا بند کر دیا۔

کچھ دنوں بعد توازن قائم ہونے پر میں نے سارے معاملے پر ٹھنڈے دل سے بچار کرنا شروع کیا۔ سارے مسئلے پر غور و خوض کرنے، اُس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کے بعد مجھے اپنا ہی قصور نظر آیا۔ میرے دماغ نے سُدیش کو بری الذمہ قرار دیا۔ اُس کے خلاف مقدمہ خارج کر دیا۔ اور مجھے ہی قصوروار ٹھہرایا۔ اِتنے زبردست موقع سے فائدہ نہ اُٹھانا۔ ہاتھ آئے شکار کو گنوا دینا۔ ایک نوجوان حسینہ اور محبوبہ کے پیار کو ٹھکرا دینا۔ مالِ غنیمت کو ہنسی خوشی لُٹا دینا۔ یہ سب سادھارن باتیں نہیں تھیں۔ یہ سب سُدیش جیسے بلند کردار شخص ہی سے ممکن ہو سکتا تھا۔ آدرش اور حقیقت کا اِس قدر شاندار امتزاج اُسی ہی مہان شخصیت میں ممکن ہو سکتا تھا۔ وقتی جوش نے میری آنکھوں پر پردہ ڈال کر اُس کی عظمت کو روپوش کر دیا تھا۔ اُس کی بڑائی اور

اپنی کوتاہی کا احساس کر کے میں نے خود ہی پر لعن طعن شروع کیا۔ ...ایک اِنسان کے اندر اُپدیش اور عمل کی حسین یگانگت گفتار اور کردار کی خوبصورت مطابقت کی مناسب قدر کرنے کے بجائے میں نے اُسے پہچانتے ہی سے اِنکار کر دیا۔ عام اِنسانوں سے اُس کی برتری کو جانتے ہوئے بھی میں نے اُسے عامیانہ معیار سے ناپا۔ اور ایک دیوتا کے سمان اُس کی پُوجا کرنے، اور من مندر میں بٹھلا کر پرستش کرنے سے اِنکار کر دیا۔

مجھ سے بڑھ کر مُورکھ دوسرا کون ہو سکتا تھا؟ اُس کی آمد بند ہو جانے سے دِل کی خلش کا بڑھنا لازم تھا۔ اُس کی بے رُخی نے میری دلی کوفت میں مزید اضافہ کر دیا۔ اُس کا پتہ لگانے، کسی بھی طریقے سے اُسے گھر پر بُلانے کا میں نے ماں سے اصرار کیا۔ یہ جان کر اُس نے وہاں سے اپنا تبادلہ ہی کرا لیا تھا مجھ پر جیسے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میری محبت کو ٹھکرا کر پریم کی کھلتی ہوئی کو یُوں مَسَل کر، مجھ سے مِلے بنا، اپنا پتہ چھوڑے بغیر، وہ یُوں میری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ شہر چھوڑ کر ہی چلا جائے گا۔ اِس بات کا مجھے گمان تک نہ ہو سکتا تھا۔

اِس دِلی آزار کو، ذہنی کوفت اور کرب کو میں نے خود ہی خاموشی کے ساتھ سہا۔ اِس صدمے کو چُپ چاپ برداشت کیا۔ میں نے کسی سے اِس کا تذکرہ نہیں کیا۔ میری خودداری نے اپنا درد، دوسروں کے ساتھ نبٹوانے سے اِنکار کر دیا۔ میری خود غرضی نے وہ کی اِس پیڑا میں جدائی کی میٹھی کسک میں، کسی دوسرے کو شریک کرنا منظور نہیں کیا۔ قصور بھی تو میرا تھا اِس انتہائی درجے تک خود کو پریم جال میں گرفتار کر لینا۔ اُس کے دِل کی تھاہ لئے بغیر، خود کو محبت کے چکر میں ڈالنا، بے خودی کی رَو میں بہہ کر خود پر قابو کھو کر، خود کو اُس کی آغوش میں ڈالنا۔ اُس کے ذریعے ٹھکرائے جانے پر اُس سے ناراضی کا اِظہار کرنا، اُس کا بائیکاٹ کرنا، اور اب اُس کے چلے جانے پر، پنچھی کے اُڑ جانے پر، دِل کو رونا، آنسو بہانا۔ پشیمانی میں مبتلا ہونا۔ اِن سب کیلئے میرے سوا، دوسرا کون ذمہ دار تھا۔؟

اِس صدمے نے میری صحت پر بُرا اثر ڈالا اور مجھے لمبی بیماری میں مبتلا کر دیا۔ بچنے کا کوئی اِمکان نظر نہ

آرہا تھا۔ لیکن اِس دوران بھی سُدیش کی یاد کے بغیر میرا
کوئی سہارا نہ تھا۔ میرے تندرست ہونے پر ماں نے میری
شادی کرنے کا فیصلہ کرکے ور ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ ہر رشتہ کو
نامنظور کرنا، ہر آئی بلا کو ٹالنا، ہر ممکن طریق سے خود کو آزاد رکھنے
کی کوشش کرنا، میرا شیوہ بن گیا۔ نتیجے کے طور پر گھر کا ہر فرد مجھ
سے ناراض ہو گیا۔ اِس اُدھیڑ بُن میں دو سال کا عرصہ بیت
گیا۔ سُدیش کا کوئی پتہ نہ چلا۔ نہ ہی اُس کے بارے میں خود
اُس کا یا کسی دوسرے کا مُراسلہ موصول ہوا۔

ایک دن وہ اچانک وارد ہو گیا۔ اُسے پہچاننا ایک دم
مُشکل تھا۔ بے ضابطہ سی بڑھی ہوئی ڈاڑھی۔ سر پر لمبے لمبے
بالوں والے انجان شخص کو دیکھ کر میرا سکتے میں آنا یقینی امر تھا۔
ایسی بھیانک شکل والے انجان پردیسی کو دیکھ کر میرا جسم کانپ اُٹھا،
دل لرزنے لگا۔ میرے لڑکھڑاتے پاؤں دیکھ کر اُس نے آگے بڑھ
کر مجھے اپنی باہوں میں سنبھال لیا۔ اور بصد مُشکل گرنے سے بچایا۔
پھر بولا۔

"نہیں پہچانا۔ ؟"

"کون ۔ ؟ سُدیش ۔ !" میں نے بے ساختہ چلّا کر کہا۔

سُدیش کا نام سُنتے ہی، ماں، ڈیڈی، بہن، بھائی،
سبھی اکٹھے ہو گئے۔

چائے پینے اور آرام کرنے کے بعد سُدیش نے مختصر
ڈھنگ سے اپنا افسانہ سُنایا۔

یہاں سے جانے کے بعد اُس نے ملازمت سے اِستعفیٰ
دے کر 'سماج سیوا' اور تعلیم بالغاں کا کام شروع کر دیا تھا۔
لیکن وہ ایک جگہ نہیں ٹِکا۔ گھومتا پھرتا رہا۔ اُس نے لگ بھگ
مُلک بھر کا دورہ کیا۔ اور مُلک کے حالات کا بہ چشم خود مطالعہ کیا۔
اِس دوران اُسے سخت تکلیف کا سامنا اور مصائب کو جھیلنا پڑا۔
لیکن یہ نہایت ہی مُفید تجربہ ثابت ہوا۔ جب وہ کلکتہ میں مقیم
تھا۔ تو وہاں فرقہ وارانہ فسادات کا آتش فشاں پھوٹ پڑا۔
دوسروں کی خدمت کرتے ہوئے، وہ خود بارہا موت کے
چنگل سے بال بال بچتا رہا۔ کئی کئی دن اُسے کھانے کو
کچھ نصیب نہیں ہوا۔ اب فسادات بند ہونے پر، وہ
سیدھا وہیں سے آ رہا تھا۔

"آپ کو ہمارا دھیان رہا ؟" میں نے پوچھا۔

"اِسی لئے تو یہاں چلا آیا" اُس نے جواب دیا۔

"اب کیا ارادہ ہے ۔ ؟"

"اِس وقت تو لنچ کرنے کا ہے ۔"

سبھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

اُس کی سادگی ہر کسی کو موہ لیتی تھی۔

اُس نے پھر ہمارے ہاں آنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے
وہ تندرست ہونے لگا۔ چہرے پر پھر رونق عود کر آئی، بشاشت
ناچنے لگی۔ جسم میں طاقت بھر آئی اور جوانی لوٹ آئی۔ رنگت میں
نکھار آ گیا۔ اور وہ پھر پہلے سا حسین وجمیل، دلکش اور شکیل سُدیش
بن گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے پڑھنا بند کر دیا تھا۔ اُس
کے اِصرار پر ایم اے میں داخلہ لیا۔ لیکن اب اُس نے ٹیوٹر بن کر
پڑھانے سے اِنکار کر دیا۔ اب وہ فیملی فرینڈ کی حیثیت سے آتا،
ماں کو اہم معاملات میں مشورہ دیتا۔ باؤجی کی مدد کرتا۔ میرے
ساتھ گھنٹوں مختلف موضوعات پر بات کرتا۔ سماج سیوا کی
اپنی نئی یوجنا کی وضاحت کرتا اور مجھے اپنے ساتھ شہر کے اندر اور
نزدیکی گاؤں میں اپنے کاموں کو دکھانے لے جاتا۔ اُس نے
ایک مقامی کالج میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنا فالتو وقت
سماجی کاموں میں لگاتا۔ آج کل کے زمانے میں جب ہر کالج اور
یونیورسٹی کا ہر ٹیچر اپنا کیریئر بنانے، اپنے گریڈ اور سکیل کے امپروو
کرنے کے چکر میں غلطاں رہتا، سُدیش، کسانوں کے مسائل حل
کرنے، اِن کے اور کھیت مزدوروں کے تنازعوں کا تصفیہ کرنے
اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کی حالت سُدھارنے کیلئے فکرمند رہتا۔
اُدھر، ماں اور ڈیڈی میری شادی کے لئے متفکر رہتے ۔
اور لڑکوں کی تلاش کرتے ۔ آئی، اے، ایس اِمتحان میں کامیاب
ایک لڑکا، نہیں پسند آیا۔

ایک دن جب میں اور سُدیش گھر پر اکیلے تھے ۔ میں
نے اِس رشتہ کا اُس سے تذکرہ کیا۔ وہ میری بات سُن کر
چونکا اور بولا۔

"تمہارا کیا ارادہ ہے۔؟"
"آخر شادی تو کرانی ہے۔ یہی سہی۔"
"طبیعت ملے یا نہ ملے۔؟"
"دوسرا چارہ ہی کیا ہے۔؟"
"ایسی مجبوری بھی کیا ہے۔؟"
"ہندوستانی شادی مجبوری کے سوا اور کیا ہے۔؟"
"ایسی بات تو ان پڑھ لڑکیوں ہی کو زیب دیتی ہے۔"
"اس معاملے میں ان پڑھ اور پڑھی لکھی میں کوئی فرق نہیں۔"
"تم اس قدر قنوطیت سے پُر ہو سکتی ہو، اس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔"
"اس کا ذمہ میرا نہیں آپ کا ہے۔"
"میں سمجھا نہیں۔"
"یہی تو آپ کی مشکل ہے۔ جس بات کو سادھارن عقل والا شخص بلا کسی اُلجھن کے سمجھ لیتا ہے وہ آپ کی سمجھ کے دائرے سے بعید ہے۔"
"تم ناراضی کا اظہار کر رہی ہو، طعنہ زنی کر رہی ہو۔ لیکن میری مشکل کو سمجھنے سے قاصر ہو۔"
اُس نے میرے ہاتھ کو اپنی اُنگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔
اِتنے سالوں کے بعد آج پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ کے مَس سے میرے جسم کے اندر بجلیاں دوڑنے لگیں۔ آنکھوں میں ڈورے پڑ گئے۔ جسم میں کپکپی آگئی۔ سُدیش کے اندر اُتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اُس نے مجھ پر اثر کر دیا۔ آج اتنی مدّت کے بعد، پہلی ملاقات کے دس سال بعد محبّت نے اُس کے اندر انگڑائی لی۔ پریم کے دیوتا نے شب خوابی سے آنکھیں کھولیں۔
لیکن میرا اندازہ غلط ہو سکتا تھا۔ شاید وہ مجھ سے مذاق کر رہا تھا۔
میں نے اپنے ہاتھ کو دھیرے دھیرے کھینچ لیا۔
اُس نے فوراً اُسے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اسے پھر اپنی طرف کھینچا اور اسے دباتے ہوئے بولا
"کیا عورت آدمی کے دل کو نہیں سمجھ سکتی۔؟"

میں خاموش رہی۔
"کیا عورت اس قدر پتھر دل ہو سکتی ہے؟"
میں پھر چُپ رہی۔
"کیا اُس کا دل جذبات سے ایک دم عاری ہوتا ہے۔؟"
جو سوال ایک دن میں نے سُدیش کے بارے میں اپنے دل سے پوچھے تھے، آج وہی سوال وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔
میں سمجھ گئی۔ سُدیش کو مجھ سے زیادہ کون جانتا تھا؟
اُس وقت میں اُس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اور وہ اس رشتے کے تقدّس کو جانتا تھا۔ اُس کی اہمیّت کو تسلیم کرتا تھا۔
اب وہ رشتہ ختم ہو چکا تھا۔
اب وہ ایک آزاد پنچھی تھا۔ اور آزادانہ ڈھنگ سے مجھ سے رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔
مجھ سے زیادہ سُدیش کو کون سمجھ سکتا تھا۔؟

دل
ایسی
چیز
عفّت موہانی

عفّت موہانی

سوانح عمری کے لئے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں؟ کوئی کارنامہ میں نے انجام نہیں دیا۔ تاریخ پیدائش ۱۹۳۷ء ہے۔ حیدر آباد ہی میں جنم لیا۔ (پتہ نہیں کیوں؟) چونکہ میرے معلّمِ اوّل مولانا حسرت موہانی مرحوم تھے، لہٰذا چھوٹی سی عمر ہی سے پڑھنے لگی اور پھر ان کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ جلد ہی لکھنے بھی لگی۔ پہلے پہل بچوں کے کالم میں لکھا اور جناب اظہر افسر نے بے حد حوصلہ بڑھایا۔ پھر جب افسانے لکھے تو محترم نسیم انہونوی صاحب نے بہت کچھ سکھایا۔ آج تک وہ میرے حال پر اس قدر مہربان ہیں جیسے ایک مُشفق باپ، اپنی بیٹی پر مہربان ہو سکتا ہے!

عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کل ڈومینین فرسٹ پاس کیا۔ جیتک یونیورسٹی اور ویمنس کالج میں زیرِ تعلیم رہی، پروفیسر عبدالقادر سروری اور محترمہ جہاں بانو نقوی نے میرے ادبی ذوق کو بہت سراہا اور مجھے نئی نئی باتیں بتائیں ـــ کہانیاں اور افسانے مجھے پریم چند اور نذیر احمد کے بے انتہا پسند ہیں لیکن میں نے کسی کی بھی تقلید نہیں کی۔

کئی سو افسانے ہندو پاک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی کہانیوں کا ہندی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ لگ بھگ سات ناول نسیم بکڈپو نے شائع کئے ہیں۔ ان سب تصانیف کا مقصد پاکیزگی اور سچائی کو دُور دُور تک پہنچانا ہے۔ مجھے جدیدیت اور ترقی پسندی کی اصطلاحیں پسند نہیں۔ چاہے مجھے لوگ قدامت پرست کہیں یا بدعقل۔ لیکن میں اپنے مسلک پر سختی سے قائم ہوں! ۔ میں نے ایک سطر بھی ایسی نہیں لکھی جسے عُریانیت کا نام دیا جا سکے! ... میں اُن مصنّفین کو بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی جو اپنی شہرت کا ذریعہ عُریانیت کو بناتے ہیں اور پڑھنے والوں کی ذہنی لذت کا سامان بہم پہنچاتے اور سستے ادب کو فروغ دیتے ہیں۔

آج اُردو زبان و ادب پر آکے عجب وقت پڑا ہے۔ ہم سب لکھنے والوں کو چاہیئے کہ نام نہاد جدیدیت کا پیچھا چھوڑ کر اعلیٰ ادبی اقدار کو سراہیں اور حتی الامکان اُردو زبان کی بقا کا سامان کریں۔ قارئین کا بھی فرض ہے کہ وہ بے سر و پا تحریر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔ اس طرح ایک صحت مند زبان مستحکم ہوگی اور یقین ہے کہ اپنے موجودہ رسم الخط کے ساتھ ہی حشر تک زندہ رہے گی!۔

(خود نوشت)

دِل ایسی چیز

عفّت موہانی

افقِ مغرب پر بھونرا سی کالی کالی گھٹائیں چھا گئی تھیں، آفتاب کا چمکیلا چہرہ بادلوں کے نقاب میں چھپ گیا تھا۔ دُور کہیں بارش ہو چکی تھی، دریچوں سے آنے والی ہواؤں میں بدمست سی خوشبو رچی بسی تھی، برآمدے میں ہلکی ہلکی پھوار گر رہی تھی اور ٹین کے شیڈ پر ہلکا سا ترنم عجیب سی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اُداسی اور مسرت کا مُلا جلا امتزاج۔

بڑی بیگم نے اُونی شال اپنے اردگرد برابر کی، نقرئی پاندان سے ایک گلوری بنا کر گال میں دبائی! اور ادھر ادھر دیکھ کر تکیے سے ٹیلی گرام کا گلابی سا کاغذ نکالا۔ اس پر سرسری نظریں دوڑائیں ان کا بوڑھا چہرہ فرطِ مسرّت سے چمک رہا تھا، جیسے کسی انہونی نے دل میں چراغاں سا کر رکھا ہو۔ تار اُنھوں نے زانوں کے نیچے دبا لیا۔ اور ملازمہ سے کہا کہ وہ اُن کے بیٹوں کو بلا لائے۔

پھر وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئیں۔۔ کیسا ہو گیا ہوگا میرا بچّہ اتنے طویل عرصے میں شاید میں اسی لیے اب تک زندہ رہی کہ ایک بار اسے اور دیکھ لوں۔ غریب، پانچ سال کا تھا۔ جب یہاں سے گیا تھا! اور اب بیس سال بعد۔ وہ آ رہا ہے! اگر اس کی تصویریں نظروں سے نہ گزرتی ہوتیں تو کیسے پہچان پڑتا کہ یہی میرا حارث ہے۔

آپ نے طلب فرمایا تھا؟۔ امّی جان!۔"

وہ چونک پڑی اور عرفان کی طرف دیکھا۔ اُن کے ساتھ سلطان اور فرحان بھی تھے!۔ مودّب اور مہذّب۔ جو شادی شدہ اور کئی کئی جوان بچّوں کے باپ ہو کر بھی ماں سے نگاہیں چار کرنے کی جراءت نہیں کر رہے تھے!۔

بیٹھو۔۔" بڑی بیگم نے کہا اور چند سکنڈ بعد پھر بولیں۔

"تمہیں پتہ ہے کہ کل شام عبدالرحمٰن آ رہے ہیں۔ اُن کے ہمراہ حارث بھی ہے!۔ تم جانتے ہو نا؟۔"

وہ خاموش رہے۔

کیا بات ہے؟ تم لوگ خاموش کیوں ہو۔! اُنھوں نے باری باری ایک ایک کو دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا" کیا تمہیں حارث کی آمد سے خوشی نہیں ہوئی۔

جی! جی نہیں تو امّی جان۔ ایسی تو کوئی بات نہیں!" عرفان نے کہا اور دریچے کے باہر دیکھنے لگے۔ جیسے مزید بات چیت سے بچنا چاہتے تھے۔

سلطان!" وہ دوسری طرف مڑیں" بیس سال بعد تمہارا یتیم دلبر بھتیجہ وطن کی سرزمین پر قدم رکھے گا۔ اگر آج اُس کے ماں باپ زندہ ہوتے تو میں کبھی تم سے التجا نہ کرتی کہ تم اسے اپنی محبت عطا کرو۔ وہ تمھارے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ میری تم سے درخواست ہے کہ اس سے بیگانگی اور غیریت کا سلوک نہ کرنا۔ وہ کبھی یہ نہ سوچ سکے کہ وہ اپنوں میں نہیں پہونچا۔ جیسا پیارا اور مددگار اتنے دنوں پہلے تھا۔ اتنا ہی اب بھی ہے۔

" امّی جان۔ مجھے تو اس کی آمد سے کوئی پریشانی نہیں ہے!"

فرحان نے کہا" اور میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے اس کی آمد کی خبر ہمیں دینا کیوں ضروری خیال کیا ہے۔ اُس کا بھی گھر ہے۔ شوق سے آئے رہے!"

واہیات!۔" عرفان زیرِ لب بڑبڑائے۔

کیا کہا؟۔ بڑی بیگم نے پوچھا۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے! عرفان نے جلدی سے کہہ دیا۔

خیال صرف اس کا ہے امّی جان کہ کہیں حارث کی وجہ سے پرانی یادیں تازہ نہ ہو جائیں" سلطان نے دبی زبان سے کہا" ویسے آپ اطمینان رکھیئے۔ کیا وہ میرا بھی بچّہ نہیں ہے!

لیکن میں اتنا گوش گزار اور کردوں۔ کہ وہ لاکھ ہمارا اپنا ہو مگر ہمارے بچّوں کی برابری نہ کر سکے گا۔" عرفان نے کہا" مذہب و ملت، اونچ نیچ کے فرق کو میں بہت اہم سمجھتا ہوں!۔"

مگر وہ خون تو تمہارے بھائی کا ہے!" بڑی بیگم کے چہرے پر جلال کے آثار نظر آئے۔

خُون تو وہ۔!" عرفان نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا تھا مگر فرحان نے بات کاٹ دی۔

"بیکار آپ بحث کرتے ہیں بھائی صاحب!۔ وہ زمانہ گیا وہ بات گئی۔ ہمیں اتنا تنگ دل بھی نہیں ہونا چاہیئے!"

"تم سب کو میرے دودھ کی قسم!" بڑی بیگم نے لرزتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ "کوئی حرکت، کوئی بات ایسی نہ کرنا کہ اُس کا دل دُکھے۔ میں حشر میں تمھاری دامنگیر ہوں گی، عرفان! قصور اگر کسی کا تھا تو وہ کامران کا تھا! حارث معصوم اور بے خبر ہے۔ اُسے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کے باپ کی کیا خطا تھی؟ سلطان! فرض کرو کہ وہ تمھارا بیٹا ہوتا!"

"جی ہاں۔ جی ہاں!۔" فرحان بولے وہ یوں بھی لاأبالی اور سادہ دل تھے۔ مگر سلطان اور عرفان اُٹھے اور بڑی ناگواری سے کمرے سے نکل گئے۔

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ امّی جان۔" فرحان نے تسلی دی۔ "جب تک میں زندہ ہوں۔ آپ کسی بات کی فکر نہ کیجئے، میں سب کچھ سنبھال لوں گا!"

"ہاں بیٹے۔ میں یہی چاہتی ہوں!،" وہ خوش ہو کر بولیں "کوئی بُغض و عناد اُس سے نہ رکھو۔ اُس کا کیا قصور ہے!۔"

حقیقی معنوں میں اگر بڑی بیگم کے بعد کوئی اور خوش تھا تو وہ نواب صاحب تھے۔ بڑی بیگم کے داماد تھے اور اسی کوٹھے کے ایک حصّے میں رہتے تھے۔ انھوں نے بیحد کھلے دل سے اپنے بیس برس کے بچھڑے ہوئے بھتیجے کی آمد پر اظہارِ مسرّت کیا تھا۔ بیگم کو بے حد سکون ملا۔ کوئی تو اُن کا ہمنوا نکلا تھا۔

سرمئی شام کے گہرے دھندلکے میں اُن کی نگاہیں باہر اُٹھ گئیں۔ برآمدے میں معظّم اور جویریہ کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نہ جانے معظم کیا کہہ رہا تھا کہ جویریہ کا چہرہ تمتما اُٹھا تھا۔ نیلے اسکارف اور گلابی لباس میں وہ نکھر اشتہر گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ دونوں کی ہنسی کی آواز کمرے تک آئی۔ بیگم نے بڑی ناگواری سے سر اٹھا کر اُدھر دیکھا اور ملازم کو حکم دیا کہ وہ دریچہ بند کر دے! اُس نے جو کھٹ سے شیشہ کھینچ دیا۔

کوٹھی کے مکینوں میں جویریہ کی حیثیت سب سے الگ تھی، کئی رشتے دار بھائیوں کی وہ ایک ہی بہن تھی، ماں باپ کی بے جا ناز برداری اور حد سے بڑھے ہوئے پیار نے اُسے کسی قدر مغرور خود پسند اور گستاخ بنا دیا تھا۔ نواب صاحب سخت گیر اور جابر تھے، لیکن رفعت جہاں ان کے بالکل برعکس تھیں۔ وہ اپنی بیٹی کو ایک مثالی عورت کے رُوپ میں دیکھنا پسند کرتی تھیں۔ جویریہ باپ پر گئی تھی، اس نے بہت قدیم جاگیردارانہ ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، ایک طرف مطلق العنان نانی کی حکومت دیکھی، اور دوسری طرف سخت گیر باپ کی حاکمانہ اصول پرستی تھی۔ وہ خود بھی عجیب و غریب مزاج رکھتی تھی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ اپنے آگے وہ کسی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتی تھی۔

اس نے بھی کوٹھی میں غیر معمولی چہل پہل اور معنی خیز خاموشی دیکھی، ہر ایک کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے رفعت جہاں سے پتہ چلا کہ اُس کا ماموں زاد بھائی آ رہا تھا!۔

"تو پھر اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔،" اُس نے بُرا سا مُنھ بنا کر پوچھا: "بڑے ماموں کا مُنھ الگ پھولا ہوا ہے۔ اور چھوٹے ماما بھی غصّے میں بھرے ہوئے نظر آ رہے ہیں!۔"

"تم نہیں سمجھوگی۔ جوری!" رفعت جہاں نے آہ بھر کر کہا۔ "ارے وہ کوئی قتل کر کے تو یورپ سے نہیں بھاگ رہے ہیں پھر کاہے کی یہ آفت!۔"

"پتہ نہیں۔ میں کیا جانوں۔"

جوری دل ہی دل میں حارث کی دید کی مشتاق تھی۔ کچھ تو پتہ چلے۔ جس کی آمد آمد کا یہ ہنگامہ ہے، وہ کیسا ہے!۔ اُسے تھوڑا بہت یاد تھا۔ کامران ماموں بہت اچھے آدمی تھے بڑی بیگم انھیں اپنے سب بچّوں سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔ ماں باپ کی محبت دوسرے بھائیوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ وہ کامران سے جلنے لگے تھے۔ انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتے۔ اکیلی رفعت جہاں تھیں جنھیں اپنا بھائی بے پناہ پیارا تھا۔ جو سب سے اچھا تھا۔ پُر محبت، نرم دل، ہنس مکھ مخلص۔ رفعت جہاں اپنے بھائی کی ناقدری پر آنسو

بہایا کرتیں، اُنہیں اپنے بھائی برادرانِ یوسف لگتے، کئی بار وہ بھائیوں کے آگے رو ئیں گڑگڑائیں۔ وہ سب مل کر کیوں کامران کا دل دکھاتے ہیں، کیا کیا ہے اُس نے۔ مگر وہ سب استہزائیہ انداز میں ہنس پڑے۔

تمہیں کیا دیتے ہیں کامران؟" فرحان سب سے زیادہ جلتے تھے، وہ صورت شکل کے لحاظ سے کامران سے بہت کم تھے!

محبت دین لین کا نام نہیں ہے۔۔۔" فرحان!" رفعت جہاں کو بڑا افسوس ہوتا۔ ایک ماں باپ کی اولاد میں یہ فرق کیسا ہے اندھیرے اجالے کا فرق!۔

پھر کامران کو بھی رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا۔ ماں باپ اور بہن کی شفقت اُنہیں دوسروں کے لئے قابلِ نفرت بنا رہی ہے، وہ گھر سے دُور دُور رہنے لگے۔

جویریہ نے ایک نگاہ اپنی ماں پر ڈالی اور پھر ماضی کے اوراق سجانے لگی۔

بہت دنوں پہلے گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ نانا ابّا سخت ترین قہر و غضب کے عالم میں اپنا پستول نکال لائے تھے۔ وہ کامران کی زندگی مٹا دینے پر تُل گئے تھے۔ نانی اماں کو غش آ گیا تھا۔ سلطان عرفان وغیرہ کو خوب موقعہ ملا تھا۔ دل کا بخار نکال رہے تھے۔ رفعت جہاں باپ کے پاؤں پکڑے گڑگڑا رہی تھیں۔ کامران کی بس یہی ایک خطا تھی کہ انھوں نے کسی سے پوچھے بغیر اپنے ادنیٰ ترین مزارع کی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا۔ کو ٹھی [illegible] ذات پات حسب نسب اور میاں بیوی کے اُصول بڑے سخت بد تھے۔ اتنے کڑے کہ بات بات پر گولیاں سینوں کو چھلنی کر تیں اور بے گناہوں کے خون سے زمین کی پیاس بجھتی۔ نانا ابا کا غیظ و غضب طوفان کی طرح بڑھتا گیا۔ ہم چشموں میں عزت گئی۔ برابر والوں نے یوں پوچھ گچھ کی جیسے دل ہی دل میں ہنس رہے ہوں نقصان ہا کے ساتھ ساتھ شماتتِ ہمسایہ کی جلتی تیز تھی نانا ابا مرحوم جو اپنے جوان بیٹے کے سینے پر گولی نہ چلا سکے۔

اپنی بوڑھی کنپٹی پر پستول رکھ کر ٹریگر دبا دیا!۔

ایک لرزہ خیز دھماکہ سا اُسی کے ذہن میں گونج اٹھا۔

خدا کی پناہ۔ کتنے رقّت انگیز لہجے میں امّی نے یہ ساری کہانی کہی تھی کہ اُس کے بھی آنسو نکل آئے تھے ایک پشت یوں ختم ہوئی۔ نانا ابّا کے بعد نانی اماں کی رہی سہی آن بان ہڈیوں کے پنجرے میں قید ہو کر رہ گئی۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے اپنے بیٹے کو یاد کرتی تھیں۔ آنسو بہاتے بہاتے آنکھیں گنوائیں۔ دل و دماغ برباد کر لئے!۔ بھائی برگشتہ تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ کامران کی شکل بھی دیکھیں۔ اُن کا اپنے گھر پر آنا بھلا کیوں کر گوارہ کرتے۔ ایک مرتبہ نانی اماں سب سے چُرا چھپا کر اپنی تحصیل پر گئی تھیں۔ وہاں انھوں نے کامران کا جو حال دیکھا۔ بس دل پر آرے چل گئے مخمل کا پاسی، دیبا و کمخواب پر سونے والا جس کی حلق میں سونے کے نوالے اٹکتے تھے وہ کاہنی بہرے پر ہاتھ کا سرہانا بنائے لیٹا تھا!۔ پاس ہی ایک المونیم کے تھال میں اُبلے چاول اور آم کا اچار تھا۔ جسے دیکھ کر بھوک بھاگے۔۔۔ چوکیدار جو فصل کی نگرانی پر متعین تھا وہ کھیت کی حد سے بھاگا آیا اور صاحبزادے کامران کو اُن کی ماں کے آنے کی خبر دی۔ کامران جلدی سے اٹھے اور دونوں ہاتھوں سے لباس درست کرتے ہوئے دوڑے۔

نے شکر کے گٹھوں کے پاس ماں بیٹے ملے۔ اس طرح کہ انھیں دیکھ کر بڑی بیگم ساکت و صامت کھڑی رہ گئیں۔ تو ماں کو دیکھ کر بیٹے کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ چوکیدار جو پیچھے پیچھے دوڑا آیا تھا۔ وہ بھاگ نکلا۔

نواب کامران کے دل میں ہلچل مچی تھی۔ چہرے پہ رنگ اور آنکھیں ماں کے قدموں پر تھیں۔ جہاں اُن کی نفرو جنت تھی! مگر جیسے دروازے آہستہ آہستہ اُن پر بند

ہو رہے تھے ۔

بیگم کے لب مرتعش تھے ۔ حلق میں آنسوؤں کا پھندہ پڑا جا رہا تھا ۔ بڑی مشکل سے وہ خود کو سنبھال سکیں ۔

" کمّو ! " انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا ۔

بہت دنوں سے کامران کے کان ترس رہے تھے ۔ اب جیسے امرت رس برس گیا ۔ تمام آداب و مراتب بھول کر چھپٹے اور اپنی ماں کے سینے سے لگ گئے ۔

" امی جان ! "

" تجھے مجھ پر ترس نہیں آیا " ان کے گرد بازو کامران کے اطراف بندھ گئے " یہ کیا حالت بنا رکھی ہے ناشاد ۔ اگر میرے پاس چلا آتا تو کسی کی مجال تھی کہ تجھ پر انگلیاں اٹھاتا ۔

" امی جان " وہ ڈھیلے ڈھالے انداز سے ایک پتھر پر جا بیٹھے ۔ اسی طرح کے سر جھکا ہوا تھا اور نظریں فرش پر تھیں " میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ذات آپ کے دکھ کا باعث بنے ۔ آپ مجھے بھول جائیے ۔ اور اپنے بیٹوں سے دل بہلائیے ۔ سمجھئے کہ آپ کے تین ہی بیٹے تھے ۔ جو تھا مر چکا ! "

" کامران ! " وہ سخت لہجے میں بولیں " میرے جیتے جی کامران نہیں مر سکتا ۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلو گے " ڈرائیور کار کی گدی نکال لایا تھا وہ املی کی گھنی چھاؤں تلے بیٹھ گئیں ۔

" کیا فائدہ ۔ امی جان " وہ غمزدہ لہجے میں بولے " میں اُن سب میں زیادہ خوش نہیں رہ سکتا ۔ میں آپ سے کیسے کہوں کہ مجھے اپنے بھائیوں سے کتنی محبت ہے ۔ لیکن پتہ نہیں وہ سب کیوں میرے درپے آزار رہتے ہیں ۔ اب اپنی اور اُن کی یکسوئی کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ میں سب سے الگ رہوں ۔ آپ یہاں کی فضا دیکھتی ہیں ۔ یہ اونچے اونچے درخت ، یہ مخملی سبزہ ۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب کھیت جھرنوں کا بہتا ہوا میٹھا اور صاف پانی ، میرے یہ بے زبان ساتھی یہ جانور ۔ اور ایک اور ہستی ۔ جو مجھ سے وابستہ ہو چکی ہے ان سب میں رہ کر مجھے کہیں زیادہ آرام ملتا ہے ۔ بہ نسبت اُس فلک بوس محل کے ۔ جہاں ہر طرح کا آرام اور عیش نصیب ہے ، مگر دل کا سکون عنقا ہے ۔ میں یہیں اچھا ہوں ، امی جان میری آپ سے التجا ہے کہ مجھے یہیں چھوڑ دیجئے ۔ "

" میں یہ سب کیسے دیکھوں ۔ کیسے دیکھوں میرے لال ۔ کہ تیرے بدن پر گاڑھے کے کپڑے ہیں ۔ پاؤں میں لکڑی کے کھڑاؤں ۔ جو تمہارے ملازم بھی نہیں پہنتے ۔ تم روکھی سوکھی کھاتے ہو ۔ بستر پر سوتے ہو ۔ یہ سب کس کے لئے ہے ۔ اُس لڑکی کے لئے جسے تم نے متعہ کر کے گھر میں ڈال لیا ہے ؟ "

" کسی نے آپ تک بڑی غلط خبریں پہونچائی ہیں " کامران کا چہرہ تمتمانے لگا " میں نے دلبتیاں کو متعہ نہیں کیا ۔ باقاعدہ نکاح کیا ہے ! "

" مگر ہے تو وہ ایک ادنیٰ گماشتہ کی لڑکی "

" محل سے نکلنے کے بعد مجھے کسی اور محل کی نواب زادی کہاں سے مل سکے گی ۔ امی جان ! "

" تو پھر واپس چلو ۔ ہزاروں نواب زادیاں تمہیں مل جائیں گی "

" اُس کی خاطر مجھے کب تک اپنا جگر چھلنی کرنا پڑے گا ۔ بھائی صاحب کے طعنے ، بھائی جان کی ڈانٹ ڈپٹ فرحان کی گستاخی ۔ اور رفعت کی دل آزاری ۔ میری خاطر ۔ آخر یہ سب میں کیوں برداشت کروں ۔ اب تو میرا جینا حرام ہو جائے گا ۔ ابا حضور کی موت کا ذمہ دار سب مجھی کو ٹھہرائیں گے ۔ نہیں نہیں امی جان ۔ میں خود بھی وہاں جانا نہیں چاہتا ! "

" تمھاری یاد مجھے چین نہیں لینے دیتی ۔ کمو ۔ " بڑی بیگم رونے لگیں !

" مجھے بھول جائیے امی جان ! "

بڑی دیر بعد وہ سنبھلیں ۔ کامران چپ چاپ بیٹھے رہے پھر انھوں نے دلبتیاں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ۔ کامران ، بیگم کو اپنے ساتھ لے گئے ۔

لال مٹی کے تودوں سے بنا ہوا گھر تھا ۔ صاف ستھرا لپا پتا ۔ ایک طرف کونے میں غلے کی کوٹھیاں تھیں ۔ دوسری طرف صاف ستھرا چولھا ۔ بالٹی میں دودھ بھرا رکھا تھا ! وسط میں دری چاندنی کا فرش تھا ۔ دروازے پر ایک دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی ! نیلے کنارے کی ساڑی باندھے گہرا نیلا بلاؤز پہنے

پاؤں میں جھانجھن۔ کلائیوں میں لال لال چوڑیاں، مانگ میں سیندور چمک رہا تھا!۔ بڑی بیگم نے ایک نظر میں پہچان لیا۔ وہی ریشماں تھی!

"میری ماں!۔" کامران نے چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی کہا تھا!

ریشماں اپنی جگہ سے مڑی اور دودھ کی بالٹی اٹھا لائی، پھر اس نے کچھ کہے سنے بغیر دودھ سے اپنی ساس کے قدم دھوئے! اور قدم چومے پھر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی!۔

بڑی بیگم کا غصہ محبت کے اُبال میں گم ہو گیا!۔ کیسی پیاری لڑکی تھی!۔ صندلی رنگت۔ سیاہ آنکھیں گھنی گھنی پلکیں، کھنچے ہوئے لب، معصوم اور پاکیزہ انداز۔ بے اختیار انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنے سینے سے لگا لیا!۔

نواب کامران مسکرانے لگے!۔

کیسا وقت ہے کہ مجھے اپنے چھوٹوں سے ڈرنا پڑتا ہے۔

"وہ بولیں"! اگر کسی کا خیال نہ ہوتا تو میں اپنے بیٹے بہو کو اپنے گھر لے جاتی!۔ اللہ... میں کیسی بدنصیب جلی ہوں!۔"

وہ دیر تک اپنے بیٹے کے گھر میں رہی تھیں۔ ریشماں بھی گھل مل گئی۔ اس نے مکئی کی موٹی موٹی روٹیوں اور تازہ مکھن سے اپنی معزز و محترم ساس کی ضیافت کی تھی! وہ کھا پی کر آرام سے لیٹیں تو اُن کے پاؤں دابنے بیٹھ گئی۔ انھوں نے منع کیا تو وہ اپنی میٹھی، اور جانگداز آواز میں بولی تھی۔

"نہ اماں۔ ہم نہیں جانت ہیں کہ ماں کا چیز ہووت ہے۔ ہم پیدائشی بدنصیب ہیں۔ آپ کی پاک صاف ذات میں ہم کا اپنی ماں کی صورت نظر آوے ہے۔ اگر وہ جیتی ہوتی تو بالکل آپ کی ہوتی۔ ہم کا سینے سے لگاتی۔ ہم اُوکے پیر دودھ سے دُھلاتے۔ اُوکی خدمت کرتے۔ کیا ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ آپ کے پیرن پر اپنے ہاتھ رکھے کے قابل نہیں!۔"

نہیں، میری بیٹی۔ تو تو اس قابل ہے کہ میرے سینے سے لگی رہے!۔ پھر وہ بھی روئیں تھیں اور ریشماں بھی روئی تھی چلتے چلتے بڑی بیگم نے اپنے بیٹے بہو کو خوب گلے لگا لگا کر بھینچ بھینچ کر پیار کئے تھے اور اپنے گلے سے سچے موتیوں کا ہار نکال کر ریشماں کو پہنا دیا تھا!۔ ایک درد ایک کسک، اور ایک اچھوتی تڑپ لئے وہ وہاں سے واپس آئی تھیں۔

پھر وہی گھٹا ہوا ماحول تھا پھر وہی زہر آلود سانسوں کا غبارہ یہاں کون تھا۔ جو اُن کی خدمت سچے دل سے کرتا تھا!۔ بیٹے جبر یہ حکم مانتے تھے۔ کہ باپ کا چھوڑا ہوا سارا سرمایہ ابھی تک بیگم ہی کا تھا! بہوئیں شوہر کے نقش قدم پر چلتی تھیں، پل پل کی مکاری۔ لمحہ لمحہ کی بناوٹ، قدم قدم پر جھوٹ اور منافقت۔

اب تو بڑی بیگم سب سے متنفر تھیں۔ انہیں اپنا کامران اور ریشماں یاد آتے تھے!۔ اپنے آپ گھلتے گھلتے وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھیں۔ پھر اس کے بعد سے اُنہیں کامران سے ملنے جانا نصیب نہ ہو سکا!۔ بس ان کی یاد تھی کہ زندگی کو سہارا دے جاتی تھی۔

ایک دن دفعتہً ایک گماشتہ خبر لایا کہ۔ صاحبزادے کامران سانپ کے ڈسنے سے ختم ہو گئے!۔ بڑی بیگم یہ خبر سنتے ہی بیہوش ہو گئیں۔

عرصے سے ماں نے بیٹے کا منہ نہیں دیکھا تھا! زندگی نوحہ بن کر رہ گئی۔ بھائیوں نے بھی مگرمچھ کے آنسو بہائے۔ بیگم کو کامران کا غم کھائے جاتا تھا! ماہی بے آب ہو رہی تھیں۔ انہیں ریشماں کی یاد بھی ستاتی تھی۔ جب وہ ان سے ملی تھی تب ماں بننے والی تھی پتہ نہیں۔ اُس نے کیا جنم دیا۔ چاند سا بیٹا یا پھولوں سی بٹیا!:

اب وہ کہاں ہے۔ کیا کر رہی ہے۔ کچھ پتہ نہیں!۔

ارے کوئی اُس کی بیوی کی خبر مجھے لا دے!۔" ایک دن وہ مضطرب ہو کر بولیں۔ "امی جان تو پاگل ہو گئی ہیں!۔" عرفان نے کہا تھا!۔" بد گوشت جسم سے خود بخود الگ ہو جائے تو اچھا۔ اب اُنہیں اس بدبخت لونڈے کی داشتہ کی یاد ستا رہی ہے لاحول ولا قوۃ!۔"

رفعت جہاں کی حالت تباہ تھی! ساری ساری رات اُس کمرے میں بیٹھی روتی تھیں۔ جو کبھی کامران کا تھا!۔ اُن کی تصویر سینے سے لگاتیں اور آہ و فغاں کرتیں۔

"بھیا۔ کیسے گئے کہ پلٹ کے نہ دیکھا۔ ہائے تم جوانمرگ ہوئے۔ کیونکر تمہیں سانپ نے ڈس لیا۔ کیا کہتا ہو گا تمھارا دل۔ بھیا۔ تم تڑپے ہو گے۔ تم مچلے ہو گے۔ تم پر نزع کا عالم طاری ہوا ہو گا۔ کون ہو گا اُس وقت تمھارے پاس۔ بھیا

تمہیں ہم سب کی یاد آتی ہوگی۔ آہ۔ پھر تم نے اپنے ظالم و نامہربان بھائیوں کی دید کی حسرت ہی میں دم توڑ دیا ہوگا۔ بھیا۔ بھیا!"

"وقت تمہارا غم بھلا دے گا۔ رفعت خدارا دل مضبوط کرو۔!" نواب صاحب سمجھاتے تھے۔ وہ بھی بہت افسردہ ہو رہے تھے اور سچ ہے وقت کے مرہم نے سب کے غم کے زخموں پر کھرنڈ جما دیئے!۔ بڑی بیگم پھر اپنی پچھلی حالت پر لوٹ گئیں۔ وہی دم خم تھے۔ وہی رعب و دبدبہ تھا! وہی حکومت تھی۔ کے بہترے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے تھے!۔

"بیٹی۔ نہا دھو کر کپڑے بدل ڈالو۔ اور اپنی ماں سے کہہ کے رات کے کھانے میں دو چار چیزیں زائد تیار کرا دیں۔ پتہ نہیں میرا بچہ کب واپس آجائے!۔" بڑی بیگم نے جویریہ سے کہا۔ فرط انبساط سے اُن کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔

"نانی اماں۔ آپ نے تو انہیں کبھی دیکھا نہیں۔ پہچانیئے گا کیسے!؟" جویریہ نے اُن پر ترس کھا کر پوچھا۔ "بیٹی میرا خون ہے۔ کیسے نہ پہچانوں گی۔" وہ ہنسنے لگیں۔ جویریہ بھی اُن کے ساتھ ہنسنے لگی۔ بیچاری نانی اماں۔ پھر وہاں ہمایوں آگیا، اس کے ساتھ نواب صاحب اور رفعت جہاں بھی تھے۔

"جول۔ کافی!۔" ہمایوں نے کہا۔ سلطان صاحب کا بڑا لڑکا تھا، کوئی جھلک اس میں اپنے مرحوم چچا کی تھی کہ بیگم اپنے سب پوتے پوتیوں سے بڑھ کر اُسے چاہتی تھیں۔ وہ بھی اُن پر جان چھڑکتا تھا۔ آتشدان کی طرف ہاتھ بڑھا کر وہ اپنی دادی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

ملازم کافی لے آئے۔

بارش دھرتی کی پیاس بجھا چکی تھی۔ بھیگی بھیگی بوجھل ہوائیں درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھیں، کمرے کا ماحول مدہوش کن تھا۔ دفعتہً ملازم نے کسی کی آمد کی خبر سنائی۔ اور ہمایوں باہر جھپٹا۔

جویریہ کے ہاتھ میں پیالی تھرتھرا گئی۔ بڑی بیگم چلنے پھرنے سے کسی حد تک معذور تھیں۔ مگر اب صبر نہ کر سکیں دیوار و دیوار کا سہارا لیتی ڈیوڑھی تک آگئیں۔ اُن کی منتظر و مشتاق آنکھوں نے دیکھا کہ ہمایوں کے ساتھ کوئی آرہا ہے ہو بہو۔ میرا کامران ہے!۔" بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا اور وہ باہیں پھیلا کر اُس کی طرف بڑھیں۔

"ماں!" اُسی بے اختیاری سے آنے والے کے منہ سے نکلا اور وہ بھی اُن کی کھلی باہوں میں سما گیا بڑی بیگم نہ جانے کیا کچھ یاد کر کے آنسو بہا رہی تھیں مگر وہ تو بے وجہ ہی رونے لگا تھا۔

خوشی کے موقع پر آپ رو رہی ہیں۔ دادی امّاں!" ہمایوں نے کہا۔ اور ہنس کر اپنی آنکھیں مل ڈالیں۔

دونوں آنسو پونچھتے ہوئے جدا ہوئے۔ وہ اپنی دادی کو سنبھال کر کمرے میں لے آیا۔ جویریہ پسندیدگی کی نظروں سے نووارد کو دیکھ رہی تھی۔ ہمایوں کھلا پڑ رہا تھا۔

نواب صاحب اور رفعت جہاں کی خوشی میں نظر لگی جا رہی تھی۔ مگر بڑی بیگم ندامت سے گڑی جا رہی تھیں۔ ابھی تک سلطان مرزا اور فرحان نہیں آئے تھے۔ بالآخر انھوں نے پوچھ ہی لیا۔

ہمایوں۔ تمہارے باپ اور چچا نہیں آئے۔ بیٹا؟!"

جی۔ دیکھئے۔ پتہ نہیں۔ اچھا۔ میں ابھی دیکھتا ہوں!" ہمایوں کو بھی احساس ہوا۔ وہ باپ کے کمرے میں پہونچا اور اُسے یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ سلطان صاحب غصے میں بھرے بیٹھے ہیں!۔

"ناہنجار آخرکار پہونچ ہی گیا۔" انھوں نے کہا۔

"ابّا جان۔ اگر وہ پہونچ گئے تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہوا؟" ہمایوں نے پوچھا۔

وہ مردود اپنے باپ کا ترکہ طلب کرے گا،" سلطان صاحب بدستور طیش بھرے لہجے میں بولے۔

اچھا خیر! فی الحال تو آپ چلیئے۔ دادی اماں طلب کر رہی تھیں۔" ہمایوں نے کہا اور پھر اپنے چچا کے پاس پہونچا۔ ان کا بھی کم و بیش وہی حال تھا۔ ساری جان سے لرز رہے تھے

"ناخلف" بدذات۔ کمینہ!" عرفان صاحب کے منہ سے جھاگ اُڑ رہا تھا۔

چچا جان میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ بیچارہ اتنے عتاب کا مستحق کیوں گردانا جارہا ہے!" ہمایوں نے حیرت و افسوس سے پوچھا۔ "ابھی ابھی تو وہ غریب آیا ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ مہر و محبت سے پیش آئیں۔ کیا خطا کی ہے اس بدنصیب نے!۔"

"تم کیا سمجھو گے۔ کل کے بچے ہو!۔" عرفان صاحب بولے۔ مگر ہمایوں کے ساتھ چلے گئے۔

کمرے میں سلطان صاحب اور فرحان بھی تھے، "بہت خلوص" سے پیش آئے۔ لیکن اُن کا خلوص جیسا بھی تھا اُسے بڑی بیگم نے صاف محسوس کرلیا۔ کوتبی پر منڈھی ہوئی شکر۔ ہمایوں کو بہت تعجب ہوا۔ یہ کیسے چچا ہیں۔ جنھیں اپنے بھتیجے کی آمد کی اتنی سی بھی خوشی نہیں کہ پُرخلوص مبارکباد ہی دے دیا!۔ حالانکہ وہ خود بہت خوش تھا!۔

پھر رسمی سی گفتگو کے بعد تینوں چلے گئے تو یکبارگی حارث بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اب مجھے بھی اجازت دیجئے۔ دادی جان!۔"

اجازت؟" وہ متعجب دکھائی دیں۔ "کس بات کی اجازت؟"

جی۔ بس۔ اب جاؤں گا۔" حارث نے کہا اور جھک کر دادی اماں کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

نہیں بیٹا۔ نہیں!۔" انھوں نے اس کی کلائی تھام لی۔ "میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی، تم سے جُدائی کامران سے جُدائی ہے۔ جب تک میری زندگی کی سانسوں کا تانا بانا باقی ہے۔ مجھے چھوڑ کر کہیں جانے کا ارادہ بھی نہ کرنا!۔ اس دن کیلئے تو میں نے دن گنے تھے میرے بیٹے!۔"

اور کیا؟" ہمایوں ہنسنے لگا۔ "آپ کے آنے کے بعد اب آپ کی جدائی بڑی گراں گزرے گی!"

اچھا" وہ دلفریب انداز میں ہنسنے لگا!۔ اور اس کے بھرے بھرے گالوں میں دو خوبصورت سے گڑھے پڑ گئے۔ پھر ہمایوں نے جویریہ کا تعارف کرایا۔ جو دور گوشے میں بیٹھی تھی۔ یکبارگی سرخ ہوگئی۔

"پھوپھی اماں کی صاحبزادی مس جویریہ افتخار الزماں!"

آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی!" وہ مسکرایا۔

"اردو میں مسرت ہوئی؟" ہمایوں نے آنکھیں نکالیں۔

"ڈلائٹیڈ مس جویریہ!" وہ احتراماً جھکا۔ اور دادی اماں ہنس پڑیں اس کے احترام میں کہیں تمسخر پنہاں دیکھ کر جویریہ جز بز ہونے لگی۔ ہمایوں اُسے اپنے کمرے میں لے کر چلا گیا۔

اپنوں میں پہونچ جانے کی خوشی میں وہ پاگل ہوا جارہا تھا۔ جب تک کسی کو جانتا نہیں تھا۔ اپنی تنہائی پر قانع تھا۔ مگر اب یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کبھی اکیلا نہیں رہا تھا!۔ کتنا بے پناہ پیار تھا۔ دادی اماں کے انداز میں کتنی شفقت تھی۔ پھوپھی جان اور پھوپھا ابا کی باتوں میں۔ بے پایاں۔ خلوص تھا۔ ہمایوں کی ہر گفتگو میں..... وہ رہ رہ کر مسکرا دیتا۔

نجانے بڑی بیگم کا ہولناک قسم کا خیال تھا یا کوئی اور احساس کسی نے بھی حارث کے کوٹھی میں رہنے پر اعتراض نہیں کیا۔ سب اپنے کام سے کام رکھتے۔ معظم نے تو اول روز سے بے رُخی اختیار کرلی تھی۔ بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ حارث کے سامنے احساس کمتری کو اس نے غرور و تکبّر میں چھپا دیا۔ جویریہ اپنے آپ کو سمیٹے رہتی۔ یوں بھی اُسے اپنے حسن اور دولت اور اکلوتے پن کی اہمیت کا احساس بہت زیادہ تھا۔ ایک ہمایوں تھا!۔ اکیلا دوست و غمگسار۔ ہر وقت ہر جگہ حارث کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتا۔ اور امکان بھر کوشش کرتا کہ دوسروں کی بے مہری کا اُسے احساس نہ ہو۔

اپنے دوسرے چچا اور تایا کی بے رُخی کو حارث اُن کی فطرت سمجھ کر ٹال گیا تھا۔ اُسے اپنوں کی محبت ملی تھی۔ وہ نہال تھا۔ ہمایوں نے اس کی شخصیت کے متعدد پہلو دیکھے تھے۔ بہت دلچسپ آدمی تھا۔ بے شمار ڈگریاں رکھتا تھا۔ مگر غرور و نخوت سے کوسوں دور۔ یوں سادگی سے مسکراتا جیسے اعزاز و علمیت اُس کیلئے کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔

بڑی بیگم کو اپنی خوشیوں کے اظہار کا اچھا موقع ملا تھا۔ بہت اعلیٰ پیمانے پر جشن کا اہتمام کر رہی تھی۔ سلطان ماں کی اس فضول خرچی پر اکیلے میں بہت تپے تھے!

"یعنی ذات ہو بس اتنی ہی بات کرنی چاہیئے؟"

کسی کی ذات کی بات کر رہے ہو" نواب صاحب نے برہمی سے کہا تھا!۔" کیا کسی کا سلسلہ براہ راست

حضرت آدم سے بھی جا ملتا ہے۔ یوں ہم سب ایک ہیں ....
کوئی لاکھ اپنا ہو مگر اُس سے رشتہ تو نہیں ہو سکتا!۔"
عرفان نے کہا۔

"اگر تم چیلنج کرتے ہو تو میں اسی خاندان میں رشتہ کر کے بھی دکھا سکتا ہوں!۔" نواب صاحب نے خم ٹھونک کر لڑ مرنے کے انداز سے کہا۔ ویسے وہ تھے بھی بڑے صاف گو اور دلیر۔ عرفان صاحب سے بات نکال کر پچھتائے۔ کیا معلوم یہ جنگجو اپنی دُھن میں جوہر یہ کو حارث سے بیاہ دے تو معظم یونہی رہ جائے اور لاکھوں کی جائیداد مفت میں ہاتھ سے چلی جائے!

"خدا کیلئے کوئی جھگڑا نہ کھڑا کر دیجئے گا چھوٹے بھیا!۔" رفعت جہاں گھبرا کر بولیں۔ "پتہ نہیں۔ آپ لوگ بات کرتے کرتے لڑنے کیوں لگتے ہیں!۔"

"حارث کھٹکتا ہے آنکھوں میں!۔" نواب صاحب خونخوار لہجے میں بولے "ارے۔ تم میں سے کسی کا لڑکا اس کی جوتیوں کی برابری تو کر لے!۔"

"پھر وہی!۔" اب کی رفعت جہاں چیخیں۔

نواب صاحب کمرے سے چلے گئے۔ رفعت جہاں بھائیوں کو منانے لگیں۔

"آپ اُن کی عادت کو جانتے ہیں۔ خواہ مخواہ اُن کو چھیڑ کر مجھے کڑوی کسیلی سنواتے ہیں"

"تمھارے ہی خیال سے خاموش رہتے ہیں۔ رفعت!۔" سلطان صاحب غرا کر بولے۔ "ورنہ مزہ چکھا دیتے"

"بھائی صاحب۔ اب بس کیجئے!۔" عرفان نے کہا۔ سلطان پیچ و تاب کھا رہے تھے مگر چپ ہو گئے۔

رفعت اپنے کمرے میں گئیں تو نواب صاحب برس پڑے۔

"بیگم! تم نے اپنے جاہل ماں جائے بھائیوں کی باتیں سنیں۔ اگر جولی۔ معظم کی منگیتر نہ ہوتی اور مجھے اپنی زبان کا پاس نہ ہوتا تو خدا کی قسم، میں ابھی اور اسی وقت حارث کا نکاح جولی سے کر کے دکھا دیتا کہ اس طرح ہوتا ہے رشتہ!۔ اور ثابت کر دیتا کہ خون اور پانی اونچ اور نیچ کے تمام مہمل اعتبارات ہمارے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ جنہیں ہم جب چاہیں توڑ بھی سکتے ہیں!۔"

"ہاں ہاں اور کیا۔" وہ شوہر کی تائید میں بولیں۔ "لیکن آپ اُن کے منہ نہ لگا کیجئے۔ اتنے روشن خیال وہ نہیں ہیں جتنے آپ ہیں۔ امی جان کی خواہش ہر حال میں پوری ہو گی۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولے۔ "جشن کا اہتمام میں کروں گا۔ دیکھوں گا کون میرا کیا بگاڑ لیتا ہے!۔"

حارث کو پتہ چلا تو وہ خوش بھی ہوا اور شرمایا بھی۔

"میری آمد کون سی اہم ہے۔ جس کا جشن کیا جائے! پھوپھی جان۔" وہ ہنسنے لگا۔ "سینکڑوں لوگ روز آتے ہیں جاتے ہیں!"

"بات یہ ہے نا کہ تم بہت دنوں بعد آئے ہو۔" ہمایوں بولا۔

"اور جلد ہی چلا بھی جاؤں گا۔ پھر کا ہے کا جشن!۔" حارث نے کہا۔

"کیوں چلے جاؤ گے اتنی جلدی؟۔"

"یہاں تو بیکار پڑا رہتا ہوں۔ وہاں جاؤں گا تو کوئی اچھی سی ملازمت تلاش کروں گا!۔"

"ہشت۔ پاگل۔ ہمارے خاندان کے لوگ ملازمت نہیں کرتے!۔"

"آسمان سے من و سلویٰ اترتا ہے ایسے لوگوں کے لئے!۔"

"پشتینی جائیداد ہے۔ گھر بیٹھے کھاتے ہیں۔ موج اڑاتے ہیں۔ اور اسی فکر میں دُبلے ہوئے جاتے ہیں کہ کب یہ جائیداد ختم ہو اور لنگوٹی لگے!۔"

"فضول بکواس کر رہے ہو۔ ہمایوں!" نواب صاحب نے ڈانٹا۔ "بہتر ہو کہ بیٹھ کے مہمانوں کی فہرست بنا لو"

"جی بہت اچھا۔" وہ حکم کی تعمیل میں کاغذ قلم لے کے بیٹھ گیا اور لمبے چوڑے کاغذ پر لمحوں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد نواب صاحب نے کڑک کر پوچھا۔

"بنالی فہرست!"

"یس سر!۔"

"لاؤ۔ دکھاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ ابھی رقعے چھپنے بھجوا دوں!"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔"

ہمایوں نے فہرست انھیں تھما دی اور کمرے سے نکل

بھاگا۔ نواب صاحب نے کاغذ پر نظر ڈالی... اور غصے اور پیار کے ملے جلے انداز میں زیرِ لب مسکرائے۔ کاغذ پر بسم اللہ کے بعد صرف ایک نام لکھا ہوا تھا۔ زرینہ بیگم۔

"تم نے دیکھی اس کی حماقت" وہ بڑبڑائے

"لکھ لی فہرست؟" رفعت جہاں نے پوچھا۔ اور جواب میں نواب صاحب نے کاغذ انہیں تھما دیا۔ وہ ہنس پڑیں...

"آپ سے بھی مذاق کیا۔ شیطان نے!... فقط اپنی منگیتر کا نام لکھا ہے اُس نے۔!"

"اوہو!" حارث ہنس پڑا۔ "یہ بات ہے۔

بڑی اچھی لڑکی ہے۔ تم جشن میں ملو گے اُس سے۔ ہمایوں کے افسر کی لڑکی ہے۔" رفعت بولیں۔ چھ مہینے پہلے منگنی ہوئی تھی۔ ارادہ ہے کہ جلد ہی شادی بھی کر دیں۔

"بڑی خوشی ہوئی اس خبر سے پھوپھی جان!"

وہ ہمایوں سے ملا اور گرمجوشی سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

جشن کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ کوٹھی میں بے موسم بہار آئی تھی۔ بے موقع عید کا چاند نکلا تھا۔ ہر وقت چہل پہل رہتی۔ اور حارث سوتے جاگتے اپنی آنکھوں میں ان گنت خواب سجائے جویریہ کی حسین ذات میں ان کی تعبیریں ڈھونڈنے لگا۔ وہ اُسے بہت پسند آئی تھی۔ اب تک جتنی لڑکیاں اس کی نظروں سے گزری تھیں۔ وہ اُن سب سے مختلف تھی۔ سنجیدہ۔ پُروقار اور خاموشی کا مجسمہ۔ چپکے چپکے وہ اُسے چاہنے لگا۔

جویریہ اپنے حسن سے آگاہ تھی۔ وہ غیر متوقع طور پر متمنی رہتی تھی۔ حارث اُس کے قدموں پر سر جھکائے اس کی ناز برداری کرے۔ اُس کے آگے پیچھے پھرتا رہے۔ اس کے التفات کا متلاشی ہو۔ اور چشم و ابرو کے اشاروں میں اپنی راحتیں تلاش کرے۔ مگر نجانے وہ کس مٹی کا بنا تھا۔ بھولے سے بھی اظہار نہیں کیا کہ وہ اُسے قابلِ توجہ سمجھتا تھا۔

اس کے اس سلوک نے جویریہ کو چراغ پا کر دیا۔ آخر وہ خود کو کیا سمجھتا ہے۔ اُسے جھکانے کی تمنا اُس کے دل میں کروٹیں بدلنے لگیں۔ کوئی تفریح ہو۔ کوئی کھیل ہو معظم کی ہم نشینی میں کوئی دقیقہ حارث کی دل آزاری کا اٹھا نہ رکھتی۔

رفعت جہاں بیٹی کی اس دیدہ دلیری پر ششدر تھیں وہ ایسی منہ پھٹ تو نہیں تھی۔

"بیٹی۔ آخر تمہیں کیا ہوا ہے۔ میں حیران ہوں۔ تم حارث کو کیا سمجھتی ہو۔ وہ تمہاری پٹی تلے پیدا ہوا ہے یا تمہارے ساتھ کا کھیلا ہوا ہے۔ ہر وقت کا مذاق مردوں سے اچھا نہیں ہوتا... معظم چاہے کچھ بھی کرے تمہیں اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔"

"آپ کیا سمجھتی ہیں حارث کو۔ وہ کوئی لاٹ گورنر ہیں۔ میں کیوں ان کا ادب کروں؟"

"ہوش کے ناخن لو۔ جویریہ۔ اگر آئندہ تمہاری کسی حرکت سے حارث کا دل دُکھا تو اچھا نہ ہوگا۔"

حارث اپنی پھوپھی کے دل میں بستا تھا۔ جتنا وقت ہمایوں سے بچتا وہ پھوپھی کی نذر کر دیتا۔ وہ جویریہ کی ماں تھی۔ پھر اسے اُن سے محبت کیوں نہ ہوتی۔ ان کے بے پایاں خلوص کو دیکھ کر ایک دن اس نے پوچھ لیا۔

"پھوپھی جان۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جب آپ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں تو پھر آپ نے اتنی مدت تک کیلئے مجھے اپنے سے جدا کرنا کیسے گوارہ کر لیا؟ کیا ماں باپ کے مرنے کے بعد میں اس قدر نفرت کے قابل ہو گیا تھا!"

دفعتہً رفعت جہاں کے ذہن میں پستول کا دھماکہ گونج اٹھا وہ کچھ بول ہی نہ سکیں۔

"بتایئے نا۔ پھوپھی جان!" اُس نے اُن کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور ماں تا بھرے سینے پر سر رکھ دیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں سے کوئی بھی اتنی دُور تعلیم حاصل کرنے نہیں گیا۔ پھر آپ نے مجھی کو کیوں بھجوا دیا۔ کیا میں بہت شریر تھا۔ یا کوئی اور بات تھی؟"

"تم امی جان کے بہت دلارے تھے وہ چاہتی تھیں کہ تم سب سے زیادہ علم حاصل کرو۔" وہ اس کے گال سہلا کر پیار سے بولیں۔ "کیوں۔ کیا یہ اچھا نہیں ہوا؟"

"اچھا تو ہوا۔ مگر میں جیسے سب سے دور ہوا اور

اخلاقی طور سے بھی۔ مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ میں آدمیوں کے جنگل میں اکیلا ہوں .... علم میرے کیا کام آیا۔ اُلٹا نقصان ہوا کہ علم نے مجھے اوروں سے مختلف کر دیا ہے!۔ میں تو محبت کا پیاسا ہوں۔ پھوپھی جان۔ مجھے بےحد صدمہ ہوتا ہے۔ جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اسی قابل نہیں۔ کوئی مجھ سے محبت کرے۔!"

تمہیں کسی سے کیا مطلب؟ ہم تو ہیں تمہارے!،

ہاں۔ آپ تو ہیں!" اُس نے کہا اور انہی کی گودی میں سر ڈال کر لیٹ گیا۔

رفعت جہاں کی نظروں میں وہ چھوٹا سا بچہ پھرنے لگا۔ جب کامران اور ریشماں کے مرنے کے بعد بڑی بیگم کا ایک گماشتہ ننھے سے لڑکے کی انگلی پکڑے ڈیوڑھی پر آیا تھا۔

"بڑی سرکار۔ یہ صاحبزادے کامران کی نشانی ہے!"

اور بڑی بیگم زار و قطار رو رہی تھیں۔

"ہائے میرے بچے۔ ارے کوئی اُسے میرے پاس لائے کہاں ہے وہ۔ میرے کمو کا بچہ۔"

سلطان صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا۔ وہ دھاڑ رہے تھے"

دُور کرو۔ دفع کرو۔ اُس مردود کی نشانی۔ ہمارے سامنے ہے۔ جس نے خاندان بھر کی آبرو پر پانی پھیر دیا۔ جس نے ماں باپ کی عزت خاک میں ملا دی۔ اگر یہ لڑکا میری نظروں کے سامنے سے نہ ہٹایا گیا تو خدا کی قسم میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

"خدا سے ڈرو۔ سلطان۔ تمہارے بھائی کا بچہ ہے!" بڑی بیگم نے فریاد کی۔

"یہ ناگ ہے۔ امّی جان! کل یہ ہماری ہمسری کا دعویٰ کریگا سانپ کے بچے کا سر فوراً کچلنا چاہئے۔" وہ بھی برابر سے گرج رہے تھے۔ بڑی سرکار مجبور ہو گئی تھیں۔ انھوں نے بس ایک نظر اپنے مرحوم اور مجبور بیٹے پر ڈالی۔ اُن کی نگاہوں تلے کامران اور ریشماں کے چہرے پھرنے لگے۔ کامران پتھر پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ریشماں نے دودھ سے اُن کے پیر دھلائے تھے۔ اور اب۔ اُن کی روحیں بےچین و بیقرار زماں و مکاں کے خلا میں چکر اتی پھر رہی تھیں۔

ننھے حارث نے ایک رحم طلب نگاہ اپنی دادی پر ڈالی تھی وہ سمجھتا ہی نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ کہاں گئے اور وہ کس کے پاس لایا گیا تھا۔ وہ تو اپنی ماں کی یاد میں رو رہا تھا۔ انھوں نے اُسے گلے سے لگا لیا تھا۔

کامران کے دوست عبدالرحمٰن یورپ جا رہے تھے۔ انھوں نے حارث کو اُن کے سپرد کر دیا۔ وہ بے یار و مددگار بچے کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ دادی کی بےبسی، چچاؤں کی سنگدلی، اور خاندان والوں کی بےحسی کی داستانیں اُس سے پوشیدہ تھیں۔ انھوں نے قدم قدم پر اُسے سہارا دیا تھا۔ تسلّی دی تھی کہ دادی نے محض اعلیٰ تعلیم کے لئے اُسے اتنی دُور بھجوا دیا تھا۔ وہ ہر ماہ ایک معقول رقم نواب صاحب کے ذریعہ سے حارث کو بھجواتی تھیں۔ جس کا علم رفعت کے سوا اور کسی کو بھی نہیں تھا۔ اسی رقم میں رحمٰن صاحب کا معاوضہ بھی شامل تھا۔ بڑی وفاداری سے وہ حارث کی خبر گیری کرتے رہے تھے۔ اور پھر جب وہ ایک طویل عرصہ بعد وطن واپس ہوئے تو اُسے بھی اپنے ساتھ لیتے آئے۔ اب وہ پردیس میں کس کے پاس رہتا۔ ویسے وہ خود بھی اپنے عزیزوں سے ملنے کیلئے بےتاب تھا!۔

آپ کیا سوچنے لگیں!۔ پھوپھی جان؟" حارث نے پوچھا ایک ننھے بچے کی طرح اُن کی آغوش میں سر رکھے لیٹا وہ انہیں بڑا معصوم لگا!

"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ ـــ" اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تو وہ جوہریہ سے بولیں۔ "بیٹی۔ بھائی کے لئے کافی لے آؤ!" وہ بھناگئی۔ خواہ مخواہ امّی کی ممتا پھٹ پڑی ہے۔

"آپ کا دل نہ چاہتا ہو تو نہ بناؤں"

"آپ کی خاطر سے پی لوں گا!"۔ وہ پھر مسکرایا۔

جوہریہ غصے سے نہیں اُٹھی۔ ملازمہ کو آرڈر دے دیا وہ کافی لے آئے مگر امّی کے حکم پر جبراً و قہراً اُسے چائے بنانی ہی پڑی۔ جب وہ جلی بھنی سی کپ اس کے سامنے سرکا رہی تھی۔ حارث نے اسی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

جوہریہ دھک سے رہ گئی۔ یہ حارث کی پہلی جسارت تھی۔ اپنا ننھا سا نرم نرم ہاتھ حارث کے مضبوط ہاتھ میں دیکھ کر وہ یک لخت گلابی ہو گئی!۔

"معاف کیجیے گا۔ میں آپ کا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں!"

"کیوں!" اس کے لب کانپے۔ اور پلکیں رخساروں پر جھک گئیں۔

تھوڑی سی دل چسپی مجھے ہاتھ کی لکیروں سے ہے۔" وہ بولا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پہلو میں آ بیٹھا جویریہ کی سانسیں پھولنے لگیں۔ اس کا قرب کیسا ترغیب انگیز تھا۔ بڑی بدمست خوشبو اس کے لباس سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ یکبارگی گم صم سی ہو گئی اور ساری تیزی طراری ہوا ہو گئی۔

"آپ اِن خرافات پر بھی یقین رکھتے ہیں؟" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دو ایک واقعات ایسے ہوئے تھے۔ جن کی بنا پر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگلی پچھلی زندگی کا کچھ نہ کچھ تعلق ہمارے ہاتھ کی لکیروں سے ضرور وابستہ ہوتا ہے۔

"آپ بڑی اچھی اُردو بولتے ہیں۔" جویریہ محض اخلاقاً مسکرائی اُس کا ہاتھ ابھی تک حارث کے ہاتھ میں تھا!۔ اس کی ہر خفیف سی احتجاجی جنبش پر حارث کی گرفت مضبوط ہو جاتی!

"مغرب اُردو سے ناآشنا تو نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اور میں نے تو خاص طور پر انکل رحمٰن کے صاحبزادے ثوبان بھائی سے اُردو سیکھی تھی۔ یہ ہی تو میری مادری زبان ہے۔ اور پھر مجھے خیال تھا کہ بہرحال کبھی نہ کبھی تو مجھے آپ کی طرف لوٹ کر آنا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ معنی خیز طور پر مسکرایا اور جویریہ کے ہاتھ پر جھک گیا۔

"اچھا۔ پہلے چائے پی لو۔ پھر لکیریں دیکھنا!" رفعت جہاں نے ٹوکا۔

ذرا دیر بعد اُس نے پھر اصرار کیا۔

"دیکھئے۔ مجھے اِن باتوں سے دل چسپی نہیں ہے!" جویریہ بے بسی سے ہنسی۔

"آپ کو نہ ہو مگر مجھے تو ہے!"

اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور لکیروں کی زبان پڑھنے لگا۔

ایک سنسنی خیز گدگدی جویریہ کو آمادہ بہ تبسم کر رہی تھی۔ حارث کی انگلیاں اس کی ہتھیلی پر دوڑیں۔ اور بے اختیار ہنستے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"بہت اچھا ہاتھ ہے!" حارث بھی ہنستے ہنستے صوفے کی پُشت گاہ پر سرک گیا۔ چند لمحوں کے بعد آپ کا مستقبل تابناک ہو جائے گا۔ لیکن ایک امٹ صدمہ آپ کی رُوح کو ہمیشہ ڈستا رہے گا۔ اور وہ صدمہ کسی چاہنے والے کی ناگہانی موت کا ہو گا!"

"نہیں!" وہ سہم کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"دور کرو۔ وہی باتیں!" رفعت جہاں بھی گھبرا گئیں۔

"آپ کا اپنا ہاتھ کیا کہتا ہے؟" جویریہ نے پوچھا۔ اور اُسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس کی پلکیں جھک گئیں۔

"میرا ہاتھ؟" اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا: "میری تقدیر کی مختصر سی کہانی سننا چاہتی ہیں آپ —

جوانی اور بربادی محبت اور ناکامی —!

انہی دو چار لفظوں میں چھپی ہے داستاں میری

میری قسمت، جویریہ۔" اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اگر یہ لکیریں سچ بولتی ہیں۔ تو میں صرف سال بھر کا اور مہمان ہوں۔ اسی لئے تو میں سب میں واپس آ گیا ہوں کہ ایک بار جی بھر کے سب کو دیکھ لوں!۔ کوئی داغ میری رُوح پر نہ رہے... بارہ مہینوں کے بعد میری زندگی کی لکیریں بالکل ختم ہو گئی ہیں۔ ان کے آگے موہوم سا نشان بھی اگلی زندگی کا نہیں ہے!"

"اتنا پڑھ لکھ گئے مگر ابھی تک وہمی بنے ہو!" پھوپھی نے ٹوکا "خدا نہ کرے کہ تم سال بھر کے مہمان رہو۔ خدا تمہیں عمر خضری اور تقدیر سکندری عطا کرے۔ بیٹا۔ فضول وہم کر کے دماغ پر بوجھ نہیں لادنا چاہئیے۔ اور جب وہ اُٹھ کر کچن میں چلی گئیں تو تنہائی میں جویریہ کا دل خلش آمیز طریق پر دھڑکنے لگا!۔ حارث صوفہ پر بیٹھا نیم باز آنکھوں سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ سہم سے لہجے میں بولا۔

"کسی کی بے مصرف زندگی جتنی جلدی ختم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

"معلوم نہیں۔ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟" جویریہ گھبرا کر بولی۔

"کیا میں غلط سوچتا ہوں؟" وہ اُس کے پاس جھک کر بولا اور اس کی گرم گرم مُعطّر سانسیں جویریہ کے رخسار سے ٹکرائیں۔ وہ جھجک کر پیچھے سرک گئی!۔ خواہ مخواہ اُس

سے متاثر ہو رہی تھی کتنی دلفریب اور مسحور کن شخصیت ہے اب اُسے پتہ چلا کہ مردانہ جلال و جمال کیا چیز ہے۔ اس کے مقابلہ میں معظم اُسے بڑی پستی میں نظر آیا۔

جولی۔!۔" اچانک اُس نے کہا: "میری ایک دوست تھی جب میں ایم۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ میری کلاس فیلو تھی۔ اتنی خوبصورت کہ جیسے چاند کی ایک کرن، بجلی کا کوندا، ماہتاب کی شعاع۔ اس کی باتوں میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔ اس کا دل خالص سونے کا بنا تھا پُر خلوص، پُر محبت، اتنی پُر کشش لڑکی پھر کبھی میری زندگی میں نہیں آئی۔ میری طرح وہ بھی دنیا میں بالکل اکیلی تھی.... پھر ہمارے دل ساتھ ساتھ دھڑکنے لگے!"

اچھا!" جویریہ نے مسکرا کر پہلو بدلا۔

"ہم نے گلستانِ محبت میں قدم بہ قدم گلگشت کی تھی، بہار کے خواب دیکھے تھے اور یہ بھول گئے تھے کہ بہار کے خوابوں کی تعبیر خزاں کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ جس رات ہماری شادی تھی۔ اُسی صبح کو وہ کار کے حادثے میں چل بسی۔ جب میں مردہ خانہ میں اُسے دیکھنے گیا.... اللہ۔ اللہ۔ قدرت ایسی ستم ظریف اور لاپرواہ ہے اُس کی لاش خاک و خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ لیکن چہرہ۔ ویسا ہی ترو تازہ تھا۔ جیسا کہ زندگی میں ہوا کرتا تھا۔ ایک ہلکی سی خراش خون کی ایک بوند بھی اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ ایک طرف گردن پھیرے وہ خاموش سو رہی تھی۔ جولی۔ جس رات وہ دلھن بننے والی تھی۔ وہ مر گئی۔ جس رات اُس کی زندگی میں چراغاں ہونے والا تھا۔ وہ لامحدود تاریکیوں کے سپرد کر دی گئی۔ پھر میری زندگی میں بھی اندھیرا پھیل گیا۔ ایسا اندھیرا جو ابھی تک دُور نہیں ہوا۔ اور نہ کبھی ہوگا۔ چاہے سینکڑوں آفتاب اس دُنیا پر چمکنے لگیں یہ رُوح کا اندھیرا۔"

۔ کیا آپ نے اُس کے متعلق بھی کوئی پیشن گوئی کی تھی؟ جویریہ نے کچھ پوچھنے کی خاطر پوچھ لیا۔

ہاں ——— اُس نے سرد آہ بھر کر کہا ——— میں نے کہا تھا کہ۔ ایک بڑی خوشی اس کی تقدیر میں ضرور ہے۔ لیکن وہ کبھی خوشی نہ ہوگی۔ تقدیر اس کا راستہ کاٹے گی۔ اور تب مجھے یقین ہو گیا کہ۔ وہ منحوس لکیریں ہمیشہ میرا راستہ کاٹا کریں گی۔ جنہیں لوگ تقدیر اور قسمت کہتے ہیں!"

۔ لیکن یہ تو صرف اتفاق ہے!"

۔ ہاں۔ اور کہا۔ مگر اتفاق اور حادثے ہمیشہ اچانک ہوتے ہیں!"

دفعتہً پردہ ہٹا اور ہمایوں اندر آیا۔

"آہا۔ تو یوں کہیئے کہ نئے بھتیجے کی محبت میں پرانے کی محبت پھوپھی جان نے اپنے دل سے نکال پھینکی۔"

چائے پیجئے!" جویریہ نے کہا۔ پھر وہ استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولی: "آپ نے کچھ اور بھی سنا۔ آپ کے بھائی صاحب بڑے اچھے دست شناس بھی ہیں!"

پاگل ہیں!" ہمایوں نے تڑپ کر کہا: "مجھ سے بھی آنجناب نے فرمایا تھا کہ میری شادی چھ ماہ سے کم عرصہ میں نہیں ہوگی۔ مگر دیکھو۔ اگلے ہفتہ میری شادی ہے!"

خدا کرے کہ تمہارا کہنا ٹھیک ہو۔" حارث نے کہا۔

خدا اور اس کا علم مقید نہیں ہے۔ حارث۔" ہمایوں بولا: "زندگی میں یونہی کیا کم پریشانیاں ہیں کہ تم نے موت کا خوف بھی اپنے اوپر لاد لیا ہے۔ ویسے بھی کیا ہم سب موت ہی کی طرف نہیں بھاگ رہے ہیں؟ ہر گزرنے والا دن۔ ہر بیتنے والی رات تمہیں اپنی ابدی منزل سے قریب کر رہی ہے۔ جو شئے ابدی اور اٹل ہو۔ اس کا خوف کیسا۔ حارث!"

سچ کہتے ہو!" حارث نے تسلیم کیا۔

اچھا۔ یہ تو بتاؤ۔" ہمایوں نے ہنس کر پوچھا: "تم نے یورپ میں شادی وادی تو نہیں کی؟"

نہیں کی۔" وہ مسکرانے لگا: "بلکہ نہیں ہوئی۔ موت کی لکیر ہمارے درمیان آ گئی۔ مگر اب یہاں کروں گا۔ کوئی لڑکی تلاش کرو۔ میرے لئے۔ جس کے لمبے لمبے سیاہ بال ہوں۔ جس کی آنکھوں میں ستارے کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے ہوں جس کے لب یاقوت کے تراشے ہوں... میں سچ کہتا ہوں کہ۔ جو حسن مشرق کو ملا ہے۔ اس کا عشر عشیر بھی مغرب کو نہیں

ملا!۔ مغرب نے اپنی عصمت گنوائی اور سب کچھ گنوا دیا۔ اصلی حسن تو عصمت ہی ہے نا؟۔"

ہمایوں نے یکایک ہنس کر جویریہ کو دیکھا۔

بہت خوب صورت ہیں!۔" حارث کو شرارت سوجھی

اگر ایسی ہی کوئی مل جائے؟۔" ہمایوں کو بھی شوخی سوجھ گئی۔

زہے نصیب۔ زہے نصیب۔!" حارث نے سینے پر دونوں بازو لپیٹ لئے اور احترام سے جھکا!۔

ہمایوں بھائی۔ بیکار بکواس بند کیجئے!۔" وہ بگڑی۔

او کے۔ بے بی۔" ہمایوں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو یار۔!"

معاف کیجئے گا۔ میری کوئی بات اگر آپ کو ناگوار ہوئی ہو"۔ حارث نے کہا۔

میں آپ سے مخاطب نہیں تھی!۔" اس کے لہجے میں ناقابل بیان خشکی تھی۔ حارث کا دل دُکھ گیا۔

ہمایوں اسے کھینچ لے گیا۔

"حارث!۔ تم مذاق ہی مذاق میں ایسے سیریس ہو جاتے ہو" اس نے کہا" وہ ایسی ہی مغرور اور سرکش ہے۔ بچپن ہی سے ایسے ماحول میں پلی بڑھی ہے نا!۔ اس لئے۔ مجھے تو وہ بہت ستاتی تھی۔ مگر میں نے کبھی بُرا نہیں مانا۔!"

تمہاری بات اور ہے!۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اس کی خودداری پر چوٹ پڑی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ کسی سے بات کئے بغیر باغ میں چلا گیا۔ موسم مسحور کُن تھا۔ خُنک ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ خزاں کا آغاز تھا۔ چنبیلی کے منڈوے پر اکا دکا ستارے جگمگا رہے تھے۔ اُس نے سگریٹ سلگایا اور سرد بنچ پر ٹک کر آنکھیں بند کر لیں۔ تکلیف دہ خیالات اُسے پریشان کرنے لگے۔ کبھی اَن دیکھے ماں باپ یاد آتے۔ کبھی اپنی غریب الوطنی۔ کبھی دادی کی بے بسی دل کو پگھلاتی۔ اور کبھی اپنوں کا مغائرانہ سلوک جگر کھرچنے لگتا۔ پھر جویریہ کی دل شکنی اور معظم کا روکھا پھیکا سلوک یاد آیا۔ دیر تک وہ اپنے خیالوں کے گرداب میں چکراتا رہا۔ اور انجانے میں آنسو اس کے رخساروں پر بہتے رہے!۔"

اور پھر اُوپر آتے ہوئے۔ اچانک معظم اور جویریہ کا سامنا ہو گیا۔ معظم بڑے مضحکانہ انداز میں اُسے دیکھنے لگا۔ سفید خوبصورت لباس میں اس کا دلکش بدن کچھ اور نکھر آیا تھا۔ مخمور آنکھوں میں حسرتوں کی دُنیا آباد تھی۔ چہرے سے اُداسی برس رہی تھی۔ ایک ایک نظر اس نے دونوں پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

مسٹر حارث!،، اچانک معظم کی آواز گونجی "کسی کے منظورِ نظر ہونے کے یہ معنے تو نہیں کہ تم دوسروں کا مذاق اُڑاتے پھرو۔ میں تمہیں متنبہ کر رہا ہوں کہ کبھی اپنی حد سے باہر قدم نہ نکالنا۔ ورنہ پچھتاؤ گے میں ہمایوں نہیں ایسا سبق دوں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔"

شکریہ۔!" حارث نے بغیر کہا "مجھے کیا ضروری ہے کہ میں آپ کے منہ لگوں۔ یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ ہمایوں نہیں ہیں۔ وہ انسان ہے اور آپ فقط ایک آدمی!۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ حارث نے معظم کے قہقہے میں گھلا ملا ایک استہزائیہ لفظ سنا۔ خوشامدی اور دانت پیس کر رہ گیا۔

عرفان صاحب کی جوانی بہت رنگین گزری تھی۔ اس شراب اور عورت نے انہیں مالی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نواب صاحب جلد از جلد جویریہ کی شادی معظم سے کر دیں۔ اسی طرح بہو کی املاک سے پھر اُن کا ہاتھ کھل جائے معظم عرصے سے باہر جانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ جویریہ سے محبت ایک خوش رنگ دھوکا تھا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا!۔ اگر کثیر دولت ہاتھ آ جائے تو کیا حرج ہے۔ اُسے لاکھوں جویریہ مل جائیں گی اس کی ماں بھی انہی خیالات کی عورت تھی۔ ہمیشہ رفعت جہاں سے منافقت برتی۔ وہ اپنی دانست میں سمجھتی رہی کہ چھوٹی بھابی سے بڑھ کر کوئی ان کا خیر خواہ نہیں ہے!

چپکے چپکے وہ انہیں ورغلاتی رہتی تھیں کہ جویریہ کی شادی کردی جائے! مگر رفعت جہاں کو معلوم نہیں کس بات کا انتظار تھا۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

انہیں بڑی فکر حارث کی تھی۔ اس کی خاموشی سے ان کا دم گھٹا جاتا۔ ہزار پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتلایا وہ جویریہ کو ماں کی نگاہوں میں بُری بنانا نہیں چاہتا تھا!۔ اور نہ اُسے یہ پسند تھا کہ اس کی موافقت میں نواب صاحب جویریہ کو صلواتیں سُنا کر رکھ دیں!۔

وہ گُم صُم ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ دادی کی صحبت میں دل لگتا نہ پھوپھی کی آغوش میں نہ ہمایوں کی دوستی میں وہ منتظر تھا کہ کب جشن اور شادی کا ہنگامہ ختم ہو۔ اور کب وہ اس گھر کو خیرباد کہے۔ دادی کی محبت اگر پاؤں کی زنجیر بنی تھی تو ہمایوں کا خلوص الگ اس کے لئے سوہانِ روح تھا!۔ وہ تو اُسے جان سے بڑھ کر چاہنے لگا تھا۔

خُدا خُدا کرکے جشن اور شادی کا دن آیا۔ کوٹھی میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ متعدد مہمان آچکے تھے۔ بے شمار چلے آرہے تھے!۔ خاموش تماشائی بنا وہ چہل پہل دیکھ رہا تھا۔ مجبوری کُوشی کیا!۔ خوشی ہی کی خاطر زندگی کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھا رہا تھا!۔ نفرت اور بیزاری کی سوغات کے سوا اور اُسے کیا ملا تھا!۔ طنز و تحقیر کے ہاتھوں کے علاوہ اسکے اپنوں نے اُسے کیا دیا تھا! آخر کیوں۔ آخر کیوں؟۔ کس اُمید پر یہاں آیا تھا۔ کب تک یہیں رہے گا؟۔

رات کی تاریکی کے ساتھ ساتھ شور و غل بڑھتا جارہا تھا! چراغاں دن کی خبر گیری کو شرمارہا تھا۔ وہ ملگجی سی تاریکی میں ڈوبے برآمدے میں کھڑا مسلسل سوچے جارہا تھا۔ نجانے کیا کیا کچھ۔!

——— اور پھر دفعتہً کوئی کاہیدہ و ناہدہ بدن اس کے شانے سے آلگا!

معظم۔" اندھیرے میں ملائم سی سرگوشی گونجی: "تم بدگمان تو نہیں ہوگئے۔ یقین کرو۔ وہ صرف ابّا جان اور امی کی محبت میں ہمارے یہاں آتا ہے۔ مجھے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ وہ کبھی ہماری راہوں میں نہیں آسکتا! میں امی کو مجبور کروں گی کہ وہ اُسے جلد سے جلد یہاں سے بھجوا دیں۔

وہ بت بنا خاموش کھڑا رہا۔ اس نے جویریہ کی سسکیاں بھی سنی تھیں۔ پتہ نہیں۔ معظم کا سلوک اُس سے کیسا رہا تھا۔ جس کی وہ شاکی تھی! اور اپنی صفائی دینے آئی تھی۔

"تم اب بھی خاموش ہو۔ کچھ تو جواب دو۔"

"آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ میں کبھی آپ کے راستے میں نہیں آؤں گا۔ اپنی امی سے کہئے کہ جلد سے جلد مجھے کہیں بھجوا دیں۔"

حارث کی بھاری اور گونجدار آواز بم کی طرح اُس پر گری۔

یا خُدا۔" اُس نے ہلکی سی چیخ مار کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔

میری طرف سے اپنا دل صاف کرلیجئے"۔ حارث نے کہا: محبت کرنیوالے کبھی دوسروں کی خوشی کے گاہک نہیں ہوتے۔ وہ جان دیتے ہیں،" جان نہیں لیتے!۔"

اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد سرمئی حلقوں میں پسینہ جھلملا رہا تھا!۔

اُف۔ میری تقدیر۔ اللہ۔ اللہ۔ تیری یہ بے مہر دُنیا۔ اس کے منہ سے نکلا۔ اور وہ دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔

دفعتہً کسی نے برآمدے کا بلب روشن کیا۔ دونوں کی آنکھیں ساتھ ساتھ معظم کی طرف اٹھیں۔ جس کا چہرہ غصے کے مارے صحرائی درندے کا سا ہو رہا تھا۔ باری باری اُس نے دونوں کو دیکھا اور ہونٹ چبانے لگا۔

جویریہ۔" اس کی دُرشت آواز گونجی۔

تمہیں ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اِدھر آ گئی تھی۔" سسک کر جویریہ نے کہا۔" انہوں نے مجھے اکیلی دیکھ کر ناگوار باتیں چھیڑ دیں۔ کہنے لگے کہ معظم کو ایک ٹھوکر میں راہ سے ہٹا دوں گا۔!"

"کیا مطلب ؟" حارث اُس کی دیدہ دلیری پر ششدر رہ گیا۔

حارث! "___ اور خباثت کی تم نے حد کر دی۔!" معظم کی آواز میں بے پایاں نفرت تھی۔ "اگر مجھے پھوپھی اور دادی اماں کا خیال نہ ہوتا تو دھکّے دے دے کر تمہیں گھر سے باہر نکال دیتا۔ حارث! یہ شریفوں کا گھر ہے۔ یورپ کا کوئی کارنیوال نہیں ہے اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی تو یاد رکھنا کہ میں بہت بُری طرح سے پیش آؤں گا۔"

"آپ سے ڈویل لڑنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے!" حارث کا تلخ لہجہ گونجا۔ "آج ہی تو میں نے دیکھا ہے کہ شریف بہو بیٹیاں کیسی ہوتی ہیں۔؟" اُس کے جاتے ہوئے قدموں کی دھمک دونوں کے سروں میں گونجتی رہ گئی۔ اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"کوئی اور بدتمیزی تو اس بد معاش نے نہیں کی تم سے ؟ جوئی ؟" معظم نے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم وقت پر آ گئے معظم۔!" جویریہ نے سر جھکا کر کہا۔ پھر اُسے اپنی ذلالت اور حارث کی شرافت پر شرم آنے لگی۔!

حارث کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں!۔ پتہ نہیں اُسے حیرت زیادہ تھی یا رنج زیادہ۔ اوندھا سیدھا صوفہ پر گرا اور سوچنے لگا۔ یہ کیسی شرارت اُس کی تقدیر نے اس کے ساتھ کی تھی؟ وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ جویریہ اتنی کم ظرف نکلے گی۔ معظم کا طنز اُسے کھائے جا رہا تھا......

اُس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لئے۔ "اُف پروردگار ___ میری قسمت میں یہ بھی تھا۔!

اتنے میں ملازم اندر آ گیا اور اُس نے نواب صاحب کی طلبی کا پیغام سنایا۔

اُسے اپنا چہرہ شگفتہ بنانے میں بڑی دیر لگی! کئی لمحوں تک آئینے کے سامنے کھڑا رہا اور سوچتا رہا۔ کون سی صورت لے کر وہ نواب صاحب کے پاس جائے گا۔؟!

لیکن اُسے جانا ہی پڑا۔ رفعت جہاں بھی تھیں مگر خاموش خاموش سی۔ نواب صاحب نے اُس کی طرف سے چہرہ پھیر لیا۔ عرفان بھی موجود تھے۔! ایک سنسنی سی حارث کے رگ و پے میں پھیل گئی۔!

"مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔ افسوس تم نے مجھے شرمندہ کیا۔"

"خدا کے واسطے مجھے غلط نہ سمجھئے پھوپھا جان!" اُس نے بڑی لجاجت سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔" میں اپنے مرحوم باپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ___!

"تمہارے مرحوم باپ ہی کون سے نیک نام تھے!" عرفان نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ بہرحال بھائی صاحب، اب اجازت دیجئے۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اس گھر میں یا تو میں رہ سکتا ہوں یا حارث۔!!!

چھوٹے بھیا۔!" رفعت جہاں دھک سے رہ گئیں۔

بہت بہتر۔ ایسا ہی ہوگا۔!" حارث نے سفاک لہجے میں کہا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

"بلایئے اُسے۔ آواز دیجئے۔" رفعت جہاں نے تڑپ کر کہا۔ اتنی سختی نامناسب ہے چھوٹے بھیا!" میں یقین نہیں کر سکتی کہ حارث نے اتنی بدتمیزی کی ہے!"

جویریہ کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ دل کی دھڑکن حلق میں شور مچا رہی تھی۔ اگر وہ سچ مچ کہیں چلا گیا تو پھر ___؟"

"دھاندلی تو دیکھئے!" عرفان نے کھسیا کر کہا۔ "اُسے واجب تھا کہ مجھ سے یا آپ سے معافی مانگتا!۔ یہ تو اپنے جرم کو تقویت دینا ہے۔!!"

رفعت جہاں کے آنسو دل ہی میں گھٹ کر رہ گئے۔!

کوٹھی کا ہنگامہ بڑی دور رہ گیا۔ ہمایوں کو اندر عورتیں دولہا بنا رہی تھیں۔ میراثنیں سہاگ گیت گا رہی تھیں۔ اور گیٹ پر "ویلکم" کی چھاؤں میں شہنائی نغمے بکھیر رہی تھی۔

"دادی اماں اپنے کمرے میں عبادت میں مصروف تھیں۔ دیر بعد وہ تسبیح پھیرتی اندر سے نکلیں۔ ایک نظر دالان میں ڈالی جہاں کنواری بالیاں بنّی گا رہی تھیں۔ ایک طرف

بڑی بڑی کشتیاں سجی رکھی تھیں۔ دُلہن کے سہرے کی کشتی الگ رکھی تھی۔ جس پر حریر کا نہایت خوشرنگ کپڑا پڑا ہوا تھا! بڑی آسودہ سی مُسکراہٹ بڑی بیگم کے لبوں پر پھیل گئی! ۔ پھر تسبیح کو آنکھوں سے بوسہ دے کر اُنہوں نے مُٹھی میں دبالیا۔ اور ایک مُلازم لڑکی سے کہا۔

"دونوں لڑکوں کو جلدی تیار کر کے باہر بھیجدو۔ پہلے حارث کی گلپوشی ہو جائے تو پھر وہ بھی بارات کے ساتھ چلا جائے گا۔! ورنہ دُلہن کی رُخصتی کے انتظار میں بڑی دیر لگ جائے گی۔!"

بڑی سرکار۔" لڑکی نے جواب دیا۔" صاحبزادے تو دولہا بنے تیار کھڑے ہیں۔ مگر نواب حارث کا پتہ نہیں۔ کیا وہ آپ کے پاس نہیں ہیں!"

"جا! جلدی سے صاحبزادی کو بُلالا" وہ بولیں۔ لڑکی دوڑ گئی۔

رفعت جہاں نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔

"بیٹی! یہ کیا قصّہ ہے؟" دادی امّاں نے فکرمند ہو کر پُوچھا۔ "حارث کہاں گیا ہے۔؟"

رفعت جہاں کا دل اُلٹا آرہا تھا!۔ اُنہیں تو سارے حالات کا پتہ تھا۔ مگر بات اُن کے ہونٹوں سے نہیں نکل رہی تھی۔ بے چین ہو کر رہ گئیں۔

"وہ تو سہ پہر سے میرے پاس بھی نہیں آیا" دادی امّاں نے کہا۔ مُلازموں سے کہو، اُسے تلاش کریں۔"

پندرہ بیس منٹ بعد مُلازم مُنہ لٹکائے واپس ہوئے۔

"صاحبزادے حارث کا کوٹھی میں اور کوٹھی کے باہر کہیں پتہ نہیں۔"

دادی امّاں کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی۔

"ہمایوں، کہاں ہے حارث؟" وہ دل تھام کر چیخیں

ہمایوں بھاگا گیا۔ "دادی امّاں، میں نے تو اُسے سہ پہر سے نہیں دیکھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آپ کے پاس بیٹھا ہوگا۔"

"کم بختوں نے اُس کا رہنا دُشوار کر دیا ہے!" دادی امّاں وفورِ غضب سے لرز رہی تھیں۔

بے تکان الفاظ اُن کے مُنہ سے نکل رہے تھے۔ "ہمایوں جاؤ اُسے تلاش کرو۔ ہائے، میں کامران کو کیا جواب دوں گی۔؟"

اُسے بھی تو انہی ظالموں نے در بدر کر دیا تھا۔ اُس کی اولاد کے بھی دشمن بن گئے۔ خدا سمجھے ان سب سے۔ نہ جانے میرا بچہ کہاں کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ ہمایوں کہاں ہیں تیرے ماں باپ۔ اُنہیں میں قسم دیتی ہوں تیرے دادا کی۔ جب تک میرا حارث نہیں ملے گا یہ شادی بھی نہیں ہوگی!"

امّی جان، بھلا میرا کیا قصور ہے؟" سلطان نے ہکلا کر کہا۔

"خاموش رہو!" وہ یوں چیخیں کہ آواز بکھر گئی۔

وہ تو احمق ہے، سنکی ہے دادی امّاں وہ۔ کہیں بیٹھ رہا ہوگا۔ آپ اپنی طبیعت کیوں خراب کرتی ہیں" معظّم نے کہا۔

"چپ رہو، تم پکے دشمن ہو اُس کے۔ کیا میں جانتی نہیں۔ دُور ہو جاؤ میری نظروں سے!" وہ اب کی بڑبڑیں۔ رفعت جہاں کا عجیب حال تھا۔ گاہ اپنی ماں کو دیکھتیں، گاہ شوہر کو۔

"میں جاتا ہوں دیکھتا ہوں اُسے!" نواب صاحب نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

"کہیں چین نہیں ملے گا" دادی امّاں چلّا چلّا کر کوس رہی تھیں۔ "سلطان، عرفان کہیں اچھے نہ رہو گے۔"

امّی جان، آپ آرام کیجئے۔ میں اُسے بھی تلاش کر کے لاتا ہوں۔

یہ کہہ کر فرحان بھی چلے گئے!

ذرا دیر بعد چوکیدار اور دوسرے ملازم اُوپر پہنچے۔

نہیں ملے سرکار۔ ہم نے ہر جگہ تلاش کر لیا۔ وہ جائیں گے کہاں۔ سارے مہمان تو یہیں جمع ہیں!" چوکیدار بولا۔

"میرے حارث۔ تیرا اللہ والی ہے!" دادی امّاں کو دُکھوں نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ ایک جاں گُداز چیخ اُن کے لبوں سے نکلی۔ اور سنبھالتے سنبھالتے وہ تیورا کر گر پڑیں۔ لوہے کے بولٹ پر سر پڑا اور خون کی دھار بہہ نکلی۔

ہمایوں نے سہرا نوچ کر پھینک دیا۔ اور جھپٹ کر دادی امّاں کو سنبھالا۔ سلطان ڈاکٹر کو فون کرنے بھاگے اور جہاں شادیانے بج رہے تھے وہاں موت کا سکوت چھا گیا۔

رفعت جہاں دل تھامے ماں کے قدموں میں بیٹھی

تھیں۔ نواب صاحب باہر سے بلوائے گئے۔ باہر دھیمے سُروں میں اب بھی روشن چوکی بج رہی تھی۔!

"کوئی اُن سے کہدے وہ یہ شور بند کریں۔!" ہمایوں نے کہا۔ شہنائی نے ایک آخری ہلکورا لیا۔ اور یوں خاموش ہوگئی۔ جیسے سکرات کے انتشار کے بعد بیمار نے دم توڑ دیا ہو۔

"دادی اماں پیاری۔" ہمایوں اُن پر گرا۔" آنکھیں کھولیئے۔ میں اُس پاگل کو ابھی لئے آتا ہوں۔"

اِتنے میں ڈاکٹر بھی آگیا۔ اور بڑی دیر کی دیکھ بھال کے بعد اُس نے سر اُٹھایا۔

"دماغ کی رگیں پھٹ گئی ہیں۔ نواب صاحب۔ بس اب اللہ سے دُعا کیجئے۔!"

اُس نے اپنا بیگ بند کیا۔ اور سر جھکائے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

"نہیں نہیں!۔" رفعت جہاں نے آنچل دانتوں میں دبالیا۔ مگر اُن کی سسکیاں نہیں رُکیں۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

"دیکھی اُس بدبخت کی نحوست!" عرفان بڑبڑا رہے تھے۔ شاید اسی لئے وہ یہاں آیا تھا کہ اپنی دادی اماں ــــ کا آخری وقت بھی دیکھ لے۔!"

"بکومت!" نواب صاحب بھڑک اُٹھے۔" تم نے کون سا سُکھ پہنچایا ہے اپنی ماں کو!"

بہرحتی الامکان کوشش کی گئی۔ مگر بڑی سرکار رات گئے بیہوشی کی حالت ہی میں ابدی نیند سوگئیں۔!

ہمایوں اُن کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اچانک۔ اُس کی نظر اپنی ہتھیلی پر پڑی، جہاں شادی کی لکیر ابھی نامکمل تھی۔ ایک ٹھنڈی سی لہر اُس کے سارے جسم میں تیر گئی۔

یہ رُوح فرسا حادثہ جویریہ کی زندگی کو روندتا ہوا نکل گیا۔

"اللہ۔ اللہ۔ یہ کیا ہوا۔" بے آواز چلتے پھرتے ہمایوں پر اُس کی نظریں پڑیں۔ اور وہ نیم بیہوشی کی حالت میں سسک سسک کر رو رہی تھی۔

مجھے معاف کر۔ میرے خدا۔ مجھے معاف کردے۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔

اپنی نانی اماں کی کمزور آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اُن کا شفیق چہرہ آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ وہ سرہانے بیٹھی رہ گئی! اُن کی ناگہانی موت کا صدمہ اُس کے دل کو برمانے لگا۔!

چُپ چاپ وہ اپنے کمرے میں قید ہوکر رہ گئی تھی۔ ساری رات جنازے کی تیاریاں ہوتی رہیں۔! انکل رحمٰن اچانک حارث کو لے آئے تھے۔ وہ اُن کے یہاں رُوپوش ہوگیا تھا۔ اُس نے اُنہیں یہاں نہیں آنے دیا تھا۔ بڑی دیر بعد وہ سمجھا بجھا کر لائے تھے۔!

مگر کیا دیکھا اُس نے یہاں آکر۔ وہ اُس کی پیاری دادی سفید لباس میں ملبوس بورئیے پر لیٹی تھیں۔ آنکھیں بند چہرہ زرد، لب نیم وا۔ بڑی بھیانک خوشبو اُن کے کپڑے سے اُڑ رہی تھی۔!

"دادی اماں!" وہ بے ہوش سا اُن کے پہلو میں گرا! اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔!

حارث!۔ دِل مضبوط کرو!۔" نواب صاحب نے اُسے اُٹھالیا۔

"اب کون ہے میرا۔" وہ بچّوں کی طرح رو رہا تھا۔" کون میرا پوچھنے والا ہے، دادی اماں۔ ایسی سزا آپ نے مجھے کیوں دی ہے؟" وہ بلکتا رہا اور لوگ جنازہ اُٹھالے گئے۔! ننگے پیر ننگے سر وہ اپنی دادی کے پیچھے چلا گیا۔

پھر بڑی طویل مدّت کے بعد اُسے ہوش آیا۔ اُس نے محسوس کیا۔ اب وہاں اس کا اپنا کوئی نہیں رہا تھا۔! سب اجنبی تھے سب غیر۔ کوٹھی اُس کی نظروں [illegible] اُجاڑ تھی۔ ماحول ویران تھا۔! دادی اماں کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ گھور اندھیرا۔ گمبھیر سناٹا۔!

"حارث۔!" پھوپھی نے سمجھایا۔" بیٹا، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اللہ رکھے تم مرد ہو۔ دل کو مضبوط کرو۔"

"پھوپھی جان۔ اب میں کہاں جاؤں، کیا کروں؟" وہ اُن کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پڑا۔

دادی کا غم۔ پھوپھا کی ہنگامی بے رُخی، ہمایوں کی اُداسی۔ یہ سب کچھ اُس کے دل پر سے گزر رہا تھا۔!

حارث! اپنے دُکھ میں تم مجھے بھی بھول گئے! ہمایوں نے سمجھایا۔" میرے بھائی۔ میں ساری عمر تمہارا ساتھ دونگا۔

چاہے زمانہ مجھے چھوڑ دے، مگر میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا!۔"

ہمایوں ــــــ!

"حارث!۔ خدا میرا شاہد ہے۔ یقین کرو۔!

میٹھے بول بھی دکھے دلوں کی دوا بن جاتے ہیں۔! مگر صبح و شام کی تمام رعنائیاں اُس کے لئے دم توڑ گئی تھیں۔ گم سم وہ گھنٹوں بیٹھا سوچا کرتا۔ رفتہ رفتہ اوروں کے دل سے بڑی بیگم کا غم مٹتا گیا۔ مگر اُس کے دل پر ہنوز وہ داغ تازہ تھا۔

ہمایوں سائے کی طرح ساتھ لگا پھرتا۔

تم نے دیکھا۔ میں کتنا منحوس ہوں۔ مجھ سے دور بھاگو۔ میرے سائے سے بچو۔ ہمایوں میں ڈرتا ہوں۔ میری نحوست تمہیں بھی نہ چمٹ جائے۔!"

"مقدرات اٹل ہوتے ہیں حارث۔!" بیکار اپنا دل نہ دکھاؤ۔!

لیکن حارث کو نہ بہلنا تھا نہ بہلا۔

بڑی بیگم کی ہستی ایک ریشمی ڈوری کی سی تھی۔ جس میں رنگ برنگے موتی پروئے ہوئے تھے۔ ڈوری ٹوٹی اور موتی بکھر گئے۔ اُن کے انتقال کے بعد جائیداد کا بٹوارہ ہوگیا۔ سلطان الگ ہو گئے۔ کوٹھی کے نئے خریدار پیدا ہوئے۔ مالک نے الٹی میٹم دے دیا تھا جلد از جلد مکان خالی کر دیا جائے۔ عرفان کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔! وہ تو نہ جانے کب سے اس موقع کے انتظار میں تھے۔ اپنی ماں کی وفات کا غم اُنہیں رتی برابر بھی نہیں تھا۔! وہ بہن کی اُملاک کے خواب دیکھ رہے تھے!۔ اکیلی جویریہ لاکھوں لائے گی۔!"

پھر یہ ماہی بھی نہ ہوئی کہ اُنہوں نے نواب صاحب پر زور ڈالا۔

معظم اور جویریہ کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے۔

"میں چاہتا ہوں کہ امی جان کے بعد یہ رسم آبائی مکان میں ہو۔ پھر ہم کہاں اور یہ گھر کہاں۔؟"

"مجھ سے یہ گھر کیسے چھوڑا جائے گا؟" رفعت جہاں رونے لگیں۔ "میرے ماں باپ کا گھر، جہاں وہ پیدا ہوئے پلے بڑھے اور مرے تھے!۔ یہاں وہ نہ ہوں۔ مگر اُن کی خوشبو تو ہے۔ کتنا بھرا ہوا گھر تھا۔ اب کیسا ڈھنڈار لگتا ہے۔"

رفعت ــــــ بی بی۔ تم جذباتی اور حسّاس بہت ہو۔!" عرفان نے کہا۔ "صبر کرو۔ جب گھر والے ہی نہ رہے تو پھر گھر کیسا؟"

اور اُنہیں صبر کی سل سینے پر رکھنی ہی پڑی۔ ہمایوں کو حارث کی اکیلی زندگی بہت گراں گزرتی تھی۔ وہ بڑی حد تک اس کا دکھ جانتا تھا۔ لیکن اُسے معلوم تھا کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے، اُسے ملنے والا نہیں۔ اور جو چیز نہ ملے اُس کا غم بے کار ہے۔

جویریہ اپنے سخت گیر باپ اور اصول پسند ماں کی بیٹی تھی لاکھ وہ روشن خیال تھی۔ آزاد ماحول میں پروان چڑھی تھی مگر اتنی ہمت اُس میں نہیں تھی کہ وہ اپنے مستقبل کے سلسلے میں زبان کھول سکے۔ اُس نے ناپسندیدگی اور مخالفت کی صورت میں بڑے بڑے ہنگامے ہوتے دیکھے تھے۔ پھر اس کی منگنی تو بہت پرانی تھی۔ بے وجہ کیوں ٹوٹتی!۔ اُس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اور پھر اُسے معظم کے دل کی بات کا پتہ بھی کہاں تھا؟!

ویسے اُسے اپنے منگیتر سے اب رتی بھر دلچسپی نہیں رہی تھی۔ حارث نے اُس کی نگاہوں میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ وہ خائف بھی کہ کہیں حارث اپنی توہین کا بدلہ نہ لے۔ مگر وہ اپنی اہانت بھول گیا تھا۔! اُس کی شکست جویریہ کے دل میں کانٹا بن کر چبھ گئی تھی۔ اب اُسے اپنی ایک ایک حرکت یاد آتی! اور وہ پچھتاتی۔ اگر حارث کی جگہ معظم ہوتا۔؟

نواب صاحب اپنے ہونے والے داماد کے رکھ رکھاؤ کا بغور معائنہ کر رہے تھے۔ باپ جیسا تھا ظاہر تھا، مگر بیٹا۔ وہ بھی اُنہی کے اُسی رنگ میں رنگا ہوا نظر آیا۔ اُس کے مشاغل کسی سے چھپے نہ تھے۔ ماں سے لڑ جھگڑ کر بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا اور ریس میں ہار آتا۔ نواب صاحب نے ایک دن ٹوکا تھا۔ مگر عرفان صاحب نے منہ توڑ جواب دے دیا۔

بھائی صاحب۔ اس عمر میں تو آپ بھی مصلّے پر تسبیح گھماتے یا سجدہ کرتے نظر نہ آتے ہوں گے۔" وہ طنزیہ ہنسے۔ "وہ بس اس کا شائق ہے۔ اور یہ اُمراء کی دل چسپی ہے۔ ویسے کوئی اور مشغلہ اُس کا نہیں۔ اگر میں اُسے بُری راہ چلتے دیکھوں گا

تو خون پی جاؤں گا۔ ایم ایس سی کر رہا ہے۔ انشاءاللہ فارن چلا جائے گا۔ اور کیا چاہیئے۔ اِس کے بعد بھی آپ کی مرضی۔!"

نواب صاحب متفکر تھے؟!

"بیگم۔ میں نے بڑی غلطی کی" وہ تنہائی میں رفعت جہاں سے بولے۔ "ہیرا چھوڑ کر پتھر اپنے لئے پسند کر لیا۔ معظم میں کون سی خوبی ہے۔ جسے ہم سراہتے رہے۔ دُنیا کے بہتیرے لڑکے پڑھ لکھ کر ولایت چلے جاتے ہیں۔ مگر حارث۔ اُس کا علم کتنا وسیع ہے۔ وہ کیسے اعلیٰ کردار کا مالک ہے۔ جتنا خوبصورت ہے اُتنا ہی خوب سیرت بھی ہے۔ تم نے بھی مجھے رائے نہیں دی۔!

جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ کیسے ہو سکتا ہے۔!" رفعت جہاں کمزور آواز میں بولیں۔ "آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔"

"رفعت!۔" وہ شکست خوردہ انداز میں ہنسے۔ "اگر کوئی کوڑھی یا جذامی باغبان کسی درخت کی آبیاری کرے تو کیا تم اُس درخت کے پھل نہیں کھاؤ گی؟ مانا کہ حارث کی ماں غریب مزارع کی نیچ اور بد قوم لڑکی تھی۔ لیکن اِس میں غریب حارث کا کیا قصور ہے۔؟ وہ تو اپنا خون ہے۔ کامران کا بیٹا۔ کاش! میں اُونچ نیچ اور ذات پات کی اِس ہولناک تفریق کو مٹا سکتا۔!" —

"آہستہ بولیئے۔" رفعت نے کہا۔ "حارث آتا ہوگا۔ کہیں سُن لے تو اچھے دل بُرے ہوں!۔ میں بھی یہی چاہتی تھی جو آپ چاہتے ہیں۔ مگر مجھے خیال آیا کہ جونی کا ہاتھ حارث کے ہاتھ میں دینے کے لئے کتنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور شاید جونی بھی منظور نہ کرے۔ ابھی تک اُسے معلوم نہیں ہے۔ بعد کو اگر وہ حارث سے بدسلوکی کرتی تو اُس کا دل کیا کہتا؟"

نواب صاحب کی پھر دوبارہ آواز نہیں آئی۔

اور ایک طویل سانس لے کر حارث پردے کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ دیر سے کھڑا اُن سب کی باتیں سُن رہا تھا بالکل اتفاق سے آج وہ بھیانک راز اُس کے کانوں میں پڑ گیا تھا۔ جس نے سب کو اُس سے اور اُس کو سب سے دُور رکھا تھا!

اُس کا دماغ گھوم رہا تھا! گرتا پڑتا لڑکھڑاتا اور اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتا ہوا وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔

اور فرش پر گر پڑا۔

ایک مُفلس نیچ اور بد قوم عورت کا بیٹا ہے! نیم بیہوشی کی حالت میں پڑا وہ سوچ رہا تھا! کیا اُن سب کو معلوم ہے، کہ اُس کی ماں کون تھی؟

ہمایوں اور معظم۔!

جویریہ۔ اُس کے اور عزیز و اقارب؟

وہ سب جانتے تھے مگر دادی کے خوف سے اظہار نہیں کیا تھا۔ یہی تو وجہ تھی کہ سب اُس سے الگ تھلگ رہتے تھے جیسے وہ کوئی بیماری ہو۔ اُڑ کر لگنے والی۔

اُس کا دِل ڈوب رہا تھا! سارا جسم پسینے میں شرابور، کیا کرے کہاں بھاگ جائے۔ اب کیا صورت رہ گئی ہے جو اوروں کو دکھائے گا۔ نہ جانے کب تک وہ یونہی پڑا رہا؟"

پھوپھی جان دادی اماں کی قائم مقام بن گئی تھیں۔ پل بھر کو اُسے اکیلا نہ چھوڑتیں۔ اُنہیں اُس کی از خود رفتگی سے ڈر لگتا تھا۔! کمرے میں آئیں اور حارث کو فرش پر پڑا دیکھ کر اُس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

بیٹے! تم یہاں لیٹ گئے، زمین پر۔!" وہ دہل کر بولیں۔ "کیسی طبیعت ہے۔ اُٹھو مسہری پر لیٹو۔!"

"مسہری۔؟" وہ دِل ہی دِل میں ہنسا۔ اِنسان کی خود ساختہ عیش کوشیاں، آدمی کی زندگی، فنا بقا، رضا بالقضا جبر و اقتدار، اُونچ نیچ، ذات پات اور پھر — ایک دن مر جانا۔ آخر یہ سب گورکھ دھندا کیا ہے۔؟ اِنسان چاند پر جا پہنچا۔ مگر وہ موت کو تسخیر نہ کر سکا۔ اشرف المخلوقات صرف حشراتِ ارض کی غذا ہے۔ کیا ہے آدمی کی معراج۔ جس کے بڑے بڑے دعوے ہیں۔ ہم نے یہ کیا۔ ہم نے وہ کیا۔ اُس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ سوائے اِس کے کہ جب موت آئی۔ چپکے سے مر گیا۔ یہ دنیاوی شہرت، عزت، دولت، اور کبر و نخوت، سب کچھ زمین کے اُوپر کی چیزیں ہیں۔ اور زمین کے نیچے کی دنیا — بس وہ کیڑوں کی دنیا ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔!"

"کیا سوچ رہے ہو حارث؟ میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں؟" رفعت جہاں نے اُسے جھنجھوڑ کر کہا۔

"کچھ نہیں پھوپھی جان!" اُس نے آہ بھر کر سر اُٹھایا۔ اب میرے سوچنے کے لئے کچھ بھی باقی نہ رہا۔"

اُنہوں نے دیکھا۔ وہ عجیب طرح سے لُٹا لُٹا سا لگ رہا تھا۔ چہرے پر ایسی ویرانی طاری تھی کہ وہ ڈر گئیں۔ ایسی ویرانی تو مرنے والوں کے چہروں پر دکھائی دیتی ہے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں بندھی ہوئی۔ آنکھیں حلقوں میں پیوستہ۔ جیسے کئی ہفتوں کی بیماری جھیل کر اُٹھا ہو۔

"کسی نے پھر کچھ کہہ دیا۔ تم سے؟" اُنہوں نے پوچھا۔

وہ اُن کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ "جی نہیں۔ اب اگر کوئی کچھ کہے گا بھی تو مجھ پر اثر نہیں ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیئے۔"

اُس نے کبھی کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا کہ وہ اپنی ذات سے وابستہ ایک راز سے واقف ہوگیا ہے۔ وہ صرف تباہی اور بربادی کے لئے بنا تھا۔ اور بڑی خاموشی سے ہر بربادی برداشت کر رہا تھا!

ایک بار پھر کوٹھی میں سوگوار سی چہل پہل تازہ ہوئی۔ جس دن خاندان بھر میں معظم اور جویریہ کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔ اُسی شام کو ہمایوں کا زرینہ سے نکاح ہوگیا۔

معظم کے چہرے سے فاتحانہ مسرت چھلکی پڑ رہی تھی۔

آج رات ہمایوں بھی اُس سے الگ ہوگیا تھا! بلکہ وہ خود ہی اُس سے بچا بچا پھر رہا تھا۔ اُس نے معظم کا سامنا بھی نہیں کیا۔ تاریک برآمدے میں کھڑا دیوانوں کی طرح سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ آج وہ اپنے غم کی اُس منزل میں تھا جہاں دوسروں کی خوشیاں بھی اُسے زہر لگ رہی تھیں۔

ہمایوں سب سے مِل کر باہر آیا اور حارث کو گم سُم دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"تم اپنی بھابی سے بھی نہیں ملے۔ یہاں کھڑے ہوئے کیا سوچ رہے ہو۔؟"

"مجھے بتاؤ ہمایوں!" اُس نے گلوگرفتہ آواز میں پوچھا۔ "مجھے کیا سوچنا چاہیئے۔؟"

"میں تمہارے المیے سے واقف ہوں بھائی۔ میں محسوس کرتا رہا کہ تم جوّی کے لئے بے چین رہے ہو۔ میرے دوست۔ جس چیز تک رسائی نہ ہو، اُس کی تڑپ کیسی۔؟ وہ بچپن ہی سے معظم کی منگیتر رہی ہے۔" پھر وہ کچھ دیر تک اُس کا کندھا سہلا کر بولا۔ "میری مانو تو پھوپھی جان سے کہو۔ وہ تمہارے لئے اچھی سی لڑکی ڈھونڈ دیں گی۔ اِس طرح سوچتے سوچتے تم یقیناً سنکی اور وہمی ہو جاؤ گے!"

"نہ جانے کون بدقسمت ہوگی جسے تم اتنی جلدی بیوہ دیکھنا پسند کرتے ہو۔!" وہ بے دردی سے ہنسا۔

"پھر وہی ضد۔" ہمایوں بگڑ کر بولا۔ "پتہ نہیں کس شیطان نے تمہیں ہاتھ کی بے معنی لکیروں میں دل چسپی لینا سکھا دیا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ سب وہم ہے۔ فراست الید، علم نجوم، سب بکواس، غیب کا پتہ صرف عالم الغیب ہی کو ہے۔ نہ تمہیں ہے نہ مجھے ہے۔ پھر بے کار وہم کے پیچھے زندگی برباد کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔"

وہ چُپ کھڑا رہا۔

"میں پھوپھی جان سے کہوں گا۔!"

"نہیں ہمایوں۔ ابھی نہیں۔ کسی طرح یہ آٹھ دس ماہ گزر جائیں۔ پھر!"

ہمایوں کو غصّہ تو آیا مگر وہ چُپ ہی رہا۔ حارث اُس کی موجودگی سے بے خبر ہوگیا۔ دُور اُفق پر نگاہیں جما دیں، جہاں اِبتدائی تاریکیوں کا پژمردہ چاند اپنی زرد، زرد مضمحل کرنیں سمیٹے غروب ہو رہا تھا۔ تاریک آسمان میں ستاروں کی بساط سجنے لگی تھی۔ وہ اِن تاروں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید اپنی قسمت کا ستارہ۔ جس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا!"

ہمایوں نے یونیورسٹی کیمپس میں اپنے لئے ایک چھوٹا سا کاٹیج خرید لیا۔ وہ زرینہ سمیت جانے ہی والا تھا۔ ایک گھر کے رہنے والے آہستہ آہستہ منتشر ہو رہے تھے! نواب صاحب نے بھی شہر میں چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ عرفان بھی اِسی تلاش میں تھے۔ اور سلطان تو چلے گئے تھے! فرحان جرمنی کیلئے پر تول رہا تھا وہ میڈیسن کی بڑی ڈگری لانے کا ارادہ رکھتا تھا! اِن دنوں گھر پر ایک منحوس اُداسی اور وحشت

چھائی رہتی تھی۔!"

جس دن ہمایوں کا سارا اسباب دوسرے گھر میں منتقل ہو رہا تھا۔!.... وہ اور پاگل ہو گیا۔ اب تو کوئی بات کرنے والا بھی نہیں رہا ہے۔ ہمایوں کو اس کا احساس تھا۔ اُس نے حارث کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم ذرا ذرا سی بات پر اس قدر گھبرا کیوں جاتے ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ یہ تمام دُکھ وہاں دُور ہو جائیں گے۔ میں یونیورسٹی چلا جاؤں گا۔ تم اپنی بھابی سے گپیں لڑایا کرنا۔ اُن کا بھی دِل بہلا رہے گا۔!"

"میں تم پر بوجھ بننا پسند نہیں کرتا!۔"

ہمایوں چونک پڑا۔ کتنا خشک لہجہ تھا۔ اجنبیت سے معمور۔

"بوجھ بن جاؤ گے مجھ پر۔؟" وہ دلسوزی سے مُسکرایا۔ "تو پھر تم جہاں کہو، میں تمہارے ساتھ چلوں! کیونکہ جلد یا بدیر یہ گھر تمہیں بھی تو چھوڑنا پڑے گا۔!"

"حارث بھیا!۔" زرینہ نے کہا۔ اِتنی غیریت کیوں برت رہے ہیں آپ؟ کیا ہم سب آپ کے نہیں ہیں۔ سچ مچ آپ ہمارے ساتھ چل رہیئے۔ تو کتنی بے پایاں مسرت ہو گی۔ تو پھر میں باندھ لوں آپ کا سامان۔؟"

زرینہ بڑی دلکش اور مخلص لڑکی تھی۔ اُسے حارث کی تنہائیوں سے پیار تھا۔! ہمایوں کی تائید میں وہ حارث کو یوں چاہنے لگی جیسے چھوٹی بہن اپنے بڑے بھائی کو چاہے!

"میں تمہارے یہاں ضرور آؤں گا بہن۔" اُس نے احساس سے عاری لہجے میں کہا۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔ بھول نہ جایئے گا۔!"

"نہیں نہیں۔" وہ بڑے پیار سے اُس کا سر سہلا کر مُسکرایا۔ "تم مطمئن رہو۔"

حارث سچ مچ بے تاب تھا۔ لیکن پھوپھی جان نے اس کی جُدائی گوارہ نہیں کی۔ ایک حسرت آگیں اُداسی اُس کی زندگی میں رچ گئی۔

ہمایوں بہت کچھ ہمدردی کر کے سدھارا۔ اُس کے بعد وحشتیں عود کر آئیں۔ لق و دق کوٹھی، سنّاٹوں اور اُداسیوں کا مسکن بن کر رہ گئی۔ نواب صاحب کو ہر جانے والے کا دُکھ ایسا ہوتا تھا کہ وہ تنہائی میں بچّوں کی طرح روتے تھے۔ بڑی سے بڑی مصیبت وہ اپنی ذات پر جھیل لے جاتے! لیکن جویریہ کا انہیں بے حد صدمہ تھا۔ وہ مصیبتیں ابھی سے نواب صاحب دیکھ رہے تھے جو آئندہ زندگی میں اُن کی بیٹی اُٹھانے والی تھی۔ حارث کے ہاتھ سے نکلنے کا رنج تھا۔ مگر وہ قول کے پکّے تھے۔ زبان پر جان کو قربان کرنے والے..... زبان دے دی اور خاندان بھر میں ڈنکا پیٹ دیا۔ کہہ کے پھرنا شریفوں کا شیوہ تو نہیں۔!

وہ اپنے آپ گھلتے گئے۔ رفعت جہاں الگ مضطرب تھیں۔ مگر مُہر بلب رہتیں۔ کس سے کہیں کیا کہیں۔ عرفان سے اُن کا معاملہ تو ایسا تھا جیسے زنجیر دے کر کوئی ہاتھ بندھوائے۔ اُن کے سامنے لاکھوں کا گھر خاک ہو رہا تھا!

جویریہ شادی کے بعد فارن جانے والی تھی! امریکن ایمبیسی سے اس کے سارے اہم کاغذات تیار ہو کر آ گئے تھے! دیر صرف ویزا کی تھی اور اس کے لئے عرفان زور دے رہے تھے کہ فوراً شادی کر دی جائے۔ جویریہ کا جہیز تیار ہو رہا تھا! اپنے ظلم و زیادتی کی تلافی میں نواب صاحب نے ساری املاک جویریہ کے نام لکھ دی اُس کے بعد وہ بڑے خاموش ہو کر رہ گئے۔

"چچا جان۔ کیا بات ہے۔ حارث نے پوچھا۔" آپ اپنی پریشانیاں مجھ سے بھی نہیں کہتے۔ کیا میں اس قابل بھی نہیں کہ آپ کی کوئی پریشانی بھی دُور کر سکوں۔!"

یکبارگی نواب صاحب کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا پڑ گیا۔ اُنہوں نے اپنا ہاتھ حارث کے سر پر رکھ دیا۔ مگر کچھ بول نہ سکے۔!

"میں آپ کی مشکلات کا باعث بن گیا ہوں۔" حارث نے کہا۔ "میری ہی وجہ سے دادی اماں گئیں۔ میری ہی وجہ سے آپ سب میں پھوٹ پڑ گئی۔ میں تو واپس جانا چاہتا تھا۔ مگر مجھے پھوپھی جان نے جانے نہیں دیا۔"

"نہیں بیٹے۔" وہ گلا صاف کر کے مدھم آواز میں بولے۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہاری ذات سے میری کوئی مشکل نہیں بڑھی..... سچ پوچھو تو تمہارے آنے کی سب سے

زیادہ خوشی مجھے ہوئی ہے۔ کم از کم میں نے تمہیں دیکھ تو لیا۔۔۔ تمہارے لئے میں کچھ بھی نہ کرسکا۔! یہ میری بدقسمتی ہے۔۔۔۔ میں حشر میں کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ کامرآن کو۔ وہ میرا دوست تھا۔ وہ میرا بھائی تھا۔ مگر وہ بھی اتنی کس مپرسی میں مرگیا اور میں ہمیشہ کی طرح آرام سے اپنے گھر میں زندگی بسر کرتا رہا! اب میں سوچتا ہوں کہ میں کامران کے وقت پر اُس کے کام کیوں نہ آسکا۔! میں نے اُسے کیوں نہیں پناہ دی۔ میں نے تمہیں بھی کیوں نہیں بچالیا۔؟ میں اِتنا بزدل اتنا پست ہمت کیوں ہوں!" اُن کی آواز رِندھ گئی۔ اور وہ رونے لگے۔!

حارث کے سینے میں بہت سے سوالات مچل رہے تھے۔ جولبوں پر آنے کی تمنا میں دم توڑ کر رہ گئے۔ وہ نواب صاحب کو سمجھانے میں لگ گیا۔!

مگر اُن کے دل پہ خدا جانے کون سے غم کا کیسا داغ لگا تھا۔ کہ ایک رات سوتے ہی سوتے اُنہوں نے جنت کی راہ لی۔

جویریہ کو اب پتہ چلا۔ غم کیا چیز ہے۔؟ دُکھ کسے کہتے ہیں؟ صدمہ کیا ہوتا ہے۔؟ اُس پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ مبہوت و دم بخود وہ ایک ایک کی صورت تکتی رہتی۔!

پھوپھی کا شمار نہ زندوں میں تھا نہ مُردوں میں۔ تھوڑی بہت چارہ گری کے بعد وہ سب اپنی اپنی راہ گئے۔ اکیلا حارث غم گُسار رہ گیا تھا۔

جولی!" اُس کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ مگر وہ اُسے سمجھا رہا تھا" یہ پہاڑ۔ دُکھ کا پہاڑ۔ اکیلا تم پر نہیں ٹوٹا۔ اُس نے مجھے بھی پاش پاش کردیا ہے۔ میں کس سے کہوں کہ میں دُکھ کی کیسی آگ میں جل رہا ہوں! غم انسان کی ازلی اور ابدی ملکیت ہے۔ اِس سے کہیں چارہ نہیں جولی۔! پھوپھی جان کا آغوشِ محبت تمہارے لئے وا ہے۔ مجھے دیکھو۔ اِس بھری پُری اللہ کی دُنیا میں میرا کون ہے؟ نہ ماں باپ نہ بھائی بہن نہ دوست احباب۔ اگر میں روتا تو ساری زندگی رُوتا رہتا!۔ جویریہ۔ کیا تمہارے آنسو پھوپھا جان کو واپس لاسکتے ہیں۔؟ خدا کے لئے اپنے آپ پر رحم کرو۔"

وہ جلتی جلتی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

اُسے اب بھی اُس کا اتنا ہی خیال ہے؟ مگر اُس نے حارث کو کیا دیا ہے؟ سوائے دُکھ اور جلن کے؟ کون سا نذرانہ اُس نے اُسے دیا تھا۔ وہ اب بھی ہمدردی سے پیچھے نہیں ہٹا۔

بہت دِنوں بعد وہ اُس کے اِتنے قریب آیا تھا۔! عجیب سا اِحساس جویریہ کو پگھلانے لگا۔ نہ جانے کیا۔ وہ کیا چاہنے لگی۔ بے اختیار اُٹھے اور اُس کے سینے سے لپٹ جائے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے؟ اُس کے مضبوط بازوؤں کے قلعہ میں ہمیشہ کے لئے چھُپ جائے۔! اُس کی سانسیں پھُولنے لگیں، اور اُس نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھُپالیا۔

وہ کتنا بدل گیا تھا!' چوڑے چکلے شانے اپنی شان کھو بیٹھے تھے۔ پژمردہ چہرے پر دُکھوں کی پرچھائیاں کانپ رہی تھیں۔ لبوں پر خشکی چھا رہی تھی!۔ از خود رفتہ سا۔!

"نہیں حارث نہیں۔!" وہ بے اختیار رو پڑی۔ "مجھے یوں تسلیاں نہ دیجئے۔ ہنسیئے۔ قہقہے لگایئے۔ آج میں بھی تو سزا بھگت رہی ہوں!۔"

"تقدیر سے کوئی نہیں لڑسکتا جولی!"

"جولی؟ اللہ، اللہ۔ اُس کے دِل میں میرا پیار جوں کا توں زندہ ہے۔؟

پھر تقدیر کا مذاق بھی پُورا ہوگیا۔ عرفان وہ آخری مکین تھے جو بڑی دیر بعد اپنے آبائی گھر سے رُخصت ہو رہے تھے۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد اُنہوں نے یہیں پر پھیرا ڈالا۔ دھوم دھام سے نہ سہی سادگی ہی سے سہی۔ جویریہ کی شادی کردی جائے۔

"چھوٹے بھیا!" رفعت جہاں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ابھی تو بدنصیب کے باپ کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا۔"

"تمہارا صدمہ میرا بھی صدمہ ہے رفعت!" وہ بولے۔ مگر مجبوری بھی تو کوئی چیز ہے۔ معظم کی روانگی کے دِن قریب آ رہے ہیں۔ وہ کئی سال تک واپس نہیں آئے گا۔ میری دِلی خواہش تھی کہ جولی بھی اُس کے ساتھ ہوتی۔ لیکن ابھی تمہاری مرضی نہیں ہے تو نہ سہی۔ میں اِصرار نہیں کروں گا۔۔۔ پھر اِنشاءاللہ اُس کی واپسی پر دیکھا جائے گا۔!"

رفعت جہاں کا دل سینے سے نکلنے لگا۔! کون جانے، کل کیا ہونے والا ہے۔ اگر معظم واپس نہ آیا۔ اگر اُس نے یورپ میں شادی کرلی!۔ حارث اُن کے سامنے تھا! لیکن اُس نے جویریہ کی شادی کا خیال جتنا فرحت انگیز تھا اُتنا ہی حوصلہ شکن بھی ــــــ خاندان بھر سے مقابلہ کرنے کی طاقت اُن میں نہیں تھی۔ پھر انہوں نے بھائی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور خود تماشائی بن کر الگ جا بیٹھیں۔!

جویریہ بھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔! مگر اُس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ لب کھول سکتی!

پھر کوٹھی میں آخری مرتبہ اور مہمان آئے۔ شادی کا سارا انتظام سلطان صاحب اور اُس کی بیوی نے کیا تھا۔ فرحان بھی بڑے منتظم بنے پھر رہے تھے۔! خوب خوب بہن بھائی کی دولت سے اُنہوں نے اپنا دامن بھرا۔

ہمایوں اور زرینہ بھی آئے ہوئے تھے، لیکن اِس شادی سے ہمایوں ایسا افسردہ اور آشفتہ خاطر تھا کہ اُس نے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگایا۔ زرینہ پھوپھی جان کی دلجوئی کرتی رہی!

عرفان صاحب نے خوب دِل کے حوصلے نکالے۔ بارات بڑی دھوم دھام سے دُلہن کو لے کر رخصت ہوئی۔ اور بارات کے ساتھ ہی وہ سب بھی خون کے آنسو روتے ہوئے کوٹھی سے یوں نکلے جیسے بچہ اپنی ماں کی آغوش سے نکلے۔ پھوپھی کو بیٹی کی جدائی کا اِتنا صدمہ نہ تھا جتنا اپنے گھر سے ہمیشہ کی جُدائی کا۔!

حارث کا آج سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ گھر کی سب سے اونچی منزل پر کھڑا دور خلاؤں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ تھک گیا تھا۔ بخار اُس پر آندھی اور طوفان کی طرح چڑھ دوڑا۔ مگر یہ سب کچھ تو تقدیر کے اچھے بُرے لیکن ناگزیر کھیلوں کی طرح اُسے دیکھنا تھا۔!

رفتہ رفتہ رات ڈھلتی گئی۔ ہر طرف بے کراں سکوت چھایا ہوا تھا۔! دور آسمان کے گوشے میں ستاروں کا غبار چاند کی تھکی ہاری دُلہن کو سنبھالے پچھم کی طرف رواں دواں تھا۔! ساری دنیا ایک سوگوار سناٹے میں مدغم ہو چکی تھی۔ جیسے خالد نے اُسی کی کیفیت کو نظم کیا تھا ؎

چاند کا زرد مرمریں چہرہ
قلزم نیلگوں میں ڈوب گیا۔
شعلۂ پرویں کا بجھ کے راکھ ہوا۔
رات بھیگی گریزپا لمحے، منزلِ نور کو روانہ ہوئے۔
صبح سُونی ہے، خواب گہہ تنہا۔
اے شبِ تار۔ اے دلِ رُسوا۔

اُس نے سر چوکھٹ سے ٹیک دیا اور اُس کے آنسو گالوں پر بہنے لگے۔

"جوجی!" اگر میں تمہارے خاندان کا ہوتا تو یہ سب کیوں ہو جاتا۔ جو آج ہوا ہے۔ یہ شام جُدائی۔ اُف۔ یہ شام کتنی مُضطرب کُن تھی۔ میرے مرحوم باپ، میری مجبور ماں۔ آپ نے اپنے ناشاد و نامراد بیٹے کو دُنیا کے جنگل میں بھٹکنے کیلئے تنہا چھوڑ دیا اور خود لامکاں میں کھو گئے، دادی اماں۔ آہ۔ اگر آپ زندہ ہوتیں ــ اے اللہ! تیری وسیع و عریض دُنیا میں کون ایسا ہے جو مجھے سینے سے لگائے، مجھے پیار کرے۔ میرے آنسو پونچھ دے۔ کوئی نہیں۔ کوئی نہیں!

اور اُسی وقت کسی نے اُسے سینے سے بھینچ کر اُس کے آنسو پونچھ دیئے۔!

ہمایوں خالی کوٹھی میں اُسے تلاش کرتا ہوا اُوپر پہنچا!۔ اُس نے سب کچھ سُن لیا تھا!

"حارث!" وہ بھی رو رہا تھا!۔ آج وہ آخری بار اپنے گھر سے رخصت ہونے آیا تھا۔!" اللہ کی اتنی بڑی دنیا میں تم اکیلے نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ پاگل! کب تک جانے والوں کی بے وفائی اور جُدائی پر آنسو بہاتے رہو گے حارث!۔ یہ دنیا دارالمحن ہے۔ از مہد تا لحد انسان بس آنسوؤں ہی کے پُل صراط پر سے گزرتا ہے۔ ہنسی، قہقہے دھوکے کی ٹٹی ہیں۔ لیکن اس خارزار میں آدمی کو اپنی مُسکراہٹوں کے لالہ زار بھی کھلانے چاہئیں۔ دوسروں کو خوش رکھنا۔ اپنے آپ کو خوشی کا دھوکا دینا، طبعی احتیاج ہی نہیں۔ اخلاقی فرض ہے!"

"چلو ہمایوں چلیں!"۔ اُس نے ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر

آنسو پونچھ لئے۔" تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں بڑی جلدی گھبرا جاتا ہوں۔!...... زرینہ نہیں آئی تمہارے ساتھ۔!"

"وہ پھوپھی جان کے ساتھ ہے۔ بیچاری کا حال تباہ ہے!"

ہمایوں اُسے نیچے لے گیا۔ یہاں پہنچ کر دونوں بیقرار ہوگئے۔

"حارث! یہ کمرہ دادی اماں کا تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی اپنے کمرے سے نکلیں گی۔ اور ہمارے ہاتھ پکڑ کر ہمیں کہیں جانے سے روک دیں گی۔ ... آہ! ہم اپنی دادی کو چھوڑ چلے۔ وہ حصہ پھوپھی جان کا تھا۔! یہاں آرام کرسی پر بیٹھ کر پھوپھا جان سگار پیا کرتے تھے۔ اُن کی شکل آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ آؤ، آج سب سے رخصت ہو لیں۔ یہ در و دیوار — یہ بڑے بڑے حال۔ یہ کمرے۔ یہ درخت۔ آہ۔ ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔!"

ننھے ننھے بچوں کی طرح روتے ہوئے وہ ایک ایک در و دیوار سے یوں ملے جیسے اپنی ماں سے مل کر کہیں دور جا رہے ہوں! پھر ہمایوں نے گلوگیر آواز میں پکار کر کہا۔

"دادی اماں ہم جا رہے ہیں!"

اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر حارث کا ہاتھ پکڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دروازے سے نکل گیا۔ اس کے بعد نئے مالک کے چوکیدار نے گیٹ میں اپنا قفل ڈال دیا۔

غم، دکھ، حادثے، اِس کے سوا زندگی میں اور کیا ہے؟ اگر کچھ ہے تو سب بیکار۔ اور ہیچ۔ غم ابدی ہے۔!

جویریہ دوسرے تیسرے دن اپنے میکے آئی۔ شرمائی شرمائی سی۔ جھکی جھکی پلکیں۔ نئی زندگی کی دلچسپیوں نے اُسے نکھار دیا تھا زرکار لباس میں لپٹی، وہ چینی کی گڑیا لگ رہی تھی!

جب وہ اپنے ابا کی یاد میں روئی اور ماں کے سینے سے لگ کر آنسو بہائے تو حارث کو بہت اچھی لگی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح روتی رہے۔ دوسرے لمحے وہ اپنی اس سفاک خواہش پر خوفزدہ نظر آنے لگا۔

پھر پھوپھی جان ضیافت کے اہتمام میں اُٹھ گئیں۔

جویریہ کو اب تنہائی سے خوف نہیں معلوم ہوتا تھا۔!

بھلا حارث سا بے ضرر اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟۔ مگر حارث گھبرا رہا تھا!

جویریہ کی پیشانی پر پسینے کے موتیوں میں گھلی ملی افشاں دمک رہی تھی۔ ننھے منے لب کپکپا رہے تھے۔ نظریں نیچی تھیں اور وہ چپکے چپکے اپنا زرکار آنچل کلائی پر لپیٹ رہی تھی!

"تمہارے ساتھ معظم نہیں آئے جویریہ؟۔ جب تنہائی وحشت اثر انداز ہونے لگی تو حارث نے پوچھا۔

"جی نہیں!" اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔" وہ کل شام شکارگاہ چلے گئے تھے۔!"

"جوئی۔" وہ شرما کر ہنسا۔ "میں تمہیں نئی زندگی کی مبارکباد دینا بھول گیا تھا۔! میں نے شادی کا کوئی تحفہ بھی تمہیں نہیں دیا۔ دراصل میرے پاس کوئی چیز ایسی نہیں۔ جو تمہارے شایانِ شان ہو۔ میں یہی سب سوچ رہا تھا۔! جولی!"

"کب تک سوچتے رہیئے گا۔؟" وہ شوخی سے ہنس کر بولی۔

اگر تم پذیرائی کرسکو تو یہ حقیر سا نذرانہ...... مجھے شرمندگی ہے!"

وہ ہکلانے لگا۔ پھر جھپٹ کر الماری کھولی۔ اور ایک سنہرا کیس اپنے دونوں کھلے ہاتھوں پر رکھ کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

جویریہ کی پلکیں جھپک گئیں۔ کیس میں بڑا خوبصورت گلوبند۔ سنہرے کنگن، قیمتی پھول اور حسین انگشتریاں جگمگا رہی تھیں! اُس نے مسکرا کر ڈھکنا بند کر دیا۔

"شکریہ! آپ نے میرا اتنا خیال کیا۔" اور بڑی عزت سے اُس کے ہاتھوں سے اپنا تحفہ لے لیا۔

"شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیئے۔" وہ خوشی کے مارے بدحواس تھا۔! "دراصل تم عالی نسب، والا حسب۔ اور میں میں بے چارہ۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میری جسارت تمہیں ناگوار نہ گزرے۔!"

جویریہ کا سر جھک گیا۔ تو کیا حارث سب کچھ جانتا ہے!؟۔

"نہ جانے کیا الٹی پلٹی چیزیں آپ سوچتے رہتے ہیں!"

اُس نے گھبرا کر کہا۔ اور کیس سنبھالے کمرے سے نکل گئی۔

"پروردگار۔ آج پہلی خوشی مجھے راس آئی ہے۔!"

دوسرے یہ جگر خراش اطلاع ملی کہ معظم کسی سے کہے بغیر

اپنی شکارگاہ سے امریکہ پرواز کرگیا۔ عرفان صاحب سے کوئی کیا باز پُرس کرتا۔ وہ تو خود سر پیٹ رہے تھے۔ اور عورتوں کی طرح اپنے بیٹے کو کوس رہے تھے۔ جویریہ اِس حادثے سے سنبھلی نہ تھی۔ اُس تک معظم کا طلاق نامہ پہنچ گیا۔

ایک ذلیل الزام حارث سے وابستہ کرکے اُس نے جویریہ سے قانونی طور پر علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ جس دن رفعت جہاں روتی دھوتی عرفان صاحب کے یہاں پہنچیں۔ وہی اُن کا آخری دن تھا! انہیں بھی تو معظم نے دھوکا دیا تھا! قرض کے بوجھ، ادائیگی کی فکر، رہاجنوں کے تقاضے نے اُن کی کمر توڑ دی تھی۔ بہن سے مل کر رودھو کر، جویریہ سے معافی مانگی۔ اور اپنے کمرے میں جاکر خواب آور گولیوں کی پوری شیشی حلق میں انڈیل لی۔!

چچی نیم جان تھیں۔ شوہر گیا۔ بیٹے نے داغ دیا۔ کوئی اور اولاد بھی نہیں تھی کہ اُسی کا منہ دیکھتیں! پاگل ہوکر رہ گئیں۔ اُنہوں نے جوی کو اپنی بیٹی بنا کر ساتھ رکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مگر جویریہ کسی صورت سے راضی نہیں ہوئی.... وہ تو دیوانی ہو رہی تھی۔!

ہمایوں کے اندر اپنے دادا کا جلال جاگ اُٹھا تھا! وہ جانتا تھا کہ یہ سارا ڈرامہ جویریہ کی املاک ہتھیانے کے لئے کھیلا گیا تھا! اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ایک ایک کا گلا گھونٹ ڈالتا۔! اُس سانپ کی طرح بل کھا رہا جس پر وار کرکے چھوڑ دیا گیا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ معظم کے پاس پہنچ کر اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دے۔ لیکن فرحان نے منع کردیا۔ مُلک مُلک کا قانون ہے۔ ہمایوں تنہا ہے۔ اور معظم کے ساتھ دولت کے ساتھی۔ جویریہ کی تقدیر کا لکھا پورا ہوا۔ اب کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔!

تھوڑے دنوں کی بہار کے بعد پھر خزاں کے ڈیرے لگ گئے۔ سب نے ہر طرح جویریہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اپنے کمرے میں بند ہوکر رہ گئی تھی۔ پھوپھی جان کے پاس کیا رہا تھا۔ وہ گھلتے گھلتے چارپائی سے لگ گئیں!

اور پھر۔ محبت کا ننھا سا شعلہ جو حارث کے دل میں جل رہا تھا۔ پیار کی جوالا بن کر بھڑک اُٹھا!

کتنے دنوں کی کشمکش و کشاکش کے بعد اُس نے اپنی آرزو کا اظہار پھوپھی جان سے کردیا۔

"میری تمنا یہی تھی حارث!" وہ کمزور آواز میں بولیں۔

یہی تمنائے ہوئے تمہارے پھوپھا قبر میں چلے گئے۔ اگر خاندان کے منحوس اُصولوں سے لڑنے کی اُن میں طاقت ہوتی تو آج میری نازوں کی بچی پھولوں کے گہوارے میں جھولتی۔ ہائے خُدا کی لاٹھی بے آواز پڑی ہے۔ میں نے تو کوئی خطا نہیں کی تھی۔! ایک طرف تم۔ دوسری طرف جویریہ۔ میری دو آنکھیں ہیں۔ مگر دونوں بے نور۔!

ہمایوں یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے زرینہ سے کہا کہ وہ جویریہ تک حارث کی بات پہنچا دے۔

زرینہ خود بھی یہی چاہتی تھی، اُس نے جویریہ سے تذکرہ کیا۔

"وہ تو ایک خواب تھا۔ جوی۔ جو تم نے جاگتے میں دیکھا تھا! اُس کی تعبیر دلشکن نکلی۔ اُسے بھول جاؤ۔ اب معظم واپس آنے والے نہیں۔ تم میرا مشورہ مانو، جوی۔ حارث بھائی بہت اچھے آدمی ہیں۔ وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ تم اُن کی ہوجاؤ۔ ساری زندگی کے دُکھوں کا مداوا ہوجائے گا۔"

جویریہ یکبارگی بھڑک اُٹھی۔

آپ کی ہمدردیوں کی مجھے ضرورت نہیں ہے بھابی!" وہ آگ اُگلتی چلی گئی۔" اپنے دکھ میں آپ برداشت کروں گی۔ اُس کم ظرف، بزدل اور کمینے انسان نے یہی سمجھ کر اپنا پیغام بھجوایا ہے کہ میں ایک مفلس کی بیٹی، ایک دھوکے باز کی بیوی ہوں! اُس نے مجھے طلاق دے دی۔ میرا کون سا مقام اب رہ گیا ہے۔ کیا وہ یہی سوچتے ہیں کہ دُنیا میں میرا ٹھکانہ فقط حارث کے پاس ہے۔ وہ میرا خُدا تو نہیں ہے۔ پنچ ماں کا پنچ بیٹا۔ مجھے مرجانا گوارا ہے۔ مگر اُس کا ہاتھ تھامنا گوارا نہیں!"

جویریہ۔ بس اب بکواس بند کرو۔! ہمایوں گرج اُٹھا۔

"تمہاری اِسی سرکشی نے یہ دن دکھایا ہے۔ تم اب بھی باز نہیں آتیں"

"پنچ ماں کا پنچ بیٹا۔!" دانت بھینچ کر ایک گھونسہ پوری طاقت سے حارث نے اپنے سینے پر مارا! اور تیورا کر فرش پر گر پڑا۔

"یہ میں نے کیا سنا ہے، یہ میں نے کیا سنا ہے!۔ اُس نے کچکچا کر اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

اور ہسپتال کی اونچی اونچی سفید دیواروں کے درمیان اُسے ہوش آیا۔ ہمایوں جلدی سے اُس پر جھک پڑا۔

"تمہیں ہوش آگیا۔ حارث۔؟ ہمایوں نے کہا۔" اُس نے اپنے ہاتھوں کے ہالے میں حارث کا چہرہ تھام لیا۔

"ہوش آگیا۔ مگر مجھے موت نہیں آئی۔!" دو جلتے جلتے آنسو اُس کی آنکھوں سے نکلے اور تکیے میں گم ہوگئے۔!

بڑے بدہمت ہو حارث!" ہمایوں نے کہا۔ "حوصلہ رکھو۔ میں تم سے ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ وہ زبان کی تیز ہے۔ پھر تم نے اس کی بکواس کا اتنا اثر کیوں لے لیا۔؟

زندگی کا دکھ دق بن گیا۔ جانے کہاں کہاں کی بیماریاں اُسے لپٹ کر رہ گئیں۔ دوائیں بھی تھیں اور دعائیں بھی۔ لیکن وہ بدستور پگھلتا ہی رہا۔

ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ نرسنگ ہوم سے سینی ٹوریم منتقل کر دیا جائے۔ موت کی سرزمین کی طرف۔ جہاں دبے پاؤں اجل بڑھتی ہے اور زندگی چپکے سے رخصت ہو جاتی ہے۔!

دن بھر سفید بستر پر لیٹا وہ کھلے دریچے سے نیلے آسمان کو تکا کرتا۔! اُسے بے اختیار ہنسی آجاتی۔ بے کراں آسمانوں، لاوسعت زمینوں کے خالق۔ کیا میری قسمت بھی تو نے بنائی ہے۔! وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا!۔ بے بات کی بات پر۔

حارث! مجھے یقین ہے۔ تم اچھے ہو کر گھر چلو گے؟"۔ ہمایوں اُسے یقین دلاتا رہا۔ ویسے اُسے خدشہ تھا کہ سچ مچ اُس کا دماغ اُلٹ گیا تھا۔!

"مسافر نے راہ پر قدم رکھ دیا۔ ہمایوں!" وہ ہنسا۔ "اب اُس کی منزل دور نہیں ہے۔

حارث!، جویریہ اپنے کیے پر پشیمان ہے۔" ہمایوں کو اُس کی ہنسی بڑی دل شکن لگتی۔ "تم جانتے ہو کہ وہ مظلوم بھی ہے اور مغضوب بھی!۔ اُسے معاف کر دو۔ تم نے اُس کی بکواس کا اِس قدر اثر لے لیا۔ پاگل آدمی۔ اور اپنی زیادتی پر وہ اُدھر شرمسار ہے۔ مجھ سے تک آنکھیں نہیں ملاتی!"

"حارث بھائی!" زرینہ بھی دل جوئی کرتی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ آپ اتنے حساس کیوں ہیں!۔ سوچیے تو سہی کیا کچھ نہیں ہے۔ آپ کے پاس۔ عزت، دولت، عظمت۔!

"ایک چیز نہیں ہے میرے پاس۔ محبت!۔ محبت کو تم بھول گئیں زرینہ۔!" وہ ہنسا۔ اور کہیں درد کی ٹیسیں اُبھریں۔ مگر میں ایک بدقوم ماں کا ذلیل بیٹا۔ میں اِس قابل کہاں کہ کوئی مجھ سے محبت کرے۔"

"خدا کے لیے یہ بات بھول جاؤ، حارث!۔ ہمایوں نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔! تم اپنی زندگی پر یہ صدمہ جھیل رہے ہو۔ یاد رکھو کہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ۔۔ پھوپھی اماں بے موت مر جائیں گی۔ اُن کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔!"

"جوئی۔ آپ سے معافی مانگنے آرہی تھی! حارث بھیا!"۔ زرینہ بولی۔ وہ بہت شرمندہ ہے آپ سے۔"

نہیں زرینہ، نہیں.... جویریہ کو میرے پاس مت لانا۔ میں کسی کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا!" وہ بھی شرمندہ ہی تھا!"۔ میں اکیلی جویریہ سے مل کر کیا کروں گا۔ مجھے تو سب کی بے رُخی کا غم ستاتا ہے۔ کیا یہاں سلطان صاحب آئے ہیں۔ فرحان صاحب نے بھی میری پرسش کی ضرورت نہیں سمجھی.... تم لوگ آجاتے ہو، میں تم سب کا مشکور ہوں۔ لیکن اب اور کسی کو میری وجہ سے تکلیف نہ دینا۔!"

جویریہ بہت نادم تھی!۔ زرینہ ہسپتال سے واپس ہوئی، تو دیکھا کہ وہ گھٹی ہوئی سی زینے پر بیٹھی تھی۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ ویران، پلکیں متورم۔ جیسے مسلسل روتی رہی ہو۔!

زرینہ نے چاہا کہ وہ پہلو بچا کر نکل جائے، وہ اُس کے پاس سے گزری اور جویریہ نے اُس کا آنچل تھام لیا۔ زرینہ کو رکنا پڑا۔

" بھابی..... اتنی خفا ہو تم مجھ سے بات کرنے کی بھی روادار نہیں؟"

"نہیں تو جوئی۔!"

"جویریہ یک بیک پھوٹ پڑی۔" بھابی۔ کہہ دو مجھ سے۔ وہ کیسے ہیں۔؟ تم درجاناں سے آرہی ہو۔ کچھ وہاں کی بھی سناؤ۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں نے ہمیشہ خود کو دھوکے دیے۔

بھابی۔۔۔۔ میں خود بھی تو اپنے باپ کی زبان اور ماں کی آن پر قربان ہوگئی۔ میں تباہ ہوگئی، لُٹ گئی۔ بھابی۔۔۔۔ تمہیں کیا خبر۔ اُن کی شکل دیکھتے ہی میں نے اپنا مجبور دل اُن کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔! میں نے اُنہیں اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ مگر میں زبان سے کہہ نہ سکی۔۔۔۔ جس کا میں نے خمیازہ کھینچا۔ اب میں کیا کروں؟!

زرینہ چُپ رہی۔

جویریہ سسک سسک کر بولتی رہی۔ "کیا کچھ بدتمیزیاں میں نے اُن سے نہیں کیں۔ اُنہیں ستایا، جلایا، رُلایا اور دُکھ دیئے۔ مگر وہ سب کچھ برداشت کرتے گئے۔ میرا کلیجہ پھُنکا جاتا ہے بھابی! مجھے کوئی تدبیر بتاؤ۔ کہیں یہ غم میری زندگی کو نہ چاٹ جائے۔"

"تم اُن سے ملنا چاہتی ہو جولی۔؟"

"ہاں، بھابی!۔"

"چلی جاؤ جولی۔ وہ خود بھی تمہارے منتظر ہیں!"

حارث کے وہم میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ جویریہ اُس سے ملنے آسکتی ہے۔!"

مگر ایک سہ پہر خزاؤں میں چلنے والی ہوا کے ایک مغموم و سوگوار جھونکے کی طرح وہ آہی گئی۔ اس کے قدم اُلجھ رہے تھے، آنکھیں اشتیاقِ دید میں ٹھہر گئی تھیں۔ سفید لباس میں لپٹی، جوہی کی پژمردہ کلی کی سی بے رنگ و بُو، بے کار ـــــ

حارث تیز بخار میں جل رہا تھا! اُسے کسی پل چین نہیں تھا! بے چینی سے سر تکیئے پر پھیرتے ہوئے اُس نے دیکھا۔ وہ اُس کے پہلو میں کھڑی تھی۔!

جویریہ۔۔۔۔ تم۔ آخر تم آگئیں!" اُس کے خشک لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔!

اور اُس کے لہجے سے بے قرار ہوکر وہ بے ضبط و مضطرب ہوکر اُس کے پہلو میں گر پڑی۔ پھر روتی ہوئی آواز میں اُس نے کہا۔

"مجھے معاف کردیجئے۔!"

اور حارث کی گرم گرم ہتھیلی پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔

"میری ساری زندگی آنسوؤں میں ڈوب کر رہ جائے گی۔ اگر آپ مجھے معاف نہ کردیں گے۔!"

"جولی! میں تم سے خفا نہیں!۔"

"کہہ دیجئے۔ ایک بار۔ صرف ایک بار۔ جولی۔ ناشاد میں نے تجھے معاف کیا۔

حارث نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور اُس کے بالوں میں اپنے لب چھپا کر خواب آگیں لہجے میں گنگنایا۔

"کن خطاؤں کی معافی مانگ رہی ہو، جویریہ!۔ آہ۔! تمہیں احساس نہیں۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

مگر تم یقین کرو جولی، میری زندگی اب بھی تمہاری محبت کے تصور سے عبارت ہے۔ میری آنکھوں میں تمہارے پیار کے سائے اب بھی خوابیدہ ہیں۔ تمہاری دلفریب مسکراہٹ میں حیات کا پیغام اب بھی پوشیدہ ہے۔ تمہارے مجبور آنسوؤں میں میری خوشیوں کے چراغ اب بھی جل رہے ہیں۔ جویریہ، محبت۔ ہر قسم کے احساسات سے بالاتر ہے۔ پہلے مجھے تم سے محبت ہوئی۔ اور بعد کو معلوم ہوا کہ میں ایک ذلیل ماں کا بیٹا۔؟"

اُس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اُس کے پاؤں پر رکھ دیا۔

حارث نے جلدی سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور یوں کھلکھلا کر ہنس پڑا کہ اس کے رُخساروں میں گہرے، گہرے گڑھے پڑ گئے۔ جویریہ پانی پانی ہوگئی۔!

"جولی!" اُس نے محبت پاش لہجے میں پکارا۔

"جی۔!" اُس کی آواز سینے میں گھُٹ گئی۔

"میری طرف دیکھو؟"

مگر ہزار چاہنے پر بھی وہ اُس کی طرف نہ دیکھ سکی۔ حارث نے اپنے جلتے ہوئے ہاتھوں میں اُس کا چہرہ تھام لیا۔ اور اُس کے ہاتھوں کی حدّت و تپش سے گھبرا کر وہ اُسے دیکھنے لگی۔ حارث اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"اب میں نہیں مروں گا۔ کبھی نہیں مروں گا۔۔۔۔ پھوپھی جان سے بھی کہہ دینا۔ اچھا؟ وہ خوش ہو جائیں گی۔!

اور پھر از خود رفتہ ہوکر اُس نے جویریہ کو اپنے بازوؤں میں گھیر لیا۔ جویریہ نے اُس کے سینے پر سر رکھ کر بڑے سکون سے آنکھیں بند کرلیں۔!

ہمایوں شام کو آیا تو اُسے نسبتاً صحت مند دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"میں کہتا ہی تھا کہ بیکار وہموں میں گھر کر زندگی خراب کر رہے ہو۔" وہ پُرمسرت آواز میں بولا۔ "اب دیکھو اچھے ہونے کی کوشش کی اور اچھے ہو گئے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" وہ بھی ہنسا۔ مگر بڑی بھیانک ہنسی تھی۔ "میں اب زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ دیکھو، میں نے وہ منحوس لکیر اپنے ہاتھ سے مٹا دی۔ جو مجھے موت کا پیغام دیتی تھی۔ اب میں زندہ رہوں گا۔

اُس نے اپنی ہتھیلی سامنے پھیلا دی۔ ہمایوں یہ دیکھ کر لرز گیا کہ پھل کاٹنے کی چھری سے اُس نے اپنی ہتھیلی زخمی کر لی تھی۔ وہ لکیر بالکل مٹ گئی تھی جسے وہ دیوانہ موت کی لکیر کہتا تھا۔! اپنی تقدیر میں آپ بناؤں گا۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ "تم نے سُنا۔ میں خواہ مخواہ ایک ایک کی محبت کی پیاس میں تڑپتا رہا۔ یہاں کسی کو کسی سے محبت نہیں ہے۔ ہمایوں۔! یہ تو غرض ہے" کسی کو پانے کی ہوس۔ کیا یہ محبت ہے؟ میں بھی کسی کو پانا چاہتا ہوں۔ جسے میں محبت کہتا ہوں۔ ہاہاہا۔!

"حواسوں میں رہو، اتنی دیوانگی اچھی نہیں۔" ہمایوں خوف زدہ ہو گیا۔

" پھر وہ کب گیا۔ حارث کو خبر بھی نہ لگی۔ وہ خوش ہو رہا تھا کہ اچانک اِس کے دل میں ایک نیا درد جاگ اُٹھا۔

اگر جویریہ مجبور نہ ہوتی! تو یہ کبھی نہ چاہتی۔ ایک مدقوق بیمار اور ناکارہ اِنسان اُسے کیا دے سکے گا۔! کیا یہ خود غرضی نہیں ہے۔ اُس کی ہنگامی خواہش پر حُسن و شباب کا مجسمہ بھینٹ چڑھ جائے گا۔ اُس کی موت یقینی ہے۔ اپنے بعد وہ جویریہ کو کس پر چھوڑ جائے گا۔! اُس کی اولاد کو بھی یونہی طعنے سہنے پڑیں گے۔ نیچ باپ کا نیچ بیٹا۔!

نہیں نہیں۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ جویریہ، تمہاری مجبوری تمہارا فیصلہ نہیں بن سکتی۔!۔ مگر میرا فیصلہ میری موت ضرور بن جائے گا۔

اللہ، اللہ۔ یہی ہے تقدیر۔ جسے میں نے اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالا۔ کدھر گئی وہ لکیر جو باقی زندگی کا پتہ دیتی تھی۔ اب تو وہ بھی مٹ گئی۔ کٹ گئی۔!"

تقدیر، تقدیر۔ وہ دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا۔!

اسی طرح ہنستے ہنستے وہ دل دبائے ہوئے بستر پر گر گیا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر وارڈ میں سب ہی پہنچ گئے۔! ڈاکٹر، نرسیں، اور تیمار دار۔ ڈاکٹر نے بڑی آہستگی سے اُس کی نبض چھوڑ دی۔

"سڈن ہارٹ فیلیور"۔۔۔ مسٹر ہمایوں، کوئی نامعلوم جذبہ۔ جسے وہ برداشت نہ کر سکے!۔ دماغ کی شریانیں پھٹ چکی ہیں۔!

موت کا ہولناک سکوت کمرے پر طاری ہو گیا۔۔۔۔

بستر پر حارث سو رہا تھا۔! ہمیشہ کی نیند میں غافل۔

اُس کے اپنے خون سے لاش تر بتر ہو رہی تھی۔!

ہمایوں کو گریہ و بُکا کی آوازیں بڑی دُور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

اُس کی دُھندلی نظریں حارث کے کھلے ہاتھ پر پڑیں۔ دوسرے زخموں پر کھرنڈ جمنے لگا تھا۔ مگر موت کی ناتمام لکیر سے تازہ تازہ لہو بہہ رہا تھا۔!

" پھر ایک سِسکی لے کر وہ اُس کے پہلو میں گر پڑا۔

۔ حارث!۔ اِتنے سارے دُکھ برداشت کر لئے۔ اور ایک سُکھ نہ برداشت نہ کر سکے!"

پھر وہ بھی ہچکیاں لے کر رو پڑا۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری
پرچھائیوں کا شہر

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

۲۹ جنوری ۱۹۳۲ء کو سری نگر میں بہوری کدل کے مقام پر پیدا ہوا۔ بچپن کی برف پوش راتوں میں گھر میں کبھی الف لیلوی قصّے اور کبھی مشہور مثنوی گلریز اور کشمیری غزلیں ساز و آواز کے ساتھ سننے کا اکثر اتفاق ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں جب کہ میں دسویں جماعت میں تھا میں نے اردو کے شفیق استاد منشی محمد صادق کی تحریک پر اُردو میں چند نظمیں لکھیں۔ اِس سے پہلے کشمیری زبان میں غزلیں اور نعتیں لکھی تھیں۔ ۱۹۴۹ء میں ایس۔ پی کالج میں داخلہ لیا اور کالج کی فضاؤں میں ذوقِ ادب کی نشوونما ہوئی اور کالج میگزین کے لئے نظمیں لکھیں۔ ۱۹۵۰ء میں کشمیر کے پختہ مشق اُردو شاعر جناب شہ زور کاشمیری سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور اُن سے اکتسابِ فیض کیا۔ اس کے بعد میری منظومات مقامی رسالوں کے علاوہ ہندوستان کے مشہور رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ مجھے افسانہ نویسی کا بھی بے حد شوق تھا۔ میرا سب سے پہلا افسانہ "ٹھوکر" شعاعیں دہلی میں ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد معاشرتی اور نفسیاتی موضوعات پر لکھے گئے میرے بہت سے افسانے ہندوستان کے ادبی رسالوں مثلاً تعمیر، آجکل، شاعر، سب رس، بیسویں صدی، کتاب، شب خون وغیرہ میں چھپتے رہے۔ میرے تین افسانوی مجموعے وادی کے پھول، برف میں آگ اور سراب چھپ چکے ہیں۔ میں نے کشمیر کی تہذیبی اور نفسیاتی زندگی پر چار ناول بھی شائع کئے ہیں۔۔۔ بہاروں میں شعلے، پگھلتے خواب، بلندیوں کے خواب اور اجنبی راستے۔ ناول "بلندیوں کے خواب" اور پہلے شعری مجموعے "عروسِ تمنّا" پر مجھے اکاڈمی ایوارڈز بھی ملے ہیں۔

۱۹۵۴ء میں ایس۔ پی کالج میں، میں انگریزی کا لیکچرر مقرر ہوا اور ۱۹۶۰ء تک انگریزی پڑھاتا رہا۔ اس کے بعد ایک سال تک اکیڈیمی آف آرٹس اور کلچر میں اسسٹنٹ سکریٹری رہا۔ اُردو سے بے پناہ لگاؤ کی بنا پر میں نے ۱۹۵۷ء میں اردو میں ایم۔ اے کر لیا اور ۱۹۶۱ء میں کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو میں میرا تقرّر ہوا جہاں اب تک کام کر رہا ہوں۔ ۱۹۶۶ء میں مجھے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی۔ ۱۹۵۹ء میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش حیدر آباد سے انگریزی تدریس کی ڈگری حاصل کر چکا ہوں۔ میری تھیسس "جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات" ۱۹۶۸ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اُردو میں تخلیقی تنقید کی کمی محسوس کرتے ہوئے میں نے تنقید کی طرف بھی توجہ کی۔ میری ایک حالیہ تنقیدی کتاب "غالب کے تخلیقی سرچشمے" منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس کتاب میں میں نے غالب کی شخصیت اور آرٹ کو نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اِن دنوں میں "عصری شاعری اور جدید حسّیت" کے موضوع پر کام کر رہا ہوں جسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے منظور بھی کیا ہے۔

(خود نوشت)

پرچھائیوں کا شہر

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

کمرے میں قدم رکھتے ہی اُس نے دروازہ بند کیا۔ چٹخنی چڑھائی۔ اور پُشت کو دروازے سے ٹکا دیا۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ کمرے میں تاریکی اُمنڈ رہی تھی۔ لمحہ بھر اُس کا وجود بھی تاریک گرداب میں گھر گیا۔ اور وہ بے دست و پا چکرانے لگی۔ صرف اُس کی دو آنکھیں۔ چمکتی ہوئی، لَو دیتی ہوئی آنکھیں اپنی جگہ ثابت و سالم تھیں۔

اُس کی قوّتِ سامعہ واپس لوٹ رہی تھی۔ پتھریلی آہٹیں ڈوب رہی تھیں۔ دستک بُجھ چکی تھی۔ اور گھر میں پھر سے سنّاٹا ہو گیا تھا۔ پار کے کمرے میں امّی گٹھری بنی سوئی ہو گی۔ اُس کے چہرے کی ڈھیلی جلد پر آنسوؤں کی نمی میٹھے میٹھے سے نقش چھوڑ گئی ہو گی۔ چاند خلاء کی وسعتوں سے اُکھڑ اُکھڑ کر ٹین کی چھتوں پر ریزہ ریزہ بکھر چکا تھا۔ اور سفید مکانوں میں سہمے لوگ کروٹ بھی نہ بدل سکے۔ سُنسان سڑک پر پیلی پیلی پرچھائیاں دراز تھیں۔ جیسے یہاں سے کوئی گُزرا ہی نہ ہو۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے پتھریلے چہرے پر کائی جمائے ——— وہ اِسی سڑک سے گُزرے۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی سڑک اُنہیں کہاں لے گئی۔ اُسے معلوم نہ تھا۔

اور وہ آبنوسی دریچے پر تنہا مہین لباس میں چاند کی طرح سُلگتی رہی۔! اُس کی سیاہ آنکھوں میں شُعلے کی طرح دمک تھی، "دد سوچتی ہوئی آنکھیں، نچلے ہونٹ سے بُوند بُوند ٹپکتا لہو۔!

امّی کی آنکھوں کے ساگر میں کالی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔!

اُس روز وہ درد کی لہروں پر غلطاں تھی۔ اُس کا سارا بدن پکّے پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ اُس کی تھکی تھکی دھندلائی نظریں ساس کے چہرے کی دلدل میں گرفتار تھیں۔ اور روشنی کی ننھی کرن تاریک غاروں سے باہر نکلنے کی جدّوجہد کر رہی تھی۔ وہ نڈھال تھی ——— مایوس، وہ سارے بندھن توڑ کر آزاد فضاؤں میں روشنی بن کر پھیل جانا چاہتی تھی۔ معاً بھابی کی آواز نے اُس کے کانوں میں شہد گھول دیا۔ وہ آ گئے ہیں اور پار کے کمرے میں چائے پی رہے ہیں۔ اور پھر ——— اُسے محسوس ہوا کہ کربِ تخلیق کی لذّت اُس کے لہو میں چراغاں کر رہی ہے۔ اُسے سکون مل رہا تھا۔ لیکن وہاں جتنی عورتیں تھیں ایک ایک کر کے مُنہ لٹکائے نکل گئیں اُس نے روشنی کے ٹکڑے کو ہمکتی چھاتیوں میں جذب کیا۔ اُس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنی شکل بھی نہ دکھائی، اور اگلے روز نہ چلے گئے۔ اور پھر کبھی نہ آئے۔

کام کاج سے فارغ ہو کر وہ اُفق کے سینے میں دھنستے ہوئے پہاڑوں کو دیکھتی۔!

ماں بیٹی دونوں منحوس ہیں ——— منحوس۔!، دفعتاً اُونچے اُونچے پہاڑ چیخنے لگتے، اور وہ گھبرا کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیتی۔ اور بے حال ہو جاتی۔

تیز آندھی درختوں کے جسم سے سُوکھے پتّوں کے لباس کی دھجّیاں اُڑا رہی تھی۔ اور کمروں میں گرد کی تہیں جم رہی تھیں۔ پھر برف گری۔ برف کے پہاڑ جم گئے۔ اور وہ ہفتوں تک "معمر" ڈاکیئے کی صورت دیکھنے کو ترس گئی۔ برتن مانجھنے کے بعد وہ یخ زدہ اُنگلیوں کی پوروں کو سانسوں کی حرارت پہنچاتے پہنچاتے کھڑکی پر جھول جاتی۔ برف پگھل کر بہہ گئی۔ بہار کی چمکیلی دھوپ کے لمس سے پتھر پھول بنے۔ لوگ تاریک تہہ خانوں سے نکل کر گلابی فضاؤں میں دوڑنے لگے۔ اُس کی ساس کو پیروں، فقیروں کے تعویذ گنڈے جلانے کے بعد جو فرصت ملتی، وہ اُسے کوسنے میں صرف کرتی ——— ڈائن، تم نے میرے لال کو کھا لیا۔ اور جب سے اِس منحوس کو جنا ہے، گھر میں نحوست برستی ہے۔ اُس نے اب خرچہ بھیجنا بھی بند کر دیا ہے۔ وہ پلکوں کی اوٹ میں سمندر کو روک کر کام میں جُٹ جاتی۔

باہر سڑکوں پر سنّاٹا تھا۔ کس کی مجال تھی دھوپ کی کالی شدّت میں گھر سے باہر نکلے۔ وہ کمرے کے حبس میں اپنی ننھی گڑیا پر چھوٹی پنکھا جھل رہی تھی۔ اور اعضاء شکنی محسوس کر رہی تھی۔ معاً اُس کے ننھے سے چہرے سے ایک جالے

پہچانے چہرے کا ہیولیٰ اُبھرنے لگا۔ وہ کِس دنیا میں آگئی تھی۔؟
یہاں مرد اپنے وجود کو آتشیں سانسوں میں گھول کر عورت کے
باریک سے باریک رگ و ریشے میں لہو بن کر رواں ہوتا ہے۔
اور جب کالے پہاڑوں کے اُس پار سے بلاوا آتا ہے تو وہ بازوؤں
کے حلقے کو توڑ کر بے رُخی سے چلا جاتا ہے، اور پھر مُڑ کر بھی نہیں
دیکھتا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ اُس کا کیا قصور ہے۔؟

ایک روز دروازے پر دستک ہوئی۔
وہ لپکتی ہوئی سیڑھی سے اُتری۔

ڈاکیئے کے چہرے کی دراڑوں سے ایک ہاتھ اُبھرا، جس نے
اُسے ایک لفافہ تھما دیا۔ وہ ایک ہی سانس میں سیڑھی پھلانگ
گئی۔ سانس کے مُردے نے حرکت کی، اور کاغذ کی چکنی سطح سے حروف
پھسل پھسل کر اُسے گھیر رہے تھے۔ اُس کی گڑیا ننھے ننھے ہاتھوں
سے طلاق نامے کو اُچھال رہی تھی۔ کچن گاڑھے دھوئیں سے بھر
گیا تھا۔ اور سالن کے جلنے کی کڑوی بو اُس کے نتھنوں میں گھُس
رہی تھی۔!

اُمّی کھانسنے لگی، سنہرے سائے لرز کر اُس کی آنکھوں کے
ویرانوں میں گُم ہوتے۔ جب بھی وہ کھانستی تو اُسے بے حد اذیت
کا سامنا کرنا پڑتا۔ کھوں، کھوں، کھوں ـــــ اُس کے قدموں
کے نیچے سے زمین سرک رہی تھی۔ اور آس پاس کی دیواریں اینٹ
اینٹ کر رہی تھیں۔

تم اب آرام کرو ماں ـــــ! اِس داستان کی بقیہ
کڑیاں وہ خود جوڑے گی۔ آج تک تم برابر ٹالتی رہیں۔ اور اُس کے
سینے پر پہاڑ جم گیا۔!

دن بھر وہ گھنے ہمہماتے جنگل میں چلتی رہیں۔ اور جنگل اُن
کے آگے آگے دوڑتا رہا۔ اور عکس در عکس خوشبوؤں کی نازک پتیاں
گرتی رہیں۔ سب سے پہلے اُن کی ٹولی جھلملاتے چشمے پر پیاس
بُجھا کر لوٹی تھی۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ وہ غلط راستے پر جا
رہی ہیں۔ وہ خوفزدہ ہوئیں۔ اُسے فوراً یاد آیا کہ وہ صنوبر کے
درختوں کے جھنڈ کے پاس ہی جہاں وہ آتی بار سستانے بیٹھی
تھیں۔ راستے سے بھٹک گئی ہیں، اُس نے فوراً اپنی چار
ساتھیوں کو خبردار کیا۔ لیکن عارفہ نے ضد کی کہ صحیح
راستہ وہی ہے جس پر وہ چل رہی ہیں۔ عارفہ کی یہ عادت تھی۔
کہ وہ ہر بات میں اُلٹی منطق سے کام لیتی، اور اپنے حریف کو
نیچا دکھانے کے لئے اُس پر اڑ جاتی۔ لیکن یہاں معاملہ کتنا نازک
تھا۔ وہ اِس تاریک راستے پر ـــــ اُس نے زبردست
احتجاج کیا۔ اور عارفہ نے اپنی ہمہ دانی پر حرف آتے دیکھ کر بے
دردی کے ساتھ وار کیا۔ تو راستے کا کیا پتہ بتائے گی صِفر۔ تجھے خود
اتا پتا معلوم نہیں ـــــ کتنا شدید وار تھا، اُس کا سارا جسم لہو
لہان ہو گیا۔ اُس کے ہونٹ پتھر کی سِل ہو گئے۔ گھنی شاخوں نے
جھرجھری لی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرت
ہوتی کہ وہ اپنے جسم سے باہر نکل آئی ہے۔ اور سامنے گھنے سایوں
میں اُس کا جسم ساکت کھڑا ہے ـــــ مرمریں مجسمہ۔ اُکھرا بدن
لمبی گردن۔ سینے کی مُدوّر گولائیاں، شفاف پیٹ۔ لہراتے گھنے
گھنے بال۔ اچانک مجسمہ سنہرے دُھوئیں میں کسمسانے لگا۔ ارے،
اِس میں جان پڑ گئی۔ اُس نے فوراً سر کے گھنے بالوں سے اپنے ننگے
وجود کو ڈھک لیا۔ اُس کی چمکیلی آنکھوں میں تجسّس تھا، چہرے
پر لگن تھی۔ اور وہ جنگل جنگل جوگن بن کر اپنے وجود کی آگہی حاصل
کرنے کے لئے پھرتی رہی۔

ٹپ ـ ٹپ ـ ٹپ ـ!

سیڑھی پر اُن کے بھاری بھرکم جوتوں کی بے ہنگم آواز اُن
سے پہلے ہی جست لگاتی اُوپر پہنچی۔ دیواروں نے جھرجھری لے لی۔
اور وہ کچن میں کٹھری کی کٹھری رہ گئی۔ اُن کے آنے کا وقت مُعین
نہ تھا۔ وہ نہ آتے تو مہینوں تک نہ آتے، اور جب آتے تو انتہائی
غیر وقت میں۔ کبھی دن ڈھلے اور کبھی رات گئے۔ اور سیدھے
اوپر آ کر دری پر تکیئے سے ٹیک لگا کے سُستانے لگتے۔ اور اپنے سیہ
فام ہونٹوں کو چباتے رہتے۔ اُمّی کی شفقت آمیز مزاج پُرسی
اُن کے پتھریلے چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہ کرتی، اور وہ کچن میں پیچ و
تاب کھاتی۔ اُمّی دس روز تک بیمار رہی۔ وہ آج ہڈیوں کا
ڈھانچہ بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن صاحبزادے سے مزاج پُرسی
کا ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔ کھوں ـــــ اُمّی بھی کتنی عجیب
ہے۔ خواہ مخواہ اُن پر شفقت نچھاور کر رہی ہے۔ اور وہ
ـــــ ہو، کیا ضروری ہے کہ وہ اُن کے پاس چلی جائے۔

امّی کے بھتیجے ہیں تو ہوا کریں۔ اُس نے کیتلی میں اُبلتا پانی انڈیل دیا۔ کیتلی اور پیالیاں ٹرے میں رکھ دیں۔ اور خود کھڑکی کی سمت گھوم کر چاول صاف کرنے لگی۔ اُس کے ذہن پر کوئی نامعلوم دباؤ بڑھ رہا تھا۔ دائیں جانب کھانے پینے کے برتن اور اسٹوو کا شور سب بے معنی تھا۔ بے وجود، اس لمحے اگر کسی کا وجود تھا تو فقط ایک رینگتے ہوئے سیاہ ہاتھ کا۔ جو اُس کی حسیاتی صلاحیتوں کو نچوڑ رہا تھا۔

چائے کی ٹرے اسی حالت میں واپس آ گئی۔

اُس کا دل دہلنے لگا۔ وہ نیم تاریک دہلیز کو جلدی سے پھلانگ کر اپنے کمرے میں آئی۔ اُس نے دروازہ بند کیا، دیواروں پر کان اُگ گئے تھے۔

ٹپ۔ ٹپ۔ ۔ !

بھاری بھرکم جوتوں کی بے ہنگم چاپ دہلیز کی خاموشی کو منتشر کرتے ہوئے سیڑھی کے زینوں پر لڑھکنے لگی۔ اور وہ بند دروازے پر اپنے جسم کا سارا بوجھ ڈالے ذہن کی تاریک گہرائیوں میں اُتر چلی گئی۔

سایہ آلود سنسان سڑک پر وہ لمبے لمبے کوٹ اور خاکی پتلون میں اپنے جسم کو گھسیٹ رہے تھے۔ اُن کے فراخ اور شکن آلود ماتھے پر اُن کی ٹوپی جھک آئی تھی۔ اُن کے قد کا سایہ اُن کے آگے آگے لپک رہا تھا۔ سیاہی مائل چہرے پر تردّد تھا۔ اذیت تھی۔ وحشت تھی۔ آنکھوں کی سایہ در سایہ تہوں میں آگ کی پرتیں سُلگ رہی تھیں۔

وہ اِس توہین کا بدلہ لے کر رہیں گے، سائے چیخ رہے تھے۔ چاند درختوں کی اونچائیوں سے پھسل پھسل کر نہر روڈ کے اُس طرف بھاگتے دریا میں ہچکولے کھا رہا تھا۔!"

۲

وہ ایک آزاد ہرنی کی مانند بید زاروں کے سائے میں ٹھہری جھیل کے سبز پوش کناروں پر دوڑتی رہی۔ کالے پہاڑوں میں گنگناتی اس سیراب جھیل کو دیکھ کر اُس کے پیاسے ہونٹ جھلنے لگے۔ بار بار اُس کے دل میں یہ خواہش مچلی کہ وہ کنول کے پھولوں کے متحرک ہجوم میں دفن ہو ـــــ اور پھر وہ اپنی حماقت پر ہنس دیتی، اور کسی نقرئی چشمے پر اپنے دودھیا پیر ڈالے خاموش نیلی وسعتوں میں اُڑتے ہوئے بادلوں کے ساتھ پرواز کرتی۔

اتوار کو وہ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی بے انت پگڈنڈیوں پر مستانہ وار تھرکتی رہی۔ تیزی سے پھیلتے ہوئے سایوں میں اجنبی چہرے تھکن کا بوجھ لئے ہوئے تحلیل ہو رہے تھے۔ اُس دن اتنی دیر کرنے پر امّی نے اُسے ڈانٹ بتائی، لیکن ممانی جان نے اُس کی حمایت کے لئے جیسے کمر باندھی تھی۔ وہ سوکھے ہاتھ اُٹھا کر اُسے دعائیں دینے لگی۔

شہتوت کے بوڑھے درخت سے دو قدم آگے چل کر اُن کا پورا مکان ایک سیاہ پوش چٹان کی طرح نظر آ رہا جیسے صدیوں سے وہاں اِستادہ تھا۔ قطار در قطار، سایہ سایہ کھڑکیاں، چُپ چاپ پُراسرار، چھوٹی چھوٹی اینٹوں پر سیاہی کی تہہ جمی ہوئی، اس کہنہ مکان کو صدیوں سے کسی آدم زاد کا اِنتظار تھا۔ اور دریچوں کے اندر منقش کمروں میں مدھم روشنی میں اَن چھوئی حسینائیں شب خوابی کے حریری لباس میں محوِ خواب تھیں۔ دروازوں پر سیاہ فام دیوزاد کالی کلہاڑیاں لئے پہرہ دے رہے تھے۔

اُس کے جسم پر کپکپی دوڑنے لگی۔ اُس نے رضائی جسم پر لپیٹی۔ اور آنکھیں بند کیں۔ لیکن اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پیلا داغدار چاند کالے پہاڑوں کے پیچھے نامعلوم غاروں میں نابود ہو چکا تھا۔ سنّاٹا گہرا ہو چکا تھا۔!

نامعلوم پگڈنڈیوں پر دوڑتے دوڑتے اُنہوں نے درختوں کے گھنے جھنڈ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ وہ جھیل کے جنوبی سرے پر پہنچ گئے تھے۔ ایک سنسان جگہ، جہاں قدم قدم پر خودرو جھاڑیاں تھیں۔ اور لمبے لمبے پروں والے پتنگے جھاڑیوں میں گُم ہو رہے تھے۔ معاً اُس کے دل میں ایک نامعلوم خدشہ پیدا ہوا۔ افضل اُسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ ۔ ؟

سامنے ایک بہت ہی بلند سنگین دروازہ تھا، محرابی سیاہ پتھروں پر کائی جمی، نصف حصّہ منہدم۔ اچانک ایک بڑے سوراخ سے جنگلی کوّوں کی ایک جماعت برآمد

ہو کر کالے نقطوں میں تبدیل ہو گئی۔ زنگ خوردہ سائے لرز لرز گئے۔ محرابیں، دریچے، حمّام، دیوان خانے، چبوترے ــــــ ایک ایک کر کے کھنڈر بن رہے تھے۔ کالے تراشیدہ پتھر ایک دوسرے پر اوندھے منہ گر رہے تھے۔ ــــــ ورق ورق داستاں، وہ کھو گئی، خوابوں کے کھنڈرات اُسے آواز دے رہے تھے۔

دونوں چُپ تھے۔ کالا سنّاٹا چیخ رہا تھا۔!

وہ اُن کے پیچھے پیچھے بے اختیار چل رہی تھی۔ ایک سیاہ چٹان کے قریب اُن کے قدم رُک گئے اور خاردار جھاڑیوں کو بے خطر ہاتھوں سے صاف کر کے وہ تنگ و تاریک سیڑھی سے نیچے اُترنے لگے۔ لمحہ بھر کے تامّل کے بعد وہ بھی خود بخود زینہ زینہ اُترنے لگی۔ گرد و غبار اور مکڑی کے جالوں سے آلودہ ہوتے ہوئے ــــــ وہ بہت نیچے پاتال میں اُتر رہی تھی۔ اور پھر اُس نے جو نظر اُٹھائی تو سامنے کوئی نہ تھا۔ وہ کہاں غائب ہو گئے تھے۔؟

افضل ــــــ! وہ چیخ اُٹھی اور برابر چیختی رہی۔ لیکن نیم تاریک بھول بھلیاں میں اُس کی چیخیں صدائے بازگشت کے بے شمار دائرے پھیلاتی رہیں۔ اور وہ ایک دائرے سے نکل کر دوسرے دائرے میں گرفتار ہوتی رہی ــــــ وہ ہانپتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ اُسے باہر سورج کی روشنی اور کھلی ہوا میں آنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ اور بازو زخموں سے چُور ہو گئے۔ دوپٹہ تار تار ہو کر تاریک سیلی ہوئی راہوں میں بکھر گیا۔ قریب تھا کہ وہ مارے خوف کے چکرا کر گر جاتی۔ اُسے دائیں جانب دھوپ کا ایک غبارہ یں ہالہ سا نظر آیا۔ وہ بے تحاشا اُدھر بھاگی۔ اور ٹپ ٹپ زینے چڑھنے لگی۔ روشنی گہری ہوتی گئی۔ اور سورج کھنڈرات کے بائیں جانب نیچے جھک آیا تھا۔

وہ بے حال ہو چکی تھی۔ اُس نے دیکھا وہ بڑی لاپرواہی کے ساتھ ایک سیاہ چٹان پر لیٹے اخروٹ توڑ رہے ہیں۔

حد کر دی آپ نے ــــــ مجھے وہاں چھوڑ کر خود یہاں مزے کر رہے ہیں۔ ــــــ وہ جھنجھلا پڑی۔

اُنہوں نے زور کا ہریاں قہقہہ بلند کیا۔ جھیل کے سنّاٹے میں چند رو پہلی مچھلیاں اُچھل کر پھر سیہ ہتوں میں غائب ہو گئیں ــــــ "آؤ، اخروٹ کھاؤ" یہاں بیٹھ کر وہ چٹان پر سر رکھ کر خلاؤں کو گھور رہے تھے۔

نہیں، میں ابھی گھر جانا چاہتی ہوں۔ وہ سراپا احتجاج تھی۔ اُس کی آنکھوں سے دریا بہہ رہا تھا۔ دائیں بائیں سیہ فام ٹیلے تھے۔ جو اُوپر جا رہے تھے۔

کیا یہاں سے کوئی راہ نجات نہیں۔؟

اُس رات اُس نے خواب دیکھا، وہ کسی اجنبی شہر میں آنکلی تھی۔ لوگ ننگے پاؤں اور ننگے سر پو پھٹنے سے پہلے ہی مَعبدؔ کے وسیع و عریض صحن میں ٹولیوں میں جمع ہونے گئے۔ اُن کے پاؤں پر چھالے پڑے تھے۔ گریبان تار تار تھے، وہ فریاد کر رہے تھے۔ معبد کی مقدّس دیواروں کے چاروں طرف آہن پوش پرچھائیاں جم کر پہرہ دے رہی تھیں۔ یہ لوگ معبد کے بند دروازوں پر آویزاں تالوں کو توڑنا چاہتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں چاقو تھے، کلہاڑیاں تھیں، آرے تھے۔ لیکن آہن پوش پرچھائیوں نے مَعبد کے سقف بالا تک دیوار کھڑی کی تھی۔

لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ اور فریاد کا شور گرجنے لگا۔ ہمیں بتا دو، معبد کے اندر آیاتِ نُور پر کس نے سیاہی پھیر دی ہے۔؟ اُس کے ہاتھ قلم کر دو ــــــ چشم زدن میں سنسناتی گولیاں ہزاروں جسموں کے آر پار ہو گئیں۔ کتنی جگر خراش چیخیں لہو کے سمندر میں غرق ہوئیں ــــــ لہو کا سمندر شہر کی سڑکوں پر بہنے لگا۔ لوگوں نے دروازے اور کھڑکیاں بند کیں۔ چولھے بجھا دیئے، اور شور مچاتے بچّوں کے حلق دبا دیئے۔ بازاروں میں سنّاٹے پھر رہے تھے۔ ساری دکانیں بند تھیں۔ باغ میں سیب کا تنہا پیڑ شاخ شاخ جلتا رہا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دونوں ماں بیٹی سر سے پیر تک کانپ اُٹھیں،

افضل گرتے پڑتے، لہو سے چپکے کپڑوں کے ساتھ منہ سے خون اُگلتے ہوئے اُن کے گھر آ گئے، اور اُس نے ہمدردی اور خوف کے جذبات سے کانپتے ہوئے اُن کے زخموں پر پھاہا رکھ دیا۔ اُسے گرم گرم دودھ پلایا۔ جب رات گئے اُن کی آنکھ لگی تو وہ اُن کے سرہانے بیٹھ کر

پنکھا جھلتی رہی۔

کھڑکی پر چاندنی کا ایک سفید دھبہ چپک گیا تھا۔ یہ دھبہ پھیلتا گیا اور در و بام پر دھوپ کا اُجالا ہو گیا۔ وہ گلابی سُوٹ میں ملبوس تھی۔ اور بہت سمارٹ لگ رہی تھی۔ بڑے گیٹ سے پنڈال تک حریری محرابیں لگی ہوئی تھیں۔ تھکا دینے والے انتظار کے بعد مہمان خصوصی آئے۔ سفید ریشمی اچکن پہنے ہوئے۔ اُن کے آگے آگے اُن کی توند جا رہی تھی۔ اُن کی چھوٹی گردن پھولوں کے بوجھ سے دب گئی تھی۔ اُنہوں نے سکرٹری کی رپورٹ کے بعد ٹوٹی پھوٹی زبان میں تعلیم کی اہمیت پر بھاشن دیا۔ اسٹاف کے ممبر جمھائیاں لینے لگے۔ اُن کی میڈم نے جب کہا کہ وہ کبھی کسی اسکول یا کالج میں نہیں پڑھے ہیں۔ تو کلاس کی سب لڑکیاں ہنس پڑیں۔ اُنہوں نے تین بار مونچھوں سے لٹکتے گچھوں کے نیچے نقلی دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اُسے پرائز دیئے۔ وہ اِسپورٹس میں اوّل آئی تھی۔ اُس کے علاوہ اُس نے ڈبیٹنگ اور آرٹ کمپیٹشن میں اُس نے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی ـــــ وہ بہت نروس ہو رہی تھی۔ اور جب جلد جلد گھر لوٹی، تو امّی نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

نئے پُل کے پاس ہی میمونہ کا گھر تھا۔ وہ ایک عجیب لذت انگیز اضطراب کے ساتھ وہاں گئی۔ میمونہ کے بھائی فیروز کو وہ ناول بھی لوٹانا تھا۔ جو وہ مسلسل تین روز تک پڑھتی رہی۔ وہ حقیقت سے بہت دُور آرٹسٹ کے ساتھ ساتھ شفاف آئینہ خانوں میں حیران پھرتی رہی، اور پھر ـــــ وہ شرمائی۔ میمونہ تو صرف ایسے ہی ناول کو چاٹتی رہتی ہے۔ بے شرم، وہ ضرور اُسے آڑے ہاتھوں لے گی ـــــ لیکن میمونہ کے حلق سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔ جیسے وہ سالانہ جلسے میں تھی ہی نہیں۔ فیروز بھی غائب تھا۔ شام درختوں کی شاخوں پر جھول رہی تھی۔ وہ صرف فیروز کا انتظار کر رہی تھی، تاکہ وہ گھر تک ساتھ دے۔

وہ گھر لوٹی ـــــ تنہا تنہا ـــــ وہ چکا چوند کرنے والی روشنی میں اجنبی چہروں کے اُمڈتے ہجوم میں مشکل سے راستہ بناتی رہی۔

۳

امّی دولت آباد گئی تھی تاکہ وہاں سے سردیوں کے لئے چاول، دالیں اور آٹا منگوائے۔ وہ بھائیں بھائیں کرتے دیوانی سی گھوم رہی تھی۔ اُسے کتابوں سے وحشت ہو رہی تھی تنہائی کا زہر اُس کی رگ رگ میں اُتر رہا تھا۔ اچانک فیروز آیا۔ جھینپا ہوا۔ دونوں نے دیر تک باتیں کیں۔ کھڑکی پر شہد کی مکھی بھنبھناتی رہی ـــــ زیادہ باتیں تو وہی کرتی رہی۔ اور وہ سُنتا رہا۔ نہ جانے کیوں اُس کے سامنے اُس کی زبان پر مُہر لگ جاتی ہے۔ وہ اُس کی خاموشی اور بے بسی کا دل ہی دل میں لطف اٹھاتی رہی۔ معاً اُسکے دل میں یہ خواہش مچلنے لگی کہ وہ اُس سے کسی چیز پر لڑ پڑے، وہ دونوں چھینا جھپٹی پر اُتر آئے۔ اور پھر فرش پر ایک دوسرے سے اُلجھتے چلے جائیں۔

میں چلتا ہوں ـــــ اُس کا لہجہ اُداس تھا۔

باغ میں سیب کا تنہا پیڑ ہلکے سایوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں پیڑ کے پاس کھڑے رہے۔ دُور مؤذن کی آواز سایوں کو چیرتی ہوئی ٹین کی چھتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے، چُپ چاپ۔ معاً فیروز نے اپنا لرزتا ہوا دایاں ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔ ہاتھ پھسلتا ہوا اُس کے سینے کی سخت گولائیوں سے ٹکرا گیا۔

وہ چونک اُٹھی۔

ارے ـــــ رے، پرندوں کو ہاتھ لگے تو فر سے اُڑ جاتے ہیں۔ اُس نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اُس کے شوخ قہقہے سایوں پر بہتے چلے گئے۔

مچھر دانی میلے کپڑوں کے ساتھ فرش پر گٹھری بنی ہوئی تھی۔ رہ رہ کر مچھروں کی بھنبھناہٹ اُس کی سماعت کے پردوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ کسی ڈھیٹ مچھر نے اُس کی گردن میں سوئی سی چبھو دی۔ وہ تلملا اُٹھی، اور نرم انگلیوں سے گردن کو سہلانے لگی۔ گردن کا سیاہ داغ جو کافی عرصہ پہلے غائب ہو چکا تھا، پھر سے نمودار ہو گیا تھا۔ گرم بھٹی میں دھات کا دہکتا ٹکڑا۔ اُس کی انگلیاں جل اُٹھیں۔

وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس کا سینہ کھلا تھا۔ بریز یئر اُتار کر اُس نے کھلا ریشمی کرتہ پہنا تھا۔ اُس دن دولت آباد کی نیلگوں فضاؤں میں، بادام کے شگوفوں کی دھول اُڑ رہی تھی۔ وہ پائیں باغ میں انگور کے چھجّے دار بیل کے پاس کھڑی تھی۔ ایسے ہی بے مقصد، افضل لاپروائی کے ساتھ پتھر کے بنے ہوئے برآمدے پر لیٹے دھوپ سینک رہے تھے۔ مُمانی جان مٹّی کی دیوار کو پھلانگ کر سبزی باغ میں چُھپ گئی تھیں۔ اتنے میں دو کالے بھنورے گُنگُناتے ہوئے آئے اور اُس کا طواف کرنے لگے، وہ اِن میں گِھر چکی تھی۔ اور فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔

افضل بھ.... یّا !۔ وہ چیخی اور بے بسی میں ناچتے ہوئے بازوؤں سے اپنا چہرہ چُھپانے لگی۔ اتنے میں اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی گردن میں کسی نے تیز برچھی اُتار دی ہے۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھی۔ گھر میں اُن کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ اُنہوں نے چیتے کی سی جَست لگائی اور اُس کی طرف دیکھے بغیر اندر گئے۔

وہ زمین پر پڑی درد سے لوٹنے لگی۔ وہ آئے، تو اُن کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی تھی۔ اور ایک تیز پھل والا چاقو۔ !

یہ آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟ وہ متوحّش نظروں سے اُنہیں گھورنے لگی۔

اُنہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آگے بڑھ کر اُنہوں نے اِس کے سر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور اُس کی گردن کو تیز چاقو سے کُھرچنے لگا۔

نہیں نہیں۔ مجھے چھوڑ دیجئے۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ الگ ہو گئی اور وہ لمحہ بھر کے لئے احمق کی طرح اُسے دیکھتے رہے۔

پُوری گردن پُھول جائے گی۔ اُس کے ڈنک میں زہریلا کانٹا ہوتا ہے۔ انتہائی سخت لہجے میں اُنہوں نے الفاظ ہوا میں اُچھال دیئے۔

لیکن میں چاقو سے کُھرچنے نہ دوں گی۔ ہائے میں مری۔

تم مر نہیں جاؤ گی۔ آؤ، میں دوا اُنڈیلتا ہوں۔ سارا زہر بے تاثیر ہو جائے گا۔ اُنہوں نے لپک کر تیزاب کی چھوٹی شیشی اُس کی گردن پر اُنڈیل دی۔ چیخ پُکار سے اُس نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ سبھی پریشان ہوئے۔ آس پاس کے ہمسایوں کا ہجوم ہو گیا۔ اور سبھی افضل کو لعن طعن کرنے لگے اور تخفیف درد کے لئے نُسخے تجویز کرتے گئے۔ اور پھر دو مہینوں تک اُس کی گردن پر ایک کالا داغ جما رہا۔

— درندہ۔ !

اُس نے تہیّہ کر لیا کہ وہ کبھی دولت آباد نہیں جائے گی۔

— کبھی نہیں، مُمانی جان کو افضل نے ہمیشہ پریشان کیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ماموں جان مرتے دم تک اُن کے تخریبی رویّے سے نالاں رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ افضل گھر کی دیکھ بھال کریں، شہر میں بزنس کو سنبھالیں۔ لیکن اُنہوں نے کبھی اُن کی خواہش یا تنبیہ پر کان نہیں دھرا۔ وہ عجیب عجیب سی ناقابلِ فہم عادتوں کے شکار ہو گئے تھے۔ کبھی دو دو، تین تین دِن کمرے میں سوئے پڑے رہتے کبھی ہفتوں تک شکار کھیلنے کے لئے جنگلوں میں غائب رہتے، کتنی راتیں اُنہوں نے ہوٹلوں میں کاٹی تھیں، جب سے اُنہیں شراب کی لت پڑ گئی تھی، وہ زندگی اور گھر کی جملہ ذمّہ داریوں سے لاتعلق ہو گئے تھے۔ اُن کا صرف ایک کام رہ گیا تھا کہ وہ رات گئے نشے میں دُھت آ کر حسینہ کی بُری طرح پٹائی کر دیتے۔ وہ چپکے سے مار کھاتی۔ اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتی۔ سبھوں کے لئے کھانا بنانا، برتن مانجھنا، جھاڑو پھیرنا۔ بستروں کو تہہ کر کے رکھنا، مویشی خانے میں گائے سے دودھ دوہنا، دو بچھیوں کو سنبھالنا اور پھر اُن کی جھڑکیاں کھانا —— یہ سب کام اُس کے ذمّے تھے۔ اور وہ جسم کے سنگار سے بے نیاز میلے کچیلے لباس میں ایک متحرّک سائے کی طرح نظر آتی۔ جب بھی وہ وہاں گئی۔ حسینہ کی زندگی کے شب و روز اُس کے لئے لمحۂ فکریہ مہیّا کرتے۔ اِس مظلوم صنف سے خود بھی متعلق ہونے پر اُسے ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا —— کاش وہ ایک لڑکا ہوتی !

اُنہیں اپنی جوڑواں لڑکیوں سے نفرت تھی۔ اور اُسے افضل سے شدید نفرت تھی۔

اُن کی بڑی بڑی ویران آنکھوں کے دہکتے اَلاؤ لرزہ خیز تھے۔ وہ اُن کے لمبے چہرے کی گہری شکنوں میں دھنستی چلی جاتی! وہ اِچانک شام کے رینگتے سایوں سے برآمد ہوئے تھے۔ اور مدھم سی روشنی میں بڑی لاپروائی سے گھمبیر لہجے میں بے مقصد باتیں کر رہے تھے۔ وہ پار کے کمرے میں اُن کے الفاظ کے بوجھ تلے دب رہی تھی۔

اُس دن وہ وہاں گئی اور پھر کبھی نہ گئی۔ وہ بی اے کا
امتحان دے چکی تھی۔ امّی کے بے حد اصرار پر وہ چند روز تفریحاً وہاں
گزارنے پر راضی ہو گئی۔ اُسے پُورا یقین تھا کہ وہ امتحان میں نمایاں
پوزیشن حاصل کرے گی۔ اور پھر سائیکالوجی یا ایجوکیشن میں ایم اے
کرے گی۔ اُسے وہ زمانہ یاد تھا جب اُسے کتابوں سے وحشت
ہونے لگی تھی۔ کلاس کے حبس میں اُس کی رُوح گھٹنے لگتی۔ اُسے
جاگتی آنکھوں میں چلتی پھرتی کتابیں نظر آتیں۔ جو قریب آ آ کر اُس
کے وجود کو گھیر لیتیں۔ اور وہ بے بس ہو جاتی! اُس نے اِس
واقعہ کو رنگوں میں بھی سمیٹ لیا تھا۔ اُس کے ہاتھ کبھی کبھی
خود بخود رنگوں اور برش کی جانب اُٹھتے ـــــ وہ اُلٹی سیدھی
لکیریں کھینچتی۔ مسخ شدہ چہرے، باتیں کرتے درخت، منہدم
دروازے، چلتے سائے، لہو اُگلتے پتھر، ـــــ عجیب عجیب خواب
اُسے پریشان کرتے۔ اور جب تک وہ اُنہیں رنگوں کو قید نہ کرتی۔
اُسے سکون نہ ملتا۔ مس کوتیا نے اُس کے آرٹ کی بڑی سراہنا
کی تھی۔ وہ اُن کے گھر جاتی۔ اور وو کل میوزک کا لیسن لیتی۔ اُسے
افسوس تھا کہ کالج میں اُس نے میوزک کا سبجکٹ نہیں لیا تھا۔
مس کوتیا نے کہا تھا تم نے میوزک کا سبجکٹ نہ لے کر اپنے آپ سے
بے انصافی کی ہے۔ تم گاتی ہو تو پتھر پگھل جاتے ہیں۔ اُن کی باتوں کی
طرح اُن کا چہرہ پُرکشش تھا۔ سُرمگیں آنکھوں میں تیرتے سائے،
وہ جب بال کھول کر گود میں ستار رکھ کر کوئی راگ چھیڑتی تو اُس کے
روئیں روئیں میں ستارے روشن ہو جاتے ـــــ خاموش، اُداس
اور سحر کار مس کوتیا کتنی بار اُس کے خوابوں میں آئی تھی اور اُس نے
کتنی بار شرم کو بالائے طاق رکھ کر اُسے سینے میں جذب کیا تھا۔ اور
ـــــ وہ خود سے بھی ایسے خوابوں کو چھپائے پھرتی تھی ـــــ!

دائیں بائیں سفید مکانوں کی چمنیوں سے دُھواں اُٹھ رہا
تھا۔ پار کے کمرے میں امّی کی مزاج پُرسی کے لئے چند معمر اُستانیاں
آئی تھیں۔ وہ دنیا جہاں کی باتوں میں مشغول تھیں۔

پیڑ کی شاخ شاخ شفق رنگ ہو رہی تھی۔

اُس کی بوٹی بوٹی تھرکنے لگی۔ اُس کے جسم کے اندر نامعلوم
گوشوں میں نغموں کے سرچشمے اُبلنے لگے۔ نغموں کی روشنی
جسم کے حصاروں کو پھاند کر شفق زاروں میں گم ہونے
کے لئے بے تاب تھیں۔ یہ روشنی بڑھتے بڑھتے سمندر بن گئی۔
اور سمندر سیلِ رواں کی صُورت تاریک سرنگوں سے گزر کر اُس
کے ہونٹوں پر آ کر منجمد ہو گیا!

سُوکھے پتّوں کا غبار دریچوں کو اندھا بنا رہا تھا۔

گھر میں آج خلافِ معمول سنّاٹا تھا۔ دُور دُور چند خس پوش
جھونپڑے اُوپر اُٹھتے ہوئے لہریئے دار دُھوئیں میں تحلیل ہو رہے
تھے۔ وہ کہاں آ گئی تھی۔ یہ اُسے گھر کی یاد تڑپانے لگی۔ امّی تنہائی محسوس
کر رہی ہوں گی۔ اور وہ خود یہاں تنہا ہے ـــــ ایک دم تنہا۔ حسینہ تھوڑی
دیر پہلے جُڑواں لڑکیوں سے اُلجھتے ہوئے خاموش سائے کی طرح وہاں
سے اُٹھ کے گئی تھی۔ افضل کے مزاج میں پہلے سے زیادہ سختی اور وحشت
آ گئی تھی۔ پچھلے سال اُنہوں نے میوہ جات کا کام ہاتھ میں لے کر پچاس
ہزار کا نقصان کیا تھا۔ مُمانی جان نے بُرا بھلا کہا تو وہ گھر کو آگ
لگانے کی دھمکی دے کر گئے۔ حسینہ کی بوجھل خاموشی متحرک ہو کر
کالے حرف میں ڈھلنے لگی۔ اور کالے حروف رینگتے ہوئے اُس کے
جسم کو چاٹنے لگے۔ وہ بے حد پریشان ہوئی۔

جھیل نے رات کے اسرار تاریک گہرائیوں میں دفن کئے
تھے۔ چاندنی بیدزاروں میں ہانپ رہی تھی۔ کنارے کے درخت
ڈھلوانوں پر پاگلوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ ڈر گئی اور کھڑکی
سے ہٹ گئی۔ دیوار پر آویزاں تعویذ شریف کے رنگین حروف پھیل
کر دیوار کو ڈھک رہے تھے۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کاش اُس
نے فیروزہ سے دو ایک ناول لئے ہوتے، تاکہ وہ دیر تک خوابوں میں
ڈوبی رہتی۔ میمونہ کی شادی کے بعد وہ اُس کی صُورت دیکھنے کو ترس
گئی تھی۔ وہ جیسے پر لگا کر کہیں اُڑ گیا ہے۔ سُنا ہے وہ کسی ورکشاپ
میں مستری کا کام کر رہا ہے۔ کمال ہے۔ ایسا نروس اور شریف آدمی
انسان اتنا سخت اور کھردرا کام کرنے جا رہا ہے۔ دُور نہیں۔ کسی
وقت بدحواسی میں اُس کا ہاتھ برقی مشین کی زد میں آ جائے ـــــ
توبہ توبہ، وہ کیسی باتیں سوچتی ہے۔ پاگل۔!

اُس نے کتنی بار طے کیا کہ وہ ناول پڑھنا چھوڑ دے،
خارجی زندگی سے اب اُس کا تعلق برائے نام رہ گیا تھا۔ بار
بار کلاس میں شاہراہوں کی ٹھٹکتی بھیڑ میں، سہیلیوں کے
جھرمٹ میں، گھر میں، ہر جگہ، اُسے محسوس ہوتا کہ وہ

اصل دنیا میں نہیں، بلکہ پرچھائیوں کے شہر میں چل پھر رہی ہے۔

اور لوگ ــــــ باتونی، مصروف بے مصرف، ایذا رسانی، چاپلوس اور احمق لوگ اُسے خوابوں کی متحرک پرچھائیاں معلوم ہوتے ہیں۔ بے وجود، اُس نے پلک جھپکی۔ چاندنی کے پیلے غبار جالی بُن رہا تھا۔ اُس نے اپنی ٹانگیں رضائی سے باہر نکالی تھیں۔ نرم، چمکیلے اور معطر بال تکیئے کو ڈھانپ چکے تھے۔ معاً قمیص اور شلوار کا بوجھ اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اُسے پیاس لگ رہی تھی۔ طاق پر ریڈیو کے ساتھ ہی پانی کا گلاس بھرا ہوا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اُسے اُٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کیوں نہ وہ اپنے جسم کو لباس سے آزاد کر دے؟ اور رات بھر خوب سوئے۔ اُسے اپنا ننگا جسم بہت پیارا لگتا ہے۔ اُس کے دودھیا جسم کا ہر عضو بھرا بھرا سا، نرم اور چکنا ہے۔ ایک دن اُس نے چُپکے سے کمرہ کا دروازہ بند کر کے سینے کی اُبھرتی ہوئی ناہمواریوں کو دیکھا۔ اُس کے رُخسار تمتما اُٹھے۔ اور آنکھیں جھک گئیں۔ نہیں، وہ کپڑے نہیں اُتارے گی۔ میمونہ کتنی بے شرمی کی باتیں کرتی ہے۔ ایسی باتیں جن سے وہ آج بھی لاعلم ہے۔ وہ اُسے طعنہ دیا کرتی، تم لڑکی نہیں ہو، لڑکا ہو ــــ صفو اور وہ کچھ بھی نہ سمجھ پاتی۔ بعض باتیں کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ بالکل سمجھ میں نہ آنے والی۔ اور جب وہ ایک دن بے خبری میں، ہو جاتی ہیں تو کتنی سراسیمگی ہوتی ہے۔ اور پھر ــــ اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے سُلگ رہے تھے!

وہ غیر شعوری طور پر اُٹھی تاکہ پانی پی لے۔ نرم اور چمکیلے بال اُس کی کمر کو ڈھکتے ہوئے نیچے تک لہرائے۔ وہ ایک ہی قدم چلی تھی کہ اُس کے پاؤں جم کر رہ گئے۔ اور ایک وحشت زدہ چیخ اُس کے گلے میں کانٹے کی طرح پھنس گئی۔

دیوار کے ساتھ پُشت کو ٹکائے وہ کھڑے تھے، اُن کا سر چھت سے جا لگا تھا۔ اُن کے تاریک چہرے پر صرف دو آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں!

وہ گھورتی آنکھوں کے اژدحام میں عُریاں ہو گئی تھی،

وہ کہاں جائے؟ ــــ کہاں جا کر چھپ جائے؟

گھورتی آنکھوں نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا

وہ اندھی ہو چکی تھی۔ متوحش ہو کر وہ واپس مڑی اور رضائی سے چمٹ گئی۔

تم ــــ! یہاں کیا کر رہے ہو؟، وہ چیخی۔

غبار آلود چاندنی تھرتھرا کر رہ گئی۔ کمینے، بدمعاش ــــ تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے ــــ میں ابھی ممانی جان کو بُلاتی ہوں۔ اُس کا سارا جسم کانپ رہا تھا!

اُنہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بھاری قدم اُٹھا کر وہ سیدھے اُن کے بستر کے قریب آ گئے۔ اور وہیں رُک گئے۔ وہ اُنگلیاں چٹخاتے ہوئے بڑی لاپروائی سے گدلی چاندنی کو گھور رہے تھے۔

میں کہتی ہوں تم چلے کیوں نہیں جاتے۔ میں سبھوں کو ابھی جگاتی ہوں۔

گھر میں کوئی نہیں ہے، وہ لوگ یہاں سے چار میل دور دعوت پر گئے ہیں۔ وہ صبح کو لوٹیں گے۔ اور ــــ اس خالی گھر میں صرف تم ہو اور میں ــــ صرف تم ــــ لمحہ بھر میں اُن کی شراب آلود سانسیں اُس کی آنکھوں، رُخساروں اور ہونٹوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ اور اُن کے لمبے سیاہ ہاتھ پھسل کر اُس کی گردن میں پیوست ہو رہے تھے۔ اُن کی دہکتی آنکھیں ــــ دہکتے سلاخ، وہ چیختی رہی، ہانپتی رہی۔ ــــ اُس نے اپنے سارے دانت اُن کے بازوؤں میں گڑھو دیئے۔ منہ خون سے بھر دیا۔ اُس نے اپنے ناخن اُن کے چہرے کی جلد میں پیوست کئے۔ وہ لہو میں لت پت ہو گئی ــــ وہ گڑگڑاتی رہی، روتی رہی، خدا اور رسول کا واسطہ دیتی رہی۔ تلملاتی رہی، یہاں تک کہ اُس کے بازو نڈھال ہو کے فرش پر گر پڑے۔ اُس نے دیکھا، تعویذ کے دُھندلے حروف بُجھ گئے، اور پھر ــــ دیواریں قریب آ گئیں۔ اُن کا آہنی ہاتھ اُس کے سینے کی گہرائیوں میں دھنس گیا۔ اور پھر اُن کی دہکتی اُنگلیاں ناف کے نیچے پھسلتی چلی گئیں۔ رات بھر اُس کی سانسوں میں ایک گھنا، مہکتا جنگل ہانپتا رہا۔

سورج طلوع ہوا۔

اُس کی آنکھ کھل گئی۔

ہائے اللہ ——— وہ مادر زاد ننگی ہے، بریزیئر، قمیص، شلوار ؟ اُس نے پاگل کی طرح جھٹ سارا بستر اُلٹ پلٹ کر دیا۔ پل بھر میں اُس نے کپڑے پہن لئے۔ اچانک رات کا پُورا واقعہ ایک بے جوڑ تصویر کی طرح اُس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ اُس کی رگ رگ میں تیزاب گھل گیا۔!

دوسرے لمحے وہ جب چکراتی ہوئی اُٹھی تو اُسے احساس ہوا کہ وہ قبرستان سے آئی ہوئی کوئی مسخ شدہ لاش ہے۔ جس کے سارے رشتے شکست ہو چکے ہیں، جسے معلوم نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ ؟

وہ کہاں جا رہی تھی۔ ؟

دھوپ کے تپتے ذرّے اُس کی بے حس آنکھوں میں چبھ رہے تھے۔!

۴

فضا میں رنگوں کا سیلاب بہک رہا تھا۔!

روپہلی دھوپ اُس کے پھیلے سیاہ بالوں سے پھسل رہی تھی عشق پیچاں کے شوخ رنگوں کے پھول برآمدے کے آہنی جنگلے سے کٹورے ایسی آنکھوں سے گھُور رہے تھے۔

وہ گلابی ہوا کی لہروں پر پھیل جانا چاہتی تھی۔

اشفاق ہر پل اُس کا تعاقب کرتے، ایک عجیب سا نشہ اُس کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا۔ جب وہ سامنے کے مکان میں رہنے کے لئے آئے تو اُن کو دیکھ کر بالکل متاثر نہ ہوئی، وہ اپنے نوکر کے ساتھ رہتے تھے، کمرے کو کباڑ خانہ بنائے ہوئے ہر وقت کتابوں کے حصار میں قید رہتے، دُبلے پتلے سے آدمی، ایک ہی سوٹ میں آتے جاتے، جس پر استری کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتے، تمام سوسائٹی سے قطع تعلق کر کے اپنے وجود میں گم۔!

وہ بہت اُداس تھی۔

چار دن تک اُن کا سایہ بھی نظر نہ آیا۔ آخر نوکر نے بتایا، وہ بخار میں مبتلا ہیں۔ پہلے امّی اور پھر وہ خود بھی اُن کو دیکھنے گئی۔ ہر طرف کتابوں کی دیواریں اور میلے کپڑوں کے ڈھیر، ایش ٹرے میں سگریٹوں کے انبار، دھواں دھواں دیواریں۔ سگریٹ کے متواتر کش لیتے ہوئے وہ کھوئے ہوئے انداز میں کہہ رہے تھے۔

انسان اور پودے میں کیا فرق ہے۔؟ دونوں زمین سے اُگتے ہیں۔ ایک روز درخت سُوکھ کر گر جاتا ہے۔ آدمی کی چکنی کھال ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اور ایک دن اُس کا سر لُڑھک جاتا ہے۔ سب زمین کا اُبال ہے۔ ذرّے اُڑتے ہیں، پھر نیچے گر کر مٹّی ہو جاتے ہیں۔ ——— وہ اُن کے الفاظ کے گھیر کو توڑ لیتی ہے، تو اُن کی سیہ تاب آنکھوں کی گہرائیاں اُسے ڈبو دیتیں۔ میں کسی کو اپنی بیماری کی کیا خبر دیتا۔؟ یہ کام ایسا تو نہیں جس کے لئے آدمی دس کام چھوڑ دے۔ آدمی بہت مجبور ہے۔ اُس کی ہر بات ہر حرکت اپنے مفاد کی پابند ہے۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ عجیب و غریب حیوان، جو صرف ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہے۔ اُن کے زرد چہرے پر گھنے سائے پھیل رہے تھے۔

خدا کے لئے اپنی زبان کو روک لیجئے، کیوں میرے زخموں کے ٹانکے کھول رہے ہیں۔؟ وہ اُن کے سایہ آلود لہجے سے کسی قدیم پتھروں کے شہر میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں الفاظ کے تیشے چمک چمک کر چٹانوں کا کلیجہ چیر رہے تھے، اور لہو اُچھل رہا تھا۔

امّی ریٹائر ہو چکی تھیں۔ اُس کی آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔ اور ٹانگوں کی رگیں ریاح کی تکلیف سے سکڑ رہی تھیں، اُس سال پُورا ملک سیلاب کی زد میں آ چکا تھا۔ دس روز تک دن رات موسلا دھار بارش ہوتی رہی اور لوگ تاریک کمروں میں بے سُدھ پڑے رہے۔ پرندے آشیانوں میں دم توڑ گئے۔ میوے کے درخت جڑ سے اُکھڑ گئے۔ خرمن بہہ نکلے، اور پھر گھر کی قیمتی چیزیں ایک ایک کر کے کوڑیوں کے مول بکتی رہیں۔ اور افلاس کے سائے منڈلانے لگے، اور جب امّی تاریک کمرے میں دوا کیلئے ترستی رہی۔ تو اُس نے کسی اسکول میں نوکری کرنے کی ٹھان لی۔

وہ صرف ماں کے لئے زندہ تھی۔ اور پچھلے ایک طویل برس کی مسافت میں رینگتے ہوئے اُسے صرف ماں کی ناتوانی کا خیال دامنگیر رہا۔ نہیں تو وہ دس بار ارادہ کر چکی تھی کہ اپنے کندھوں سے اپنی لاش کہیں اُتار پھینکے گی۔ ؟

اُس کے جینے کا کیا مطلب تھا ـــــ لیکن ماں ـــــ؟

وہ لوگوں سے ملتی رہی، دفتروں کے پھیرے لگاتی رہی اور تپتی دھوپ میں سڑکوں پر پگھلتی رہی۔ ہر اتوار کو وہ ماں کے اصرار پر شاہ صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر دستک دیتی۔ اور پھر اُن کے جدید فرنیچر سے آراستہ ڈرائینگ روم میں تصویرِ خموشی بن جاتی۔ وہ بغیر کسی آہٹ یا آواز کے قیمتی گاؤن پہنے دروازے کے اندر آجاتے۔ کبھی خالی چندیا پر ہاتھ پھیرتے، اور کبھی سینے کے سفید بالوں پر اُسے ہنسنے کی تحریک ملتی۔ لیکن وہ پُوری عاجزی اور اُمید کے ساتھ بیٹھی رہتی۔ وہ سینے کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پالیٹکس کی بُرائیوں اور سماجی بدعات کے خلاف پُرزور تقریر جھاڑتے، اور اُس کے بعد بڑی خوش طبعی کے موڈ میں کچن گارڈن میں بوئی ہوئی سبزیوں کی تفصیل سُناتے۔ اور جوش میں آکر اُس کا بازو پکڑ کر اُسے باغ میں لے جاتے، اور جب بوریت، اور بیزاری سے اُس کے سر میں درد ہونے لگتا۔ تو وہ اگلے اتوار کو پھر آنے کی تاکید کرتے۔!

اُس دن صبح ہی سے بُوندا باندی ہو رہی تھی۔ اور وہ سینے پر پتھر رکھ کر پالیٹکس کی بُرائیوں پر پُرجوش تقریر سُن چکی تھی آرڈر کاپی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ ہوا میں اُڑ کر ماں کو یہ خوشخبری سُنانا چاہتی تھی، وہ انٹرویو میں اوّل آئی تھی۔ لیکن پھر بھی آرڈر کاپی پر اُس کا نمبر گیارھواں تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے محسن کا شکریہ ادا کرے۔ وہ سینے کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اب سماجی بُرائیوں کی مثالیں گِنا رہے تھے۔ اچانک وہ پھُدک کر اُس کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ اُن کے جسم سے بدبُو کا ایک بھبکا نکل کر اُس کے حواس کو مُنتشر کر گیا۔ تقریر کرتے ہوئے اُن کا ہاتھ خالی چندیا کو سہلا کر اُس کے شانے پر آ گیا۔

وہ چونکی، اور پل بھر کے لئے ساکت رہ گئی۔ آپ کو نہیں معلوم، اس پوسٹ کے لئے مجھے کیا کیا نہ کرنا پڑا۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اُن کی گرم اور بے ترتیب سانسیں اُس کے بائیں گال اور کان کو ڈسنے لگیں۔

ایک ساتھ جیسے سو آدمیوں نے اُس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، اور آرڈر کاپی کو پیروں تلے روند کر آگے بڑھی۔ اور آنِ واحد میں بڑی سڑک پر بھاگتی چلی گئی

دوسرے ہفتے اُسے ایک رجسٹرڈ لفافہ ملا اُس میں اُس کا اپوائنٹمنٹ آرڈر تھا۔

اُسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔

امّی نمازِ عصر ادا کر کے گاجر کتر رہی تھی۔ اُس کی دھندلی آنکھوں میں روشنی کے دائرے پھیلتے گئے۔'

اشفاق کی باتیں ابھی تک اُس کے کمرے میں گونج رہی تھیں۔

انسان کے جسم پر تہذیب کا لبادہ مَسک گیا ہے۔ وہ پھر سے عُریاں ہو رہا ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں کے دائروں میں وہ لپٹتے جا رہے تھے۔ کاش وہ اُن کی سوچوں کے آگے دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی۔ تاکہ وہ منتشر ہونے سے محفوظ رہیں۔ جب وہ بکھر جاتے ہیں تو انہیں پہچاننا مُشکل ہو جاتا ہے۔!

محبّتیں اور نفرتیں بے معنی ہیں۔ زندگی محض ایک سایہ ہے۔ ہر خیال سراب ہے۔ کسی کو فرصت نہیں کہ آدمی کے اندر کے آتشکدے کو جھانک کر دیکھ لے۔ کوئی کیوں دیکھے؟ زندگی نفس شماری ہے۔ کوئی بے کار جلتا ہے ـــــ پیٹ کی بھٹی کھانا مانگتی ہے۔ اور جسم جسم کا تعاقب کرتا ہے ـــــ

وہ شانوں تک بڑھے ہوئے بے ترتیب بالوں کے ساتھ سڑک کو پار کر چکے تھے۔ لیکن اُن کے الفاظ ذہن کی تاریکیوں میں کوندوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی وہ سوتیلی ماں کی متضاد شخصیت سے اُلجھتے رہے، اور اندر ہی اندر کھولتے رہے۔ جب بھی وہ باپ سے ملے تو انہوں نے جلدی میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر انہیں خاموش کیا۔ خون کے رشتے محض فراڈ، بکواس، آدمی عادتوں کا غلام ہے۔ اور جب بھی اُس کے اغراض کو زک پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔ عادتیں بھی پگھل کر رہ جاتی ہیں، اور عشق ـــــ؟ ـــــ؟؟

عشق اگر دبے ہوئے جنسی جذبے کا اظہار نہیں تو کچھ بھی نہیں "آئیڈیل ازم نان سینس" ـــــ ہر ذرہ دوسرے ذرّے کی جانب جھکتا ہے۔ اور وہ اُلجھ اُلجھ کر رہ جاتی۔ کبھی کبھی وہ شدّت سے چاہتی کہ اشفاق اُٹھ کر چلے جائیں۔ اور اگر وہ چلے جائیں تو اُسے محسوس ہوتا کہ وہ ساری دنیا میں تنہا رہ گئی ہے۔!

نہ جانے اب اُن سے مُلاقات ہوگی بھی یا نہیں۔

شاہکار

اُس نے بڑی بے گانہ وشی سے کام لیا تھا، اور اُن کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ اُن کے لہجے کا اضطراب بھی اُسے متاثر نہ کر سکا۔ اُس نے جان بوجھ کر اُن کی سیاہ آنکھوں کی طرف نہ دیکھا! وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہے۔ اور لمبی لمبی اُنگلیوں کو چٹخاتے رہے۔!

اتوار کو اُس نے اپنے سینے کی بند کھڑکی کھول ہی دی اور اُنہیں اندر کے برستے ہوئے گھاؤ دکھائے، تاکہ وہ کراہیت سے مُنہ پھیر لیں۔ اور دوبارہ اِس گھر میں قدم نہ رکھیں، اِس لئے کہ اُسے اُن کی معصومیت کی ادا پسند تھی۔ وہ اُن کی سیاہ آنکھوں میں اَفسردگی کے سائے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بات اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ کبھی کبھی اُسے ہنسی بھی آجاتی۔ اشفاق بالکل ایک ضدی بچے کی طرح پسندیدہ کھلونا حاصل کرنے پر اڑ گئے تھے۔ اُس رات اُسے خوب نیند آئی۔ خواب آور گولیوں کی شیشی ٹیبل پہ دھری کی دھری رہ گئی۔

میں اپنا سب کچھ لُٹا بیٹھی ہوں ——— میرے پاس کیا رکھا ہے۔؟ میں اپنے وجود کا ہنستا ہوا زخم ہوں، میرے قریب نہ آجایئے۔ میں بڑی سیہ کار ہوں، وہ خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے۔ جلتا ہوا سگریٹ اُن کی اُنگلی کی پوروں کو جلا رہا تھا، جلے گوشت کی بُو پھیل رہی تھی۔ کمرہ دُھواں دُھواں تھا، اور پھر رات ہوگئی ——— گہری بے آواز رات!

وہ دوسرے ہی دن ویران آنکھوں میں بے خوابی اور وحشت کی جلن لئے اُس کے گھر آگئے۔ لیکن وہ اُن کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکی۔ اُس کے ہونٹ منجمد ہو چکے تھے۔!

کیا وہ سچ مچ اِس داغ داغ اُجالے کو اپنے سینے میں چھپانے کے لئے تیار ہیں۔؟ اُسے ہرگز یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ جا چکے تھے۔ اور ابھی تک اُن کے الفاظ دُور دُور تک سمندر کی لہروں کی طرح گونج رہے تھے۔

میں اِنسان کو خود ساختہ خیالوں کی زنجیروں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہوں۔ گُناہ اور ثواب مُہمل ہیں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے صفیہ۔ موت سے پہلے میں چند لمحوں کو پہچاننا چاہتا ہوں ——— میں دھرتی کی پیاس ہوں، اور تم سمندر ———

صفو بیٹی، ماں کی آواز نے اُسے پُرشور سمندر سے کنارے لگا دیا۔ لیکن ماں کا گلا بیٹھا ہوا کیوں تھا؟۔ وہ پریشان کیوں تھی۔؟

اُس کی آنکھوں میں آنسو۔؟

کیا بات ہے ماں؟ خیریت تو ہے؟ وہ بہت گھبرائی۔

دولت آباد سے ایک آدمی آیا ہے، بیٹے افضل کو چھ سال قید کی سزا ہوئی ہے۔ کتنا ظلم ہے، قتل کسی نے کیا، اور سزا کسی اور کو ملے ——— توبہ توبہ!

آدمی اپنے کئے کی سزا پاتا ہے ماں، اُس نے دل کی بھڑاس نکالی، پہلی بار اُسے ماں کے سامنے افضل کے خلاف کچھ کہنے کی ہمت ہوئی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ اُس کے کندھوں سے شام کا سارا بوجھ اُتر چکا ہے۔

ایسا نہ کہو صفو، یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ یہاں بے گناہوں کو تختۂ دار پر لٹکایا جاتا ہے ——— ہائے بھابی کو اِس عمر میں کیا کیا دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔ اُس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ لیں۔

کتنی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جو دل میں دفن کرنا پڑتی ہیں۔

ماں کا دل نازک ہے اور ——— اور وہ بھول ہی چکی تھی۔ کہ افضل تین مہینوں سے حوالات میں بند ہیں۔ اور آج دولت آباد کے مشہور قتل کیس کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا۔ اُسے کیا دلچسپی تھی۔ طوعاً وکرہاً وہ ماں سے کبھی کبھی اِس کی بعض تفصیلات سنتی رہی۔ اُنہیں پولیس نے نصف شب کو ایک ہوٹل میں پکڑ لیا تھا۔ اُن پر الزام تھا کہ اُنہوں نے ایک مشہور ٹھیکے دار کے بیٹے کو مار ڈالا ہے۔ جھگڑے کا باعث ایک عورت تھی۔ لیکن ہمارا افضل ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ کہتا ہے وہ عورت کے باپ کے ہمراہ وہاں گیا تھا۔ اُس کی عزت بچانے کے لئے۔ لیکن وہاں اغوا کرنے والا اَمر دمُردہ پڑا تھا۔ کبھی کبھی ماں کا وجود ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ افضل کا ذکر ہی اُس کی رگ رگ میں زہر پھیلا دیتا ہے۔ اور خواب آور گولیوں کی شیشی خالی کرنے کے باوجود اُسے نیند نہیں آئی۔

زور کی بارش ہو رہی تھی، درختوں کی شاخوں سے چمکتے نیزے برس رہے تھے۔ بادل کی کڑک سے ٹوٹا

مکان ہلنے لگتا۔ امّی کب کی سو چکی تھی۔ اور وہ تنہا رضائی میں ٹھنڈ سے کانپ رہی تھی۔ اتنے میں باغ کے دروازے پر تیز تیز دستک سے اُس کے کان کھڑے ہوئے۔

اُس نے کچھ تامّل کے بعد کمبل اوڑھ لیا۔ اور ڈرتے جھجکتے نیم تاریک سیڑھی سے اُتر کر بھیگتے ہوئے دروازہ کھولا۔ سامنے افضل کھڑے تھے۔ بارش میں نہائے ہوئے۔!

اُس کے جی میں آیا کہ وہ اُن کے چہرے پر تھوک دے۔ اور کھٹاک سے دروازہ بند کر دے۔ لیکن اُس کے بازو جم گئے تھے۔ اور جب اُس کی بینائی اُسے واپس ملی تو اُس نے دیکھا کہ وہ کمرے میں بند دروازے کے ساتھ چپٹی ہوئی بُری طرح ہانپ رہی ہے۔ شاید اُس نے اِس گرجتی رات میں کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو ـــــ وہ پسینے میں شرابور ہو چکی تھی۔ اور اُسے خیال ہی نہ رہا۔ کہ وہ کب تک اسی طرح کھڑی تھرتھراتی رہی ـــــ کب دروازے پر دستک ہوئی اور کب اُس نے بے اختیار ہو کر دروازہ کھول دیا۔ ـــــ وہ سیدھے اُس کے بستر پر دراز ہو گئے تھے۔ لیکن ـــــ

ـــــ لیکن اب بھی اُن کے درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا۔ وہ چاہے تو ـــــ لیکن وہ بلا سوچے سمجھے ننگے پیر نوکیلے کانٹوں پر چلتے ہوئے آہستہ آہستہ ـــــ آہستہ آہستہ اُن کے قریب آتی گئی ـــــ اور قریب آتی گئی۔ اور پھر اُس کے تھکے ہارے جسم کو سیاہ گھنا جنگل اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ اور وہ آنکھیں موندے کسی اجنبی منزل کی سمت بہہ رہی تھی۔

اُف ـــــ اُوہ!، وہ اپنا سر تھام کر رہ گئی۔

اُنہوں نے مُنہ اندھیرے جانے سے پہلے وعدہ کیا کہ وہ اب کبھی اس گھر کا رخ نہ کریں گے۔ اور پھر ـــــ چھ سال قید بامشقت، ایک طویل زمانہ ـــــ ایک عمر، وہ اپنے کمرے میں آئی۔ آگ میں نہائی ہوئی۔ اُس کے جسم کا بند بند بے داغ تھا۔ صدیوں کے سنّاٹے کے بعد اُس کی روح میں سنگیت کے سرچشمے جاگ رہے تھے۔ اُس نے گنگناتے ہاتھوں سے اشفاق کے نام ایک مختصر سا خط لکھنا شروع کیا۔

۵

اُس نے کپڑے دھوئے۔ پھر سارے گھر کی صفائی، چیزوں کو نفاست اور قرینے سے رکھ دیا۔ کتابیں الماری میں رکھ دیں۔ چھ سات روز تک وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر رنگوں میں نہاتی رہی۔ اور ایک نئی تصویر کے خدوخال سنور گئے۔ سامنے دیوار پر ابسٹریکٹ آرٹ کے دو نمونے ٹنگے ہوئے تھے۔ جو اُس نے نیشنل آرٹ ایگزیبیشن میں بھجوائے تھے۔ اور اُسے فرسٹ پرائز کا حقدار قرار دیا گیا تھا۔ سبز رنگ کی آڑی ترچھی لکیریں، نسوانی جسم کے خواب کے تاثر کو اُبھار رہی تھیں۔ جیسے سفید روشنی کے سلاخ آر پار ہو رہے تھے۔ دوسری تصویر میں ایک مسخ شدہ چہرہ دھوئیں کی چٹان سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا، اُس کے ذہن میں کتنے ہی خاکے متحرک تھے۔ جنہیں وہ ابھی تک کینواس پر نہ اُتار سکی تھی۔ پچھلے دو سال تک اُسے سانس لینے کی فرصت نہ ملی۔ وہ ایم اے کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ سکول سے لوٹ کر وہ رات گئے تک کتابوں میں غرق رہتی، نوٹس بناتی، اور پھر اشفاق کے پاس بھجواتی۔ وہ اُن کی تصحیح کر کے کچھ ترمیم و تبدیلی کے ساتھ واپس کرتے، وہ خود بھی ایجوکیشنل سائیکالوجی کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ واقعی اُن کی توجہ، رہنمائی اور حوصلہ افزائی اُس کے ساتھ نہ رہتی تو اُس کا ایم اے کرنا ایک خواب ہی رہتا۔

کالج میں لیکچرار کے عہدے پر تقرری کے بعد اُس نے اطمینان اور آزادی کی سانس لی۔

وہ اب زیادہ سے زیادہ وقت تصویروں کی تخلیق میں گزارنے لگی۔ اکاڈمی کے مسٹر پانڈے کے ریمارکس اُسے یاد تھے۔ اِن کی لکیروں میں خواب جاگتے ہیں۔ لیکن اشفاق کو کبھی اُس کی مصوّری سمجھ میں نہ آتی۔ اور نہ اُنہوں نے اس میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ وہ آرٹ کے بارے میں بھی ایک شخصی نظریہ رکھتے ہیں۔ زندگی خود ایک خواب ہے۔ ڈھلتا سایہ ـــــ آرٹ اور فلسفہ فانی آدمی کے ذہن کی قلابازی ہے اور خلا بے اَنت ہے۔!، علم و فن نے انسان کے خون میں زہر گھول دیا ہے۔ اُن کے ماتھے کی لکیریں گہری ہو رہی تھیں ـــــ ہاں انسان جب روشنی کے جگمگ جگمگ کرتے لازوال پیکر میں تبدیل ہو جائے تو میں اپنا عقیدہ بدل دوں گا۔

وہ اِن تین برسوں میں اُن کے خیالوں اور سوچوں میں،

کوئی تبدیلی نہ لاسکی۔ وہ اُن سے ملتی، بحثیں کرتی۔ دلیلیں دیتی۔

لیکن اشفاق کا ذہن ایک سانچے میں ڈھل چکا تھا —— اور اُس کی بچّوں کی سی ضد، اور سیاہ آنکھوں کی گہرائیاں —— کیا اُسے اشفاق سے محبّت ہوگئی تھی۔ ہے —— اُن کی بے لگام سوچیں، بے ترتیب اور اُلجھی ہوئی زندگی، اُن کی گہری افسردگی، لاأبالی پن! —— وہ اُداس ہوئی، لیکن اُس نے تہیّہ کرلیا کہ وہ اشفاق کی سوچوں کے دھارے کا رُخ بدل دے گی!

اشفاق پر کبھی کبھی اُسے ماں کا پیار آتا ہے —— اور وہ مُسکراتی ہے۔ اور آئینہ خانوں میں اُس کی ہزاروں شبِیہیں مُسکراتی ہیں، اور فضاؤں میں شوخ رنگ بکھر بکھر جاتے ہیں!

وہ شام کو گھر آئی تو بالکل بدل چکی تھی۔ اُس نے اشفاق سے شادی کرنے کا غیر متزلزل فیصلہ کرلیا تھا۔ لوگوں کے بے رحمانہ فقروں اور کمینہ حرکتوں سے اب وہ عاجز آچکی تھی۔ اِس عمر میں مجرّد زندگی گزارنا اُس کے لئے عذابِ جان بن گیا تھا۔ اور لوگوں کی باتوں کا زیادہ اثر ماں لیتی تھی۔ بیچاری، اور وہ ماں سے بحث کرنے کی روادار نہ تھی۔ ماں اب ڈھلتا سایہ تھی۔!

اُس کے جسم میں چاندنی کی لہریں بہہ رہی تھیں۔!

پہلی بار اُس کے سینے کے دہکتے گھاؤ مُندمِل ہوچکے تھے۔

اِس مہینے کے آخری ہفتے میں شادی کی تاریخ کا تعیّن ہوگا۔ وقت کم رہ گیا ہے۔ اور ابھی بیسیوں کام پڑے ہیں۔ امّی بڑی پھرتی سے عشاء کی نماز کے لئے سجّادہ بچھانے لگی۔

وہ امّی پر ایک مُطمئن نظر ڈال کر کمرے سے نکلی۔

ٹپ —— ٹپ —— ٹپ —!

بھاری بھرکم جُوتوں کی بے ہنگم آواز —— اُس کے دِل کی دھڑکن تھم گئی۔ —— نہیں نہیں، یہ اُس کا واہمہ ہے —— واہمہ، اُس کے کان بجتے ہیں، وہ چاپ تو ہمیشہ کے لئے ڈوب چکی ہے، اور بے کراں خاموشی محیط ہے، شہر کی حدود سے باہر گرد آلود فضاؤں میں کالے پتھروں کی فصیل کے اندر کسی کالی کوٹھری میں۔

ٹپ —— ٹپ ——

چاپ تیز ہو رہی تھی، واضح، جارحانہ —— کمرے سے باہر اچانک کچھ مبہم صدائیں جاگیں اور پھر امّی کی مسرّت آمیز

چیخ —!

اُس نے جھٹ سے دروازہ کھولا۔

سامنے افضل کھڑے تھے۔ شکن آلود پُرانے خاکی لباس میں ملبوس، ویران چہرے کے نشیب و فراز پر منجمد تاریکی۔ آنکھوں میں دُنیا بھر کی وحشت ——

امّی ابھی تک اُن کی بلائیں لے رہی تھیں۔!

ایک لمحہ گزر گیا۔ —— صدیوں پر حاوی ایک طویل لمحہ!

اُسے اب بھی یہ سمجھنے میں دقّت ہو رہی تھی۔ کہ وہ جاگ رہی ہے۔ یا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے —— وہ خواب ہی تو دیکھ رہی ہے۔ —— بھیانک خواب، سنگین فصیلوں کو پھاند کر وہ خود آئے ہیں یا اُن کا بھوت —— بیٹے افضل کی نصف سزا معاف کردی گئی ہے۔ اپیل منظور ہوئی ہے —— جھوٹ، بکواس —!

افضل چُپ چاپ اپنی وحشت آلود آنکھوں سے اُسے گھور رہے تھے۔

اور رات کے سنّاٹے میں جب وہ بے نیازی سے اُس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ تو اُس لمحے بھی اُسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ یہ سب کچھ عالمِ خواب میں ہو رہا ہے۔ کاش اِنسان اپنے خوابوں کو شعوری گرفت میں لے سکتا۔ اے کاش —— وہ صدیوں کی مسافت پیدل طے کرتے ہوئے خود بخود اُن کے قریب آتی گئی —— اور قریب —! خواب تو بہرحال خواب ہوتے ہیں۔

صُبح کو سُورج کو نِکلنے کے بعد جب اُس کی آنکھ کُھلی تو اُس نے دیکھا وہ اُس کے کمرے میں تکیئے سے ٹیک لگائے شیو بنا رہے ہیں۔ اُس نے جھٹ سے آنکھیں مُوند لیں۔!

۶

اُس نے بند کھڑکی کے قریب لگے ٹیبل سے ذرا گھوم کر دیکھا۔ پُرشور ہال میں برقی قمقمے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ کھڑکی کے شیشوں سے برفیلی ہوا کے جھکڑ ٹکرا رہے تھے، سگریٹ اور شراب کی مِلی جُلی بُو دائرے بناتے ہوئے اُس کا تعاقب کر رہی تھی۔ چاروں طرف کرسیوں پر چمکتے سیاہ سُوٹ، اور زرتاب ساڑھیاں آپس میں آرٹ، سائنس اور پالیٹکس

گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ خالی ٹیبلوں پر پتھر کی آنکھیں پڑی تھیں۔ مسز بھاٹیہ اور ملٹری آفیسر ابھی تک دیوار کے ساتھ ماڈل بنے ہوئے تھے۔ اور وہ رہ رہ کر منتشر نظروں سے ہر آنے والے کو دیکھتی اور جب اُسے اشفاق کی صورت نظر نہ آتی تو سارا جگمگاتا ہال گھومنے لگتا۔

ماڈل غائب ہو چکے تھے۔ قمقمے بجھ چکے تھے۔ اور وہ گرتی پڑتی اندھیروں سے باہر آگئی، اور جب گھر پہنچی، تو تھکن سے اُس کا بُرا حال تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے شوہر آئے تھے۔ اور کپڑے بدلے بغیر ٹانگیں پھیلائے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ اُن کے چہرے کی رگیں تنی ہوئی تھیں،

میں مسز بھاٹیہ کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی، اُس نے جھوٹ بتایا، اُسے افضل سے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ وہ یوں غیر متوقع طور پر کیسے ٹپک پڑے۔ انہیں تو پہلی تاریخ کو آنا تھا۔ خاموشی طویل ہو گئی، تو وہ خود ہی بولے،

کام اچھا چل رہا ہے۔ موسم ابھی تک ساتھ دے رہا ہے لیکن لکڑی کے بھاؤ میں اچانک تبدیلی آگئی ہے۔ مجھے کل صبح فلائی کرنا پڑے گا۔ ایک نئی فرم سے معاہدہ کرنا ہے، اُس نے اُن کے لئے چائے بنائی۔ اور وہ بھی چائے کے گھونٹ لیتی رہی۔ نوکر نے چائے کا سامان ٹرے میں سمیٹ لیا۔ اُس نے بستر پر دُھلا ہوا شیٹ بچھا دیا، افضل اسی حالت میں بستر پر دراز ہو گئے، کچھ سوچ کر وہ قدِ آدم آئینے سے ہٹ گئی۔ اُس کے ملائم بال کُھل کر اُس کے شانوں پر پھیل گئے تھے۔

غزل ختم ہوئی تو تالیوں کا شور بلند ہوا، اور وہ اجنبی مردوں اور عورتوں کے ہجوم میں سے مشکل سے راستہ بنا کر ہال سے ملحق چھوٹے سے کمرے سے آئی تو اُس کی ریشمی ساڑھی شکن آلود ہو گئی تھی۔ اُس نے کرسی کھینچ لی، اور سامنے دیوار پر ٹنگی نیم عریاں تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ مدھم سی سبز روشنی میں اشفاق کے جسم کے پنجر پر کانپ رہی تھی۔ اور وہ وہسکی کے دہکتے جام پر جھکے ہوئے تھے۔

اُنہوں نے ایک اور پیگ خالی کیا۔

مجھے انسان سے کبھی شکایت نہیں رہی، انسان انسان سے شکایت کرے تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ —— ہاہا ——

سب لوگ ہوا کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کون آزاد ہے کون قیدی —— اور پھر خیالوں کے ہزاروں بندھن ——

تمہاری سوچوں نے ہی تمہیں تباہ کیا ہے اشفاق۔ آج تم ہڈیوں کا پنجرہ بن کر رہ گئے ہو۔ تم نے مکان کیوں بدل دیا؟ —— تم نے کیوں نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔؟ تم فلٹر ڈپارٹمنٹ میں فائلوں کا بوجھ ڈھونے کیوں چلے گئے؟ یہ تم نے کیا کیا اشفاق؟، بولو، جواب دو وہ اُن سے کیا کیا کہنا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

زرد پتّیوں کے سوکھے ڈھانچے اُس کے قدموں کے نیچے شکستہ ہو رہے تھے۔ سامنے سُرخ آگ کی لپٹیں اُفق کو چاٹ رہی تھیں۔ متواتر چار مہینوں کی صحت کی تباہی کے بعد جب وہ اُمّی کے پیہم اصرار پر ایک اینگلو انڈین لیڈی ڈاکٹر سے ملی تو اُس پر یہ الفاظ بجلی بن کر گرے۔ "تم نے CONCEINIE کیا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کا سانولا چہرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ تاریکی کا سمندر اُمنڈنے لگا۔ DON'T WORRY ہم تمہارا ABORTION کر دے گا۔ دو سو فیس لے گا —— سمندر کی کالی سطح پر دور دور ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ جب وہ دریا کے کنارے پہنچی، تو دریا میں کودنے کے بجائے وہ درخت کے پرانے تنے پر بیٹھ گئی۔ شام گیلے پتھروں سے چپک رہی تھی۔ امّی اُس کا راستہ دیکھ رہی ہوں گی!

سُنو ماں، میں زخموں سے چُور ہوں۔ لو میں زخموں سے پردہ اُٹھاتی ہوں —— یہ دیکھو، یہ سب تمہارے چہیتے بھتیجے کی مہربانی ہے۔ اور اب اُنہوں نے مجھے ہمیشہ کے لئے تباہ کیا —— میں اُن کے گناہ کو کیوں کر چھپاؤں؟ —— میں کہاں جاؤں ماں؟ وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

اُسی مہینے اُس نے انتہائی سادہ طریقے سے افضل سے شادی کی، اور وہ اُسی کے گھر میں رہنے لگے، شادی کے صرف ایک ہفتے کے بعد وہ لیڈی ڈاکٹر سے ملے، خاموش کلینک میں مکمل تیاری تھی۔ الماریوں میں رکھے گئے آلات سرک کر اُس کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

میرے ہسبینڈ کو ہر وقت میری فکر سوار رہتی ہے۔ دس
پندرہ دن کی جدائی بھی اُن سے برداشت نہیں ہوتی ـــــ ہا ہا۔
جب آتے ہیں سونا حرام کرتے ہیں۔ اُس کے لہجے سے مسرت
چھلک رہی تھی۔ مسز بھاٹیہ نے پرس سے شیشی نکال کر میک اپ
درست کیا۔ ڈاکٹر سنتوش حسبِ عادت سیکس پر اپنی معلومات
بیان کرنے لگیں۔ وہ چپ ہوئیں۔ تو مسز بھاٹیہ سے رہا نہ گیا۔

گھر کی چار دیواری میں، میں گھٹ جاتی ہوں اور یہاں
بھاگ آتی ہوں، ستیش کو تو برش اور رنگوں سے ہی فرصت
نہیں۔ رات کو میں رضائی میں اکیلی ٹھٹھرتی ہوں۔ عجیب عجیب
خیال پریشان کرتے ہیں ـــــ

وہی بوریت، یکسانیت اور تھکن ـــــ اور وہی
شب و روز، افضل اُس کے شوہر ہیں، اُس کے جسم و جان کے
مالک، لیکن ـــــ لیکن کیا وہ ـــــ کیا اُس کے جسم اور روح
کے تمام راز اُن پر کھلے ہیں۔ ؟ ـــــ وہ باتیں کرتے ہیں، گھر کی
باتیں، مستقبل کی باتیں، رشتہ داروں کی باتیں ـــــ لیکن اُسے
شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی جگہ کوئی دوسری عورت
باتیں کر رہی ہے۔ وہ اپنے گھر میں اجنبی ہے ـــــ اجنبی
اور اکیلی۔!

جب دیکھو بیگم صاحبہ گھر سے باہر ہیں اور گھر نوکروں
کے رحم و کرم پر ـــــ یہ روز روز کیا پروگرام ہوتے ہیں۔ سینما،
سیر، پارٹی ـــــ حد ہو گئی، وہ گرجتے رہے۔

اور وہ اُن کے چہرے کے متحرک دلدل سے باہر نکلنے
کی جدوجہد کرتی رہی۔

وہ چائے بھی نہ پی سکے، سارا دودھ بلّی پی چکی تھی۔ نوکر سہما
ہوا کھانے بنانے میں مصروف تھا۔ وہ کتاب کے حروف سے
اُلجھ رہی تھی۔ اور وہ تکیہ کے سہارے لیٹے ہونٹ چباتے رہے۔!
وہ سگریٹ کی پوری ڈبیا ختم کر چکے تھے۔!

لمحے پہاڑ ہو رہے تھے۔!

اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے زندگی کی سب سے
بڑی حقیقت پالی ہے ـــــ یہ لمحہ حقیقت ہے اور ماضی
دھواں، اور مستقبل غیر یقینی اور بے اصل ـــــ اشفاق
کو دیکھ کر اُس کی بے قرار متلاشی نگاہ کو سکون مل رہا تھا۔!

انسان کی آواز بے کراں خلاؤں میں گم ہوتی ہے۔
لیکن وہ خالق کے لئے ایک چیلنج ہے ـــ ایک گونجتا سوال،
ـــــ وہ اپنی اصل کی تلاش میں سرگرداں ہے، وہ دھوئیں
میں گم ہو رہے تھے۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ صدیوں پہلے اُن
کے بدن سے جدا ہوئی ہے۔ اور جب سے تنہائی کے صحراؤں
میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ اُس کی روح پیاسی ہے، اُس کے
ہونٹ جل رہے ہیں۔ اُس نے جگمگاتے ہال میں گھومتی
پرچھائیوں کو نظر انداز کر کے اشفاق کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں
میں لے لیا۔ اور اُسے اپنے دل پر رکھ دیا۔ اور پھر اُس کے
جھکتے ہوئے پیاسے ہونٹ ـــــ اُس نے نگاہ اُٹھائی
تو دروازے کی دیوار پر افضل کی دو شعلہ بار آنکھیں گڑی
ہوئی تھیں۔

وہ ٹیکسی میں برف بنی ہوئی اُن کے پہلو میں بیٹھی تھی۔
ٹیکسی روشن اور نیم تاریک سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی،
بعض لمحوں میں خواب اور حقیقت میں فرق کرنا کتنا مشکل
ہو جاتا ہے۔ انسان کی حسّیات بھی کتنی محدود ہیں۔!
اُنہوں نے دروازہ بند کیا، اور آتش فشاں بن کر پھوٹ
پڑے۔

اِس اشفاق کے بچّے کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔
ـــــ اور تم کو بھی ـــــ میں پہلے ہی تم کو جان چکا تھا،
میں اُسی دن سب جان چکا تھا، جب تم نے اشفاق کے
ناجائز بچّے کو میرے گلے مڑھ دیا تھا۔ میں نے تمہارا پردہ رکھا۔
لیکن مجھے کیا معلوم تھا، تم اتنی ذلیل ہو۔ کمینہ ـــــ
بازاری عورت !

وہ چپ تھی، اُس نے صرف اتنا کہا۔
میں تم سے نفرت کرتی ہوں ـــــ تم انسان نہیں
درندے ہو ـــــ

خاموش ـــــ ذلیل کتیا ـــــ آخ تھو ـــــ!
دروازے کو زور کا دھکا لگا کر وہ بھاگے، کف، بلب،
اور تاریک گہری برفانی رات میں غائب ہو گئے۔

اُس نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کیا۔ گرم شال سے ٹھٹھرے بدن کو لپیٹا، اور بوجھل سر کو تکیے پر گرا دیا۔

وہ جلد جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر نے اُس کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔

آپ کے ہسبینڈ نمونیہ کے شکار ہو گئے ہیں۔ بلڈ پریشر بھی نارمل نہیں ___ وہ جب صبح کو گھر آئے تھے تو بُری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ آنکھیں سُوجھ گئی تھیں۔ چہرہ متورم تھا اور گیلے کپڑوں سے دُھواں نکل رہا تھا۔ وہ اُسی دن سے بستر پر دراز تھے۔ اور وہ سب کچھ بھول کر اُن کی تیمارداری میں مُنہمک رہی۔ بُخار اُترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اور اُس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنا سارا سکون کھو بیٹھی تھی۔ وہ جلد سے جلد اُنہیں صحت مند اور مضبوط دیکھنا چاہتی تھی۔ اُن کے مضبوط بازوؤں میں وہ دُنیا کی ہر آفت اور گزند سے محفوظ تھی۔ کیا اُسے سچ مُچ اُن سے نفرت تھی۔ ؟

ساری رات جاگتے گزار کر جب اُس نے مُنہ اندھیرے ڈاکٹر کو بلایا، تو ڈاکٹر کے یہ الفاظ بجلی بن کر گرے،

اُن کے جسم کے ایک حصّے پر PARALYSIS کا حملہ ہوا ہے۔

اب کیا ہوگا؟ اُس کی رُوح چیخی، اور آنسو اُس کی پلکوں سے ٹپ ٹپ گر پڑے۔!

علاج سے ٹھیک ہوں گے، فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ دوائیں اور انجکشن منگوایئے گا۔

اور وہ دن رات ایک کر کے اُن کے علاج مُعالجے میں لگ گئی۔

اُسے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

سڑک پر برف کی موٹی تہہ جم گئی تھی۔

اب وہ اچھے ہو رہے ہیں۔ چلنے لگے ہیں۔ لیکن ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ ہوا ایسا کہ یہ جنگلات سے آ رہے تھے کہ برف کے طوفان میں گھِر گئے اور پھر انہیں نمونیہ ہو گیا۔

___ اُسے خیال ہی نہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اشفاق کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔

ہر نئی اور دلچسپ بات پُرانی ہو جاتی ہے۔ اور کشش کی حس سو جاتی ہے۔ یہ موت سے پہلے کی موت ہے۔ جس سے میں ڈرتا ہوں، اور میں یہ نہیں چاہتا صفّو کہ تم بھی موت سے پہلے مر جاؤ ___ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

وہ اُن کے لمبے بازوؤں کے حلقے میں تھی، اور عجیب طرح کی آسودگی محسوس کر رہی تھی۔ اشفاق کے سُلگتے ہونٹ اُس کی آنکھوں کو چُومتے ہوئے اُس کے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے تھے۔

اُس کی ازل ازل کی پیاس سیراب ہو رہی تھی۔!

وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے، اور وہ اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹتے سمیٹتے کمرے سے باہر آئی۔ اور سامنے کے کمرے کے اندر لپکی ___ وہاں کوئی نہ تھا۔

افضل ___! وہ دروازے سے باہر نکلی، برآمدے پر اُن کی چھڑی پڑی تھی ___ وہ کہاں تھے؟

اُس نے بدحواسی میں برآمدے کے جنگلے سے نیچے جھانکا۔ نیچے برف آلود فرش پر اُن کی ٹوپی اوندھی پڑی تھی، اور تھوڑے ہی فاصلے پر وہ بے سُدھ پڑے تھے۔ اُن کے مُنہ سے خون بہہ رہا تھا۔

پھر کیا ہوا، اُسے کچھ معلوم نہیں۔

اور جب اُسے ہوش آیا، تو اُس کی دنیا تاریک ہو چکی تھی۔

وہ بستر پر بے خبر دراز تھے۔ اُن کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں ___ اور گھر میں ماتم کا شور برپا تھا۔

وہ ایک پاگل کی طرح اُٹھی اور اُن کے جسم پر گری، اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر آیا، اُس نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

مریض خطرے سے باہر ہے، فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، چہرے اور بازو پر معمولی چوٹیں آئیں ہیں، یہ انجکشن لگوایئے فوراً ہوش آئے گا۔

ڈاکٹر چلا گیا۔

ہمسائے چلے گئے، نوکر گھر کے کاموں میں جُٹ گئے، خاموش دیواروں پر بلب کی افسردہ روشنی کپکپا رہی تھی۔ اور وہ تنہا ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹکائے سرہانے پر اُن کے ساکن پتھریلے چہرے کو تک رہی تھی۔

پتھروں کی منجمد پرچھائیاں حرکت کر رہی تھیں، اور وہ پرچھائیوں کے شہر میں گُم ہو گئی تھی۔!

ص ___ ف

اُس نے جُھرجُھری لی، وہ ——— وہ اپنے کمرے میں تھی، اور سامنے بیڈ پر افضل پڑے تھے۔ اُن کی پلکیں مرتعش ہو رہی تھیں۔ اُنہوں نے آنکھیں کھولیں۔ اور بے حس آنکھوں سے اُسے تکتے رہے۔

پانی،

ابھی لاتی ہوں۔

یا اللہ تیرا شکر، معمر چوکیدار بوڑھے ہاتھ اوپر اٹھا کر دروازے سے باہر نکلا۔

وہ پانی پی چکے تھے۔ اور وہ ٹیبل پر گلاس رکھ کر اُن کی طرف پیٹھ کئے شدت سے سوچ رہی تھی۔ کہ وہ کتنی تنہا ہے کتنی اکیلی، اس تنگ و تاریک کمرے میں اُسے گھٹن ہوتی ہے، لیکن اگر ——— اگر زندگی کا یہی حال رہا تو ——— تو وہ انہیں زہر دیگی۔!

آؤ
سو جائیں
نورشاہ

نُورشاہ

پیدائش: سری نگر (کشمیر)، ۹ جولائی ۱۹۳۴ء

تخلیقات

ناول

(۱) نیلی جھیل کالے سائے (۲) پائل کے زخم

افسانوی مجموعے

(۱) بے گھاٹ کی ناؤ (۲) ویرانے کے پھول (۳) ایک رات کی ملکہ۔

(۴) من کا آنگن اُداس اُداس (۵) یہ میری دنیا

نُورشاہ کی تحریروں میں جو زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں، اندازِ بیاں میں جو شگفتگی، رچاؤ اور موسیقی ہے وہ تو کچھ حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت وجلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہینِ منت۔ نورُشاہ بحیثیت کہانی کار مقبول ومعروف ہیں۔ ان کے افسانوں کی تخلیق وترتیب کی تہہ میں ایک کہانی ہے۔ نگاہِ تجسس کی کہانی جس کا محور آج کا انسان ہے، انسانی زندگی کے سوز وساز کا زیر وبم ہے، مجبوریوں اور ناکامیوں کی خلش ہے، رِستے ہوئے ناسُوروں کا ذکر ہے۔ نورشاہ کی تحریروں میں شعور وفکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ زبان واسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے کہ وہ دھیمے سُریلے سُروں میں اپنی بات کہنے کے قائل ہیں۔ اکثر ان کی شگفتگی پسندی رومانیت کی طرف لے جاتی ہے لیکن ان کے قدم حقیقت کی زمین پر ہی جمے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ افسانے زمینوں میں نہیں بلکہ زندگی کی کھردری سطح پر بکھرے پڑے ہیں۔ اِن کو سلیقے سے چُننا اور صناعی سے واقعات ومحسوسات کو ایک قصّے کے رُوپ میں پیش کرنا نُورشاہ کو خوب آتا ہے۔

"آؤ سو جائیں" جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے، وہیں ایک میگ کی کہانی بھی ہے۔ اِس ناولٹ میں نورشاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کُشائی اپنے مُنفرد ڈھنگ سے کی ہے۔

(بقلم دیگر)

آؤ سو جائیں

نورشاہ

رات کتنی اندھیری ہے۔ کل اور آج کی رات میں کتنا فرق ہے، کتنا بڑا فاصلہ ہے۔ اس فاصلے کو قدموں سے عبور کروں۔ اس اندھیرے کو کن روشنیوں کے سہارے دُور کروں —— تھک سا گیا ہے میرا وجود، رُوٹھ سا گیا ہے میرا دِل۔ سونا چاہتا ہوں لیکن نیند بھی نیلما کی طرح رُوٹھ گئی ہے۔ یہ نیند بھی عورت کی سوچ ہے۔ عورت کا سپنا ہے۔ میری زندگی میں آئی بھی تو بڑی جھجک کے ساتھ، شرمائی شرمائی سی —!!

قد پورا پانچ فٹ ہو۔ پموش جیسا مُلائم مُلائم سا چہرہ ہو۔ آنکھیں مست مست اور دانت سفید سفید موتیوں جیسے ہوں۔ آواز میں بے پناہ مٹھاس ہو اور باتیں کرتے وقت پلکیں جُھک جُھک جاتی ہوں، بھرے بھرے رُخساروں میں اچانک ایک گڑھا سا پڑ جاتا ہو، چلتے وقت انگ انگ رقص کرنے لگتا ہو۔ —— تو کیا خشک زندگی میں محبت کی پہلی ہلکی سی حرارت کا جذبہ پیدا نہ ہو گا۔

یہ کہتے کہتے وہ سو گیا ہے۔ میرا دوست، خوبصورت بیوی، خوبصورت نیند، خوش بخت اِنسان، میں بھی سونا چاہتا ہوں ..... !

نیند نہیں آتی —؟

شبنم کے قطرے جب کنول کے پتّوں پر بکھر جاتے ہیں تو ایک عجیب سی بے قراری کا اِحساس ہوتا ہے۔ ایک ان دیکھی سی تمنّا دِل کے کسی تنہا گوشے میں دھڑکنے لگتی ہے، اِن دھڑکنوں میں یادوں بھری کہانیوں کی کہکشاں سنور جاتی ہے۔ اور اچانک جیسے ہواؤں میں مدیرا گھل جاتی ہے۔ سپنوں بھری فضائیں مہک اُٹھتی ہیں، پیڑوں کے نیلے اور چاندی ایسے رنگ سُواگت کرتے نظر آتے ہیں۔ ہاں سہمے سہمے کی بات ہے نا۔ میری اُجاڑ اُجاڑ سی ویران زندگی میں جب یہ لمحہ نیلما کے رنگ و رُوپ میں آیا تو یک لخت جیسے شبنمی لمس کا احساس ہوا۔ تب میں نے صرف ایک لمحے کے لئے سوچا تھا۔ کیا عورت کبھی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے تب نیلما نہیں دیکھی تھی، شاید نیند آ رہی ہے۔ آنکھوں سے کسی کا آنچل چُھو گیا۔

—— لیکن نیلما میرے دوست کی خوبصورت نیند —!!

بات صرف میری نہیں۔ میرے کچھ اور بھی ساتھی ہیں۔ پر میرے اور اُن کے درمیان ایک مختصر طویل سا فاصلہ ہے۔ جیسے ڈل جھیل کی بے کراں وسعتوں پر پھیلی ہوئی دو کشتیوں تلے ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی لہریں، ایک دوسرے سے گھل مِل کر بھی ایک دوسرے سے اجنبی، ایک دوسرے سے ٹکرا کر بھی دُور ہوتی ہیں۔

لیکن وہ اجنبی پن کا اِحساس —!

وہ کون سے لوگ ہیں جن کی زندگی میں کوئی شبنمی لمحہ نہ آیا میری ہی طرح جن کی ساری زندگی بے کیف و بے رنگ رہی —— اقبال ...... راشد ...... بشی .... پال .... برج!

اور سیکڑوں نہیں شاید لاکھوں نام —!

کیوں نہ آج اپنی ادھوری کہانی لکھ ڈالوں۔ لیکن نیند نے وفائی کی تو —؟

یہ ایک اجنبی دَور کی کہانی ہے۔ اِس دَور کے سارے کردار اجنبی سے ہیں۔ یہاں تک کہ مجھے بھی اپنا کردار اجنبی سا لگ رہا ہے۔ لیکن اِس اجنبی پن میں بھی میں اپنے خیالات اور اپنی تحریر میں صاف گوئی برت کر اپنے اور اُن سب کے جذبات کی عکّاسی کرنا چاہتا ہوں۔ اِن خیالات کی نوک پلک سنوارنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اجنبی پن کا یہ اِحساس ختم ہو جائے —— کبھی میں نے سوچا تھا کہ جب میں اپنی زندگی کے خدوخال اُبھاروں گا تو اپنے قلم کی سیاہی میں چاند اور ستاروں کی ساری سُندرتا، ساری چمک گھول دوں گا۔ اور ایک ایسی کہانی کی تخلیق کروں گا جس میں صرف پھول کِھلے ہوں گے، نیلی نیلی جھیلیں اور اُن کی چھاتی

سے لگے ہوئے کنول کے پھول۔ میں اپنے سر سبز پہاڑوں کی کہانی لکھوں گا۔ چیڑ، دیودار اور چنار کی کہانی، ریشمی گھاس سے اَٹے ہوئے مرغزاروں کی کہانی، میں نے چاہا تھا اپنی کہانی میں اُس حُسن کو سمو دوں گا جو شبنم سے مُنہ دھوتی کلیوں میں ہے۔ مدہ مست آنکھوں میں ہے۔ پر جب اِس کہانی نے جنم لیا تو میں اپنے اِرد گِرد اور نزدیک پھیلی ہوئی گندگی، غلاظت اور بدصورت جراثیموں میں پھنس چکا تھا اور میں نے صرف کالی راتیں دیکھیں۔ ڈوبتے سورج دیکھے۔ گرہن کے شکنجے میں جکڑے چاند دیکھے اور ---!

نیلی کا پورا نام نیلما ہے ـــــ نیلم۔!

نیلما اور آکاش ۔!!

کتنی بڑی وسعتوں کی دنیا۔ کتنی بڑی تمنّا کا احساس ـــــ لیکن کیسی نیلما اور کیسا آکاش..... پاؤں دھرتی سے چمٹے ہوئے اور یہ دھرتی مجھے پسند ہے۔ شاید یہی پسند مجھے اُس کے قریب لے آئی۔ جانے یہ میرے شعور کی باتیں ہیں یا لاشعور کی۔ جانے یہ کیسی سوچیں ہیں۔ کس رنگ کی ـــــ!!!

آج میں بڑا دُکھی ہوں اور نیند دُکھ کا ساتھ نہیں دیتی۔ کاش کہ نیند بھی میری بیوی ہوتی، محبوبہ نہیں۔ نیلما نہیں۔ کوثر نہیں، شاہدہ نہیں، اور آنکھوں کے سامنے چند چہرے ہیں۔ کچھ اپنانے کو تیار، کچھ.....

اور یہ نیلما کا چہرہ۔

وہ ایک سرد سی رات تھی جب برج نے اُسے نیلی کہا تھا۔

نیلی۔!

سنگم۔!

آکاش اور دھرتی کا۔

اندھیرے اور نور کا۔

نیلی کی ایک ساتھی بھی ہے۔ اُس کا نام میمی ہے۔ پر میمی نیلی کی طرح کوئی لڑکی نہیں۔ چلتا پھرتا جادو نہیں اور نہ ہی دِل کی تاریکیوں کو روشنی بخشنے والا دیا ـــــ وہ تو مہندی، کالے اور سپید رنگ کی ایک معصوم سی بِلّی ہے۔ جنگلی بلّی!

آج میں اپنے کھوئے ہوئے وجود کو ڈھونڈ رہا ہوں اور میمی وہ تو جا چکی ہے۔ کل کا وعدہ!

کل کی کیا بات ـــــ کیا ہوگا، کون جانے۔ کیوں نہ آج اِن سِسکتے لمحوں میں یہ کہانی مکمل کر لوں، انجام سے بے خبر، انجان اور ادھوری..... بالکل میری اپنی زندگی کی طرح۔!

میرا وجود کس قدر اجنبی اجنبی سا ہے آج۔ یہ لمحے.....

یہ سِسکتے ہوئے لمحے کتنے عجیب عجیب سے ہیں اور مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں یہ زہریلے ناگ بن کر مجھے ڈس نہ لیں۔ یہ آہستہ آہستہ سے رینگتے ہوئے ناگ کبھی ایسے نہ تھے۔ کبھی یہ اِنسان تھے۔ چلتے پھرتے متحرک اور بولنے والے اِنسان، میرے دوست میرے ساتھی جو نیلی سے ملے، جنہوں نے نیلی کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کی۔ نیلی سے پیار و محبت کی باتیں کیں۔ جنہوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے، اپنے ذہن کے دریچوں کو بند کر کے میمی کو نیلی کا رُوپ دیا۔ اُس کے نرم نرم بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ایک شبنمی لمس حاصل کرنے کے لئے اُس لمحے کو جاوِداں بنانے کے لئے اور ---- اور اپنے اندر کے حیوان کو سُلانے کے لئے۔

اور جب اِنسان حیوان کی سی صُورت اپناتا ہے تو وہ ناگ بن کر ڈس لیتا ہے۔

برج جا چکا ہے۔ یہ برج ہی تھا جس کی وساطت سے میں نیلی سے اوبرائے پیلس کے کمرہ نمبر ۹ میں مِلا۔ وہ اب بمبئی کے ہنگاموں میں کھو چکا ہوگا۔ کمرہ نمبر ۹ کی شامیں اور کمرہ نمبر ۱۰۴ کی راتیں فراموش کر چکا ہوگا۔ البتہ میں اب بھی اُن شاموں اور راتوں کو فراموش کر چکا ہونگا۔ البتہ میں اب بھی اُن راتوں اور شاموں کے چند سِسکتے لمحوں کو اپنے سینے کی قبر میں دفنائے اپنے اجنبی اجنبی سے وجود میں جھانک رہا ہوں۔

برج نے نیلی سے کہا تھا ـــــ "آؤ چلیں دُور موہ مرگ کی برف سے ڈھکی چھُپی چوٹیوں میں گھرے ہوئے ریسٹ ہاؤس میں، جس کی برف آلود دیواریں تمہارے جسم کی گرمی سے پگھل جانا چاہتی ہیں۔

میں خاموش رہا۔!

نیلی نے میری طرف دیکھا اور میرا گلاس بھر دیا۔

برج نے پھر کہا۔

آؤ، چلیں دُور، پری محل کے ویران کھنڈروں میں۔ جہاں کئی سو سال پہلے تم نے ایک برفانی پری کا رُوپ

اپنا کر سنگِ مرمر کے فرش پر رقص کیا تھا۔"

میں نے ایک ہی گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کیا۔

اُس نے پُوچھا۔

"کیا آپ بھی جنم جنم میں یقین رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں نے زندگی میں ایک ہی بار جنم لیا ہے۔ اور ساری زندگی اِسی جنم میں پُوری کروں گا۔ پر میں نہیں جانتا کہ میں نے کب جنم لیا۔ اور میرا یہ جنم کب ختم ہوگا۔"

"کیا شاعری ہے"۔ برج نے میتی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ——— تب تم کہاں تھے۔ جب نیلی برفانی پری کے رُوپ میں پری محل میں رقص کیا کرتی تھی۔"

میں نے کہا ———" برج بھائی، میں اُس سمے جنم لے چکا تھا۔ اور میں بھی اُسی پری محل میں تھا دارا شکوہ کے رُوپ میں اور شاید تم نہیں جانتے، نیلی اُس وقت میرے لئے ہی رقص کیا کرتی تھی۔"

"یہ سب جھوٹ ہے"۔ —— نیلی، یہ آدمی جو اپنے آپ کو کہانی کار کہتا ہے بڑا مکّار ہے۔ اِس کی باتوں میں نہ آنا۔ ویسے اِس کی شخصیت بڑی پیاری ہے۔ لیکن شراب پی کر بہکتا ہے۔ بہکاتا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں، برسوں سے جانتا ہوں۔"

"برج، تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔"

"نیلی ڈیر، اس وقت میرا دِل چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ ایک جادوئی رتھ پر سوار ہو کر کہیں دُور چلا جاؤں۔"

"کہاں۔؟"

"جہاں صرف میں ہوں گا اور تمہاری آغوش۔"

اور یہ تمہارا یہ دوست۔"

برج نے بات بدل دی ——— "تمہارا گلاس خالی پڑا ہے پھر دوں۔"

"ہاں اور ۔ ۔ ۔ ۔!"

نیلی سے میری ملاقات کی نیم تاریک رات ختم ہوئی۔

اور یہ زندگی ایک ایک لمحہ جوڑ کر بنتی ہے۔ ہر لمحے کی اپنی اہمیت ہے۔ ہر لمحہ دوسرے سے مختلف ہے۔ کچھ لمحے چھوٹے ہو کر بھی اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ اِن کے سائے ہماری ساری زندگی کو تاریک بنا دیتے ہیں۔

رات بڑی تاریک ہے۔

نیند نہیں آتی ۔ !!

میں اپنے کمرے میں بیٹھا لکھ رہا ہوں، کمرے کی کھڑکیاں بند ہیں۔ ذرا اِن کھڑکیوں کو کھول دوں پہلے۔ شاید شنکر آچاریہ کی اوٹ سے چاند نکل رہا ہو۔ شاید چاند کی دھیمی دھیمی سی نرم نرم سی ٹھنڈی ٹھنڈی سی چاندنی میں نیلی کو اور اپنے قریب پا سکوں۔ شاید ڈل جھیل کی برف برف سی ٹھنڈی لہروں کی سرد ہوا کے جھونکے مجھے سکون بخش سکیں ——— میں نے کھڑکی کھول دی اور چاند کی چاندنی نہ نکھری ہوا اور سرد ہوا کے جھونکے کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے پردوں میں کوئی سرسراہٹ پیدا نہ کر سکے تو ——— میرا سارا وجود رات کے اِن سسکتے لمحوں میں بکھر جائے گا، بکھر بکھر کر پگھل جائے گا۔ اور میں ساری عمر اپنے وجود کو نہ ڈھونڈ پاؤں گا۔ اور پھر زندگی بھر اِس کہانی کو نہ لکھ سکوں گا۔

نیلی کی یہ کہانی بھی ایک ایسی ہی نیم تاریک رات کو شروع ہوئی، اُس کمرے میں بھی تو نیم تاریک اندھیرا تھا۔ حالانکہ اوبرائے پیلس کے کسی کمرے میں تاریکی نہیں ہوتی اور پھر کمرہ ۱۰۲ کی بات ہی تو دوسری ہے ——— کیا ہوا بجلی کے قمقموں میں ایرانی قالین چمک رہا تھا، دیواروں کا رنگ و روغن مسکرا رہا تھا۔ بستر کی شکنیں حرارت اور گرمی کی گواہی دے رہی تھیں اور کیا ہوا شراب سے لبریز جام نظروں کے سامنے تھے۔ قمقموں کی روشنی دِل کو کہاں تک نُور بخش سکتی ہے۔ دِل کی روشنی کے لئے اپنا خونِ جگر پینا پڑتا ہے۔ اپنے آپ میں کھو جانا پڑتا ہے جیسے میں کھو گیا تھا۔ جیسے نیلی کھوئی تھی۔ برج کھو گیا تھا اور جیسے ایک رات راشد کھو گیا تھا۔ بنسی، اقبال، یا اشفاق کھو گئے تھے یا وہ خوبصورت منسٹر کھو گیا تھا جو نیلی کو دیکھنے کے لئے دِلّی سے سرینگر چلا آیا تھا۔ پر کھونے کھونے کی بات ہوتی ہے نا، وہ سب ایسے کھو گئے۔ جیسے ڈل جھیل کی گہرائیوں میں پتھر، جو پھر اُبھر نہ سکے، اگر اُبھرا تو صرف میں۔ وہ سب تو مئے ناب پی کر قمقموں کی روشنی میں نیلی کے جسم کو دیکھتے رہے، تلاش کرتے رہے۔

تیمی کے نرم نرم بالوں پر ہاتھ پھیرتے رہے ۔۔۔۔ میں نے
اپنا خونِ جگر پیا شراب کی شکل میں اور پہلے اُس کی آنکھوں
میں جھانکا ۔ پھر آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ اُس کے دل میں اُترا
اور ایک کہانی نے جنم لیا ۔ انجام سے بے خبر ایک کہانی ۔۔۔۔
اور اُس کہانی کا کوئی ہیرو نہیں ۔ کوئی ہیروئن نہیں، سب ہی
ولن ہیں ۔ سبھی ایک دوسرے کو اجنبی اجنبی نظروں سے دیکھتے
ہیں ۔ سبھی کی نظروں میں شک کی پرچھائیاں ہیں ۔ اور شاید
اسی لئے یہ کہانی ایک اجنبی ادا کی کہانی ہے ۔

برج کے بعد میں اِس کہانی میں آیا ۔ لیکن اُس وقت
وائلن کے تار ٹوٹ چکے تھے ۔ اور اُن تاروں سے نکلا ہوا نغمہ
فضاؤں کی نذر ہو چکا تھا اور آکاش کی بے کراں وسعت میں
لپٹا ہوا چاند دُھند تلے گم ہو چکا تھا ۔

یہ برج کے جانے کی بات ہے ۔ میں نے نیلی سے فون پر بات
کی اور پہلی ہی بات میں برج کے ساتھ اُس کی شادی کا اشارہ کیا ۔

اُس نے کہا ۔۔۔۔ "میں تمہاری راہ دیکھوں گی ۔"

اُس رات راشد میرے ساتھ تھا ۔

چھوٹی سی تپائی پر گلاس رکھے ہوئے تھے ۔ ایک پلیٹ
میں چپس پڑے تھے ۔ تھرماس میں چشمہ شاہی کا یخ بستہ ٹھنڈا
پانی تھا اور بوتل راشد کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی ۔ ٹیپ ریکارڈ
پر کوئی گیت بج رہا تھا ۔ گیت کے بول مجھے یاد نہیں ۔ البتہ
ایک بہت ہی رومانی گیت تھا وہ ۔ دو رُوحوں کا مِلاپ ۔ دو
جسموں کا ٹکراؤ ۔۔۔۔ پہلا پیگ ہیرے کا پنج کے گلاسوں میں
ڈالا گیا ۔ ہم سب نے سِپ کیا ۔ راشد مہاراجہ ہری سنگھ کے ماضی
میں کھو گیا ۔ اُس کی زندگی کا معیار ۔ اُس کے رہنے سہنے کا
ڈھنگ ۔۔۔۔ آج بھی اوبرائے پیلیس کی عظیم عمارتیں اُس
کے رہنے سہنے کے ڈھنگ کی گواہی دے رہی ہے ۔ آج بھی
اوبرائے پیلیس کے کمروں کی دیواروں پر ہماری غلامی کی
پرچھائیاں نظر آتی ہیں ۔ بس رنگ بدلنے سے ماضی کے
سائے ساتھ نہیں چھوڑتے ۔ آج ان کمروں میں اگر اوبرائے
پیلیس کا ہوٹل جگمگا رہا ہے تو اب سے کئی سال پہلے
ان کمروں کے مکینوں نے سالہا سال کشمیر پر حکومت
کی ہے ۔

کتنا بھیانک دَور تھا ۔!

اور ایک دن ان عمارتوں میں آگ لگ گئی ۔ اُس دن
ان عمارتوں کے تراشے ہوئے خوبصورت پتھر چیخ اُٹھے ۔ ان
چیخوں میں بادشاہ کی چیخیں بھی شامل تھیں ۔ لیکن یہ چیخیں آگ کے
شعلوں میں دب کر رہ گئیں ۔۔۔۔ اور آزادی کا سورج طلوع ہوا ۔

راشد آہستہ آہستہ اپنا جام خالی کرتے ہوئے ماضی سے حال
میں لوٹ آیا ۔ اور جیسے اُس کی نظروں کے سامنے ٹنگمرگ کی
سبز زمین گھوم گئی ۔ جہاں اُس نے اِن ہی دِنوں ایک چھوٹی سی
سیٹ بنالی ہے ۔

ٹنگمرگ ۔!

سمے اور جل نے مِل کر ٹنگمرگ کو تراشا ہے ۔ ایک طرف
دیوار اور چیڑھ کے درخت، چنار کے پتوں کا لال رنگ، کھیتوں
میں اناج کی سُنہری بالیاں اور دوسری جانب ۔ یخ ٹھنڈا جل،
دُور دُور تک بہتا ہوا پانی، ہر سمت برف ہی برف، سپید سپید
سی برف بے داغ ۔ ۔ ۔ رنگوں کے نئے رُوپ کے لئے ہی
شاید راشد نے ٹنگمرگ میں مکان بنالیا ہے ۔ کیونکہ یہاں سے
لال نارنجی رنگ زوجی لا چوٹی پر بکھرے نظر آتے ہیں ۔ اور پھر
یہاں اتنے پھول ہیں، نیلے پیلے پھول، اتنے سُندر جیسے کسی نے
اِن پر رنگوں کی پچکاریاں کی ہوں ۔ یہاں چڑیوں کے راگ سے
رات گا اُٹھتی ہے ۔ پانی کی آواز سے ندی نالے گنگناتے ہیں ۔
اشٹامبری کی خوشبو میں ڈوبی ہوئی دُھوپ کس قدر صحت مند ہے
۔۔۔۔ اسی ماحول میں راشد کا مکان ٹنگمرگ کی وسعتوں
میں کھڑا ہے ۔ اکیلا تنہا ۔۔۔۔ جیسے میں ۔ میری زندگی ۔ میرا جیون!

اور پھر راشد نے باتیں کیں ۔ مگر بنانے کی باتیں ۔ گھر
سجانے کی باتیں ۔۔۔۔ خُوب باتیں کیں!

جانے مجھے کیا ہوا ۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں اپنا
گلاس خالی کیا ۔ نیلی نے پھر بھرا ۔ میں نے ایک اور بار خالی کیا ۔
اور راشد کی طرف دیکھا ۔

راشد نے پوچھا ۔۔۔۔ "تم کچھ کہنا چاہتے ہو ۔"

"ہاں ۔۔ !"

"کیا۔۔؟"

"تم ہوش میں نہیں ہو۔ یہ ہوٹل کا کمرہ ہے جہاں بیٹھ کر گھر کی باتیں نہیں کی جاسکتیں۔ صرف گھر کا ماحول بدلنے کے لئے ہوٹل کے کمرے کا سہارا لیا جاتا ہے۔"

نیلی کو میری باتیں اچھی نہیں لگیں۔ وہ بھی ایک گھر کے متعلق سوچ رہی تھی شاید ــــ اپنے گھر کی باتیں، گھر بنانے، سجانے اور سنوارنے کی باتیں۔

نیلی نے پوچھا ــــ "آپ سے برج نے اور کیا کہا۔"

میں نے کہا "وہ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"شادی، مجھ سے ــــ کیوں۔۔؟"

"کیونکہ وہ آپ سے پیار کرتا ہے۔"

"پیار، یا، تفریح۔۔؟"

راشد نے کہا۔ "ایک بات میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہئے"۔ نیلی نے جواب دیا۔

"تفریحی پیار بھی زندگی کا المیہ بن سکتا ہے۔"

وہ رو پڑی۔ میں نے سوچا، جانے اِن مست مست سی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے امڈ آتے ہیں۔ نیلی کی یہ آنکھیں اگر زندگی بھر آنسو بہاتی رہیں تو کیسے گزرے گا یہ جیون۔ کیسے پورا ہوگا زندگی کا یہ طویل چکر۔۔۔؟

میں نے کہا ــــ "دیکھو نیلی مت رو۔ یہ رونے کا سمے نہیں۔ زندگی کا دوسرا نام مسکان ہے۔ اور بن مسکان کی زندگی کوئی زندگی نہیں۔"

اُس نے اپنی جھکی جھکی سی پلکوں کو آہستہ سے حرکت دی۔ اور میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"مجھے اپنے آنسوؤں پر کوئی اختیار نہیں۔"

شاید اُن آنسوؤں میں میرے دل کی دنیا تاریک ہونے کی داستان پوشیدہ تھی۔ میرے ذہن کے کسی گوشے سے ایک لوک کہانی اُبھر آئی ــــ ایک تھی گڑیا، پھر اُس نے ایک شہزادی کا روپ اپنا لیا۔ اور پھر ایک دیو آیا۔ بچپن کے گھروندے ڈھ گئے۔۔!

اُس رات ہم نے پریمیئر ہوٹل میں کھانا کھایا۔

ہم کھانا کھا رہے تھے اور چکنے فرش پر ایک نیم عریاں کالی کلوٹی سی لڑکی مغربی دھنوں پر رقص کر رہی تھی ــــ وہ رات کسی بات کا پتہ دے رہی تھی۔ کئی باتوں کا انکشاف کر رہی تھی۔ مسکراتے لب، دونوں شانوں پر بکھرتے اور لہراتے کالے کالے بال۔۔۔ نرم و نازک ریشمی لباس جو نیلی کے بدن کو اپنی آغوش میں سنبھالے ہوئے تھا۔ ہولے ہولے آہستہ آہستہ چمٹا رہا تھا۔ اور رہ رہ کے اُس کی گدگدیاں کر رہا تھا۔

موسیقی اُبھر رہی تھی۔ کالی کلوٹی لڑکی محوِ رقص تھی، اور راشد کہہ رہا تھا۔

"We share a room in the office"

نیلی نے پوچھا۔ بڑی سادگی تھی اُس کے انداز میں۔

"what about your real life"

راشد نے سوچ کر کہا ــــ "صرف ہمارے دفتر کا کمرہ مشترکہ ہے۔ اور۔۔۔!"

"اور کیا۔۔؟"

"اور شراب۔۔!"

"بس۔۔!"

"yes, but I hope my friend has no objection to share you with me"

نیلی نے پوچھا ــــ "me"

"yes"

"کیا مطلب۔۔؟"

"Let us go for a long drive"

نیلی نے میری طرف دیکھا۔ راشد نے بھی میری طرف دیکھا۔ میں خاموش رہا۔

رقص ختم چکا تھا۔ میں نے نیلی کی آنکھوں میں غور سے جھانکا۔ وہ آنکھیں جیسے بتا رہی تھیں۔

"تم ایک عورت کے جسم سے کیا ہی سلوک کرتے ہو۔"

ہم دونوں اُسے چھوڑنے اوبرائے آئے۔ راشد باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ اور میں نیلی کے ساتھ اُس کے

کمرے میں چلا گیا۔ میں نے پوچھا۔
"کیا ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔"
ہمارا ایک رشتہ بن چکا ہے۔" اُس نے جواب دیا۔
میں نے پوچھا ـــــ "کون سا۔ ؟"
"ذہنی رشتہ۔ !"
"میں سمجھتا ہوں ذہنی رشتوں سے جسمانی رشتے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔"
میں نیلی کے قریب سرک گیا۔
"اور برجح" اُس نے پوچھا۔
"ابھی شادی نہیں ہوئی۔"
"ہو تو جائے گی۔"
"ضرور ہوگی۔"
"تم مبہم سی باتیں کرتے ہو۔"
"پھر کیسی باتیں کروں۔"
"باتیں کھل کر ہونی چاہیئے جیسے دو حقیقت پسند انسان آپس میں کرتے ہیں۔"
"میں خود حقیقی زندگی کا قائل ہوں۔ اِسی لئے ذہنی رشتوں پر جسمانی رشتوں کو ترجیح دیتا ہوں۔"
"ایک سوال پوچھوں۔"
"پوچھیئے۔" میں نے کہا۔
"برجح سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ ؟"
"ہم دوست ہیں۔"
"کیا میں اُس دوست کی امانت نہیں ہوں !"
"برجح نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا۔"
"پھر کیا کہا تھا۔ ؟"
"صرف شادی کی بات کی تھی۔"
"اگر میں . . . . !"
"ہاں ہاں کہیئے۔"
"اگر میں تمہاری بات مان بھی لوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں بھی جسمانی رشتوں کو ذہنی رشتوں پر ترجیح دوں اور پھر ایک دن میری شادی برجح سے ہوتی ہے۔ تب کیا ہوگا ؟"

"ہوگا کیا ـــــ کچھ بھی نہ ہوگا۔ بس تمہارے گھر کا دروازہ میرے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔ لیکن پھر بھی زندگی کے کسی اُداس لمحے میں تمہیں کسی کا خیال آئے گا۔ کوئی تمہاری یادوں کو جھنجھوڑ ڈالے گا۔ وہ میں ہوں گا ـــــ صرف میں . . . . . جانے اُس وقت میں کہاں ہوں گا۔ تم مجھے کہاں تلاش کروگی ؟"
"کیا تم ایک لمحے کی مسرّت کے لئے زندگی بھر کی دوستی قربان کر دینا چاہتے ہو۔ ؟"
"میں نے کل کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں صرف آج کے بارے میں سوچتا ہوں۔ آج کے آخری لمحے کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ اُس لمحے کی آخری سیما۔ آخری حد۔ . . ."
"نادر۔ !"

زندگی کیا ہے چند لمحاتی لذّتوں کا احساس !
رات کافی جھک آئی ہے۔
اُف میں کیا کروں۔ نیند نہیں آتی۔
اور اگر نیند آگئی اور میں سو گیا پھر . . . . . ؟ !

بات نیلی کی نہیں۔ کوئی بھی عورت خواہ کتنی ہی مغرور کیوں نہ ہو۔ کتنی ہی خود پسند کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے محبوب کی آغوش میں ہو یا کسی غیر مرد کے سینے سے لپٹی ہوئی، اُس کے بازوؤں میں جکڑی ہوئی ہو ـــــ اُس وقت بھلا اُس کی کیا حقیقت ہوتی ہے۔
اور نیلی ـــ !!
میں اپنے آپ کو کوئی نام نہ دے سکا۔ نہ محبوب کا اور نہ ہی غیر مرد کا ـــــ میرا کوئی نام نہیں۔
میں جب نیلی کے کمرے سے باہر آیا، رات کے تین بج چکے تھے۔ اور آشا چلا گیا تھا۔ رات سو رہی تھی۔ میں پیدل ڈل کے کنارے چلتا رہا۔ جھیل ڈل کے کنارے ـــــ کائنات بڑی خاموش تھی۔ ہاؤس بوٹوں کی رنگین دنیا میں کوئی زندگی نہ تھی۔ جھیل کے آس پاس نالوں میں بید کے پیڑوں کی قطاریں بھی بے حس تھیں۔ اور ڈل کے پانیوں میں تیرتے ہوئے باغ بھی جیسے سو چکے تھے۔ ابدی نیند ـــــ صرف ایک میں جاگ رہا تھا۔

برج بمبئی کے ہنگاموں میں گم ہو چکا تھا۔ اور میں کشمیر کے ہنگاموں سے اپنا چکا تھا۔

نیلی اور برج کی شادی بنتے بنتے رہ گئی، صرف ایک دیو۔ ——— کالا دیو، ایک لمحے کے لئے نیلی کی زندگی میں آیا اور گھر بنانے کے ارمان، خواب مسمار کر گیا۔ نوعمر تمنائیں اپنے آپ مر گئیں۔

وہ کالا دیو میں تھا۔ !

میں نے مڑ کر دیکھا ——— اوبرائے پیلس کی ہوٹل کی عمارتیں خاموش تھیں اور ان عمارتوں میں ماضی کے سائے خاموش تھے۔ ابدی نیند سو چکے تھے۔ آگ کے شعلے بجھ چکے تھے۔ صرف راکھ باقی تھی۔ غلامی کی راکھ.... آزادی کے شعلے۔ !

یہ کوئی بہادری نہیں کہ تم نے اپنے مکان کی سیڑھیوں پر سونا بچھا رکھا ہے اور گھر میں صندل کے دروازے اور کھڑکیاں لگا رکھی ہیں، یا اُس کی اونچی بنیادیں سونے کی اینٹوں سے تعمیر کی ہیں۔ بہادری تو یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی تلوار سے کھیلنا سیکھو۔

یہ آزادی کی باتیں ہیں۔ شاعرِ کشمیر آزاد کی آواز ہے۔

عوام ظلم، غربت، ناانصافی، پسماندگی اور جہالت کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ اور خود غرض لیڈر شان و شوکت سے بیٹھے ہیں! یہ کشمیر ہے۔

بڈشاہ کا کشمیر ——— للہ دید اور نورالدین ولی کا کشمیر!

یہ میرا کشمیر ہے ——— میرا گھر..... آزادی زندہ باد۔

رات اتنی تاریک کیوں ہے؟ یہ کیسا اندھیرا ہے۔؟

یہاں کوئی روشنی نہیں، کہیں نور نہیں ——— اس اندھیرے میں، میں اپنی نیند کو کہاں تلاش کروں ——— میں سونا چاہتا ہوں اور اتنی دیر سونا چاہتا ہوں کہ نیلی کو بھول جاؤں۔ صوفیہ اور انیتا کو فراموش کر سکوں اور وہ زلیخا...... پر نیند نہیں آتی۔

آزاد کہہ رہے ہیں ـــ

"تم ایک آفتاب ہو اپنا نور دنیا کو دکھلاؤ۔"

اور میں اُس نور کی تلاش میں آج پینا چاہتا ہوں، پی پی کر بدمست ہونا چاہتا ہوں ——— میرے پاس نئی شراب ہے، شراب کے برتن نئے ہیں، پیالہ نیا ہے۔

!..... لیکن ساقی۔ ؟!

کاش آج آرما میری ساقی ہوتی۔

کبھی کبھی شام ہوتے ہی کالے سیاہ بادل پھٹ جاتے ہیں۔ اور صاف و شفاف بارش برسنے لگتی ہے، ایسی بارش میں بھیگ جانا جانے مجھے کیوں اچھا لگتا ہے۔ جی میں آتا ہے ایسے ہی بھیگتا بھاگتا دور کسی جنگل میں جا بسوں اور شاید اُس ہرنی کو پا سکوں جو مجھ سے کھو گئی ہے۔

دوستو۔ !

تم بے شک میرا مضحکہ اڑاؤ، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے ہی ایک اَن دیکھے جنگل میں ایک بار وہ ہرنی مجھ سے کھو چکی ہے۔ اُس روز جنگل میں برق و باراں کا طوفان اُمڈ پڑا اور قد آور درختوں نے ہیبت ناک طریقے سے آپس میں سرگوشیاں کرنی شروع کر دیں اور اس کے بعد وہاں اس قدر گہرا اندھیرا چھا گیا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے میری پیدائش سے اب تک تمام راتوں کی تاریکی میرے دل کے جنگل میں جا بسی ہو۔

دل کا جنگل۔

ویران ویران ـــ !!

اور اب ہر برستی شام کو میں اُسے پانے کی آرزو میں ان جنگلوں میں گھومتا ہوں ——— آج جب میں نے اپنی نظریں اٹھا کر دیکھا، کوئی جنگل نہ تھا اور نہ کوئی ہرنی تھی... قمقموں کی تیز روشنی تھی۔ گہما گہمی تھی، ہنگامے تھے، زندگی اپنے شباب پر تھی اور میرے سامنے اوبرائے پیلس کا بار جہاں اقبال اکیلا بیئر پی رہا تھا۔

برستی شام اور تلخ آلود ٹھنڈی بیئر۔ !

"بیئر پیو گے۔؟" اقبال نے پوچھا۔

"بیئر نہیں، وہسکی، لیکن ابھی ٹھہر کر، اور یہاں نہیں۔"

"پھر۔"

"اندر، میرے کمرے میں۔" دفعتاً میری زبان سے نکل گیا۔

"تمہارا کمرہ۔؟"

"میرا مطلب ہے کہ کمرہ ۱۳ میں کوئی میرا منتظر ہے۔"

"میں بھی چلوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اُٹھو۔"

اقبال نے بیئر کا گلاس ایسے ہی رکھ دیا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کمرہ کھلا ہی تھا۔

"COME IN"

وہی آواز۔ وہی مٹھاس؟

میں نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے کے اندر آ گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں خوابوں کے جزیرے میں آ گیا ہوں۔ حالانکہ وہی کمرہ تھا۔ کمرے کی چیزیں ویسی ہی تھیں۔ کمرے کی سجاوٹ وہی تھی اور نیلی بھی وہی تھی ____ پر آج کی نیلی کل کی نیلی سے کچھ مختلف تھی۔ آج نیلی کی آنکھوں میں انتظار کا عکس نظر آ رہا تھا۔

"میں آپ ہی کی منتظر تھی۔!"

"یہ میرے بھائی ہیں اور دوست بھی ____ اقبال۔!"

"اقبال۔"

"ہاں اقبال۔ البتہ یہ شاعر اقبال نہیں، انجینئر ہے۔"

"میرے بڑے بھائی کا نام بھی اقبال تھا۔"

"تھا۔؟ ____ کیا مطلب۔؟"

"وہ AIR CRASH کی نذر ہو گیا۔"

"اوہ ____ سوری" اقبال نے کہا۔

میں نے اقبال کا ہاتھ تھام لیا۔ نہ جانے کیسے میری نظروں کے سامنے آکاش کی بلندیوں میں پرواز کرتے ہوئے ایک جہاز کی تصویر گھوم گئی اور جیسے میرے دیکھتے دیکھتے وہ جہاز بادلوں کی اوٹ میں گم ہو گیا۔ اور ان بادلوں میں آگ لگ گئی۔

میری گرفت میں زور آ گیا۔

"کیا بات ہے؟"۔ اقبال نے پوچھا۔

"ایر کریش۔"

اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان کے بھائی کا ہوا تھا۔"

میں نے اقبال کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نیلم نے کہا۔

"بیٹھئے نا، اقبال بھائی۔"

بیرا آیا۔ گلاس لگ گئے، شراب انڈیل دی گئی اور اس کہانی کی دوسری نیم تاریک رات شروع ہوئی ____ میں نے کہا نا کہ کبھی کبھی سرِ شام ہی بادل پھٹ جاتے ہیں اور صاف و شفاف بارش برسنے لگتی ہے۔ بس ایسے ہی نیلی ایک بادل بن کر پھٹ گئی اور اُس کے سینے کی گہرائیوں سے اُس کا دل بولنے لگا۔ صاف و شفاف باتیں۔ ان باتوں میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔ کوئی تضاد نہ تھا۔

اُس نے کہا ____ "میں ہر شام شراب پیتی ہوں۔ شراب پینا کوئی پاپ نہیں۔ لیکن میری ایک کمزوری ہے، میں تنہا شراب نہیں پی سکتی۔ شراب ایک ایسی شے ہے جو تنہائی نہیں چاہتی۔ حالاں کہ کبھی میں ان تنہائیوں سے پیار کرتی تھی۔"

"اور اب۔" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو میتھی کو ساتھی بنا لیا ہے۔ میری بے زبان جنگلی بلی۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"میں شراب نہیں چھوڑ سکتی اور شراب پینے کے لئے ہر روز کسی نئے دوست، کسی نئی صورت کو دیکھنا نہیں چاہتی۔"

میں سونا چاہتا ہوں۔ لیکن نیلما کے یہ الفاظ، شراب ..... نئے دوست ..... مجھے کہیں دور لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور مجھے ایک کہانی یاد آ رہی ہے نیلما کے یہ الفاظ اُس کہانی میں خلط ملط ہو رہے ہیں۔ اور جیسے نیلی ہی اپیتسی کہانی کار، ویلیرا کی کہانی کا کردار بن کر مجھ سے کہہ رہی ہے ____ کبھی کبھی میں بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتی ہوں۔ جو معصوم ہوتی ہیں۔ یا گناہ آلود، میں نہیں جانتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں اپنے جسم کو دیکھتی ہوں اور لاتعلق انداز میں اپنے حسن کے بارے میں سوچتی ہوں۔ میری یہ حرکت میرے شہوانی جذبات کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اُس سے میری جمالیاتی اور افلاطونی احساسات کو تسکین پہنچتی ہے۔ میری ان حرکات سے نرگسیت جھلکتی ہے اور میں اپنے ہونٹ آئینہ کی ٹھنڈی سطح پر رکھ کر اپنے ہی عکس کا بوسہ لیتی ہوں۔!

اقبال تمہارے لئے یہ نیا ہی سہی، مگر اس کا یہ روپ میرا جانا پہچانا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے غلط سمجھا۔ میں چاہتی ہوں میرا ایک ہی ساتھی ہو جو میری تنہائیاں بانٹ لے۔"

"تب میتھی کا کیا ہو گا۔؟"

"میں اُس کو چھوڑ دوں گا۔"
"اگر یہ تنہا بھٹک گئی تو" ——— میں نے کریدا۔
"تمہیں میتی کی بڑی فکر ہے اور میری ....."
"میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔؟"
"تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میری شادی ہو سکتی ہے۔"
"کس سے۔؟"
"برج سے۔!"
"برج ——— برج ..... کم بخت پھر آیا اس کہانی میں۔ میں نے تو کل رات ہی اُسے مار ڈالا تھا۔ کل رات ہی بمبئی کے ہنگاموں میں گم کر دیا تھا ——— آج کیسے زندہ ہو گیا۔"
"کون برج ؟" اقبال نے پوچھا۔
"برج یعنی پل" ——— میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔
"پل تو دو کناروں کو ملاتا ہے۔ ایک بہتی ندی کے دو کنارے ایک ہو جاتے ہیں" اقبال اب ایک انجنیئر کی طرح سمجھانے لگا۔
"نیلی اقبال کو دیکھے جا رہی تھی۔ میں خاموش رہا۔"
"کیا سوچنے لگے۔"
"کچھ بھی تو نہیں ——— لیکن کچھ سوچ ہی رہا ہوں ..... کیا ؟"
"بڑے بھائی بہک گئے ہیں۔" اقبال نے چوٹ کی۔
"ہاں میں بہک گیا ہوں۔" میں نے کہا۔
"اُسے شراب نہیں پینی چاہئے جو بہک جاتا ہے۔" اقبال نے پھر چوٹ کی۔
نیلی نے کہا ——— اقبال بھائی شراب پی کر بہکنا زندگی کا ایک خوبصورت پہلو ہے، تم کیا جانو۔"
سوچتے سوچتے میں اُسی راہ پر چل پڑا۔ جس کے کئی موڑ ہیں۔ کہیں ساری زندگی ان ہی سارے موڑوں کی نذر نہ ہو جائے۔ اور سُکھ اور شانتی کے سائے ڈوب نہ جائیں ——— یکبار میں نے اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھا، کئی چہرے ایک ساتھ میرے سامنے بکھر گئے۔ کئی گھر ایک ساتھ گھوم گئے۔ راشد کی سیٹ گھوم گئی، جہاں ایک خوبصورت کمرے میں ایک بے داغ بستر بچھا ہے۔ بمبئی کے ہنگاموں میں سمندر کے کنارے وہ

فلیٹ گھوم گیا جہاں برج رہتا ہے اور جس کے ایک کمرے میں ریشمی بستر سجا ہوا ہے۔ شاہدہ کی خواب گاہ نگاہوں کے سامنے آگئی کوثر کا کمرہ ..... کھردرا بستر ——— اور یہاں بالکل میرے سامنے اوبرائے پیلس کے اِسی کمرے میں ایک بستر نظر آ رہا ہے گرم اور حرارت سے بھرپور ..... !
اور نیلا شادی کرنا چاہتی ہے، ایک گھر کے لئے۔ شادی دراصل ایک بستر ہے۔ نرم نرم ریشمی بستر۔ گھر دراصل ایک بستر ہے۔ گرم گرم گداز بستر ——— اور اسی بستر کے لئے زندگی کے سارے ہنگامے جنم لیتے ہیں۔ اِسی بستر پر لوگوں کی تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اِسی بستر پر دنیا کے بُرے اور اچھے لوگوں کا جنم ہوتا ہے۔ اور اِسی بستر پر محبت کا آغاز ہوتا ہے اور نفرت کی انتہا۔ ؟!
گھر کی بات چلی نا۔ مجھے کوثر یاد آ رہی ہے اور احسان کا گھر۔ اُس گھر کا ایک کمرہ کبھی میرے مصرف میں تھا۔ اب کوثر احسان کی بیوی ہے۔ اور میرا اُس گھر سے کوئی تعلق نہیں، ہاں اُس گھر سے اور اُس گھر کے ایک مخصوص کمرے سے میری بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ اُنہیں کہاں دفنا دوں، اُس کمرے میں تو میرے ماضی کی ایک طویل کہانی بکھری ہوئی ہے ——— وہ کمرہ ..... لیکن نیلگوں سیمابی روشنی میں نہایا ہوا کمرہ۔ گلابی رنگ کی گدّی دار کرسیاں، جن میں دائیں ہاتھ کی کرسی پر میں بیٹھا کرتا تھا۔ اور اُس کی پہلو والی کرسی پر کوثر میرے زانو پر سر رکھے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہتی تھی۔ صندل کی بنائی ہوئی خوشنما میز ہے، جس کے سامنے بیٹھ کر اُس نے کئی بار اپنے ریشمی بالوں کو سنوارا ہے۔ کونے میں کھڑی گودریج کی وہ الماری اب بھی مرکری لائٹ میں جگمگا رہی ہوگی، جس کے نِکل کئے ہینڈل پر اُس کے ہاتھوں کا لمس ہے۔ مینٹل پیس پر رکھا ہوا وہ روغنی گلدان اور اُس میں رکھے ہوئے پھول شاید اب مُرجھا چکے ہوں گے۔ اُن دنوں میں خود اپنے ہاتھوں سے گلدان سجاتا تھا۔ ہاں سُنہرے رنگ کا وہ پن تو ہوگا۔ مگر وہ لیٹر پیڈ نہیں جس کے ڈسٹ کور پر کوثر نے میرا نام لکھا تھا۔ اب کوئی اور لیٹر پیڈ ہوگا اور اُس کے ڈسٹ کور پر کوئی اور نام۔
——— ہاں احسان کا نام ..... آنگن کی طرف

کھلنے والی کھڑکی کے قریب اخروٹ کی لکڑی کا پالش کیا ہوا خوب صورت پلنگ اور اُس پر بچھا ہوا پھول دار ساٹن کا مُعطّر بستر۔ ـــــ کتنی بار کوثر سوئی تھی اُس بستر پر۔ شاید اب بھی اُس کے دودھیا جسم کی گرمی اور نرمی رچی ہو گی اُس بستر میں ـــــ وہی سب کچھ ہو گا۔ صرف میں نہیں ـــــ میں ؟!

ایک دن کوثر میرے ساتھ اس گھر میں اجنبی بن کر آئی اور ایک روز میں اُس گھر سے اجنبی بن کر نکلا۔ کتنی بڑی بات ہے۔ کتنی دیر لگتی ہے اجنبی بننے میں، اپنا بننے میں ـــــ اپنا اپنا گھر۔ اپنے اپنے لوگ ـــــ !!

"نیلی، ایک بات پوچھوں۔"

"ہاں ـ !"

"کشمیر میں تمہیں کیا اچھا لگا۔ ؟"

"یہاں کے رنگ ـــــ رنگ جو کبھی تیکھے ہوتے ہیں اور کبھی شوخ۔ کبھی بھیگے ہوئے، دھند میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"اور یہاں کے لوگ ؟"

"یہاں آنے سے پہلے کتنے لوگوں نے اُسے کہا تھا کہ میں یہاں آکر کشمیریوں کے ساتھ گھل مل نہ جاؤں۔ یہ لوگ بڑے ہیں۔"

"کچھ لوگ تو ملے ہوں گے ؟"

"بھلا کون سے لوگ ـ ؟"

"میں بتانا نہیں چاہتی ـ !"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔" پھر کیا ہوا ؟

"لوگ بُرے نہیں ہیں۔ اور پھر سبھی جگہ لوگ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ لوگوں میں اپنی کمزوریاں اور اچھائیاں ہوتی ہیں۔"

"میرے بارے میں کیا رائے قائم کر لی ہے۔ ؟"

"تم بُرے نہیں ہو۔"

"کہنا کیا چاہتی ہو ؟"

"تم بے حد جذباتی ہو، ہر بات دل تک لے جاتے ہو۔"

"کیا مجھے اپنے جذبات پر کوئی اختیار نہیں۔ اپنے دل پر کوئی حق نہیں۔ کیا میرا دل کسی کے لئے نہیں دھڑک سکتا۔ کیا کسی کو پانے کے لئے میرے دل میں کوئی خواہش پیدا نہیں ہو سکتی۔ ؟"

"لیکن اگر یہی دل کسی اور کی زندگی بنانے کے لئے دھڑکے تو میں ساری زندگی کے لئے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں گی۔"

"پھر کیا ہو گا۔ ؟"

"میرا گھر بنے گا۔ !"

"اور اس گھر میں کیا ہو گا۔ ؟"

"میرا پیار ..... میرے بچے ..... میری ....."

"نا ـــ کچھ بھی نہ ہو گا؟ یہ سب پانے کے لئے ایک بستر کی ضرورت پڑتی ہے۔ گرم اور گداز بستر، اور وہ بستر کمرے میں بھی ہے۔ وہ دیکھو۔"

"لیکن میرا ساتھی تو ہو گا میرے ساتھ۔"

"ساتھی کا کیا ہے، میں بھی بن سکتا ہوں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" اقبال تقریباً چیخ پڑا۔

"اقبال" میں نے بھی اسی لہجے میں کہا ـــــ "کچھ باتیں سننے کے لئے ہوتی ہیں، کچھ سوچنے کی اور کہنے کی ـــــ تم میری باتیں سنو۔ اُن پر سوچو، پر کچھ بھی نہ کہو۔"

"تم ہمیشہ اپنی چکنی چکنی باتوں سے محفل کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہو۔"

"شاید یہ میری کمزوری ہو اور شاید میں اسی لئے بہک جاتا ہوں۔"

اقبال نے نیلی کو مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ کا بھائی مر گیا تھا نا۔"

"ہاں۔ !"

"کیا نام تھا اُن کا۔ ؟"

"تمہارا ہم نام تھا ـــــ اقبال۔" !

"کیا میں اُس کی جگہ لے سکتا ہوں۔"

"تم۔ ؟"

"ہاں۔ !"

نیلی کھڑی ہو گئی۔ اقبال بھی کھڑا ہوا۔ دونوں کے ہاتھوں میں گلاس تھے۔ میں بیٹھا رہا۔ سب کچھ دیکھتا

رہا۔ دونوں نے گلاس ٹکرائے ـــــ اِس ٹکراؤ نے ایک رشتے کو جنم دیا۔ جب دونوں نے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیں۔ میں نے ایک بار پھر نرم گرم ریشمی بستر کی جانب دیکھا۔ محبت۔ !

"اے عزیزو ! ـــــ آؤ، ہم ایک دوسرے سے محبت رکھیں، کیونکہ محبت خدا کی دین ہے۔ اور جو کوئی محبت رکھتا ہے۔ وہ خدا سے محبت رکھتا ہے۔"

(انجیل مقدس ـــــ یوحنا کا پہلا خط)

ایسی تاریکی، ایسا اندھیرا، جس میں سب کچھ کھو گیا۔ قبر کا سا اندھیرا، قبر کی سی گھٹن ـــــ یہ گھٹن کہاں نہیں۔ قبر کی تہہ میں، جھیل کی گہرائیوں میں اور یہ گھٹن تو یہاں میرے کشمیر میں کئی سالوں سے چلی آرہی ہے ـــــ ہاں جب کشمیر آزاد ہوا تھا۔ جب کشمیریوں نے آزادی کی جنگ جیتی تھی۔ اِس آزادی نے کیا دیا ـــــ تاریکیاں، گھٹن، بے بسی اور مجبوری!!!

اَن کہی داستان ایک نظر کہہ گئی۔

اور اندھیرے سے بھرپور دوسری رات کی کہانی ختم ہو گئی۔ پر آج میں اکیلا نہ تھا۔ میرے ساتھ کئی سائے تھے۔ کوئی راشد کے روپ میں، کوئی برج کی صورت میں اور کوئی اقبال کی شکل میں ۔۔۔۔! میرا اپنا کوئی سایہ نہ تھا۔ کیونکہ ان اندھیروں میں اپنا سایہ نظر نہیں آتا اور کبھی کبھی تو میں دن کے اجالوں میں بھی اپنے سائے سے ڈرتا ہوں ـــــ ـــــ مجھے اندھیرے پسند ہیں۔ آؤ سو جائیں۔ نیند نہیں آتی!

اس سے پہلے کہ تیسری ملاقات یا اس کہانی کی تیسری رات کی بات کروں۔ میں اپنے ناسور کو رِسنے دینا چاہتا ہوں کیونکہ تیسری رات کو بسنتی نے نیلی سے میرے بارے میں کچھ ایسی باتیں کہیں کہ میرے پرانے ناسور رِسنے لگے۔ میرے پرانے زخم کھل گئے ـــــ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں نے زندگی میں ایک بار بڑی شدت کے ساتھ شاہدہ سے محبت کی تھی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اُن دنوں میں محبت کو اثاثہ سمجھتا تھا۔ اُن دنوں محبت میرے لئے محبت تھی، زندگی تھی۔ جیون تھی، ہاں یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں شاہدہ کے ساتھ برفانی چوٹیوں پر پورے چاند کی رقصاں چاندنی کو دیکھ سکتا تھا۔ نیلگوں وسعتوں میں لاتعداد ستاروں کی تھرک محسوس کر سکتا تھا۔ اُن دنوں ٹمٹماتے ستارے ہماری محبت کی داستان میں شریک تھے ـــــ اور ایک دن اِسی شاہدہ نے کسی اور کو اپنا لیا اور بھری محفل میں مجھ سے کہا ـــــ "میں نے کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ اِس محفل میں ریاض بھی تھا۔ اور شاہدہ کا بھائی الطاف بھی ـــــ الطاف (میرے لڑکپن کا دوست جو میری اور شاہدہ کی محبت سے بخوبی واقف تھا وہ چاہتا تھا کہ شاہدہ کی شادی مجھ سے ہو۔ وہ دوستی کو رشتہ داری میں بدلنا چاہتا تھا۔ اور اُس رشتہ داری کو ابدیت بخشنا چاہتا تھا۔

میری ساری تمنائیں مرگئیں۔ زندگی دم توڑنے لگی۔

اور میں بہت دُور تک حسرتوں اور محرومیوں کی لاش اپنے سینے کے مدفن میں دبائے زندگی سے نباہ کرتا رہا۔ پہلی محبت تھی دھندلکوں میں کھو گئی میں نے زندگی کو اُسی ڈگر پہ ڈال دیا جو موت کی سمت بڑھتی ہیں۔

کیسی باتیں ہیں۔ کیسے حالات ہیں اور وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ بدلے ہوئے حالات میں لڑکپن کی گونگی محبت جب اپنی بھرپور جوانی میں بدل جاتی ہے تو اُسے زبان مل جاتی ہے۔ سوچ مل جاتی ہے۔ ایک مکان کی سوچ، گھر گرہستی کی سوچ، باعزت زندگی کی سوچ، بس مرد اور عورت کی زندگی میں اتنا سا فرق ہے۔ مرد کی محبت ہمیشہ گونگی رہتی ہے، بولتی ہے نہ سوچتی ہے۔ لیکن عورت کی محبت ـــــ مکان، کار، روپیہ، عزت اور ۔۔۔۔۔۔ ؟!۔

کتنے ہی لوگ آسمان کی طرف تکتے تکتے مایوس ہو چکے ہیں۔ کاش آسمان ایک خزانہ ہوتا اور کسی دن اس خزانے کا منہ اپنے آپ کھل جاتا۔ آسمان پھٹ پڑتا اور یہ خزانہ، یہ ساری دولت لوگوں میں یکساں تقسیم ہوتی ـــــ پھر شاید محبت نہیں روتی۔ میں بھی کب سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔

کتنی بڑی دنیا ہے یہ اور اس بڑی دنیا میں میرے لئے کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے میں سونا چاہتا ہوں۔ میں اُس سانپ کو بھی سُلانا چاہتا ہوں جو میری چھاتی پہ آہستہ آہستہ رینگ رہا ہے۔ آج ایسا نہ سوچو۔ دل کی دیواروں کو اور اُونچا کرلو، ان پر آہنی زنجیریں لٹکا دو۔ تاکہ یہ سانپ باہر نہ آئے، اگر یہ باہر آنے میں کامیاب ہو گیا تو جانتے ہو کیا ہوگا۔؟

"بھلا کیا ہوگا؟"

"میں شاہدہ کو اغوا کرلوں گا۔"

"پھر کیا ہوگا۔؟"

"دل کے آنگن کا پھول مرجھا جائے گا۔"

شاہدہ اور ریاض کی شادی طے ہوئی۔ اور محبت نام کی شئے سے میرا اعتقاد اٹھ گیا۔ محبت کو میں نے ایک بستر کے روپ میں دیکھا، بستر جتنا نرم ہو، ملائم ہو، ریشمی ہو، گداز ہو، عورت کے لئے کشش رکھتا ہے۔ جب میں یہ فلسفہ سمجھ پایا۔ میں نے اپنے اندر کے انسان کو سلا کر نیم وحشی حیوان کو جگایا اور میلی کچیلی اور گندی گلیوں میں گندے اور میلے کچیلے بستروں میں کھو گیا، اور کھویا ہی رہا۔ اس زندگی میں اگرچہ بڑا ہنگامہ ہے۔ بڑا ہی جوش ہے، لیکن کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا۔ سبھی کی شکلیں ایک جیسی ہیں۔ دکھ، درد، اور پریشانیاں ایک سی ہیں۔ لیکن ایک بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، اُس کے بعد بھی میں نے کبھی کبھی اپنی تنہائی کے زہریلے اور کربناک لمحوں میں ایک شبنمی لمس کا انتظار کیا۔ اُس سمے میں شاہدہ کو اپنے قریب محسوس کرتا اور پھر سوچتے سوچتے، دیکھتے دیکھتے ایک قیمتی بستر سامنے آجاتا ——— شاہدہ ریاض کی آغوش میں، اور میں بے کل سا ہو جاتا۔ بے قرار سا ہو جاتا۔ نیلی کو دیکھ کر مجھے اُسی شبنمی اُسی نرگسی لمس کا احساس ہوا۔

بنسی نے کہا۔ "آپ کی شادی برج سے نہیں ہو سکتی۔"

نیلی نے پوچھا ——— "کیوں۔؟"

"کیا برج سے آپ نے شادی کی بات کی تھی۔؟"

"مجھ سے نہیں، لیکن آپ کے دوست کہہ چکے ہیں۔ برج کو ان پر اعتبار ہے اور مجھے بھی۔"

"آپ نے کیسے ان پر اعتبار کیا۔"

"میں خود بھی نہیں جانتی۔"

"میں جانتا ہوں ——— ان کا چہرہ دیکھ کر۔ بڑا شریف سا لگتا ہے نا۔ دراصل یہ چہرہ بناوٹی ہے، مصنوعی ہے۔ اس کا اصلی چہرہ بڑا مکروہ ہے۔ اس آدمی پر بھروسہ مت کیجئے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔؟"

"یہ آدمی مر چکا ہے، آپ جو دیکھ رہی ہیں نا، یہ اس کی چلتی پھرتی لاش ہے اور یہ لاش بن کر عجیب عجیب سی کہانیاں گھڑ کر دوسروں کو بھی بے موت مارنا چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ برج آپ سے شادی کرنے کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہیں۔ البتہ اُس آدمی نے آپ کے قریب آنے کے لئے شادی کرنے کی ایک کہانی سوچی اور آپ کو سنائی ——— شادی کی کہانی سب کو اچھی لگتی ہے۔ جو غیر شادی شدہ ہیں وہ شادی کرنا چاہتے ہیں اور جن کی شادی ہو چکی ہے وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک پرانا اصول ہے اور آپ بھی شادی کی کہانی سن کر نادر کی باتوں میں آگئیں اور اب...... اب نیلما دیوی یہ ہر روز، ہر شام، ہر رات گئے یہاں آکر شراب پیتا ہے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ بس اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے بنسی ایک ہی سانس میں حسب معمول ایک بھرپور لیکچر دے گیا۔

"میں نے کہا۔ "بنسی پسر، یہ کافی ہاؤس نہیں ہے۔"

وہ خاموش رہا۔

"کون سا مقصد مسٹر بنسی"۔ نیلی نے حیرانگی سے پوچھا۔

"آپ کو پانے کا مقصد۔"

"یہ مجھے پا چکا ہے۔"

"کس روپ میں۔؟"

"ایک دوست کے روپ میں۔"

"دوست ——— دوست...... یہ کسی بھی دوستی میں یقین نہیں رکھتا۔ کسی رشتے پر اعتبار نہیں کرتا۔ کسی بھی عمر کا قائل نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک ہی رشتہ ہے، ایک ہی عمر ہے۔ اور ایک ہی نام ہے ——— عورت اور مرد۔ عورت اور مرد کا رشتہ۔!

دفعتاً میمی چلائی۔ اور دگھبرا کر نیلی کی گود میں بھاگ گئی۔ میں نے کہا۔

"میمی کو شاید پیاس لگی ہے۔"

"میمی کی پیاس تو پانی سے بُجھ سکتی ہے۔ لیکن تمہاری پیاس کا کیا ہو گا۔؟"۔ بنسی نے مجھ سے سوال کیا۔

"میری پیاس تمہارے خُون سے بھی نہیں بُجھ سکتی۔" میں چاہتا تھا کہ وہ خاموشی اختیار کرے۔

"کاش ایسا ہوتا تو مجھے کئی جنموں کا شگون ایک ساتھ میسر ہوتا۔" وہ حسبِ معمول باتیں کرنے اور لڑنے کے مُوڈ میں تھا۔

"میں نے نرم لہجہ اپنایا۔" اپنی بڑھائی کی باتیں مت کرو یار۔"

"میں کیا ہوں کہاں کھڑا ہوں یہ تم بہتر جانتے ہو۔ لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ تم اِس لڑکی کی زندگی تباہ کرو۔"

"جو خود تباہ ہو چکا ہو۔ وہ دوسروں کو کیا تباہ کر سکتا ہے۔"

"تو چلو، چلیں۔"

"چلو۔"

نیلی نے کہا "نادر جانے سے پہلے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو۔"

"اِس سمے مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

"ہاں دیکھا ہے۔!"

"کہاں۔؟"

"پری محل میں جب میں دارا شکوہ تھا اور تم ایک برفانی پری۔ تم نے میرے لئے ہی رقص کیا تھا۔"

"میں اپنے ماضی کو بھول جانا چاہتی ہوں۔ حال کی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"اِس زندگی میں بھی دیکھا ہو گا۔"

"بھلا کہاں۔؟"

"ہو سکتا ہے کہ تم نے مجھے کسی کھیل کے میدان میں دیکھا ہو گا۔ کسی سینما گھر میں، کسی دکان میں خریداری کرتے ہوئے! کہیں بطخوں کا شکار کرتے ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ تم نے کسی ہوائی سفر کے دَوران مجھے اپنے قریب پایا ہو——

کسی ہوٹل میں، کسی بُک شاپ میں۔ لیکن نیلم جی صحیح بات تو یہ ہے کہ تم نے مجھے پہلی بار برج کے ساتھ دیکھا اور اُسی کے کمرے میں۔"

"بنسی ہنس پڑا۔

"کیا ہوا۔؟" میں نے پُوچھا۔

"کیا نفیس کہانی بنائی ہے۔"

"کہانی۔؟" نیلی نے پُوچھا۔

بہرحال نیلما دیوی، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر وہی الفاظ دُہرا رہا ہوں۔ یہ آدمی جو آپ کے سامنے ہے نادر کی شکل وصُورت میں کھڑا باتیں کر رہا ہے، مر چکا ہے——

——ہاں مَر چکا ہے۔"

نیلی نے میری طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر آیا۔ ہاں ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"کل ضرور آنا، پر اپنے دوست کو تکلیف نہ دینا۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں اکثر اپنے من سے باتیں کرتا ہوں، کئی بار میں نے اپنے من سے پُوچھا——جب کبھی شاہدہ کو اُس کی سکھیوں نے میرے بارے میں کچھ پُوچھا ہو گا تو اُس نے کیا جواب دیا ہو گا؟"

"پُوچھا ہو گا——تیرے ساجن کیوں نہیں آئے۔؟"

"کیا جواب دیا ہو گا۔؟"

پھر سکھیوں نے کیا کیا پُوچھا

"خاموشی——!!

جس دِن کوثر کی شادی اِحسان کے ساتھ ہوئی، میں بھی موجود تھا۔ یہ شادی اِحسان کے گھر میں ہوئی، کوثر کی جانب سے شادی میں کوئی شریک نہ ہوا۔ صرف اُس کی ایک سہیلی تھی۔ گھونگریالے بالوں والی ایک لڑکی جس کی آنکھیں جیسے شعلے برسا رہی تھیں——بھی اِحسان کی طرف سے تھے پال، اِقبال، بنسی، ہینڈو، البشیر اور موہن کے علاوہ بھی کچھ یار دوست تھے۔ میں اُسی کمرے میں بیٹھا تھا، جہاں کوثر ایک بار اجنبی بن کر میرے ساتھ آئی تھی اور جہاں سے میں ایک بار اجنبی بن کر نکل رہا تھا۔ اُس کمرے کی سب چیزیں اُسی

انداز میں سجی ہوئی تھیں جیسے کہ میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ہاں ایک چیز ضرور نئی تھی۔ پہلے اخروٹ کے پلنگ پر ساٹن کا بستر بچھا تھا۔ اب اُس پر ایک نیا بستر بچھا تھا۔ بے حد کُھردرا ـــــ جانے کیوں۔؟ اور اُس نئے بستر پر کوئی شکن نہ تھی۔!

اُس رات میں نے پہلی بار خودکشی کے بارے میں سوچا تھا۔ باہر ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ رات شاید کافی جھک آئی ہے۔ ڈل کی بے کراں وسعتیں سامنے نظر آرہی ہیں۔ کتنی بڑی جھیل ہے۔ ڈل جھیل، صدیوں پرانی، اپنے سینے میں صدیوں کی کہانیاں چھپائے ـــــ میری زندگی بھی ڈل جھیل کی ان بل کھاتی لہروں سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ چند لمحوں کی قربت اور پھر جیون بھر کے لئے فراق۔؟

میں نے سوچا، اگر آج کی رات میں ڈل جھیل کی گہرائیوں میں کھو جاؤں تو ایک اور کہانی کا اضافہ ہو گا ـــــ پر میری خودکشی کی کہانی کون لکھے گا۔ میری موت پر کون آنسو بہائے گا۔ اُس آنسو کی کہانی کون لکھے گا۔ میرے اِس ادھورے افسانے کو کون مکمل کرے گا۔؟

بنسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ـــــ ایک عورت کا جسم پانے کے لئے، ایک گھر کا تصور کرنے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

"تم کس کے جسم کی باتیں کر رہے ہو۔؟"

"نیلما اور کون۔!"

"میں اُسے پا چکا ہوں۔؟"

"کس رُوپ میں۔؟"

"بقول تمہارے میرے لئے رُوپ صرف جسم ہے۔"

"پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو۔؟"

"بس ایک کہانی۔"

"اور اُس کا انجام۔؟"

"میں نے کبھی انجام کے بارے میں نہیں سوچا۔ اگر سوچا ہوتا تو آج شاہدہ میری بیوی ہوتی۔"

"تم صوفیہ کو کیوں بھول جانے کی کوشش کرتے ہو۔؟"

"صوفیہ اِن سب عورتوں سے بڑھ کر ہے ـــ صوفیہ کے لئے میرے دل میں جو احترام ہے، جو محبت ہے وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اور میں صوفیہ کو شاہدہ اور نیلما کے درمیان لانا بھی نہیں چاہتا۔"

"یہ بھی سہی لیکن ایک شاہدہ کے لئے، تم کتنی اور شاہداؤں کو تباہ کرتے رہو گے۔؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے صرف مُسکرا دیا۔ بنسی میری مُسکراہٹ دیکھ بھی نہ سکا۔ ہم دونوں دوش بدوش ڈل کا کنارا طے کرتے رہے ـــــ خاموش خاموش ـــــ صرف ہمارے قدموں کی دبی دبی سی آوازیں تھیں۔

دفعتاً ہم چونک پڑے۔

پَو پھٹ رہی تھی۔

شادی کے بعد شاہدہ کو میں نے صرف ایک رات دیکھا۔ سردی سے کپکپاتی رات کُہرے کی دبیز چادریں پھیلائے اُتر آئی تھی۔ برف کے طوفان نے کُہرے کے مٹیلے اندھیرے کو اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ باہر برف کے موٹے موٹے سپید سپید اُڑتے ہوئے گالے زمین پر گر کر منجمد تہہ میں بدل رہے تھے اور اندر نرسنگ ہوم کے ایک کمرے میں شاہدہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے شبنمی قطرے پتپتے ہوئے شفق آلود گالوں سے بہہ رہے تھے۔ شاہدہ اکیلی نہ تھی۔ ریاض بھی تھا۔ کئی اور لوگ تھے۔ اُن لوگوں میں، میں بھی تھا ـــــ بس ایک لمحہ بدلتے ہی اپنے غیر اور غیر اپنے بن جاتے ہیں۔ کبھی میں بھی اپنا تھا۔ اور اب غیر ـــــ!!

سامنے لوہے کے پلنگ پر الطاف بے ہوش پڑا تھا ـــ الطاف ..... شاہدہ کا بھائی اور میرے بیتے دنوں کا دوست! وہ ایک کار کے حادثے میں زخمی ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہوش میں تھا۔ اور اب بے ہوش۔ ساری دُنیا سے انجان اور بے خبر، اپنی زندگی سے بے خبر۔ اُس کے لئے نہ کوئی غیر تھا اور نہ کوئی اپنا۔ یہ بے ہوشی بھی کیا شے ہے۔ ہر تضاد کو مٹا دیتی ہے:

زندگی ایک المیہ ہے، ایک روگ؟!
میں رونا چاہتا ہوں۔ میرے آنسو بس چھلکنے کو ہیں۔

میرا دل اپنی ہی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔ آنکھیں دھندلائی جا رہی ہیں اور اس اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا —— اپنا سایہ تک نہیں۔

آنسو تھم چکے ہیں۔

شاہدہ کے رونے کی دبی دبی سسکیاں بند ہو گئی ہیں اور اب دبی دبی سی سسکیاں سنائی دے رہی ہیں۔

میں اپنی آنکھیں کھول رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

شاہدہ ریاض کے قریب آ گئی ہے۔

"تم گھر چلو۔ میں ابھی ٹھہر کر آؤں گی۔"

"الطاف ابھی بے ہوش ہے۔ ٹھہر کر جاؤں گا اور پھر گھر میں اکیلا کروں گا بھی کیا۔؟"

"بنٹی رو رہی ہو گی۔"

"اماں ہے گھر میں۔"

"نہیں وہ کہیں چلی گئی ہے۔ بنٹی کے دودھ پینے کا وقت ہو گیا ہے۔ دایہ سے کہہ دینا وہ پلا دے گی۔"

"اچھا میں چلا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"الطاف کے ہوش میں آتے ہی مجھے فون کرنا۔"

میرے کانوں سے ریاض کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نرسنگ ہوم کی سیڑھیوں سے اترا۔ کر گیٹ سے باہر جا رہا ہے۔

میں کمرے سے برآمدے میں آ گیا ہوں۔

برآمدے میں ڈاکٹر محمود کھڑا ہے۔

"ہیلو ڈاکٹر۔"

"ہیلو نادر۔" بڑی مدت کے بعد نظر آئے۔"

"اور وہ بھی تمہارے نرسنگ ہوم میں۔"

ڈاکٹر مسکرا رہا ہے۔ "HOW is ZULAIKH"

"میں کیا جانوں۔"

"کیوں لندن سے اس کا کوئی خط نہیں آیا۔"

میں بات ٹال دیتا ہوں —— "الطاف کی یہ حالت ڈاکٹر ....؟"

ڈاکٹر میری بات اَن سُنی کر دیتا ہے۔ "بے ہوشی کا دورہ ابھی ختم ہو جائے گا۔ اگرچہ چوٹ شدید آئی ہے۔ لیکن ڈر کی کوئی بات نہیں۔ بس چند دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں خاموش ہوں ڈاکٹر مجھ سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

"کبھی زلیخا کو خط لکھنے کا ارادہ ہو تو میرا اسلام لکھ دینا۔"

ڈاکٹر محمود اب سیڑھیوں سے اتر رہا ہے۔

میں برآمدے میں کھڑا ہوں۔

کوئی آواز نہیں —— !!!

"I ask of the, beloved night — swift be thine approaching flight, come soon — soon." (Shelly)

"آپ کیسے ہیں۔؟"

شاہدہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں خاموش ہوں۔

میں اپنے دل سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے دل سے پوچھنا چاہتا ہوں۔؟

"کیسے ہو۔؟"

پر یہ کیسے کروں؟ شاہدہ جو سامنے ہے۔ شاہدہ اور دل —— دونوں کے درمیان فاصلہ ضرور ہے۔ لیکن کوئی فرق نہیں۔

"آپ کیسی ہیں؟" میں پوچھتا ہوں۔

"ٹھیک ہوں۔"

(خاموشی)

"ان دنوں کیا کرتے ہو۔ کہاں رہتے ہو؟"

"بڑا الجھا ہوا سوال ہے۔"

"نہیں تو۔"

"آپ کے لئے نہ سہی، میرے لئے تو ہے۔"

"ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں؟"

"کہئے۔!"

"دوسروں کو خوشی دے کر ہم اپنا غم بھول جاتے ہیں۔"

"خوشی اور دکھ —— کس کی بات کر رہی ہیں آپ۔؟"

"تمہاری اور اپنی   مجھے خوشی دے کر کیا تم اپنا غم نہیں بھول سکتے۔ ؟"

"مجھے کوئی دُکھ نہیں ہے۔"

"تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں۔"

"شاید بتا رہی ہوں۔"

"یہ ویرانیاں بھی بہاروں۔ ۔ ۔ ۔"

میں بات کاٹ دیتا ہوں ــــ "آپ بہاروں کی خواہاں ہیں اور میں ویرانیوں کا۔ بہاروں کا خواہاں ویرانیوں سے کیسے نباہ کر سکتا ہے۔ چھوٹا سا فاصلہ ہے دونوں کے درمیان۔ اپنی اپنی نظر ہے اور اپنی اپنی سوچ کا فرق۔"

میں اب کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اِسی لئے آہستہ آہستہ برآمدے کو طے کر کے سیڑھیوں سے اُتر رہا ہوں اور اب نرسنگ ہوم کے گیٹ سے باہر جا رہا ہوں۔ ابھی ایسے ہی ریاض بھی کچھ دیر پہلے گیٹ سے باہر گیا تھا۔ بنٹی کو دودھ پلانے کے لئے۔ جانے بنٹی کو واقعی دودھ پلانے کا سمے آ گیا تھا یا ریاض کو نرسنگ ہوم سے بھاگنے کا بہانہ ــــ پر مجھے کیا۔ ۔ ۔ ۔ اگر بنٹی میری بیٹی ہوتی۔ اگر شاہدہ میری بیوی ہوتی۔ اور نیلما ــــ ؟!

میں شاہدہ کو کیسے کہتا کہ مرد کی پہلی محبت کا ساتھ چھوٹ تو سکتا ہے لیکن رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ؟

کوئی خودکشی کی طرف چل دیا۔

اُداسی کی محنت ٹھکانے لگی۔

دوسرے دِن کی بات ہے۔ راشد اپنی فائلوں میں کھویا ہوا تھا اور میں لداخ کے لوک گیتوں کے بارے میں ایک مضمون لکھ رہا تھا ــــ میں لکھ رہا تھا کہ ۔۔

"مقامی حالات اور گرد و پیش نے لداخیوں کے عشق کو بھی مخصوص رنگ و روپ بخشا ہے۔ معشوق کا دِل پتھر کے بجائے گلیشیر ہے۔ ملاحظہ ہو، لداخ کے ایک رومانی گیت کا بند ــــ

"تمہارا دِل ایک گلیشیر
یہ اگر ایسے ہی رہا، ادا بدلنے نہ پایا۔
میرا دل سورج اور چاند
پرانی ریت ہے کہ سورج اور چاند گلیشیر پر چمکتے ہیں۔"

فائلوں کے ڈھیر تلے راشد نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ "تمہیں ہو کیا گیا ہے آج۔ ؟"

"کیوں ــــ ؟"

"بے حد اُداس ہو۔ صبح سے کچھ بولے نہیں۔"

"تم ذرا فائلوں میں کھو گئے تھے نا۔"

"یہ تو روز کا معمول ہے۔ البتہ آج تم موڈ میں نہیں ہو۔"

"میں لکھ رہا تھا۔"

"کیا۔ ؟"

"لداخ کے لوک گیت۔"

"بھلا کچھ اِن گیتوں میں۔ ؟"

"ہاں   پتھر اور گلیشیر۔"

"بس۔ ؟"

"اور کیا ہونا چاہیئے۔ ؟"

"لداخ میں نیلم بھی ہوتے ہیں۔"

"نیلم ــــ ہوتے ہوں گے۔ ؟"

"اور تمہاری نیلما کا کیا حال ہے۔ ؟"

"پتھر اور گلیشیر کے درمیان لٹک گئی ہے۔"

دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ راشد نے ریسیور اُٹھایا ــــ بات کی۔

میں نے پوچھا۔ "کوئی خاص بات ؟"

"نہیں تو۔ کوئی منسٹر آ رہے ہیں دِلّی سے۔ اُن کی ہی بات تھی۔"

پھر راشد نے کئی فون کئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بج چکے تھے۔ میں نے اپنا مضمون ادھورا ہی چھوڑا، اور دفتر سے نکل پڑا۔ گھومتا گھومتا لا آبیلا کی جانب چل پڑا۔ پالی تنہا پی رہا تھا۔ میں اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ گلاس تھامے اُس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں حیران ہو گیا۔

"آج اِتنی جلدی۔ ؟"

"وجہ ہے۔"

"بھلا میں بھی جانوں۔ ؟"

"آج اس دھرتی پہ خُون بہا ہے۔"

میں نے کہا۔۔۔"خُون کا گیا ہے۔ کئی بار بہا ہے اور پھر تُم نے خود ہی کہا تھا۔ خُون کا کوئی جغرافیہ نہیں ہوتا۔"

"اِسی لئے تو رو رہا ہوں اور پی رہا ہوں۔ آج کچھ لوگوں نے خُون کا جغرافیہ دریافت کر لیا ہے۔ تم کیا پیو گے۔؟"

"کیا پیوں۔؟"

"بیئر یا وِہسکی۔"

"نہیں۔"

"آنسو۔"

"کِس کے۔؟"

"میرے۔"

"نہیں پی سکتا۔"

"پھر کیوں آئے یہاں۔؟"

"کہیں اور جانا چاہتا تھا، اِس طرف چلا آیا۔"

"کہاں۔؟"

"کوئی میرا اِنتظار کر رہا ہے۔"

"کوئی کسی کا اِنتظار نہیں کرتا۔"

"آج آزمانا چاہتا ہوں۔"

"پال تم کیسے کرو گے میرا اِنتظار۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا۔ کوئی کسی کا اِنتظار نہیں کرتا۔"

"میں کر لوں گا۔"

"آزماؤں آج۔"

"شاید پہلے بھی آزما چکے ہو۔"

"اب، تمہارے پاس سرکاری کوٹھی ہے۔ اور تم بڑے آدمی بن گئے۔"

"مکان بدلنے سے دل نہیں بدلتے۔"

"اور بڑا آدمی۔؟"

"بڑے مکان میں رہنے سے آدمی بڑا نہیں ہوتا۔"

"پھر بھی۔؟"

"WILL YOU shutup man"

میں خاموش ہو گیا۔ یہ پال بھی عجیب آدمی ہے۔

کسی زمانے میں ہم دونوں ایک ہی محلّے کی نیم تاریک گلی میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ کیسے دِن تھے وہ۔ کیسی زندگی تھی وہ۔ ایک روز سویرے پال وہ گلی چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک خُوبصورت سی دو منزلہ سرکاری کوٹھی میں جا بسا۔ اُس دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا اور میں اُس کا سامان، اُس کی کتابیں، اُس کے کپڑے صندوقوں میں رکھواتا گیا۔ اُسے یہ محلّہ یہ گلی چھوڑ کر دُکھ ہو رہا تھا۔ اُس کی بیوی خوش تھی کہ اب گندے اور کیچڑ سے بھرپور محلّے سے چھُٹکارا مل گیا۔ اُس کی بچیاں اُداس تھیں کہ وہ اپنی سکھیوں سے دور ہو رہی ہیں۔

پال اندر ہی اندر خُون کے آنسو رو رہا تھا۔ اُس گلی نے بچپن سے لے کر جوانی کی آخری حدوں تک اُس کی دیکھ بھال کی تھی۔ اور اب ــــ اب بھی کبھی کبھی رات کے کسی آن دیکھے لمحے میں، اُس کے قدموں کی آہٹ گلی کے اندھیاروں کو چیر کر میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ میں کھڑکی کھول دیتا ہوں۔ کوئی آواز نہیں۔ کل کا ابدی اندھیرا ــــ میں اور میرے من کا اندھیرا۔۔۔!!

یہ میرا محلّہ ہے۔

اور یہ میرا شہر ہے، شہر سرینگر۔ جہلم کے کناروں پر بسا ہوا جسے مغل بادشاہوں کے سپنوں ایسے ہاتھوں نے سجایا ہے۔ ہری بھری شاداب دھرتی۔ بھانت بھانت کے لوگوں کا شہر۔ شہر کے اِرد گرد پھیلے ہوئے پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں۔ وہ پہاڑ جو آگے ہی آگے پھیل کر ایسی شکل و صورت میں بدل جاتے ہیں۔ جن پر بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔

اُس نے کہا تھا۔

"مجھے صرف کشمیر میں روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔"

ایک چھوٹا سا کنبہ ہوتا ہے۔ مُنفرد کنبہ یا مشترکہ خاندان۔ اِس سے بھی بڑا ایک اور کنبہ ہوتا ہے۔ جسے قوم کہتے ہیں۔ قوم سے بھی بڑا ایک خاندان ہوتا ہے جو مُلک کہلاتا ہے۔ اپنے چھوٹے سے کنبہ سے ہمارا بڑا قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ اِسی لئے ہمارا اُس کے ساتھ لگاؤ رکھنا

ایک قدرتی امر ہے۔ یہی لگاؤ اپنے وسیع معنی میں قومیت ہے۔ اور وسیع ترین معنی میں بین الاقوامی اخوت کا مظہر ہے۔ لیکن جب ہم اس تعریف کے عملی پہلو پر غور کرتے ہیں تو قوم کی یہ تشریح نامکمل ہوتی ہے۔ اصلی تعریف تو یہ ہے کہ ایک ملک میں آباد ایک عوامی معاشرہ خواہ وہ کئی جغرافیائی حدود میں منقسم کیوں نہ ہو، اس کے افراد کتنی ہی زبانیں کیوں نہ بولتے ہوں۔ وہ الگ الگ دھرموں سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں ——— قوم ہے اور قومیت وہ جذبہ ہے جو عوام کو ملک کے تئیں وفادار بننے اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ برادرانہ طور پر رہنے کی تحریک بخشتا ہے۔

قومیت کا یہ جذبہ بنی نوع انسان کے لئے بے حد ضروری ہے!!

اور آج وہ روشنی بجھ چکی ہے!

مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں کبھی مسلمان تھا۔ اور نہ ہی ہندو۔ تب بھی مجھے ان ناموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پر آج میں سوچ رہا ہوں ——— کیا اب میں پال کو اس گلی میں کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ اگر اسے اپنی کوٹھی میں جاتے ہوئے قتل کیا گیا تو میں خون کا رنگ کہاں تلاش کروں گا۔؟ کہاں پا سکوں گا اسے... کہاں؟

اور اگر اس نیم تاریک گلی میں مجھے قتل کیا گیا؟؟

اور اس روز میں بے حد پچھتایا جب میں نے سنا کہ خدا مر گیا ——— خدا کی موت..... ایک عظیم سانحہ، ایک عظیم صدمہ ——— پر کوئی ہنگامہ نہ ہوا، کوئی خون نہ بہا اور میری موت پر یہ کیسا ہنگامہ، میری موت کوئی سانحہ نہیں، کوئی صدمہ نہیں ——— خدا عظیم ہے اور میں..... ؟! شاید ایک سوالیہ نشان؟

بات چھوٹی سی تھی، پر اتنا بڑا ہنگامہ ہوا۔ لڑکی ہندو، اور لڑکا مسلمان۔ شادی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ دیو پیکر ہیولا، وہ کالا دیو اب بھی محبت کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کالے دیو نے یوں تو محبت کی راہ میں ہمیشہ نوک دار کانٹے بچھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اب کی بار اس نے جو روپ اپنا لیا ہے وہ بے حد گھناؤنا ہے۔ اب کی بار یہ کالا دیو دین دھرم کا لباس پہنے اپنے تیز نوکیلے دانت باہر نکالے ہنس رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے۔ کیوں کہ اسے ایک ہندو لڑکی اور مسلمان لڑکے کا ملن پسند نہیں۔ مسلمان لڑکی اور ہندو لڑکے کا ملن پسند نہیں ——— اور بس اتنی سی بات پر اتنا بڑا ہنگامہ!!

محبت کی شمعیں جلتی ہیں اور جل کر ہی روشنی بکھیرتی ہیں۔

محبت، زندگی کی تفسیر ہے۔ پیار، زندگی کا سرمایہ ہے، اور وہ کالا دیو، بس ایک بلبلے کا تودہ ؟!!

ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ ہم میں سے کوئی لڑنا نہیں چاہتا۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، اپنے لئے، اپنے بچوں کے لئے، اپنی خوبصورت دھرتی کے لئے، ہم فرقہ وارانہ میل ملاپ میں یقین رکھتے ہیں۔ ہم گولیوں سے، خون خرابہ سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم صرف پیار و محبت کو اپنانا چاہتے ہیں ——— ہم کہتے ہیں جنگ، لڑائی اور نفرت، ایک دوسرے سے دور رکھنے کی پہلی سیڑھی ہے۔ ہم اس سیڑھی کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ امن کی فتح چاہتے ہیں۔ انسانیت کی فتح چاہتے ہیں۔ ہاں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ لاتعداد ہیں اور اس سلسلے میں ساری دنیا کے عوام ہمارے ساتھ ہیں۔

——— اور یہاں ایک سہانی صبح کو جب سُرخ و سپید درختوں کی ڈالیوں پر شگوفے نکل آئیں گے تو ایک نئی بہار کا آغاز ہوگا۔ فصلیں کاٹی جائیں گی، زعفران کے پھول مسکرا اٹھیں گے ——— اور پھر کوئی خون کا جغرافیہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریگا۔

اہلیا آیرن برگ!

ان کی باتیں ان کے خیالات!!

آیرن برگ مر گئے ——— کیا موت کے ساتھ ہی انسان کی سوچیں بھی مر جاتی ہیں۔ انسان کے خیالات بھی مر جاتے ہیں۔

رات کا جانے کون سا عالم ہے۔ میری نیند اڑ گئی ہے۔

رات سونے کے لئے جاگتی ہے۔ سپنے ٹوٹنے کے لئے جاگتے ہیں اور نیلما ابھی ابھی روتے روتے سو گئی ہے۔

آؤ سو جائیں!

سونے کے لئے ایک بستر کی ضرورت ہے۔ اگر نیند آ بھی گئی اور میں سونا بھی چاہوں ——— تو سوؤں گا کہاں۔؟ میرے پاس جو بستر ہے وہ کھُردرا ہے اور ایک رنگ کا بھی نہیں، میرا بستر تو ایک ABSRACT پینٹنگ ہے۔ جو بنانے والا سمجھا ہے اور نہ ہی دیکھنے والا۔ میں خود اس لئے کو اب تک نہ پا سکا۔ اگر سمجھ گیا ہوتا تو شاید میرے پاس بھی ایک ہی رنگ کا گدّا

نرم اور ریشمی بستر ہوتا ——— اور آج شاہدہ میری بیوی ہوتی !!
کل تک میں خود نہ جانتا تھا کہ کتنے چہرے بنائے اور بگاڑے،
اپنے بس کی بات تھی نا اور اب اپنے بس سے باہر ——— بس
سے باہر ہو کر کوئی بات اپنی نہیں رہتی۔ !!

اور میں لابیلا سے باہر چلا آیا۔ باہر آتے ہی ایک ٹیکسی مل
گئی اور میں اوبرائے پیلس جا پہنچا۔ میں نے حسبِ عادت دروازہ
کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی ——— خلافِ معمول !!
میں نے پھر کھٹکھٹایا۔ اب کی بار ذرا زور زور سے۔ دروازہ
کھلا ہی تھا۔ ذرا سے دباؤ سے خود ہی کھل گیا۔ اندر کمرے میں کوئی نہ
تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے ایک سایہ سا کھڑا تھا ———
سایہ قریب آ گیا۔

"تم آ گئے" نیلما تھی۔

"ہاں۔ !"

"تم بیٹھو۔ میں ذرا ٹھہر کر آؤں گی۔"

"کہاں جا رہی ہو۔ ؟"

"دہلی سے میرے ایک دوست آئے ہیں، بہت ہی پرانے۔"

"یہ تم نئی پرانی دوستی کا کب سے خیال کرنے لگی ہو۔ ؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو۔ ؟"

"کون ہیں یہ تمہارے پرانے دوست۔ ؟"

"نام نہیں بتاؤں گی۔ ؟۔ ایک منسٹر ہیں۔

"نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں۔"

"کیا جانتے ہو۔ ؟"

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔"

"یہ غالب کا شعر ہے۔"

"ہوگا۔ ؟"

"کیا مطلب۔ ؟"

"میں جا رہا ہوں۔ !"

"تم بیٹھو نا۔ میں بس ابھی آ رہی ہوں۔"

"میں نے کہا۔" پھر کبھی آؤں گا۔"

"I want to disturb you"

"کب آ رہے ہو۔ ؟"

"مجھے فیض کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ سنو گی۔ ؟"

"سناؤ۔ !"

"وہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے۔"

"میں نے فیض احمد فیض کا شعر اپنی بھونڈی آواز میں گنگنایا۔

"کل آؤ گے۔ ؟"

"کل ——؟۔ ہاں کس وقت ——؟۔ میرا مطلب
ہے کل کون سا وقت تم میرے لئے ——؟"

اُس نے جان بوجھ کر بات کاٹ لی ——— ٹھیک اسی وقت۔!
میں چلا آیا۔ میں لابیلا نہ جا سکا۔ جا سکتا تھا۔ خود ہی حقیقت
سے دنیا سے آشنا ہونے کی قوت کھونے کی کوشش کی۔ میں جانتا
تھا کہ پال نے میرا انتظار کیا ہوگا۔ ؟۔ اب بھی کر رہا ہوگا۔ میں وہاں
جا کر یہ ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا کہ زندگی میں میرا کوئی انتظار نہیں کرتا۔"

انتظار ——— سسکتی روتی خزاؤں کی شام .... انتظار ؟!

اے لوگو ! ——— اٹھو اور مجھے سرِ راہ سنگسار کرو۔ میں نے
محبت کی ہے، ایک کالی کلوٹی لڑکی سے محبت کی ہے ——— شاہدہ !!
جس کے بے داغ جسم پر چاند کے دھبے ہیں۔

"کوئی دھوئے گا یہ داغ ؟ ——— کوئی نہیں .... ہاں اب
کوئی میرا انتظار نہیں کر سکتا۔ اور صوفیہ .... بس سوالیہ نشان اُبھر آتا ہے !
کشمیر کی گود میں کتنے جنگل آباد ہیں۔ کتنے پہاڑ کھڑے ہیں۔
کتنے ندی نالے ہیں، سدا بہار جوان۔ ان کی روانی اور آواز میں ایک
عجیب سی سرشاری ہے۔ سرمستی ہے۔ یہاں کتنے لوگ بستے ہیں۔
بھانت بھانت کے لوگ .... ہندو، سکھ، عیسائی، مسلمان
——— یہاں مندر ہیں۔ مسجدیں ہیں۔ گورودوارے ہیں اور یہاں
اس کشمیر میں مقدس چیزوں کی چوری ہو جاتی ہے۔ گرجوں کو جلایا
جاتا ہے اور ... !!

دوسری صبح ——— !

میں جب جاگا۔ میں نے سوچا، مجھے رات کی باتیں بھول
جانا چاہئیں۔ میں نے دفتر میں اپنا مضمون "لداخ کے لوک
گیت" مکمل کیا اور اب آخری پڑھ رہا تھا کہ نیلی کا
فون آیا۔

"میں کل کے لئے بے حد شرمندہ ہوں۔"

میں نے سوچا۔ شرمندگی کیوں۔ کس لئے؟۔ میرے سوچوں کی دھار رُک گئی۔ ایک آدمی اچھی موت نہیں مر سکتا جبکہ خطرناک تفاوت کا مقابلہ ہو۔ یوں تو بقول بنسی میں مر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اچھی موت پانے کے لئے میں نے خطرناک تفاوت کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اور اُسی شام نیلی سے ملنے گیا ——— کوئی منسٹر نہ تھا۔ اور نہ ہی کوئی پرچھائیں۔ ایک نیلی تھی کمرے میں اور اُس کی بے زبان ممی۔

——— "سامنے گلدان میں رنگ رنگ کے پھول تھے!"

دل کی چنگاریاں اِن لطیف رنگ رنگ کے پھولوں کی طرح فروزاں ہو رہی تھیں جو بس ایک لمحے کے لئے کھلتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔

جانے یہ کس رات کا ذکر ہے۔ کون سی رات شروع ہو رہی تھی اور کون سی ختم ..... شاید چوتھی پانچویں یا دسویں .....

کبھی کبھی ایک لمحہ بھی رات بن جاتی ہے۔ اور کبھی ایک رات صدی۔ میں بھی کئی لمحے، کئی راتیں اور کئی صدیاں بتا کر نیلی سے ملنے آیا تھا۔ سوچتے سوچتے ذہنی طور پر ایک صدی اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

ایک صدی پہلے شاہدہ آئی تھی میری زندگی میں۔ اُس کی مُسکراہٹ میں میری مُسکراہٹ پوشیدہ تھی۔ میں جب پہلی بار شاہدہ سے مِلا تو اُس کے سراپا نے مجھے کچھ کر گزرنے کی تحریک بخشی..... میری تنہا تنہا سی زندگی کے لئے یہ احسان بڑا حوصلہ افزا تھا ——— اور اُس کے بعد ایک۔ اپنی اپنی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تمہارے سامنے ہوں۔ اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھو۔ تم مجھے بالکل اپنے قریب پاؤ گے۔ میں جب تنہا ہوتی ہوں تو لگتا ہے جیسے تم دبے پاؤں میرے دِل کی عمیق گہرائیوں میں قدم رکھ چکے ہو ——— ایک میٹھا سا پُر کیف گیت بن کر۔"

لیکن ہر لڑکی کی طرح شاہدہ کی پسند، پیار اور فیصلے میں بڑا فاصلہ تھا۔ ایک ایسا فاصلہ جسے میں ناپ نہ سکا۔ جسے میرے قدم طے نہ کر سکے۔!

اور دیکھتے دیکھتے موت کی سی ویرانی چھا گئی۔ ہر سمت دھول اُڑنے لگی، جہاں میرے دِل کا خوشنما بنگلہ شاہدہ کی ملگجی دھوپ کی چھاؤں میں کھڑا میری رُوح کی تسکین کا باعث تھا۔ وہ جھلسی ہوئی اینٹوں اور پتھروں کے ایک عظیم انبار میں بدل گیا۔ میری بے نور سی بجھی بجھی آنکھیں مٹی اور راکھ کے تلے جیسے کچھ تلاش کرنے کی کوششیں کرنے لگیں۔ میرے تھکے تھکے سے قدم رُک گئے۔

سامنے گلدان میں رنگ رنگ کے پھول تھے!"

میں پھولوں کا ذکر چھیڑتا ہوں ——— حسین چیزیں مجھے پسند ہیں۔ بالکل اپنی نیند کی طرح جو مجھے کبھی نہیں ملی۔"

"نیند کا پیاسا؟"

"مجھے نیند میں موت ملتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ موت سے میں پیار کرتا ہوں وہ روز مجھ سے ملنے آتی ہے۔"

"بات پھولوں کی تھی۔"

"ہاں بڑے معصوم پھول ہیں اگر تم بھی اِن میں سے ایک پھول ہوتیں تو جانتی ہو میں کیا کرتا۔؟"

"مجھے پھولوں سے نفرت ہے پھر بھی اِن سے پیار کرتی ہوں۔"

"تمہیں پھول میں عورت کا عکس دِکھائی دیتا ہے۔"

"شاید ٹھیک ہو۔ لیکن عجیب سی بات ہوئی کل۔!"

"کیا کوئی عجیب سا اِنسان مِلا جیسے میں..... جیسے۔"

"نہیں کل میں نے جو شراب پی اُس میں پھولوں کی خوشبو تھی ——— کشمیر کے پھولوں کی خوشبو۔ کتنی اچھی ہے یہ خوشبو، پیار میں ڈوبی ہوئی درد بھری دھڑکن نہیں ہوتی جیسے۔"

"اگر تم نے شاعروں سے پیار کیا ہوتا۔"

"میں شاعری سے پیار کرتی ہوں اور اپنا دہ منسٹر ——— یہ پھول وہی لایا تھا۔ مجھے اُس سے ویسی ہی نفرت ہے جیسے کہ پھولوں سے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں صرف کانٹا ہوں!"

وہ ہنس رہی ہے!

"میں نے کہا ——— "نیلی میں جب بھی آیا خالی ہاتھ آیا۔ اور جب بھی چلا کچھ لے کر چلا۔"

وہ پھر ہنس رہی ہے۔

حسین لمحے کتنی جلدی گزر جاتے ہیں اور پھر زندگی تو

صرف ناخنوں تک ہے۔ ناخنوں تک خون کی گردش ہے، اور اُس کے بعد ایک خلاء ——— ؟!

"تم نے زعفران کے پھولوں کے کھیت دیکھے ہیں ؟"

"ہاں۔ !"

"زعفران کے پھول بھی دیکھے ہوں گے ؟"

"ہاں۔ !"

"کب۔ ؟"

"بڑی دیر ہوئی جب میں حبّہ خاتون بنی تھی۔"

"کیسے۔ ؟"

"بس بنی تھی۔"

"تم پھر یوسف شاہ چک کو بھی جانتی ہوگی۔ ؟"

"میری زندگی کا ہر انسان یوسف شاہ چک ہے۔"

"آؤ ماضی میں جھانک کر دیکھیں۔"

"کیوں ؟"

"ہو سکتا ہے کہ آج کی رات ایک بیتا ہوا یگ بنجائے۔"

نیلی نے اُٹھ کر الماری سے بوتل نکالی۔ گلاس لے آئی۔ کال بل کا بٹن دبایا۔ ویٹر آیا۔ اُس نے کچھ آہستہ سے کہا۔ ویٹر چلا گیا۔ اُس نے گلاسوں میں شراب اُنڈیل دی۔ ویٹر دوبارہ آیا۔ اُس کے ہاتھوں میں برف سے بھری پلیٹ تھی۔ نیلی نے گلاسوں میں برف ڈالی۔ ویٹر چلا گیا۔

میری جانب گلاس بڑھاتے ہوئے نیلی نے کہا۔ "چیرس۔"

میں نے سِپ کیا۔ اُس نے ایک ہی گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کرنا چاہا۔ پر ایسا نہ کرسکی۔ وہ شاید دن میں بھی پی چکی تھی۔

دن میں اقبال نے اُسے نگین جھیل کے ٹھنڈے پانیوں میں جن کی بوتل تھامے لہروں سے کھیلتے دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ زریندر تھا۔ پتھروں کے شہر کا باسی جو بقول اُس کے نیلما سے عشق کرتا ہے۔ مجنوں اور فرہاد کا سا عشق۔ کبھی فرہاد دودھ کی نہریں کھودتا تھا۔ اب فرہاد نگین جھیل میں اپنی شیریں کے ساتھ نہاتا ہے۔ اُس کے عُریاں جسم کو اپنی جنس زدہ نظروں سے دیکھتا ہے اور دودھ کی بجائے جن کی ایک پوری بوتل پی جاتا ہے۔

"میں نے ہاتھ بڑھا کر ہیمی کو اپنے پاس کھینچ لیا۔ آہستہ آہستہ پیار سے اُس کا منہ کھولا۔ چھوٹے چھوٹے بیحد نازک دانت، بے حد نازک زبان . . . . میں نے ایک ہی بار شراب سے بھرا ہوا گلاس اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ تھوڑی سی شراب فرش پر گر گئی۔ اُس نے اپنی پوری قوت سے چیخنا چاہا لیکن میں نے اُسے ایرانی قالین پر پھینک دیا۔

"یہ تم نے کیا کیا۔ ؟"

"میں نے ہیمی کو شراب پلائی۔"

"کیوں۔ ؟"

"اِس لئے کہ میں آج پینا نہیں چاہتا۔ آج کی رات میں اپنے حصّے کی ساری شراب ہیمی کو پلانا چاہتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اتنی پی لو کہ تم بہک جاؤ۔ جیسے . . . . "

"خاموش کیوں ہوگئے ؟"

"جیسے یوسف شاہ چک بہکا کرتا تھا۔"

"پر میں یوسف شاہ چک نہیں۔"

"آج کی رات میں چاہتا ہوں کہ تم یوسف چک بنجاؤ۔"

"پھر کیا ہوگا۔ ؟"

"میں کسی کھیت میں جاکر حبّہ خاتون کا کوئی گیت گنگناؤں گا۔"

"کون سا گیت ؟"

"زعفران کے پھولوں کا کھیت . . . . مجھے ایک گیت یاد آرہا ہے۔ اُس کا مفہوم یُوں ہے۔ تم بھی سُنو ——

میرے محبوب ! میں چاہتی ہوں کہ آج کی یہ رات کبھی ختم نہ ہو۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوں۔ ہم پر زعفران کے پھولوں کی بارش ہو اور ہم پھولوں کے ڈھیر تلے دفن ہوجائیں۔

——— میرے محبوب میں چاہتی ہوں کہ آج کی یہ رات کبھی ختم نہ ہو۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوں اور ہم پر اتنی برف گرے کہ برف کے ڈھیر تلے دفن ہوجائیں !"

"کتنا پیارا گیت ہے۔"

(خاموشی)

"پھر۔ !"

"پھر تم میری آواز سُن کر اپنی ساری کائنات میرے

قدموں میں ڈالوگی۔!"

"میرے پاس کیا ہے۔"؟

"تین چیزیں ہیں!"

"کیا۔؟۔ ذرا میں بھی جانوں؟"

"ایک تمہارا جسم۔!"

"یہ جسم تو پاچکے ہو۔"

"دوسری تمہاری قربت۔!"

"تمہارے پاس ہے۔"

"تیسری تمہاری ہاتھوں کی بنائی ہوئی شراب!"

"تم زندگی بھر میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی شراب پی سکتے ہو؟"

"بس مجھے زندگی بھر اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

"تمہاری باتوں میں کتنا تضاد ہے۔"

"شاید میرے دوست بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔"

"آج مجھے یقین ہوگیا ہے۔"

"کیسے؟"

"میرے پاس ایک اور شے ہے، بڑی خوبصورت، جاندار۔"

"بھلا کیا؟"

"تم بخوبی جانتے ہو۔ مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔"

"کیسے۔؟"

"اس نے تمہاری مٹی سے جنم لیا ہے۔ اس کی رگوں میں تمہارے کشمیر کا خون ہے۔ اس کا خمیر تمہاری مٹی سے بنا ہے۔"

"کس کی باتیں کرتی ہو؟"

"میں برج کی بات کر رہی ہوں۔"

"برج۔!"

"برج۔!!"

صوفیہ ــــ چھوڑ دو میرا ہاتھ۔ مجھے کیوں پکڑ رہی ہو۔ تم سمجھتی ہو، میں نے شراب پی لی ہے۔ نہیں نہیں صوفیہ۔ میں بھلا شراب پی سکتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی نہیں۔ پر تم میرا انتظار کیوں کرتی ہو۔؟ سو کیوں نہیں جاتیں اور ابھی تک تم نے کھانا بھی کہاں کھایا ہوگا۔؟ ــــ جا کھانا کھالے۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ بالکل ہی بھوک نہیں ہے۔

"ممی کو چڑھ گئی ہے۔ وہ ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک بے مقصد دوڑ رہی ہے۔ شاید اسے بھی کسی چیز کی تلاش ہے۔ ہاں تلاش ہے۔ وہ کچھ چاہتی ہے۔

"میں آج ممی کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"کیوں۔؟"

"ہوش میں نہیں ہے!"

"تو پھر کیا ہوا۔؟"

"اُسے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔"

"تم کہاں ڈھونڈتے پھروگے اس کے لئے ساتھی۔؟"

"کیوں۔؟"

"تم میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔"

وہ بے چاری بے زبان ہے اور میں بے زبانوں کی زبان سمجھ لیتا ہوں۔!"

"ہے تمہارے پاس اُس کے لئے کوئی ساتھی؟"

"ہے تو نہیں، پر دیکھ لوں گا۔؟"

"کہاں ــــ؟"

"کسی ویران گلی میں کوئی بلا ضرور تمہاری بلی کے لئے بے قرار ہوگا۔؟"

"میں ممی کو اوباش نہیں دیکھنا چاہتی ہوں؟"

دفعتاً فون بج اُٹھا۔ نیلی نے ریسور اُٹھایا ــــ "ہیلو۔" پھر نیلی نے میری طرف دیکھا ــــ "تمہارا فون۔"

"میرا" ــــ میں نے ریسیور تھام لیا۔ میرا ہاتھ کانپنے لگا۔

"کون۔؟"

"اشفاق۔!"

"کیا بات ہے۔؟"

"بات کرو۔!"

"کس سے۔" میں نے کہا۔ اشفاق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک زنانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں یہ آواز پہچان گیا۔ یہ مسز اشفاق تھیں۔"

"آپ کیا کر رہے ہیں وہاں۔"

"میں ــــ میرے ایک دوست دہلی سے آئے ہیں۔

بس اُس کے پاس بیٹھا ہوں۔"

"وقت کیا ہوا۔؟"

"میری گھڑی میں گیارہ بجے ہیں۔"

"جی نہیں رات کے تین بجے ہیں۔ اشفاق آپ کو لینے آرہے ہیں۔"

"میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہے۔"

"تو آکر کھا لینا۔"

"وہ بھی بھوکی ہے۔!"

"وہ کون۔؟"

"میمی۔!"

"کون میمی۔؟"

"میری جنگلی بلّی۔!"

"بلّی کو تین بجے رات تک بھوکا نہیں رکھا جاتا۔ بہر حال اشفاق آپ کو لینے آرہے ہیں۔ بلّی کو اب آرام کرنے دیجئے۔"

فون بند ہوا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر میری ساری باتیں در و دیوار سے ٹکرا کر رہ گئیں اور میرے ماضی کے جھروکوں سے ایک صُورت بن کر ابھر آئیں۔

"صُوفیہ۔!"

"صوفیہ ـــــ کہاں ہو تم۔؟ ـــــ کہاں ہو تم۔؟"

تب تک صُوفیہ نہیں آئی تھی میری زندگی میں۔ میں نے اُسے دیکھا بھی نہ تھا اور میں اُس برگد کے پیڑ کی تلاش میں تھا جس کی جڑوں کو اپنائے گوتم بدھ کو نروان ملا تھا۔ بدھ کا خلسفہ، اُس کی حیات کی کہانی اور اُس کے اُصول آہستہ آہستہ میرے ذہن سے اُتر گئے۔ اور میں نے ٹوٹے پھوٹے گھر کے آنگن میں انجیر کے ایک درخت کے سائے میں ایک لڑکی کو دیکھا ـــــ یہی صُوفیہ تھی۔!

اور میری گونگی محبت کا آغاز ہوا۔ میں نے اپنے بارے میں سوچا۔ اکیلے میں ہر کسی کو اپنے بارے میں، کسی کے بارے میں سوچنے کا حق ہے اور پھر یہ سوچیں مجھے جنم سے ملی ہیں۔ اب تک اُن ہی کے سہارے اپنی زندگی سے نباہ کئے جا رہا ہوں۔"

"تم بڑے جذباتی ہو۔"

"اپنا پن کسی میں نظر نہیں آتا۔ اِس لئے اپنے من کی بات کس سے کروں۔"

"تمہارے من میں کیا ہے۔؟"

"بس ایک گھر کا احساس ـــــ گھر کا اِنتظار۔؟"

"بہت بڑی بات ہے۔"

"اِس لئے کہ میرے کمرے کا دروازہ دن رات کُھلا رہتا ہے۔ ایک کمرہ ہے۔ اُس میں ایک ریڈیو ہے جس کو آج تک کسی نے نہیں چھُوا۔ کوئی چھُوتا تو شاید ایک دلربا نغمہ کمرے کی چاردیواری میں پھیل جاتا۔ ایک خوبصورت سا بستر ہے جس پر میں آج تک نہیں سویا۔ ایک صُوفہ ہے جس پر میں آج تک نہیں بیٹھا۔ اُس کمرے میں ہر قسم کا سامان ہے جیسے کہ ایک گھر میں ہونا چاہئے۔ لیکن میں نے ابھی تک اِستعمال نہیں کیا۔ ـــــ بس ایک اِحساس اور انتظار کی بات ہے۔"

صوفیہ نے ایک لمحے کے لئے میری طرف اپنی بھرپور نظروں سے دیکھا اور کہا ـــــ "کیوں۔؟"

"میں چاہتا ہوں کہ میرے کمرے کا دروازہ کسی دوسرے کے لمس سے بند ہو۔ میرا ریڈیو کسی دوسرے کی انگلیوں سے جھنجھنا اُٹھے۔ میرے بستر پر کسی دوسرے کی دھڑکنیں سو لیں۔ میرے صُوفے پر کسی دوسرے کی سانسیں اپنی یادوں کو سمیٹ لیں اور میرے کمرے کا سامان کسی دوسرے کے ہاتھوں سے بج اُٹھے۔ کتنی چھوٹی سی حسرت ہے۔ کتنی درد بھری تمنّا ہے۔"

بات اَدھوری رہ گئی۔ صُوفیہ بن کہے چلی گئی۔ میں دیر تک اُس کے قدموں کے نِشانوں کو دیکھتا رہا۔ اُن میں اپنے ماضی کے نشانوں کو تلاش کرتا رہا اور اپنے مستقبل کے خدوخال ڈھونڈتا رہا۔

اشفاق آگئے۔!

اُس نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا ـــــ لیجئے میں خود ہی اپنا تعارف کرالوں۔ میں اشفاق ہوں۔ ابھی ابھی فون سے باتیں کر چکا ہوں میں نادر کو لینے آیا ہوں۔!"

"بے جائیے۔"

میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ نیلی نے اشفاق سے کہا "آپ کے لئے ایک پیگ بناؤں۔"؟

" I DONT MIND "

"کتنی بری ہے یہ شراب۔ اور کس قدر اچھی۔ اگر میں ایم اے کا طالب علم ہوتا تو میں شراب کی اچھائیوں پر اس قدر خوب صورت تھیسس لکھتا کہ مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔"

"نیلی نے اشفاق سے کہا۔ "اپنے نادر سے کہئے کبھی ایسے ہی مجھے لینے کے لئے آجایئے۔"

"تم اب بھی چل سکتی ہو۔"

"تم تو اکیلے ہو۔"

اشفاق ہے میرے ساتھ۔"

"ان کی جگہ برج کو لیتے آنا۔"

"برج۔!"

"برج۔!!"

اشفاق نے نیلی کی طرف حیران حیران نظروں سے دیکھا۔ اور پھر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بڑے خوبصورت پھول ہیں۔!"

"جی ہاں، کشمیر کے پھول ہیں نا اسی لئے۔ ہماری طرف ایسے سندر پھول نظر نہیں آتے۔"

"آپ کہاں کی باتیں کر رہی ہیں۔"

"دہلی کی۔"

"او ــــ دہلی تو میں مہینے میں چار بار جاتا ہوں۔ پھر آپ سے ملاقات ہوگی وہاں۔؟"

"جی نہیں مجھے افسوس ہے۔"

نیلی کا لہجہ سپاٹ تھا ـــــــ

"کوئی بات نہیں۔"

"میں نے موضوع کا رخ بدل دیا" ـــ اشفاق اگر یہ کمرہ تمہارا ہوتا تو کیا تم کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے؟"

"ہاں" اشفاق نے سارے کمرے میں بھرپور نظر ڈالتے ہوئے کہا۔"

"میں نے پوچھا۔ "بھلا کیا۔؟"

"اگر یہ کمرہ میرا ہوتا تو میں ان ریشمی پردوں کو فوراً ہی بدل دیتا۔ قالین اور پردے کا رنگ ایک سا ہوتا یا یہ پردے بالکل ہی سادہ ہوتے۔ یہ الماری یہاں نہیں ہوتی۔ یہ اس طرف ہوتی۔ یہ قدآدم آئینہ بھی اس جگہ نہیں نہیں ہوتا ـــــ ہاں یہ کمرہ اگر واقعی میرا ہوتا تو اس کھڑکی کے قریب میں کچی اینٹوں کی ایک چھوٹی سی دیوار بناتا، اور اس دیوار پر قسم قسم کی شراب کی بوتلیں رکھتا ـــــ یہ میرا بار ہوتا، اور میں یہاں۔۔۔۔۔"

نیلی نے بات کاٹتے ہوئے کہا ـــ اور آپ کی۔۔۔۔"

بے ہوشی کا دور جیسے ختم ہو گیا۔ اشفاق نے نیلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نیلی نے خدا حافظ کہا۔

"میں نے کہا۔ "گڈ نائٹ"

نیلی نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں کو اپنے ہونٹوں سے چھو لیا۔ ـــــ مجھے نیند سی آگئی۔

رات بڑی اندھیری ہے۔ لیکن کتنی خوبصورت، کبھی کبھی بدصورت عورتیں بھی خوبصورت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ صرف احساس کی بات ہے۔!

لیکن وہ کالا دیو ـــــ شاید ڈل کی گہرائیوں میں گم ہو گیا۔

چن ماہی سرو دا بوٹا

۔۔۔۔۔۔!!

میرا چاند جیسا محبوب تو سرو قد ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس سرو رواں کو اپنے صحن میں لگا رکھوں۔

اور ایک دن صوفیہ کے انتظار اور احساس کی باتیں ختم ہوئیں۔ اور وہ میری بیوی بن کر میری زندگی میں آگئی۔

I loved her long.
I loved her between the lines and against the clock,
I loved her long.

گل پوش، سرسبز و شاداب وادی کے ایک دل نشیں کنج سرینگر کے ایک چھوٹے سے محلے میں ایک اجلی اجلی کوٹھی ہے ـــــ صبا۔!؟"

یہ کوٹھی شہر کے ایک بڑے ٹھیکیدار ریاض احمد کی ہے

اور اس کوٹھی میں آج سے کوئی چھ سال پہلے شاہدہ دُلہن بن کر آئی۔
اس کوٹھی میں روپیوں کی افراط ہے۔ فراوانی ہے۔ شاہدہ کو اس کوٹھی میں کائنات کی ساری مسرتیں مل گئیں ـــــــ میں خوش ہوا، مگر اس کے بعد مجھے اس بھری پُری دُنیا میں کیا مِلا۔ یوں تو یہ ساری دنیا میری ہے۔ لوگ میرے ہیں۔ لیکن پھر بھی میں اکیلا ہوں۔
یہاں کوئی چیز میری نہیں۔ البتہ یہاں کے سارے غم میرے غم ہیں
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ۔ خود شاہدہ، میں، ہمارا یہ سماج، یہ اُونچ نیچ ـــــــ ہاں روپیہ سب کچھ خرید سکتا ہے۔ ایک کوٹھی، ایک گھر، ایک بستر اور اُس گھر میں بستر کو سنوارنے کے لئے ایک عورت ـــــــ محبوبہ یا بیوی کی صُورت میں ـــــــ میں شاہدہ کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ ریاض کا بھی کوئی قصور نہیں۔ ہاں میں اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں۔ میں نے بھی اگر بے ایمانی کر کے روپیہ بٹورا ہوتا آج میرے پاس بھی کوٹھی ہوتی۔ اور آج شاہدہ میری ہوتی۔ میری زندگی کا سب سے بڑا جُرم ایمانداری ہے۔ اور اس بات کا احساس پہلی بار مجھے اُس روز ہوا جب ایک بھری محفل میں شاہدہ کی شادی ریاض سے طے ہوئی، اور دوسری بار اُس روز ہوا جب نیلی نے مجھے اپنا سب کچھ سونپ کر برج سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ صرف اِس لئے کہ برج کے پاس ایک فلیٹ ہے۔ ایک کار ہے۔ فلمی دنیا کی گہما گہمی ہے، ہنگامے ہیں، رنگینی ہے۔ اور ایک بستر ہے جہاں سو کر نیلی کے جسم کی ساری تھکان دُور ہو سکتی ہے، جہاں سو کر کوئی اُس کے ماضی میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اور جہاں برج کی بجائے کوئی اور بھی سو سکتا ہے ـــــــ کوئی مشہور و معروف فلمی ہیرو، کوئی ویلن، کوئی پروڈیوسر، کوئی ہدایت کار اور کوئی کہانی کار ـــــــ میں بھی ایک کہانی کار ہوں۔ میں بھی خوبصورت کہانیاں لکھتا ہوں۔ میرے بازوؤں میں برج سے زیادہ شکتی ہے۔ میں برج سے زیادہ جوان دکھائی دیتا ہوں، صحت میں، خوبصورتی میں، قد میں ـــــــ پر وہی بستر کی بات ہے نا۔ ؟!
نیلی ۔ !!
میرے قریب آؤ۔ اور قریب ۔ میرے دِل کی دھڑکنوں میں سما جاؤ۔ میری سانسوں میں اپنے شباب کا رس گھول دو۔ میرے خوابوں کو سجاؤ۔
نیلی ۔ !!!
کوئی جواب نہیں بس خاموشی ہے، بے حد پُر اسرار خاموشی!!
زندگی کی عمارت کے صرف چور دروازے ہوتے ہیں۔
چھوٹے بڑے راستے نہیں۔ میں اپنی زندگی کی عمارت میں ایک بڑے راستے کی تلاش میں ہوں۔ لیکن ابھی تک مِلنے کی کوئی صُورت نظر نہیں آرہی ہے۔
اور بہت جلد بہار ڈوب گئی۔ پھول مُرجھا گئے۔ بید مجنوں کی ٹہنیاں کانپ گئیں۔ نرگس رونے لگی اور یاسمین کے پھول دل کے آنگن میں بجھ گئے۔
اُف، یہ کیسی چیخ و پکار ہے۔ کیسا شور و ہنگامہ ہے۔
کیسی قیامت ہے۔ آخر ایک مُسلمان کی محبت کو ایک ہندو کے دِل سے کیا واسطہ۔ آخر ایک صابر کا پین سے کیا تعلق۔
ہندو، مُسلمان، مُسلمان، ہندو۔ یہ کیسا رشتہ ہے۔ یہ کیسا بندھن ہے؟
رِشتہ اور بندھن ۔ ؟
عِشق کا مذہب ہے عِشق ـــــــ جنون، نابینائی، اندھا پن اور پیار ـــــــ پھر وہی تفرقہ بازی! یہ مذہب اور دھرم کی آڑ میں ہوئی قتل و غارت! یہ بہتی خون کی ندیاں۔
ـــــــ اُف، بند کرو یہ شور و غل، یہ ہنگامے یہ سِسکیاں یہ آہ و زاری۔ کوئی پیار بھرا گیت چھیڑو۔ مخروطی انگلیوں سے کوئی شیریں نغمہ، مدھر گیت چھیڑو۔ دِلوں کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ دِل نہ مُسلمان ہے اور نہ ہی ہندو ۔۔۔ سمجھا دو، اِن کالے دیوؤں کو۔ اِن دیو ہیکر ہیولاؤں کو ـــــــ!!
ارے جہاں تیرے ہل چل رہے ہیں میرا جی خاطبھی وہیں لے چل ۔ !
تمہاری ناک کی تیلی پر سورج کی ایک شوخ کرن آ پڑی اور وہاں سے روشنی کا ایک دھارا پھوٹا۔ اور اُس روشنی کی چکا چوند سے گھبرا کر تمام کسانوں نے اپنے چلتے ہوئے بیل روک لئے۔ ہل رُک گئے اور سبھی نظریں تمہاری طرف اُٹھ گئیں۔
اور دیکھتے دیکھتے ٹنگمرگ کے کھیت میری نظروں کے سامنے پھر گئے۔ اِن کھیتوں سے ذرا پرے سڑک کے

ایک طرف سرکاری ڈاک بنگلہ سامنے آیا۔ جہاں میں نے کوثر کو پہلی بار دیکھا ــــ کوثر پہلی کیٹیری فلم "مائنز راتھ" کی شوٹنگ میں شرکت کرنے آئی تھی۔ میں نے اُس دِن پہلی بار کوثر کو دیکھا اور اُس کا کھویا ہوا چہرہ میری نظروں کی زینت بنا۔

اگر میں ایک کتا ہوتا اور مجھے ایک سپید تن یا کالے بالوں والی کُتیا مِل جاتی، سڑک کے کسی موڑ پر، کسی گوشے میں تو شاید یہ ازل ازل کی تنہائیاں، یہ جنم جنم کی بھوک مٹ جاتی ــــ اگر میں واقعی کتا ہوتا تو سماج اور قانون کی پابندیوں سے آزاد ہوتا۔ یہ نقلی خول، یہ مصنوعی چہرہ اِسی سماج اور قانون کی دین ہیں۔ سماج اور قانون کی باریکیوں اور نزاکتوں کا جال تو صرف آدمی کے لئے ہے۔ کتّے اور کُتیا کے لئے نہیں۔ اُن کے لئے سماج اور قانون، پسند ناپسند کی کوئی زنجیر نہیں۔ بھلا اُن کو پسند اور ناپسند سے کیا واسطہ۔ جہاں خواہش ہوئی، دِل مچلا اور وہی پسند بن گئی۔ اُن کے لئے نہ کوئی ٹھیکیدار ہے اور نہ کوئی مزدور، کوئی ایمان دار ہے اور نہ کوئی بے ایمان، کوئی سڑک ہے نہ کوئی مکان ــــ ــــ مساوات کے علمبردار یہ کتّے اور یہ کتیاں ۔ ؟

شاستروں میں لکھا ہے من بھٹکنے لگے تو اپنی آنکھیں بند کرلو۔ تمہیں سکون ملے گا۔ من کا سُکھ مِل جانے سے تن کے سارے دُکھ دُھل جاتے ہیں۔

پھر تیری کہانی یاد آئی، پھر تیرا فسانہ یاد آیا۔ کون سی کہانی یاد آرہی ہے۔ کون فسانہ چھیڑ رہا ہے۔ کسی کی صُورت آنکھوں میں گھوم رہی ہے۔ کوئی ایک کہانی، ایک صُورت کی بات ہو۔ ؟

اور یہ بات نہیں کہ شاہدہ کے بعد اور نیلما سے پہلے میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ مجھے کسی لڑکی کے قریب آنے کا موقع نہ مِلا۔ اِن میں وہ عورتیں اور لڑکیاں بھی شامِل ہیں جو مجھے گندی، کچیلی گلیوں کے نیم اندھیروں میں ملیں اور وہ بھی جو اپنے آپ کو کلچرڈ کہتی ہیں۔ دونوں کی باتیں کر رہا ہوں۔

ایک زلیخا نام کی لڑکی آئی میری زندگی میں۔ وہ ڈاکٹر تھی۔ ایک شام کیپری میں حسن کے ساتھ کافی پی رہی تھی کہ میرا اُس کے ساتھ تعارف ہوا۔ دوسری بار ہسپتال میں ملی اور دوسری ہی ملاقات میں وہ میرے یا میں اُس کے قریب آیا۔ کئی دِن ایک ساتھ بیتے اور ایک دن لندن چلی گئی۔

جانے سے پہلے اُس نے مجھ سے کہا ــــ تمہارے ساتھ گُزری چند شامیں اپنا رنگ دِکھا رہی ہیں۔"

"کیا۔ ؟"

"تم سمجھدار ہو۔! اور تم ڈاکٹر ــــ"

"میرا پیشہ زندگی کو بچانا ہے، مارنا نہیں۔"

کہتے ہیں کہ جانے سے پہلے اُس نے یہ بات حسن سے بھی کہدی تھی۔ جانے ہم دو میں سے کون مُجرم تھا۔ ؟

ایک اُوما بھی آئی میری زندگی میں۔ وہ میری COLLEGUE تھی۔ شادی شدہ اور ایک بچّے کی ماں۔ جانے اُسے میری کون سی ادا بھا گئی کہ دفتر میں اپنا سارا وقت میرے ساتھ گزارنے کے بہانے تلاش کرتی۔ وہ مجھ سے اکثر کہتی ــــ "تمہاری باتوں سے مجھے ہمیشہ بُجھے بُجھے سے خیالوں کا اِحساس ہوتا ہے۔"

میں خاموش رہتا۔ شاید اِس لئے کہ، اُس کے بچّے کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی اور اُس کا پتی۔ ۔ ۔ ۔ ؟

آنیتا بمبئی کی رہنے والی تھی اور ہوٹل ہمپوش میں ٹھہری تھی۔ میں نے اُسے کشمیر بک شاپ میں کشمیری لوک گیتوں پر کتابیں تلاش کرتے دیکھا۔ پھر ایک دِن اچانک پہلگام کلب میں ملی۔ وہ امرناتھ یاترا سے لَوٹ آئی تھی۔ اُس کے چہرے پر عجیب سی شانتی تھی۔ میں نے خود ہی بات چھیڑی اور اُسے کئی گیت سُنائے۔ اُسے گیتوں سے پیار تھا۔

کہنے لگی۔ " ان لوک گیتوں میں جادو ہے اور مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں اِن لوک گیتوں میں گرفتار ہو گئی ہوں۔"

میں نے جب اُسے اُس شہزادے کی کہانی سُنائی جو اب بھی قبر کی تہہ میں ابدی نیند سو یا کچّے موتیوں کے پکنے کا اِنتظار کر رہا ہے تو وہ پاگل سی ہو گئی۔ اُس نے کوہ سلیمان کے دامن میں اُس کی قبر دیکھی اور اُس پر ایک عجیب سی کیفیت چھا گئی۔

آنیتا کو دیکھ کر مجھے شبنمی لمس کا کوئی اِحساس نہ ہوا۔ بےحد ٹھنڈی لڑکی تھی وہ !

اور یہ آواز مجھے بہت دُور لے جاتی ہے، یہاں سے کئی اور آوازوں میں گھُل مِل جاتی ہے۔ شہنائیاں بجتی ہیں۔

محرابیں بنتی ہیں اور کوثر دلہن بن جاتی ہے۔

کوثر ـــــ ایک میلی کچیلی گلی کی ایک پڑھی لکھی لڑکی۔!

جسے دیکھ کر محسوس ہوا تھا۔ جیسے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو۔ جیسے بہتے ہوئے جھرنے گنگنا رہے ہوں۔

اُس کی شادی کے بعد جب میں پہلی بار اور آخری بار کوثر سے ملا اُسی کے کمرے میں جو کبھی میرے مصرف میں تھا' اُس کمرے کی ہر شئے بدلی ہوئی تھی۔

میں نے کہا ـــــ "میری چھاتی میں آگ سلگ رہی ہے۔ نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا ہے۔ دل کا جوالا مکھی جیسے سلگ رہا ہے"

"اے میرے خدا۔"

"کیا ہوا تمہیں۔ تم کبھی ایسی نہ تھیں۔ ؟"

"دروازے پر ابھی کون تھا ـــــ کون ہے وہاں ؟"

"وہ تمہارا خدا نہ تھا۔!"

"قدموں کی آہٹ سُن رہے ہو۔ ؟"

"ہاں۔!"

"کس کی آہٹ ہے یہ۔ ؟"

"تمہارا احسان ہوگا !"

"ہائے اب میں کیا کروں۔ کہیں اُس نے دیکھ لیا تو۔ ؟"

"تمہارا احسان ہم دونوں کے ماضی سے واقف ہے۔"

ماضی چاہے کتنا ہی گھناؤنا کیوں نہ ہو' حال پر چھا جاتا ہے حال کی ساری مسرتیں' ساری خوشیاں' ساری کامیابیاں' اُس کے دھندلے سایوں میں چھپ جاتی ہیں۔ بے کیف سی لگتی ہیں۔ اور یادوں کے دریچوں سے جھانکنے والے ماضی سے چھوٹے چھوٹے بے معنی واقعات اور دُکھوں سے بھرے ہوئے حادثے بھی قوس و قزح کے رنگوں میں لپٹے ہوئے نہایت خوبصورت لگتے ہیں۔

اندو ایک عجیب سی لڑکی تھی۔ اُس کی باتوں میں کوئی تسلسل نہ تھا۔ اُس کی سوچوں کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ وہ نفسیات پر بات شروع کرتی اور وائلن کے تاروں میں اُلجھ کر رہ جاتی۔

اُس نے کہا ـــــ کل تک میرے ساتھ زندگی کا آئینہ تھا جس میں خود کو دیکھ سکتی تھی۔ اب یہ زندگی

ایک راہ بن گئی ہے۔ اس راہ کی کوئی منزل نہیں۔"

یہ منزل تلاش کرتے کرتے کئی مہینے لگ گئے اور جب میں منزل پانے میں کامیاب ہوا تو وائلن کے تار ٹوٹ چکے تھے۔

اور بھی کئی چہرے ہیں' کئی کہانیاں ہیں۔ کن کن کا ذکر کروں۔ وقت کم ہے اور یہ کہانی ..... انجام سے بے خبر کہانی مکمل کرنی ہے۔ سونے سے پہلے' نیند آنے سے پہلے' رات کے اِس اندھیرے میں .....!

نیند نہیں آتی !!

کاش رات کا میٹھا پیارا خاموش اندھیرا نہ ہوتا' صرف خنک ہواؤں کی چنچل سی سرسراہٹ ہوتی اور صرف میں ہوتا اور صوفیہ ....!

نیند نہیں آتی !

آؤ سو جائیں !!

یہ سب اُلجھے ہوئے لمحوں کے چہرے ہیں۔ اور ان چہروں پر محبت کی جو ریکھائیں ہیں' چاندنی راتوں کی سرگوشیاں ہیں۔ کچھ کھونے اور کچھ پانے کی شرمیلی ادائیں ہیں' وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔ اُن کی جگہ ایک عجیب سی کرب' ایک انوکھی سی تڑپ ہے ـــــ جیسے تھوکی دھرتی ہو' تھوکا کسان ہو' تھوکا آسمان ہو۔ کوئی بادل نہیں' کوئی بارش نہیں' کوئی بوند نہیں' کوئی آس نہیں صرف ایک ملاپ اور زندگی بھر کا انتظار ـ ؟!

نیلما کے ایک خط کی چند باتیں یاد آرہی ہیں ـــــ

I can feel your loneliness in life but you must have patience and strength in your life to live. People say life is very short but I think life is too long and you might be feeling the same. But dont forget that we are not yet surrounded in our enlightened period by a little

flower that can be casually plucked from our life path. Look at me -----

زندگی کی یہ دوڑ کبھی ختم نہ ہو گی۔ وقت کسی کا اِنتظار نہیں کرتا۔ کسی کے لئے نہیں رُکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بھاگنا پڑتا ہے۔ وقت کی یہ دَوڑ کبھی ختم نہ ہو گی۔

رات کافی بھیگ چکی ہے اور میں اب بھی لکھ رہا ہوں۔ اِس کہانی کو اپنے ہی ہاتھوں بنانا ــــــــــ سنوارنا اور دفنانا ہے ــــ کمرے کی کھڑکی بند ہے۔ باہر بے حد اندھیرا ہے۔ اور میں سونا چاہتا ہوں۔

نیند نہیں آتی۔!

چلتے چلتے ایک کُتّا رُک گیا۔ دوسرے کتّے نے تعجب سے اُس کی جانب دیکھا اور خود بھی رُک گیا گویا دوسرے کُتّے سے رُکنے کی وجہ دریافت کر رہا ہو۔ اور پھر دونوں نے اپنی گردنیں اُونچی کیں اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید اُن دونوں کو بھی اِنتظار تھا ــــ کبھی کبھی اِنتظار خود ہی نا اُمید ہو کر سو جاتا ہے۔

یہ سپنے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ اِن سپنوں میں مَیں کبھی کبھی اپنے جسم سے باہر آتا ہوتا۔ صُوفیہ۔ یہ باتیں کرتا ہوں ــــــ تم سمجھتی ہو کہ مجھے یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔ سکون ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ میری آتما میری رُوح کچھ اور بھی چاہتی ہے۔ تم تو صرف ایک بیوی تک محدود ہو کر رہ گئی ہو۔ بس چاول نہیں، لکڑیاں نہیں ہیں، بچوّں کے کپڑے نہیں ہیں۔ شادی میں شرکت کرنی ہے۔ کسی کی موت پر ماتم کرنا ہے۔ دُنیا داری کی باتیں . . . . .

پھر سپنے ٹُوٹ جاتے ہیں۔ اور میں آسمان کی وسعتوں میں دیکھنے لگتا ہوں اور انتظار نا اُمید ہو کر سو جاتا ہے۔ اور پھر جیسے میری رُوح آکاش کی وُسعتوں کو چیر کر اندھیرے اور روشنی کے سمندر کو پھاڑ کر میرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے اور مجھ میں زندگی کا اِحساس جاگ اُٹھتا ہے اور میں سوچتا ہوں نیلا ایک سراب ہے۔ چاول لکڑیاں، بچوّں کے کپڑے، شادی بیاہ، ماتم، دنیا داری۔ ــــــــ حقیقت !!

میں نیلی کے سامنے بیٹھا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک خط ہے جو آج ہی نیلی کو مِلا ہے۔ برج نے لکھا ہے۔ عام سا انداز ہے۔ عام سی بات ہے۔

"مبارک ہو۔"

"کیا۔؟"

"برج کا خط!"

"میں چاہتی ہوں کہ جواب تمہارا ہو۔"

"کیوں۔؟"

"ویسے ہی چاہتی ہوں۔"

نیلی نے پیڈ اور قلم میرے سامنے رکھا ہے۔ کیا لکھوں، اور کیا نہ لکھوں ــــــ قلم ہاتھ میں تھام لیا ہے اور سیاہی چکنے کاغذ پر پھیل رہی ہے۔

"میں زندگی میں بہت کچھ جیت کر بھی ایک ہارا ہوا اِنسان ہوں۔ اور میں نے گندی گلیوں میں گھومنے کے بعد ایک شبنمی لمس حاصِل کرنے کی صرف تمنّا کی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری اِس تمنّا کا نام ہار ہے۔ پھر بھی میں نے ایک کہانی سوچی تھی اور اُس کہانی کو حقیقت کا رُوپ دینا چاہا تھا۔ پر مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کچھ بھی نہ پا سکوں گا۔ میرے قدموں کو کبھی نصیب نہ ہوا کہ وہ بھی چلتے چلتے کسی پیار کی چھاؤں میں ذرا بھر کے لئے رُک جائیں اور سفر اور اُس سفر کی تنہائیاں . . . . . شاید بہک گیا ہوں میں۔ لیکن سب کچھ پہچان رہا ہوں۔ تم نے نیلی سے بڑے پیارے انداز میں گھر کی باتیں کی ہیں۔ لیکن اِس خط کے بعد نیلی کے کالے دیوؤں کی باتیں کروں گا۔ اور شاید تم نہیں جانتے کہ تمہاری نیلم پری کا ایک کالا دیو میں بھی ہوں . . . . ."

اب مجھ سے اور نہیں لکھا جاتا۔ میں نے خط نیلی کی طرف بڑھایا ہے۔ وہ بغور اُسے دیکھ رہی ہے۔ پڑھ رہی ہے۔ اُس کے چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں ایسا لکھوں۔ اُس نے کاغذ کا یہ پُرزہ، یہ اَدھورا سا خط آہستہ سے اپنے بیگ میں ڈال دیا ہے شاید کبھی نہ پوسٹ کرنے کے لئے۔

میں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا ہے۔ اندھیرے کو چیرتی ہوئی میری نظریں زیتون کو دیکھ رہی ہیں۔ اُس کے کمرے کی کھڑکی بند ہے۔

زیتون ــــــ تیری ڈولی آکاش کی بلندیوں سے اُتری اور پری محل کے کھنڈروں کی پریاں تجھے اپنی گود میں لئے گھوم رہی ہیں۔ یہ آبشار، یہ پہاڑ، یہ ندیاں، یہ نالے تیری ناز برداری میں مشغول ہیں۔ مجھے بتا کہ تیری جڑوں میں کون پانی دیتا ہے جو تو اس قدر سرسبز ہے۔ خوبصورت ہے۔ سُندر ہے۔

اندھیرا ــــــ میں کسی زیتون کو تلاش کر رہا ہوں، اب یہاں کوئی زیتون نہیں رہتی ــــــ میں نے کھڑکی کا پٹ زور سے پھر بند کیا ہے۔ مجھے بھی رات کے اندھیرے میں تلاش کرو۔ میری لاش کو ڈھونڈو۔ میں آج کی شب خودکشی کر رہا ہوں۔!

مجھے حلیم کا کشمیری گیت یاد آرہا ہے ؎

میرے لئے ایسی قبر بنانا۔
جہاں برف ہو۔
جہاں ہر سال برف گرے۔
تمام عمر آگ کی جلن میں تڑپتا رہا۔
موت کے بعد
برف کی قبر میں سکون چاہتا ہوں۔!!

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ خودکشی وہ لوگ کرتے ہیں جو کم عقل اور علم و فلسفۂ حیات سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ خودکشی کرنے والے جاہل اور کم عقل ہیں تو پھر میکسیم گورکی، موپاساں اور ٹالسٹائی کی گنتی کن لوگوں میں ہوگی، جب کہ یہ تینوں، جرم خودکشی میں ماخوذ تھے۔ اس کے علاوہ ایرنسٹ، ہیمنگوے، وان گاگھ، اور فلسفی شاعر عیسیٰ طوم نے خودکشی کی تھی۔ ان دانش مندوں کا یہ اقدامِ خودکشی کیا جہالت اور کم عقلی کے باعث تھا۔؟

اس کے باوجود خودکشی دنیا کا بدترین جرم ہے۔

نام :۔ نامعلوم
مقامِ پیدائش : کشمیر
تاریخِ پیدائش :۔ ۹ر جولائی ۱۹۳۷ء
مقامِ وفات : نامعلوم
وقت : نامعلوم
تاریخِ وفات : نامعلوم

کل سویرے نیلما واپس جا رہی ہے۔

ہر آدمی کی زندگی پریتی کی کہانی ہے۔ جسے خدا نے خود اپنی ہی انگلیوں سے لکھا ہے ــــــ میرے زندگی کے چند سِسکتے لمحوں کی یہ کہانی بھی پری کی ہی کہانی ہے اور شاید اِسے خدا نے ہی اپنی انگلیوں سے لکھا ہے ــــــ لیکن یہ کہانی اَدھوری ہے اور یہ اَدھوری کہانی ختم نہ کرنے سے پہلے میں اُس مُلاقات کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں جو دہلی کے ہنگامہ پرور شہر میں نیلما سے ہوئی۔

اور وہ رات سرد سرد سی تنہائیوں کی اور میں صرف ایک گنہگار اِنسان، اپنے گناہوں میں اضافہ کرنے کا تمنّائی اور نیلما۔

ــــــ عورت ایک وقت ہے۔ ہر لمحہ بدلتی ہے اور نیلما ایک عورت تھی۔!!

"دہلی کی روشنیاں بڑی سمجھدار ہیں۔"

"کیوں۔؟"

"میں آیا، یک دم بُجھ گئیں۔"

"لیکن ٹارچ کی روشنی۔؟"

"مدّھم چیزوں سے مجھے پھُولوں کی طرح نفرت ہے۔"

"میں نے راستہ تو دکھایا۔"

"گمراہ کرنے کے لئے اکثر اپنے ہی راستہ دکھاتے ہیں۔"

"کیا لوگے۔؟"

"بس تمہاری باتیں۔"

"تم جانتے ہو میں ....؟"

"میں نیلی کے ڈرائینگ رُوم میں بیٹھا ہوں!!

میری نظر گھڑی پر ہے۔ میں اِس شہر میں اجنبی ہوں۔ اور بھی زیادہ اجنبی بن گیا ہوں۔ کیونکہ نیلی وہ نہیں جو اوبرائے پیلس میں ملی تھی۔ بڑی عجیب سی، بڑی اجنبی سی نیلی۔؟!

بات برج کی چلی، بہت سے جملے بہت سی پیار کی باتیں۔ اور آکاش اور دھرتی کا مِلاپ، لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔

ــــــ عورت کتنی بدذات ہے اور برج سے شادی

ایک سوال ــــــ دل کسی کا دوست نہیں۔!
میتھی کی کچھ صحت بنی ہے۔"

"ہاں پہلے سے کافی موٹی ہو گئی ہے۔"
"کشمیر سے دہلی تک جانے میں جانے کتنے چوہے کھا چکی ہو گی۔"
"میمی چوہے نہیں کھاتی۔ لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو۔؟"
"تم سمجھتی ہو کہ میں اُلجھی ہوئی باتیں کرتا ہوں۔"
"ہاں تو۔!"
میں بات کا رُخ پھیر دیتا ہوں ــــــ "میمی میرے پاس آ۔"
"بے زبان ہے، تمہاری باتوں کو کیسے سمجھے؟"
"سمجھتی تو ہے لیکن قریب آنا نہیں چاہتی۔"
"کیوں۔؟"
"تم اپنے دِل سے پوچھو۔"
"بتا دوں۔؟"
"اِسی لئے تو پوچھ رہا ہوں۔"
"میمی کا دِل اِن دِنوں دہلی میں نہیں لگتا۔"
"کشمیر لے چلوں اسے۔؟"
"نہیں بمبئی جانا چاہتی ہے۔"
"کشمیر سے بمبئی تک کا راستہ بہت طویل ہے۔ شاید یہ راستہ طے کرتے ہوئے میمی کو کچھ اور چوہے کھانے کو ملیں۔"
"پھر۔!"
"میمی بمبئی نہ جا سکے گی کسی اور شہر کو اپنائے گی۔"
'عورت ایک بلی ہے۔
اور مرد ــــــ ایک چوہا۔ صرف ایک بار بلی کے پنجوں میں پھنس گیا اور ہمیشہ کے لئے کھو گیا۔ اُس کا وجود اُس کی باتیں، اُس کے خیالات، اُس کی سوچیں اور ــــــ سبھی کچھ؟!
میں مکان سے باہر آ گیا ہوں۔ رات کے دو بجے ہیں، نیلما میرے ساتھ ہے۔
"سُنو۔؟"
"کیا ہے۔؟"
"میں پرسوں بمبئی جا رہی ہوں، بر تھ ڈے پارٹی ہے نا۔ میں ساری چیزیں خرید چکی ہوں۔ ہاں میرا ایک کام کرو گے۔؟"
"ہاں ہاں۔!"

"میں ڈپلومیٹ کی چار پانچ بوتلیں ساتھ لینا چاہتی ہوں۔"
میں سوچ رہا ہوں ــــــ
"کیا سوچنے لگے۔؟"
"لے آؤں گا۔!"
"میں خود لے آتی کل سویرے FLIGHT پر جانا ہے اور پرسوں ڈرائی ڈے ہے۔"
"کوئی بات نہیں۔"
نیلی میری طرف ہاتھ بڑھا رہی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں سَو سَو کے تین نوٹ ہیں۔ میں لرزتے ہاتھوں سے روپیہ لے رہا ہوں
نیلی اندر چلی گئی ہے۔ میں ویران سی سڑک پر اکیلا کھڑا ہوں۔ رات بڑی اُداس ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں ــــــ نیند نہیں آتی!!
میں نے دوسری شام نیلما کو فون کیا۔ معلوم ہوا، وہ اُسی صبح بمبئی چلی گئی ہے ــــــ میں نے سوچا، کیا مجھے شراب پلا کر نیلما بے خود کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ نہیں جانتی پینے کے بعد میں زیادہ حسّاس بنتا ہوں۔ دِل کا آدمی ہوں نا ــــــ!!
میں ایک، کہانی کار دوست کے ہاں ٹھہرا ہوں ــــــ کہانیاں بنتی ہیں اور بن بن کر مٹ جاتی ہیں۔ زندگی میں بے حد تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تلخ بنانے کے لئے بوتلیں خالی ہوتی جا رہی ہیں ــــــ نیلی کا کوئی علم نہیں!!
میں کشمیر لوٹ آتا ہوں!
کل سویرے نیلما واپس جا رہی ہے اور نیلی کے رُوپ میں پُورے پانچ فٹ قد والی لڑکی میرے سامنے بیٹھی آہستہ آہستہ سے شراب کی چسکیاں لے رہی ہے۔ گلاس میرے ہاتھ میں بھی ہے۔
"تم اُداس ہو۔؟"
"تم سے اب کیا کہوں ــــــ بڑی مدّتوں بعد ایک شبنمی لمس میری زندگی میں آیا تھا۔"
"کیا مطلب۔؟"
"ہر بات کا مطلب نہیں ہوتا۔"

"تم آہستہ آہستہ جا رہے ہو۔"

"میں بن پیئے ہی بہکنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں۔؟"

"میں غم اور دُکھ کے لمحات میں اپنے آپ کو تنہا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

لمحے بیتتے رہے۔!

"وقت کے رفتار کا پہیہ گھومتا رہا؟!!

اور یہ صبح کی روشنی۔"!

میں نے آخری بار کشمیر میں نیلما کو ایرپورٹ پر دیکھا۔

"میں جا رہی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں!"

"دہلی آؤ گے نا۔؟"

"ہاں، جب تم بلاؤ گی۔!"

جہاز آکاش کی وسعتوں میں چلا گیا ــــ پردیسی کیا ہے ایک بہتا دریا جو مڑ کے جھکے بغیر اپنی راہ لیتا ہے ــــ!!!

رات کتنی اندھیری ہے۔ کل اور آج کی رات میں کتنا فرق ہے۔ کتنا فاصلہ ہے اور اس فاصلے کو میں کن قدموں سے عبور کروں۔ اس اندھیرے کو کن روشنیوں کے سہارے دُور کروں۔ تھک سا گیا ہے میرا وجود!!

میں اکیلا ہوں اور میرے ہاتھ میں میمی ہے ــــ جنگلی بلّی..... شہری عورت!!

میں نے اُسے آزاد کر دیا ہے۔ وہ بھاگے جا رہی ہے۔ اپنے ساتھی کی تلاش میں!

اب میں بالکل اکیلا ہوں۔

شام سے پہلے ہی مر چکا ہے شہر۔!

میں اپنے قدموں کی بھاری چاپ لئے آگے بڑھ رہا ہوں۔ دو الگ الگ دُنیاؤں کی بات ہے۔ ایک بڑی رنگ آلود اور ایک نہایت ہی زنگ آلود..... جیسے میری دُنیا۔ رنگ اور زنگ میں امتیاز لازمی ہے۔ وہ دُنیا لاکھ پُر تصنع اور بناوٹی ہو۔ مگر سارے فلسفے وہاں دم توڑتے نظر آتے ہیں ــــ میں پھر بھی تنہا ہوں اور اب شاید ساری عمر

اُس شبنمی لمس کے انتظار میں جاگ جاگ کر بسر کرنا ہوگی، جو ایک خواب کا رُوپ دھارن کر رہا ہے۔ اس لئے کہ میرے پاس دل کی دولت کے سوا کوئی دوسری پُونجی نہیں۔!

میں اس گلی سے باہر آگیا ہوں۔ اب میری نظروں کے سامنے ایک بڑی کشادہ سڑک ہے۔ اس کے ایک کنارے جھیل کی دُنیا بسی ہے اور دوسرے کنارے شنکر آچاریہ کا پہاڑ کھڑا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک پُوری بستی آباد ہے۔ اب میرے سامنے ایک چھوٹی سی پختہ گلی ہے۔ میں اس گلی میں سے گزر کر سامنے کے ایک مکان کو دیکھ رہا ہوں۔ سارا مکان محلّے کی نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہاں ایک کمرے کی کھڑکی سے مدھم مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی ہے ــــ میرا گھر اور اُس گھر میں صُوفیہ.....!!

میں دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔

صُوفیہ آ رہی ہے ــــ صُوفیہ جس میں پہاڑی ندی کی چنچلتا ہے۔ پہاڑوں پر بکھری چاندنی کی چمک ــــ میں واپس مُڑ رہا ہوں۔ بھاگ رہا ہوں۔.. گلی..... کشادہ سڑک..... بازار..... میں بھاگتے بھاگتے رُک گیا ہوں۔ میرے قدم تھم چکے ہیں۔

میں ایک ویران سی گلی میں ہانپ رہا ہوں!

میرے بالکل سامنے ایک مکان کا دروازہ اچانک کُھل گیا ہے۔ اور دروازے میں کھڑی ایک لڑکی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اجنبی سا چہرہ ہے۔ اجنبی سی آنکھیں اور ان آنکھوں سے پُھوٹتی ہوئی مدھم مدھم سی روشنی سے میرے ضمیر کی تاریکی دُور ہونے لگی ہے۔

میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ لڑکی دروازے سے ہٹ رہی ہے۔ جانے اُس کا کیا نام ہے..... شاہدہ، نیلما، اُوما، کوثر..... میں آگے بڑھ رہا ہوں ــــ اور آگے.....!!

لڑکی سامنے ہے۔!

میں..... میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔!

اور پھر ــــ زور سے دروازہ بند کرتا ہوں۔!!!

پگھلتے موم کا شعلہ

اکرام جاوید

اِکرام جاوید

میں ۲۴ مارچ ۱۹۳۵ء کو قصبہ کوہیر تعلقہ ظہیر آباد ضلع میدک (آندھرا پردیش) کے ایک معزز اور خوشحال زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا جو علم و فضل کے اعتبار سے بھی کافی مشہور اور معتبر تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور کوہیر کے مدرسے میں پائی۔ دار العلوم ہائی اسکول حیدر آباد سے میٹرک، چادر گھاٹ کالج سے انٹر میڈیٹ اور کالج آف آرٹس اینڈ کامرس عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۶ء میں بی۔ کام کی ڈگری لی۔ ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد میں پولیس ایکشن ہوا تو ہمارا سارا اثاثہ لُٹ گیا۔ گھر بار جل گیا۔ آگ، قتل و خون اور غارتگری کا ہولناک طوفان ابھی تھما ہی تھا کہ میرے شفیق اور اولوالعزم والد کا اچانک دسمبر ۱۹۵۳ء میں انتقال ہوگیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا جانکاہ حادثہ تھا۔ پھر زندگی ایک درد بھری چیخ بن کر رہ گئی۔ فکرِ معاش کے اندھیروں میں نارسائی کے شعلوں میں جلتا ہوا، دنیا کی نفرت، خود غرضی اور بے مہری کے ستم جھیلتا ہوا میں زندہ رہا اور زندہ ہوں۔ دنیا نے حادثات اور تجربات کی شکل میں اتنا کچھ دیا ہے کہ لکھنا چاہوں تو زندگی ختم ہو جائے اور یہ داستان رقم نہ ہو۔

اپنے غم سے دنیا کے غم کو سمجھنے، درد کے معنی و مطالب سے آگاہ ہوتے، خود سکون پاتے اور دوسروں کو راحت اور سکون پہنچانے کے لئے میں نے لکھنے کا آغاز کیا۔ بنی نوع انسان کی مسرت، آسودگی اور نجات کے لئے اپنے فن کو وقف کر دیا۔ ۱۹۵۱ء سے افسانے، کہانیاں، ڈرامے، خاکے اور ناول لکھ رہا ہوں۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۰ء تک میرا جذباتی وجود کئی طوفانوں سے دوچار ہوا ہے۔ دل بُری طرح باربار ٹوٹا۔ خواب جل گئے۔ چکرائی اور پتھرائی ہوئی جاگتی آنکھوں سے شعلہ بدوش کائناتِ قلب و نظر کا نظارہ کرتا رہ گیا ہوں۔ زندگی کو ہمیشہ تجربۂ ہوش و حواس سمجھتا رہا ہوں اور تادمِ تحریر جذبۂ شوق و تجسّس اور تلاش اور تجربے کی خواہش زندہ ہے۔ ادب کے ترقی پسند اسکول سے خود کو ہمیشہ قریب پاتا رہا ہوں۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے میری جذباتی اور ذہنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ وابستہ رہا ہے اور اب بھی میں اِس تحریک کے ساتھ پُرخلوص ہوں!۔

میری زندگی کی سب سے بڑی اور واحد تمنا یہی ہے کہ اپنے فن سے بنی نوع انسان کی بقا، ترقی، خوشحالی اور آسودگی کے لئے کوئی اہم اور قابل قدر کارنامہ انجام دوں۔ بے یقینی، مایوسی، نفرت اور خود غرضی کے اندھیروں میں موم کی طرح جل کر روشنی کروں۔ پیار کی، اعتبارِ انسانیت کی، محبّت کی روشنی۔!

زندہ رہنے کے لئے مجھے سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ اوروں کی طرح مجھے بھی محرومی اور غم کے شعلوں میں جلنا پڑا اور اپنی خواہش، مرضی، ارادے اور فطرت کے خلاف مجھے ملازمت قبول کر لینی پڑی۔ دو تین ملازمتیں چھوڑ چکا ہوں اور اکتوبر ۱۹۵۷ء سے محکمۂ ڈاک و تار سے وابستہ ہوں۔ اپنی مصروف مشینی زندگی کا وہ وقت جو جسم کے آرام اور صحت کی برقراری کے لئے ملتا ہے، وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتا رہا ہوں۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۶ء تک میں نے بہت لکھا۔ کتنا لکھا یہ مجھے خود یاد نہیں۔ ایک دوست کے اعداد و شمار کے بموجب میں نے اس وقت تک کوئی دو ڈھائی سو افسانے اور کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ یہ سب ہند و پاک کے ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ کچھ ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اِن کے علاوہ کوئی درجن بھر ناول بھی لکھے جن میں سے دو ناول شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ اب شائع ہوتے جا رہے ہیں اور کچھ پر نظرِ ثانی کر رہا ہوں۔ میرے افسانے اور ناول اپنی فضا، واقعات کے تجزیے اور ادبی نثر کے لئے اربابِ علم و فکر میں قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ عمومی نثر اور سستے پن سے میں نے ہمیشہ خود کو بچایا ہے۔ خواہ افسانوی ادب ہو یا ڈرامے کا فن، میں دونوں میں ایک شگفتہ علمی و ادبی انداز پسند کرتا ہوں۔

(خود نوشت)

پگھلتے موم کا شعلہ

اکرام جاوید

(اس ناولٹ کے کردار، مقامات اور واقعات قطعاً فرضی ہیں۔)

نسرین سے جدائی کے بعد جینے میں کوئی لطف نہ رہا۔ قلب و نظر کی دنیا کیا اُجڑی، دنیا سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ خالی خالی دنیا، اُداس ویران نظارے، وحشت زا محفلیں، محفل در محفل خلوت، جلتی ہوئی تنہائیاں۔ دل میں ہر طرف شعلے بکھرے ہوئے، چار سُو دھواں بل کھاتا ہوا۔ غم اور مایوسی کا دھواں۔ ٹوٹا ٹوٹا سا دل۔ بجھی بجھی سی خالی خالی سی آنکھیں۔ تاریک دہکی ہوئی خلا میں ایک پُرہول سناٹا سا چھایا ہوا۔ میں جو ایک جیتا جاگتا امنگ بھرا پیار بھرا دل تھا، ہر تمنا اور ہر طلب سے بے نیاز معلق اور مصلوب سا ہو کر رہ گیا ــــــ

میں نے ابھی عمر کی صرف پینتیس بہاریں دیکھی تھیں۔ صورت شکل اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی میں ابھی پُرکشش تھا جوان تھا۔ لیکن میں ایک زندہ لاش بن گیا تھا۔ میں ایک مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس جس کے فن کی خوشبو دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی، جل بجھ کر رہ گیا تھا۔ شہر میں آبائی اور موروثی جائیداد اتنی تھی کہ زندگی بھر مجھے کھانے کمانے کی کوئی فکر نہ رہی۔ پچیس برس کی عمر میں میری شادی ہوئی تھی۔ ماں باپ کی پسند کی وہ لڑکی جو میری بیوی تھی، صورت اور سیرت کے اعتبار سے مجھے بھی پسند تھی۔ شادی کے بعد حسب روایت بچے بھی ہوئے تھے معصوم اور پھول جیسے خوبصورت بچے۔ دولت، عزت اور شہرت، بظاہر میری زندگی میں کوئی کمی نہیں تھی۔ کوئی غم نہیں تھا۔ لیکن میں اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش نہیں تھا۔ نارسائی کے شعلوں میں جلتا ہوا تسکین کے لئے ترستا ہوا میں ہمیشہ کسی کا منتظر رہا۔ اور کوئی آیا۔ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح، ابر رواں کے سائے کی صورت میں کوئی آیا اور چلا بھی گیا کسی کے آنے سے زندگی ملی تھی۔ کوئی چلا گیا تو زندگی بھی چلی گئی اور ایک سرد بے حس لاش کی طرح میں جینے کی رسم پوری کر رہا تھا۔

میں دنیا سے دُور ایسی جگہ رہنا چاہتا تھا جہاں کوئی نہ ہو اپنا، پرایا، ہمدرد، مہربان کوئی نہ ہو۔ نہ کوئی مجھ سے پرسشِ حال کرے نہ میرا ماضی مجھے یاد دلائے۔ بلیو ہلز ایک ایسی ہی جگہ تھی۔ شہر کے آخری حصے میں سرسبز و شاداب بلندیوں پر واقع بلیو ہلز کی روڈ نمبر چار پر میرا آبائی مکان میرے لئے بڑی اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا۔ نسرین کے حادثے کے بعد میری بیوی کافی محتاط ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا اور کبھی میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔ ننھے معصوم بچے تھے جو اپنی دنیا میں آپ مگن رہتے تھے۔ بیوی بچوں کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر ملازمہ تھی اور ایک نوعمر ملازم چھوکرا تھا جو میرے مزاج سے خوب واقف تھے۔ دن بھر میں ڈرائینگ رُوم میں پڑا رہتا۔ ڈرائینگ رُوم میں سڑک کی طرف کُھلنے والی کھڑکی کے آگے بیٹھا ادب اور فلسفے کی کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہتا۔ دل و دماغ کی حالت ابتر تھی۔ کبھی اپنی لکھی ہوئی چیزوں کو دیکھتا تو حیرت ہوتی کہ آخر میں نے اتنی ساری چیزیں کیسے لکھ ڈالیں۔ اب تو دو سطر تک لکھنا مجھ سے مشکل تھا ــــ!

میرے ڈرائینگ رُوم کے سامنے سمنٹ کی نیلگوں سڑک تھی۔ سڑک کے اُس پار پُرانی وضع کا بنا ہوا ایک وسیع و عریض مکان تھا جس کے آہنی پھاٹک پر سُرخ پھولوں والی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اونچی کائی زدہ چار دیواری سے محصور پرانی طرز کا بنا ہوا یہ مکان ویران اور سنسان سا دکھائی دیتا تھا۔ میرے ڈرائینگ روم کی کھڑکی کے عین مقابل اِس مکان کا دیوان خانہ تھا۔ دیوان خانے کے دروازے کی دونوں طرف بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جو سڑک کی طرف کُھلتی تھیں۔ دروازے اور کھڑکیوں کا رنگ آسمانی تھا۔ کھڑکیوں کی سلاخوں پر نیلے رنگ کی مہین سی لوہے کی

جالی لگی ہوئی تھی۔ سرِشام جب سڑک پر بجلی کے قمقمے روشن ہوتے تو وہ خاموش اور سنسان سا مکان جیسے انگڑائی لیتے ہوئے بیدار ہو جاتا۔ دیوانخانے کا دروازہ کھلتا۔ کھڑکیوں کے پٹ وا ہوتے اور اندر نیلے رنگ کی روشنی جل اٹھتی تو معلوم ہوتا کہ دیوانخانے کی اندرونی دیواروں کا رنگ بھی نیلا ہے۔ دروازے اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردوں کا رنگ بھی نیلا ہے۔ اپنی نیلاہٹوں کے ساتھ وہ دیوانخانہ آسمان کا ایک ایسا نیلا روشن حصہ دکھائی دیتا جو زمین بوس ہو گیا ہو۔ رات ذرا ڈھلتی تو نارنجی رنگ کی ایک لمبی سی شاندار کار کہیں سے آ کر دیوانخانے کے آگے رک جاتی۔ ایک مرد اور ایک نوجوان لڑکی کی ہنسی قہقہوں کا شور ابھرتا۔ پھر دیوانخانے کا دروازہ بند ہو جاتا۔ رات بھر وہ نارنجی کار دیوانخانے کے آگے کھڑی رہتی اور صبح ہوتے ہی قطرۂ شبنم کی طرح غائب ہو جاتی۔!

میں نے اس مکان اور اس کے مکینوں کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔ اس نارنجی کار پر کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر اس مکان میں رہنے والے لوگ کچھ اس قدر خاموش اور کم آمیز تھے کہ انہوں نے کبھی مجھ سے راہ و رسم بڑھانے کی سعی نہیں کی اور میری حالت ایسی تھی کہ اپنے سائے تک سے بیزار اور اکتایا ہوا تھا میں نے بھی کبھی ان لوگوں کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔!

ایک رات ایک عجیب سا واقعہ ہو گیا۔ سڑک پر ڈرینیج کی مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ اس دیوانخانے کے قریب سڑک پر مین ہول کا ڈھکن نکال دیا گیا تھا۔ حسبِ معمول رات میں نارنجی کار فراٹے بھرتی ہوئی آئی۔ ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ کسی لڑکی کی چیخ بلند ہوئی تو میں باہر نکلا۔ کار کا اگلا پہیہ کھلے مین ہول میں اتر گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کار کا دروازہ کھلا اور ایک چھریرے بدن کی دراز قد لڑکی شانوں پر سر کے بال بکھرائے لڑکھڑاتی ہوئی کار سے اتر کر دیوانخانے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا چہرہ تو میں دیکھ نہ سکا۔ البتہ اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ نشے میں چور ہے۔ اس کا ساتھی گہرے سانولے رنگ کا ایک پستہ قد مضبوط گٹھے ہوئے بدن کا نوجوان تھا جو سیاہ سوٹ میں ملبوس نشے میں دھت جھومتا ہوا سا کار سے نکلا اور شانِ بے نیازی سے دیوانخانے میں چلا گیا۔ پھر دیوانخانے کا دروازہ اور کھڑکیاں بند ہو گئیں۔۔ دوسرے دن صبح نارنجی کار جا چکی تھی۔۔۔!

میرے ذہن پر اس واقعہ نے کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ لوگ شراب پیتے ہیں، پی کر بہک جاتے ہیں، نشے میں گرتے پڑتے ہیں۔ ایسے حادثے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن اس سے مجھے اپنے پڑوسیوں کے عادات و اطوار کا اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس واقعہ پر کوئی توجہ نہیں دی اور بھول گیا۔۔۔!

اس کے بعد چند دنوں تک وہ نارنجی کار برابر دکھائی دیتی رہی۔ پھر ایک دم غائب ہو گئی۔۔۔

راتوں میں کبھی کبھی دیوانخانے کی کھڑکیاں کھلتیں اور نیلی روشنی میں چند سائے تھرک جاتے۔ مگر اب وہ پہلی سی رونق نہیں رہی تھی۔ ایک پراسراری خاموشی اس مکان پر مسلط تھی۔ مجھے راتوں میں اکثر اس نارنجی کار کا خیال آتا۔ غیر ارادی طور پر میں اس کار کا انتظار کرتا۔ لیکن وہ کار پھر کبھی دکھائی نہیں دی۔ جب بھی میں اپنے ڈرائنگ روم سے باہر کی طرف دیکھتا، ماحول اور منظر میں مجھے ایک کمی سی محسوس ہوتی۔۔۔!

اوائل مارچ میں بمبئی سے شہاب آیا تو میرے ڈرائنگ روم کی خلوت درہم برہم ہو گئی۔ شہاب میرا بہت پرانا دوست تھا۔ ہمراز اور ہم خیال قسم کا دوست۔ چھریرے بدن کا متوسط قامت شہاب سیاہ فام تھا۔ اس کے بیضوی چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ عمر میں وہ مجھ سے کوئی دو چار سال کا بڑا تھا۔ بیک نظر اس کی شخصیت میں کوئی کشش دکھائی نہیں دیتی تھی۔ لیکن وہ بڑی تہہ دار اور پرکشش شخصیت کا حامل تھا۔ دل باتوں سے موہ لیتا تھا۔ اس کا مطالعہ شاندار تھا اور اندازِ فکر مہذب اور شائستہ۔ شہر کے ایک امیر گھرانے کا لاڈ پیار میں پلا ہوا۔ نازک مزاج۔۔۔

نفاست پسند شہاب بڑا لاابالی اور کاہل واقع ہوا تھا۔ ہمیشہ خوابوں اور خیالوں میں گم رہنے والے انسان کے مستقبل سے سب ہی مایوس ہو چکے تھے۔ وہ بہت اچھا افسانہ نگار بھی تھا لیکن بے عملی اور اپنی فطری آرام پسندی کے سبب وہ عرصۂ دراز تک پریشان رہا۔ زمانہ بدلا۔ حالات بدلے۔ جاگیر چلی گئی۔ ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو وہ قسمت آزمائی کے لئے بمبئی چلا گیا اور پندرہ برس کی سخت جدوجہد کے بعد وہاں اُس نے فلم انڈسٹری میں اپنے لئے ایک نمایاں مقام پیدا کر لیا تھا۔ اس نے اب تک کوئی درجن بھر فلمیں لکھی تھیں۔ اس کی لکھی ہوئی اکثر فلمیں سلور جوبلی منا چکی تھیں۔ فلمی دنیا میں اس کی مانگ تھی۔

اور اب وہ خود فلم بنانا چاہتا تھا اور اپنی پہلی فلم کے لئے وہ مجھ سے کہانی لکھوانا چاہتا تھا۔ میں ہندوستانی فلموں کے معیار سے کبھی مطمئن نہ ہو سکا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ایک نہایت معیاری فلم بنائے اور فلم انڈسٹری میں ایک نئے صحت مند رجحان کو فروغ دے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کی پہلی فلم کے لئے عام روش سے ہٹ کر کوئی عمدہ سی کہانی لکھوں۔ وہ میرے فن کا نقّاد بھی تھا اور مداح بھی۔ اُسے یقین تھا کہ ایسی کہانی صرف میں ہی لکھ سکتا ہوں۔ شہاب میرا بہت قریبی دوست تھا۔ دنیا میں واحد دوست جس سے میں خود کو الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے اصرار پر میں نے وعدہ کر لیا اور دوسرے ہی دن پریس کانفرنس میں شہاب نے اعلان کر دیا کہ اس کی پہلی رنگین فلم کے لئے میں کہانی لکھ رہا ہوں۔ اخباروں میں جب یہ خبر چھپی تو دنیا کو جیسے میری زندگی کا احساس ہوا۔ پبلشروں اور ادبی رسالوں کے ایڈیٹروں نے مجھ پر یلغار کر دی۔ میں پریشان ہو گیا۔ کسی نہ کسی طرح اس طوفان پر میں نے قابو پا لیا——!

دو چار دن بعد شہاب بمبئی واپس چلا گیا۔ مجھے قدرے سکون ملا۔ لیکن دوسرے ہی دن صبح سویرے چھریرے بدن کا ایک سیاہ فام معصوم صورت ادھیڑ عمر کا آدمی سفید ٹیریلین کی شرٹ اور چاکلیٹی رنگ کی پتلون میں جھجکتا ہوا سا میرے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میں چونک گیا۔ "میں آپ کا پڑوسی ہوں، سامنے والے مکان میں رہتا ہوں۔" نووارد نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا "میرا نام منظور احمد ہے۔!" اُس کا لب و لہجہ مدراسی تھا۔

"تشریف رکھئے!" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے مکان کے سامنے رہتے ہیں لیکن گذشتہ دو چار مہینوں میں کبھی آپ سے میرا سامنا نہیں ہوا۔"

میرے مقابل صوفے پر بیٹھتا ہوا وہ محجوب سا ہو گیا اور بولا۔ "دیکھئے بات یہ ہے کہ میں لوگوں سے ملتے ہوئے گھبراتا ہوں۔ لوگ اس قابل نہیں کہ اُن سے ملا جائے۔ میں اسی لئے گھر سے باہر بھی نہیں نکلتا۔"

اس کی معصوم صورت اور بھولی بھالی سی باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے میں نے کہا۔

"فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"جی۔ وہ شہاب صاحب۔ ڈائرکٹر پروڈیوسر——" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"شہاب صاحب تو کل شام ہی چلے گئے۔" میں نے کہا۔ "آپ شاید ان سے ملنا چاہتے تھے؟"

"چلے گئے؟" وہ حسرت سے بولا۔ "میں اپنی بچّی کے سلسلے میں ان سے ملنا چاہتا تھا۔!"

"بچّی کے سلسلے میں؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

"جی ہاں۔ میری بچی کالج آف فلمز کی ڈپلومہ ہولڈر ہے۔ فلم ایکٹنگ اور رقص میں اس نے ڈپلومہ لیا ہے۔" وہ رک کر بولا۔ "اخبار میں شہاب صاحب کا بیان میری نظر سے گذرا۔ وہ بڑی کاسٹ کی ایک کلر فلم بنا رہے ہیں جس کی کہانی آپ لکھ رہے ہیں۔ آپ کہانیاں لکھتے ہیں مجھے اخبار سے معلوم ہوا۔ شاید چراغ تلے اندھیرے میں رہنا اسی کو کہتے ہیں۔ آپ کے پڑوس میں رہتے ہوئے میں آپ سے واقف نہیں تھا اور ساری دنیا آپ کو جانتی ہے۔ البتہ میری بچی آپ کے نام سے واقف تھی۔ وہ آپ کی بہت سی کتابیں پڑھ چکی ہے

اُسے قصّے کہانیوں کا بہت شوق ہے۔ ان دنوں تو وہ ہمیشہ افسانے اور ناول ہی پڑھتی رہتی ہے۔ تو میری بچّی نے بھی کہا کہ آپ بہت مشہور افسانہ نگار ہیں۔"

"ہاں۔ تو آپ، شہاب سے ملنا چاہتے تھے۔" میں نے قصہ مختصر کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔" وہ خفّت سے بولا۔ "مگر وہ اب جا چکے ہیں۔"

"شہاب میرا بہت قریبی دوست ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن میں فلمی ماحول سے بہت دور رہا ہوں۔ مجھے پتہ نہیں کہ وہ اپنی فلم کے لئے کن اداکاروں کو لے رہا ہے!"

"وہ بمبئی کے اداکاروں کو ہی لیں گے۔" منظور احمد کے لہجے میں گہری اُداسی تھی۔

"میری بچّی بہت خوبصورت ہے۔ اُس میں اداکاری کی بہترین صلاحیتیں ہیں۔ وہ ایک پیدائشی فن کار ہے۔ لیکن فلمی دنیا میں داخلے کے لئے یا تو سرمایہ چاہیئے یا پھر اثر و رسوخ۔ اور یہ چیزیں ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ہمارا کام بن سکتا ہے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں نے کہا نا، مجھے فلمی کاروبار سے کچھ بھی واقفیت نہیں ہے۔"

"آپ کا فلمی دنیا پر بھی اثر ہے۔" وہ متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ "پھر شہاب صاحب تو آپ کے گہرے دوست ہیں۔ آپ ایک نظر میری بچی کو دیکھ لیجئے۔ اگر وہ اس قابل ہوئی، تو شہاب صاحب سے سفارش کر دیجئے!"

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ بڑی بے دلی سے میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن اس کی معصومیت پر مجھے ترس آ گیا۔ اور میں نے وعدہ کر لیا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر آپ کی لڑکی واقعی اس قابل ہے تو میں کوشش کروں گا۔"

"شکریہ۔" وہ گہری احسانمندی سے بولا۔ "آپ میرے غریب خانے پر کب تشریف لائیں گے۔"

مجھے اس کے پُر تکلف اندازِ کلام پر ہنسی آ گئی۔

"آپ کے ہاں آنا کونسا مسئلہ ہے جناب۔" میں نے کہا۔ "ایک سانس کا فاصلہ بھی درمیان نہیں ہے۔ آج شام میں کسی بھی وقت آ جاؤں گا۔"

"شکریہ!" وفورِ مسرت سے اس کی آواز کپکپا کر رہ گئی۔ اور وہ خوش اور مطمئن سا چلا گیا۔۔۔!

•

اُداس رُومانی آنکھوں والی اس حسینہ کا نام ریشماں تھا۔ ویسے اس کا اصلی نام رخشندہ بانو تھا۔ لیکن کالج آف فلمز سے ڈپلومہ لینے کے بعد اس نے اپنے لئے فلمی نام ریشماں پسند کیا تھا اور اب سب اسے ریشماں ہی پکارتے تھے۔

چھریرے بدن کا دراز قد ادھیڑ عمر منظور احمد سیاہ فام تھا لیکن اس کی لڑکی ریشماں کا رنگ گورا گلابی تھا۔ دبلی پتلی دراز قد اس لڑکی کا چہرہ کتابی تھا۔ سر کے بال لمبے سیاہ چمکدار تھے۔ کمانی دار ابرو۔ بڑی بڑی گہری سیاہ اُداس رومانی آنکھیں۔ پتلے پتلے پھول کی پنکھڑی جیسے لب۔ موتی جیسے سفید چمکدار دانت۔ اس کے حُسن میں شاہانہ وقار تھا، تمکنت تھی، لطافت اور نزاکت تھی۔ وہ یقیناً کسی بھی بڑی فلم اسٹار سے زیادہ خوبصورت اور پُرکشش تھی۔ لیکن مجھے جس چیز نے چونکا دیا وہ اس کی آنکھوں کی اُداسی تھی، اور دل میں آگ سی لگاتی ہوئی مسکراتے بات کرتے ہوئے لبوں کی مخصوص انداز میں جنبش تھی۔ وہ بے جھجک اور بے ساختہ گفتگو کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں بلا کا ترنّم تھا۔ درد اور سوز کی ایک لطیف سی ناقابلِ بیان کیفیت تھی۔ منظور احمد کے لب و لہجہ پر مدراسی اثر غالب تھا۔ لیکن ریشماں خالص اُردو لہجے میں بول رہی تھی۔ صاف شستہ زبان، نپے تُلے پُراثر جملے اور دل میں اُتر جانے والا پیارا سا اندازِ گفتگو۔۔۔ اور بات کے اثر کو اس کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اور گہرا کرتا تھا۔ ریشماں کی کہانی بہت مختصر تھی۔ اس نے منظور احمد کے گھر میں جنم لیا تھا اور منظور احمد ایک متوسط گھرانے کا بھولا بھالا کثیر العیال آدمی تھا جو مدراس کے کسی دیہات میں پیدا ہوا تھا اور تلاشِ معاش میں ترکِ وطن کر کے اس شہر میں آیا تھا اور اٹھارہ سال سے یہاں مقیم تھا۔

یہاں وہ محکمۂ مال میں ملازم تھا اور یہیں ریشماں کے علاوہ نو بچے اور پیدا ہوئے تھے۔ ریشماں اس کی بڑی لڑکی تھی اس کے علاوہ اس کے نو عدد بچے اور تھے۔ پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں۔ رشوت ستانی کے ایک جھوٹے الزام میں اس کی ملازمت چلی گئی تھی اور گذشتہ چھ سال سے وہ بیکار تھا۔ گاؤں کی زراعت سے کچھ آمدنی ہوجاتی تھی۔ شہر میں مکان ذاتی تھا۔ بڑی مشکل سے زندگی بسر ہورہی تھی۔

ریشماں کو بچپن ہی سے فلموں کا شوق تھا۔ وہ ہر روز فلم دیکھتی۔ اسکول کے زمانے میں ڈراموں میں کام کرتی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد اس کے نظری رجحان کو دیکھتے ہوئے منظور احمد نے اسے کالج آف فلمز میں داخلہ دلوایا۔ دو سال تک وہ کالج آف فلمز میں پڑھتی رہی۔ اس دوران میں منظور احمد کی نوکری چلی گئی۔ وہ معاشی بحران کا شکار ہوگیا لیکن اس نے ریشماں کو روپے پیسے کی کمی کا احساس ہونے نہیں دیا۔ ریشماں کے لئے وہ مقروض ہوگیا تھا۔ مکان کا ایک حصہ گروی رکھ دیا تھا لیکن ناامید اور مایوس کبھی نہیں ہوا تھا۔ ریشماں کو ایک بھی فلم میں کام مل جائے تو سارے قرضے ادا ہو سکتے ہیں۔ ایسے کئی مکان بیچے اور خریدے جا سکتے ہیں۔ فلم اسٹار ایک ایک فلم کے لئے کئی کئی لاکھ روپے لیتے ہیں اور ان کے پاس فلموں کی کمی ہوتی ہے نہ معاہدوں کی۔ ریشماں کی آس پر منظور احمد کے خاندان نے خوابوں کا ایک محل سا تعمیر کرلیا تھا اور تنگدستی اور مفلسی کے ستم ہنس ہنس کے جھیل رہے تھے۔ گھر میں سب روکھا سوکھا کھا لیتے معمولی کپڑا پہن لیتے لیکن ریشماں کو اچھی غذا اور اچھا لباس مہیا کرتے۔ اس کی صحت اور اس کے حسن کی برقراری کے لئے ہر طرح کا جتن کرتے ایک گوہر نایاب کی طرح ریشماں کی دیکھ بھال ہوتی تھی لیکن ریشماں بہت حساس لڑکی تھی۔ اسے اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی فکر گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ اس کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ گذشتہ چھ سال سے وہ بمبئی اور مدراس کے کئی چکر لگا چکی تھی۔

ہر جگہ کوشش کرچکی تھی اور ہر جگہ اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ چھوٹے موٹے رول تو اسے کبھی کے مل جاتے لیکن وہ ہیروئن سے کم رول قبول کرنے کو تیار نہیں تھی اور کوئی بھی فلمساز اسے ہیروئن بنانے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔

”میں اپنے فن کے وسیلے سے اپنی ذات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں لیکن اپنے ماحول کے اندھیرے خول میں قید ہو کر رہ گئی ہوں!“ اس نے غمگین لہجے میں کہا تو میرا دل بھر آیا۔ ایک فنکار کا درد میرے لئے پرایا درد نہیں تھا۔ اس کے حالات کی تاریکی کا مجھے احساس تھا۔ قرضوں کے سمندر میں اس کا خاندان تا بہ حلق ڈوب چکا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی بہن تعلیم اور ترقی کے حق سے محروم ہو گئے تھے۔ عزیز رشتہ دار بیگانے بن چکے تھے۔ دوست احباب خود غرض اور مطلبی ثابت ہوئے تھے۔ سب پتھر دل تھے، بے حس اور ظالم تھے۔ سب طنز کرتے تھے۔ ان کی پریشانی پر ہنستے تھے۔ سیاہ فام ادھیڑ عمر منظور احمد رشتہ داروں سے قطع تعلق کرچکا تھا۔ دوست احباب سے کٹ گیا تھا۔ اور اپنی خاندانی زندگی کے اندھیروں میں اُلجھ کر رہ گیا تھا!

ریشماں پر مجھے بڑا ترس آیا۔ اس کے لئے میرے دل میں چند نرم گوشے اُبھرے۔ میں جو پتھر کا ایک بُت تھا اس کے درد کی حدت سے موم کی طرح پگھلنے لگا۔ میں نے دل و جان کی تمام تر صداقتوں کے ساتھ وعدہ کیا کہ اس کے بارے میں شہاب کو ضرور لکھوں گا۔ اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے اسے کسی نہ کسی طرح کام دلا دوں گا۔!

اُس رات جب میں ریشماں سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو مجھے دنیا بدلی بدلی سی دکھائی دی۔ آسمان بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ زمین بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی۔ زندگی بڑی پیاری بڑی خوبصورت اور دلربا شے بن گئی تھی ——!

•

اُداس آنکھوں والی اس لڑکی نے پہلی ملاقات میں

کچھ ایسا تاثر دیا کہ میں رات بھر بے چین اور بے خواب رہا۔ اُن آنکھوں نے، مسکراتے ہوئے اُن لبوں کی جنبش نے دل میں ایک آتشِ خاموش کو جگا دیا تھا۔ دو چار ملاقاتوں میں وہ اور کھل گئی تو محسوس ہوا جیسے وہ وہی ہے۔ وہی جانِ تمنا، جانِ بہار، جانِ انتظار، میری زندگی میری جان جو مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ اس سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ خواب کس طرح حقیقت میں ڈھلتے ہیں اور تنِ مُردہ میں کیسے جان پڑتی ہے۔

پھر وہی ماحول تھا، وہی پیار کا موسم، وہی دل اور وہی جذبات کا عالم۔ احساس کا رنگ وہی آواز کا رنگ۔ مجھے اپنے آپ کا خیال آیا۔ دنیا سے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو پھر سے جوڑنے کی خواہش اُبھری۔ احساس کے بال و پر کھل گئے۔ رُوح پر چھائے ہوئے تاریک سائے چھٹ سے گئے۔ میں کاروبارِ حیات میں دلچسپی لینے لگا۔ ریشماں کے لئے میں نے شہاب کو ایک دو نہیں کئی خطوط لکھے۔ ریشماں کی نئی پرانی ڈھیر ساری تصاویر اسے بھیجدیں اور ہر خط میں اصرار کیا تھا کہ اس کی فلم میں ریشماں ہیروئن ہو اور اپنے آخری خط میں تو میں نے صاف صاف لکھ دیا کہ اس کی فلم کے لئے میں جو کہانی لکھوں گا وہ ریشماں کی زندگی کی کہانی ہوگی اور ریشماں ہی فلم میں مرکزی رول ادا کرے گی۔

ریشماں میں میری دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ میری بدلی ہوئی حالت سے جہاں میری بیوی کو حیرت تھی، میں خود بھی حیران تھا۔ سیاہ فام منظور احمد اب ہر روز مجھ سے ملتا اور نیلے دیوانخانے میں ہر شام ریشماں میری منتظر رہتی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی اور شوق سے میرے افسانوں اور ناولوں کو پڑھتی تھی اور انتہائی سُلجھے ہوئے انداز میں ان پر اظہارِ خیال بھی کرتی تھی۔ اس کا مطالعہ وسیع تھا۔ ادب اور فلسفے سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ اس میں سوچنے سمجھنے اور واقعات سے اثر قبول کرنے اور نتائج اخذ کرنے کی بہترین صلاحیتیں موجود تھیں۔

"اداکار کو انسانی جذبات اور نفسیات کا گہرا علم ہونا چاہیئے۔ اس کو انسانی جذبات اور احساسات کا حسّاس ترین آئینہ ہونا چاہیئے۔" میں عالمانہ شان سے کہا کرتا۔ "بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں الفاظ کی صورت میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آنکھیں انہیں کہہ سکتی ہیں۔ چہرہ انہیں بیان کر سکتا ہے۔" میں رُک رُک کر کہتا۔ "آنکھوں کا ایک ہلکا سا تاثر، لبوں کی ایک خفیف سی جنبش ایک لمحے میں وہ سب کچھ عیاں کر دیتی ہے جو قلم ہو تو داستان بن جائے۔"

"میرے لئے یہی مشکل ہے۔" وہ بے بسی سے کہتی۔ "میرا چہرہ اکثر میرے جذبات کی غمازی نہیں کرتا۔"

"چہرہ تو بس ایک آئینہ ہے۔" میں سمجھاتا۔ "آپ کا تصور دراصل آپ کے جذبات کا ساتھ نہیں دیتا۔ یوں سمجھئے آپ کا دماغ آپ کے دل سے اشتراک نہیں کرتا۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"یوں سمجھئے۔ آپ کو ایک ایسی لڑکی کے جذبات کی عکاسی کرنی ہے جسے کسی نوجوان سے محبت ہو گئی ہے۔" میں گہری نظروں سے اس کو گھورتے ہوئے کہتا۔ "ایسے وقت آپ کو اپنی حقیقی زندگی میں کسی ایسے تجربے کو یاد کر لینا چاہیئے ذہن میں کسی ایسے منظر کا تصور کر لینا چاہیئے جو کبھی آپ کی زندگی میں گذرا ہو۔"

"اگر حقیقی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ہی نہ ہوا ہو تو؟" وہ اُلجھ جاتی۔

"ایسا ناممکن ہے۔" میں جواب دیتا۔ "فنکار کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہوتے ہیں۔ دل بار بار ٹوٹ جاتا ہے۔ زندگی اک درد بھری چیخ بن جاتی ہے۔ عشق بہت خراب کرتا ہے بہت تباہ کرتا ہے۔ اپنی انتہا پر پہنچکر درد کم ہوتا ہے تو وہ ایک نیا روگ لگا لیتا ہے۔ بار بار عشق کرتا ہے۔ بار بار ناکام اور برباد ہوتا ہے۔"

"میری زندگی میں مگر ایسا کوئی واقعہ نہیں گذرا۔" وہ

بناوٹی لہجے میں کہتی۔

"آپ غلط کہہ رہی ہیں؟"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"میں کہہ سکتا ہوں ——!" میں جلتی ہوئی نظروں سے اُسے گھورنے لگتا اور وہ بے بسی سے نظریں جھکا لیتی۔

"جی ——؟"

"جی ہاں ——"

"جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ بوکھلا کر کہتی۔ "آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟"

"آپ مجھ سے چھپانا ہی چاہتی ہیں تو پھر میں مجبور نہیں کروں گا۔" میں مضطرب لہجے میں کہتا۔ "آپ شاید مجھ پر اعتبار نہیں کر سکتیں۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ دنیا میں کوئی بھی کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔"

"جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ خشک سی آواز میں کہتی۔ "میں نے آپ سے اپنی ہر بات کہہ دی ہے۔ میں آپ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتی۔"

"لیکن ایک بات تم نے ہمیشہ چھپائی۔" میں آہستہ سے کہتا۔ "اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ کونسی بات ہے۔"

"کونسی بات؟" وہ گھبرا جاتی۔ "کہیئے وہ کونسی بات ہے۔"

"وہی نارنجی رنگ کی کار والی بات۔" میں یاد دلاتا۔ تو وہ ایکدم نروس ہو جاتی۔ پھر کھوکھلی سی ہنسی کے درمیان کہہ اٹھتی۔

"نارنجی رنگ کی کار سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ بدحواسی سے کہتی۔ "ان کا نام راحت نواب ہے۔ وہ صاحب ابا کے دوست ہیں۔ انہیں فلمسازی کا شوق تھا کالج آف فلمز کے زمانے ہی سے وہ ابا کے پیچھے پڑ گئے تھے وہ مجھے اپنی پہلی فلم میں ہیروئن بنانا چاہتے تھے۔ وہ پیسے والے آدمی ہیں، فلم بنا بھی سکتے تھے۔ لیکن ——"

"لیکن کیا ——؟"

"بات یہ ہے۔" وہ غم سے کہتی۔ "دراصل ان کی بیوی ساری جائداد اور دولت کی مالک ہے۔ اُن کا اپنا ذاتی سرمایہ کچھ نہیں تھا۔ انہیں بس فلمسازی کا شوق تھا۔ بیوی نے فلم میں سرمایہ لگانے سے انکار کر دیا تو بات ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ وہ فلم نہیں بنا سکے۔ قصہ ختم ہو گیا۔"

"تمہارا وقت تو کافی خراب ہوا ہوگا؟" میں جرح کے سے انداز میں پوچھتا۔

"بہت وقت خراب ہوا۔ زندگی کے پانچ سال برباد ہو گئے۔" وہ مضطرب آواز میں کہتی۔ "بہر حال جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب اس کے ذکر سے حاصل؟"

"کیا واقعی تم اسے اپنے دل و دماغ سے نکال چکی ہو؟" میری آواز جیسے ماضی کے ویرانوں سے ابھرتی۔ اس خیال سے میں تڑپ جاتا کہ ایک زمانے میں کسی سے میں نے ایک ایسا ہی سوال کیا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ پریشان آواز میں کہنے لگتی۔ "وہ کبھی بھی میرے دل و دماغ میں نہیں رہے۔ میں نے کہا نا وہ ابا کے دوست تھے اور بس۔ ان کا میرا رشتہ کاروباری رشتہ تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ مجھ سے ملتے تھے اور کاروبار ختم ہو گیا تو ملنا جلنا بھی ختم ہو گیا۔"

مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے رازداری برت رہی تھی۔ میں نے اس کے سیاہ فام ادھیڑ عمر باپ سے بھی اس بارے میں گفتگو کی تھی۔ اس نے بھی کم و بیش اسی قسم کا جواب دے کر مجھے ٹال دیا تھا۔ مجھے غصہ بھی آتا اور کوفت بھی ہوتی کہ ان لوگوں کے بارے میں جذباتی ہو رہا ہوں جو مجھ پر اعتبار نہیں کرتے —— مجھ سے دل کی بات چھپاتے ہیں۔ رازداری برتتے ہیں۔ میں سنبھلنا چاہتا تھا۔ ریشاں کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کسی نفیس قسم کی شراب کے نشے کی طرح اس کا خیال میرے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ ضبط و احتیاط کے باوجود میرے قدم بڑھتے ہی گئے۔ میں بے خودی کے عالم میں دور تک نکل گیا۔ اب پیچھے مڑ کر بھی

دیکھنا مشکل تھا۔ رازداری اور بے اعتباری کے باوجود میرے
دل میں ریشماں کے لئے ہمدردی اور پیار کے جذبات تھے میں
اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے اپنے دل و دماغ سے
نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ میرے لئے ناگزیر بن چکی تھی ـــــ!

●

مئی کے دوسرے ہفتے میں بمبئی سے شہاب کا خط آیا۔
ریشماں کی تصاویر اسے پسند آئی تھیں۔ اس نے لکھا تھا "لڑکی
واقعی خوبصورت ہے۔ کالج آف فلمز کی ڈپلومہ ہولڈر ہے
اور کالج آف فلمز میں صرف ان ہی لڑکیوں کو داخلہ ملتا ہے
جن کا چہرہ فلم کے لئے موزوں ہو اور جن میں اداکاری کی
صلاحیت ہو اور سب سے زیادہ مجھے تمہاری خاطر عزیز ہے
اب جلد سے جلد کہانی لکھ دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ
میری پہلی فلم کی ہیروئن تمہاری کہانی کی حسینہ ریشماں
ہوگی۔ اسے وعدہ نہیں معاہدہ سمجھو ـــ!"

شہاب کے خط نے میری روح کے بوجھ کو جیسے
ہلکا کر دیا۔ نسرین سے جدائی کے بعد یہ میری زندگی کی پہلی
کامیابی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر آسانی
سے ریشماں ہیروئن بن جائے گی۔ میں نے شہاب کا
خط سیاہ فام منظور احمد کے حوالے کر دیا۔ خط پڑھ کر وہ ایکدم
چہک گیا۔ پھر وفورِ مسرت سے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
لے کر زور سے دباتے ہوئے کہا۔

"شکریہ اشفاق صاحب! آپ نے ہمیں ڈوبنے سے بچا
لیا۔ آپ کا احسان ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔" وہ رک
کر بولا۔ "یہ خوشخبری آپ خود چل کر اسے دے دیجئے
وہ شاید میری بات کا یقین نہ کرے گی!"

اس شام جب میں ریشماں سے ملنے گیا تو نیلی روشنی
میں ڈوبے ہوئے دیوانخانے میں وہ جیسے میری منتظر ہی تھی
سیاہ خانے دار زرد ریشمی ساڑی اور سیاہ بلاؤز میں اس
کے حسن کا شعلہ بڑی تیز لو میں جل رہا تھا۔ اس کا
پژمردہ سا سوگوار چہرہ کسی تازہ گلاب کی طرح شاداب
تھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی اداسی میں خوشی کا
رنگ چمک اٹھا تھا۔

"میں نے شہاب صاحب کا خط پڑھ لیا ہے"۔ وہ
مسرور آواز میں بولی "یہ سب آپ کی بدولت ہوا ہے۔ ورنہ
ان حالات میں مجھے ایسا موقع کہاں مل سکتا تھا۔؟"

"میں نے کیا کیا ہے"۔ میں نے تکلف برتتے ہوئے
کہا۔ "تم واقعی اس قابل ہو ریشماں۔ تم میں یقیناً عمدہ
صلاحیتیں ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں دیر سے سہی بہت
اچھا موقع مل رہا ہے۔"

"میں بہت مایوس ہو چکی تھی۔ انتظار۔ جان لیوا انتظار۔
ہر جگہ ہر کوشش میں ناکامی"۔ وہ گہری آواز میں کہنے لگی۔
"کالج آف فلمز میں میرے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں اب
مشہور اسٹار بن چکی ہیں۔ ایک میں تھی جو بیکار پڑے
پڑے سڑ رہی تھی۔ آپ اگر نہیں ملتے تو جانے میرا کیا حشر ہوتا۔"

"اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔ میں نے پرسکون
لہجے میں کہا۔ "شہاب کی فلم یقیناً بہت عمدہ فلم ہوگی"۔

"پھر کلر فلم ہے۔ کاسٹ میں دوسرے تمام بڑے اداکار
ہوں گے"۔ منظور احمد جلدی سے بولا۔ "باکس آفس پر یقیناً
یہ فلم ہٹ ہوگی"۔

"ہر کام وقت پر ہوتا ہے"۔ میں نے آہستہ سے کہا۔
"انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے"۔

"لیکن ابھی تو آپ کو کہانی لکھنی ہے"۔ وہ ایکدم فکرمند
ہو گئی۔

"ہاں۔ اصل کام تو آپ کا ہے"۔ منظور احمد ہکلا کر بولا
"کہانی کے بعد ہی دوسرے کام ہوں گے"۔

"آپ کہانی کب تک لکھ سکیں گے؟" وہ بیقراری سے
پوچھنے لگی تو میں چونک گیا۔

"کہانی؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں مجھے وقت
لگے گا۔ کہانی کے لئے مجھے خود کو تیار کرنا پڑے گا۔ میرے
جذبۂ تخلیق پر عرصے سے گرد سی جمی ہوئی ہے"۔ میں
نے آہستہ سے کہا۔ تم اگر ساتھ دو تو شاید یہ گرد

صاف ہو جائے اور میں جلد کہانی لکھ سکوں۔"

"میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "فرمائیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"اداکاری ــــ!" میں نے کہا۔

"اداکاری؟"

"ہاں۔ اداکاری۔" میں نے خیالوں میں کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ "میرے ذہن میں ایک کہانی ہے ایک سچی اور حقیقی کہانی۔ اس کہانی کا ایک کردار میں خود ہوں۔ کہانی کے مقامات بھی موجود ہیں۔ کہانی کی ہیروئن البتہ نہیں ہے۔ تم اگر ساتھ دو تو لکھنے سے پہلے میں اس کہانی کو اپنے ذہن کے اسکرین پر آسانی سے دیکھ سکوں گا۔"

"فلمی کہانی کے لکھنے سے پہلے کہانی نویس اُسے اپنی نظروں سے دیکھ لیتا ہے۔ پوری فلم اس کے ذہن کے پردے پر اُبھر آتی ہے تب کہیں جا کر وہ کہانی لکھ سکتا ہے۔" منظور احمد نے فلمی کہانی کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اشفاق صاحب، ریشماں آپ کا ساتھ دے گی۔"

"اس کے لئے انہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔ "اس جگہ چلنا ہوگا جہاں اس حقیقی کہانی کا آغاز ہوا ــ اور ــ جہاں وہ کہانی کھو گئی۔"

"مجھے کہاں چلنا ہوگا؟" وہ جلدی سے بولی۔ "فرمائیے کہاں چلنا ہوگا؟"

"یہاں سے کوئی بیس بائیس میل دُور سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے دامن میں ایک خوبصورت سی جھیل ہے۔ جھیل کے کنارے ایک خوبصورت سا ڈاک بنگلہ ہے۔ ڈاک ــــ بنگلے کے اِرد گرد گھنے قد آور درخت ایستادہ ہیں۔ جگہ جگہ چٹانیں بکھری ہوئی ہیں۔ قدم قدم پر سبزے کا فرش بچھا ہے۔ خودرَو پودوں اور جھاڑیوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ نیلم پلی میرے خوابوں کی جنت ہے، میں اس کہانی کو وہیں مکمل کرنا چاہتا ہوں!"

"تو وہ ایک پہاڑی مقام ہے۔" وہ خوابناک لہجے میں بولی۔ "مجھے بلندیوں سے پیار ہے پہاڑوں سے عشق ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی اشفاق صاحب کل رات میں نے ایک بڑا ہی عجیب خواب دیکھا۔ ایک پہاڑی مقام ہے۔ میں ایک ایسی چٹان پر کھڑی ہوں جو زمین اور آسمان کے درمیان معلق سی دکھائی دیتی ہے۔ میں اس بلند چٹان پر اکیلی کھڑی ہوں۔ تیز و تند ہواؤں کے جھونکے چل رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا تیز طوفانی ہو جاتی ہے۔ میں لڑکھڑانے لگتی ہوں کہ اچانک ایک نوجوان کہیں سے نمودار ہوتا ہے۔ اور مجھے تھام لیتا ہے۔ میں اپنے محُسن کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ آنکھ کھل جاتی ہے۔"

"تم نے اس چٹان کو خواب میں دیکھا خود کو اس چٹان پر موجود پایا۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ حیرت اور اضطراب سے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ "تم شاید یقین نہ کرو گی۔ نیلم پلی میں ایک بالکل ایسی ہی چٹان واقعی موجود ہے جو نیچے سے دیکھنے والوں کو زمین اور آسمان کے درمیان معلق دکھائی دیتی ہے۔"

"سچ؟" وہ حیرت سے بولی۔ "پھر تو میں ضرور چلوں گی فرمائیے کب چلیں گے؟"

"جب بھی آپ لوگ چاہیں۔" میں نے سنبھل کر سیاہ فام منظور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "فرمائیے جناب آپ کو کب فرصت ہے؟"

"میرا آنا کیا بہت ضروری ہے؟" وہ بوکھلا کر کہنے لگا "مجھے بچوں کے اسکول اور کالج کی فیس کا بندوبست کرنا ہے اور دو چار کام اور بھی ہیں۔ آپ اور ریشماں چلے جائیں۔" وہ رُک کر بولا۔ "مجھے آپ پر بھروسہ ہے اشفاق صاحب۔ آپ ریشماں کو اپنے ساتھ لے جائیے اور کہانی کو جلد سے جلد مکمل کر دیجئے۔"

"تو پھر کب چلیں گے اشفاق صاحب؟" وہ بے قرار آواز میں بولی۔ "ابا تو نہیں آسکتے اور مجھے تو فرصت ہی فرصت ہے۔"

"مجھے بھی فرصت ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ہم کل صبح ہی چلے جائیں گے۔"

"کل صبح؟"

"ہاں میں کل صبح ٹھیک آٹھ بجے کیفے امروز پہنچ جاؤنگا آپ لوگ بھی وہیں آجائیں تو بہتر ہے۔"

"ہم آجائیں گے۔" منظور احمد نے کہا۔ "ہم آپ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"کیفے امروز؟" ریشماں کے خوبصورت چہرے پر ایک اُلجھن سی اُبھری اور بڑی بڑی اُداس اُودانی آنکھوں میں ایک سوال مچل اُٹھا جس کا جواب میں نہیں دے سکتا تھا۔"

•

نیلم پلی کے تصور ہی سے میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میرے خوابوں کا ایک ڈوبا ہوا جزیرہ، یادوں کا ایک حسین تاج محل۔ ایک خوبصورت مقبرہ جس میں خیالوں کی ایک جنت دفن تھی۔ گذشتہ چھ سال کے عرصے میں بارہا مجھے نیلم پلی کی یاد آئی لیکن وہاں جانے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ میں ان فضاؤں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ ان نظاروں کو دوبارہ دیکھنے کی مجھ میں سکت نہیں تھی۔ دل میں اتنی طاقت تھی نہ ہی نظر میں تابِ نظارہ کہ میں نیلم پلی جا سکتا ——— اور اب برسوں بعد میں نیلم پلی جا رہا تھا۔ یادوں کے اس حسین مقبرے کا در وا ہو رہا تھا۔ محبت کا مزار شق ہونے والا تھا۔ قیامت آنے والی تھی۔ دیدارِ یار عام ہونے والا تھا۔ وہ رات لمبی اور اندھیری رات تھی۔ وحشت اور غم سے میری حالت ابتر تھی۔ شدتِ احساس سے دم گھٹ رہا تھا۔ دل کچھ اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے اچانک رُک جائے گا۔ برسوں پہلے جب بھی میں نیلم پلی گیا نسرین میرے ساتھ ہوتی تھی اور اب ریشماں میرے ساتھ ہوگی۔ کیا وہ نسرین کی کمی محسوس ہونے نہیں دے گی؟ کیا ریشماں وہی ہے؟ اور اگر نہیں تو اس کی آنکھوں کی اُداسی اور لبوں کی جنبش اُس سے اس قدر مشابہ کیوں ہے؟ مجھے وہ کیوں اجنبی اور غیر محسوس نہیں لگتی؟ وہی انداز، وہی آواز، وہی آزادی پسند محبت بھری رُوح۔ ویسے ہی حالات اور وہی مجبوریاں ——— کیا ریشماں نسرین کا بدلا ہوا رُوپ ہے؟ اور اگر نہیں تو اس نے وہ خواب کیوں دیکھا۔ خواب میں اپنے آپ کو اس چٹان پر کیسے موجود پایا؟ اس جگہ کا ریشماں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ میں اسے محض ایک اتفاق نہیں سمجھ سکتا۔ یقیناً وہ ایک بھٹکی ہوئی بے چین رُوح ریشماں کے قالب میں حلول کر گئی ہے۔ رات بھر میں بے چین اور بے خواب رہا۔

صبح بستر سے اُٹھتے ہی میں نے سُوٹ کیس میں ایک دو جوڑے رکھ لئے۔ رائٹنگ پیڈ اور دو تین کتابیں رکھ لیں۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ رگوں میں خون کا بھونچال سا اُبھر آیا تھا۔ دل و دماغ کی حالت کچھ اتنی ابتر تھی کہ میں نے سُوٹ کیس میں رَم کی وہ بوتلیں بھی رکھ لیں۔ میں عادی شرابی نہیں ہوں۔ سُنا تھا کہ شراب سے غم بہلتا ہے، مجھے یاد نہیں رَم کی وہ بوتلیں میں نے کب خریدی تھیں۔ ایک عرصے سے وہ الماری میں دھری پڑی تھیں۔ شراب کا خیال مجھے اس لئے بھی آیا کہ ریشماں کو میں نے نارنجی کا سے نشے کے عالم میں اُترتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک گونہ بیخودی لمحاتی خود فراموشی کے لئے، ذہنی سکون کے لئے شاید یہ سامان بہت کافی تھا ———!

کیفے امروز پر ریشماں اپنے سیاہ فام ادھیڑ عمر کے باپ کے ساتھ میرا انتظار کر رہی تھی۔ سیاہ لباس میں وہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ پُرکشش اور پُروقار دکھائی دے رہی تھی۔ ٹیکسی میں سامان رکھ کر پچھلی نشست پر وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ میرے اور اس کے درمیان چند مصوّر فلمی رسالے تھے اور ایک خوبصورت سا چرمی پرس۔ مہین خوشبو کی لپٹیں اس کے جسم سے اُبھر رہی تھیں۔ کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے اُس کے ادھیڑ عمر سیاہ فام باپ نے مسرور آواز میں کہا۔ "خدا حافظ!"

"خدا حافظ!" میں نے چونک کر کہا اور ایک جھٹکے سے ٹیکسی سڑک پر بڑھ گئی۔

راستہ بھر ریشماں نے دو چار رسمی جملوں کے سوا کچھ نہیں کہا۔ راستہ بھر میں نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ میں اپنے دل و دماغ پر قابو پانے کی سعی کرتا رہا اور

ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی شہر کے حدود سے نکل کر سیاہ تارکول کی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ نیلم پلی قریب آ رہا تھا۔ یادوں کے شعلوں میں گھرا ہوا میں خود کو نیلم پلی کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر رہا تھا۔

سرمئی غبار میں ڈوبی ہوئی نیلم پلی کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت پہاڑیاں، سرسبز و شاداب نظارے، جابجا بکھری ہوئی چٹانیں کسی خوبصورت منظر کی طرح نگاہوں کے آگے اُبھرنے لگے تو میں بے چین ہو گیا۔ آدھی سیاہ اور آدھی زرد ٹیکسی پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی دُور تک چلی جانے والی سیاہ تارکول کی سڑک پر پوری رفتار سے دوڑتی ہوئی سڑک کی دائیں طرف مُڑی اور آم اور املی کے گھنے قدآور درختوں کی قطاروں میں سے گذرتی ہوئی اٹھارہویں صدی کے کلیساؤں کی طرز میں بنے ہوئے ڈاک بنگلے کے برآمدے کے آگے پہنچ کر رُک گئی۔ ہارن کی آواز سن کر ڈاک بنگلے کا بوڑھا چوکیدار کریم اللہ خاں اپنی مخصوص لنگڑاتی ہوئی چال چلتا ہوا باہر نکل آیا اور مجھے دیکھتے ہی حیرت سے چیخ اٹھا۔

"سرکار آپ؟"

میں ٹیکسی سے اُترتا ہوا بولا۔ "تم نے مجھے پہچان لیا کریم اللہ خاں، اچھے تو ہو؟"

"دُعا ہے سرکار ۔۔۔ جی رہا ہوں۔" اُس کی بوڑھی آنکھیں ٹیکسی میں ریشاں کو دیکھ کر جیسے حیران ہو رہی تھیں۔ ان نگاہوں میں بے چین سے سوال بھی تھے۔ وہ کہاں ہے۔ کیوں نہیں آئی اور یہ لڑکی کون ہے۔ لیکن اس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور خاموشی سے ٹیکسی کی طرف بڑھ کر سامان اُتارنے لگا۔

"آج پورے چھ سال بعد یہاں آیا ہوں۔" میں نے ریشاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہاں کا ہر منظر بالکل ویسا ہی ہے۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ نیلم پلی بالکل وہی ہے"

"واقعی بڑا خوبصورت مقام ہے!"۔ ریشاں حیرت اور مسرت بھری نظروں سے ماحول اور منظر کا نظارہ کرتی ہوئی بولی۔ "میرے تصوّر سے بھی زیادہ حسین!"

کریم اللہ خاں سامان لے کر چلا گیا تو میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور پھر ریشاں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈاک بنگلے کے برآمدے میں پہنچ گیا۔

بیرونی برآمدے کا دروازہ ایک مستطیل وضع سے وسیع و عریض سے بند ہال میں کھلتا تھا جس کے آخری حصے میں شیشم کا بنا ہوا پرانی وضع کا خوبصورت سا ڈائننگ ٹیبل اسی طرح بچھا ہوا تھا۔ ٹیبل کے گرد دو چار کُرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سفید سُوتی ٹیبل کور پر ایک بڑا سا گلدان رکھا ہوا تھا جس میں گلاب اور موگرے کے پھول مہک رہے تھے۔ بند ہال میں دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ جانب مشرق ڈاک بنگلے کے عقبی برآمدے میں کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ ایک مربع شکل کے کشادہ بیڈ رُوم کا تھا۔ بیڈ روم میں مغربی سمت کی طرف پلنگ پر سفید بستر بچھا ہوا تھا۔ جانب شمال ایک خوبصورت سا ڈریسنگ ٹیبل تھا اور ڈریسنگ ٹیبل سے متصل ایک سلاخ دار کھڑکی تھی جو باہر کی طرف کھلتی تھی بیڈ رُوم کے ساتھ ہی باتھ رُوم ملحق تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل اور کھلی کھڑکی کے آگے دو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ڈاک بنگلہ کا ماحول وہی تھا۔ سب کچھ وہی تھا۔ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا تو مجھے اس میں ایک مانوس سی خوشبو رچی ہوئی محسوس ہوئی۔ غم سے میرا دل ڈوب رہا تھا۔ تھکا تھکا سا نڈھال میں بند ہال میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ کریم اللہ خاں روایتی انداز میں میرے آگے مؤدب سا کھڑا تھا۔ میں نے اسے دس دس کے چند نوٹ تھما دیئے، اور دوپہر اور رات کے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ ریشاں مُنہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو گئی تھی۔ دوپہر کے کھانے تک ہم دونوں بند ہال میں بیٹھے رہے۔ میں پے در پے سگریٹ پیتا رہا۔ اور وہ کسی مصوّر رسالے کی ورق گردانی کرتی رہی۔ در و دیوار پر ایک حسرت سی برس رہی تھی۔ ماحول پر ایک جلتی ہوئی سی سوگواری مسلط تھی۔ میں ایک انگارے

کی طرح بار بار دہک رہا تھا۔ بار بار بجھ رہا تھا۔ بجھتے انگاروں کی سنسناہٹ میرے وجود کے ویرانے میں گونج رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر ہم نے آرام کیا۔ پھر باہر گھومنے نکل گئے۔ ریشماں نے نیلا شرٹ اور شلوار پہن لیا تھا۔ شانوں پر سفید جالیدار دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ نیلے لباس میں وہ یوں لگ رہی تھی جیسے جھیل کے نیلے پانی میں کھلا ہوا کوئی کنول۔ یا آسمان کی نیلاہٹوں میں چمکنے والا کوئی ستارہ۔ اس کا وجود ایک نورانی غبار کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ لطیف۔ شبنمی۔ پگھلتا ہوا۔ تر و تازہ اور شاداب۔ دھواں دھواں سے پس منظر میں اُس کا جسم یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دُھندلے آئینے میں کوئی روشن عکس۔ اس کے چہرے کے نقوش دُھندلا سے گئے تھے۔

ڈاک بنگلے سے باہر ہرے بھرے میدانوں میں چلتے ہوئے بار بار اس کا دُوپٹہ فضا میں لہرا جاتا تو محسوس ہوتا جیسے ریشماں نہیں، وہ میرے ساتھ چل رہی ہو۔ پرانے مانوس راستوں پر کسی کے مٹے مٹے سے نقشِ قدم ستاروں کی طرح جگمگانے لگے۔ فضا میں سانسوں کی حدت بھی تھی اور کسی کی آواز کا ترنم بھی۔ ماضی لوٹ آیا تھا۔ کچے راستوں پر سے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلتے ہوئے بارہا مجھے خیال آیا کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں دل اسی انداز میں دھڑک رہا تھا۔ سوز و گداز اور گداخت کا عالم وہی تھا۔ جذبات اور احساسات کا رنگ وہی تھا۔ چھوٹے سے اسٹیشن پر مختصر سا ٹی۔ اسٹال اب بھی اسی جگہ موجود تھا۔ ٹی۔ اسٹال پر کام کرنے والے بچے بڑے ہو گئے تھے لیکن ان کی نگاہوں میں میرے لئے کوئی اجنبیت نہیں تھی۔ ٹی۔ اسٹال پر ہم دونوں نے چائے پی۔ کچھ دیر پلیٹ فارم پر چہل قدمی کی۔ ریلوے اسٹیشن پر سے کوئی ڈیڑھ دو میل دُور نیلم پلی کی مختصر سی آبادی تھی۔ سرسبز و شاداب درختوں سے گھری ہوئی چھوٹی سی خاموش بستی۔ مشرق میں کوئی دو چار فرلانگ کے فاصلے پر ڈاک بنگلہ تھا۔ سرسبز و شاداب سرمئی پہاڑیوں کے دامن میں کسی قدیم طرز کے بنے ہوئے کلیسا کی شکل کا ڈاک بنگلہ — درمیان میں سرسبز و شاداب میدان تھے۔ اسٹیشن سے واپسی میں ہم ڈاک بنگلے کے عقب میں واقع جھیل کی طرف چلے گئے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور چٹانوں سے محصور پُرسکون سی جھیل میں کھلے نیلگوں آسمان کا عکس جما ہوا تھا۔ کناروں پر چند خودرَو جھاڑیاں تھیں جن پر سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ جھیل میں ایک طرف سبز پتّوں پر سُرخ کنول کے پھول سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اوپر صاف بے ابر آسمان ڈھلتے سورج کی کرنوں سے روشن تھا۔ ایک آسمان اوپر تھا۔ ایک آسمان جھیل میں تھا۔ نیلے روشن ماحول میں نیلے لباس میں ملبوس ریشماں منظر کا ایک خوبصورت جُزو بن گئی تھی۔ فضا خنک اور خوشگوار تھی۔ ماحول پر ایک رومانی خاموشی چھائی ہوئی تھی — ایک پُرسکون سا سکوت۔ دلربا سی تنہائی۔ وہ بہت خوش تھی اور حیرت اور معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ جھیل بہت گہری تو نہیں ہوگی؟"

"ہاں۔ اس سے گہری تو کسی کی آنکھیں تھیں جن میں ڈوب کر میں آج تک اُبھر نہ سکا۔" میں بے خیالی میں کہہ گیا۔ پھر جیسے سنبھل کر بولا "ہاں۔ یہ جھیل کافی گہری ہے!"

"اِن پہاڑیوں میں جنگلی جانور بھی ہوں گے۔"

"ہرن اور خرگوش بہت ہیں۔ شام ہوتے ہی میدانوں میں اُتر آتے ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "انگریزوں کے زمانے میں یہ ایک شکار گاہ تھی۔"

"وہ دیکھئے۔ اُف۔ کس قدر خوبصورت ہرن ہے۔" وہ مسرور آواز میں کہہ اُٹھی۔

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے پہاڑیوں کے دامن میں دیکھا جہاں ایک ہرن چر رہا تھا اور چرتے ہوئے بار بار پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔

"کہیں آس پاس ہی اس کے ساتھی بھی ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "جانور تک تنہا نہیں رہتے۔"

"لیکن انسان ہمیشہ تنہا رہتا ہے۔" وہ ایکدم اُداس ہو گئی۔ "تنہا پیدا ہوتا ہے۔ بھری دنیا میں اکیلا رہتا ہے اور تنہا مر جاتا ہے۔"

"زندگی بھر امن و آسودگی کے خواب دیکھتا ہے۔ خوشی کے لئے ترستا ہے۔ رفاقت کے لئے تڑپتا ہے اور بالآخر مرجاتا ہے۔ تنہا، اکیلا، تشنہ لب اور تشنہ کام۔!" میں نے افسردگی سے کہا۔ "کوئی بھی کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہاں بالکل اسی جگہ ــــ کبھی کسی نے عمر بھر ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وعدہ رہ گیا۔ ساتھ چھوٹ گیا۔"

"جی ــــ!" وہ گہری ہمدردی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

دُور پہاڑیوں میں ڈوبتے سورج کی آگ بھڑک اُٹھی تھی منظر پر شعلوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ زمین اور آسمان رنگین ہوگئے تھے۔ نیلے لباس میں ریشماں کا سارا وجود سُرخ ہو رہا تھا۔

"کتنی حسین شام ہے۔ کس قدر رنگین نظارہ!ــ" وہ پُرسوز سی آواز میں بولی۔

"اور کتنی اُداس کتنی اکیلی تنہا اور سوگوار ــــ یاد کے شعلوں میں جلتی ہوئی یہ شام۔" میں نے حسرت سے کہا "اب چلو ریشماں، مجھ میں تابِ نظارہ نہیں ہے۔"

وہ اُلجھی اُلجھی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور خاموشی سے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی ــــ!

●

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم ڈاک بنگلے کے عقبی برآمدے میں آ بیٹھے۔ رات چاندنی تھی۔ اندر بند ہال میں مرکیوری ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ برآمدے میں ہلکا سبز بلب روشن تھا۔ اوائل برسات کی خنک خوشگوار چاندنی منظر اور ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ برآمدے سے آگے سرسبز و شاداب میدان میں آم اور املی کے درخت چاندنی میں نہائے ہوئے کھڑے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر جھیل کا پانی تھا جس کی سطح پر چاندنی چمک رہی تھی۔ سرمئی پہاڑیوں میں سیاہ پتھر کی چٹانوں پر چاندنی کا غبار اُڑ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے سست خرام جھونکے مستی بھری پُرسوز روشن فضاؤں میں سرسرا رہے تھے۔ دل میں ایک آتش خاموش بھڑک اٹھی تھی۔

میں نے چوکیدار کو شراب لانے کے لئے کہا تو وہ چونک گئی۔

"شراب؟" وہ حیرت اور خوف سے بولی۔ "آپ پیتے بھی ہیں؟"

میرے جواب دینے سے پہلے کریم اللہ خاں نے ایک مشاق بار بوائے کی طرح میز پر رم اور سوڈے کی بوتلیں، دو خالی جام، تندوری مُرغ، چپس اور نمکین کاجو کی پلیٹیں جما دیں۔ میں نے اشارہ کیا تو وہ مودّب انداز میں چلا گیا۔

"کریم اللہ خاں انگریزوں کے وقت کا آدمی ہے۔ وہ مجلسی آداب سے خوب واقف ہے۔ بہت اچھا خانساماں بھی ہے مگر اب صرف ایک چوکیدار رہ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ساری چیزیں اس نے تیار کی ہیں۔"

"لیکن یہ شراب؟" وہ بے چینی سے بولی۔

"ہاں یہ شراب ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میں عادی شرابی نہیں ہوں۔ کبھی کبھی ضرورتاً پی لیتا ہوں اور تم بھی تو پیتی ہو۔"

"جی ــــ ہیں؟" وہ بوکھلا گئی۔

"میں جانتا ہوں۔" میں نے رم کا بوتل کھولتے ہوئے کہا۔ "تم بھی پیتی ہو۔ اب انکار مت کرو۔ مجھ سے مت چھپاؤ۔ کم از کم آج کی رات مجھ سے پردہ داری مت کرو ورنہ مجھے غم رہے گا۔ تم شاید میرے غم کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ سمجھ لو۔ مجھے بہت دکھ ہوگا۔ بہت زیادہ۔"

"ٹھیک ہے میں پی لوں گی۔" وہ جلدی سے بولی۔ "ہاں میں شراب پیتی رہی ہوں۔ اب بھی پی لوں گی۔"

"تو پھر جام تیار کرو۔" میں نے اس کے لہجے کی اداسی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم واقعی بہت اچھی ہو۔"

اس نے رم میں سوڈا ملایا۔ دو جام تیار کئے۔ ایک میری طرف بڑھایا اور دوسرا جام اپنے ہاتھ میں اٹھا کر اسے میرے جام سے ٹکراتی ہوئی بولی۔ "دل کی زندگی کے لئے!"

میں دھیرے سے مسکرا دیا۔

رم کا پہلا جام بے اثر ثابت ہوا۔ دوسرے جام

سے ہلکا سا سرور آیا تھا۔ تیسرے جام نے رنگ جما دیا۔ روح پر چھائے ہوئے تاریک سائے چھٹ گئے۔ احساس کے بال و پر کھل گئے۔ کیف و مستی، بے خودی اور سرشاری۔ نور و لطافت کا خوابناک عالم۔ سوز و گداز کی ایک جنت میرے دل میں جیسے آباد ہو رہی تھی۔ آنکھ شرابی، گال گلابی، سایۂ چشم میں جمالِ یار کا عکس شرابی۔ موسم بہکا ہوا۔ چاندنی کی چمک اور بڑھ گئی۔ کائنات جھوم جھوم گئی اور دل کے سیاہ خانے میں یادوں کے چراغ جل اٹھے۔ تیسرے جام کے بعد وہ نشیلی آواز میں کہہ اٹھی۔

"میں بہت اداس تھی۔ آپ سے خوف زدہ بھی تھی۔ اپنے آپ سے متنفر ہو رہی تھی۔ لیکن اب بہت بہتر ہوں۔ دل پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ گھٹن اور حبس کا احساس اب نہیں ہوتا۔ بالکل نہیں۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یہ منظر۔ یہ موسم۔ اور آپ کی قربت۔ بلکہ رفاقت۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ بہت عظیم انسان ... بہت عظیم افسانہ نگار ۔۔۔!

"تمہیں نشہ ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" کہتے ہوئے اس نے ایک جام اور بنایا اور ایک بڑا سا گھونٹ نگلتی ہوئی بولی۔

"ہاں تو آپ کی کہانی کیا ہے؟"

"میری کہانی؟"

وہی کہانی ۔۔۔ فلمی کہانی جو آپ شہاب صاحب کے لئے لکھنا چاہتے ہیں۔" وہ مخمور سی آواز میں بولی۔ "وہ کہانی اسی جگہ سے متعلق ہے نا؟"

"وہ کہانی ۔۔۔؟" میں نے درد بھری آواز میں آہستہ سے کہا۔ "ہاں یہی وہ جگہ تھی۔ یہی فضا تھی۔ یہیں پر ہم دونوں ملے تھے۔ عجیب زمانہ تھا وہ۔ ناقابلِ یقین۔ ناقابلِ فراموش!" میں نے لہجہ بدل کر کہا۔ "فرض کر لو، بلکہ مان لو اور یقین کر لو کہ تم ریشماں نہیں ہو۔ بھول جاؤ۔ اپنا وجود مستعار دے دو۔ ایک روح اِن فضاؤں میں بھٹک رہی ہے، بے جسم۔ بے نام۔ تم اسے اپنا جسم دے دو تو میں اسے نام دوں گا ۔۔۔ نسرین۔ ہاں سمجھو کہ تم اس وقت نسرین ہو!"

"ٹھیک ہے، مجھے یہ فن آتا ہے۔ میرا فن بھی تو یہی ہے۔" وہ بہکی بہکی آواز میں بولی۔ "ہاں کہو۔ سناؤ۔"

"تو سنو تمہارا نام نسرین ہے۔" میں جذباتی لہجے میں کہنے لگا۔ "تم نے شہر کے ایک مشہور جاگیردار گھرانے میں جنم لیا ہے۔ تمہاری ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ تمہارے بابا نے دوسری شادی کر لی ہے اور تم سے غافل اور بے پروا ہو گئے ہیں۔ تمہارے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ بہت چھوٹے بہت معصوم۔ تم ان معصوم بچوں کی ماں بھی ہو اور باپ بھی۔ تم کبھی بہت دولت مند تھیں مگر اب بہت غریب ہو۔ زمانہ بدل گیا۔ جاگیریں چلی گئیں۔ سونے چاندی کی بہتی ہوئی نہریں خشک ہو گئیں۔ تمہارے بابا کی گذر بسر مکانوں سے ہر ماہ وصول ہونے والے کرایے پر ہوتی ہے۔ وہ تمہاری کچھ بھی مدد نہیں کر سکتے۔ تم نے بڑی مشکل سے گریجویشن کیا ہے اور ملازمت کے لئے سرگرداں ہو۔ تمہیں کام چاہیئے آمدنی چاہیئے اپنی زندگی کے لئے، اپنے بھائی بہنوں کے مستقبل کے لئے۔ لیکن گرانی اور بے روزگاری کے اس تاریک دور میں نوکری کہاں ملتی ہے جو تمہیں ملتی۔ ان گنت نوجوانوں کی طرح تم بھی فکرِ معاش کے شعلوں میں جل رہی ہو۔ تم بہت حسین ہو، بہت جوان ہو۔ اس لئے دنیا میں تمہارے بہت سے ہمدرد اور مہربان پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہوس باصد مکر و فن تمہاری طرف بڑھتی ہے۔"

"میں جو حسین ہوں، جوان ہوں، معصوم اور نادان ہوں، بہت آزاد رہنا چاہتی ہوں۔" وہ کراہ کر بولی۔ "میں شہد کی نازک سی مکھی ۔۔۔ جال میں پھنس جاتی ہوں، مکھی اور مکڑے کی کہانی بہت پرانی کہانی ہے۔"

"ہاں تمہارے پرستاروں میں سرِفہرست امجد کا نام آتا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "امجد تمہارا خالہ زاد بھائی ہے۔ بچپن کا ساتھی ہے اور تمہارا منگیتر بھی ہے۔ تم امجد سے محبت کرتی ہو اور ساتھ ہی نریش کے لئے بھی تمہارے دل میں جگہ ہے۔ نریش جو تمہارے کالج کا ساتھی ہے۔"

"نرلیش؟" ریشماں کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی "کہیں یہ وہ تو نہیں، وہی مہیش۔ کالج آف فلمز میں فوٹوگرافی کا طالب علم۔ گلیمر۔ لوا سے۔ اُداس خوبصورت لڑکا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ ہندو تھا اور میں مسلمان۔ میں کیسے اس سے محبت کر سکتی تھی۔"

میں بُری طرح چونک گیا۔ تو ریشماں کی زندگی میں بھی کوئی مہیش ہے۔ نسرین کے نرلیش کی طرح۔ کتنی ملتی جلتی کہانی ہے۔ ریشماں۔ تم آخر نسرین سے اتنی ملتی جلتی کیوں ہو؟۔

"محبت کے لئے ابھی ماحول سازگار نہیں۔ قلب و نظر پر یہاں سنگین پہرے ہیں۔ رُوح پر قید مسلط ہے۔ تنگ نظر، تنگ دل، خودغرض مطلبی دنیا محبت کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ ہاں۔ میں مہیش سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور میں اس سے تو کیا کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتی تھی۔ محبت کے سوا مجھے اور بھی بہت سے غم تھے۔ دنیا میں بہت سے کام تھے۔ میری دنیا۔ میری ذمہ داریاں۔ میرے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی زندگی اور مستقبل ـــ اور میرا فن ـــ میری زندگی ـــ میں نے کہا نا؟ میں ہمیشہ مجبور رہی ہوں۔ بہت مجبور۔" وہ گہری اُداسی سے بولی۔ "مہیش مجھ سے بدگمان ہو گیا۔ مجھ سے بچھڑ گیا اور مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ نہ دل ڈوبا، نہ آنکھ بھر آئی۔ ہاں اس سے بچھڑنے کے بعد جب بھی اس کا خیال آیا، ایک خلش سی دل میں ضرور اُبھر آئی۔ اور بس!"

"تم ریشماں نہیں، نسرین ہو۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ "تم نے نرلیش سے محبت کی ہے۔ امجد تمہارا منگیتر ہے۔ تم اُسے بھی چاہتی ہو۔ تم دونوں ہی سے محبت کرتی ہو۔ تم ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑ سکتیں۔ وہ دونوں ہی تمہارے لئے ناگزیر ہیں۔" میں نے جام میں بچی ہوئی شراب حلق میں اُنڈیلتے ہوئے کہا۔ "امجد مگر نرلیش کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ تم کو روکتا ہے۔ پابند کرنا چاہتا ہے اور اپنی کوشش میں ناکام ہو کر تم سے ترکِ تعلق کر لیتا ہے۔ تمہارا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ تم خودکشی کی کوشش کرتی ہو۔ نرلیش تمہیں بچا لیتا ہے۔" میں نے رُک کر کہا۔ "لیکن نرلیش دنیا سے ڈر جاتا ہے، رُسوائی کے خوف سے لرز جاتا ہے اور اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کر کے اپنے ماں باپ کی خوشی اور اپنے دھرم کی لاج رکھ لیتا ہے اور تم دنیا میں اکیلی اور تنہا رہ جاتی ہو۔"

میں نے ایک جام اور بنایا اور ایک چسکی لے کر آہستہ سے بولا۔ "تم چکرا جاتی ہو۔ جینا مشکل ہو جاتا ہے لیکن تم کو جینا ہی پڑتا ہے اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے لئے ـــ تم دیوانہ وار نوکری کی تلاش کرتی ہو۔ نوکری نہیں ملتی۔ کام نہیں ملتا۔ ایسے میں تم مجھ سے ملتی ہو۔ میں جو ایک بااثر، بارسوخ فن کار ہوں۔ تم تعاون اور مدد کے لئے میری طرف بڑھتی ہو اور میں تمہیں دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتا ہوں اس لئے کہ تم میرے خوابوں اور خیالوں کی ملکہ ہو۔ زندگی بھر میں تمہاری تلاش میں بے چین اور بے قرار رہا ہوں۔ میں جو ازل سے حُسن کا پرستار رہا ہوں، ابد تک تمہاری پرستش کا دعویٰ کرتا ہوں۔ بھول جاتا ہوں کہ میں ایک شادی شدہ بال بچوں والا آدمی ہوں۔ میری سماجی پوزیشن ہے۔ شخصی عزت ہے۔ شہرت اور ساکھ ہے۔ میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ احساس رہتا ہے کہ میں تسکین کے لئے ترستا رہا ہوں۔ ہمیشہ تشنہ کام اور محروم رہا ہوں اور تم میرے دل کی تسکین، رُوح کا قرار اور نظر کا اُجالا ہو۔ میں پانے اور کھونے کے خیال سے بے نیاز ہو کر تم سے محبت کرتا ہوں!"

"تم ـــ؟ تم کون ہو؟" ریشماں چونک کر کہنے لگی۔ "کیا نام ہے تمہارا؟" وہ حیران نگاہوں سے دیکھتی ہوئی پُرخمار آواز میں بولی۔ "تم وہی ہو۔ بالکل وہی ہو ـــ!"

"میں اشفاق ہوں۔ وہ اشفاق جو اب نہیں رہا۔ موم کی طرح پگھل گیا۔ کافور کی طرح جل گیا۔ معدوم ہو گیا۔ میرا نام اشفاق ہے اور تم نسرین ہو!"

"میرا نام ریشماں ہے اور تم نواب راحت ہو۔" وہ نشیلی آواز میں کہنے لگی۔ "تم حسن پرست ہو، پیدائشی عاشق مزاج ہو۔ میرے جنم جنم کے پرستار ہو۔ تم کالج آف فلمز میں مجھے ایک نظر دیکھ کر ہی مجھ پر مر مٹے ہو۔" وہ جیسے یاد کرتے ہوئے بولی۔ "تم خاندانی نواب ہو۔ ایک دولت مند جاگیردار گھرانے کی لڑکی کے شوہر ہو۔ تمہارے ننھے معصوم بچے بھی ہیں لیکن تم میرے بغیر ایک پل بھی جی نہیں سکتے۔ تم میری خاطر فلمساز بن جاتے ہو اور مجھے اپنی پہلی فلم میں ہیروئن کے رول کی پیشکش کرتے ہو۔ پانچ سال کے لئے معاہدہ کر کے مجھے پابند کر لیتے ہو کہ میں کسی دوسری جگہ کام نہیں کروں گی۔" وہ روہانسی ہو کر کہنے لگی۔ "میں نے اپنی عمر کے پانچ سال فروخت کر دیئے۔ تم بہت اچھے خریدار ثابت ہوتے ہو۔ خوبصورت ماحول، عمدہ لباس، بہترین غذا، سیر و تفریح، کلب، کیبرے اور بار ۔۔۔ تم مجھے عیش و آرام کی زندگی بخش دیتے ہو۔ کسی الف لیلوی شہزادے کی طرح میری اور میرے گھر والوں کی پرورش کرتے ہو۔ میری خاطر۔ میری محبت میں ۔"

"میں شہزادہ کبھی نہیں رہا۔ دولت کی تمنا کبھی نہیں رہی مجھے۔ تم بھول رہی ہو۔" میں نے بے قرار ہو کر کہا۔ "تم اس وقت نسرین ہو اور میرا نام اشفاق ہے۔"

"تم نواب راحت ہو۔ تمہاری نارنجی کار شہر بھر میں مشہور ہے۔ میں تمہارے ساتھ نئے ماڈل کی اس شاندار کار میں اتراتی ہوئی سی پھرتی ہوں، مغرور، مغرور سی نازاں ۔۔۔ تمہاری فلم کی ہیروئن۔ تمہارے دل کی ملکہ۔" وہ رو دینے کے سے انداز میں بولی۔ "پانچ سال تک تم فلمسازی کی باتیں کرتے ہوئے فلم نہیں بناتے۔ مجھے تمہاری دولت سے مطلب ہے نہ عیش و آرام کی زندگی سے۔ میری روح پیاسی ہے۔ میں فلم میں کام کرنے کے لئے بے قرار ہوں اور تم مجھے یقین دلاتے ہو مجھے خواب دکھاتے ہو اور میں خواب دیکھتی جاتی ہوں۔"

"تم کو بہت زیادہ نشہ ہو گیا ہے۔" میں نے جھلا کر کہا "تم بھول رہی ہو کہ میں اشفاق ہوں اور تم نسرین۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ خفت سے بولی۔ "ہاں میں نسرین ہوں اور تم اشفاق۔ ایک مشہور اور با اثر فن کار۔ ایک شادی شدہ انسان، جو مجھ سے بڑی عظیم، بے مثال، ناقابل بیان محبت کرتے ہو۔"

"ہاں میں اشفاق ہوں اور نسرین کے ساتھ پہلی بار تیلم پلی آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اسی جگہ۔ یہیں۔ اس ڈاک بنگلے میں سر شام نسرین کے ساتھ پہنچا ہوں۔ ادھیڑ عمر کے چوکیدار کو رات کے کھانے کا آرڈر دے کر کمرے میں نسرین کے ساتھ اسی برآمدے میں بیٹھا ہوا ہوں اور اسے مستقبل کے خواب دے رہا ہوں۔ کسی سرکاری دفتر میں کوئی خوبصورت سا عہدہ۔ یا پھر لاکھوں کے سرمایے سے قائم ہونے والا پریس اور پبلشنگ ہاؤس جس کی تنہا مالک وہ ہو گی۔"

"میں نسرین ہوں۔ ہے نا؟" وہ مخمور سی آواز میں بولی "ہاں تو کہو، پھر کیا ہوتا ہے۔"

"رات کے کھانے کے بعد ہم دیر تک ڈاک بنگلے کے بند ہال میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے ہیں۔ میں اپنی محرومی، نارسائی اور تنہائی کی بات کرتا ہوں۔ تم مجھ سے ہمدردی جتاتی ہو۔ زندگی بھر ساتھ دینے کا وعدہ کرتی ہو۔ محبت اور دائمی رفاقت کی ہر شرط کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہو۔ میں کہتا ہوں نسرین تم میری روح ہو اور میرے بیوی بچے میرا جسم۔ اور تم جواب دیتی ہو، کہتی ہو کہ روح کی طرح میرے جسم کے ساتھ رہو گی۔ کبھی میری خاندانی زندگی کو متاثر ہونے نہیں دو گی۔ مجھ سے کوئی مطالبہ کرو گی اور نہ ہی کوئی غرض وابستہ رکھو گی۔ بس محبت کرو گی۔ ویسی ہی محبت جیسی کہ میں چاہتا ہوں۔ میں مطمئن ہو جاتا ہوں۔

"تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو۔ رات دیر گئے تک ہم ہال میں بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر تم کو نیند آنے لگتی ہے اور تم بند ہال سے اٹھ کر بیڈ روم میں چلی جاتی ہو۔ میں کہتا ہوں نسرین اندر سے دروازہ بند کر لو، اور تم کہتی ہو، دروازہ کیوں بند کروں، باہر تم سو رہے ہو نا۔ پھر بند کمرے میں مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔

میں کہتا ہوں۔ ٹھیک ہے شب بخیر۔ اور تم بیڈ روم

میں چلی جاتی ہو۔ بند ہال کی روشنی گُل کر کے میں بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی اور تمہارے کمرے میں بلب جلتا رہتا ہے۔ پھر شب خوابی کے لباس میں تم ایکدم کمرے سے باہر نکل آتی ہو۔ میرے قریب آکر کہتی ہو۔

" مجھے اکیلے کمرے میں ڈر لگ رہا ہے تم بھی اندر چل کر سو جاؤ "

میں بوکھلا جاتا ہوں۔ معمولی سی ایک بات بہت غیر معمولی محسوس ہوتی ہے۔ کافی پس و پیش کے بعد اٹھ کر تمہارے کمرے میں آجاتا ہوں اور فرش پر بستر بچھا کر لیٹ جاتا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ میں پلنگ پر سو جاؤں اور تم نیچے سو رہو گی۔ میں انکار کرتا ہوں۔ تم اصرار کرتی ہو۔ بات بڑھ جاتی ہے۔ میں لرزتا ہوا سا بستر سے اٹھتا ہوں۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے لائٹ آف کر دیتا ہوں۔ کمرے میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اندھیرے میں میرے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ میں جذبات کے طوفانی ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا ہوں۔ اندھیرا بند کمرہ۔ میری بھرائی ہوئی آواز اور تمہاری دبی دبی سی سسکیاں !"

" تم غلط کہہ رہے ہو۔" ریشماں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔" تم نے غلط کہا۔ تم مجھے خوب شراب پلاتے ہو۔ ہمیشہ سے زیادہ۔ بہت زیادہ۔ اتنی کہ مجھے ہوش تک نہیں رہتا کہ میں کہاں ہوں ... ہاں وہ ایک کمرہ ہی ہے۔ تم مجھے بازوؤں کا سہارا دے کر کمرے میں لے آتے ہو۔ پلنگ پر لٹا دیتے ہو۔ پھر روشنی گل کر دیتے ہو۔ میں تڑپتی ہوں۔ نشے کے عالم میں بھی احتجاج کرتی ہوں۔ گڑگڑاتی ہوں۔ منت و سماجت کرتی ہوں۔ تم کچھ نہیں سنتے۔ کچھ بھی نہیں سنتے۔ اور صبح کے اجالے میں تم مسرور ہو اور میں شرمندہ ... تمہاری محبت کا وہ طوفان تھم جاتا ہے۔ جوش و خروش د[illegible] جاتا ہے۔ تم انجان اور بے تعلق ہو جاتے ہو۔"

" نہیں۔ میں بہت شرمندہ تھا۔ بہت نادم۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔" اور تم پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں ؟

" تم شرمندہ اور نادم کیسے ہو سکتے تھے راحت "
وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں کہنے لگی۔" تم نے جو کچھ بھی کیا دانستہ کیا۔ سوچ سمجھ کر ہی تم نے وہ ناٹک کھیلا تھا۔ تم شرمندہ کیسے ہو سکتے تھے۔ تم نے مجھ پر فتح پائی۔ تم بہت مسرور تھے پھر کھیل ختم ہو گیا۔ فلم سازی ایک خواب بن گئی۔ تم کو فلم سازی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تم نے روپیہ خرچ کیا۔ میری زندگی کے پانچ سال خرید لئے اور میں نے اپنا جسم جلایا۔ تمہاری خلوت کے اندھیرے میں روشنی کر دی۔ حساب برابر ہے۔ نہ ظلم ہے نہ ستم۔ انصاف ہے نہ ہی ناانصافی۔ وفا اور بے وفائی کا ذکر ہی فضول ہے !"

میں نے خالی خالی بہکی بہکی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ہال کی چھت میں آویزاں مرکیوری ٹیوب لائٹ سے پتنگے والہانہ انداز میں ٹکرا رہے تھے اور فرش پر ڈھیر ہو رہے تھے۔ میں نے رم کی بوتل اٹھائی اور باقی ماندہ شراب حلق میں انڈیل کر جیسے کراہ اٹھا۔

" نسرین نے بھی یہی کہا تھا۔ اسے بھی کوئی شکوہ تھا نہ کوئی شکایت۔ اسے میری کمزوری اور مجبوری کا احساس تھا۔ اس نے اپنی مرضی کے خلاف امجد سے شادی کر لی اور مجھ سے 'میرے شہر سے' میرے ملک سے سینکڑوں ہزاروں میل دور چلی گئی۔ مجھ سے اس قدر دور، لیکن دل سے اس قدر نزدیک ---- !"

" مجھے نیند آرہی ہے !" وہ ایکدم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

" نیند آرہی ہے ؟" میں چونک پڑا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر ہال کی طرف بڑھ گئی۔ میں اس کے ساتھ بند ہال میں چلا آیا۔" ٹھیک ہے۔ سو جاؤ۔"

" تم نہیں سوؤ گے ؟" ڈریسنگ ٹیبل کے آگے رک کر وہ نشیلی آواز میں کہہ اٹھی۔" تم نہیں سوؤ گے ؟"

" شاید نہیں۔" میں نے اٹک اٹک کر کہا۔" تم اندر کمرے میں سو جاؤ۔ میں یہاں بیٹھا رہوں گا۔ نیند کا آنا ممکن نہیں۔ آجائے تو یہیں سو جاؤں گا۔"

" سنو۔ تم اندر چل کر سو جاؤ۔ میرے ساتھ۔" وہ لڑکھڑاتی

ہوئی میری طرف بڑھی اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بیقراری سے کہنے لگی "آہ۔ بات کو طول مت دو۔ وقت کو ضائع نہ کرو۔ وقت بھاگ رہا، لڑ رہا ہے ... میں انتظار نہیں کر سکتی۔ آہ۔ میں بہت حسین ہوں۔ بہت جوان ہوں۔ پیدائشی فن کار ہوں۔ پھر بھی کچھ نہیں ہوں۔ سنو۔ موم پگھل ہے۔ شعلہ جل رہا ہے۔ موم پگھل کر جل کر معدوم ہو جائے گا۔ خلا میں ایک شعلہ رہ جائے گا۔ جلتا ہوا۔ کانپتا تھرکتا ہوا شعلہ۔ ایک آتشیں عکس رہ جائے گا۔ اس سے پہلے کہ میں خواب بن جاؤں، مجھے دیکھ لو محسوس کر لو۔" وہ مجھ سے چمٹتی ہوئی بولی "مت سوچو۔ کوئی اندیشہ نہ کرو۔ اس دنیا میں جینے کا مطلب یہی ہے۔ کچھ دینا کچھ پالینا۔ پانے کے لئے کھونا۔ ہے نا۔" وہ میری گردن میں باہیں حائل کرتی ہوئی بڑی پُراسرار سی آواز میں کہنے لگی "میرے پاس کیا ہے کسی کو دینے کیلئے۔ دنیا میں کچھ پانے کیلئے۔ اس جسم کے سوا، اس حسن کے سوا۔"

"ریشماں"۔ میں اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولا۔ "تم ہوش میں نہیں ہو۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔"

"جھوٹ مت بولو۔" وہ ہچکی لیتی ہوئی کہنے لگی "تم اچھی طرح جانتے ہو میں ہوش میں ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "تم فلمی کہانی لکھنا چاہتے ہو، ہے نا۔ اپنے دوست کے لئے۔ جب تک تم کہانی نہیں لکھتے فلم نہیں بنتی اور میں ہیروئن نہیں بن سکتی۔" وہ ایکدم مجھ سے لپٹتی ہوئی بولی۔ "اور ہیروئن نہ بن سکی تو شاید زندہ ہی نہ رہ سکوں گی۔ میرے ماں باپ بہت غریب ہیں۔ میرے بھائی بہن بہت معصوم ہیں۔ مجھے ان کے لئے کچھ کرنا ہے۔ کچھ بننا ہے۔ کچھ اپنے لئے بہت کچھ ان کے لئے۔ مطلب سمجھتے ہو نا ... چلو۔ مجھے اپنے کمرے میں لے چلو۔ لائٹ آف کر دو اور مجھے آنے والے خوبصورت زمانے کے خواب دے دو۔ مجھے یقین دلا دو کہ میں دنیائے فلم کا روشن ستارہ بن کر ابھروں گی۔" میرا نشہ جیسے ہرن ہو گیا۔ نادم نادم سا حیران اور پریشان میں اُسے کمرے میں لے گیا اور اُسے پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ بستر پر کسمسائی۔

"آؤ۔ آجاؤ۔" وہ تکیے میں منہ چھپا کر جیسے سسک پڑی "بمبئی اور مدراس کے تجربات نے مجھے سب کچھ سکھا دیا ہے۔ میرے محسن، میرے مہربان۔ رکو نہیں۔ میں ایک پامال سڑک ہوں۔ تم بھی گزر جاؤ"۔ میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس پر بلانکٹ اُڑھا دی۔ لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر نکل آیا اور باہر سے دروازہ بند کر لیا۔ ماحول پر خاموشی مسلط تھی۔ بند کمرے میں ریشماں کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ میرے جذباتی وجود میں اٹھنے والے سارے طوفان دب گئے تھے۔ دل بالکل میرے قابو میں تھا۔ رگوں میں سنسناتے ہوئے خون کی روانی ذرا تھمی تو میرے دل کی گہرائیوں سے ایک آواز سی بلند ہوئی "نسرین میں اب خود پر قابو پا چکا ہوں۔ محبت کے لئے میں جسم کا محتاج ہوں اور نہ ہی صورت شکل کا حاجت مند ——!

•

دوسرے دن صبح وہ دیر تک سوتی رہی اور جب سو کر اٹھی تو ایک بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ نادم اور پشیمان نگاہوں سے وہ گھورتی جا رہی تھی۔ خلا میں نہ جانے کس شے کو گھورتی جا رہی تھی۔ ناشتے کی میز پر بھی وہ خاموش رہی۔ خاموش، نادم اور شرمسار۔ چائے پینے کے بعد میں نے کہا۔

"آؤ ریشماں باہر چلیں۔ نیلم پلی کے حسین ماحول کا نظارہ کریں۔ یادوں کے مٹے مٹے سے نقوش اجاگر کریں۔ دل میں ایک آتشِ خوابیدہ کو جگائیں۔"

وہ میرے ساتھ باہر نکلی۔ نیلے لباس میں پژمردہ اور نڈھال سی۔ ڈاک بنگلے سے باہر نکل کر میدان میں آم کے درختوں کی طرف بڑھتے ہوئے وہ عجیب سی آواز میں بولی۔

"میں شرمندہ ہوں۔ رات مجھے بہت زیادہ نشہ ہو گیا تھا۔" وہ رک رک کر بولی۔ "میں شاید بہک گئی تھی۔"

"رات میں ایک حقیقت بے نقاب ہو گئی۔" میں نے آہستہ سے کہا: "وہ بات جو تم مجھ سے چھپانا چاہتی تھیں وہ عیاں ہو گئی۔ میں اب خوش ہوں۔ تمہیں بہتر انداز میں سمجھ سکتا ہوں۔"

"میں نے بھی آپ کو پہچان لیا ہے۔" وہ متاثر ہوتی ہوئی بولی۔ "آپ وہی ہیں جو خود کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔"

"تم مجھے جان گئی ہو؟ یہ خوشی کی بات ہے ریشماں۔" میں نے غم سے کہا۔ "دل کی سلامتی کے لئے یہ یقین کافی ہے کہ تم مجھے جانتی پہچانتی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے پہاڑی راستے پر چلتی رہی۔ راستے میں آم کا وہ درخت ملا۔ وہ درخت اب کافی گھنا اور قدآور ہو گیا تھا۔ میں چلتے چلتے ایکدم رُک گیا۔ وہ بھی رک گئی۔

"اس درخت کے نیچے کبھی کسی نے کہا تھا کہ میں ہوا کا جھونکا ہوں اور وہ اس درخت کی طرح ہے۔ ہوا کے جھونکے آتے ہیں اور شاخوں کو چھیڑ کر چلے جاتے ہیں۔ درخت اپنی جگہ رہتا ہے۔ جھونکے چلے جاتے ہیں۔" میں نے جذباتی آواز میں کہا۔ "آج میں پھر یہاں ہوں۔ وہ درخت بھی اسی طرح موجود ہے لیکن وہ نہیں ہے۔ سوچتا ہوں کہ ہوا کا جھونکا میں تھا کہ وہ ___!"

"آپ کو نسرین کا بہت غم ہے!" اس نے انتہائی ہمدرد اور مہربان لہجے میں پوچھا۔

"بہت ___ اتنا کہ کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "یہ غم مگر اب میری زندگی ہے۔ اس غم کے بغیر میں ایک سانس تک نہیں لے سکتا۔"

چھوٹی چھوٹی چٹانوں، ہری بھری جھاڑیوں اور خودرَو گھاس کے درمیان بکھرے ہوئے پہاڑی راستے پر چلتے ہوئے ہم اُس چٹان پر پہنچ گئے جو نیچے سے دیکھنے والوں کو زمین اور آسمان کے درمیان معلق دکھائی دیتی تھی۔ چٹان پر پہنچکر وہ حیرت بھری آواز میں چیخ پڑی۔

"اوہ بالکل یہی جگہ تھی۔ خواب میں اس رات میں نے اسی چٹان کو دیکھا تھا۔ خود کو اس چٹان پر طوفانوں میں تنہا پایا تھا۔ اف ___ اوہ!"

"یہ وہی چٹان ہے۔" میں نے درد بھری آواز میں کہا۔ "یہاں کسی نے دائمی رفاقت کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا وعدہ سچا تھا۔ وہ تمہارے رُوپ میں اپنے وعدے کو نبھانے چلی آئی ہے۔"

"آپ شاید نسرین کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں نسرین کی بات۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اور تم نسرین سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتیں۔" میں جذباتی آواز میں رُل پڑا۔ "خدا کے لئے میرے یقین کی شمع کو گل نہ کرو۔ انکار مت کرو۔ ریشماں، میرا ساتھ دو۔ ہمیشہ ساتھ رہو۔ میرے لئے طاقت و توانائی کا سرچشمہ بنی رہو۔"

"اشفاق صاحب" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ خود میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔ میں آپ کو کیسے سہارا دے سکتی ہوں۔"

"یہی الفاظ تھے۔ بالکل ایسا ہی لہجہ تھا۔" میں نے حیرت و غم سے کہا۔ "تم نسرین ہو ریشماں۔ مذاق نہیں سچ مچ تم نسرین ہو۔ میں زندگی میں تمہارے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن تم انتظار نہ کر سکیں۔ میں حالات سے اُلجھ کر رہ گیا نسرین۔ اب میں اپنے وعدوں کو پورا کروں گا۔ ماحول کو تمہارے لئے سازگار بنا دوں گا۔ ایسا کرتے ہوئے چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

"مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ اداکاری کو میں ایک مقدس فن سمجھتی ہوں۔ اپنی زندگی اور اپنی نجات کا، خوشی اور آسودگی کا ایک واحد وسیلہ۔" وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں کہنے لگی۔ "میں خوبصورت ہوں، پرکشش ہوں۔ کئی دولت مند لڑکے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ چاہوں تو شادی کر کے آرام سے رہ سکتی ہوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اپنے گھر والوں سے بے پروا ہو سکتی ہوں نہ ہی اپنے فن سے غفلت برت سکتی ہوں۔ میں زنجیروں میں جکڑ کر رہ گئی ہوں اشفاق صاحب۔ میں بے بس اور مجبور ہوں۔ کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ کسی کو یقین نہیں دلا سکتی۔ کسی بھی بات کا یقین ___!"

"میں ان زنجیروں کو توڑ دوں گا۔" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "تم ساتھ دو تو میں طوفانوں سے ٹکرا سکتا ہوں۔"

"میں وعدہ تو نہیں کر سکتی۔ کوشش کروں گی کہ آپ کا ساتھ دوں۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ کی کھوئی ہوئی خوشی آپ کو مل جائے تو مجھے واقعی بڑا سکون ملے گا۔"

"اتنا بھی سہارا کافی ہے جینے کے لئے۔ خواب دیکھنے کے لئے"۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ سے اسے دباتے ہوئے کہا۔ "تم نے واقعی مجھے نئی زندگی دی ہے ریشماں"۔ اور جواب میں ریشماں نے گہری نظروں سے گھور کر مجھے دیکھا اور مسکرادی اور زمین و آسمان کے درمیان معلق سی دکھائی دینے والی اس چٹان پر ایک اُجالا سا پھیل گیا۔ ساری فضا، ساری وادی سارے نظارے تابندہ اور درخشاں ہو گئے۔!

•

نیلم پلی سے واپسی کے بعد میری زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ نئی زندگی، نئی امنگیں، نئی ترنگیں نئے حوصلے اور عزائم۔ سرگرم عمل، پُر جوش اور پُر اُمید۔ شب و روز ایک کر کے میں نے شہاب کے لئے فلمی کہانی لکھی تھی۔ لازوال محبت کی پُر اثر خوبصورت کہانی۔ شہاب کو کہانی پسند آئی تھی۔ وہ کہانی کا اسکرین پلے لکھ رہا تھا۔ مکالموں اور گانوں کے لئے فلمی دنیا کے صف اول کے فنکاروں کی خدمات حاصل کرلی گئی تھیں۔ فلم کی کاغذی تیاری کا کام جوش و خروش سے جاری تھا۔ ریشماں بہت خوش تھی۔ اس کے ماں باپ مطمئن تھے۔ گھر کی رونق ہی بدل گئی تھی۔

"اب ریشماں ہیروئن بن رہی ہیں"۔ میں اکثر کہا کرتا۔ "ایک اے کلاس کلر پکچر کی ہیروئن۔ پہلی فلم ہی سے یہ آسمان فلم پر ایک روشن ستارے کی طرح اُبھریں گی۔ چشم زدن میں اُن کی حالت بدل جائے گی۔ بمبئی میں ساحل سمندر پر ایک خوبصورت بنگلہ ہوگا۔ نئے ماڈل کی کار ہوگی۔ بنک بیلنس ہوگا۔ سجے سجائے ڈرائینگ رُوم میں فلمسازوں کا جمگھٹا ہوگا۔ نئی نئی فلموں کے معاہدوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ پھر مس ریشماں سے ملنا دشوار ہو جائے گا۔ ہر دن مصروف، ہر رات شب برات۔ پرستاروں کے ہجوم میں پونم کے چاند کی طرح دمکتی ہوئی ملک کی اس مُمتاز فلم اسٹار کو ہم دُور دُور سے دیکھ کر ترستے رہ جائیں گے۔ ہم ملنے جائیں گے تو سکریٹری بولے گا مس صاحبہ نہیں مل سکتیں ان کو فرصت نہیں ہے۔ ہم دھرنا دے کر ڈرائینگ رُوم میں بیٹھ جائیں گے تو زچ ہو کر یہ باہر نکلیں گی۔ تیوری پر بل ڈال کر پوچھیں گی۔۔۔ آپ کون ہیں؟ کیوں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟ ہم یاد دلائینگے تو سوچ میں پڑ جائیں گی اور پھر بڑی اجنبی آواز میں کہیں گی، لگتا ہے آپ کو کہیں دیکھا ضرور ہے مگر کب اور کہاں یاد نہیں آرہا ہے"۔

"آپ تو غضب کر رہے ہیں"۔ وہ رُوٹھ سی جاتی۔ "میں اور آپ کو نہیں پہچانوں گی، کیا آپ مجھے اس قدر کم ظرف اور احسان فراموش سمجھتے ہیں؟"

"ارے خفا کیوں ہوتی ہو"۔ میں جلدی سے کہتا۔ "میں تو امکانات کی بات کر رہا تھا۔ دنیا میں اکثر ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور شاید ہوتا رہے گا بھی"۔

"آپ دنیا کی نہیں میری بات کیجئے"۔ وہ دھیرے سے کہتی۔ "آپ کو بھول کر پھر میں یاد کسے رکھوں گی؟"

"یعنی۔۔۔؟"

"آپ کوئی بھُولنے کی شے ہیں جناب؟"

"دیکھا۔ ابھی سے ہم شے بن گئے۔ یعنی کہ شے۔ لاشے۔ ایک چیز جو بے جان بھی ہو سکتی ہے"۔

"آپ سے کون جیت سکتا ہے!"۔ وہ مسکراتے لگتی۔ "بات سے بات پیدا کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے"۔

سیاہ فام منظور احمد ارمان بھرے لہجے میں کہتا۔ "میں تو اپنے بچوں کو بمبئی ہی میں پڑھاؤں گا۔ اس شہر میں تو تعلیم کا معیار بالکل گر گیا ہے"۔

"سب سے پہلے تو ہمیں قرض ادا کرنا ہے"۔ ریشماں کی زرد رو بھاری بھر کم ماں کہتی۔

"ہم اس مکان کو فروخت کر دیں گے"۔ منظور احمد جلدی سے کہتا۔ "سارے قرضے ادا ہو جائیں گے"۔

"آپ بھی بمبئی چلیں گے نا؟" ریشماں پیار بھری آواز میں پوچھتی تو میں ایکدم اُداس ہو جاتا۔ دل میں درد کی لہر سی ابھرتی کہ جلد ہی ریشماں مجھ سے دُور ہو جائے گی۔ اس سے اب روز ملاقات نہ ہو سکے گی۔ پھر وہی سناٹا ہو گا اور قاتل تنہائی۔۔۔

"بمبئی یہاں سے کتنی دُور ہے" میں بے جان سی آواز میں کہتا۔
"میں کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتا ہوں۔"
"کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے؟"
"جسمانی اعتبار سے ساتھ رہوں نہ رہوں مگر میرا دل، میری آنکھیں، میری رُوح تمہارے ساتھ ہوں گے، ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔"
میں اُسے اور خود کو جیسے بہلاتا۔
وہ مطمئن ہو جاتی۔
کبھی کبھی وہ اس فلمی کہانی پر مجھ سے تبادلۂ خیال کرتی۔ کہانی کے مسودے کی ایک کاپی میں نے اُسے دی تھی۔ وہ بار بار اسے پڑھتی اور ہر بار مجھ سے کہتی۔
"میں کہانی کی فضا، ماحول اور واقعات سے بے حد مانوس ہو چکی ہوں۔ مجھے کہانی کی ہیروئن سے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔"
"وہ تمہارے لئے اجنبی کہاں ہے؟" میں کہتا۔ "وہ تو تمہارا اپنا عکس ہے، سایہ، ہمزاد بلکہ وہ تو خود تم ہو ریشماں۔"
وہ شرما جاتی۔ گہری پیار بھری نظروں سے مجھے گھورتی رہ جاتی۔

موسمِ برسات کے آخری دنوں میں بمبئی سے شہاب کا خط آیا کہ فلم کی کاغذی تیاریاں ہو چکی ہیں لیکن فلم کا فینانسر اچانک بیمار ہو گیا ہے۔ اس کے صحت یاب ہوتے ہی کام آگے بڑھے گا۔"
سرما کا موسم انتظار میں گذر گیا۔ گرما بے قراری کا موسم ثابت ہوا۔ گرما کے آخری مہینے میں شہاب نے لکھا کہ اس کا فینانسر دیوالیہ ہو گیا ہے۔ اب وہ کسی نئے فینانسر کی تلاش میں ہے۔ پھر برسات آئی۔ سرما آیا اور گرمیاں بھی گذرنے لگیں۔ شہاب کو کوئی فینانسر نہیں ملا۔ ریشماں کے حالات ابتر ہوتے جا رہے تھے۔ دس بارہ افراد پر مشتمل اس کے خاندان کی گذر بسر قرضوں پر ہو رہی تھی۔ اور اب قرض ملنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ گاؤں کی زمینات بک چکی تھیں۔ شہر کا مکان گروی ہو چکا تھا۔

جوں جوں دن گذرتے جا رہے تھے مسئلہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔
"شہاب صاحب کی فلم کب بنے گی؟" وہ مایوسی اور غم سے کہتی۔ "سوچتے سوچتے میرا دماغ جواب دینے لگتا ہے۔ رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ آخر کب تک ایسا چل سکے گا۔ گھر کی جو بھی حالت ہے آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ خود پیٹ بھر نہیں کھاتے، مجھے اچھا کھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لئے ترستے ہیں مگر مجھے آرام و آسائش کی ہر شے مل جاتی ہے۔ دودھ۔ پھل۔ ٹانک اور میک اپ کا سامان۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں ایک لقمہ بھی نہیں کھا سکتی۔"
"تم خواہ مخواہ سوچتی ہو۔ پریشان ہونے سے کہیں مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟" میں سمجھاتا۔ "تمہیں خوش رہنا چاہیئے۔ اپنی صحت اور خوبصورتی کی حفاظت کرنی چاہیئے۔"
شہاب کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے بمبئی اور مدراس میں دو چار جگہ اور بھی کوشش کی لیکن ہر جگہ وہی ایک سا جواب ملا۔ نئی ہیروئن کے ساتھ فلم بنانا ایک رسک لینا ہے۔ عام کساد بازاری اور معاشی بحران کے اس دور میں ایسا خطرہ مول لینا ممکن نہیں ہے۔ چند مقامی فلمسازوں نے ریشماں کی پژمردگی اور دُبلے پن کو بہانہ بنایا اور انکار کر دیا۔
"اشفاق صاحب۔ یقین مانیئے وہ بہت دُبلی ہے۔ ہرگز اس قابل نہیں کہ ہیروئن بن سکے۔ آپ کو شاید اندازہ ہوگا کہ فلم کی ہیروئن کو کس قدر صحت مند، تر و تازہ اور اسمارٹ ہونا چاہیئے!"

ریشماں جیسے اندر ہی اندر گھُلتی جا رہی تھی۔ جب بھی میں اس سے ملتا وہ مایوسی اور اداسی سے پوچھتی۔
"بمبئی سے کوئی خط آیا؟ شہاب صاحب کی فلم کب بنے گی؟"
اور میں ایک مشین کی طرح رٹے رٹائے جملے دُہراتا۔ شہاب دُھن کا پکا اور وعدے کا سچا آدمی ہے۔

جوں ہی سرمایے کا بندوبست ہوگا فلم بنے گی اور بہت عمدہ اور معیاری بنے گی اور تم یقیناً اس فلم کی ہیروئن ہوگی۔"

"کیا آپ کو یقین ہے۔" وہ افسردگی سے کہتی "کیا میں واقعی ہیروئن بن سکوں گی؟"

"تمہیں شک کیوں ہو رہا ہے؟" میں تڑپ کر کہتا۔ "آخر مایوسی کی وجہ کیا ہے؟"

"میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔" وہ جذباتی لہجے میں کہنے لگتی۔ "میں جل رہی ہوں اشفاق صاحب۔ موم کی طرح جل رہی ہوں مسلسل پگھل رہی ہوں۔ ایک ایک کرکے دن گذرتے جاتے ہیں۔ جوانی کی عمر مختصر ہوتی جاتی ہے۔ آس ٹوٹ جاتی ہے۔ اُمید کے چراغ بجھتے جا رہے ہیں۔ کب تک۔ آخر کب تک فریب اُمید کھاؤں۔ کب تک انتظار کروں؟" فرطِ جذبات سے اس کی آواز رُندھ گئی۔

"فنکار کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔" میں غم سے کہتا۔ "فن پر کبھی خزاں نہیں آسکتی۔"

آپ کب تک مجھے خوابوں پر زندہ رکھ سکیں گے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتی۔ "کب تک میرے ساتھ اپنا وقت خراب کرتے رہیں گے۔ مجھے میری بدنصیبی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیجیے اشفاق صاحب۔ مجھے اپنی آگ میں تنہا جل جانے دیجیے۔ میرا مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکتا۔"

"خود کو تنہا مت سمجھو ریشماں۔" میں درد بھری آواز میں کہہ اٹھتا۔ "تم اگر جل رہی ہو تو سمجھو میں بھی شعلوں کے درمیان گھرا ہوا ہوں۔ تمہارے ساتھ ہوں۔"

"آپ کب تک میرا ساتھ دے سکیں گے؟" وہ حسرت سے کہتی۔ "آپ کسی کا سہاگ ہیں معصوم بچوں کے باپ ہیں۔ آپ کب تک اپنی خاندانی زندگی کی ذمہ داریوں سے غفلت برت سکیں گے۔ آہ۔ ایک دن آپ بھی بیزار ہو جائیں گے۔ مجھ سے اُکتا جائیں گے۔"

"وہ دن شاید میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔" میں پُر اعتماد لہجے میں کہتا۔ "میرا اور تمہارا ساتھ جسم اور جان کا ساتھ ہے۔ یہ ساتھ زندگی میں چھوٹ سکتا ہے نہ ہی مرنے کے بعد۔"

وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ جاتی اور انتہائی درد بھری آواز میں کہتی۔ "آپ کی رفاقت کا اعتبار نہ ہوتا تو اب تک میں زندہ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ آہ۔ مجھے سنبھال لیجیے، مجھے یقین دلائیے۔ مجھے بچا لیجیے۔ میرے محسن۔ میرے مہربان۔!"

اور بے اختیار میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی اُبھر آتی۔ بے بسی اور مجبوری کے شدید احساس سے میرا دم گھٹنے لگتا۔ جس کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہوں اس کے لئے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کاش میرے اختیار میں ہوتا۔ میرے پاس اتنا سرمایہ ہوتا تو یقیناً میں خود فلم بناتا۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار سہی ایک فلم تو ضرور بناتا۔ ریشماں کے لئے۔ اپنی جان کے لئے۔

•

ایک سال اور بیت گیا۔

نئے سال کی پہلی رات بھی سے شہاب آیا تو میرے تن مُردہ میں جیسے جان پڑ گئی۔ اس نے اپنی فلم کے لئے سرمایے کا بندوبست کر لیا تھا اور اب وہ ریشماں سے معاہدہ کرنے کے لئے آیا تھا۔ ویرانے میں جیسے ایکدم بہار آگئی تھی۔ اُمید کے چراغ بجھتے بجھتے جل اُٹھے تھے۔

ریشماں کو دیکھ کر شہاب کا چہرہ اُتر گیا۔ اُس وقت تو اس نے کچھ نہیں کہا لیکن وہاں سے واپسی کے بعد وہ مجھ پر برس پڑا۔

"تم یقیناً سٹھیا گئے ہو۔ اس لڑکی کو ہیروئن تو کیا ہیروئن کی ماں کا رول بھی نہیں دیا جا سکتا۔ ہیروئن کو بہت حسین، بہت شاندار، بے حد اسمارٹ اور رعنا ہونا چاہئے۔ اور یہاں کیا ہے، سوکھی ماری ہونق سی بے رونق لڑکی۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ۔ تم نے خواہ مخواہ میرا وقت برباد کیا۔"

"اس قدر بے رحم نہ بنو۔" میں درد سے بولا۔ "اس قدر جلد بازی سے فیصلہ مت کرو۔ تم اس کے دُبلے پن اور گری ہوئی صحت کو دیکھ رہے ہو۔ کڑی دھوپ میں پودے تک کمہلا جاتے ہیں، اور وہ تو

ایک نازک سی حسّاس لڑکی ہے۔ وقت کے دیئے ہوئے زخم خود وقت کے ہاتھوں مُندمل ہو جائیں گے۔ تم ایک بار اسے موقع تو دو۔ وہ بہت عظیم فنکارہ ہے' ایک عظیم اور لازوال حُسن!"

میں نے شہاب کے آگے حالات کا سارا نقشہ کھینچ دیا۔ رات بھر اسے سمجھاتا رہا۔ اور دوسرے دن وہ بولا "ٹھیک ہے۔ تم میرے واحد دوست ہو جس کی بات میں کبھی ٹال ہی نہیں سکتا۔ تمہاری خاطر میں ایک کیا' ہزاروں خطرات مول لے سکتا ہوں۔ میں ریشماں سے ضرور معاہدہ کر لونگا"۔ وہ لہجہ بدل کر بولا "اگلے ماہ مناظر کے انتخاب کے لئے میں کشمیر جا رہا ہوں۔ اگر وہ میرے ساتھ چل سکے تو یقیناً اس کی صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ بہرحال تمہاری خاطر یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا"۔

"مجھے یقین ہے دوست"۔ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ تمہیں اس انتخاب کے لئے ہرگز پچھتانا نہیں پڑے گا"۔

اس دن سہ پہر میں ایڈووکیٹ ریحانی کی موجودگی میں ریشماں نے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ چالیس ہزار پر معاملہ طے پایا تھا۔ شہاب نے پانچ ہزار روپیہ نقد پیشگی ادا کیا اور باقی رقم اقساط میں ادا شدنی تھی۔

اُس شام جب میں ریشماں کے دیوانخانے میں پہنچا تو وہ وہاں اکیلی تھی۔ سفید ریشمی ساڑی اور بلاؤز میں وہ پھول کی طرح نازک اور توشگفتہ دکھائی دے رہی تھی۔ نیلی روشنی میں ڈوبے ہوئے دیوانخانے پر ایک رُومانی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ایکدم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بے اختیار میری طرف بڑھی اور بڑے ہی والہانہ انداز میں میری گردن میں اپنی بانہیں حمائل کر کے مسرت بھری آواز میں کہہ اُٹھی۔

"میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ دوست۔ تم نے مجھے ایک نئی زندگی دیدی"۔ وہ وفورِ جذبات سے بے قابو ہوتے ہوئے کہنے لگی "آہ۔ میں بھول نہیں سکتی۔ زندگی بھر تمہیں بھول نہیں سکتی۔ تم کتنے اچھے ہو اشفاق، کتنے اچھے ہو"۔ وہ میری گردن کو چومتی ہوئی اُبل پڑی "آہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ جان۔ یقین کرو۔ محبت کرتی ہوں"۔

محبت کے اس اُمڈے ہوئے طوفان میں بہتے ہوئے میں اچانک سنبھل گیا اور اسے سینے سے چمٹائے ہوئے بڑے جذباتی لہجے میں بولا۔ میں بہت خوش ہوں ریشماں۔ کسی سے کبھی میں نے وعدہ کیا تھا۔ وہ وعدہ آج پورا ہوا ہے۔ ریشماں نئی زندگی مبارک ہو"۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" وہ پُرسکون ہوتے ہوئے بولی۔

"شہاب کے ساتھ تمہیں پہلے بمبئی اور پھر کشمیر جانا ہے۔ کشمیر میں تمہاری صحت بہتر ہو جائے گی۔ پھر فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہو گا"۔

"آپ بمبئی نہیں چلیں گے؟" وہ ایکدم اُداس ہو گئی۔

"اِن دنوں میرے ہاں بیماریوں کا چکر چل رہا ہے۔ سارا گھر بخار میں مبتلا ہے۔ شاید میں تمہارے ساتھ نہ آ سکوں گا۔ لیکن تم اپنے ابا کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں بمبئی یا کشمیر میں تم سے آ ملوں گا"۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"بچّے کا بخار ابھی نارمل نہیں ہوا؟" وہ فکرمند لہجے میں بولی "میں تو خوشی میں بھول گئی تھی آپ کے بچے کو بخار آ رہا تھا"۔

"بچے کے ساتھ بچے کی ماں کو بھی بخار آ رہا ہے"۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "بہرحال ان حالات میں میرا نکلنا مشکل ہے"۔

اب ان لوگوں کی حالت کیسی ہے؟" وہ ہمدردی سے پوچھنے لگی "تشویش کی تو کوئی بات نہیں ہے؟"

"فلو کا اثر ہے۔ کوئی خاص بات نہیں"۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجبوری ہے' ورنہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا"۔

آپ سے روز ملاقات کی عادت سی ہو گئی تھی۔" وہ بے چینی سے بولی "اس احساس سے دل بیٹھا جا رہا ہے کہ اب جلد ہی آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی!"

"اس سے کیا ہوتا ہے"۔ میں نے پُرسوز لہجے میں کہا۔ "تم مجھے جانتی پہچانتی ہو اور مجھے تمہاری رُوح سے آشنائی

ہے۔ اس کے لئے جسمانی ملاقات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔!

"اشفاق!" وہ میرے سینے سے لگ کر بولی۔ "میں جانتی ہوں تم میرے نہیں ہو سکتے۔ تمہارا جسم میرے لئے پرایا ہے۔ پھر بھی یقین کرو میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ ویسی ہی محبت جیسی کہ تم چاہتے ہو۔ میری محبت ہمیشہ رہے گی۔ تمہارے ساتھ رہے گی۔"

"میری تمنّا" میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے لبوں کو چوم لیا اور جلتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میری زندگی جینے کے لئے یہ اقرار بہت کافی ہے۔"

●

دو چار دن بعد شہاب کے ساتھ ریشماں اور اس کا ادھیڑ عمر باپ بمبئی چلے گئے۔ ایک ہفتہ بعد سری نگر سے شہاب کا خط ملا کہ وہ کم از کم ڈیڑھ ماہ تک کشمیر میں رہے گا اور یہ کہ میں کشمیر پہنچ جاؤں۔ میں کشمیر جا نہ سکا۔ ریشماں شہاب کے ساتھ کشمیر میں تھی۔ ہر دوسرے روز ڈاک میں مجھے ریشماں کا خط ملتا۔ وہ بڑی پابندی سے خطوط لکھ رہی تھی۔ اس کے محبت بھرے خطوط اگر نہ ملتے تو وحشت اور غمِ تنہائی سے میرا جینا محال ہو جاتا۔ ہر ہفتے شہاب مجھے خط لکھتا جس میں ریشماں کی صحت کی تفصیل ہوتی تھی۔ کشمیر کی آب و ہوا میں اس کی صحت شاندار ہو گئی تھی۔ رنگ روپ نکھر رہا تھا۔

اپریل کے دوسرے ہفتے سے فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہو رہا تھا۔ مہورت کے دن میں بمبئی پہنچا تو ریشماں کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ وہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ سیاہ چمکیلے سر کے لمبے لمبے بال، گوری گلابی رنگت، چھریرا بدن، اور دراز قامت۔ تر و تازہ سے روشن منور کتابی چہرے پر جوانی کی بہار۔ گہری سرخ ریشمی ساڑی اور بلاؤز میں وہ شعلۂ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ بے حد خوبصورت اور اسمارٹ لگ رہی تھی۔

"تم نے بالکل سچ کہا تھا۔" شہاب نے اعتراف کیا۔ "میں اپنے انتخاب پر بے حد مطمئن ہوں۔ یہاں سارے ہی لوگوں نے ریشماں کو پسند کیا ہے۔"

"جتنی حسین وہ ہے اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اس کی روح ہے اور اس سے کہیں بڑھ کر اس کے فن کا جمال!" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔"

"کشمیر کی آب و ہوا نے اس کی صحت پر بڑا شاندار اثر کیا۔" چھریرے بدن کے متوسط قامت سیاہ فام شہاب نے دادِ طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال بالکل درست نکلا۔ کشمیر میں اسے دوبارہ زندگی ملی۔ تازہ جوانی اور لازوال حُسن۔ ہیگرڈ کے ناول "شی" کی ہیروئن کی طرح وہ لافانی حُسن پا چکی ہے۔"

"کشمیر کی حیات بخش آب و ہوا نے تمہیں بھی بال و پر دے دیئے ہیں۔" میں نے زندہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ "تم بھی خاصے صحت مند اور پُرکشش بن چکے ہو۔"

"سچ۔!" شہاب مسرور آواز میں بولا۔ "ظالم تم اگر وہاں آجاتے تو واقعی مزہ آجاتا۔ خیر پھر کبھی چلیں گے۔ یار باقی صحبت زندہ۔"

مہورت کے بعد میں زیادہ دن بمبئی میں نہیں رہ سکا۔ کچھ گھریلو حالات تھے اور کچھ ادبی مصروفیات۔ میں ایک دو ہفتے بعد بمبئی سے لوٹ آیا۔ ریشماں مجھے چھوڑنے اسٹیشن تک آئی۔ دیر تک اداس آواز میں اصرار کرتی رہی کہ میں جلد بمبئی لوٹ آؤں۔ بوجھل دل اور غمگین روح کے ساتھ میں بمبئی سے واپس ہوا جیسے خالی دل اور خالی ہاتھ وہاں سے لوٹا ہوں ——!

●

مہورت کے چھ سات ماہ بعد ہی شہاب کی فلم تیار ہو گئی اور نمائش کے لئے پیش کر دی گئی۔ پریمیئر شو میں مجھے بھی شرکت کرنی پڑی۔ فلم کی شوٹنگ میں ریشماں شب و روز میں مصروف رہی تھی۔ پھر بھی وہ وقت نکال کر مجھے خط لکھا کرتی۔ روا روی کے عالم میں تحریر شدہ مختصر اور سرسری قسم کے خطوط میں ہمیشہ مشینی طرز کی

زندگی اور مصروفیت کے شکوے ہوتے۔ مجھ سے دوری کے احساس کا ذکر ہوتا اور ہر خط کم و بیش ایک ہی انداز میں ختم ہوتا۔ "تم بہت یاد آتے ہو۔ اتنے سارے لوگوں میں کوئی بھی ایسا آدمی نہیں جس سے بات کر سکوں۔ کچھ سن سکوں۔ کچھ کہہ سکوں۔ تمہارے بغیر دنیا میں خود کو بہت اکیلی اور تنہا محسوس کرتی ہوں۔ تم کب آؤ گے۔ کب آرہے ہو؟"

دنیا میں ریشماں کے وجود کے احساس سے مجھے کسی بھی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں خوش تھا۔ مطمئن تھا۔ کوئی مجھ سے پیار کرتا ہے۔ میرا اعتبار کرتا ہے۔ میرا انتظار کرتا ہے۔ جینے کے لئے یہ سہارا بہت بڑا سہارا تھا اور میں زندگی سے مطمئن اور خوش تھا۔ بڑی گرمجوشی سے کاروبار حیات میں دلچسپی لے رہا تھا۔

پریمیئر شو میں ریاستی وزراء، معززین شہر، فلمی صنعت سے وابستہ نامور فنکاروں کے علاوہ ملک بھر کے نمائندہ صحافی اور فلمی نقاد بھی مدعو تھے۔ ہر شخص نے فلم کے انداز پیشکش اور معیار کو سراہا تھا۔ ریشماں کی اداکاری نے دیکھنے والوں کو حیران و ششدر کر دیا تھا۔ شو ختم ہوا تو ریشماں پرستاروں کے ہجوم میں گھر گئی۔ ہلکے آسمانی رنگ کی زرکار ساڑی اور بلاؤز میں اس کا ملکوتی حسن اور نکھر گیا تھا۔ پُر وقار، پُر شکوہ اور پُر کشش۔ ہر شخص اس کے جلوؤں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اسے مبارکباد دی تو اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آہستہ سے بولی "یہ سب تمہاری بدولت ہے۔ مبارکباد کے مستحق تو تم ہو۔"

"میں بہت خوش ہوں۔" اس کے ادھیڑ عمر سیاہ فام باپ نے احسان مندی سے کہا۔ "آپ کی ایک ایک بات سچ ثابت ہو رہی ہے۔ فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی چھ سات نئے معاہدے ہو چکے ہیں۔"

"ابھی تو ابتدا ہے۔" میں نے مسرور لہجے میں کہا۔ "ابھی تو ریشماں کو اور بڑھنا ہے۔ اور بلند ہونا ہے۔ میں انہیں شہرت اور ترقی کی انتہائی بلندیوں پر دیکھنے کا آرزومند ہوں۔"

"میں نے اپنی اگلی فلم کے لئے بھی ان سے معاہدہ کر لیا ہے۔" شہاب نے انکشاف کیا۔ "کہانی تمہاری ہوگی اور میں اسے ڈائریکٹ کروں گا۔"

"میری کہانی؟"

"ہاں — تمہاری کہانی۔" شہاب نے جلدی سے کہا۔ "خیر ہم اس بارے میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اب چل کر آرام کرلو۔" وہ رُک کر ریشماں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میں انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"جی — ؟" وہ ایکدم بوکھلا گئی اور ادھیڑ عمر منظور احمد بولا۔ "اشفاق صاحب کے ٹھہرنے کا ہم نے انتظام کیا تھا۔!"

"میرے لئے تم غیر ہو نہ ریشماں غیر ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "دونوں گھر بھی میرے اپنے ہیں۔ چاہے جہاں بھی ٹھہروں، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

ریشماں قدرے اداسی سے بولی۔ "بہتر ہے آپ شہاب صاحب کے ہاں چلے جائیے۔ وہ آپ سے کام کی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"شکریہ!" شہاب نے مسرور نگاہوں سے ریشماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ریشماں نے بوکھلا کر نگاہیں جھکا لیں اور میں شہاب کے ساتھ اس کے بنگلے پر چلا گیا۔

دوسرے دن ریشماں کے گھر پر فلمسازوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ادھیڑ عمر دراز قد منظور احمد کاروباری باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ ریشماں بہت مصروف تھی۔ بڑی سرسری قسم کی ملاقات رہی۔ رسمی قسم کی مختصر سی گفتگو کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ تیسرے دن میں بمبئی سے واپس ہو گیا۔ جانے سے پہلے میں نے ریشماں سے ملنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بے حد مصروف تھی۔ اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ جاتے ہوئے ٹیلیفون پر ریشماں سے ربط پیدا کیا۔ اس نے بڑے ہی مضطرب لہجے میں کہا۔

"تم جا رہے ہو۔ اتنی جلدی کیا تھی۔ کچھ دن ٹھہر جاتے۔

میں تمہیں اپنے ہاں بُلانا چاہتی تھی۔ تم سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتی تھی۔

"تم بہت مصروف ہو۔" میں نے اُداسی سے کہا۔ "میری وجہ سے تمہارا وقت کیوں خراب ہو؟"

"مجھ سے ناراض ہو؟" وہ گہرے غم سے بولی۔ "خدا کے لئے مجھے غلط مت سمجھو اشفاق۔ میری مجبوری کو تم سمجھتے ہو نا۔ اس شہر کی ٹریجڈی بھی ہے۔ آدمی یہاں مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ احساس مجھے چین نہیں لینے دے گا کہ تم آئے اور میں تم سے دو گھڑی بات بھی نہ کر سکی اور اب تم جا رہے ہو۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"تم خواہ مخواہ جذباتی بن رہی ہو۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میں تم کو غلط سمجھ ہی نہیں سکتا اور اس خیال کو بھی ذہن سے نکال دو کہ میں تم سے کبھی ناراض یا بدگمان ہو سکتا ہوں۔"

"تم واقعی بہت عظیم ہو۔ بے لوث۔ پُرخلوص اور بلند۔" وہ مسرور آواز میں بولی۔ "اب تک کوئی درجن بھر فلموں کے معاہدے کر چکی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی ساری فلموں میں کیسے کام کر سکوں گی۔"

"تم میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں ریشماں۔ فکر مت کرو۔ اعتماد سے کام کرو۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری کامیابی اور ترقی کا آرزومند ہوں۔"

"تم اب پھر کب آرہے ہو؟" وہ بے چینی سے کہہ اٹھی۔ "جلد لوٹ آؤ اشفاق اور آنے سے چند دن قبل مجھے اطلاع دے دو۔ میں وقت نکال لوں گی۔ تمہاری منتظر رہوں گی۔"

بمبئی سے واپسی کے بعد شہاب کے دو چار خطوط ملے۔ اس کی فلم باکس آفس پر کامیابی کا شاندار ریکارڈ قائم کر چکی تھی۔ وہ مجھ سے اپنی اگلی فلم کی کہانی لکھوانا چاہتا تھا۔ دو چار فلمساز اور بھی تھے جو مجھ سے کہانی لکھوانا چاہتے تھے لیکن میں اپنی خاندانی زندگی کی مصروفیات میں اس قدر اُلجھ گیا تھا کہ کسی کے لئے بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ ریشماں تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ ملک کے مشہور اور معتبر فلمی جرائد میں اس کی تصویریں چھپ رہی تھیں۔ انٹرویو شائع ہو رہے تھے۔ وہ اپنے وقت کی حسین ترین اور کامیاب فلم اسٹار مان لی گئی تھی۔

پچھلے کئی ماہ سے ریشماں کا کوئی خط نہیں ملا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بہن اب مستقل طور پر بمبئی میں رہتے تھے۔ بلیو ہلز پر میرے مکان کے سامنے واقع اس کا گھر فروخت ہو چکا تھا۔ میں دن دن بھر اپنے ڈرائینگ رُوم میں پڑا رہتا۔ ڈرائینگ رُوم کی کھڑکی سے جب بھی اس کے دیوانخانے کی طرف دیکھتا دل میں ایک شعلہ سا لہرا جاتا اور ذہن میں ریشماں سے وابستہ یادوں کے چراغ جل اُٹھتے وہ جب بھی یاد آتی دل میں ایک نرم نرم سی آنچ سلگ اٹھتی ایک خلش، ایک کسک، ایک میٹھا سا خوبصورت درد میرے جذباتی وجود پر چھا جاتا۔ موم کی طرح جلتے پگھلتے ہوئے شب و روز گذر رہے تھے۔

نومبر کی ایک سرد شام ڈاک آئی تو اس میں شہاب کا خط ملا۔ مختصر سی عبارت تھی۔

"یہ جان کر تمہیں حیرت اور مسرت ہوگی کہ تمہارا پینتالیس سالہ کنوارا دوست اب کنوارا نہیں رہا۔ پچھلے ہفتے میں نے اپنی زندگی کا ایک اہم ترین فیصلہ کیا اور انتہائی خاموشی سے بڑے ہی سیدھے سادے طریقے سے شادی کر لی۔ لڑکی کو تم خوب جانتے ہو، وہی میری پہلی فلم کی ہیروئن ریشماں۔ جو اب مسز شہاب بن چکی ہے........

....

اور شہاب کا خط میرے ہاتھوں میں لرز کر رہ گیا۔

▲

آغا رشید مرزا

آغا رشید مرزا

ہر چند پیشۂ آبا سپہ گری تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ میدانِ علم و ادب کے بھی شہسوار رہے۔ خاندان میں ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، خان بہادر میر ناصر علی اور نور الحسن برلاس جیسے مشاہیر ہوئے۔

والد مرحوم آغا خورشید مرزا سینٹرل گورنمنٹ کے محکمۂ اری گیشن میں ریونیو آفیسر تھے۔ کافی عرصہ ملازمت کے بعد طویل علالت کے باعث ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ تندرست ہونے کے بعد کاروبار کی طرف رجوع ہوئے اور ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ "اصلاحِ رسوم" کے نام سے سب سے پہلا معاشرتی ناولٹ لکھا۔ اور اس کے بعد "نعیم کی زندگی" کے عنوان سے دو حصوں میں ایک طویل سوشیل ناول لکھا جو بے حد مقبول ہوا اور کئی مرتبہ طبع ہوا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ناول لکھے جو طبع نہ ہو سکے اور دلّی کے فسادات میں ضائع ہو گئے۔

خود اکلوتے تھے لیکن رشتہ کے بھائی بہنوں کی فہرست طویل تھی۔ ایک بھائی حکیم اجمل خاں کی لڑکی سے وابستہ تھے۔ ایک بہن خان بہادر میر ناصر علی کے لڑکے میر انتصار علی سے منسوب تھیں۔ فسادات کے دنوں میں مجھے چند روز میر انتصار علی کے ہاں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے۔ ایک بھائی نور الحسن برلاس ٹوکیو یونیورسٹی جاپان میں شعبۂ علومِ مشرقی کے صدر تھے۔ دس بارہ برس تک وہیں رہے۔ جاپانی تہذیب و تمدن کے متعلق اُن کے مضامین کا ایک سلسلہ "ساقی" دہلی میں شائع ہوا تھا۔

دادا مرحوم آغا حاتم مرزا۔ انڈین پولیس سروس میں تھے۔ قدیم خاندانی رؤسا اور عمائدین شہر میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ اپنی کارکردگی کی وجہ سے ریاست کپورتھلہ پنجاب میں انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے پر مامور کئے گئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد دہلی آ گئے اور آنریری مجسٹریٹ بنا دیئے گئے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ گھر پر ہی عدالت کرتے۔ زیادہ وقت عبادت میں گزارتے۔ مولانا حالی کے شاگرد تھے۔ حافظ اور رومی ان کے دل پسند شعراء میں سے تھے۔ خود بھی کبھی کبھی فارسی میں شعر کہا کرتے تھے ——— دادی حاجرہ بیگم، راشد الخیری ان کے ماموں زاد بھائی تھے اور ڈپٹی نذیر احمد خالو ہوتے تھے۔ ان ہی کے نانا کے ہاں ڈپٹی نذیر احمد کی پرورش اور تربیت ہوئی۔ بعد میں ان کی خالا ڈپٹی نذیر احمد سے منسوب ہوئیں۔ ان کے لڑکے بشیر احمد اگرچہ عمر میں بڑے خالہ زاد بھائی ہوتے تھے۔ لیکن اُن کا ادب بڑی بہن کی طرح کرتے تھے۔ راشد الخیری اور بشیر احمد اُن دونوں بزرگوں کو میں نے بہت بچپن میں دیکھا ہے۔ ایک ہلکی سی یاد ذہن میں باقی ہے ——— اس خاندانی پس منظر کے ساتھ اگر میں یہ کہوں کہ یہ ذوقِ ادب مجھے ورثہ میں ملا ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ کرشن چندر سے میں نے دریافت کیا۔ کہ آپ نے پہلا افسانہ کب لکھا۔ انہوں نے کہا ۱۹۳۹ء میں۔ پھر یہی سوال انہوں نے مجھ سے کیا۔ میں نے جواب دیا ۱۹۳۷ء میں۔ اس پر انہوں نے کہا۔ اس معاملہ میں آپ مجھ سے زیادہ پرانے گناہگار ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ جی ہاں! لیکن آپ سے دو ہاتھ آگے نہیں۔ ہاں دو سال آگے ضرور ہوں ——— چنانچہ سب سے پہلا افسانہ ۱۹۳۷ء میں سعادت حسن منٹو مرحوم کی پسند پر اُن ہی کی زیرِ ادارت نکلنے والے "مصور" بمبئی میں شائع ہوا۔ اُن دنوں میں بمبئی ہی میں تھا۔ وہ میرے خاندانی تعلق اور اہلِ زبان ہونے کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اور اس وقت اُن کو میری تحریریں کچھ ایسی پسند آئیں کہ ہر ہفتہ کچھ نہ کچھ ضرور شائع کرتے۔ اُس کے بعد اُس دور کے مشہور ادبی رسائل "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" وغیرہ میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ "محشرِ خیال" اور "گلفروش" دہلی کے ادارۂ تحریر سے اعزازی طور پر وابستہ رہا اور ان کے لئے بہت کچھ کیا ——— ۱۹۴۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اُردو زبان و ادب میں سند حاصل کی ہی تھی کہ اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے پچاس سال کی عمر میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اسلئے کم عمری اور ناتجربہ کاری کے عالم ہی میں کاروبار کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں اور لکھنے لکھانے کا سلسلہ بہت کم ہو گیا ——— دہلی کے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جہاں اور سب کچھ ختم ہوا وہاں یہ سلسلہ بھی بالکل ہی ختم ہو گیا۔ صرف جانیں بچ رہیں۔ وہی لیکر کلکتہ چلا آیا۔ جہاں غالب نے سینے پر صرف تیر ہی کھایا۔ لیکن میں لختِ جگر کھاتا رہا اور خونِ جگر پیتا رہا۔ شاید حق کے دیوانوں کی یہی غذا ہے ——— برسوں کے ترکِ ادب کے بعد میں اسے اعجاز صاحب کا معجزہ سمجھتا ہوں کہ ۱۹۶۶ء میں اس ذوق کی تجدید ہوئی۔ اور اب یہ اُن ہی کے خلوص، محبت اور اصرار کی وجہ ہے کہ اس دور کی زندگی میں پھیلے ہوئے درد و کرب کو دیکھ کر جب کبھی احساس کے دھارے بہہ نکلتے ہیں تو کاغذ پر کچھ لکھ دیتا ہوں۔ اور یوں کبھی کبھار بے نام و نشان لکھنے والوں میں میرا نام بھی آ جاتا ہے۔

جینئس

آغا رشید مرزا

حقیقت کی اِس دنیا میں جا بجا بکھرے ہوئے ان مختلف کرداروں کو ماضی کی گم شدہ یادوں سے تلاش کر کے اِس داستان کی شکل میں یکجا کیا گیا ہے۔ اِس میں زیبِ داستاں کچھ نہیں۔

۱

صبح سے شام تک پھرتے پھرتے شاہ کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ شہر کی صاف شفاف سڑکوں کے بجائے کسی ویران سنگلاخ سرزمین میں اُونچے نیچے ٹیلوں اور پتھریلی چٹانوں پر گھومتا رہا ہے۔ اور یہ سورج اپنی کرنوں کے ہزاروں فٹ لمبے تار لئے تیز اور نکیلی میخیں بنا بنا کر اُس کے تمام جسم میں پیوست کرتا رہا ہے۔ پھر دن چھپے جب وہ گھر پہنچ کر اپنے جسم کو ٹھنڈے پانی میں نل کے نیچے ڈال دیتا تو اُسے احساس ہوتا کہ وہ رات بھر کے لئے صلیب پر سے اُتار لیا گیا ہے۔ اور جب وہ بستر پر آکر ڈھیر ہو جاتا تو اُس کی نظریں چاروں طرف پھیلی ہوئی کتابوں پر پڑتیں اور وہ سب اُسے اپنے گرد مُردہ ہڈیوں کے ڈھانچوں کی طرح ناچتی ہوئی معلوم ہونے لگتیں۔ وہ سوچنے لگتا اتنے برسوں اِن ہڈیوں کو گلے کا ہار بنائے رکھنے سے اُسے کیا ملا۔ اُس کی رُوح اندر سے گھٹنے لگتی۔ لیکن پھر وہ اِن ہی میں سے کوئی کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگتا۔ اور وہ آہستہ آہستہ اُسے کسی حسین ساحرہ کے رُوپ میں نظر آنے لگتیں۔ تلاش کرتے کرتے اُسے کہیں نہ کہیں شراب کی طرح تند و تیز اور تلخ الفاظ کے گھونٹ مل ہی جاتے

اور وہ اُس کی رُوحانی اذیّت کو نجات بخش دیتے۔ پھر وہ سب کچھ بھول کر کتاب کو سینے پر رکھے یوں سو جاتا جیسے اُسے بھی مسیح کی طرح آسمان کی بلندیوں پر اُٹھا لیا گیا ہے۔

کچھ دیر سو اُٹھنے کے بعد بھوک سے نڈھال ہونے پر بھی وہ کبھی کھانے کے لئے نہیں کہتا اور بھوک کو کتابوں سے بہلانے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ گھر میں کچھ کھانے کے لئے ہو گا بھی یا نہیں؟ اور ہو گا بھی تو کہاں سے آیا ہو گا۔ لیکن اُس کا باپ کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی گھسیٹ ہی رہا تھا۔ اور اُس کی ماں آنکھوں کی روشنی کم ہو جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح چولہا روشن کر ہی لیتی۔ اور دھوئیں سے بھرے ہوئے باورچی خانے سے اپنی آنکھوں کا رِستا پانی میلے دوپٹے سے پونچھتی ہوئی اُس کے لئے کچھ نہ کچھ کھانے کو لے ہی آتی۔ لیکن اُس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی کتابیں دیکھ کر اُس کے مزاج کا پارہ چڑھ جاتا اور وہ چلّانے لگتی۔ گھر میں کھانے کے لئے کچھ ملے یا نہ ملے، لیکن دُنیا بھر کی کتابیں ضرور مل جائیں گی۔ اور پھر اُس کے سینے پر رکھی ہوئی کتاب اُٹھا کر ایک طرف پھینکتے ہوئے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتی۔ آخر اِن کم بختوں کے پڑھنے کا فائدہ ہی کیا ہوتا ہے۔ جب ایک آدمی اِتنا پڑھ لکھ کر اپنا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا۔ اور یہ سرکار جب پڑھے لکھے لوگوں کو کام نہیں دے سکتی تو یہ کتابیں چھاپنے ہی کیوں دیتی ہے۔ اور یہ بڑے بڑے اِسکول اور کالج کھول رکھے ہی کیوں ہیں۔ اور اب یہ نئی بات اِن لیڈروں نے نکالی ہے۔ کہتے ہیں جنہیں نوکری نہیں ملتی وہ کاروبار کریں۔ یہ تو وہی بات ہوئی، وہ جو کسی بادشاہ نے کہا تھا۔ روٹی نہیں ملتی تو کیک کھاؤ۔ اب ان سے کوئی جا کر پوچھے کہ کاروبار کے لئے پیسہ آئے گا کہاں سے۔؟ کیا وہ اپنی دولت بے روزگاروں میں بانٹ رہے ہیں۔ پھر وہ خاموش ہو کر سوچنے لگتی۔ آخر یہ ذمّہ داری ہے کس کی۔ سرکار کی! جس نے یہ حکومت یہ سوسائٹی اور یہ نظام بنایا۔ یا پھر اُس خُدا کی جس نے یہ ساری کائنات بنائی۔ لیکن ذمّہ داری کسی کی بھی کیوں نہ ہو، آخر وہ اُسے پُورا کیوں نہیں کرتا۔ لیکن پھر اُس کے خیال میں سارا قصور اُس کی قسمت

کا ہی نکلتا اور وہ اُسے کوس پیٹ کر خاموش ہو جاتی۔ پھر جب
اُس کا بیٹا اُٹھ کر کھانا کھانے لگتا تو وہ سب کچھ بھول کر ممتا بھری
نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگتی اور ایک انجانی حسرت میں ڈوب جاتی۔

۲

ایک شام وہ بہت بیزار تھا۔ اس زندگی سے۔ اس ماحول
سے اُس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اُس کا دل نہیں چاہا کہ وہ کسی کتاب
کو ہاتھ لگائے، کچھ پڑھے، پھر سو رہے۔ اور مُردوں کی طرح اپنے
آپ کو تازہ دم کرلے۔ وہ آنکھیں بند کئے یوں ہی لیٹا رہا۔ لیکن
اُس کا ذہن فرار کے لئے کسی نہ کسی سہارے کی تلاش میں تھا۔
اور آخر وہ ماضی کا سہارا لے کر پُرانی یادوں کو کُریدنے میں مصروف
ہو گیا۔

یوں تو جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا۔ دنیا اُسے
آنکھیں دکھا رہی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی وہ اپنے آپ کو ایک
سنجیدہ معمر انسان کی طرح محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن اس تمام
تپتی ہوئی کڑی دھوپ اور چٹیل میدان سی زندگی میں صرف
طالب علمی کا ہی ایک ایسا زمانہ تھا جو اُسے سایہ دار درخت کی
طرح معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا ذہن سُستانے کے لئے وہیں
رُک گیا۔ اسکول سے لے کر ڈگری کے آخری سال تک اُسے
اپنے ساتھیوں کا خیال آنے لگا۔ کون کہاں گیا۔ زندگی کی دوڑ میں
کس نے میدان مارا اور کون کھیت رہا۔

عالم خان نہ معلوم کس طرح ماسٹروں کے سہارے کھینچ
تان کر پرائمری سے مڈل سکول تک لایا گیا۔ وہ پشاور کا رہنے
والا تھا۔ چھوٹی عمر ہی میں لمبا چوڑا قد آور جوان نظر آتا تھا۔ اُسے
پڑھنے لکھنے سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اُس کا باپ کبھی
مار کے سہارے۔ کبھی پیار اور کبھی اپنی دولت کے سہارے
اُسے پڑھانے پر تلا ہوا تھا۔ وہ اُسے مار پیٹ کر اسکول چھوڑ آتا۔
لیکن وہ جب چاہتا وہاں سے غائب ہو جاتا اور سارا وقت
کسی پارک، کسی ہوٹل یا کہیں کھیل کود میں بِتا کر گھر پہنچ
جاتا۔ مہینہ بیس روز بعد جب اُس کے باپ کو معلوم ہوتا وہ
پھر کسی نہ کسی طرح اسکول پہنچا دیتا۔ اسی طرح اسکول
سے غیر حاضری پر اُسے آئے دن سزا ملتی۔ لیکن جب کبھی اُسے
سزا ملتی وہ بید پڑنے سے پہلے ہی چلانا شروع کر دیتا۔ "ہائے
مر گئے ماسٹر جی، ہائے مر گئے ماسٹر جی۔" اور جب بید تیزی سے
برسنے لگتے تو وہ سارے کلاس روم میں اِدھر سے اُدھر یوں طرح
دیتا پھرتا کہ سارے کے سارے بید کسی ڈیسک، کسی بینچ یا کسی
دیوار پر پڑتے۔ ماسٹر جی اس طرح اپنا نشانہ مسلسل چوک جانے
اور بغیر چوٹ لگے یوں چلانے پر اور جھنجلاتے اور طیش میں آکر
اپنے بید کی رفتار زیادہ تیز کر دیتے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ
بھی کہتے جاتے۔ ماسٹر جی کیوں مر گئے تو کیوں نہ مر گیا۔ لیکن
وہ کچھ ایسی دردناک آواز بنا کر نکالتا کہ سُننے والوں کا دل ہل جاتا
اور ماسٹر جی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ یہ سب شرارتاً کر رہا ہے
کچھ نہ کر سکتے اور مجبور ہو کر اُن کا ہاتھ خود بخود رُک جاتا۔

اُسے پڑھنے لکھنے سے اتنی نفرت کیوں تھی۔ یہ بات
کوئی دل میں جھانک کر نہ دیکھ سکا۔ اور نہ سمجھ سکا۔ ماسٹر کی
بید اور باپ کی مار نے اُس کے دل میں جو نفرت پیدا کر دی
تھی وہ آہستہ آہستہ بغاوت کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ وہ
جب چاہتا اسکول سے غائب ہو جاتا۔ اس طرح غائب ہونے
پر جس روز اسے سزا ملتی وہ چھٹی کے بعد باہر نکل کر بہت خطرناک
شرارتیں کرتا۔ کبھی سڑک پر سے کسی کا تانگہ لے اُڑتا۔ اُسے
خوب شہر کی سڑکوں پر دوڑاتا اور جہاں چاہے چھوڑ کر چل دیتا۔
اور کبھی سادھوؤں کی ٹولی میں بیٹھ کر سُلفہ کا دم لگاتا۔ اور دھوئیں
کے ایسے بادل چھوڑتا کہ سادھو بھی متعجب ہو کر ایک دوسرے
کا منہ تکنے لگتے اور وہ فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے دھوئیں کو
یوں دیکھنے لگتا۔ جیسے وہ ساری دنیا کو سُلفہ کی طرح پھونک
ڈالے گا۔ اور زندگی کو دھوئیں کی طرح اُڑا ڈالے گا۔ پھر یکایک
ایک روز وہ اسکول اور گھر سے ایسا غائب ہوا کہ اور نظر نہ آیا۔
مدت کے بعد بڑے بڑے اخباروں میں گورنر سے ہاتھ ملاتے
ہوئے اُس کی تصویریں اُس نے دیکھیں۔ تمام بڑے بڑے
شہروں میں اُس کے ریس کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

پھر کالج میں اُسے بہت سے ساتھی ملے۔ پھول سنگھ
مارواڑی تھا۔ اُس کا باپ کپڑے کا معمولی آڑھتی تھا۔ اُس

کی آرزو تھی۔ کہ خاندان میں اُس کا ایک بیٹا تو بی اے پاس کرلے لیکن پھول سنگھ ابھی کالج کے پہلے سال میں ہی تھا کہ اُس کا باپ مرگیا۔ اور اُس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ باپ کے مرتے ہی پھول سنگھ نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ اُس وقت اُسے پھول سنگھ کی بیوقوفی پر تعجب ہوا تھا۔ اور اس نے پھول سنگھ سے کہا تھا کہ وہ اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر غلطی کر رہا ہے۔ لیکن اُس نے جواب میں کہا تھا۔ بھائی اگر کاروبار رہے گا اور پیسہ ہوگا تو بہت سی ڈگریاں خرید لوں گا۔ پھر جب وہ بی اے پاس کرکے بیکار پھر رہا تھا۔ پھول سنگھ نہ جانے کتنی انڈسٹریز کا منیجنگ ڈائرکٹر تھا۔ چیرمین ہو چکا تھا۔ اُس کی تصویریں اور سالانہ تقریریں بڑے بڑے اخباروں میں شائع ہوتیں۔ اِن تقریروں کو دیکھ کر اُسے خیال آتا، پھول سنگھ سچ ہی کہتا تھا۔ یہ قابلیت اُس کی نہیں، اُن دماغوں کی ہے جنہیں اُس نے خرید لیا ہے۔

پھر اُس کے ذہن میں بالی آیا۔ وہ تندرست پنجابی لڑکا تھا جسے سوائے ہنسنے، کھانے اور کھیلنے کے دوسرا کوئی کام نہ تھا۔ پڑھنے لکھنے میں بھی اُسے کبھی سنجیدہ نہیں دیکھا۔ لیکن اُس نے کسی نہ کسی طرح بی اے پاس کر ہی لیا۔ بی اے کے بعد نہ معلوم وہ کس طرح وہ پیرس پہنچ گیا اور وہاں سے سال بھر میں عورتوں کے بال بنانے اور بیوٹی ایکسپرٹ کا ڈپلوما حاصل کرکے واپس آگیا۔ جانے سے پہلے اُس نے بالی کو چھیڑتے ہوئے طنزاً کہا تھا۔ کیا واقعی تم حجام بننے جا رہے ہو۔ میں تو سمجھا تھا کوئی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جا رہے ہو۔ تب بالی نے اُس کے جواب میں ہنس کر کہا تھا۔ تمہاری اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے سڑکوں پر پھرنے اور اپنے سر کے بال گنوانے سے تو بہتر ہے کہ دوسروں کے سر کے بال ہی تراشا کروں۔ پھر جب وہ واپس آگیا تو اُس کا کاروبار دیکھتے ہی دیکھتے تیزی سے چمکنے لگا۔ اُن دنوں جب پاؤ روٹی راشن میں ملنے لگی تھی اور اُسے اپنی ماں کے لئے ایک پاؤ روٹی حاصل کرنے کے لئے ایک بڑے ہوٹل کے سامنے گھنٹوں لائن میں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ بالی کی دکان کے سامنے کاروں کی لائن لگی رہتی اور اُس میں ماڈرن بیویوں کے دولت مند خاوند اور ان کے ڈرائیور بیٹھے انتظار کرتے رہتے۔

پھر اُس کا ذہن زیب اور داور کی طرف گیا۔ زیب تو اُس کے نزدیک ترین دوستوں میں سے تھا۔ کیوں کہ وہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ اُس کی اپنی ہمت تو بی اے سے آگے نہ ہو سکی۔ لیکن زیب نے کسی نہ کسی طرح ایم اے کر ہی لیا۔ کالج سے نکلنے کے بعد وہ ایک دوسرے سے نہ مل سکے تھے اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ کون کس حال میں ہے۔ اِتفاقاً ایک روز زیب اُسے راستے میں ملا تو اُس نے بتایا کہ اُسے ایک اِسکول میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ٹیچر کی جگہ بمشکل ملی ہے، اور پھر وہ خود ہنس کر کہنے لگا۔ لطف تو یہ ہے کہ اسکول کے بس ڈرائیور کو مجھ سے کچھ زیادہ ہی ملتا ہے۔

اور داور تو خیر ایم اے کے پہلے سال میں ہی تھا کہ اُس نے بڑی بھاگ دوڑ، جوڑ توڑ اور سفارشوں کے بعد ایک بڑی کمپنی میں پانچ سال کے معاہدہ پر معقول جگہ حاصل کرلی۔ لیکن وہ اُس سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ بہت آگے بڑھ جانا چاہتا تھا اور اُونچے معیار کی اعلیٰ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو اچھے مشنری اِسکول میں تعلیم دِلا رہا تھا۔ ایک بچّے کی تعلیم پر سو روپیہ ماہوار خرچ ہو جاتا تھا۔ پھر اُس کے تو چار بچّے تھے۔ بڑے ہونے پر اُنہیں کسی اُونچی تعلیم کے لئے ولایت بھیجنا بھی ضروری تھا تاکہ وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ اُسے ابھی سے اُن کے مستقبل کی فکر تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی اولاد اُس کی طرح ملازمت کے لئے پریشان پھرے، اِسی لئے جو کچھ گھر میں آتا وہ خرچ ہو جاتا۔ لیکن داور کسی نہ کسی طرح اُن اخراجات کو پورا کرتا۔ اور اپنی زندگی کے معیار کو قائم رکھتا۔

داور کا خیال آتے ہی اُسے یاد آیا کہ اُس نے شام کو چائے پر بلایا ہے۔ وہ اپنے اُن دوستوں سے جو کسی رتبے پر پہنچ چکے تھے خود ہی کبھی نہیں ملتا تھا۔ لیکن اِن سب میں ایک داور ہی ایسا تھا جس کی خوش اخلاقی اُسے ملنے کے لئے مجبور کر دیتی تھی۔ لیکن شام کو چائے پر آنے کے لئے اتنا خلوص تو اُس نے بھی پہلے کبھی نہیں دکھایا تھا اُس نے سوچا کہ اِس سے کسی کا کیا کام ہوگا سکتا ہے۔ اور اُس کے پاس کسی کو کچھ دینے کے لئے ہے بھی کیا؟

۳

شام کو جب وہ گھر سے نکلا تو دادر کے گھر تک پہنچنے کے لئے اُسے دو تین میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا تھا۔ راستے میں سڑک پار کرنے کے لئے جہاں کہیں اُسے چند منٹ کے لئے کھڑا رہنا پڑتا اُس کے سامنے سے خوبصورت کاروں کا کارواں سا بہتا چلا جاتا اُس وقت اُسے خیال آتا، اگر ٹریفک کی سُرخ بتّی روشن نہ ہو تو اُسے گھنٹوں یوں ہی کھڑا رہنا پڑے اور وہ سوچنے لگتا، کیا ان کاروں، سڑک کے دونوں طرف پھیلی ہوئی ملٹی سٹوری بلڈنگوں اور جنّت نشاں بڑے بڑے ہوٹلوں کی افراط ہماری خوش حالی کی نشانی ہے۔ اگر یہ خوش حالی ہے تو پھر شاہراہ پر رکھے ہوئے کوڑے کے ڈرم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے یہ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں۔ وہ عورت بجھے ہوئے کوئلے کی راکھ میں سے چُن چُن کر جمع کر رہی ہے۔ وہ دُہری کمر والا بوڑھا کندھے پر پڑی ہوئی بوری میں پھٹے پُرانے کاغذ تلاش کر کے ڈال رہا ہے۔ وہ چھوٹی سی لڑکی جھوٹے پتّے میں پڑے ہوئے دال چاول مٹّی صاف کر کے کھا رہی ہے۔ اور وہ ننگ دھڑنگ چھوٹا سا بچہ بھوک سے بے تاب ہو کر اپنی ماں کے لئے چلّا کر رو رہا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ اُس کی ماں ابھی ایندھن کے لئے کوئلہ تلاش کر کے جمع کر رہی ہے۔ بچّے کے پاس ہی ایک کتّا اپنے پنجوں سے کوڑے کے ڈھیر کو کُرید کُرید کر ادھر سے اُدھر پھیلا رہا ہے۔ شاید اُسے بھی ان انسانوں کے ساتھ روٹی کی تلاش ہے۔ اُسے ایک روٹی کا ٹکڑا مل گیا ہے۔ جسے اُس نے روتے ہوئے بچے کے سامنے ڈال دیا ہے۔ اور خود دُم ہلاتے ہوئے اُس کے سامنے بیٹھ گیا ہے بچّہ خاموش ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ رہا ہے۔

پھر چلتے چلتے اُس کی نظر فٹ پاتھ پر پھیلے ہوئے خانہ بدوش پر پڑی۔ شاید انسان پھر سے اپنی تاریخ کو دُہرا رہا ہے اور گھروں کو چھوڑ کر میدانوں میں آبسا ہے۔ اوپر بالکنی پر سے کسی نے تربوز کے چھلکے فٹ پاتھ پر پھینک دیئے ہیں۔ ایک پاگل ان چھلکوں پر جھپٹا ہے۔ چھلکوں پر سُرخ گودے کی ایک ہلکی سی تہہ باقی ہے پاگل نے مٹی سے لتھڑا ہوا ایک چھلکا اٹھا کر کھانا شروع کر دیا ہے لیکن ایک دو مُنہ مار کر اُسے وہیں پھینک دیا ہے۔ وہ پھر وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا ہے اور کوئلے سے برابر برابر زمین پر لکیریں کھینچ رہا ہے۔ اور ساتھ ہی اُن کو گنتا بھی جا رہا ہے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ وہ پھر ان لکیروں کے نیچے دوسری پانچ لکیریں کھینچتا ہے۔ پانچ تک گنتا ہے۔ اور ہر پانچ پر چند لمحہ رُک جاتا ہے۔ شاید وہ پنج سالہ منصوبوں کا حساب لگا رہا ہے۔ وہ کون سا منصوبہ ہوگا۔ جب اُسے پیٹ بھر کھانا اور تن بھر کپڑا ملے گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ پاگل ہے۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اگر وہ پاگل نہ ہوتا تو پنج سالہ منصوبوں کے بجائے پاگل ہونے والوں کی گنتی کرتا اور یہ حساب لگاتا کہ ہر پانچ سال میں بھوک اور مفلسی سے پاگل ہونے والوں میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔؟

سارے راستے وہ نگاہوں سے اوروں کا غم اپنے دل میں سمیٹتا رہا اور سوچتا رہا۔ غم دوسروں کا ہو یا اپنا۔ اُسے تو لباس کی طرح ہمیں ہر وقت پہنے ہی رہنا ہے اور اپنے جسم سے چمٹائے ہی رکھنا ہے۔

۴

جب وہ دادر کے گھر پہنچا تو اُسے اپنا منتظر پایا۔ بڑا پُر جوش استقبال اور بڑی خاطر اُس کی ہوئی۔ چائے کی میز لوازمات سے بھرپور دیکھ کر اُس کی تھکان یوں ہی آدھی رہ گئی اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرنے لگا۔ پھر ماضی کی پُرانی یادیں تازہ کرنے میں بھی لُطف آنے لگا۔ اور اُس دَور کے لاعلاج ناسور، بے روزگاری اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے زخموں کو کُریدنے میں بھی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ خیر ان زخموں کو کُریدنا تو ہر وقت ہر گفتگو میں روزانہ کا معمول ہی تھا۔ پھر جب اُن دونوں کے پاس باتیں کرنے کے لئے کچھ نہ رہا تو دادر نے ریڈیو آن کر دیا۔ ٹیپ ڈانس کے ساتھ ہسپانوی موسیقی کی پُر جوش دُھن کمرے میں چاروں طرف بکھر گئی۔ زندگی کے ہاتھوں ایک مستقل شکست خوردہ احساس اور مایوسی کے باوجود اُس کا جی چاہا۔ کہ وہ اُٹھ کر اِس دُھن پر خود رقص کرنے لگے اور زندگی کو بھی رقصاں کر دے۔ اُس وقت وہ سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ لیکن کبھی

کبھی ایک بے چینی اُس کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ داور نے اُسے کیوں بُلایا ہے۔ اور وہ کیوں اس کی اتنی خاطر کر رہا ہے۔ کافی دیر تک موسیقی اُن کے احساسات کے گرد اپنا خوب صُورت جال بُنتی رہی۔ پھر یکایک موسیقی کا پروگرام ختم ہو گیا۔ اور داور نے خود ہی ریڈیو بند کرتے ہوئے اُس سے کہا۔ میں نے تمہیں ایک کام کے لئے بُلایا ہے۔ اگر تم یہ کام کر سکے اور کام ہو بھی جائے تو ہم دونوں کو کچھ رقم مِل جائے گی۔ میں یہ کام کسی اور سے بھی کرا سکتا تھا۔ لیکن سوچا کہ تم ضرورت مند ہو کچھ فائدہ تم کو بھی پہنچ جائیگا

شاہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور غور سے داور کی بات سُننے لگا۔ داور نے اپنا سِلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بات یہ ہے کہ میرے اختیار میں کچھ سپلائی کا کام ہے جو ایک کمپنی کو پہلی مرتبہ دیا جانے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اُن لوگوں سے مِل کر کمیشن کی بات کر لو میرا براہِ راست بات کرنا مناسب نہیں۔ وہ لوگ اگر راضی ہوں گے تو اپنا آدمی میرے پاس بھیج دیں گے۔ پھر میں خود سمجھ لونگا۔ اگر کام بن گیا تو تمہارا حصّہ بھی رہے گا۔ کام کچھ مشکل نہیں ہے کسی سے بات کرنی ہوگی اور کیا کہنا ہوگا۔ یہ سب تفصیل میں تمہیں سمجھا دوں گا۔ داور کی بات سُن کر وہ حیرت سے اُس کا مُنہ تکنے لگا۔ اور سوچنے لگا، رشوت کا نام کمیشن رکھ دینے سے کیا وہ رشوت نہیں رہتی۔ اور کیا یہ وہی داور ہے جس نے اُصول اور سچائی کی خاطر اسٹرائک کرانے کے جُرم میں کالج سے نکالے جانے اور ایک سال کھو دینے پر بھی معافی نہ مانگی تھی۔

شاہ کے اس طرح سوچتے رہنے پر داور نے کچھ اندازہ کر لیا۔ کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اور اُس نے ہنستے ہوئے کہا جب کوئی لیڈر یا منسٹر رشوت لیتا ہے تو وہ نذرانہ کہلاتا ہے اور جب کوئی بڑا سرکاری افسر لیتا ہے تو وہ تحفہ یعنی پریزنٹ ہو جاتا ہے اور جب کوئی مجھ جیسا غریب آدمی کسی کا کام کرنے کے بعد بھی کچھ محنتانہ لے تو اُس کا نام رشوت ہو جاتا ہے۔ شاہ کو اس بات پر ہنسی آ گئی اور وہ کہنے لگا تم اسے چاہے جو کچھ کہہ لو۔ گنہگار کی منطق تو کچھ نہ کچھ ہوا ہی کرتی ہے۔ داور نے فوراً جواب دیا۔ تم ابھی نہیں سمجھو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں سے جب خیالوں کے شیش محل، بلوریں اُصول، آدرش اور آئیڈیل لے کر باہر کی دُنیا میں نکلتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ دُنیا پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ یہاں اِنسانوں کے بجائے پتھر ہی پتھر بستے ہیں۔ اور اِن پتھروں سے ٹکرا کر ہمارا وہ سب اثاثہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ پھر اِن ٹوٹی ہوئی کرچوں کو اگر ہم مضبوطی سے تھامے رکھیں تو سوائے اپنے آپ کو لہولہان کرنے اور خاموشی سے مر جانے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ میں اِس طرح مر جانے کو سچّائی نہیں خود کشی سمجھتا ہوں۔ مانو یا نہ مانو حقیقت یہی ہے۔ اِس دَور میں ایک اِنسان کی طرح زندہ رہنا بہت بڑا ہُنر ہے۔ اگر اِس ہنر کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو کچھ نہ کچھ عیب کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر تمہارے ہر عیب پر خود ہی پردہ پڑ جائے گا اور ہر عیب ایک ہُنر بن جائے گا۔

وہ داور کی باتیں خاموشی سے سُنتا رہا۔ اُس وقت وہ کسی بحث میں پڑنے کے موڈ میں نہ تھا۔ یوں بھی اُس نے سوچا کہ داور ٹھیک ہی کہتا ہے۔ پھر اُس نے داور کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ مجھے نہ کسی عیب و ہُنر سے مطلب ہے نہ کسی معاوضہ کی خواہش ہے۔ ایک دوست کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ تمہارا جو بھی کام ہو میں اُسے کر دوں۔ اور پھر تم مجھے کتنے عزیز ہو۔ اس زمانے میں جب میرے لئے اپنے پرائے سب انجان بنے ہوئے ہیں تم کم از کم پُوچھ تو لیتے ہو۔ میرے دُکھ درد میں شریک تو ہو جاتے ہو۔ یہی کیا کم ہے میرے لئے۔ داور پر اِس بات کا بہت اثر ہوا، اور اُس نے کہا۔ ارے بھائی یہ تکلّف اور غیریت کی باتیں چھوڑو۔ اب کچھ کام کی باتیں کرو۔ پھر اُس نے کام کے بارے میں سب تفصیل اُسے سمجھائی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کس سے ملنا ہے اور کیا بات کرنی ہے۔

۵

جب وہ داور کے گھر سے چلا تو اُس کا مُوڈ بہت اچھا تھا۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ زندگی سڑکوں کا سینہ کوٹتے کوٹتے تھک کر آہستہ آہستہ رات کی چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی اور اُسے خاموشی بہت پسند تھی۔ زندگی کے ہنگامے اور شور و غُل کو دفن کر دینے والی خاموشی۔ لیکن اُس کے دماغ میں خاموشی نہ تھی۔ کئی

ہنگامے اُٹھ رہے تھے وہاں۔ وہی تکلیف دہ صبح۔ وہی شام۔ وہی دن، وہی رات۔ آخر ایسا کیوں۔ ناکامی کے احساس نے اُس کے دماغ میں بارود سا بھر دیا تھا۔ اور اُس کا دل چاہا کہ وہ اِن سب بازاروں کو آگ لگا دے۔ اِس ساری دنیا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے

گھر تک پہنچتے پہنچتے اُسے پھر اِن ہی مایوسیوں اور نااُمیدیوں نے گھیر لیا۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ خوف کا وہی احساس جو اُسے ہر وقت گھیرے رہتا تھا پھر اُس پر چھا گیا۔ مستقبل کا خوف، آنے والی کل کا خوف، بیکاری کا خوف، بھوک اور پیاس کا خوف اور نہ جانے کتنے خوف تھے جو اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہے تھے۔ اِس بھری پُری دُنیا میں تنہائی کا احساس بھی شاید اسی خوف کی دین معلوم ہوتا تھا۔

گھر پہنچا تو ماں کھانا لئے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اُس نے ماں سے کہا کہ وہ بہت کچھ کھا پی کر آیا ہے۔ اسے بھوک نہیں ہے۔ وہ اور کچھ نہیں کھائے گا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے یہ کہنے پر وہی کھانا جو ماں نے اُس کے لئے رکھا تھا وہ خود کھانے بیٹھ گئی ہے۔ وہ سوچنے لگا اگر یہ کھانا وہ خود کھا لیتا تو ماں بھوکی رہ جاتی۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ ماں نے اور ایسا ہی کیا ہوگا۔ خود بھوکا رہ کر اُسے کھلایا ہوگا۔ اپنی بےبسی پر اُس کا دل اندر سے رونے لگا۔

کھانے کے بعد ماں خاموش رہی۔ اُس نے کسی سے بات نہیں کی۔ اپنے بیٹے سے بھی نہیں۔ ـــ وہ سمجھ گیا کہ آج ضرور بابا کے ساتھ کچھ جھپٹ ہوئی ہے۔ کیوں کہ بابا چارپائی پر لیٹے لیٹے اُس وقت وہی مصرع گنگنا رہا تھا جو کسی مشکل کے پڑنے پر یا ماں سے جھگڑا ہونے پر وہ اکثر گنگنایا کرتا ہے، ع:

"مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی"

اور وہ گھڑیاں گزر ہی جاتیں۔ وہ بھلا کب اور کس لئے رُکنے والی ہیں۔ یہ تھا اُس کی زندگی کا سیدھا سادھا سا فلسفہ۔ اسی لئے وہ اپنی زندگی کے زخم اور اُس کی تکلیف کبھی اپنی پیشانی پر نمایاں نہیں ہونے دیتا تھا۔ شاہ اکثر اپنے بابا کے بارے میں سوچتا کہ وہ اتنا پُرسکون اور مطمئن کیوں ہے۔ وہ اُس کی طرح غصّہ، جھنجھلاہٹ، نااُمیدی اور مایوسی میں مبتلا کیوں نہیں ہوتا۔ تخریب کی باتیں کیوں نہیں سوچتا۔ پھر اُسے خیال آتا۔ یہ بوڑھا مضبوط سایہ دار درخت کتنا عظیم ہے۔ جس کے سہارے وہ ابھی تک کھڑا ہے۔

گھر کی اِس خاموش اور اُداس فضا کو بدلنے کے لئے اُس نے دا آور کا ذکر چھیڑ دیا اور وہ سب باتیں سُنا دیں جو اُس سے ہوئی تھیں۔ اُس کا خیال تھا کہ کمیشن کی بات سُن کر اُن دونوں کو ذرا تسلّی ہوگی اور وہ خاموش ہو جائیں گے۔ لیکن اُس کی ماں نے ساری بات سُن کر اُس سے کہا۔ وہ تجھے کتنے روپے دے گا۔ چار سو، پانچ سو یا بہت سے بہت ہزار بھی دے دے گا تو اس سے تیرا کیا بھلا ہوگا۔ مہینہ بیس روز میں کھا پی کر بیٹھ جائے گا۔ اور دو چار دن اچھے گزارنے کے بعد پھر بُرے دن اور زیادہ اکھرنے لگیں گے۔ وہ اِتنا اختیار والا ہے تو اُس سے کہہ، کہ وہ کوئی اچھا سا کام یا ملازمت دلا دے۔ یہ کمیشن ومیشن کا روپیہ ہمیں نہیں چاہئے۔ ماں کی یہ بات اُس کی سمجھ میں تو آ گئی۔ لیکن بابا کی سمجھ میں یہ فلسفہ نہ آیا۔ اور اُس نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بھاگوان، آئی ہوئی مایا کو ٹھکرانا بھلا کون سی عقلمندی ہے۔ وہ مولوی صاحب والا قصّہ سُنا ہے تم نے۔ پھر وہ اُٹھ کر مولوی صاحب والا قصّہ سُنانے لگا..... ایک مولوی صاحب تھے۔ ایک روز صبح جب وہ کسی کام کے لئے باہر گئے تو محلّے میں سے کسی کا مُرغا اُن کے گھر میں گھس آیا۔ مولویانی نے اُسے اللہ کی دین سمجھ کر پکڑ لیا اور ذبح کر کے بھون ڈالا۔ کھانے کے وقت جب مولوی صاحب آئے تو انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ دسترخوان پر مُرغ پکا رکھا ہے۔ اُنہوں نے مولویانی سے پوچھا تو مولویانی نے کہا۔ بس یوں سمجھو اللہ ہی نے بھیجا تھا۔ آپ ہی گھر میں گھس آیا۔ مولوی صاحب یہ سُن کر بولے، اوہو، یہ تو حرام ہو گیا۔ لیکن بھلا بھوکے بھی کیسے رہتے۔ اِدھر کھانے کی خوشبو بھی دماغ اور ایمان دونوں میں خلل ڈالے دے رہی تھی۔ مولوی صاحب کچھ سوچ کر بولے، ٹھیک ہے۔ گھی اور مصالحہ تو میری حلال کی کمائی کا ہے۔ تم مجھے صرف شوربہ دے دو۔ ـــــ مولویانی بھرا ہوا پیالہ اُٹھا کر پلیٹ میں شوربہ اُلٹنے لگیں تو پیالے میں سے بوٹیاں بھی نکل کر پلیٹ میں آنے لگیں۔ مولویانی نے چمچہ آگے لگا کر اُن کو روکنا چاہا تو مولوی صاحب جلدی سے بولے۔ ہوں اہوں، روکو

مت۔ جو آپ سے آتی ہیں آنے دو۔ قصہ سُنا کر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اور اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ سمجھیں ؟ اِسی لئے کہتا ہوں جو مایا آپ سے آتی ہے وہ آنے دو۔ تم بھی بھلا کس چکر میں پڑی ہو۔ بیوی نے فوراً تڑخ کر جواب دیا۔ تمہاری عقل تو ٹھکانے نہیں۔ اولاد کو بھی اُلٹے پلٹے مشورے دیتے ہو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روپیہ نہیں لینے سے اس پر کچھ بوجھ بھی رہے گا اور وہ کچھ کردے گا۔ اور روپیہ لینے کے بعد تو بات ہی ختم ہو جائے گی۔ پھر کوئی کسی کے لئے کچھ کرتا ہے۔ یہ تو لینے کا دینا ہوا کرتا ہے۔

گھر کے معاملے میں بیوی کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ہی اُس کا اصول تھا۔ اور اسی میں وہ اپنی اور گھر کی بھلائی سمجھتا تھا۔ چنانچہ حسبِ عادت وہ سب کچھ اُس پر چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

۶

دوسرے روز داور کی ہدایت کے مطابق شاہ اُس کمپنی کے متعلقہ افسر سے ملا۔ وہاں بات طے کرنے میں اُسے زیادہ دیر نہ لگی، کیونکہ وہ لوگ تو پہلے سے ہی تیار بیٹھے معلوم ہوتے تھے۔ اُنہوں نے شاہ کی بڑی خاطر تواضع کی اور گھر تک پہنچانے کے لئے کار بھی دی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اُن کا نمائندہ براہِ راست داور سے مل کر فیصلہ کرلیگا۔ شاہ نے داور کو نتیجے سے مطلع کر دیا۔ اور وہ یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔

اِس بات کو دو تین مہینے گزر گئے۔ لیکن شاہ کو اس کے بعد کوئی خبر نہیں ملی۔ اُس نے خود بھی ایسے حالات میں داور سے ملنا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر ایک روز یکایک داور خود ہی اُس کے گھر آیا۔ سب سے پہلے اُس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور شاہ کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے تین ہزار ملے تھے۔ اس میں سات سو ہیں۔ یہ تمہارا حصّہ ہے۔ شاہ کا ہاتھ فوراً آگے بڑھا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ یہ روپیہ نہ چھوڑے۔ کتنی ضرورتیں گھر کی رُکی ہوئی ہیں۔ اور وہ خود بھی کتنا تھکا ہوا ہے۔ کچھ دن سب آرام ہی کریں گے۔ لیکن پھر اُسے ماں کی بات کا خیال آیا اور اُس نے روپیہ لینے سے اِنکار کر دیا۔

داور کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا اور اُس نے کہا تم یا تو بہت بڑے بے وقوف ہو یا پھر بہت بڑے اِنسان ہو۔ لیکن دونوں صورتوں میں تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو۔ جس وجہ سے تم یہ لینے سے اِنکار کر رہے ہو وہ سب ضمیر کے بہلاوے ہیں، اور شیشے کے کھلونے۔ ایک روز وقت آنے پر تم خود ہی اِن کو توڑ ڈالو گے۔ ابھی تمہارا باپ زندہ ہے۔ ذمہ داری بھی کچھ نہیں ہے۔ ہر طرح کے کھلونوں سے دل بہلا سکتے ہو۔

کچھ دیر توقف کے بعد اُس نے پھر کہا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ گناہ و ثواب تو میری گردن پر ہے۔ تم پر کیا بوجھ پڑ رہا ہے جو لینے سے گریز کر رہے ہو۔ شاہ نے یہ بات سُن کر بڑی محبت سے کہا۔ بھائی خدا کے لئے تم مجھے غلط نہ سمجھو۔ بات وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ پھر اُس نے ماں کی ساری ہی بات اُسے کہہ سُنائی۔ کہ وہ اگر واقعی اُس کی کچھ مدد کرنا چاہتا ہے تو اُسے کوئی مناسب ملازمت دلا دے۔ اِس روپیہ سے اُس کا کچھ نہ بھلا ہو گا۔ داور یہ بات سُن کر پہلے تو خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ٹھیک ہے۔ اِس کے لینے یا نہ لینے سے تمہارے لئے میری کوشش میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا تمہارے لئے ضرور کرونگا۔

داور کے اصرار پر شاہ نے لفافہ لے لیا۔ معلوم نہیں کتنے دنوں سے وہ نیند بھر کر سویا نہ تھا۔ دو چار روز میں ہی اُسے محسوس ہوا کہ وہ بھی زندہ ہے۔ اور اس کی زندگی بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔ محلہ کا شور و غل اور اُونچی آواز میں بجتے ہوئے ریڈیو بھی اُسے اب بُرے نہیں لگ رہے تھے۔ دُنیا کی ہر چیز میں کچھ دنوں کے لئے کشش سی نظر آنے لگی تھی۔

شاہ کو کچھ اُمید نہیں تھی کہ داور اپنے وعدے کو یاد رکھے گا۔ اِس بات کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اور وہ خود بھی بھول چکا تھا۔ اُس نے سوچا کہ داور کو اب کہاں خیال رہا ہو گا۔ لیکن خلافِ اُمید ایک روز اُسے ایک کمپنی کی طرف سے خط ملا۔ جس میں داور کا حوالہ دیا گیا تھا اور اُسے انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا۔

خط پڑھ کر اُسے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ داور کے متعلق اُسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ واقعی اِس مطلبی اور خود غرض دُنیا میں کچھ انسانوں کا ہونا بھی ضروری ہے ورنہ یہ دنیا ختم ہی ہو جائے۔ اُس کے دل میں داور کے لئے بے اندازہ محبت اور عزت پیدا ہو گئی تھی۔ یوں تو انٹرویو کے لئے وہ بارہا جا چکا تھا۔ اور پہلے تو وہ اس کے لئے بڑی تیاریاں بھی کرتا تھا۔ لیکن اب آہستہ آہستہ اُس کے لئے یہ اہمیت ختم ہو چکی تھی کیونکہ

انٹرویو کا نتیجہ کیا ہوگا وہ جانتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ داور کی سفارش کی وجہ سے اُسے یقین کی حد تک اُمید ہو گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ کام ضرور ہو جائے گا۔ وہ ہر طرح سے انٹرویو کے لئے تیار ہو کر جانا چاہتا تھا، ایک دن تو انتظام میں ہی نکل گیا۔ ایسے موقع کے لئے احتیاط سے رکھے ہوئے سوٹ کو پریس کرایا۔ درخواست اور سرٹیفکیٹ کی نقلیں ٹائپ کرائیں۔ دوسرے روز صبح سویرے اُٹھ کر ہی وہ تیاری میں مشغول ہو گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے ہر طرح سے آئینہ کے آگے اپنی شخصیت کو جانچا۔ اُسے کم از کم ایک بڑے افسر کی طرح دیکھنے والے کو متاثر کرنا چاہیے۔

جب وہ آفس پہنچا تو اُسے یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ انٹرویو میں دوسرا کوئی اُمیدوار نہیں ہے۔ صرف اُسے ہی خاص طور پہ بُلایا گیا ہے۔ خبر پہنچتے ہی بڑے صاحب نے اُسے فوراً اندر بُلا لیا۔ اور بڑی عزت سے اُس کا استقبال کیا۔ بیٹھتے ہی جو پہلا سوال اُنہوں نے اُس سے کیا وہ یہ تھا کہ آپ چائے پئیں گے یا کولڈ ڈرنک۔ شاہ کو انٹرویو کی اس نوعیت کا اندازہ نہ تھا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ بڑے صاحب نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس دوران میں وہ داور کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ بڑے ہیرا آدمی ہیں۔ بڑا خیال رکھتے ہیں ہمارا۔ اُنہیں کے دم سے بہت کچھ کام ہو جاتا ہے۔ غرض وہ تعریفیں کرتے رہے۔ اتنے میں چائے بھی آ گئی۔ چائے ختم ہوتے ہی بڑے صاحب نے کہا۔ ٹھیک ہے بس۔ آپ کل سے آ جائیے اور اپنا کام سنبھال لیجئے۔ تنخواہ اگرچہ کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن ان حالات میں گزارہ کے لئے بُری بھی نہ تھی۔ اُسے بڑا تعجب تھا۔ ایسا انٹرویو تو اُس نے زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ نہ سُنا تھا۔ نہ تجربے کی پُرسش ہوئی، نہ عمر اور نہ درخواست کا ہی سوال ہوا۔ سرٹیفکیٹ بھی سب یوں ہی اُس کی جیب میں رکھے رہ گئے۔

شاہ کو کام کرتے ہوئے کئی مہینے گزر گئے۔ اپنے اُصول کے مطابق وہ بہت ایمانداری اور محنت سے کام کر رہا تھا۔ کام کچھ زیادہ نہ تھا۔ صرف بڑے بڑے افسروں سے ملنا۔ کوئی پرمٹ یا لائسنس اٹک گیا ہو تو اُسے نکلوانا۔ پارٹیاں دینا، کمیشن طے کرنا اور اُسے افسروں تک پہنچانا۔ یا پھر ریس کورس جا کر جیتے ہوئے ٹکٹ زیادہ قیمت میں خریدنا اور اس طرح کمپنی کے کالے روپیوں کو سفید بنانا۔ کیونکہ ریس میں جیتا ہوا روپیہ قانوناً جائز ہوتا ہے۔ یا ایسے ہی دوسرے کام جو بڑے صاحب یا اور کسی کے لئے کرنے مُشکل ہوتے اُسے ہی کرنے پڑتے۔

یوں تو فیکٹری اور آفس سے مُتعلق سیکڑوں کام کرنے والے تھے۔ لیکن بڑے صاحب کے آفس اسٹاف میں اُس کے علاوہ بڑے بابو، جو آفس کے سب ہی کاموں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ چھوٹے بابو ان کے اسسٹنٹ تھے۔ رام لال روپیہ پیسہ کھاتہ اور حساب کتاب کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اور بیک وقت کیشیئر، اکاؤنٹینٹ سب ہی کچھ تھا۔ اپنے آپ کو میٹرک پاس کہتا تھا۔ لیکن انگریزی نہ بول سکتا تھا نہ لکھ سکتا تھا۔ اپنے آفس کے خطوط بڑے بابو سے پڑھواتا اور اُنہیں سے جواب لکھواتا۔ قد چھوٹا پر دماغ بڑا تیز تھا۔ آفس میں بڑے چھوٹے سب پر خوب حاوی تھا۔ شرما جی عمر رسیدہ آدمی تھے۔ پہلے زمانے کے اُردو فارسی پڑھے لکھے تھے۔ باہر کا کام کرنے پر متعین تھے۔ کوئی خاص ڈیوٹی نہ تھی۔ گدھے کی طرح ہر آدمی، ہر کام اُن پر لاد دیتا اور وہ کسی کام سے انکار بھی نہ کرتے، ان لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے کام کرنے والے تھے۔ لیکن ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ سب ایک دوسرے سے خوش نہ تھے۔

پس پُشت ایک دوسرے کو بُرا کہتے، گالیاں دیتے اور سامنے تعریفیں کرتے۔ ایک دوسرے سے اس طرح ملتے اور باتیں کرتے جس سے بڑے خلوص اور محبت کا اظہار ہوتا۔ بڑے صاحب سے لے کر چپراسی تک، ہر ایک، اس کدورت اور بددلی میں مبتلا تھا۔ بڑے صاحب آئے دن کی ہڑتالوں، یونین کے جھگڑے بازیوں اور ملازمین کی مانگوں کی وجہ سے تنگ تھے اور اس لئے اپنے سب ملازموں کو اُن کے پیچھے بُرا بھلا کہتے رہتے۔ ملازمین کام زیادہ کم معاوضہ، بڑھتی ہوئی مہنگائی اور مستقبل کی غیر یقینی کی وجہ سے غیر مطمئن اور پریشان رہتے۔ کبھی بڑے صاحب کو اور کبھی ایک دوسرے کو پس پشت بُرا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ سب ایک دوسرے سے مشین کے پرزوں کی طرح ایسے جُڑے ہوئے تھے کہ الگ نہ ہو سکتے تھے۔

ان سب میں رام لال سب سے زیادہ خوش حال اور مطمئن نظر آتا تھا۔ اتنی تھوڑی سی تنخواہ میں وہ کس طرح اتنا مگن تھا۔

یہ بات سب ہی جانتے تھے۔ لیکن مُنہ پر کسی کو کچھ کہنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ سارے آفس کے چھوٹے بڑے سب ہی اُس کے زیرِ اثر تھے۔

شرما جی جب کبھی باہر سے آتے، شاہ کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر ضرور دم لیتے۔ انہیں شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ شاہ اکثر انہیں چُبھتے ہوئے شعر سُناتا اور وہ اسی چسکے میں اُس کے پاس زیادہ رہتے اور دیر تک دل چسپ باتیں کرتے رہتے۔ کبھی آفس کی سیاست اور کبھی کسی کا کچا چِٹھا چُپکے چُپکے کھولتے رہتے۔ شاہ کو وہ ذرا پُر خلوص اِنسان معلوم ہوئے۔ سب سے پہلے دِن جب وہ اُس کے پاس آکر بیٹھے تھے تو اُنہوں نے بڑی ہمدردی سے کہا تھا۔ بھائی یہ میز کُرسی بدل دو۔ بڑی منحوس جگہ ہے۔ جو آتا ہے سال چھ مہینے میں چلا جاتا ہے اور شاہ اُس وقت اُن کی سادگی پر ہنس کر خاموش ہو گیا تھا۔

ایک روز جب بڑے بابو آفس نہیں آئے تھے۔ رام لال کچھ ضروری خطوں کے جواب لکھوانے شاہ کے پاس آیا۔ کام ختم ہونے کے بعد بڑی رازداری سے کہنے لگا۔ شاہ صاحب کچھ بنا لیجیے۔ کام آئے گا۔ موقع سے فائدہ اُٹھانا ہی عقلمندی ہے۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ آپ کے ہاتھ میں تو بہت کچھ ہے۔ اور یہ بھی نہیں تو میں اور رستہ بتا دوں آپ کو۔ ایک آدھ چکّر فورِن کا ہی لگا لیجیے۔ ایک دو ٹرپ میں ہی کایا پلٹ جائے گی۔ اِنتظام میں سب کرا دونگا۔

وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ شرما جی آگئے۔ اُن کے آتے ہی اُس نے فوراً بات کا رُخ پلٹ دیا اور چند منٹ اِدھر اُدھر کی بات کرکے چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد شرما جی نے پُوچھا۔ یہ سالا یہاں کیوں آیا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا آپ سے؟ اس کے بعد تو ایسا معلوم ہوا جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ بس شرما جی آپ ہی آپ بولے جا رہے تھے۔ شاہ صاحب آپ سیدھے سادے شریف آدمی ہیں۔ اِس لئے بتا رہا ہوں آپ کو۔ اِس کی باتوں میں نہ آیئے گا۔ بڑا چور باجی آدمی ہے۔ اِس کی تھاہ آپ کو نہیں ملے گی۔ جتنا نیچے اُتنا ہی اُوپر ہے۔ گاؤں سے چلا تھا لُٹیا ڈور لے کر۔ اب حرام کا روپیہ بنا کر سیٹھ صرّاف بنا پھرتا ہے اور دُنیا سے پھرتا ہے، گاؤں میں اِس کی لاکھوں کی زمینداری ہے۔ معلوم کون لے آیا یہاں اس کو۔ ؟ سو روپیہ مہینے پر کھاتہ لکھنے کے لئے نوکر ہوا تھا۔ شروع شروع تو بہت سیدھا سادا سا لگتا تھا۔ آہستہ آہستہ خوب پر پُرزے نکالے۔ آفس کا روپیہ آفس میں ہی سود پر چلانا شروع کر دیا۔ مُلازمت پیشہ لوگوں کو روپیہ کی پریشانی تو ہر وقت رہتی ہی ہے۔ اُن کی مجبوریوں سے خوب ناجائز فائدہ اُٹھاتا۔ آہستہ آہستہ سارے آفس اور فیکٹری میں اِس کا جال پھیل گیا۔ بڑے بابو کو خوب کھلا پلا کر رکھتا۔ چھوٹے بابو کو جب روپے کی ضرورت ہوتی بغیر سود کے دیتا۔ اِس طرح کوئی اُس کے جال سے نہ بچا۔ اِس کے بعد آفس کے باہر بھی اِس کا لین دین چلنے لگا۔ اور ہوتے ہوتے رُوپئے کا فورن ایکسچینج بھی اُس نے شروع کر دیا۔ اِدھر اسمگلنگ میں بھی ہاتھ مارنے لگا۔ آپ کیا سمجھ رہے ہیں اِس کو۔ خود بھی فورن ہو آیا ہے۔ ایک بار بڑے بابو کو اور ایک بار چھوٹے بابو کو حقہ داری میں بھیج چکا ہے۔ اور بڑے صاحب کو بھی سیر کرا چکا ہے۔ بس کچھ نہ پوچھیئے اُن دِنوں اُس کے غرور کا عالم کسی سے سیدھے مُنہ بات نہ کرتا تھا۔ لیکن سَو دِن چور کے، ایک دن ساہوکار کا بھی ہوتا ہے۔ ایک دِن اسمگلنگ کیس میں پکڑا گیا۔ وکیلوں اور عدالتوں میں کھِچا کھِچا پھرا۔ روپیہ کی تو کمی نہ تھی، خوب پانی کی طرح بہایا تب جا کر جان چھوٹی۔ اُس وقت اگر میں چاہتا تو اُسے بہت نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن میری شرافت نے گوارا نہ کیا۔ جیسا کرے گا اُس کے آگے آئے گا۔ اب پھر وہی سب دھندے برابر چل رہے ہیں۔ حرام کا لقمہ جب مُنہ کو لگ جائے تو چھوٹنا مشکل ہوتا ہے۔ تعجّب تو یہ ہے کہ دنیا اُس کے کرتُوتوں کو جانتی ہے۔ آفس میں بھی سب کو معلوم ہے۔ پھر بھی کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ سب اُسے سلام ہی کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں بھی اُس کی عزّت اور مان ہے۔

آپ سے کیا کہوں ایک دفعہ تو میں بھی اُس کے جال میں پھنس گیا تھا۔ بچّہ کی تعلیم کے لئے کسی کسی وقت سُود پر روپیہ قرض لیا تھا۔ ہوتے ہوتے رقم پندرہ سو کے قریب ہو گئی۔ دس روپیہ سیکڑہ ماہوار کے حساب سے کابلیوں کا سود لیتا۔ تنخواہ اُسی کے ہاتھ میں تھی۔ آپ یقین مانیئے پُوری کی پُوری تنخواہ سود میں کاٹ کر رکھ لیتا۔ اور میں مہینے کی پہلی تاریخ خالی ہاتھ گھر جاتا تو بیوی بچّے میرا مُنہ دیکھتے۔ شرافت مجھے کچھ کہنے اور کرنے نہ دیتی تھی۔ پانچ سال تک میں اُسے سُود دیتا رہا۔

پندرہ سو پر پانچ ہزار صرف سود ہی سود میں وصول کر لئے۔ اصل الگ رہا۔ اور وہ بھی ایک ایک پیسہ اُس نے الگ لے کر چھوڑا۔ اب آپ ہی سمجھ لیجئے کتنا کمینہ آدمی ہے۔ اِسی لئے آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اِس سے بچ کر رہیں۔ شاہ نے یہ سب سُن کر بڑے تعجب سے کہا۔ تو کیا بڑے صاحب یہ سب جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرتے۔ شرماجی نے طنز سے ہنستے ہوئے کہا۔ بڑا چور چھوٹے چور کو کیا کہہ سکتا ہے۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اپنی اپنی لُوٹ مار میں لگے ہوئے ہیں معلوم ہوتا تھا شرماجی کا دِل بہت دُکھا ہوا ہے اور وہ اُس دُکھ کو بھُول نہیں پاتے ہیں۔ بات کرتے کرتے کبھی غصّے سے اُن کا مُنہ سُرخ ہو جاتا اور کبھی دُکھ سے اُن کی آنکھیں پُر نم ہو جاتیں۔ بات ختم ہونے پر بھی ایسا لگتا تھا کہ ان کے دِل کی بھڑاس نہ ابھی نکل سکی ہے اور نہ کبھی نکل سکے گی۔

۷

ایک روز جب آفس کا کام ختم ہونے کے بعد شاہ گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ چپراسی نے آ کر اطلاع دی کہ بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔ بڑے صاحب کے بُلانے سے اُسے ذرا پریشانی ہوتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے سپرد کچھ ایسا ہی کام کیا جائے گا جسے نہ وہ خود کر سکتے ہوں اور نہ کوئی دوسرا ہی کر سکتا ہو۔ اور جنہیں وہ خود بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اُسے کرنے پڑتے تھے۔ جب وہ بڑے صاحب کے پاس پہنچا تو اُسے اطمینان ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بڑے صاحب نے اُسے ایک فائل دیتے ہوئے کہا۔ یہ لیڈی سٹینو کی جگہ کے لئے درخواستیں ہیں۔ تین سو درخواستوں میں سے بڑے بابو نے چھانٹ کر تیس اُمیدواروں کو انٹرویو کیلئے بُلایا ہے۔ بڑے بابو چھٹی پر ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ انٹرویو لے لو۔ اور اِس میں سے دو چار کو چھانٹ کر فائنل انٹرویو کے لئے میرے پاس بھیج دو۔ وہ فائل لے کر چلا آیا اور سوچنے لگا۔ کاش! وہ اِن سب کو رکھ سکتا۔ معلوم نہیں کس کے ساتھ کیا مجبوریاں ہوں گی۔ پھر اُسے یاد آیا کہ اِس پر بھی کبھی یہ دَور گزرا تھا اور آئندہ بھی نہ معلوم کب گزر سکتا ہے۔؟

دوسرے روز انٹرویو تھا۔ شاہ جب آفس پہنچا تو بہت سے اُمیدوار پہلے سے ہی منتظر بیٹھے تھے۔ جوان، نوجوان اور قدرے عمر رسیدہ عورتیں اور لڑکیاں، ہر طرح سے بناؤ سِنگار کیے، چہرے پر وقت کے ڈالے ہوئے نشانوں کو پاؤڈر اور سُرخی کی تہہ میں دبائے ہر طرح سے سمارٹ نظر آنے کی کوشش میں اپنا بہترین لباس پہنے صنفِ نازک کے بجائے زندگی سے جنگ آزما ہونے والے دیش دیش کے بہادر شہزادوں کی طرح یوں اُمید و بیم اور کشمکش کی حالت میں بیٹھی تھیں جیسے یہ بھی کوئی انٹرویو نہیں سوئمبر کی رسم ہے۔ معلوم نہیں روزگار کی راجکماری کس پر نظرِ انتخاب ڈالے اور کس کے گلے میں ور مالا پہنائے۔

شاہ نے جلدی سے کام کو نمٹا دیا۔ اُس نے چند تجربہ کار اور انتہائی ضرورت مند اُمیدواروں کا انتخاب کرنے کے بعد انہیں دوسرے روز آنے کے لئے کہہ دیا۔ انٹرویو کا وقت ختم ہو چکا تھا اور وہ کسی کام سے باہر جانے ہی والا تھا کہ انٹرویو کے لئے ایک مِلیپ اور اُس کی میز پر آ گیا۔ اُس نے پھر دوبارہ فائل نکالا۔ تلاش کرنے کے بعد اُس کی درخواست نکالی۔ پھر اُسے بُلایا۔ ہر طرح کے میک اپ سے پاک، فکرمند، لیکن کشش سے بھرپور، مُسکراتا ہوا چہرہ، شوخ متجسّس نگاہیں، سیدھی مانگ، اکہرا جسم، کاٹن کی سفید ساڑی پہنے ایک جواں سال لڑکی اُس کے سامنے تھی۔ دیکھتے ہی پہلی نظر میں ہمدردی کا ایک احساس اُس کے دِل میں پیدا ہوا۔ بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کرتے ہوئے شاہ نے کہا۔ آپ بہت دیر سے آئی ہیں۔ لڑکی کے چہرے پر مُسکراہٹ بکھر گئی اور اُس نے بڑی انکساری سے کہا۔ جی ہاں، مجھے بہت افسوس ہے —— کیا بتاؤں ہمارے دیش میں ہر کام دیر سے ہی ہوتا ہے۔ گھنٹوں پہلے لائن میں کھڑے بس کا انتظار کرتے رہو۔ اِس کے بعد کہیں بس آتی ہے تو وہ بھی ایسی بھری ہوئی جیسے ہم بیکاروں کے دماغ ہر وقت فکر و پریشانی سے اوور لوڈ رہتے ہیں —— زندگی کے ہر شعبے میں بس یہی حال ہے۔ ہسپتال میں مریض کو لے کر جاؤ تو مریض کو مرنے کے بعد داخلہ ملے گا۔ پہلے قحط پڑ جائے گا بعد میں اناج پہنچے گا۔ پہلے فساد ہو لیں گے۔ مرنے والے بے گناہ مر جائیں گے۔ بعد میں روک تھام ہو گی۔ اب دیکھئے نا پچیس سال یعنی تقریباً ایک چوتھائی صدی سے ہم پڑھے لکھے،

بے روزگاروں کے مسئلے کا حل بھی دیر آید درست آید کے اصول پر
ہی ہو رہا ہے۔

شاہ کو اُس کی بے تکلف باتوں پر ہنسی آگئی اور اُس نے کہا۔ آپ
تو اچھی خاصی کیمونسٹ معلوم ہوتی ہیں۔ لڑکی نے فوراً جواب دیا جی
نہیں میں تو اپرچونسٹ ہوں۔ لیکن ابھی تک کوئی اپرچونسٹی ملی نہیں
ہے۔ جناب آپ کیا سمجھتے ہیں۔ یہ اپرچون ازم بھی کوئی معمولی ازم
نہیں ہے۔ بڑے بڑے لیڈر اور منسٹر دراصل پرائیویٹ طور پر
اِسی ازم میں یقین رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے فائدے ہیں اِس میں۔
بس کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔ جب ہی تو بہت سے بڑے بڑے
نیتاؤں نے بڑے بڑے تحقیقاتی کمیشن کا مردانہ وار مقابلہ کرنے
کے بعد بھی اسے زندہ رکھا ہے۔ پھر یکایک اُسے احساس ہوا
کہ وہ انٹرویو کے لئے آئی ہے۔ اُس کے لئے ایسی بے تکلّفی مناسب
نہیں۔ چنانچہ اُس نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ معاف کیجئے
آپ نے میری باتوں کا بُرا تو نہیں مانا۔ میں نے آپ کا کافی وقت فضول
باتوں میں ضائع کیا۔ شاہ نے کہا جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔
ہم آپ جیسے کچھ لوگ اِس دنیا میں وقت ضائع کرنے کے لئے
ہی آتے ہیں۔ آپ کسی بات کا خیال نہ کریں۔ آپ کی باتیں مجھے
بہت دل چسپ معلوم ہوئیں۔ پھر کچھ توقف کے بعد شاہ نے
کہا۔ میں نے آپ کی درخواست دیکھی۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے
کہ آپ کافی ضرورت مند ہیں۔ اور میں یہی چاہتا ہوں کہ یہ جگہ کسی
ایسے ہی حقدار کو ملے۔ اِس لئے میں آپ کا نام فائینل انٹرویو میں
آنے والوں کی فہرست میں رکھ رہا ہوں۔ جس کا فیصلہ ہمارے
بڑے صاحب کریں گے۔ آپ کل صبح دس بجے تشریف لے آئیں،
اِس سے زیادہ میں آپ کے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ آئی وِش یو گڈ
لک۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کام سے باہر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا اور
لڑکی کی آنکھیں اظہارِ تشکّر سے جھک گئیں۔

۸

شاہ کا اندازہ تھا کہ فائینل انٹرویو بھی اُسی کے ہاتھ
رہے گا۔ کیوں کہ وہ کافی سمارٹ، حاضر جواب اور اپنے کام
میں تیز معلوم ہوتی تھی۔ اور اُس کا اندازہ صحیح نکلا۔ آفس میں
اُس کے آنے سے رونق ہی آگئی تھی۔ سب ہی کام کرنے والے بن
سنور کر آنے لگے تھے۔ اور ان کے لباس میں بھی تبدیلی آگئی تھی، کیونکہ
مس کلپنا کا آنچل سب ہی کے دِل میں لہرانے لگا تھا۔ اور وہ بھی ہر
ایک سے مُسکرا کر اِس طرح بات کرتی جیسے یہ خصوصیت اُسی کے لئے
ہے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد آفس میں طرح طرح کی خبریں گشت کرنے لگیں۔
کبھی بڑے صاحب کے ساتھ اِس کے رُومانس کا ذکر ہوتا۔ کوئی کہتا
بڑے صاحب کے ساتھ اسے سینما میں دیکھا ہے۔ کوئی کہتا ہوٹل میں
ایک ساتھ ڈنر کھاتے دیکھا ہے۔ پھر کبھی بڑے بابو کے ساتھ عشق
کی خبریں گرم ہونے لگیں اور کبھی چھوٹے بابو کے ساتھ۔ بس ایک
رام لال ہی تھا جس کا نام اِس فہرست میں نہ آتا تھا۔ کیوں کہ
سب کا خیال تھا کہ رام لال اِس جھنجھٹ میں پڑنے والا نہیں۔
پھر کچھ دنوں کے بعد اُس کے متعلق بھی سُننے میں آگیا کہ اُس نے کلپنا
کو بغیر کسی سُود کے کافی رقم اُس کی کسی ضرورت کے لئے دی ہے۔ رام
لال دُور ہی دُور سے بگلا بھگت کی طرح سب کچھ دیکھتا اور سُنتا
لیکن مُنہ سے کچھ نہ کہتا۔ چھوٹے بابو تو کلپنا کے عشق میں دیوانے ہو
رہے تھے۔ لیکن اُن کا عشق کسی سے چُھپا نہ تھا۔ اور نہ وہ کسی سے
چُھپاتے تھے۔ اُن کی دیوانگی اِس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ہر ایک پر
اُن کو اپنی رقابت کا شبہ ہوتا تھا لیکن رام لال کی طرف سے روپیہ
قرض دینے کی خبروں کے باوجود انہیں کوئی خطرہ محسوس نہ ہوتا تھا۔
کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ کلپنا اُن جیسے خوش شکل اور کم عمر نوجوان کو
چھوڑ کر رام لال جیسے گنجے، ناٹے اور چیچک کے داغوں سے نقشین
صُورت کو قبول نہیں کرسکتی۔ دراصل انہیں سب سے زیادہ خطرہ
کلپنا کی طرف سے ہی تھا۔ کیونکہ وہ ابھی تک اس کا فیصلہ نہ معلوم
کرسکے تھے۔ اور اس کے لئے وہ بے چین تھے۔

ایک روز جب آفس میں سب جا چکے تھے۔ صرف شاہ کسی
کام سے رُکا ہوا تھا۔ چھوٹے بابو اُس کے پاس آئے اور کہنے لگے۔
شاہ صاحب میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ نے بڑی
سنجیدگی اور ہمدردی سے کہا۔ ہاں ہاں ضرور کہئے کیا بات ہے۔
میرے لائق کوئی مشورہ کوئی خدمت ہوگی تو ضرور کروں گا۔ لیکن
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ شاہ
کچھ سمجھ نہ سکا کہ آخر کیا بات ہے۔ اُس کے تسلی دینے پر

جب ذرا اُن کے آنسو رُکے تو اُنہوں نے کہا۔ شاہ صاحب میں کلپنا کی محبت میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ شاہ نے کہا پہلے آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کا عشق یک طرفہ ہے یا "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"۔ چھوٹے بابو نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ یہی تو مشکل ہے۔ میں بارہا اپنی محبت کا اظہار کر چکا ہوں۔ اپنا درد اُس سے بیان کر چکا ہوں۔ لیکن وہ سب کچھ سُنتی ہے اور مُسکرا کر خاموش ہو جاتی ہے۔ اُس کی مُسکراہٹ سے، اُس کی خاموشی سے تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ لیکن ہزار کہنے پر بھی وہ خود اپنے مُنہ سے اِقرار نہیں کرتی۔ نہ ہاں ہی کہتی ہے نہ اِنکار ہی کرتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور یہ کہہ کر اُن کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

اِس نئے زمانے میں الف لیلوی قسم کا روایتی عشق دیکھ کر شاہ کو بڑا تعجب ہوا۔ چھوٹے بابو کی حالت پر اُسے ترس بھی آیا اور ہنسی بھی آئی اور اُس نے چھوٹے بابو سے کہا۔ لیکن بھئی تمہارا اُس کا تو کچھ میل ہی نہیں۔ چھوٹے بابو نے مُنہ بسورتے ہوئے کہا۔ کچھ بھی ہو میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور پھر اُن کے اِصرار پر شاہ نے وعدہ کر لیا کہ وہ موقع ملنے پر کلپنا سے بات کر کے اُن کو بتائے گا۔

کئی روز بعد جب شاہ کو آفس کے کچھ ضروری خطوط لکھوانے تھے۔ اُس نے کلپنا کو بُلوایا اور کام ختم ہونے کے بعد چھوٹے بابو کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا۔ سُنا ہے۔ بھئی، چھوٹے بابو سے آپ کا اینگیجمنٹ ہونے والا ہے۔ کلپنا نے کچھ پریشان ہو کر فوراً جواب دیا ـــــــ جی نہیں، آپ سے کس نے کہا۔ شاہ نے جواب دیا۔ کہا کسی نے نہیں۔ خبریں یہی سُننے میں آ رہی ہیں۔ اور پھر اس معاملہ میں آپ کی خاموشی سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اُن کی محبت قبول کر لی ہے۔ اور محبت کا نتیجہ شادی ہوتا ہی ہے۔

کلپنا اب کچھ سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی، ہم لڑکیوں کے لئے آفسوں میں کام کرنا بھی ایک مصیبت ہے۔ اوّل تو رکھنے والے مالکین ہی ہم کو اپنی مِلکیت سمجھنے لگتے ہیں۔ اور وہ نہیں تو پھر آفس کے دوسرے کام کرنے والے ہی ہر طرح کی نظر ڈال سکتے ہیں۔ ہر طرح کی بات کہہ سکتے ہیں۔ افواہیں اُڑا سکتے

کون کس کو روک سکتا ہے۔ چھوٹے بابو مجھ سے عمر میں چھوٹے ــــ آمدنی بھی اُن کی چھوٹی سی۔ مجھے اگر غربت میں رُوکھی سُوکھی کھا کر گزارہ کرنا ہوتا تو گھر سے باہر ملازمت کے لئے ہی کیوں نکلتی۔ پھر میرے ساتھ اپنے علاوہ اور بھی ذمّہ داریاں ہیں۔ شاہ نے کہا تو پھر ایسی حالت میں آپ کو اُن سے صاف کہہ دینا چاہئے تھا۔ وہ خواہ مخواہ بے وقوف بن رہے ہیں۔ اِس پر اُس نے ذرا بگڑ کر کہا۔ بیوقوف تو وہ خود اپنی خوشی سے بن رہے ہیں۔ اُنہیں خود ہی سمجھ لینا چاہئے تھا اب تک۔ یوں وہ ایک اچھے شریف اِنسان ہیں۔ میں اُنہیں پسند بھی ضرور کرتی ہوں۔ لیکن اِس کا یہ مطلب تو نہیں۔

یہ سُن کر شاہ خاموش ہو گیا۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ حقیقت کیا ہے۔ اِس کے لئے کلپنا کو سمجھنا مشکل تھا اور وہ سمجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی نگاہ یہ کلپنا کا ذاتی معاملہ تھا اور اس میں اُسے یا کسی کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ لیکن چھوٹے بابو کے مُصر ہونے پر وہ اِتنا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دوسرے روز چھوٹے بابو نے جب یہ تفصیل سُنی تو اُن کو بڑا رنج ہوا۔ اور اُنہیں یقین نہ آیا کہ اُن کے بارے میں کلپنا اتنا سب کچھ کہہ سکتی ہے۔ انہیں فکرمند دیکھ کر شاہ نے کہا۔ بھائی معلوم نہیں یہ لاٹری کس کے نام نکلے۔ لیکن کم از کم آپ کے نام تو نکلتی معلوم نہیں ہوتی۔ اب آپ صبر کیجئے اور اُسے بھول جائیے۔ آپ کی بھلائی اِسی میں ہے۔ ورنہ پھر "کئے جاؤ کوشش مرے دوستو"۔ ممکن ہے کسی وقت اُس کا دل پگھل جائے۔ یوں تو وہ آپ کو پسند ضرور کرتی ہے اور آپ کی شرافت کی تعریف بھی کرتی ہے۔ یہ بات سُن کر چھوٹے بابو ذرا خوش ہوئے اور اُنہیں اُمید کی کرن نظر آنے لگی۔ اُن کے دل کو واقعی ایسی لگی ہوئی تھی، معلوم ہوتا کہ وہ اُس کے لئے اپنی جان بھی دے دیں گے۔ لیکن جان دینے سے پہلے اُنہوں نے اُسے تحفہ تحائف دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اپنی پُوری تنخواہ کسی نہ کسی طرح اُس پر خرچ کر دیتے یا اُسے نقد دے دیتے۔ اب رفتہ رفتہ خبریں گرم ہونے لگیں کہ اِن دونوں کا رومان عُروج پر ہے۔ چھوٹے بابو کی آنکھوں میں بھی چمک آ گئی تھی اور وہ ہر وقت بات بے بات ہنستے مُسکراتے نظر آتے تھے۔ اُن کے مقابل میدان میں اب کوئی دوسرا نہ تھا۔ ان کے رُومان کا عُروج دیکھ کر دوسرے رقیبوں کو بھی صبر آ گیا تھا

آخر اُنھوں نے میدان مار ہی لیا اور ان کی محبت نے کلپنا کو جیت لیا۔

۹

شاہ کی ملاقات آفس کے کاموں کے سلسلے میں دوسرے تیسرے دن داور سے ہوتی ہی رہتی تھی۔ لیکن اُدھر اتفاقاً کئی ماہ سے کوئی کام نہیں پڑا تھا۔ اور وہ داور سے نہیں مل سکا تھا۔ یکایک اُسے خیال آیا اور وہ اُسی روز شام کو داور سے ملنے اُس کے گھر پہنچا۔ دیکھا کہ وہ سفر کی تیاریاں کر رہا ہے اور بہت خوش نظر آرہا ہے۔ اُس نے سوچا کہ شاید وہ ترقی کر کے باہر کہیں تبادلے پر جا رہا ہے۔ لیکن پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک ماہ بعد اس ملازمت سے سُبکدوش ہو رہا ہے۔ اُسے یہ سُن کر بڑا صدمہ ہوا" اور اُس نے کہا کہ اتنی اچھی" ملازمت تم کیوں چھوڑ رہے ہو۔ کیا کوئی بہتر جگہ مل گئی ہے۔ داور نے جواب دیا۔ میں ملازمت نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ ملازمت مجھے چھوڑ رہی ہے۔ کمپنی نے میرے ایگریمنٹ کی توسیع نہیں کی ہے۔ کیونکہ میں جن صاحب کی سفارش سے آیا تھا وہ اب کمپنی کے ڈائریکٹر نہیں ہیں اور تم جانتے ہو، یہاں آج کل کوئی کام بغیر سفارش کے ہوتا نہیں۔ شاہ نے پھر تعجب سے کہا۔ لیکن اس میں خوشی کی کیا بات ہے۔ تم اتنے خوش نظر آرہے ہو۔ داور نے کہا خوشی کی بات تو ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ میں مستقل طور پر لندن جا رہا ہوں۔ مجھے امپلائمنٹ واؤچر مل گیا ہے۔ سال بھر بعد آکر نیلی کو بھی لے جاؤں گا۔ شاہ میری مانو تو تم بھی کسی صورت وہیں آجاؤ۔ یہاں تو صرف زندہ رہنے کی کوشش میں ہی یہ تھوڑی سی زندگی بیت جائے گی۔ داور اپنے مستقبل کی کامیابی سے خوش تھا۔ لیکن شاہ کو اُس کے جانے کا بہت افسوس تھا۔ اُسے اپنے مستقبل پر پھر اندھیرے بادلوں کا سایہ نظر آرہا تھا۔ اُسے خوف تھا کہ داور کے علیحدہ ہونے کا اثر اُس کی ملازمت پر بھی پڑ سکتا ہے اور اُس کا یہ خوف غلط نہیں تھا۔ داور کے جانے کے بعد ایک دو مہینے تو اسی امید و بیم اور کشمکش میں گزر گئے۔ لیکن تیسرے مہینے اُسے نوٹس مل ہی گیا۔ اس پر اُسے تعجب تو نہیں ہوا۔ لیکن دُکھ ضرور ہوا۔ کیونکہ اُس نے بڑی ایمانداری اور محنت سے کام کیا تھا اور اُسے یقین تھا کہ اُس کی قدر ضرور ہوگی۔ اُس وقت اُسے شرما جی کی بات یاد آگئی۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ اِس جگہ سال چھ مہینے سے زیادہ کوئی نہیں رہتا۔ پھر اُسے داور کی بات کا خیال آیا اور پھر رام لال کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ موقع سے فائدہ اٹھالو ورنہ پچھتاؤ گے۔

لیکن فائدہ اُٹھانے کے لئے وہ رام لال کیسے بن سکتا تھا۔ ایک بار بچپن میں جب اُس نے ایک چھوٹا سا جھوٹ بولا تھا تو اُس کی ماں نے کہا تھا۔ خبردار پھر کبھی جھوٹ بولا تو زبان پر انگارہ رکھ دوں گی اور جب سے وہ اس انگارے کی جلن کا احساس لئے راہِ مستقیم پر چل رہا ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ ان بے چاری پرانے زمانے کی ماؤں کو بھی بھلا کیا معلوم تھا کہ آنے والے زمانے کی ضرورت کیا ہوگی۔

اس بات کو کئی برس گزر چکے تھے۔ کمپنی کی ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد شاہ کو ایک نائٹ اسکول میں پڑھانے کی جگہ مل گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا ہر نیا دن سڑکوں میں دفن کر دیتا اور شام کو نائٹ اسکول میں پڑھانے چلا جاتا۔ ایک دن یوں ہی بے مصرف پھرتے پھرتے اُس نے دیکھا۔ مشہور بُک سیلر مارٹن لانگ فیلو کے ہاں سیل ہو رہی ہے۔ برسوں بعد اُسے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ دنیا کے ہر موضوع پر کتابوں اور اسٹیشنری سے بھری ہوئی تین منزلہ لمبی چوڑی دوکان تقریباً خالی نظر آرہی تھی۔ جہاں پندرہ بیس سیلز مین بیک وقت کام میں مصروف رہتے تھے، وہاں صرف ایک پرانا سیلز مین جارج باقی رہ گیا تھا۔ شاہ اُسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ اُس کا نام ابھی تک اُس کے ذہن میں باقی تھا۔ کئی برس پہلے جب اُس نے جارج کو دیکھا تھا تو وہ ایک لڑکا سا نظر آتا تھا اور اب معلوم ہوتا تھا کہ پانچ برس میں پچاس برس کا زمانہ اُس پر سے گزر گیا ہے۔ جارج نے بھی شاہ کو پہچان لیا اور کہا، ہیلو سر، بہت دنوں بعد نظر آئے آپ۔ شاہ نے کہا۔ ارے میں نظر تو آرہا ہوں لیکن تم تو اتنے دُبلے اور کمزور ہو گئے ہو کہ نظروں سے غائب ہی ہوئے جا رہے ہو۔ وقت سے پہلے ہی اتنے بوڑھے نظر آرہے ہو۔ جارج نے ہنس کر کہا۔ اور جناب آپ کون سے جوان نظر آرہے ہیں، میں کتابیں بیچتے بیچتے وقت سے پہلے بوڑھا ہوا ہوں اور آپ کتابیں پڑھتے پڑھتے وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں کو ہی ان کتابوں سے کچھ نہیں ملا۔ اور مجھے تو تھوڑا بہت جو کچھ ملا تھا وہ بھی ہاتھ سے جاتا معلوم ہو رہا ہے۔ یہ کاروبار ایک

انگریز کا تھا۔ وہ اسے بیچ کر اپنے وطن چلا گیا۔ اب نیا مالک اس کاروبار کو ختم کر کے معلوم نہیں اس دُکان میں کیا دھندا شروع کریگا۔ تھوڑا سا پیسہ دے کر سب کو الگ کر دیا ہے۔ دس دس پندرہ سال کی سروس منٹوں میں ختم ہو گئی۔ کوئی فریاد سُننے والا نہیں۔ اب بتایئے کہ یہ لوگ کہاں جائیں گے کیا کریں گے۔ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ تھوڑا سا کام اب یہاں باقی رہ گیا ہے۔ اسے سمیٹنے کے لئے مجھے باقی رکھ چھوڑا ہے۔ نہ معلوم مجھے بھی کب الگ کر دے۔ سُنا ہے کسی دفتر میں معمولی سا بابو تھا۔ اب بہت سے بڑے بڑے کاروبار ہیں اِس کے۔ آدمی تو جینئیس ہی ہوگا جب ہی اتنی ترقی کر گیا۔ شاہ کتابیں دیکھتا جا رہا تھا۔ اور جارج کی باتیں سُنتا جا رہا تھا۔ یکایک اُوپر کی منزل سے لِفٹ نیچے آ کر رُکا۔ جارج، معاف کیجیئے گا جناب کہہ کر لفٹ سے آنے والے ایک مرد اور ایک عورت کی پیشوائی کے لئے دوڑا۔ لفٹ کا دروازہ کچھ اِس طرح سے تھا کہ شاہ ان دونوں کی شکل نہ دیکھ سکا تھا۔ لیکن وہ یہ ضرور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کون لوگ تھے۔ جن کے لئے جارج اِس طرح سے دوڑا ہوا گیا۔ جارج جب اِن دونوں کو کار تک پہنچا کر واپس آیا تو شاہ نے اُس سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا۔ جارج نے جواب دیا۔ یہ ہی اِس کاروبار کے نئے مالک ہیں مسٹر رام لال اور اُن کی بیوی مسز کلپنا رام لال۔

دکان سے باہر نکلتے ہوئے شاہ کو چھوٹے بابو کا خیال آیا۔ معلوم نہیں بے چارے کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ کم بخت نے اُس غریب کو بھی نہ چھوڑا۔ پھر اُس کے ذہن میں جارج کے الفاظ لوٹ آئے اور وہ سوچنے لگا۔ واقعی جینئیس کون ہے۔ وہ جو کلپنا کو پہلو میں لئے کار اُڑائے جا رہا ہے۔ یا وہ جو اپنے ذہن پر گدھے کی طرح کتابوں کا بوجھ لادے سڑکوں کی دھول اُڑاتا پھر رہا ہے۔

▲

واجدہ تبسم

انتظاریہ

واجدہ تبسّمؔ

تاریخ پیدائش :- ۱۹۳۵ء، ۱۶ مارچ ـــ اُمراؤتی۔ برار (مہاراشٹر)

مجھے علمِ نجوم سے بے حد لگاؤ ہے، آتا جاتا کچھ نہیں۔ صرف یہ جاننے کی خواہش رہتی ہے کہ آج کیا ہونے والا ہے۔ اسی دل چسپی کو دیکھتے ہوئے ایک نجومی نے مجھے Explain کرنا چاہا تھا کہ "سارے بڑے آدمی مارچ میں پیدا ہوتے ہیں۔" میں نے جواب دیا تھا۔ ویسے تو سبھی مہینوں میں پیدا ہونے والے بچے اگلے چند سالوں میں "بڑے آدمی" بن جاتے ہیں، میری اپنی کیا تخصیص ہوئی ـــــ؟"

ویسے اپنی چودہ سالہ ادبی زندگی میں بے پناہ شہرت ملنے کے باوجود وہ "بڑی آدمی" بننے والی پیشین گوئی پوری ہونی ہنوز باقی ہے۔ ابھی تک چار کتابیں۔ تین افسانوی مجموعے (۱) "شہرِ ممنوع" (جس کا تیسرا ایڈیشن بمبئی سے عنقریب "بنتِ حوّا" پبلیکیشنز کی طرف سے چھپ رہا ہے۔) ۲۔ اُترن خانہ، ۳۔ توبہ توبہ اور ایک ناولٹ "شعلے") چھپ چکی ہیں۔ اس سال کوئی سات کتابیں ایک ساتھ چھپ رہی ہیں۔ پچھلے تین سالوں میں نے حیدرآباد دکن کے جاگیرداری، نوابی ماحول پر چند کہانیاں لکھیں۔ جنہوں نے مجھے ایک ساتھ بے حد مشہور اور بیحد بدنام کر دیا۔ لیکن میں شہرت سے مغرور ہوئی اور نہ بدنامی سے بددل۔ کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ایک لکھنے والے کو ہمیشہ سچّائی سے کام لینا چاہیے، اردو میں لے رہی ہوں۔

۱۹۶۰ء میری زندگی میں ایک خوبصورت سال ہے۔ (جی ہاں ہے۔ تھا نہیں۔ تھا، اُسے کہتے ہیں جو گزر جاتا ہے۔ وہ خوبصورت سال گزرا نہیں، وہ میری زندگی میں نیلے آسمان کی طرح ہمیشہ چھایا رہا ہے، چھایا رہے گا) اُس سال میں نے فرسٹ کلاس میں ایم اے کیا اور میں دُلہن بنی۔ اپنے میاں سے وہ پیار پایا جس کی مثال نہ کتابوں میں ملے نہ کہانیوں میں۔ ـــ میری اتنی خوش باش اور (خدا کے فضل سے) کامیاب زندگی میں پچانوے فی صد ہاتھ میرے میاں کا ہے۔ ایک عورت ادیبہ کے "حالاتِ زندگی" میں سب سے بڑا دخل اُس کے میاں کا ہوتا ہے (اگر وہ شادی شدہ ہے تو) شوہر ہی اچھا نہ ہو تو کاہے کی زندگی اور کاہے کے حالات۔ اشفاق نے میری زندگی کو اس قابل بنایا ہے کہ میں خوشی خوشی اپنے حالات لکھ سکوں! اُسی سال یعنی ۶۰ء میں میری پہلی کتاب "شہرِ ممنوع" بھی چھپی۔ اور حیدرآباد سے اسٹیٹ ساہتیہ ایوارڈ بھی بہترین افسانہ نگاری پر ملا۔ اُسی سال میری کہانیاں امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی کے نصاب میں لی گئیں۔ میری کہانیوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ لیکن زیادہ نہیں۔ یہی چند زبانوں، ہندی، مرہٹی، گجراتی، سندھی، انگلش تامل اور ملیالم میں ـــ میری اکثر کہانیاں اور تین کتابیں پاکستان سے چھپی ہیں۔ "اُترن خانہ" اور اب "شہرِ ممنوع" کا تیسرا ایڈیشن ہندوستان سے چھپ رہا ہے ـــــــ مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ اتنی کم ادبی عمر میں اتنی بے پناہ شہرت نے آپ کو مغرور تو نہیں کیا ہے؟ ـــ تو ارے اللہ میں نے ابھی لکھا ہی کیا ہے کہ غرور و دور کا چکّر چلنے کی نوبت آئے ـــ بس میرا جی چاہتا ہے جیوں اور خوب لکھوں ـ اور یہ بات سراسر خدا کے ہاتھ ہے۔

حالاتِ زندگی میں اپنے مذہبی عقیدے کا ذکر نہ آئے تو میرے نزدیک وہ حالات مکمّل نہیں۔ لیکن ایک جگہ میں نے اپنے مذہبی عقیدے کا ذکر کیا تو الزام لگا کہ اپنی عبادت کی پبلسٹی کرتی ہوں۔ بہرحال میں ایسی نمازی بندی ہوں جو ایک طرف تو پورے روزے رکھ کر پورا سر ڈھانک کر پل پل کر قرآن شریف پڑھتی ہوں اور ادھر مہینے میں ایک دو بار لپ اسٹک لگا کر بڑے خلوص سے پکچر دیکھنے جاتی ہوں۔ پردے جھردے کی میں قائل نہیں۔ ایسے اوٹ پٹانگ خیالات ہیں کہ پتہ نہیں دوزخ میں جلوں یا جنّت میں موج اڑاؤں۔ ویسے صرف ایک ادا پر لگتا ہے کہ اللہ میاں مجھے جنّت سے نواز دیں گے وہ ہے اپنے میاں کی بے پناہ خدمت اور محبّت ــــــ ویسے میں نے اپنی پسندیدہ چیزوں کے بارے میں تو آپ کو بتایا ہی نہیں۔ یعنی ایسی "چیزیں" جن کے بغیر میں زندگی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔

(۱) ایک شوہر ۲۔ پانچ بچّے۔ ۳۔ لپ اسٹک اور چاول ـــ اور آخر میں ہندوستانی فلمیں جن میں ولن کی خوب پٹائی ہوتی ہے۔ اور یہ وجہ ہے کہ ہیروئن کو اپنی دُلہن بنا لیتا ہے۔! پسندیدہ مشغلہ :- میاں سے جھگڑنا۔!!

دھنک کے رنگ نہیں

واجدہ تبسم

اور پھر پھول اتنا رویا — اتنا رویا کہ اس کا کلیجہ پھٹ گیا —

گھاس سر اٹھا کر بولی۔ "ارے بھائی تم روتے کیوں ہو؟ ابھی ابھی تو تمہارے منہ پر ہنسی آئی تھی کہ تم رونے بھی لگے —؟"

پھول نے مرتے مرتے جواب دیا — میں رویا ہوں اس لئے کہ دوسرے ہنس سکیں —" اور پھول مر گیا

دوسرے دن ٹہنی پر گلابی کلیاں جھوم جھوم کر ہنس رہی تھیں — گھاس نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا — میں کتنی نادان ہوں! اتنی سی بات میری سمجھ میں نہ آسکی"

ہم سب گھاس کی طرح نادان ہیں۔

(ایک جاپانی گیت)

رفیق میاں کندھے پر اچکن اٹکا کر باہر نکلے تو پیچھے سے حوری لپکی ہوئی آئی اور پردے کو اپنے جسم کے آس پاس لپیٹ کر، سر نکال کر بولی

"اجی ماموں جان پاندان میں ڈلی نہیں ہے۔"

رفیق میاں پلٹے۔ "نہیں ہے تو نہ رہے۔ کون پان کھانے کا اتنا شوقین ہے؟"

وہ پھر سے بولی۔ "امی جان کہتی ہیں، واپسی میں ضرور لائیے گا — ہاں — اور وہ پاؤں نچانے لگی۔

"یہ تو بھئی خواہ مخواہ کے خرچے ہیں، بی بنو — بھلا ....؟"

ابھی اُن کی بات اُن کے مُنہ ہی میں تھی کہ اچانک اُن کی نگاہیں حُوری کے تھرکتے پیروں سے جا ٹکرائیں۔ "ارے ....!

اچانک اُن کے منہ سے نکلا۔ اُن کی نگاہیں حُوری کے پیروں سے چپک کر رہ گئیں۔

"ارے یہ گلابی گرگابیاں —؟" حُوری نے اِترا اِترا کر پیر نچانے شروع کر دیئے۔ مخمل کی نازک نازک گلابی گلابی کامدار گرگابیاں۔ جیسے دو مہکتے مہکتے گلاب حوری کے پیروں میں مچل اُٹھے تھے۔ اُن کا دل دھڑ دھڑ دھڑ دھڑکا اور پھر وہ دل مزے سے حلق میں اُتر کر جھُولنے لگا۔ "اماں تو بوڑھی ٹھہریں۔ وہ بھلا ایسی گرگابیاں پہننے لگیں —؟؟ آپا بھی بے چاری بیوہ۔ سفید ساڑھی کے سوا کبھی تو انہوں نے دوسرے رنگ کی ساڑھی تک نہ پہنی، تو ایسی چمکتی دمکتی گرگابیاں وہ کہاں پہننے چلیں —؟ وہ زہرہ دلہن۔ انہیں تو میں جانتا ہوں۔ اُن کے پاس بھی ایسی گرگابیاں نہیں — .... پھر .... پھر .... اتّو میاں؟

اتّو میاں ٹھہرے مرد۔ وہ آخر ایسی رنگین بھڑکیلی گرگابیاں کیسے پہن سکتے ہیں وہ .... اور بچّے تو بچّے ہی ٹھہرے۔ پھر؟؟ ہو سکتا ہے آپا بی کے جہیز کی رکھی رکھائی ہوں اور حوری نے مارے اتراہٹ سے پہن لی ہوں۔ مگر آپا بی کا سارا جہیز تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے، اور جو کبھی جہیز کی ہوتیں تو بھی اتنے دنوں تک ان کی چمک دمک ماند نہ پڑ جاتی —؟ ہو سکتا ہے حوری نے ہی خریدی ہوں۔ اچھا اگر حوری نے ہی خریدی ہیں تو یہ اس کے پیروں سے اتنی بڑی کیوں ہیں کہ ایڑیاں تو اندر رہ گئی ہیں اور جُوتی پیچھے سے باہر نکل گئی ہے۔"

انہوں نے حیرت سے پھر حوری کے پیروں کو دیکھا۔ گرگابیاں تو اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتیں۔ ان کے زبان نہیں ہوتی — پھر یہ کیسی گرگابیاں تھیں بھئی جو باقاعدہ پٹ پٹ باتیں کر رہی تھیں، چہک رہی تھیں اور رفیق میاں کو باقاعدہ مجبور کر رہی تھیں کہ وہ بھی چہکیں اور ان کے ساتھ باتیں کریں۔

بھلا آدم کے سُنسان ویران جنّت کے باغ میں یہ کونسی حوّا آ گئی ہے کہ سارے میں گلاب مہکنے لگے ہیں — وہ

جھلّا کر بولے ـــــ "ارے یہ کس کی گرگابیاں چڑھا رکھی ہیں۔؟ خراب ہو جائیں گی تو ـــــ؟"

حوری نے پردے میں پاؤں چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ پھر چلبلا کر بولی۔ اے واہ خراب کاہے سے ہونے لگیں ـــــ"

"اور جو تو مسلسل ناچے جا رہی ہے تو اتنی نازک گرگابیاں جیسے پھٹیں گی تھوڑے ہی ـــــ"

حوری کس قدر منہ پھٹ تھی۔ "شکّو باجی کا درد آپ کو کیوں ہو رہا ہے۔ بھئی واہ جس کی چپلی وہ تو کچھ نہ کہے، تیسرا ہی دل اٹکاتا پھرے۔"

شکّو باجی ـــــ؟ وہ گڑبڑائے۔ یہ شکّو باجی کون۔ ذرا حیرت۔ ذرا نرمی۔ ذرا گھبراہٹ۔

"یہ شکّو باجی کون بھئی؟" بالآخر وہ کھل کر پوچھ بیٹھے۔

"وہی جو اندر بیٹھی ہیں۔ دھانی رنگ کی ساڑھی پہنے۔" وہ اک دم پردہ چھوڑ کر باہر لپک آئی۔ "قسم خدا کی ماموں جان۔ ان کا سارا بکس لال نیلے پیلے کپڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ راتّے پیارے پیارے رنگ کہ لوٹ پوٹ ہو جائے مَتی ـــــ اور ایک اور چھوٹا بکسا ہے جس میں ڈھیروں چوڑیاں۔ ایک اور بکسا ہے جس میں ان گنت چپلیاں، ڈھیروں جوتیاں رنگ برنگی کہ نظر نہ ٹھہرے۔ ایک بکس اور ہے جس میں...."

"اونہوں ہوں ـــــ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ تجھ سے اتنی ساری تفصیل کس نے پوچھی تھی۔ اور یوں اچک اچک کر باتیں نہ بنا۔ کہیں آڑھا ترچھا پاؤں پڑ گیا تو گرگابی بے چاری ٹوٹ جائے گی۔ اتنی نازک جو ہے!"

"تو کیا غضب ہو جائے گا خداوند۔ ڈھیروں تو جوتیاں ہیں۔ کچھ قحط تو نہ پڑ جائے گا۔"

"مگر دوسرے کی چیز لینا کچھ اچھا لگتا ہے۔" وہ اسے ذرا سی غیرت دلانے پر تلے ہوئے تھے۔

"یہ دوسرا کیا ہوتا ہے جی میاں ـــــ میری پھوپھی ہی تو ہے اور بھلا پھوپھی کہیں غیر ہوتی ہے جی ماموں جان؟"

رفیق میاں نے حیرت سے دیدے کھول کر پوچھا۔

"تیری پھوپھی ـــــ تیری پھوپھی یعنی کہ اپنی آپا بی کی نند۔"

"ظاہر ہے ـــــ" وہ انتہائی لاپروائی سے بولی۔

"مگر میں نے تو انہیں آج تک نہیں دیکھا بھالا۔"

حوری تنک کر بولی۔ "تو اس کا مطلب یہ کہاں نکلتا ہے کہ آپ نے نہیں دیکھا تو وہ میری پھوپھی نہیں ہوئیں۔"

"تو بڑی چربانک ہے لڑکی۔ یہ نہیں سوچتی کہ میں تیرا بڑا ماموں ہوں اور تو ایسی زبان چلاتی ہے۔"

"واہ بھئی واہ۔ میں نے ایسی کون بُری بات کہی۔ اپنا دل صاف نہیں اسی لئے جناب نے لتاڑ بتائی۔ میں نے تو ذرا ہی زبان ہلائی تو مجھ پر الزام"

رفیق میاں کو پہلی بات یاد آ گئی ـــــ تو آپ اسی لئے ڈلی منگوانے پر اصرار کر رہی تھیں کہ گھر میں مہمان آ گئے ہیں۔"

"ظاہر ہے ـــــ" وہی لہجہ ـــــ بیزاری بھرا

"حوری .... اے حوری ـــــ اری حور ....." اندر سے آپا بی کی آواز آئی ـــــ اور حوری پردے کو جھلاتی سپڑ سپڑ اندر کو بھاگ گئی۔

نرم نرم گلابی گلابی گرگابیاں اس کے پیروں تلے کس بُری طرح رگڑے کھا رہی تھیں۔ رفیق میاں جھلّا گئے۔ "اری کم بخت....."

کوئی آدھ پون گھنٹے بعد رفیق میاں باہر سے واپس آئے تو اپنے کمرے میں پہنچ گئے ـــــ مگر ہمیشہ کی طرح انہوں نے پلنگ پر پڑ کر تھکی ہاری سانس نہیں لی۔ بلکہ اچکن کو ٹانگ کر وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگے ـــــ پیروں کی چاپ سُنکر حوری پھر جان کھانے کو آن موجود ہوئی تھی ـــــ آتے ہی تنک کر بولی۔ "ڈلی آئی یا نہیں؟"

رفیق میاں نے خوشی خوشی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آج بہت اترا رہی ہے ری ـــــ اور جو دو چانٹے جڑ ہی دوں تو ـــــ"

حوری شرارت اور گستاخی سے بولی "اور میرے پیر تو غالباً جناب نے دیکھے ہی نہیں۔"

"اچھا ـــــ!!" وہ بناوٹی غصے سے بولے۔ "تو مطلب یہ ہے کہ آپ ان چپلیوں سے ہماری خبر لیں گی نا؟"

حوری کھی کھی کرکے ہنسنے لگی۔ "اچھا لائیے چھالیہ تو دے دیجئے ــــــ" وہ ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔

"تو چل ــــ میں خود ہی لئے آتا ہوں۔" اور وہ پلنگ کے نیچے جوتے ٹٹولنے لگے ــــــ آگے آگے حوری تھی اور گلابی مخملیں گرگابیوں کی ہلکی ہلکی دپ ــــ دپ اور پیچھے پیچھے رفیق میاں تھے اور تازہ تازہ گلابوں کی مہک ــــــ حوری پردہ اٹھا کر اندر کہیں غائب ہو گئی تھی۔ سامنے باورچی خانے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اماں ہانڈی بھون رہی تھیں۔ رفیق میاں آگے بڑھ گئے۔ بائیں ہاتھ والے کمرے کے اندر سے مشین کی کھر کھر سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے گردن نیہوڑا کر دیکھا ــــ آپا بی کچھ سلائی کر رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھ گئے ــــــ پرلے دالان میں اتو میاں کی بیوی بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھیں۔ وہ مایوسی سے اور آگے بڑھ گئے ــــــ سامنے والے کمرے میں حوری کی اسلم سے چھین جھپٹ جاری ہو چکی تھی۔ شاید گڑیا کی چوٹی کھینچے جانے کا سا کوئی سنگین معاملہ درپیش تھا۔ انہوں نے بھنا کر زور سے چھالیہ کی پڑیا تخت پر پٹخ دی اور اماں سے بولے۔

"یہ چھالیہ یہاں رکھ رہا ہوں ــــ پاندان جانے کدھر پڑا ہے ورنہ میں خود ہی کلیا میں ڈال دیتا ــــــ"

کونے والے کمرے میں جہاں سبز پردہ جھول رہا تھا، ہلکی سی گڑبڑاہٹ ہوئی اور اک دم رفیق میاں چکرا کر رہ گئے ــــــ

دھنک کے رنگ ــــــ

قوس قزح کی رنگینیاں ــــــ

دھیرے سے پاندان تخت پر رکھ کر وہ بولی ــــــ

"امی پان کھا رہی تھیں ــــ معاف کیجئے آپ کو تکلیف ہوئی"

نہ پھول مہکے، نہ کلیاں چٹکیں، نہ ہوائیں چلیں، نہ بادل جھومے۔ بس آپ ہی آپ بہار سی چھا گئی۔ جیسے سارے میں دھنک کے رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ رنگ جو بہاروں اور خوشبوؤں سے عبارت تھے۔

ہرا آنچل پاندان کے کونے سے اٹک گیا تو وہ ذرا کی ذرا رکی، مڑی اور ہلکی سی "اونہہ" کے ساتھ آنچل چھڑا کر اندر چلی گئی۔ اور تو کچھ نہیں لیکن اس کی وہ مخمل والی گلابی گلابی ایڑیاں وہیں رہ گئیں ــــ جو اتنی تازہ، اتنی نازک نتھیں جیسے گلاب کی کچی کلیاں !!۔ قسم خدا کی، یہ پاؤں نہیں یہ گلاب ہیں ــــ رفیق میاں نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ کہیں دل کی بات زبان نہ کہنے لگے اور جو زبان کہہ دے تو کان نہ سن لیں ــــ تو یہ بات کھل جائے گی کہ دیکھو بھائی یہ رفیق میاں تو محبت کرنے لگے ہیں ــــ!"

اب جب کبھی اندر سے پانوں کی گلوریاں باہر بھجوائی جائیں تو رفیق میاں کو ان پانوں سے صفا گلابوں کی خوشبو آتی ــــ اور وہ حوری سے پوچھتے ــــ "ہاں ری حوری یہ پان کس نے بنائے ہیں؟"

"شکو باجی نے ــــــ"

"کس نے ــــ؟" وہ جان کر دوبارہ پوچھتے۔

حوری چڑ جاتی ــــ "شکو باجی نے ــــ شکو باجی نے شکو باجی نے ــــ اب سن لیا یا نہیں؟"

"ارے یہ تمہاری شکو باجی بڑھیا کی طرح دن رات پان ہی چباتی رہتی ہیں کیا ــــ؟" وہ شرارت سے پوچھتے۔

"ہنش ــــ" وہ ناک سکوڑ کر کہتی ــــ انہیں پان کھانے کی کیا غرض پڑی ہے، ان کے ہونٹ تو خود ایسے سرخ ہیں کہ بس ــــ"

"اچھا تو یہ ساری دنیا کے لوگ بس اسی لئے پان کھاتے ہیں کہ ہونٹ سرخ ہو جایا کریں ــــ"

"ہم کو کیا پتہ لیکن یہ آپ کو شکو باجی سے کیا لینا ہے جی ــــ وہ بھلے سے پان کھائیں۔ چھالیہ کھائیں، آپ سے مطلب ــــ؟"

رفیق میاں جھٹ سے بات کا رخ پھیر دیتے، جو حوری سی طرار لڑکی بات چھوڑ دے تو سارے میں ادھم مچ جائے گی اور یہ گلوریاں تو دن بھر میں کم سے کم چار پانچ بار چلی آتی تھیں کمبخت ــــــ ورنہ

اماں جی کے ہاتھوں تو نہ کبھی پان ہی ملا — نہ پان کی طلب ہی کبھی محسوس ہوئی — اب تو جب دیکھو تب رفیق میاں کی جوبیچ لال ہے اور وقت بے وقت حوری سے فرمائش کئے جا رہے ہیں

"اری حُوری ذرا پان تو بنوا لائیو۔"

"ابھی ابھی تو پان کھایا تھا ماموں جان آپ نے — ہُوا کیا ہے آپ کو — ؟"

وہ چونک جاتے۔

"واقعی مجھے کیا ہوا ہے ؟ کیا ہو رہا ہے۔ ؟"

کوئی ہفتہ بھر بعد کی بات ہے۔ رفیق میاں مردانے میں بیٹھے کچھ کاغذات اُلٹ پلٹ کر رہے تھے کہ پردہ اُٹھا کر اماں اندر آ گئیں۔

"کیا بات ہے اماں — ؟" انہوں نے اپنا ہاتھ روک کر ماں سے پوچھا۔

اماں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دیوان کے کنارے ٹک کر بیٹھ گئیں — "تیری آپا بی کی نند اور ساس آئی ہوئی ہیں"۔ انہوں نے اپنے طور پر گویا بہت بڑی اور نئی خبر سُنائی۔

"انہیں تو آئے بھی غالباً چار چھ دن ہو گئے ہیں نا"

وہ لاپروائی سے بولے — اماں چپ رہ گئیں — بیٹے نے ماں کو چور نگاہوں سے دیکھا اور گلا صاف کر کے بولے "آپ کچھ خاموش خاموش سی نظر آ رہی ہیں اماں۔ کیا بات ہے ؟"

"نہیں تو —" اماں نے خواہ مخواہ کی ہنسی چہرے پر لانی چاہی — "تجھے وہم ہو رہا ہے"۔

"آپ کو قسم ہے اماں جو آپ نے مجھ سے کوئی بات چھپائی، ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے"۔

"اے واہ میاں — کیسی بات کرتا ہے۔ بھلا تجھ سے محبت نہ ہوگی تو پھر کس سے ہوگی — اللہ کے بعد تُو ہی تو میرا پہلا اور آخری سہارا ہے"۔ اماں کا جی کلپ اٹھا — آنکھیں بھیگ گئیں۔ "اور یوں بھر پور جوانی میں تجھ پر بڑھاپا آیا تو کس کے کارن ؟" انہوں نے رفیق میاں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا جس میں اِکّا دُکّا سفید بال جھلک رہا تھا۔

"اونہہ —" رفیق میاں نے پیار سے اماں کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "بس نے ایسا کیا کر دیا ہے آپ کے لئے، جو آپ بار بار یاد دلاتی رہتی ہیں — میرا تو جی چاہتا ہے اماں کہ اللہ مجھے ہزار جنم دے اور میں ہر جنم آپ پر اور بھائی بہنوں پر یوں ہی وارتا جاؤں ....."

"بس بس ...." اماں نے منہ میں پلّو ٹھونس لیا "اب ایسا نہ کہہ میرے بچے — تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔ میرا جی کیسے کیسے کٹتا ہے کہ تو نے ہماری خاطر، میری خاطر، ان بچوں اور اس گھر کی خاطر کیسا سنجوگ لے لیا۔ آج کو تیرا بھی گھر ہوتا۔ تیری بھی دُلہن ہوتی۔ تیرے بھی بال بچے — تیرے بھی جی کو ٹھنڈک پہنچتی مگر ....."

"اُف اماں بی تو ہوا ہی کیا — آپ کیوں یوں دل کو جلا رہی ہیں — کیا مجھے کسی نے منع کیا تھا ؟ کیا کسی نے میرا ہاتھ روکا تھا — ؟"

"وہی تو میں بھی کہتی ہوں —" وہ آنسو پونچھتی پونچھتی بولیں — "اگر آج کو تیرے سر اتنی ذمے داریاں نہ ہوتیں تو کیا تُو یونہی اکیلا۔ تنہا پڑا رہتا — ؟ اب تو میرا جی رہ رہ کر کہتا ہے کہ ....." آنسوؤں کا گلا دبوچے لے رہے تھے۔

رفیق میاں نے ہنس کر بات کاٹی — "اوہ اماں ان سب باتوں کا بھلا یہ کون سا موقع ہے ؟ اچھا بتایئے —" وہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔ "آپ میرے پاس کس کام سے آئی تھیں —"

اماں نے ڈوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کر کے کہا "بیٹا مہمان گھر آئے ہوئے ہیں، گھی ختم ہو چکا ہے — پراٹھوں اور انڈوں کے لئے تو گھی ہونا ہی چاہیئے .... ذرا سا تھا تو اتنے دن چل گیا۔ اب تو ڈول خالی پڑا ہے"۔

"کوئی بات نہیں، میں منگوا دوں گا ــــ اتنی اتنی سی باتوں کے لئے آپ یوں پریشان کیوں ہوتی ہیں اماں؟"

"اتنی سی بات ــــ؟" اماں الجھ کر بولیں "کیا تمہارے قدموں تلے سے گنگا بہہ رہی ہے جو اتنی سی بات ہے یہ ــــ اور ماشاءاللہ سے کھانے کے لئے تو پورا گھر بھرا پڑا ہے بھائی۔ بھاوج۔ تین بچے ....."

"اماں ــــ اماں ــــ" وہ ماں کے لہجے کو دھیما کروانے کے لئے خود بھی دبے دبے بولنے لگے

"آپ ذرا چپ رہا کیجئے ــــ انو کو بار بار الاہنے نہ دیا کیجئے۔ بدک گیا تو گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔"

"جاتا ہے تو سو بار جائے ــــ ہمارا کیا لے جائے گا؟"

"ہمارا چین سکون لے جائے گا" رفیق میاں کھوئے کھوئے لہجے میں درد سے بولے۔ "آپ بھول گئیں وہ ابا میاں کا کتنا دلارا تھا اور ابا میاں نے مرتے مرتے آپ سے کہا بھی تو تھا کہ بیگم، انو اور کوئی نہیں میرا ہی دوسرا روپ ہے اور ابا میاں نے مجھ سے بھی تو کہا تھا اماں کہ رفیق بیٹے میرے بعد اور کون ہوگا جو اس گھر کو دیکھے ــــ تم سے مجھے بہت ساری امیدیں ہیں۔ میرے پیچھے تم سا بیٹا ہو تو قبر میں بھی چین ہی چین ہے ــــ آپ انو کو دکھ دیں گی تو ابا میاں کی روح کہاں چین پائے گی۔"

"تمہاری شہ پا پا کر ہی وہ اتنا غیر ذمے دار اور لاپروا ہوگیا ہے، ورنہ کس نے دیکھا ہے کہ جوان جودھ کا مرد اور اتنے سارے بچوں کا باپ یوں گھر، زندگی اور پیسے خرچے سے بیگانہ رہے کہ پھوٹی کوڑی دینے کا بھی روادار نہیں ہے۔ اُلٹے دھونس جماتا پھرے۔"

"سنبھل جائے گا اماں ــــ آخر عمر ہی کیا ہے۔"

"یہ لو اور سنو ــــ ڈھیر سے بچوں کا باپ ہے اور آخر کیا عمر ہونی چاہیئے ــــ"

"ایسا چھوٹا دل بھی نہیں کرنا چاہیئے اماں۔ اوپر والا دیتا ہے، ہم کسی کو کھلانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں بھلا! سب اللہ کی دین ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا کہ اللہ کی دین ہے لیکن اللہ بھی کب تک دے گا ــــ دے گا۔ دے گا پھر ہاتھ سمیٹ لیگا۔"

"ارے واہ اماں یہ کیسے ممکن ہے بھلا ــــ بھولے بھٹکے دو چار مقدّمے تو مہینے بھر میں مل ہی جاتے ہیں۔"

"اور کھانے والے جو گاڑی بھر ہیں ــــ؟" اماں تلخی سے بولیں ــــ رفیق میاں نے جان کر بات کا رُخ موڑ دیا۔

"اچھا تو اماں میں صبح ہی باقر کو بھجوا کر گھی منگوا دوں گا۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہلوا دیجئے گا۔"

ماں کی آنسو بھری آنکھیں وہ بھول نہ سکے۔ رہ رہ کر انہیں ان جھریوں بھرے چہرے کا خیال آ رہا جس پر آنسو آڑھی ٹیڑھی ترچھی لکیریں بناتے ہوئے بہے چلے جا رہے تھے ــــ اور کیا اماں بی کا رونا غلط تھا ــــ دُکھوں سُکھوں سے پالی گئی اولاد کا کون ماں سُکھ نہیں چاہتی، کس ماں کا دل گردہ ہے کہ بیہان جوان اولاد کو کنوارپن کی تنہائیاں بھوگتے دیکھے نصیبوں کے ستم تو دیکھو کہ پھول کو بھی ہاتھ لگایا تو وہ کانٹا ہو گیا۔ ماں باپ کے گھر کوئی سُکھ تو برستا نہ تھا۔ جیسا میکہ تھا ویسی ہی سسرال ملی۔ مگر اللہ نے کل اولاد سے خوش رکھا۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے۔ اب اور کیا چاہیئے تھا۔ رُوکھی سُوکھی سے ہنسی خوشی سے بسر ہوتی ہی تھی۔ بیٹی عمر کے سترہویں اٹھارویں میں آئی تو ماں باپ نے اچھی جگہ دیکھ کر سر کا بوجھ اُٹھا دیا ــــ مگر قسمت کی ہیٹی تھی کہ بھری جوانی میں رنڈاپے نے آ گھیرا۔ اُوپر تلے چار بیٹے ہوئے۔ چوتھے باپ کی موت کے کوئی چھ سات ماہ بعد پیدا ہوئے۔ عورت کا سارا دم خم مرد کے دم سے ہوتا ہے۔ مرد ہی چھوڑ جائے تو کون اس کو پوچھے ــــ کون اس کی عزت کرے۔ باپ اور بھائی نہیں چاہتے تھے کہ غریبی سے سہی مگر نازوں لاڈوں کی پالی کو سسرال میں یونہی چھوڑ دیں۔ سسرال والے بھلے سے لاکھ نانا کرتے رہے مگر انہوں نے بیٹی کو گھر بلا ہی لیا۔ یہ پھر بھی اپنا ہی گھر تھا ــــ بُرے بھلے کی کیا بات تھی۔ جو یہ کھاتے وہی کچھ وہ بھی کھاتی ــــ جو یہ پہنتے وہی کچھ وہ بھی پہنتی ــــ یہ

تو نہ تھا کہ عمر بھر سسرالیوں کی چھیڑ چھاڑ پر پڑی سُنا کرتی —— چار دن تو ہر کوئی اوپر اوپر کرتا ہے اور پھر بات بات میں گوشے نکال کر موت میں ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے سے میکہ کیا بُرا ہوتا ہے۔

جانے کونسا اُلّو گھر پر پکار گیا تھا کہ ایک سے ایک مصیبت ٹوٹتی گئی —— دن نہ گذرے تھے کہ باپ بھی چلتے ہوئے۔ دو دو بیوائیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے —— جو کچھ بڑا پن تھا وہ رفیق میاں ہی میں تھا —— پڑھائی جاری تھی مگر اب ساری ذمے داری اُنہی کے سر آپڑی —— ماں نے پھر بھی اپنے اتنے حواس نہ کھوئے کہ بیٹے کی پڑھائی ہی ختم کروا دیتیں۔ پاس کا زیور، برتن بھانڈے کام آتے رہے۔ رفیق میاں کو وکالت کی ڈگری مل گئی —— یہ تو ہوا کہ منہ بھگونے کو کوئی آسرا تو ہوا، ورنہ چھوٹے انّو میاں تو بچپن ہی سے ماں باپ کے لاڈلے تھے۔ اب ان سے کیا آس تھی۔ اُن کی اور رفیق میاں کی عمروں میں فرق بھی تھا —— باپ بیٹے جیسا نہ سہی مگر گِنے جاتے یہ باپ ہی سے —— وہ بھلا دیتے کیا اور یہ لیتے کیا؟ بلکہ خود ہی چار آٹھ آنے کے لئے بھائی اور ماں کے آگے ہاتھ پھیلایا کرتے۔ ایسے میں وہ خود کسی کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں کیا رکھ سکتے تھے —— دسویں کے بعد تو ان کی پڑھائی کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ بھائی نے لاکھ چاہا کہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جائے مگر شاید ان کے مقدر ہی میں کسی کے زخموں پر مرہم رکھنا نہ لکھا تھا تو وہ کرتے بھی تو کیا کرتے؟

یونہی برس گذر گئے —— زندگی اس قدر سپاٹ تھی کہ کوئی اونچ نہ نیچ —— اس قدر ویران تھی کہ رنگ نہ بو۔ آخر ماؤں کے جی میں بھی ارمان ہوتے ہیں۔ اماں بی ایسی کونسی انوکھی تھیں اور بڑے بیٹے کی موجودگی میں آخر کو بول ہی اٹھیں "اللہ نے جیسی بھی گذار دی —— گذار دی۔ اس کا شکوہ کس سے کیا کریں۔ ہم سے بھی گئے گذرے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں مگر میاں اب تو یہی جی چاہتا رہے کہ میرے بھی آنگن میں بہو پازیب چھنکاتی پھرتی۔ اس سے پہلے بھی اماں نے ہزار بار کہا ہوگا مگر بیٹے ٹال ٹال گئے۔ جس پر اتنی ذمہ داریاں ہوں، وہ کیا گھر بسائے گا

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر آپ دیر کیوں کر رہی ہیں، سوچ کیا رہی ہیں۔ آخر کیوں نہیں ڈال لیتیں ایک ہنگامہ۔ لے آئیے دُلہن بھی ——"

اماں کی آنکھیں چمک اُٹھیں "کلموہنے —— اتنے دنوں سے پھر منہ کیوں سیئے بیٹھا تھا —— آج کو چار چار پوتے گھر بھر میں اُدھم مچاتے، لوٹتے پھرتے۔"

"پوتوں کا کیا ہے۔ آج بہو لے آئیے، چند ہی سالوں میں پوتے پوتیوں سے آنگن بھر جائے گا —— وہ ہنسے "مگر آپ نے کوئی ڈھنگ کی لڑکی بھی دیکھی ہے؟"

"تو تو کان ہی نہیں دیتا تھا، پھر لڑکی دیکھ کر میں کرتی بھی کیا —— اب تو نے حامی بھر لی ہے تو سمجھ میں نے لڑکی بھی دیکھ لی ——" وہ خوشی خوشی بولیں۔

رفیق میاں کچھ سمجھ کر گھبرائے "مگر اماں میں تو انّو میاں کی شادی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔"

"کیا کہا ——" اماں ان کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولیں "انّو کی شادی ہوگی اور تو یونہی سانڈ بنا گھومتا رہے گا ——"

"اماں ——" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سنجیدگی سے بولے "میرے حالات ایسے نہیں ہیں اماں کہ میں شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی سکوں ——"

"اوئی میں بھی تو سُنوں کہ وہ کون سے حالات ہیں جو تیری شادی میں پتھر روڑے اٹکا رہے ہیں؟"

"اماں میری حالت اس ستون کی سی ہے جو ساری چھت کو سنبھالے رہتا ہے۔ ستون ذرا بھی اپنی جگہ سے ہلا کہ ساری عمارت نیچے —— میں ایسی ناسمجھی کی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔"

"عقل والے ستون کو ہلنے بھی نہیں دیتے —— قدم جمائے کھڑے رہتے ہیں —— تجھے خود پر بھروسہ نہیں"

"ہاں اماں۔ مجھے کھلے لفظوں میں اقرار کرنے دیجئے کہ خود مجھے ہی اپنی ذات پر بھروسہ نہیں۔ مجھے اتنے سارے مرحلے طے کرنے ہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی جورو مل گئی جس نے گھر والوں میں پھوٹ ڈلوادی تو میں اپنے آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ یہ سارے لوگ کدھر بھٹکیں گے۔"

"اے چل میاں۔ عورت پاؤں کی جوتی ہوتی ہے، اس سے اتنا بھی کیا دبنا۔"

"نہیں اماں۔ آپ عورت ہو کر عورت ذات کی بے حرمتی نہ کیجئے۔ عورت تو سر کا تاج ہوتی ہے۔ وہ ہر روپ میں قابلِ عقیدت ہوتی ہے۔ میں خود کو بہت کمزور پاتا ہوں مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ سر کے تاج کو ٹھوکر لگا سکوں۔"

"تو کیا تو اب شادی کرے گا ہی نہیں۔؟"

وہ ہنسنے لگے۔ تو اماں کہنے لگیں۔ "تیری باتوں سے تو یہی لگتا ہے مجھے۔"

"جی نہیں اماں، اس کا یہ مطلب تو نہیں نکلتا میں شادی کروں گا ضرور۔ مگر ابھی نہیں۔ کچھ دن ٹھہر کر۔ جب حالات ذرا سدھر جائیں گے۔ دیکھئے نا اماں آپا جی کے بچے ہیں۔ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اتنے سارے بچوں کی لکھائی پڑھائی، پرورش، تعلیم، تربیت، پہننا اوڑھنا پھر آگے ہے اُس کی شادی بیاہ۔ اس کے بچے ہوں گے۔ پھر گھرداری۔ کتنی ساری اُلجھنیں اور بکھیڑے ہیں اور ......"

اماں بات کاٹ کر بولیں۔ "ارے پگلے تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اپنی اُلجھنوں اور بکھیڑوں کو بانٹنے والا بھی کوئی ہونا چاہیئے۔ مرد تھکا ہارا ہو، پریشان ہو، غم نصیب ہو تو کوئی تو ہاتھ ایسا ہو جو ممتا کی سی محبت سے اس دُکھی دل کو سنبھال لے۔"

"آپ جو ہیں۔"

"ماں ماں ہے بیٹا۔ بیوی بیوی ہی ہوتی ہے۔"

"میں اس بات کو نہیں مانتا اماں۔ عورت بہرحال عورت ہے۔ جو ہر حال میں، ہر روپ میں محبت ہی تو دیتی ہے۔"

آدم اور حوا کا حوالہ دیتے ہوئے اماں صاف صاف بے تکے پن پر اُتر آئیں۔

"وہ .... وہ اماں۔" بیٹے گھبرا گئے۔ "بات ایسی ہے کہ شاید آپ بھی ٹھیک ہی کہتی ہوں لیکن اماں اصل بات یہ ہے کہ اُف .... آپ میرا مطلب تو سمجھتی نہیں ہیں۔ میں نے کبھی آپ کا حکم ماننے سے انکار کیا ہے۔؟ یہ تو مجبوری کی بات ہے اماں اور آپ خود جانتی ہیں اور بوجھتی ہیں کہ میں شادی کرلوں، چار دن میں بال بچہ ہوگا۔ اپنی بیوی اپنے بچوں اور اپنے گھر گرہستی میں گھر کر بس یہی سوچا کروں گا نا کہ میں اپنوں کا منہ مار کر دوسروں کا منہ کیوں بھر دوں۔ کیوں ان کی حق تلفی کروں۔ آخر اپنی زندگی بھی میرے سامنے ہے۔ دوسرے خود کمائیں خود کھائیں، میں کیوں ان کا ساتھ دوں۔ کیا میں اکیلا کمانے کے لئے رہ گیا ہوں۔؟ اُف تو خیر مرد ہے کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ لیکن آپا جی کدھر ٹھوکریں کھاتی پھریں گی۔ پانچ بچوں کا ساتھ۔ چار دن میں لڑکی جوان ہو جائے گی پھر کیا ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہانڈی ڈوئی آپس میں کھڑکھڑائیں گی ضرور ہی۔ دو بہوئیں ہوں گی۔ دو بیٹے۔ دن گزریں گے تو دانتا کل کل شروع ہو جائے گی۔ ہمارا کیا ہے مگر بچوں میں کون آئے گا۔؟ آپا جی اور اماں بی۔! میرا تو کچھ نہیں جائے گا۔ اچھا بتائیے آپ نے میرے لئے کونسی لڑکی ڈھونڈی اور پسند کی ہے۔ میں کیوں یہ گناہ مول لوں کہ بڑھاپے میں ایسی محبت والی ماں کا دل دُکھایا۔؟"

اماں نے غور سے بیٹے کی صورت دیکھی۔ کتنی سچی باتیں اس نے کہیں۔ وہی تو اس گھر کا کرتا دھرتا ہے۔ وہی منہ پھیر لے تو کس پہ کیا گزرے، کون جانتے۔ یہاں تو سارا ہی کچا آوا تھا۔ اور پھر یہ تو دنیا میں ہوتی آئی ہے کہ شادی کے بعد مرد کا دل اس کے اپنے بس میں نہیں رہ جاتا۔ ایسی کٹھ پتلی بن جاتا ہے جس کی ڈور کسی اور کے ہاتھوں ہوتی ہے کہ جیسا نچائے ویسا ہی وہ ناچے۔

بیٹے نے ماں کو کچھ اس طرح قائل کیا کہ پھر آگے منہ ہلانے

کی ہمت ہی نہ پڑی ـــــ جی بہلانے کو آبائی کے نیچے تھے ـــــ بڑے بڑے بھی تھے تو کیا ہوا؟ تھے تو نیچے ہی ـــــ ہاں یہ ضرور تھا کہ گھر میں بیواؤں کا راج تھا۔ پائل کی چھنک اور چوڑیوں کی کھنک مدت ہوئی اس گھر سے رخصت ہو چکی تھی ـــــ اب اتو میاں کی دلہن آجاتی تو یہ ویرانی بھی رخصت ہو جاتی ـــــ

اپنے ہی قریبی عزیزوں میں بیٹی دیکھی اور اتو میاں کی شادی رچ گئی ـــــ دالان کے ساتھ والا کمرہ میاں بیوی کو دیا گیا۔ اب دلہن جو چلتی تو پازیب چھن چھنا اُٹھتی اور وہ آنچل سنبھالتی تو چوڑیاں کھنکنے لگتیں ـــــ اور کبھی جو اتو میاں کو رات بے رات شرارت سوجھتی تو پھر پائل اور چوڑیاں دونوں مل کر چیخ پکار مچانا شروع کر دیتیں۔ گھر کی فضا اب ایسی تھی جیسے برسوں پڑتی پڑی رہنے والی بنجر زمین میں کسی نے ہل چلا کر ہری بھری فصل اُگا دی ہو ـــــ پہلے تو یوں ہوتا تھا کہ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن اور اپنے اپنے بکھیڑوں میں اُلجھے رہتے۔ لیکن اب ان اداس چہروں پر ہنسی کی چھوٹ میں بھی دکھائی دے جاتی تھیں جو مدت ہوئی مسکرانا تک بھول چکے تھے ـــــ رفیق میاں، جب کبھی کوئی موٹی رقم ہاتھ لگتی، چھوٹی دلہن کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لے ہی آتے۔ کبھی ساڑی ـــــ کبھی جھمکے۔ کبھی چوڑیاں تو کبھی کنگن۔

دلہن تو بچوں کے لئے عجوبہ ہوتی ہے۔ گھیرے میں لے کر بیٹھ جاتے اور چہلیں ہوتیں۔ اب کہیں اتنے دنوں بعد اس گھر میں قہقہے جاگے ـــــ شادی کے ٹھیک دسویں مہینے چھوٹی دلہن کے درد اُٹھا ـــــ رات مصیبتوں سے کٹی ـــــ ایک طرف اتو میاں اور دوسری طرف خود رفیق میاں ـــــ دروازے کے باہر بیٹھے گھڑیاں گنتے تھے ـــــ اماں بدحواس۔ نند پریشان۔ پہلا پہل معاملہ اور چودہ گھنٹے گذرنے پر بھی مشکل آسان نہ ہوئی۔ رفیق میاں کا جی رہ رہ کر ڈوبتا اُبھرتا ـــــ مصیبتوں نے ہمیشہ سے اس گھر کو تاکا تھا۔ خدا نہ کرے زہرہ دلہن کو کچھ ہو گیا تو ـــــ وہ جان جوان دلہن اپنی جان سے جائے گی۔ یہاں کیا ہے آٹھ چار دن میں اتو میاں کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے گا ـــــ پھر ڈوبتے دل سے اتو میاں کو دیکھتے آنکھوں میں نمی گھلی پاتے تو خیال بدلنا پڑتا کہ گھر آباد ہو گا تب آباد ہو گا۔ یہاں تو ایسے وہناک کے مارے بیٹھے تھے کہ بُری بھلی خبر جو آجاتی تو وہیں بیٹھے بیٹھے دم چھوڑ دیتے

"ہمارے قہقہے نہ چھین لینا خداوندـــ" انہوں نے کلپ کر دُعا مانگی ـــــ

چیاں چیاں کی آواز آئی اور ادھر ان کا دل ان کے حلق میں آبیٹھا ـــــ اتو میاں چیاں چیاں سنتے ہی لپک پڑے۔ اُدھر ماں بہن ہاں ہاں کرتی ہی رہیں ـــــ

"ارے میاں کیا کرتے ہو۔" مگر وہ اندر پہنچ بھی گئے اور ہا ہا ہو ہو کر کے گوشت کے گولے کو ہنسانے کا جتن بھی کرنے لگے۔

اتو میاں باپ بن گئے ـــــ

رفیق میاں کا دل آج تک اس انداز سے نہ دھڑکا تھا۔ ماں نے ٹھیک کان کے پاس آکر بھتیجا ہونے کی خوش خبری سُنائی تو بھرے دل سے ہنس کر بولے ـــــ "چلو بھائی آج ہم تایا بن گئے۔"

اُس دن جب آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے آئینے کو خوش خبری سُنائی کہ لو بھئی تم تایا ہو گئے، تو آئینے نے ہنس کر بولا ـــــ "اور آج ہم بھی تم کو ایک خوش خبری سُناتے ہیں کہ وہ دیکھو تمہارے کان کے پاس ایک سفید تار سا چم چما رہا ہے ـــــ

"کہیں یہ بڑھاپا تو نہیں ؟؟"

لوگ کہتے ہیں کہ گرمیوں کی شاموں کو جو سرسراتی ہوائیں چلتی ہیں اُن میں ایک جھونکا ایسا بھی آتا ہے جو تنہائی کا احساس دلا کر کانوں کے پاس شائیں شائیں کئے جاتا ہے۔

"اُٹھو، کسی کا ہاتھ تھامو ـــــ اُٹھو کسی کا ہاتھ تھامو ـــــ اُٹھو ....." یقیناً ایسے ہی کسی جھونکے نے آدم کو تنہائی کا احساس دلایا ہو گا اور شدت سے دلایا ہو گا تبھی تو حوا نے ان کی پسلی میں اپنی سیج سجائی۔ مگر لاکھ ہوائیں چلیں ـــــ ہوائیں گرم گرم ہوائیں ـــــ ٹھنڈی ٹھنڈی زندگی بخش پھواروں سے بدلیں ـــــ پھواریں پھر سردیوں کا پیغام

لائیں ـــــ موسم کی اس آنکھ مچولی نے جی کو کیسے کیسے کلپایا۔ کبھی سرد برف کے سے جھونکے، کبھی پُروا ـــــ کبھی چھینٹے جو بدمست ہواؤں کے دوش بدوش آتے ـــــ اور یہ سرسر کرتے جھونکے کانوں میں سرگوشیاں کرتے "اُٹھو کسی کا ہاتھ تھامو ـــــ کسی کی مہکی ہوئی زلف کو اپنے چہرے پر بکھیر لو ـــــ کسی کا آنچل جو دھنک رنگ ہے اس میں اپنے وجود کو چُھپا چُھپا لو، لیکن رفیق میاں کے کان ایسے پٹ تھے کہ ان کے پردوں سے کبھی یہ آواز نہ ٹکرائی ـــــ

جنے ایک دن بیٹھے بٹھائے انہیں خود ہی یہ خیال کیوں آیا ـــــ زہرہ دُلہن نے تو کبھی کسی بات پر زبان نہ ہلائی۔ ممکن تھا کہ میں شادی کر لیتا تو میری دُلہن موم کی مورت ہی ہلتی۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں ـــــ اُونہہ اب غصّے کی بات تو جانے ہی دو۔ بھلا کون انسان ایسا ہے جسے ایک آدھ بات پر غصّہ نہ آتا ہو ـــــ پھر میری دُلہن ہی کیوں قصوروار ٹھہرائی جاتی ـــــ؟

یہ سوال انہوں نے اپنے دل سے کیا تھا۔ دل کچھ جواب نہ دے پایا۔ دیتا بھی کیا۔ لیکن دوسرے ہی دن انہیں خود بخود جواب مل گیا۔

ننھے اسلم کے چھلے پر گھر میں دھوم دھڑکا تھا۔ یوں تو اب گھر میں قہقہے سُنائی دیتے ہی تھے مگر اس دن تو ہر طرف خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ماں بن جانے کے بعد عورت کا دل بڑا نرم و نازک، بڑا وہمی بن جاتا ہے اور اسلم میاں تو یوں بھی ماں کو زیادہ ہی پیارے تھے کہ کڑے دردوں سے جنائے گئے تھے۔ گود بھرائی کی رسم کے لیے زہرہ دُلہن جب اسلم کو گود میں لے کر بیٹھیں تو چاؤ کے مارے بیوہ پھوپھی پھول پہنانے لگیں ـــــ چھوٹی دلہن کے منہ سے جیسے آپ ہی آپ سوچا سمجھا جملہ ٹپک پڑا ـــــ

"آپا بی پھول پہنانے کو ایک آپ ہی رہ گئی تھیں۔ چوڑی بھی تو ایک ہلکا پھلکا ہار پہنا سکتی تھی۔"

دُلہن نے تو اپنے حسابوں بڑی سمجھداری کی بات کی تھی لیکن آپا بی سے چھپا نہ رہ سکا کہ ان کا مطلب کیا تھا ـــــ بھلا کون بہن اپنی بھابی کے سہاگ کو یعنی اپنی ہی زندگی اپنے ہی بھائی اپنے ہی خون کو ٹوک سکتی ہے ـــــ ارمان بھرا دل بھائی کی خوشی پر خوش ہی ہوا ہوگا۔ یہ تو نہ سوچا ہوگا کہ اپنا منحوس سایہ بھابی پر بھی ڈال دیں اور بھائی بھرپور جوانی میں مر کر اپنے پیچھے اولاد کو یتیم چھوڑ جائے۔ پھر زہرہ دلہن کے منہ سے یہ بات کیسے نکل پڑی اور پھر وہ انداز سے وہ اسلم کو اپنے سینے میں سمیٹ بیٹھی تھیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہار تو گرا ہی گرا، اُدھر آپا بی بھی گر پڑیں۔

امّاں بی کے دل کو جو کھٹک دن رات کھائے ہی جاتی تھی کہ رفّو میاں نے شادی نہیں کی، شادی نہیں کی، وہ کھٹک آج کھٹ سے کہیں اُڑ گئی۔ آج انہیں یاد آیا کہ کیسی عقلمندی کی بات بیٹے نے کہی تھی کہ ہانڈی ڈوئی ساتھ رہیں گی تو کھڑکینگی ہی۔ اگر آج یہ رفیق میاں کی دُلہن نے کہا ہوتا تو کسی کو سہار ہوتی ـــــ؟؟ کوئی نہ کوئی کچھ کہہ اُٹھتا اور پھر وہ اپنے میاں کے کان بھر دیتی اور مرد کس کی سُنے گا؟ ماں بہنوں کی یا اپنی دل لگی بیوی کی ـــــ؟ جو اُس کا پہلو گرماتی ہے، اور بچوں سے اس کا گھر بھر دیتی ہے۔

رات کو رفیق میاں نے بڑی جھلملاہٹ سے اپنے دل کو سمجھایا

"میں جانتا ہوں تم عمر کے اس دَور میں ہو کہ کسی پر نگاہ نہ ڈالو گے لیکن پھر بھی آج تمہیں سُنا دیتا ہوں کہ اپنے کان بند کر لو، اپنی آنکھیں میچ لو، ایسا نہ ہو کہ کوئی سُریلی آواز اور مٹھاس بھری صورت تمہارا عہد توڑ دے۔ ممکن ہے کوئی چاند سی صورت تمہاری عبادت میں خلل ڈال دے۔

دل نے دھیرے سے جواب دیا۔

عمر کا یہی حصّہ تو خطرناک ہوتا ہے۔ اسی دَور میں آکر تو عورت کے پیار کی، اس کے محبت بھرے دل کی، اس کے نرم گرم جسم کی خواہشیں بڑھتی ہیں۔ پیاسا تو پانی دیکھ کر لپکتا ہی ہے۔ کیا میں یونہی قصوروار ٹھہرایا جاؤں گا؟"

وہ ہنسے ـــــ "نادان پیاس تو مدت ہوئی بجھ چکی ہے اب کوئی خطرہ نہیں ـــــ یہ تو محض ایک دوستانہ

مشورہ تھا۔"

دل بے تکے پن سے بولا۔ بعض مُلائم ہونٹ اتنے گستاخ ہوتے ہیں کہ بے صدا آواز سے پُکارے جاتے ہیں۔۔۔ ہمیں چُوم لو۔ ہمیں چُوم لو۔ ہمیں چُوم لو..... اگران گُستاخ ہونٹوں پر بھولے بسرے پیار آ ہی گیا تو۔۔۔؟؟"

"نہیں۔۔۔" انھوں نے دھیرے سے مضبوط لہجے میں کہا۔" ایسا کبھی نہ ہوگا۔۔۔ میری رُوح کے سارے دروازے بند ہیں۔ یہاں تک کسی کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ چاہے وہ پیار کی درخواست کرتے والے مُلائم ہونٹ ہوں یا چنگاریاں چھوڑتے ہوئے سُرخ سُرخ گال۔۔۔۔"

اس سے پہلے اماں نے ایک بار شادی کے لئے کہا تھا، بڑے پیار اور بڑی ضد سے انھوں نے بیٹے کو قائل کرنا چاہا تھا۔

"خواہ مخواہ عورتوں کو بدنام کرتا ہے۔ بھلا چھوٹی دلہن نے آج تک کیا کیا۔۔۔ بھلے کو بڑی ہی آتی تو دلی سکون تو ملتا۔"

"کیوں اب سکون نہیں ہے کیا۔۔۔" انھوں نے کہا تھا۔

"ہے کیوں نہیں۔ مگر..."

"مگر کیا۔۔؟"

"ارے کم بخت۔۔" اماں گلا پھاڑ کر چلاّئیں۔ "خواہ مخواہ ٹرٹر کئے جاتا ہے۔ کبھی تو اس ممتا کے مارے بوڑھے دل کا خیال کر...."

اُس دن اماں نے ایسی گُونج گرج کے ساتھ ڈرا دیا تھا کہ ایک لمحے کو وہ جھک سے گئے تھے اور اماں بھی اپنی جگہ خوش ہوگئی تھیں، مگر اُس دن کی بات اور تھی اور آج کی بات اور ہے۔ زہرہ دُلہن کی اتنی سی بات نے سارے گھر میں سناٹا پھیلا دیا تھا۔ اّنو میاں بن بات اپنی جگہ رُوٹھ گئے تھے۔ جیسے واقعی آپا بی کا قصور ہو اور آپا بی کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسوؤں کی قندیلیں سُلگ اٹھی تھیں۔ اب انھوں نے اماں سے جا کر بڑے دھیمے سبھاؤ میں کہا۔۔۔

"میری آمدنی تو یونہی سی ہے، اور کوئی ذریعہ آمدنی کا ہے بھی نہیں۔۔۔ اور اماں شادی کرنا تو سراسر آبادی بڑھانا ہے۔۔۔ بھلا اتنے سارے لوگوں کے کھانے پینے پر کچھ نہ کچھ خرچ تو لگتا ہی ہے۔ بس آپ سب لوگ میرے آس پاس رہیں۔ اماں مجھے سچ مچ بڑا غرور محسوس ہوتا ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میں اتنے سارے لوگوں کا بڑا ہوں۔ ان سب کی دیکھ ریکھ کرتا ہوں۔ میرے دم سے ان کی خوشیاں ہیں اور میرے ہی دم سے....."

اور اُن کی بات کاٹ کر اُن کا دل اُن سے پوچھ بیٹھا۔

"اور اپنی تو سُناؤ۔۔۔ سچ کہنا کیا تم نے کبھی ایک چاند سی دُلہن اور پھُول سے بچے کی آرزو نہیں کی؟ یہ تمہارے وجود پر برف کی سلیں کیسی رکھی ہیں، جو راتوں کو پگھل پگھل کر تکیے کو گیلا کر دیتی ہیں۔ اور اماں .... (وہ دل کا الاہنا شربت کا گھونٹ جان کر پی گئے) سب سے زیادہ خوشی تو مجھے اس بات کی ہے اماں کہ میں آپ کا بھی بڑا ہوں۔!"

اماں نے بیٹے کو سینے سے لگا دیا۔۔۔ وہ سِل، جو راتوں کو چھپے چوری پگھل پگھل کر تکیہ بھگویا کرتی تھی دن دہاڑے پگھل اُٹھی۔۔۔

ٹپ۔۔۔ٹپ۔۔۔ٹپ

شروع سے رفیق میاں نے انّو میاں کو ایسی شہ دی، بات بے بات یوں پُشت پناہی کی تھی کہ ان کو ذمہ داری کا احساس ہوا ہی نہیں۔۔۔ انسان کے آگے پیچھے کوئی اُلجھٹا ایسا لگا رہے کہ بار بار اُسی کا دھیان بندھا رہے تو وہ ذرا ذمے دار بن جاتا ہے۔۔۔ یہاں تو شروع سے لے کر آخر تک ہر کام کو رفیق میاں نے سنبھال لیا۔ پھر بھلا اُن میں کیا احساس پیدا ہوتا۔۔۔ اور تو اور پڑھائی بھی پوری نہ کر سکے۔ بھائی کی کمائی کو کبھی یہ سوچ سمجھ کر خرچ نہ کیا کہ یہ بھائی کے محنت کے پسینے کی کھینچ ہے اور انّو میاں کا تھا ہی کیا، سبھی رفیق میاں کے بل بوتے پر زندہ تھے۔ اگر رفیق میاں کی بھی کوئی بیوی ہوتی تو وہ اپنا حق جتا کر کچھ نہ کچھ تو

سنبھال بچا کر رکھتی۔ مگر انہوں نے خود ہی یہ روگ نہ پالا۔
اب تک تو جتنا بھی آیا سبھی کھائی میں گیا۔ ان کا جو کچھ بھی تھا
سب گھر والوں کا تھا۔ بھولے سے بھی کبھی خیال نہ آتا کہ کبھی
اپنی بھی شادی ہوگی۔ دلہن گھر آئے گی۔ اپنے بچے ہوں گے۔
اور ان کی بھی زندگی بنانی پڑے گی ___ جب آگے پیچھے
کوئی فکر ہی نہیں تھی تو اور کون سا خیال ہوتا جو جی سے
چمٹا رہتا؟ بس آپا کے یہی دکھ انہیں ستائے جاتا کہ میری
جان پر بھلے سے جو گذرے سو گذرے لیکن سب چین اور
امن خوشی سے رہیں۔ مگر اتنا سا سکھ ان کے نصیب میں
نہ تھا ___ زہرہ دلہن کا منہ ایک بار کیا کھلا کہ سدا کے
لئے ہی کھل کر رہ گیا۔ روز روز کی دانتا کلکل ہونے لگی ___
کبھی کبھار تو اماں بول جاتیں ورنہ اکثر خاموش ہی
رہتیں۔ مگر چھوٹی دلہن کا منہ بند ہونے میں نہ آتا ___
آپا بی کے بچے اسلم کے دیوانے ___ یوں بھی گھر میں ننھا
بچہ ہو تو بڑوں چھوٹوں سبھی کے لئے کھلونا ہو جاتا ہے۔
بچے اسے ستائیں بھی، ماریں بھی اور کھلا پلا کر پیار دلار بھی
کریں۔ اس کا یہ مطلب کہاں ہوا کہ بچے سے دشمنی
ٹھہری ہے۔ کھلائے پلائے کی حد تک تو ممانی چپ
تھیں لیکن جہاں بچے کی چیں بھی سنی وہ آپے سے باہر ___
"اوئی۔ بچہ نہ ہوا خدا کا غضب ہو گیا۔ میں کہوں، یہ
کون سی تک ہے کہ ننھے بچے کو رلا رلا کر خوش ہوتے ہیں۔
ہنستے ہیں ___ جوری ایسی طرار تھی کہ خاموش تو اس سے
بیٹھا ہی نہ جاتا۔ تیزی سے بولتی "ہاں ہاں جان کر رلاتے
ہیں ___ سن لیا ___ ارے کھاتا ہی بہت ہے تو چلائے گا
نہیں؟"

چھوٹی دلہن انگار اگلنے لگیں ___ اے لیو اور سنو۔
کیا تمہارے باوا جان جائداد چھوڑ کر مرے تھے کہ کھلائے
پلائے کا الاہنا دیتی ہو ___ لو بھئی چار دن کی چھوکری ہمارے
منہ آتی ہے۔"

آپا بی جو بیک کہ دو چار ڈھول دھپے جوری کو جڑ
دیں تو جڑ دیں ورنہ بات بڑھتی ہی چلی جاتی ___ اور
جب تک خود رفیق میاں اپنے کاغذات کے انبار سے نکل کر
نہ آتے تب تک صلح صفائی نہ ہوتی

انہی دنوں زہرہ دلہن کی چھوٹی بہن طاہرہ اپنی بہن سے
ملنے آئی ہوئی تھیں ___ اچھی خاصی صورت۔ ڈھنگ گن بھی
اچھے ___ منہ کی ایسی میٹھی کہ بس باتیں ہی سنا کرو۔ رفیق
میاں سے پردہ تھا لیکن آتے جاتے جھلک ضرور دکھائی
پڑ جاتی ___ اماں تو چھوٹی بہو کے تماشے دیکھ دیکھ کر دنگ
تھیں ___ مگر آپا بی چاہتی تھیں کہ رفیق میاں گھر بسا لیں ___
جانتی تھیں کہ یہ ویرانی بھائی نے کسی اور کے لئے نہیں انہی
لوگوں کے لئے اٹھائی ہے، ورنہ آگے پیچھے بہن بھائی بھانجے
بھتیجے نہ لگے ہوتے تو وہ کیوں ایسے ڈھائیں ڈھائیں پھرتے۔
لاکھ چاہا کہ بھائی ہاں کر دیں لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔
بہن نے بہت ہی جان کھانی شروع کی تو بولے ___
"جیسی ایک بہن ویسی دوسری۔ زہرہ دلہن نے بیٹھے بیٹھے
کیسے ہاتھ پاؤں نکالے ہیں، اگر طاہرہ بی بی بھی ویسی ہی
نکلیں تو ___؟ پھر تو اس گھر کا اللہ ہی مالک ہے ___ نہ
آپا بی نہ ___ میرے سامنے میرے ننھے منے بھانجے بھانجی
ہیں۔ ان کی زندگیاں ہیں ___ میرا اپنا بھائی ہے۔ لاکھ جان
جوان ہے مگر مجھے تو یہ بات نہیں بھولتی کہ ابا میاں میرے
ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے کر گئے تھے پھر اس کی بیوی بچے
ہیں۔ آپ ہیں۔ اماں بی ہیں ___ میں کیسے اتنے سارے
لوگوں کو چھوڑ دوں؟ میں اور کتنی بار دہراؤں کہ مجھے بار بار
مجبور نہ کیا جائے۔ میں اپنا ذہنی سکون نہیں برباد کرنا چاہتا۔
سب سے ٹھیک یہ ہے کہ اتنے سارے لوگوں کو چھوڑنے
کی بجائے میں ایک دلہن کو چھوڑ دوں ___"

آپا بی خوش ہو گئیں "اگر طاہرہ بی بی بھی ایسی ہی
نکلیں تو ___" مطلب یہ کہ وہ شادی کے لئے راضی تو
ہیں مگر وہ صرف اس وجہ سے آنا کانی کر رہے ہیں کہ کہیں
بڑی بہو بھی چھوٹی کی طرح بدتمیز اور لڑاکا نہ نکل آئے
اور گھر کا سکون لٹ جائے ___ وہ خوشی خوشی بولیں
"اے میاں تو میں کوئی اچھی سی میٹھے سبھاؤ کی دلہن

ڈھونڈھ لاؤں گی۔"

سامنے ٹوکری میں سیب دھرے تھے۔ ایک سُرخ سا سیب اٹھا کر وہ بولے ۔۔۔ "یوں دیکھنے میں اوپر سے تو یہ اتنا خوبصورت نظر آرہا ہے لیکن کون جانے یہ میٹھا ہے یا کھٹا۔۔۔"

آپا بی کی زبان پر تالے پڑ گئے ۔۔۔۔

ایک دن چھوٹی دلہن نے بڑے چاؤ سے باورچی خانہ سنبھالا اور ہری مرچوں کا کھٹا سالن پکایا۔۔۔ اور تو سب نے ہری مرچوں کا کھٹا اور تیز سالن مزے لے لے کر کھایا مگر۔۔۔ اماں بی ایک تو بوڑھی دوسرے دس دن سے پیچش سے گھل رہی تھیں ۔۔۔ سوں سوں کر کے جیسے تیسے مگر انہوں نے بھی کھا ہی لیا۔ بہو کو یہ بات نہ بھائی کہ سب تو تعریف کریں اور ساس شوں شوں کر کے سب کی توجہ اس بات کی طرف دلائیں کہ "دیکھو بھئی اس نے سالن مزے کا نہیں پکایا۔ بلکہ مرچیں کچھ زیادہ ہی جھونک دی ہیں ۔۔۔"

وہ کھرے پن سے بولیں "اوئی اماں جان آپ یہ سُوں سُوں کیوں کئے جا رہی ہیں۔؟"

اماں نے بےچارگی سے دیکھا اور بولیں "بی بی میں کچھ بہانہ تو کر نہیں رہی ہوں، دیکھو پیچش کے مارے زبان چھالوں سے لد گئی ہے ۔۔۔" انھوں نے زبان نکال کر بتائی۔ سُرخ کھیری ہو رہی تھی۔

انو میاں۔ بیوی سے مخاطب ہو کر بولے۔ "تمہیں معلوم تھا اماں بیمار ہیں تو ایک پھیکا سالن الگ سے پکا دیتیں۔"

" اے واہ ۔۔۔ میں کوئی باورچن ہوں؟ کیا میں نے ماماگیری کرنے کا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے کہ سارے گھر کا کام کاج کرتی پھروں ۔۔۔ ایسا ہی ہے تو چولہے کیوں نہ الگ کرلیں ۔۔۔ وہ اپنی مرضی سے کھائیں، ہم اپنا من مانا پکائیں ۔۔۔" بہو کی زبان چرچر چلی ہی جا رہی تھی۔ رفیق میاں نے ناگواری سے بھاوج کو دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔ اماں بی بھی خاموش رہ گئیں ۔۔۔ مگر آپا بی سے چُپ نہ رہا جا سکا ۔۔۔ تیوری چڑھا کر بولیں ۔۔۔

" دلہن ۔۔۔ ایک دن چولہے کے پاس جا کر جھانکا تو اتنی باتیں کر رہی ہو ۔۔۔ آخر تمہیں اپنے بچوں سے فرصت ہی کب ملتی ہے کہ باورچی خانے کا رُخ بھی کرو۔ اوپر کا سارا کام تو باقر ہی نبیڑ لیتا ہے۔ رہا روٹی تھوپنا اور ہانڈی بھون دینا تو آخر میں اور اماں پھر کرتی ہی کیا ہیں؟"۔

"گویا میں تو مالکن بن کر راج رج رہی ہوں نا"۔ وہ تیکھی ہو کر بولیں۔

"میں نے تو نہیں کہا بی ۔۔۔ تم آپ کہہ لو تو میں کیا کہہ سکتی ہوں ۔۔۔ لیکن تم ہی کہو کہ شادی کے اتنے دن گذر گئے تم نے کتنی بار باورچی خانے میں جھانک کر بھی دیکھا۔ ایک دن ایک سالن پکا کر یہ کہہ دینا ذرا تو زیبا نہیں کہ میں باورچن نہیں جو سارے گھر کا کام کاج کرتی پھروں ۔۔۔ انسان ذرا تو ایمان کا پاس کرے۔"

سارے گھر میں وہ ہلور مچی کہ توبہ ہی بھلی ۔۔۔ دلہن نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ آخر رفیق میاں کو ٹھنڈے دل سے کہنا پڑا۔

"آپا بی آپ غلطی پر ہیں۔ چھوٹی دلہن کا کہنا ٹھیک ہے۔ اگر ان کی مرضی ہو تو آپ چولہا ہانڈی الگ کر لیں۔"

اماں جو اب تک چُپ تھیں، پھپھک کر بولیں۔

"اے واہ ان کی مرضی ۔۔۔ یہ ان کی مرضی کیا ہوئی۔ کون سی بڑی ان کی کمائی دھمائی ہے۔ ذرا منہ تو ہو بولنے کے لئے ۔۔۔ دوسروں کے مال پر یوں چودھرائی کرتے ذرا تو شرم آئے ۔۔۔"

انو میاں نے ندامت سے سر جھکا لیا ۔۔۔ بھائی صاحب آپ زہرہ کی باتوں کا اثر نہ لیں۔ سب ایک ساتھ ہی بھلے ۔۔۔ خواہ مخواہ ایک فتنہ کھڑا کر دیا۔" وہ غصے سے بیوی کو گھورتے ہوئے بولے ۔۔۔" بہو کو ساس کی بات تیر جیسی لگی ۔۔۔"

" یہ دوسروں کے مال کی اچھی سُنائی ۔۔۔ آخر کو بڑے بھائی ہیں، کچھ تو حق لگے گا۔ اور کیا ابا میاں یونہی خالی ہاتھ تو نہ مرے ہوں گے' پھر وہ جمع جتھا

کدھر ہوگئی۔ ہمیں تو پھوٹی دمڑی تک نہ ملی ـــــ ورنہ یہ بڑے
بھائی آج وکیل اور چھوٹے بھائی ان پڑھ نہ رہ جاتے۔"

ایک تلوار تھی کہ سب کے دلوں کو کاٹتی ہوئی نکل چلی۔ کوئی کچھ
نہ کہہ سکا۔ کسی کے منہ سے ایک حرف نہ نکلا۔ رفیق میاں اپنی
جگہ سکتے میں رہ گئے۔ اسی کو دنیا کہتے ہیں۔ بھائی سے محبت
کی اور ایسی کہ کبھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ دیکھا ـــــ ہر ضد پوری کی۔
یہاں تک کہ پڑھنے سے جی چرایا تو ڈانٹ ڈپٹ تک نہ کی کہ
دل پر بوجھ نہ پالے۔ اسکول سے اس لئے اٹھایا کہ پڑھائی
میں دل نہ لگتا تھا۔ ماسٹر مار پیٹ کرتے تھے تو روتا ہی رہتا
تھا اور ان کا اپنا دل دکھتا تھا ـــــ خود روکھا سوکھا کھا کر سب
کی برابری کی۔ اپنے ارمانوں آرزوؤں کو تھپک تھپک کر سلایا۔
اپنے جذبات کی خود ہی قدر نہ کی اور بھائی کی سیج سجادی۔
بھائی کی دلہن آئی تو ان کا اپنا بستر ان کے لئے کانٹوں کا بچھونا
ہوگیا ـــــ مگر کسی سے کبھی اپنے دل کا درد نہ کہا۔ بھائی
باپ بنا تو جگر پر آرے چل چل گئے، مگر دل کے درد کو تکیہ
بھگو بھگو کر مٹاتے رہے اور آج بھاوج نے کیا صاف صاف
سُنا دیا ـــــ پشیمان نگاہوں سے بھائی کو دیکھا ـــــ لاکھ
بُرے تھے انو میاں، مگر ان میں ایسی بُری کوئی ادا نہ تھی کہ
جس کی وجہ سے بڑے بھائی کا دل ان سے پھر جاتا ـــــ بس
اتنی بات ضرور تھی کہ گھر بیٹھے روٹی توڑتے تھے اور کمائی نہ
دھن۔ سال پیچھے بچہ جنتے تھے لیکن یوں کھری کھری تو کبھی
انہوں نے بھی نہ سُنائی۔

انو میاں نے بڑی شرمندگی سے بڑے بھائی کو دیکھا۔
اور غم سے بولے ـــــ بھائی صاحب زہرہ کی باتوں پر نہ
جائیے۔ چولہے دو ہو جائیں گے تو دل بھی دو ہو جائیں گے۔"

"ـــــ ہمیں کیا ایک دل لے کر چاٹنا ہے جی کہ آئے دن کی
موئی لڑائیاں لپٹ گئی ہیں۔" زہرہ دلہن کا غبار ابھی تک نہ
نکلا تھا۔

"ہاں زہرہ تم ٹھیک ہی کہتی ہو ـــــ ایک جگہ رہ کر بکھرے
ہوئے دلوں سے یہ کہیں اچھا ہے کہ بکھرے ہوئے رہ
کر دل ایک رہیں ـــــ" رفیق میاں نے ٹھنڈی
سانس بھر کر بھیگے بھیگے لہجے میں کہا۔

چولہے دو ہوگئے لیکن دل پھر بھی ایک نہ ہو سکے۔
دل کی رنجشیں باقی ہی رہیں۔ چھوٹی موٹی باتوں پر آئے دن
جھڑپ ہو جاتی۔ آناں تو طرح دے کر ٹال جاتیں لیکن آپا بی
برداشت نہ کر پاتیں ـــــ انہیں رہ رہ کر یہی دکھ ستاتا کہ آج
بھائی کی حالت انہی کی وجہ سے یوں تباہ ہے۔ یوں وہ بڑے
نرم سبھاؤ کی تھیں۔ اپنی سسرال میں کسی سے اونچی آواز سے
بات تک نہ کی۔ اپنے سے چھوٹوں تک کی بھی عزت کی۔ بھلا
بڑوں کا تو پوچھنا ہی کیا ـــــ مگر بھاوج نے رات دن کے طعنوں
مینوں سے ان کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔

پہلے پہل تو رفیق میاں گھر کے اندر ہی دالان کے دائیں
ہاتھ والے کمرے میں رہتے تھے مگر جب لڑائیوں کا زور شور
بڑھا تو وہ مردانے میں اُٹھ گئے۔

بیاہے مرد کو یہ احساس نہیں ہو سکتا کہ ایک کنوارے مرد
کی زندگی کیسی کانٹوں کا بچھونا ہوتی ہے۔ عورت کا ساتھ کسی
ٹھنڈے باغ سے کم نہیں ہوتا ـــــ فکر ہو، پریشانی ہو، غم ہو،
الجھن ہو، ذرا جی ہارا اور عورت کا سہارا لیا۔ اس کے
پیار کے دو بول زندگی میں ٹھنڈک پھیلا دیتے ہیں۔ غم کے
اندھیرے میں اس کی محبت اور دلاسوں سے چاندنی بکھرنے
لگتی ہے ـــــ ہر غم تو ایسا نہیں ہوتا کہ ماں بہن سے رونا لے
بیٹھے ـــــ ماں، بہن لاکھ کلیجے سے چمٹائیں وہ بات پیدا نہیں
ہو سکتی جو عورت محض ایک پیار بھری ترچھی نگاہ سے ہی دیکھ
لے!!

رفیق میاں کی زندگی میں تو اس نگاہ کا گذر ہی نہ تھا ـــــ
رات ہو یا دن ـــــ بیٹھک بھلی اور وہ بھلے ـــــ کاغذات
سامنے دھرے ہیں اور وہ سوچ بچار میں غرق ہیں۔ کبھی بچے
اچھل پھاند کرتے پہنچ گئے، کبھی گوری شرارت کرنے جا
پہنچی۔ ورنہ وہاں وہی یک رنگی تھی ـــــ ایک دن انہوں
نے بڑے جتن سے اپنے دل کو سمجھایا تھا۔

"اپنی آنکھیں میچ لو ـــــ اپنے کان بند کر لو۔ کیا خبر
کوئی چاند سی صورت تمہاری عبادت میں بادھا ڈال

دے۔" اب ایسی بات سوچ کر انہیں ہنسی آتی تھی۔ بھلا میں بھی کتنا نادان تھا۔ دل کو سمجھانے چلا تھا ___ بھلا میری زندگی میں کہیں چاند چمکا کرتے ہیں؟ اور جو چمکیں بھی تو میں کہیں دیکھا کرتا ہوں۔"

اور وہ مزے میں اِدھر اُدھر ڈولتے پھرتے۔ اپنے کھچڑی بالوں کو دیکھتے اور بولتے۔

"عبادت کے دروازے تو بند ہیں۔ اب یہاں کون آئیگا کیسے آئے گا ___؟" گرمیوں کی رسمساتی شاموں کا وہ البیلا جھونکا کبھی تو ان کے کانوں میں نہ کہہ سکا کہ "اٹھو کسی کا ہاتھ تھامو۔"

مگر اب ان کا سارا مان ٹوٹ کر رہ گیا ___ سُرخ مخملیں چپلیوں کو دیکھ کر ان کی ساری عبادت دھری کی دھری رہ گئی ___ وہ نرم نرم گرگابیاں ان کے دل سے یوں چمٹ کر رہ گئی تھیں کہ نکالے نہ نکلتیں ___ نہ کسی کی چاند ایسی صورت پر پیار آیا نہ کسی کی سُریلی آواز نے کانوں میں رس ہی گھولا۔ نہ کسی کی نگاہوں کا تیر دل کے آرپار ہوا ___ نہ کسی کی البیلی چال نے ان کا سیدھا راستہ چلتے قدم ڈگمگائے ___ اور تو اور کسی کے سُرخ ہونٹوں نے یہ گستاخی نہیں کی کہ "ہمیں چوم لو ___ ہمیں چوم لو ... ہمیں ...."

جنے کیسا سمے تھا کہ بے پروں کے دل اُڑنچھو ہو گیا۔ ان کا دل چاہتا کہ نرم نرم گرگابیوں پر ہمیشہ کے لئے اپنا سر جھکا دیں ___ "میں تمہاری عبادت کرتا ہوں۔ میں تمہیں پُوجنا چاہتا ہوں ___ میں تمہیں پیار کرنا چاہتا ہوں۔"

اور جب سے وہ شوکی اپنی پیٹھ موڑے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اپنی گلابی گلابی ایڑیاں ان کے دل کے زخموں پر مرہم کی طرح رکھتی چلی گئی تھی۔ ان کو ہمیشہ اپنے آس پاس گلاب کی ادھ کھلی کچی کلیوں کا ڈھیر سا محسوس ہوتا رہتا۔ ہاتھ بڑھا بڑھا کر وہ ان کلیوں کو چھونا چاہتے تو وہ جیتی جاگتی ایڑیاں بن جاتیں اور دھیرے دھیرے دُور ہوتی چلی جاتیں۔ یہ ٹھٹکتے تو قہقہے لگا کر کہتیں ___

"ہمیں چھُوو نہیں، ہماری عبادت کرو ___ ہم تو پوجے جانے کے لئے ہی بنی ہیں۔"

اور یہ کسی انجانی طاقت کے آگے اپنا سر جھکا دیتے ___

کیا یہ محبت ہے ___؟ وہ اپنے دل سے پوچھتے۔

___ دل بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔

"عبادت خانے کے دروازے تو بہر حال اب کھل ہی گئے ہیں اور جیتا جاگتا بُت اس میں داخل ہو گیا ہے۔ عبادت تو کرنی ہی پڑے گی ___ بھلے یہ کفر ہی سہی۔"!!!

اب تک تو رفیق میاں کی شوکت سے مڈبھیڑ نہ ہوئی تھی۔ وہ تو اندر ہی گھسی رہتیں۔ کھانا لگ جاتا تو ادھر سے اماں بی آواز دیتیں۔

"رفو میاں کھانا کھا لے بیٹا ___" یا پھر حوری تھرکتی ہوئی آتی اور وہیں سے چلائے جاتی۔

"سب بھائی لوگ کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ماموں جان اجی ماموں جان چلئے نا بھئی کھانے ......"

پہلے رفیق میاں یونہی اُٹ چھٹ کر آ جایا کرتے اور اب گھر میں داخل ہونے پر یوں سنبھل جاتے تھے، جیسے عبادت گھر میں داخل ہو رہے ہوں۔ سر جھکا ہوا۔ آنکھیں نیچی۔ ہلکے ہلکے قدم ___ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا کہ شوکت نظر آ گئی ہو ___ مگر انہیں تو اُڑتی خوشبوئیں آپ ہی بتا دیتی تھیں کہ وہ گلاب کس جگہ مہک رہا ہے۔

انو میاں کے گود کے بیٹے کا عقیقہ تھا۔ ایسے کام کاج کے دن دو جگہ کھانا نہ پکتا بلکہ سبھی ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ ورنہ جب سے لڑائی ہوئی تھی اس گھڑی سے لیکر آج کے دن تک الگ الگ ہی کھانے پکتے اور کھائے جاتے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کے گھر تو کچے گوشت کا حصہ بھجوا دیا گیا۔ گھر میں تین چار رنگ کے سالن قورمے پکے۔ میٹھا بنا۔ تیلی تیلی چپاتیاں ___ کھانا کھانے سبھی بیٹھے۔ رفو میاں نے ایک نوالہ مُنہ میں رکھا اور بے ساختگی سے بولے

"قسم خدا کی، اماں کیا ہی مزے دار قورمہ بنایا ہے۔"

اماں شوکت کی طرف دیکھ کر پیار سے مُسکرا دیں۔

شوکت عورتوں والے حصّے میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ اپنا ذکر اور پھر تعریف کے سلسلے میں سُن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں اُٹھیں اور سیدھی اُن بجلیوں سے جا ٹکرائیں جو اتفاقاً رفیق میاں کی آنکھیں تھیں ——— رفیق میاں بُری طرح گڑبڑا گئے۔

کھانا حلق سے اُترا بھی نہ تھا کہ جلدی سے سامنے سے کھارے کی رکابی ہٹا کر میٹھے کی طشتری کھینچ لی۔

پھر شامت آئی ——— ماں سے اسی لہجے میں لاعلمی میں کہنے لگے ———

اماں میں سمجھتا ہوں آپ نے اتنی مزے دار فرنی تو آج تک شاید ہی کبھی بنائی ہو ———"

اب کے اماں صاف صاف ہنس پڑیں۔

"اے لڑکے تیری عقل ماری گئی ہے۔ دوپہر سے گھر میں ہلّڑ ہے کہ آج کے کھانے شوکت نے پکائے ہیں اور ماں کی تعریف ہو رہی ہے۔ واہ ———"

لوگ کہتے ہیں کیسی ہی پتھر دل عورت ہو مرد کی تعریف سے بہہ جاتی ہے اور بھلا شوکت پتھر دل کب تھی ———؟

اب کی بار پھر شوکت کی نگاہیں اُٹھیں اور اب کے، بجائے آنکھیں ملنے کے، یوں ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اُتر گئے اور آنکھوں کے راستے سیدھے دل میں اتر کر بیٹھ گئے، ہمیشہ کے لئے ——— ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

بے تکے پن سے رفیق میاں اُٹھے اور لپکتے ہوئے باہر چلے گئے ——— دھم سے اپنے پلنگ پر گر پڑے اور اُوپر نیچے لمبی لمبی سانسیں لینے لگے ——— پلٹ پلٹ کر اِدھر اُدھر دیکھتے اور گھبرا گھبرا کر آنکھیں بند کرتے اور پھر کھول دیتے ———

کچھ نہ سوجھا تو آئینے کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور آنکھوں میں جھانکنے لگے ——— سوچا تھا وہاں شوکت ملے گی لیکن وہاں تو بس وہی وہ تھے ———

"تم کہاں چلی گئیں ——— تم کہاں چلی گئیں . . . ."

"میں ——— ؟ میں تو تمہارا ہی ایک روپ ہوں۔ میں تم سے الگ کب تھی جو مجھے کھوجنے کی ضرورت پڑے — اپنی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو، اگر اپنا ہی عکس نظر آئے تو جان لو کہ وہ تم نہیں، میں ہوں میں، جو تم میں جذب ہو کر تمہارا ہی روپ دھار چکی ——— !!!"

پلکیں جھپکا جھپکا کر انہوں نے دُور دُور تک اپنی آنکھوں کی سیر کر ڈالی۔ وہاں اُن آنکھوں میں شوکت بہار بن کر پھول کھلا رہی تھی۔ پھول بن کر خوشبو مہکا رہی تھی اور خوشبو مہکا کر اپنے وجود کو نہلائے بیٹھی تھی ——— میٹھی میٹھی پھوار سے ان کا سارا جسم بھیگ گیا۔

وہ شوکت بڑی نازک تھی۔ دُبلی پتلی، سرخ و سفید رنگت ——— پیٹھ پر لمبی سی موٹی چوٹی سدا جھولتی ہوئی۔ وہ یوں تو جُوہی کی مُنّی کلی ایسی تھی مگر اس کی ساری خوبصورتی آ کر ایڑیوں میں جمع ہو گئی تھی ——— ایسی کومل کومل گلابی ایڑیاں کہ ایک دن رفیق میاں نے حوری سے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ری حوری ——— یہ تیری شکّو باجی نے کہیں گلابی رنگ تو گھول کر اپنی ایڑیوں میں نہیں بھر لیا ہے ———؟"

——— حوری ہنستے ہنستے لوٹ گئی ——— لوٹتے لوٹتے پھر اُٹھ بیٹھی اور اُٹھ کر اندر بھاگ گئی۔ اپنے قہقہوں کو روک کر اس نے بڑی مشکلوں سے پھوپھی سے کہا۔

"شکّو باجی کچھ سُنا ——— ہمارے ماموں جان کہہ رہے تھے"۔ وہ سانس لے کر بولی "کہ کہیں آپ نے ایڑیوں میں گلابی رنگ تو گھول کر نہیں بھر لیا ہے ———؟ ہی ہی ——— ہاہا ——— ہو ہو ———

شوکت نے گھبرا کر اپنے پیروں کو دیکھا۔ اپنے بازوؤں کو دیکھا۔ اپنی آنکھوں میں جھانکا۔ اپنی انگلیوں کی سُرخ سُرخ پوروں کو پُتلیوں سے قریب لا کر دیکھا اور پھر ہتھیلیوں میں ایڑیوں کو لے لے کر دیکھنے لگی ——— پھر وہی سُرخی اس کے گالوں میں بھی بھر گئی اور ہنسی اس کے چہرے پر چھا گئی ——— ہنستے ہی ہنستے اس نے حوری کی ٹھوڑی پکڑ لی اور بولی ——— بتا تو بھلا مجھے ہنسی کیوں

آ رہی ہے ؟"

حوری اپنی ہنسی بھول بھلا کر شوکت کے چہرے کو دیکھنے لگی ـــ پھر جیسے بڑی عقلمندی کے انداز سے سر ہلا ہلا کر بولی ـــ

معلوم ہو گیا جی، یہ آپ کچے رنگ کے مخمل کی گرگابیاں اس لئے پہنتی ہیں کہ ان کا رنگ چھوٹ چھوٹ کر ایڑیوں میں لگتا رہے اور ماموں جان تعریف کرتے رہیں ـــ"

"ارررر ـــ" شوکت گھبرا کر بولی "کیسی باتیں کرتی ہے حوری ـــ بھلا کہیں میری چپلیاں کچے رنگوں کی ہیں۔ توبہ توبہ"

"پھر آپ کی ایڑیاں گلابی کیوں ہیں ؟؟"

شوکت نے ہنس کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ـــ" اور کل تو یہ پوچھنے بیٹھے گی کہ آپ کے گال اتنے سرخ کیوں ہوئے جاتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں اتنی گہری کیوں ہیں ـــ آپ چلتے میں جھومتی کیوں ہیں ـــ آپ آئینے میں کس سے باتیں کرتی ہیں ـــ ایسی بے بنیاد باتوں کا بھلا میں کیا جواب دے سکتی ہوں ـــ ؟ اونہہ !!"

پھر ایک دن یوں ہوا کہ تیسری تاریخ کا کچھ مدھم سا، کچھ چمکیلا سا، زیادہ مدھم، کم چمکیلا چاند آسمان پر چمک رہا تھا ـــ سب لوگ آنگن میں بچھے ہوئے تختوں اور پلنگوں پر لیٹے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ شوکت کی شادی کا ذکر چل نکلا۔

اماں نے اپنی سمدھن سے پوچھا۔

"کیوں بہن شکو بی بی کی بات کہیں ٹھہرائی ہے ؟"

بہن کے چہرے پر ذرا ناگواری کے اثرات چھا گئے۔

"دوئی بہن اس کے باپ سے پوچھو ہم سے کیا پوچھتی ہو۔ تم سے کیا چھپانا ہے ـــ بیس اوپر دو برس کی بٹیا ہو گئی مگر قسم لے لو جو کبھی بھول سے بھی شادی کی بات چھیڑی ہو۔ لکھا پڑھا کر عاقبت خراب کر دی ہے۔ اب تو یوں آزاد چھوڑ رکھا ہے، صفا کہتے ہیں کہ جب بٹیا کا جی چاہے گا تبھی کریں گے۔"

اماں نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر دیکھا۔

"دوئی یہ کیا بات ہوئی بھلا" پھر بولیں..... مگر کوئی لڑکا تو نظر میں ہوگا ہی۔"

"مجھے تو نہیں معلوم بی" پھر ذرا طعنے سے بولیں "کیا پتہ یہ لڑکا ڈھونڈنے کا اختیار بھی بیٹی کو ہی دے رکھا ہو ـــ ساری روشن خیالی یہیں آ کر اٹک گئی ہے۔ صاف تو بولتے ہیں کہ مذہبی کتابوں میں لکھا ہے کہ کبھی لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف نہ کرو ـــ"

"اور ہم نے تو اپنے بیٹے تک کی شادی بھی اپنی مرضی سے نہ کی" اماں اچھنبے سے بولیں ـــ

"بہن یہ تو آج تم نے نئی ہی بات سنائی۔"

"ہاں بہن ـــ" انہوں نے ایک ٹھنڈا ٹھنڈا طعنہ چھوڑا "نئے زمانے کے لوگ ہیں کوئی کیا کہے۔ بی۔ اے تو پاس کر ہی لیا ہے بٹیا نے ـــ اب باپ کہتے ہیں، ام۔ اے بھی کروائیں گے۔ اب تک تو لڑکیوں کے کالج میں پڑھایا، اب تو لڑکوں کے کالج میں پڑھانا پڑے گا ـــ میں کچھ زبان ہلاتی بھی ہوں تو بولتے ہیں کہ مذہبی کتابوں میں آیا ہے کہ جو بیوی اپنے شوہر کو خوش نہیں رکھے گی، سیدھا دوزخ میں جائے گی ـــ"

پھر تھوڑی دیر کے لئے تیسری کا چاند ایک بدلی کی آڑ میں چلا گیا اور سارے میں صرف چھالیہ کترنے کی چک چک باقی رہ گئی۔ مگر رفیق میاں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو تخت کے اس کونے پر ایک چودھویں کا چاند چمک رہا تھا ـــ ! یہ کیسا اجالا ہے ـــ یہ کیسی بجلیاں ہیں ـــ یہ کیسے سویرے ہیں ؟ کہیں زمین پر بھی چاند چمکتا ہے۔ نہ چمکتا ہوگا، یہاں اس آنگن میں تو چمک رہا تھا

وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے ـــ ہلکے سبز رنگ کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے رفیق میاں کو جا کر دیکھا۔ اچھے خاصے تھے ـــ چہرے پر جھری تھی نہ ماتھے پر شکن ـــ انگوں میں تناؤ بھی تھا

اور بدن بھی گٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ اور ہوتا کیوں نا ــــــ کیا چار چھ بچّوں کے باپ تھے جو ڈھلتی کا سایہ پڑتا مگر موجلیں مارتے سیاہ بالوں میں یہ سفید سفید سی رہگذر کہاں سے پھوٹ نکلی تھی! ــــــ

"میں تمہیں چاہتا ہوں مگر... مگر..." مگر کے ساتھ اپنے عکس سے مخاطب ہو کر کسی اور کو سُنایا۔

"مگر تم یہ میرے بالوں میں سفید تار بھی دیکھ رہی ہو۔"

"دیکھ رہی ہوں۔ یہ سفید تار نہیں، یہ تو تاروں بھری راہ ہے، کہکشاں ہے۔ اس پر شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے ــــ کیا محبّت سیاہ بالوں اور حسین چہرے ہی سے کی جاتی ہے ــــ وہ تو دل سے کی جاتی ہے، پیار کرنے والے، پیار کو سمجھنے والے دل سے . . . ."

رفیق میاں گھبرا کر پلٹے ــــ اس راہ پر پاؤں دھرتے دھرتے، قدم قدم چلتے چلتے کون ان کے دل کے اس قدر قریب آگیا تھا کہ اس کی آواز تک سُنائی دے رہی تھی۔ ملے جلے سبز اور سیاہ اُجالے میں انہوں نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھا اپنے دبلے پتلے جسم کو سمیٹے شوکت پردے سے لگی پاس کھڑی ہوئی تھی پردے کو اس نے اپنی پتلی سی کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا ــــ ساڑی کے نیچے سے اس کے گلابی کافوری پیر نظر آرہے تھے اور وہ پردے میں سے چاند ایسا منہ نکالے، دھیمے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں رفیق میاں سے کہہ رہی تھی۔

"اِس پر شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ کہکشاں تو راہ دکھاتی ہے ــــ بھلا کہیں سفید روشن جھم جھماتے ستاروں کو کسی نے یہ کہہ کر ٹھکرایا ہے کہ یہ اُجالا کیوں بکھیرتے ہیں ــــ کیوں ــــ؟ کیوں ــــ؟؟"

رفیق میاں نے آنکھوں کے پٹ کھول دیئے ــــــ

شوکت شرما گئی ــــ اس نے دھیرے سے پردہ چھوڑ دیا۔ اور گلابی گلابی ایڑیوں کو دھیرے دھیرے زمین پر ٹکاتی، اُٹھاتی یوں دھیرے سے چلی گئی جیسے وہ ایڑیاں کانچ کی تھیں کہ ذرا زور سے پاؤں پڑتا اور وہ چٹخ چٹخ جاتیں

ابھی ابھی جہاں ایڑیوں کے نشان تھے، وہاں سجدوں کے نشان اُبھر آئے ــــــ

رات بھر رفیق میاں کا کمرہ گلاب کی کچّی کچّی کلیوں سے مہکتا رہا۔

عورت جب محبّت کرتی ہے تو چاہتی ہے کہ ہر صورت اپنے محبوب کی خوشنودی حاصل کرے۔ اس کی محبّت کا مرکز اپنی ہی اپنی ذات کو بنالے۔ اس کی راہوں میں اپنی آنکھیں اپنا دل بچھادے ــــ اور جب محبوب کے قدم پڑیں، وہ قدم تلے بچھی زمین رہ رہ کر پکار اُٹھے۔ ہمیں تم سے محبّت ہے . . . ہمیں تم سے محبّت ہے ــــــ

ہمیں تم سے . . . . .

ہمیں . . . . . .

اور یہ بھی تو محبّت ہی تھی کہ اب دستر خوان پر ہمیشہ چٹ پٹی نئی نئی چیزیں کھانے کو ملتیں ــــ جانے کیسے شوکت کو پتہ چل گیا تھا کہ رفیق میاں کو سویّوں کی فیرنی پسند ہے ــــ ثابت آلوؤں کا سالن من بھاتا ہے۔ چاول کھڑے کھڑے نہ پکیں تو دستر خوان چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ــــ مرد ہو یا عورت، کنوارپن کی پھٹکار منہ پھوڑ پھوڑ کر بولتی ہے، ہم کنوارے ہیں۔ ایسے میں جو محبّت کی کہیں مٹھاس مل جائے تو چہرے پر نور بکھر جاتا ہے ــــ وہی رفیق میاں تھے۔ وہی گھر۔ وہی حالات۔ وہی خرچے۔ وہی خرچ کی تنگی، وہی بھاوج اور ماں کے جھگڑے ــــ وہی بچّوں کی جھڑ جھڑ پھڑ پھڑ ــــ مگر پھر بھی وہ ــــ وہ رفیق میاں نہ رہ گئے تھے اور کوئی فرق بھلے سے آیا ہو نہ آیا ہو لیکن آنکھیں سدا چمکتی رہتیں، جیسے آنکھیں نہ ہوں، آسمان سے توڑ کر دو ستارے ٹانک دیئے گئے ہوں۔

ایک دن باورچی خانے سے شوکت نکلی تو آنکھیں سُرخ تھیں۔ آنگن بیچ کھڑی ہو کر اس نے حُوری کو پُکارا۔ "حُوری ذرا دیکھ تو میری آنکھ میں شاید بال پڑ

گیا ہے۔" شیشے کی سی نازک ایڑیوں کی مانوس مدھم چاپ سُن کر رفیق میاں بھی اپنے کمرے سے نکل آئے تھے — خود کی بازو میں کمزوری پھوپھی کی آنکھوں میں بال ڈھونڈ رہی تھی کہ اسی دم اسے رفیق میاں بھی اسی دنیا میں چلتے پھرتے نظر آگئے۔

رفیق کو سامنے دیکھ کر شوکت شرما سی گئی۔ ٹالنے کو خود ی سے بولی۔

"جانے دے کدھر بھی کھو گیا ہوگا۔"

خود ی شرارت سے بولی۔ "اجی جناب بال کی کیا بات ہے، آپ کی آنکھوں میں تو بڑے بڑے آدمی کھو جاتے ہیں — بال بے چارہ تو اتنا نازک اتنا باریک ہی تھا —!"

"کیا مطلب —؟" شوکت گڑبڑا کر بولی۔

"مطلب یہی —" وہ ہاتھ نچا کر بولی "کہ ابھی ابھی میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماموں جان آپ کی آنکھوں میں اُترے اور دیکھتے ہی دیکھتے کھو گئے۔"

شوکت اِس سچی حقیقت کو سُن کر پانی پانی ہو گئی۔

رفیق میاں نے بہت — بہت دھیمے کہا۔

"وہ آنکھیں تو میرا وطن ہیں — میں وہیں پیدا ہوا، میں وہیں پلا، وہیں بڑھا، وہیں میں نے زندگی بِتائی — وہیں رہ کر میں نے محبت کرنی سیکھی — وہیں رہ کر میں نے جانا کہ ایڑیوں میں گلاب کیسے کِھلتے ہیں۔ وہیں میرے دل نے نئے انداز سے دھڑکنا سیکھا — اور زندہ رہنے کا گُر بھی تو میں نے اپنے اس وطن سے ہی سیکھا ہے — کاش میں وہیں کہیں کھو جاؤں — یوں کہ پھر کبھی کسی کو نظر نہ آؤں — کبھی نہیں — کبھی بھی نہیں — اور اُن پلکوں کے پیچھے میری زندگی یونہی خاموش سی بیت جائے۔"

شوکت نے بڑی مشکل سے پلکیں اٹھائیں۔ یوں جیسے اُن پر ساری دنیا کا بوجھ تھا — وہ آنکھیں جو رفیق میاں کا وطن تھیں — وہ ان کے سامنے کُھلی تھیں۔ پلکوں کے دروازے کُھلے ہوئے تھے اور کوئی بے صدا آواز جیسے خوابوں کی دنیا سے انھیں بُلا رہی تھی

"آجاؤ — چھپ جاؤ —
آجاؤ — چھپ جاؤ —
خدا نہ کرے جو تمہیں کبھی تمہیں جلا وطن ہونا پڑے۔"

اور شوکت نے بڑے معنی خیز انداز میں آنکھیں بند کر لیں، یوں جیسے ہمیشہ کے لئے ان دو پُتلیوں میں رفیق میاں کو قید کر لیا ہو۔

رات چمکدار تھی — فضا خوشبودار تھی — پھر یہ دل لگتا کیوں نہیں —؟ نیند آتی کیوں نہیں —؟ انھوں نے اپنے پلنگ پر پڑے پڑے سوچا۔

"میں بوڑھا ہو رہا ہوں — بھلا بوڑھے سے کون پیار کر سکتا ہے —؟"

"میں کر سکتی ہوں۔ میں — جو ایک عورت ہوں اور سہارا دینا چاہتی ہوں — دو آنکھیں ان کی آنکھوں میں جھک آئیں — اور دھیرے دھیرے سے بولیں۔

ذرا اِن آنکھوں میں جھانک کر تو دیکھو، تمہارے سوا اور کوئی دوسری تصویر یہاں نظر آجائے تو پھر جو جی چاہے کہنا۔

اگر وہ آنکھیں شوکت کی تھیں تو پھر واقعی ان میں سوائے رفیق میاں کے اور کسی کی تصویر نہ تھی۔

رات کے سنّاٹے میں یہ آواز کہیں سے بھی آئی ہو، مگر ہے شوکت کی ہی — انہوں نے بڑی خوشی اور گہرے اطمینان سے سوچا۔

رفیق میاں نے اپنے ہاتھوں اپنے لئے ایسا راستہ بنایا تھا کہ کوئی اُونچ نہ نیچ — سیدھی سیدھی سڑک تھی۔ بار بار ماں اور بہن نے کہا اور انہوں نے وہی ایک بندھا ٹکا جواب دیا۔

"نا، میں شادی نہیں کروں گا۔"

اور آخر کتنی بار کوئی اصرار کرتا — اور جب ان کے سر میں کھلم کھلا سفید بالوں نے راج رچنا شروع کر دیا تو یہ خیال ہی سبھوں کے دل سے مٹ گیا کہ کبھی ان کی شادی ہو بھی سکتی ہے۔ لاکھ وہ سفیدی رنگ روں

اور پریشانیوں کی رہی ہو مگر تھی تو سفیدی ہی۔ پھر کون اُن کے
دل پر ہاتھ رکھنے چلا تھا ــــ اور اب رفیق میاں کا دل اپنے
پہلو سے اڑا تو کسی پل قرار نہ آیا ــــ منہ پھوڑ کر ماں سے کیسے
بولیں؟ کیا صاف صاف جا کر یونہی سُنا دیں "اماں میری
شادی شوکت سے کروا دیجئے نا"

کہنے کو کیا تھا کہہ بھی دیتے۔ مگر ایک تو انہیں یہ خیال اُٹھتا
کہ اس میں شوکت کی اپنی بدنامی ہوگی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اس
کے ابّا نے اسے شادی کا پورا اختیار دے رکھا تھا۔ ایسے میں
یقینی بات تھی کہ سب کی نگاہیں اس کے دل کو ٹٹولنے لگتیں
اور پھر دوسرے یہ کہ انہیں عمر کے اس دَور میں پہنچ چکنے کے
بعد یہ کہتے بڑی شرم محسوس ہوتی کہ ــــ

"میں سہرا باندھوں گا"

ماں بہن لاکھ ماں بہن تھیں لیکن اگر تڑ سے بول دیتیں
کہ جب ہمارے دلوں کے ارمان نکلنے کا وقت تھا اور ہم نے
بول بول کر منہ سُکھایا تو کلموہے نے سہرا نہ باندھا اور اب
اپنے قدم بہکے ہیں تو کیسے سہارے کی ضرورت محسوس
ہو رہی ہے۔ اسی مخمصے میں رات دن اُلجھے رہتے ــــ
کہ اچانک ایک دن اماں ان کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئیں۔
اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر ذرا مطلب بھرے انداز میں بولیں۔

"توبہ میلے کپڑوں کا انبار بھرا پڑا ہے۔ دھوبی کو کیوں
نہیں دیئے"

"ارے ــــ" انہوں نے کھونٹیوں کی طرف دیکھا اور
ذرا شرمندہ ہو کر بولے۔

"ایک بات دھیان میں آئے اور اسی دم کر ڈالوں تو
اچھا ورنہ پھر کام کاج میں دوسرے ہی لمحے بھول بیٹھتا
ہوں"

اماں نے بڑے غور سے دیکھا "ارے میاں اپنے
کمرے کی گت تو دیکھ ذرا ــــ یہ جالے، یہ کچرا، یہ دُھول،
یہ پھٹے پھٹائے کاغذوں کے انبار ــــ تجھ سے اتنا
بھی نہیں ہوتا کہ باقر سے کہہ کر ذرا جھاڑو ہی پھروا لے۔
آخر تیرے مقدموں والے آتے ہوں گے تو کیا منہ پر
تھوک کر جاتے ہوں گے"

رفیق میاں کے چہرے پر شرمندگی چھا گئی۔

"بولوں بھی تو ایک بار کے کہے میں سُنتا ہی نہیں ہے
اماں۔ اُسے تو بار بار یاد دلانا پڑتا ہے اور یہاں کسے اتنی
فرصت ہے ــــ اور جب نوکر ایسا کم بخت ہو تو ....."

"تو ....." اماں نے بات کاٹ دی "یوں ناک بھوں
چڑھاتا ہے تو سیدھے سے شادی کیوں نہیں کر لیتا کہ آپ
ہی وہ سارے گھر کی دیکھ بھال کر لے گی"

رفیق میاں کے دل کا وہ چراغ جو اتنے دنوں سے مدھم
مدھم سی لو دیتا تھا، آج پوری چمک دمک سے جل اٹھا۔

"اب ــــ؟" وہ ہنسے "کون بدنصیب اس بوڑھے کا
ہاتھ تھامنا پسند کرے گی ــــ؟"

اماں نے غصے سے دیکھا "اونہہ بوڑھا ــــ یہ کیوں
نہیں کہتا کہ مرنے کے قریب ہوں۔ شرم نہیں آتی ذرا سی۔
تیری اور اُس کی عمروں میں ایسا فرق ہی کتنا ہے۔ فکروں
نے یہ سفیدی عنایت کی ہے"

رفیق میاں ہنسے ــــ

"دیکھو میاں۔ میں عورت ہوں اور عورت کے دل کی
بات جانتی ہوں ــــ عورت کی فطرت میں خدمت کا جذبہ
کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ اسے خود پالنے پوسنے اور
دیکھ ریکھ کرنے میں مزہ آتا ہے۔ یہ تو اللہ کا بنایا ہوا
طریقہ ہے میاں ــــ اگر ایسا نہ ہوتا تو اولاد کو اللہ میاں
عورت کے پیٹ کی بجائے مرد کے پیٹ سے پیدا کرتا"

رفیق میاں نے ماں کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں ــــ

"عورت اسی مرد سے زیادہ محبت کرے گی جس مرد کی خدمت
کا اسے زیادہ موقع ملے اور پھر یہ تو دلوں کی بات ہے بیٹا
عورت کا دل تو بس محبت کرنا جانتا ہے"

رفیق میاں کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ اماں کا دھیان
کدھر ہے ــــ آخر یہ تو وہ بھی دیکھتی ہی تھیں کہ وہ بی شوکت
نے آئے گھڑی سے چولہا چکی سنبھال لی تھی۔ سب گھر والوں
کا ثابت آلوؤں کا قورمہ اور کھڑے چاول کھاتے

کھاتے ناک میں دم آگیا تھا۔ اماں بی کے دانت روزانہ شکایت کرتے لیکن چپاتیاں ویسی ہی ہلکی اور پتلی پکتیں کہ کوّوں کے کانوں میں باندھ دو تو آسانی سے لے کر اڑ جائیں۔ رفیق میاں کو مٹھاس زیادہ پسند نہ تھی ــــ لے دے کے ایک سویّوں کی فیرنی پسند تھی، سو آئے دن ایسی پھیکی پھیکی فیرنی کھاتے کھاتے حلق میں پھندے پڑنے لگے تھے، اوپر سے موئی کرکری شکر چھڑک کر کھاؤ تو کھاؤ ورنہ وہ پھیکا گولا نصیب میں بندھ کر رہ گیا تھا ــــ بچپن سے رفیق میاں کو گلابی رنگ پسند تھا۔ گھر میں جتنے بھی دروازے تھے سبھوں پر اب گلابی گلابی سرسر کرتے پردے جھولتے تھے ــــ اب اماں کے دیدے پھٹے تو نہیں تھے اور ایسی باتوں کو دیکھ کر تو کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ پانی کا بہاؤ کس طرف کو ہے؟ یہ ندی چاہے نکلی کہیں سے بھی ہو مگر بل کھاتی لہراتی آکر رفیق میاں کے قدموں ہی میں سر پٹختی تھی ــــ اور رفیق میاں بھی کہ لاکھ سادھو مہاتما تھے کہ کسی پر آج تک اچھی بری نظر نہ پھینکی تھی، اب ایسے دیوانے کاہے سے ہو گئے تھے کہ بات تو کرتے حوری سے اور نگاہیں کھوجتی رہتیں شوکت کو ــــ بات کرتے بس حوری کی بجائے شوکی شوکی نکل پڑتا ــــ اور حوری ایسی تیز طرار کہ چار لوگوں کی موجودگی دیکھے نہ جھجکے ــــ صفا بول پڑتی "میں نے کہا جناب میرا نام حوری ہے حوری ــــ شوکی نہیں ــــ شوکی آپ کی وہ بیٹھی ہیں وہاں ــــ یا باورچی خانے میں آلو ابالتی ہوئی ــــ"

ہمیشہ تو رفیق میاں بڑھ بڑھ کر باتیں بنایا کرتے تھے مگر آج ان کی زبان کو اماں کے سامنے چپ لگ گئی تھی ــــ بس بیٹھے بیٹھے منٹ منٹ کو ماں کے منہ کو تکتے رہے۔

"تیری مرضی ہو تو بول دے ــــ ورنہ پھر تو وہ لوگ چلے جائیں گے ــــ وہ تو شوکت کا اصرار تھا کہ چھٹیاں گذارنے بھابی کے پاس چلیں تو بہن آ گئیں، ورنہ وہ کدھر ہم کدھر ــــ"

"تو آپ یہ غضب کر دیں گی کہ اپنے گھر بیٹھ کر ہی بات چھیڑ دیں گی ــــ نہیں اماں بی ــــ انہیں برا لگے گا کہ جس گھر میں بیٹی آئی ہوئی تھی، وہیں بات چھیڑ دی ــــ آپ جانتی ہیں پرانے لوگ ایسی باتوں کا برا مانتے ہیں۔ آپ ان کے یہاں سے جانے کے بعد ان کے ابا کو خط کیوں نہ لکھ دیں؟" رفیق میاں معصومیت سے یہ سب کچھ سناتے رہے۔ وہ بھول گئے کہ ان کے بات کرنے کے انداز نے اماں پر ان کی محبت کا بھید کھول کر رکھ دیا ہے۔

شوکت کے جانے میں تین چار دن باقی رہ گئے تھے ــــ اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ ان کا دل بھی گھومتا پھرتا۔ مسکراہٹ ان کے روئیں روئیں سے پھوٹی پڑتی ــــ کیسے سدا بہار گلابوں سے ان کا باغ مہکنے والا تھا ــــ

سردی کے دن تھے۔ آتش دان میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں چٹختیں یا پھر انگیٹھی میں سرخ انگارے دہکتے ــــ پان چبائے جاتے۔ کافی اور چائے کے گھونٹ بھرے جاتے۔ رات گئے تک باتیں ہوتیں ــــ ایسی ہی ایک رات میں آپا بی کمرے کے گرم ماحول سے اٹھ کر باہر کوئلے لانے گئیں ــــ اندر گرمی تھی۔ باہر سردی نے جیسے ان کا سر جکڑ لیا ــــ واپس کمرے میں آئیں تو سر پکڑے ہوئے ــــ اماں نے دیکھا تو ذرا فکرمندی سے بولیں۔

"کیا ہوا بیٹی ــــ؟"

"کچھ نہیں اماں ــــ ایسے ہی اچانک سر میں درد ہونے لگا ہے ــــ جنے ہوا لگی یا کیا ہو گیا۔ ابھی تو بھلی چنگی تھی"

ماں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا ــــ جو ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ رضائی اڑھا کر لٹا دیا ــــ صبح سے وہ گھر کے کاموں میں الجھی رہی تھیں۔ کبھی کھلے آنگن میں بیٹھ کر گیہوں پھٹکے تو کبھی چاول صاف کئے ــــ برتن دھو دھلا کر رکھے تو مرچوں کے ڈنٹھل توڑنے بیٹھ گئیں ــــ کمر میں سخت درد ہونے لگا۔ گھنٹے بھر میں بخار اچھا خاصا تیز ہو گیا ــــ سارا گھر آپا بی کی تیمارداری میں جٹ گیا سوائے زہرہ دلہن کے ــــ وہ ادھر قیامت گذر جائے تب بھی اپنے دالان سے نہ نکلتیں۔ گہرائی کا بیج جو اتنے زمانے پہلے دل کی زمین میں بویا گیا

تھا اب پھیل پھول کر ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ ان
کو آج اسے اسی بات پر غصہ تھا کہ میں تو میاں والی ہو کر بھی
خالی ہاتھ رہتی ہوں اور آپا بی سارے گھر پر راج رچتی پھرتی
ہیں ــ آٹھ چار دن میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی کہ پھر
گھر میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا ـــــ

ایک دن گذر گیا ـــــ

دوسرے دن بھی بخار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ جسم تھا کہ
پھنکا جا رہا تھا۔ سانس میں آنچ کی سی لپٹیں نکلتیں۔ آنکھیں
سرخ انگارہ ہوئی جا رہی تھیں ـــ ڈاکٹر آیا۔ دوا انجکشن
سبھی کر کے گیا مگر بخار اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ نہ آنکھوں
کی سرخی ہی کم ہوئی۔ سر تھا کہ درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔
حوری ماں کے سرہانے بیٹھی تھی۔

"اُف ـــ" آپا بی درد سے کراہیں۔

"امی آپ کی طبیعت کیسی ہے ـــ؟"

ماں نے آنکھیں کھولیں ــ دل رکھنے کو ذرا مسکرائیں
اور بولیں ــ اچھی خاصی ہوں بیٹا بس سر میں درد بہت ہے۔"

"آپ بستر پر پڑ گئی ہیں امی تو سارا گھر ہمیں اداس
اداس نظر آ رہا ہے۔" وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔

"مجھے ہوا ہی کیا ہے ــ" وہ بچوں کا دل بڑھانے کو
بولیں ــ "ذرا سر میں درد زیادہ ہے، وہ بھی اچھا ہو جائے گا۔"

"بام مل دوں امی ـــ؟"

"شیشی تو خالی پڑی ہے، رات ہی ختم ہو گیا تھا۔ رہنے
دے، یونہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھہریئے میں زہرہ ممانی سے پوچھتی ہوں، ان کے پاس
شاید ہے۔"

آپا بی منع کرتی ہی رہیں اور وہ دالان کی طرف دوڑ بھی
گئی ــ تھوڑی ہی دیر میں اُدھر سے تیز تیز آوازیں آنے
لگیں ــ

رفیق میاں نے سر اونچا کر کے سننے کی کوشش کی۔
آواز زہرہ دلہن کی تھی۔

"اے ہے درد ورد خاک بھی نہیں۔ اب وہ
شوکت بیگم چلی جا رہی ہیں نا سوچا کہ چولہا چکی پھر نصیبوں
میں آ گئی تو کیوں نہ بیمار پڑ جاؤں کہ ادھر میرے گلے سارے
گھر کی مصیبتیں آ جائیں۔"

حوری کی غصہ بھری آواز آئی ـــ

"ذرا چل کر خود ہی دیکھ لیجئے نا ــ مارے درد کے تڑپ
رہی ہیں۔"

"اے بی بی درد کی نہ کہو ــ درد آج تک کس کو دکھائی
دیا ہے ــ بخار کہو تو ایک بات بھی ہے۔"

"بخار اور کیسا ہوتا ہے جسم تو جلا جا رہا ہے۔"

"سر سے پاؤں تک رضائی اوڑھ اوڑھ کر جسم تپا لیا
اور بخار کا نام بدنام ـــ ہونہہ!"

حوری تیز آواز سے بولی ــ" ذرا سا بام مانگا تو ستر
باتیں سنا ڈالیں ـــ تھو ہے۔ بڑے ماموں جان کی کمائی
پر اتنی کنجوسی ـــ؟ اور جو خود کی کمائی . . . ."

ابھی اس کی بات منہ کے منہ ہی میں تھی کہ دھن دھن کی
آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی گرجدار ڈانٹ ـــــ

"بالشت بھر کی چھوکری اور زبان اتنی بڑی۔ نکل یہاں
سے بدتمیز کہیں کی ــ اور خبردار جو کبھی ادھر کے دالان میں پاؤں
بھی دیا۔ ٹانگیں چیر ڈالوں گا کم بخت کی۔" آواز تو میاں
کی تھی۔

حوری سرخ سرخ آنکھیں اور بجھا ہوا چہرہ لئے سسکتی
ہوئی آ کر بڑے ماموں سے لپٹ گئی۔

"کیا ہوا بی بی ــ کیوں روتی ہے حوری ـــ؟"

حوری نے ہچکیاں لے لے کر روتے رکتے سنانا شروع کیا۔
ماموں جان ــ ماموں جان ــ ہم ذرا امی کے لئے بام
مانگنے گئے تو زہرہ ممانی نے سو باتیں سنا ڈالیں ــ اور غصہ
میں آ کر ہم نے کوئی جواب دے ڈالا تو چھوٹے ماموں نے آ کر
دھن دھن چار چھ تھپڑ مار دیئے ـــ" وہ روتے روتے اور
زور سے ان سے چمٹ گئی اور بولی ـــــ

"اچھا ہوا آپ نے شادی نہیں کی، ورنہ بڑی ممانی کی
باتوں پر آ کر آپ بھی ہمیں چھوٹے ماموں کی طرح مارتے"

ہمیں ڈانٹتے۔ پھر تو کوئی بھی ہمیں پیار کرنے والا نہ ہوتا۔ زہرہ مومانی بے حد بُری ہیں۔ اچھا ہوا ......"

وہ سنہرا چراغ جو زندگی بھر کے اُجالوں کا امین تھا، حوری کے آنسوؤں سے اسی دم بجھ گیا ــــ سارے میں اندھیرا پھیل گیا اور رفیق میاں اسی ایک لمحے میں اسّی برس کے بوڑھے بن گئے

جھریوں بھرا ہاتھ وہ حوری کے سر پر رکھ کر بولے۔

"مت رو بیٹی۔ مت رو۔ میں تو تجھ سے محبت کرتا ہوں نا ــــ میں تو تیرا اچھا ماموں ہوں نا ــــ میں نے تو کبھی ....."

برآمدے میں ہوا کے سرد سرد جھونکے آ رہے تھے۔ اندر کمرے میں شوکت اپنی بجلی بھری نگاہوں سے رفیق میاں کو تاک رہی تھی ــــ اک دم رفیق میاں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ تھام لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے ــــ

ــــ "اماں ــــ یہ دروازہ بند کر لیجیے" ــــ

بیان ملکیت و دیگر تفصیلات ماہنامہ "شاعر" بمبئی

فارم ۴ ـ رول ۸

۱۔ مقام اشاعت : بمبئی

۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہانہ

۳۔ پرنٹر : اعجاز صدیقی

۴۔ پبلشر : اعجاز صدیقی

۵۔ قومیت : ہندوستانی

۶۔ ایڈیٹر : اعجاز صدیقی

۷۔ قومیت : ہندوستانی

۸۔ پتہ : دیناناتھ بلڈنگ۔ تیسرا منزلہ۔ فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴

۹۔ ملکیت : اعجاز صدیقی

میں اعجاز صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔ (دستخط) اعجاز صدیقی

۲۸ / فروری ۱۹۷۱ء

کشمیری لال ذاکر

دھرتی سدا سہاگن

کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر اردو کے ممتاز کہانی نگاروں میں سے ہیں۔ اپنی کہانیوں کی انفرادیت سے وہ اپنے قاری کو ہمیشہ متاثر کرتے رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ مگر کبھی افراط و تفریط کے شکار نہیں ہوئے۔ اُن کی پہلی کہانی "الگ الگ رائے" ہمایوں لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ اور پہلی ہی بار انہوں نے اردو حلقوں کو چونکا دیا تھا۔

کشمیری لال ذاکر اچھے شاعر بھی ہیں۔ لیکن بحیثیت شاعر انہوں نے خود کو منوانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ انہیں اُن کی کہانیوں اور اُن کے ناولوں ہی سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ تلگو، تامل، گجراتی اور روسی زبانوں میں اُن کی بعض درجہ اوّل کی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں حکومت ہریانہ نے اُن کی طویل خدمات کو سراہتے ہوئے "اسٹیٹ ایوارڈ" دیا تھا۔ اُن کی دو کتابوں پر حکومت پنجاب اور ایک کتاب پر ہند سرکار سے انعامات مل چکے ہیں۔ تعلیمی محکموں میں اُن کی زندگی گزری ہے۔ آج کل بورڈ آف ایجوکیشن حکومت ہریانہ میں آفیسر ہیں۔

تصانیف:—

اردو:—

دو ناول

تین کہانیوں کے مجموعے

دو ڈراموں کے مجموعے

پنجابی:—

ایک ناول

دو کہانیوں کے مجموعے

ہندی:—

دو ناول

چار کہانیوں کے مجموعے

تین ڈراموں کے مجموعے

زیرِ اشاعت:—

دو ناول (اردو ہندی میں)

ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ (اردو ہندی میں)

(بقلمِ دیگر)

دھرتی سدا سہاگن

کشمیری لال ذاکر

"شاعر" کی گذشتہ اشاعتوں میں "دھرتی سدا سہاگن" کی چھ اقساط شائع ہو چکی ہیں۔ اِس "ناولٹ نمبر" میں یہ ناول ساتویں باب سے اختتام تک شائع کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ چھ اقساط کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ (ادارہ)

پسنجر ٹرین کے سکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے شیتل نے باہر جھانکا۔ آج کئی برس کے بعد وہ اپنی ایک ٹانگ کٹوا کر اپنے گاؤں واپس آ رہا تھا۔ سمرپور گاؤں کی سیمائیں شروع ہو گئی تھیں اور وہ اُن سیماؤں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین سمرپور اسٹیشن پر رُک گئی۔ وہ اپنی بیساکھی سنبھالے پلیٹ فارم پر اُترا اور دوسرے مسافروں نے اُس کا سامان اُتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا کیونکہ وہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا اور وہاں قلیوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ ٹرین کے چلے جانے کے بعد شیتل اپنے ٹرنک پر بیٹھ گیا اور اُس نے بیساکھی ایک طرف رکھ دی۔ سردیوں کی دُھوپ اُسے اچھی لگ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے پلیٹ فارم خالی ہو گیا اور وہ سوچنے لگا کہ اب وہ گاؤں کیسے جائے گا۔ اُسی لمحہ اُس نے دیکھا کہ ایک تانگہ اسٹیشن کی طرف آ رہا تھا۔ وہ بیساکھی سنبھال کر پلیٹ فارم سے باہر آ گیا اور کوچوان کو پہچاننے لگا۔ ارے یہ تو دولت کاکا تھا، اُس کے مرحوم والد کا لنگوٹیا یار۔ دولت کو شیتل کے پہچاننے میں کچھ دیر لگی، لیکن جب اُس نے پہچان لیا تو اُسے شیتل کی ٹانگ کے کٹ جانے کا بہت افسوس ہوا۔ دولت نے اُس کا سامان تانگہ میں رکھ لیا اور اُسے سہارا دیکر اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ راستے میں شیتل گاؤں کے بارے میں باتیں کرتا رہا اور کئی برس پہلے گاؤں چھوڑنے کے بعد آج تک جو اُس پر بیتی وہ سب دولت کاکا کو سُناتا رہا۔ تانگہ جب گاؤں میں داخل ہوا تو شیتل کا دل دھڑکنے لگا اور جب گھر کے سامنے پہنچ کر اُس نے بیساکھی کی مدد سے گھر کی ڈیوڑھی پار کی تو اُس کی ماں اُسے دیکھ کر چیخ اُٹھی۔ اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ ایک دن جب اُس کا لڑکا گھر لوٹے گا تو وہ اپاہج بن چکا ہوگا۔ لیکن کچھ دولت کے سمجھانے اور کچھ اِس خیال سے کہ شیتل اُس کے دُکھ کو نہ جان پائے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ اُس نے شیتل کو بتایا کہ اُس کے دوست چندر کا کئی برس ہوئے انتقال ہو گیا تھا اور اُس کی بیوی کیرتی بجائے اپنے میکے جانے کے یہیں سُسرال میں رہتی تھی اور اپنے سُسر نیکی رام سرپنچ کا پنچایت اور گاؤں کے ترقی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔

دوسری صبح شیتل ابھی سو کر اُٹھا ہی تھا اور چائے کی پیالی پی کر ماں سے باتیں کر رہا تھا کہ ڈیوڑھی کی سانکل کھٹکی۔ ماں نے دروازہ کھولا تو کیرتی داخل ہوئی۔ وہ اُسے کیرتن میں شامل ہونے کو کہنے آئی تھی۔ ماں نے اُسے بتایا کہ اُس کا لڑکا شیتل واپس آ گیا ہے۔ شیتل کا نام سُنتے ہی کیرتی کو کئی برس پہلے کی بات یاد آ گئی۔ جب شادی کے فوراً بعد اُس کے خاوند نے اُسے شیتل سے پردہ نہ کرنے کو کہا تھا۔ آج اتنے برسوں کے بعد جب شیتل نے کیرتی کو دیکھا تو اُسے محسوس ہوا کہ وقت نے کیرتی کو ایک کمسن دُلہن سے مکمل عورت بنا ڈالا تھا۔ واپس جانے سے پہلے کیرتی نے شیتل کو شام کو ہونے والی پنچایت کی بیٹھک میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ کیرتی چلی گئی تو شیتل دیر تک چندر اور کیرتی کے بارے میں سوچتا رہا۔ شام کو دولت کاکا، شیتل کو پنچایت کی بیٹھک میں شریک

ہونے کے لیئے ساتھ لے گیا۔ دولت تھا تو ایک معمولی کوچوان، لیکن تمام گاؤں اُس کی عزت کرتا تھا۔ پنچایت گھر گاؤں کی سب سے اُونچی جگہ پر واقع تھا اور وہاں تک پہونچنے کے لیئے سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ شتیل سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا تھا۔ اس لیئے وہ واپس پلٹ پڑا اور عین اُسی وقت کیرتی پنچایت گھر سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے گلی میں آگئی اور اُسے سہارا دیکر اُوپر لے گئی۔ نیکی رام سرپنچ نے سب سے اُس کا تعارف کرایا اور پھر شتیل نے اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لیئے مختصر سی تقریر کی اور کہا کہ تمام گاؤں والوں کو آپس میں مل کر کوشش کرنی چاہیئے کہ سمرپور ایک آدرش گاؤں بن سکے۔ آج کی پنچایت میں جو معاملہ پیش ہو رہا تھا وہ یہ تھا کہ جگو نے اپنے بیل رام دھن کے کھیت میں چھوڑ دیئے تھے اس کے جواز میں جگو کا کہنا تھا کہ اُس کی مختصر سی زمین میں اُگی فصل خراب ہوگئی تھی اور اب اُس کے پاس گزارے کو بھی اناج نہیں تھا۔ وہ اپنے بیلوں کو کہاں سے کھلائے۔ جب پنچایت کے سامنے معاملے پر بحث ہوئی تو شتیل نے محسوس کیا کہ یہ مسئلہ صرف ایک جگو اور ایک رام دھن کا نہیں تھا بلکہ سینکڑوں جگو اور سینکڑوں ہی رام دھن اس سے اُلجھے ہوئے تھے۔ یہ مسئلہ سماج کے ایک طبقے اور دوسرے طبقے کی بُنیادی قدروں اور ضرورتوں کے ٹکراؤ کی اُپج تھی۔ لیکن پنچایت نے فیصلہ رام دھن کے حق میں دیا۔ جگو کو پچیس روپے جُرمانہ کیا گیا اور اُسے پنچایت سے معافی مانگنے کو کہا۔ جگو معافی مانگنے کو تیار تھا لیکن جُرمانے کی رقم اُس کے پاس نہیں تھی۔ اُس نے جب اپنی لاچاری اور بے بسی کا اظہار کیا تو شتیل بڑی ٹھہری ہوئی آواز میں بولا: "جگو کا جرمانہ مَیں ادا کردوں گا" پنچایت کا فیصلہ بنا لیے"۔ شتیل نے ایک نہایت ہی غیر متوقع قدم اُٹھایا تھا اور اس کا مختلف افراد پر مختلف ردِّ عمل تھا۔ اپنے خاوند کی موت کے بعد کیرتی پر کافی مدت تک ایک جمود کی سی کیفیت طاری رہی تھی۔ اُسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک بے کار اور فضول سی ہستی تھی، جو کچھ بھی کر سکنے کے قابل نہ تھی۔ اُس کے سُسر نیکی رام کو اس بات کا بے حد دُکھ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کیرتی کی زندگی میں کوئی دلچسپی پیدا کی جائے جس سے وہ اپنے ذاتی دُکھ کی گرفت سے آزاد ہو سکے اور دوسروں کے لیئے کچھ کر سکے۔ اس لیئے جب وہ گاؤں کا سرپنچ منتخب ہوا تو اُس نے کیرتی کو عورتوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیئے چھوٹے موٹے پروگراموں میں شامل کر لیا اور پنچایت کے مسئلوں میں بھی اُس کی رائے لینے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کیرتی رفتہ رفتہ اپنے ذاتی دُکھ کو بھول گئی۔ لیکن آج شتیل نے جگو کا جُرمانہ ادا کر کے کیرتی کے خیالات کو ایک نیا موڑ دے دیا تھا۔

نیکی رام سرپنچ، دولت کاکا اور شتیل اب تقریباً ہر روز ہی مِلتے تھے اور سمرپور کی تعمیر و ترقی کے پروگراموں کی رُوپ ریکھا بناتے تھے۔ شتیل نے اُن کی توجہ گاؤں کے کنویں کی طرف دلائی۔ تمام گاؤں برسوں سے کھاری پانی پی رہا تھا اور اُن سے اب تک اپنے لیئے میٹھے پانی کا ایک کنواں نہ بن سکا تھا۔ گاؤں کے ساتھ لگتی ساری ہی زمین کے نیچے کھاری پانی کی تہ تھی۔ ایک صرف گاؤں کے زمیندار ٹھاکر امراؤ سنگھ کی زمین کی ایک ٹکڑی تھی جہاں میٹھے پانی کا کنواں بن سکتا تھا۔ لیکن ٹھاکر وہ زمین دینے کو تیار نہ تھا اور اس کا اصلی ذمہ دار ٹھاکر کا مُختار مُراری تھا جو اپنی خود غرضی کے لیئے تمام گاؤں کے مفاد کو نظرانداز کرا رہا تھا۔ شتیل نے یہ تجویز پیش کی کہ زمین کی اُس ٹکڑی کو بجائے مُفت مانگنے کے ٹھاکر سے خرید لی جائے۔ سوال تھا کہ اس کے لیئے رقم کہاں سے آئے گی؟ اس کے لیئے کیرتی نے گاؤں کی عورتوں کو تیار کیا! اور وہ سب کچھ نہ کچھ دینے کو تیار ہوگئیں۔ اِس غرض کے لیئے آخر پنچایت کی بیٹھک بُلائی گئی اور جب کنویں کا مسئلہ سب کے سامنے پیش کیا گیا تو ٹھاکر کے مختار مُراری اور اُس کے ایک ہریجن ساتھی رام سیوک نے اس کی مخالفت کی۔ پنچایت گھر میں جمع لوگ، ایکدم سناٹے میں آگئے جب رام سیوک کی لڑکی گلابی نے سب سے پہلے کنویں کی تعمیر کے لیئے سونے کا ایک کنگن پیش کیا جو

اُس کی ماں مرتے وقت اُسے دے گئی تھی۔ اس کے بعد لوگوں کا سویا ہوا احساس جاگ پڑا اور عورتوں اور مردوں سب نے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ پیش کیا، جو رقم کی صورت میں کچھ نہ دے سکے، انھوں نے کنویں کی تعمیر میں اپنی محنت دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ گاؤں کا ایک ڈیلی گیشن ٹھاکر کے پاس زمین خریدنے کے لیئے شہر گیا۔ اس ڈیلی گیشن کا لیڈر شیتل تھا۔ شیتل کی لگن سے اُمراؤ سنگھ اتنا متاثر ہوا کہ مُراری کی مخالفت کے باوجود اُس نے گاؤں کی پنچایت کو کنویں کے لیئے اپنی زمین کی ٹکڑی بیچ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اُس سے اگلے روز وہ خود گاؤں گیا کہ زمین بیچ دینے کا اعلان کر آئے۔ گاؤں والوں کی پائی پائی اکھٹا کی ہوئی رقم اور ماشہ ماشہ کر کے بٹورے ہوئے سونے کے پس منظر میں گاؤں کی جنتا کے گہرے احساس نے اُسے ایک انوکھا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے سارے گاؤں کے سامنے روپوں اور زیوروں سے بھری ہوئی تھیلی پنچایت کو واپس کر دی اور کہا کہ اُس کی زمین کی قیمت وہ وشواس ہے جو کسی سماج کے افراد کو اپنا مستقبل سنوارنے کے لیئے پیدا کرنا پڑتا ہے اور گاؤں والوں نے اِس وشواس کا اظہار کر کے اُس کی زمین کی قیمت ادا کر دی تھی۔ ٹھاکر نے بلکہ اپنی طرف سے دو ہزار روپے کنویں کی تعمیر کے لیئے گاؤں کی پنچایت کو پیش کر دیئے۔ اس مختصر لیکن پُر اثر تقریب کے بعد ٹھاکر واپس شہر چلا گیا اور شیتل اپنے ذہن پر ایک بھاری بوجھ لیئے گھر آگیا۔

ساتواں باب

شیتل جب گھر پہنچا تو اُسے لگ رہا تھا، جیسے اُس کے جسم میں جان نہیں تھی۔ اتنے لمبے اور شدید ذہنی دباؤ نے اُسے کُچل کر رکھ دیا تھا۔ وہ آتے ہی آنگن میں پڑی کھاٹ پر گر گیا۔

ماں سرہانے بیٹھی اُس کا سر دبا رہی تھی اور شیتل آنکھیں بند کیئے پڑا تھا۔ صبح سے لے کر اب تک کے تمام مناظر اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا، سب غیر متوقع تھا۔ اُس نے ایک بار بھی یہ نہ سوچا تھا کہ ٹھاکر اتنی جلد مان جائے گا اور کامیابی کا سہرا اُس کے سر بندھے گا۔ اچانک ہی گاؤں کا نیتا بن گیا تھا وہ۔ اُسے یہ سوچ کر بڑا سکون ہوا کہ ایک اپاہج اور غریب انسان ایکدم اِتنا اُونچا بھی اُٹھ سکتا ہے۔ یہ سب گاؤں والوں کی مہربانی تھی، گاؤں کی پنچایت، کی مہربانی۔ پنچایت کا خیال آتے ہی اُسے وہ شام یاد آگئی جب وہ پہلی بار پنچایت کی بیٹھک میں گیا تھا۔ کیرتی نے اُسے بڑی احتیاط سے سہارا دے کر سیڑھیاں چڑھائی تھیں اور وہ اِتنا بُرا لگا کہ سیڑھیاں پار کرنے کے بعد کیرتی سے ہی اس کی جگہ چھین لی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے جو کچھ اُسے مِلا تھا اُس کی حقدار کیرتی تھی، وہ نہیں تھا۔ اُس نے کیرتی سے ناانصافی کی تھی۔

ماں نے پل بھر کو اُس کا سر دبانا چھوڑ دیا اور بولی:

"چائے بناؤں، تھکے ہوئے ہو ایک پیالی پی لو۔"

"بنا دو۔"

ماں سرہانے سے اُٹھ گئی۔ اُس نے آگ جلا کر چائے کا پانی چڑھا دیا۔

اتنے میں ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور کیرتی اندر داخل ہوئی۔

"کاکی مبارک ہو، شیتل بابو نے گاؤں کا سر اُونچا کر دیا۔"

کیرتی کی آواز سن کر شیتل نے آنکھیں کھولیں۔

"تم لوگوں کی ہی بڑائی ہے اس میں بیٹی"۔ ماں نے جواب دیا اور کیرتی کے بیٹھنے کو اندر سے مُڈھا اُٹھا لائی اور خود شیتل کی پائینتی بیٹھ گئی۔

"آپ لیٹے ہوئے ہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے آپکی؟" کیرتی نے شیتل سے پوچھا۔

"ویسے ہی ذرا تھک گیا تھا۔"

"سر دبا دوں؟"

"نہیں، شکریہ۔"

"ساکی تم نہیں گئیں ٹھاکر کے جلسے میں۔ آج کا نظارہ گاؤں والوں کو عمر بھر یاد رہے گا۔ شتیل بابو کی وہ تعریف کی کہ مزا آ گیا۔" کیرتی نے کہا۔

"چھوڑو بھی، کیوں بنا رہی ہو مجھے"! شتیل بولا

"سچی بات، کہہ رہی ہوں۔"

ماں نے اسٹول پر چائے کا سامان لگا دیا۔ کیرتی چائے بنانے لگی تو ماں نے کہا۔

"میں بناتی ہوں تمہارے لیئے چائے۔"

ماں چائے بنانے لگی۔

"لیکن کھانڈ میرے مطلب کی ڈالنا اپنے کی نہیں۔"

شتیل کی بات سن کر ماں مسکرا دی۔

"تو تو دودھ اور کھانڈ کا صرف نام کرتا ہے، تیرا کیا۔"

اور اس نے خوب دودھ اور کھانڈ ڈال کر چائے کی پیالی شتیل کو پکڑائی۔

"تم تو مجھے اب بھی بچہ ہی سمجھتی ہو۔"

"آپ تو بوڑھے ہو رہے ہیں، بچے کہاں ہیں"؟ کیرتی نے ہنستے ہوئے کہا اور چائے کی پیالی اٹھائی۔

"چائے تو تم نے بنا دی، لیکن سگریٹ کا کیا ہو گا"؟

"سگریٹ پینا ضروری ہے کیا"؟ کیرتی نے پوچھا۔

"یوں تو جینا بھی ضروری نہیں، لیکن ہم پھر بھی جیتے ہیں۔"

"بڑے سنکی قسم کے آدمی ہیں آپ"؟

"اس تعریف کے لیئے شکریہ"۔ شتیل نے ہنستے ہوئے کہا اور گرم گرم چائے کا ایک لمبا گھونٹ لیا۔

"تو میں تمہارے لیئے پہلے سگریٹ لے آؤں"۔ ماں نے کہا

"تم جاؤ گی ساکی"؟ کیرتی نے پوچھا۔

"اور کون جائے گا؟ اس کے باپو کی چلمیں بھی تو بھرا کرتی تھی کبھی، بیٹا کیا باپ سے کم ہو گا"؟ ماں نے کہا۔

"وہ بھی تو تمہاری خدمت کیا کرتے تھے ماں۔"

شتیل اپنے مرحوم پتا کا پکھش لیتے ہوئے بولا۔

"تم باتیں کرو، میں سگریٹ لے آؤں"۔ یہ کہکر وہ چلی گئی۔

شتیل کی ماں آج بہت برسوں کے بعد دکان پر سگریٹ لینے جا رہی تھی اپنے بیٹے کے لیئے۔ بہت دنوں کی بات ہے جب وہ اس کے پتا کے لیئے میٹھا تمباکو لایا کرتی تھی اور جب وہ تازہ چلم بھر کے حقہ اس کے سامنے رکھتی تو وہ نہال ہی تو ہو جاتا تھا۔

ماں چلی گئی تو کیرتی نے کہا۔

"آج تو سچ مچ آپ سے حسد ہو رہا ہے۔"

"مجھے احساس ہے اپنی غلطی کا۔ تمہارے آنے سے پہلے میں یہی بات سوچ رہا تھا۔"

"کونسی بات؟"

"یہی کہ جو عزت تمہیں ملنی چاہیئے تھی وہ میں نے چھین لی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ تم جانے کب سے محنت کر رہی ہو اور میں نے آ کر جو صلہ تمہیں ملنا چاہیئے تھا اس پر ڈاکہ ڈالا ہے۔"

"تو یوں سوچتے ہیں آپ؟"

"ہاں۔"

"ایسا سوچ کر آپ مجھ سے انیائے کر رہے ہیں۔"

"میں نے زندگی میں کبھی کسی سے انیائے نہیں کیا۔"

"لیکن مجھ سے ایسا نہ کیجیئے گا۔ یہ نہ ہو کہ مجھے راستے ہی میں چھوڑ جائیں آپ۔"

"کیرتی!"

"ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں شتیل بابو۔ بہت دنوں کے بعد میں نے ایک بار پھر منزل کی چاہ کی ہے۔ جیون کی ایک سپاٹ اور سیدھی پگڈنڈی پر چلتے چلتے اوب گئی تھی۔ آپ نے آ کر پھر رخ بدلا ہے۔ مجھے زندگی کا ایک نیا روپ دکھایا ہے۔"

"ایک اپاہج کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے کسی کا؟"

"ایک اپاہج کا ساتھ ایک اپاہج ہی دے سکتا ہے۔ وہی اس کے دکھ اور درد کو پہچان سکتا ہے۔ یہ

پہچان ہی صحیح پریچے ہے شیتل جی۔"

شیتل کی نظریں اپنے آنگن کا جائزہ لینے لگیں۔

"میرا آنگن بہت تنگ ہے کیرتی۔"

"لیکن اس میں پھول بھی کھل سکتے ہیں۔"

"دھرتی بڑی ناہموار ہے۔"

"اسے ہموار کیا جا سکتا ہے۔"

"میرے گھر میں بڑی گھٹن ہے۔"

"اس میں تازہ ہوا کے جھونکے بھی لائے جا سکتے ہیں۔"

کیرتی کی یہ بات سن کر شیتل کو لگا، جیسے ہوا کا ایک مدھر جھونکا جانے کہاں سے آیا تھا اور بڑے خاموش انداز سے اُسکے قریب سے گزر گیا تھا۔

ماں سگریٹ لے کر آ گئی تھی۔

"دیکھ، لے آئی ہوں سگریٹ، ایکدم تیرے برانڈ والا۔"

"ماں تم کتنی اچھی ہو!"

"اور تم کتنے مورکھ"! وہ بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" شیتل نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا۔

"لاؤ، میں جلا دوں تمہارا سگریٹ۔" اور ماں نے شیتل کے ہاتھ سے ماچس لے کر اُس کا سگریٹ جلا دیا۔

کیرتی، ماں بیٹے کے اس گہرے سمبندھ کو دیکھ کر جھوم اُٹھی۔ کاش وہ کبھی اس گھر میں آ سکتی، اِس اتھاہ محبت اور خلوص میں شریک ہونے کے لیئے۔

سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے شیتل نے کہا۔

"زمین تو ٹھاکر نے دے دی لیکن اُس میں کنواں جلدی سے کھد جانا چاہیئے۔"

"نہیں تو ٹھاکر سوچے گا، یہ لوگ صرف باتیں ہی کرتے ہیں۔" کیرتی بولی۔

"تو کیا اڑچن ہے اب؟" ماں نے پوچھا۔

"زیور وغیرہ بیچ کر رقم کھری کی جائے، کنواں کھودنے والوں کو بُلا کر اُن سے فیصلہ کیا جائے۔ گاؤں کے وہ لوگ جنہوں نے روپیہ نہیں دیا، اپنی محنت دیں اور مزدوری کریں۔"

"پنچایت سے بات کر کے ہی سارا پروگرام بنانا پڑیگا۔" کیرتی بولی۔

"تم ایک آدھ روز میں پنچایت کی بیٹھک بُلا لو اور جو فیصلہ کرنا ہے کر ڈالو۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ہو سکے تو دولت کاکا اور سرپنچ جی کو میرے پاس بھیج دینا۔" شیتل نے کہا۔

"مجھے ایک بات کا ڈر ہے۔"

"کس بات کا؟"

"مُراری اور اُس کے ساتھی کوئی شرارت نہ کریں۔"

"اُنھیں زمیندار کی شہ تھی، وہ ختم ہو گئی۔ خود اُن میں اِتنا دم خم نہیں کہ شرارت کر سکیں۔"

"یہ تو خیر ٹھیک ہے۔"

"لیکن پھر بھی ہمیں ساودھان رہنا چاہیئے۔" شیتل بولا۔

کیرتی جانے کو اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو نہ بیٹی۔"

"میں دیر سے گھر سے باہر ہوں، اب جانا چاہیئے۔"

شیتل اُٹھنے لگا تو کیرتی نے ٹوک دیا۔

"آپ لیٹے رہیئے، آرام میں خلل پڑے گا۔"

شیتل ہنس پڑا اور کیرتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دروازے پر رُک کر اُس نے ایک بھرپور نظر شیتل پر ڈالی اور پھر چلی گئی۔

شیتل دیر تک اُس نظر کی چاندنی کو نکھرتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے اور اپنے دل و دماغ پر دھیرے دھیرے چھاتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔

اُس کے گھر کا تنگ آنگن جیسے ایکدم روشن ہو رہا تھا۔

نیکی رام سرپنچ، دولت کاکا اور شیتل نے

ساری اسکیم کی رُوپ ریکھا تیار کرلی۔ اور اُس کے بعد اُسے گاؤں پنچایت میں پیش کیا۔ جو جو تبدیلیاں تجویز کی گئیں اُن کے مطابق اسکیم کو بدل لیا گیا اور پھر سارا ڈھانچہ تیار ہو گیا۔

جس روز کنوئیں کی کھُدائی کا کام شروع ہونا تھا، اُس روز صبح سویرے ٹھاکر کی زمین میں ہَون کیا گیا، پوجا ہوئی، پرشاد بانٹا گیا اور گاؤں کے سرپنچ نے پہلا کُدال مار کر کھُدائی کا کام شروع کر دیا۔ پنچایت کے ممبروں کی ایک کمیٹی بنی جس نے گاؤں سے اکٹھا کئے ہوئے زیور بیچ کر روپے وصول کیئے اور رقم شہر کے بنک میں جمع کرادی۔ خرچ کا علٰحدہ کھاتہ کھول دیا۔ آپس میں کام بانٹنے میں بھی بہت سی باتوں کا خیال رکھا گیا۔ کنوئیں کی تعمیر میں جس سامان کی ضرورت تھی اُسے مہیّا کرنے کا کام نیکی رام کے ذمّے لگایا گیا۔ وہ ضرورت کے مطابق سامان خریدتا، اُس کا حساب کتاب رکھتا اور ہر تیسرے روز بتاتا کہ کتنا روپیہ خرچ ہوا تھا۔ پنچایت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کوشش کی جائے کہ ٹھاکر نے جو دو ہزار روپے پیش کیئے تھے اُن کے بغیر ہی کام چل جائے۔ یہی بہت تھا کہ جس زمین کے لیئے کئی برسوں سے جھگڑا چل رہا تھا، وہ ٹھاکر نے مُفت دیدی تھی۔ سب کی یہی رائے تھی کہ ٹھاکر کی پیش کی گئی رقم استعمال نہ کی جائے۔

گلابی نے اپنے ذمہ بڑا عجیب کام لیا تھا۔ وہ صبح سویرے لوگوں کے گھروں میں جا کر انھیں کام پر جانے کو کہتی۔ اُس نے گاؤں بھر کی محنت کا کھاتہ کھول رکھا تھا۔ کون آدمی کتنا کام کرے گا، کب اُس کی باری آئے گی، کب اُس کے آرام کا دن ہوگا۔ کس عورت نے کتنی مٹی پھینکی تھی، اُس کے بعد کون آئے گا۔ گلابی تو بالکل ایک تجربہ کار منشی کی طرح کان میں پنسل اڑائے گھومتی رہی۔ جب سب لوگ کام پر آجاتے تو وہ گھر جا کر رسوئی کا کام کرتی اور پھر فارغ ہو کر کنوئیں پر ہی آجاتی۔

کیرتی کا کام بھی کم دلچسپ نہیں تھا۔ وہ کام کرنے والوں کی حاضری کے رجسٹر تیار کرنے کی ذمہ دار تھی۔ وہ اُن کاریگروں کا حساب رکھتی جو اُجرت پر کام کر رہے تھے۔ اُن کی حاضریاں لگا کر انھیں مزدوری دیتی اور اُس کا باقاعدہ حساب کتاب رکھتی۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ گاؤں میں جاتی اور باری کے مطابق کام کرنے والوں کے لیئے گاؤں والوں سے کھانا تیار کرواتی اور انھیں بھجوانے کا انتظام کرتی۔

بڑی ترتیب اور باقاعدگی سے کام ہو رہا تھا۔ کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ دوپہر کو لوگ آرام بھی کرتے۔ رات کو گانا بجانا بھی ہوتا۔ گئی رات تک گاؤں کی گلیاں اِن گیتوں سے گونجتی رہتیں اور چاندنی کے ڈھلتے ہوئے سائے انھیں سُنتے رہتے۔

شیتل دوپہر کے قریب کنوئیں پر ہی آجاتا تھا اور کام کی نگرانی کرتا تھا۔ کاریگر، مزدور، گاؤں کے لوگ سب اُس سے خوش تھے۔ وہ سب سے بڑی محبت اور نرمی سے پیش آتا اور سدا اُن کی حوصلہ افزائی کرتا۔ اور اُن کے کام کو سراہتا۔

شام کو کیرتی ایک بار ضرور وہاں آتی۔ کام ختم ہونے سے پہلے وہ اپنا حساب کتاب کرتی اور پھر وہ اور شیتل گاؤں کی طرف چل پڑتے۔ شروع شروع میں تو شیتل کو اِن اوبڑ کھابڑ راستوں پر چلتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی لیکن اب تو وہ اِن راستوں کا عادی ہو گیا تھا۔ بغل میں بیساکھی دبائے وہ بڑے آرام سے چلتا اور باتیں بھی کرتا جاتا۔ یہ روزمرّہ کا پروگرام تھا۔ کنوئیں کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا اور شیتل اور کیرتی ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔ جوں جوں کنواں گہرا ہوتا جا رہا تھا، اُن دونوں کے تعلقات بھی گہرے اور مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔

شام کو گاؤں لوٹتے ہوئے وہ اپنی باتوں میں اسقدر محو ہوتے کہ انھیں وقت اور فاصلے کا احساس ہی نہ ہوتا۔

"آج کل تو آپ اتنے مصروف ہیں، کنواں مکمل ہو گیا تو پھر کیا کیا کریں گے؟"

"پانی بھرا کروں گا۔"

"کس کے لیئے؟"

"اپنے لیئے۔"

"آپ کو تو دو تین گھڑے کافی ہوں گے۔ اس میں تو بہت وقت نہیں لگے گا۔ بعد میں کیا کریں گے؟"

"گھڑوں کو انڈیل دیا کروں گا اور دوبارہ انہیں بھروں گا۔"

"اس سے اچھا کام تو واقعی نہیں مل سکے گا"، کیرتی نے کہا۔

"تم کیا کروگی کنواں مکمل ہو چکنے بعد، تم بھی تو ایکدم فارغ ہو جاؤ گی۔"

"میں آپ کی طرح بیکار نہیں، عورتوں میں کام کروں گی۔"

"تو میں بیکار ہوں؟"

"اور کیا ہیں، کونسی تیس مار خانی کی ہے آپ نے؟"

"یہ میری ہی ہمت تھی جو ٹھاکر کو قابو میں کر لیا، ورنہ یہ کنواں بننے میں پچاس برس اور لگ جاتے۔"

"اتنا گھمنڈ نہ کیجیے شتیل بابو، زمانہ بڑا نازک ہے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا، زمانہ بڑا نازک ہے، ہمیں زیادہ نہیں ملنا چاہیئے۔"

"تو آپ ڈر گئے، ڈرنا تو مجھے چاہیئے، آپ تو مرد ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کسی کو ہمارا یہ ملنا جلنا پسند نہ ہو۔"

"آپ اپنی بات کہیئے، دوسروں کو چھوڑیئے۔"

"کیا کہوں؟"

"یہی کہ اگر آپ کو پسند نہ ہو تو میں نہیں ملا کروں گی"۔ کیرتی بولی۔

"تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تو یہ تمہارے لیئے ہی کہہ رہا تھا۔ چندر کے نہ ہونے سے بڑا فرق پڑ گیا ہے۔"

"مجھے اپنے برے بھلے کی پہچان ہے، آپ لیکچر نہ جھاڑیں۔"

کیرتی نے شتیل کی بات کا برا مانا تھا۔ وہ ان لمحوں میں اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ شتیل کو خود احساس ہونا چاہیئے اس بات کا۔ لیکن وہ تو نرا بدھو ہے۔ ایکدم بے حس، بے جان۔

"تم ناراض ہو گئیں؟"

"آپ بات ہی ایسی کرتے ہیں!"

"اچھا کھشما کر دو۔"

شتیل کی بات سن کر کیرتی من ہی من میں شرمندہ ہو گئی۔ کم بخت کے لڑنے کے ڈھنگ بھی عجیب ہیں، اور جیتنے کے بھی۔ کیرتی اس بات کو طول دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے موضوع بدل ڈالا۔

"جب کنواں تیار ہو گا تو لوگوں پر اس کا کیا ردِ عمل ہو گا؟"

"کچھ روز تو وہ صرف اس کا پانی پئیں گے۔ پھر پہلے کنوئیں سے اس کا مقابلہ کریں گے اور جب کہیں جا کر اپنا فیصلہ دیں گے کہ اس کا کوئی فائدہ بھی تھا یا نہیں"۔ شتیل نے جواب دیا۔

"پھر کیا ہو گا؟"

"کچھ سمے تک تو اور کچھ نہیں ہو گا۔ سارا کام ایک بندھی رفتار سے چلتا رہے گا۔ لوگ جلدی جلدی تبدیلی بھی تو نہیں چاہتے۔ دھیرے دھیرے رک رک کر چلنا بہتر ہے، ایک ہی بار کود کر تاروں کو چھو لینے کی کوشش سے۔"

"لیکن مقصد تو تاروں کو چھونا ہی ہونا چاہیئے۔"

"مقصد کی اور بات ہے۔ مقصد بلند ہو، لیکن کوششیں بھی تو مضبوط اور مستقل ہوں"۔ کیرتی کئی بار شتیل کی بات کو سمجھ نہ پاتی تھی۔ اس قسم کے جواب اسے الجھا دیتے تھے۔

"تو کیا کنوئیں کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی گاؤں کی ترقی کے کام رک جائیں گے۔"

"رک کیوں جائیں گے؟" شتیل نے کھینچ کر کہا۔

"جب آپ کسی بات پر کھیجے اٹھتے ہیں تو زیادہ اچھے لگتے ہیں"۔ کیرتی بولی۔ اور پھر دونوں ہنس دیئے۔ شتیل اور کیرتی، کیرتی اور شتیل۔

گاؤں کو ریلوے اسٹیشن سے ملانے والی یہ سڑک کچی ہے کچھ مدت کے بعد اسے پکا بنانے کی بات چھیڑیں گے۔"

"ہاں برسات میں تو یہ سڑک ایک اچھی خاصی ندی میں بدل جاتی ہے۔"

"جب تک اس کا روپ نہیں بدلتا تم اپنی کشتی چلاتی رہو۔"

"منجدھار سے ڈر لگتا ہے۔"

"تو کنارے پہ کھڑی رہو، کیوں کودتی ہو طوفان میں؟"

"طوفان کیوں بلاتا ہے مجھے؟"

"وہ تو بلاتا ہی ہے، اس کی فطرت تو ہے ڈبونا۔"

"کوئی ہوشیار مانجھی مل گیا تو پار اُتر جاؤں گی۔"

"ہے کوئی نظر میں؟"

"جی!"

کیرتی نے یہ کہہ کر شتیل کی طرف دیکھا۔ دیر تک دونوں کی نظریں ملی رہیں۔ کیرتی کو لگا جیسے وہ کسی گہرے سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی اور کسی کا ہاتھ اُسے اُوپر کھینچنے کیلئے بڑھ رہا تھا۔

کچھ دیر دونوں خاموش چلتے رہتے۔ شتیل پرندوں کو اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف اُڑتے ہوئے دیکھ کر سوچتا کہ آخر کب تک کوئی بے ٹھکانہ رہ سکتا ہے اور پھر اُسے چندر کا خیال آتا جو کچھ ہی برسوں میں کیرتی کو بے ٹھکانہ کر کے چلا گیا تھا۔ ایکدم بے سہارا اور تنہا۔ ان ہی لمحوں میں وہ سوچتا تھا کہ گاؤں کو اسٹیشن سے ملانے والی سڑک ضرور پکی ہونی چاہیئے تاکہ سفر آسان ہو جائے۔

کسی روز پھر بات اُٹھتی۔

"سڑک کیسے بنے گی شتیل بابو؟"

"جیسے سڑک بنا کرتی ہے۔" وہ جواب دیتا۔

"کیسے بنتی ہے؟"

"جیسے اب بن رہی ہے۔"

اس طرح کے جواب سُن کر کیرتی بُری طرح اُلجھ جاتی۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے اُس کا پاؤں ساڑھی میں اُلجھ رہا تھا۔ اور وہ کسی بھی لمحہ گر جائے گی۔

"لوگوں ہی کے سہیوگ سے بنے گی نا سڑک؟" کیرتی پوچھتی۔

"ہاں، ایک بار سہیوگ دینے لگے تو پھر جنتا کا سہیوگ بنا ہی رہتا ہے، شرم دان کا ہتھیار استعمال کریں گے۔"

"کتنے دن لگیں گے، اسے مکمل ہونے میں؟"

"دن بھی لگ سکتے ہیں، برس بھی، کیا کیا جا سکتا ہے۔" شتیل جواب دیتا اور کیرتی ایک بار پھر اُلجھ جاتی۔

"سڑک مکمل ہو گئی تو اس کا اُدگھاٹن کون کرے گا؟"

"دولت کاکا۔ گاؤں کا سب سے پُرانا کوچوان۔ اُس نے برسوں سے سڑک کا ساتھ نبھایا ہے۔ اس کی تقدیر سنورے گی تو سب سے زیادہ خوشی دولت کاکا ہی کو ہو گی۔" شتیل کہتا۔

"پھر ہم دونوں تانگے میں بیٹھ کر اسٹیشن جائیں گے اور گاڑی پکڑیں گے اور پھر"۔۔ ایک دن کیرتی اتنی ہی بات کہہ پائی تھی کہ پیچھے سے دولت کا تانگہ آ گیا۔ شتیل اور کیرتی راستے کی ایک طرف ہٹ گئے اور کیرتی کی بات ادھوری رہ گئی۔

ادھوری بات کی یہ کسک اُس شام کیرتی کے سینے کو جلاتی رہی اور رات جب وہ بستر میں لیٹی تو اُسے محسوس ہوا جیسے ایک دہکتا ہوا انگارہ اُس کی زبان پر پڑا سُلگ رہا تھا۔ شتیل بھی اُس رات چین سے نہ سو سکا۔ سوچتا رہا جانے کیرتی کو آگے کیا کہنا تھا۔ اُسے افسوس تھا کہ اُس کی بات ادھوری رہ گئی تھی ____

آٹھواں باب

بہت دنوں سے شتیل شہر نہیں گیا تھا۔

ٹھاکر نے اُس سے کہا تھا کہ وہ تیسرے چوتھے روز شہر آ کر اُسے کنوئیں کی تعمیر کے بارے میں بتاتا رہے۔ ایک آدھ بار ٹھاکر خود بھی گاؤں آیا تھا۔ جس رفتار سے کام چل رہا تھا وہ اُس سے مطمئن تھا۔ جانے سے پہلے اُس نے گاؤں کے پنچوں اور شتیل سے بات چیت کی۔ اُنھیں کچھ سجھاؤ بھی دیئے۔ اُس نے شتیل سے کہا کہ وہ شہر آئے اور گاؤں کی ترقی کے کچھ اور پروگرام اُس کے سامنے رکھے۔

کیرتی بھی بہت دنوں سے شہر نہیں گئی تھی۔ ادھر گاؤں کے کاموں میں ایسی اُلجھی رہی کہ کہیں جا ہی نہ سکی۔ وہ بھی ایک بار شہر ہو کر آنا چاہتی تھی۔ نیکی رام سرپنچ کو کوئی اعتراض نہ تھا اور پھر شتیل بھی اُس کے ساتھ جا رہا تھا، اور

دولت کا کا کے من میں ترنگ اُٹھی تھی شہر کی رونق دیکھنے کی۔ تینوں کا ساتھ رہے گا۔ شتیل کو ٹھاکر کی کوٹھی پر چھوڑ کر دولت اور کیرتی شہر میں گھومیں پھریں گے۔ شتیل ٹھاکر سے مل کر آجائے گا اور وہ کسی جگہ اکھٹے ہو جائیں گے۔ کہیں چائے وائے کا پروگرام رہے گا۔ تھوڑی بہت خرید و فروخت ہو گی اور پھر شام کی گاڑی سے تینوں گاؤں لوٹ آئیں گے۔ دولت اپنا تانگہ اسٹیشن پر ہی کھڑا کر جائے گا۔ واپسی پر گھوڑا جوتے گا اور سب کھٹ سے گاؤں پہونچ جائیں گے۔

پروگرام کے مطابق ایک روز تینوں ہی شہر کی طرف چل دیئے۔ مُراری کئی دنوں سے بس تاک میں تھا کہ کوئی موقع ملے اور وہ اپنے ہاتھ دکھائے۔ گاڑی کے آنے سے پہلے ہی وہ سمر پور کے اسٹیشن پر آگیا اور جب گاڑی آئی تو سب سے آخری ڈبے میں بیٹھ گیا۔ گاڑی شہر پہونچی تو وہ شتیل، کیرتی اور دولت کے پیچھے ہولیا۔ جہاں جہاں وہ جاتے مُراری اُن کا پیچھا کرتا۔ جب دولت اور کیرتی، شتیل کو ٹھاکر کی کوٹھی تک چھوڑنے گئے تو وہ ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب وہ اُسے چھوڑ کر واپس ہوئے، وہ جب بھی اُن پر نظر رکھے ہی رہا۔

شتیل کے آنے پر ٹھاکر نے بڑے پیار سے اُس کا سواگت کیا۔ اُسے بڑی عزت سے بٹھایا۔ چائے پلائی اور پھر اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

"کتنا وقت اور لگ جائے گا، کنواں مکمل ہونے میں"؟ ٹھاکر نے پوچھا۔

"میرے خیال سے تو پندرہ بیس روز میں کام ختم ہو جائیگا"۔

"پانی کیسا نکلا ہے"؟

"میٹھا ہے ٹھاکر صاحب، آپ کی دُعائیں ہمارے ساتھ ہیں"۔

"مَیں چاہتا ہوں کہ سمر پور ایک آدرش گاؤں بن جائے"۔

"اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو یہ گاؤں کی خوش قسمتی ہے"۔

"سوچتا ہوں کہ جب تم جیسے لوگ ساتھ ہیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے"۔

"آپ کی مہربانی ہے ٹھاکر صاحب"۔ شتیل نے جواب دیا۔

"ایک بلیو پرنٹ سا تیار کرو، نئے سمر پور کا"۔

"جی بہت اچھا"۔

"اور کیا ہونا چاہیئے گاؤں میں"؟

"بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے ٹھاکر صاحب، سمر پور بڑا پچھڑا ہوا گاؤں ہے، اس میں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے"۔

"مثال کے طور پر"؟

"اسٹیشن سے گاؤں تک کی سڑک پکّی ہو"۔

"ٹھیک ہے"۔

"لڑکیوں کے لیئے اسکول کھولا جائے۔ عورتوں کیلئے پرسُرت گھر تعمیر ہوں۔ ایک کمیونٹی سنٹر بنے، جہاں گاؤں کے نوجوان اپنا فالتو وقت گذاریں اور کام کی باتیں سوچیں"۔

"اور کہو"۔ ٹھاکر نے دلچسپی دکھاتے ہوئے کہا۔

"سب سے بڑی ضرورت سہکاری کھیتی کی ہے"۔

"وہ کیسے"؟

"موجودہ حالات میں گاؤں کے لوگ اپنی تھوڑی تھوڑی زمین کے الگ الگ ٹکڑوں پر محنت ضائع کرتے ہیں اور حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ گاؤں والے اپنی زمینوں کو اکٹھا کرلیں۔ کوآپریٹیو سوسائٹیاں کھول لیں، جن کے ذریعہ اپنے کھیتوں میں پیداوار بڑھائیں اور اناج کو منڈیوں میں فروخت کرکے منافع کی رقم آپس میں بانٹ لیں"۔

"بہت اچھا خیال ہے۔ لیکن اس میں مجھے کیا کرنا ہوگا"؟ ٹھاکر نے پوچھا۔

"آپ اپنی زمین بھی گاؤں والوں کی زمینوں میں شامل کرلیں، اپنا حصّہ کم کردیں۔ آپ کے کھیتوں کی پیداوار کا فائدہ تمام گاؤں کو پہنچے گا"۔

"مجھے منظور ہے"۔

"آپ کا گاؤں سورگ بن جائے گا اور گاؤں کا بچّہ بچّہ اس کی تخلیق میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائے گا"۔ شتیل نے کہا۔

ٹھاکر نے اِن باتوں کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا۔

اس کی سوچ کبھی یہاں تک پہونچی ہی نہ تھی۔ اُسے تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے سے ہی فرصت نہ تھی۔ یہ تو کنوئیں کے اِس سلسلے نے اس کے سامنے نئے راستے اُجال دیئے تھے۔ شنیتل کی باتیں سُن کر اُسے واقعی خوشی ہوتی۔

"آج تم یہیں رُک جاؤ۔ کل مَیں بھی تمہارے ساتھ گاؤں چلوں گا۔" ٹھاکر نے سگریٹ کیس شنیتل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ گاؤں کے دو ایک آدمی اور بھی ہیں۔ وہ اسٹیشن پر میرا انتظار کرتے رہیں گے۔ آج تو مجھے جانے ہی دیجئے، لیکن آپ کل ضرور آئیے گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

کچھ دیر اور بیٹھ کر شنیتل نے ٹھاکر سے اجازت چاہی۔ ٹھاکر کی گاڑی آج خراب تھی، اس لیئے اُس نے تانگہ منگوا کر شنیتل کو اُس میں بٹھا دیا۔

نورنگ رسٹورنٹ کے سامنے تانگہ رُکا تو شنیتل نے دیکھا کہ دولت اور کیرتی کھڑے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ دولت نے آگے بڑھ کر شنیتل کو تانگے سے اُترنے میں مدد دی اور پھر اُسے رسٹورنٹ کے اندر لے گیا۔

شنیتل نے پہلے ہی بہت دیر کر دی تھی، اِس لیئے وہ رسٹورنٹ میں زیادہ دیر نہیں بیٹھے۔ کچھ کھا پی کر بازار کی طرف نکل گئے۔ کیرتی کو اپنی ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنا تھیں۔

کیرتی بزازی کی دُکان سے کپڑے خرید رہی تھی، شیڈ اور پرنٹ کا انتخاب وہ شنیتل سے کراتی۔

"میں فوجی آدمی ہوں، مجھے اِن باریکیوں کا کیا پتہ؟" شنیتل نے کہا۔

"تو آپ کا خیال ہے فوجیوں کو ایسی چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں۔" کیرتی نے یہ کہتے ہوئے کھلے ہوئے تھانوں کے حصّے شنیتل کے آگے ڈال دیئے۔

جب تک شنیتل نے اپنا فیصلہ نہیں دیا، کیرتی نے ایک ٹکڑا نہ خریدا۔

دولت پاس بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا، اور اُسے اچھا لگ رہا تھا۔

شنیتل جب سے دُکان میں داخل ہوا تھا، اُس کی نگاہیں سامنے شیشے کی الماری میں سجی ایک ساڑی پر جمی تھیں۔ یہ ساڑی کیرتی کے جسم پر کیسی لگے گی۔ جانے اُسے ہلکے رنگ پسند بھی ہیں کہ نہیں؟ شنیتل نے جتنے بھی کپڑے چُنے تھے وہ سب ہلکے شیڈ کے تھے۔ کیرتی نے محض اُس کی بات رکھنے کو وہ کپڑے لے لیئے تھے یا واقعی اُسے پسند تھے۔ اس کے بارے میں شنیتل کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

"یہ ساڑی کیسی ہے کیرتی؟" آخر اُس نے پوچھ ہی لیا۔

"اچھی ہے۔"

"صرف اچھی ہے؟" شنیتل کو جیسے اِس جواب سے چوٹ پہونچی ہو۔

"نہیں بہت اچھی ہے۔"

"تمہیں پسند ہے؟"

"ہاں!"

"تو لے لو۔"

شنیتل کی بات سُن کر کیرتی خاموش ہو گئی۔ لمحہ بھر کے بعد بولی۔

"تو مَیں قمیضوں کے کپڑے واپس کر دیتی ہوں۔"

"کیوں؟"

کیرتی کے جواب سے شنیتل جان گیا کہ وہ زیادہ روپے ساتھ نہیں لائی تھی۔

"میں دے رہا ہوں۔"

"آپ؟" جیسے کیرتی کو شنیتل کی بات کا اعتبار نہ ہو۔

"ہاں۔"

"تو ضرور لوں گی۔"

دُکاندار جب کپڑے اور ساڑھی بنڈلوں میں ڈال رہا تھا، اُسی لمحہ مُراری دُکان کے سامنے سے گزرا۔

تینوں میں سے کسی نے اُسے نہ دیکھا تھا۔

گاڑی کا وقت ہو رہا تھا، اس لیئے وہ جلد ہی اسٹیشن پہونچے، ٹکٹ خریدے اور ڈبے میں بیٹھ گئے۔

شیتل نے دیکھا، مراری ڈبے کے سامنے سے گزر کر آگے جا رہا تھا۔ اُس کا دِل دَھک سے رہ گیا۔ شگُن اچھا نہیں تھا۔ اُس نے کیرتی اور دولت سے تو اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن جس سکون اور خوشی کا احساس اُسے اب تک ہوا تھا وہ مجروح ہو گیا۔

گاڑی چلی تو وہ اَن منا سا بیٹھا رہا۔ دولت نے دو ایک بار بات کرنا چاہی، لیکن شیتل کا مُوڈ نہیں بنا۔ اس لیئے وہ بھی خاموش ہو گیا۔

کیرتی نے بھی بات کرنے کی کوشِش کی، لیکن شیتل کا جواب حوصلہ افزا نہیں تھا۔ عجیب سنکی آدمی ہے یہ شخص۔ پل پل میں تو اس کا مزاج بدلتا ہے۔ کوئی کیا اعتبار کر سکتا ہے اس پر؟ ایسے شخص کی قُربت بھی مُصیبت ہے جُدائی بھی۔ اس کی دوستی بھی بُری، دُشمنی بھی۔

شیتل بہت دیر تک چلتی گاڑی میں سے ڈبے کے باہر دیکھتا رہا اور جانے کیا سوچتا رہا۔ دولت بڑی پی کر اب اُونگھنے لگا تھا۔

"کیرتی"!

کیرتی نے جواب نہ دیا صرف اُس کی طرف دیکھا۔

"کیا واقعی تمہیں میرا اپاہج پن بُرا نہیں لگتا؟"

"کبھی کبھی کیسی باتیں کرنے لگتے ہیں آپ؟"

"سوچ رہا ہوں کہ کیا تم میرا ساتھ دے سکو گی؟"

"یہی بات میں بھی سوچ رہی ہوں۔"

"تو دونوں ہی کو ایک دوسرے پر اعتبار نہیں۔"؟

"آپ تو بات میں سے بات نکالتے ہیں۔" کیرتی چڑ کر بولی۔

"کچھ لوگ شائد ہمیں اکٹھے دیکھنا برداشت نہ کریں۔"

"کچھ لوگ، تو یقیناً نہیں کریں گے۔"

"ایسی صُورت میں کیا ہوگا؟"

"ہم اُنھیں نظر انداز کر دیں گے۔"

"کر سکو گی؟" شیتل نے پوچھا۔

"جی۔"

اِس کے بعد دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ بات

صاف ہو گئی تھی۔ دونوں مطلب سمجھ گئے تھے۔ مزید بحث کی ضرورت نہ تھی۔

شیتل نے پاس بیٹھی کیرتی کے ہاتھ کو چھُوا اور کیرتی کی اُنگلیاں اُس کی اُنگلیوں پر جم گئیں۔

ایک سمجھوتے پر دونوں کے دستخط ہو گئے تھے۔

اسٹیشن شہر سے بہت زیادہ دُور نہیں تھا۔ سمرپُور گاؤں آ ہی گیا۔ مراری سب سے پہلا مسافر تھا جو اُس گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم سے باہر نِکل گیا۔

دولت کاکا جب شیتل اور کیرتی کو تانگے میں بٹھا کر گاؤں پہونچا تو شام کا دُھندلکا پھیلنے لگا تھا۔

مراری پیچھے رہ گیا تھا۔ لیکن اُس کا دماغ بہت آگے سوچ رہا تھا۔

کچھ روز مراری سوچتا رہا اور پھر اُس نے فیصلہ کر لیا۔

ایک صبح جب نیکی رام سرپنچ کنوئیں کی طرف جا رہا تھا تو مراری راستے کے بیچ آ گیا۔

"کتنا کام اور رہ گیا ہے سرپنچ جی"؟

"اب تو دو چار روز کا ہی کام ہے۔"

"آخر کنواں بنا ہی لیا آپ نے"!

"یہ سارے گاؤں والوں کی ہمّت ہے۔"

"لیکن کام تو آپ کے بھی آئے گا۔"

"وہ تو سبھی کے آئے گا۔" نیکی رام نے جواب دیا۔

"لیکن پہلے تو آپ ہی کے آئے گا۔"

"کیسے"؟

"ڈوب مرنے کے لیئے۔" مراری بولا۔

"مراری تم سدا ہی ایسی باتیں کرتے ہو۔ بھلے مانس کبھی تو اچھی بات بھی کیا کرو۔"

"میں نے ٹھیک ہی کہا ہے سرپنچ جی۔"

"کیا ٹھیک کہا ہے۔"؟

"یہی کہ اگر کیرتی کے یہی لچّھن رہے تو تمہیں ڈوبنا ہی ہوگا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" نیکی رام نے تلخ ہو کر کہا
"میں اکیلا نہیں سارا گاؤں کہتا ہے۔"
"کیا کہتا ہے سارا گاؤں؟"
"جوان بیوہ کا اس آزادی سے گھومنا پھرنا کون برداشت کر سکتا ہے؟"
"یہ آزادی میں نے اُسے آج تو نہیں دی، کئی برسوں سے دے رکھی ہے۔ آج تک کسی نے کوئی بات نہیں کہی۔"
"جب تک وہ لنگڑا شیتل نہیں آیا تھا سب ٹھیک تھا۔"
"اُس کے آنے سے کیا ہو گیا ہے؟"
"میری زبان نہ کھلواؤ سرپنچ۔"
"کہہ ڈالو جو کچھ بھی تمہیں کہنا ہے۔"
"آپ کو بھی کنوئیں پر جانا ہے اور میں بھی اس سمے مصروف ہوں، پھر کبھی بات کروں گا۔"
"نہیں ابھی کرنی ہوگی، اسی وقت۔"
"تو سُنو، کیرتی، شیتل کے ساتھ گلچھرے اُڑاتی پھرتی ہے۔"
"مُراری، دوسروں کے بارے میں سوچ سمجھ کر کہنا چاہئیے۔"
"سوچ کر ہی کہا ہے۔ ابھی دو تین دن کی ہی تو بات ہے کیرتی، شیتل کے ساتھ شہر میں گھوم رہی تھی۔"
"وہ تو میری اجازت سے گئی تھی۔"
"ہوٹلوں میں بھی وہ تمہاری اجازت سے گئی تھی، ساڑیوں کے تحفے بھی اُس نے تمہاری اجازت ہی سے لیئے تھے؟"
"کون سے تحفے؟"
"شیتل نے اُسے کپڑے خرید کر دیئے ہیں۔" مُراری نے کہا۔
نیکی رام، مُراری کی بات سُن کر خاموش ہو گیا۔
"لیکن دوست بھی تو ساتھ تھا۔"
"اُسے تم کم نہ سمجھو سرپنچ، جھگڑے کی اصل جڑ تو وہی ہے۔"
نیکی رام، راستے ہی میں کھڑا مُراری کی بات سُن رہا تھا اور مُراری اپنی ادھوری سی بات کہہ کر اُسے وہیں چھوڑ کر اچانک چلتا بنا۔
مُراری کے جانے کے بعد اُس کے پاؤں جیسے زمین کے ساتھ جم گئے تھے۔ اُس نے بڑی مشکل سے قدم اُٹھائے اور کنوئیں کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہونچکر اُس نے شیتل سے کھُل کر بات نہ کی۔ کیرتی آئی تو اُس سے بھی نہیں بولا۔ کیرتی کو تو خیر شک نہ گزرا لیکن شیتل سمجھ گیا کہ مُراری نے آخر وار کر ہی ڈالا۔

نیکی رام یوں تو دن بھر کام میں لگا رہا، لیکن اُس کا دماغ بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ پچھلے سات برس سے کیرتی بیوہ تھی کسی نے کبھی جرأت نہ کی تھی اُس کے متعلق کچھ کہنے کی۔ لیکن اس کا ذمہ دار تو وہ خود ہی تھا۔ اُس نے خود ہی تو کیرتی کو اتنی آزادی دے رکھی تھی۔ لیکن شیتل پنچ نہیں ہو سکتا۔ وہ اُس کے باپ دادا کو بھی جانتا تھا۔ اچھا گھرانا تھا۔ گاؤں بھر میں اُن کی عزت تھی۔

کاش وہ کنوئیں کا جھگڑا اکھڑا نہ کرتا! آخر اب تک لوگ کھارا پانی ہی تو پیتے رہے تھے۔ کیا بگڑا تھا اُن کا۔ یہ بے کار میں بکھیڑا شروع کر دیا اُس نے۔

دوپہر کو کیرتی جب گھر آئی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے سُسر کا مزاج کچھ گرم تھا۔ وہ تو سمجھ گئی، لیکن خاموش ہی رہی۔
"شام کو کنوئیں پر مت جانا کیرتی۔"
"کیوں پتا جی؟ مزدوروں کا حساب کرنا ہوگا۔"
"وہ میں خود کر لوں گا۔"
"لیکن آج ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟"
"یہ پھر بتاؤں گا۔"
یہ سُنکر کیرتی چُپ ہو گئی۔
اُس شام وہ کنوئیں پر نہیں گئی۔

شیتل روز کی طرح اُس کا انتظار کرتا رہا۔ ایک ایک کر کے سب لوگ چلے گئے۔ اندھیرا ہونے لگا۔ وہ ابھی تک کیرتی کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر کب تک بیٹھا رہے گا وہ وہاں اُس ویرانے میں؟ اُس نے بیساکھی بغل میں دبائی اور چل پڑا۔ وہ راستہ جس پر وہ ہر روز بڑے آرام سے چلا کرتا تھا۔ آج بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ قدم قدم پر اُسے ٹھوکر لگتی تھی۔ کیرتی کے ساتھ نہ ہونے سے کتنا فرق پڑ گیا تھا۔ ایک شخص کے ساتھ نہ ہونے سے کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ ہر شام وہ اُس کے ساتھ ہوتی تھی اور اُسکے

ساتھ ہوتے ہوئے اُسے کبھی خیال میں نہ آیا تھا کہ کنویں سے گاؤں تک کا راستہ اتنا دشوار بھی ہو سکتا ہے۔

جب وہ گاؤں کی سیما کے اندر داخل ہوا تو تارے نکل آئے تھے اور اندھیرا ہو گیا تھا۔ اُس نے گلی کے اندر قدم رکھا تو سامنے سے آتے ہوئے مُراری نے ٹوکا۔

"آج بڑی دیر سے آ رہے ہو شتیل بابو؟"

"ویسے ہی دیر ہو گئی۔"

"کیرتی نہیں ہے ساتھ؟"

"وہ جلدی چلی گئی تھی۔" شتیل نے جواب دیا۔

اُسی لمحہ مُراری نے ماچس جلا کر بیڑی سلگائی اور مسکراتے ہوئے آگے نکل گیا۔ دیا سلائی کی اس روشنی میں شتیل نے مُراری کا چہرہ بھی دیکھا، اور اُسے بدلے ہوئے حالات کی پرچھائیں بھی نظر آ گئی۔

جب وہ اپنے گھر کی دہلیز تک پہنچا تو اُسے لگا جیسے وہ لڑکھڑانے لگا ہے۔

کیرتی شام کو کنویں پر نہیں گئی تھی۔ گھر ہی پر رہی تھی۔ لیکن اُس کا من بڑا بے چین تھا۔ وہ گھڑی آ گئی تھی، جب اُسے اپنے لیئے ایک بہت بڑا فیصلہ کرنا تھا۔ وہ ایکدم کھوئی کھوئی سی تھی رات اُس نے کھانا بھی نہیں کھایا، دودھ بھی نہیں پیا۔ سونے کے لیئے اپنے کمرے میں جانے لگی تو نیکی رام نے بلا لیا۔

"بیٹی تم شہر گئی تھیں تو مُراری نے تمہیں کہیں دیکھا تھا؟"

"مجھے تو معلوم نہیں پتا جی۔"

"تم نے کچھ کپڑے وغیرہ بھی خریدے تھے؟"

"جی!"

"روپے تھے تمہارے پاس؟"

"ماں جی سے لے گئی تھی۔"

"اور کہاں کہاں گئی تھیں تم؟" نیکی رام نے پوچھا۔

"لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ویسے ہی۔"

"آپ صاف بات کہیئے، میں جواب دوں گی۔" کیرتی نے ذرا غصے سے کہا۔

"تم کل سے کنویں پر مت جایا کرو۔"

"کیوں؟"

"میرا یہی خیال ہے۔"

"عورتوں کا سنٹر بھی بند کر دوں؟"

"نہیں سنٹر کھولا کرو۔" نیکی رام نے جواب دیا۔

کچھ لمحے وہیں کھڑی رہ کر کیرتی سونے چلی گئی۔ لیکن بہت دیر تک اُسے نیند نہ آئی۔ وہ جاگتی رہی اور سوچتی رہی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ کنویں پر جانے کی روک اس لیئے تھی کہ وہ شتیل سے نہ مل سکے۔ شتیل ٹھیک ہی کہتا تھا کہ نازک وقت آنے والا ہے۔ اُس کے سامنے اب دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ عمر بھر بیوہ بنی سسرال میں پڑی رہے اور جلتی رہے اور یا شتیل سے شادی کر لے۔ بے مطلب اور بیکار زندگی گذارنا اب اُس کے لیئے ناممکن تھا۔ لیکن وہ اپنے سسر نیکی رام سرپنچ کی مخالفت بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے کیرتی کے لیئے جو کچھ کیا تھا وہ سمرپور جیسے پچھڑے ہوئے گاؤں کا کوئی آدمی نہ کر سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی احسان فراموشی ہو گی اگر وہ نیکی رام کی رضامندی کے بغیر کوئی قدم اُٹھائے۔ لیکن وہ اس مسئلے پر اپنے سسر سے بات کیسے کرے؟ یہ تو ہرگز ممکن نہ تھا۔ اُسے شتیل سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ اب اُس سے بھی وہ کیا مشورہ کرے گی؟ اُسے خود ہی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اِسی اُدھیڑ بُن میں محو کیرتی رات کے کسی پہر سو گئی۔

وہ رات شتیل کے لیئے بھی قیامت کی رات تھی۔ بہت دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد اُس نے ماں کو آواز دی۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

"تھوڑا پانی پلاؤ۔"

ماں نے گھڑے میں سے ٹھنڈا پانی پلایا۔ پانی ٹھنڈا تو تھا، لیکن تھا کھاری۔ جیون کا یہ کھاری پن کب تک برداشت کرنا ہو گا اُسے۔

"ماں! ایک بات پوچھوں تم سے؟"

"پوچھ بیٹا! تم پریشان کیوں ہو؟"

" ماں، اگر میں کیرتی سے شادی کر لوں تو کیسا رہے ؟"
" لیکن وہ تو بیوہ ہے شیتل "۔
" بیوہ سے شادی نہیں ہو سکتی کیا ؟"
" تمہیں اور لڑکیاں بھی تو مِل سکتی ہیں "۔
" سوال لڑکی ملنے کا نہیں "۔
" اور کیا ہے ؟" ماں نے پوچھا۔
" تم نہیں سمجھو گی "۔
" تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے "۔
" تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ؟"
" مجھے نہ بھی ہو، لیکن سرپنچ اس بات کو کیسے برداشت کریگا گاؤں والے اسے کیسے سیوئیکار کریں گے ؟"
" مَیں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کیرتی ہی سے شادی کروں گا "۔ شیتل بولا۔
" اُس سے بھی پُوچھا ہے تم نے ؟"
" ہاں، اُسے منظور ہے "۔ شیتل نے جواب دیا۔

اس کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی۔ دونوں ہی خاموش ہو گئے لیکن ماں بہت دیر تک نہ سو سکی۔ اُسے یقین تھا کہ نیکی رام اس پر رضامند نہ ہوگا۔ اور پھر کیرتی کے ماں باپ سے بھی تو پُوچھنا ضروری تھا۔ اس معاملے میں کون ان کی مدد کر سکتا ہے۔ گھوم پھر کر اسکی نظریں دولت سا کا پر ٹِکیں۔ وہی ایک شخص تھا جس کی مدد پر وہ بھروسہ کر سکتی تھی۔

دوسری صبح جب شیتل کی ماں، دولت سا کا سے ملنے گئی تو وہ تانگہ جوڑ رہا تھا۔ اُس نے دولت سے بات چھیڑی تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ تو پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا۔
" لیکن کیا کرنا چاہیئے اب ؟"
" اُنھیں شادی کر لینی چاہیئے "۔ دولت نے کہا۔
" تم بھی یہی کہتے ہو ؟"
" اِس لیئے کہ یہی مناسب ہے "۔
" مگر یہ ممکن کیسے ہو گا ؟"
" میں تین چار روز کے لیئے باہر جا رہا ہوں، ٹھاکر سے بات چیت کروں گا، اُس کی بات کوئی نہ ٹالے گا۔ پھر مَیں کیرتی کے میکے جاؤں گا اور اُس کے ماں باپ کو سمجھاؤں گا۔ مجھے وِشواس ہے کوئی اڑچن نہ پڑے گی "۔
" مَیں تو ڈر رہی ہوں بھیّا "۔
" تم ناحق ڈر رہی ہو، میرے ہوتے ہوئے شیتل پر کبھی آنچ نہیں آ سکتی۔ اُس کا باپ میرا لنگوٹیا تھا۔ مجھے بھی اپنے فرض کا احساس ہے "۔
" میرے گھر کی لاج تمہارے ہاتھ ہے بھیا "۔
" تانگے والے کی بات بھی دیکھ لینا۔ تم جاؤ، کوئی چِنتا نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر بارات کی خاطر شاندار ہونی چاہیئے "۔

دولت کی بات سُن کر ماں شرما گئی اور اُس کا دِل خوشی سے بھر اُٹھا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

نواں باب

ٹھاکر اُمراؤ سنگھ نے شیتل سے دولت کا نام سُن رکھا تھا شیتل نے اس کی بہت تعریف کی تھی اور جب اسٹیشن سے گاؤں تک کی سڑک کو پکّا بنانے کی بات ہوئی تھی تو شیتل نے ٹھاکر کو دولت کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔

اور جب ایک روز دولت، ٹھاکر سے ملنے شہر گیا تو بیچارہ گھبرا گیا۔ اُس کا ٹھاکر سے گھر پر ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ جھجھکتا، گھبراتا، گیٹ کے اندر داخل ہوا۔ پھر پورچ تک پہنچ گیا۔ ٹھاکر کا نوکر کھڑا تھا۔
" مجھے ٹھاکر صاحب سے ملنا ہے "۔ دولت نے کہا۔
" ٹھاکر صاحب اس وقت فارغ نہیں ہیں "۔
ٹھاکر اندر کھڑا یہ گفتگو سُن رہا تھا۔
" مَیں گاؤں سے آیا ہوں اُنھیں ملنے "۔
" کیا نام ہے تمہارا ؟"
" دولت کوچوان "
" ٹھاکر صاحب کوچوانوں اور ڈرائیوروں سے نہیں ملا کرتے "
نوکر نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

دولت مایوس ہو گیا۔ کچھ لمحے خاموش کھڑا رہ کر وہ واپس پلٹ پڑا۔ اُس نے کچھ ہی قدم اُٹھائے تھے کہ پیچھے سے ٹھاکر کی آواز آئی

"دولت کاکا، واپس کیوں جا رہے ہو؟"

دولت نے پلٹ کر دیکھا، ٹھاکر برآمدے میں کھڑا اُسے پکار رہا تھا۔ اُسے جیسے دوبارہ زندگی مل گئی ہو۔ وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے برآمدے میں گیا۔

"نمسکار ٹھاکر صاحب۔"

"ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ تم دولت کو جوان نہیں، دولت کاکا ہو، جس کی آواز سارا سمرپور گاؤں پہچانتا ہے۔"

"آپ کی مہربانی ہے سرکار۔"

"آؤ، اندر آؤ۔" ٹھاکر نے کہا۔

نوکر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پہلے ٹھاکر اور پھر دولت اندر داخل ہوا۔

"کیسے آئے ہو دولت کاکا؟"

"سرکار مجھے دولت کہہ کر مخاطب کیجئے۔"

"ارے نہیں، اِس میں مزا نہیں آتا، کہو کیسے آئے ہو؟"

"آپ کے درشن کرنے آ گیا سرکار۔"

"کنواں مکمل ہو گیا کیا؟"

"جی ہو گیا۔ ایک آدھ روز میں گاؤں کی پنچایت آپ کے پاس آنے والی ہے۔ آپ سے کنوئیں کا اُدگھاٹن کرنے کی درخواست لے کر۔"

"یہ کام تو گاؤں ہی کے کسی آدمی کو کرنا چاہیئے۔"

"آپ تو مالک ہیں گاؤں کے۔"

"خیر دیکھیں گے۔ شیتل کا کیا حال ہے؟ بڑا ہمت والا چھوکرا ہے بھائی۔"

"مَیں اُسی کے لیئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"کہو، کیا بات ہے؟"

"کیرتی کو تو آپ جانتے ہیں نا؟"

"اِتنا جانتا ہوں کہ وہ سرپنچ کے لڑکے کی بیوی ہے اور شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بیوہ ہو گئی تھی۔"

"جی ہاں۔"

"سُنا ہے اُس نے گاؤں کی عورتوں میں بڑا کام کیا ہے اور کنوئیں کے لیئے روپیہ اکٹھا کرنے میں بھی اُس نے بڑی مدد کی ہے۔"

"وہ نہ ہوتی سرکار تو یہ کام شروع ہی نہ ہوتا۔ اُس نے بڑی جان کھپائی ہے اِن دنوں۔"

"تو پریشانی کی کیا بات ہے اب؟"

"سرکار، شیتل اور کیرتی شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

ٹھاکر نے چاندی کے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سُلگایا اور کمرے میں ڈھیر سارا دُھواں اُگل دیا۔ دولت، ٹھاکر کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے خیال میں یہ ٹھیک ہے؟"

"سرکار! بیوہ عورت اگر جیون بھر گھر میں پڑی رہ سکے تو سب سے اچھا ہے، نہیں تو اُسے شادی کر لینی چاہیئے۔"

"ہوں۔"

ٹھاکر نے ایک بار پھر دُھوئیں کا غبار فضا میں چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔ ایسا جواب جس کا کچھ بھی مطلب نہ تھا۔

"کیرتی کے خاوند کو مَرے سات برس ہو گئے ہیں، وہ جوان ہے خوبصورت ہے، نیک ہے، سرپنچ بوڑھا ہے۔ اُس کے مرنے کے بعد کیرتی کی دیکھ بھال کون کرے گا، ماں باپ کے گھر وہ اب تک نہیں گئی تو بعد میں کیا جائے گی؟"

دولت، پہلے پہل تو گھبراتا رہا، لیکن اب بڑی تسلّی سے بات کر رہا تھا۔

"سرپنچ کیا کہتا ہے؟"

"اُس سے میری بات نہیں ہوئی، لیکن وہ آسانی سے نہیں مانے گا اور پھر گاؤں کی پنچایت بھی تو ہے۔"

"تو کیا چاہتے ہو تم؟"

"سرکار! آپ ہی اِس معاملے کو نپٹا سکتے ہیں۔"

"اچھا، میں سوچوں گا۔"

ٹھاکر کی اِس بات سے دولت کوئی بھی اندازہ نہ لگا سکا۔ وہ اِس سے زیادہ ٹھاکر سے کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

دولت ٹھاکر سے اجازت لے کر چلا آیا۔ لیکن وہ بہت مطمئن نہیں تھا۔ وہ کیرتی کے ماں باپ سے بھی ملا تھا۔ انہوں نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی۔ اُن کی لڑکی سات برس سے اُن کے پاس نہیں آئی تھی۔ اب وہ جو اُس کی مرضی ہے کرے انہیں کیا۔

دولت گاؤں نہیں گیا۔ شتیل کی ماں نے اُس سے پوچھا کہ ٹھاکر سے کیا بات ہوئی تھی تو وہ کیا جواب دے گا۔ وہ ایک آدھ روز شہر ہی میں ٹِک گیا۔

کنواں مکمل ہو گیا تو اُسے لگ رہا تھا، جیسے تاج محل ہو — چرخیوں کے سفید سفید ستون بہت ہی خوبصورت لگتے تھے۔ گاؤں کی شان بن گئی تھی کنویں سے۔ آس پاس کے گاؤں والے اُسے دیکھنے آتے تھے۔ دن بھر جیسے میلہ لگا رہتا تھا وہاں۔ اب بس اُس کا اُدگھاٹن کرانا باقی تھا۔ پنچایت کا یہی فیصلہ تھا کہ اس کے لیئے ٹھاکر اُمراؤ سنگھ کو دعوت دی جائے۔

نیکی رام سرپنچ اور پنچایت کے دوسرے ممبروں نے جب شتیل سے ساتھ چلنے کو کہا تو اُس نے انکار کر دیا۔

"میرا کام ختم ہو چکا، اب آپ سنبھالیئے اِسے۔"

"تم ہمارے نیتا ہو۔" ایک پنچ نے کہا۔

"آپ کے نیتا آپ کے سرپنچ جی ہیں۔ جب وہ ساتھ جا رہے ہیں تو میری ضرورت نہیں۔"

نیکی رام نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ شتیل نہیں مانے گا۔

چنانچہ پنچایت والے بغیر شتیل کو ساتھ لیئے ہی شہر چلے گئے، ٹھاکر اُمراؤ سنگھ کو دعوت دینے۔

ٹھاکر اتنے لوگوں کے اصرار کو نہ ٹال سکا۔ اور اُس نے گاؤں والوں کی درخواست مان لی۔

جب سب لوگ چائے پی رہے تھے تو ٹھاکر نے نیکی رام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سرپنچ جی! میرا ایک سُجھاؤ ہے۔"

"فرمائیے ٹھاکر صاحب۔"

"شتیل کی شادی کیرتی سے کر دیجئے۔"

پنچایت کے لوگ حیران رہ گئے۔ ٹھاکر یہ کیا کہہ رہا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ٹھاکر صاحب؟" نیکی رام بولا۔

"زمانہ بڑا بدل چکا ہے۔ قانون کے لحاظ سے ایک بیوہ دوسری شادی کر سکتی ہے۔ جب تک آپ زندہ ہیں کیرتی کو کوئی چنتا نہیں۔ لیکن آپ کے بعد اُس کا کیا ہوگا؟"

"میری تمام جائداد کیرتی کے نام ہے۔"

"جینے کے لیئے صرف جائداد ہی کافی نہیں ہوتی سرپنچ جی۔ زندگی میں اور بھی بہت کچھ چاہیئے۔"

"مَیں مجبور ہوں، اور پھر یہ سارے گاؤں کا سوال ہے، صرف میرا ذاتی معاملہ ہی نہیں۔" نیکی رام نے جواب دیا۔

"اگر کیرتی اِس پر راضی ہو تو گاؤں کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔"

"ہمارے گاؤں میں آج تک ایسا نہیں ہوا سرکار۔" ایک پنچ بولا۔

"ہمارے گاؤں میں بہت کچھ پہلے نہیں تھا جو اب ہو رہا ہے۔ زمانے کے ساتھ بدلنا پڑتا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن"۔۔۔ دوسرا پنچ بولنے کو اُٹھا۔

"دیکھیئے، میں خود ایکدم بدل گیا ہوں۔ آخر مَیں نے محسوس کر لیا کہ اگر میں وقت کے ساتھ نہ چلا تو وقت مجھے چھوڑ کر آگے نکل جائے گا۔ وہ بڑا ظالم ہے، کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔"

"کیرتی کے ماں باپ کی رائے لینا بھی تو ضروری ہے۔" ایک اور پنچ بولا۔

"اُس کا انتظام مَیں نے کر لیا ہے۔ اُنہیں کوئی اعتراض نہیں۔ اُنھوں نے سب کچھ لڑکی پر چھوڑ دیا ہے۔"

ٹھاکر اور پنچوں میں بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ دونوں طرف سے دلیلوں کا تانتا بندھا رہا۔ آخر نیکی رام نے کہا۔

"اگر پنچایت کو کوئی اعتراض نہیں تو مجھے منظور ہے۔"

نیکی رام، کٹر قسم کا آدمی نہیں تھا۔ اُس کے خیالات کافی کھلے تھے۔ اُسے قائل کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

اُسے تو صرف گاؤں والوں کا خیال تھا۔ اگر پنچایت اپنی رضامندی دے دے تو ٹھیک ہے۔

ٹھاکر نے پنچایت سے آخری بار پُوچھا۔ دو چار لمحے آپس میں بات ہوئی اور پھر سب نے منظوری دیدی۔

ٹھاکر نے کہا:

"لڑکی کے پِتا کے فرائض میں ادا کروں گا"

ٹھاکر کی یہ بات سُن کر سب خوش ہو گئے اور پھر دوسرے دن کا پروگرام طے کرنے کے بعد گاؤں لوٹ گئے۔

دوسری صبح، ٹھاکر اُمراؤ سنگھ اپنی کار میں سمر پُور پہنچا لوگوں نے جی بھر کر اُس کا سواگت کیا۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ سب خوش تھے۔ ایک صرف کیرتی اور شتیل اُداس تھے۔ جیسے وہ منزل پر پہنچ کر لُٹ گئے ہوں۔ جیسے جس مقصد کے لیئے وہ اتنی دیر جد وجہد کرتے رہے تھے وہ مقصد ہی ختم ہو گیا تھا۔ بالکل بے جان سے نظر آ رہے تھے دونوں۔ کئی دِنوں سے دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے آنکھیں چُرا رہے ہوں۔

اُدگھاٹن کے سمے سارا گاؤں چُپ چاپ بیٹھا تھا۔

ٹھاکر تقریر کرنے کے لیئے اُٹھا۔

"مَیں نے سُنا ہے کوئی لڑکی گُلابی ہے اِس گاؤں میں، کسی ہری جَن بھائی کی لڑکی۔ اُس نے کنُویں کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ مَیں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں"

سب کی نظریں پنڈال میں بیٹھی عورتوں کی طرف اُٹھیں۔

کہیں سب سے پیچھے کیرتی کے ساتھ گلابی بیٹھی تھی، سیدھے سادے لباس میں، ایک دیہاتی لڑکی کی طرح۔ اپنا نام سُنا تو گھبرا گئی کیرتی نے اُسے بڑی مشکل سے اپنی جگہ پر کھڑا کیا اور پھر بیکی رام سرپنچ اُسے تھامے ہوئے ٹھاکر کے پاس لے آیا۔ گلابی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

گلابی اتنے سارے لوگوں کے سامنے اکیلی کھڑی تھی۔

اُس کی نظریں جُھکی تھیں اور اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔

"کنُویں کا اُدگھاٹن، مَیں نہیں گلابی کرے گی" ٹھاکر کی آواز گونجی۔

گُلابی کو لگا، جیسے وہ پسینے میں نہا رہی تھی۔ تالیوں کی گونج میں اُس کے دل کی دھڑکنیں ڈوبنے لگیں۔

کنُویں کا اُدگھاٹن گلابی نے کیا۔

اُسی لمحہ جانے کیسے شتیل اور کیرتی کی آنکھیں مِلیں، جیسے دو چراغوں کی لَوئیں آپس میں ٹکرا گئی ہوں۔

"مَیں گاؤں والوں کو ایک اور خوشخبری دینا چاہتا ہوں"

ٹھاکر کی پاٹ دار آواز ایک بار پھر گونجی۔ اور سب کی نظریں اُس کے چہرے پر جم گئیں۔

"گاؤں کی پنچایت نے فیصلہ کیا ہے کہ آج شتیل اور کیرتی کی شادی ہوگی، یہیں، اِسی جگہ، اِسی وقت"

ایک سنّاٹا چھا گیا۔ یہ غیر متوقع خبر لمحہ بھر کے لیئے سب کو سُن کر گئی۔ اور پھر ایکدم مسرّت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کے اِس ٹھہرے ہوئے سمندر میں۔ عورتوں اور مردوں کے چہرے چمک اُٹھے۔ شتیل اور کیرتی کی آنکھیں جُھکی رہ گئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے منڈپ بن گیا۔ شادی کی تیاری ہو گئی۔

ایک شخص تھا جس کی اب تک کسی کو یاد نہ آئی تھی۔ اب اُس کی تلاش ہونے لگی۔ وہ تھا دولت کاکا۔ جو اپنے گھر کے کواڑ بند کیئے پڑا تھا۔ ایکدم اُداس اور ہارا ہوا۔ لوگ اُسے بڑی مشکل سے ساتھ لائے۔ ٹھاکر کے سامنے آیا تو ٹھاکر نے کہا۔

"وقت آیا ہے تو بھاگنے لگے ہو دولت کاکا۔ لڑکے کے پِتا کے فرائض تو تمہیں انجام دینے ہیں"

ٹھاکر کی بات سُن کر دولت نے اُس کے پاؤں چُھونے چاہے۔

"نہیں یہ مریادا کے خلاف ہے۔ یہ فرض لڑکی والوں کا ہے"

لڑکی کی طرف سے ٹھاکر اُمراؤ سنگھ اور لڑکے کی طرف سے دولت کاکا منڈپ میں بیٹھے اور شتیل اور کیرتی سدا کے لیئے ایک دوسرے کے ہو گئے۔

ٹھاکر نے اپنی طرف سے دو ہزار روپے شتیل کو دیا۔

"شتیل کی ماں! آج شام بہت بڑھیا دعوت کا انتظام کرو" ٹھاکر نے ہنستے ہوئے کہا۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے اور اُس نے جواب دیا۔
"آپ اَن داتا ہیں ٹھاکر صاحب۔ شیتل کے پِتا زندہ تھے تو آپ ہی کا سہارا تھا۔"
دھیرے دھیرے، ہجوم چھٹ گیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔
سبھی لوگ اِس خوشی کے موقع پر شامل تھے۔ اگر کوئی غیر حاضر رہا تھا تو مُراری اور اُس کا ساتھی گلابی کا باپ رام سیوک، اور اُن کے تین اور پیروکار۔ شیتل کو اس بات کا افسوس تھا۔
شام کو شیتل کے گھر چائے پی کر ٹھاکر واپس شہر چلا گیا۔
اور کیرتی اُس رات نیکی رام کے گھر سے شیتل کے گھر آ گئی۔

اُس روز کے بعد سب نے کھاری پانی والے کُنویں پر جانا چھوڑ دیا۔ بڑا ہی پیارا میٹھا اور ٹھنڈا پانی تھا نئے کُنویں کا تمام گاؤں اب اِسی کُنویں سے پانی بھرتا تھا اور ٹھاکر کو دُعائیں دیتا تھا۔ ہریجن بھی اب وہیں سے پانی لیتے تھے۔ لیکن گاؤں کے پانچ آدمی اب بھی کھاری پانی کے کُنویں پر ہی جاتے تھے۔ وہ تھے مُراری، گلابی کا باپ رام سیوک اور اُن کے تین اور ساتھی۔
کچھ روز تو شیتل یہ سب دیکھتا رہا اور پھر ایک صُبح وہ اور کیرتی، مُراری، رام سیوک اور اُن کے تین دوسرے ساتھیوں من پیر، گوبند اور جگ رام کے گھر گئے۔ اُن کے سامنے ہاتھ جوڑے اور اُنہیں نئے کُنویں سے پانی بھرنے کے لیئے کہا۔ گلابی ڈول لے آئی۔ پانچوں آدمی ساتھ تھے۔ شیتل اور کیرتی پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔
گلابی نے کُنویں میں ڈول لٹکا کر پانی کھینچا اور سب کو اوک سے پانی پلایا۔ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے گھونٹ پی کر سب نہال ہو گئے۔ شُدھ اور پوتر پانی کے اِس جھرنے نے دِلوں کا میل دھو دیا اور سب کے مَن آئینے کی طرح چمک اُٹھے۔ ایکدم صاف اور نکھرے ہوئے۔ انسانی رشتے اِسی طرح تو سَنورتے ہیں۔

اور اُس کے بعد کچھ روز اور بھی عورتوں کا سنٹر نہیں کھلا۔ سب عورتیں دوسرے کاموں میں اُلجھی رہیں۔ فُرصت ہی نہ ملی کسی کو اُدھر آنے کی۔
آج گلابی نے سنٹر کھولا تھا۔ بیٹھنے کی جگہ صاف کی تھی۔ دریاں جھاڑی تھیں۔ پانی کے مٹکے بھرے تھے اور پھر دھیرے دھیرے گاؤں کی عورتیں گھر کے کام کاج سے نمٹ کر آنے لگی تھیں، سب جیسے ایکدم بدل گئی تھیں۔ اُنھیں خود احساس ہو رہا تھا کہ کوئی نئی بات ہو گئی تھی۔ نئی اور اچھی اور انوکھی۔
سب سے آخر میں کیرتی آئی۔
اُس نے وہ ساڑی پہن رکھی تھی جو کچھ روز پہلے شیتل نے اُسے خرید کر دی تھی۔ اُس کی مانگ جو پورے سات برس تک سُونی رہی تھی، آج سیندور کی لکیر سے چمک رہی تھی۔ جیسے روشنی کا دریا بہہ رہا ہو۔ اُس کے کُشادہ گورے ماتھے پر لال بندی یُوں چمک رہی تھی جیسے اُس میں سے نئے پربھات کی کرنیں پُھوٹ کر سارے ماحول کو جگمگا رہی ہوں۔
نیا سویرا جو سمر پُور گاؤں پر طُلوع ہو چکا تھا۔
روشنی کا سیندور دھرتی کی مانگ میں بِکھر رہا تھا۔ دھرتی جو سدا سُہاگن ہے!

▲

مالک پرنٹر، پبلشر، اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۳-۲ نوروزجی اسٹریٹ، ٹھاکردوار، بمبئی ۲ میں چھپوا کر وہیں سے شائع کیا۔